فسانۂ آزاد

جلد اوّل

فسانۂ آزاد

جلد اول

مصنّف

رتن ناتھ سرشار لکھنوی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

FASANA-AZAD VOL. I

By: Rattan Nath Sarshar

سنہ اشاعت: جنوری، مارچ 1986 شک 1907

پہلا اڈیشن : 1000
قیمت: 100/=
سلسلۂ مطبوعات: ترقی اردو بیورو 516
کتابت: وکیل الرّحمٰن ملک، مکان نمبر ۲۵۲ سی بٹلا ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ناشر: ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، محکمہ تعلیم ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110066
طابع: سپر پرنٹرز ساؤتھ انارکلی دہلی 51

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کرچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو

جلد اول

فسانۂ آزاد

فہرست مضامین

جلد اوّل

فسانۂ آزاد

دیباچہ رازِ نکتہ سازان است ایں — فہرست خیال جاں گدازاں است ایں

تعویذ دلِ سخن طرازاں است ایں — طومارِ جنون عشق بازاں است ایں

سحر کاذب کے وقت، مرغِ بے ہنگام نے گربۂ مسکین کی آہٹ جو پائی، تو گھبرا کر گٹروں کوں کی بانگ لگائی اور ہمارے حبیبؔ لبیب دقیقہ رس، صبح نفس، جو سرِ شام سے لمبی تانے، میٹھی نیند سو رہے تھے، یہ آوازِ خوش آیند سنتے ہی، کُلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ اُدھر آنکھ کھلی، اِدھر باچھیں کھل گئیں۔ دیکھتے کیا ہیں، کہ ابرِ نوبہار، نسیمِ مشکبار، نے تمام شہر کو نمونۂ گلزارِ ارم بنادیا ہے۔ یہ شاعر آدمی حسن پرست، وارفتہ مزاج، رنگین طبع، آزاد منش، تاب کہاں کہ مکان کے قفس میں قید رہیں۔ بوئے گل کی طرح نکل کھڑے ہوئے۔ روشنی طبع کے صدقے، ایک ایک قدم پر ایک ایک مصرعِ ریختہ، موزوں ہوتا جاتا تھا۔ وہاں داد کون دے۔ خود ہی گردن ہلاتے جاتے تھے، اور احسنت و مرحبا وغیرہ کلمات زبان پر لاتے تھے، اور خود ہی جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔

الغرض ہمارے دُھن کے پکّے حبیب، بُجذ ذبوں کی قطع بنائے، چلے جاتے تھے، کہ دو مختلف الاوضاع حضرات نظر سے گذرے۔ ایک صاحب کی وضع دُنیا سے نرالی، پتلون خاکی، جاکٹ کالی، کوٹ پیلا، ویس کوٹ ڈھیلا، گھنی ڈاڑھی، خرگوش کی جھاڑی، ہاف بوٹ پہنے، کھٹ پٹ کرتے ڈبل چال چلے جاتے ہیں۔ دوسرے بزرگوار، زیبا اندام، نازک خرام، گلفام، کیمچل لیٹ کا دھانی رنگا

لے فسانہ آزاد کا پہلا کردار حبیب لبیب۔ یہ نہایت خوش مذاق اور نکتہ سنج انسان معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا کردار آزاد اور تیسرا چھمی جان یہ دونوں نہایت تیز وطرار ہیں۔

ہوا کرتہ اس پر روپیہ گز والی مہین شربتی کا تین کمر توئی کا چست انگرکھا۔ گلبدن کا چوڑی دار گھٹنا پہنے، بیسواؤں کی طرح پٹیاں جمائے، عطرِ عُروس لگائے، نکّے دار ماشہ بھر کی ننھی سی ٹوپی، آلپین سے اٹکائے۔ ہاتھوں میں منھدی، پور پور چھلے، آنکھوں میں سرمے کی تحریر، چھوٹے پنجے کا زرد مخملی چڑھواں جوتا زیب پا کیے ہوئے، ایک عجیب لوچ سے کمر لچکاتے، پھونک پھونک کر قدم دھرتے چلے آتے تھے۔ اُنھوں نے اُن کو اور اُنھوں نے اِن کو خوب غور سے گھورا، اور ہمارے جیبب لبیب نے دونوں پر ایک ایک نظرِ غلط انداز ڈالی چتونوں سے تاڑ گئے، کہ دونوں دُھن کے پکّے ہیں۔ اتنے میں حضرت نازک بدن نے مسکراتے ہوئے آواز دی۔ اب دل لگی دیکھیے، کہ کس لطف کی نوک جھونک ہوتی ہے۔

نازک بدن : میاں جانے والے! او میاں جانے والے! اے ذری ادھر تو دیکھو! الٰہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ میرا کلیجہ بلیّوں اچھلتا ہے۔ بھری برسات کے دن اے ہے! کہیں پھسل نہ پڑیں، تو قہقہہ اُڑے۔ یار لوگوں کو دل لگی ہاتھ آئے۔ ان بیچارے کی کھوپڑی پر جائے۔ حضرت سنبھلے ہوئے۔

جانے والا : (ٹھہر کر) ارشاد، آپ اپنا مطلب فرمائیے۔ میرے پھسلنے کی فکر نہ کیجیے۔

نازک بدن : گر پڑے گا تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔

جانے والا : بہت خوب، ضرور پوچھ لوں گا، بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گروں تو سہی۔ نیچے آپ ہوں، اُوپر بندہ۔ انشاء اللہ۔

نازک بدن : آپ نے یہ کیسی نیم ٹر قطع بنائی ہے۔ کہیں گڈ امیر کی پھبتی آپ ہی پر تو لوگ نہیں کہتے ہیں؟

جانے والا : آپ کو یہ زنانوں کی وضع کیسی بھائی ہے، یہ چھمی جان آپ ہی تو نہیں مشہور ہیں۔

چھمی جان : (وہی نازک بدن) خدا کی قسم آپ کے کانے کپڑوں سے میں سمجھا، کہ بنڈیلا کسم کے کھیت سے نکل پڑا میاں آزاد، جو سنا کرتے تھے وہ آپ ہی تو نہیں ہیں؟

جانے والا : قسم حضرت عباسؑ کی میں آپ کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ کوئی زنانہ مٹکتا جاتا ہے۔ یا پنجہ کش ساقن مردانہ بھیس میں آتی ہے۔

چھمی جان : واللہ آپ کی دھج ہی نرالی ہے۔ یہ ڈبل کوٹ، اور لکڑ توڑ بوٹ، ماشاء اللہ ختم ماشاء اللہ۔

آزاد : اللہ رے تیرے دستِ حنائی۔ اُف ری تیری دلربائی، یہ لگاوٹ، یہ سجاوٹ، یہ لوچ،

نازک کمری، یہ دیدے کی صفائی، یہ شوخ نظری، خدا اس چشم سرگیں کو عینُ الکمال کے اثر سے بچائے اللہ تم کو مردِ دوا بنائے۔

چھمّی جان : اس وقت آپ ایسے بدحواس، کہاں بکٹٹ بھاگے جاتے تھے۔ سچ کہیے گا آپ کو ہماری جان کی قسم۔ ہمارا ہی لہو پیے جو لگی لپٹی بات کہے۔

آزاد : آج پروفیسر لاک صاحب، زبانِ پاک سنسکرت کی اشرفیت پر لکچر دینے والے ہیں۔ یہ بزرگوار بڑے مقدّس اور عالم یگانہ، یکتائے زمانہ، مشہور دیار امصار ہیں ان کی زیارت سے ہے۔

چھمّی جان : لَاحَولَ وَلا قوۃ۔ بھئی قسم خدا کی، کتنے بھونڈے ہو۔ کتنا خراب مذاق ہے۔ پروفیسر صاحب کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی ہم اتنے بڑے ہوئے آج تک نام بھی سُنا ہو تو قسم لیجیے۔ کیا دُنی خاں سے زیادہ مشہور ہیں؟ نام زبان پر آتے ہی لطفِ صحبت آنکھوں میں پھر گیا اور تو نہیں جانتا۔ بھئی جو کہیں، تمھارے گھونگریالے بال۔ ایک دفعہ بھی اس کی زبان سے سن لو تو عمر بھر نہ بھولو۔ واللہ! کیا ٹیپ دار آواز ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بین بجا رہا ہے۔ مگر تم ایسے کوڑھ مغزوں کو گلے بازی اور نازک آوازی، سے کیا واسطہ۔ تم تو پروفیسر صاحب کے پھیر میں ہو۔ تڑ کا ہوا اور چلے لکچر سننے۔ ایسے مذاق پر تین حرف۔

آزاد : بندہ پرور مجھے جو کچھ صلواتیں سُنانا ہو سنا لیجیے۔ اُلو بنا لیجیے۔ مگر برائے خدا، ایسے طیّب النفس فخرِ بنی نوعِ انسان بلیغ نکتہ داں، بزرگوار کے حق میں تو کلماتِ خُرافات زبان سے نہ نکالیے۔ آج وہ تمام یورپ میں محقّقِ اکمل، فاضلِ اَجل، سمجھے جاتے ہیں، اور ہزاروں آدمی اُس عالم تبحّر کی تحقیق اَنیق سے فیض پاتے ہیں؟

گوہر پاک تو از مدحت ما مستغنی ست
دستِ مشاطہ چہ با حُسنِ خدا داد کند (حافظ)

چھمّی جان : کیوں حضرت یہ شعر کس دُھن میں ہے؟ واللہ گانے کے لائق ہے۔

ع ۱ آزاد اور چھمّی جان یہ دو دلچسپ کردار ہیں، دونوں ذہین اور حاضر جواب۔ اگر ایک محاورے میں بات کرتا ہے تو دوسرا اس معیار کے روز مرّہ میں جواب دیتا ہے۔ فقرہ بازی میں بھی دونوں برابر ہیں۔ حبیب لبیب، دونوں میں رابطہ کا کام کرتا ہے اور عقل و ہوش کی باتیں کر کے مشکلات کا حل تلاش کرتا ہے۔

آزاد : آپ پر خدا کی سنوار۔ اور آپ کی دُھن پر شیطان کی پھٹکار۔ اے توبہ شعر کی تعریف کرنا درکنار کہنے لگے کہ یہ کس دُھن میں ہے۔ دُھن کسی ڈھاڑی بچے سے پوچھیے، میں دُھن وُن نہیں جانتا۔ وزن تقطیع بحر، البتہ پوچھیے تو تشفی کر دوں۔ آپ تو میں دیکھتا ہوں نے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بندہ نواز! اس ناچ رنگ نے آپ کی یہ گت بنائی، کہ مونچھ اور ڈاڑھی کتروائی۔ مہندی لگائی۔ عورتوں کی وضع بھائی۔ للہ اب تو مرد دے ہنجاؤ۔ ان باتوں سے باز آؤ۔

چھمّی جان: جی، تو آپ کے پروفیسر لاک کے پاس چلا جاؤں۔ آپ کے پیرِ مغاں کی بیعت لاؤں۔ آدمی سے مخنث بن جائیں۔ اپنے کو آپ کی طرح گڈامی بناؤں۔ آپ کسی گلی کوچے میں نکلیں، تو واللہ! اس وضع پر کتے ٹنگڑی لیں۔ اپنی وضع تو دیکھیے۔ ہیں پر شیر ہیں۔ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔

آزاد : اب یہ فرمائیے کہ اس وقت آپ کہاں کے ارادے سے نکلے ہیں؟

چھمّی جان : کل شب کو تین بجے تک ایک رنگیلے دوست کے یہاں محفل رقص و سرود میں شریک تھا۔ واللہ وہ پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئیں، کہ واہ جی واہ۔ کس کا اٹھنے کو دل چاہتا ہو۔ جلسہ برخواست ہوا، تو بس کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ہم بھی با دلِ سرد، اٹھ کھڑے ہوئے لیکن دل زُلفِ مہوشاں ہی میں پھنسا تھا۔ رات بھر کانوں میں چھماچھم کی آواز آیا کی۔ پریوں کی پیاری پیاری صورت آنکھوں میں پھرا کی۔ ایک ایک جو وہاں تھی، دنیا سے نرالی، فتنۂ زمانہ، آفت ڈھانے والی، جسے دیکھو نور کا عالم، چندے آفتاب، چندے ماہتاب، مگر وہ چاند سا مکھڑا نہ بھولے گا، نہ بھولے گا۔ ہائے مرتے دم تک نہ بھولے گا زاہد صد سالہ بھی دیکھے تو اس بت بے پیر کی پرستش کرے۔ اب اس وقت جھٹ پٹ پھر جاتے ہیں۔ ذرا آنکھیں سینک آئیں۔ بھیرویں اُڑ رہی ہوگی۔ "رسیلی نینوں والیوں نے پھندا مارا۔"

آزاد : کل فرصت ہو تو ہم سے ملیے گا۔

چھمّی جان : کل تو ملنا معلوم۔ کل تک تو نیند کا خمار رہے گا۔

آزاد : اچھا جانے دیجیے، پرسوں سہی۔

چھمّی جان : پرسوں، اے پرسوں تو فغفورِ چین[1] بھی یاد فرمائیں تو بندہ نہ جانے کا پرسوں نواب صاحب کے ہاں بٹیروں کی پالی ہے۔ مہینوں سے بٹیر تیار کیے ہیں۔ دو دو پنجے تو کسا لیں، اِدھر یا

---

[1] زمانہ قدیم میں چین میں فغفور نامی حکمراں گذرا ہے اس کے خاندان کا ہر بادشاہ فغفورِ چین کہلاتا تھا۔ یہ بہت مشہور اور زبردست خاندان تھا۔ سکندر رومی کے بعد وہ باسٹھ سال حکمراں رہا۔ فغ چینی زبان میں بت کو کہتے ہیں اور فور بیٹے کو۔ یعنی بت کا بیٹا۔

اُدھر دیکھیے تو میری ٹوری کیسی بڑھ بڑھ کے لات دیتی ہے، کہ اچھے اچھے بٹیر ایک ہی منھ میں نوک دم بھاگیں
آزاد: خیر صاحب! پرسوں نہ سہی دوشنبہ کے دن ملیے۔
چھمّی جان: دوشنبہ کو تڑکے سے بانے کی کنکیاں لڑیں گی۔ ابھی بنارس سے بانا منگایا ہے۔ واللہ ماہی جال کی کنکیاں، ایسی سدھی ہیں کہ ہر دم قابو میں۔ موڑو، غوطہ دو، کھینچو، جو چاہو سو کرو، جیسے اصیل گھوڑا۔ بھئی کھینچ میں تو ولایتی اپنے فن کا جالینوس ہے۔
آزاد: الٰہی خیر! چلیے سہ شنبہ یوں گیا۔ چہار شنبہ کو فرصت ہے۔
چھمّی جان: واہ وا، واہ، چہار شنبہ کو تو بڑے تڑکے سے بھٹیاریوں کی لڑائی ہوگی۔ دیکھیے تو کیسی کیسی پریزاد بھٹیاریاں، کس بانکی ادا سے ہاتھ چمکا کر، انگلیاں مٹکا کر لڑتی ہیں اور کیسی بے نقط سناتی ہیں کہ تو بہ ہی بھلی
آزاد: پنجشنبہ کو تو ضرور ملنا ہوگا۔ تم کو واسطہ خدا کا۔
چھمّی جان: حضرت آپ تو بڑے مڑچڑے ہیں۔ ملوں تو سب کچھ جب فرصت بھی ہو۔ یہاں مرنے تک کی تو فرصت نہیں۔ اب کی نوچندی جمعرات ہے۔ خدا جانے کس کس کے وعدے وفا ہوں گے۔ برسوں سے منتیں مانی ہیں۔ آپ کو دنیا و مافیہا کی خبر تو ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو بس ایک پروفیسر صاحب اور دوسرے لکچر سے سروکار ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔
آزاد: بس قبلہ! ملنا ملانا معلوم۔ فرصت عنقا، ملاقات معدوم۔ آج مرغ لڑائیے گا کل پتنگ چھپکائیے گا۔ پرسوں بٹیروں کی پالی میں جائیے گا۔ کہیں محفل رقص و سرود آراستہ ہوگی۔ کہیں بزم طرب پیراستہ ہوگی۔ آپ رونق افروز نہ ہوں، تو رنگ کیوں کر جمے۔ اربابِ نشاط کا فروغ آپ کے دم سے۔ جلسے کا لطف آپ کے فیض قدم سے۔ میلا ٹھیلا تو کوئی آپ سے کاہے کو چھوٹتا ہوگا۔ پھر بھلا ملنے کی کون صورت:۔

ہمیں لکچر سے اور تم کو تھر کنے سے کہاں فرصت[۲]
چلو بس ہو چکا ملنا نہ یاں فرصت نہ واں فرصت

۲؎ سرشار عبارت آرائی کے دوران، اردو اور فارسی شعر کے اشعار لکھتے چلے جاتے ہیں۔ شاعر کا حوالہ نہیں دیتے۔ اس کا سبب یہ ہوگا کہ اس زمانہ میں یہ اشعار مشہور اور مروج ہوں گے۔ اور انھوں نے حوالے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ یا سرشار کو یہ اشعار یاد تو ہوں گے لیکن یہ قلم برداشتہ لکھتے وقت شاعر کا نام اور اس کا عہد یاد نہ رہا ہوگا۔ بعض مقامات پر نام لکھے ہیں۔ بہت سے اشعار ایسے بھی نظر آتے ہیں، جن کے متعلق گمان غالب ہے کہ خود سرشار نے موقع کی مناسبت سے تصنیف کیے ہیں۔

الوداع یار زندہ وصحبت باقی۔ جیبں گے تو مل رہیں گے۔

چھمی جان: اے توخداوند آپ روٹھے کیوں جاتے ہیں۔ بے سبب، بے خطا، یہ جور وجفا:

تعلیم جفا کردو وفا ہیچ نیاموخت

ایں درس غلط بحث براستاد تودارم

آزاد: بے حضرت! واسطے خدا کے اب مجھے آزاد ہی کیجیے۔ باتیں آپ کرتے ہیں، وحشت مجھے ہوتی ہے۔ آپ کے ان اشغال پر تین حرف، ل۔ ع۔ ن۔ آپ کا اور ہمارا میل جیسے گنگا اور مدار کا ساتھ۔ بندے کو کتب بینی کا شوق، آپ کو تال دھن کا ذوق۔ میں شعر کی تقطیع کرتا ہوں۔ آپ اور دھن پر سر دھنتے ہیں۔ جائیے، جائیے، ٹھنڈے ٹھنڈے، ہوا کھائیے۔ دیکھیے پھر دیں کا لطف جاتا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا ہے۔

چھمی جان: بھئی قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی کہ اب ناچ دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ چمک دمک اب کہاں۔ وہ دھوم، نہ وہ سامان، وہ ولولہ، نہ وہ ارمان، دل ہی بجھ گیا۔ مگر پرانی صحبتیں دیکھی ہیں۔ جہاں طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک سنی، وہیں جاد ھمکے اور میاں جو لطف ہم نے دیکھے ہیں ہفت اقلیم کے بادشاہ کسی خاقان کج کلاہ، خسرو گیتی پناہ، کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ قیصر باغ[1]، رد کشِ باغ نعیم، نمونۂ فردوس بریں تھا۔ جدھر دیکھو سبزانِ گلابی پوش، جدھر جاؤ رِندانِ ساغر نوش۔ کہیں پریوں کا ہجوم، کہیں ماہرویوں کی دھوم، کوئی رشکِ شاہدانِ چگل۔ کوئی کالبدر فی النجوم۔ وہ تیکھی چتون، وہ دلربائی، وہ شوخی، وہ رنگین ادائی، عشاقِ خستہ جاں، زار و نالاں، ہجر میں دم توڑتے جاتے ہیں۔ چاہے عاشقوں کی جان جائے۔ مگر وہ نظر اٹھا کر دیکھیں، تو معشوق پن کجا، اُف ری غرور افزی ادا:

غرورِ حسن اجازت، مگر ندادا ی گل

کہ پرسشی بکنی عندلیبِ شیدا را[2]

---

[1] لکھنؤ میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی تعمیر کرائی ہوئی مشہور عمارت اور باغ۔

[2] حافظ کے بعض نسخوں میں غرور منت ہے۔ سرشار نے خواجہ حافظ شیرازی (متوفی ۷۹۱ھ) کے اشعار میں سے زیادہ پیش کیے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو حافظ کا کلام بہت پسند تھا اور بکثرت اشعار حفظ تھے جیسا کہ آیندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

بڑے بڑے زہّادِ صد سالہ تسبیح و تہلیل بھول گئے۔ اچھے اچھے متشرع ان کے مصحفِ رُخ کا کلمہ پڑھنے لگے۔ ایک بانکی ادا نے برسوں کی ریاضت خاک میں ملا دی :

پنجہ زد عشقش لباسِ پارسائی پارہ شد
طاعتِ صد سالہ ام تاراجِ یک نظارہ شد

ہے ہے اب یہاں رہ کیا گیا۔ گلی کوچوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ سو جب سے دو گنڈے کتا ملنے لگا۔ اب وہ بھی نظر نہیں آتے۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ ساقنوں کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ بانکے ترچھے رئیس زادے، ایک ایک دم کی دو دو اشرفیاں کھنا کھن اور چھنا چھن پھینک دیتے تھے یا اب ایک زمانہ ہے کہ شہر بھر میں اِس سرے سے اُس سرے تک شمع لے کر ڈھونڈھیے تو شمع را عنبریں مو، عربدہ جو۔ محبوب آئینہ زانو کا پتا نہیں، میدان خالی۔ نہ جندر، نہ مندر، نہ پارہ والی۔ کل محمد علی کی دُکان سے دو سیر اخمیر ا بنوا کر فرنگی محل سے نئی سڑک کی طرف جو نکلا، تو نکڑ پر ایک ہاتھی بندھا دیکھا۔ سونڈ سے گھاس اُچھال رہا تھا، پوچھا کیوں میاں یہ کس کا ہاتھی ہے۔ ایک خوش قطع، خوش وضع، جوان بول اٹھا، کہ حضرت یہ بی حیدر جان کا ہاتھی ہے۔ قسم خدا کی جھوٹ بولنا اور سور کا کھانا برابر ہے۔ واللہ ایسا مسرور ہوا کہ آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ سر جھک گیا دل بھر آیا اللہ رے عروج ے

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

شکر ہے خداوندا کہ لکھنؤ میں اب بھی اربابِ ہم موجود ہیں۔ اور ہیں نہیں تو دنیا کیوں کر قایم ہے۔ واللہ جو کسی سے ملنے کو جی بھی چاہتا ہو۔ وہ لوگ ہی نہیں۔ وہ صحبتیں ہی نہیں، وہ چہل پہل نہیں۔ واللہ قیصر باغ کی بہار، اور مہوشانِ پری پیکر کا نکھار، اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ جس طرف نکل جاؤ سُرخا سُرخ، گُلِ لالہ کھلا ہے۔ اور اس گُلِ لالہ کی بہار میں غنچہ دہاں، گل اندام، گلفام، گلرنگ، گلبدن، عجب ٹھسّے سے چمک چمک کے چھُپ چھُپ کر چھب دکھاتے تھے۔ نور کا عالم، دن عید، رات شب برات، اس کا اکھاڑا گرد، پرستان مات۔ اگر ہرے بھرے درخت کے سایہ میں کوئی سرو قد چھپ رہا تو شجر کو نہال کر دیا۔ کلیوں نے کسی غنچہ دہن کو دیکھا اور کھل گئیں۔ نرگس شہلا کی نظر بازی، سوسن کی زبان درازی، بُلبُل کی خوش آوازی، الغرض باغ نزہت آگین، اور حسینانِ زہرہ جبین، اور اس کے فریدون فر، جم جاہ، مکیں پر گلزارِ ارم، حورانِ بہشت

اور ملائکہ نوری کا دھوکہ ہوتا تھا۔ اب بھی غنیمت ہے کہ مہینے دوسرے مہینے کسی رنگین طبع کے طفیل میں کسی آتشیں رو سے آنکھیں سینک لیتے ہیں:

صیاد نے تسلیِ بلبل کے واسطے
کنجِ قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

آزاد : واللہ کتنے تو چین میں تھے۔ صبح کو جام، شام کو دلآرام طبلے کی تھاپ، ہائیں کی گمک، پازیب کی چھم چھم، برق و شوق کے شعلۂ آواز کی چمک۔ پاؤں کی تھپک، عطر کی مہک، رخسار تاباں کی جھلک، مگر۔ "عمر سب مفت میں کھویا کیے نادان رہے" میاں آزاد نے یہ مصرعہ پیچیدہ اس بے ساختہ پن سے عین موقع پر ادا کیا کہ ہمارے حبیب لبیب کھِل کھلا کر ہنس پڑے، اور ایسا فرمائشی قہقہہ لگا کہ چھمّی جان کے منھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اب چپتے کہ ایک ثالث بالخیر بھی چپکے چپکے ساری داستان سُن رہے تھے۔

حبیب لبیب : (چھمّی جان) یا حضرت! مجرا عرض ہے۔ اس خوش بیانی اور پرگوئی کے قربان! ماشاء اللہ کس آن سے اور کس شان سے، آپ نے پُرانی صحبتوں کا مرقع کھینچ دیا۔ ہم نے فصیح و زباں داں، تو بہت دیکھ ڈالے ہیں، مگر آپ سب سے نرالے ہیں۔ واللہ آپ اپنے وقت کے سلمان ساؤجی ہو[1]:

مرغانِ خوش آہنگ اندر باغ سخن لیکن
نالیدن ایں بلبلِ شورِ دگرے وارد

آپ کی جادو بیانی تو اس دم اپنا کام کر گئی، مگر حضرت! سچ کہیے گا ان صحبتوں سے ملا کیا، سرخرو ہوئے یا روسیاہ۔ فارغ البال ہوئے یا تباہ۔ یہاں تو نتیجے پر نظر ہے۔

چھمّی جان : قبلہ یہ تو بڑا کڑا سوال ہے۔ یکے نقصان مایہ، و دیگرے شماتتِ ہمسایہ، سچ تو یہ ہے کہ عمر بھر اس ناچ ورنگ ہی کے پھندے میں پھنسے رہے۔ دن رات طبلہ، سارنگی، باجا، ڈھول، ستار، بین، یاد الٰہی بالائے طاق۔ تحصیل علم چھپّر پر۔ تہذیب کی دم میں نمدا۔ جامۂ انسانیت سے خارج۔ آدمیت چھو نہیں گئی۔ خاصے پیر بخارا[2] کے چھٹے ہوئے شہدے آن بیٹھے

ع[1] مسلمان ساؤجی متوفی ۱۳۷۶ء ایران کا مشہور فارسی شاعر۔
ع[2] لکھنؤ کے ایک مشہور محلّے کا نام ہے۔ تفصیل فرہنگ میں دیکھیے۔

لیکن اب تو آبی کہ از سر گذشت، چہ یک نیزہ، وچہ یک دست کا نقشہ ہے۔ آپ جو اس بھر دسے ہوں کہ ہمیں تہذیب سکھائیں، تو یہ خیر صلاح ہے۔ کہیں بوڑھے طوطے بھی قرآن پڑھا کرتے ہیں۔

آزاد: اجی حضرت یہ کیا بد پرہیزیاں ہیں۔ ابھی تو آپ ہم پر آوازے کس رہے تھے سیکڑوں ہی پھبتیاں کہہ ڈالیں۔ یا اب اپنے اوپر آپ ہی لاحول پڑھنے لگے۔ صد شکر کہ حضور اپنی بد وضعی، بد اطواری، کے تو مقر ہوئے۔ کڑوے نہ ہوجیے، تو کہوں کہ آپ اس میٹھی وضع پر لعنت بھیجیے، اور چھیل چھلا، ترش ترشا کر وضعدار بن جائیے۔ یہ لوچ، یہ لچک، کچھ نسواں ہی کو خوب زیب دیتی ہے اور یہ دست حنائی، یہ نازک کمری، یہ مسی کی دھڑی، پان کی تحریر، دلھن ہی کے لیے موزوں ہیں۔ ذرا تو اس ڈاڑھی مونچھ کا خیال رکھو۔ نام خدا اب مرد وے بنو۔

چھمّی جان: بس چلیے ہٹیے! یہ بھرّے کسی ایسے ویسے کو دیجیے۔ یہاں بڑے بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ آپ کے جھانسے میں کوئی انیلا آئے، تو آئے، ہم پر چکمانہ چلے گا۔

حبیب لبیب: کیوں قبلہ و کعبہ خدّام حضور کو ہمارے غدّار شہر لکھنؤ میں ڈوم ڈھماڑوں ہی کی صحبت پسند آئی، یا کسی اور کی بھی وضع بھائی۔ لکھنؤ میں تو ہر فن کا باکمال موجود ہے۔ وہ کونسا ہنر ہے جو یہاں مفقود ہے:

کوئی ایسا شہر دنیا میں نہیں   غیرتِ وَیر کہن ہے لکھنؤ
پھلے ہیں اس کے در نظم اس قدر   چشم عالم میں عَدَن ہے لکھنؤ

چھمّی جان: ہم تو ہمیشہ ایسی ہی ٹکڑی میں رہے۔ روز و شب یہی چرچے یہی چہچہے۔ یہی قہقہے۔ گھر پھونک تماشا دیکھا۔ لنگوٹی میں بھاگ تھیلا۔ خوب گلچھرے اڑائے فرنگی محل[1] کی طرف سے بھی نکلے تو کمروں ہی کو تاکتے ہوئے۔ کوئی جلسہ خالی نہ گیا۔ میاں شوری کے پٹے کدر پیا کی ٹھمریاں۔ گھسیٹ خاں کی ٹیپ دار آواز۔ بہادر علی کی گٹکری۔ صادق علی خاں

---

[1] فرنگی محل۔ لکھنؤ کا مشہور محلہ جو علما کا مسکن رہا ہے۔ اس میں ایک فرانسیسی کی کوٹھی تھی جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ عہد عالمگیر میں وہ ضبط کر کے ملا قطب الدین سہالوی جو قتل ہو گئے تھے ان کی اولاد کو رہنے کے لیے دی گئی تھی۔ ملا نظام الدین نے اس میں اپنا مشہور مدرسہ قائم کیا اور نصاب درس نظامیہ ترتیب دیا جو مشہور ہے۔ نور اللغات

کی نے داری۔ پیار خاں کا خیال چھوڑ کر جائیں کہاں۔ اب تو یہی دین و ایمان ہے۔ سارنگی مجرے کی آواز سنیں۔ تو جھپ سے گھس پڑیں۔ مؤذن اذان دیا کرے تو سنتا کون ہے۔ بہت گذر گئی تھوڑی باقی ہے۔

آزاد: اس فرنگی محل کا نام آفتاب جہانتاب کی طرح ساری خدائی میں روشن ہے، اور علمائے فرنگی محل کی مصنفات مسلمات المشہور کالشمس فی نصف النہار ہیں۔ کربلائے معلیٰ، مدینۂ منورۂ مشہد مقدس، بیت اللہ تک کے قدرداں، اور نکتہ داں، ان بزرگانِ خورشید ضمیر بیضا تحریر کے کلام قدرتِ القیام پر احسنت کہتے ہیں۔ مہینوں کی راہ طے کر کے شائقینِ علم و ہنر کسبِ کمال و تحصیلِ علوم کے لیے یہاں آتے، اور چار دانگ ہند کے علما فیض پاتے ہیں۔ یہ وہ فرنگی محل ہے کہ ؎

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

جناب غفران مآب مفتی سعد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ مفتی میر عباس صاحب مدظلہ العالی، حضرت ملا حسن، ید طولےٰ مولوی محمد فضل اللہ صاحب، اور فردوس آرام گاہ مجتہد العصر سید محمد صاحب میرور برد اللہ مضجعہ کو افتخارِ لکھنؤ، بلکہ فخرِ ہندوستان۔ کہنا عین صواب ہے۔ اب شعرا کو دیکھیے۔ شاعر معجز بیان، آتش زبان، خواجہ حیدر علی آتش۔ مرجع سخنورانِ نزدیک و دور شیخ ناسخ مغفور، اپنے فن میں یکتائے روزگار ہو گئے ہیں۔ مرثیہ گوئی تو اہل لکھنؤ کا حصہ ہے۔ خدائے سخن میر انیس صاحب کو خدا بخشے، واللہ فصاحت اور روزمرہ پر تو ابتدائے آفرینش سے کوئی اس درجہ حاوی نہ ہوا ہوگا۔ فس علیٰ ہذا۔ امام کعبۂ بلاغت، دبیرِ عطارد تحریر، میرزا دبیر صاحب طاب ثراہ، اپنے طرزِ دلکش کے موجد تھے۔ جن کے ایک ایک بند سے شانِ قصائد نمودار ہے۔ نسیم اور صبا نے آتش کو بھڑکا دیا: ؏

ایں سخن باید بآب زر نوشت

۲۰؎ خواجہ حیدر علی آتش متوفی ۱۸۴۷ء۔ شیخ امام بخش ناسخ متوفی ۱۸۳۸ء۔ میر ببر علی انیس متوفی ۱۸۷۴ء۔ مرزا سلامت علی دبیر متوفی ۱۸۷۵ء۔ دیا شنکر نسیم متوفی ۱۸۴۵ء، میر وزیر علی۔ صبا شاگرد آتش متوفی ۱۸۸۴ء۔ سید محمد خاں رند متوفی ۱۸۵۸ء۔ رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب۔ متوفی ۱۸۶۹ء۔ نواب مرزا شوق مصنف مثنوی زہر عشق متوفی ۱۸۷۱ء۔ خواجہ وزیر شاگرد ناسخ۔ لقمان۔ ایک مشہور عالم اور حکیم تھے جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔

گویا تو گویا بلبلِ چمنِ معنی پروری تھا۔ رند کا رندانہ کلام، قابلِ صاد ہے۔ خواجہ وزیر کو شہنشاہِ قلمرو خوش بیانی کہنا، عین سداد ہے میرزا رجب علی بیگ سرور مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے! واللہ وہ نثر دلپذیر دبے نظیر لکھی کہ قلم توڑ دیے۔ ایک ایک سطر گنجینۂ معانی، ایک ایک فقرہ کانِ نکتہ دانی ہے۔ حکیم نواب مرزا صاحب موجدِ طرز نوی، تھے۔ منشی ظہیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، واقفِ نکاتِ دری پہلوی تھے۔ الغرض اب بھی ایک ایک طفلِ مکتب مجسطی[3] خوان ہے۔ بلکہ رشکِ لقمان ہے۔ یہاں کے صناعان چابکدست، کے بھی جھنڈے گڑے ہیں۔ کمہار تو ایسے دنیا کے پردے پر نہ ہوں گے۔ مٹی کی مورتیں ایسی بنائیں، کہ مصوروں کی کِرکری ہوگئی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مورت گویا بولا ہی چاہتی ہے۔ جس عجائب گھر میں جائیے گا۔ لکھنؤ کے کمہاروں کی کاریگری ضرور پائیے گا۔ خوشنویسوں نے کاتبِ قدرت کا نوشتہ مٹا دیا۔ نقاط مثل نجوم درخشاں، دائر آفتاب سے زیادہ فروزاں۔ ایک ایک حرف کی پانچ پانچ اشرفیاں لیں۔ عین نابینائے مادرزاد کی آنکھوں میں نور بخشے۔ قاف از قاف، تا قاف کوس لمن الملک بجائے۔ بانکے شیر کا پنجہ توڑ ڈالیں۔ ہاتھی کو ڈپٹیں تو چنگھاڑ کر منزلوں بھاگے۔ ہیمراج رستم سیتانی تھا تو شیدی لندھور، ہفتخوانِ منازل پہلوانی۔ اسفندیار روئیں تن کو چٹکیوں میں لڑا دیں۔ استاد محمد علی خاں پھکیت، چھریرا بدن، لیکن گتکہ ہاتھ میں آنے کی دیر تھی، پرے کے پرے دم میں صاف کر دیے کڑک کر طمانچہ کا تلا ہاتھ لگایا، تو حریف کا منھ پھر گیا، اکھاڑے میں گتکہ لے کر کھڑے ہوئے، تو معلوم ہوا بجلی چمک گئی۔ ایک دفعہ للکار دیا کہ روک ہتھ کٹی دیکھ، سنبھل، خبردار، ہوشیار، یہ آئی وہ آئی، (تڑ) وہ پڑ گئی بارک اللہ کی آواز فلکِ ہفتم پر پہنچنے لگی۔ بلا کی صفائی، غضب کی صفائی، ستم کی صفائی۔ قیامت کی صفائی تھی۔ جو منھ چڑھا منھ کی کھائی، سامنے گیا اور شامت آئی:

سن اس کا گھٹا تھا جو دلبرانہ بڑھتا تھا
منھ کی وہی کھاتا تھا جو منھ اس کے چڑھتا تھا

کامدانی وہ ایجاد کی کہ اڑیسہ اور کوچین تک سے فرمائشیں آنے لگیں۔

---

[3] مجسطی یہ یونان کے مشہور فلسفی عالم بطلیموس کی تصنیف ہے فلسفہ، نجوم جغرافیہ وغیرہ علوم کا ذکر ہے بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے

[1] سرشار نے اپنے دور کے اور اپنے سے پہلے زمانے کے ان فنکاروں کے نام لکھے ہیں جو اپنے فن میں ماہر تھے۔ حاشیہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب کا مختصر تعارف کرایا جائے۔ خاص خاص ماہرینِ فن کے نام اور مختصر حال فرہنگ میں دیکھیے۔ نورانی

حبیب (آزاد سے) واہ قبلہ کیوں نہ ہو۔ چشم بد دور کس لطافت سے آپ نے لکھنؤ کے علمائے اجل فضلائے اکمل، صنّاعانِ کاملِ فن، اور پہلوانانِ روئیں تن کے کمال کا حال بیان کیا۔ حق یوں ہے کہ لکھنؤ کا علم و فضل، لکھنؤ کے محاورات رنگین فقرات، دلنشین، خوش بیانی، طرز غزل خوانی، المشہور فی المشارق وَ المغارب ہے۔ لیکن چھمّی جان کو علوم سے سروکار نہ فنون سے مطلب، یہ تو تال سم، سُر کے پھیر میں پڑے ہیں۔ افسوس!

چھمّی جان: حضرات اس وقت بھیرویں سننے جاتا تھا اور جاگے بھاگ پیارا، بخر دلنظر آیا۔ سننے کا شوق چرّایا تھا۔ لیکن آپ نے پادریوں کی طرح وعظ کہہ کر کایا پلٹ کر دی:

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

اب جو ہمیں راہ پر لاتے ہو تو اتنا مان جاؤ، کہ ذرا قدم بڑھائے ہوئے ہمارے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے، پاٹے نالے تک چلے چلو۔ دیکھوں تو پرستان سے کیوں کر بھاگ آتے ہو۔ انھیں بتوں کا سجدہ نہ کرو تو کچھ جرمانہ دوں اور صاف تو یوں ہے کہ بلا امتحان۔ ع

قائل نہیں ہے بندہ کسی شیخ و شاب کا

اس اندر کے اکھاڑے سے کورے نکل آؤ تو ٹانگ کی راہ نکلجاؤں۔ اور تمھاری ہی بیعت لاؤں۔

آزاد: (گھڑی جیب سے نکال کر) ائیں آٹھ پر اکیس منٹ آئے۔ اس خوش گپی نے آج ستم ڈھایا۔ لکچر سننے میں نہ آیا۔ مفت کی بک بک، جھک جھک۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ۔ واللہ لکچر لائق شنید تھا۔ لعنت بکار شیطان۔

چھمّی جان: اللہ جانتا ہے۔ اس وقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ نہ جانے تڑکے تڑکے کس منحوس کا منھ دیکھا ہے، کہ بھیرویں کے مزے ہاتھ سے گئے۔

حبیب لبیب: یہ ضعیف الاعتقادی، بھلا کسی کے منھ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ بھی نرے چونچ ہی رہے۔ اتنی دیر تک سمجھایا، سر مغزن کی، مگر واہ رے کتّے کی دُم، بارہ برس بعد بھی ٹیڑھی ہی نکلی۔ جو کہیں چھ مہینے ہماری جوتیاں سیدھی کرو تو اونٹ سے آدمی بن جاؤ۔

چھمّی جان: واہ! بس چلیے چلیے۔ یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے، ایسے ہی بڑے صوفی صافی ہو، تو ذرا ساتھ چلے چلو، بغلیں کیوں جھانکتے ہو۔ جب جانیں کہ تلوہ کورے نکل آؤ۔

آزاد: (حبیب لبیب سے) یا حضرت آیئے دل کڑا کر کے چلیے تو چلیں۔ دام زلف میں مرغ دل

نہ پھنسے گا۔ مرغِ زیرک کہیں صیاد کے پھندے میں آیا کرتے ہیں۔ کیا مجال۔ خدا نے چاہا تو وہاں بھی دامن بے لوث رہے۔ یہاں تو ایسی صحبتوں سے طبیعت ہی نفور ہے۔

حبیب لبیب: بسم اللہ چلیے! دیکھیں تو کوئی بت ہے۔ پیر تیغ نگہ کے زور سے کیوں کر ہمیں مجبور کرے کہ بیعت لائیں۔ مہذب اور علم و دست سے رند عالم سوز بن جائیں۔ برسوں کے خیالات ایک ادائے دلبر باکیوں کر مٹادے گی۔ ہم اور کسی کے تھرکتے پر فدا ہو جائیں، توبہ! یہ خیال ہم رنگ محال ہے، یا کسی دلدار سے دل اٹکائیں۔ اَستغفِرُ اللہ! پہلے کوئی ایسا محبوب تو ہمیں دکھائیے۔ جسے ہم پیار کریں۔ ہمارا معشوق مردم دانا، یا صنم لطیف و رعنا۔ چوٹی اور موباف پر کوئی اور سر دھنتے ہیں۔ اگر تمنا ہے تو یہ ہے کہ میں ہوں، اور کنج تنہائی۔ کتاب سامنے اور بغل میں خرقۂ پارسائی۔ یہاں شوقِ شرابِ شیراز، نہ عشقِ بتانِ طنّاز۔

الغرض حبیب لبیب اور میاں آزاد، دونوں چھمّی جان کے ساتھ ساتھ پاٹے نالے پر کسی حافظ جی کے بیت اللّطف میں کھٹ سے جا پہنچے۔ کوئی چالیس پچاس قدم کے فاصلے سے لہرا لہرا کر گانے کی آواز آنے لگی۔ چھمّی جان جھوم جھوم کر عجب ناز و انداز سے قدم اٹھاتے تھے۔ بارے حافظ جی کے مکانِ عالیشان میں داخل ہوئے۔

حافظ جی کا مکان مینو سواد، اور شکّر لبانِ حُور نژاد

ایں چہ بزم ست کہ لب برلب جام ست اینجا
بادہ خورشید و قدح ماہِ تمام ست اینجا

حافظ جی کا مکان: خوش ہوا، روکش بہشت شداد تھا۔ اور نور بخشِ چشم نابینا ہے اور ہر در و دیوار پر نور برستا تھا۔ صحن و بام سے سرور موفور۔ اب بزم طرب کا حال نہ پوچھیے۔ جدھر دیکھو خوش وقتی جدھر دیکھو عیش، ایک ایک کم سن کا جوڑا معرکۂ عشق کا مقدمۃ الجیش ادھر سفید پوشوں کی قطار اُدھر سبزانِ سبز بخت۔ جوبن کی بہار ادھر نظارہ بازی اُدھر شوخی و طنّازی ادھر رندانِ عالم شور، اُدھر نور عالم افروز، ادھر شوقِ وصال، اُدھر غرور حسن و جمال، ادھر آنکھیں اشکبار، اُدھر بناوٹ سجاوٹ نکھار، ادھر چشمِ خونچکان۔ ادھر لبِ لعل شکر خا پر سرخی پان۔ ادھر عشق جنون خیز۔ اُدھر زلف عنبر بیز، ادھر صدائے بریز بریز ادھر خندہ شکر آمیز، ادھر دل درا باغ۔ ادھر ساقِ بلوریں جگر خون کن، گوہر شب چراغ ادھر جنوں کی گرمجوشی، ادھر چشم خوں بر داز کو تعلیم ناز فروشی،

ادھر شمع رویوں کی لو دل سے لگی تھی۔ ادھر چہل پہل، دل لگی تھی ادھر عشاقِ خستہ جاں کا نیاز، ادھر حسنِ پر آشوب کا استغنا و نازک، تن چار بتانِ شکر لب مل کر مبارک باد گاتی ہیں، گم کردگانِ بادیۂ عشق کو راہ پر لاتی ہیں:

شکر لب مطربانِ نغمہ پرداز ... برنگ خوش کردہ آواز
مغنیٔ چنگ عشرت ساز کردہ ... نوائے خرمی آغاز کردہ
رباب از تار غم جاں را امان دہ ... بر آوردہ کمانچہ نغمۂ زہ

یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں، اسے دیکھ کر گردن ہلاتا ہے، بیاز ندہ حاضرین جلسہ کو وجد میں لاتا ہے۔ پازیب کی چھما چھم دل کو پامال کرتی ہے کوئی انا برق کہتی ہوئی چمک جاتی ہے کوئی اونچے سروں میں تان لگاتی ہے۔ کوئی سینۂ حنائی پر دستِ حنائی دیکھ کر گہری گہری ندیا بتاتی ہے، کوئی چشم مخمور کے اشارے سے رتیاں پہلے کی چھوٹ کھاتی ہے۔ دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے، چھمی جان نے ایک ناظورۂ نظر فریب سے فرمایش کی کہ میدانِ خوش بیانی کے یکہ تاز لسان الغیب حافظ شیراز کی اس غزل کو گائیں:

برزمینی کہ نشانِ کفِ پائے تو بُود
سالہا سجدۂ گہ صاحب نظراں خواہد بود

سوہنی کی دھن میں اس غزل نے وہ لطف دکھایا اور ایسا رنگ جمایا، کہ ہمارے حبیب لبیب تک اہو، ہو، ہو، کہہ اٹھتے تھے، اس کے بعد ایک شاہدِ زاہد فریب نے ایک حقّانی غزل گائی۔ جس کا مقطع یہ ہے:

چو خود کروند سرِ خویشتن فاش
عراقی راچرا بدنام کروند

اس مقطع پر جلسہ میں کہرام مچ گیا۔ اول تو غزل حقّانی، دوسرے اس رنگین ادا کا طرزِ غزل خوانی، تیسرے اس کی نازک آوازی، اور شیریں بیانی۔ حاضرین جلسہ اس درجہ سرخوش بادۂ

ع ۱ سرشار کے زمانے میں فارسی کا مذاق عام تھا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں بھی فارسی اشعار زیادہ پڑھے جاتے تھے۔ اور سب اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بوڑھے اور جوانوں کے مذاق کا تجزیہ بھی ان اشعار سے بخوبی کیا جاسکتا تھا۔ سرشار نے عام ذوق کے پیش نظر فارسی اشعار زیادہ سے زیادہ پیش کیے ہیں۔

وحدانیت ہوئے کہ جلسہ رقص و سرود پر عُرس کا دھوکا ہوتا تھا۔ حق حق کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی۔ اور اسی حالتِ وجد میں ہر فرد بشر کی زبان پر یہ شعر تھا:

چو خود کردند سرِ خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

اب سب کو شک کی جگہ یقین ہو گیا، کہ اس کے بعد کسی خوش گلو کا رنگ نہ جمے گا۔ ہر طرف سے حقانی غزلوں کی فرمائش ہے، شوق کی افزائش ہے۔ دُھرپد کا خیال، نہ ٹپے کی فکر۔ بھیرویں کی دُھن نہ چلتے گانے کا ذکر۔ فارسی ہی کی غزلیں دلکش اور فاخرہ گائی جاتی ہیں۔ معرفت میں ڈوبی ہوئیں

قلق از سوزشِ پروانہ داری — زسوزِ عاشقاں پروانہ داری
دلم قربان ایں مژگان و ابرو — عجب تیر و کماں ترکانہ داری

اب دل لگی دیکھیے، کہ پیر فرتوت، اور نوجوانانِ نوعمر، اور کمسن لڑکے، سب کے سب بے دھڑک اُس مشتری خصائل، زہرہ شمائل، کو گھور رہے ہیں۔ کوئی اس جادو نگاہ سے آنکھیں لڑاتا ہے۔ کوئی اس شوخ و شنگ کے طرۂ شبرنگ، دلیلۃ المعراج گیسو کی سیر کر رہا ہے۔ کوئی سر دھنتا ہے۔ کوئی آہ سرد کھینچتا ہے۔ کسی کے دل میں تیرِ عشق کی خلش، کسی کو بیٹھے بٹھائے مفت کی ذوادوش، دو چار بیباک، مدعیانِ تہذیب نے طوائفوں کو بلا کر، بڑے شوق سے قریب بٹھایا۔ نوک جھونک، ہنسی۔ مذاق، چہل دل لگی، دھول دھپا، ہونے لگا۔ حافظ جی بھی داروغہ اربابِ نشاط بنے ہوئے، مزے سے چونکھی لڑ رہے ہیں۔ اِردگرد گل رُخانِ سیم تن کا غنچہ ہے۔ نوجوان بھی تعلیم نظری سے استفادہ حاصل کرتے ہیں، اب مہ جبینوں اور بڈھوں اور نوجوانوں کا مکالمہ سنیے۔

پیر فرتوت : آجکل کے لڑکوں کو بھی ہوا لگی ہے۔

نوعمر : اجی قبلہ اب تو ہوا ہی ایسی چلی ہے، کہ جوان تو جوان، بڈھوں تک کو برہبس لگا ہے، سو برس کا سن، تابوت پر لدنے کے دن، مگر جوانی ہی کا دم بھرتے ہیں:

پیری کہ دم عشق زند بس غنیمت ست
از شاخ کہنہ میوہ نورس غنیمت ست

پیر فرتوت : میاں صاحبزادے ہم تو دنیا بھر کے نیارے ہیں۔ ہمیں کوئی چنگ پر کیا چڑھائے گی۔ اور رنگ پر کیا لائے گی۔ مگر تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، ایسا نہ ہو ان کے پھیر

میں آجاؤ۔ پھر دین و دنیا دونوں کو رو بیٹھو۔

نوجوان: واہ قبلہ آپ کے فیضانِ صحبت سے ہم بھی پختہ مغز ہو گئے ہیں۔ ایسے کچے نہیں، کہ ہم پر کسی کا داؤ پیچ چلے۔

پیر فرتوت: توڑ پھوڑ، کچے پکے کے بھروسے نہ رہیے گا۔ ان بتوں کا بڑے بڑے زہاد نے سجدہ کیا ہے، تم کس کھیت کی مولی ہو۔

نوجوان:

ان بتوں کو ہم فقیروں سے بھلا کیا کام ہے
یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

مہ جبین: ان بڑے میاں سے کوئی اتنا تو پوچھو، کہ بال بال گل کے برف سا سفید ہو گیا مگر اب تک سیاہ کاری نہ چھوڑی۔ یہ سمجھاتے کس منہ سے ہیں۔ ان کی سنتا کون ہے۔ ذرا شیخ جی بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنایا کیجیے۔ شاہ چھڑے والی گلی، روز بیس بیس چکر ہوتے ہیں۔ اے تم ٹھکتے بھی نہیں۔

حافظ جی: شیخ جی جہاں بیٹھتے ہیں، جھگڑا ضرور خریدتے ہیں۔ غم نداری کیے آپ ہیں کون، آئے وہاں سے بڑے ناصح بن کے۔

پیر فرتوت:

نہ قاضیم نہ مشائخ نہ محتسب نہ فقیہ
مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

اچھا بی صاحب اپنا کلام سنائیے، مگر شرط یہ ہے کہ جب ہم تعریف کریں تو سلام کیجیے۔

مہ جبین: آپ ہیں تو اسی لائق، کہ دور ہی سے جھک کر سلام کر لے اور سلام کے تو آپ پیشک مستحق ہیں، مگر بھولیں تو ٹوکیے گا ضرور۔

نوعمر: قبلہ و کعبہ! گستاخی معاف، آپ پر اس وقت اچھا فقرہ چست ہوا، انھوں نے آپ کو اپنا استاد جی بنایا۔ مگر واللہ آپ سمجھے خاک نہیں۔

مہ جبین: یہ بال انھوں نے سفید کیے ہیں، یا شاید نزلہ نے ان کو جوانی ہی میں قبلہ پیری، و صد عیب کر دیا ہو، بے تکی اڑانا خوب جانتے ہیں۔ جواب نہیں سوجھتا۔ منہ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔

ادھر تو یہ گفتگو ہوتی تھی ادھر دوسری ٹکڑی میں فحش اور پھکڑ کا چھرّا چلتا تھا۔ تیسرے غول بیابانی میں ڈھول دھپا ہوتا تھا۔ کم سن اطفال اور جوانانِ مطلق العنان اور رنگین خیال

پیران نودسال، چُہل کی تعلیم پاتے تھے۔ اتنے میں دوپہر کی توپ دغی۔ دھننانا۔ جلسہ برخاست ناچ رنگ بند۔ چہل پہل موقوف۔ طبلیوں نے بوریا بندھنا اُٹھایا۔ حُضّارِ جلسہ نے بقچہ سنبھالا۔ مہوشان زہرہ جبیں، و نازنین، بصد ناز و کرشمہ ڈولیوں میں جلوہ گر ہوئیں، جلسے سناٹا ہو گیا:

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ خلد نگاہ ہے تو وہ فردوس گوش ہے
یا دوپہر کو جا کے جو دیکھا تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

مہ پارۂ عابد فریب کی ستم کوشی اور جنوں کی گرم جوشی

خیر مقدم اے جنونِ نیک فال — اے توام شیرِ نیستانِ خیال
اے تو برقِ خرمنِ بیم و اُمید — قفلِ وسواس ہو سہار اگلید
اے بہارِ عاشقی رار نگ و بو — از تو ہر فرہاد و مجنوں کام جُو
شہرِ دانش تنگ بر جولانِ تو — پہن دشت بیخودی میدانِ تو

جلسے کا قُل، چراغِ رقص و سرود کا گُل، ہونا تھا کہ ایک نیا گُل کھلا۔ میاں آزاد نے جامۂ شیخوخیت تہہ کر رکھا اور عشقِ خانہ خراب کے ہاتھ بک گئے۔ اب ہر دم آہ و زاری ہے۔ بیتابی و بے قراری ہے۔ دیدۂ مسطروح، سینۂ مجروح۔ آہِ سرد دل پُر درد، عقل دنگ، سینہ پر سنگ، پائے خِرد لنگ، عشقِ مہوشانِ شوخ و شنگ، جنون کی امنگ، ایک دفعہ ہی یہ اشعار حسرت بار زبان پر لائے:

شاہنشہ بے نبرد عشق ست — سلطانِ خرابہ گرد عشق ست
پر کوہ غم کند عماری — بر مرکبِ خوں کند سواری

اب تو میاں آزاد چکّر میں آئے، مگر چھمّی جان تجربہ کار اور مزاج دانِ عشاق زار تھے چونوں

سے تاڑ گئے، کہ کسی ترکِ زرّیں کمر کے تیر نگاہ نے گھائل کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ بولے نیا رنگ لائی گلہری، کہیے لکچر سننے چلیے گا:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا (غالب)

آزاد : اب تو یہی دھن ہے کہ سینے کو چمن بنائیں۔ لالہ رُو کے داغِ حسرت میں گل کھائیں ہائے وہ خالِ عنبریں، وہ گیسوئے مشکیں، وہ لعلِ نگاریں، وہ چشم سرگیں، وہ سنگار، وہ نکھار، ہے ہے! میں تو جیتے جی مر مٹا۔ یارو کوئی تدبیر ایسی بتاؤ، کہ وصال نصیب ہو۔ باغ ہو، جام ہو، مَیں ہوں، اور وہ حبیب ہو۔

چھمّی جان : ابھی نام خدا عنفوانِ شباب ہے۔ پختہ مغز جنوں نہیں۔ میدانِ عشق کی پہلی ہی منزل ہے۔ عشق کا وار کوئی سرِ میدان روک تو لے، بڑے جیوٹ کے آدمیوں کا جی چھوٹ جاتا ہے۔ کلیجہ مُنھ کو آتا ہے۔ عشق کے صدمے اُٹھانے کو جگر بھی چاہیے۔

آزاد ؎ دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

حبیب لبیب : خدا ہر بھلے مانس کو بُری صحبت سے بچائے، یہ تمھیں سوجھی کیا، کہ اس جلسے میں آئے:

باید منشیں دبّاش بیگانۂ او	در دام افتی اگر خوری دانۂ او
تیر از سرِ راستی کماں را کج دید	جگر کہ چگونہ جست از خانۂ او

مگر یہ عشق سب ڈھکوسلا ہے، ڈھکوسلا ہے۔ بندہ تو قائل نہیں، یہاں تو دل میں ٹھن گئی کہ انھیں سودا ہو گیا۔ کسی طبیبِ حاذق کو بلا لاؤ۔ ذرا ان کی نبض تو دیکھے۔

آزاد : ؎ ہم کو سودا ابھی ہوا، تو میرزا یا نہ ہوا، سودا ہو یا جنونِ سحر ہو، یا فسون، اب تو جان پر بن گئی ہے۔ کلیجے پر چوٹ کھائی ہے۔ طبیب بیچارہ نبض کیا دیکھے گا۔

ہماری نبض ہمارے مزاج داں جانیں

اور آپ طبیب کو بلا کر دل کا ارمان نکال لیں لیکن:

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

چھمّی جان : اس فن کا قانون شناس تو بوعلی سینا بھی نہ تھا۔ طبیب تو کیا کھا کر مریضِ عشق کو چنگا کرے گا۔ ہاں مجنوں کی تربت پر پھولوں کی چادر چڑھاؤ تو شاید غنچۂ مقصود شگفتہ ہو جائے۔ ورنہ مسیحا کی مسیحائی بھی کارگر نہ ہوگی:

آگاہ نہ تپِ دروں را   نشتر یہ زنی رگِ جنوں را
معشوقۂ نازنیں طلب کن   عناب بش بہ کار تب کن

اب تو بے کشودِ کار، اطمینانِ دل معلوم۔ سہل چھٹکارا یہ ہے کہ عاشق و معشوق، دونوں کا وصل ہو۔ ورنہ حسن و عشق کا جھگڑا پاک ہو چکا۔

آزاد : تیر ایسا کاری لگا کہ بلبلا اٹھا۔ اب ہم ہیں، اور گردابِ بلا۔ دل ہے، اور موجِ خونِ خیز دیکھیں بحرِ عشق کے تھپیڑے کدھر بہالے جاتے ہیں، اور دل کے داغ کیا سبز باغ دکھاتے ہیں:

دریا و کوہ در رہ و من خستہ و ضعیف
اے حضرِ پے خجستہ مدد دہ بہ ہمم

مگر بیڑا پار ہوتا نظر نہیں آتا۔ چاہِ زنخداں میں دل ڈانواں ڈول ہے۔

اب شہر بھر میں دھوم مچ گئی۔ کہ ایک نئے بگڑے۔ جہاں جاؤ یہی چرچا میاں آزاد کے لنگوٹیے یاروں نے لاکھ فکر کی کہ ان کو راہ راست پر لائیں، مگر عشقِ صادق سے ایک کی پیش نہ گئی۔ قصرِ مراد تک کمندِ تدبیر نہ پہنچی۔ میاں آزاد کی حالت اس درجہ ردی ہوگئی کہ دن کو آہ وزاری۔ شب کو اختر شماری۔ کھانا پینا چھوڑا۔ عیش و آرام سے منھ موڑا۔ رنج و محن سے ناتا جوڑا۔ شیشۂ دل پر سنگِ فراق کی ایسی ٹھیس لگی، کہ چکنا چور ہو گیا۔ حبیب لبیب نے چھمّی جان کو اپنے طور پر سمجھایا، کہ واسطے خدا کے، ان کے سامنے ایسی باتیں نہ کرو، کہ سمندِ جنون پر تازیانے کا کام کرے۔ عشق کی مذمت، اور جنون کی ہجو کرنی چاہیے، نہ کہ تعریف۔ چھمّی جان کو اتنا اشارہ کافی تھا۔

آزاد : وہ لبوں کی سرخی، دانتوں پر پان کی تحریر، وہ رخسارِ تاباں، وہ مستانہ چال، نہ بھولوں گا۔ نہ بھولوں گا۔ اس گلابی دوپٹے نے گلِ رخسار کے جوبن کو اور بھی دوبالا کر دیا۔

چھمّی جان : ہم تو لکھنؤ کے رنگریزوں کی خیر مناتے ہیں۔ واللہ ٹکے کے شباب میں۔ دوپٹہ

ع ۱؎ مشہور فلسفی، عالم اور طبیب، حکیم بوعلی سینا متوفی ۴۲۸ھ ہجری

ایسا رنگ دیں۔ کہ انسان گھنٹوں اُسی کو گھورا کرے۔ کیسی ہی بد قطع کریہہ منظر یوں نہ ہو، دھانی دلائی اوڑھی اور دُلھن معلوم ہونے لگی لیکن :

بس قامتِ خوش کہ زیرِ چادر باشد
چوں باز کنی مادرِ مادر باشد

حبیب لبیب : یہ جن پر ہمارے رنگیلے جوان کا دل آیا ہے۔ کچھ ایسی آفت کا پرکالہ نہیں ایسی تو گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ ٹکے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مگر ان کا عشق بھی عجب طرح کا ہے۔ سچ ہے، جیسی روح ویسے فرشتے۔ ہمیں تو ہنسی آتی ہے کہ میاں کا دل بھی آیا تو کس پر، فریفتہ ہوئے تو اس پر شکل چڑیلوں کی، ناز پریوں کا۔

چھمّی جان : قسم حسینؓ[1] کی! ایسی ایسی زہرہ جبین، رشکِ لیلیٰ غیرتِ شیریں، نظر سے گذری ہیں، کہ صلّ وجلّ مگر دل ایک کو نہ دیا۔

آخرکار احباب کی یہ صلاح ہوئی کہ کسی باغ نزہت افزا، اور چمنستان پر فضا میں میاں آزاد رہیں شاید وحشتِ دل دور اور مرضِ جنون کافور ہو جائے۔

سبزانِ چمن کا جوبن اور گرمئِ ہنگامہ عشقِ عقل دشمن :

ہنوز ایں اول عشق ست جاناں گریہ کمتر کن
کہ ایں طوفانِ رسوائی ست عالمگیر خواہد شد

میاں آزاد کی وحشت دل دور اور شیشۂ جنون کے چکنا چور، کرنے کے لیے اب جو ایک نزہت افزا، اور پُر فضا، باغ آراستہ ہوا، احباب صافی مزاج، و بذلہ سنج، مرنجان مرنج نے بھی ان کی دل جوئی کے لیے وہاں ہی بستر جمایا۔ صلاح ہوئی کہ ہر روز دنیائے دوں، کی بے ثباتی اور عشقِ خانہ خراب کے مَفَاسِدِ ذاتی ہی کی گفتگو ہو تاکہ آزاد کا دل ان باتوں سے پھر جائے اور پھر کسی شمع رو کے رخِ آتشیں سے لو نہ لگائے۔ شاید اس پند و موعظت سے اس ڈھرے کو چھوڑ کر راہِ راست پر آوے، اور گمراہی سے نجات کلّی پائے۔ سوچے کہ کبھی کبھی اور تذکرے بھی ہوا کریں، ورنہ اگر حسن و عشق ہی کی مذمت کی تو مبادا کھٹک جائے

---

[1] حضرت امام حسینؓ شہید کربلا۔

احباب خدا ترس، دو دقیقہ رس، خورشید ضمیر، وصبح نفس، نے طرح طرح کی دلچسپ روایتیں کہنا شروع کیں۔[۲]

اوج : ہندوستان جنت نشان کے ایک شہر نزہت آگین، دلنوآئین، میں ایک خسرو کج کلاہ وگیتی پناہ، نے اپنی بیگم سے کہ چندے آفتاب، وچندے ماہتاب، تھی سوتے وقت کہا کہ ہمیں صبح صادق سے پہلے جگا دینا۔ اتفاق سے اس شب کو مرغ نے آدھی ہی رات سے ککڑوں کوں کی بانگ لگائی۔ وہ سیہ چشم، جادو نگاہ، خواب ناز سے بیدار ہو گئی، اور حسب وعدہ بادشاہ جم جاہ کو جگا دیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ صبح صادق کیا معنی، ابھی سحر کاذب بھی نہیں۔ شیطان نے پٹی پڑھا دی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ نہایت ہی بد دماغ ہوئے۔ غصّے کے تھرمامیٹر کا پارہ ایک سو پندرہ درجے پر پہنچا۔ زبان حال وقال سے یہی صدا نکلتی تھی:

تو شبینہ می نمائی کہ بہ بر کہ بودی امشب۔
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار وارد

جھلّا کر شمشیر خوش غلاف ہاتھ میں لیے باہر نکل آئے، چہرہ مارے غصّے کے سُرخ، جیسے بیر بہوٹی۔ بآواز بلند سر بریدن لازم ست کہتے جاتے تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ ایک شاعر موزوں طبع نے بھانپ لیا، کہ کیا اسرار ہے۔ حاضر جوابی کے صدقے، فی البدیہہ اور برجستہ یہ شعر زبان پر لایا:

سر بریدن لازم ست ایں مرغ بے ہنگام را
آن پری پیکر چہ داند وقتِ صبح وشام را

واللہ آگے کے شعرائے رنگین خیال، وشیریں مقال، غیب کی باتیں بھی جانتے تھے۔

آزاد : لاحول ولا بھئی کتنی بھونڈی بات کہی۔ شعر تو غضب کا ہے مگر۔ ؎ عالم الغیب کیست غیر از حق۔ شعرا عروض، بحر صنائع وبدائع جائیں غیب دانی سے انھیں کیا سروکار۔ ایشیاء کی ضعیف الاعتقادی پر خدا کی سنوار۔ بندۂ درگاہ آج تک غیب دانی کے قائل ہی نہیں ہوئے۔ بارے شکر ہے، کہ آپ نے برسوں کے بعد آدمیت کی بات تو کی۔ پڑھے جن ہو، تمھارا شیشے میں اتار نا کارے وارد۔ اپنی حرکات پر لعنت نہیں بھیجتے کہ گرداب عشق میں غوطے

---

[۲] اوج۔ یہ چوتھا کردار ہے جو سرشار پیش کر رہے ہیں۔

کھار ہے ہو - ایشیا کے خیالات پر شیر ہو - اپنی خبری نہیں -
میاں آزاد تھوڑی دیر کے لیے آدمی بن گئے تھے، مگر عشق کا حرف درمیان میں آیا اور ہوش اڑ گئے - جنون سر پر چڑھ بیٹھا - اس سرد - جوئبارِ رعنائی اور گلبنِ گلزارِ دلربائی کا بوٹا سا قد آنکھوں میں پھر گیا - مطرب کی ناخن بازی، اور اس خوش گلو کی نازک آوازی یاد آ گئی - اب غم ہجراں یار ہے، یا آہ آتشبار - سینہ بریاں اور دیدۂ گریاں، حیران و پریشان - سراسیمہ و سرگرداں، حسبِ حال اشعارِ حسرت بار، نوک زبان ہیں:

درونِ سینۂ من زخمِ بے نشان زدہ
بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

در قفس بسیار ناشادیم ما　　از فراموشان صیادیم ما

چمن کا رنگ تجھ بن اپنی آنکھوں میں مبدل ہے
چراغِ لالہ چشمِ غول ہے، گلزارِ جنگل ہے
بہار آئی ہے ہنگامِ جنوں ہے کپڑے پھٹتے ہیں
مسلسل ہوں میں دیوانہ درِ زنداں مقفّل ہے
ہاتھ مشتاقِ گریباں ہے جنوں کا جوش ہے
پیرہن تن پر مرے گرمی کا بالا پوش ہے

یاروں نے دیکھا کہ پھر سیلاب جنوں کا جوش ہے - پھر رخصتِ عقل ہوش ہے، ناچار بلیغ[1] نے ایک اور ذکر چھیڑا -
بلیغ: حضرت اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ ؎ - معشوق کیجیے تو پری زاد کیجیے، ہم ظاہری حسن و جمال کے شیفتہ، نہ خط و خال کے فریفتہ - روئے خوش کے ساتھ خوئے خوش بھی ہو تو ہم ہزار جان سے اس گل کے بلبل ہو جائیں ورنہ:

نشاید ہوس باختن با گلی　　کہ ہر بامدادش بود بلبلی

ایسا عشق باعث خواری ہے -
نقل ہے کہ ایک شیخ ملکوتی صفات اشرف المخلوقات کی طبیعت لہرائی کہ سیرِ دریا کریں -

---

[1] بلیغ - یہ پانچویں کردار کا تعارف ہے -

خراماں خراماں چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک نوعروسِ پری پیکر، برہنہ سر لبِ بام کھڑی تھی، یہ شیخ نے کہا اے سرمایۂ ناز! سر کو ڈھک لے۔ اس جاہ و جمال نے جواب دیا، کہ آنکھیں بند کر لے۔ یہ شیخ نے کہا میں عاشق ہوں، کہیں عاشقِ زار آنکھیں بند کرتے ہیں۔ اس غیرتِ ماہ نے عین مستی میں کہا میں مستانہ ہوں۔ مجھے سر ڈھکنے سے کیا کام۔ اور معاً یہ شعر بہ لحن باریدی پڑھ

ایں موی نیست بر سرِ من بلکہ خارِ عشق　　　در پائے من خلیدہ واز سر بر آمدہ

شیخ مبارک نہاد، سنتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، عاشقی خالہ جی کا گھر نہیں ہے عشق بازی، سر بازی ہے۔ مگر کوئی معشوق تو ہو، مرد دانا کا معشوق مسلک نیک ہے۔

شمیم[1] : واللہ لبِ جوئبار، یہ گلزار پر بہار، ایسا لطف دکھاتا ہے کہ غنچۂ دل نسیم طرب کے اہتزاز سے کھلا جاتا ہے۔

لکھنؤ کی ایک شادی

ایامِ شاہی میں ایک مرتبہ بڑی کیفیت ہوئی تھی۔ اعیانِ دولت میں سے ایک رکنِ رکین سلطنت کی دخترِ فرخندہ اختر کی شادی اس دھوم دھام سے ہوئی، کہ پیرِ فلک نے باوصفِ پیرانہ سالی، اس دھوم کی شادی دیکھی نہ سنی۔ عین گومتی[2] کے کنارے جشنِ جمشیدی، بڑے کروفر سے منعقد ہوا۔ وہ دھوم، وہ ہجوم کہ صَلِّ وَجَلَّ۔ نورِ چراغاں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ رات رشکِ لیلۃُ القدر ہے۔ غیرتِ لیلۃ البدر ہے۔ جدھر جاؤ نورِ مَوفور برس رہا ہے۔ لبِ دریا اس پار خیموں کی قطار۔ ایں روئے دریا، نوعروسانِ چمن کا نکھار۔ بجروں پہ شاہدانِ جادو جمال، و مشتری خصال، مصروفِ رقص و سرود ہیں۔ مُطرب کا ہاتھ ساز پر۔ رنگین مزاجوں کے کان آواز پر۔ کہیں زمزمہ خاں فزا، کہیں نغمۂ طرب انتما۔ پھولوں کی بھینی بھینی مہک، سبزے کی لہک، مرغانِ خوش الحان، کی نوا سنجی۔ گل و بلبل کی شکر رنجی۔ میلے کی سی رونق تازہ، اور سرورِ بے اندازہ۔ دریا خوب چڑھا ہوا ہے۔ مینڈھا اچھل رہا ہے۔ حباب آنکھیں بدل رہے ہیں، اور رنگین بجرے چھوٹے ہوئے ہیں۔ لاکھوں تماشائی۔ غرض کہ بڑے دھوم

---

1. شمیم کے نام سے یہ چھٹا کردار ہے۔
2. گومتی، صوبہ اتر پردیش کا مشہور دریا، جو شہر لکھنؤ کے اندر سے گزرتا ہے۔

دھڑکتے اور ٹھسے سے شادی ہوئی۔ کئی دن برابر دھما چوکڑی رہی۔ مگر آنکھ کھلی تو سب خواب اور نقش بر آب تھا۔ رہے نام اللہ کا۔

آزاد: وہ نرگس غمزہ زن، وہ زلفِ پر شکن۔ وہ شوخ پرفن، وہ گل سا بدن:

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ہائے! ع۔ جسے دلدار سمجھا تھا وہ دلبر نکلا، پند و نصیحت مرہم زخم جگر ہوگیا:

منع کرتا ہے مجھے یار کے گھر جانے کو
ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

انوار[۳۷]: اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا۔ سناؤں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جائیں۔ لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنے لگو۔

ایک لطیفہ

نقل ہے کہ ایک صاحب نے اپنے غلام کو، کہ صاحب طبع لطیف، و بذلہ سنج تھا۔ حکم دیا جا کر بازار میں تاک لگائے۔ اگر انگور ہاتھ آئے تو فوراً خرید لائے۔ غلام نے ایک دلبر میوہ فروش ستم گار و ستم کوش، کی دکان سے کئی خوشے خریدے، اور مٹر گشت کرتے ہوئے خراماں خراماں آقا کے پاس لے گیا۔ وہ نہایت ہی بد دماغ ہوئے۔ فرمایا کہ ذرا سا کام اور یہ تاخیر اتنی دیر میں تو میں لندن ہو آتا۔ ایسا کاہل دیکھا نہ سنا۔ خبردار آج سے اگر ایک کام کو بھیجوں، تو ہاتھوں ہاتھ چار کام انجام دے لانا۔ غلام نے دست بستہ عرض کیا کہ پیر و مرشد! اس مرتبہ معاف فرمائیں انشاء اللہ آئندہ ارشاد واجب الانقیاد کی لفظ بہ لفظ تعمیل ہوگی۔ دوسرے دن خواجہ کسی زبان دراز، اور گستاخ، کنیزک عشوہ پرواز پر ایسے گرمائے کہ تپ چڑھ آئی۔ غلام کو حکم دیا کہ کسی طبیب لبیب کو بلاؤ۔ وہ فوراً گیا اور طبیب کے علاوہ اور چند آدمیوں کو بھی ساتھ لایا۔ خواجہ نے پوچھا کہ یہ جماعت کیسی ہے۔ ہم نے حکم دیا تھا کہ طبیب کو بلاؤ۔ تم اتنے آدمیوں کو کیوں ساتھ لے آئے۔ غلام نے بصد ادب عرض کی کہ خداوندا! حضور تو بھول بھول جاتے ہیں۔ ابھی تو کل ہی تاکیداً کید کی تھی کہ اگر ایک کام کا ارشاد کروں، تو کئی کام بعجلت

---

[۳۷] انوار فسانۂ آزاد کا ساتواں کردار ہے۔

تمام سرانجام دے لانا۔ اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبْ، لیجیے آج دم کے دم میں میں نے اتنے کام کیے۔ قدر دانی شرط ہے۔ حکیم جی کو حسبُ الحکم حضور بلا لایا کہ تشخیصِ مرض کر کے معالجہ کریں۔ اور اُدھر ہی سے لپکا ہوا گیا، مطربِ خوش الحان کو ساتھ لایا کہ اگر خداوند عروسِ صحت سے ہم آغوش ہوں تو قوال کی خوش آوازی۔ اور ناخن بازی، سے بزم طرب آراستہ ہو۔ غسّال کو بھی لیتا آیا کہ زندگی کا کیا بھروسہ، اگر پیک اَجَل حضور کو خلدِ علّیین کی سیر دکھائے تو غسّال جھٹ پٹ غسل دے دے۔ اُدھر سے ایک شاعر جادو بیان اور طلیق اللسان کو ہمراہ لیا۔ کہ مرثیہ موزوں کرے۔ اب باقی کون رہا۔ گورکن۔ وہ بھی بات کی بات میں آن موجود ہوگا۔ مطمئن رہیے۔ اب انصاف میرے آقائے نامدار کے ہاتھ ہے۔ غلام نے انعام ہی کا کام کیا ہے۔ آئندہ اختیار بدستِ مختار۔

لطیفہ

شرف[1] : حضرت ایک لطیفہ بندے کو بھی یاد آگیا، ایک تذکرے میں نظر سے گذرا کہ ایک رندِ مے آشام نے وقتِ نزع اپنے احباب کو وصیت کی، کہ یارو ہم پر اتنا احسان کرو کہیں سے باوا آدم کے وقت کا پُرانا دھرانا سڑا گلا کفن لا رکھو۔ جب ہم دم توڑیں تو اسی کفن کہنہ میں لپیٹ کر ہمیں گور میں دفنا دینا۔ لوگ متحیّر ہوئے کہ یہ عجب انوکھی بات ہے پوچھا اس سے فائدہ۔ حضرت نے آہ سرد بھر کر بصد حزن و ملال، زیر لب کہا کہ بھئی ہم تمام عمر پرلے سرے کے بدمعاش، اور آوارہ و عیاش رہے۔ یادِ الٰہی سے طبیعت نفور تھی، منہیّات و معصیّات سے بالکل اجتناب نہ کیا۔ خوب شراب لنڈھائی۔ خود بھی پی، اوروں کو بھی پلائی۔

---

[1] شرف فسانہ کا اٹھواں کردار ہے۔ سرشار ایک دن لکھے ہوئے مضمون اور دوسرے دن کے مضمون سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کبھی تو دونوں میں قریبی رابطہ نظر آتا اور کبھی یہ رابطہ بہت بعید نظر آتا ہے۔ دراصل ان کو روزانہ اودھ اخبار کے لیے اس فسانہ کی ایک قسط پانچ چھ کالم کی لکھنا پڑتی تھی۔ مضمون کے ربط کا تعلق ان کی یادداشت پر تھا۔ فسانہ کو بڑھانے کے لیے بات میں بات پیدا کرتے جاتے تھے۔ ان کی یادداشت، تخیّل کی جولانی، اور الفاظ و محاورات پر قدرت ان کی غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔ نورانی۔

دن رات بتوں ہی کے کوچے میں پڑے رہے۔ نماز کے قریب نہ پھٹکے۔ جو فعل کیا خلاف شرع، جو کام ہوا منافیِ تہذیب:

وہ ایسا کون سا معشوق ہے جس کو نہیں چاہا
یہ فردیں جتنی ہیں ان پر ہماری بھی نشانی ہے

اب ہم سوچتے ہیں کہ بارِ خدایا۔ ہمارا سرانجام کیا ہوگا۔ ہیں تو ہم اسی قابل، کہ نارِ جہنم میں جلائے جائیں۔ مگر ایک تدبیر سوجھ گئی۔ پرانے کفن میں ہماری نعش ہوگی۔ منکر نکیر آئیں گے۔ کفن کہنہ دیکھ کر سمجھیں گے کہ مردہ دیرینہ ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیں گے۔ ہم اسی حیلے سے نجات پائیں گے:

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

حبیب لبیب : ایسے بھونڈے عشق خانہ خراب، کا یہی انجام ہے۔

بحرِ عشق کی طغیانی اور قلزم جنون کی روانی

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

اس گلزارِ رشکِ فرخار، اور لالہ زار، سراپا بہار، اور نسیم مشک بیز و عنبر بار، نے میاں آزاد کی آتشِ عشق کو اور بھی بھڑکا دیا۔ جنون کی مذمت نے کشتی دل کے ساتھ بادِ مخالف کا کام کیا۔ آہِ آتشبار نے خرمنِ خرد پر بجلی گرائی۔ حشر توڑا۔ آفت ڈھائی۔ سبزانِ چمن کا جوبن دیکھ کر، سبزۂ گلگوں کا خیال آیا، حنا نے خون رلایا کبھی کنگھی کو دیکھ کر، اس پریشان کاکل کی زلفِ چلیپا یاد آئی۔ کبھی چشم مست کی یاد میں نرگس شہلا سے، آنکھ لڑائی۔ سرو کو دیکھا تو اپنے سربلند، اقبال کا بوٹا سا قد، آنکھوں میں پھر گیا۔ شمشاد نظروں سے گر گیا۔ گلِ رعنا کی دید سے گلِ رخسار کا خیال بندھا۔ بلبل شیدا کا نالۂ زار، تیر کی طرح جگر کے پار ہوا۔ الغرض اضطراب و بیقراری، نالہ و شیون، و آہ و زاری، دن دونی، رات چوگنی، ترقی پاتی تھی:

بے گلعذار جا کے گلستان میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو نیا کیا

عین حالت انتشار، وہجوم افکار، میں یہ سوجھی کہ اب رسّیاں توڑ کر نکل بھاگو اور بیابان کی راہ لو!

بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں　　گریباں پھاڑ کر جا بیٹھے صحرا کے دامن میں

جنوں کے جوش میں یکجا نہیں دم بھر قرار آیا
کبھی گلشن سے صحرا میں کبھی صحرا سے گلشن میں

مزاج اصلاح پر آنا دشوار تھا۔ دلِ مثلِ برق بیقرار تھا۔ آخر کار باغ کی دیوار پھاند کر یہ جا وہ جا۔ راہ میں سوچتے جاتے ہیں، کہ اگر وہ گل اندام ملے تو پھولے نہ سماؤں۔ باغ باغ ہو جاؤں۔ جو ملتا ہے اس سے کوئے یارِ دل آزار کا پتہ پوچھتے ہیں۔ وہ ہوا بتاتا ہے۔ قہقہہ اڑاتا ہے، اور بھانپ جاتا ہے کہ جنون کی اُمنگ اور عشق کی ترنگ ہے۔ بادۂ محبت کے نشہ میں چور مست و مخمور، کبھی خنداں، کبھی گریاں، آنکھیں اشکبار، لب پر عاشقانہ اشعار:

کوچۂ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے
بلبلِ مست کی صورت سے گلستاں چلیے

جدھر سیلاب جنوں بہا لے گیا، اُدھر چلے۔ جب رات بھیگی، تو ایک مقام پر کیا دیکھتے ہیں، کہ پچاس ساٹھ کہار اڈے پر جمع ہیں[1]۔ ایک کہار ہڑک بجاتا ہے۔ چار پانچ جوڑی، چھولکی، جھانجھ بجانے میں مصروف ہیں۔ دس پندرہ گردن ہلا ہلا کر بھجن، اور گیت گاتے ہیں۔ سامعین کو وجد میں لاتے ہیں۔

ہک، ہک، ہک ائے سبحان اللہ۔ کیا کہنا ہے۔ یہ وزن ہی نرالا ہے، چند کہار ڈولیوں کے اندر مدمست پڑے ہیں۔ کچھ اِدھر، کچھ اُدھر، نشے میں چور، کھڑے ہیں۔ کوئی لال لال وردی دکھاتا ہے، کوئی پگڑی کی مچھلی پر اتراتا ہے۔ ہنڈے میں دارو بھری ہے۔ کٹورا چل رہا ہے۔ طاق پر چراغ جل رہا ہے۔ آپس میں دھول دھپّا ہو رہا ہے، راجہ مہرا اڈے کے چودھری، بلاتشبیہ۔ فغفورِ چین، بنے بیٹھے ہیں۔ ہنگامہ حشر پا ہے۔ آگے بڑھے تو دیکھا کہ کندن سنار نے گھریا میں سہاگا ڈالا، سونا گلایا، اور کسی سیمتن کے لیے طلائی چھپکا تیار کیا۔ وہاں سے چلے تو ایک دکان پر دیکھتے کیا ہیں کہ چق والا دوزانو بیٹھا کہانی کہہ رہا ہے۔ اور چق والی ایک

---

[1] سرشار نے جا بجا اپنے عہد کے لکھنؤ کی عوامی زندگی کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اس طرح انھوں نے کی زندگی کی تصویر کشی بھی خوب کی ہے۔

پھٹی چٹائی پر لیٹی ہوئی ہوں ہوں کرتی جاتی ہے۔ اور ارد گرد ایک مرد، تین چار عورتیں بڑے لطف کے ساتھ کہانی سن رہی ہیں۔ جس میں ایک بات سچ تو ۹۹۔ لغو۔ اور بیس قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک وسیع میدان میں کوریوں کا ہجوم دیکھ کر ٹھٹک رہے۔ نرکل کی چٹائیاں بچھی ہیں۔ کوری اور کورنیں، چوطرفہ جمع ہیں۔ ایک کوری نوچہ، کشتی گیر، نیلا لہنگا پہنے لال لال پھریا اوڑھے، عورت کی قطع بنائے گیت گاتا ہے۔

دل ہمارا تیری نجر ہے　　　　تو تو پیاری بے کھبر ہے

اڑوسی پڑوسی تالیاں بجاتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ مرچنگ بج رہا ہے۔ ہر سمت عیش و عشرت کے سامان ہیں۔ یہ اپنی دھن میں ناک کی سیدھ پر چلے جاتے تھے۔ آنکھ جھپکنے کی دیر نہ ہوئی تھی، کہ ایک نئے محلے میں پہنچے۔ چوطرفہ سنّاٹا۔ ہو کا عالم۔ جانور نہ آدم۔ کتّے تک دبکے پڑے ہیں۔ کوئی منکنا ہی نہیں۔ دروازے افیونیوں کی آنکھ کی طرح بند۔ کہیں بوڑھا، نہ فرزند، حیرت تھی کہ بالعجب۔ اچھے شہر خموشاں میں گذر ہوا۔ جہاں ہر کوئی دیوار ہے۔ باولے کتے کی طرح اِدھر سے اُدھر بوکھلائے پھرتے تھے۔ بارے ایک دفعہ ہی آواز آئی، کہ (پو بارہ) شش واللہ خوب ہی داؤں اٹھا۔ اب ان کی جان میں جان آئی کہ ہمجنس کی آواز تو خدا نے سنائی جس رخ سے کان میں یہ آواز آئی تھی، ادھر ہی چلے۔ پھر آواز آئی کہ وہ فرد پیٹ لی۔ دوسری آواز) واللہ ہاتھ چوم لے کیا موقع پر کچے پھینکے ہیں۔ (تیسری) خدا کی مار ایسے پانسے پر جب دیکھو بدی کر جاتا ہے۔ پہلے سہ کی بازی گئی۔ اب شش کی ہارے۔ اتنے میں ایک دروازہ کھلا اور پانچ سات سفید پوش، بھڑ بھڑا کر نکل پڑے۔ وہ شور وہ غل کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔ اپنی اپنی سب گاتے ہیں۔ کوئی پورب گیا، کوئی پچھّم۔ ایک بزرگوار نے میاں آزاد کو دیکھا تو تعجب ہوا، کہ اجنبی اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔

بزرگوار: کون، آپ کون صاحب ہیں؟

آزاد: ہم کوئی ہیں آپ اپنی کہیے۔

بزرگوار: اجی حضرت آپ تیکھے کیوں ہوئے جاتے ہیں، میں سیدھی بات کرتا ہوں، آپ ٹیڑھے

عا اب کرداروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جلدی جلدی نئے نئے کردار سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن اہم مرکزی کردار آزاد ہے۔ جس کا واسطہ ہر کردار سے پڑتا ہے۔

ہوتے ہیں۔ ابھی اگر قندازبرقنداز دیکھ لے، تو کوتوالی کا چبوترہ ہی دکھائے۔

آزاد : برقنداز کی ایک ہی کہی، برقندازوں سے تم ایسے قماربازوں کو خوف ہے، یا ہم کو۔ یہاں تھانہ دار کا خوف نہ حولدار کا ڈر:

تو پاک باش برادر، مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

بزرگوار : (دل ہی دل میں)۔ اچھے بدتہذیب آدمی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ اپنی ہی سی کہے جاتا ہے۔ (آزاد سے) یا حضرت! اک ذراسی بات کو آپ نے کتنا طول دیا۔ قسم لیجیے جو میں نے آپ کو چور بنایا ہو۔ صرف اتنا پوچھا کہ حضور کہاں تشریف لیے جاتے ہیں۔ ائے بس اتنی سی بات پر آپ بگڑ اٹھے، لگے بے نقط سنانے۔

آزاد : خیر اگر بندے ہی کا قصور ہے، تو معاف فرمائیے، مگر خدا کے لیے اتنا تو ضرور بتائیے، کہ اس ٹکڑی میں کون کون ذات شریف جمع تھے اتنا ہم پر احسان کیجیے!

بزرگوار : ذات شریف، سبحان اللہ! خوب پہچانا۔ اے قبلہ یہ سب شریف زادے تھے۔ اہل قلم، عالی خاندان، معانی دود ماں لائق فائق، بذلہ سنج، خوش فکر، تربیت یافتہ، دن بھر اپنے اپنے کام میں رہتے ہیں۔ شام سے آدھی رات تک، یہاں جمتے ہیں۔ چوسر، شطرنج، گنجفہ، چہل، مذاق، لپاڈگی، یہی عیش زندگی ہے:

بہارِ عمر ملاقاتِ دوستداران ست
چہ خط برد خضر از عمرِ جاوداں تنہا

آزاد : کیوں حضرت، بھلا کوئی اور شغل بھی رہتا ہے۔ یا چکما ہی اڑا کرتا ہے؟

بزرگوار : اور کیا چانڈو پئیں، سبزی اڑائیں، افیون گھولیں، تاڑی منگائیں، دس پانچ، ہم سن بیٹھے خوش گپی ہونے لگی۔ یارانِ چوری نہ پیرانِ دغابازی۔

آزاد : اجی خدا کی مار، ایسے اشغال بیہودہ پر ہم حال ہی میں خوب غور سے تجویز کر چکے ہیں، کہ کُرمی۔ کہار۔ لہار۔ نیچ قوم، دن بھر لہو پسینہ ایک کر کے شام کو خوش خوش گھر آتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مذاق کے موافق طرح طرح کے اشغال میں مصروف رہتے ہیں۔ کوئی ڈفلی کوئی ہڑک بجاتا ہے۔ کوئی دن بھر کا تھکا ماندا مزے سے لیٹا ہوا کہانی کہہ کر اپنے عزیزوں کو خوش کرتا ہے۔ لیکن واہ رے اہلِ قلم۔ واہ رے شریف زادو، جب دیکھو گنجفہ ہو رہا ہے۔

ایک دو تین، لا بوجھ کو چھین، رو سے چار جا کے براتِ عاشقاں بر شاخ آہو۔ سات آٹھ نو۔ نو برابر سو، پشت دکھا دو۔ وہ ناج! کیوں سچ کہنا کس تماش کی بوجھ نکالتے ہیں۔ آفتاب آیا ہے، سورج کنڈھ میں۔ اب کی اللہ نے چاہا تو دو دستہ ہو۔ نادری چڑھے تو پھر دل لگی دیکھیے۔ ہفتوں، مہینوں، برسوں، پتوں ہی کی الٹ پھیر رہی۔ جب دیکھو ورق گردانی چلتے تو بشاش، ورنہ پشیمانی۔ واہ ری نادانی۔ بیسوں دَور ہو گئے، مگر طبیعت سیر ہوئی۔ چوسر کی طرف جھک پڑے، تو تڑ کا کر دیا۔ بازی پر بازی، سہ اور پنج، اور شش، کے داؤں لگا رہے ہیں۔ آپس میں گتھم گتھا، گنجپ مار ڈھاڑ، لڑائی تکرار، رنگ بد رنگ کے پھیر میں عمر گنوائی پانسے پھینکتے پھینکتے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ لکھنا پڑھنا چھوڑا۔ احباب سے ملنا ترک کیا۔ خط کتابت سے ہاتھ دھویا۔ جو پیدا کیا وہ سب کھویا۔ مطالعہ کتب کا شوق، نہ اخبار بینی کا ذوق، صبح چوسر، شام چوسر، اِدھر چوسر، اُدھر چوسر، الٰہی خیر، اور لطف یہ کہ بکارنے کو موجود، کہ ہم شریف ہیں۔ تربیت یافتگی کا دم بھرتے ہیں۔ ہیچو من دیگرے نیست اور افعال ایسے قبیحہ و دنیہ۔ ان سے تو کوری کہار ہی اچھے۔ کہ اپنے پیشے اور اپنی تھوڑی سی عقل کے موافق دلبستگی کی تو صورت نکالتے ہیں مانا کہ ان کے اشغال بھی تعریف کے لائق نہیں لیشائیل مردوں کا پھریلا اوڑھ کر تھرکنا، نفرت انگیز فعل ہے۔ مگر وہ منطقی فلسفی تو ہیں نہیں۔ تربیت یافتہ علم سے آشنا، آپ تو دون کی لیتے ہیں۔ اور باایں ہمہ لن ترانی وہی ڈھاک کے تین پات وقتِ فرصت ہوا کھائیے۔ کتبخانہ جائیے۔ جلسہ تہذیب جائیے۔ کتبِ مفید مطالعہ کیجیے۔ لکچر یا تصانیفِ لطیف کی فکر معقول فرمائیے، تو ہم سمجھیں، کہ تربیت یافتہ ہیں۔ یہ نہیں کہ جواریوں کی طرح تہذیب کی خواری کریں۔ بیکلو اور کھیل آلا، اور کھیل سر، اور اٹھارہ اور پانچ دو کے سوا اور کچھ نہ سیکھے اور ہر شب کو بدبدا گنجفے یا چوسر میں مغزن کی۔

رنگے سیار

میاں آزاد زلفِ پریشاں کی یاد میں، رات بھر خواب پریشان دیکھا کیے۔ تڑکے خواب خرگوش سے بیدار ہوئے، تو پھر سینچر پاؤں پر سوار ہو گیا، دوپہر تک بے آب و دانہ، ہر دم خیال وصل جانانہ۔ دوپہر ڈھلے ایک قصبہ میں پہنچے۔ پیپل کے پیڑ کے سایہ میں بستر جمایا۔ سبزۂ بیگانہ کو اپنا مسکن بنایا۔ پیپل کے دھانی دھانی پتوں کی رنگت پر جو نظر پڑی تو سبزان رنگیں ادا کا حسنِ برشتہ

یاد آیا۔ کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگے۔ تھکے ماندے چلے آتے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ذرا دل کو ڈھارس ہوئی، پانوں پھیلا کر لمبی تانی تو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ جب خوب نیند بھر سو چکے، تو ایک مرد آدمی نے جگا دیا۔ اِلّا اللہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے۔ وحشت کسی قدر دور ہو گئی تھی۔ مگر پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ سامنے اندارے پر ایک گلبدن، سیمتن عورت عجب نزاکت سے پانی بھر رہی تھی۔ حضرت بھی پہنچے۔

آزاد : کیوں نیک بخت! ہمیں اک ذرا سا پانی نہیں پلاتیں۔ بھر نادو بھر ہو، تو لاؤ ہم بھریں تم بھی پیو، ہم بھی پییں۔ احسان ہو گا۔

سیم تن : جواب ندارد۔ تیکھی چتون سے بھر پور نظر ڈالی۔ مگر قہر کی بھری ہوئی۔

آزاد : سخی سے سوم بھلا جو ترنت دیوے جواب۔ بیوی پانی پلاؤ یا ٹکا سا جواب دو۔ یہ قصبہ تو اپنے حق میں دشتِ کربلا ہو گیا۔ ایک بوند پانی کو ترس ترس گئے۔ اب تو آبِ خنجر کی چاہ ہے۔ ایک دفعہ دزدیدہ نگاہ سے پھر دیکھ لو، تو پانی بھی نہ مانگوں۔

سیم تن : (لب تک نہ ہلے۔ سکوت مگر ایک ناز معشوقانہ سے ظرفِ سیمین بھر کر پانی لے چلی)۔

آزاد : بھئی اچھا گاؤں ہے۔ جو بات ہے انوکھی، جو ریت ہے نرالی۔ ایک آبخورہ پانی نہ ملا، واہ ری قسمت! لوگ تو اس بھادوں کی جلتی بلتی دھوپ میں پوشالے بٹھاتے ہیں۔ کیوڑا پڑا ہوا آبِ سرد پلاتے ہیں۔ یہاں کٹوروں کی جھنکار نہ سبیل ہے نذر حسین کی، پکار۔

میاں آزاد کو حیرت تھی کہ یہ کمسن نازنین، یہ مشک افشاں بال، اور مستانہ چال، یہاں ویرانے میں اس کا کیا کام، سائے کی طرح ساتھ ہو لیے، وہ کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی۔ مگر منھ نہیں لگاتی تھی۔ بارے سڑک سے دائیں ہاتھ پر، ایک خوشنما پھاٹک کے قریب، وہ گلفام سیم اندام ٹھہر گئی۔ ظرف سیمین کو دوسرے ہاتھ میں لیا۔ اور پیڑ کے سایہ میں بیٹھ کر ستانے لگی۔

آزاد : ہم بھی ہمراہ رکاب ہیں۔ ہم تاڑ گئے کہ نزاکت کے مارے یہ ہلکا پھلکا برتن ہی پہاڑ ہو گیا۔ اشارے کی دیر ہے۔ ذرا لب ہلاؤ، تو ہاتھ بٹا لوں۔ قسم لو جو ایک قطرہ بھی پیوں۔ گو پیاس کی شدت سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ دم نکلا جاتا ہے، اور چاہوں تو چھین لوں۔ لیکن تمہارا دل دکھانا منظور نہیں۔ اس میں چاہے جان پر بن آئے۔ افسوس یہ چہرۂ نورانی، اور یہ نامہربانی۔!

اُس ناظورۂ طاؤس تہذیب و عابدِ فریب، نے پھر اس برتن کو بڑی کوشش سے اُٹھایا، اور پھاٹک کے اندر ہو رہی۔ میاں آزاد نے ایک درد انگیز آواز سے حسبِ حال ایک شعر پڑھا اور چپکے

چپکے خود بھی پھاٹک میں دبے پاؤں، اس گل عذار کے پیچھے پیچھے گئے۔ وہ رعنا شمائل، ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جا بیٹھی، میاں آزاد ایک روش میں دبک رہے۔ گو شیطان وَرغلاتا تھا، کہ چل کر زلفِ چلیپا کی بلائیں لیں، مگر ڈر تھا کہیں یہ کالی ناگنی ڈس نہ جائے۔ اور تہذیب بھی مانع تھی۔ جی بھر بھر اتا تھا۔ مگر قدم آگے نہیں بڑھتا تھا:

تنگ آیا ہوں نہایت خاطرِ مشتاق سے
ہر گھڑی کہتی تھی چل، ہر وقت سمجھاتی تھی ہاں

اب اُس فرح بخش و دلکشا، مقام ندرت القیام، کا ذکر سنئیے، چوطرفہ کھائی کھدی ہوئی، آٹھ آٹھ گز گہری، سرپٹ اور گردبوئی ہوئی۔ ایسی گھنی کہ چڑیا تک کا گذر نہ ہو سکے۔ اور وہ تیز کہ تلوار گرد۔ بڑا عالیشان محراب دار پھاٹک لگا ہوا ہے۔ وہ جوہر دار شیشم کی لکڑی کہ باید و شاید۔ کیاریاں۔ دڑ بیچی جاتی تھیں۔ رَوِشوں پر سُرخی کٹی تھی۔ اشجار پر بہار، گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کہیں انار کی قطار، کہیں لکھوٹ کی بہار۔ ادھر انبہ لذیز و شیریں، اُدھر امرود ملوائے بے دود۔ چکوتروں اور مہتابیوں سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ نارنگی اور میٹھے شاخوں پر لدے تھے۔ پھولوں کی بو باس۔ کہیں گل منہدی۔ کہیں گل عباس، نواڑی پھولی ہوئی، چوطرفہ عالم نور ہے۔ ہر سمت لُطفِ مَوفُور ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اودی اودی گھٹا، کلیوں کی چٹک جوہی کی بھبتی مہک، کلغے کی دہک، کنیل کی دمک، وسط باغ میں ایک تین فٹ کا اونچا پکا مربع، چبوترہ بنا ہے۔ اور ایک کونے میں چھوٹا سا خوشنما بنگلہ ہے۔ اغل بغل دو ایک صاف ستھری کوٹھریاں۔ یہ تو سب کچھ ہے مگر مکین کا پتہ نہیں۔ اس سیم تن کی چال ڈھال، اور طرزِ نشست سے اجنبیت برستی تھی۔ حیرت تھی کہ اس باغِ لطافت بار کے مکین سلیقہ شعار کہاں چھپ رہے:

باغ ہے پر عجب ہے یہ روداد
نہ کہیں آدمی نہ آدم زاد

گل ہیں سب اپنی اپنی جوبن پر — بوئے گل ہے صبا کے توسن پر
ہے عجب لطف پر شگوفہ و گل — کہیں شبو کھلی کہیں سنبل

انھوں نے دیکھا کہ وہ بتِ طناز، سرمایۂ ناز، ظرف سیمین زمین پر پٹک کر، ایک نواڑ کی نازک پلنگڑی پر سو رہی۔ اب تو ان کو خوب ہی موقع ملا۔ اٹھے اور میوہ تر جس قدر جی چاہا خوب

چھک کر کھائے۔ اور اس ظرف سیمیں کو منھ سے لگایا، تو ایک ایک قطرہ پی گئے۔ اتنے میں پانوؤں کی آہٹ سنائی دی، یہاں آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے۔ مگر تاک لگائے بیٹھے ہیں، کہ دیکھیں ہے کون؟ دیکھا تو پھاٹک کی جانب سے کوئی آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ قریب آیا تو انھوں نے بغور نظر ڈالی۔ ایک کشیدہ قامتِ لحیم وشحیم، ڈنڈ پیل، چٹ لنگوٹ باندھے، اکڑتا اینڈتا، اس بنگلہ کی طرف جاتا ہے۔ سمجھے کہ کوئی پہلوان کشتی گیر، اپنے اکھاڑے سے واپس آتا ہے۔ قریب آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہیں۔ وہ چٹ لنگوٹ جس سے پہلوان کا دھوکا ہوتا تھا۔ تہ بند نکلا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے۔ سیم تن کو پلنگڑی پر سوتا پایا۔ ایک دفعہ ہی پلنگڑی پر ہاتھ مار کر چلا اُٹھے۔ اٹھ حکم معبود! وہ زن رعنا شمائل، گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُٹھتے ہی قدم لیے۔ شاہ جی نے فرط شفقت سے اس کی جبین نورانی اور چینِ پیشانی، پر بوسہ دیا۔ اور ایک تپائی پر بیٹھ کر یوں تقریر کرنے لگے۔

شاہ جی: بیٹی آج تم کو ہمارے سبب سے بہت راہ دیکھنی پڑی۔ ایک گانوں میں یہاں سے دس کوس پر، ایک راجہ رہتا ہے مگر اسّی برس کا ہو گیا۔ اللہ نے اسے لڑکا دیا نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا، میں کہیں کو جاتا آتا تو ہوں نہیں۔ وہ رانی کو لے کر آپ آیا۔ قدموں پر گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پر ایک گلاب کا پھول بِن سونگھا دے مارا۔ پانچویں ہی مہینے اللہ نے لڑکا دیا۔ راجہ میرے پاس دوڑا آتا تھا، کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بٹھا لیا۔ کہتا ہے روپیہ لو، جاگیر لو، گانوں لو، ہاتھی گھوڑے لو، مگر میں کب مانتا ہوں۔ اس وقت پیچھا چھوٹا تم پانی لائی ہو گی۔ تو میں پھونک دوں گا جس میں تم نامحروم نہ رہو۔

سیم تن: میں آپ کی لونڈی ہوں۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ پانی وہ رکھا ہے۔ آپ پھونک ڈالدیں، تو میں رخصت ہوں۔ یہ کہہ کر سیم تن اٹھی، دیکھا تو ظرف موجود مگر پانی ندارد۔ ایں یہ پانی کیا ہوا۔ زمین کھا گئی، آسمان کھا گیا۔ ابھی پانی رکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ گیا۔ ہے ہے شاہ صاحب آپ کے پاس میں جھوٹی بنی۔ میری بڑی کرکری ہوئی، زمین پھٹ جائے تو میں دھنس جاؤں۔ اے لو غضب خدا کا ایک بوند تک نہیں۔ اللہ جانتا ہے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی: بتا ہی دوں؟ اچھا۔ اب بے چین نہ ہو۔ مجھے اشراق سے معلوم ہو گیا کہ تم آئی ہو۔ جب تم سو رہیں۔ تو میں نے آنکھ بند کی اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا پھر آنکھ بند کی، اور

راجہ کے پاس ہو رہا۔ پھونک ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے پر بات جاتی۔ یہ الائچی لو اور کل آدھی رات کو کسی مرگھٹ میں دفنا دو۔ بس مطلب حاصل ہو جائے گا۔

سیمتن نے الائچی لی اور اسی دم واپس گئی۔ میاں آزاد چپکے چپکے سب سن رہے تھے اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ آفتابے کا پانی تو انھوں نے پی لیا تھا اور شاہ صاحب نے معاً یہ بٹی کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے، اور پانی پی کر کسی ترکیب سے چل دیے یہ سن کر آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شاہ جی کی باتوں سے ان کے دل پر نقش ہو گیا کہ بڑے ہی ذات شریف ہیں۔ اتنا بڑا جھوٹا نہ دیکھا نہ سنا ایسے بڑے ولی اللہ ہو گئے، کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں مہینے بچّہ جن پڑی۔ اس کذب پر خدا کی سنوار۔ جھوٹھ بھی تو کتنا اور علم اشراق میں بھی حضور کو بڑا دخل ہے۔ چشم بد دور، حق تو یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں۔ مگر پٹے بڑھا لیے۔ تہ بند باندھ کر شاہ جی بن گئے لگے پجنے، کوئی بیٹا مانگتا ہے، کوئی تعویذ کا خواستگار ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میرا مقدمہ جتوا دو، تو حق خدمت بجا لاؤں، کوئی کہتا ہے کہ فلاں عہدہ دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ اتّفاقِ وقت سے مطلب بر آیا، تو شاہ صاحب کی چاندی ہے، ورنہ مجال کس کی کہ شکایت کا لفظ زبان تک لائے! ڈر ہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک، بہت سے دشمنِ عقل ان بنے ہوئے فقیروں کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں۔ بعض بعض تو معاذ اللہ انھیں دوسرا خدا سمجھتے ہیں۔ خدا ایسے خیالات مزخرف سے بچائے۔ میاں آزاد اس درویش معمّر کی گفتگو سے سمجھ گئے تھے، کہ پڑھے لکھے خاک بھی نہیں ہیں، ورنہ (بہ سبب) اور (نا محرم) نہ کہتے۔ بھلا ان پڑھ، کندۂ ناتراش، بھی کہیں مسلکِ خدا شناسی کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اور غیب کی بات تو جناب باری عزّ اسمہٗ کے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہ شاہ جی بے چارے کیا کھا کر بتائیں گے۔ یہ سب باتیں ہیں۔ ضعیف الاعتقاد آدمی، ایسے جاہل، مکاروں کے بھرّوں میں آئیں، تو آئیں۔ ہم بھلا کب پھنسنے والے ہیں۔ اے توبہ! یہاں طفلی ہی سے فقیروں کے قائل نہ ہوئے اور ان شاہ جی نے تو کذب کے پل باندھ دیے۔ وہ بے چاری عورت ناقص العقل، دنیا کے حالات سے واقف نہیں، جس کا جی چاہا بہکا دیا۔ ہم ایسوں کو شاہ جی چکما دیں، تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔

میاں آزاد کی کارستانی اور شاہ جی کی پریشانی

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن (غالب)

میاں آزاد ایسے بنے ہوئے شُدھا اور رنگے سیار فقیروں کی نبض تک سے واقف تھے۔ معاً تاڑ گئے کہ شاہ صاحب ایک ہی مرشد، بڑے ہی رنگ باز ہیں۔ خرقہ، سالوس دَر بَر، اور عمامۂ زُور بر سر، گوکھوں کو پھانس پھونس کر ہنڈیا چڑھاتے ہیں، اور بیوقوفوں کو اور بھی اُلّو بناتے ہیں۔ ان پڑھ گنوار، چنگ پر چڑھ جاتے ہیں۔ سوچے کہ شاہ جی کی قرار واقعی مرمت کر دینی چاہیے اتنے میں شاہ صاحب نے ایک صاف شفاف چبوترے پر لنگی بچھائی، اور اس پر دراز ہو کر مناجات پڑھنے لگے۔ مگر پڑھے لکھے تو تھے ہی نہیں، صرف حافظے پر دار و مدار تھا۔ شین قاف تک درست نہیں۔ شاعری کا خوب دل کھول کر خون کیا[1] اور اناپ شناپ بکنے لگے:

خدایا جہاں بادشاہی ترا ست — نما خدِ باَمدائی ترا ست
ہماں آفریدی بالا و پست — توئی آفریں نندوالاو کشت
توئی کا سماں رازیں ساکتی — زمین راز مان وزمین ساکتی
نیائی زما جو بس بجز کردنی — دگر خفنی بار آپے خوردنی
دکا نست باف فرخندگی — خدا وندِ ما از تو بندگی

شاہ جی بڑے سوز و گداز سے لہرا لہرا کر حضرت نظامی گنجوی[2] علیہ الرحمۃ والغفران کے کلام نظام کا خون اپنی گردن پر لے رہے تھے کہ میاں آزاد سے نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ ہی بول اُٹھے کہ یا وحشت تیرا ہی آسرا ہے۔ اب تو شاہ جی چکر میں آئے۔ یہ آوازہ کس نے کسا۔ یہ حریف کون پیدا ہوئے۔ یہ پھبتی کس نے کہی۔ اِدھر اُدھر دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر آدم نہ آدم زاد۔ انسان نہ انسان کا سایہ۔ یا الٰہی یہ کون بولا۔ یا خدا یہ کس نے ٹوکا۔ سمجھے کہ یہ آسمانی

---

[1] فارسی میں مناجات کے یہ اشعار نظامی گنجوی کے ہیں ایک جاہل کی زبان سے غلط تلفظ سے ادا کیے گئے ہیں اس لیے سب غلط اور بے معنی ہو گئے۔ اصل اشعار فرہنگ میں درج ہیں۔ نورانی۔

[2] جمال الدین ابو محمد نظامی گنجوی متوفی ۶۰۶ھ فارسی کے مشہور شاعر جن کی پانچ مشہور مثنویاں خمسۂ نظامی کہلاتی ہیں۔

ڈھیلا ہے۔ خدا کھوپڑی کو بچائے۔ ڈرپوک ضعیف الاعتقاد تو تھے۔ ہی ڈرے، کہ کوئی بلائے ناگہانی، یا آفتِ آسمانی ہے۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے، بدن تھر تھرانے لگا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کشف و کمال سب بھول گئے۔ جو اس بلا اجازت سپاٹو پر ہو رہے۔ ہوش قلابازی کھانے لگے دفع بلا کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ آخر میں باواز بلند چلا اُٹھے، کہ (یا مظہر العجائب) ادھر یہ بول اُٹھے (لنگی مع شاہ جی غائب) اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال نہ پوچھیے، کچھ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ۶

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

دم بخود، میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا، جھٹ نکل کر ٹٹّوں کو خوب پاؤں سے کھڑکھڑایا شاہ جی کانپ اُٹھے کہ پریوں کا لشکر کا لشکر آن کھڑا ہوا اب گئے ہی گذرے آزاد نے بلحن داؤدی، خاص اہلِ عجم کے لہجے میں ایک غزل پڑھی، گو شاہ جی الف کے نام بے بھی نہیں جانتے تھے، مگر رات خوب ہی بھیگی تھی اور چاندنی نکھری تھی۔ ہوائے سرد پھولوں کی بو باس کو منتشر کر رہی تھی۔ آزاد نے ایسی سریلی آواز سے اُس حقانی غزل کو گایا کہ کندۂ ناتراش تک کو وجد آیا۔ شاہ جی مست ہو گئے سمجھے کہ کوئی درویش باکمال آنکلے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیے، انھوں نے پیٹھ ٹھونکی۔ شاہ جی اس وقت دو آتشہ شراب اڑائے ہوئے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں خیال بندھ گیا، کہ کوئی آسمان سے اترا ہے۔

آزاد : کیستی نواز کجائی، د بامنت چہ کارست ؟ سکوت تاکے ماسمک، اَنتَ تسبیحٌ اوسیّدٌ۔ بلغنا المُراد و زال العناد لک الحمد و الشکر یا ربّنا۔ اللہ بس باقی ہوس۔ شاہ جی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی، سمجھے کہ بیشک فرشتہ آسمان ہے۔ ہماری روح کو قبض کرنے کو نازل ہوا، دبے دانتوں فرماتے کیا ہیں، کہ میں علم سے نامحروم ہوں گا۔ سمجھتا نہیں ہوں گا، کہ آپ اس وقت کیا حکم دیتے ہیں۔ ہم نے بہت گناہ کیے، اب ماف (معاف) فرماؤ۔ کچھ دن اور جینے دو۔ تو توبہ کروں، یہ ٹھگ بدیا چھوڑ دوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ فرشتے ہو۔ روح قبض کرنے آئے ہو۔

آزاد : یہ پیرانہ سالی اور یہ بداعمالی۔ یہ سنِ وسال اور یہ چال ڈھال، یاد رکھ کہ قعرِ جہنم میں پڑے گا اور نارِ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ سُن فرشتۂ آسمانی، نہ ملک روحانی، میں حکیم بلنیاس کی روح پاک، عالم ہوں، حکیم ہوں، خدا ترس ہوں، رحیم ہوں، ملکوتی صفات ہوں، صاحبِ

طلسمات ونیرنجات ہوں۔ شجاعت میں رستم[1] سیستانی، حکمت میں ارسطوئے[2] ثانی، مصوری میں رشک بہزاد و مانی[3]، سکندر نامہ میں نظامی نے یہ شعر میری ہی شان میں کہا ہے:

بلیناس فرزانہ راپیش خواند
بنزدیک جام جہاں میں نشاند

میری تعریف و توصیف میں بڑے بڑے شعرائے بلند پایہ، وسخنورانِ گرانمایہ رطب اللسان ہیں۔ میرا مزار اسی جگہ پر تھا، جہاں تیرا چبوترہ ہے، اور جہاں تو ناپاک رہتا ہے، اور شرابیں انڈیلتا ہے، خیر تیری ناواقفیت کے سبب سے، تجھے میں نے چھوڑ دیا۔ لیکن اب آپ نے یہ نیا ہتھکنڈہ سیکھا، کہ اُس زنِ جادو جمال، زہرہ تمثال کو پھانسا، اور اس سے کچھ اینٹھا چاہتے تھے۔ وہ اس زمانہ میں میری منکوحہ اور مطبوعہ بیوی تھی۔ لے اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ دو۔ مکر وریا سے منھ موڑ دو ورنہ تم ہو، اور ہم۔ ابھی ابھی ٹھیک بناؤں گا، اور ناچ نچاؤں گا، مفر اسی میں ہے کہ اپنا کل حال پوست کندہ، راست، براست، بے کم وکاست، کہہ چلو۔ نہیں خود ہی بھگتوگے۔ میرا کچھ نہ جائے گا۔ شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی بیتی صاف صاف کہہ سنائی جس کو ہم اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں ذرا کان دھر کر سنیئے۔

شاہ جی کی آپ بیتی

شاہ جی : چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کی لت پڑی۔ وہ مشاقی بہم پہنچائی کہ آنکھ چوکی اور گٹھری اُڑائی۔ غافل ہوا، اور ٹوپی کھسکائی۔ پہلے کچھ دن تو لٹیا چور رہے۔ مگر یہ تو کرنی بدیا ہے۔ چند ہی روز میں چوروں کے دلی کھنگر ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے۔ چھت کی کڑیوں میں یوں چپٹ رہوں، جیسے چھپکلی۔ اُچک پھاند میں بندر، میرے مقابلے میں گرد ہیں۔ دبے پاؤں

ع۱ ایران کا مشہور پہلوان، رستم جو ایران کے علاقہ سیستان کا باشندہ تھا۔ اس کا بیٹا سہراب زبردست پہلوان تھا جو خود رستم کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

ع۲ حکیم ارسطو۔ یونان کا مشہور فلسفی، عالم اور فاضل تھا۔

ع۳ مانی ایران کا بہت ماہر نقاش اور مصور تھا۔ اس نے نبوت کا دعوا کیا تھا۔ بادشاہ بہرام اول نے اس کو قتل کرادیا تھا۔ ارتنگ، اس کی مشہور کتاب ہے۔

کوسوں نکل جاؤں، ممکن کیا کسی کو آہٹ معلوم ہو۔ شہر بھر کے بدمعاش، اوباش، لقّے، لچّے، شہدے، گرگے، ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ بڑے بڑے مہاجن، ساہوکار، جھک کر سلام کرنے لگے۔ جس نے ہیکڑی کی لی۔ اس کو نیچا دکھا دیا۔ جو ٹیڑھا ہو، اس کو سیدھا بنا دیا۔ خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا۔ کل اس کی چھت کاٹی۔ پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیند دی۔ رفتہ رفتہ ڈاکے مارنے لگے۔ سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ ٹھانگ میں دنیا بھر کے بیفکرے جمع ہیں۔ ایک طرف یارانِ سرپل، چانڈو اڑا رہے ہیں۔ دوسری طرف چرس کے دم لگا رہے ہیں۔ گانجا، بھنگ، ٹھرے سب کا شغل ہے۔ تانیں اُڑ رہی ہیں۔ شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ گنڈیریوں کے انبار لگے ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں۔ سب کو یہی فکر ہے کہ کسی کا مال تاکیں۔ کوئی زردار کورا نہ بچ نکلے داغی ضرور ہو۔ ایک دن شامتِ اعمال سے ایک نواب صاحب ذی مقدرت کے یہاں چوری کرنے کا شوق چرّایا۔ ان کے خدمت گار کو بلایا۔ ماما چھوچھو کو کچھ چٹایا۔ ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اسی محلے میں ایک مہینے قبل مکان کرایہ پر لیا۔ اسی مکان میں بیٹھے نواب کا ایوانِ عالیشان کوئی پچاس ہی قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ تین آدمی دس قدم پر، اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے۔ ہم اور خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑیں۔ قریب گئے تو ڈیوڑھی پر چوکیدار نے پکارا۔ کون؟ سن سے جان نکل گئی۔ عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکیدار کو پہلے سے نہیں ملایا۔ اب کیا کریں۔ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ پھر چوکیدار نے للکارا کون آتا ہے؟ ہم نے کہا ہم ہیں۔ بھئی (چوکیدار) ہم کی ایک ہی کہی۔ ہم کا کچھ نام بھی ہے۔ آخر کار ہم نے چوکیدار کو اسی دم کچھ چٹا کر سیند دی۔ گھر میں گھسے تو دیکھتے کیا ہیں، کہ نواب صاحب پلنگ پر سوتے ہیں، اور ان کی بیگم دوسرے پلنگ پر خوابِ ناز میں ہیں۔ مگر شمع روشن ہے۔ اپنے ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع کو گل کر دے۔ اتفاقِ وقت سے وہ ایسا گھبرایا کہ بڑے زور سے پھونک ماری۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے، ایسا نہ ہو کے نواب جاگ اٹھیں تو لینے کے دینے پڑیں۔ آگے بڑھ کے میں نے بتی کو تیل میں کھسکا دیا۔ چلیے چراغ گل، پگڑی غائب بیگم صاحب کے سرہانے زیور کا صندوق رکھا تھا۔ مگر آڑ میں۔ ہم تو ماما کی زبانی کچا چٹھا سن چکے تھے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ فوراً صندوق اٹھا۔ اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر پہنچا دے وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ مارے بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا، اور ایک دفعہ ہی اَرارا اگر دھم۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی نواب چونک پڑے۔ شیر بچہ سرہانے سے اٹھا پلنگ سے اٹھ پیترے بدل بدل

کر چمکیتی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور جھٹ کمرے سے نکل دیوار پر چڑھ پچھواڑے کودا، اور چور چور پکارتا ہوا نا کے باہر، وہ دونوں سر لو جھیے نو سیکھیے تھے۔ دھر لیے گئے۔ مگر واہ رے نواب، واللہ جری آدمی ہے۔ دونوں کو گھیر لیا۔ وہ تو جیلخانہ گئے۔ بندہ نلوہ بچا۔ اب ہم نے یہ پیشہ چھوڑا۔ اور سفاکی پر کمر باندھی۔ ایک مہینے میں کئی خون کیے پہلے ایک سوداگر کو گھر میں گھس کر چار پائی پر ڈھیر کر دیا۔ اور جمع جتھا ہمارے باپ کی ہو گئی۔ پھر ریل پر ایک مالدار جوہری کا گلا گھونٹ ڈالا، اور جواہرات صاف اڑا لیے۔ تیسری دفعہ دو بنجارے سرائے میں اُترے تھے ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں۔ ان کو سراہی میں انٹا غفیل کرنا چاہا۔ بھٹیاری نے ہمیں دیکھ لیا۔ غل مچا یا پکڑے گئے۔ چالان ہوا۔ مجسٹریٹ نے قید خانہ دکھایا۔ وہاں آٹھ دن رہے تھے، کہ نویں دن آزادی یاد آئی۔ رات کو موقع پا کر کال کوٹھڑی کا دروازہ توڑا، ایک کنجی بردار کا سر اینٹ سے پھوڑا۔ پہرے کے کانسٹبل کو اُسی بندوق سے شہید کیا۔ صاف نکل بھاگے۔ اب ہم سوچے کہ کوئی نیا پیشہ اختیار کریں۔ اس گاؤں میں آئے، تو عجب ہتھکنڈے سے درویش با کمال بن بیٹھے۔ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک پیڑ کے نیچے بستر جما دیا۔ پجنے لگے ایک دن اس گاؤں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا۔ یہاں طبیب نہ ڈاکٹر۔ کسی نے کہہ دیا کہ ایک وَلی اللہ پکریا کے نیچے بیٹھے، یاد خدا کیا کرتے ہیں۔ چہرے سے نور برستا ہے۔ کسی سے لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے ہی اپنے بھائی کو بھیجا۔ ہم ساتھ گئے۔ چہرہ بشاش کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا۔ تو عمر بھر چین سے گذرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے (قدم درویشاں رَدِّ بلا بہ آواز بلند کہہ کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے) اور کچھ بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا کہ لڑکے کا برا حال ہے، بچنا محال ہے۔ ٹھاکر قدموں پر گر پڑا۔ ہم نے پیٹھ ٹھوکی، اور لمبے لمبے ڈگ بڑھائے چل دیے۔ اس دن اتفاق سے ایک یورپین ڈاکٹر دورہ کرتے ہوئے اس گاؤں میں آئے۔ اور ان کے معالجے سے مریض چنگا ہو گیا، اب لطف دیکھیے کہ ڈاکٹر کا تو کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ کوئی عیسےٰ بناتا ہے، کوئی خدا رسیدہ کہتا ہے۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپیہ دیا۔ وہ ہم نے قبول نہ کیا۔ سبحان اللہ پھر تو ہوا بندھ گئی۔ اب چوطرفہ ہم ہی ہم ہیں۔ کوئی بیمار ہو تو ہم پوچھے جائیں۔ کوئی مرے تو ہم بلائے جائیں۔ میاں بیوی کی شکررنجی میں ہم قاضی بنتے ہیں۔ باپ بیٹے کا جھگڑا فیصل کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں، اور نعمتوں پر نعمتیں ہمارے سامنے چنی رہتی ہیں۔

عورت مرد، غریب و امیر، برناؤ پیر، سب زیارت کو آتے ہیں۔ ہمارے آزاد منش بیباک روش، پاکیزہ مشرب، عالی گوہر، فرخندہ اختر، معزز ممدوح، میاں آزاد اب حکیم بلیناس فرزانہ کی روح بن بیٹھے۔ بھئی کیا کیا فقرے یاد ہیں۔ اچھا روپ بدلا۔ شاہ جی کو وہ گیدڑ بھبکی بتائی کہ آتے حواس غائب ہو گئے۔ شراب کے نشہ نے سمندِ وحشت پر ایک اور کوڑا جمایا، مکر و زور کا سارا حال موبمو کہہ سنایا۔ واللہ اچھا سہل نسخہ ہاتھ آیا۔ شاہ صاحب کی قلعی کھل گئی۔ سچ ہے، ہر فرعونے را موسیٰ۔ گاؤں بھر چرکھایا تھا۔ خوب دام تزویر پھیلایا تھا۔ اب پھنسے بچّا، میاں آزاد نے جب دیکھا کہ مارے بوکھلاہٹ کے ان کی جان پر بن آئی ہے، تو تشفی دی، اور یوں سمجھایا۔ سنو شاہ جی! سمک سے سما اور ثریٰ سے ثریا تک اپنا راج ہے۔ لیکن ہماری بیعت لاؤ، ہمیں اپنا پیر بناؤ، تو چھوڑ دیں۔ اس وقت تو مزے سے پاؤں پھیلا کر سو رہو۔ کل تڑکے، گجر دم، گاؤں بھر میں غلغلہ ڈال دو۔ کہ ہمارے پیر مقدّس نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مگر ہمارا سن دو سو گیارہ برس بتانا، اور سب سے کہہ آنا کہ ابھی نام خدا سبزہ آغاز ہیں۔ اور جوانِ طنّاز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ جی کی باچھیں کھل گئیں، کہ چلو کسی طرح جان تو بچے۔ نور کے تڑکے تمام گاؤں میں اس سرے سے اس سرے تک، پکار آئے۔ کہ ہمارے پیر مقدس آتے ہیں۔ جسے دیکھنا ہے دیکھ لے۔ شاہ جی کی وہاں دھاک بندھی ہی تھی، جب لوگوں نے سنا کہ ان کے بھی ولی کھنگر آتے ہیں۔ تو شوق چرّایا کہ زیارت کو چلیں۔ دو دن اور دو رات میاں آزاد نے کسی کو رُخ تاباں نہ دکھایا۔ تیسرے دن فقیرانہ لباس پہن کر ہرے ہرے پیڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایے میں آن بیٹھے۔ میاں آزاد گلفام، و نازک اندام، حسین و مہ جبین تو تھے ہی۔ شنجرفی تہ بند، اور پیرہن نے آتشِ حسن کو اور بھی بھڑکایا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پو پھٹتے ہی زن و مرد، غریب ادر امیر، برنا و پیر، زیارت کو آرہے ہیں۔ ٹھٹ کے ٹھٹ۔ جمع۔ ہندو اور مسلمان کی عوراتِ جوان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ جوان، کمسن، جادو جمال، زہرہ تمثال، شوخ و طنّاز، خوش انداز، سراپا ناز، زیور سے مزین، لباس گراں بہا، سے مشیّن، چھما چھم، کرتی چلی آتی ہیں۔ دس دس کوس سے فینسوں پر سوار، بصد شوق زیارت کو آئی ہیں نمکین، طرحدار، مہریاں ساتھ، بانکی ادا، سے فینس کے کونے پر ہاتھ، کوئی بڑے ٹھسّے سے ڈولی پر، کوئی پیادہ پا۔ غنچہ کھلا ہوا ہے۔ میاں آزاد نے

دل ہی دل میں ان کے ورثا کو خوب صلواتیں بتائیں، کہ فقیر اور باکمال، کا نام سنتے ہی کیا جھٹ سے بھیج دیا - خدا کی مار - ان کو اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ ذرا دل میں سوچیں کہ ہم بھیجتے کہاں ہیں۔ الٰہی توبہ، الٰہی توبہ! میاں آزاد نے نہایت جوش و خروش، اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ اشعار اور آیات پڑھنا شروع کیں۔ اور خوب ہی بنے۔ بھئی واللہ کیا بھیڑیا دھسان خلقت ہے جس نے کپڑے رنگ لیے وہی خدا رسیدہ بن بیٹھا۔ دنیا بھر کے بے فکرے فقیر کے لباس میں مال مارتے ہیں۔ اور اکثر تربیت یافتہ ثقات قسمن تک ان کے باکمال ہونے پر گنگا اور قرآن اٹھاتے ہیں۔ کوئی ذی عقل سمجھائے تو الٹی آنتیں گلے پڑیں:

خیانت سے مکائد سے دغا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

صحبتِ رندانِ مَے آشام و مہوشانِ نازک اندام

گھٹا کالی کالی دھنک لال لال
کنہیا کے ابرو پہ جیسے گلال

گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ
ہے اُبی دوپٹے میں لچکے گی گوٹ

گلستان عالم میں چھائی گھٹا
وہ آئی وہ آئی وہ آئی گھٹا

سیہ ابر مغرب سے ایسا اُٹھا
میں سمجھا کہ کعبہ کا پردا اُٹھا

آزاد خانہ برباد، مستانہ وار، جھومتے چلے جاتے تھے، کہ ایک کمرے سے آواز آئی، (اتنی ارج موری مان)، ہو ہو ہو تھوڑی تھوڑی پھوہار، سبزۂ نو دمید کی بہار، ننھی ننھی بوندیں۔ ابر طرب خیز نسیم سحری، مشک بیز۔ تڑکے کا وقت، اس صدائے خوش آہنگ کے سنتے ہی میاں آزاد نے اُسی جگہ ایک کیاری میں بستر جمایا۔ پھر آواز آئی، (پیا پیارے اتنی ارج موری مان)۔ اہو ہو ہو واہ، استاد تم تو اپنے وقت کے میاں شوری نکلے۔ کیا تان سین کی قبر کے پیڑ میں ایک پتی باقی نہ رکھی۔ جڑ سے پھنگی تک، سب چٹ کر گئے۔ ہاں ذرا اونچے سروں میں۔ چھڑے چھڑے (پیاں پیارے اتنی ارج موری مان) اتنے میں اس کمرے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اور دس پانچ آدمیوں نے گردن نکال کر میاں آزاد کو دیکھا کہ ایک تھالے میں دو زانو بیٹھے موجیں لے رہے ہیں۔

ایک :۔ حضرت یہ خانۂ بے تکلف ہے۔ بسم اللہ تشریف لائیے! میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دن سے کمرے میں داخل۔ السلام علیکم۔

دوسرا :۔ وعلیکم السلام۔

تیسرا :۔
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں (غالب)

چوتھا :۔ بندہ نواز! ادھر تشریف رکھیے، آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ۶ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔

پانچواں :۔ گستاخی معاف۔ آپ کس طریقت میں ہیں۔

آزاد :۔
از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم
من رسم ایں دیار ندانم مسافرم

چھٹا :۔ کہیے کبھی جام بھی دیکھا ہے۔

آزاد :۔ اے حضرت یہ نہ پوچھیے۔ صبح ارزق ہو، اور جام مروّق ہو۔ شرابِ شیراز ہو، تو عمر دراز ہو :۔

گویند بہشت و حور کوثر باشد — وانجا می ناب وشہد وشکر باشد
پُر کن قدحِ بادہ کہ معلوم نیست — نقدی زہزار نسیہ بہتر باشد

شراب ایک ہے، کوثر کی ہو کہ لندن کی
اک اپنے واسطے زاہد حلال کرتے ہیں

مگر بندہ محروم ہے۔

ایک ادبی محفل کا حال

اب اس جلسۂ احباب اُولُوا الالباب بادہ خوار، مے گسار، بلا کوش، ساغر نوش، سرخوش و مدہوش، جفا کیش دلریش، کی چہل پہل، کا حالِ عبرت مآل، بگوشِ ہوش سنیے! فراخ و وسیع میدان میں، ایک ایوان سپہر توامان ہے۔ چو طرفہ سبزہ روئیدہ، کی لہک، اور گلہائے مشک بیز کی مہک۔ بقول عنایت اللہ خرد آگاہ، نمک ریزی سبزان بہار، ورامشگری مرغانِ چمن زار دمستانہ ردتے، آب رود بار و قہقہہ قدر دانِ خوش رفتار وپائے کوبی

غزالانِ مینا چشم وخفیاگری طاؤسان مرصع دم۔ غرض کہ عجب لطف بہار ہے۔ سرودر بارِ چمن کا چوبدار ہے۔ بستی کے باہر گونی بھر کے پٹے پر باغ ہے۔ جس کے ہر چہار سمت جنگل و دراغ ہے۔ ایوانِ عالیشان کے بیچوں بیچ ایک سجے سجائے کمرے میں بزم طرب آراستہ اور محفلِ سرور پیراستہ ہے۔ چاندنی وہ صاف بچھی ہے کہ چاندنی بھی شرمائے۔ ادر ادھر مئی کی گلابیاں چنی ہوئی ہیں۔ صراحی گردن کشی کر رہی ہے۔ نعلِ آتشیں، خوانِ جواہر روح کے جام منتظر ہیں کہ لب سے ملے۔ ہمارے یارِ طرحدار میاں آزاد نے کہا کہ حضرت ہم غریب الوطن آدمی ہیں۔ ہمیں شرکائے جلسہ کی مختصر کیفیت سے آگاہ کیجیے۔ مالک مکان بول اٹھے، کہ ہم سب اپنی اپنی تعریف کہہ چلیں گے۔ ذرا دَور تو چلنے دیجیے یہ کہہ کر حضرت نے گردنِ شیشۂ پیمانہ پر جھکائی، اور شرابِ ناب اور مصفا اڑائی۔ دور چلنے لگا۔ آب طربناک کا وہ سرور جاکہ سب سیہ مست ہو گئے۔

ایک ؎

آب وگلِ من کہ فیض عام ست | از خطۂ پاک بلگرام ست
سبحان اللہ چہ بلگرامی | کوثر می و آفتاب جامی

لیکن حضراتِ بادہ گسار، اور عشاق زار کا وہاں کال ہے۔ مگر علماء، فضلاء، شعرا، کملا کی ٹکسال ہے۔ اودھ میں لکھنؤ کے بعد پھر بلگرام¹ ہی کا نمبر ہے۔

دوسرے :- بندہ رئیس پنجاب ہے جو تمام عالم میں انتخاب ہے۔

چہ پنجاب انتخابِ ہفت کشور | قسم خوردہ بر خاکش آب کوثر
فضائے نشۂ مستی ہوائیش | زمینی کاسمانہا خاکِ پائیش
غبارش آب ورنگِ چہرۂ گل | گیاہش دلربائے زلفِ سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ | رخ خوباں بہ پیشش خط کشیدہ
بجاکش سایۂ پر ہائے بلبل | جواب یک چمن خندیدنِ گل
بہر شہرش بتانِ گرم بازار | پے سودائے دل عاشق خریدار

---

¹ بلگرام مشہور قصبہ جو علماء و فضلاء کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ مولانا غلام علی آزاد اور بہت سے ممتاز علماء و شعرا اسی سرزمین کے باشندے تھے۔ یہ قصبہ اترپردیش کے ضلع ہردوئی میں واقع ہے۔

تیسرے :- خاکسار کا مسکن و مولد خطۂ مینو سوادِ کشمیر جنت نظیر ہے۔ جو باغِ نعیم سے بھی زیادہ دلچسپ و دلپذیر ہے۔ مرغزارِ نزہت پیرا، سبزۂ طراوت افزا، واللہ عجب گل زمین ہے۔ باللہ رشکِ بہشتِ بریں ہے:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید ۔۔۔ گر مرغ کباب ست کہ بابال و پر آید
از بسکہ کند جذب رطوبت خطرش نیست ۔۔۔ گر کاسۂ چینی ز ہوا پر حجر آید
ایں سبزہ و ایں چشمہ و ایں لالہ و ایں گل ۔۔۔ آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید
بنگر کہ رفیقش چہ سود گوہر یکتا ۔۔۔ جائیکہ حزف گر رود آنجا گہر آید (عرفی)

چوتھے :- سنار ضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ کیا طبقۂ مردم خیز ہے۔ زبان اور لطف بیاں نکتہ رانی اور غزل خوانی، اہلِ لکھنؤ ہی کا حصّہ ہے۔ جو شاعر ہے خدائے سخن، جو نثار ہے کامل فن۔

پانچویں :- گفتگوئے عاشقاں در کار شب
جوشش عشق ست نی ترک ادب

ہمارا اشعار و دِثار صُوفیانِ صافی طینتِ عالی گوہر و راست کردار کا سا ہے عقیدت وطریقت وجُودِ وَحدت پر ہے یعنی ہم وَحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ روزے سے غرض، نہ نماز سے سروکار جو نقطۂ وحدت سے مل جائے۔ اس کی نجات ہے۔ ہم اُس واحدِ حقیقی کے افراد ہیں جس کی وحدت سے اِس عَالَمِ افراد میں یہ کثرت ہے۔ سنو! یقین مانو! وحدتِ عین، کثرت اور کثرتِ عین وحدت ہے۔ عَالَمِ مشاہدہ میں ایک مثال اِس کی دیتا ہوں، جس سے اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ مقولہ نظری ہے۔ بدیہی ہو جائے۔ دیکھو ایک تخم خربزہ ہم نے بویا۔ اُس نے اپنی طبیعت سے اپنے کو ایک پودے اور چند پتّوں میں ظاہر کیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے چند عرصے میں اس نے اپنے تئیں، پھر اپنی اُسی ذات خربزہ میں ظاہر کیا، اور اُسی تخم میں اب دیکھو ایک تخم واحد نے جس میں وحدت ہی وحدت تھی۔ کس قدر کثرت میں اپنے کو جتایا۔ پھر وہی بیج کا بیج۔ چنانچہ ہمارے اِمام ہدایت اور پیشوائے رشاداتِ نکتہ رس، علی الاطلاق حکیم الاشراق، مولوی مولوی و معنوی، قدس سرہٗ الخفی والجلی اپنی مثنوی میں اس مطلب کی طرف اشارہ بہ ایں اشعار فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

نیستاں سے وہی وحدتِ حقیقی کا بن مراد ہے۔ جس سے کٹ کٹ کر ہم بانسریاں ترانہ سنج ہیں:

شب از مطرب کہ وخوش باد ویرا شنیدم نالۂ دل سوز نی را
چناں در جانِ من سوزش اثر کرد کہ بے رقت ندیدم ہیچ سے را

ہمیں کچھ سالک و مجذوب سے مطلب نہیں۔ ہم اپنی لَو اسی سے لگائے بیٹھے ہیں۔ فقہ و حدیث سے غرض نہیں:

جام جم رکھدے طاق کسریٰ پر میرا چلّو شراب سے بھر دے

بھلا اِنَّمَا الخَمرُ وَالمَیسِرُ رِجسٌ مِن عَمَلِ الشَّیطَان۔ قرآن میں آیا ہے۔ مگر یہ ہم لوگوں کے واسطے نہیں ہے اچھا یہ صحیح ہی سہی، وَاِثمُہُمَا اَکبَرُ مِن نَفعِہِمَا۔ لیکن ہمارے پیرِ مغاں اور ہادیِ دوراں دیکھو کدھر جاتے ہیں:۔

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما
ما مریداں و بسوئے کعبہ چوں آہم چوں رو بسوئے خانۂ خمار دار و پیر ما

باقی رہا عذاب و عقاب، نعیم و جحیم یہ فقط شرعی دھڑ کا ہے۔ ع

بہشت اک باغ ہے دوزخ بھی اک شرعی دھڑ کا ہے

چھٹے:۔ کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

صوفی عالی مقام کو ایں جانب کا سلام۔ حضرت آپ کی گفتگوئے عاشقانہ اور کلام صوفیانہ سے طبیعت کو سرور حاصل ہوا۔ یہاں بھی دوزخ اور بہشت کو شرعی دھڑ کا ہی سمجھتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہاں روزہ رکھنا اچھا ہے۔ کشف رطوبات ہوتا ہے۔ مے لعل فام و آتش لباس، ہمارے مشرب رندانہ میں بھی جائز ہے۔

ساتویں: گر بیاید مَلکُ الموت کہ جانم ببرد
بے دوسہ چھینٹا کشی روح رمیدن ندہم

واہ مولانا۔ چوک گئے۔ مولوی معنوی کے شعر کے معنی اچھے حل کیے:

ع، بشنو از نے چوں حکایت می کند

نے سے مطلب بھی سمجھے، خاک نہیں۔ اجی حضرت یہ چانڈو کی نے سے عبارت ہے۔ چانڈو کی نے کی دلی تمنا ہے کہ لوگ ہر دم اسے منھ سے لگائے رہیں۔ جب ہی کہا ہے کہ: ع

ع، وز جدائی ہا شکایت می کند

آٹھویں:۔ صوفی بیا کہ آئینہ صاف ست جام را
تا بنگری صفائی می لعل فام را

راز درون پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

یہ یاران سرِ پل کی بیٹھک ہے۔ یہاں زہاد اور صوفیانِ صافی کا کیا کام۔ جام اور بادۂ گلفام کا ذکر چھڑے۔ یہ حقانی باتیں مزاکرکرا کیے دیتی ہیں۔ والد مرحوم بڑے بے وقوف تھے چپڑ غٹو کر کے ہمیں مدرسے بھیجا۔ اسپلنگ بک بھی ہنوز نہ ختم کی تھی کہ ہم بھاگ کھڑے ہوئے سلیٹ کو کلوار کی بھٹی پر گرو رکھ خوب راسی اُڑائی۔ الغرض صبح سے چار بجے تک ترزبانی اور شعر خوانی، بادۂ انگور حور و قصور، کی چہ می گوئیاں رہیں۔ لطیفے ہوا کیے۔ چار بجے کے بعد حضرت آزاد نے زبان کھولی تو یہ سب بند ہو گئے۔

آزاد:۔ دن رات گفتگو ہے شراب و کباب کی
کیا مُنھ لگوں نے یار کی صحبت خراب ہے

اس صحبت اور جلسے پر خدا کی مار۔ اور شراب خانے پر شیطان کی پھٹکار۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ۔ یارو اخلاق سیکھو۔ آدمی بنو۔ آدمیت کا سبق لو۔ منافع پند احبا و ابرار و مضار صحبت اشرار میں تمیز کرو۔ یہ نہیں تڑکے سے بیٹھے تو بھور ہو گیا۔ شام تک سوائے پیمانہ و میخانہ کے کوئی چرچا ہی نہیں۔ ان بزرگوار کی جمعیت کے صدقے کہ اپنے باپ کو بے وقوف بناتے ہیں۔ واللہ کہتے سچ ہیں۔ یہی تو ان کی بے وقوفی ہے۔ الٰہی توبہ! کیا اشغالِ مزخرف

؎۱ مراد ہیں مولانا جلال الدین رومی متوفی ۶۷۲ھ جن کی مثنوی تصوف کی بلند پایہ کتابوں میں ممتاز ہے۔ مثنوی معنوی کے نام سے مشہور ہے اور چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ (نورانی)

ہیں۔ خدا اپناہ میں رکھے اور صحبتِ بد سے بچائے:

حیف از تو کہ روزی کہ مقیم باغی　　ز بلبل غافل و حریف زاغی
صحبت اینجا موثر ست اگر باشی　　در آب ردی تری در آتش داغی

یہ شراب خانہ خراب نے لاکھوں گھر بلٹائے۔ یہ ہزاروں تاجداروں کو گدائے بینوا بنائے۔ مُنھ لگائی اور مُنھ کی کھائی۔ فلک رفعت تاجروں کو اس نے خاک میں ملایا۔ مہاجنوں کا دوالہ اس نے نکلوایا۔ یا خدا مدد دے، یا خدا مدد دے:

زچوبِ تاک گویا عودِ خود را ساخت ایں مطرب
کہ خوش مستانہ بیروں نغمہ ہا از ساز می آید

ان یارانِ صادق و دوستانِ موافق، یارانِ بادہ نوش و بذلہ سنجان عشرت کوش میں دن بھر تو وہ چہل پہل، قہقہے اور چہچہے رہے۔ سرِ شام سے ناچ رنگ کی دھماچوکڑی مچی خانہ باغ میں جس کے در و دیوار سے صحرائیت برستی تھی، شامیانۂ عیش کا شانہ بصد حشمتِ شاہانہ نصب ہوا۔ یاران سرِ پل بیٹھے رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ گل رخان پری چہرہ، شادیانے بجاتے ہیں۔ طبلے پر تھاپ ہے۔ گت بج رہی ہے۔ حاضرین جلسہ زیر و بم سے واقف، چڑھاؤ اتار کے سمجھنے والے، خوش رو، خوش گلو، کوئی تان سین بنا بیٹھا ہے۔ کوئی بیجو باورا، گردن سب کی ہل رہی ہے۔ اہاہا۔ اہو ہو ہو، واہ واہ واہ، اے سبحان اللہ، اے صدقے قربان جاؤں کیا گلا ہے۔ یہ گلبانگِ توصیف و طنطنہ تعریف ہر سمت بلند ہے۔ ایک بتِ پندار، شوخ و ستم گار نے، یہ غزل عجب لطف و اندازِ برنائی اور شانِ خود آرائی سے ادا کی:

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

اس پر کٹاؤ تھے۔ سب بے خود۔ بے ہوش۔ بے قابو، بے دل، بے صبر۔ سر و پا کی خبر نہیں، یک رِندِ عالم سوز و آزادہ، نغمۂ سنجی کے دلدادہ، نے چومالے کی فرمائش کی۔ کہنے بھر کی دیر تھی۔ سارنگی غضب ڈھانے لگی، اور (مچھریا بند یا لیگیومُور) کی آواز خوش آنے لگی۔ اُدھر مطرب کی ناخن بازی، ادھر خوش الحانوں کی نازک آوازی، بے فکروں کی واہ واہ۔ الحذر۔ خدا کی پناہ۔ کسی سیہ چردہ شیریں حرکات نے خدیو مصرِ سخن

واقف رموزِ ہر فن، عراقیؔ آں جہانی کی یہ غزل گائی اور ہاتھوں ہاتھ داد پائی:

صنمارہِ قلندر سزد ار بمن نمائی | کہ دراز، دور ودیدم رہ ورسم پارسائی
بہ طوافِ کعبہ رفتم زدم ندا برآمد | کہ برونِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ زائی
درِ دَیر چوزدم لن زدروں ندابر آمد | کہ بیابیا عراقی توزِ خاصگانِ نائی

اس کا مطلب تو دو ہی چار سمجھے۔ مگر ٹوپیاں چوطرفہ اُچھلنے لگیں۔ سحر کاذب کے وقت جب پپیہا بولنے لگا۔ اور نسیم سحری مشک و عنبر سے بسی ہوئی، بہشت کی لپٹیں لانے لگی۔ تو کھروے کی فرمائش ہوئی۔ زلفیں پریشان، مست و خوش الحان، سب حاضرین جلسہ شاداں و فرحاں، مگر حضرتِ آزاد آزردہ و گریاں۔ لَاحَول گویاں۔ یہ بے اعتدالی۔ اور بے عنوانی، بحر بے حیائی کی روانی، وطغیانی، دیکھ کران کا دل اس صحبت فسق و فجور سے پھر گیا۔ چہرہ مارے غصہ کے لال بھبھوکا۔ بدن میں رعشہ، مزاج کبھی تولہ، کبھی ماشہ، معلوم ہوتا ہے ایک آدھ کو پھاڑ کھائیں گے۔ یا گھن پٹی بتائیں گے۔ چکت دیا ہی چاہتے ہیں۔ آڑے ہاتھوں لیا ہی چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اُس تخلیے کی صحبت میں ایک خواجہ صاحب کا بھی گذر ہوا تھا۔ اور وہ بے چارے نئے پنچھی تھے۔ میاں آزاد کے بشرے سے تاڑ گئے کہ اس صحبت سے حضرت بہت کبیدہ خاطر ہیں۔ وہ بھی ان سے متفق الرّائے تھے۔ لہٰذا دونوں میں سرگوشی ہوئی۔

خواجہ:۔ یا حضرت! مجرا عرض ہے۔

آزاد:۔ سبحان اللہ

اے وقت توخوش کہ وقت ماخوش کردی

یہ ریش سفید یکمشت و پانزدہ انگشت۔ اور یہ شستہ تقریر، یہ جبّہ و دستار، اور یہ غیر شعار، کہنے لگے مجرا عرض ہے۔ تسلیم، آداب، کورنش بندگی، السلام علیکم، بالائے طاق۔ ناچ ورنگ کا ضلع حفظ ہے۔ واہ ری جگت بازی، استغفر اللہ۔

خواجہ:۔ قبلہ یہ دیکھیے واللہ ہے، کہ میں بھی گھبرا اُٹھا۔ یہ بے حیائی دیکھی نہیں جاتی۔ جو ہے مست۔ جو ہے رند خرابات جو ہے بھکڑ۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ آپ کے چہرے کی رنگت سے بھانپ

عا فخر الدین صمدانی تخلص یہ عراقی متوفی ۶۸۰ھ فارسی کا غزل گو شاعر۔

یا کہ اتنی محفل میں ایک یہ ہمدرد ہیں۔ یہ دیکھیے واللہ ہے، کہ یار لوگوں نے تڑ کا کر دیا۔ مگر آنکھ تک نہ جھپکی۔ دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

آزاد:۔ جی ہاں، اور ابھی کوئی نیک کام کرتے ہوتے تو چراغ جلے ہی سے پڑ رہتے۔ ایک جو سنکنا۔ مگر اس تھرکنے اور چمک دمک کے قربان کہ چار پہر بیٹھے ہی بیٹھے کاٹ دیے۔ اٹھنا دور، ہلنے تک کی قسم ہے۔ ستم ستم ہے۔ دمبدم حقہ چلم پر چلم بھری جاتی ہے۔ خمیرا دوسیر مشکبو، دھواں دھار اُڑ رہا ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں چلی آتی ہیں۔ عطر کی شیشیاں لنڈھائی جاتی ہیں۔ سچ کہوں حضرت! پہلے تو آپ مجرا ایسا بجا لائے کہ میں سمجھا کہ آپ بھی اس چھٹی ہوئی محفل کے چھٹے ہوئے ہیں۔ مگر آپ تو بندے کے ہمدرد نکلے۔

خواجہ:۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ یہ جتنے حضرات نظر آتے ہیں۔ سب شرفا کے صاحبزادے ہیں۔ نصف تو اُمرا کے لڑکے ہیں دال روٹی سے خوش۔ باقی ماندہ مفلس۔ ٹکا کفن کو پاس نہیں۔ مگر بانکپن پر جان دیتے ہیں۔ گھر میں فاقہ ہے۔ رمضان شریف در پر کھڑے ہیں۔ ہر مہینے مرچڑوں کی طرح اڑے ہیں۔ ٹوپی ہے تو جوتا غائب غلم۔ جوتا ہے تو ٹوپی ندارد۔ لیکن اکڑے نکلتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا فلاش معاش سب کی دُم میں رسا لنگوٹی میں پھاگ۔ کبھی رنگ کبھی راگ۔ بھیر دیں ہو، یا اور راگ، امرازادوں کو دیکھیے، واللہ ہے کہ کیا قطع بنائی۔ کیسی وضع بھائی جن کے پاس روٹی کھانے کو نہیں، وہ تحصیل علم سے باز رہیں۔ تو مضائقہ ندارد، مگر ان سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھئی تم پر کون ایسی سختی پڑی تھی کہ کالج چھوڑ بیٹھے۔ عربی پڑھی نہ انگریزی۔ موچی گری کر دگے یا انگریزی جگت بولنے میں سب طاق ہیں۔ ابھی کوئی ضلع بولیے، دیکھیے، واللہ ہے کہ سب کے سب طوطی کی طرح چہچہ زن ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہاں ذرا چھیڑیے تو آپ کو واللہ۔ بس ایک فقرہ چست کر کے چپکے ہو رہیے وہ پرسوں تک بکے جائیں گے۔

آزاد:۔ حضرت مجھے تو ان کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ بس چلے تو کھڑے کھڑے شہر بدر کرادوں۔ ابھی حبس دوام بعبور دریائے شور۔ کا حکم نافذ کروں، یہ ننگِ خاندان پیدا ہوئے ہیں:۔

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار — اگر وقتِ ولادت مار زایند
ازاں بہتر بہ نزدیکِ خردمند — کہ فرزندانِ ناہموار زایند

جلسہ برخواست، تا بہ چاشت، وقتِ درد ہنگام کاشت، پاسِ مرایت بگاہداشت" یہ بے تکی صدا ایک کونے سے آئی۔ طبلچیوں نے بغچہ سنبھالا۔ ڈھاڑیوں نے بوریا بندھنا اٹھایا۔ عابد فریبوں نے ناز و انداز سے قدم بڑھایا۔ صبح کی نوبت بجنے لگی۔ مرغ نے بانگ لگائی۔ شوالے کا گھنٹا ٹھنا ٹھن بجنے لگا۔ موذّن نے مسجد میں اللہ اکبر کہنا شروع کیا:-

منشی سحر ہاتھ میں لیکر قلم زر — لکھنے لگا منصوبی و معزولی لشکر

ے فروسیہ شب کو کیا خارج از دفتر — منصوب ہوا عامل روز اپنی جگہ پر

مہتاب پہ جاری تھا قلم امر و نہی کا — پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

شمع گل پگڑی غائب۔ رند جھٹ سے جا نماز بچھا نماز پڑھنے لگے۔ ایک مسخرے نے اپنے قریب کے یار عیّار کو ڈھکیل دیا۔ تو منھ کے بھل زمین پر۔ دوسرے نے ایک کی کھوپڑی پر چپت جمائی، تو ٹوپی دس قدم پر، تیسرے نے چوتھے کو آنٹی بتائی تو چاروں خانے چت پانچویں نے باآواز بلند کہا:

بنکارو آج خوب چلو میکدہ کو ذوقؔ — چھوڑو کہیں وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

ایک اور بادہ گسار نے دیکھا کہ وہ سب مڑی رہے، ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں۔ فرمایا:

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

چلیے حضرت اللہ میاں پر احسان کر چکے۔ نماز پڑھی یا نہ پڑھی۔ وضو کر کے مستعد تو تھے۔ اَلْاَعْمَالُ بالنّیات۔ پھر خوف کاہے کا ہے اور بھئی نماز چاہے ایک نہیں پچاس بار قضا ہو جائے۔ نماز خفتن پڑھ لیں گے، چلو چھٹی ہوئی میاں آزاد کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا کہ یہ سَوادُ الوجہِ فی الدنیا حضرت قادر ذوالجلال سے بھی نہیں چوکتے۔ نماز میں بھی دل لگی عبادت میں مسخرہ پن۔ خاصے لچے ہیں:-

اے فسق و فجور کار ہر روزۂ ما — دے پر ز حرام کاسہ و کوزۂ ما

می خندد روزگار و می گرید خلق — بر طاعت دبر نماز و بر روزۂ ما

خواجہ:- یہ دیکھیے واللہ ہے کہ یہ مرتد رحمت رب سے محروم رہیں گے اپنے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔

آزاد:- بندہ پرور گستاخی معاف۔ یہ تکیہ کلام تو چھوڑیے آپ ایک جملہ بولتے ہیں، تو تین سو پینسٹھ (یہ دیکھیے واللہ ہے) کوئی فقرہ (یہ دیکھیے واللہ ہے) سے خالی نہیں۔ یہ بری عادت

ہے۔

خواجہ:- یہ دیکھیے نہیں۔ توبہ توبہ مگر یہ دیکھیے واللہ ارے! پھر وہی فقرہ نکلا۔ مگر واللہ اس جوڑ توڑ کے قربان ۳۶۵ کی بہت ہوئی سال میں ۳۶۵ ہی دن ہوتے ہیں۔

میاں آزاد اس صحبت رندان می آشام سے ایسے ناراض ہوئے کہ بلا رخصت بھاگ گئے اجی حضرت سنیے تو سہی، سنیے تو سہی۔ واسطے خدا کے پیچھے پھر کے نہ دیکھے تو جنت سے نکالا جائے وہ سنتے کس کی ہیں۔ یہ جا وہ جا۔

برات کی دھوم

ایک رئیس گردوں مدار دامیر باوقار کی ایک دختر، فرخندہ اختر تھی رئیس موصوف نے اس کو بہ ناز و نعم پالا۔ جب لڑکی کچھ سیانی ہوئی تو اس کی شادی کی فکر پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے نام بر آوردہ، روسائے ذوالاقتدار کے یہاں سے پیغام آنے لگے۔ دور، دور تک اس کے حسن وجمال کی شہرت ہوئی، آخر کار ایک رئیس والاتبار وجم اقتدار کے ساتھ نسبت قرار پائی پھر کیا تھا طرفین سے تیاریاں ہونے لگیں۔ اب شوق کی اس درجہ افزائش ہے کہ جی چاہتا ہے سب جمع جتھا لٹا دیں۔ آنکھ بند کر کے خرچنے لگیں۔ ایک نے اسّی ہزار روپیے قرض لیے، دوسرے نے تعلقے کے کوڑے کیے۔ دونوں لنگوٹی میں بھاگ کھیلنے لگے۔ جوڑے بنے۔ خدمت گاروں، ماماؤں اصیلوں نوکروں چاکروں نے بیش بہا جوڑے بھڑکائے۔ خوب انعام وخلعت پائے برات کے دن بڑے کرّوفر سے برات سجی گئی۔ دونوں طرف خوب ٹھاٹھ تھے:-

الماس کے واں تھے جھاڑ وفانوس — یاں جلوہ فروش تخت طاؤس
مہتاب سے چاندنی کا واں فرش — یاں چرخی سے چرخ میں سرِ عرش
گلگوں تھا کسی کا بادرفتار — گلرنگ کسی کا تھا ہوا دار
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دھت تھی — گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی
وہ ماہ کہ تھا سوارِ شبدیز — تھا پابرکاب شوقِ مہمیز

سب سے پہلے نشان کا ہاتھی شب رنگ، مست، صورت دیکھے انسان ڈر جائے۔ اس کے بعد بڑی دور تک جلوس کی بہار، اور سانڈنیوں کی قطار تھی۔ عربی، ترکی، تازی، دبلا کیپ انواع واقسام کے رہوار بادرفتار خوش خرام دتیز گام، ساز دار، سجے سجائے۔ پرے کے پرے

جائے چاندی کا گہنا پہنے دُلھن کی ایسی صورت بنائے چھم چھم کرتے چمکتے جاتے ہیں۔ آرائش کے تخت بڑے صناعانِ چابکدست کے بنائے ہوئے لطف جلوس دو بالا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گلزار ارم کے پھول پھولے ہیں۔ سرو بنایا تو نقل کو اصل کر دکھایا۔ چانڈو بازوں کا تخت قابل دید تھا۔ کوئی نشے میں جھوم رہا ہے کوئی نٹے چوم رہا ہے۔ کوئی گرمٹ تھامے غین ہے۔ کوئی کنارا چوستا ہے۔ بعینہ چانڈو خانہ کی تصویر کھینچ دی۔ خربزے کا پتلی کا تخت، رہس منڈل دیکھنے سے دل کو سرور ہوتا تھا۔ سواروں کا تخت ستم ڈھاتا تھا۔ سوار خاکی وردیاں پہنے کرچ لٹکائے، گھوڑے کی باگ اٹھائے، دھاوا بولا ہی چاہتے ہیں۔ قدم قدم پر آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ انار آسمان کی خبر لاتے ہیں۔ پھلجھڑی کی تعریف میں اچھے اچھے آتش زبانوں کی زبان لال ہے۔ چرخی کا چرخ دیکھ کر عقل چرخ تھی۔ کامل فن آتش بازوں نے بڑی دلسوزی سے آتش بازی بنائی تھی۔ انار سے تختۂ زمردیں نظر آتا تھا۔ باجے والوں کی جماعت، ڈُہل کی دھوم، تماشائیوں کا ہجوم، گوروں کی لال لال وردیوں سے گل لالہ کھلا تھا۔ تلنگوں کی کالی کالی کرتیوں سے، حاسدوں کا مُنھ کالا تھا۔ ایک سمت چوبدار عصائے نقرئی لیے پگڑیاں جمائے گھوم رہے تھے۔ دوسرے سمت خاص بردار رنگین جھنڈیاں اٹھائے، پھرتے تھے، رئیس، شریف، عائد، لاتعداد، غیر محدود تھے جملہ سامان لطف و مذاق موجود تھے۔ نوشہ حسین ومہ جبین خلعت بیش بہا زیب تن، کیے بصد طنطنہ و دبدبہ گلگون، خوش عنان پر سوار تھا۔ گھوڑا ایسا شایستہ کہ دودھ پیتا بچّہ تک سوار ہو جائے۔ پاؤں کی مہندی نے دلھن بنا دیا تھا:

سپیت کہ حنا زیب فزای تن اوست   کو ہیست کہ لالہ زار در دامنِ اوست
نے نے غلطم کہ آسمان و گرزست   در رنگ حنا شفق بہ پیراہن اوست

نوشہ کے گھوڑے کے بعد کئی ہاتھی تھے۔ مکنا اور اک دنتا اور دُم کٹا اور پاٹھا ان پر دس دس، بارہ بارہ، چودہ چودہ، برس کے لڑکے سوار تھے۔ بیٹھے ہاتھی پر ہیں، نظر کمروں پر ہے۔ ڈوڈو چوچیں لڑتے چلے آتے ہیں۔ الغرض خوب چکر کھا کر، اور سوتوں کو جگا کر برات دلھن کے مکان سے تھوڑی ہی دور پر تھی کہ آتشبازی سے ایک ہاتھی بھڑکا' دوسرے نے اس کا ساتھ دیا۔ فیلبان لاکھ تدبیریں کرتا ہے۔ آنکس پر آنکس لگاتا ہے مگر وہ بُری دھت میں ایک نہیں سنتے۔ تیسرا ہاتھی لپکا تو ایک بڑھیا کچل گئی۔ ایک پنشاخہ والا پس گیا۔ دس دکانیں تہ و بالا ہو گئیں۔ گھبراہٹ اور بدحواسی سے پندرہ بیس آدمی زخمی ہوئے۔ اتنے میں آرائش

لٹنے لگی۔ ہلڑ ہو گیا۔ برقندازوں کی ایک نہیں چلتی۔ آدھے تخت لٹ گئے چھ ٹوپیاں اُتر گئیں۔ تین لڑکوں کا زیور اچکوں نے ہتھیا لیا۔ ایک کا کان کٹ گیا۔ چلو ناک تو بچی۔ مبارک بادے خدا خدا کر کے دُلھن کے مکان پر برات پہنچی:

در تک جو برات اُدھر سے آئی — کی سب نے ادھر سے پیشوائی
باران گلاب و بارش گل — ہو کر بڑھے آگے با تجمّل
قلیان پئے مشکبو دھواں دھار — بیڑے چکھے پان کے مزیدار
جب عقد کی ان کی ساعت آئی — دو رشتوں میں اک گرہ لگائی
زلفیں ہوئیں چہرے کی بلا چین — ٹونا دہ، نگاہیں سحر آگیں

میاں آزاد گھنٹوں یہ کیفیت چپکے چپکے دیکھا کیے، اور یہ سوچنے لگے، کہ اس قدر زر کثیر بیوجہ، بلا سبب مفت، بیکار، ضایع ہوا۔ اور ہزاروں روپیے غارت کیے۔ اگر یہی زر خطیر امورِ رفاہ عام اور فائدہ انام میں صرف ہوتا تو سبحان اللہ! افسوس صد افسوس کہ ہندی اس آرائش پر لٹّو ہیں۔ ہم نے کہیں سنا ہی نہیں کہ، اس فضول دھوم دھام سے کسی ملک کو فائدہ پہنچا ہو:

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے — بھاگو بھاگو کہ خوف بس راہ میں ہے
جاگو جاگو یہ خوابِ غفلت کیسا — دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

یہ ٹھٹے کی برائیں اور یہ دھوم، یہ رسوم مذموم، درد انگیز، حسرت خیز ہیں مگر اہل ہندان ہی کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ وہ اسی کو بڑا عروج سمجھتے ہیں، کہ تمام عمر کی آمدنی ایک برات کی نذر کر دیں۔ دو گھڑی کی واہ واہ اس کے بعد حالِ تباہ، عیاذاً باللہ۔ شادی کو غم سے مبدل کرنا کون دانائی ہے۔ لیکن حیف صد حیف کہ ان امور پر نظر ہی نہیں ڈالتے۔

لکھنؤ کا محرم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیرِ غم چلتے ہیں — رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیاد — دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے مٹر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے۔ اور سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیں

ہیں کہ گھر گھر شیون و شین، گھر گھر بکا و بین، گریہ و زاری۔ اشکباری، جمِ غفیر، مجمع کثیر، ایک جلے تن بول اٹھے اور کیوں نہ ہو، مجالسِ عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری، از شام تا دم، مشہور ہر مرز بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے۔ اور ان سب میں حسین آباد مبارک کا بدر فی النجوم ہے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی ہو لیے تھے۔ ان کی بےقراری کا حال کچھ نہ پوچھیے، وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے۔ لوٹے جاتے ہیں، کہ شہید کربلا کا واسطہ، آلِ مصطفٰے کا صدقہ، ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں، لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم[1] کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوئے اوج طور بھی غش کر جاتا، بانکوں کی شمشیر دو پیکر، جب دیکھو میان سے دو انگل باہر۔ کسی نے ذرا تیکھی چتون کی، اور انھوں نے کھٹ سے سرو ہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹے میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھم دھکا، وہ بھیڑ بھڑکا، ہوتا تھا کہ واہ جی واہ۔ انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذرِ حسین نہیں نکالتا ہے۔ اب انیس ہیں نہ دبیر مونس[2] ہیں نہ مشیر۔ ضمیر ہیں نہ دستگیر:

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا گل جس نے دیکھی نہ خزاں — وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیر مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے واللہ خدائے سخن تھا سرِ ممبر:

جب قفلِ دہن کھلا جواہر نکلے — گویا کہ زبان کلیدِ گنجینہ ہے

ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجۂ حیرت میں غرق ہو گئے۔ کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت:

مداح امیر ابنِ امیر آتا ہے — دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاقِ سخن، خلق چلی آتی ہے — لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

---

[1] پیا جانِ عالم اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کا عوامی لقب ہے۔
[2] مونس۔ میر خلیق کے بیٹے، میر انیس کے چھوٹے بھائی۔ یہ بھی مرثیہ گو شاعر تھے۔

ورانیسؔ مغفور کو خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے، قند و نبات کے ریزے، نور کے مرثیہ ہیں۔

ع۔ جوہر شناس ہے تو انھیں موتیوں میں تول

فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیسؔ کجا فردوسی، کجا کمربند مرصع کجا شال طوسی، بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ:

مضمونِ انیسؔ کا نہ چربا اترا
اترا بھی تو بگڑ کر نقشا اترا
نقّاش نے سو طرح کی خفت کھینچی
تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ اب کہیے کہاں کی سدّھیاں ہیں۔ نجفِ اشرف، کربلا کاظمین، میر باقر کے امام۔ اڑے جو پٹیاں۔ جہاں چلو داخل حسنات ہو۔ واللہ بہشت کی بھی کیا سیدھی راہ ہے:

دربارِ جنابِ مصطفےٰ کو دیکھا
ان آنکھوں سے شانِ کبریا کو دیکھا
فردوس میں پہنچے جو نجف میں پہنچے
جنت دیکھی جو کربلا کو دیکھا

رنگ رلیاں مناتے پو قدمے چلے جاتے تھے، راہ میں وہ بھیڑ، وہ ریل پیل، کہ عیاذاً باللہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بعد خرابی بصرہ کہیں گذر پائے، تو ضیق النفس ہو جائے بانکے ترچھے تیکھے؛ مقامات مقدّس کس و ناکس، غریب و امیر، برنا و پیر، امڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج مومن پاک، مثلِ کعبہ سیاہ پوش۔ کوئی ماتم حسین میں برہنہ سر چلا جاتا ہے۔ کوئی حُلّہ پوشان بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔ حسینانِ عنبریں مو اور مہ جبینانِ قوس ابرو کی مستانہ چال، ماتمی پوشاک، بکھڑے ہوئے بال، واہ واہ ناز۔ وہ نگاہِ غلط انداز، وہ چھپ چھپ کر کترا جانا، کبھی لجانا، کبھی مسکرانا۔ بے فکروں کی سو سو چک پھیریاں۔ تماشائیوں کی زور آزمائیاں۔ عاشق تنوں کی گھاتیں۔ رمز و کنایہ کی باتیں۔ دیہاتنیں، گنوارنیں، بینڈی لگائے پھریا پھڑکائے، گوند سے پٹیاں جمائے، حیرت سے باہم چہ میگوئیاں کر رہی ہیں:

اری دیدی تنک مہکا بتا دے
یہ کندیلیں جو لٹکت ہیں یہ ذرماں

حسین آباد تو پھر پھر ہے بیکنٹھ   برت ہے یاں دیا لکرن کے گھر ماں

لیجیے آغا باقرؔ[1] کے امام بارہ میں کھٹ سے داخل۔ اوہو ہو ہو خدا کی قدرت مجسّم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو۔ نام کر گئے چکا چوند کا عالم ہے۔ لیکن گلی تنگ، تماشائیوں کی عقل دنگ۔ ع جائے تنگ ست مرد ماں بسیار :۔ مگر خلقت گھس پیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے، آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے جو طرّارہ بھرا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیرِ فرتوت دقیانوس کے ہم عصر بیٹھے، اگلے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کمہار بڑے نادرہ کار ہیں۔ ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منھ سے اب بولا اور اب بولا۔ وہی سَن کے سے بال۔ وہی سفید بھویں۔ وہی چیتون، وہی پیشانی کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھرّیاں، وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا۔ واہ رے کاری گر، تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ اور تیر ا بڑھوا تو اللہ ہی اللہ۔ وہاں سے جو چلے تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑہ میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پردہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر، وہ دیکھ پاتا تو مارے غیرت کے بحر ظلمات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے۔ اہلکارانِ سلیقہ شعار تے الائچی، چکنی ڈلی، پیش کش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضواں۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغِ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرامگاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا۔ دُلہن کا ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے موفور۔ تو منار نورٌ علیٰ نور۔ حیرت تھی کہ یہ کوہ ہے یا شعلہ طور ہے۔ سُرخ قندیل پر یاقوت احمر ہیرا کھائے۔ چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے۔ پھر نہر مصفّا جو نظر آئی، تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی :

منوّر ہمچو چشم تیز بیناں   مصفّا چوں دلِ خلوت گزیناں

رسیدہ عمق اوتا گاؤ ماہی   نمودہ ہمچو عینک در سیاہی

---

[1] آغا باقر لکھنؤ کے ممتاز رئیس تھے، ان کا بنوایا ہوا امام باڑا بہت مشہور ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کی مجالس میں اپنے نو نصف مرثیے پڑھے ہیں۔ یہ امام باڑا بہت قیمتی سامان سے آراستہ رہتا تھا۔

پئے کسب لطافت آب حیواں　　　　در وکشتہ چو دُردِ ازتہ نشیناں

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے

یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

اب ان کے دوست کو شوق چرّایا، کہ اربابِ نشاط کے امام باڑوں کی زیارت کریں تو میاں میاں آزاد جھجکے۔ اے حضرت خدا خدا کیجیے۔ بندہ ایسی جگہ نہ جانے کا، اپنی وضع کے خلاف ہے۔

دوست : بھئی واللہ کتنے روکھے پھیکے آدمی ہو۔ اے میاں حیدر کی نازک آوازی، مشتری کی جادو طرازی، گوہر کی چمک دمک آبادی کے رخِ انور کی جھلک سے کانوں کو سرور آنکھوں کو نور، نہ حاصل ہوا تو لکھنؤ کا محرم کیا خاک دیکھا۔ اور پیر مرشد خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے، کہ انھیں دس دن تو مزے سے جہاں چاہیے جائیے۔ رنگین کمروں پر دوگال ہنس بول آئیے۔ بچّے اور بوڑھے سب پہنچتے ہیں۔ مضمون واحد ہے۔

آزاد : یہ کہیے تو خیر۔ چلیے بندہ بھی لہو مل کر شہیدوں داخل ہو جائے۔ پہلے گوہر کے یہاں پہنچے۔ اللہ اللہ دماغ عرش بریں پر ہے۔ اچھے اچھے رئیس زادے فخریہ مصاحبت کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مالدار جوہری صاحب مٹکتے ہوئے آئے۔ دس روپیہ کی کارچوبی ٹوپی، زیبِ سر، فالسی، طلس کا فوق البھڑک دگلہ، زیب بر، سنہری لیس ٹکی ہوئی۔ یک رنگ جوڑا۔ خاصے مرغِ زرّیں بنے ہوئے۔ خدمت گار کے کاندھے پر زرنگاری دوشالہ۔ یہ وضع یہ قطع مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے۔ بیٹھے تو ضریح کی طرف پشت کر کے۔ صاحب خانہ نے ایک عجیب ادائے دلربا سے جھڑک دیا۔ اے واہ بڑے خوش تمیز ہو۔ ضریح مبارک کی طرف پشت سیدھے بیٹھیے آدمیت کے ساتھ۔

جوہری : ماجلاّ (معاذ اللہ) بیوی مجھے بیٹھ نہیں آتا۔

میاں آزاد نے چپکے سے دوست کے کان میں کہا۔ لاحول ارے میاں یہ بابا اینہمہ ٹیم ٹام گھڑکے گئے۔ اور ذرا چیں بجبیں نہ ہوئے۔ پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

دوست : بھائی جان! گوہر جان، لکھنؤ شان، لکھنؤ آن بان، لکھنؤ روحِ رواں، لکھنؤ ہے۔ رگ رگ میں شوخی:

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام　　　　قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ایسا خوش قسمت کوئی ہو تو ہے، کہ اس بتِ عربدہ جو کی گھڑکی سہے۔ حاضرین ادب سے گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔ جسے دیکھو وزدیدہ نگاہ سے محوِ نظارہ بازی ہے۔ لیکن رعبِ حسن سے بات کرتے کلیجہ لرزتا ہے۔

غرورِ حسن اجازت مگر ندادائے گل　　　که پرسشی بکنی عندلیب شیدا را

یہاں سے درد کی طرح اُٹھے تو فرنگی محل میں حیدر جان کے یہاں پہنچے:

نکلے خیمہ سے جو ہتھیار لگائے عبّاس　　　چڑھکے رہوار پہ میدان میں آئے عبّاس

اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے، سارنگ کی مانجھ میں ادا کیا کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیوں کا نام ہے۔ اوہو، ہو، ہو، کی صدا ہر درو دیوار سے بلند تھی۔ واللہ کیا پیارا گلا پایا ہے۔ میاں آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔

اب پھدک کر بی منجھو مشتری کے کمرے پر پہنچے۔ ان کی لفاظی ان کی جادو طرازی، ان کی خوش بیانی، ان کے طرزِ سوز خوانی کی دھوم ہے۔ اربابِ صافی مذاق کا ہجوم ہے۔ کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں:

ع۔　خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبر پہ چل گیا

اس کو جھنجھوٹی کی دھن میں اس لطف سے پڑھا کہ سامعین سر دھننے لگے۔

دوست: کیوں یار کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے؟

آزاد: لاحول ولاقوۃ تم بالکل ہی گنوار ہو۔ ماتم میں زیور کا کیا ذکر، گورے گورے کانوں میں، کالے کالے کرن پھول۔ ہاتھوں میں سیاہ سیلی بس کافی ہے:

سیاہ سیلی بدست آں نگاری　　　بشاخِ صندلی پیچیدہ ماری

لیکن یہ سادگی بھی عجب لطف دکھاتی ہے۔ چلیے ذرا مجالسِ عزا کا رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھیں۔ نواب باقر حسین خاں بہادر اور داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم اور جناب سید العلماء مہرِ سپہرِ شرع و دینداری سید ابراہیم صاحب، اور جناب آغا علی خاں صاحب سابق ناظم کی مجلسوں میں گئے۔ ماتم دارانِ جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا اور زائرینِ مصائب خامسِ آلِ عبا کی اشکباری اور گریہ وزاری سے یقین کامل ہو گیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔ عاشورا کی رات تو نچوڑ کا دن تھا۔ آزاد نے لکھنؤ کے محرم کا خوب لطف اٹھایا:

اَلوِدَاع اے اشکبارو اَلوِدَاع　　　آخری یہ شب ہے یارو اَلوِدَاع

عشرۂ ماہِ عزا کا ختم ہے ‏ ‏ سر کو پیٹو اور پکارو الوداع

جدھر جاتے ہیں آواز گریہ وزاری۔ جسے دیکھتے ہیں صرفِ اشکباری رات تو زیارت میں بسر ہوئی :

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی ‏ ‏ پنہاں درازی پر طاؤس شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زُہرہ لقب ہوئی ‏ ‏ مجنوں صفت قبائے سحر چاک جب ہوئی (انیس)

یعنی عاشورہ کے دن پو پھٹنے کے وقت تعزیہ نکلے۔ رانگے کا تعزیہ، جو کا تعزیہ، موم کا تعزیہ۔ کھیلوں کا تعزیہ، روئی کا تعزیہ، پیپل کے پتوں کا تعزیہ، انڈوں کا تعزیہ، نوگزہ تعزیہ، لاکھوں تعزیے تالکٹورے کی کربلا میں دفنائے جاتے ہیں۔ ارباب نشاط برہنہ سر، برہنہ پا، سیاہ ماتمی پوشاک نے ان کے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا لیکن :

رومال نہ اشکوں سے بھگونے پائے ‏ ‏ منھ آب گہر سے بھی نہ دھونے پائے
کیا جلد ہوا ماہِ محرم آخر ‏ ‏ جی بھر کے حسین کو نہ رونے پائے

تندرستی ہزار نعمت ہے

لکھنؤ کے محرم کی چہل پہل۔ علم اٹھانے والوں کا زور، اور بل، امام باڑوں کی تیاریاں صناعوں کی گلکاریاں۔ نازک اندا موں کی بہار جوانی، صادق علی خاں کی سوز خوانی۔ اربابِ نشاط کی بناوٹ، دکانوں کی سجاوٹ، تنبولیوں کی سرخروئی، دلبر میوہ فروش کی دلجوئی، تعزیہ خانوں کی دھوم، تالکٹورے[1] کی کربلا معلیٰ کا ہجوم، حسین[2] آباد مبارک کا نور، نجف اشرف کا لطفِ موفور، ماتم دارانِ سید الشہدا کی گریہ وزاری، مومنوں کی اشکباری، دیکھ کر حضرت آزاد بادلِ شاد طاؤس مست کی طرح جھومتے چوک[3] میں آنکلے۔ دیکھتے کیا ہیں

---

[1] تال کٹورہ لکھنؤ کے جنوب مغرب میں واقع وہ مقام ہے جہاں فرقہ شیعہ تعزیے دفن کرتے ہیں۔ یہ کربلا تال کٹورہ کے نام سے مشہور ہے۔

[2] حسین آباد لکھنؤ کا مشہور محلہ ہے۔ جہاں محمد علی شاہ کا بنوایا ہوا خوبصورت امام باڑہ واقع ہے۔

[3] لکھنؤ کا قدیم بازار جو اکبری دروازہ اور گول دروازہ کے درمیان واقع ہے اور اپنی کئی خصوصیات کے باعث مشہور ہے۔

کہ پندرہ بیس کمسن لڑکے جزدان لٹکائے، سلیٹیں دبائے، پرے جمائے، پو قدمے آتے ہیں۔ پندرہ پندرہ، بیس بیس، برس کا سن، اٹھتی جوانی کے دن، مگر کمر بہتر جگہ سے خم، جیسے تیغ ریختہ دم۔ گالوں پر پکے پل کے بڈھے کی طرح جھرّیاں۔ آنکھیں گڈھے میں دھنسی ہوئی منھ پر ہوائیاں چلنا محال ہے۔ یا الٰہی یہ جھکا ہوا سینہ، یہ شانے، یہ ڈنڈ اور تین کانے، اس نئی جوانی میں قبلہ پیری و صد عیب بن بیٹھے۔ پیرانہ سالی میں تو شاید اٹھ کر پانی پینا بھی وبال جان ہو جائے گا۔ بڑھ کر:

پوچھا تم لوگ خیَل کے خیَل　　آتے ہو کدھر سے صورت سیَل

میاں صاحبزادو ہمیں اس وقت واللہ حیرت ہے۔ کہ عنفوانِ شباب اور کمزوری۔

طالب علم: یہ بے چارے طاقت توانائی اور کس بل کس کے گھر سے لائیں۔ زور دوا تو ہے نہیں، کہ عطّار کی دکان پر جائیں۔ دُعا نہیں کہ کسی شاہ جی سے رجوع لائیں۔ ان کی تو جان عذاب میں ہے۔ دس برس کے سن میں تو بیوی چھم چھم کرتی ہوئی گھر میں آئیں۔ چلیے اسی دن سے پڑھنا لکھنا چھپر پر رکھا۔ نظارہ بازی کا سبق نوک زبان کیا۔ جب دیکھیے چاہتی بیوی کے مُصحَفِ رخ پر نظر ہے۔ نئی دُھن ہے۔ کچھ اور ہی اڈھیڑ بن ہے۔ تیرھویں ہی برس ایک چھوکری کے باپ یا چھوکرے کے ابّا جان ہوئے۔ فکرِ معاش نے دامن پکڑا۔ کھلائی، دائی، ماما چھوچھو، کی فکر ہوئی۔ یہ دبلے پتلے نہ ہوں تو کون ہو۔ اس کو بھی جانے دیجیے۔ ورزش سے طبیعت نفور، ڈنڈ مگدر سے منزلوں دور، کشتی سے اجتناب۔ غذا مقوّی نہیں، طرز معاشرت بھونڈا۔

میاں آزاد اس تقریر پُر تنویر سے باغ باغ ہو گئے۔ دل میں سوچنے لگے کہ ہائے ان کی جوانی کیسی برباد جاتی ہے۔ اس رو میں کہیں حضرت گنج، دلکشا، سکندر باغ کی طرف نکل گئے۔ دیکھتے کیا ہیں ایک فرح بخش و نزہت انتما دلکش و خوشنما، بنگلے میں دس دس پندرہ برس کی انگریزوں کی لڑکیاں، اور لڑکے، صاف ستھری پوشاک زیب تن کیے ہوئے۔ کھیل رہے ہیں۔ سب سیم بدن غنچہ دہن۔ ایک پیڑ کی ٹہنی پر جھولتا ہے دوسرا دیوار کو رہوار بنائے مزے سے اس پر دندناتا ہے۔ ٹخ ٹخ ٹخ دس بیس، دو دو میل سے رپ رپ کرتے آتے ہیں۔ چار پانچ گیند کھیلنے پر لٹو ہیں۔ ایک مقام پر دیکھا کہ رسّی کا سرا ایک لڑکے نے ادھر اور دوسرے لڑکے نے ادھر سے لیا، اور کئی فٹ زمین سے بلند کیا۔ اور ایک پیاری

لڑکی بدن تول کر زمین سے اس پار اچک گئی۔ دوسری طرف سے ایک لڑکا جھپٹ کر کئی گز رسی سے اونچا کود گیا۔ کوئی دوڑتا ہے، کوئی کرکٹ کھیلتا ہے۔ سب صحیح و تندرست خوش و خرم دوڑ دھوپ میں طاق۔ جس سڑک پر جاتے ہیں اور جس طرف بار پاتے ہیں۔ یہی تماشا۔ اس وقت حضرت آزاد نے ان ہونہار لڑکوں، اور گل اندام لڑکیوں، کو دل سے دعا دی۔ اور ہندوستان کے ادبار پر لاحول پڑھتے ہوئے گھر آئے۔

امیرزادوں کو فکر معاش اور نوکری کی تلاش

ساقیا مے ہلا کے ٹھلیا دے　　سوندھی مٹّی کی بھر کے کلھیا دے
ساقیا تجھ سے التجا یہ ہے　　سچ جو پوچھے تو مدّعا یہ ہے
گھول کر اک ذری پلا افیون　　تا کہ پھر نشے میں گٹھے مضمون
خنظ اُٹھایا بہت مسہری کا　　اب تماشا دکھا کچہری کا

میاں آزاد صبح منھ اندھیرے تاروں کی چھاؤں میں بستر استراحت سے اٹھے معًا دل میں ٹھان لی۔ چلو بھائی ادھر ادھر کے تو خوب سیر سپاٹے کیے۔ اب ذری عدالت اور کچہری کی بھی دو گھڑی سیر کر آئیں۔ پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لق و دق باغ ہے اور سہانی چھاؤں میں میلا سا جمع ہے کوئی حلوائی سے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ کہیں خوانچے والا بیٹھا ہے۔ (گلابی حلوا سوہن) مدار یے حقے ایک سمت تازے کیے جاتے ہیں۔ وہ تڑاقا کے واہ واہ۔ میں آ تو آ۔ یہ آدہ آ۔ آدمیوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ بیسیوں منشی متصدّی چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے ہیں۔ مستغیث ہیں کہ ایک ایک کے پاس دس دس جھرمٹ کیے بیٹھے قانون چھانٹ رہے ہیں۔ (ارے منشی جی یو کا انٹ سنٹ چنگھٹیاں سی کھچائے دیھو۔ ہم تو آپن مجمون بتا دت ہیں آؤ تم اپنے اڑھائی چاول الگے چورا دت ہو۔ ے مور منسی جی تنک اُس سوچ بچار کر لکھو تا کہ پھر یک ثانی کیا، مکدمہ ڈھسمسائے جائے، تو ہار گوڑ دھرت ہے۔ دوہی کچّا اور ے لیو) یہ زبان سنتے ہی میاں آزاد ہنس پڑے۔ گواہ گھر کی طرف جو رخ کیا تو سبحان اللہ۔ سبز مندیلیں اور فوق البھڑک چُغے ہی چُغے نظر آتے ہیں۔ دکلا اِدھر اُدھر بیٹھے مقدمے چکار رہے ہیں۔ ہیں تو میرزا منشی، لیکن یہ چکوتا کیسا اِدھر اُدھر دیکھا۔ یار نہ غمگسار، نہ کوئی ہاں ہوں سے شریک، نہ کوئی پرسان حال، اکیلا باؤلا مثل

مشہور ہے، پیچھے پھر کر دیکھا۔ کہ ایک دوست کھڑے گلوریاں بنوا رہے تھے۔ جان میں جان آئی۔ مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ فرط ابتہاج سے بول اٹھے۔ کہ اے حضرت! ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں، آخاہ آپ ہیں؟ آیئے۔ کہاں بھول پڑے۔ جی یوں ہی چلا آیا۔ دوست نے کہا آیئے کچہری کے اندر چلیے۔ دو قدم بڑھے تھے، کہ چپراسی نے کڑک کر آواز لگائی۔ سیتا بیگ حاضر ہے! ایک افیمی کے پاؤں لڑکھڑائے۔ سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے۔ یا علیؑ ایک ٹھٹول نے کہا۔ واہ قبلہ دیکھیے یہ شرط نہ تھی۔ گرے تو، مگر بندہ درگاہ سے پوچھ نہ لیا۔ اٹھے تو یار لوگوں نے گرد جھاڑ دی۔ اتنے میں ایک اپرینٹس (امیدوار) اور آیا اور کرسی پر ڈٹ گیا۔

امیدوار : کہاں سے آنا ہوا۔

دوست : جی اسی شہر میں رہتا ہوں۔

امیدوار : کچہری میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں ہے۔ ہمارے کمرے میں سے آپ جایئے۔ ورنہ چپراسی کو آواز دیتا ہوں۔

دوست : بگڑیے نہیں بس صرف یہ تو بتا دیجیے، کہ آپ کا عہدہ کیا ہے؟

امیدوار : ہم امیدواری کرتے ہیں۔ تین مہینے سے روز یہاں کام سیکھتے ہیں۔ اب فراٹے اڑاتا ہوں۔ آٹھوں گانٹھ کمیت، ڈاکٹ تڑ سے لکھ لوں۔ نقشہ چٹکیوں میں بناؤں۔ کسی کام میں بند نہیں۔ پندرہ روپیہ کی اسامی، ہمیں صبح و شام ملا ہی چاہتی ہے۔ مگر پہلے تو واللہ گھانس چھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا، اب بقراط بن گیا۔

آزاد : کیوں میاں صاحبزادے تمہارے والد کہاں نوکر ہیں۔

امیدوار : نوکر؟ توبہ توبہ کیجیے۔ وہ دس گاؤں کے زمیندار ہیں۔

آزاد : کیا تم کو گھر سے نکال دیا یا عاق کر دیا۔ یا کچھ کھٹ پٹ ہے؟

امیدوار : ہم ہونہار لڑکے ہیں۔ اس سن میں نوکری کی فکر ہوئی۔

آزاد : حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے، تو مضائقہ ندارد۔ تم خدا کے فضل سے خوش و خرم، مرفہ حال، فارغ البال، زمیندار روپیہ والے ہو۔ تم کو یہ کیا سوجھی کہ دس پانچ کی نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہو۔ اسی سے تو ہندوستان خراب ہے۔ ہائے اسی سے ہندوستان خراب ہے۔ واہ رے ادبار۔

جسے دیکھو نوکری پر ہزار جان سے عاشق۔ میاں صاحبزادے کہا مانو اپنے گھر جاؤ، اپنا کام دیکھو۔ اس پھیر میں نہ پڑو۔ عمامہ باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ محرری پر لوٹ۔ امانت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور گھر میں سونے کی اینٹیں بھری ہیں۔ لاحول وَلا قوّۃ۔

دوسرے امیدوار کی نسبت معلوم ہوا کہ ایک مہاجن لکھپتی کا لڑکا امیدواری کرتا ہے۔ باپ کی کوٹھی چلتی ہے۔ لاکھوں کا وارا نیارا۔ بیٹا بارہ روپیہ کی نوکری کے لیے سوسو چکر لگاتا ہے۔ چوتھے درجہ سے مدرسہ چھوڑا اور اپرینٹس ہوتے کام خاک نہیں جانتے ہیں۔ ڈاکٹ میں لکھتے انرڈسر۔ باہر جاتے ہیں تو منصرم صاحب سے پوچھ کر۔ مولوی صاحب اگر اجازت باشد، آب خوردہ بیایم؟ اس وقت جب سب دفتر والے اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ تو حضرت پوچھتے کیا ہیں۔ کیوں جی یہ سب چلے جاتے ہیں، اور ابھی چھٹی کی گھنٹہ تو بجی ہی نہیں۔ اسکول کی گھنٹی یاد آ گئی۔

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کمسن لڑکے، مسیں بھیگتی ہوئی، نوجوان، امیروں کے لڑکے، ابھی گبھرو، نامِ خدا پندرہ پندرہ، سولہ سولہ، برس کا سن، پڑھنے لکھنے کے دن، مدرسہ چھوڑا، کالج سے منھ موڑا۔ امیدواروں کے زمرے میں شامل، اپرینٹسوں کی ٹکڑی میں داخل۔ الغرض ایف اے نگاڑا علم وہنر کو چنے کے کھیت میں پچھاڑا۔ ہائے ستم، وائے ستم! محنت کرنا وبال، درس وتدریس میں جی لگانا دشوار، دو چار برس جم کر پڑھنا محال۔ لاحول ولا۔ یہ سب ہندوستان کے ادبار پر دال ہے۔ یورپ میں دیکھیے کہ ایک ایک پیرزال تک تربیت یافتہ وبدیعُ الخیال ہے۔ افسوس اپنی تو یہ کیفیت کہ جہاں کسی کمسن مرفّہ حال کو قبل تکمیلِ مدرسہ چھوڑتے دیکھا، سینہ پاش پاش ہوگیا۔ دل کراہنے لگا۔ اکثر لوگوں سے پوچھا کہ بھئی صاحبزادے مدرسہ کیوں چھوڑ بیٹھے۔ تو جواب یہی پایا کہ اقلیدس کی شکل سے نفرت ہے۔ جبر ومقابلہ سیکھنا طبیعت پر جبر کرنا تھا۔ تاریخ یاد کسے رہے۔ یہاں تو خدا جھوٹ نہ بلائے، گھر کے بچوں کا نام یاد نہیں آتا۔ لہٰذا پڑھنے کی دم میں نمدا باندھا۔ ہم بھی سوچے کہ کہاں کی جھنجھٹ۔ بھئی الگ بھی کرو چلتا دھندا کرو۔ اور لطیفہ سنیے! مدرسہ چھوڑا، اور نوکری کی فکر ہوئی، عمامہ اوٹ پٹانگ باندھا اور کچہری میں غڑپ موجود۔ اس لپٹئی دستار کے قربان اور اس وحشت کے صدقے۔ زمیندار کے لڑکے کی یہ

خواہش ہوتی ہے کہ کھیتی کو یک قلم القط کرے اور کچہری میں گھس بیٹھ کر داخل ہو وے۔ تاجوئے صاحبزادے کو جی سے لگی ہے کہ کالج سے چھیت ہوں، اور کچہری کی کرسی پر جا ڈٹوں۔ متصدّی محرر منشی اہل قلم کے صاحبزادوں کی تو گھٹی ہی میں نوکری ہے۔ علما، فضلا، عقلا، کملا معزز حکّام اور افسرانِ ذوی الاحترام کہتے کہتے تھک گئے، کہ پڑھ لکھ کر اپنا اپنا پیشہ کرو اور اسی کو چمکاؤ، مگر بابو بننے کا شوق اور اہل دفتر کہلانے کا عشق ایسا چرّاتا ہے کہ عقل بالائے طاق، وحشت گلے کا ہار ہوتی ہے۔ مگر دیکھیے تو سہی رفتہ رفتہ سب سیدھے ڈھرّے پر آجائیں گے اور چار وانگ ہند میں تربیت یافتہ ہی تربیت یافتہ نظر آئیں گے۔

رت آئی بسنت عجب بہار

ساقیا برخیز دردہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایّام را
بادہ دردہ چند ازیں بادِ غرور — خاک بر سر نفسِ نافرجام را
ساغرمی برکفم نِہ تا زبر — برکشم ایں دلق ارزق فام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را

کیسا کباب، کس کی شراب، کیسا مطرب، کہاں کا رباب۔ یہاں بادۂ فصاحت کے نشہ سے آنکھیں چور، چشم بد دور۔ اچّھا سرور، ہے ساقی ہو، کیا غم ہے۔ مطرب سے واسطہ دل بہلانے کے لیے میاں آزاد کا ترانہ کیا کم ہے۔ اب سنیے کہ ادھر:

منشی سحر ہاتھ میں لے کر قلم زر — لکھنے لگا منصوبی و معزولی لشکر
لے فردِ سہ شب کو کیا خارج دفتر — منصوب ہوا عاملِ روز اپنی جگہ پر

مہتاب پہ جاری تھا قلم امر و نہی کا
پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

سویرے ہی سویرے ایک دوست نے آن کر میاں آزاد کو اٹھایا۔

بگڑے دل دوست : یا حضرت کچھ بسنت کی خبر ہے؟

آزاد : کیا آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے، یا ساون میں پھوٹی تھیں۔ ارے نادان یہاں دل سرد، چہرے زرد، جدھر جاؤ گرد برد ہے۔ واللہ یہ اچھی صفت عکس و طرح ہے کہ آپ بسنت بسنت پکارتے ہیں، ہوش کی دوا کیجیے۔

بگڑے دل : وہ دل سرد ہو، یا چہرہ زرد ہو، لیکن آپ کو بسنت کی خبر ہی نہیں۔ دونوں دوست چلے جاتے تھے، کہ چند آدمی ملے۔ ہے باہم یہ گفتگو کر رہے تھے۔ چلو ہنسیا کلوارن کی دکان پر۔ اُدکھ سے چلّو لگائیں۔ اور جھوم جھوم کر بسنت گائیں۔ فصل بہار ہے۔ دس دن کا تیوہار ہے۔ صبح کا سہانا وقت، اور نسیم طرب انگیز و عنبر بار، پیشتر و قافلۂ باد تاتار ہے:

ان تلخ وش کہ ساقی ام الخبائث خواند
اشہیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا

وہ سب رند ہنسیا کلوارن کی بھٹی پر جا ڈٹے۔ ایک نے کہا:

روح مدت سے نظر آتی ہے کچھ پیاسی مجھے　　ہنسیا دے کورے سکورے میں تو اب راسی مجھے

ہنسیا تو اس فشن کے رندان بلا نوش، گندم جو فروش، کی قبر تک سے واقف تھی۔ ایک سوندھی کوری کلھیا میں دو آتشہ شراب انڈیل دی۔ انھوں نے خوب چسکی لگائی۔ اور کچّی پر کچّی اڑائی پیتے ہی لے اڑی۔ بیٹھے تو اٹھنا دوبھر۔ اٹھے تو چلنا اجیرن۔ چلے تو یہ لڑکھڑائے، وہ ڈگمگائے۔ وہ لڑھکے، یہ آئے۔ دھم۔ پاؤں بہکے تو راسی کی ٹھلیا پر گرے۔ اس کی بساط کیا۔ چکنا چور ہو گئی۔ فرماتے کیا ہیں:

گہہ بسوزم بر سنگ گہہ بپائے خم افتم　　ہنسیا مرنج از من عالم جوانی ہاست

الغرض کپڑے شرابور ہو گئے۔ اور ہنسیا نے تاک کر چپت گاہ پر ایک ٹیپ اس زناٹے سے جمائی، اور وہ فرمائشی دھول لگائی، کہ تڑ کی آواز سے بھٹی بھر گونجنے لگی۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ مسکرا کر فرماتے ہیں کہ:

دھول دھپہ ہنسیا کی تو اب تک عادت نہ تھی　　ہائے کر بیٹھے تھے ہم ہی پیشدستی ایک دن

وہاں سے اور دو قدم چلے تو ایک پر دوسرا گرا۔ ع پا بدست دگرے دست بدست دگرے : انکھڑیوں میں لال لال ڈورے۔ میاں آزاد اور ان کے دوست بھی یہ کیفیت دیکھ کر چلے، تو دیکھا کہ ہر شے زرد زرد ہے۔ اشجار زرد، در و دیوار زرد، رنگین کمرے زرد لباس زرد، کپڑے زرد، شاہ[1] مینا کی درگاہ میں دھوم ہے۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے، ارباب نشاط

---

[1] شاہ مینار ح مشہور صوفی بزرگ جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے۔ بسنت کے تہوار پر اب بھی ان کی درگاہ کے احاطہ میں ایک میلہ لگتا ہے اور ہر نوچندی جمعرات کو فاتحہ خوانی کی خاص
(باقی دوسرے صفحہ پر)

کے جھمگڑے ۔ رنگیلے جوانوں کی ریل پیل ۔ صوفیوں اور رندوں کا میل ۔ اندر کے اکھاڑے کی پریوں کا دنگل ہے ۔ جنگل میں منگل ہے ۔ بہار بسنت خوش زن ہے ۔ زہادِ خشک کا نشہ ہرن ہے ۔ جسے دیکھو زرد پوشاک زیب تن ہے ۔ زعفرانی دوپٹوں اور کیسری پائجاموں پر عجب جوبن ہے :

ہے لطف حسینوں کی دورنگی کا امانت
دو چار گلابی ہیں تو دو چار بسنتی

وہاں سے طرارہ بھر کے چوک پہنچے ۔ واہ جی واہ ۔ جوہریوں کی دکان پر ایسے خوش رنگ عقیق ہیں، کہ پکھراج پری دیکھتی تو مارے غیرت کے ہیرا کھاتی ۔ اور اندر کا اکھاڑا بھول جاتی ۔ دلبر میوہ فروش، زرد آلو، نارنگی، زروک، امرود، چکوترہ، مہتابی، کی بہار دکھاتی ہے ۔ چمپئی دوپٹے پر اتراتی ہے ۔ مالن گیندہ، ہزارا زرد گلاب، کی بو باس سے دماغ کو طبلۂ عطار بناتی ہے اور صدا دے دے کر لبھاتی ہے ۔ کہ گیندے کی بہار ہے ۔ گلے کا ہار ہے ۔ حلوائی کھوپڑے کی زرد برفی ۔ پستے کی زرد برفی، نان ختائی، بیسن کے لڈو، نخودی کے لڈو ۔ مونگ کے زرد لڈو، خوانچے والے پاپڑ، دال موٹھ ۔ سیو مونگ کی دال، بیچتے پھرتے ہیں ۔ ایک ایک کے دس دس لیتے ہیں ۔ الغرض دونوں دل بہلاتے چلے جاتے تھے ۔ تو دیکھتے کیا ہیں ۔ کہ ایک گلی کے نکڑ پر لالہ بسنت رائے کا ایک خوشنما مکان ہے ۔ اور اس مکان میں ایک دلربا دالان ہے ۔ اس دالان میں عجیب سماں ہے ۔ بانکی ٹوپیاں جمائے ، بسنتی پگیا باندھے زعفرانی لباس پھڑکائے، رنگیلے جوان بیٹھے ہیں، اور سامنے مہوشان پری پیکر، رشک قمر، زریں کمر، نازک بدن، سیم تن، غنچہ دہن، بسنتی چمپا، زعفرانو، نوبہار کی دھن میں بسنت گاتی ہیں ۔ اور کافی انعام کھنا کھن اشرفیاں پاتی ہیں، زرد زرد قالیچے، زرد چھت پوش، زرد جھاڑ، زرد کنول، زرد جھالر سے مکان سجا سجایا ہے ۔ بسنت پنچمی نے درو دیوار تک کو زرد پوش بنایا ہے ۔ گل رخان گلفام کا زرد لباس اور اس پر عطر فتنہ کی بو باس، جسے دیکھو راحت و آرام سے

تقریب ہوتی ہے، اور جشن منایا جاتا ہے ۔ حضرت شاہ میناؒ نے ۸۸۴ھ ہجری میں وفات پائی وہ شیخ سارنگ کے جانشین تھے جو مولانا قوام الدین خلیفہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خلیفہ تھے ۔ مولانا قوام الدین کا مزار لکھنؤ میں ہے جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے (اخبار الاخیار صفحہ ۱۴۶)

ہم آغوش۔ رنج و محن آس نہ پاس۔ کوئی نازک آوازی سے تان سین کی روح کو شرماتی ہے، اور چمک دمک کر تان لگاتی ہے:

رُت آئی بسنت عجب بہار — کھلے جرد پھول برددں کی ڈار
چٹکو کسُم پھولے لاگی سرسوں — پھبکت چلت گیہوں کی بار
ہر کے دوارے مالی کا چھوہرا — گروا ڈارت گیندوں کے ہار
ٹیسو پھولے انب بورائے — چمپا کے روکھ کلیں کی بہار
گروا ڈالے استاد کے دوارے — چلو سب سکھیں کر کر سنگار

کوئی برق وش، انا البرق کہتی ہوئی چمک جاتی ہے۔ اور میاں امانت کی یہ غزل گاتی ہے:

ہے جلوہ تن سے در و دیوار بسنتی — پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے — معشوق ہیں پھرتے سرِ بازار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ میں میدان میں سرسوں — صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی
منھ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ — ہو جائے نہ رنگِ گلِ رخسار بسنتی
رُت پھر گئی عالم میں چلی بادِ بہاری — میخوانوں کو سجواتے ہیں میخوار بسنتی

گھر پر آئے تو میاں آزاد نے ایک اخبار کے لیے مضمون دلکش لکھا۔

بسنت کی بہار

دمید برگ و نہال طرب بیار آمد
بہ نو عروس چمن رقعۂ بہار آمد

اللہ اللہ کیا روح افزا بہار ہے۔ جس طرف دیکھیے زعفران زار ہے۔ صوفی صافی تک مرید۔ مغبچہ، بادہ فروش ہے۔ ہر سمت: ع

ہات الصبوح ہبوا یا ایہا السکارا (حافظ)

کا خروش ہے۔ بہار بسنت کا وہ جوش ہے کہ ساقی تک مدہوش ہے۔ اور کیوں نہ ہو:

حکمرانی پہ ہوا سیل سلیمان بہار — عشق پیچاں بن گیا طغرائے فرمانِ بہار
زلف سنبل کو سمجھیے گوش گل کو جانیے — نرگس شہلا کو کہیے چشمِ نشان بہار

بہار باغ کا عالم خطِ گلزار[1] میں مسطور ہے۔ صفحۂ قرطاس نورٌ علیٰ نور ہے۔ گلزار دبستان[2] ہیں کہ جنت کے چمن، حور و غلمان ہیں یا نسرین و نسترن، فردوسی آئے تو گلچیں ہو جائے، رضواں دیکھے تو شرمائے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی ٹھٹھرن، باد بہاری کے جھونکے، سناسن، سبزے کی لہک، گلِ جعفری کی مہک، کلیوں کا چٹکنا، پھولوں کا مہکنا، شاخِ گل کی کج ادائی، سنبل کی آشفتگی، گلوں کی رعنائی، مردِ دیدۂ نگاہوں سے نرگس شہلا کی نظارہ بازی، زبان حال سے سوسن کی زبان درازی، شاخ گل کا مستانہ وار جھومنا، اشجارِ پُرمیوہ کا زمین کو بار بار چومنا، سنبل کی سیہ مستی، نرگس کی جام پرستی، نونہالان چمن کے ہاتھوں میں پھول کے جام، جیسے رندانِ مے آشام، منقارِ بلبل نغمہ خیز، نائے موسیقار ترانہ ریز، طوطی کی خوش بیانی، عنادل کی غزل خوانی، کوئل کی کو کو، قمری کا نعرۂ حق سرۂ سبحان اللہ سبحان اللہ:

بہار آئی ہے عالم ہے گل و نسرین و سوسن پر
جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے جوبن پر

عنادل جوش مسرت میں بے پر کی اڑاتے ہیں۔ غنچۂ گل سُن سُن کر زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ شبنم کے قطرے ہرے ہرے پتوں پر اس طرح نمودار ہیں جیسے کسی تہ گل گوں کے ہاتھ میں لالی آبدار ہیں۔ درخت پھولے پھلے، سرو سہی سانچے میں ڈھلے، نسرین و نسترین کا حسن بے عیب و داغ۔ نرگس و گل چمنستان کے چشم و چراغ:

وہ بہار آئی ہوئے نغمہ سرا مرغ چمن
غیرتِ باغ ارم آج ہے صحنِ گلشن
جوش ہے زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار
کیا تعجب ہے جو گویا ہو زبانِ سوسن
کرم ابرِ بہاری سے ہے سیراب زمین
خاک اڑ کر نہیں ہوتی ہے غبارِ دامن
نئے مضمون ادا کرتی ہے سبزے کی زبان
کھولتا نکتۂ سربستہ ہے غنچہ کا دہن
آب شبنم سے کہاں کاسۂ گل ہیں لبریز
جلترنگ آج بجانے کو ہے معشوق چمن
آبشاروں کا سر آئینہ بجاتی ہے صبا
تال دیتا ہے کفِ برگ سے ہر نخلِ چمن

---

[1] خطِ گلزار، خوش نویسی کی ایک قسم ہے۔ جس میں حروف پھول، پتوں سے بنائے جاتے ہیں۔

[2] گلزار دبستاں۔ فارسی زبان سیکھنے کی ایک ابتدائی کتاب کا نام ہے۔ جو مکتبوں اور مدرسوں میں عام طور پڑھائی جاتی ہے۔

کوئی افسانۂ زہاد نہیں سنتا ہے — خس و خاشاک سے کیا صاف ہے صحنِ گلشن
ایسی کثرت سے جو ہو بارشِ باران بہار — زاہد خشک کا ممکن ہے نہ ہو تر دامن

پھولوں سے لبریز گل چینوں کی جھولی ہے۔ باغبان کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ حوضِ باغ آئینہ کی صورت صاف، پانی مثل بلور شفاف، روشیں صاف و پاک، پٹریاں بے خس و خاشاک، رنگیلے جوان نشاءِ گل گشت میں مخمور، بادۂ مسرت سے چور، لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بسنت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر سمت طبلے پر تھاپ سارنگی کی چھیڑ چھاڑ، اور نغمۂ سراتی کا انتظام ہے۔ مگر شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ سب میں انتخاب زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ اللہ اکبر گردِ مزار کہیں نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔ غٹ کے غٹ، جوق کے جوق چلے جاتے ہیں۔ غول کے غول امڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا، وہ ریل پیل وہ شور و شر کہ الاماں! الحذر! ایک دوسرے کو ریلتا ہے، دوسرا تیسرے کو ڈھکیلتا ہے، ڈولیوں پر ڈولیاں اور فنس پر فنس چلی آتی ہیں۔ مہ جبینانِ ماہرو، تماشہ بینوں کی بدولت گلچھرّے اڑاتی ہیں۔ قدم بھر چلنا دشوار۔ سر پر خاک چہرے پر غبار، مزار شریف کے گرد جا بجا گل رخان سنبل مو عجب ناز و انداز سے جلوہ گر، جیسے دیکھو طرحدار، ہلال ابرو رشک قمر، صندلی رنگ شوخ و شنگ، پوشاک از سرتا پا دھانی، دوپٹہ ہلکا زعفرانی، خوشبو، خوش رو، خوش خو، مرغولہ مو، آئینہ زانو، نازک اندام، نازنین۔ حور لقا، زہرہ جبین، شوخ و بیباک، چست و چالاک، خوش الحان۔ غزل خوان، گوہر یاقوت لب یمن گاتی ہے، دل بہار گل عذار بہار کی تان اُڑاتی ہے۔ عجب ناز و انداز سے کھڑی ہاتھ سارنگی والے کے کاندھے پر دھرے، کمر کو لوچ دیے، (رت آئی بسنت بہار) کی تان اُڑا رہی ہیں۔ اشاروں میں سارے نکتہ سربستہ بتا رہی ہیں۔ ہر ایک تانِ جانستان تان سین کی روح جس پر قربان۔ نور کے گلے نور کی آواز، بلا کا ناز، قہر کا انداز، مطرب کی ناخن بازی پر دل لوٹ ہے، ارباب نشاط کے رقص اور ٹھوکر سے کلیجے پر چوٹ ہے۔ رقص کا وہ سماں بندھا کہ عاشقوں کا دل بھی گنگنانے لگا:

آفت جاں ہے ترا اے سرو گل اندام رقص — ساتھ ہر ٹھوکر کے کرتا ہے ہمارا کام رقص
جی اٹھے مردے، ہزاروں مٹنے گھنگرو کی صدا — واسطے زندوں کے ایا موت کا پیغام رقص

سارنگیاں ہاں میں ہاں ملانے کو تیار، واہ بیوی اس خوش الحانی کے نثار، طبلہ نواز، کمربستہ خدمت گزار، گرداگرد تماش بینوں کی قطار، دوسری جانب قوّال حقانی غزلیں گاتے صوفیوں کو وجد میں لاتے ہیں۔ کسی اہل دل کو حال آیا۔ کوئی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہو حق کا نعرہ بلند ہے۔ سرور و غنا کا لطف دوچند ہے۔ ایک سمت ساقیوں کا گرم بازار، دکانیں دھواں دھار، چلم پر چلم بھری جاتی ہے۔ دم پر دم پڑتے ہیں۔ ناتواں نوجوان نشہ کے زور میں عجیب لوچ سے اکڑتے ہیں۔ بسنت نے بھی اچھا رنگ جمایا ہے۔ چنڈو بازوں تک کو زعفرانی بنایا ہے۔ لباس درکنار، جسم تک زعفرانی ہیں۔ بیمار دعا مانگنے آئے تو وہ بھی برقانی ہیں۔ بگھیوں کی آمد رفت سے وہ دھول، وہ خاک وہ گرد وہ غبار ہے، کہ دم لینا دشوار ہے سانس باہر نکلتے جان چراتی ہے۔ کیوں نہ ہو آخر ہولی خاک اڑاتی آتی ہے۔ الٰہی جس طرح بسنت آیا ہولی بھی آئے، قلم جادو رقم جی کھول کر خاک اڑائے، ہمارے رنگیلے جوان حسینوں کے سنگار دان، میاں آزاد اور ان کے دوست بسنت کی بہار، پریوں کے نکھار، مہ جبینوں کے سنگار، میوؤں کے انبار، بادہ نوشوں کی تکرار۔ کہاروں اور کلاروں کی جوتی پیزار، نسیم مشک بیز و عنبر بار، شمیم زلفِ مہوشان گل عذار، زعفران پوشوں کی قطار، جلسۂ مسرت آثار، زرد زرد لباس، عطر کی بو باس، دکانوں کی بناوٹ کمروں کی سجاوٹ، قوالوں کی نازک آوازیاں، مطربوں کی جادو طرازیاں، خوش گپوں کی لفّاظیاں، عاشق تنوں کی نظارہ بازیاں، دیکھ کر چل کھڑے ہوئے، تو ایک نئی قطع نئی وضع کے بزرگوار سے مڈبھیڑ ہوئی۔ بڑے عیار، بڑے تجربہ کار، بڑے جہاں دیدہ، بڑے سن رسیدہ۔ بڑے خرّانٹ گرگِ باران دیدہ۔

خرّانٹ : آیئے آیئے! یوں آیئے! اے حضرت! تکلف سے بندۂ درگاہ کو نفرت ہے:

گر بر سرو چشمِ من نشینی نازت بکشم کہ نازنینی

خوب ملے واللہ شریف کی صورت پر عاشق ہوں۔ چین و ماچین، ختن و ختین، سمرقند، اور خجند، تاتار اور سبزدار، لاسا اور کوکانار، ہند اور سند، ہسپانیہ اور رومانیہ، روم و شام، طوس و جام، کوہ قاف، اور موسیٰ باف، الغرض ساری خدائی کی بندۂ درگاہ نے خاک چھانی ہے اور تو یارِ جانی ہے۔ سفر کا حال سن، گھنگرو بولے چھن، دل خراش، سینہ پاش پاش، رود نیل کی روانی بھری برسات میں طغیانی:

شاہوں کی وہ جا ہے تاجداروں کی ہے مسکن پسِ مرگ ذی وقاروں کی ہے

واں ذہن رسا کا حوصلہ پست رہنے رفعت یہ مصر کے مناروں کی ہے

یہ تقریر سن کر آزاد کے ہوش پیترا ہوئے۔ سمجھے کہ کوئی پاگل ہے اچھے کا ساتھ ہوا۔ وحشتِ دل کا علاج ہاتھوں ہاتھ ہوا۔ یا کوئی مقدس بزرگوار ہیں، معمر و تجربہ کار ہیں، مگر جنون کے ایسے آثار ہیں، اتنے میں خرانٹ نے پھر بڑ شروع کی۔

خرانٹ: سنو یار! عرضِ خاکسار۔ ہم سو رہیں، تم جاگو۔ پھر ہم اٹھ نہ بیٹھیں تم سو رہو۔ سفرِ دور و دراز ہے۔ سوتے جاگتے، ٹھہرتے بھاگتے، راہ کاٹیں۔ سفر کا اندھا کنواں انھیں اینٹوں سے پاٹیں، اب ریل ایک اسٹیشن پر ٹھہری اور خرانٹ نے ایک خوانچے والے کو بلایا۔

خرّانٹ: کھٹیاں کتنے سیر؟ برفی کا کیا بھاؤ۔ لڈو پیسے کے کئے؟ بولو جھٹ پٹ، ورنہ ریل چلی جائے گی۔

خوانچے والا: آپ کو سودا تو نہیں ہو گیا ہے؟ آپ مٹھائی خریدتے ہیں یا جھگڑا چکاتے ہیں۔ الغرض تین چار آنے کی مٹھائی لی۔ میاں آزاد کو کھلائی۔ اور سقے سے پانی پلوایا۔ ریل پھر سن سے چل کھڑی ہوئی۔

خرّانٹ: بھائی اب سو رہو ہم اسباب تاکتے ہیں۔

اس کے بعد میاں آزاد سے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ وہ بھی باغ باغ ہو گئے، اور دوست صادق سمجھ کر لیٹ رہے۔ لیٹے تو ایسے سوئے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا:

بھاگے جہاں وہاں پہ بزن اور ربکٹ ملا لٹ پٹ کے گھر کو آئے تو گھر کا ٹکٹ ملا

کئی دن کے تھکے ماندے تو تھے ہی، سوئے تو گھوڑے بیچ کر۔ سر و پا کی خبر نہیں، مُردوں سے شرط کی تھی خرّانٹ نے وہ لقاظی کی کہ آزاد انٹا چت ہو گئے۔ وہ ایک کائیاں، دنیا بھر کا نیاریاں، ان کو غافل پایا تو بوریا بدھنا اٹھایا اور چلتے ہوئے انھوں نے کروٹ تک نہ بدلی، جاگے تو کب؟ جب:

حریفان بادہ ہا خوردند و رفتند تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

بدحواسی کے عالم میں اترے تو اسٹیشن کو سر پر اٹھایا، اور وہ غل غپاڑا مچایا، کہ زمین کو زلزلہ آگیا۔ در و دیوار تھرا گئے۔ انسان و حیوان کانپ اُٹھے۔ دہائی ہے سرکار کی! لوٹ لیا، اب کبھی ٹکٹ بابو کے پاس جاتے ہیں، کبھی کانسٹبل پر جھلّاتے ہیں، کبھی اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں غل مچاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا، مگر خرّانٹ کہاں، وہ یہاں سے

۲۸ کوس پر تھے، رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ بابو نے ٹکٹ لیا، اور ان کو سیدھا راستہ بتایا۔ چلے تو سینہ بریاں، بادیدۂ گریاں، یا الٰہی! کدھر جاؤں؟ بارِ خدا چور سینہ زور کو کہاں پاؤں، پاؤں تو کچا ہی کھاؤں، یہ پردیس کا واسطہ، نیا شہر، اپنا نہ پرایا، خویش نہ بیگانہ، ایک قدم تک چلنا دوبھر تھا۔ مگر قہر درویش بر جانِ درویش، ناچار ٹھوکریں کھاتے چلے جاتے تھے۔ ایک چوراہے پر کیا دیکھتے ہیں، کہ سامنے سے ایک جوانِ طنّاز، دورَ کا بہ مشکی گھوڑا پھکیتا چلا آتا ہے۔ اور سمندِ وغا پسند، ایسا سرپٹ جاتا ہے، کہ ہوا۔ اس کے غبار تک کو نہیں پہنچتی۔ ایک کونے میں دبک رہے، کہ ایسا نہو، کہیں جھپیٹ میں آجائیں۔ اور وہ پشتک کھائیں کہ ہاتھ پاؤں ٹوٹے یا سر پھوٹے۔ اتنے میں سوار ان کے کلّے پر آن کھڑا ہوا۔ جھٹ گھوڑے کی باگ روکی اور ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ چکرائے کہ الٰہی خیر! یہ شخص تو بے طور گھور رہا ہے۔ خدا اپناہ میں رکھے، اب ہنٹر دیا ہی چاہتا ہے۔ موے پر سو دُرّے۔ اس سوار کی قطع وضع پر جو انھوں نے نظر ڈالی، تو دیکھا کہ آدمی شریف، خوش پوش، حسین وجیہہ اور جری ہے، اور گھوڑے پر تو ایسا جمتا ہے کہ سبحان اللہ!

جوان: کیوں حضرت آپ کسی کو پہچانتے بھی ہیں؟ اس بھول کے قربان، خدا کی شان، آپ اور ہم کو بھول جائیں، یہ معاملہ کیا ہے؟

آزاد: میاں تمھیں دھوکا ہوا ہوگا۔ میں صورت آشنا بھی نہیں۔ میں تو ایک غریب الوطن غمزدہ، دل شکستہ، خستہ وخراب، مسافر پردیسی ہوں۔

جوان: کیا؟ غمزدہ! تمھارے دشمن، دل شکستہ! خدا نہ کرے! خراب وخستہ جو تمھاری طرف دیکھ نہ سکے۔

یہ کہہ کر وہ جوانِ طنّاز سمند باد رفتار سے اتر پڑا اور میاں آزاد سے چمٹ گیا۔ میاں آزاد حیرت میں کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے؟ جوان نے مسکرا کر کہا! کہ یار تم ہمارے ہم مکتب ہو۔ یاد ہے، کالج میں ہم تم ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ وہ کشتی پر ہوا کھانے جانا، اور دریا کے مزے اڑانا، وہ مداری خوانچے والا، وہ اقلیدس کے وقت اُڑ بھاگنا، منطق سے جی چُرانا، سب بھول گئے؟ تب تو میاں آزاد خوب بغل گیر ہوئے اور رو دیے، یہ خوشی!

جوان: تمھیں یاد ہوگا کہ جب انٹرنس کا امتحان دینے کو تھا، تو میرے پاس دس روپیہ کا

ٹھکانا نہ تھا کہ فیس بھیجتا۔ سرگرداں و پریشان اِدھر اُدھر تلاش زر میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ کہ راہ میں اسپتال کے پاس تالاب پر تم سے مڈبھیڑ ہوئی، اور تم نے میرے حال زار پر رحم کر کے دس روپیہ کی فکر دور کر دی۔ درجۂ اوّل میں بندہ پاس ہوا، اور پھر تمھاری پرورش سے بی۔ اے تک پڑھا، اور ڈگری پائی۔ اب میں یہاں دو سو روپیہ ماہواری پاتا ہوں۔ اور تمھاری بدولت دندناتا ہوں۔ لیکن تمھاری صورت سے مایوسی اور وحشت برستی ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

آزاد نے اپنا سارا دُکھڑا کہہ سنایا، اور کہا کہ بھئی! تو ہی اس گاڑھے وقت پر آڑے آیا۔

جوان: استعجاب ہے کہ ایسا تجربہ کار آدمی اور اتنا بھونڈا چکمہ کھائے اور بھرّوں میں آجائے۔ ارے میاں مسافر کا اعتبار کیا۔ ریل پر بڑی ہوشیاری لازم ہے۔ مسافرت خالہ جی کا گھر نہیں، کیل کانٹے سے درست، آٹھوں گانٹھ کمیت ہونا چاہیے۔ لے! اب کان پکڑو کہ پھر کسی مسافر کی دوستی کا اعتبار نہ کریں گے ''لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃ۔ واللہ اس وقت تمھاری حالت دیکھ کر ایسا رنج ہوا ہے کہ بیان سے باہر۔ تم تو ساری خدائی کے نیارے تھے۔ ایسا غپّا کھا گئے! ہے ہے! اگر میں راہ میں نہ ملتا تو خدا جانے تمھاری کیا حالت ہوتی۔ چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔ کپڑے تک اُتار لے گیا۔ اور آپ کو ہوش ہی نہیں، یہ بنجیری۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک شخص نے میاں آزاد سے آن کر پوچھا، کیوں قبلہ اولڈ ٹام کو خالی پیتے ہیں یا سوڈا واٹر ملا کر؟ اکثا نمبروں میں تو ہم نے لمنیڈ ملایا ہے۔ مگر اولڈ ٹام کا حال نہیں معلوم۔ شراب کا حال سننا تھا کہ آزاد کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور بڑی دیر تک حضرت لیکچر دیا کیے، کہ خبردار شراب نہ پینا، ورنہ دھوبن کان پکڑے گی۔ کلوا رِن دھپیں جڑے گی۔ آبرو خاک میں مل جائے گی۔ شراب خواری ستم ڈھائے گی۔ الغرض وہ جوان اپنے محسن میاں آزاد کو اپنے گھر لے گیا:

نہ تو شیشہ ہی ملا اور نہ ساغر پایا
ساقیا لے تری محفل سے چلے بھر پایا

میاں آزاد اور کہیں دو دن جم کر ٹک جائیں۔ معاذاللہ، کیا مجال، ایسے سیلانی اور کسی

خاص مقام پر بستر جمائیں، استغفر اللہ ان کے پاؤں میں تو پرکار کی گردش تھی۔ چلتے پیر کی بیعت لائے تھے۔ سیر ہو، سپاٹا ہو، سفر ہو یا پاٹا ہو تو چین آئے، ورنہ پاؤں سوچ کر کپّا ہو جائے۔ بھئی واللہ! کیا الٹی بات ہے۔ ایک دن اپنے لنگوٹیے یار کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے، اور خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے، کہ دفعتہً ان کے پاؤں پر سنیچر سوار ہوا۔ پھر کیا تھا عقل کو رو بیٹھے۔ اب تو شیطان نے دور سے انگلی دکھائی، چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ تلوے کھجلانے لگے۔ جوتے پر جوتا سوار ہو گیا، سفر کا بھتنا سر پر چڑھ بیٹھا۔ بادیہ پیمائی کی دُھن سمائی، اللہ ری وحشت:

رخصت اے زندان جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

سوچے کہ یار سے کہیں، یا چپکے سے چلدیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ کریں، بوریا بدھنا سمیٹ جنگل کی راہ لیں۔ کہیں نہ سنیں، اور سفر ہی میں سر دُھنیں، مگر دل نے سمجھایا کہ جائیں ڈنکے کی چوٹ پر، گا بجا کے، محلہ والوں کو جتا کے، ورنہ کہیں اڑوسی پڑوسی کہیں گے کہ اچھے لوٹیا چور تھے۔ آئے تو اس طرح جیسے ہونچال۔ گئے تو اس طرح جیسے سگِ زرد برادرِ شغال۔ آخر کار دل میں ٹھان لی کہ جائیں گے، اور بیچ کھیت جائیں گے۔ مگر یار سے مافی الضمیر نہ چھپائیں گے۔

آزاد: حضرت سلامت! لے بس اب رخصت۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے پھپھوندی لگ گئی۔ پاؤں مشتاقِ دشت نوردی ہیں۔ بادۂ سفر خم کدہ دل میں جوش زن ہے۔ گلگونِ خیال جولاں گاہ بادیہ پیمائی میں سبک پویہ ہے۔ عشرت کدہ میں دو چار دن خوب گل چھرّے اڑائے۔ پلاؤ اور زردے پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ لگائے۔ مگر اب یہ صحبت کاٹے کھاتی ہے طبیعت اچاٹ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں شوقِ شراب، نہ خواہش ساقی، یار زندہ و صحبت باقی:

اب تو جاتے ہیں بتکدہ سے میر[1]
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

یار: نیا رنگ لائی گلہری۔ کیا دماغ پر گرمی چڑھ گئی، یا جنون نے زور کیا۔ اب کی فصل بہار خیر سے گزرے تو تربت مجنوں پر پھولوں کا چادر چڑھانا۔ اس وحشت کا کیا ٹھکانا۔ ہوش کی باتیں کیجیے، بہت وحشت کی نہ لیجیے۔ جانا اور آنا اور ملنا اور ملانا کیا

---

[1] میر تقی میر متوفی ۱۸۱۰ء

بچھڑے ہوئے البتہ ملتے ہیں۔ ہم تم تو آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔

آزاد : ہم تو اس طرح جائیں جیسے روح تن سے، یا جوانی کا بل پیروں کے بدن سے۔ یا بوئے گل چمن سے، یا بردہ فروشی کی رسم یمن سے :

درویش رواں رہے تو بہتر — آبِ دریا بہے تو بہتر
عقل اور جنون کا سامنا کیا — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا (نسیم[1])

تم کو شکر لبان عنبرین چہرہ، ہم کو سفر اور جنگل کا بسیرا مبارک، خدا حافظ :

کب سبک دوش رہے قیدی زندانِ وطن
بوئے گل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

جب میاں آزاد نے دیکھا کہ ان کے یار بھی دھن کے پکے ہیں تو بات ٹال دی، اور قہقہہ لگا کر کہا اے واہ حضرت آگئے نہ جھانسے میں :

اب تو سودا نے ترے در پہ بٹھایا زانو

بیٹھے تو ایسے، جیسے نقش قدم اٹھنا فنا پر موقوف، الغرض تتو تھمبو کر کے ان کو ٹالا۔ جب وہ خراٹے لینے لگے تو خدام باادب سے ؎

مانگا کاغذ دوات و خامہ — جھٹ پٹ موزوں کیا یہ نامہ

بگڑے دل کے خدمت گار کو میاں آزاد نے یہ نامۂ منظوم دیا۔ اور چل کھڑے ہوئے :

اکتا گیا جی یہاں سے بھائی — پھر چلنے کی دل میں جھک سمائی
ایسی صدہا پڑی ہیں اُفتاد — روکے سے کہیں رُکے ہیں آزاد
گردش میں ہے ان دنوں جو اختر — پاؤں پہ سوار ہے سنیچر
کیا تم سے کہوں میں یار کیا ہوں — چلتا پُرزا بنا ہوا ہوں
چھپر پہ دھرا ہے عیش و آرام — سیاحوں کو ایک جا پہ کیا کام
بس ہے یہی لطف زندگانی — دانہ ہو نیا، نیا ہو پانی
چشمہ نہ بہے تو اس میں بو آئے — خنجر نہ چلے تو مورچہ کھائے
اجسام میں دل چلے تو بہتر — گردش خون میں رہے تو بہتر

---

[1] دیا شنکر نسیم لکھنوی متوفی ۱۸۴۵ء شاگرد خواجہ آتش۔ مصنف مثنوی گلزار نسیم۔

گردش سے زمین نے اوج پایا — افزوں ہوا مہر و مہ سے پایا
کھلتے ہیں کہیں وطن میں جوہر — کیا قدرِ گہر صدف کے اندر
ہر چند کہ صورتِ سفر ہے — پر گلشنِ بیخزاں سفر ہے
ہر رنگ کے گل کھلے ہوئے ہیں — میووں سے شجر لدے ہوئے ہیں
جو پھول کہ خوشنما نظر آئیں، — بھر بھر کے وہ جھولیوں میں لے جائیں
جو میوے لطیف دل کو بھائیں — کھائیں خود، غیر کو کھلائیں
گل سے تو مرادیاں ہے فیشن — میوؤں سے غرض ہے علم اور فن
نافہم کرے سفر کو مطعون — جانے کیا شیخ نرخِ صابون
لیتے ہیں خبر ادھر ادھر کی — اب پھرتے ہیں سدّھیان سفر کی
پھر سیر کی ٹھن گئی ہے۔ جی میں — ہم کو تو مزہ ہے دل لگی میں
سیٹی بجی ریل کی مری جان — لو جاتے ہیں اب خدا نگہبان
اب تو اپنی جگہ سے ہم سے — جیتے ہیں تو پھر ملیں گے تم سے

یہ لکھ کر خدمتگار کو دیدیا، اور کہا جب میاں جاگیں ان کو دے دینا اور عمامہ باندھ، کپڑے پہن، کمر کس، چوکس ہوگئے۔ یہ جا وہ جا۔

نیچریہ شاعری

میاں آزاد ایک مرتبہ سیر کرتے ہوئے ایک شہر میں داخل، اور ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ جھٹپٹے وقت ہوا کھانے چلے تو دیکھا۔ کہ سرا کی ایک کوٹھری کے برآمدے میں چار پانچ سفید پوش، فرشِ مُکلّف پر بیٹھے، عظیم اللہ خانی حقے مشکبو، دھواں دھار، اُڑا رہے ہیں۔ اور گلوری چبا رہے ہیں۔ مگر سب موزوں طبع، شعرائے نازک خیال، وشیریں مقال، حامی، علامی، فہامی، وقاد، اور جواد، ایک شاعر نے کہا کہ بھئی ہم تینوں کے تخلص کا وزن ایک ہے۔ علّامی، فہّامی، اور حامی۔ مگر تم دو ہی ہو۔ وقاد وجواد۔ ایک شاعر اور آجائے تو چھ گڈم کی خوب ٹھہرے۔ اتنے میں میاں آزاد تڑ سے پہنچ گئے۔ ایں! آپ کون؟ شاعر غرا، پوچھا: آپ تخلص کیا کرتے ہیں؟ فرمایا آزاد، تب تو ان سب کی باچھیں کھل گئیں کہ اچھا قافیہ ملا۔ لو صاحب! اب جواد۔ وقاد، اور آزاد، یہ تین شعرا بھی ہم قافیہ تخلص والے جمع ہو گئے۔

بھئی خوب آئے، واللہ آپ ہی کی کسر تھی۔ اب شعر خوانی ہونے لگی۔ ایک شعر پڑھتا ہے۔ باقی داد دیتے ہیں۔ اے سبحان اللہ واہ میر صاحب! یہ حضور ہی کا حصّہ تھا۔ حاصل زمیں بارک اللہ؟ کیا خداداد طبیعت پائی ہے۔ واللہ کیا ذہن کی رسائی ہے۔ پھر فرمائیے گا۔ حضرت خدا کی قسم قلم توڑ دیے، کیا روزمرہ ہے۔ ہائے اس بول چال کے صدقے۔ واللہ کیا خوب تقسیم ہے۔ ٹوپیاں اچھل رہی ہیں۔ کوئی جھومتا ہے کوئی وجد کرتا ہے۔

آزاد: میاں سنو! اینجانب اس شاعری کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں نیچریہ کلام پسند ہے۔ یہاں اس شاعری کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ لوگ تو زبان پر مرتے ہیں، اور ہم خیالات پر جان دیتے ہیں۔ ہائے شاعری تو انگریزی پر ختم ہے۔ نیچر نیچر ہائے نیچر! وائے نیچر! نیچر کہاں پایئے۔ گل و بلبل کا عشق، معشوق کے قد کو تاڑ بنایا اور در پردہ کلّ طویلٍ لے کی پھبتی سنائی۔

فہّامی: اخاہ! آپ نیچریے ہیں۔ انیسیے اور دبیریے، تو سنتے تھے، اب نیچریے پیدا ہوئے۔ غضب خدا کا ایسا کلام دلکش پسند نہیں، یہ ان شعرا کا کلام فصاحت التیام، ہے جو پیغمبر شعر گوئی تھے۔ جن کا سب کلمہ پڑھتے ہیں۔ بلکہ خدائے سخن تھے۔

آزاد: بندہ صاف گو، صاف باطن آدمی ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ یہ شاعری نہیں خبط ہے۔ بے تکا پن ہے۔ مبالغہ بھی تو کتنا، کچھ ٹھکانا ہے۔ جھوٹ کے چھپر اڑا دیے۔ لے اب کان کھول کر نیچریہ کلام سنو! اس پر وہ فرمایشی قہقہہ پڑا کہ سرا بھر گونج اٹھی۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ بڑی دیر تک ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔

فہّامی: واہ قبلہ واہ! آپ کی نیچریت کے صدقے، اچھی گٹ پٹ ہے۔

آزاد: حضرت شیخ کیا جانیں صابون کا بھاؤ۔ اندھے کے آگے رونا اپنی آنکھیں کھونا، بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگرائے۔

میاں آزاد نے اپنی نیچریہ شاعری کی تعریف کے وہ پل باندھے کہ بحر ظلمات پٹ جائے۔ تعریف کیا ایک سمندر کا سمندر تھا۔ جس کا اور نہ چھور ممکن کیا کہ کوئی تھاہ پائے۔

لے کلّ طویلٍ احمقٌ۔ ہر لمبے قد والا احمق ہوتا ہے۔

اُدھر وہ پانچوں اردو کی شاعری پر عش، آتش و میر کے روز مرے پر عش عش کرتے تھے۔ ناسخ کی بلاغت، انیس کی فصاحت۔ ذوق کی تشبیہ، غالب کے کلام اوق و خیالات نفیس، مومن کی زبان سلیس، امیر کے استادانہ کلام کی بڑھ بڑھ کر تعریف کرتے تھے۔ اب فرمائیے فیصلہ کون کرے، بھٹیارن جھگڑا چکانے سے رہی۔ بھٹیارا گھانس چھیلنا جانے، شاعری علم دریا ہے۔ آخر کار فریقین کی رائے یہ قرار پائی کہ شہر چلیے، جو پڑھا لکھا آدمی پہلے ملے وہی حکم، جو کہدے آمنّا و صدّقنا منظور۔

بھٹیارن

سب نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چلنے ہی کو تھے کہ بھٹیارن نے ان کو للکارا، اور جھپک کر میاں جوّاد کا دامن لیا۔ میاں یہ بتے کسی اور کو بتانا۔ ہم بھی اس شہر میں اتنے بڑے ہوئے ہیں۔ ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر، کل سیکڑوں ہی کنوؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوڑی کوڑی بائیں ہاتھ سے رکھ جائیے۔ پھر اسباب اٹھائیے، اور تشریف کھسکائیے۔

علاّمی: نیک بخت! یہ شریف بھلے مانس ہیں۔ دو پیسے کے واسطے کہیں شرفا ایمان بیچا کرتے ہیں۔ چلو دامن چھوڑ دو۔ ابھی دم کے دم میں آئے۔

بھٹیارن: اس دم میں بندی نہ آئے گی۔ ایسی باتوں میں نہ آنے کی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے اسامی ہو تو ایک گنڈا چپکے سے نکال دو نہ۔ اے واہ میاں! بڑا کھرا پن دکھاتے ہیں۔ یہاں اس ۱۹ برس کی عمر میں ہزاروں ہی چراڈالے ہوں گے۔

دقّاد: یہ مڑ چڑی ہے، یا بھٹیارن، عورت ہے یا ڈائن، اڑی، سواری، صاحب للہ اس سے پیچھا چھڑاؤ، ورنہ ریش مبارک پر ہاتھ ڈالا ہی چاہتی ہے۔ بھئی ایسی بھٹیارن دیکھی نہ سنی۔

بھٹیارن: میاں کچھ بیدھے تو نہیں ہوئے ہو۔ یا بلی نانگھ کر گھر سے چلے تھے۔ یہ لام کاف

۱۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق متوفی ۱۸۵۴ء مرزا اسد اللہ خاں غالب متوفی ۱۸۶۹ء حکیم مومن خاں مومن متوفی ۱۸۵۱ء حیدر علی آتش متوفی ۱۸۴۷ء۔ چاروں اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔

۲۔ بھٹیارن، نہایت اہم اور دلچسپ کردار ہے۔ آزاد پر مختلف حالتوں میں عرصہ تک اثر انداز رہی۔

ذری زبان سے نہ نکالو۔ ہوں، چھوٹی تو کیا ہوا، پربس کی گانٹھ ہوں، میرے کاٹے کا منتر نہیں۔

میاں جواد آدمی تھے صلح کل، جب انھوں نے دیکھا کہ مفت میں دھرے گئے، تو کہا بھئی تم پانچوں جاؤ۔ ہم یہاں بی مہترانی کی تشفی کے لیے بیٹھے ہیں۔ اور اسی بہانے پر ابھی دیتے جائیں گے۔ تم لوگ نپٹ آؤ۔ خیر وہ سب تو اُدھر چلے اور خواجہ سرا ہی میں زیر حراست بی بھٹیاری رہے۔ دو چار منٹ بعد پکارتے ہیں کہ، بی مہترانی! بی مہترانی! میں لیٹا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو، پیٹ میں چوہے دوڑیں کہ رفو چکر ہوئے۔ پھر تین منٹ کے بعد گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے۔ بھٹیارن، بھٹیارن، ہم بھاگنے والے اسامی نہیں۔ تم بے فکری سے دال بگھارو، جب بار بار انھوں نے چھیڑنا شروع کیا تو وہ آگ بھبوکا ہو گئی۔

بھٹیارن : میاں میں ایسے دو پیسے سے درگزری، بلی بخشے چوہا لنڈورا ہی جیے گا۔ تم نے تو غل مچا مچا کر میرا کلیجہ پکا دیا۔ ناکوں دم آگیا۔ آپ جائیں، بلکہ کھٹیا سمیت دفان ہوں، تو میں خوش، میرا اللہ خوش، یہ بات وہ بات ٹکا لا میرے ہاتھ۔ اے واہ! دیکھی تری کاپی اور باون پورے اُجاڑ۔ میاں ہوں تو ابھی جمعہ جمعہ سات اور آٹھ دن کی پیدائش مجھے تو نگوڑی گنتی بھی نہیں آتی، ٹل ناک پر تو مکھی بیٹھنے دیتی نہیں۔

ادھر تو میاں جواد سادہ دلی سے بی بھٹیارن سے چہل کر رہے تھے، ادھر سنیے وہ پانچوں سرا سے چلے تو راہ میں سنّاٹا۔ آدمی نہ آدم زاد چلتے چلتے ایک مردِ مقدس باریشِ مخفّب سے دوچار ہوئے۔

حامی : السّلام علیکم۔

مقدس : وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

حامی : یاحضرت مولانا! ایک مسئلہ حل کیجیے تو احسان ہوگا۔

مقدس : عرض کروں پیر و مرشد! خاکسار، ایک ذرۂ بے مقدار، اضعف العباد ہیچ مرز ہیچ مدان، دبستان نادانی کا ابجد خوان خاک پائے سخنوران نامی زلہ ربائے خوانِ عسجدی؎

؎ عسجدی متوفی ۴۳۲ھ محمود غزنوی کا درباری شاعر بلند پایہ فارسی شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ فردوسی کا ہم عصر تھا۔

و جامیؔ، خاک بیز کوچہ ناکامی ہے۔ پس مخاطب بخطاب مولانا فرمانا، اضعف العباد ناہنجار ننگ انام، ردِ خلائق مستہلام کو صریح بنانا ہے۔ مولانا ہونا ایک امر ہے از بس دشوار فاعتبروا یا اُولی الابصار۔

آج خدا ہی ہمارا حافظ و ناصر ہے۔ حکم بھی ملے تو ایسے، واہ ری قسمت کی خوبی، قبلہ اگر اسی طرح دو چار بار انکسار کی باتیں کیجیے گا تو بھور ہو جائے گا اور ادھر جواد بیچارے کو بھٹیارن نخاس دکھائے تو عجب نہیں۔ ہم دو ٹپی بات کے عاشق ہیں سنیئے! آپ اس وقت قاضی اور آپ کے گھر کے چوہے سیانے، آپ ایک امر متنازع فیہ کا فیصلہ کر دیجیے اور دولت خانہ کا راستہ لیجیے۔ اور ہم سب کے جدّا مجد کے جدّ امجد، اور ان کے نانا جان کے جدّ امجد، پر احسان کیجیے۔ وہ یہ کہ یہ حضرت (آزاد) نیچریہ شاعری کا جنبہ کرتے ہیں، اور ہم چاروں اردو شاعری پر جان دیتے ہیں۔

یہ تو کوئی غور طلب مسئلہ ادق نہیں، کہ غور و تعمق کا محتاج ہو۔ آپ چاروں کا فعل عبث ہے، آپ سیدھے دار الشفا جائیے اور فصد کھلوائیے۔ شاعری پر جان دینا کارِ عقلائے دہر نہیں، فعلِ حمقائے روزگار ہے۔ جانِ عطیہ حضرتِ ایزدِ کردگار ہے۔ اس کو اسی کی راہ میں صرف کرنا فرائض انسانی ہے، ورنہ شعر سخن پر جان دینا خریت اور حماقت کی نشانی ہے۔ باقی رہی دوسری نوع کی شاعری، اس کے نام سے اس نابکار، ردّ خلائق و روسیاہ کے کان آشنا نہیں۔ یہ نیچریہ شاعری کس عالم اجل اور محقق کی تحقیق انیق ہے؟ یہ قسم جدید ہے۔ یا عتیق ہے بینوا و توجروا۔

اس بینوا و توجروا پر پانچوں ہنس پڑے اور اس زور سے قہقہہ لگایا کہ مولانا صاحب کفش کو سٹر پٹر کرتے، جبہ و دستار کو سنبھالتے، چلتے ہوئے۔ اب سر ایا د آئی، اپنا سا منھ لے کر ناک کی سیدھ پر نو دو گیارہ بھاگے۔ راہ میں آزاد نے کہا کہ بھئی سنو غزل مسلسل بندہ درگاہ کو البتہ پسند ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے مصرع میں شہید ہو گئے دوسرے میں بوسۂ لعلِ شکر خا کے خواستگار رہیں۔ مطلع میں معشوق کے خط آنے کا دُکھڑا رو دیا۔ قطع میں محرمِ آبِ رواں کی تعریف کی اب غزل مُسلسل سنیئے۔ ؎

---

[1] جامی۔ مولانا عبد الرحمن جامی متوفی ۱۴۹۲ء ممتاز عالم بلند مرتبہ صوفی اور مشہور شاعر تھے۔

شب وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمین پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل
وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی علامت تھی حاصل
فرحناک تھی روح، دل شادماں تھا
مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکاں وصل کا اک طلسمی مکاں تھا
حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھُلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
کیا تھا اسے بوسہ بازی نے پیدا
کمر کی طرح سے جو غائب دہاں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہّ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اہو ہو ہو! واللہ کیا غزل ہے، پھڑکا دیا۔ روح شاد ہو گئی۔ القصہّ وہ سب سرا گئے اور آزاد ہوٹل پہنچے، سرا میں داخل ہوئے۔ اب ادھر ان کے یار وفادار کا حالِ ذرا بغور سنیے! یہ جو حسب معمول تڑکے گجردم، آنکھیں ملتے پلنگ سے اٹھے تو سب کے سب غائب غلّہ۔

میاں جوّاد

وہ شعرا دل لگی دیکھنے کے لیے اُس دن سرا نہ گئے تاکہ میاں جوّاد اور بھٹیارن میں گلخپ ہو، اور یہ دل لگی دیکھیں۔ بھٹیارن سے مل کر اسباب بھی غائب کر دیا۔

جواد : غیاث (خدمت گار)!

خدمت گار : حضور! الغیاث! الغیاث!

جواد : ایں! یہ کیا سنائی۔

خدمت گار : پیر و مرشد غلام کی تو جان پر بن آئی۔

جواد : یہ جان پر بن آنا کیسا؟

خدمت گار : خداوند، جُل دے گئے اور اسباب بھی کھسکا دیا۔

جواد: یہ پہیلی تو ہمارے "فرشتہ خان" کے بوجھے بھی بوجھی نہ جائے گی۔

خدمت گار: جب آفتابہ اور دیگچی ڈھونڈھیے گا تو قلعی کھل جائے گی۔

جواد: کیا آفتابہ اور دیگچی بھی غائب ہے؟

خدمت گار: جی حضور! ذرا اٹھیے تو میاں، وہ لے دے کے چلدیے۔

جواد: ارے تم نے جانے کیوں دیا؟ ٹانگ کیوں نہ لی۔

خدمت گار: ٹانگ لینے کے لیے گلڈانگ پا لیے، آپ تو پاس لیٹے ہوئے تھے، آپ نے ہی ٹیٹوا لیا ہوتا۔ مجھ پر آپ بن ناحق کو خفا ہوتے ہیں۔

تب تو حضرت بہت ہی گھبرائے، رنگ فق ہو گیا، چو طرفہ ڈھونڈھنے لگے۔ الغرض کنوؤں میں بانس پڑے، مگر ان کی تھاہ نہ پائی، تو وہ شوخ بھٹیاری کیا کہتی ہے: حضور! ہم نے اول ہی کہہ دیا تھا کہ حضور چھٹ، یہ ہوئے سب کے سب بڑے خورتدے، ڈال کے ٹوٹے ہیں۔ باورچی خانہ چٹ کر جائیں، اور نگوڑے ڈکار تک نہ لیں۔ حضور تو ننھی ننھی دو چپاتیاں کھانے والے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ لگانے والے، وہ تو کہو موئے آفتابے ہی کے ماتھے گئی۔ نہیں وہ تو مجھ تک کو چٹ کر جاتے۔ میاں جواد مسخرہ پن میں طاق، ضلع جگت میں مشاق دل لگی، چہل میں شہرۂ آفاق، تھے جھپ سے تک ملا، گردن ہلا ہلا کر، ایک نامہ لکھا:

اے انجن ریلِ رہ نوردی — وے پہیۂ جھکڑۂ ودر بُردی

اے کاگِ جہندۂ لمونیڈ — وے برقِ جہندۂ بریگیڈ

اے رشکِ خرامِ ریل گاری — وے روکشِ ٹانگنِ پہاڑی

اے ورتگ ڈپو برنگ ڈلڈل — وے گولۂ توپِ جنگِ کابل

اے تیرِ کمانِ ملکِ ایران — وے برشِ خنجرِ صفاہاں

اے جوشِ ابالِ گرم ہانڈی — وے قلقلِ بوتلِ برانڈی

اے ریگِ روانِ دشتِ قبچاق — وے چنگاریِ سنگِ چقماق

اے خضرِ نکوے ہامونِ و دشت — وے رشکِ جہانیانِ جہاں گشت

اے شوخیٔ نازِ مہ جبینان — وے طرزِ خرامِ نازنیناں

بعد از شوقِ لقائے صوری — دو دو باتیں سنو ضروری

کیوں جی یہی شرطِ دوستی تھی — جو کچھ مرے ساتھ آپ نے کی

غیروں کو تو راستہ بتایا — یاروں سے بھی راز دل چھپایا
چار آنکھوں کی تھی فقط مروت — بس دیکھ لی آپ کی محبت
دحشت نے جو ہاتھ پاؤں پھیلائے — ایڑی گھسنے کو تلوے کھجلائے
تم کیا کرو تیرھویں صدی ہے — بدلا نیکی کا بھی بدی ہے
معلوم ہوا کہ تم ہو بے پیر — چلنے میں کڑی کمان کے تیر
جس جا سے چلا کہیں نہ اٹکا — یہ پاؤں ہیں یا گھڑی کا کھٹکا
جو کچھ دیکھی بہت سفر میں — نقطے کا ہے بل سفر مستقر میں
برباد کرو نہ مفت جاں کو — صحرا کی نہ خاک دھول پھانکو
کچھ کام نہ آئیں گے یہ خم دم — غربت میں نہ یار ہیں نہ ہمدم
احسان کیا ہم پہ تم نے جانو — اب بھی لوٹ آؤ بات مانو
اب مانو نہ مانو تم ہو مختار — پچھتاؤ گے یار آخر کار
یہ کیا روش اختیار کی ہے — دانشمندی یہ کون سی ہے
کیا لطف نہ آؤ تا و دیدن — زر دادن و درد سر خریدن
چانڈو کی قسم تمھیں پلٹ آؤ — بانو کی قسم تمھیں پلٹ آؤ
افیوں ہی کو کھاؤ گر نہ آؤ — گانجے کو جلاؤ گر نہ آؤ
آئے نہ تو طبلے ہی کو پیٹے — کتوں ہی کی لاش کو گھسیٹے
سوگند تمھیں مدک کی آزاد — ہے تم کو قسم سٹک کی آزاد
لوٹ آؤ۔ یہیں میاں خدارا — تکلیف کرو ذری گوارا

رکتا ہے اسی دعا پہ خامہ
بن جاؤ تمہیں جواب نامہ

ایک دن بازار کی طرف جا نکلے تو ایک مکتب خانہ نظر سے گزرا، ٹوٹا پھوٹا مکان، پرانا دھرانا دالان، دیواریں بابا آدم کے وقت کی، ایک مولوی صاحب دقیانوس کے ہم عصر، بیٹھے ہل ہل کر پڑھا رہے ہیں، اور بیس پچیس کم سن لڑکے زٹل قافیہ اڑا رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے دوسرے کی چاند پر تڑ سے دھپ جمائی، کس نے چپت گاہ پر زناٹے سے دھول لگائی۔ مولوی صاحب پوچھتے ہیں ابے یہ کیا ہوا؟

جی کچھ نہیں مولوی صاحب، تختی گر پڑی تھی ابے! یہ تختی کی آواز تھی؟ جی ہاں اور نہیں تو کیا۔ اتنے میں دو چار شریر لڑکوں نے آپس میں منھ چڑھانا شروع کیا۔ دیکھیے مولوی صاحب یہ منھ چڑھاتا ہے، نہیں مولوی صاحب یہ جھک مارتا ہے۔ ہاں ہاں مولوی صاحب میں بھی دیکھتا تھا۔ نہیں مولوی صاحب یہ تو باہر گیا تھا۔ وہ جانے والے کی ایسی تیسی۔ مولوی صاحب نے کیا خوب فیصلہ کیا کہ چپ رہو، (بک بک بک بک) کتاب کی طرف دیکھ، اچھا تصفیہ چکایا۔ غل غپاڑے کی آواز ایسی بلند ہے کہ آسماں کی خبر لاتی ہے۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی جدھر دیکھو چل پون، کائو کائو، دھول دھپّا، پپّا ڈگی، جوتی پیزار، جھگڑا تکرار، مگر سب کے سب ہل ہل کر بڑ بڑائے جاتے ہیں۔ کتاب تو دو ہی چار پڑھ رہے ہیں۔ مگر واہی تباہی، اناپ شناپ، بہتوں کی زبان پر ہے۔

ایک : آج شام کو میں بانے کی کنکیاں ضرور لڑاؤں گا!

دوسرا : آغا نقی کے باغ میں کوّا حلال ہے۔

تیسرا : ارے مالی تجھے گل بوٹے کی پہچان رہے۔

چوتھا: مولوی صاحب گو پیر ہوئے، نادان رہے۔

پانچواں ؎ پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب
جو کھیلوگے کودوگے ہوگے نواب

الغرض دس پندرہ لڑکے غل مچا کر بیہودہ بک رہے ہیں، مگر سب کی آواز مل ملا کر خاک سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیا خرافات بکتے ہیں۔ ورنہ مولوی صاحب قمچی سے ضرور خبر لیتے۔ ادھر لونڈے یہ زٹل قافیہ اُڑا رہے ہیں، ادھر مولوی صاحب مزے سے اونگھتے ہیں اور مکتب کے خلیفہ جی سوئی تاگا لیے ہوئے انگرکھے میں پیوند لگا رہے ہیں۔ واللہ پورے خلیفہ ہوگئے۔ آخر کار جب مولوی صاحب خواب خرگوش سے بیدار ہوئے تو ایک لڑکے کو بلایا۔ آؤ کتاب لاؤ! سبق پڑھ لو وہ سر کھجلاتا ہوا گلستان بغل میں دبائے مولوی صاحب کے قریب جا بیٹھا، اور سبق شروع ہوا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مولوی صاحب: چھیدا ذری چلم تو بھر لا: شاباش بیٹا دیکھو وہ تمبا کو دھرا ہے۔

لڑکے نے پھر کہا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ہرمزا گفتند، از وزیرانِ پدر چہ خطا دیدی کہ بند فرمودی ہو گفت: گنا ہے معلوم نکردم ولیکن بریقین دانستم کہ مہابت من در دلِ

ایشاں بیکراں بست و بر عہد من اعتماد کلی ندارند ترسم کہ از بیم گزندِ خویش، آہنگ ہلاک من کنند پس قول حکمارا کار بستم کہ گفتہ اند : قطعہ

ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم — دگر با چنو صد بر آئی بجنگ

ازاں بار بر پای راعی زند — کہ ترسد سرش را بکوبد بہ سنگ

مولوی صاحب بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے ہیں اور حقہ گڑگڑاتے جاتے ہیں۔
اب ترجمہ سنیے! ہرمز کے تئیں کہتے ہیں کہ وزیروں سے کیا خطا دیکھی تونے، کہ بند فرمایا تونے۔ گفت کہا، گناہ ایک معلوم نہ کیا میں نے، ولیکن اور لیکن، یا یقین ساتھ یقین کے دانستم، جانا میں نے۔ خوف میرا بیچ دل اُنھوں کے بہت ہے اور اوپر عہد میرے کے پورا نہ رکھا۔ ڈرتا ہوں کہ خوف اپنے کے ڈر سے، قصد مار ڈالنے میرے کا کریں، پس قولِ حکما کے تئیں کام باندھا میں نے، کہ کہا ہے قطعہ اس سے جو کہ تجھ سے ڈرے ڈر تو اے حکیم۔ جو ساتھ چنو کے شکار میں بیچ لڑائی کے، اس سے اسانپ اور پاؤں راعی کے مارتا ہے کہ ڈرتا ہے سر اس کے کوٹھوں کے ساتھ پتھر کے۔

اشاءاللہ! کیا ترجمہ ہے، اور کیا روزمرہ ہے، راعی کے معنی راعی کے تئیں، کیا فصاحت ہے؟ ع۔ دیگر با چنو صد بر آئی بجنگ : کے معنی یہ بتائے گئے کہ "اور جو ساتھ چنو کے بیچ لڑائی کے،" و بر عہد من اعتماد کلی ندارند کا ترجمہ بھی سننے کے قابل ہے کہ" اوپر عہد میرے کے پورا نہ رکھا،" اسی طرح نصف طلبہ نے مولوی صاحب کو سبق سنایا اور نصف نے خلیفہ جی کو، خلیفہ جی نے مولوی صاحب کے بھی کان کاٹے۔ مولانا غتا ربود سے بھی بڑھ گئے ؎ مرغِ شاخِ درخت ملا ہونیم : گوہر دیع گنج اسراریم: کا ترجمہ یوں بتایا "مرغا شام کے وقت ٹہنی پیڑ پر ککڑوں کرتا ہے،" اور اگرچہ ہرڈبا گنج کا اسرار ہے" اے صلِ علیٰ کیوں نہو:

گر ہمیں مکتب ست وہمیں ملا — کار طفلاں تمام خواہد شد

دوپہر کے وقت لڑکے تختی لے کر بیٹھے۔ کوئی گیندے کی پتی تختی پر ملتا ہے، کوئی مہرے یا کوڑی سے تختی کو چکناتا ہے، کوئی دوات صاف کرتا ہے، کوئی قلم پر چاکو تیز کرتا ہے۔ الغرض آدھ گھنٹے تک یہی ہوا کیا۔ بعد ازاں لڑکے لکھنے بیٹھے۔ مولوی صاحب نے کوٹھری سے مکھیوں کو نکالا اور دروازہ بند کرکے سو رہے۔ یہاں خوب لپاڈگی

ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد مولوی صاحب چونکے، کوٹھری کھولتے ہیں تو یہاں دو لڑکے میں چٹ پٹ ہو رہی ہے، دونوں گتھے پڑے ہیں۔ نکلتے ہی ایک پر دو ہتڑ لگانا شروع کیے۔ اب سنیئے کہ جو ڈنڈ پیل لڑکا بانی شر تھا، اس سے تو مولوی صاحب نہ بولے، مگر دبلے پتلے بیچارے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ دو چار کی تختیاں دیکھیں پھر سبق سنا۔ چلیے چھٹی۔

یا مظہر العجائب ہاتھی مع ہودا غائب

میاں آزاد مکتب خانہ کی ہجو کرتے، بڑبڑاتے، دل ہی دل میں گالیاں دیتے جاتے تھے! کہ واہ یہ مکتب ہے، یا منڈی، اتنے میں ایک رئیس با توقیر کی عالیشان کوٹھی کی طرف گزرے، تو حسن اتفاق سے اس وقت رئیس موصوف عالمگیر کا یہ فقرہ پڑھ رہے تھے (آدم خوب بدست نمی آید، کشمیری دریں صوبہ نیست کہ مامقرر کینم) میاں آزاد تڑسے بول اٹھے، آدمی تو کھانچیوں ملیں مگر قدر دان، کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ دور کیوں جائیے، ایک بندۂ درگاہی موجود ہیں۔ رئیس نے اشارے سے بلایا اور کہا: اچھا آؤ ادھر!

آزاد : "آتا ہوں پہنچے کو چڑھائے ہوئے کل پر"

رئیس : ماشاءاللہ آپ شاعر بھی ہیں؟

آزاد : جی! اور چشم بد دور ایں جانب ساحر بھی ہیں۔

رئیس : ہم سحر کے کبھی قائل ہی نہیں ہوئے۔

آزاد : بس معلوم ہو گیا کہ آپ کسی قوس ابرو کی تیغِ نگاہ کے گھائل ہی نہیں ہوئے۔

رئیس : بھئی واللہ کتنے حاضر جواب ہو۔

آزاد : تم بھی بے تکے پن میں انتخاب ہو۔

رئیس : تم تو گالیاں دینے لگے تو نوکری کر چکے۔ بس ہوا کھائیے۔

آزاد : بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائیے، یہاں اسی بات کے لاکھوں پاتے ہیں، کہ ہر بات میں تُنک ملاتے ہیں۔

رئیس : اچھا آج سے آپ ہمارے مصاحب ہوئے۔ مگر سوتے جاگتے ہمیشہ قافیہ

ہی میں جواب لیں گے۔

آزاد : دیں گے اور بیچ کھیت دیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد رئیس نے بلایا۔ آزاد!

آزاد : خانۂ احسان آباد۔

رئیس : اخاہ آپ ہیں؟

آزاد : جی اور نہیں تو کیا، آپ کے باپ ہیں۔

رئیس : مت بک فضول۔

آزاد : چونچ سنبھال نامعقول۔

اب سنیے کہ رئیس سموء المکان بڑے دھوم دھڑکے سے ہاتھی پر سوار ہوتے اور سیر دریا کو چلے، میاں آزاد خواصی میں بیٹھے ہیں، ہاتھی دتیلا، مست مکنا، جیسے ہی دریا میں ہاتھی ڈالا اور اس نے سونڈ سے پانی اچھالا،۔ ہودا ڈانواں، ڈول، ہونے لگا اب گرے اور اب گرے۔

رئیس : خدا بچائیو!

آزاد : یا خدا ڈوبائیو!

رئیس : امام ضامن[1] کی دہائی!

آزاد : آج پوری شامت آئی!

رئیس : یا علی مشکل کشا! مشکل کشائی کیجیے!

آزاد : خواجہ خضر! ذرا ہاتھی کا پاؤں تو پھسلا دیجیے۔

رئیس : یا مُظہرُ العَجائب!

---

[1] امام موسیٰ رضا جو فرقہ شیعہ کے چھٹے امام تھے۔ ان کو امام ضامن کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سفر میں مسافر کی حفاظت کرتے ہیں اس لیے یہ عقیدہ کر لینے والے اپنے اعزا و احباب میں سے جب کوئی عازم سفر ہوتا ہے تو کچھ رقم کپڑے میں لپیٹ کر اس کے بازو پر باندھ دیتے ہیں اس کو امام ضامن کہتے ہیں۔ گویا اس کی حفاظت کی ذمہ داری امام موسیٰ رضا کو سونپ دی۔

آزاد : ہاتھی مع ہودا غائب۔
اتنے میں فیلبان ہاتھی کو نکال لایا اور رئیس نے مارے غصّے کے آزاد کو دھتا بتایا، ڈھکیلا تو زمین پر آرہے، اچھا تک ملایا تھا۔ وہ تو کہیے ریت نہوتی تو قافیہ تنگ ہو جاتا۔ ہاتھ کے ماتھے جاتی، یا پاؤں لنگ ہو جاتا۔ رئیس بھی سوچ کہ اچھے فقرہ باز ملے۔ وقت بے وقت تک ہی ملانے سے مطلب ہے۔ ہم کہتے ہیں یا مظہر العجائب! وہ فرماتے ہیں ہاتھی مع ہودا غائب۔

کھوسٹ شوہر کے نام نوخیز بیوی کا خط

ایک روز میاں آزاد، فرخ نہاد، سیر کر رہے تھے، کہ ایک پیر مرد، لٹھیا ٹیکتے، کانپتے کو بکھتے، آن کھڑے ہوئے۔ اور میاں آزاد سے کہا کہ میاں ذری یہ خط تو پڑھ دیجیے۔ اور اس کا جواب لکھ دیجیے۔

میاں آزاد نے خط لیا، کھولا، اور پڑھ کر سنانے لگے۔

خط : میرے کھوسٹ شوہر خدا تم سے سمجھے۔

آزاد : ایں! یہ نرالا القاب، انوکھا آداب ہے۔ دعا چھپر پر، مزاج پرسی بالائے طاق۔ بسم اللہ ہی غلط، ابتدا ہی سے کوسنا شروع کیا۔ الٰہی خیر۔

پیر مرد : حضرت آپ خط پڑھتے ہیں یا میرے گھر کا قضیہ چکاتے ہیں۔ پرائے جھگڑے سے آپ کو واسطہ۔ جب میاں بیوی راضی ہیں، تو آپ کوئی قاضی ہیں۔ ے خدا کے لیے آپ لفظ بہ لفظ پڑھ دیجیے، مگر اس جھگڑے میں نہ پڑیئے۔

آزاد : اہاہاہا! تو یہ کہیے آپ کی زوجۂ مقدس کا خط ہے۔ ماشاء اللہ خیر صاحب مجھے میاں بیوی کے جھگڑے سے کیا سروکار، خط پڑھے دیتا ہوں۔

خط : میرے کھوسٹ شوہر خدا تم سے سمجھے۔ سکندر ظلمات سے پیاسا آیا۔ مگر تم نے آب حیات کے دو چار قطرے ضرور پی لیے ہیں۔ جب ہی مرنے کا نام نہیں لیتے۔ کچھ اوپر سو برس کے تو ہوئے، اب آخر کیا عاقبت کے بوریے بٹورو گے۔ ذرا دل میں شرماؤ تو، ہزاروں نوجوان نوخیز کفن پوش ہوتے جاتے ہیں، اور تم ٹیاں سے موجود ڈنکو فیور بھی آیا، مگر تم موچھوں پر تاؤ ہی دیتے رہے۔ ہیضہ نے لکھوکھا آدمی چٹ کیے،

مگر حضور بے حیائی کی بلا دور، ہیضہ کے باپ کو چٹ کر جائیں۔ اور ڈکار تک نہ لیں۔ بخار میں ہزاروں حیادار چل بسے۔ مگر تم اور بھی موٹے ہو گئے۔ تم پر فالج تک نہیں گرتا لقوہ تک نہیں مارتا، لُو کے جھونکے تک بھی تمھیں نہیں جھلساتے، دریا میں بھی تم پھسل نہیں جاتے اور سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اگر حیادار ہوتے تو ایک چلو کافی تھا۔ مگر تم وہ چکنے گھڑے ہو کہ عرقِ انفعال کے تم پر ہزاروں ہی گھڑے پڑیں لیکن ایک قطرہ نہ تھم سکے۔ واہ پیٹھے! کیوں نہ ہو! بس نرے پیٹھے ہی ہو۔ ہے ہے! کس ساعت میں تمھارے پالے پڑی۔ کس بری گھڑی تمھارے ساتھ بیاہ ہوا۔ ماں باپ کو کیا کہوں، مگر میری گردن تو کند چھری سے ریت ڈالی۔ اس سے تو کسی کنوئیں ہی میں ڈھکیل دیتے، قصائی ہی کے حوالے کر دیتے، تو یہ روز روز کا کڑھنا تو نہ ہوتا۔ تم خود ہی انصاف کرو کہ تمھارے بُڑھ بھس سے مجھ پر کیا گاج پڑی۔ ہاتھوں میں تو آپ کے رعشہ، پاؤں میں سکت نہیں، منھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت، کمر کمان کی طرح خم، بینائی کی یہ کیفیت کہ دن کو اونٹ نہیں سوجھتا، جریب ٹیک کر دس قدم چلے بھی تو سانس پھول گئی، دم ٹوٹ گیا۔ سستانے بیٹھے تو نقش قدم بن گئے۔ صبح کو ننھی ننھی دو چپاتیاں کھالیں تو شام تک کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں۔ گُرگُری ہو گئی۔ تولہ بھر شکنجبین کا ستیاناس کیا، مگر سوء ہضم کی شکایت بدستور۔ حافظے کا یہ حال کہ اپنے باپ کا نام بھی یاد نہیں۔ پھر آخر سوچو تو، کہ بیاہ کرنے کا شوق کیوں چرّایا، ایک پاؤں تو قبر میں لٹکایا ہے، اور خیال یہ گدگدایا ہے، کہ دولہا بنیں، دُلہن لائیں۔ نوشہ کہلائیں اللہ سوں جس وقت تمھارا پوپلا منھ اور سفید بھوں، اور گالوں کی جھریاں، اور دوہری کمر، اور گنجی چاند، اور منحوس صورت یاد آتی ہے، کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ واہ بڑے میاں واہ! خدا جھوٹ نہ بلائے، تو ہمارے ابّا جان سے پچاس ساٹھ برس بڑے ہوں گے۔ اور امّاں جان کو تم نے گود میں کھلایا ہو تو تعجب نہیں۔ خدا گواہ ہے تم میرے دادا کے بھی باپ سے بڑے ہو۔ مگر واہ ری قسمت، کہ آپ اور میرے شوہر، زمین شق ہو تو میں دھس جاؤں۔

آزاد: قبلہ و کعبہ۔ اس کا جواب کسی منشی بے دل سے لکھوائیے۔

پیرمرد: بڑھاپے میں اب کبھی شادی نہ کریں گے۔

آزاد: کیا خوب! کیا ابھی شادی کرنے کی ہوس باقی ہے۔ ابھی پیٹ نہیں بھرا؟

پیر مرد: اچھا اس کا جواب کل سوچ کر دیں گے۔

میاں آزاد دوسرے روز اٹھے اور سویرے ہی چل کھڑے ہوئے۔ چو طرفہ سناٹا پڑا ہوا۔ مگر ہر سمت لطف اتم ہے، نور کا عالم ہے، جام گل قطرۂ شبنم سے لبریز، نسیم سحری مشکبار و عنبر بیز، کہیں بتانِ ساغر نوش کا جوش و غل، کہیں صراحی و بادۂ گلگون کا قلقل، ادھر فاختہ دستک زنان، ادھر قمری کو کو کنان، پپیہوں کی پکار، موریلوں کی جھنکار، جس شجر کو دیکھو نہال، ہر غنچہ گل زر سے مالا مال، کہیں بلبل چہک رہے ہیں، اور تاروں کی روشنی سے چمک رہے ہیں:

صبحے بہ فروغ دل کشائی — بگداختہ شب بروشنائی
روشن چو جبینِ صبح خیزاں — فیض از دور بام چرخ ریزاں
افشاند بنفشہ و گل از دور — سرتا سر باغ سایۂ و نور
آں گل کہ از و بروزگاراں — در یوزۂ بوکند بہاراں
می جست نسیم نو بہاراں — چوں دیدہ در انتظار یاراں

اس سہانے وقت کا سماں دیکھ کر آزاد مسرور ہوئے۔ خوش و خنداں مست و غزلخواں، دل شاد روح فرحناک، شعرائے ایران زمین کے ساتھ دمساز لب پر شعر حافظ شیراز:

نسیم صبح کہ مستانہ وار میگذری — ندامت ز کدامی دیار میگذری

تھوڑی دیر بعد کانوں میں بھنک پڑی، کہ ان کو کوئی پکارتا ہے کہ:

ادھر دیکھنا، اُو اُدھر جانے والے

ایں! یہ غیب کی آواز کیسی پیچھے پھر کے دیکھتے ہیں تو وہی پیر فرتوت جس کو اس کی بیوی نے کھوسٹ شوہر کے القاب سے یاد کیا تھا۔ اور خط میں خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

آزاد: اخاہ! مزاج شریف؟ کہیے اور کوئی خط تو نہیں آیا؟

پیر مرد: اس نے تو میرا ناک میں دم کر دیا، اور سچ پوچھو تو جس دن سے اس کو بیاہ لائے ناک ہی کٹ گئی۔ ایسی تنک مزاج دیکھی نہ سُنی۔ مجال کیا کہ ناک پر مکھی تو بیٹھ جائے، فوراً میری ناک اڑائے۔ ذری کوئی خلاف بات ہوئی اور تنک گئیں۔

میاں آزاد نے وہ چکنی چپڑی باتیں کیں کہ بڈھا نان پاؤ کی طرح پھول گیا، سوا سو

برس کا تجربہ چٹکیوں میں بھول گیا، گاؤں کا نام، مکان کا پتا۔ صاف صاف بتایا۔ اور ایسا دم میں آیا، کہ بیوی کا کچا چٹھا کہہ سنایا، میاں آزاد نے چپکے سے سب سن لیا جھٹ دوات قلم کاغذ لیے، گلگوں صبا رفتار، خامہ کو صفحہ قرطاس پر کڑ کڑا دیا۔ کھوسٹ شوہر کی طرف سے اس کی بیوی کے نام جواب خط لکھا۔ مگر یاران سر پک، ایک استاد کسی جھانسے سے خط کی نقل اُڑا ہی لائے ذری سنیئے گا۔

جواب خط: میری البیلی، چھیل چھبیلی، تنک مزاج، نازک بدن، مغلوب الغیظ، غنچہ دہن، آگ بھبھوکا، سیم تن، نوعمر و نوجوان، کم سن، نادان بیوی، متوالی بیوی کو! اس کے سن رسیدہ، گرگ باراں دیدہ، کمر خمیدہ، سنجیدہ، و فہمیدہ شوہر کی اٹھتی جوانی دیکھنا نصیب ہو! اے وہ جم جم جیے' اور تم پوتوں پھلو، دودھوں نہاؤ! اٹھارہ لڑکے ہوں اور اٹھارہ دونی چھتیس چھوکریاں، جب میں دہلیز میں قدم رکھوں تو سب بچے ابا آئے، ابا آئے، کھلونا لائے، پٹاخے لائے، کہہ کہہ کر دوڑ پڑیں۔ مگر ڈر یہ ہے کہ تم بھی ابھی کمسن ہو، ان کی دیکھا دیکھی کہیں مجھے ابا نہ کہہ اٹھنا، کہ پاس پڑوس کی عورتیں مجھے انگلیوں پر نچائیں، اور الّو بنائیں، مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی کو اپنے جگر گوشہ کی ہوتی ہے۔ میری نانی کو میں ایسا پیارا نہ تھا جتنی تم مجھے پیاری ہو، اور کیوں نہ ہو، تمھاری پردادی کو میں نے گودیوں میں کھلایا ہے' اور میری بہن نے اسے دودھ پلایا ہے۔ مجھے تمھاری دادی کی خالہ کا گڑیاں کھیلنا اس طرح یاد ہے جیسے کسی کو صبح کا کھانا یاد ہو۔ مگر تمھارے خط نے میرے دل کے ساتھ وہ کیا، جو خزاں چمن اور برق خرمن، کے ساتھ کرتی ہے۔ لیکن مجھ میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ پرلے سرے کا بے حیا ہوں اور کیوں نہو شرم دُلہن کے لیے زیبا ہے۔ بندہ تو چکنا گھڑا ہے۔ مانا کہ آنکھوں میں نور نہیں، مگر چشم نگراں ست۔ قوت سامعہ سے بے بہرہ ہی سہی، لیکن گوش بر آواز زنِ جواں ست۔ پیر ہوں مگر بے پیر نہیں، ہاتھ میں رعشہ سہی مگر حاجت دستگیر نہیں، تم عصائے پیری ہو مگر خاص الخاص میری ہو، گو ضعف کے مارے مرتا ہوں مگر تمھاری محبت کا دم بھرتا ہوں، تمھارا پیارا پیارا مکھڑا، رسیلے نیناں۔ نشیلی انکھڑیاں، گوری گوری بہیاں، جس وقت یاد آتی ہیں کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ وہ خندۂ شکر آمیز، وہ زلف عنبر بیز، وہ خالِ مشکیں، وہ لعلِ نگاریں، وہ ابر کی ایسی مستانہ چال، وہ خط و خال، چندے آفتاب، چندے

مہتاب - وہ چاندنی رات میں نکھر کر نکلنا - کبھی مُسکرانا، کبھی کھل کھلانا، کبھی شرمانا، کیسا لجانا، اور تو اور تمھاری پھرتی سے دل لوٹ پوٹ ہے - کلیجے پر چوٹ ہے، صحن سے جو طرارہ بھرا تو تڑ سے بام پر - یہ چلبلاپن - اور وہاں سے ایک ذقن میں مہتابی پر ہو رہیں، اور وہاں سے پھلانگ ماری تو دَن سے پھر صحن میں، ابر کی طرح اٹکھیلیاں کر رہی ہیں - پھرکی کے مثل چوطرفہ گھومنا، طاؤس وار جھومنا، کبھی کھیلتے کھیلتے میری چپت گاہ پر ٹیپ جمائی - کبھی شوخی سے وہ ڈانٹ بتائی، کہ کلیجہ لرز گیا - کبھی آپ ہی آپ رونا، کبھی دن دن بھر سونا، الھڑپن کے دن، بارہ برس کا سن، تیرے بیساختہ پن کے قربان، بیوی جان، لے کہا مانو، ہمیں غنیمت جانو - میں چراغ سحری ہوں، ہوا چلے یا نہ چلے - اب گل ہوا، اب گل ہوا - میں آفتاب لبِ بام ہوں، اب غروب ہوا، اب غروب ہوا - میں وہ کشتی ہوں جو ڈبکا ڈبکا میشود - مجھے ستانا موے پر سو دُرّے - تم خوب جانتی ہو کہ میں شیریں بیاں ہوں - ستر برس ہوئے، کہ دانت چوہے کی نذر کیے، تب سے حلوے پر بسر ہے، پھر جو روز حلوا کھائے گا اس کی زبان تنگ شکر کیوں نہ بن جائے - وہ میٹھی میٹھی باتیں کروں کہ لب بند ہو جائیں - مگر تم بھی بے قصور ہو - تمھارے گود میں کھیلنے کے دن، ہمارا کچھ اوپر سو برس کا سن، تم طنّاز یہاں کمر خم، تم سرو بلند اقبال، یہاں ریختہ دم، تم گل عذار، باغ و بہار، ہم ضعیف و خستہ زار - مگر ہمارا عشق بھی بلا کا عشق ہے:

عشقم کہ نصیبہ ایست نورس	نامش نہ شنیدہ بودم از کس
ایں شعلہ ندانم از کجا خاست	کز ہر رگ و ریشہ ام بلا خاست
بے وصل تو زندگانیم چیست	صد خندۂ مرگ بر چنیں زیست
زریاب کہ خاک خورد خونم	آتش بدماغ زد جنونم
بادِ تو رسید بر چراغم	بوے تو زوند بر دماغم

تم لاکھ روٹھو پھر ہماری ہو - بیوی ہو، لخت جگر ہو، پیاری ہو، وہ شبھ گھڑی یاد کرو جب ہم دولہا بنے، پرانے سر پر نئی دستار جمائے، سہرہ لٹکائے، مہندی لگائے، اُلو کے دم فاختہ، حواس باختہ، ٹینی مرغی کے برابر گھوڑیا پر سوار میٹھی پوئی جاتے تھے، اور تم دُلہن بنی، سولہ سنگار کیے فنس زرنگار میں سے جھانک رہی تھیں - ہمارے گالوں کی جُھریاں، ہمارا پوپلا منھ، ہماری ٹیڑھی کمر، دیکھ کر خوش تو نہ ہوئی

ہو گی ۔ ع ۔ وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتی ہو ۔ اب ایک نصیحت بزرگانہ یاد رکھو۔ ایک تو میلے ٹھیلے نہ جانا، دوسرے آس پاس کی چھوکریوں کو گوئیاں نہ بنانا۔ خدا کرے جب تک زمین و آسمان قایم ہے، تم جوان رہو، اور نادان رہو۔ الھڑپن دن دونی ترقی پائے، اور جوبن روز بروز بڑھتا جائے ۔ ہمارے سفید بال تمھیں بھائیں، حاسد خار کھائیں ۔ تمھارا پیرنا بالغ، شوہر۔

لکھنؤ کا چہلم

یہاں آزاد نور کے تڑکے جو اٹھتے ہیں، تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا۔ ہر سمت تیرہ و تار، ظلمات سی کیفیت نمودار، کوئی شے نظر ہی نہیں آتی ۔ نور کا فور سرا کے باہر آئے تو چو طرفہ دل بادل ۔ قبلہ کی طرف سے جھومتی ہوئی گھٹا اٹھی ۔ کالی گھٹا، متوالی گھٹا، گھنگھور گھٹا، گھنیری گھٹا، ابر اٹکھیلیوں پر ہے ۔شاخیں مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ ہوا اس زنّاٹے سے چل رہی کہ کلیجہ لرزا جاتا ہے ۔ مرغانِ خوش نوا گھونسلوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ پرندہ پر نہیں مارتا۔ ایک دفعہ ہی بجلی کوندی اور رعد نے گرجنا شروع کیا پھر تاریکی نے وہ زور باندھا کہ کالے کوسوں تک کالی کالی گھٹا ہی نظر آتی تھی اور ہوائے سرد سن سن کرتی جاتی تھی : ؎

آتش گل کا دھواں بام فلک تک پہنچا — جم گیا منزل خورشید کی چھت میں کاجل
جو گیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے — برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر اُدھر آ نہ سکی — قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
کبھی ڈوبی کبھی اُچھلی مہِ نو کی کشتی — بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل

ایک دفعہ ہی پھر دامنی دمکی اور بجلی چمکی تو اندھیری رات میں بس یہی معلوم ہوا کہ سونا کسوٹی پر کسا گیا۔ چشم زدن میں برق چشمک زن، اُلوپ انجن تھی۔ اتنے میں ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں اور کسی شوخ پرفن نے الاپنا شروع کیا کہ :

برسن کو آئیں گھٹا کاری کاری — اددری دھمری کاری بجری کی اجیاری
کارے کارے پیرے پیرے بدرا ایسے سنگھ — بدرا کی گرج سنت جیرا گرجت برسن کو آئیں کاری گھٹا

مگر ہوا نے پھر وہ زور باندھا کہ بادل اوپر ہی اوپر اُڑنچھو ہو گئے۔ کچھ یوں ہی سی بدلی تھی، تو دیکھتے کیا ہیں کہ، دھانی دوپٹہ پھڑکاتی، ایک حسین مہ جبین چمکتی چلی آتی ہے وہ اُودی اودی گھٹا، اور وہ ہلکا دھانی دوپٹا۔ فصل کی چیز، ہر دل عزیز، پوچھا کہاں سواری چلی! مسکرا کر بصد ناز و ادا جواب دیا: لکھنؤ کا چہلم دیکھنے۔ میاں آزاد تو لکھنؤ کے محرم الحرام، اور مجالس عزا کی دھوم دھام، پر لٹو ہو گئے تھے۔ ٹھان لی کہ چہلم کی چہل پہل بھی دیکھیں گے، اور ضرور دیکھیں گے۔ ریل پر سوار ہو کر لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں سے تال کٹورے کی کربلا پہنچے۔ اللہ اللہ! جہاں تک پیکِ نظر کی رسائی ہے۔ بگھیوں، اور اِکوں اور گھوڑوں، اور ہاتھیوں، اور رتھ اور بیل اور ڈولیوں اور فنسوں کا تانتا لگا ہے۔ جدھر جاؤ دھوم، جدھر دیکھو ہجوم۔ بانکے، ترچھے، تیکھے، ٹورے، گنڈے تھے۔ لقے۔ لقندرے۔ دو انگل کی نکے دار ٹوپیاں آلپین سے مستک گاہ پر جمائے، انکھڑیوں میں سرمہ لگائے، بانڈی ٹیکتے، آنکھیں سینکتے، بررتے، اینڈتے، تنتے، اینٹھتے، شربتی کی تین کمر توتی، اور اونچی چولی کے انگرکھے پھڑکاتے، پرے جمائے جا رہے ہیں، جو ہے اونچی بنا، ٹنڈ پیل چوبل کرتا ہے۔ صوفیانِ صافی طینت میں ہُوحق کی صدا بلند ہے۔ مگر افشائے راز میں زبان بند ہے۔ خوش باش بھی پوقدمے جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دل بہلاتے ہیں۔ چانڈو باز بڑھ بڑھ کر دم لگاتے ہیں۔ جب گرماتے ہیں تو دھوئیں کے بلّے اُڑاتے ہیں۔ میاں آزاد گھبرائے کہ ایں یہاں بھی چانڈو خانہ، بھلا چانڈو اور بانو کا یہاں کیا کام ہے۔ واللہ کتنا اژدہام ہے۔ امرا رؤسا، عمائد شہر، چھولداریوں، شامیانوں، خس کے بنگلوں اور خیموں میں تین دن سے مقیم تھے۔ امرا کی شان ہی اور تھی، رؤسا کی آن بان ہی اور تھی۔ کشمیر جنت نظیر کے شال بافوں کا بارِ منت سب کی گردن پر تھا۔ دوشالہ دوسالہ زیب دوش، کوئی چاندی کی گڑگڑی گڑگڑاتا ہے۔ کوئی مشکبو دھواں دھار ہے پیچواں پیتا ہے۔ زیر انداز پر جوبن ہے۔ حقہ کیا دُلہن ہے:

حقّہ نہیں عصا ہے یہ موسیٰ کے ہاتھ میں ... بیجاں بولتا ہے مسیحا کی ہاتھ میں

آگے بڑھتے ہیں تو اربابِ نشاط کے جمگھٹے، معشوق کے جھمکڑے، وہ چھب وہ ادا، وہ ناز وہ

۱؎ کربلا تال کٹورا شہر لکھنؤ کے مغربی حصّے میں واقع وہ مقام جہاں فرقۂ شیعہ کے لوگ تعزیے دفن کرتے ہیں۔

غمزہ، کہ زہادِ صد سالہ بھی تسبیح و تہلیل بھول جائیں۔ اور صوفی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ میاں آزاد گو رنگیں طبع، سودائی مزاج آدمی تھے، مگر دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ اور ایسے گرمائے جیسے چونے پر پانی چھڑک دیا۔ لَاحَوْلَ وَلَا۔ انھوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس متبرک مقام سے منہ نہ موڑا۔ ایک عاشق سنتے ہی لال بھبھوکا ہو گئے۔ اور میاں آزاد کی طرف گھور کر کہنے لگے :۔

دھواں بھٹی سے اٹھ کر یاالٰہی ابر رحمت ہو　　کہ پیشِ زاہدانِ خشک تر دامن کی عزت ہو

اتنے میں باجے کی آواز کان میں آئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا، کہ جناب نواب ممتاز الدولہ بہادر کا تعزیہ آتا ہے۔ بڑے دھوم دھڑکے سے اٹھا ہے۔ میاں آزاد بھی ایک اونچے ٹیکرے پر کھڑے ہو گئے۔ کہ کل کیفیت دیکھیں۔ اللہ اللہ کوسوں تک جلوس ہے۔ ۴۵ ہاتھی دتیلے ایک دنتے، مست دُم کٹے، کوئی زنجیر کو سونڈ سے اُچھالتا ہے۔ کوئی جھومتا ہوا آتا ہے۔ کوئی سر پر خاک ڈالتا ہے۔ مستیوں کی دھت، گھوڑے چابکی کی لت، اونٹ بلبلاتے ہیں۔ شتر غمزے کرتے جاتے ہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ، کیا کاداک کھڈ بھیانک جانور ہے۔ ماشاء اللہ کیا قطع ہے۔ یہ گردن ہے یا شیطان کی آنت، باجے والے وردیاں ڈانٹے، گھوڑوں پر اکڑے بیٹھے ہیں۔ دماغ عرش بریں پر ہے۔ نیچے زمین آسمان بالائے سر ہے۔ خاکی پلٹن کے چار سو تلنگے رِپ رِپ کرتے جا رہے ہیں۔ برچھی برداروں کی لال لال وردی سے گلِ لالہ کھِلا تھا۔ سر تا سرخ بیر بہوٹی بنے ہوئے، بانَ برداریاں چمکاتے، پھر ہرے اڑاتے، بڑے دھڑلے سے ساتھ ہیں۔ بادِ بہاری، شہید کربلا کی سواری، طنبورے چھڑ رہے ہیں۔ باجے نے رنگ جمایا کہ راگ اور راگنی نے مرحبا کا طنطنہ بلند فرمایا۔ نشان کی وہ آن بان کہ ع "عجب تیری قدرت عجب تیری شان" کشتیوں کی قطار، اور ان پر گلاب پاش عنبر بار، گنگا جمنی پر بہار، انگیٹھیوں میں مشکِ اذفر ناخہ و عنبر، چوبدارِ عصای نُقرئی و طلائی لیے جلوس کا زیب و زین ہے۔ کسی سمت آہ و بکا، اور صدائے بین ہے۔ چپراسی لال لال پگیاں جمائے ہدہد کی صورت بنائے، ہاتھ میں خوشنما لکڑیاں، اور ان میں پتیل کی پھلیاں، پھکیت گتکہ لیے اکڑ رہے ہیں، گھائی اور چھوٹ لڑ رہے ہیں۔ طمانچہ دکھایا اور ہاتھ گھومایا، باہرہ دیا اور ہنکٹی کا ہاتھ لگایا۔ گتکہ سو قدم پر اُچھل گیا۔ ہاتھوں ہاتھ سیر بھر حلوا سوہن لیا۔ یہ چمکایا وہ کڑک کر پالٹ کا بھرپور ہاتھ لگایا۔ واہ اُستاد اس صفائی کے قربان کیوں نہ ہو، واہ پہلوان، پھر

ایک دفعہ ہی تین کی دوہری صاف کی توپرے کے پرے صاف تھے۔ زیچ کھیت کہار لڑتے ہیں، گتکے پر گتکے پڑتے ہیں، اب ماتم داروں کا نام لیا تو کروبیوں نے عرش بریں کو تھام لیا، زمین کا گہوارہ ڈانواں ڈول تھا، ہزاروں کا غول تھا، اور حسنؓ اور حسینؑ کی صدا تو کرسی آسماں تک بلند تھی۔ گریہ وزاری، بکاؤ اشکباری، اور برسوں سے دوچند تھی، ہزار ہا عزادار، شریک ماتم، سینہ مجروح آنکھیں پرنم، مرثیہ خواں، خوش الحان، گریہ کناں چماں چماں جارہے ہیں ؂

واحسرتا کہ ماہ محرم گزر گیا — اور چہلم امام دو عالم گزر گیا
تیسرا مصرع غل میں سن نہ سکے — ماتم رہا پہ موسم ماتم گزر گیا

ایک دن اسی طرح سے یہ دنیا تمام ہے
پر شاہ کربلا کی عزا نا تمام ہے

اور یوں بیان کرتے تھے سجادِ خستہ حال — بندی بنا کے لے چلے دیکھو یہ بد خصال
سر ننگے بال کھولے مرا کارواں تھا — سب اونٹ پر سوار تھے میں ساربان تھا

اتنے میں ریلا آیا تو ٹیپ کا شعر سننا محال ہوگیا۔ اس کے بعد کوئی ۲۵ تعزیے آئے۔ ایک سے ایک خوشنما ہر ایک ضریح مبارک قابل دید تھی بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ چوطرفہ علم اور سونے کے پنجے اور پھریرے اور ان میں گوہر شاہوار لٹکتے اور در یتیم و آبدار جھلکتے، پھولوں کی بو باس سے دِماغ طبلۂ عطّار بن گیا۔ دُلدُل سبحان اللہ، سبحان اللہ اشہب آہو شکار، تند خور اہوار، سمند دغا پسند، گرنگ نُقرہ ختک جویائے جنگ، کمیت اور سرنگ سونے کی دمچی، گنگا جمنی لٹو، ڈھال نڈھال، اس کے برابر شمشیر خارا شگاف و خوش غلاف لٹکتی ہوئی۔ چادر میں خون کے ایسے دھبے عزا جس نے اداروں کو خون رُلایا۔ ہر مومن پاک آنسو بھر لایا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ دلدل سوار نے ابھی زخم کھایا ہے اور فرسِ سلیقہ شعار اس سانحہ ہوش ربا کی خبر لایا ہے۔ اور میدان کارزار سے سیدھا چلا آیا ہے۔ باگ ایک طرف کٹی ہوئی ہے۔ ہائے! یہ واقعہ بھی کیسا جگر خراش ہے۔ ہے ہے! سینہ پاش پاش ہے۔ اِدھر تیر، اُدھر کمان، اِدھر داستانہ اُدھر عمامہ، حضرت فردوس آشیاں، فخر زمین وزماں، پل پر مجمع خاص و عام تھا۔ خاتونانِ بلقیس منزلت اور بیگمات لکھنؤ کا بند گاڑیوں میں اژدہام تھا۔ لوگ پلے پڑتے تھے چپے چپے پر لڑتے تھے۔ ساتھوں

کی دکان دھواں دھار، ایک دم میں تو آسماں کے پار۔
میاں آزاد یہاں سے بھاگے تو افتاں وخیزاں کربلا میں دم لیا۔ کیوں میاں یہ قبر کس کی ہے۔ ایک جوان طناز باسینۂ بریاں، و دیدۂ گریاں، بول اٹھا کہ یہ مقام فشار ہے۔ تیرِ غم جگر کے پار ہے۔ ارے نادان یہ حسنو جان کا مزار ہے۔ ہے! دل فگار ہے۔ چشم اشکبار ہے۔ ادھر اُدھر گلاس اور ہانڈیوں کی قطار، بیچ میں مردنگوں کی بہار، قبر پر زر لبفت کی چادر اور مقیش کی جھالر، چو طرفہ کرن، قبر ہے یا دلہن، مسہری میں مرلین زمردگوں گھنڈیاں لگی ہیں، ان سب پر زر لبفت کا نمگیرا ستم ڈھاتا ہے۔ دل ہے کہ امڈا آتا ہے۔ اچھے اچھے وضعدار ارد گرد کھڑے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ ایک جلسۂ یاران سرپل کی طرف سے گزر ہوا، تو عجب گفتگو سننے میں آئی۔ ایک صاحب نے اپنی بیتی واردات یوں سنائی۔ بھئی! قسم ہے خدا کی جیسے ہی جنگل میں پہنچا ہوں عجب تماشا دیکھا۔ واللہ باللہ تم باللہ دیکھتا کیا ہوں، کہ ایک شیر ببر دم ہلاتا درخت کے سایے میں کھڑا ڈکار رہا ہے۔ اور ابا جان کی قسم یہ دیکھیے واللہ کہ مجھ سے اور اس سے کوئی چار ہی پانچ قدم کا فاصلہ ہوگا۔ حضرت میری اٹھتی جوانی اور گینڈا بنا ہوا۔ اور بھئی اللہ گواہ ہے کہ میں اپنی طاقت آزمائی بھی کر چکا تھا۔ ایک دفعہ مکنا ہاتھی کو بڑھ کر طمانچہ مارتا ہوں تو دم دبا کر یہ بھاگا وہ بھاگا پھر میرا ازعم بیجا تو تھا نہیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس شیر کو ایک دفعہ ہی ڈپٹ دیا۔ بھلا بے آگے قدم بڑھایا اور میں نے بھرپور ہاتھ جمایا۔ تب تو شیر اور بھی غرایا۔ بس اس پر مجھے بھی غصہ آگیا۔ پھر تو حضرت قسم ہے جناب باری کی بندۂ درگاہ بھی جم گئے۔ اور زناٹے سے بدن تول کر ولایتی کا ہاتھ جو چھوڑا، تو شیر نے تیورا کر منہ موڑا، میں نے کہا او گیدی! نامعقول، تو شیر ہے یا بھیڑ ہے۔ یہ کہہ کر میں جھپٹ پڑا۔ اور جھپٹتے ہی میاں کی دم جو دبائی تو ہاتھ میں تھی۔ پھر بھاگا۔ میں نے غل مچایا کہ ابے اولنڈورے! (سوچنے لگے) واللہ ہے بڑھ کر ایک ہاتھ ولایتی کا دیا، کاسۂ سر کاٹتی ہوئی پیر کے بر تک پہنچ گئی۔ اتنے میں مجھے خیال آیا کہ ایں، بار خدایا میں مسلح، وہ نہتا، یہ تمغائے شجاعت نہیں۔ معاً خدا گواہ ہے تلوار پھینک کر چمٹ گیا۔ (پھر سوچنے لگے) ہاتھوں ہاتھ دستی کھینچی، اور کولے پر لاد کر دھم سے زمین پر دے پٹکا۔ چاروں شانے چت، وہ پچھاڑا۔ تین دفعہ تال ٹھونک، یا علی کہہ کر اٹھا۔ مگر اپنی جان کی قسم! اس وقت داد دینے والا کوئی نہیں اِدھر اُدھر دیکھا، سناٹا اتنے میں

جنگل کے بھورے ریچھ نے آکر ڈنڈ مل دیے۔

میاں آزاد چپکے چپکے بیٹھے سن رہے تھے۔ جب داستان ختم ہوئی تو ان کی گپ پر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے چلے، کہ اتنا جھوٹ، ریچھ کا ڈنڈ ملنا کیا معنی۔ ریچھ بھی ان کا کوئی چچا تھا اور ماشاء اللہ ایسے کرارے ہیں کہ شیر ببر سے مقابلہ کیا۔ اس پر بات بات میں قسم کھانا۔ اور جناب باری کو درمیان میں لانا، لاحول ولا قوۃ۔

مکتب خانہ

ادھر آثارِ بہار گنبدِ دوّار سے پدیدار ہوئے، ادھر میاں آزاد خواب نوشیں سے بیدار ہوئے نورِ سحر جلوہ آمیز، بادِ شمال عطر بیز، نوبت خاتون سے آوازۂ زیر و بم بلند، نوائے نائے جان نواز و دل پسند، مرغان خوشنوا شاخ گل پر غزل سرا، غنچہ سرگرم شگفتن۔ خار مستعد سبزہ زار گشتن:

وقت ست کہ گل برفگند پردہ زرخ باد
زانسان کہ زفانوس چراغی بدر آید

میاں آزاد سرا سے اس طرح نکل گئے زن سے، جیسے روح تن سے، یا بوئے گل چمن سے، یا بزدل سپاہی رن سے۔ شوق چرایا کہ اس پیر فرتوت قبلہ پیری وصد عیب، کھوسٹ شوہر کی بیوی کا گھر ڈھونڈھ نکالیں۔ خط دیں اور جواب لیں۔ اور دل لگی دیکھیں۔ شوق نے ایسا گدگدایا کہ شہ گام جانے لگے۔ اور ڈپٹ ڈپٹ کر قدم بڑھانے لگے۔ دوپہر کو ایک ہرے بھرے درخت کے سایہ میں بستر جمایا، روغنی روٹی اور گوشت اڑایا، جب ٹانٹھے ہوئے تو کمر کسی اور چلتا دھندا کیا۔ بارے خدا خدا کر کے کافر سفر سر سے اترا۔ اور حضرت آزاد داخل منزل مقصود ہوئے۔ گو بڈھے گاؤدی کو جھانسے دے دے کر! ٹھیک پتا پوچھ آئے تھے، مگر پردیسی آدمی جھٹ پٹا وقت، گلی کوچوں سے ناواقف، اجنبی غریب الوطن، نیا شہر جائیں تو کہاں جائیں، اور پتا پائیں تو کیوں کر پائیں۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکے پھرے! آخر کار سرا میں دھنسے۔ رات بھر وہاں بسیرا کیا۔ نور کے تڑکے مکان کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

اب سنیے کہ پیر نابالغ کا مکان نیب ٹولہ میں تھا۔ ان حضرت کو املی محلہ یاد رہا۔ چلیے مکان کھٹائی میں پڑ گیا۔ اب ایک ایک سے گڑگڑا کر پوچھتے ہیں۔ کہ حضرت املی محلہ کدھر

ہے ؟ کوئی دل لگی باز انگلی کے اشارے سے بتاتا ہے کہ ادھر ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ادھر ہے۔ ایک نے کہا ناک کی سیدھ پر چلے جائیے! پھر داہنے ہاتھ آئیے، پھر نکڑ کی طرف منھ پھیلائیے، سامنے املی محلہ ہے۔ لیجیے ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیب چڑھا۔ ایک تو پردیسی آدمی دوسرے ٹھٹھول، فقرہ بازوں نے فقرے دینے شروع کیے، چلتے چلتے ایک مکتب خانہ یہاں بھی نظر آیا۔ مولوی صاحب بڑے معمّر و سن رسیدہ در وغ گو جہاں دیدہ کھٹیا پر دوزانو بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔ ریش مخضب تا بہ ناف، سر مبارک کوہ قاف، گول گول، دیدے، کھوپڑی گھٹی گھٹائی، اس پر کلاہ ترتری خوب جمی جمائی۔ ہاتھ میں تسبیح لیے کھٹ کھٹا رہے ہیں۔ لونڈے ارد گرد غل مچا رہے ہیں۔ ہو حق کی آواز بلند۔ منڈی سے بھی غل غپاڑا دہ چند، تہذیب منزلوں دور، ادب کافور، مگر مولوی صاحب سے اس طرح ڈرتے ہیں، جیسے چوہا بلاؤ سے، یا افیونی ناؤ سے۔ ذری چتون تیکھی ہوئی اور کھل بلی مچ گئی۔ سب کتابیں کھولے جھوم جھوم کر مولوی صاحب کو پھسلا رہے ہیں۔ ایک شعر جو رٹنا شروع کیا تو بلا کی طرح اس کو چمٹ گئے۔ مطلب تو یہ ہے کہ مولوی صاحب، منھ کا کھلنا اور زبان کا ہلنا، اور ان کا جھومنا، دیکھیں۔ کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ اس سے سروکار نہیں۔ طرز تعلیم سے مولانا بالعلم والفضل اولنا محض ناواقف، پڑھے لکھے بھی واجبی ہی واجبی تھے۔ کچھ شد بد جانتے تھے۔ ایک شاگرد سے چلم بھروائی۔ دوسرے سے حقّہ تازہ کرایا۔ دم دھاگے میں کام لیا۔ حقہ گڑگڑایا، اور دھواں اڑایا۔ شامتِ اعمال سے کہیں حضرت افیوں کے بھی عادی تھے۔ چینی کی پیالی آئی۔ افیون گھولی اور نوش فرمائی، ایک مہاجن کے لڑکے نے برفی منگوائی۔ آپ نے خوب ڈٹ کر چکھوتیاں کیں۔ جب ٹنگار چکے تو پینک نے آدبوچا۔ اونگھ حقہ خم ہوگیا، ناک میں دم ہوگیا، گردن اب زمین پر آئی، اور اب زمین پر آئی، حقہ یہ گرا وہ گرا۔ چل چل چل، دھم چلیے حقہ تو چکنا چور ہوگیا۔ دو ایک لڑکوں کی کتابوں پر چنگاریاں گریں۔ اب پینک سے چونکے تو دو چار شاگردوں کو دوہتڑ پیٹنا شروع کیا۔ ایسے جھلائے کہ کسی کو چپت لگائی، کسی کی کھوپڑی پر دھپ جمائی، ایک کے کان گرمائے دوسرے کو چپتیں لگائیں۔ ماشاءاللہ اس وحشت کے صدقے، پینک میں آکر خود تو حقہ گرایا اور شاگردوں پر بے قصور قمچیاں پڑنے لگیں۔ خیر اتنے میں ایک لڑکا مفید نامہ لے کر قریب آیا۔ ربِّ یسّر و تمم بالخیر! یا فتاح! برادر صاحب مظہر اشفاق و مہربانی

ومصدر اخلاق، قدردانی، سلمہ اللہ تعالیٰ۔
ترجمہ: برادر صاحب جائے ضرور اشفاقوں کے اور جائے صدور اخلاقوں اور قدر جاننے والے کے، سلامت رکھے تم کو اللہ برتر۔ اے سبحان اللہ۔ واللہ کیا ترجمے کی مٹی پلید کی ہے۔ اور تو اور یہ مظہر کا ترجمہ جائے ضرور، کتنا موزوں ہے۔ مصدر کے معنی جائے صدور، لیکن کم استعداد لڑکوں کے لیے جائے صدور اور مصدر دونوں یکساں۔
اور سنیے آرزوئے مواصلتِ سامی از تکلفات دانستہ بہ مطلب می گراید۔
ترجمہ: آرزو ملاقات بڑی کی تکلیفوں سے جان کر بیچ مطلب کے گراتا ہے۔ بارک اللہ کیا فصیح ترجمہ ہے۔ ماشاء اللہ کیا روزمرہ ہے۔ ملاقات بڑی کی بیچ مطلب کے گراتا ہے، لاحول ولا ترجمے کی اچھی ٹانگ توڑی۔ پھر لڑکے نے کہا:

دلم کشود کشادم چو نامہ ات گوئی　　　کلید بابِ گلستانِ دلکشائی بود

ترجمہ: دل میرا کھلا، کھولا میں نے جو خط تیرا، کہے تو کنجی دروازے باغ دل کھولنے کی تھی (اے صلّ وجلّ)

اور دل لگی سنیے، کہ مولوی صاحب بھی شاگرد کے ساتھ پڑھتے جاتے ہیں، اور دونوں ہلتے جاتے ہیں۔ جب یہ پڑھ چکے تو دوسرے صاحب مینا بازار بغل میں دبائے، تشریف لائے۔

لڑکا: بسم اللہ الرّ۔

مولوی صاحب: ہائیں۔ گاؤدی نئی کتاب شروع کی اور چراغی ندارد، شکرانہ چھپر پر، ہدیہ بالائے طاق، جا دوڑ کر گھر سے دو آنے لے آ۔

لڑکا: مولوی صاحب کل لیتا آؤں گا۔ آپ تو ہتھے ہی پر ٹوک دیتے ہیں۔ آپ کو اپنی مٹھائی سے مطلب ہے یا مفت کے جھگڑے سے۔

مولوی صاحب: یہ جھانسے کسی اور کو دینا۔ اچھا اپنے ابّا کی قسم کھا کہ کل ضرور لاؤں گا۔

لڑکا: مولوی صاحب کے بڑے سر کی قسم! چڑھتے چاند تک لاؤں گا۔ اس پر سب لڑکے ہنس پڑے کہ کیا حاضر جواب لڑکا ہے۔ قسم بھی کھائی تو مولوی صاحب کے سر کی۔ اور سر بھی بڑا، واللہ کیا زبان دراز ہے۔

مولوی صاحب: چپ نامعقول، میرا سر کیا کدو ہے! اچھا پڑھو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ربِّ یسّر و تمّم بالخیر۔ یا فتاح۔ عصمتیانِ روپوش، حیا پرور خلوتیانِ عفت کوش، پاک نظر را مژدہ باد کہ وقت گرمی بازار نشاط است۔ وبسط بساطِ انبساط۔ یعنی زنانہ بازار سے ملائک نظر فریب، دل نشین تمام۔ لَاحَولَا وَلَا قُوَّۃَ، اضافتوں کو کیسا ستیاناس کیا اور فقروں کے ہاتھ ایسے توڑے کہ بالکل گنجا ہی کر دیا۔ عفت کوش کو عفت مژدہ باد، اس کی دال کو کاست بیانیہ سے خلط ملط کر کے، دکہ بنایا۔ است کو بسط سے ملایا۔ ملائک نظر فریب کے ملائک کو اوپر کے فقرے میں داخل کیا۔ نظر فریب کو دل نشین تمام سے پیوند لگایا۔ اور مولانا صاحب چوں بھی نہیں کرتے۔ وہ اور ہی فکر میں ہیں۔ مٹھائی کی فکر میں لب بند ہیں۔ سوچ رہے ہیں کہ جو کل دو آنے نہ لایا تو خوب کوڑے پھٹکاروں گا۔ تسمہ تک تو باقی رکھوں گا نہیں۔ اپنے حلوا مانڈے سے مطلب۔ دس پانچ طلبہ عجیب قطع سے پڑھ رہے ہیں۔ کتابیں تو سامنے کھلی ہوئی ہیں۔ مگر نظر آسمان پر ہے۔ منہ سے اول جلول بک رہے ہیں۔ خالق باری حفظ، مامقمان برزبان، مگر پوچھ بیٹھے کہ ع چیل ہے درگوش کن گفتارِ من، کہاں لکھا ہے تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ میاں آزاد اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے سرا پہنچے۔

میاں آزاد مکتب خانے کی حالتِ سقیم اور مولوی صاحب کی طرزِ تعلیم اور لونڈوں کی چیں پوں (دیکھ سن کر) ایسے طیش میں آئے کہ اگر پاتے تو مولوی صاحب کو کچا ہی کھا جاتے۔ سرا میں جاتے ہی حضرت نے مکتب خانے کی تصویر کھینچی، اور پھر اس کا خوب خاکہ اڑایا۔ اشتہار"

گر ہمیں مکتب ست و ایں ملا   کارِ طفلان تمام خواہد شد

یہ مکتب خانہ ہے یا وحشت کی منڈی۔ جدھر دیکھو بوکھلاہٹ کے ڈھیر، حماقت کے تودے، جہل کی کھانچیاں بھری ہوئی ہیں۔ چل پوں، غل غپاڑا، دھول دھپا، شور و غوغا، معلوم ہوتا ہے بھری برسات میں جنادری مینڈک غاؤں غاؤں یا سحر کاذب کے وقت کوے کاؤں کاؤں کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی غرفش طرزِ تعلیم، واہ جی واہ لہٰذا بندۂ درگاہ نے یہ چند سطور تنبیہ غافلین اور قدر دانیِ کاملین کے لیے تڑ سے لکھ ڈالیں۔ کہ ثانی الحال سند بنا شد، وعندالحاجت بکار نیاید۔

۱۔ نور کے تڑکے سے جھٹپٹے وقت تک لڑکوں کو مکتب خانہ میں قید رکھنا اینجانب کے

پسند نہیں۔ دس بجے آئیں، چار بجے رخصت پائیں، چلیے چھٹی ہوئی۔ یہ نہیں کہ دن بھر دانتا کِلکِل، کہ پڑھنا بھی اجیرن ہو جائے۔ اور خواہ مخواہ یہی فکر دامن گیر ہو کہ درس تدریس کی دُم میں موٹا سا رسا باندھیں اور دل کھول کر گل چھرّے اڑائیں۔ مولوی صاحب کو ہوا بتائیں۔ مدرسہ چھوڑیں۔ پڑھنے لکھنے کی گردن مروڑیں۔

۲۔ میاں! اس بھونڈی روش کو چھوڑو۔ اور اس بھدے قاعدے سے منھ موڑو، کہ جتنے لڑکے ہیں سب کا سبق مختلف۔ دشمنوں کی آنکھوں میں خار۔ خیر سے تیس چالیس طلبہ ہیں۔ دو دو، چار چار، دس دس کی ایک ایک جماعت کیجیے تو کیا گناہ ہے۔ محنت کی محنت بچے۔ کام کا کام زیادہ ہو۔ اور فائدہ کھانے ہیں۔

۳۔ جدھر نظر ڈالتا ہوں انشا کی تعلیم ہو رہی ہے۔ کوئی انشاءِ خلیفہ بغل میں دبائے ہیں۔ کوئی انشاءِ فیض رساں کھولے بیٹھا ہے۔ کوئی انشاءِ دلکشا کا سبق پڑھ رہا ہے۔ یا دیوانوں کی بھر مار ہے۔ کہیں دیوانِ عرفی، کہیں دیوانِ بہار ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ میاں صاحب اتنا تو سوچیے، کہ تعلیم میں صرف علمِ ادب ہی شامل نہیں، ریاضی میں ریاضت کیجیے، جبر و مقابلہ اور اقلیدس کا سبق دیجیے۔ کسی گھنٹے میں علم تاریخ لیجیے۔ وقس علیٰ ہذا۔ یہ نہیں کہ گلستان ما مقیمان عطائی نامہ انشاءِ خرد افروزہی پر لٹو ہیں۔ واہ رے تعلیم مگر پڑھائے کون؟ مولانا صاحب کو تو سو تک کی گنتی بھی نہیں آتی، اقلیدس کی صورت ہی نہیں دیکھی۔

۴۔ سب لڑکوں کا غل مچا مچا کر آواز لگانا، لچر بات۔ محض فضول بالکل خرافات ہے۔ کوئی خوانچہ والا۔ گنڈیری والا۔ چنے پر مل والا، اس طرح چلائے تو مضائقہ ندارد۔ مٹروٹر گول گپے، مصالح کے بیگن، مولی۔ تورئی لو ترکاری کو، یہ تو پھیری دینے والوں کی صدا ہے۔ پس مکتب کو منڈی بنانا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ بھئی واللہ کیا تماشہ ہے۔ یہ چل پون، ادب آداب کے خلاف ہے۔ ہاں کسی وقت باآواز بھی پڑھے تو خیر۔

۵۔ ترجمے پر خدا کی مار، شیطان کی پھٹکار، جاتا ہوں بیچ ایک باغ کے واسطے لانے اچھی چیزوں کے۔ لَاحَوْلَ وَلَا۔ لاحول ولا۔ میں نے دیکھا، میں نے تو جاتا ہے تو۔ اے واہ کیا تو تو میں میں ہے۔ چھری گردن پر مولانا! واسطے خدا کے، ذرا ترجمہ تو فصیح بنایا کرو ورنہ لڑکوں کا روزمرہ صاف ہو چکا۔ ترجمے میں اردو پن تو پایا جائے، یہ تو نہ کوئی

آوازہ کسے کہ پشتو میں بھیک مانگ رہے ہیں۔ فقرے چست ہوں، لفظ درست ہوں، محاورات دل نشین سیکھیں آدمی بنیں۔ یہ نہیں کہ اُول جلول ترجمہ کر کے زبان ہی خراب ہو جائے۔

۶۔ پڑھتے وقت لڑکوں کا ہلنا عیب ہے! مگر کہیں کس سے؟ مولوی صاحب تو خود جھومنے لگتے ہیں۔ ع۔ وزیرے چنیں شہر یارے چناں"

۷۔ یہ ناک سے غن غنانا چہ معنی دارد۔ مدرسہ خانہ ہے یا مکتب خانہ۔ معقول۔ جس لڑکے کو دیکھو ناک سے تلفظ کر رہا ہے۔

۸۔ مطلب مطلب متن پڑھو، انیڈ ابینڈا ترجمہ کرو، مگر سمجھ خاک نہیں۔ سمجھے اور پتھر کے ہوئے۔ مولانا ذرا دل میں سوچیے تو کہ جب طالبِ علم مطلب ہی نہ سمجھے گا تو اس کو فائدہ کیا خاک ہوگا۔ پڑھاؤ چاہے کم، مگر مطلب زیادہ بتاؤ، املا روز لکھاؤ، ہجے ضرور پوچھو۔

۹۔ سبق کو برزبان رٹانا بھی حمق کی نشانی ہے۔ کتاب بند کی اور فر فر دس صفحے برزبان سنا دئے خیر حافظہ ہی نے قوت پائی سہی۔ مگر ستم یہ ہے کہ پھر طوطے کی طرح حق اللہ، پاک ذات اللہ کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ مطلب پر نظر ہی نہیں ڈالتے۔ مدعا سے سروکار ہی نہیں رکھتے۔ اور طرّہ یہ کہ اگر پوچھ بیٹھے کہ فلاں شعر کہاں ہے؟ تو لگیں بغلیں جھانکنے اور مُنھ تاکنے۔ مولوی صاحب نے ایک سطر بتا دی۔ وہ لڑکے نے تھوڑی دیر میں نوک زبان کرلی۔ اب اگر پوچھے کہ لفظ (گفتم) کہاں ہے، تو ان کی بلا جانے۔ انھوں نے کل فقرہ یاد کرلیا۔ مگر حرف آشنا نہیں۔ اے لاحول اے لاحول۔

۱۰۔ اردو سے فارسی، اور فارسی سے اردو میں ترجمہ روز لکھنا چاہیے۔ ورنہ پھر یہی ہونا ہے۔ کہ مولانا بالعلم والفضل اولٰنا، بن گئے لیکن ایک سطر نہیں لکھ سکتے۔

۱۱۔ کم استعداد طلبہ کو اکثر کتبِ اَدَق پڑھائی جاتی ہیں۔ ماشاء اللہ کیا تعلیم ہے۔ ذری سے ٹٹو پر جب دو ہاتھیوں کا بوجھ لاد دوگے، تو ٹٹو بے چارہ آنکھیں مانگنے لگے گا یا نہیں معصوم بچہ اور پڑھے سکندر نامہ، واہ ری عقل چار۔ آتشیںج کا تلفظ اس کے پیر سے بھی نہ ہو سکے۔ بھلا مناجات کا مطلب وہ کیا سمجھے۔ جشن نوشابہ میں اسے کیا لطف اٹھے۔

۱۲۔ لڑکے کو ابتدا ہی سے فارسی پڑھانا، اس کا ذہن کند کرنا ہے۔ پہلے اردو پڑھایئے،

جب اس میں عبور ہو تو بسم اللہ فارسی سہی، مگر ابتدا ہی سے کریما مقیماں پڑھانا اس کی مٹی پلید کرتا ہے۔ ابتدا میں فارسی کی ایسی کتابیں پڑھانی چاہئیں جو سہل ہوں جن میں عمدہ محاورات ہوں۔ لفظ ادق نہ ہوں۔

۱۳۔ مولوی صاحب لڑکوں سے حقہ بھروانا، حقہ تازہ کرانا، چھوڑ دیں۔ اس کے عوض ان کو نشست برخاست کے قاعدے، ادب اور تہذیب سکھائیں۔

۱۴۔ افیونی مولوی چھپر پر رکھے جائیں۔ مولوی نے افیون کھائی، اور لڑکوں کی شامت آئی، وہ پینک میں جھوما کریں گے، لڑکے اِدھر اُدھر گھوما کریں گے۔ ع۔ کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہے۔

یہ اشتہار جلی قلم سے لکھ کر میاں آزاد راتوں رات مکتب کے دروازے پر چپکا آئے۔ اور جھٹ سے نقل کر کے شہر کے تین چار مشہور مقامات پر بھی چپکا دیا۔ اور سرا میں لمبی تان کر سو رہے۔

میاں آزاد پھر آپ جانیے ایک دل لگی باز آدمی، مکتب خانہ کا خاکہ اڑا کر جا بجا مولوی صاحب کا اعمال نامہ چپکا کر چمپت ہوئے۔ دوسرے روز گاؤں والوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ ہر اشتہار کے پاس ٹھٹ کے ٹھٹ جمع۔ غٹ کے غٹ پلے پڑتے ہیں۔ جسے دیکھو قہقہہ اڑاتا ہے۔ لوٹن کبوتر ہوا جاتا ہے۔ بھئی واللہ کسی بڑے ہی فقرہ باز کا کام ہے۔ اچھی اچھی پھبتیاں کہیں۔ خوب آوازے کسے، اور مولوی بے چارے کو تو لے ہی ڈالا۔ اس کو بڑا ہی کر دیا۔ کیا گرما گرم فقرے ہیں۔ مکتب خانہ میں لڑکوں کے چہرے گلنار ہو گئے۔ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ہات تری کی۔ روز چڈا گجر د کچیاں جماتے تھے۔ چپتیں لگاتے تھے۔ افیون گھولی اور سر پر شیخ سدّو سوار، دو ہتھڑ پیٹنا شروع کیا کسی کے کان گرمائے، کسی کے سر پر دھپ لگائی۔ جو بولا اس کی شامت آئی۔ خوب ما ما پختیاں اڑائیں۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ مولوی صاحب تشریف کا بقچہ لائے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ع۔ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے" لڑکے کہنا نہیں مانتے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کتاب کھولو۔ شاگرد جواب دیتے ہیں۔ بس منھ بند کرو۔ فرمایا دور ہو۔ یہاں سے اٹھ جا۔ جواب پایا کہ چپ چاپ بیٹھا رہ۔ فرمایا کہ اب بولا تو ہم بگڑ جائیں گے۔ شاگردوں نے کہا ہم خوب بنائیں گے۔ تب تو جھلائے اور ڈپٹ کر فرمایا کہ میں بڑا گرم مزاج ہوں۔ ایک زبان دراز نے مسکرا کر کہا پھر

پھر ہم ٹھنڈا بنائیں گے۔ دوسرا بولا، قبلہ اگر آپ گرم مزاج ہیں تو برفستان میں بستر جمائیے تیسرے حاضر جواب نے کہا: گرم مزاجی تو بخیر، مگر دماغ پر البتہ گرمی چڑھ گئی ہے۔ باہر کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ جوق جوق تماشائی بازاری سفید پوش، گنوار کھڑے قہقہے اُڑا رہے ہیں۔ باہر گئے تو اشتہار نظر آیا۔ پڑھا تو عرق عرق ہو گئے۔ دل ہی دل میں راقم اشتہار کو گالیاں دینے لگے۔ پاؤں تو کچا ہی کھا جاؤں۔ اتنے ڈنڈے لگاؤں کہ بچہ جی چھٹی کا دودھ یاد کریں۔ مردود نے کیسا خاکہ اُڑایا ہے اور کچا چٹھا لکھ مارا۔ یہ جب ہی لڑکے ڈھیٹ ہو گئے۔ میں کہتا ہوں آم، وہ کہتے ہیں املی، اب عزت ڈوبی، جان ہی پر بن آئی۔ مکتب خانے میں قہر درویش برجان درویش کہہ کر دھنس پڑوں تو خوف ہے کہ مبادا لونڈے روز کی کسر نکالیں۔ اور انجر پنجر ڈھیلے کر دیں۔ بھاگ جاؤں تو روٹیوں کے لالے پڑیں۔ کھاؤں کیا انگارے۔ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

الغرض ٹھان لی کہ بوریا بدھنا چھوڑو، ملاگیری سے منھ موڑو، چلتا دھندا کرو۔ بھاگے تو گھر پر دم لیا۔ لڑکوں نے جو دیکھا کہ مولوی صاحب پٹا توڑ بھاگے جاتے ہیں۔ تو جوتیاں بغل میں دبا، پائنچے چڑھا، تختیاں اور بستے دبا، دواتیں سنبھال، دُم کے پیچھے چلے۔ فوجِ طفلاں مفت، یارانِ ٹرپل باہم کیا چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔

ایک : ارے میاں یہ بھاگا کون جاتا ہے بگٹٹ۔

دوسرا : شیطان روز بچۂ انسان کو بہکاتے تھے، اب چڑھ گئے لڑکوں کے داؤ پر۔ بھئی ان سے شیطان نے بھی پناہ مانگی۔ دیکھو نہ کیا بھیگی بلی بنے دم دبائے بھاگے جاتے ہیں "لاحول ولا"۔

اب سنیئے کہ قصبے بھر میں کھل بلی مچ گئی۔ اجی ایسے مکتب کی ایسی تیسی، پڑھانے کی دُم میں نمدا، برسوں سے لونڈے پٹتے ہیں۔ ایک حرف نہ آیا۔ لڑکوں کی مٹی پلید کی۔ پڑھانا لکھانا خیر صلاح، چلمیں بھروایا کیے، سب نے مل کر کمیٹی کی کہ ایک جلسہ عام میں مولوی صاحب کا امتحان لیا جائے۔ اور منادی ہو کہ جس مقدس بزرگ نے یہ اشتہار لکھا ہے، وہ ضرور قدم رنجہ فرمائیں۔ عزت بخشیں۔ رتبہ بڑھائیں۔ ڈھنڈورا قصبے بھر میں کہتا پھرا کہ خلق خدا کا، ملک سرکار کا، حکم پریسیڈنٹ بہادر کا کہ آج نیب ٹولے میں

ایک کمیٹی ہوگی۔ مولوی صاحب جو لڑکوں کو پڑھاتے ہیں ان کا کام تمام کیا جائے۔ اور امتحان لیا جائے گا۔ جس نے اشتہار لکھا ہے وہ بھی حاضر ہو کر دم دھم۔

میاں آزاد نے جو یہ ہانک سنی، تو بہت ہی خوش ہوئے۔ اہو ہو، ہو ہو! مولوی صاحب کی قلعی بھی کھولیں گے اور نیب ٹولے میں پیر فرتوت کی البیلی چھیل چھبیلی بیوی سے بھی ہنسیں بولیں گے ع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار، ہوا کے جھونکے کی طرح سن سے کمیٹی میں داخل، اور غڑاپ شریک محفل ہوئے۔ جب دو تین سو آدمی اہالی موالی، ڈوم ڈفالی، اشراف اجلاف، ایرا غیرا نتھو خیرا، حلوائی۔ نان بائی۔ خوش باش، عیاش، سب جمع ہوئے تو صاحب پریسیڈنٹ جلسہ نے فرمایا۔

صاحبو! آج آپ کو اس غرض سے تکلیفِ مالا یطاق دی گئی ہے۔ کہ مولوی صاحب کی خبر لی جائے۔ مولوی صاحب عرصۂ دراز سے میٹھے ٹکڑے اڑایا کیے اور لڑکوں کو واہی تباہی سبق پڑھایا کیے، اوٹ پٹانگ، اناپ شناپ، بتایا کیے۔ اب ان کا امتحان لیا جائے پورے اتریں تو خیر ورنہ القط۔

ایک ممبر نے کہا۔ حضرت یہ تو سب کچھ ہے، مگر مولوی صاحب اس وقت ندارد ہیں۔ ایک طرفہ ڈگری نہ دیجیے۔ وہ آئیں تو امتحان لیجیے، ورنہ ع۔ خانۂ ملاح در چین ست و کشتی در ختن۔" مگر کہیں یہ نہ کیجیے گا کہ ان کو کچا چٹھا لکھ بھیجیے۔ وہ بھی آئیں جو۔ ہم ایک تدبیر بتائیں۔ جو دوڑے نہ آئیں تو مونچھ منڈا ڈالوں، ہاتھ قلم کرا ڈالوں۔ کہلا بھیجیے کہ زید بکر خاں کسی کے یہاں شادی ہے۔ نکاح پڑھنے کے لیے ابھی بلاتے ہیں۔ سب حاضرین جلسہ نے کہا: خوب سوجھی۔ دور کی سوجھی، واللہ اچھی سوجھی، آدمی گیا۔ اور دروازے پر آواز دی۔ مولوی صاحب مولوی صاحب اجی مولوی صاحب ہوت! ارے کیا مر گئے۔ اس گھر میں کوئی ہے یا سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اجی مولوی صاحب! الٰہی توبہ چیختے چیختے گلا سوکھ گیا مگر صدائے بر نخاست۔ دروازہ دھمدھمایا، کنڈی کھڑکھڑائی، مگر جواب ندارد، تب تو آدمی نے جھلا کر پتھر پھینکنے شروع کیے اور دو ایک مولوی صاحب کے سر مبارک پر بھی پڑے

مولوی صاحب : کون ہے۔ ارے بھئی کون ہے؟

آدمی نے کہا بارے آپ زندہ تو ہوئے، میں سمجھا تھا کہ گورکن کی بن آئی۔ مگر آپ نے موت کو بھی ہوا بتائی۔ چلیے اغل خاں کے یہاں عقد ہے۔ نکاح پڑھ دیجیے۔ ابھی بلایا ہے۔

نکاح کا لفظ سنتے ہی مولانا خمیری روٹی کی طرح پھول گئے ۔ انگرکھے کا بند تڑسے ٹوٹ گیا، اور کفن پھاڑ کر چلا اٹھے ۔ آیا آیا ٹھہرے رہو، ابھی آیا، شملہ بقدر علم کھوپڑی پر جمایا ۔ پیرہن ڈانٹ عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں لے ۔ سرمہ لگا گھر سے چلے آدمی ساتھ ہے ۔ دل ہی دل میں کہتے جاتے ہیں، کہ آج پو بارا ہے ۔ بڑھ کر ہاتھ مارا ہے ۔ دے چھپن کروڑ کی تہائی ۔ ہاتھی کے ہودے ہیں گھٹے ۔ اب لمبے لمبے ڈگ بھرتے، آدمی سے پوچھتے جاتے ہیں کہ کیوں میاں اب کتنی دور مکان ہے؟ کیوں بھئی پاس ہے نہ دیکھیں نکاح خوانی کا کیا ملتا ہے ۔ سوا روپیہ تو معمول ہی ہے ۔ مگر خدا نے چاہا ۔ بہت کچھ لے مروں گا ۔ آدمی پیچھے پیچھے ہنستا جاتا ہے ۔ کہ میاں ہیں کس خیال میں ۔ کہیں گل کے عوض خار نہ پائیں ۔ بارے خدا خدا کر کے وہ کافر منزل طے ہوئی ۔ مکان میں آئے تو ہوش اڑ گئے ۔ ایں! یہ اچھا بیاہ ہے ۔ خدا کی پناہ ہے ۔ بھلا یہاں کیسا بیاہ ہے ۔ نہ ڈھول نہ شہنائی، ہماری شامت آئی ۔ وزدیدہ نگاہ سے ادھر اُدھر دیکھتے ہیں، عقل دنگ کہ بارِ خدایا یہ سب کے سب ہمیں کو کیوں گھور رہے ہیں ۔ اتنے میں پریسیڈنٹ جلسہ نے کہا کہ جن صاحب نے اشتہار لکھا تھا وہ اگر رونق افروز جلسہ ہوں تو وہ مہربانی کر کے کچھ فرمائیں ۔

میاں آزاد : ایہا السامعین ۔ ایک روز سعید بہتر از عید ۔ بہ آن حمید :

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے — تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت،
جو مسائل نظری تھی وہ بدیہی تھے تمام — عقل کو تجربہ سے اتنی ہوئی تھی کثرت
کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قایم — کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علت
ہو گیا علم حصولی، تھا حضوری مجکو
تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

کہ یکایک میٹھی نیند آ گئی پلک کا جھپکنا تھا کہ :

آ کے اک رشک مسیحا نے کہا بالیں پر
لا تنم قم کہ یہ غافل نہیں وقت غفلت

آنکھ کھلی تو ایک مکتب خانہ نظر آیا ۔ پہلے مولوی صاحب کی قطع سنیے! شربتی آنکھیں گول گول دیدے، پھولے پھولے گال، بھورے بھورے بال، لال لال ڈاڑھی، خرگوش

کی جھاڑی تا بہ ناف، معلوم ہوتا تھا کہ چوری نگل گئے ہیں۔ کوتاہ گردن، تنگ پیشانی۔ شرافت اور اصالت کی نشانی، نیلی لنگی کسے، افیون کی بو میں بسے، پینک میں اونگھ رہے ہیں۔ یا مٹھائی ٹونگ رہے ہیں۔ پڑھانے سے جی چراتے ہیں۔ پینک سے چونکتے ہی، لونڈوں پر چپتیں جماتے ہیں۔ اور صلواتیں سناتے ہیں۔ طرز تعلیم سے محض ناآشنا۔ اور کیوں کر نہ ہوں ع۔ کارِ بوزنہ نیست بخاری، "معلمی خالاجی کا گھر نہیں، کہ سر گھٹایا اور ملّا بن گئے۔ چوری نگلی اور پیر جی بن بیٹھے۔ کنٹھا لیا اور لگے بڑبڑانے، یا کریم! یا رحیم! یا اللہ!

اتنے میں مولوی صاحب بھاگنے ہی کو تھے! کہ یاران سرپل نے ٹنگڑی لی۔ ایک نے آنٹی بتائی تو پھٹ سے زمین پر آ رہے۔ یا علی! اچھے پھنسے، خوب عقد بندھا۔ یہ راز اب کھلا بنا بنایا گھر اب بگڑ گیا۔ مفت میں اُلّو بنے۔ یہ سب ہمیں پر ہو رہی ہے۔ خیر اب تو ادکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا خوف کیا۔ میاں آزاد نے پھر لکچر شروع کیا۔

مولوی صاحب کو کسی مقبرے کا مجاور، یا کہیں کا تکیہ دار کر دیجیے تو خیر۔ خوب میٹھے ٹکڑے اڑائیں، کھائیں، اور ڈنڈ پیلیں اور خم ٹھوکیں۔ چپڑی اور دو دو۔ یہ مکتب خانے میں اُلّو کا وسہرہ ان کو کس نے بنا دیا۔ لڑکوں کی کیفیت سنیے کہ دن بھر گلی ڈنڈا کھیلا کرتے ہیں، لڑتے ہیں، اور ڈنڈ پیلا کرتے ہیں۔ مگر الف کے نام بے نہیں جانتے۔ حرف تک نہیں پہچانتے۔ یوسف زلیخا حفظ ہے۔ مگر (زلیخا زن بود یا مرد) گلستاں نوک زباں لیکن حکایت چہ معنی دارد۔ سکندر نامہ رٹ لیا۔ کہ ذری پوچھیے کہ خدا یا میں الف کیسا ہے تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ دن بھر میں اٹھارہ[۱۸] مرتبہ یہی گفتگو کہ مولوی صاحب شاشہ کردہ بیایم۔ مولوی صاحب آب خوردہ بیایم۔ مولوی صاحب دیکھیے یہ ہماری ناک پکڑتا ہے۔ مولوی صاحب یہ ہم سے لڑتا ہے۔ مولوی صاحب اب شام ہوئی۔ چھٹی دیجیے۔ مولوی صاحب سبق سن لیجیے۔ مولوی صاحب ایسی نہیں سنا کرتے۔ ان باتوں میں سر نہیں دُھنا کرتے۔ پڑھو تو واہ واہ، نہ پڑھو تو واہ، مگر ہلتے جاؤ، اور ایسا غل مچاؤ کہ کان پڑے آواز نہ سنائی دے۔

اس میں چاہے جو کچھ اول جلول بکو۔ اتنے میں مولوی صاحب پھر رسی تڑا کر بھاگنے لگے۔ لینا لینا، جانے نہ دینا۔ واہ اچھا نکاح ہے۔ گئے تھے روزے بخشانے نماز گلے پڑی واہ۔ میری الٹی کے سننے والے۔ مانگی تھی نکاحی پڑی تباہی، یا الٰہی! واہ بھئی اغل خان تم تو بغلی گھونسے نکلے۔

میاں آزاد: آج ہی تو پنجے میں پھنسے ہو۔ روز توند نکالے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ جیسے بن چلکتی کا دنیہ یا گاؤ تکیہ در بغل۔ یہ توند ہے یا بے ایمان کی قبر۔ یا غبارہ یا ہوا کا تکیہ، اب پچک نجائے تو سہی۔ اور سنیے لڑکوں میں فراموش بدی گئی ہے۔ قلم دیا اور فراموش دو پیسے ہوئے۔ دوات دی اور وہ کہتے جاتے ہیں کہ یاد ہے یاد ہے۔ چلیے سبق بھول گئے۔ فراموش البتہ یاد ہے۔ اور کیوں نہ ہو اُن کا استاد بھی تو بے وقوف مادر زاد ہے۔ شیطان نے مولوی صاحب کو یہ پٹی پڑھادی ہے۔ کہ لڑکے کو لفظ بتائے جاؤ۔ خود ہجے کر کے وہ ایک لفظ نہ کہے۔ پھر لڑکا کودن نہ ہو تو کیا ہو۔ اور ترجمہ تو اللہ ہی اللہ ہے۔ توئی کے معنی تو ہے تو۔ منم کے معنی میں ہوں ہیں۔ اور محاورات بالکل دیہاتی۔ خدا جانے کہاں کا گنوار بٹھا دیا ہے۔ اس کو تو ہمایوں[1] کے مقبرے میں مجاور، یا حضرت عباس[2] کی درگاہ کا سقہ بناؤ۔

الغرض کل صبح کو ان حضرت کا امتحان لیا جائے، تو قلعی کھل جائے۔ کل حضارِ جلسہ نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھونکی، اور ڈنڈ مل دیے، کہ واہ اُستاد کیا کہنا ہے۔

مولوی صاحب: میاں آزاد بڑے شیطان ہیں۔

آزاد: اے حضرت! یہ آپ اپنی تعریف کر رہے ہیں۔ بندہ کس لایق ہے۔ بڑے تو حضور ہیں۔ حق یوں ہے کہ آپ لنگور ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ یہ چاہِ زنخدان سے دُم کی کوپل کیوں کر پھوٹی لوگوں نے دل میں ٹھان لی کہ کل چاہے اولے پڑیں، چاہے کڑکڑاتی دھوپ ہو، چاہے بھونچال آئے، جو ہو، ہم آئیں گے، اور ضرور آئیں گے۔ مولوی صاحب سے تاکید کی گئی کہ حضرت! کل نہ آیئے گا تو یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ دل میں تو سب کی صورت سے نفرت تھی۔ اور چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ مگر بہت کڑک کر فرمایا کہ:

جواں مرداں نہ پیچند از سخن رُد   ہمیں میدان، ہمیں چوگاں ہمیں گو

ہم اور نہ آئیں اَن ہونی بات ہے۔ ہم اور منھ چھپائیں یہ محال ہے۔ اجی آئیں، اور

---

[1] مشہور مغل بادشاہ ہمایوں متوفی ۱۵۵۶ء جن کا مقبرہ دہلی میں واقع ہے۔ اسی کے قریب اس کا تعمیر کرایا ہوا قلعہ ہے۔

[2] درگاہ حضرت عباس، لکھنؤ میں فرقۂ شیعہ کی متبرک زیارت گاہ یہ عمارت حضرت عباس کے علَم کی یادگار میں تعمیر کی گئی تھی۔ تفصیل فرہنگ میں دیکھیے۔

بیچ کھیت آئیں، اور ڈنکے کی چوٹ آئیں، ہم کیا کوئی چور ہیں، یا کسی کا مال مارا ہے۔ آزاد تو کیا بے چارہ ہے۔ ہم ایسے ویسے نہیں کہ پھسڈی ہو جائیں۔ آئیں، اور سُرخرو ہو جائیں۔ جسے دیکھو مولوی صاحب ہی کی طرف نظر ہے۔ چھوٹے بڑے سب حضرت ہی کو تاک رہے ہیں۔ جلسہ برخاست۔

مولوی صاحب کی خرابی

مولوی صاحب کے حواس غائب۔ آوازوں کا چھرّا ایسا چلا کر جل بھُن کے خاک ہو گئے۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ اور بھی پاک بیباک ہوئے۔ دل ہی دل میں کروروں صلواتیں سنائیں۔ لاکھوں گالیاں یاد آئیں۔ لگے پانی پی پی کر کوسنے۔ اُس ملعون پر گاج پڑے، اس کی زبان سڑے منھ پھول جائے، ساری چوکڑیاں بھول جائے، آسمان سے انگارے برسیں۔ میاں آزاد ایسی جگہ مریں جہاں پانی نہ ملے۔ بوند بوند کو ترسیں۔ ڈنکو فیور چیٹ کرے۔ انجن کے نیچے دب کر مرے۔ ہاتھی روند ڈالے۔ ہیضہ کھائے۔ خیر ان کی تو خدا حسن چکا۔ ایسے ایسے مداری میاں آزاد نے بہت چنگے کیے تھے۔ صدہا گنواروں، رنگے سیاروں، کے دُھرّے کیے تھے۔ دوسرے روز نیب ٹوے میں اہالی موالی، دُنی کالی، کنجڑے، مالی، شریف نجیب، منشی طبیب، ان پڑھ لبیب، ہر پیشہ کے آدمی پو پھٹتے ہی آن موجود ہوئے۔ مگر مولانا ایسے مفقود ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بارے یارانِ سرپل تو تھمبو کر کے، سر سہلاتے بھیجا کھاتے سبز باغ دکھاتے، گھسیٹ ہی لائے۔ آئیے آئیے! مولوی صاحب آئیے! مکتب کے لڑکے بھی ڈٹے بیٹھے تھے۔ مگر مولوی صاحب سے ذرا ہٹے بیٹھے تھے۔ کہ مبادا شیخ سدّو سوار ہو، تو مفت میں تکرار ہو۔

میاں آزاد: کیوں مولوی صاحب کس منصوبے میں ہو؟

مولوی صاحب: سوچتا ہوں کہ اب کون چال چلوں۔ تم نے تو زچ کر دیا، واللہ رخ پھر گئے۔ سوچ لیے ہیں کہ اب ملّا گری چھوڑ پیادوں میں نوکری کریں گے۔ بس وطن سے جائیں گے۔ تو پھر لوٹ کر گھر نہ آئیں گے۔ میدان فکر میں خوب گھوڑے دوڑائیں گے۔ رئیس، امیر، بادشاہ وزیر، سب پر مصیبت پڑتی ہے۔ پھر ہماری بساط کیا، چار خانے کا پیر ہی نہیں، گاڑھے کی مرزائی سہی۔ چاہے کوئی توپ کے مہرے اُڑا دے، تم کو ہم

صلواتیں ضرور سنائیں گے۔ تم نے ہم سے نردِ دغا کھیلی ششدر ہوں کر کروں تو کیا کروں، اب نقشہ جمنا محال ہے۔ ہم نرے اناڑی ہم یارِ شاطر، تم بارِ خاطر۔

میاں آزاد : آپ لاکھ پتنگ پر چڑھایئے، ہم جھانسے میں نہ آئیں گے۔ یہ چکما کسی اور کو دیجیے۔

مولوی صاحب : چکما؟ چکمے کی ایک ہی ہوئی۔ یہ عجب قماش کی بات ہے۔ میں حضور کا غلام، آپ میرے سرتاج، سر مبارک کی قسم، ادھر آفتاب برآمد ہوا، اُدھر ہم نے مکتب کا راستہ لیا۔ دن بھر ورق گردانی کی۔ مجال کیا کہ شاگرد کھیل میں مصروف ہوں۔ بولا اور میں نے ٹیپ جمائی، کھیلا اور شامت آئی، سمجھ بوجھ کر چلنا تھا۔ کوئی اِکّا دُکّا مکتب میں کھلونا ولونا لایا اور میں نے انگیٹھی میں سوخت کر دیا۔ مگر میری سنتا کون ہے۔ آپ تو میر کے پایہ سے ہیں۔

پریسیڈنٹ : اجی اس دانتا کلکل سے کیا واسطہ مولوی صاحب کا امتحان لیجیے! سوال کیجیے۔

میاں آزاد الا اللہ کہہ کر کھڑے ہوئے۔ اب مولوی صاحب کی بوکھلاہٹ کا حال نہ پوچھیے۔ رنگ فق، خاصے ہونق، کلیجہ شق، یادِ مولا۔ یادِ حق۔ آنکھیں پُرنم، کمر خم، اشکبار بے قرار، منھ پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، کلیجہ دھک دھک کرتا ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے کھڑے تو ہوئے مگر قدم نہ جما، پاؤں ڈگمگائے، یہ گرے وہ لڑکھڑائے۔ اوساں خطا، حواس پران۔ ہوش سپاٹو کی سیر کر رہے ہیں۔ بلا اجازت غائب، گول گول دیدے چمکا کر، اور توند مٹکا کر، کچھ کہتے ہی کو تھے، کہ وحشت نے گلا دبوچا۔ گھگھی بندھ گئی :

بہ فہم ہیچ مضموں جز بہ لب بستن نمی آید
خموش معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید

ہائے! امتحان دینا تو لوہے کے چنے چبانا ہے۔ انگارے کھانا ہے۔ نام سنا اور حواس بیترا۔ میاں آزاد نے جلسۂ عام میں سوالات شروع کیے۔ سب خاموش، ہمہ تن گوش۔ کمیٹی رجوع ہو، تو امتحان شروع ہو۔

سوال : یہ اشعار کس بحر میں ہیں؟

نہ پوچھو حال مرا ہوں وہ مشعل دستی　　　کہ جس کے ہاتھ پڑا لے چلا جلائے ہوئے

جو پہنچا تربت عاشق پہ ناز کہتا ہے حضور خاک سے دامن ذرا اٹھائے ہوئے

مولوی صاحب : بحر میں آپ ہی غوطہ لگائیے اور خدا کرے ڈوب جائیے۔ تھاہ خاک نہ پائیے۔ واللہ میرا تو قافیہ تنگ ہے۔ عقل دنگ ہے۔ کوئی مونس نہ جلیس، خلیل نہ انیس جسے دیکھو ہیں پر شیر ہے۔ آتش زبانی دکھلانے کو مستعد، رند بن کر شیخ کے چھیڑنے کو تیار۔ برق بن کر جلانے کو تیار۔ نا معقول، اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم مولوی آدمی لونڈے پڑھانا جانیں، یا شاعری، شعر و سخن کا ذوق کہاں، تک بندی کا شوق کہاں، بحر سے واسطہ، قافیے سے سروکار، نظم سے مطلب، آئے وہاں سے بحر پوچھنے۔ میں خود بحرِ مواجِ علم و فضل ہوں۔ وہ سمندر جس کا اور نہ چھوڑ۔ ساحل کا پتا ہی نہیں۔ منتہائے قعر تک زنجیر فکر پہنچے! کیا مجال؛ سوال

بشنو از نے چوں حکایت می کند از جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

ان اشعار کے معنی بتائیے۔

مولوی صاحب : (بنچ پر دوزانو بیٹھ کر) یہ مولوی معنوی جعل الجنۃ مثواہ کا کلام جمیل ہے۔ اس میں جائے دم زدن، نہ مقامِ قال و قیل ہے۔ لیکن ساقی چلم فروش کی قسم! وہ دھواں دھار معنی اڑاؤں، کہ آسماں تک تو پہنچاؤں۔ لے اب سنیئے! نے عبارت ہے چانڈو کی نے سے۔ اس سے ایک تاریخی بات یاد رکھنے کے قابل ہے! کہ مولوی معنوی طابَ ثراہ کے وقت میں بھی افیون کی گرم بازاری تھی۔ اور چانڈو بازی بھی جاری تھی۔ نیستاں مراد ہے اس گلزارِ سراپا بہار، رشکِ فرخار سے، جہاں چانڈو کی نی کا جنگل ہے اور چانڈو بازوں کا دنگل ہے۔ نفیر کے لفظی معنی پیں پیں ہیں۔ مگر چانڈو بازوں کی اصطلاح میں نفیر، اُس آواز دلربا کو کہتے ہیں، جو چانڈو پیتے وقت دہانِ پاک سے نکلے۔ دَھک دَھک۔ بُھک بُھک۔

سوال : بکری کی پچھلی ٹانگوں کو فارسی میں کیا کہتے ہیں؟

مولوی صاحب : یہ کسی اپنے بھائی بند بز قصاب سے پوچھیے، بندہ چھچھڑے کھائے، نہ جانے۔ واہ اچھا سوال ہے۔ اب ملّاؤں کو بڑا قصاب ہوں؟ آدمی بھی کرنا چاہیے۔ کیا دل گردہ ہے۔ پاؤں تو بوٹیاں ہی نوچ کھاؤں۔ اور ایسا پچھاڑوں کہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بنانا بھول جاؤ۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن چھری گردن پر ضرور پھر جائے گی۔

سوال : ہندوستان کے شمال میں کون ملک ہے ؟
مولوی صاحب : خدا جانے میں کیا دیکھنے گیا تھا، یا آپ کی طرح میں بھی کوچہ گرد ہوں۔
سوال : سب سے بڑا دریا ہندوستان میں کون ہے ؟
مولوی صاحب : فُرات، نہیں، وہ دیکھیے لاحول ولا قوۃ، بھولا جاتا ہوں، توبہ! اجی وہی، دجلہ دجلہ، خوب یاد آیا۔ حقار جلسہ۔ اس یاد پر پتھر پڑیں! فرات و دجلہ ہند میں ہیں ؟ واہ واہ، رے گاؤدی۔ اچھی الٹی گنگا بہائی، بے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ معلمی کرتے ہو، اور اتنا نہیں جانتے کہ فرات کہاں ہے لاحول ولا۔
سوال : زلزلے کے اسباب، اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب بتاؤ ؟
مولوی صاحب : واہ کیا خوب خدائی میں دخل دوں۔ ایک فرامشن (فریمشن[1]) تو کسی کی سمجھ میں آتا ہی نہیں، پھر بھلا یہ کون جانے کہ زلزلہ کیوں کر آتا ہے۔ زمین میں کس طرح ہل چل مچ جاتی ہے، یہ رموزِ سربستہ خدا ہی جانے۔ باقی باتیں ہیں۔ ہم ان ڈھکوسلوں کے قائل نہیں۔ باقی رہا چاند کا گھٹنا بڑھنا اور اس کا سبب سو حضرت سبب یہی ہے کہ خدا کا حکم۔ بندے کو دخل کیا، ان قدرتی امور کا کچھ سبب بھی ہوا کرتا ہے۔
سوال : بارش کیوں کر ہوتی ہے ؟ یہ پانی کہاں سے آتا ہے ؟
مولوی صاحب : (خوب اکڑ کر) ہاں دیکھیے اب سیدھے ڈھرّے پر آئے نہ بارش کیوں کر ہوتی ہے اس کا دو ٹوک جواب یہ ہے۔

نہ بارد ہوا، تا نہ گوئی بیار
زبر، نا درد، تا نہ گوئی بیار

---

[1] فریمسن کے نام سے انیسویں صدی میں انگلینڈ کے اندر پر اسرار جماعت وجود میں آئی تھی۔ اس کے ممبر اپنے اصول و ضوابط راز میں رکھتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو پہچانتے اور گفتگو کرنے کے لیے خاص اشاروں سے کام لیتے تھے۔ لندن کے نواح میں ان کا ایک سالانہ اجتماع بھی ہوتا تھا۔ یہ ایک خاموش انقلابی گروہ تھا۔ ماخوذ از مسیر طالبی، مصنفہ مرزا ابو طالب اصفہانی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۵ء

اور پانی کہاں سے آتا ہے۔ یہ تو ہماری دادی جان تک کو معلوم تھا خدا بخشے بے چاری کو سینے نہ کہ بادل تالابوں، ڈبروں، چشموں، حوضوں، کنوؤں، دریاؤں، ندّیوں، گڑھوں، بدرروؤں، سمندروں، بحروں، خلیجوں، ٹاپوؤں میں گھس پیٹھ کر، دو تین روز تک خوب بیٹھ کر، پانی پیتا ہے۔ جب پی چکا تو آسمان پر اُڑ گیا۔ اور منھ کھولا تو پانی رم جھم برسنے لگا۔ اشجار نہال ہو گئے۔ غنچے دنا دن چٹکے۔ میگساروں کی بغل میں بادۂ ناب کے مٹکے:

تند پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
مے کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

خصار جلسہ: ایسی مدرسی پر شیطان کی پھٹکار۔ آئے وہاں سے مولوی بن کے۔ واللہ کیا بے پر کی اُڑائی ہے۔ کہنے لگے بادل پانی پیتے ہیں اچھی بٹی۔

سوال: گنتی آپ کو کہاں تک یاد ہے، اور پہاڑا کہاں تک؟

مولوی صاحب: جوانی میں روپیہ کے ٹکے گن لیتا تھا، اب بھی آٹھ آٹھ آنے دُو دفعہ میں گن سکتا ہوں۔ مگر پہاڑا کسی حلوائی کے لونڈے سے پوچھیے۔ ڈھونچے پونچے سے یہاں نفرت ہے۔

سوال: جونپور میں زید نے ۷۶۲۵۹۹ من غلہ خریدا اور شب کو چور نے موقع تاک کر ۶۳۶۱ من ہاتھوں ہاتھ، راتوں رات، اڑا دیا، بتاؤ زید کو کتنا گھاٹا ہوا؟

جواب: یہ جھگڑا جونپور کے قاضی چکائیں گے۔ بندہ کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالتا۔ چوری چکاری کا حال تھانہ داروں سے پوچھیے، بندہ مولوی ہے۔ ملّا کی دوڑ مسجد تک۔

سوال: شاہ جہاں کے وقت میں ہندوستان کی کیا حالت تھی، اور اکبر کے وقت میں کیا حالت تھی؟

مولوی صاحب: اجی آپ تو پرانے مُردے اکھیڑتے ہیں، اکبر اور شاہ جہاں دونوں کی ہڈیاں گل کے خاک ہو گئی ہوں گی۔ اس ڈھکڑے سے واسطہ۔

سوال: طرزِ تعلیم کا سب سے بہتر قاعدہ کیا ہے۔

مولوی صاحب: اس بحث سے فائدہ کیا ہے۔ میں کیا کوئی گوکھا ہوں، یا مجھے کوئی گدھا مقرر کیا ہے۔ بڑے بڑے استادوں کا کلام نوکِ زبان ہے۔

سوال : عقل بڑی کہ بھینس؟

مولوی صاحب : ان دونوں سے گھوسن بڑی، جو دودھ دیتی ہے۔

سوال : آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں؟

مولوی صاحب : اے صاحب وہ آدمی نہیں، گرگ باران دیدہ، گربہ مسکین۔ پچھیا کا تاؤ، اُلّو کی دُم فاختہ سہی۔ اب آپ بندے کو آزاد کیجیے، تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا۔

حضارِ جلسہ : لاحول ولاقوۃ! یہ چرکٹا ہے کون، اس مردک کو یہی نہیں معلوم کہ بحر کس چڑیا کا نام ہے، بادل کسے کہتے ہیں، دو تک کا پہاڑا نہیں یاد، گنتی جانتا ہی نہیں۔ طرزِ تعلیم سے بالکل ناواقف دجلہ و فرات ہندوستان میں بتاتا ہے، اور باایں ہمہ شیخی جتاتا ہے۔ جغرافیہ میں محض کورا، آدمی ہے یا دوھیا لٹورا، تاریخ میں الف کے نام بے نہیں جانتا، اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو شاید حرف بھی نہیں پہچانتا، اور چلے ہیں مولوی بننے۔ لڑکوں کی مفت میں مٹی خراب ہے۔ اور سنیے! بادل بدر رو سے پانی پیتا ہے، اور ٹاپو کا پانی نوش کرتا ہے۔ اس تحقیقات کے قربان۔ واہ رے ناداں۔

ہندی اور یورپین کا طرزِ معاشرت[1]

میاں آزاد مکتب کا خاکہ اُڑا، مولوی صاحب سے پیچھا چھڑا، گاؤں سے ایک شہر میں جا دھمکے۔ اُہو ہو ہو! جدھر جاؤ چہل پہل، جدھر دیکھو لہر بہر، ہر محلّہ آباد۔ کوچہ و بازار مینو سواد، چپہ چپہ رو کش بہشت شدّاد، جگر ٹھنڈا کرنے والی ہوا کے جھونکے سن سن چل رہے ہیں۔ گویا پھلے پھولے ہرے بھرے درخت، گلاب اور کیوڑے کے بسے ہوئے پنکھے جھل رہے ہیں۔ میاں آزاد دن بھر چک پھیریوں میں رہے۔ اور (ع) جب زلف کو کھولے

---

[1] سرشار، یورپ کی تہذیب و معاشرت سے حد درجہ متاثر تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے فسانۂ آزاد میں جا بجا کیا ہے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر ہندوستان اور انگلستان کے طرز معاشرت کا تقابل کیا ہے۔ جس سے اُن کے ذہنی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے دور کی خصوصاً اودھ کی تہذیب و معاشرت کا کہیں اشاروں، کنایوں میں اور کہیں کھل کر مضحکہ اڑایا ہے۔ نورانی

ہوئے لیلائے شب آئی، تو میاں آزاد کو سونے کی دھن سمائی، ہوٹل میں آئے۔ اتنے میں ایک آدمی چھریرا بدن، پستہ قامت، چشمِ ازرق موئے میگوں، رنگ زرد، سامنے آن کھڑا ہوا۔ کون؟ ہم ہیں بھئی۔ ہم کا آخر کچھ نام بھی ہے۔؟ مسافر، پھر یہاں کیا کام، آفتابہ تاکا ہے یا ٹوپی لے بھاگیے گا۔ یا حضرت! ذری بندۂ درگاہ کی قطع شریف اور صورت مبارک تو دیکھیے۔ چوٹٹے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، بھلا؟ اخاہ! حضور ہیں آیئے۔ میاں آزاد نے آؤبھگت کی، پاس بٹھایا، عطر ملا، پان کھلایا، باہم خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ آخر کار انھوں نے کہا کہ کیوں جی! کیا یوروپین ہم لوگوں سے علم و فضل، اور طرز معاشرت میں بڑھ چڑھ کر ہیں؟ میاں آزاد نے "ہونھ" کر کے جواب دیا کہ دریں چہ شک، یورپ میں علم کی گرم بازاری ہے۔ یہاں حضرات ناعاقبت اندیش، کی عقل حلیۂ عاقبت اندیشی سے عاری ہے۔ یہاں کیا بہ لحاظ علم، کیا باعتبار معاشرت، بنگالی البتہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ باقی خیر صلاح کے ڈھیر۔ اتنے میں بھٹیاری نے ہانک لگائی کہ پھاٹک بند ہوتا ہے، باہر والو اندر آؤ۔ اندر والو باہر جاؤ، میاں آزاد بستر پر ڈٹ گئے۔ نور کے تڑکے حبیب لبیب نے میاں آزاد کو خواب نوشیں سے جگایا۔ ایں! آپ لمبی تانے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ اٹھو اٹھو! یہ طوطے چشمی جما کہ آنکھ تک نہیں کھولتے۔ کچھ کنمنائے تو سہی۔ اے لو وہ اٹھ بیٹھے "بسم اللہ" کیا کل رت جگا تھا؟

میاں آزاد نے کہا: حضرت ایسا شل ہو گیا تھا کہ گھوڑے بیچ کر سویا۔ اور اب تک سوتا ہی رہا۔ خیر بارے آپ اٹھے تو۔ ہاں حضرت لے فرمایئے۔ بنگالی اور یوروپین میں کیا بات ہے، جس سے ہمارا علم اور طرزِ معاشرت ان کے آگے مات ہے۔ مگر بندہ منطقی آدمی ہے۔ براہینِ انی دلمی پیش کیجیے۔ میاں آزاد نے لپ جھپ کپڑے ڈانٹے۔ حبیب لبیب کو ساتھ لیا، اور چل کھڑے ہوئے۔ تڑکے کا سہانا وقت:

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور

ادھر شوالے کا گھنٹا بجا ٹھناٹھن۔ ادھر دد ناکوں سے صبح کی توپ دغی دنا دن چلتے چلتے بستی کے باہر پہنچے۔ سبحان اللہ! خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے، بہار دل کو بھاتی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دلچسپ و پرفضا، فرح بخش و دلکشا، بنگلہ خس پوش ہے۔

پٹریاں صاف، روشیں شفاف، اشجار کا جھومنا مستانہ وار، نے ونوروزی عنبر بار، دماغ طبلۂ عطار، ہر سمت باغ و بہار، پتے زمردیں، بنگلے مینو آئین، دروازے رنگین۔ ایک عالی شان کمرے میں ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اور ان کے قریب ایک بتِ حور وش، زیبا اندام، گلبدن۔ گلفام زنِ حسینہ و جمیلہ، نازک سی کرسی پر متمکن ہے۔ وہ نورانی چہرہ۔ وہ قیمتی ریشمی سیاہ لباس، اس پر عطر کی بو باس جس کی لپیٹن سڑک تک آتی تھیں۔ اور دماغ کو تختہ گلاب بناتی تھیں:

از کجا می آئی اے سرمستِ خوبی محوِ ناز
عطر آگیں تا بدامن عنبر افشاں تا کمر

دونوں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ اور ٹن چاپ اڑاتے ہیں۔ کمرے بھر میں وہ صاحب اور وہ بتِ بلند بالا، تے غمِ دُزدو نے غمِ کالا، حبیبِ لبیب اس لطف کو مشاہدہ کرکے پھڑک گئے۔ اور بے اختیار کہہ اٹھے کہ:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

میاں آزاد ان کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے، چپکے سے آگے بڑھے۔ بیس قدم آگے نہ گئے ہوں گے کہ سامنے سے کئی یا بوکر تنگ سر نگ اور نقرہ خنگ گزرے۔ تیز اور سبک خیز۔ ان پر خوشنما کاٹھیاں اور سیم تن، تن غنچہ دہن، لڑکے متمکن۔ ہنستے کھیلتے۔ بولتے چالتے ہوا کھاتے جاتے ہیں۔ کپڑے سفید، جیسے بگلے کے پر۔ کئی منٹ تک حبیب لبیب ان گلبدن لڑکوں کو دیکھا کیے۔ اور میاں آزاد سے کہا: کہ بھئی واللہ بچوں کی صحبت و تربیت کا خیال اتنا تو ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے ہیں کہ، ایک فٹن پر پانچ نوجوان بنگالی، ایک بیرسٹر، ایک سول سروس، دو ایم۔ اے، ایک بی۔ اے، چلے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک میاں آزاد کے خواجہ تاش تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہاتھ ملایا۔ انھوں نے ان کو چرٹ پلایا۔ معلوم ہوا کہ وہ چار نوخیز بنگالی غریب آدمیوں کے لڑکے ہیں۔ مگر ان کے عالم باپ کے ہمدرد احباب نے ان کو ولایت بھیجا۔ اور خود صرف کے متحمل ہوئے۔ اب وہ مدارج اعلیٰ حاصل کرکے آئے ہیں۔ رخصت ہوئے تو میاں آزاد اور ان کے حبیب، مشرق، اور وہ نوجوان مغرب کی طرف چلے۔ حبیب لبیب نے آہ سرد کھینچ کر کہا: کہ بس ان بنگالیوں کے قدم لے۔

بیس بیس برس کے لڑکے، ایم ۔ اے، بی ۔ اے ہو جاتے ہیں ۔ امیر تو امیر، غریب تک اعلا درجہ کی تعلیم پاتے ہیں ۔ مگر ہندی ابھی بحرِ جہل میں غوطے کھاتے ہیں ۔ چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے ۔ جہاں سڑک پر دور دیہ سوداگروں کی عالیشان کوٹھیاں ہیں ۔ جان اینڈ کمپنی رو اینڈ سن، کے سہ منزلہ ۔ پنج منزلہ ۔ سر بفلک کشیدہ ایوان، سپہر توامان، گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں ۔ فلک الافلاک سے ٹکر لڑتے ہیں ۔ میاں آزاد حبیب لبیب کو ایک کوٹھی میں لے گئے ۔ الٰہی یہ مکان ہے یا صنّاعی کا کاشانہ، کوٹھی ہے یا لندن کا عجائب خانہ، اشیائے غریبہ لاتعداد و غیر محدود ۔ تمام عالم کی نعمتیں موجود، حبیب لبیب نے کہا! صلّ علیٰ! صلّ علیٰ! یہ تجارت کے شعبدے ہیں ۔ واہ ری تجارت، تیرے قدم دھو دھو کر پیے ۔ اتنے میں سامنے سے کئی بگھیاں آئیں، اور زن سے نکل گئیں ۔ سب پر یورپین جنٹلمین اور لیڈیاں متمکن ۔ ہندوستانی کا منزلوں پتا ہی نہیں ۔ آگے بڑھے تو ایک کتب خانہ نظر آیا ۔ لاکھوں کتابیں چنی ہوئیں ۔ دفتیاں قابل دید، بلکہ دید نہ شنید ۔ کسی الماری میں گل لالہ کھلا ہے ۔ کہیں زمرد گوں تختہ بنا ہے ۔ انسان اگر سال بھر اس کتب خانہ میں جم کر بیٹھے تو عالم اجل اور فاضل اکمل ہو جائے ۔ سر شام سے آٹھ بجے تک شائقین آتے ہیں ۔ سیر کتب سے دل بہلاتے ہیں ۔ لیڈیاں اپنے مذاق کے اخبار اور کتب مطالعہ میں لاتی ہیں ۔ اور دنیا کے حالات پر واقفیت پاتی ہیں ۔ مگر ہندوستانی جنٹلمین کو ان امور سے کیا سروکار ۔

اس سیر سے جب خوب سیر ہو چکے تو سرا کی سوجھی ۔ حیران و ششدر کہ :

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے　　تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

خدا خدا کر کے بستی میں داخل ہوئے ۔ راہ میں ایک مرفہ حال، اور صاحب جاہ و مال، کے دروازے پر ان کے دو کمسن لڑکوں کو دیکھا ۔ نک سک سے تو درست ہیں ۔ مگر وضع نرالی ۔ کانوں میں بالے، پاؤں میں بھدّے بھدّے کڑے ۔ انگرکھا میلا کچیلا کثیف، پاجامہ چار جگہ سے چاک، ہاتھوں پر گرد منھ پر خاک، دروازے پر ننگے پاؤں کھڑے ہیں ۔ مولوی صاحب ڈیوڑھی میں بیٹھے، دو اور لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں ۔ لیکن ڈیوڑھی اور پاتخانہ ملحق ۔

میاں آزاد : کہیے پیر و مرشد! وہ غنچہ دہن سیمین بدن، لڑکے اور وہ بابو بھی یاد ہیں ۔ ان کو دیکھیے میلے گندے، دن بھر بیت الخلا کے پڑوس، بھلا یہ توانا و تندرست چالاک و چست کیوں کر ہوں ۔ ہاں زیور سے البتہ گوندنی کی طرح لدے ہیں ۔ حق یوں ہے کہ چاہیے لڑکا جس قدر

زیور پہنے ہو، مگر اس کو وہ سچی خوشی نہیں حاصل ہوسکتی جو اُن پیارے بچوں کو نسیم سحری کے جھونکوں، اور ٹاپوں کی کھٹ پٹ سے حاصل ہوتی تھی۔ لڑکا تڑکے بگر دم بیدار ہوا۔ حمام خانہ گیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ صبح کی ہوا کھائی۔ یہ اچھا یا یہ اچھا کہ لچکے اور پٹھے اور نبت کے کپڑوں میں جکڑ دیا جائے۔ اور زیور سر سے پاؤں تک لاد دیا جائے۔ اور گڑھیا پر بٹھا دیا جائے کہ کوڑے کے ٹوکرے کے گنا کر۔ الامان! الحذر! اتنے میں سات آٹھ نوجوان سامنے سے گزرے۔ ابھی ۱۹ ہی برس کا سن ہے۔ مگر گالوں پر جھریاں، کسی کی کمر خم، کسی کا چہرہ زرد، دل سرد، سرخ و سفید رنگ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اور طرہ یہ کہ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ س اور ش نہیں پہچانتے۔ ایک نمبر اول کے چانڈو باز ہیں۔ دوسرے بڑے زبان دراز ہیں۔ وہ فراٹے بھریں کہ بھلا چنگا آدمی گھن چکر ہو جائے ایک بہترین درجے میں تعلیم پاتے تھے، مگر پروفیسر ریاضی سے گلخپ ہو گئی ہے۔ جھٹ مدرسہ چھوڑا۔ کیوں نہ ہو، میرے شیر، ہتنگ مزاجی ختم ہے۔ ایک صاحب اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے بائیں ہاتھ پر تال بجا رہے ہیں۔ دھن تا دھن تا، دو صاحب بہادر نامی بٹیر کے گھٹ جانے کا افسوس کر رہے ہیں۔ کسی کو ناز ہے کہ میں بانے کی کنکیاں خوب لڑاتا ہوں۔ نکل خوب بڑھاتا ہوں۔

میاں آزاد نے پوچھا کیوں قبلہ! کہیے وہ بنگالی نوجوان بھی یاد ہیں۔ ان حضرات کو دیکھیے کہ مدرسہ چھوڑا، کوچہ گردی سے ناتا جوڑا۔ صحبت نیک سے منھ موڑا، افعالِ شایستہ کی گردن کو مروڑا، لیاقت خدا کا نام ہے، مٹرگشتی سے کام ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو صاحب اور ملے۔ سفید پوش، صاحب تن و توش، حبیب لبیب نے کہا: حضرت ان کو پہچان رکھیے۔ ان مدعیان خرد نے روپیہ کو دفن کر رکھا ہے۔ ایک کے پاس ڈولاکھ سے زیادہ ہے۔ دوسرے کے پاس کوئی اسّی ہزار۔ مگر زمین میں دفن۔ بی بی اور لڑکوں کو کچھ زیور تو البتہ بنا دیا ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ اگر تجارت کریں تو وہ فروغ ہو کہ باید و شاید۔ مگر یہ سیکھا ہی نہیں۔ میاں آزاد نے کہا کیوں میاں وہ کوٹھیاں بھی یاد ہیں؟ بنگال بینک اور دہلی بینک کو سنا تھا۔ یہ زمین کا بینک آج سنا۔ الحمد للہ! کہ اب میاں آزاد اور حبیب لبیب سرا میں داخل ہوئے۔

آزاد: کہو یار چے۔ صبح کے سوال کا جواب پایا یا سچ کہنا۔ جو کہا تھا ثابت کر دیا یا نہیں۔

اب پھر پوچھو گے کہ بنگالیوں سے عموماً اور یورپین سے خصوصاً ہندی کس بات میں کم ہیں۔ حبیب لبیب نے گردن جھکائی۔ آنکھیں نیچی کرلیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے اور فرمایا: کہ خدائے پاک کی قسم، ایسا شافی اور برجستہ جواب پایا کہ عمر بھر تو بھولوں گا نہیں بھئی آج کی سیر نے تو جامِ جمشید کا لطف دکھایا۔ یورپین اور اہلِ ہند کے طرزِ معاشرت میں زمین اور آسمان کا فرق پایا۔ واللہ تہذیب بھی صد ہا امراض جہالت کی دوا ہے۔ جوب ہالوے ہے۔ اکسیر کی پڑیا ہے۔

دوسرے روز ہمارے سودائی مزاج، میاں آزاد، جھٹپٹے وقت حبیب لبیب کو ساتھ لے شہر کے صدقے ہونے چلے۔ چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا ہے۔ نو عروسانِ چمن کا جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ ایک باغیچہ فرح بخش، دلکشا میں احباب بذلہ سنج وصافی مذاق، بیٹھے عظیم اللہ خانی حقے اُڑاتے تھے۔ اور رنگ رلیاں مناتے تھے۔ کہ ایک دفعہ ہی بحث، اور بحث سے تکرار، تکرار سے گلخپ، شروع ہوئی۔ میاں برق نے کہا: بھئی کلجگ ہے کلجگ، اس میں جو نہ ہو تھوڑا۔ پرانی رسموں کو اب بعض ذات شریف دقیانوسی بتاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے خرچ کو اخراجات فضول کہتے ہیں۔ بچوں کو زیور پہنانا گالی ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اب کوئی ان حضرات سے اتنا تو پوچھے کہ جو رسم باپ دادا کے وقت سے چلی آتی ہے۔ اس کو کیوں کر مٹائیے۔ یارو دن دہاڑے یہ اندھیر۔ دوسرے صاحبِ شرق ان خیالات کے خلاف تھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں پورب کی طرف سے شور اور غل کی صدا، ایسی بلند ہوئی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ کسی نے کہا چور آیا۔ لینا جانے نہ پائے۔ کوئی بولا سانپ ہے سانپ۔ کوئی بھیڑیا بھیڑیا چلا اٹھا، کسی کو شک ہوا کہ آگ لگی۔ سب کے سب بھڑ بھڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تو چور نہ چکار، بھیڑیا نہ مار، آگ نہ باگ، ع۔ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے۔ ایک خواجہ صاحب لنگوٹ کسے لٹھ ہاتھ میں لیے، اکڑے کھڑے ہیں۔ اور ان سے دس قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکرے پر کوئی لالہ جی بانس کی کھپانچ لیے ڈٹے ہیں۔ اردگرد تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شور فساد دنگا اور دھوم ہے۔ ادھر خواجہ صاحب پینترے بدل رہے ہیں ادھر لالہ انگلیاں مٹکا مٹکا کر غل مچاتے ہیں۔

برق : اے خواجہ صاحب خیر تو ہے؟

خواجہ : کیا عرض کروں منشی برق صاحب۔ آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ اور یہاں جان

پر بن گئی ہے۔ یہ لالہ میرے ہمسایہ ہیں۔ ان کا قاعدہ ہے کہ ٹھرّا پی کر مجھے ہزار ہا گالیاں دیا کرتے ہیں۔ آج سنیئے! کہ کوٹھے پر چڑھ کر خدا واسطے کو صلواتیں سنائیں۔ اب فرمائیے! انسان ضبط کہاں تک کرے۔ لاکھ سمجھایا کہ بھئی آدمی سے اونٹ، اور انسان سے خر بے دُم نہ بن جاؤ۔ عقل کے ناخن لو، ہوش میں آؤ، یہ بادشاہ کی نہیں سنتے، میں کس شمار قطار میں ہوں۔ خم ٹھوک کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ خدا نہ کرے کہ کسی بھلے مانس کو اَن پڑھ سے سابقہ پڑے۔

لالہ: ہو نھ، اور سنیئے گا۔ ہم چار پانچ برس لکھنؤ میں رہے، اَن پڑھ ہی رہے۔

خواجہ: بارہ برس دلی میں رہ کر تم نے کیا سیکھ لیا؟ جواب چار برس لکھنؤ میں رہنے سے فاضل ہو گئے۔

لالہ: یہ ساٹھ برس سے ہمارے پڑوسی ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ برس دن کا تہوار ہے۔ ہم شراب ضرور پئیں گے۔ چسکی ضرور لگائیں گے۔ نشے میں صلواتیں ضرور سنائیں گے۔ ہماری رسم ہی یہی ہے کہ راسی اڑاؤ، محلے والوں کو گالیاں سناؤ۔ خوب گل چھرے اڑیں۔ لوگ ہم سے فرماوت ہیں کہ چند مردمانِ سلیقہ شعار سبھا منعقد کہن ہیں۔ کہ شراب قلیہ چھوڑو، واہ، بڑے نستعلیق تو لّد بھیے۔

برق: اجی لالہ صاحب! عقل کے ناخن لیجیے، بہت بہکی بہکی باتیں نہ کیجیے۔ ہم نے مانا کہ یہ رسم قدیم ہے۔ مگر ایسی رسم پر تین حرف۔ آپ دیکھیں تو کہ اس وقت آپ کی قطع کیا ہے۔ کیچڑ میں لت پت۔ بھئی واہ! واللہ تمہارا بایاں قدم لے۔ بھلے مانسوں کو گالیاں دیتے ہو، اور یہ کہتے ہو کہ یہ تو ہماری رسم ہے۔ وہ سبھا بڑے دور اندیش بزرگواروں نے قائم کی ہے۔ تم ہی ایسے حُمقا کی تنبیہ کے لیے۔

شرق: یا حضرتِ برق! ذرا مجھ سے تو آنکھیں ملائیے۔ شرماتے تو نہ ہو گے۔ کیوں صاحب یہ دن دہاڑے اندھیر، جو بات اس لالہ کے یہاں جس طرح ہوتی آئی ہے۔ اسی طرح اب بھی ہو گی۔ ابھی تو آپ کا کچھ مقولہ تھا۔ اب کچھ اور کہنے لگے۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کی رنگت آپ نے کہاں پائی، یہ گرگٹ کی خاصیت کیوں بھائی، میاں رسم بد کی حماقت پابندی کی نشانی ہے۔

خیر برق کو قائل کر کے میاں شرق، اور میاں آزاد، اور حبیب لبیب اور یارانِ موافق

اسی غنچہ، نزہت انتما کی طرف جانے لگے، اور برق کو ہنس ہنس کر جلانے لگے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گنوار عورت روتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک مرد چپکے چپکے سمجھا رہا ہے کہ چپائی مار، چپائی مار، میاں آزاد سمجھے کہ کوئی بدمعاش ہے۔ معاً للکارے۔ کون ہے؟ بے تو بول ابے کون ہے؟ اس عورت کو کہاں بھگائے لیے جاتا ہے۔ اس گنوار نے کہا صاحب بھگائے نہیں لیے جات ہوں۔ یہ ہمری مہرارو ہے۔ ہمارے یہاں رسم ہے کہ جب جورو کا میکے سے سسرال لے جات ہیں۔ تو دوئی تین کوس تلک مہرار ورووت جات ہے۔

برق : لاحول ولا قوۃ۔ واللہ میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ بھئی ان گنواروں سے خدا کی پناہ۔ محض رسم کی پابندی کو فرائض دینے تک پر ترجیح دیتے ہیں۔

شرق : بجا ہے پیر و مرشد خود را فضیحت و دیگراں را فضیحت: گنوار تو خیر گنوار بن کر چھوٹ جائیں گے۔ مگر آپ ابھی اس باغ میں کیا کہہ رہے تھے، سچ ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ شائستہ اور تربیت یافتہ آدمیوں کا پابند رسوم مذموم ہونا البتہ مقام استعجاب ہے۔ مگر دن دہاڑے یہ اندھیر۔ جو رسم اُس عورت کے یہاں ہوتی ہے۔ اُسے کیوں کر چھوڑے۔ اور اس کے خلاف کرے تو آپ ہی کے قول کے بموجب اس کا یہ فعل داخل گناہ کبیرہ ہے۔

آزاد : واہ مولوی شرق صاحب! کیا کہنا ہے۔ واللہ مانتا ہوں۔ خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اب تو میاں برق مسکرا مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ بھائی کچھ فرض نہیں کہ عقل کی آنکھوں کو پاکٹ میں بند کر کے پرانی رسموں کے ڈھرے پر چلنا شروع کرے۔ اور اتنی ٹھوکریں کھائے کہ قدم قدم پر منھ کے بھل گرے۔ خدا نے عقل اس لیے نہیں دی ہے کہ رسم قدیم میں ترمیم نہ کرے۔ بلکہ اس لیے کہ خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیجیے۔ اگر پرانی باتوں کی پوری پوری پیروی کی جاتی تو یہ جامدانی کے کرتے اور شربتی کے انگرکھے، اور زربفت و کمخواب، خواب میں بھی نظر نہ آتا۔ باقرخانی اور پلاؤ، اور نرگسی کباب، کے عوض انسان پاڑھے اور ہرن کا کچا گوشت کھاتا۔ خدا نے آنکھیں دی ہیں، مگر افسوس کہ ہم نے بند کر لیں۔ پر موجود ہیں مگر کام میں نہیں لاتے۔ یارو کچھ تو بلند پروازی کرو۔ ذرا تو آنکھ کھولو:

اے ذرہ یکی قصد رہ گردوں کن　　　　دی قطرہ یکی میل لب جیحوں کن
اے دانہ کہ خوشہ میتوانی گشتن　　　　درخاک چہ ماندۂ سری بیروں کن

برق : واہ بھئی واہ، واللہ تم بڑے گرما گرم آدمی ہو۔ اچھا آڑے ہاتھوں لیا۔ اور ایسا

معقول کر دیا کہ میں تمھارا ہی کلمہ پڑھنے لگا۔

۔ بوڑھے کھوسٹ کی نوخیز اور چنچل بیوی کی باتیں اور عاشقی و معشوقی کی گھاتیں۔

پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

میاں آزاد کو شوق چرّایا کہ پیر فرتوت کی البیلی چھیل چھبیلی بیوی کو وہ خط دیں۔ اور دل لگی دیکھیں۔ ٹانگن کی سواری، باد بہاری، غڑاپ سے اسی مقام پر داخل۔ رات کو پنچھیوں کی طرح ایک پیڑ کے سایہ میں بسیرا لیا۔ اور صبحدم منھ بنوا، خط گھٹوا، آب سرو سے غسل کر، جاکٹ زیب، برپتلون ڈانٹ، ترکی پھندنے دار لال لال ٹوپی سر پر جا، ہدہد کی صورت بنا، نیب ٹولے کی طرف بوئے گل کی طرح چل کھڑے ہوئے۔ کپڑے فوق البھڑک، رشک طاؤس نگارین، روکش مرغ زرّیں۔ چلتے چلتے نیب ٹولے میں دن سے جا دھمکے۔ پیر فرتوت نے تو ان کے دم دھاگے میں آکر، اور ایسے حریف عیّار کو لنگوٹیا یار جان کر کچا چٹھا کہہ ہی سنایا تھا۔ ناک کی سیدھ پر چلے، اور ٹھیک اسی نزہت کدۂ پر فضا میں پہنچے۔ جہاں اُس گلِ رعنا کا مسکن تھا۔ اب اندر قدم رکھتے کلیجہ لرزا جاتا ہے اور باہر خیال دید گدگداتا ہے:

تنگ آیا تھا نہایت خاطرِ مشتاق سے
ہر گھڑی کہتی تھی چل ہر وقت سمجھاتی تھی ہاں

اتنے میں ایک طرار اور ستم گار، کہاری چمکتی ہوئی آئی۔

کہاری : میاں کون ہو؟ کہاں سے آنا ہوا۔ کس کی تلاش ہے؟

آزاد : بی مہری صاحب سلام۔ ہم مسافر پردیسی ہیں۔

کہاری : (جھڑک کر) اے واہ اچھے آئے۔ میاں یہ کیا کچھ سرا ہے؟

آزاد : (ہاتھ جوڑ کر) از برائے خدا اپنی بیوی سے نہیں کہہ دیتیں کہ بڑے میاں نے ایک خط بھیجا ہے۔

مہری نے ایک طرّارہ بھرا تو گھر کے اندر تھی۔ میاں کے پاس سے ایک صاحب آئے ہیں۔ خط لائے ہیں۔ وہ چونک اٹھیں، ایں! میاں کے پاس سے؟ چل جھوٹی، مجھے نہ جھٹلا!

کسی اور کو جا کر اڑاتا۔ یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میاں کسی قبرستان میں میٹھی نیند سو رہے ہوں گے۔ بیوی ذری جھروکے سے جھانکیے تو وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔

اتنے میں میاں آزاد نے دو عورتوں کی باتیں سنیں۔ ایک جوان۔ دوسری اس کی ماں۔ سنیے! کیا مزے مزے سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

جوان: اے اماں آج تو بے طور کنگھی چوٹی کی فکر ہے:

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

کوئی گھورے تو انسان نکھار کرے، کوئی مرے تو آدمی سنگار کرے۔ تم دو اوپر اسی برس کی ہوئیں۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ مگر جوانی کا بل نہیں گیا۔ سہیلیاں ارد گرد سنوار رہی ہیں۔ عطر لاؤ، غازہ لاؤ، بنکار رہی ہیں۔ حسن دان سامنے ہے۔ کس ٹھسّے سے مشاطہ چوٹی گوندھ رہی ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

پیرزال: مجھ نصیبوں جلی کی قسمتوں میں یہ ہی بدا تھا کہ سخت محنت میں باتیں سنوں، اور بیٹی تہمتیں تراشے۔ کوئی اور کہتی تو دست پناہ سے زبان نکال لیتی۔ تم تو میری آنکھوں کی پتلی ہو۔ ہائے مامتا بڑی چیز ہے۔ بیٹا تم یہ باتیں کیا جانو۔ نام خدا ابھی جوان ہو۔ الھڑ ہو نادان ہو:

ای لیاقت ہزار ہو بابا ابھی ناکردہ کار ہو بابا

بناوٹ سجاوٹ تو میری گھٹی میں پڑی تھی اور میں نہ بنتی ٹھنتی تو تمھاری چشم فسوں پرداز کو تعلیم ناز کون دیتا۔ ستم گاری کا سبق کون لیتا۔ اے بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ باہر جاؤ، تمھارے میاں کا آدمی آیا ہے خط لایا ہے۔

میاں آزاد نے جو یہ باتیں، اور رمز و کنایہ کی گھاتیں، سُنیں تو ہوش پرّاں ہو گئے۔ آئے حواس غائب۔ اس:

شمع افروزِ محفلِ عشاق — نمکِ جاں بسمل عشاق
جرسِ کاروانِ منزلِ شوق — طرفہ لیلیٰ نمائے محمل شوق
نامہ آموز بُلبلِ حیرت — تخم افشاں مزرع الفت

نے جھروکے سے دیکھا۔ کہ ایک آدمی سچ مچ کھڑا ہے۔ مہری نے ان کو بلایا۔ باہر کرسی پر حضرت متمکن ہوئے۔ اور چق کے ادھر وہ گلبدن اُس حوروش پر جو نظر پڑی تو نور کا مجسمہ

نظر آیا۔ تیر عشق جگر کے پار تھا۔ دل مضطر و بے قرار تھا۔ کمر ایسی پتلی کہ سایہ کے بوجھ سے بل کھائے۔ مکھڑا بن گھنے چاند کو شرمائے۔ چاہ زنخداں وہ جسمیں زلیخا کا دل ڈانواں ڈول ہو جائے:

به فرقش گل کند گر سایبانی — قدش خم گردد از بارِ گرانی
بر اندامش فتد گر پرتو ماه — نزاکت سازدش در خواب آگاه

اس حسن گلوسوز پر وہ سیاہ ریشمی لباس، اور اس پر عطر عروس کی بو باس، جوبن جو پھٹا پڑتا تھا، نظارے کا قدم پھسلتا تھا:

حسن پر اُس پری کے کی جو نگاہ — نظر آئی وہ شکلِ غیرتِ ماہ
پر اتیلی کمال ہے وہ سمن — کم سنی کے سبب سے الھڑپن
اک جھمکڑے سے پھر وہ غیرت برق — زن سے بھاگی چمک کے صورت برق
حسن و خوبی میں وہ بتِ مغرور — سر سے پا تک برنگِ شعلۂ نور
سن برس چودہ اک کا ہوگا کمال — پر وہ ماہ دو ہفتہ بدر جمال
مستِ صہبائے غمزہ و انداز — اٹھتا جوبن شباب کا آغاز
انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز — دلربا بات کا نیا انداز
نشہ کے لال لال وہ ڈورے — جن پہ نرگس کے پڑتے ہیں ڈورے
اونچی چوٹی وہ گوٹے کا موباف — پیچ سارے گندھے ہوئے شفاف
ناک میں بھی وہ نور کا تنکا — چشم زہرہ میں جس کی کھٹکے ضیا
اور گلے میں وہ نور کی ہیکل — دیکھ کر جس کو جان ہو بیکل
زیب پا تھی جڑاؤ وہ پازیب — آدمی کیا مَلَک کو دے جو فریب
کاندھوں پر وہ دوپٹہ ململ کا — فالسائی رنگا ہوا ہلکا
دھانی اطلس کی خوب چوڑی گوٹ — دلِ عاشق ہو جس کو دیکھ کے لوٹ
کرتی شبنم کی آستینوں دار — ملگجے پن پہ اس کے اور بہار
پاؤں میں بوٹ بھی وہ زردوزی — شمع رخ محو گلشن افروزی
ناز سے پائینچے اٹھائے ہوئے — شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
نشۂ بادۂ شباب سے چور — چال مستانہ حسن پر مغرور

سیکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی
جان طاؤس و کبک لیتی ہوئی

وہ جادو نگاہ، غیرتِ مہر و ماہ، مستوں کی طرح جھومتی، اٹھکھیلیاں کرتی چلدی۔ ادھر مہری نے میاں آزاد سے کہا کہ آپ سے خفا ہو گئیں۔ اسی وقت بوریا بدھنا اٹھائیے۔ میاں آزاد باذلِ پُر درد، وآہ سرد چل کھڑے ہوئے۔ جان سے عاری، عاشقانہ اشعار زبان پر جاری۔

میاں آزاد تو تھے بڑے فراٹے باز، زبان دراز، حاضر جواب، لگاوٹ میں انتخاب میٹھی میٹھی باتوں میں طاق، رمز و کنایہ کی گھاتوں میں مشاق، عاشقی میں مجنوں و فرہاد، سچے سودائی پکّے آزاد۔ لیکن بڈھے کھوسٹ کی چھبیلی چنچل جورو سے جو آنکھ لڑی، تو بلا کی مصیبت پڑی، یہ شوخ و شنگ، وہ بڈھا دقیانوس کا ہم سنگ، اس کی اٹھتی جوانی، نام خدا بارہ[12] تیرہ[13] برس کا سن، ان کے حلوا کھانے کے دن، اس کا حسن گلو سوز، وہ کالا بھجنگا، ہفتہ کا روز یہ رگ جاں میں آفت اُٹھانے والی، وہ صید پیرانہ سالی، یہ بُتِ جادو جمال، وہ تیرہ صدی کا دجّال۔ اس کا پیارا پیارا مکھڑا ایسا جیسے چودھویں کا چاند۔ اس کا وہ کالا کالا چہرہ جس کے مقابل میں الٹا توا بھی ماند۔ نشیلی انکھڑیوں کے لال لال ڈورے خون رلاتے تھے۔ طفل اشک رنگ لاتے تھے۔ زلفِ عنبریں سے بہشت کی لپٹیں آتی تھیں۔ دماغ کو طبلۂ عطار بناتی تھیں۔ وہ طاؤس کی سی چال، مستانہ کمر کا پائینچے کے بوجھ سے سیکڑوں بل کھانا۔ وہ جلوہ فروشی وہ معشوقانہ انداز، وہ عربدہ جوئی وہ دلربایانہ ناز، وہ شوخی وہ مسکرانا، وہ دستِ حنائی وہ شانِ دلربائی، وہ گردن کا نہوڑانا، دوپٹے کا سینے سے لپٹا جانا:

ناتوانی وہ چشمِ جادو کی
اور کھجاوٹ وہ تیغ ابرو کی

الغرض جنون کے ترنگ، اور عشق کی امنگ میں میاں آزاد:

پنجہ زد عشقش لباسِ پارسائی پارہ شد
طاعتِ صد سالہ ام تاراج یک نظارہ شد

کہتے ہوئے سر دھنتے تھے۔ کہ یکایک ایک شخص سامنے آن کھڑا ہوا۔ چھریرا بدن، سیم تن، نازک اندام، گلفام، یا حضرت حضور کی تو دھوم ہے۔ ذری اس گاڑھے وقت غریبوں

کے بھی آڑے آیئے تو احسان ہو گا۔

آپ اپنا مطلب فرمائیے، حال صاف صاف کہہ سنائیے ہائے!

میں تو اس درد سے نہ تھا آگاہ / دل کو کیا ہو گیا مرے اللہ
تپِ عشقِ صنم نے شدّت کی / سوزِ غم نے تباہ حالت کی
بے قراریِ دل ستانے لگی / چشمِ تر اشکِ خوں بہانے لگی
شعلۂ شوقِ دل بھڑکنے لگا / مرغِ جاں حزیں پھڑکنے لگا

یا حضرت وضع سے تو مولوی پن برستا ہے۔ مگر گفتگو سے ٹپکتا ہے کہ کسی ترک شوخ کے تیر نگاہ کی دل میں خلش ہے۔ بندہ میر شکار۔ کمر بستہ خدمت گزار۔ مطلوب سے ملاؤں۔ محبوب کو لاؤں۔ دل شکستہ کی مومیائی میرے پاس ہے۔ مرہم زخم عشق دیا س ہے۔ لیکن ذری اتنا احسان کیجیے کہ یہ اخبار پڑھ لیجیے، اور جواب ترکی تبر کی لکھ دیجیے۔

یہ کہہ کر میر شکار نے کئی اخبار میاں آزاد کو دیے۔ یہ لاکھ سودائی تھے تو کیا ہوا۔ مگر چتونوں سے تاڑ گئے کہ یہ طوائف بچہ پڑھنے لکھنے کا شائق ہے۔ حلّالِ غوامض و دقائق ہے۔

میاں آزاد نے باآواز بلند پڑھا "اقوام مجہول النّسب کی تعلیم،" اخّاہ یہ بحث ہے۔ ہم تمھارے طرف سے بیڑا اٹھاتے ہیں اور اقوام مجہول النّسب کی تعلیم کے فوائد زبان قلم پر لاتے ہیں۔

ارباب نشاط کی تعلیم

کل شیخ بن کے مجتہد العصر ساقیا / دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے پہ طنز / معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے / پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
تقصیر ہو معاف تو اک عرض میں کروں / لیکن نہ کیجیے مجھے موردِ عتاب کا
سبزہ ہو کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش / اور واں کوئی نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے اک شوخ بیحجاب / دے ذائقہ دہن کو زبان کے لعاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے / گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت نہ ہم سلام کریں قبلہ آپ کو / گر کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

اڈیٹر صاحب : مجرا عرض ہے۔ ذرا بایاں قدم، اور دایاں ہاتھ دیجیے۔ واللہ آپ کو تو دور ہی سے سلام کرے۔ میں کہتا ہوں یہ آخر آپ کو سوجھی کیا کہ اقوام مجہول النّسب کی دھجیاں اُڑا دیں۔ واللہ مانتا ہوں۔ اچھا فتویٰ دیا۔ پہلے تو میں چکرایا کہ یہ مجہول النّسب اور معروف النّسب چہ معنی دارد؟ یائے معروف و مجہول سنا کرتے تھے۔ اقوام معروف و مجہول اب سننے میں آئیں۔ خیر پیر شوربیا موز۔ اب سنیئے! کہ گھبرا کر ایک مولانا بالعلم والفضل اولنا کے پاس گیا۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج اقدس، الحمد للہ علی کل شئی قدیر۔ یا حضرت ایک شے ہے۔ فرمایا سگ ہے۔ یا خالی بک بک ہے۔ یا الٰہی اتنے قافیے کہ قافیے کا بھی قافیہ تنگ ہے، عقل دنگ ہے۔ پوچھنا صرف اس قدر ہے کہ اقوام مجہول النسب چہ معنی دارد۔ استغفر اللہ، کوئی مسئلہ منطقی پوچھا ہوتا تو جواب دیتا۔ علم ہیأت کا سوال کیجیے تو زمین و آسمان کے قلابے ملاؤں، لامکاں کی خبر لاؤں، ستارے آسماں سے اتاروں۔ حکیم تھل تھل کی قبر پر لات ماروں۔ فقہ کا مسئلہ پوچھو تو وہ بات بتاوں کہ سیدھے طوبےٰ کے سائے میں ٹھنڈی ہوا کھاتے ہو۔ میوہ گرا اور غٹ سے نوش جان، سات طبق زمین اور نو طبق آسمان، سمک سے سما اور فلک الافلاک سے تابہ تحت الثریٰ کی خبر ہے۔ قبلہ و کعبہ بندے کو اس تقریر سے الجھن ہوتی ہے۔ سوال از آسماں جواب از ریسماں، میں کہوں املی آپ کہیں آم۔ حضور بورا گئے ہیں یا غلام، اچھا تو سنو!

اقوام مجہول النّسب عبارت ہے اُن اقوام ناعاقبت اندیش و ستم کیش، خستہ جگر و دلریش، سے جن کے باپ کا پتا نہ دادا کا ٹھکانا، لاکھ میدان فکر میں عقل کے گھوڑے دوڑائیے گا۔ ان کا پتا نہ پایئے گا۔ مثل رنڈی طوائف وغیرہ کے۔ بس رخصت۔ ع مغز ما خورد و جان خود ید رید۔ لو صاحب، اب ہم شیر ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ اقوام مجہول النسب طوائف بچوں اور طوائفوں کو کہتے ہیں، یا جو اُن کے قبیل کے ہوں۔

یا حضرت آپ سچ سچ کہہ دیجیے۔ بھئی جھوٹ بولے تو تمھارا ہی خون پیے۔ راست راست، بے کم و کاست، تڑ سے بے دھڑک کہہ دو، کہ ان کی تعلیم میں گناہ کیا ہے۔ اور ایمان سے کہنا تعلیم ارباب نشاط کے لیے موزوں ہے یا آپ کے لیے۔ وہ ہنسے،

بھئی وہ ناک پر ہنسی آگئی - وہ ہونٹھ پر آئی - ع - وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو - ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ :

ہم خوب سمجھتے ہیں تمھاری باتیں دکھلانے کی ہیں فقط یہ ساری باتیں
منظور ہے جلوہ لن ترانی حیلہ اللہ ری تمھاری پیاری پیاری باتیں

میاں ارباب نشاط کا دم غنیمت ہے - دنیا کی چہل پہل ان کے دم سے محفل کی رونق ان کے قدم سے، بھلا گونگی محفل کس کام کی - یہ زہاد خشک ہی کو مبارک رہے - یہاں تو جب تک طبلے کی گمک نہ ہو، رخ انور کی جھلک نہ ہو، کڑوں کی جھنکار نہ ہو، چھڑوں کی چھنکار نہ ہو، چھما چھم کی آواز نہ آوے، کان سرور نہ پاوے کوئی برق وش نظر نہ پڑے، کسی شوخ ستم گار سے آنکھ نہ لڑے، گمرہ نہ سجے، تال نہ بجے - دھما چوکڑی نہ مچے، منہدی نہ رچے، رنگ رلیاں نہ منائیں، شادیانے نہ بجائیں، آوازے نہ کسیں، عطریں نہ بسیں، تانیں نہ سنیں، سر نہ دھنیں، نازک آوازی نہ ہو، نظارہ بازی نہ ہو، آنکھوں میں لال لال ڈورے نہ ہوں - دودھیا لٹورے نہ ہوں، ناؤنوش نہ ہو، صنم بادہ فروش نہ ہو، عقل فراموش نہ ہو، پریاں عین مستی میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتی نہ ہوں، سیوطی کے پھول اور حنا کی ٹٹیاں مہکتی نہ ہوں، قہقہے نہ ہوں، چہچہے نہ ہوں، تو کس مردود و مطرود کو اپنے حساب دم بھر جینے کو جی چاہے - واللہ محفل باؤلے کتے کی طرح کاٹ کھائے :

محفل میں گدگداتی ہو شوخی نگاہ کی
شیشوں سے آرہی ہو صدا قاہ قاہ کی

اِدھر جام مل ہو، اُدھر صراحی کی قلقل ہو، ادھر گل ہو، اُدھر بلبل ہو، اور کوئی نازنین مہ جبیں، بصد ناز معشوقانہ بھارہی ہو - اور گا رہی ہو کہ - ے

مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو بادۂ دلکشا بجو، تازہ بتازہ نو بنو
با صنمے چو لعبتے خوش نبشیں بخلوتے بوسہ ستاں بکام از د تازہ بتازہ نو بنو
شاہد دلربائے من میکند از برائے من نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو

محفل کا رنگ خوب جما ہو - عجب دلربایانہ سماں ہو، پھر اگر گردن نہ ہلجائے تو جھک کر سلام کر دوں - اب غور فرمایئے کہ ایسے طائفے کو جوڑ بیا میں بند کر رکھنے کے قابل ہے -

حضور نے کن الفاظ سے یاد کیا ہے۔ واہ بندہ نواز۔ ارباب نشاط کی اچھی گت بنائی۔ اس کو بھی جانے دیجیے۔ ہاتھوں ہاتھ ایک اور دلیل لیجیے۔ مگر ہٹ دھرمی نہ کیجیے سنیے! عالی خاندانی کا غرور، معالی دُودمانی کا فخر، شرافت کا ناز، نجابت کا غرّہ، دقیانوسی باتیں ہیں۔ نئی روشنی سوجھاتی ہے، ع کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست؟

آپ حضرت نوح کے ہمعصر ہوں تو وہ بات ہی اور ہے۔ ورنہ نظر انصاف سے کہیے کہ افعال کی نیکی اور بدی پر لحاظ کرنا چاہیے، یا اس پر کہ پدرم سلطان بود۔ ماشاءاللہ بود یا نبود، مرا چہ ترا چہ۔ مانا کہ اُن کے فعل کو بعض دنیا پرست مخل تہذیب ہی سمجھیں، مگر حضرت یہ تو اپنا اپنا پیشہ ہے۔ وہ اپنے ناچنے گانے ہی کی روٹیاں کھاتے ہیں۔ آپ کیوں اپنے اڑھائی چانول گلاتے ہیں۔ یہ بھی نہ سہی جانے دیجیے اور سنیے! نیک کا تعلیم دنیا تحصیل حاصل ہے۔ اس کی تو گھٹی میں نیکی پڑی ہے۔ تعلیم بدوں کو دو کہ نیک ہو جائیں طبلے اور ڈھولک کو توڑیں۔ تھرکنے ناچنے سے منھ موڑیں۔ بھاؤ بتانا چھوڑیں۔ تہذیب سے ناتا جوڑیں۔ مگر بخیر ان کو چچا سعدیؔ کا شعر خوب یاد ہے۔ اور اسی سے دل فرحناک و روح شاد ہے کہ:

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم   بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

لیکن۔ ع۔ جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ: میاں سنو تعلیم وہ سمندر ہے۔ جس کا اور نہ چھور۔ اور سمندر میں ناپاک بھی پاک ہو جاتا ہے۔ حزیں بھی فرحناک ہو جاتا ہے۔

اور کر در باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ، جو اس نے کہا ہم نے لکھ مارا، اور نہ اپنا تو مقولہ یہ ہے کہ چاہے، کسے باشد خیر سے خالی نہ ہو، شر کے قریب نہ پھٹکے، راہ راست سے نہ بھٹکے:

خیری کن ای فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

لہ شیخ شرف الدین مصلح بن عبداللہ، سعدی شیرازی متوفی ۶۹۲ھ مصنف گلستاں و بوستاں۔ مشہور عالم، صوفی اور شاعر تھے۔

ایک چھیل چھبیلی، کامنی کی سواری بادبہاری اور میاں آزاد کی بے قراری واشکباری

میاں آزاد نہار منھ شہر میں چکر لگا رہے تھے، تو ایک دفعہ ہی کیا دیکھتے ہیں، کہ سامنے سے ایک زرنگار، پُر بہار، فنس بڑے ٹھٹے اور دھوم دھڑکے سے آرہی ہے۔ کہاروں کی ہَری ہَری وردی طوطے پھڑک، لال لال پگیا فوق البھڑک، کندھے جوڑے ہوئے شہ گام جارہے ہیں۔ چھتکا سرخا سُرخ لال بھبھوکا، فنس زنگاری، سواری ہے یا بادبہاری۔ ایک طرحدار، باغ وبہار، گل عذار، شوخ و عیار، مہری ساتھ ہے۔ نظر اِدھر اُدھر، مگر فنس کے ایک کونے پر ہاتھ ہے۔ بے حجاب برفگندہ نقاب، چندے خورشید، چندے مہتاب۔ آنکھوں میں صہبائے جوانی کا سرور، وہ حسن وہ نور کہ :

ع۔ دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوے اوجِ طور

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ اللہ اللہ، جس پری کے جلو میں ایسی ایسی چھیل چھبیلی، بانکی ترچھی، دنیا سے نرالی، سہیلیاں ہیں، وہ خود کیسی نہوگی۔ اب بی مہری کی چال ڈھال، اور جوڑے کا حال سُنیے! فالسئی اطلس کا لہنگا، "۔ نازسے پائنچے اٹھائے ہوئے"، پڑاتے کی ڈیڑھ ہاتھ چوڑی سبز سرخ گلابی، آسمانی گوٹ ہے۔ میاں آزاد کے کلیجے پر چوٹ ہے۔ گوٹ پر آٹھ آٹھ پلیٹیں، اس پر تاج بنے ہوئے لال گرنٹ کا نیفہ، جو یاقوت احمر کو خوں رلائے۔ اس میں فالسئی اور ریشمی ازار بند پڑا ہوا۔ گُچھے دار کرن ٹکی ہوئی۔ ہاتھ میں آٹھ آٹھ لڑ کا توڑا گنگا جمنی، وہ گوری گوری بھیاں، اور کالی کالی لچھیاں، جیسے شاخ صندلی پر مار، آب رواں کا چُست پھنسا ہوا شلوکا آستینوں دار۔ چوڑی کے کڑے شیر دہاں، اور نازک نازک، سبز سبز کریلیاں۔ پور پور چھلّے۔ بازوؤں پر یکہ اور جوشن، بلا کا نکھار، غضب کا جوبن۔ ناک میں فیروزے کی ننھی سی کیل۔ کانوں میں تین تین انتیاں اور بیچ میں بجلیاں۔ زلف چلیپا تا بہ کمر۔ چھپکا زیب سر آگے مچھلی غیرتِ ماہ: چاہِ زنخداں کی چاہ۔ وہ دستِ حنائی، اور فردی بوٹی کی دُلائی، شربتی کا استر، ڈیڑھ بالشت کی گوٹ، دل لوٹ پوٹ، اس پر کٹاؤ نے اور بھی کٹا ؤ کیا۔ گلے میں ڈھک دھکی پڑی ہوئی، میاں آزاد سے آنکھ لڑی ہوئی،

کبھی بصد ادائے دلربا، ڈلائی کو سنبھالنا، کبھی بالوں کو سوارنا، پائنچے اٹھائے فنس کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے، کبھی مسکراتی ہے۔ کبھی کمر لچکاتی ہے چھٹکے ہیں سے وہ نور کا بکا نظر آیا کہ میاں آزاد کلیجہ پکڑ کر رہ گئے۔ اب شہر بھر میں جس طرف فنس جاتی ہے، سودائی مزاج مہری پر آوازے کستے ہیں۔ کوئی بولا فنس ہے یا اُڑن کھٹولا۔ دوسرے حیرت زدہ نے کہا: کسی پری کی سواری ہے، باد بہاری ہے۔ تیسرے عاشق تن کیا کہتے ہیں۔ راجہ مہر اذری دھیرے قدم، چوتھے محب عشق باز، موزوں طبع بولے:

دیکھنا پینس ہے یا سکھپال ہے
وہ میاں وہ جس کا چھٹکا لال ہے

کوئی امیر فقیر کا بھیس بدل کر کہتا ہے، مہری کا جوبن برقرار، میں صدقے میں نثار، بیگم صاحب ان گورے گورے پیارے پیارے ہاتھوں سے زکوٰۃ حسن دے ڈالو۔ سائیں کو بے دیے نہ ٹالو۔ مہری جھڑک رہی ہے۔ اے چل موئے، درگور، چخے دور، کبھی ہنس کر گھڑکیاں دینا کبھی جھنجلا جھنجلا کر بُرا بھلا کہتا، یہ موا مرچرا تو اچھا رنگ لایا ہے۔ کیا نشہ پی کر آیا ہے۔

میاں آزاد غور کر کے دیکھتے ہیں تو وہی مہری جو پیر فرتوت کی چھیل چھبیلی بیوی کی جلو میں تھی۔ دیکھتے ہی کھل گئے۔ اہو ہو ہو! آج تڑکے تڑکے بہتی اچھی ہوئی۔

آزاد: بی مہری سلام۔ غریبوں کو بھی پہچانتی ہو؟

مہری: اخاہ آپ ابھی جیتے جاگتے ہیں۔ بے حیا کی بلا دُور۔

آزاد: زندہ تو ہوں مگر زندہ درگور۔ اب جینا محال ہے۔ زندگی وبال ہے۔

مہری: ہم ابھی سے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔

اتنی شہ جو پائی، تو میاں آزاد نے آگے قدم بڑھایا، مگر ٹکا سا جواب پایا۔ بس بس ذرا الگ رہیے گا۔ چہ خوش ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔ اتنے میں کہار ہوا سے باتیں کرتے زن سے نکل گئے، اور یہ بے چارے سٹپٹا کر رہ گئے۔ جب تک فنس نظر آئی اُدھر ہی نگاہ تھی۔ ادھر وہ نظر سے غائب ہوئی تو آنکھوں سے جوئے اشک رواں، منھ پر ہوائیاں قدم اُٹھانا دوبھر تھا۔ الٰہی یہ چھلاوا تھا یا سواری، واہ ری ناکامی، جو کام ہوا وہ پورا ہی نہ ہوا۔ میاں آزاد مارے رنج کے جا کر سو رہے۔

ماں بیٹیوں کی زبان درازی
اور میاں آزاد کی نظارہ بازی

خدا ترا اُبتِ ناداں دراز سن توکرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن توکرے

ہمارے سیلانی جوان، میاں آزاد تو راہ عشق کے خضر مجنوں و فرہاد، ووامق کی قبر تک سے واقف تھے۔ رات توجوں توں کاٹی۔ مگر سحر کاذب کے تاروں کی چھاں میں نیب لوٹے پہنچے۔ دل ہی دل میں، دعا مانگتے جاتے ہیں، کہ خداوندا! آج اس جادونگاہ غیرت ماہ، نوش لب، سیم غبغب کا چاند سا مکھڑا دور ہی سے دکھادے، تو جی اٹھوں تیری بندہ نوازی کے صدقے جاؤں، اور نہیں تو نظر بھر کر جھلک ہی دیکھ پاؤں۔ اہو ہو ہو! جامے میں پھولے نہ سماؤں۔ اس رشک خوبانِ فرخار، مستِ بادۂ پندار کے ایوان لطافت بار، کی طرف سے نکلے تو کان میں بھنک پڑی کہ کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہیں۔ اتنے میں اس کی بوڑھی ماں نے کہا: اہو ہو ہو! اے ذری دیکھ تو، کیا نور کی چاندنی چھٹکی ہے۔ چاند اس وقت دلہن بنا ہوا ہے۔ اس نے عجب سادگی سے جواب دیا۔ امّی جان! تمھاری بھی انوکھی باتیں ہیں۔ سردی کی چاندنی! جیسے بوڑھے کی نصیبوں جلی بیوی کی جوانی۔ اور آج تو آسمان یوں ہی جھک جھک کر رہا ہے۔ آج نکلا تو کیا۔ جب جانے کہ اندھیرے گھُپ میں ہمیں اوپر والا شکل دکھائے۔ اندھیری رات میں نظر آئے۔ بوڑھیا ایک جہاں دیدہ، سن رسیدہ، لگی تشفی کرنے۔ جانی ذری صبر کرو، اپنی جوانی کی قسم! بڈھا تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ آج موا کل دوسرا دن۔ ٹیں سے انٹا غفیل ہو جائے گا۔ پھر ہم تم کو کسی اچھے گھر بیاہیں گے۔ اب کی خدائی بھر کی خاک چھان کر وہ ڈھونڈ نکالوں، جو اپنے وقت کا یوسف ہو، قبول صورت ہو، صبح و شام خبر آیا ہی چاہتی ہے کہ بڈھا چل بسا۔ یہ سُن کر وہ پرکالۂ آتش کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اماں! جب تم اپنی جوانی کی قسم کھاتی ہو تو ہمیں بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ تم تو اپنے کو بالکل ننھی سی سمجھتی ہو۔ کم درددں تو آپ کے گالوں پر جھریاں، چونڈا اسفید جیسے بگلے کا پر۔ سرِ آپ کا گھوڑے کا کھٹکا بنا ہوا ہے۔ کمر ٹیڑھی ہو گئی۔ مگر منھدی کا

لگا نا نہ چھوٹا نہ چھوٹا۔ رنگین دوپٹہ ہی عمر بھر اوڑھا جب دیکھو کنگھی چوٹی سے لیس، اللہ سوں ایسی آن گڈھ بوڑھی، دیکھی نہ سنی۔ لے چلو کوئی اور ذکر چھیڑو، گڑے مردے نہ اکھیڑو تم پیر، ہیں دلگیر، تم سن رسیدہ، ہیں ستم دیدہ، بڑھیا نے ٹوئیاں طوطے کی طرح گردن ہلا کر پوپلے منھ سے کہا: پیاری، تمھاری باتوں سے مجھے ہول ہوتا ہے۔ اللہ میری بچّی پر رحم کھائے۔ بوڑھے کے مرنے کی خبر سنائے۔ موا زندہ درگور ہو، مہری آمین امین کہتی جاتی ہے۔ تڑکے تڑکے اچھی دعا مانگی۔ اتنے میں مہری بھی چھپر کھٹ سے انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھی۔ بیوی آپ کے نمک کی قسم، صاحبزادی کو دل وجان سے آپ کا پیار ہے۔ مگر ابھی نام خدا بچّہ ہے۔ ناکردہ کار ہے۔ سادگی سے جو ناپ شناپ منھ پر آیا کہہ سنایا۔ اور اکھڑ پنے کے تو ان کے دن ہی ہیں۔ ابھی جمّا جمّا (جمعہ) آٹھ دن کی پیدائش، نیک و بد اونچ نیچ کیا جانیں۔ جب سیانی ہوں گی تو شہور (شعور) آپ ہی آپ سیکھ جائیں گی۔ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: جو مجھے ان کی باتوں سے رنج ہوا ہوتا نیک بیبیوں کے ساتھ حشر نہ ہو۔ مگر کیا کروں آگئی اوریب میں۔ اپنا کیا، اپنی آنکھوں اور گھٹنوں کے آگے آیا۔ اس میں کسی کا کیا اجارا، پھر ایک دفعہ ہی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی: بُرا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجکو یہ آئے دن طعنے دیتی ہیں کہ تم بڑھیا ہو۔ اس ضعیفی میں نکھرتی کیوں ہو۔ ہے ہے، لوگو میں کس سے کہوں کہ اس کے غم نے میری کمر توڑ ڈالی۔ نہیں میرا ابھی سن ہی کیا ہے۔ اچھا ازروے حلف تو ہی کہہ کہ کوئی اور بھی مجھے بوڑھی کہتا ہے۔ مہری اپنے دل میں تو ہنستی تھی کہ انھیں جوان بننے کا شوق چرایا۔ بی حوّا کے ساتھ کھیلی ہوں گی۔ مگر ابھی ننھی ہی بنی جاتی ہیں۔ لیکن ایک طرّار مکار کہتی کیا ہے۔ اے توبہ! بوڑھے پن کی آپ میں چھاں بھی نہیں۔ میرا اللہ جانتا ہے، جب آپ اور بٹیا کو کوئی ساتھ دیکھ لیتا ہے تو پہلے آپ پر نظر پڑتی ہے، پیچھے ان پر۔ بلکہ ایک موئی دل جلی نے پرسوں آوازہ کسا تھا کہ چھوٹی بی تو چھوٹی بی بڑی بی سبحان اللہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی تو خیر۔ اس کی ماں نے خوب کاٹھی پائی ہے۔ آپ کے چہرے سے تڑخ تڑخ نور برستا ہے۔ جو دیکھتا ہے ترستا ہے۔ پیرزن تو کھل گئیں۔ مارے خوشی کے ریشہ خطمی ہوگئیں۔ اتنے میں وہ پرکالۂ آتش آگ بھبھوکا ہوگئی۔ اٹھلا کر اٹھی، اور کڑک کر بولی: چل چپ۔ خوشامد خوری، اللہ کرے تیرا میاں بھی میرے میاں کا ایسا بڈھا ہو جائے، اور تم خوشامد نہ کرو تو

کھاؤ کیا۔ اماں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔ جھوٹے پر شیطان کی پھٹکار۔ بوڑھی عورت، کچھ اوپر سو برس کا سن، لٹھیا ٹیک کر دس قدم چلتی ہیں، تو گھنٹوں ہانپا کرتی ہیں۔ دن کو اونٹ اور سارس نہیں سوجھتا۔ میں اندھیری رات میں تاگا پرو لوں، ایک طرارہ بھروں تو آسمان میں تھگلی لگاؤں۔ ان کے بوڑھے غمزے دیکھ کر مجھے ہنسی آتی ہے۔ جی جلتا ہے کہ یہ کس برتے پر اتراتی ہیں۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بھلا کمر تو میرے غم کے سبب سے خم ہو گئی، اور دانت کیا ہوئے؟ مہری نے سمجھا، سمجھ کر بات کو ٹال دیا۔ اب وہ بتِ قوس ابرو، عنبریں مو، پلنگڑی سے بصد ناز اٹھی، اور باغیچے میں اٹھلا اٹھلا کر چہل قدمی کرنے لگی۔ بال بکھرے ہوئے، یہی معلوم ہوتا کہ سانپ لہرا رہا ہے۔ کمر لاکھوں بل کھا رہی ہے۔ میاں آزاد نے جو اُس بت پندار کو برافگندہ نقاب دیکھا تو سن سے جاں نکل گئی۔ زلف چلیپا پر نظر پڑی تو سانپ کلیجے پر لوٹنے لگا۔ وہ آب وتاب، وہ شباب، وہ شوخی، وہ دلربائی، وہ شان خود نمائی، اہو ہو ہو! اتفاق سے اُس زاہد فریب، دشمنِ صبر و شکیب نے کہیں ان کو دیکھ لیا کہ مصروف نظارہ بازی ہیں، اور دور ہی سے جوبن لوٹ رہے ہیں۔ جسم کو چھپائے آنکھ چرائے، بجلی کی طرح لونک کر نظر سے غائب ہو گئی۔ میاں آزاد حیران کہ اب کیا کروں۔ آخر کار دل کی بے قراری نے ایسا مجبور کیا کہ بآوازِ بلند آٹھ آٹھ آنسو سے رو رو کر یہ اشعار زبان پر لائے۔ اور اس صنم ستم کوش کو سنائے:

او بتِ پر غرور بے پروا — ہم غریبوں پہ تو ہے رحم کی جا
تمکنت کو نہ کام فرماؤ — اک نظر مڑ کے دیکھتی جاؤ
عاشقوں سے نہ اس قدر شرما — اک نگہ کے لیے نہ آنکھ چرا
جانِ جاں کچھ ترس نہ کھاؤ گی — نیم بسمل ہی چھوڑ جاؤ گی
خنجر ناز سے کیا ہے جو قتل — تیغ انداز سے کیا ہے جو قتل

وہ ان ایسوں کی کب سننے والی تھی، مڑ کے دیکھنا گالی تھی، تمکنت مانع تھی، حسن پر قانع تھی۔ وہ گیسوئے غدار انداز۔ یہ شہید کشتۂ ناز۔ وہ طرح دار رنگیلی گل عذار۔ یہ صید عشق واد ہار۔ ایک دفعہ ہی وہ غمزہ فروشِ سمن اندام، بھیرویں کی دھن میں لہرا لہرا، یہ ٹھمری زبان پر لائی، اور جوشِ جوانی میں بحسرت خوب گائی۔

پیا کے آون کی بھئی بر باں، درد جو اٹھاری رہوں: مورے پیا کو بیگ لے آوری،

نکست جیرا جائے ہو۔ پیا درد جو اٹھاری رہوں۔ اس کے جواب میں ان کی اماں جان ٹیپ دار آواز میں کیا کہتی ہیں۔ جو بنوا ہو چار دنا دیو ساتھ۔ جوبن رُت جات، سب ہیں کھ مورت رے۔ کدر نہ پوچھے بات رے۔ یہ جو بنوا ہو چار دنا دیو ساتھ میاں آزاد نے باہر سے تان لگائی۔ ے

تیرے نینو نے مجھے مارا رسیلی متواریوں نے جادو ڈارا

بی مہری نے دیکھا کہ سب نے اپنے اپنے حسب حال، ہانک لگائی، ایک میں ہی پھسڈی رہ گئی۔ یہ بھی کفن پھاڑ کر، پنجے جھاڑ کر، چیخ اٹھیں۔

جاؤ جاؤ کاہے ٹھاڑے ڈارڑے گلے بائیں رے گھیرے رہت نت تیرے جیسے چھائیں رے
جانت ہوں جو ہم سے چہت ہو ناہک اتنی منتی کرت ہو
کدر کرت ہوارے ناہیں ناہیں رے جاؤ چلو کاہے ٹھارے ڈارے گلے بائیں رے

ماشاء اللہ کیا ہی خوش قطع جانور ہے

ایک روز میاں آزاد پچھلے پہر سے ہی مٹر گشتی کے لیے نکل کھڑے ہوئے، سڑک پر کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑوں کا تانتا لگا ہے۔ پہیے چوں چوں کرتے جاتے ہیں۔ گاڑی بان برہا گاتے ہیں۔ مسافر کوئی کمر کسے، کوئی سر پر بوجھ لادے، کوئی آفتابہ یا لوٹیا رسّی میں لٹکائے، کوئی جوتا پہنے یا بغل میں دبائے، چلا جاتا ہے۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہے۔ شکرم یہ آئی وہ زن سے نکل گئی۔ بھوپوں بھوپوں مسافر اِدھر اُدھر کترا گئے۔ کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار۔ میٹھی لوپی جاتا ہے۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا ہے۔ کہ اتنے میں سامنے سے بیس پچیس اونٹ نظر آئے۔ کسی پر انار چلغوزہ، کسی پر خوبانی وانگوزہ، مغلیے ساتھ ہیں۔ کُھر معلوم ہو نہ سُم، ایک اونٹ کا سر دوسرے کی دم۔ ایک مسافر نے میاں آزاد سے کہا سچ کہیے گا۔ یہ وزن ہی نرالا ہے، گردن کا بول بالا ہے، ایسا جانور دیکھا نہ سنا۔ ماشاء اللہ کیا قطع شریف ہے۔

میاں آزاد: صورت واہ جی واہ! سیرت سبحان اللہ، قطع دنیا سے نرالی، طبیعت نہایت عالی، جانور کیا جانوروں کا قبلہ گاہ ہے۔ اور حق یوں ہے کہ رہ نوردانِ دشتِ عرب کا یہی پشت و پناہ ہے۔ بے تکاپن قطع ہی سے ظاہر ہے۔ گردن شیطان کی آنت،

یا طولِ اَمل۔ مگر دُم میں نمدا۔ خاصہ لنڈورا۔ اور بلبلانا ماشاء اللہ کتنا موزوں ہے۔ گویا ارگن باجا بجا رہے ہیں۔ اور سنیئے کہ یہ حضرت بڑے جغادری ہیں۔ اس سے پُرانا جانور ہی نہیں۔ ساری خدائی کی خاک چھانیے مگر بھلا مشعلِ آفتاب لے کر ایسا پرانا جانور کہیں سے ڈھونڈھ تو لائیے، جب ہی تو ہم نے ان کو جانوروں کا قبلہ گاہ کہا۔ ہماچل پہاڑ کی چوٹی پر جو علما نے تحقیقات کی اور پہاڑ کھودا تو اونٹ کی ہڈیاں پائیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اونٹ کا یہ مقولہ صحیح ہے:

من آن وقت بودم کہ آدم نبود   کہ آدم عدم بود و حوّا نبود

اور لطیفہ سنیئے! کہ جنگل سے حضرت ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ حضرت انسان کے پکے خیر خواہ ہیں۔ جنگل میں نام نہیں۔ غیر آباد مقام سے ان کو کام نہیں۔ جب دیکھیے ہماری آپ کی خدمت کے لیے تیار۔ ناک میں نکیل پڑی ہوئی کمر پر بوجھ لادے، ریگستان، میدان، بیابان میں، گردن اٹھائے، بلبلاتے چلے جاتے ہیں۔ اور طرّہ یہ کہ بھٹکٹیا ہی کھاتے ہیں۔ سادگی جو مزاج میں سمائی تو اغذیہ نفیس ولذیذ سے نفرت ہو گئی۔ تارک اللحم بھی حد سے سوا۔ گوشت کا چھونا قسم ہے۔ ہاں کانٹوں پر عاشق ہیں۔ اس میں کسی کا اجارا نہیں۔ املی کی پتی پر بھی لوٹ ہیں۔ اب بعض علما نے تحقیقات کی ہے، کہ دنیا میں ایسا بھی ایک مقام ہے، جہاں اونٹ جنگلوں میں رہتے ہیں۔ ورنہ اب تک سب کو شک کی جگہ یقین تھا کہ اونٹ پالو ہی جانور ہے۔ جنگل سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں۔ دور کیوں جائیے۔ امریکہ اور اسٹریلیا میں کیوں ٹھوکریں کھائیے، ترکستان اور شمالی چین ہی کے جنگلوں میں ان سے نہ مصافحہ کر لیجیے۔ اب سنیئے کہ جنگلی اونٹ پالو کی نسبت زیادہ خاکی رنگ کا ہوتا ہے لیکن ناک کے پاس زرد ازرد۔ پھر سلیم الطبع، حلیم المزاج، اتنے بڑے کہ جب چاہیے جنگل سے پکڑ لائیے۔ ہاں ذرا شتر غمزے تو دکھائیں گے، مگر جھپ سے دَم میں آجائیں گے۔ بے چوں چرا۔ شر تو مزاج میں چھو ہی نہیں گیا۔ حضرت انسان کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب۔ پکڑا اور چھری تیز کی۔ اور گوشت خوب چھک کر چکھ گئے۔ مگر ہاں کوئی جنگل کا اونٹ پکڑ لینا دل لگی نہیں ہے۔ اور اگر پھنس بھی گیا تو پالنا محال ہے۔ وحشت عمر بھر جاتی ہی نہیں۔ کتے کی دم ہے۔ جنگلی اونٹ ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ گھوڑے کو سانڈنی کی دم میں باندھ دو، یہ کیسا ہی

تیز رفتار صرصر تک کیوں نہ ہو، اس کے غبار کو تو پہنچے نہیں۔ مگر جنگلی سانڈنی کی آواز نازک ہوتی ہے۔ بلبلانے میں بھی معشوق پن کا انداز، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض بے تکے شاعر اپنے معشوق کی آواز کو سانڈنی کی نازک آواز ہی سے تشبیہ دے دیں۔ ہر سال بچے جنے، ممکن کیا کہ کسی سال ناغہ ہونے پائے۔ کبھی کبھی توام بچے بھی جن پڑتی ہے۔ ورنہ عموماً ایک جنگلی کا گوشت پالو کے گوشت سے شیریں اور خوش ذائقہ ہوتا ہے جھیل تالاب نالہ پر بیشتر گھوما کرتے ہیں۔ لوگوں کی یہ بھی دل لگی ہے کہ شکار کیا اور نوش جان فرمایا۔ اور کھال دو ڈھائی روپیہ کو پٹیل ڈالی۔ نظر منزلوں کی خبر لائے، گدھ شرمائے۔ قوت شامہ ایسی تیز کہ کتا بھی مان جائے اور کان تو بلا کے پائے ذرا پتا کھڑکا اور اونٹ سرکا۔

نام بھی حضرت کے مختلف ہیں۔ اونٹ، شتر، بعیر، کمیل، سانڈنی، اوٹونا۔ اور عرب کے لغات میں تو شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہوگا۔ جس میں ان کا ساجھا نہ ہو۔ بھئی چاہے کوئی اس کو بنائے، چاہے اس کی نرالی سج دھج پر قہقہہ اڑائے، اس میں شک نہیں کہ ریگستان کے تو یہ بادشاہ ہیں۔ مہینوں کا پانی ایک ہی دفعہ سڑک لیتا ہے پیٹ ہے یا بحرا دقیانوس۔

ہات ترے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں

میاں آزاد تو تیر عشق کے گھائل تھے۔ اس پری پیکر، رشک قمر کی تصویر ہر دم نظر کے روبرو رہتی تھی۔ ایک دن اس تاک میں بیٹھے تھے کہ شاید اس مست بادۂ نازنیت طناز کی سواری، اور وہ فنس زنگاری، نکلے تو خیر دور ہی سے آنکھیں سینک لیں۔ جب دل زیادہ بے قرار ہوا تو آپ ہی آپ بڑا اٹھے۔ ہائے! وہ مسّی مالیدہ لب، وہ سیم غبغب، وہ ترچھی چتون، وہ نور کا جوبن:

اس لبِ جاں بخش کا بوسہ نہ پایا ایک شب
مثل اسکندر تلاشِ آبِ حیواں میں رہے
یا خدا قسمت رسا ہو اس دلِ صد چاک کی
شانہ بن کر یار کی زلفِ پریشاں میں رہے

اتنے میں دور باش، داد ب، کی کانوں میں بھنک پڑی۔ یہ سمجھے کہ وہی سرخا سرخ چھتکا، وہی فنس زنگاری ہے۔ وہی مہری وہی سواری ہے۔ چہرہ گلنار ہو گیا۔ کلیجہ دھڑ

دھڑ کرنے لگا۔ مارے خوشی کے آنسو ڈبڈبا آئے، اور یہ شعر زبان پر لائے:

غلغلے مدت سے سنتے ہیں مبارکباد کے
آمد آمد ان کی ہے پر آج تک آتے نہیں

مگر دیکھتے ہیں تو ایک مست ہاتھی پر ایک مہنت جی سوار۔ گیروے کپڑے پہنے، بھبھوت رمائے پلتھی مارے، بڑے طنطنے سے بیٹھے ہیں۔ چیلے چاپڑ ساتھ، کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار۔ کوئی پیدل۔ کوئی خواصی میں بیٹھا مورچھل ہلاتا ہے۔ کوئی نرسنگا بجاتا ہے۔ میاں آزاد نے اپنے دل میں کہا، کہ اچھے ملے، ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے مگر اپنی ناکامی کے صدقے۔ واہ ری قسمت۔ اتنے میں ایک خواہ مخواہ مردِ آدمی ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

مرد آدمی: خیر تو ہے حضرت خیر تو ہے؟ آخر اس بے قراری اور پریشانِ حالی کا سبب کیا کچھ ہم سے تو کہیے۔

آزاد: کہیں کیا، بڑے کا سر۔ اور آپ سے کہیں بھی تو مطلب۔ آپ بے چارے بھلا کیا بتائیں گے۔ ہمارے زخم کا کسی کے پاس مرہم ہی نہیں۔ کوئی پری کو شیشے میں اتارے تو ہم دردِ دل سنائیں، ورنہ اپنا کلیجہ کیوں پکائیں:

دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا حافظ

مرد آدمی: میاں میری صورت پر نہ جاؤ، میں عشق کے کوچے سے خوب واقف۔ پرانا جفا دری ہوں۔ بے ذری چلیے تو میرے ساتھ۔ جیسے ہی میاں آزاد اُٹھے، پٹ سے چھینک پڑی۔ مرد آدمی تو بڑے بچھیا کے تاؤ تھے کہنے لگے دار ے ہٹ ترے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں۔ نامعقول نے ہتھے ہی پر ٹوک دیا۔ یار ذرا دم کے دم تامل کرو، چھینکتے چلنا بدشگونی ہے۔

آزاد: لاحول ولا قوۃ! تو قبلہ ہمارا آپ کا ساتھ ہو چکا۔ چھینک کی ایسی تیسی۔

خیر دونوں پو قدمی چلے۔ دس قدم بھی نہ گئے تھے کہ بلّی راستہ کاٹ گئی۔ مردِ آدمی نے میاں آزاد کا ہاتھ پکڑ کر اُن کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بھئی عجب بے تکے آدمی ہو میاں بلی راہ کاٹ گئی۔ دم کے دم ٹھہرو! پہلے کوئی اور جائے تو ہم بھی جائیں۔ اب سنیے کہ آدھ گھنٹے تک منھ کھولے کھڑے ہیں اللہ بھیج، مولا بھیج، یا الٰہی کوئی ادھر سے آئے۔ آزاد

نے جھلاّ کر کہا کہ بھئی ہم کو آپ کا ساتھ اجیرن ہو گیا۔ یہاں ان باتوں کے قائل نہ ان خرفات کی طرف طبیعت مائل۔ خیر خدا خدا کر کے وہاں سے چلے تو پھر تھوڑے عرصے کے بعد مردِ آدمی نے میاں آزاد کو روکا۔ ہائیں! ہائیں خدا کا واسطہ ادھر سے نہ جانا میاں اندھے ہو کیوں۔ دیکھتے نہیں دو گدھے کھڑے ہیں۔ ان میں سے جانا بد شگونی ہے۔ آزاد نے کہا۔ گدھے تو آپ خود ہیں۔ اتنے میں مردِ آدمی نے ڈنڈے سے گدھوں کی خبر لی۔ پھر دونوں ساتھ چلے تو مرد آدمی کی بائیں آنکھ پھڑکی۔ غضب ہی ہو گیا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ساری چوکڑی بھول گئے۔ کیوں یار کوئی تدبیر بتاؤ؟ للہ اس وقت کام آؤ، بھئی ہماری بائیں آنکھ بے طور پھڑک رہی ہے۔ مرد کی بائیں اور عورت کی دائیں آنکھ کا پھڑکنا ستم ہے۔ ایک دفعہ ہی آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ جَل تو جَلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ میاں آزاد کھل کھلا کر ہنس پڑے کہ عجیب بزرگوار ہیں۔ چھینک پڑی اور حواس غائب، بلّی نے راستہ کاٹا، اور ہوش پیترا، گدھے دیکھے اور اوسان خطا، اور جو بائیں آنکھ پھڑکی تو ستم ہی ہوا۔ حضرت اب آپ کا ٹھکانا نہیں۔ اب بائیں پھڑکی خدا ہی خیر کرے۔ کہنا مانو ان خرافات باتوں میں نہ جاؤ۔ یہ وہم ہی وہم ہے۔ جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔ لیکن میں آپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔ آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ ع۔ بندہ رخصت می شود اللہ نگہبان شما ست۔

مول تول تو واجبی سو

میاں آزاد یا ٹھوکریں کھاتے، ڈنڈا ہلاتے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے، گریہ وزاری کرتے مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ شباب، وہ آب تاب، وہ جوشِ جوانی، وہ طرز غزل خوانی، وہ چاند سا مکھڑا، الغرض پرانا دُکھڑا، سب نوک زبان تھا۔ کبھی بے قرار ہو کر چلاّ اٹھے رسیلی متوالیوں نے جادو ڈالا۔ کبھی یاہ وزاری اشعارِ عاشقانہ اپنے حسبِ حال زبان پر لائے۔

حسن اتفاق سے ایک خوشخو، خوبرو، جوان طنّاز سے دو چار ہوئے۔ اِنھوں نے اُن کو اُنھوں نے اِن کو نظر بھر کر دیکھا۔ یہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ جوان طنّاز نے کہا:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

پیچھے پھر کر دیکھا تو جوان رعنا نے مسکرا کر کہا :

گو نہیں پوچھتے ہر گز وہ مزاج ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

یا حضرت وحشت عرض ہے۔ کہیے پہچانا؟ واہ استاد یہ اُڑان گھائیاں، گویا کبھی کی علیک سلیک ہی نہیں۔ میاں آزاد چکرائے، کہ بھئی یہ اچھے آئے۔ حضرت میں تو اس اٹھتی جوانی ہی میں قبلہ پیری و صد عیب ہو گیا۔ واللہ کس مردک نے آپ کو پہچانا ہو۔ ایں! ماشاء اللہ! کمال کیا واللہ! اب تک نہ پہچانا۔ میاں ہم تمھارے لنگوٹیے یار ہیں۔ انور۔ اخاہ! میاں انور ہیں، یہ کہہ کر دونوں گلے ملے، اور ایسے خوش ہوئے کہ دونوں رو دیے، پھر بغلگیر ہوئے، پھر آنکھیں پرنم ہو گئیں، پھر ملے، پھر آنسو ڈبڈبا آئے۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ ہم تم برسوں ایک جگہ رہے۔ ساتھ ساتھ مٹر گشتی کی۔ کبھی باغ میں، کبھی چاندنی رات میں بھاگ اُڑا رہے ہیں، کبھی جنگل میں منگل گا رہے ہیں۔ کبھی منطق کی بحث، کبھی معقولات میں قیل و قال، کبھی عدم اور وجود، عبد اور معبود، کی بحث میں جنگ و جدال۔ کبھی بانک کا شوق، کبھی لکڑی کا ذوق، میاں وہ دن لد گئے۔

میاں آزاد نے اپنے پرانے دوست کو جو پایا، کچا چٹھا کہہ سنایا۔ انور نے کہا بھئی چلو اب ساتھ ساتھ رہیں۔ جئیں یا مریں۔ مگر رفاقت نہ چھوڑیں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک شہر ہے مینو سواد، چپہ چپہ آباد، وہاں چل کر بے فکری سے بسر کریں۔ مگر یار ہمیں آج کچھ سودا خریدنا ہے۔ چلو لگے ہاتھوں بازار سے لے نہ آئیں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد اور میاں انور چوک چلے۔ اور چلتے چلتے چوک میں غڑاپ داخل۔ پہلے بزازے میں دھنسے۔ چاروں طرف سے آؤ آؤ، اور کاؤ کاؤ آوازیں آنے لگیں۔ آئیے آئیے! اجی میاں صاحب کیا کھریداری منجور ہے؟ کھان صاحب کپڑا کھریدیے گا، آئیے! وہ وہ کپڑا دکھاؤں کہ بجار بھر میں کسی کے پاس نہ نکلے۔ ایک دُکان میں جا کر بیٹھ ہی تو گئے۔ دکان میں ٹاٹ بچھا ہے، اس پر سفید چاندنی۔ اور لالہ نین سکھ دوڑیے کا انگرکھا ڈانٹے بڑے ٹھسّے سے بیٹھے ہیں۔

توند وہ فرمایشی کہ اللہ ہی اللہ، جیسے روپیہ کے ڈو دالے تربوز۔ ایک سمت تنزیب شربتی ادھی کے تھانوں کی قطار۔ دوسری سمت مومی چھینٹ، اور فلالین کی بہار۔ ایک جانب گرنٹ اور ساسالیٹ، دوسری جانب چکن یا کیچل لیٹ، الگنی یا کھونٹی پر رومال قرینے سے لٹکے ہوئے سرخا سرخ، لال بھبھوکا، یا سفید جیسے بگلے کے پر۔ ہرے ہرے

دھانی۔ جیسے، امیر دروازہ لال رنگا ہوا، پنّی سے منڈھا ہوا، دیوار پر صدہا چٹھیاں، میاں آزاد اور ان کے یار جاکر دکان پر ڈٹ گئے۔

انور : بھئی سیاہ مخمل دکھانا۔

بزاز : بد لو بد لو! جری کھان صاحب کو کالی مکھمل کے تھان دکھاؤ۔ برطھیا۔

لالہ بد لو کئی تھان تڑ سے اٹھا لائے۔ سوتی، کاشانی، بوٹی دار، باغ و بہار، انور نے کئی تھان دیکھے۔ خوب دیکھ بھال پوچھا دام؟

لالہ : گجوں کے حساب بتاؤں یا تھان کے دام؟

بھئی گزوں کے حساب بتاؤ؟ مگر لالہ جھوٹ کم بولنا۔ لالہ نے قہقہہ اُڑایا۔ ہجور ہماری دکان میں ایک بات کے سوا دوسری نہیں کہتے کون میل پر سند ہے۔ انور نے ایک تھان پسند کیا۔ اس کی قیمت بتاؤ؟ سُنیئے کھداوند۔ جی چہے لیجیے جی چہے نہ لیجیے۔ جی اکھتیار ہے مُل دس روپیہ گج سے کم نہ ہوگی۔ ایں! دس روپیہ گز میاں خدا سے ڈرو۔ اتنا جھوٹ۔ الٰہی توبہ۔ یار عزیز آخر خوف خدا بھی کچھ چیز ہے۔ اچھا تو پھر آپ بھی کچھ پھرماؤ۔ ہم چار روپیہ گز سے ٹکا زیادہ نہ دیں گے، میاں آزاد کیا کہتے ہیں۔ برادر اول بہا، مشک بہا، انور نے جھڑک کر کہا۔ بس آپ چپکے بیٹھے رہیں، آپ کو ان باتوں میں ذرا بھی دخل نہیں۔ شیخ کیا جانے صابون کا بھاؤ۔

لالہ : تو چار روپیہ گج تو بجار بھر میں نہ ملے گی۔ اچھا آپ سات کے دام دیجیے، بولیے کتنی کھریداری منجور ہے۔ دس گج اُتاروں کیا خوب دام چکائے ہی نہیں، اور گزوں کی فکر پڑ گئی۔ واجبی بتاؤ واجبی۔ چکما کسی انیلے کو دیجیے گا۔ ہم ایک گھاگ ہیں۔ اچھا صاحب پانچ روپیہ گج لیجیے گا یا اب بھی چکما ہے۔ نا میاں بڑی مہنگی ہے۔ خیر خاطر ہے سوا چار سہی لے بس پانچ گز اتار دو لالہ نے ناک بھوں چڑھا کر پانچ گز مخمل اتار دی۔ اور کہا آپ بڑے کڑے خریدار ہیں۔ ہمیں گھاٹا ہوا۔ کھیر کھالی ہاتھ آپ کو کیا بھیجتے، مُل ان داموں میں شہر بھر میں نہ پایئے گا۔

آزاد : بھئی قسم ہے خدا کی میرا ایسا انیلا تو پھنس ہی جائے، اور وہ چپتا کھائے کہ عمر بھر نہ بھولے۔

انور : اجی ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔ آج تو شام ہوگئی۔ کل سہ پہر کو ہم آپ کو

زار کی سیر کرائیں گے۔ دیکھیے گا۔ کیا دل لگی ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر انور اپنے شفیق باتحقیق زا اپنے گھر لے گئے۔

تمھاری تیغ کا منھ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

میاں آزاد کے تنور سینے میں تو حسرت کا داغ تھا۔ اور خونابہ دل دراباغ تھا۔ چہرے سے وحشت آشکار۔ بشرے پر جنوں کے آثار۔ چشم خوں چکاں سینہ بریاں۔ دن کو گریہ وزاری شب کو اختر شماری۔

انور نے جو اپنے لنگوٹیے یار کی یہ حالت زار دیکھی، تو گھرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ع۔ "درماں ہے کہ درد لا دوا ہے" آزاد نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا:

دلبری برداز دلم صبر و قرار — کز رخش بر قع بود صبح بہار
فتنہ جوئی آفتِ صبر و شکیب — نو گلی چشمِ خرابش عندلیب
زلفِ پُرچیں کردۂ عمر دراز — نوکِ قرگاں خاصۂ تصویر ناز
بندِ بر قع طرۂ گیسوئے حور — طوقِ گردن مشرقِ صبح ہُور
چشم جادو یش گرِ تسخیر جان — در نگہ سازد تبسّم راعیاں
زلف و کاکل سنبلِ گلزار طور — ساق و ساعد ماہی دریائے نور

انور تو چتونوں سے تاڑ گئے تھے، کہ کسی ترک زرّیں کمر کے تیر تنگ نے گھائل کر دیا۔ اب ان اشعار سے اور بھی یقین کامل ہو گیا کہ کسی نگار تند خو۔ آتشیں رو، کی نظر غلط انداز، تیر کی طرح کلیجے کے پار ہو گئی، اور یہ عشق وہ سمّ قاتل ہے کہ تریاق اکبر کو بھی مسموم کر دے۔ آدمی تھے دانا، دور اندیش، سوچے کر فہمایش ان کی آتشِ عشق پر روغن کا کام کرے گی۔ ان کو نصیحت کرنا، گویا سمند جنوں پر تازیانہ لگانا ہے۔ آؤ اِدھر اُدھر کے سیر سپاٹے سے ان کا دل بہلائیں، باتوں میں لگائیں۔ پوچھا کہو کہیں بھئی چلنے کا قصد ہے۔ میاں آزاد تو مٹر گشتی پر اُدھار کھائے ہی بیٹھے تھے، جھپ راضی ہو گئے۔ ایک پاؤں میں ادھوڑی استر کا گنوار جوتا، دوسرے میں مُتھرا گھیلا۔ اس وحشت کو دیکھیے گا۔ یارانِ سر پل آوازے کسنے لگے۔ نزی کے جوتے لگا چور ہے۔ ماشاء اللہ کیا دورنگی ہے۔ چلتے چلتے انور نے کہا: لو خوب یاد آیا، اس پھاٹک

میں ایک بانکے رہتے ہیں۔ ذری میں ان سے مل لوں۔ میاں آزاد اور انور دونوں پھاٹک میں ہو رہے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کس بل کے جوان رعنا، ادھیڑ مگر جری، اور دلیر نبوٹ، پٹے میں طاق، بانک لکڑی میں مشاق، کرسی پر بیٹھے ہیں۔ گھٹنا چوڑی دار چست، ذرا شکن نہیں، چنت دار انگرکھا ایڑی تک، چھاتا گول کٹا ہوا، چولی اونچی تنکے دار، ماشہ بھر کی کٹی ہوئی ٹوپی، چیت گاہ کے ایک کونے پر مانگ نکلی ہوئی، سر دہی سامنے رکھی ہے۔ اور جا بجا قرولی، قرابینچہ کٹار، کھانڈا تلوار، پتنچہ خدائی کے ہتھیار چنے ہوئے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد انور نے کہا: حضور وہ بندوق آپ نے پچاس روپیہ کو خریدی تھی۔ دو دن کا وعدہ تھا۔ جس کے چھ مہینے ہو گئے، مگر آپ سانس ڈکار تک نہیں لیتے۔ بندوق ہضم کی تو صاف صاف کہہ دیجیے؟ روز روز کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا فائدہ۔ اس بانکے نے مسکرا کر کہا: ہوش کی دوا کیجیے، عقل کے ناخن لیجیے، کیسا صندوق، کس کی بندوق، اپنا کام کرو، میرے منھ نہ چڑھو۔ میاں ہم بانکے لوگ ہیں۔ سیکڑوں کو غچے، ہزاروں کو جھانسے دیے۔ آپ بیچارے کس کھیت کی مولی ہیں۔ یہاں تو پشت سے سپہ گری ہوتی آئی ہے۔ ہم اور دام دیں؟ خدا خدا کیجیے۔ معقول"، لو حضرت یہ اچھا بانکپن ہے۔ واہ اچھے بانکے ہیں۔ کر آنکھ چوکی اور کپڑے غائب۔ کمل ڈالا اور لوٹ لیا۔ اور کہنے لگے ہم بانکے ہیں۔ لقوں لچوں۔ شہدوں لچوں کا کام ہے۔ کیا بانکپن اسی کا نام ہے، کہ قرض خواہ کو آنکھیں دکھائے، اور گیدڑ بھبکیاں بتائے۔ آج کے ساتویں دن چہرہ شاہی بائیں ہاتھ سے گن دیجیے گا، ورنہ خیر نظر نہیں آتی۔ انور بکتے ہی رہے، اور وہ مونچھوں پر تاؤ ہی دیا کیے۔ کہا تو یہ کہا کہ معلوم ہوتا ہے۔ زندگی اجیرن ہو گئی۔ ہمارے ہاتھ تمھاری موت بدی ہے۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ پہلے اپنا منھ تو دیکھو آپ اور ہم سے ٹرائیں۔ آپ اور بانکوں سے بڑائیں۔ اے تری قدرت؟ اس پر انور آگ بھبھوکا ہو گئے۔ اے ذوق ہے اس بانکپن پر۔ سینہ لگائیں اور بانکے کہلائیں۔ آخر کار اس تکرار اور تو تو میں میں کے بعد میاں آزاد کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف رخ کیا۔

اب سنیے کہ انور اور میاں آزاد ادھر راہی ہوئے۔ اُدھر اس بانکے کا بھانجا جو گھر میں گیا، تو دیکھتا کیا ہے سب عورتیں ناک بھوں چڑھائے منھ بنائے غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ ایں کیوں کیوں خیر تو ہے؟ یہ آج سب چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں۔ گھر ہے یا شہر خموشاں؟ مکان ہے یا گنج شہیداں؟ اتنے میں ان کی ممانی کڑک کر بولیں: اب

چوڑیاں پہنو۔ چوڑیاں، اور بہو بیٹیوں میں دب کر بیٹھ رہو۔ وہ موا، درگور کردروں باتیں سنا گیا۔ اور پکے پہر بھر تک اول فول بکا کیا، اور تمھارے ماموں بیٹھے سب سنا کیے۔ دیکھی تیری کاپی، اور باون پورے اجاڑ۔ بس بس! پھیری منھ پر لوئی تو کیا کرے گا کوئی۔ جب شرم ہی نگوڑی بھوں کھائی تو پھر کیا۔ بڑے مردوے بنتے ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ موئے کلیجے کی زبان دست پناہ سے نکال لیں۔ الٰہی خیر، اُنھوں تے تو بانکوں کے بھی کان کاٹے۔ بلا کی عورت ہے۔ یہ خم ٹھونک دم۔ بانکے کے بھانجے کو جوانی کا زعم، طاقت کا غرّہ شیر خشمگیں کی طرح بھرا ہوا باہر آیا۔ ماموجان یہ آج آپ سے کس سے گلخپ ہوئی؟ جلد بتائیے؟ ورنہ میں ہیرے کی کنی کھا لوں گا۔ ہمارے بانکپن میں بٹہ لگ گیا۔ عورتوں تک کی رگِ حمیت جوش زن ہوئی، اور آپ چپکے بیٹھے سنا کیے۔ واللہ عزّت ڈوب گئی۔ لے از برائے خدا اس کا نام تو بتائیے؟ قسم جناب امیرؑ کی ابھی آنتوں کا ڈھیر ہو۔

ماموں صاحب: بھائی وہ ایک شریف زادہ ہے۔ میں اس کا قرض دار ہوں۔ اگر دو باتیں اس نے سنائیں بھی تو کیا۔ اور وہ ہے ہی بے چارہ کیا۔ وہ پدی میں شہباز۔ وہ دُبلا پتلا آدمی میں جوان طناز۔ بولنے کا موقع ہوتا تو اس وقت اس کی لاش نہ پھڑکتی ہوتی۔ مجھے جانتے نہیں کیسا محرور المزاج، مغلوب الغیظ ہوں۔ مکھی تو ناک پر بیٹھنے نہیں پاتی۔ لے غصّہ تھوک دو۔ جاؤ کھانا کھاؤ۔ آج میٹھے ٹکڑے پکے ہیں۔ قسم خدا کی جب تک اس شمر کا خون نہ لوں تب تک کھانا حرام ہے۔ میٹھے ٹکڑوں پر آپ ہتھے لگائیے، یہاں زندگی تلخ ہے۔ الغرض ایسے طیش میں آئے کہ چل ہی کھڑے ہوئے۔ ماموں نے لاکھ سمجھایا۔ مگر یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔

اب ادھر کا حال سنیے! کہ انور جو اپنے گھر پر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ان کا لڑکا تڑپ رہا ہے۔ ہائیں! یہ کیا؟ خیریت ہے۔ لونڈی نے کہا میاں کیا بتاؤں۔ بھیا یہاں کھیل رہے تھے کہ (کہ) کا لفظ کہہ کر وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ، انور نے چلّا کر کہا اُف غضب ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ سفاک طیش کھا کر آیا۔ جب مجکو نہ پایا، تو اس معصوم بچے پر ہاتھ صاف کیا۔ آزاد کے حواس غائب، اری نیک بخت جلد بتا۔ خیر تو ہے۔ ہاں ہاں سنیے تو سہی۔ بھیّا یہاں کھیل رہے تھے۔ بچھی نے کاٹا، بڑی دیر سے بچّہ تڑپ تڑپ کر لوٹ رہا ہے۔ استنے میں میاں انور کی زوجہ مخدّرہ نے اپنے شوہر کو سب حال بتایا۔

اور آنسو بھر لائی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے کہا کہ (ڈانکٹر کو لپک کے بلا نہیں لاتے) آزاد کو لڑکے کے پاس بٹھا کر میاں انور ہسپتال چلے کہ جھٹ پٹ ڈاکٹر کو بلائیں۔

اب سنیئے کہ راستہ میں نیا گل کھلا۔ پچاس قدم بھی انور نہ گئے ہوں گے کہ سامنے سے اس بانکے کا بانکا بھانجا آنکلا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ دیکھتے ہی شیر ببر کی طرح ڈکارا۔ بس اناڑی بس تیری عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابھی ابھی کاسۂ سر خاک و خوں میں لوٹ رہا ہو گا۔ ہمارے ماموں کو صلواتیں سُنانا بڑھ بڑھ کر باتیں بنانا۔ بانکوں کے منہ چڑھنا، استادوں سے بھڑ پڑنا، خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ ہلا اور میں نے ہاتھ دیا، بڑھا اور میں نے کوچے کاٹے۔ انور بے چارے کی حیرانی و پریشانی ناگفتہ بہ اُدھر نور بصر، اور لخت جگر کی وہ حالت سقیم، پیارے معصوم بچّے کا تڑپنا اور بلبلانا، بیوی کا رونا، تلملانا، اَعزّا و اقربا کا بکاو بین، اڑوسیوں پڑوسیوں کا شور و شین، لڑکے کی محبت۔ ادھر اُس شقی القلب سے مقابلہ۔ جسم میں سکت نہیں، زور نہیں، طاقت نہیں، بھاگیں تو قدم نہیں اٹھتے، ٹھہریں تو پاؤں نہیں جمتے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ارد گرد ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں۔ سب سمجھاتے ہیں کہ آپ بانکے جوان۔ یہ دُبلے پتلے آدمی۔ آپ شیر غرین یہ گربہ مسکین:

بہ بازوانِ توانا و قوتِ سرِ دست — خطاست پنجۂ مسکین ناتوان شکست

نترسد آنکہ بر افتادگان نہ بخشاید — کہ گر زپای در آید کسش نگیرد دست

انور نے بادیدۂ مطروح خلق خدا سے کہا کہ بھائی! اس وقت میرا معصوم بچہ جاں بلب ہے۔ ہائے کیا جانے اس وقت کیسا ہو گا! میں اس کو نیم جاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ڈاکٹر کو بلانے جاتا تھا کہ راہ میں انھوں نے گھیرا۔ اب کسی صورت سے مجھے بچاؤ۔ اکثر رقیق القلب آدمی یہ رقت انگیز تقریر سن کر رو دیے۔ اور سب کے سب دست تاسُّف ملنے لگے۔ مگر اس دُھن کے پکّے نے ایک کی نہ مانی۔ خدمت گار سے کہا ایک ولایتی ہمیں دے، دوسری ان کے حوالے کر۔ انھوں نے پھر بہ گریہ وزاری سے کہا کہ مردِ خدا میرا پیارا بچّہ میرے خاندان بھر کا چشم و چراغ، میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا چین، اس وقت حالتِ نزع میں تھا۔ ہائے! ہائے! خدا جانے اس پر اب کیا گزرتی ہو گی۔ بھائی مجھ پر رحم نہ کرو اس معصوم پر تو رحم کی جا ہے۔ وہ سر دہی رے، پیترا بدل کر سامنے آن کھڑا ہوا۔ اور پھر خوب ڈکار کر کہا چپ بزدل، زنان، منتری آچوٹ کے سامنے۔

اتنے میں کسی نے انور کے گھر پر خبر پہنچائی کہ میاں سے خانہ جنگی ہو گئی، تلوار چل گئی۔ آپ جائیں جتنے آدمی اتنی ہی زبانیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ چرکا کھایا اور گردن کھٹ سے الگ ہو گئی۔ یہ سنتے ہی انور کی بی بی دوہتڑ پیٹنے لگی۔ لوگو دوڑو ہائے لوگو دوڑو۔ ارے مجھ پر بجلی گری۔ ہائے میں جیتے جی مرمٹی، ہے ہے میرے سرتاج کا سر خاک میں لوٹتا ہے۔ ہے ہے اس کی گردن سے خون کے شرارے برس رہے ہیں۔ یہ کہہ کر عین حالت بدحواسی میں لڑکے سے چمٹ کر خوب چلّا چلّا کر رو دی۔ ارے میرے بچے اب تو یتیم ہو گیا۔ ارے تیرا باپ داغ دے گیا۔ ہائے! میں اب کہاں جاؤں۔ اس اکلے کو کہاں پاؤں۔ ہائے میرا سہاگ لٹ گیا۔

یہ بے چاری عفیفہ دیوانی کی طرح سر ٹکراتی پھرتی تھی اور تمام عالم اس کی نظروں میں تیرہ و تار تھا۔

میاں آزاد یہ خبر پاتے ہی تیر کی طرح زن سے دوڑ گئے۔ دیکھا تو وہ شقی شمشیر اصفہانی لیے، فیل مست کی طرح چنگھاڑ رہا ہے۔ میاں آزاد خود بڑے بنوٹیے تھے۔ جھٹ سے چھپٹ کر دوسری سروہی اپنے قبضہ میں کی۔ اور انور کو ہٹا کر یہ بھی پینترا بدل، ٹھاٹ سے سامنے جا ڈٹے۔ وہ تو جوش جوانی، اور دعوا ہمہ دانی، کے نشہ میں سرشار تھا۔ پہلے ہتھکٹی کا ہاتھ لگانا چاہا، مگر آزاد نے خالی دی۔ وہ پھر ڈپٹا، اور چاہا کہ چاکی کا ہاتھ جمائے، مگر یہ آڑے ہو گئے۔ وہ پھر جھپٹا، چاہا کہ انی کی چوٹ دے۔ مگر یہ ہتھکٹی کی طرف جھکے، تو اس کا ہاتھ آگے نہ بڑھا۔

"چڈا اگل خیر د"، کسی انیلے گنوار کو یہ اڑن گھائیاں بتانا، میرے مقابل میں چھکے چھوٹ جائیں تو سہی۔ ہاں ہاں آؤ چوٹ پر یہ ستانے کی سند نہیں۔ دے گھس کے ہاتھ۔ وہ رنجک چاٹ گئی۔ اتنے میں وہ بانکا جھلا کر جھپٹا، اور گھٹنا ٹیک کر پالٹ کا ہاتھ لگانے ہی کو تھا کہ آزاد نے پینترا بدلا، اور توڑ کیا۔ مونڈھا مونڈھا تو اس نے بچایا۔ مگر آزاد نے ساتھ ہی جنیو کا وہ تلا ہوا بھرپور ہاتھ جمایا کہ اس کافر شقی کا بھنڈار اتنک کھل گیا۔ اور فیل تن اراراکر دھم سے زمین پر آ رہا۔ میاں آزاد کو سب نے گھیر لیا۔ کوئی پیٹھ ٹھوکتا ہے۔ کوئی ڈنڈ ملتا ہے۔ انور لپکتے ہوئے گھر گئے۔ بی بی کی باچھیں کھل گئیں۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ لڑکے کو بھی افاقہ تھا۔

ہمارے حبیب لبیب، ادیب، اریب، شور بخت، بدنصیب، دشت رہ نوردی کے گردباد، میاں آزاد کو وہ پیاری پیاری صورت گورا گورا مکھڑا، زلف چلیپا، لب لعل شکر خا، جو یاد آیا۔ تو کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ دل مثل سیماب بے قرار آنکھیں چنار کی طرح آتش بار، درد دل کی چمک غضب ڈھاتی تھی، وہ نور کی صورت ہر دم آنکھوں میں پھر جاتی تھی:

بڑھتی جب دل کی بے قراری
پڑھتا یہ غزل بہ آہ وزاری

کیا حال ہو گیا ہے دلِ بے قرار کا — آزار ہو کسی کو الٰہی نہ پیار کا
مشہور ہے جو روز قیامت جہاں میں — پہلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا
امسال دیکھنا مری وحشت کے ولولے — آیا ہے دھوم دھام سے موسم بہار کا
راہ ان کی تکتے تکتے یہ مدت گزر گئی — آنکھوں کو حوصلہ نہ رہا انتظار کا

مقطع ہنوز پڑھنے نہ پائے تھے کہ انور نے بات کاٹ دی۔ میاں اس عشق کا برا ہو، جس نے تم کو دین و دنیا ایک کا بھی نہ رکھا۔ آزاد نے کہا حضرت اس کوچے سے حضور واقف ہی نہیں۔ کوئی میرے جی سے پوچھے، کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ میں عاشقوں میں لاجواب وہ حسن وجمال میں انتخاب، اور اس پر طرّہ شباب:

یاد زلفی سوختت خوں در پیکرم — بوی عنبر مید ہد خاکسترم

گو ایک دفعہ پہلے بھی ایک بتِ شوخ و شنگ، کے طرۂ شبرنگ، اور لیلۃ المعراج گیسو میں دل اٹک رہا تھا مگر:

ناز در مغزم شرابی ریخت عشق — روغنم با شعلۂ آمیخت عشق

انور نے دیکھا کہ یہ بالکل دیوانے ہی ہو رہے ہیں، سوچے چلو ذرا ہوا کھلا لاؤ، شاید وحشتِ دل دور، اور شیشۂ جنوں چکنا چور ہو، دل میں ٹھان لی کہ اس کے سوا کوئی علاج ہی نہیں، اور ان کا ایسا کوئی سودائی مزاج ہی نہیں۔ خیر ٹال ٹول کرکے چلے تو، چلتے چلتے ایک باغ میں پہنچے۔ یہ دونوں دن سے پھاٹک میں داخل۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شامیانہ بصد تزک و احتشام نصب ہے۔ اور اس میں بارہ نوجوان بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ مگر تخلیے کی صحبت ہے۔ انور نے کہا یار ان کے مخل نہ ہو۔ نظر سے اوجھل کیفیت دیکھنے لگے۔ واہ وا واہ! عجب لطف ہے۔ ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں۔ مگر سراب

بے تکلف لنڈھائی جا رہی ہے۔ آزاد کو دن میں اونٹ نہیں سوجھتا تھا، مگر میاں انور نے اتنی دُور سے بوتلوں کے لیبل کو پڑھنا شروع کیا۔ ڈیرا گاگ نیک، اولڈ ٹام جن، شام پن ارش، ہوسکی، کیا خوب، یہاں تو دور چل رہا ہے۔ بڑے بڑے باجپئی اور شیخ شراب ناب کی چسکی لگا رہے ہیں۔ ایک ہندو بے چارہ نیا پھنسا تھا۔ پہلے تو جام شراب لیتے جھجکا مگر ایک اور ہندو نے جو اس وقت ساقی بلکہ پیر مغاں بنے تھے کہا: کہ کچھ سودائی سے ہوا دے، یہ نرمل گنگا جل ہے۔ پیتے ہی سیدھا بیکنٹھ پہنچ جائے گا۔ چلیے وہ غٹ سے نگل گئے۔ ایک مسلمان نو آموز تھے۔ ڈرتے ڈرتے ایک ایک گھونٹ پیتے تھے۔ مگر ایک شیخ صاحب نے ٹہوکا دیا۔ اور کہا پی بھی جاؤ میاں:

شراب ایک ہے لندن کی ہو کہ کوثر کی — اک اپنے واسطے زاہد حلال کرتے ہیں

پیجیے! وہ بھی کھٹ سے اڑا گئے۔ بڑی دیر تک دور چلا کیا۔ جب سب کے سب نشے میں چور، سیر مست و مخمور ہوئے، تو ایک پڑی وش کو بلایا۔ کچھ دیر تک چہل کی باتیں ہوا کیں، بعد ازاں اس نے یہ غزل گائی، اور محفل بھر کو وجد میں لائی:

طرفِ گلشن زاشک گلگوں گل بداماں کسی ست — جعدِ سنبل طرّہ زلفِ پریشاں کسی ست
شور محشر خندۂ زخم نمایانِ کسی ست — مرہم دل خستگان سور نمکداں کسی ست
شب بر وز آمد زسوز نالہائے گرم خیز — داغ درد لہا چراغِ زیرداماں کسی ست
بلبل بے دل برنگِ گل درد بند فیا — در دل شوریدہ پنہاں دردِ پنہاں کسی ست
بے تو در محفل دلِ پروانہ سوز و چوں کباب — شیخِ آہِ آتشیں شمع شبستاں کسی ست
رخنہ بر روئے کار زخم دل افتادہ آہ — کار خود در پردہ ساز و چشم فتاں کسی ست
ردی آسایش نداری از چہ رد پیشِ نظر — یا تو عاشق صحبت دست و گریباں کسی ست

حاضرین جلسہ، بادۂ گلرنگ کی ترنگ میں، ایسے مست ہوئے کہ سر و پا کی خبر نہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

اتنے میں ان رندانِ می آشام میں سے ایک نے دوسرے کی ناک پکڑی۔ دوسرے نے تیسرے کے کان اینٹھے۔ تیسرے نے چوتھے کی گت بنائی۔ چوتھے نے پانچویں پر چپت جمائی۔ پانچویں نے چھٹے کے چانٹا رسید کیا۔ چھٹے نے ساتویں پر دو ہتڑ دیا۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ سب کے سب بھڑ بھڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر پاؤں لڑکھڑائے۔ دھم، دھس

ارار ادھوں، دو قدم چلے اور لڑھک گئے۔ آزاد اور انور وہاں سے چمپت ہوئے، تو راہ میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

آزاد: اس شراب خانہ خراب، پر لعنتِ خدا۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ! اب تک ہم نے نباہی توبہ۔ آیندہ خدا حافظ و ناصر:

از مئی گلِ مقصود چہ دست کسی — ہر گز بمرادی نرسید ست کسی

انور: اجی حضرت آپ نے شرفا کی صحبتیں نہیں اٹھائی ہیں۔ ان کی آنکھیں ہی نہیں دیکھی ہیں:

گر بادہ خوری تو، با خرد منداں خور — یا با صنمی لالہ رُخے خنداں خور
بسیار مخور، فاش مکن درد مساز — کم کم خور و آہستہ خور و پنہاں خور

الغرض دونوں یار گھر پہنچے۔ اور لمبی تان کر خر خر خراٹے لینے لگے۔

ضرورت ہے ایک جورو کی

انور مع اپنے رفیق اور خلیل با التحقیق، عالی نژاد و فرّخ نہاد، میاں آزاد کے، ایک دن اپنے باغچہ فرحت انتما، اور نزہت افزا میں بیٹھے ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے۔ اور گرما گرم چائے اڑا رہے تھے۔ کہ ایک دفعہ ہی ڈاک کا ہرکارہ، ہری وردی پھڑکاتے لال لال پگیا جمائے، خاصہ ٹیاں بنا ہوا، سامنے سے آن موجود ہوا۔ جھک کر سلام کیا۔ اور ایک اخبار دیکر لمبا ہوا۔ اتنے میں انور کے ایک اور لنگوٹیے یار المتخلص بہ بہار، تشریف لائے۔ علیک سلیک اور مصافحہ و معانقہ کے بعد ایک کرسی پر وہ بھی ڈٹ گئے۔ انور نے جھٹ پٹ اخبار کھولا۔ عینک لگائی، اور بڑے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے، صفحہ آخر پر نظر پڑی تو باچھیں کھل گئیں۔ چہرہ گلنار مزاج زعفران زار۔

بہار: اللہ اللہ اس وقت حضور کھلے ہی جاتے ہیں، جامے میں پھولے نہیں سماتے، کیا پڑا پایا؟

آزاد: ہم بتائیں، اور وہ پتے، پتے کی بات بتائیں، کہ حضرت بھی وجد میں آئیں۔ کسی معشوق پری وش کی آمد آمد اس وقت ہے، نہ کہو گے سچ کہیے گا، کیا چتونوں سے تاڑ گیا۔ اللہ ذہن کا بغارہ کھلا ہوا ہے۔ قربان اپنے استاد کے، کیا دور کی کوڑی لاتا ہوں۔

ہم نے سب پاپڑ بیلے ہیں۔ ؎

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے   خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

انور: حضرت آپ تو عاشق تن آدمی ٹھہرے۔ جب دیکھو عشق کے پھیر میں۔ بندہ اس کوچے سے منزلوں بھاگتا ہے۔ بیانِ زہرہ تمثال، حسن و جمال، اور عاشقی معشوقی کا خیال، آپ ہی کو مبارک رہے۔ بندے کو یہ مرض ہی نہیں۔ اس وقت ایک اشتہار پڑھ کر باغ باغ ہوگیا۔ خدا نے چاہا تو اسی اتوارے میں پانچوں گھی میں ہوں۔ اشتہار سنیئے تو آپ خود ہی سمجھ جائیے گا۔ نوٹس

Wanted

An Arabic Professor for The Nazirpur Collage Pay Rs 200, for particulors. Apply to The Principal.

ترجمہ: ضرورت ہے ایک عربی پروفیسر کی، نظیر پور کالج کے لیے۔ تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار اس کی نسبت جو کچھ دریافت کرنا ہو پرنسپل سے دریافت کیا جائے۔

بہار: ہم کچھ سمجھے و مجھے خاک بھی نہیں۔ آخر اس سے مطلب کیا؟

آزاد: ارے صاحب ایک عربی پروفیسر نصیر پور کالج کے لیے چاہیے ہے۔ دو سو روپیہ تنخواہ ملے گی۔ میاں انور درخواست داغنے والے ہیں۔

بہار: خدا کامیاب کرے! لیکن سنیئے تو سہی۔ یہ تو اخبار ہے۔ اس میں خلوئے عہدہ اور تنخواہ، اور درخواست کا کیسا جھگڑا۔ اس میں محاربہ کا حال۔ یا جنگ و جدال، علمی اور پولٹیکل قیل و قال چاہیے یا یہ جنجال۔

آزاد: تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیر و مرشد اخبار تو عطرِ مجموعہ ہے۔ لڑکوں کا اتالیق، جوانوں کا ناصح شفیق، بڈھوں کے تجربہ کی کسوٹی، رکنِ رکینِ سلطنت، تجّار کا دوست، صناعوں کا یارِ غار، رعایا کا وکیل، جمہورِ انام کا سفیر، مدبروں کا مشیر، کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں شوشل امور میں تکرار، کہیں اشعار آبدار، کہیں نوٹس اور اشتہار۔ انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔ شطرنج کے حل طلب نقشے، قرضہ قومی کا نرخ، گھوڑ دوڑ کا تذکرہ، سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ اور جب کبھی کوئی عہدہ خالی ہو، اور اچھا اہلکار نہ ملا، تو حکام خلوے عہدہ

کا حال مشتہر کرتے ہیں۔ لوگوں نے پڑھا اور درخواست داغ دی۔ جہاں اشتہار کے صیغے میں دیکھا کہ ضرورت ہے۔ ضرور پڑھیں گے۔ کہ کس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات بڑی دل لگی ہوتی ہے۔ (ضرورت ہے) پڑھ کر شوق چرّایا کہ دیکھیں شاید ہمارے مذاق کے موافق ہو تو آدھا آنے کا خون کریں۔ لگے تو تیر، نہیں تکا، پڑھتے ہیں تو وہاں کچھ اور ہی رنگ ہے۔ ضرورت ہے ایک آیا کی، بوڑھی خرانٹ ہو، شریف ہو، دیانت دار ہو، مگر دونوں آنکھیں ہوں، (کانی ٹلو نہ ہو) لاحول ولا قوۃ۔ سمجھے تھے کہ کسی کلرک یا اکاونٹنٹ یا مترجم کی ضرورت ہو گی، وہ آیا کی فکر میں ہیں۔ دیسی اخباروں میں بھی اس کا کما حقہ رواج ہو تو بڑے مزے ہوں۔ جس راجہ مہاراجہ، نواب رئیس، کو اہلکار کی ضرورت ہو، کسی نامی گرامی اخبار میں چھپوا دے۔ تاکہ شرفا علما وغیرہ کو درخواست بھیجنے کا موقع ملے۔

بہار: لیکن حضرت۔ پھر تو طرح طرح کی ضرورتیں چھپنے لگیں۔ چانڈو باز چھاپیں کہ ضرورت ہے۔ ایک ببو کی جس میں دقیانوس کے وقت سے چانڈو پیا گیا ہو اور چھ ٹنٹ کیٹ جمی ہو، کوئی نیا گنج آباد کرے تو اس کو لامحالہ یہ نوٹس چھپوانا پڑے۔ ضرورت ہے۔ ایک نئی جوان ساقن کی، نئے گنج میں دکان جمانے کے لیے۔ کیونکہ جب تک دھواں دھار چلمیں نہ اڑیں، چرس کی کو آسمان کی خبر نہ لائے، بگڑے دل دموں کی خیر نہ منائیں، دلسوز، دم پر دم نہ لگائیں، تب تک گنج کی رونق نہیں۔ افیونی اپنے رنگ کے موافق مشتہر کریں کہ ضرورت ہے۔ ایک ایسے شخص کی جو افیون گھولنے میں طاق ہو، دن رات پینک میں رہے، مگر افیون گھولنے کے وقت چشم نیم باز سے چینی کی پیالی پر نظر ڈالے۔ آرام طلب لوگ چھپوائیں کہ۔ ضرورت ہے۔ ایک داستان گو کی، جس کی زبان کترنی کی طرح چلی جائے۔ جس کو امیر حمزہ[1] کی داستان نوک زبان ہو۔ بدر منیر[2] اور گلزار نسیم[3] حفظ ہو۔ بات بات میں قافیے کا قافیہ

---

[1] اردو زبان کی مشہور داستان، جو کئی دفتروں پر مشتمل ہے، اور بعض دفتر کئی، کئی جلدوں میں ہیں کل جلدوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ مشہور داستان طلسم ہوشربا اسی سلسلہ کی ایک مقبول عام کڑی ہے۔

[2] بدر منیر، مصنف میر حسن متوفی ۱۷۸۶ء اردو کی بلند پایہ مثنوی ہے۔

[3] گلزار نسیم مصنف دیا شنکر۔ نسیم لکھنوی شاگرد آتش۔

تنگ کرے۔ ضلع جگت میں برق ہو۔ اور زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ جھوٹ کے چھپّر اڑائے۔ شام سے جو بکنا شروع کرے تو تڑکا کر دے۔ سننے والوں کا بھور ہو جائے۔ مگر یہ عادت نہ ہو کہ سامعین ہوں ہوں کرتے جائیں، تب وہ داستان سنائیں۔ ہم چاہے خراٹے ہی لیتے ہوں، لیکن وہ منھ کھول کر بکتا ہی جائے۔ خوشامد پسند حضرات یہ خواہش ظاہر فرمائیں کہ ضرورت ہے ایک مصاحب کی جو آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ ہاں میں ہاں ملائے اور ہم کو سخاوت میں حاتم، شجاعت میں رُستم، حسن میں یوسف ثانی، حکمت میں ارسطوئے یونانی، شاعری میں لاجواب، نثاری میں انتخاب، بنائے۔ منھ پر خوشامد کہ حضور ایسے، اور حضور کے باپ ایسے، مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دے۔ کہ اس اَن پڑھ ناتجربہ کار کو میں نے خوب ہی تبایا بتایا۔ بے فکرے اعلان کریں کہ ضرورت ہے۔ ایک بیٹر کی، جو بڑھ بڑھ کر لات لگاتا ہو، اور اچھے اچھے بیٹروں کو پالی سے نوک دم بھگاتا ہو۔ ضرورت ہے ایک مرغ کی۔ مگر ڈنڈ پیل ہو۔ تنا ہوا جوڑ اچھاتا، گتھ جائے تو حریف کو پیٹھ نہ دکھائے۔ بلکہ خوں رلائے، اور چھکے چھڑائے، سوایا مارے، ڈیوڑھا مارے۔ ضرورت ہے۔ ایک مینڈھے کی، جو پہاڑ سے ٹکر لڑنے میں بند نہ ہو۔ اور بھڑے تو دس بیس پہلوانوں سے بھی نہ رک سکے۔ ضرورت ہے۔ طبیلے کے لیے ایک جغادری بندر کی" مگر اینٹھا سنگھ ہوں۔ لال چقندر خاصہ مچھندر" حضرت اور تو باتیں ہیں، لیکن ہمیں اس وقت اپنی ضرورت یاد آگئی۔ بھائی از برائے خدا چھپوا نہیں دیتے۔

ضرورت ہے ایک جورو کی: چالاک اور چست، خط و خال، نک سک سے درست شوخ و زبان دراز ہو، جوان ہو، طناز ہو، ہزاروں میں انتخاب، لاکھوں میں لاجواب، اٹھتی جوانی، عنفوانِ شباب ہو، مگر بلا کی چنچل ہو، کبھی ہنسی، ہنسی میں ایں جانب کی چپت گاہ پر دھول جمائے۔ کبھی بصد ناز ٹوپی چھین کر چپتا جڑے، کبھی روٹھ جائے۔ کبھی گدگدائے۔ بخیل ہو، ورنہ ہم سے میزان نہ پٹے گی۔ گاو دیدہ نہ ہو، سن رسیدہ نہ ہو، شنجرنی چہرہ ہو۔ رف کے ایسے ہاتھ پاؤں، ہرن کی ایسی آنکھ، لیکن قد تاڑ کے برابر نہ ہو کہ ہم کو پاڑ باندھنے کے لیے مزدور بلوانے پڑیں۔ بندہ پست قد آدمی ہے۔ اور شرط یہ ہے کہ کھانا پکانے میں ستاد، سینے پرونے گل بوٹے بنانے میں برق ہو، لیکن سوء ہضم کی روز شکایت نہ رہے، اور ضعف معدہ کا عارضہ ضرور ہو۔ ہلکی پھلکی دو چپاتیاں کھائے تو تین دن میں ہضم ہوں،

سادہ مزاج ایسی ہو کہ زیور پہننے پالے سے مطلب ہی نہ رکھے۔ سادگی ہی جوبن دکھائے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ مذہب کے ہاتھ نہ بک گئی ہو، خدا کو واجبی ہی واجبی مانتی ہو۔ مگر برانڈی کی تاک میں ہر دم رہے۔ غٹ غٹ جام شراب پیے۔ اور ہم میلے ٹھیلے بھی نہ جانے دیں گے، اور محلے کی کسی عورت کو بھی نہ آنے دیں گے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ چھریرا بدن ہو۔ نزاکت سے آنچل کا بوجھ نہ اٹھ سکے۔ کمر لچک جائے۔ کروروں بل کھائے۔ ہنس مکھ بھی ہو، روتے کو ہنسائے۔ مگر یہ نہیں کہ چھٹی جوتی کی طرح موقع بے موقع محل بے محل دانت کھول دیے۔ ہاں اور ہلڑی نہ ہو۔ ورنہ اجیرن ہو جائے گی۔ طرار ہو۔ مکار ہو، عیار ہو، ستم گار ہو، طرحدار ہو، باغ و بہار ہو، وہ ترچھی چتون، وہ بانکی ادا، کہ بے ساختہ زبان سے نکل جایا کرے (تیری بانکی ادا نے مجھے مارا) گانے بجانے کو عیب نہ سمجھتی ہو، بلکہ وقت بے وقت تھرکنے میں عار نہ ہو،۔لیکن چال بھونڈی نہ ہو۔ بھدے پاؤں نہ پڑیں۔ جب چلے اٹھلا اٹھلا کر، درخواستیں کھٹا کھٹ، بندۂ درگاہ کے پاس آئیں۔ مگر ٹکٹ چسپاں نہ ہوں گے تو بیرنگ واپس۔ مگر یہ کہ بی صاحب کے رخ انور پر ریش مبارک نہ ہو۔

آزاد: اور تو خیر۔ مگر یہ ڈاڑھی کی بڑی کڑی شرط ہے۔ بھلا کیوں صاحب عورتیں بھی ریشائیل، یا مچھاکڑا بیگ، ہوا کرتی ہیں۔ یہ انوکھی بات بتائی، اچھی قید لگائی۔

بہار: واہ معقول۔ آپ کیا جائیں۔ اجی قبلہ یہ نکاح کی شرطیں ہیں۔ احتیاط شرط ہے۔ جب شرطیں ہی کرنے پر آئے تو کوئی بات اٹھا کیوں رکھیں۔ کہ پیچھے ہماری موچھ ان کے ہاتھ، اور ان کی داڑھی ہمارے ہاتھ میں ہو۔

آزاد: اجی بندہ نواز! عورت کی ڈاڑھی چہ معنی دارد؟

بہار: معنی سے کیا مطلب۔ یہاں تو صورت کا ذکر ہے۔ بھئی چاہے جو ہو، یہ قید ہم ضرور لگائیں گے، کہ بی صاحب زن بروتی نہ ہوں۔ احتیاط شرط ہے۔ ع۔ مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست۔

انور: قبلہ سنیے! جورو کی تو پیچھے فکر کیجیے گا، پہلے دماغ کی فکر کیجیے۔ سڑی سودائی کو شادی سے کیا کام۔

بہار: جی! تو دماغ کی آپ جیسے زہّادِ خشک فکر کریں، بندے کا دماغ خوب چاق ہے۔ دیکھیے آج کے آٹھویں ہی دن کسی شوخ و شنگ سے بیاہ نہ رچے تو سہی، مگر یار شرطیں بڑی

کڑی ہیں۔

آزاد : اور خصوصاً یہ داڑھی والی۔

ضلع جگت

ایک اٹھوارے میں انور عربی پروفیسر ہو گئے۔ سمجھے تھے کہ ٹکا سا جواب آئے گا۔ مگر کھٹ سے درخواست منظور۔ اور نادری حکم کہ بقچہ سنبھال کر تڑسے دھر دھمکو۔ ذری دیر ہوئی اور عہدہ غت ربود۔ انور تو نوکری پر ادھار کھائے بیٹھے ہی تھے۔ پچھلے پہر کمر کس، لیس ہو، بوریا بدھنا اٹھا، روٹیاں اور گوشت دستر خوان میں باندھ، لڑکے کو چوم بیوی سے رل چلے ڈاکخانے۔ میاں آزاد جب شکرم پر سوار ہوئے تو آزاد نے کہا:

تو عزم سفر کردی در فتی ز برِ من   بستی کمرِ خویش وشکستی کمرِ من

انور نے کہا بھائی! گھر میں برسوں بیٹھے بیٹھے پھپھوندی لگ گئی۔ زبان حال وقال سے یہی شعر وردِ زباں تھا:

سفر چگونہ گزینم ز آستانۂ خویش   کہ ہمچو مردمِ چشم چراغِ خانۂ خویش

آزاد : خیرالمکتوب نصف الملاقات۔ یار زندہ وصحبت باقی۔

دونوں نے مصافحہ کیا، بغلگیر ہوئے۔ شکرم گھڑ گھڑ کرتی ہوئی چلی۔ انور نے کہا: الوداع۔ آزاد بولے فی امان اللہ۔ جب تک شکرم نظر آئی، حیرت کے ساتھ میاں آزاد دیکھا کیے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئی تو یہ بھی کھسکے۔ چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اثنائے راہ میں پانچ چھ نوجوان، سفید پوش، شریف ونجیب، سڑک پر جا رہے ہیں۔ مگر سب خوش رو، خوش خو، میاں آزاد نے پوچھا یا حضرت! کہاں کی تیاریاں ہیں؟ کہیں مشاعرہ ہے؟ یا ناچ رنگ کا جلسہ، جی نہیں جلسہ نہ مشاعرہ مگر جہاں چار آدمی بیٹھ گئے وہیں جلسہ ہے۔ اس وقت چاندنی خوب نکھری ہے، جی چاہتا ہے۔ لپک کر چاند کا مکھڑا چوم لوں۔ ہم یارانِ بذلہ سنج، مرنجان مرنج، نے ٹھان لی کہ گل گشت چمن اور تماشائے نسرین ونسترن کریں۔ نوعروسانِ چمن کا جوبن لوٹیں، نرگس شہلا سے آنکھیں لڑائیں، شادیانے بجائیں، دھماچوکڑی مچائیں، خوب مزے اوڑائیں، شب ماہ کے لطف اٹھائیں۔ آئیے! آپ بھی تشریف لائیے! باغ میں قدم رنجہ فرمائیے، عزت بخشیے، [illegible] میاں آزاد تو ایک ہی [illegible] کے کوچہ گرد، جھٹ سے

راضی ہو گئے۔ چلیے بسم اللہ، الامر فوق الادب۔ باغ میں پہنچے تو ایک روش میں چبوترے پر جا ڈٹے۔ پہلے کچھ عرصے تک شعر خوانی رہی، پھر بعد ازاں ضلع جگت کی ٹھہری۔ جو ہے ضلع میں طاق، جگت بازی میں مشاق، پہلے حقے کا ضلع شروع ہوا۔ میاں تم کندن کیے دیتے ہو۔ ایک قش ہم بھی تو لیں۔ اے صل و جل۔ قش کے کیا معنی حضرت؟ جی یہ قشیدن سے ہے۔ بس بہت دم نہ دیجیے۔ واللہ کیا گرما گرم آدمی ہو۔ بندے کا مکان مہنال دروازے میں ہے۔ اور ہمارا مسکن تو چرخ چنبر میں ہے۔ یہ آدمی ہے یا الٹا توا۔ تمباکو کا پنڈا۔ یہ حقہ بازی ہم خوب سمجھتے ہیں۔ اجی ایسے مدار لیے ہم نے بہت چنگے کیے۔ اس کو کوئی نے کر کرے کیا۔ لے بہت چنچنیے نہ۔ آپ تو میری باتوں سے سوختت ہوئے جاتے ہیں۔ بندہ تازہ دم ہے۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ واللہ آپ کا سر تو چھلا یا ناریل ہے۔ یار تو تو پریت کی طرح چمٹا۔ تمھارا ضامن کون ہے۔ میاں کل تک تو کوڑی گٹا بیچتے پھرتے تھے آج باتیں بناتے ہو۔ لے اب برف کی قفلی کھائیے۔ یہ آپ کا سر ہے یا مٹھو کا سرپوش۔ بہت ٹرائیے نہ ورنہ نیچے لم لگائیں گے۔ بھئی کیا بے تکی اڑائی۔ واہ چلم کا تلازمہ تو رہا ہی جاتا تھا۔ اب اس کو چھوڑ لیے اب بے تکی ہونے لگی۔ چل شک۔ آئیے پان کا تلازمہ ہو۔ بھئی واللہ کیا خوب بنگلہ ہے۔ دساور سے مال آیا ہے۔ میرے جوتے کا پان خوب چمکتا ہے۔ بہت چبا چبا کر باتیں نہ کیجیے۔ آج تو میں سرخرو رہا۔ آپ سبز بخت ہیں۔ ذری کپوری سنگھ کو تو بلانا، "برگ سبز ست تحفۂ درویش"، آپ کے پاؤں کا نیاں کیا ہے۔ کیا چکنی چپڑی باتیں ہیں۔ میں تیرا یار کتھا۔ ایں! یہ کیا حضرت یہ کتھے کا تلازمہ ہے۔ لاحول ولا۔ بس لگے بے تکی اڑاتے آئیے گانے بجانے کا تلازمہ ہو۔ واہ بندہ نواز، کہیے آج تار برقی کیا ہے۔ طبیعت ناساز ہے۔ آپ مستان شاہ ہیں۔ دنیا کے پردے پر ایسا گھستی نہ ہوگا۔ کیا بے وقت کی شہنائی بجائی ہے۔ بتیال پچیسی پڑھیے۔ بھئی تمھیں قسم ہے آپ کے گلے میں توڑا ڈال دو۔ دیکھیے دہل نہ جائیے گا۔ اب لایا تب لایا۔ ہم اپنا دیس بھول گئے۔ جنگل کی دھن ہے۔ یہ سر ہے، یا تو بنی۔ اب میں کہیں کان نہ اینٹھوں۔ اچھا راگ لائے۔ بھئی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ بس بس، تانت باجی، اور راگ بوجھا۔ بے وقت کی شہنائی ہے۔ واہ یہ ہو چکی ہے۔ چلو خوشی کے شادیانے بجاؤ۔ کہیں لونڈے تالیاں نہ بجائیں۔ وہ ناچ نچاؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ بے بھاؤ کی پڑنے لگیں گی۔ آدمی ہے یا گھن چکر۔ اپنا تو کلیان ہو گیا۔ آئیے اب کھانے کا ضلع ہو۔ بھئی نوجوانان ے آشام سے خدا بچائے۔

آپ کی دال نہ گلنے کی۔ جی چپڑی اور دو، دو۔ ظرافت تو آپ کے خمیر میں ہے۔ تم تو ماش کا آٹا ہوئے جاتے ہو۔ یہ ناحق اپنے ڈھائی چانول گلاتے ہیں۔ آپ کے منھ میں گھی شکر۔ اچھی کھچڑی پک رہی ہے۔ کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ جاؤ ہنڈیا چڑھاؤ۔ آج تو پانچوں گھی میں ہیں اور سر کرھائی میں۔ اس میں پوری نہ پڑے گی۔ اب مٹر گشتی کیجیے۔ اب کی ہولی میں شیر مالیں کھائی تھیں۔ پاؤں تو تمھاری بوٹیاں ہی چبا جاؤں۔

میاں آزاد نے جو دیکھا کہ اب یہ سب کے سب جھک مارنے لگے، تو وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ اجی حضرت! اجی حضرت! ذرا سنیے تو سہی۔ بس اگر ہوس ست ہمیں قدر بس ست۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس تضیع اوقات سے فائدہ۔ ایک کہتا ہے چل سٹک۔ دوسرا کہتا ہے تیرا سر کڑھائی میں۔ مفت میں بے ہودہ بکنے سے فائدہ۔ قبلہ یہ تو دل لگی کا وقت ہی ہے۔ علما فضلا، شعرا کملا کے سامنے تھوڑے ہی یہ باتیں ہوں گی۔ ہو نھ ہم کو کوئی گھس کھدا سمجھے ہیں۔ بس رخصت۔

میاں آزاد ایک روز مٹر گشت کرتے ہوئے ایک محلے میں جا نکلے، تو سنتے کیا ہیں، کہ ایک شخص کراہتا، اور غل مچا مچا کر چلاتا ہے۔ ہائے مرا ارے مرا! ہائے جان گئی! باپ رے باپ، یا خدا بچائیو، اُف اُف! ہائے ہائے! ارے کوئی دوڑو، خداوندا موت دے۔ یا الٰہی میری سن لے! اُف اُف! ادھر ان کے کان میں جو بھنک پڑی تو آواز کی سیدھ پر چل ہی تو کھڑے ہوئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک ضعیف آدمی دقیانوس کا ہم عصر، چھپر کھٹ پر لیٹا ہوا سسک رہا ہے۔ مگر چہرے سے موت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہے۔ انھوں نے نبض پر ہاتھ ڈالا تو پتا ہی نہیں۔ سینے پر ہاتھ لے گئے تو کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ پوچھا مزاج کیسا ہے؟ صدائے برنخاست۔ اشارے سے دریافت کیا کہ کیسے ہو۔ آنکھ بند کر لی دو گھنٹے تک سسکتا رہا۔ بعد ازاں گھر" لگا اور اوپر کی سانس بھرنے لگے۔ اور آناً فاناً میں مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میاں آزاد کا دل بھر آیا۔ رقیق القلب تو تھے ہی آٹھ آٹھ آنسو رو دئے۔ ایک مرد آدمی سے جو قریب بیٹھے تھے، پوچھا: کہ یا حضرت، بھلا یہ پیر مرد کس عارضے میں مبتلا تھے۔ اس نے آہ سرد کھینچ کر کہا کہ یہ نہ پوچھیے حمق کا عارضہ تھا۔ کیا حمق یہ کون عارضہ ہے؟ صاحب قانونچے میں اس کا کہیں پتا نہیں۔ طب اکبر میں اس کا ذکر بھی نہیں۔ یہ نیا عارضہ ہے۔ جی ام العوارض ہے۔

ذرا اس کے علامات تو بتائیے ؟ اجی حضرت کیا بتاؤں عقل کی مار، اس کا خاص باعث ہے۔ عرض کروں کہ یہ پیر مرد اسّی برس کے تھے۔ مگر عقل کے پورے، تمیز چھو نہیں گئی، خدا جانے دھوپ میں بال سفید کیے تھے یا نزلہ سے یہ عارضہ ہو گیا تھا۔

اب سنیے کہ شامتِ اعمال سے حضرت کی پیٹھ پر ایک پھوڑ نکلا۔ دس دن تک علاج ندارد۔ دسویں دن کسی گنوار نے کہہ دیا کہ گلِ عباس کے پتے، اور سرکہ باندھو جھپ راضی ہو گئے۔ سرکہ بازار سے خریدا۔ گلِ عباس کے پتے باغ سے توڑ لائے، اور سرکے میں پتوں کو خوب تر کر کے پیٹھ پر باندھا۔ دوسرے روز پھوڑا آدھا انگل بڑھ گیا۔ کسی اور گوکھے نے کہہ دیا کہ بھٹکٹیا، اور نمک باندھو، بسم اللہ کر کے آپ نے وہ بھی کیا۔ لوگوں نے سمجھایا بڈھے کچھ گھانس تو نہیں کھا گیا ہے۔ ارے پھوڑے کو بھٹکٹیا سے کیا واسطہ۔ فرمایا: کہ واہ آپ کیا جائیں یہ کچھ علاج تھوڑا ہی ہے یہ تو ٹوٹکا ہے۔ خیر صاحب ٹوٹکا سہی۔ خدا کرے، اس چھومنتر کی کالی بوٹی سے آپ چنگے ہو جائیں مگر یہ بخیر۔ درد اور زیادہ شروع ہو گیا۔ کسی نے بتایا املی کی پتی، اور دھتورا اور گوبر باندھو۔ وہاں کیا تھا فوراً منظور۔ اب تڑپنے لگے اف اف، اف اُف، لگے تلملانے، اب ہوش و حواس باختہ۔ آگ لگ گئی۔ محلے کی ایک عورت نے کہا میں بتاؤں مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ سہل ترکیب ہے۔ مولی کا اچار دفنا دو، مگر تین قتلے ہوں۔ اور دفنا کر نکال لو، اور نکال کر کنویں میں ڈال دو اور اپنے ہاتھ سے پانی بھرو۔ اسی دم چنگے نہ ہو جاؤ تو ناک کٹا ڈالوں۔ سوچے کہ بھئی شرط اس نے بڑی کڑی کی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ناک بدلی جھپ مولی کے قتلے لے دفن کیے۔ اور پھر نکالے کنویں میں تینوں قتلے غڑاپ داخل لگے پانی بھرنے۔ ڈول تھا وزنی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ رسی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور حضرت دھم سے گرے، پھوڑا تو آپ جانیئے شیشے کی مثال، ٹھیس لگی، اور بھی درد بڑھا لگے تلملانے، آخر کار دم توڑا۔

افسوس صد افسوس ان مدعیانِ عقل سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ ہر کس و ناکس کی رائے پر علاج کیوں کر بیٹھتے ہو۔ جس نے جو بتایا، آمنّا و صدّقنا منظور۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو عارضہ بڑھ جاتا ہے۔ یا جان تن سے نکل جاتی ہے۔

وحشی مگر خدا ترس ریشائیل

میاں آزاد ایک دن چلے جاتے تھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ کسی پرانی ڈھرانی، گڑھیا کے کنارے، ایک ریشائیل بیٹھے کائی کی کیفیت دیکھ رہے تھے۔ کبھی ڈھیلا اُٹھا کر پھینکا۔ جھپ۔ ماشاءاللہ سنِ شریف چہل و شش، ناز م باین ریش و فش، میسن آدمی اور لونڈے کہے۔ جاتے ہیں۔ اس داڑھی کا بھی خیال نہیں، اور لطف یہ کہ محلے بھر کے لونڈے لاڑ لیے، ارد گرد، جمع، تالیاں بجا رہے ہیں۔ اور الّو بنا رہے ہیں۔ لیکن آپ گڑھیا کی لہروں ہی پر لٹو ہیں۔ کمر جھکائے ہوئے، چوطرفہ ڈھیلے اور ٹھیکرے، ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ ہی کئی، ڈھیلے اٹھا کر، حضرت نے گڑھیا میں پھینکے۔ چھپ چھپ، چھپ چھپ، اُدھر سے ایک مرد آدمی بھی چلے آتے تھے۔ آپ کو دیکھا تو نظر سے اوجھل، ذرا ٹھٹک کر لگے سیر دیکھنے، دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ ماشاءاللہ! گوسالۂ ما پیر شد، دگا د نہ شد۔ یہ سن و سال اور یہ حال:

چہل سالِ عمر عزیزت گذشت　　　مزاج تو از حال طفلی نہ گشت۔ سعدی

مشیّن بدن، لباسِ فاخرہ زیبِ تن، یہ قطع۔ یہ وضع، اور چشمِ بد دور، کس مزے سے گڑھیا پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور یہ خبر ہی نہیں کہ گاؤں بھر کے لونڈے تالیاں بجا رہے ہیں۔ وہ ایک لونڈے نے چپت لگانے کا قصد کیا، مگر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسرے نے پیڑ کے آڑ سے وہ کنکری لگائی۔ تیسرے نے ریش مبارک پر گھانس پھینکی۔ چوتھے نے کہا میاں تمھاری داڑھی میں تنکا۔ مگر میرا شیر ذرا نہ منکا۔ اب سنیے! کہ گڑھیا سے اٹھے تو دور کی سوجھی۔ جھپ سے ایک پیڑ پر چڑھ گئے۔ اور پھنگی پر جا بیٹھے، اور بندر کی طرح لگے اُچکنے۔ اس ٹہنی پر سے اچکے تو دوسری شاخ پر پھدک رہے۔ اور ایسا ہلایا کہ درخت پر بید مجنوں کا دھوکا ہونے لگا۔ طرہ یہ کہ لڑکوں کو بھی ہدایت کرتے جاتے ہیں۔ کہ آؤ درخت پر آؤ! املی کا درخت:

شاخش کہ بسدرہ سرکشیدہ　　　سیلی برخ قمر کشیدہ

بلند ایسا کہ گویا آسماں سے باتیں کرتا تھا۔ حضرت مزے سے بے تکلف بیٹھے ہوئے املی کھاتے ہیں اور حسین لونڈوں پر تاک تاک کر پھینکتے جاتے ہیں۔ اور وہ غل مچاتے ہیں کہ ایک چیاں ہم کو اِدھر اُدھر ہاتھ ہی لوٹیں جو اُدھر پھینکے۔ خدا سمجھے کیا مزے سے غپڑ غپڑ کرتے

کھاتے جاتے ہیں۔ ادھر ایک چیان بھی نہیں پھینکتے۔ او بخیل! او کنجوس! او ممسک! او بندر! او چھندر! ایک اِدھر ایک اُدھر، کیا خوب گویا شہد ے کسی رئیس سے مانگ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کھٹ کھٹ کرتے درخت سے اترے۔ اتفاق سے کمسریٹ کے تین چار ہاتھی مستی کے دھت میں جھومتے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر سب چارے اور گنے سے لدے ہوئے۔ آپ نے لونڈوں کو سکھایا کہ ابے غل مچا کر کہو کہ ہاتھی ہاتھی گنا دے۔ لونڈوں نے جو اتنی شہ پائی تو آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ہاتھی ہاتھی گنّا دے! ہاتھی ہاتھی گنّا دے! اتنے میں ایک ریچھ والا نکلا۔ ریشائیل نے جھٹ ریچھ کی گردن دبائی، اور پیٹھ پر ہو رہے۔ تخ تخ تخ تخ۔ معقول! اچھا ٹٹو اہے۔ ریچھ والا چل پوں مچا ہی کیا انھوں نے دو تین لڑکوں کو آگے پیچھے۔ اغل بغل بیٹھا ہی لیا۔ مزے سے اکڑے تنے بیٹھے ہیں۔ گویا اپنے وقت کے فغفور چین ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکوں کو زمین پر پٹکا۔ اور خود بدولت بھی دھم سے کود پڑے۔ گویا اپنے حساب اونٹ پر سے اُترے تھے۔ اور جھٹ لنگوٹ کس، خم ٹھوک، کر ریچھ سے کشتی پر آمادہ ہو گئے۔ تب تو ریچھ والا کفن پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ میاں کیوں جان کے دشمن ہوتے ہو چبا ہی ڈالے گا۔ یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ چپٹ ہی تو گئے، اور ایک آنٹی بتائی تو ریچھ چاروں شانے چت۔ وہ مارا۔ لونڈوں نے وہ غل مچایا کہ ریچھ پورب، اور ریچھ والا پچھم، کی طرف بھاگا۔ محلے بھر میں قہقہہ اڑانے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ایک بھدڑی کی شامت اعمال، اُس کو کشاں کشاں اس طرف لے آئی۔ ساعت بچاریں، شگن بچاریں، دھوتی باندھے پوتھی بغل میں دبائے۔ ادّراج کا مالا پہنے، بآواز بلند ہانک لگاتا جاتا ہے۔ ریشائیل کے قریب آنکلا، تو ان کو شکار ہاتھ آیا۔ بھئی اِدھر آنا اس کی باچھیں کھل گئیں کہ گھرے ہیں۔ پو بارہ ہیں۔ اچھی بوہنی ہوئی۔ ریشائیل نے ہاتھ دکھایا، اور پوچھا کہ ہماری کتنی شادیاں ہوں گی۔ اس نے کنیا۔ برچھک، مکر۔ سنگھ کر کے بہت خوض اور فکر کے بعد کہا: کہ پانچ۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کی پگڑی اچھال دی۔ ع۔ لڑکوں کو شگوفہ ہاتھ آیا، کسی نے سر سہلایا، کسی نے چپتا جمایا۔ واہ اچھی بوہنی ہوئی۔ ریشائیل نے کہا واہ اچھی ساعت بچارتے ہو۔ اپنی ساعت بھی دیکھ لیتے ہو یا اوروں ہی کو راہ بتاتے ہو۔ سچ کہتا آج ساعت دیکھ کر چلے تھے۔ یا یوں ہی میاں، ہم سچ بتائیں کہ ہم کیوں جھلا گئے۔ وجہ یہ کہ ہماری چاہتی بیوی کو تم نے کوسا۔ بس مزاج کا پارہ ایک سو بیس درجے پر پہنچ گیا۔ اچھا خیر بتاؤ ہمارے بہار، لڑکا کب تک ہوگا سو لسو،

آپ کسی اور سے پوچھیے، بھر پایا- اپنا کیا اپنے آگے آیا- یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلنے ہی کو تھا کہ ریشائیل نے لڑکوں کو اشارہ کیا، وہ تو ان کو اپنا پیر دستگیر سمجھتے تھے ہی، اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نے پوتھی لی، دوسرے نے مالا چھپایا، تیسرے نے پگیا ٹہلا دی، دس پانچ چمٹ گئے۔ بیچارے کو بہزار دقت پیچھا چھڑا کر بھاگنا پڑا، اور قسم کھائی کہ اب اس محلے کی طرف رخ کر دوں تو چمار- اتنے میں ایک خوانچے والے نے آواز دی- گلابی ریوڑیاں، کراری کھٹیاں- دال موٹ سلونے، مٹر نکونے- لونڈے اپنے اپنے دل میں خوش ہو گئے کہ ریشائیل کی بدولت خوب مٹھائیاں چکھیں گے- اور خوانچہ لوٹ لیں گے- مگر انھوں نے منع کر دیا- خبردار ہاتھ نہ بڑھانا جب خوانچہ والا پاس آیا تو انھوں نے ٹھہرایا اور کہا سب خوانچے کے کیا دام ہیں؟ اس نے کہا ڈھائی روپیہ، ایں- ڈھائی روپیہ؟ بھئی مول تول نہیں واجبی کہو واجبی- اچھا تو دو روپیہ دیجیے- دو روپیہ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ دھرے، اور لڑکوں کو خوب چھک کر کھلایا- دس منٹ کے بعد آواز آئی کھیرے لو کھیرے- حضرت نے اچک کر ٹوکرا الٹ دیا- کھیرے زمین پر آرہے- جیسے ہی لڑکوں نے چاہا کہ کھیرے بٹوریں، کہ انھوں نے ڈانٹ بتائی- کھیرے والے کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، اور لڑکوں سے کہا کہ کھیرے اٹھا اٹھا کر اسی گڑھیا میں پھینکتے جاؤ ان کے نزدیک یہ بھی ایک دل لگی تھی- کھیرا اُٹھایا اور غڑاپ گڑھیا میں- پچاس ساٹھ کھیرے آناً فاناً گڑھیا میں تھے- جھٹپٹے وقت ایک چڑی مار کپنیا جال لیے ہوئے آنکلا- ہاتھ میں تین چار جانور، کچھ جھولے کے اندر سب پھڑ پھڑا رہے ہیں- کالا بھجنگا، منگل کا روز، ریشائیل نے پکارا- آؤ آؤ میاں ادھر آؤ! ایک بھجنگا لے کر اپنے اوپر سے صدقے کر کے چھوڑ دیا- چڑی مار نے کہا کیا ہوا- دوسرا جانور دو ایک لڑکوں پر سے صدقے کر کے چھوڑ دیا- تیسرا جانور ایک سینکی والی پر سے صدقہ کیا- اسی طرح دس پندرہ جانور صدقہ کر کے خاموش کھڑے ہوئے- گویا کچھ مطلب ہی نہ تھا- چڑی مار نے کہا- ہجور دام- آپ نے فرمایا تمھارا نام؟ تب تو وہ چکرایا کہ اچھے ملے- خوب جھانسا دیا- ہجور دھیلی کے جنور تھے- ایں! دھیلی! کچھ گھانس تو نہیں کھا گیا- کیسی دھیلی؟ کہتا کس سے ہے، ہوش کی دوا کر ہوش کی- بھنگ پی گیا ہے، یا شراب کا نشہ ہے- یا بیدھا ہے- اور سنیے! ارے کھداوند- جنور سب سد کے کر دیے اب آنکھیں نکالت ہو- لڑکوں نے جال کپا سب ٹہلا دیا- تھوڑی دیر رو یا پیٹا- آخر کار صبر کر کے چل دیا-

اس کارروائی کے بعد ریشائیل نے لڑکوں کو چھوڑا، اور اس محلے سے منھ موڑ کر،

بسے ہوتے ہی کوٹھے، کہ میاں آزاد ان کے قریب آئے۔ یا حضرت آپ آدمی کیا معجون وحشت ہیں۔ میں عرصۂ دراز سے آپ کی انوکھی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ کبھی کھیرے گڑھیا میں پھینکے۔ کبھی املی پر اچک رہے۔ کبھی چڑیمار جنگ کا قافیہ تنگ کیا۔ کبھی بھڈری کو آڑے ہاتھوں لیا۔ حضرت واسطے خدا کے فصد کھلوائیے چندیا کے بال پر قینچ کروائیے ورنہ آپ بہت جلد پاگل ہو جائیں گے۔

ریشائیل : اس طرز بانی اور خوش بیانی کے قربان، بندہ سڑی، سودائی، خبطی، مستان، آئے دہاں سے بڑے وہ بن کے سینئے قبلہ! ع۔ نکتہ ہاہست بسے محرم اسرار کجا: سمجھنے کے لیے بڑی عقل چاہیے۔ گڑھیا پر بستر جما کے ڈھیلے پھینکنے اور پیڑ پر اچک کر املی کھانے اور ہاتھی سے گنّے مانگنے کا سبب یہ کہ لڑکے بھی ہماری دیکھا دیکھی اچک پھاند دوڑ دھوپ میں مشاق ہو جائیں یہ نہیں کہ مریل ٹٹو یا گاو بیل کی طرح جہاں بیٹھے وہیں جم گئے لڑکوں کو کم سے کم دو گھنٹے روز دوڑ دھوپ کی مشق کرنی چاہیے ورنہ آئے دن بیماری ستائے گی۔ اور صحت و تندرستی گھٹتی جائے گی۔ ریچھ والے کے ریچھ پر اچک بیٹھنے اور ریچھ کے بھگا دینے اور چڑی مار کے جانوروں کو مفت، بے کوڑی، بے دام، صدقہ کر دینے کا سبب خاص یہ ہے کہ جب ہم جانوروں کو ایذا یا تکلیف کی حالت میں دیکھتے ہیں تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ اور ان چڑی ماروں کا تو بندہ جانی دشمن ہے۔ واللہ پاؤں تو کالے پانی بھجواؤں جہاں دیکھا کہ دو چار سفید پوش کھڑے ہیں۔ لگے جانوروں کو زور سے دبانے تاکہ وہ بے زبان ایذا کے سبب سے محشر بپا کریں۔ اور لوگ ان کی حالت دیکھ کر کچھ دے نکلیں۔ ان کی ہنڈیا چڑھ جائے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ ے

تو اے کبوترِ بام حرم چہ می دانی　　　طپیدن دلِ مرغانِ رشتہ بر پارا

ان کے درد دل کا حال کوئی کیا جانے۔ کھیرے اس لیے گڑھیا میں پھنکوا دیے کہ آج کل ہوا خراب ہے۔ کھیرے کھانے سے مرتا نہ ہو تو انسان مرجائے۔ مگر ان کنجڑوں کبڑیوں کو ان امور سے کیا واسطہ۔ ان کو اپنی بکری سے مطلب۔ ہم تو بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں۔ ایک کبڑیے کا نقصان ہو ہزار سے، پچاسوں بندگانِ خدا کی تو جان بچے گی۔ دیکھ لو خوانچے والے کو ہم نے اپنے پاس سے دو روپیہ کھتا کھن گن دیے۔ میاں ہم خدا ترس ہیں۔ مردم آزار نہیں۔

نشہ بُری چیز ہے

ایک دن میاں آزاد حسبِ معمول کوٹ پتلون پہنے، ترکی ٹوپی زیب سر کیے، پھرتی کے ساتھ کسی طرف جاتے تھے، اور سامنے سے ایک صاحب آتے تھے۔ جب دونوں قریب پہنچے تو اس نے پوچھا: حضرت افیون تو نہیں کھاتے؟ خدا کی مار افیون پر، شیطان کی پھٹکار کسی ملعون نے آج تک ہاتھ سے بھی چھوئی ہو۔ اس سیاہ کاری سے بندہ اب تک تو بچا رہا آئندہ خدا مالک ہے۔ واللہ افیون کے تو نام سے نفرت ہے ایں جانب کو۔ افیونی کی صورت دیکھوں تو لاحول پڑھوں اور جو کہیں افیون پر ہاتھ پڑ جائے تو آبِ گوہر سے ہاتھ دھوؤں۔ اس وقت اس کالی بلا کا نام زبان پر آیا بس جی چاہتا ہے کہ پونے دو سو گھڑوں سے زبان پاک کروں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد ندی کے کنارے جا بیٹھے۔ وہاں سے پلٹ کر جو آئے ہیں، تو کچھ اور ہی گل کھلا ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہ ذات شریف، پڑے آنکھیں مانگ رہے ہیں، اور کراہتے ہیں۔ صورت پر مردنی چھائی ہے۔ لب خشک، چشم تر، سر کی فکر نہ پاؤں کی خبر۔ تب تو میاں آزاد چکرائے کہ یا الٰہی کیا اسرار ہے۔ پوچھا کیوں بھائی خیر تو ہے؟ ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ یہ اتنی جلد کایا پلٹ کیسی ہو گئی۔ کچھ منھ سے بولو، سر سے کھیلو۔ ع۔ درما ہے کہ درد لا دوا ہے۔ اس نے کانکھ کانکھ کر آہستہ سے کہا کہ یار دیں تو مر مٹا، بھائی کہیں سے پانچ چھٹکے کی افیون لے آؤ۔ پیوں تو آنکھیں کھل جائیں۔ جان میں جان آئے۔ بندہ چھٹپنے سے افیون کا عادی ہے۔ وقت پر نہ ملے تو نزع کی حالت پہنچے۔ ایں! یہ کیفیت ہے۔ حضرت آپ کا کہیں ٹھکانا ہی نہیں، کچھ انتہا بھی ہے۔ چھٹکے کی افیون ایک دفعہ ہی نوش جان۔ آدمی ہے یا بلا نوش۔ بچہ ایک دن ٹیں سے مر جاؤ گے۔ جی بجا ہے اور آپ تو شاید آبِ حیات پی کر آئے ہیں۔ عاقبت کے بورئیے آپ ہی بٹور لیے گا۔ واہ میاں واہ! ہو تیکھے آدمی۔ چتون کہے دیتی ہے کہ بڑے خم ودم کے آدمی ہو۔ رسی جلی مگر رسی کا بل نہ گیا۔ واہ آکا کیوں نہ ہو، سسک رہے ہو، مگر جواب ترکی بترکی نہ دو تو دوزخ ہی نصیب ہو۔ حضرت افیون لانی ہو لائیے، ورنہ یہاں بک بک کا دماغ نہیں:

دوزخ قبول ہے یا منکر و نکیر لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

جی تو اس بھر دسے بھی نہ رہیے گا، کہ ہم اور افیون لائیں۔ ہم تو اس فکر میں بیٹھے

ہیں کہ آپ مریں تو نوحہ موزوں کریں۔ ع مر گیا کشتۂ تیغِ افیوں" یہ پہلا مصرع ہو گا۔ ایک بات مانو تو ابھی لپک جاؤں، اور افیم لاؤں۔ ذرا لکڑی کے سہارے سے اس ہرے بھرے پیڑ کے تلے چلو، وہاں ہری ہری گھانس پر لوٹ مارو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ واہ اچھی صلاح اے میاں یہاں جان دوبھر ہے، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا کیسا۔ بھائی کہا مانو میرے سہارے سے چلو۔ الغرض میاں آزاد نے اس افیونی کو پیٹھ پر لادا اور لے چلے۔ ان کی یہ قطع کہ آنکھیں بند، منھ کھلا ہوا، معلوم ہی نہیں کہ جاتے کہاں ہیں۔ ایک دفعہ میاں آزاد نے ان کو ندی میں لے جا کر غوطہ دیا۔ بس قیامت بپا ہو گئی۔ ستم ڈھایا، آفت کا سامنا، بلا کا سامنا، مصیبت کا سامنا تھا۔ افیونی آدمی پانی کی صورت سے نفرت، لگے چلّانے۔ بڑا غچّا دے گیا۔ مار اپڑا کر دیا۔ عمر بھر میں آج ہی ندی میں قدم رکھّا۔ خدا سمجھے تجھ سے۔ سن سے جان نکل گئی ہو ہو ہو ہو! ٹھٹھر گیا۔ او خدا ناترس، اب تو رحم کر۔ اتنے میں میاں آزاد نے ایک اور غوطہ دیا، تیسرا غوطہ دیا، چوتھا غوطہ دیا، تابڑ توڑ کئی غوطے دیئے اب، ان کی کیفیت نہ پوچھیے۔ بس ناگفتہ بہ، کروروں گالیاں دیں۔ لاکھوں صلواتیں سنائیں۔ میاں آزاد نے ان کو ریتی میں چھوڑ دیا اور چلتے ہوتے۔ اور پیو افیون۔ سنیئے صاحب! ہم نے جو ایک دوستانہ صلاح دی تو کہنے لگے تم عاقبت کے بوریے بٹور وگے۔ لو چنڈو گل خیرو اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ۔ ہات تیرے کی۔ میاں آزاد وہاں سے چلے تو راہ میں ایک اور حضرت ملے۔ آداب عرض ہے تسلیم۔ آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمائیے! بندہ چانڈو باز ہے۔ اس وقت شہر بھر میں۔ چانڈو کی دوکان ہی نہیں۔ سب چانڈو والے میلے گئے ہیں۔ وہاں جائیں تو شام ہو جائے اُدھر پھر جایا کس سے جائے گا۔ ہم تو نیم جاں ہیں۔ آپ کچھ سبیل کر دیں تو بڑا ہی احسان ہو۔ میاں آزاد نے کہا میں بتاؤں؟ سامنے ناک کی سیدھ پر چلے جائیے، وہ ہرا بھرا پیڑ نظر آتا ہے، ندی کے کنارے۔ وہاں ایک صاحب لیٹے ہوئے چانڈو اڑا رہے ہیں۔ آپ بھی شریک ہو جائیں۔ اہاہا! ہو ہو ہو کہہ کر اچکتے ہوئے چلے کہ بھئی دو چار چھینٹے تو اُڑائیں، اور ذرا گرمائیں۔ میاں آزاد ایک پچاس قدم گئے ہوں گے کہ ایک اور ذات شریف سے دو چار ہوئے۔ کیوں بھئی گھبرد کبھی جام بھی دیکھا ہے۔ کیا! جام، کیسا جام؟ جامِ جہاں نما کا نوں سنا ہے دیکھا نہیں۔ ارے میاں ہم اس جام کو پوچھتے ہیں جو کونین نما ہے۔ کونین! کیا بخار کا عارضہ ہے، واہ بھئی الٹے کے سمجھنے والے۔ کونین دو

انھیں۔ کون کی جمع۔ نہ صاحب ہم نے ایسا جام دیکھا نہ سُنا۔ میاں اب صاف صاف کہہ دیں کبھی شراب بھی پی ہے۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ۔

کیا ذکر شراب یار توبہ خاور — ہو ایسا نہ شرمسار توبہ خاور
دوزخ میں جلیں گے مے کے پینے والے — توبہ خاور ہزار توبہ خاور

اجی تم تو گھامڑ ہی نکلے۔ میاں۔ ع۔ نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے۔ کیا کہیں بوتل میں اس وقت ایک بوند تک نہیں، ورنہ آپ کو ضرور مزہ چکھاتے۔ اس وقت طبیعت بے لطف ہے۔ بندہ ہر روز دو وقتہ شراب پینے کا عادی ہے۔ آج جان عذاب میں ہے۔

میاں آزاد نے کہا ہم بتائیں، وہ دیکھو سامنے املی کا پیڑ ہے۔ چلے جاؤ وہاں دو چار آدمی بیٹھے راسی اڑاتے، اور چُسکی لگاتے ہیں۔ جاؤ غٹا غٹ شراب اڑاؤ۔ میاں شرابی تو کھِل گئے۔ اے خانہ احسان آیا، واہ استاد۔ کیا بات بتائی۔ اس وقت جان بچائی۔ چلو تم بھی ایک چلو میں الو ہو۔ میاں آزاد نے کہا، معاذاللہ میں اور شراب۔ آج تک کبھی پی نہ پیوں گا۔ یہ کہتے ہی تھے کہ ہنسیا کلوارن اودی اودی پھریا پھڑکائے ادھر سے گزری۔ صورت دیکھتے ہی میاں آزاد سیدھے نو کدم بھاگے۔ پیچھے پھر کے دیکھنا قسم تھا۔ مگر دل ہی دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ نشہ بھی کیا بُری چیز ہے۔ کہ ذرا وقت پر نہ ملا اور دم ٹوٹنے لگا۔

میاں مسافر۔ میاں مسافر۔ سچ کہنا
میں نشہ میں تو نہیں ہوں

اب تک تو میاں آزاد دن بھر چکر لگا کر رات کو دبک رہتے تھے۔ اب گرمی کی فصل جو آئی، تو رات کو بھی لگیں چک پھیریاں ہونے۔ ایک نشد دو شد۔ ایک شب کو ایک پُرانے دُھرانے برگد کے پیڑ کے تلے، جس کی ٹہنیاں آسمان پر تھگلی لگاتی تھیں، اور جس کی زمین دوز جٹائیں پاتال کی خبر لاتی تھیں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ذات شریف نشے میں چور، سیہ مست و مخمور، ایک ذرا سی دبلی پتلی ٹٹوی پر سوار رُخ رُخ کرتے جا رہے ہیں۔
میاں آزاد نے پوچھا اس ٹٹو پر کون لدا ہے؟ ادھا جی کون لدا ہے۔ اچھا لدا ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں میں اُتر کر انجر پنجر ڈھیلے کر دوں۔ یوں نہیں پوچھتا کہ اس راہوارِ صبا

رفتار پر آسن جمائیے، باگ اٹھائیے، کون شہسوار جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔ ٹٹو ایسے ہی ہوا کرتے ہیں بولو؟ میاں آزاد نے کہا حضرت قصور ہوا معاف فرمایئے۔ واقع میں یہ تو دور کا بے پور گھوڑا دیلا کی نسل سے ہے خدا جھوٹ نہ بلائے۔ جمنا پار کی بکری اس سے ذرا یوں ہی سی نکلتی ہوگی، مگر مرغ ٹینی سے کہیں بڑا ہے۔ ہاں اب راہ راست پر آئیے اور میاں اب تو:

اسپِ تازی شدہ مجروحِ بر زیر پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردن خرمی بنیم

اب عربی ترکی کاٹھیاوار دیکھنے ہی میں نہیں آتے۔ اور قبلہ اس گھوڑے کی کچھ نہ پوچھیے۔ دوبا گئے ہیں، تبا گئے ہیں، واللہ یہ بچھڑا تو ماں کے پیٹ سے پھدکتا اچکتا نکلا تھا بجا ہے وہ تو اس کی آنکھیں ہی کہے دیتی ہیں۔ آپ کیوں تعریف کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ واللہ گھوڑا کیا اڑن کھٹولا ہے الوپ انجن ہے کہ دیکھا اور نظر سے غائب۔ اس کی قیمت بھی آپ کو معلوم ہے؟ ناصاحب بھلا میں کیا جانوں۔ آپ تو خیر گدھے پر سوار بھی ہیں۔ یہاں ٹانگوں کی سواری روزِ ازل سے ہمارے نامۂ اعمال میں لکھی ہے۔ مگر آپ کے گھوڑے کو رقعاتِ عالمگیر بھی از بر ہے۔ اس کے کیا معنی؟ جی کچھ نہیں ایک شعر مجھے اس کے حسب حال یاد آیا:

آہستہ خرام بلکہ اخرام   زیرِ قدمت ہزار جاں است

ہاں اسی بات پر کڑکڑا دوں۔ یہ کہہ کر ایڑ لگائی مگر ٹٹو نے جنبش تک نہ کی۔ اب ایڑ پر ایڑ لگاتے ہیں، مگر وہ نقش قدم کی طرح جم گیا۔ اب تو خدا ہی ہٹائے تو ہٹے، ورنہ ڈٹے سو ڈٹے۔ میاں آزاد نے کہا بس زیادہ شیخی میں نہ آیئے۔ ٹھنڈی ہوا کھایئے۔ خیر ادھر ٹٹو ادھر میاں آزاد پو قدمے جانے لگے۔ جب نشے کے طلوع کا وقت ہوا تو پاؤں ڈگمگانے لگے۔ باگ اب چھٹی اور اب چھٹی۔ دس قدم چلے اور باگ روک لی۔ میاں مسافر میاں مسافر! جی پیر و مرشد ارشاد۔ سچ کہنا میں نشے میں تو نہیں ہوں؟ ناصاحب نشہ کیسا۔ پھر گھڑیا خیز کی، اور ایک بیس قدم پر ٹھٹک رہے۔ میاں مسافر! میاں مسافر! حاضر ہوں، حکم، تمھیں ایمان کی قسم سچ کہنا میں نشے میں تو نہیں ہوں! اجی حضرت کیسا نشہ آپ ہوش کی باتیں کر رہے ہیں۔ پھر گھڑیا کو ایڑ لگائی سات ہی آٹھ قدم گئے ہوں گے

کہ پھر بانک لگائی - ارے میاں مسافر - ہوت! ارے میاں کیا سو گئے - جی ہمراہِ رکاب ہوں - بھئی سچ نہ کہے تو ہمارا ہی خون پیے - تمھیں واللہ نشے کے کچھ بھی آثار ہمارے چہرے سے پائے جاتے ہیں ؟ ہوش و ہواس درست ہیں نہ - ہاں ہاں صاحب درست ہیں - عرض تو کر چکا کہ آپ ہوش میں ہیں - ایمان سے کہتے ہو ؟ تو بہ آپ بھی عجیب شخص ہیں ، ایمان سے نہیں تو کیا بے ایمانی سے کہتا ہوں - پھر چند قدم گئے اور گھڑیا کو روک کر کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے - میاں مسافر ! میاں مسافر ! سچ کہنا ذرا بھی ہوائی ہوائی بات تو زبان پر نہیں آئی ہے - کیوں ہے نہ یہی بات - بے شک جو بات کہی پتے کی ، اور بوکھلاہٹ تو آپ کے قریب نہیں پھٹکنے پاتی - فوراً میرے شیر نے ٹٹو کی باگ پھیری ، اور لگے الٹے چلنے - ہائیں ہائیں ، اے حضرت کیا یہ الٹی گنگا بہائی - ارے میاں یوں چلو یوں ، اچھا دوں سہی یا یوں سہی ، لیکن سچ کہنا کوئی بات نشے کی پائی جاتی ہے - میاں آزاد نے اپنے کان اینٹھے اور کہا بندہ نواز ! وہم کی دوا تو لقمان کے پاس نہ تھی - ایک دفعہ ، بیس دفعہ ، پچاس دفعہ ، سمجھا دیا کہ آپ ہوش کی پڑیا ہیں - پھر آپ بار بار کیوں پوچھتے جاتے ہیں - خیر خدا خدا کرکے جانور کو پھیرا ، مگر نشہ نے اٹیرن کر دیا - مسافر ! مسافر ! مسافر ! مسافر ! دیکھیے کیا قدم ہے - نہ کہو گے - سچ کہنا - جھوٹ بولنا اور سور کھانا اپنے حساب برابر ہے - ذرا بھی نشہ کی کوئی بات پائی گئی - کیا مجال - بالکل ہوش کی باتیں ہیں - حضرت خصوصاً اس وقت جو آپ نے گھوڑے کو پھیر دیا تھا یہ عین ہوش و ہواس کی نشانی ہے اور یہ بار بار ایک ہی بات کو دہرانا صاحب ہوش کی باتیں ہیں - جیو شیر - ایک کچی اور چڑھا لو تو ٹیں ہی ہو جاؤ - ایک دفعہ ہی آواز آئی - مسافر مسافر - او میاں مسافر ! بد حواسی کی بات تو میں نے نہیں کی - تمھیں قسم ہے اپنے دین اور ایمان کی - میاں آزاد نے پھر اپنے کان اینٹھے - بد حواسی تو چھو نہیں گئی - معاذ اللہ جو کہیں آپ بے ہوش ہوتے تو ممکن تھا کہ گھڑیا کا رخ پھیر دیتے - ایک یہی ہوش کی بات ہے کہ کوئی اٹھارہ کروڑ مرتبہ مجھ سے آپ پوچھ چکے کہ میں ہوش میں ہوں - نہ پھر میاں شہسوار نے چیخنا شروع کیا ، کہو بھئی مسافر ، دیکھنا ہم بھی کس خم ودم کے جوان ہیں ، چشم بد دور دم غنیمت ہے - اور یہ دیکھو ذرا نشے کی بو تک نہیں آتی - بجا ہے مشفق - میں خوب واقف ہوں - نشہ ہوتا تو ایسے ٹھکانے کی باتیں نہ سوجھتیں - جب میاں آزاد نے دیکھا کہ اب یہ غین ہوئے ، اور گھڑیا پر سے لڑھکا ہی چاہتے

ہیں، اب خیر نظر نہیں آتی ہے۔ جھٹ گھڑیا کو ایک کھیت میں ہانک دیا۔ اور غل مچایا کہ او کسان! او کسان! دیکھ یہ تیرا کھیت چرائے لیتا ہے۔ کسان کے کان میں جو یہ بھنک پڑی تو لٹھ کاندھے پر رکھ، لاکھوں صلواتیں سناتا ہوا جھپٹا۔ آج چچا بنا کے چھوڑوں گا۔ روز سوری چرا لے جاتے تھے، آج ہی تو ہتھے چڑھے ہو۔ بچہ جی۔ اب کہیے کیا درگت بناؤں؟ قریب گیا تو دیکھا ہے کہ ٹٹوی ہے اور ایک آدمی اس پر لدا ہے۔ ایں! ایں گلِ دیگر شگفت۔ اخاہ آپ ہیں چلیے گھر لے چلوں، رات کو گھر ہی پر سوئیے، کسان گو کسان ہی تھا گنوار۔ مگر تیز طبع یہ جھانسا دے کر کہ تم کو گھر لے چلوں گا۔ سیدھا کانجی ہوس پہنچا۔ پیچھے پیچھے ٹٹوی۔ ایک دفعہ حضرت جو چونکے تو ہانک لگائی۔ میاں مسافر میاں مسافر! بھئی سچ کہہ دو ذرا نشہ کی چھا تھ تک نہیں ہے۔ او چھا جی۔ یہ اپنے حساب ابھی راہ میں میاں آزاد ہی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اس دحشت کو ملاحظہ فرمائیے۔ الغرض ٹٹوی اور سوار دونوں کو کانجی ہوس میں ڈھکیلا، اور چمپت ہوئے۔ ادھر میاں آزاد نے راہ لی یہ بے چارے رات بھر کانجی ہوس میں رہے۔ صبح کو دس آنہ دے کر پیچھا چھوٹا۔ خدا اس شراب خانہ خراب کو غارت کرے۔ آمین آمین۔

اپنے حلوے مانڈے سے کام

میاں آزاد کے تو پاؤں میں آندھی رد گ تھا۔ اِدھر اُدھر چکر لگائے، راستہ ناپا، اور پڑ کر سو رہے۔ ایک دن حسبِ معمول تلوے کھجلائے تو چلے سرا کی طرف۔ وہ تو کہیے خیر گزری کہ جوشِ جنون نے جنگل نہ دکھایا۔ دونوں وقت ملتے سرا میں پہنچے۔ بڑی چہل پہل ہے۔ ایک طرف روٹیاں پک رہی ہیں، دوسری طرف دال بگھاری جاتی ہے۔ بھٹیاریاں مسافروں کو گھیر گھار کر لا رہی ہیں۔ صاف ستھری کوٹھریاں دکھا رہی ہیں۔ حضرت اِدھر اُدھر خوب گھومے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک کوٹھری کے پاس ایک صاحب لحیم و شحیم، فربہ و جسیم، جیسے ہی چارپائی پر بیٹھنے لگے پٹی ٹوٹ گئی۔ اور حضرت غڑاپ سے جھلنگے میں ہو رہے۔ ہائے موٹاپا بھی کیا بُری چیز ہے۔ اب سنیے کہ گرے تو اٹھا نہیں جاتا، آخر کار دایاں ہاتھ بھٹیاروں نے لیا۔ بائیں طرف میاں آزاد نے ہاتھ دیا، اور بعد خرابی بصرہ حضرت کو نکالا۔ جھلنگے سے باہر آئے تو نہایت ہی خفیف۔ پہلے تو بی بھٹیاری سے خوب

گل غپ ہوئی۔ واہ اچھی چار پائی دی، اور جو میرا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتا، سر پھوٹ جاتا، تو کیسی ہوتی۔ اے واہ میاں! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، ایک تو چھپر کھٹ کو چکنا چور کر ڈالا۔ پٹی کے بہتر ٹکڑے ہو گئے۔ دینگے ٹکا۔ اور چھ گنڈے پر پانی پھیر دیا۔ دوسرے ہمیں کو للکارتے ہیں۔ الغرض لوگوں نے سمجھا بجھا کر جھگڑا پاک کیا تو حضرت ٹہل ٹہل کر یہ شعر پڑھنے لگے ؎

رُدائے دلِ حزیں نہ تپ ہجر یار میں　　　بیمار کو مفر ہے نہانا بخار میں

میاں آزاد نے پوچھا حضرت! کہاں سے تشریف لانے کا اتفاق ہوا۔ فرمایا یہیں تک آیا ہوں۔ معقول، سوال دیگر جواب دیگر۔ قبلہ آپ آئے کہاں سے ہیں۔ جی وطن سے آتا ہوں۔ الٰہی خیر وطن کا کچھ نام بھی ہے۔ یا گمنام ہے۔ جی گوپامؤ میں مکان ہے۔ اخاہ آئیے آئیے! واللہ خوب ملے۔ تو یہ کہیے حضور کا دولت خانہ گوپامؤ میں ہے۔ خوش آمدی، خوش آمدی! یہاں کس غرض سے آنا ہوا حضور۔ جی بندہ حکیم ہے۔ یہ کہیے تو آپ طبیب ہیں کیا! طبیب! طبیب آپ خود ہوں گے ہم حکیم ہیں۔ طبیب کہیں اور رہتے ہوں گے۔ خیر صاحب وہ طبیب نہیں۔ آپ حکیم بلکہ سلطان الحکما سہی۔ خفا کیوں ہوتے ہو صاحب۔ کیا یہاں مطب کرنے کا قصد ہے؟ اور نہیں تو کیا، بھاڑ جھونکنے آیا ہوں، یا سنیچر پاؤں پر سوار تھا۔ بھلا یہ فرمائیے کیسا مقام ہے، لوگ کس قسم کے ہیں، آب و ہوا کیسی ہے؟ حضرت یہ نہ پوچھیے، باشندے شورہ پشت، چاق و چوبند، انٹھوں گانٹھ کمیت، اور آب و ہوا کا تو خیال ہی نہ کیجیے۔ برسوں رہیے، اگر کسی دن سوء ہضم کی شکایت ہو تو جرمانہ دوں۔ پاؤ بھر کی غذا ہو تو تین پاؤ کھائیے۔ ڈکار تک لیجیے، تو مجھے سزا دیجیے۔ یہ سن کر حکیم صاحب نے منھ بنایا، اور گو لاکھ ضبط کیا مگر بے اختیار بول اٹھے: لاحول ولا قوۃ۔ بڑے بُرے پھنسے۔ ایں بُرے پھنسے! یہ کیوں کیوں! اجی آب و ہوا مرغوب ہے، بیماری کا نام نہیں، یہ تو اچھا مقام ہے، لاحول چہ معنی دارد؟ حضرت آپ نرے کوڑھ مغز ہیں۔ ایک تو آپ نے یہ گولا مارا کہ آب و ہوا اچھی ہے، اتنا نہیں سمجھتے کہ آب و ہوا اچھی ہے تو ہم سے کیا واسطہ۔ ہمیں کون پوچھے گا۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھے مکھیاں مارا کریں گے۔ ہم تو ایسے شہر میں جانا چاہتے ہیں جہاں ہیضے کا گھر ہو، بخار پیچھا نہ چھوڑتا ہو، ڈنکو روز ٹیٹوا دبوچے، قبض اور پیچش کی سب کو شکایت ہو، آب و ہوا میں سم کی خاصیت ہو، چیچک کا وہ زور ہو کہ الامان! جب البتہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔ آپ نے تو واللہ آتے ہی گولا مارا۔

ہتھے ہی پر ٹوک دیا، اور ماشاء اللہ کس ہمدردی سے آپ فرماتے ہیں کہ سو، ہضم کی شکایت نہ ہوگی۔ واہ سو، ہضم کی شکایت ان کو ہوتی ہوگی، جو ضعف معدہ کے عارضے میں مبتلا ہیں، اور اس پر طرہ یہ کہ پاؤ بھر کے عوض میں تین پاؤ غذا کھانے لگوں۔ واہ وا واہ۔ پڑا ہی کر دیا۔ آمدنی ٹکا نہیں، اور کھائیں چوگنا۔ تو فرمائیے مرے یا جیے، نا صاحب بندہ سویرے ہی بوریا بدھنا اٹھا کر چمپت ہوگا۔ ایسے منحوس شہر میں میری بلا رہے۔ جہاں سب ہٹے کٹے ہی نظر آتے ہیں۔ جسے دیکھو ڈنڈ پیل۔ سنڈ ابنا ہوا۔ بھلا کوئی خاص عارضہ بھی یہاں ہے، یا عارضے کا اس طرف گزر ہی نہیں ہوا۔ حضرت یہاں کے پانی میں یہ تاثیر ہے کہ ہو سو کا مریض آئے، اور ایک قطرہ پی لیا چاہے، بس خاصہ ہٹا کٹا لاحول۔ پانی کیا آبِ حیات ہے۔ تو سہی جو پانی میں زہر نہ ملا دیا۔ اے تو قبلہ ہزاروں کنویں، سیکڑوں اندارے، پچاسوں باؤلیاں کس کس میں زہر ملاتے پھریے گا۔ خیر بھئی سمجھا جائے گا مگر بُرے پھنسے۔ واللہ بُرے پھنسے۔ اس وقت ہوش ٹھکانے نہیں ہے۔ مہترانی، مہترانی، بی مہترانی! ذری ہم کو پنساری کی دکان سے تولہ بھر شکنجبیں تولا دینا، اس وقت جی قابو میں نہیں ہے۔ اے میاں پنساری یہاں کہاں۔ کسی فقیر کی دعا ایسی ہے کہ یہاں حکیم اور پنساری جینے ہی نہیں پاتا۔ کئی حکیم آئے مگر گور میں ہیں۔ کئی پنساریوں نے دکان جمائی مگر چتا پر پھونک دیے گئے۔ یہاں تو بیماری نے آنے کی قسم کھائی ہے۔ ارے توبہ! ارے توبہ! بھئی واللہ کیا تکلا شہر ہے۔ خداوندا بچائیو! اس طرف رخ جو آج سے کرے اُس پر لعنت ہے۔ بے یارو خدا کے لیے ہمیں ٹٹو کرایہ کر دو تو رفو چکر ہو جائیں۔ یچ پی، ہزار لعنت کھائی۔ ایسے شہر کی ایسی تیسی غضب خدا کا یہاں پنساری کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔

میاں آزاد نے ان کو چھوڑا تو سرا سے دوسرے گوشے میں ہو رہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگوار گوش محل میں بستر جمائے فوق البھڑک کپڑے پہنے کھڑے ہیں۔ یہ بے تکلف آدمی۔ السلام علیکم۔ کہہ کر گوشہ محل میں داخل ہو گئے۔ وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ ہاتھ ملایا، بغل گیر ہوئے، تعظیم کی۔ لطف و اخلاق سے بٹھایا۔ مزاج اقدس؟ الحمدللہ، جناب کا مزاج عالی؟ شکر ہے۔ میں تو ایک مسافر غریب الوطن ہوں۔ آپ نے بڑی بندہ نوازی فرمائی۔ اور ممنوع احسان کیا۔

زقدر شوکتِ سلطان نگشت چیزے کم   زالتفات بہ مہمان سرائے دھقانی

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید   کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانی

میاں آزاد سمجھ گئے، کہ یہ کوئی بڑے لسّان آدمی ہیں۔ پوچھا آپ یہاں کس تقریب سے تشریف لائے ہیں؟ فرمایا عرض کردوں، پیرو مرشد میں وکیل ہوں۔ قصد ہے کہ یہاں وکالت کروں، کہیے یہاں عدالت کی کیا کیفیت ہے۔ میاں آزاد نے فرمایا یہ نہ پوچھیے یہاں کے باشندے بھیگی بلی ہیں۔ لڑنا بھڑنا جانتے ہی نہیں۔ سال بھر میں دو چار مقدمے شاید ہوتے ہوں، چوری چکاری یہاں کبھی سننے ہی میں نہیں آتی۔ زمین آراضی، لگان پٹی داری، حقیت کے مقدمے کبھی سنے ہی نہیں۔ قرض کوئی لے نہ دے۔ وکیل صاحب کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر حکیم صاحب کی طرح مخبوط تو تھے ہی نہیں کہ بلبلا اٹھتے، نہایت متانت سے فرمایا کہ سبحان اللہ! بڑے مسکین آدمی یہاں بستے ہیں، مگر دل میں افسوس ہوا، اس ٹیم ٹام، دھوم دھام سے آئے اور یہاں وہی ڈھاک کے تین پات۔ ان کو بھی چھوڑا، اور یہاں سے اور طرف چلے۔ دیکھا کہ چارپائی بچھائے، شہتوت کے پیڑ کے تلے ایک صاحب بیٹھے حقہ اڑا رہے ہیں، پوچھا آپ کا اسم شریف؟ فرمایا گمنام۔ پوچھا مسکن فرمایا:

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

پوچھا پیشہ فرمایا خونِ جگر کھانا۔ اخاہ آپ شاعر ہیں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بھی چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے۔ حضرت حقہ تو بندے کے حوالے کیجیے، اور آپ اپنا کلام سنائیے۔ بسم اللہ شاعر موصوف نے بہت کچھ چنیں و چناں کے بعد پرایا کلام اپنا کہہ کر یوں سُنایا:

گفتمش اے مہ شب از من روے تابیدن چہ سود
گفت گستاخانہ بر روے من آں دیدن چہ سود
گفتمش رویت گل ست و گل براے دیدن ست
گفت بر دیدن دکانِ عاشقی چیدن چہ سود
گفتمش عشقِ گلِ رویت مگر باشد گناہ
گفت ایں رمزیست پنہاں فاش نالیدن چہ سود
گفتمش نالیدہ ام کز جور تو رنجیدہ ام
گفت چوں عاشق شدی بر جور رنجیدن چہ سود

گفتمش بر جورِ نا فہمیدہ گشتم مبتلا
گفت ایں رسم قدیم ما ست فہمیدن چہ سود
گفتمش فہمیدہ نا فہمیدہ گشتم مبتلا
گفت بس اے عقل مغز ما خراشیدن چہ سود

سبحان اللہ! حضرت آپ تو شاعرِ غرّا ہیں۔ عرض کروں حضرت شاعرِ غرّا ہونا تو محال ہے، مگر آپ قدرداں آدمی ہیں۔ ورنہ شاعرِ غرّا تو عرب میں متنبّیؔ اور امرا القیس۔ فارس میں سعدی و خاقانی و فردوسی و انوری۔ ہند میں کالیداس اور کبراج، اور اردو میں انیس و دبیر آتش و میر گزرے ہیں۔ باقی خیر صلاح۔ اچھا حضرت کچھ اردو کلام تو سنائیے۔

بہت خوب:

داغ دے جاتے ہیں جب آتے ہیں — یہ شگوفہ وہ نیا لاتے ہیں

سبحان اللہ داغ کے لیے شگوفہ کیا خوب۔ (تسلیم)

یار تک بار کہاں پاتے ہیں — راستہ ناپ کے رہ جاتے ہیں

کیا بول چال ہے کیا روزمرّہ ہے (آداب)

پھر جنوں دشت نہ دکھلائے کہیں — آج تلوے مرے کھجلاتے ہیں

اوہو ہو۔ کیا زبان ہے سبحان اللہ حضرت۔ (کورنش)

ٹال جاتے ہیں جو بوسہ مانگو — بات مطلب کی چبا جاتے ہیں

بارک اللہ خدا کی قسم زبان چوم لے۔ بوسے کے لیے چبانا بھی کیا خوب ہے:

پھول کا جام پلا اے ساقی — کانٹے تالو میں پڑے جاتے ہیں

اہاہاہا۔ پھول کے لیے کانٹے:

لے متنبّی عہد اسلام میں مشہور عربی شاعر تھا، جس نے نبوّت کا دعوا کیا تھا۔ امرا القیس متوفی ۵۳۹ ء عرب کا بلند پایہ شاعر قبل از اسلام جس کا قصیدہ کعبہ شریف میں لٹکایا گیا تھا۔ سعدی متوفی ۶۹۴ ھ خاقانی متوفی ۵۹۵ ھ فارسی کا قصیدہ گو شاعر۔ فردوسی متوفی ۴۱۱ ھ مثنوی گو شاعر مصنف شاہنامہ۔ انوری متوفی ۵۸۳ ھ مشہور قصیدہ گو شاعر۔ کالی داس سنسکرت کے مشہور شاعر۔

کنگھی کے نام سے ہوتے ہیں خفا　　بات سلجھی ہوئی الجھاتے ہیں
نگہ رحم کبھی تو کیجیے　　کوئی دم رحم بھی فرماتے ہیں
ساتھ لاتے ہیں رقیبوں کو ضرور
دل دُکھانے کو وہ عقل آتے ہیں

اس کے بعد شاعر نے پوچھا کیوں حضرت! یہاں کے رؤسا میں کوئی قدردانِ شعرو سخن بھی ہے؟ یہ نہ پوچھیے، یہاں مارواڑی البتہ رہتے ہیں۔ کتاب یا کتب فروش، شاعر یا منشی کی صورت سے نفرت ہے۔ یہاں کے رؤسا سے کچھ بھروسا نہ رکھیے، وہ شعرو شاعری کے قریب نہیں بھٹکتے۔ لاحول ولا قوۃ۔ توبہ آنا ہی بے کار ہوا۔ اجی اس میں کیا شک۔ لاحول ولا قوۃ۔ اے صاحب آخر کوئی صافی مذاق بھی ہے؟ اب آپ تو مانتے ہی نہیں۔ یہاں قدردان خدا کا نام ہے۔

آٹھوں کا میلا

وہاں سے جو میاں آزاد تیر کی طرح رواں ہوئے تو راہ میں دیکھا کہ کئی مسافر لدے پھندے جا رہے ہیں۔ کیوں بھئی اس وقت کہاں؟ لکھنؤ۔ لکھنؤ یہ کیوں؟ کیوں کیا! آٹھوں کا میلا ہے یا نہیں۔ اس دھوم دھڑکے کا میلا دیکھا نہ سُنا۔ ہاں! تو اب ہم بھی چلتے ہیں۔ محرم الحرام اور بہار بسنت کے تو خوب مزے اڑائے، اب چلیے یہ میلا بھی دیکھ لیں۔ کیا جانے پھر ہاتھی چھوٹے، گھوڑا چھوٹے، یہ کہہ کر میاں آزاد بھی لکھنؤ چلے۔ نور کے تڑکے داخل، سبحان اللہ کیا صبح ہے۔ عارفانِ حق پرست کے دل کی طرح نورانی۔ اور باطن میں اہل تصوف کے مثل مہبطِ فیضِ ربانی جدھر دیکھو تجلّی اور نور۔ جدھر جاؤ لطف اور سرور سلطانِ خاوری کے تاجِ زریں کی چمک، اور اشعۂ زرنگار سے ذرّوں کی جھلک نمودار۔ در و دیوار سے آیۂ وجعلنا الشمس ضیاء آشکار۔ شنبہ کا دن جس کی شان میں فصحا نے کہا ہے۔ کہ مکتب خانہ ہار اروزِ بازار از دستِ واطفالِ دبستان سبق آموز او۔ الف ابجد زبانان ست و نقطۂ اولیں پرکارِ دوراں دیکھتے کیا ہیں کہ صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے۔ نخلِ بہار کی نشوونما ہے۔ غٹ کے غٹ، ٹھٹ کے ٹھٹ، شہدے لقّے، ٹورے پچے، گرہ کٹ جیب کترے، چرسیے مدکیے، گنجریے بھنگیریے، شریف و نجیب، زیرک و لبیب،

سب جوق جوق، امنڈے آتے ہیں۔ تامدان ہوادار، رہوار باد رفتار، فنس زرنگار، ٹٹو گھوڑا اسب خراماں خراماں، پوقدمے آتے ہیں۔ بگھی پر بگھی ٹوٹی پڑتی ہے۔ گاڑی سے گاڑی لڑتی ہے۔ رنگیلوں چھیل چھبیلوں کی بن آئی۔ گاڑھی بوٹی چڑھائی۔ بن ٹھن کے چھیلا بن کے میلا دیکھنے چلے۔ بالوں میں حِنا کا تیل چھوڑے، کیچل لیٹ کا دھانی رومال اوڑھے، دوانگل مانگ کھولے، بانڈی سے پٹیاں جمائے، گھڑی لگائے، داڑھی چڑھائے، گلے میں گلوبند دلفریب شربتی کا انگرکھا تن زیب پاؤں میں مخملی جوتی، کاشانی یا سوتی۔ قہقہے اُڑاتے، آنکھیں لڑاتے جارہے ہیں۔ ادھر ادھر نظارہ بازی کرکے مسکرا رہے ہیں۔ فنس پر ماہرو ٹھسّے سے بیٹھی ہیں۔ مگر بند۔ ہٹو بچو کا شور بلند، ساقیوں کا بازار گرم، کسی نے دو کش پیئے ٹکا ہتھیایا۔ ساقیوں کی دکانیں دھواں دھار، تنبولیوں کے بیڑے مزے دار۔ کان میلیے کی سرگوشی۔ حجام کی رونمائی۔ برف والے کی سرد مہری، ٹھنکرنوں کی ہانک ؟ آنب کے بجے کی کمرکھیں۔ کابل کا میوہ۔ رس بھری۔ تاجے گلابیاں شہتوت۔ بونٹ لوہرے بھرے بونٹ۔ کسی طرف سرمرمسی، شیشہ۔ کنگھی دیا سلائی کی دیبا ہے بخشی بھولا ناتھ کا باغ میلے کا چشم و چراغ ہے۔ ٹھیکیٹ رائے کا تالاب، ہزاروں میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب ہے۔ جو سلسبیل و کوثر کو شرمائے۔ تسنیم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے۔ عجب لطف وسماں ہے۔ ہزارہا تماشائی تالاب کے اردگرد دلبستر جمائے کوئی دری کوئی زین پوش بچھائے، بیٹھا میلا دیکھ رہا ہے۔ کوئی جہانیان جہاں گشت چکر لگا رہا ہے۔ کوئی ہوا کھاتا ہے۔ ایک فنس پر ایک جوانان رعنا ڈھوہ کا ڈھوہ پچیس برس کا سن چلنے پھرنے کے دن، لدا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا آرہا ہے۔ امرا کے لڑکے زیور سے گوندنی کی طرح لدے، مٹھائی خریدنے میں مصروف ہیں، مگر خدمت گار دیکھ بھال رہا ہے۔ کہ کوئی دستِ چالاک ہاتھوں ہاتھ پاؤں کے گونگھرو نہ اڑا لے۔ عورتیں الگ زیور سے منجلی گھونگھٹ کاڑھے، دبکی چلی جاتی ہیں، کہ کوئی چوہے دتیاں نہ موس لے جائے۔ تختِ رواں آتے ہیں، سوانگ کرتب دکھاتے ہیں۔ شعبدہ باز سوانگ لاتے ہیں۔ کوئی دہکتا انگارا کھا گیا، کوئی لوہے کے چنے کرکرکر کے چبا گیا۔ برہمن ڈول لیے گشت لگاتے ہیں۔ سقے اور بہشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں۔ سہ پہر تک خوب جمگھٹا رہا۔ چراغ روشن ہوئے، اور یار لوگ کھسکے۔ کسی نے مٹی کا بوا لیا، کسی نے روئی کا لنگور، اتنے میں ایک ریلا آیا تو کھلونے چکنا چور، ایک نے غل مچایا کہ وہ ہاتھی آیا، بھیڑ چھٹ گئی اور وہ ڈراتے ہوئے چلے،

مگر بگڑے دل اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ شربتی کا انگرکھا چاہے ان گاؤ زوریوں میں چر سے نکل جائے، مگر ممکن کیا کہ بل جائے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں پولیس کا انتظام خوب رہا، چوٹٹے اچکّے جا کر پچھتائے، بھلے مانس مزے سے گھر آئے۔

ایک رئیس کی صحبت

ہمارے دقیقہ رس اور صبح نفس سیاہ میاں آزاد، آج سر شام سے مٹر گشت کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اب تو فصل بہار میں جنون کے پینگ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ شام کہ شام اودھ بھی اس کے مقابل میں گرد، وہ نور کے صبح بنارس کا رنگ اس کے آگے زردؔ طرۂ شام روکشِ زلفِ مہوشان فرخار۔ سواد سرمہ کشِ دیدۂ خوبانِ گل عذار، ماہ مثل محبوب چاردہ سالہ منتظر فلک سے جلوہ افگن۔ حیرت تھی کہ الٰہی یہ شام ہے یا روز روشن، یہ قمر ہے یا محفلِ طرب کا چشم وچراغ، یہ شب ہے یا نور کا چھلکتا ہوا ایاغ، آسمان ہے یا خوانِ جواہر الوان، میاں آزاد بادلِ شاد سیر کرتے پھونک پھونک کر قدم دھرتے، مزے مزے چلے جاتے تھے۔ اور بہارِ طبع تو تھے ہی، قدم قدم پر وجد میں آتے تھے۔ چلتے چلتے ایک چمنستان پُر بہار، گلزار بیخار، میں گزر ہوا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! جو در و دیوار ہے، لطافت بار ہے۔ کہیں امرود کے ہرے بھرے درخت، کہیں تختۂ انار ہے۔ جس گل کو دیکھتے ہیں شگفتہ طبع، کشادہ جبیں، جس پھول کو سونگھتے ہیں، مشکبو عنبریں۔ عنادلِ پرسوز زمزمہ پرداز، ہر روشِ گلستانِ سعدی شیراز۔ جس غنچے کو دیکھو نازپرورد، کوئی سبز، کوئی سُرخ کوئی زرد، کہیں نرگسِ حیراں، دفتاں، کہیں ارغوان وعشق پیچاں۔ گل شبّو صناعی مصوّر بہار کا گواہ، اور شمیم مشکبار سے معتبر، از ماہی تا ماہ۔ انتخابِ فصلِ بہار۔ کوکنار خالِ عارضِ شاہدانِ فرخار:

در چمن بنگر بہارِ کوکنار — لالہ غلطاں درکنارِ کوکنار
گرچہ افیون خویش را بیرون کشید — کم نشد زاں اعتبارِ کوکنار
نشۂ دارد معرّا از خمار — شوخ پُرکارے نگارِ کوکنار
فخرن رازست دمہری بردہاں — اہل دل باشند یارِ کوکنار
سنگ بر سر می زند از ننگ آں — نیک تنگ آمد زکارِ کوکنار

ناشپاتی کی آبداری وسیرابی، شفتالوے آردی دکاردی کی شادابی، کچھ

سبز کچھ سُرخ:
تو گوئی کہ گل چہرگانِ فرنگ
کشیدہ بسر چادرِ سبز رنگ

انار لعل آبدار، شیریں کار، عناب بالب دلبران در شکر آب ہر روش رشکِ بستان۔ ہر قطعہ روکشِ روضۂ رضواں؛

در دامنِ ہر شگوفہ باغی
ہر برگِ گلے چو شب چراغی

گلہای شگفتہ جام بردست
برداشتہ بانگ بلبلِ مست

در ہر چمنی بہ چشمِ بینا
مینوکدۂ برنگ مینا

سیرابی سبزہ ہائے نوخیز
از لُولُوِ تر زمرد انگیز

وسط باغ میں سنگ مرمر کا ایک صاف و شفاف چبوترہ ہے۔ اور اس پر فرش مکلف بچھا ہے۔ اور ایک رئیس با توقیر صدرِ محفل خلد نظیر، مع رفقائے فرمان پذیر و تحریر بیٹھے ہیں۔ شعر خوانی ہو رہی ہے۔ اپنا اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لیے ہر ایک مصاحب اساتذہ بے ہمتا اور شعرائے نغز کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھ رہا ہے:

۱- وحشت عیاں ہے خاک سے مجھ خاکسار کی
بھڑکے ہرن بھی سونگھ کے مٹی مزار کی

دوسرے صاحب۔ لو نے بھئی یہ رنگ پسند نہیں۔ پھیکا رنگ ہے۔ دیکھیے شعر ہم سنائیں:

۲- آبداری تو کریں خنجرِ مژگان پیدا
ہم بھی کرلیں گے ہر اک مُو سے رگِ جاں پیدا

دو چار حاضرین نے گردن ہلائی۔ مگر ایک صاحب جل مرے کہ ایسا نہ ہو یہ رئیس گردون مدار کے مزاج میں دخیل ہو جائیں، تو ہم پھسڈی ہی رہیں۔ انھوں نے یہ شعر پڑھا:

۳- من عاشقم دیار بکارِ دگراں است
چوں غرۂ شوال کہ عیدِ رمضاں ست

اکثر مصاحبین نے اس پر وجد کیا۔ سبحان اللہ ع ۔ چوں غرۂ شوال کہ عید رمضاں ست" کتنا خوب کہا ہے۔

اتنے میں رئیسِ والا تبار نے فرمایا کہ جام و مینا کی تعریف میں کچھ شعر سنائیے!

۴- ساقی سرو قدِ ما چو ز جا برخیزد
از لب ساغر می نام خدا برخیزد

۵- میر دو خندہ زنان باز مراحی برکوع
ایں نمازی ست کہ از قہقہہ باطلِ نہ شود

۶۔ اعجاز بادمی کہ مسیحی بصد نیاز　　تعلیم قم قم از لبِ مینا گرفتہ است

۷۔ کہنہ ہر چند شود بیشترش میخواہند　　دخترِ تاک عجب بختِ جوانی دارد

۸۔ دے شرابِ ارغوانی ساقیا　　ہے ابھی جوشِ جوانی ساقیا

اتنے میں ایک صاحب کو جام و مینا کا کوئی شعر اس وقت یاد نہ تھا۔ فرماتے کیا ہیں حضور! گردن کی تعریف میں نجف قلی بیگ نے کیا جادو بیانی کی ہے: اہاہا:

از لطافت می توان چوں نور در فانوس دید
از بیاضِ گردنِ او شعلۂ آواز را

سبحان اللہ کا دونگڑا برسنے لگا۔ اور کئی منٹ تک لوگوں نے تعریف کی۔ تب تو ایک بزرگوار نے ان کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے یہ شعر فرمایا:

خونِ عشاق بر اں گردنِ سیمیں باشد
چوں بیاضی کہ پر از معنیٔ رنگین باشد

واہ واسبحان اللہ خون کے لیے معنیٔ رنگیں۔ واللہ اس لفظ سے شعر میں جان پڑ گئی اچھی طبیعت لڑ گئی، خداوند یہ کسی کا حصہ نہیں۔ حضور یہ اشعار سنیے گا: میں نے ایک شیرازی کے سامنے پڑھے بربِ کعبہ کہنے لگا کہ ایں قال شما ست۔ میں نے عجز کی راہ سے کہا کہ یا با ما کہ شاعر نیستیم۔ نمی دانم کہ کیستیم۔ پھر اسرار کیا کہ کلامِ خویش بر خواں۔ عرض کیا بندہ کم کم می گوید، نہ قابل سماعتِ فصحائے خاکِ پاکِ شیراز لوحش اللہ۔ خیر دہ شعر تو سناؤں:

تا گرد ماہ سنبلِ مشکین نہادۂ　　بس داغہا کہ برمنِ مسکین نہادۂ
بر عارضِ تو زلف سمن را چہ حکمت ست　　یعنی بجیب فاتحہ آمین نہادۂ
دان خالِ نازنین تو بر روئے دلفریب　　طغرای مشک بر گلِ نسرین نہادۂ
جانہا حیات یافت زحُسنِ کلام تو　　در زیرِ لب چہ شیوۂ شیریں نہادۂ

فریاد ہائے قاسمی از آسماں گذشت
زیں جور ہا کہ شیوۂ آئین نہادۂ

رئیس باوقار نے اس غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور فرمایا کہ بھئی ہمیں تو آتش اور حافظ کا رنگ دل سے پسند ہے:

مر ڈروں کان کو مجنوں کے مثلِ طفل شریر — عجب نہیں یہ جنون کی بزرگواری سے
چال ابر کی چلا جو گلستاں میں جھوم کر — طاؤس نے قدم ترے رہوار کے لیے

رفقا اور لیمو نچوڑ تڑ سے بول اٹھے کہ بجا ہے خداوند آتش کی سی زبان کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یہ روزمرہ کہاں سے پائیے۔ وہ تو وہ ان کے تلمیذ سعید رشید صباؔ[1] کے محاورات اور بول چال کو تو دیکھیے:

نہایت جوش پر دریا ہے اپنی طبع موزوں کا
جہاں میں شور ہے طوفانِ آب دُرِّ مضمون کا

ایک صاحب نے کہا خداوندِ نعمت! فصاحت اور جادو طرازی میں انیس مبرور، بول چال میں آتش مغفور، خیالات میں ناسخ، تشبیہ میں ذوقؔ[2]، عاشقانہ رنگ میں مومن، بلاغت میں دبیر، استعارہ میں میاں امانت، مثنوی میں نسیم لکھنوی، واسوخت میں عیشیؔ[3] ریختی میں بیدل، محلات کی بول چال میں حکیم نوابؔ[4]۔ خدا جانتا ہے کہ قلم توڑ گئے۔ اور سرورؔ مبرور تو خدائے نثر تھے۔ ذرا اس بول چال کو دیکھیے۔

وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی جھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری، ایک بار کھائیے، نان نعمت کا مزہ پائیے۔ ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون کہ آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعب حسن سے بات نہ کر سکے۔ سنکر نین پریزاد، سروقامت رشکِ شمشاد، دکانوں میں انواع و اقسام کے میوے، قرینے سے چنے۔ محاورے ان کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی میاں یہ ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش بیانی، شرر افشانی، سے دل جلوں کے سینہ میں سوز و گداز ہے۔ مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک صاحب نے اٹھ کر ایک کاغذ

---

[1] میر وزیر علی۔ صبا متوفی ۱۸۸۴ء شاگرد آتش [2] شیخ ابراہیم ذوق دہلوی متوفی ۱۸۵۴ء [3] طالب علی خان عیشی متوفی ۱۲۴۰ھ [4] حکیم نواب مرزا شوق وصف زہر عشق و بہار عشق متوفی ۱۸۷۱ء

[5] مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب متوفی ۱۸۶۹ء

رئیس جم جاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

یہ کیا ہے بندہ نواز؟

حضور کی شان میں کچھ نثرِ پریشان کہی ہے اور کچھ اشعار موزوں کیے ہیں۔ اب لگے فارسی میں گفتگو کرنے۔ خداوندا! چہ گویم، از مفلسی و تنگدستی نوبت کارو باستخواں رسیدہ۔ نان گریہ بر تیری دوزم، اگر قصیدۂ ہذا کہ بیش از مُرخرفات نیست، بسندِ خاطر عاطر افتد، فہوالمراد، ورنہ خیر خدا حافظ و ناصر ست۔ زیادہ بجز دعائے دولت بندگان عتبۂ عالیہ متعالیہ چہ گویم۔

رئیس نے ایک مصاحب کو اشارہ کیا کہ پڑھو۔ انھوں نے یوں پڑھنا شروع کیا۔

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب　　　　کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

روزے بباغی رسیدم، دیدم، کہ بلبل خوش نوا برگِ گل در منقار داشتہ، وروے سخن بما نمودہ، می سراید۔ کہ اے مردِ خدا! ما کہ بسبب وحشت وحیوانیت دور از قصورِ حضورِ موفور السّرور، سرتا پا نور حاجت روائے جمہور اکلیلِ تاجِ ارجمندی، دررغرا افسر بلندی۔ کان سخا، جان وفا، مزیّنِ مسند علم وافضال، رونق محفل ہنر و کمال، حمیدہ خصال خجستہ جمال، مریخ جلال، سکندر اقبال، ماہ خدم، سپر حشم، عطارد قلم، آسمان خیم، ستودہ شیم، عالی ہمم، کیواں ایوان، فریدون مکان، دادرسِ مظلومان، سحبان طلاقت، انوری بلاغت، بوعلی ذکاوت، حاتم سخاوت، اسفندیار شجاعت۔ زینت وسادۂ دولت، زیب انجمن حشمت، صفا اخلاق، عمیم الاشفاق:

نیرّ آسمانِ عِزّ و عُلا　　　　آفتابِ سپہرِ مہر و وفا
کوکب برج دولت واقبال　　　　گوہر درج عظمت و اجلال
زیرک و مُدرِک و فہیم و عقیل　　　　منشیِ بے بدل شکیل و جمیل
دُرِ دریائے ہمت وجرأت　　　　معدنِ جود و مخزن نصفت
گل شاداب بوستان بقا　　　　بلبل شاخسار بذل و عطا

اتنے میں میاں آزاد چپکے سے بول اٹھے، کہ یہ چورن والے کی بانی ہے، یا امیر حمزہ کی کہانی ہے۔ حضرت دم گھبرانے لگا۔ اب الجھن ہوتی ہے۔ یہ دُنبالۂ توصیف "الٰہی خیر!" حاضرین جلسہ نے قہقہہ لگایا۔ اور ان کو بھی چبوترہ پر بلایا' اور پھر وہ زٹل قافیہ شروع

ہوا۔ والانژاد، پاک نہاد، سرو قامت، گل رخسار، سہی قد، ماہ عذار، سنبل مو، خورشید رو، کاکل درپیچ وتاب، بلبل را دل از مشاہدۂ جمال کباب، یاقوت لب، سیم غبغب، ماشاءاللہ، لب فوق از ظہور، بر دوت تماشاگاہ حور، چاہِ زنخداں از نمود ریش، مصداقِ نورٌ علیٰ نور۔ از خجلتِ ابروانِ خمدار قوس قزح گوشہ پذیر، واز خوفِ سنانِ مژگاں، تیر بہ دامنِ نرگس امان گیر، چشمانش رشک غزالِ ختن وشیر افگن، سلکِ دندانش خجلت دہِ دُرِّ عدن و عقیقِ یمن، ماہ کامل بمقابلۂ عارضِ صافِ آن دریا دل واعظارد مہر زرنگار پیش روئے آں والاتبار شرمسار، حکیمی کہ ارسطو، جالینوس، بقراط و بطلیموس، را در مطبش لیاقتِ نسخۂ نوشتن نیست و بو علی بن سینا رایش ومجال دم زدن نہ، بہ تصدیق می گویم کہ در علم منطق بہ تصوّرم در اشکالِ انواع النسانی مثل آن صاحب کمال کسے نتیجہ بخش بدیہی نہ گذشت۔

اے رفیع المرتبت عالی نسب والا مقام — یافتہ از فیض پایت زیب بزم احتشام
مہر تاباں دائما باہمہ شان و شکوہ — بر در دولت سرایت می نماید اہتمام
حسن یوسف در تماشای رخ چوں ماہ نو — چوں زلیخا با ہزاران دیدہ می ماند مدام
از نہیبِ قہر تو لرزاں مثالِ شاخ بید — زیرِ مرقد رستم واسفندیار وزاد وسام
گر وہی ترتیب بزم راحت وعیش وسرور — چوں گدا جمشید آید در پیت محتاج جام
از ادب پیش تو کے ہر کس تو اند ایستاد — چوں کند اقبال دربانی در مثلِ غلام

اس پر ایک شخص نے دبے دانتوں فرمایا: دربانی در کی ایک ہی کہی:

چوں نگیرد دوام از خلق تو باد شمال — در گلستان غنچۂ گل را نفاروا بتسام

"ایک مصرع کی کٹ گئی ہے دم ہے لنڈورا یہ مصرع وہ دمدار۔

گر کنی جولان سمند باد پا را در نبرد — فرقِ نحس خصم را آرد بزدوی زیر گام
از صبا واسپ گل گونت بستی فرق ستہا — تا بماند او ہمیں جا طے کند این ردم وشام

واہ داواہ اسپ گل گون کیا خوب فرمایا' ادرہاں بھی کلمۂ تنبیہ اچھا آیا۔

نعرہ ہائے الحفیظ والامان گرد و بلند — روز میدان گر کشی تیغ غضب را از نیام
دشمنت در برج جوزا گر بجوید حفظِ جان — ہمچو کھیرا میکند دو نیم تیغِ سبز فام

اہاہاہا! کھیرا خوب موقع پر یاد آیا' اس سے تو یوں ہی کہا ہوتا کہ ؎

چوں خیارِ تر کند دو نیم تیغ سبز فام:

شیر می ترسد چو نیز از خوفِ عدل و داد تو
ساختی گردن کشانِ دہر را این درجہ رام

حاتم طے در طے میدانِ بخشش پیشِ تو
اے سخی ابن السخی سرنگون باشد مدام

بارک اللہ! مصرعہ ثانی کیا مختصر و موزوں ہے، ایک دفعہ ابن السخی اور آجاتا تو مصرعہ ابن الشیطان کی آنت بن جاتا:

عادل و غربا نواز و جوہر مردم شناس
مسند آرائے امارت ہست آن گردوں خیام

ماشاء اللہ جوہر مردم شناس اچھی ترکیب ہے۔ شیخ نہیں کہہ گئے ہیں۔ در زبان آفریں۔ غربا کی رائے مہملہ کا سکون عین لطف شاعری اور ثبوت کمال شاعر ہے:

فخرِ شعرائے زمانِ حالِ ردم و جبین وہند
میکند ختم دعا و ختم کل ختم کلام

اس مقطع کے قربان! یہ تعلّی تو جائز ہی ہے۔ نظامی نہیں کہہ گئے ہیں:

نظامی لیسا صاحب آوازہ
کہن گشتہ و ہمچنان تازہ

ضعیف الاعتقادی

کوچہ گردوں کے پشت پناہ، رہ نوردوں کے قبلہ گاہ، قلمروِ وحشت کے شہنشاہ ذی جاہ میاں آزاد کو ایک دن شوق چرّ آیا، کہ کسی مسجد میں جاکر نماز دوگانہ پڑھیں۔ سوچے کہ آج یوم الجمعہ، روز آدینہ ہے۔ مکتبوں میں یہ آزادی کا سکّہ بٹھاتا ہے۔ مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ آج کے مبارک دن سے سبزہ و گل بھی ہزار زبان سے وحدہٗ لاَ شریک لہٗ، گویا ہے۔ بلبلِ رنگین گفتار کو وظیفہ، معشوقِ حقیقی ورد زباں ہے۔ طاؤس طنّاز فرطِ طرب سے رقص کناں ہے۔ طوطی مثل محلّہ پوشانِ جنان سبز پوش ہے۔ صوفی صافی نشۂ بادۂ ماعرفناک حقّ معرفتک میں سرخوش و مدہوش ہے۔ جدھر دیکھو تسبیحیں کھٹا کھٹ چل رہی ہیں۔ شراب عرفان کی مٹھوریں جوش سے ابل رہی ہیں۔ بارک اللہ! کیا روز برکت آثار ہے، کہ ہر در و دیوار فیض بار ہے۔ جمعہ رہ گم کردگان بادیۂ ظلمت کے لیے چراغ مراغ ہے۔ جمعہ عرفان کا پھلا پھولا باغ ہے۔

میاں آزاد ایسے مزے میں آئے کہ معاً چل کھڑے ہوئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بڑے بڑے

زہاد، اور مولانا بالعلم والفضل اولٰنا، اور قاضی و مفتی، شیخ و شاب، عمامۂ فضیلت برسر، اور قبائے معرفت در بر باجبہ و دستار بصد فخر و افتخار، چلے جاتے ہیں۔ چہرے سے نور الٰہی برستا ہے۔ اتنے میں دو رندان ساغر نوش بصد جوش و خروش، جن اور چڑیل کی باتیں کرتے ان کے قریب آئے۔ ایک لحیم و شحیم دوسرا لاغر۔

لحیم : یار تم تو مغز کے پھیچے، کے گودے کے کیڑے تک چاٹ گئے۔ بڑے بکی ہو۔ لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے مگر تمھیں تو کچے گھڑے کی چڑھی ہے۔ تم کب سب سننے والے ہو۔ مردِ آدمی یہ سب لغویاتیں ہیں۔ واللہ بنی ہوئی باتیں ہیں۔

لاغر : قبلہ مرد آدمی تو خواہ مخواہ آپ ہی ہیں۔ ماشاء اللہ صاحب تن و توش واللہ گینڈے بنے ہوئے ہو۔ یار کس چکی کا پیسا کھاتے ہو۔ موٹے آدمی تو بہت دیکھ ڈالے مگر واللہ ہے، جو ایسی کلائی ایک کی ہو۔ مٹاپا پھٹا پڑتا ہے، مگر استاد یاد رکھو:

اسپِ لاغر میاں بکار آید   روز میدان نہ گاؤ پرواری

جیسے تم بھدّے ویسی تمھاری عقل بھدّی۔

لحیم : بجا ہے پیر و مرشد! یونان کے حکما کا سرتاج تھیولز بھی بڑے تن و توش کا آدمی تھا۔ مگر اچھے اچھے حکیم اَریب اور علماے ادیب، اس کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے تھے۔ یہ بحث میں موٹے اور دبلے سے کیا واسطہ۔ اگر آپ بھوت پریت دکھادیں تو ٹانگ کے راستے نکل جاؤں۔

لاغر : ہاں۔ یہ دعوٰی بھی پرسوں ہی کا تذکرہ ہے کہ میرے ایک دوست نے آدھی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی۔ چوٹی تا بناف، اور چچے کا موباف۔ بال بال موتی پردیے ہوئے، یہ مسٹ مارنے پڑے رہے۔ منکے تک نہیں مگر آپ کہہ دیں گے جھوٹ ہے۔

لحیم : بھائی یہ سب غپ ہے۔ یہ واہمہ وہ بلا ہے جو صورت بناوے، اور سناوے، حس و حرکت دکھاوے، چلا پھرا دے۔ واہمہ خلّاق ہے۔ آپ کیا جانیں۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے آپ کی۔ اور میاں کروڑ باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بے دیکھے اس جانب نہ پتیائیں گے لوگ بات کا تبنگڑ سوئی کا بھالا۔ بدررو کا نالہ بنا دیتے ہیں۔ ایک صحیح تو ننانوے لغو۔ پتا کھڑ کا اور بندہ سرکا، اور آپ ایسے ڈھلمل یقین حضرات کا تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں، جو سنا فوراً تسلیم کر لیا۔ برہان و دلیل سے سروکار نہیں۔ رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھا، اور

روح فنا ہو گئی۔ کہ پریت جھانک رہا ہے۔ بولے اور ٹیٹو الیا۔ کلبلائے اور گلا دبوچا۔ ذرا ہلے اور شامت آئی۔ اندھیرے گھپ میں تو یوں انسان کا جی گھبراتا ہے۔ اور جو بھوت پریت کا خیال جم گیا تو ساری چوکڑی بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں سب بھول گئے۔ بلّی نے میاؤں کیا اور مرغ روح قفسِ تن سے پرواز کر گیا۔ چوہوں کی کھڑ بڑ سنی، اور بل ڈھونڈھنے لگے۔ اب جو چیز سامنے آئے گی پریت بن جائے گی۔ اس وحشت کے قربان میاں بندۂ درگاہ سب پاپڑ بیل چکے ہیں۔ کئی جن ہم نے اتارے کئی چڑیلوں سے ہم نے محلے خالی کرائے، جہاں دس جوتے کھوپڑی پر جمائے اور پریت نے بقچہ سنبھالا۔ میاں ہم جیتے جاگتے بھوت ہیں اور پڑھے لکھے جن۔ یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ کوئی ہم پر بلا وے تو جانیں، اور یوں گپ اڑانے کو کہیے تو ہم بھی بے پر کی اڑانے لگیں۔ یاد رکھو یہ عامل وامل، سب رنگے سیار ہیں۔ ع۔ روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر،، بندر نہ نچائے۔ مرغ نہ لڑائے، پتنگ نہ چھپکائے، بھوت پریت ہی جھاڑنے لگے۔ اتنا نہیں سوچتے کہ بھوت پریت، چڑیل برھم راکس، کو مانو تو پھر لونا چماری اور نٹ تیتا بیتا کی بھی بیعت لاؤ۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ لونا چماری کو کوئی بھی مانے گا۔ ارے غضب! ارے ستم!

لاغر: خیر اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ۔ چلیے ہمارے ساتھ یہاں سے کوئی دو تین کوس کے فاصلے پر گاؤں ہے۔ وہاں ایک صاحب رہتے ہیں۔ اگر آپ کی کھوپڑی پر ان کے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو گدھے کے پیشاب سے مونچھ منڈوا لوں۔ کہیے گا شریف نہیں چمار ہے۔ بس اب چلیے۔ دعویٰ بے دلیل کے مہمل ہوتا ہے۔ بندہ بدیہی ثبوت دے گا۔ آپ نے تو جہاں ذرا سی چڑھائی اور بس کہنا شروع کیا کہ سب پوچ۔ سب ہیچ۔ پیر و پیمبر۔ دیبی دیوتا۔ بھوت پریت۔ حور قصور، شیطان۔ خبیث، بہشت دوزخ تک کے آپ قائل نہیں لیکن آج ٹھیک بتائیے جائیے گا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں اس گاؤں کی طرف چلے۔ میاں آزاد تو دنیا بھر کے بے فکرے تھے ہی۔ شوق چرایا کہ چلو سیر دیکھ آؤ۔ اچھی دل لگی ہوگی۔ یہ بھی ان خیالاتِ دقیانوسی کے جانی دشمن تھے، اب کہاں تو مسجد جاتے تھے کہ نماز دوگانہ پڑھیں، کہاں چھو چھکے کے دیکھنے کا شوق ہوا۔ مسجد کو دور ہی سے سلام کیا، اور سیدھے سرا چلے۔ ارے کوئی اِکہ کرایہ کو ہوگا؟ کوئی اِکے والا ہے۔ ارے میاں کوئی بھٹیارا اِکہ بھاڑے کرے گا۔ جی ہاں کہاں کو جائیے گا۔ کہاں کو؟ سک جملدی پور۔ کیا

دیجیے گا؟ پہلے گھوڑا اکہ تو دیکھیں۔ گھر گھوڑا انخاس مول۔ وہ کیا کانی دار اکہ کھڑا ہے۔ اور یہ سرنگ گھوڑی ہے۔ ارے، توبہ! مریل، دبلی پتلی، ہڈی ہڈی گن لو، یہ تو کوئی نو دن میں اڑھائی کوس چلے گی۔ کون؟ یہ گھوڑی۔ واہ ہجور۔ ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے۔ بیٹھے اور دن سے پہنچے، واہ وا۔ گھڑیا کیا ریل کا انجن ہے کہ چلتے ہی الوپ انجن ہو جاتی ہے اچھا کسو چار آنے دیں گے۔ دھیلی کے پیسے لیں گے۔ میاں آزاد دوسری طرف چلے۔ پھر پلٹے اچھا پانچ آنے۔ ناہیں کھداوند! سات گنڈے سے کوڑی کم نہ لیں گے۔ اچھا کسو۔ اتنے میں میاں آزاد نے ایک صاحب سے پوچھا کیوں حضرت اس گاؤں کو "سک جملدی پور" کیوں کہتے ہیں؟ بندہ نواز اس کی بڑی داستان ہے۔

ایک صاحب تھے شیخ جمال الدین انھوں نے گاؤں بسایا۔ اور شوق چرّایا کہ اپنا پورا نام رکھ دیں۔ شیخ جمال الدین پورا نام رکھا۔ گنوار آدمی شیخ جمال الدین کیا جانیں انھوں نے شیخ کا سک اور جمال کا جمل، اور الدین کا دین کر دیا۔ اتنے میں اکے والے نے آواز دی کہ یکہ تیار ہے۔ میاں آزاد جلدی سے اکے پر سوار ہوئے۔ اور اکہ کھڑ کھڑاتا چلا۔ اثنائے راہ میں انھوں نے پوچھا کہ کیوں بھئی دن بھر میں کیا مل رہتا ہوگا؟ اے ہجور! اب رجگار کہاں، صبح سے شام تک جو ملا چر تدم پر ندم۔ دو ڈھائی آنے جنور کھا گیا۔ دو تین گنڈے گھر کے خرچ میں گئے دھیلے پیسے کا سلپھا تباخو اڑایا۔ پھر موچی کے موچی۔ مہاجن کے پچیس روپیہ چھ مہینے سے بیباک نہ ہوئے، اور جو کہیں کچی میں چار پانچ کوس لے گئے۔ تو پٹھیاں دھنس گئیں۔ سنسنی ہاں دھرے ورے انجر پنجر سب نکل گئے۔ دو چار کے ماتھے گئی۔ اور میاں رجگار تو تمھاری سلامتی سے تب ہو، جب یہ ریل اڑ جائے۔ اس نے سب رجگار لے ڈالے۔ اب آپ ہی نے سات گنڈے جملدی پور تک کے دیے۔ مل تین چکر لگا کر۔ یہ تو روجگار رہ گیا ہے۔ مل مل کے پیسہ نکلتا ہے۔ کوئی دو پونے دو گھنٹہ میں میاں آزاد سک جملدی پور پہنچے۔ پتا وتا تو ان کو معلوم ہی تھا۔ سیدھے چلے اور عامل کے مکان پر کھٹ سے داخل۔ اللہ اللہ بڑی بھیڑ ہے۔ خلقت ہے کہ امڈی چلی آتی ہے۔ عورت مرد ٹوٹے پڑتے ہیں۔ تماشائیوں کا تانتا لگا ہے۔ ایک آدمی سے انھوں نے پوچھا کیا آج یہاں میلا ہے؟ ناہیں میلا ویلا ناہیں۔ ایک نئی کے موڑ پر آج پریت آئے ہے، تونِ مہرار دنیسر د سب دیکھے آوت ہیں۔ ہاں ہے دل لگی۔ اس جھنڈ میں انھوں نے

اس لحیم شحیم آدمی کو ڈھونڈھ نکالا۔ جو دعویٰ کر کے آئے تھے کہ بھلا ہم پر تو کوئی پریت بلا دے اور تنہا ایک گوشے میں لے جا کر یوں کہا۔

آزاد : میاں، ہم اس وقت مسجد کے پاس تمھاری چہ میگوئیاں کان دھر کے سن رہے تھے۔ برب کعبہ جو آج تک ہم کبھی بھوت پریت کے قائل ہوئے ہوں۔ یار اب کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس عامل کی قلعی کھل جائے۔

لحیم : اور میں آیا کس فکر میں ہوں۔ آپ خاموش رہیں دیکھیے میں ابھی ابھی ٹھیک بناتا ہوں۔ ساری مشیخت کرکری ہو جائے تو سہی۔ آج ہی تو پھنسے ہیں چڈا اگل خیرو۔ ایسا دباؤں کہ چھٹی کا دودھ نکل پڑے۔ اب ہم ایک سے دو ہوئے۔

اتنے میں عامل صاحب عباسی تہ بند باندھے، لمبے لمبے بال بڑھائے، حنا کا تیل پڑا ہوا۔ چٹیاں جمی ہوئیں، مانگ نکالے، کھڑاؤں پہنے تشریف لائے۔ آنکھوں سے جلال برستا تھا۔ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھا وہی کانپ اٹھا۔ کسی نے قدم لیے کسی نے سر ٹیک کی۔ اور انھوں نے غل مچانا شروع کیا کہ دھونی میری جلتی ہے، جلتی ہے اور ملتی ہے۔ دھونی میری جلتی ہے۔ کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی لمبے گیسو والا ہے۔ لمبی زلفوں والا ہے میرا درجہ اعلیٰ ہے۔ جھوم جھوم کر جو انھوں نے ہانک لگائی تو حوالی موالی سب سناٹے میں ہو گئے۔ ایک دفعہ ہی با آواز بلند پکار اکہ کسی کو دعویٰ ہو تو آ کر کشتی لڑے۔ ہاتھی کو ٹکر دوں تو چنگھاڑ کر نوک دم بھاگے۔ (خم ٹھوک کر) آ! کون آتا ہے۔ اب سنیے کہ پہلے سے ایک شخص کو سکھا پڑھا رکھا تھا، وہ تو سدھا ہوا تھا ہی، جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ہم لڑیں گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک ڈنڈ پیل کشتی گیر مقابلے کے لیے کھڑا ہوا ہے۔ تین انچھ کی دبیز گردن گینڈا بنا ہوا۔ خدا ہی خیر کرے۔ مگر عامل کی وہ ہوا بندھی تھی کہ لوگ اس پہلوان کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔ کہ بیدھا ہے۔ عامل چٹکیوں میں زورِ سحر سے چُرمُر کر ڈالے گا۔

الغرض دونوں آمنے سامنے آئے۔ اور عامل نے گردن پکڑتے ہی زمین پر دے ٹپکا۔ وہ مارا کا دونگڑا برس گیا، اور پہلوان پندرہ منٹ تک بے ہوش بنا رہا۔ میاں آزاد نے لحیم سے کہا کہ یہ ملی بھگت ہے۔ اسی طرح گنوار معتقد ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا اجی میں ایسے مزدوروں کی قبر تک سے واقف ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میاں عامل نے پھر اکڑتے ہوئے ہانک لگائی۔ کوئی اور زور آزمائے گا؟ ! !

میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چٹ لنگوٹ باندھ دھم سے کود پڑے۔ آؤ استاد ایک ایک پکڑ ہم سے بھی ہو جائے، تب تو عامل صاحب چکرائے، کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ پوچھا آپ انگریزی خوان ہیں؟ آزاد نے کڑک کر کہا حضرت میں ہفت خوان ہوں۔ بس اب سنبھلیے میں آگیا۔ یہ کہہ کر گھٹنا ٹیک کر قلاجنگ کے پیچ پر مارا۔ چاروں شانے چت۔ عامل زمین پر دھم سے گرے۔ ان کا گرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب بتاؤ بچا کاٹ لوں ناک؟ کتر لوں کان؟ باندھوں دم میں نمدا، ہات تیرے کی عامل بنے ہیں۔ لحیم نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اٹھا لیا۔ واہ استاد کیوں نہ ہو۔ میاں عامل کی ساری شیخی خاک میں مل گئی۔ گنواروں کا عقیدہ جاتا رہا۔ بیچارے کو اسی دن گاؤں چھوڑنا پڑا۔ صحرائے دشت نوردی کے گرد و ذی جودت و قار میاں آزاد اس رنگیے سیار عامل کو پٹخنی بتا کر اور گاؤں کے ڈھلمل یقین گنواروں کو سیدھے ڈھرے پر لگا کر میاں لحیم فہیم کو ساتھ لے ہاتھ میں ہاتھ دے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اسی عامل کی باتیں مزے مزے کی چہ میگوئیاں کھلی بازیاں، ٹھٹھے ہوتے جاتے ہیں۔ کیوں سچ کہنا کیسا اڑنگا دیا بہت بلبلا رہے تھے چڈا:

سمجھے تھے اب میرا کوئی سرکوب ہی نہیں　　فرعون کے لیے کوئی موسیٰ نہ آئے گا

یہاں استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ پور پور میں پھبتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک پیچ کے دو دو سو توڑ یاد ہیں۔ گھنٹوں لڑوں، ہانپنے کا نام نہ لوں۔ ممکن کیا کہ دم ٹوٹے لڑتے کا تو کینڈا ہی اس کا نہ تھا۔ گردن موٹی نہیں، چھاتا چوڑا نہیں، بدن کٹا پٹا نہیں کان ٹوٹے نہیں، چتونوں سے تاڑ گیا کہ گھامڑ ہے۔ گردن پکڑتے ہی چرمر کر ڈالا۔ مارا چاروں شانے چت دھڑ سے زمین پر گرا۔ ارارا دھوں۔ بہت بلون پر تھے۔ بچہ جی۔ عامل کی دم بنے تھے یاد ہی تو کرتا ہو گا۔ قسم حسینؑ! کی جوان باتوں کی ذرا بھی اصلیت ہو۔ کیسا پریت؟ کس کا بھوت، کہاں کی چڑیل۔ سب ڈھکوسلا، سب گپ، مگر خلقت بھی کیا بھیڑیا دھسان ہے۔ سن لیا چاہیں بس فوراً ایمان لائیں۔ اور سنیئے ایک مرتبہ ایک بنے ہوئے سدھ پلتھا مار کر بیٹھے، اور لگے بنکارنے کہ کوئی چھپا کر ہاتھ میں پھول لے، ہم چٹکیوں میں بتا دیں گے۔ آگ لگ گئی، واللہ! شعلے بدن سے نکلنے لگے۔ میں نے کہا اچھا ہم نے پھول لیا۔ آپ بتائیے تو سہی۔ پہلے تو آنکھیں نیلی پیلی کر کے مجھے ڈرانے لگے۔ میں نے کہا میاں

پھل کے ناخن لو، میں ان گیدڑ بھپکیوں میں نہ آنے کا۔ یہ پتلیوں کا تماشا کسی نادان کو دکھاؤ۔ لے بتاؤ بس بتاؤ۔ تھوڑی دیر سوچ ساچ کر بولے: زرد پھول ہے۔ میں نے کہا کہیں ہو نہ زرد اتنا کہنا تھا کہ کہاں پھول کا رنگ زرد بتاتے تھے کہاں خود حضرت کا چہرہ زرد ہو گیا۔ رنگ فق۔ ع "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" پھر گھبرا کر فرمایا کہ ارے دھو کا ہوا سبز پھول ہے۔ میں نے کہا واہ بھئی لال بھبکڑ کیوں نہ ہو۔ بھینس نہ کودی کودی گون، یہ تماشا دیکھے کون۔ ہرا پھول آج تک دیکھا نہ سنا۔ ایں گل دیگر شگفت۔ اچھا شگوفہ چھوڑا۔ واللہ یہ نیا گل کھلا۔ واہ چھچھئی۔ میرا اس قدر کہنا کہ ان کا گلاب سا چہرہ کمھلا گیا۔ میری باتیں کانٹے کی طرح چبھنے لگیں۔ اور ادھر۔ لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ واللہ کوئی اس وقت ان کی بے کلی دیکھتا اور میں جامے میں پھولے نہ سماتا تھا۔ غنچے کی طرح کھلا جاتا تھا۔ ان باتوں سے انھیں ایسا خار ہوا کہ بگولا بن کے وہاں سے پٹّا توڑ بھاگے۔ لچیم نے کہا استاد واللہ باللہ ایک تم کو اپنا ہم صفیر ہمدرد پایا۔ یار ہم بھی یہ سب معرکہ جھیلے ہوئے ہیں، سب کھیل کھیلے ہوئے ہیں۔

سنیے ایک دفعہ ایک صحبت میں جانے کا اتفاق ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، کہ ایک نیم مُلّا خطرۂ ایمان، لسان الغیب[1] بنے بیٹھے ہیں۔ اور اچھے اچھے تربیت یافتہ ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ پوچھا آپ کی تعریف کیجیے۔ ایک صاحب نے جو اس مزوّر کا ایمان لا چکے تھے، دبے دانتوں کہا: شاہ صاحب غیب دان ہیں۔ آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دس پانچ نے تو ان کو آسمان ہی پر چڑھا دیا۔ میں نے کہا تو رندجو اسے جھنڈے ہی پر نہ چڑھاؤں۔ پوچھا کیوں شاہ جی صاحب قبلہ، یہ تو بتائیے کہ ہمارے گھر میں لڑکا کب تک ہو گا؟ شاہ جی سمجھے کہ یہ بھی نرے چونگا ہی ہیں۔ چلو اناپ شناپ بتا کر چونگا کر دو، اور کچھ لے مرو۔ میرا اور میرے باپ دادا اور ان کے باپ کے پردادا کا نام پوچھا۔ یہاں حافظے کی یہ کیفیت ہے کہ باپ کا نام تو اکثر یاد بھی رہتا ہے، دادا جان کا نام کس ملعون کو یاد ہو، مگر خیر جو زبان پر آیا الول جلول بتایا۔ تو حضرت فرماتے کیا ہیں۔ بچّہ دو مہینے کے اندر ہی اندر بیٹا لے۔ ہائیں! شاہ صاحب قبلہ ذری سنبھلے ہوئے۔ اب تو کہا اب نہ کہیے گا۔

---

[1] لسان الغیب۔ خواجہ حافظ شیرازی کا لقب ہے۔ لوگ دیوان حافظ میں فال دیکھتے ہیں اور اپنے مستقبل کا حال اور غیب کی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ اسی لیے حافظ۔ اس لقب سے مشہور ہیں۔

دیکھیے میں بتائے دیتا ہوں۔ کیا خوب آپ اچھے ملے۔ اجی حضرت کچھ خیر ہے۔ پندرہ دن تو بندے کی شادی کو ہوئے اور آپ فرماتے ہیں دو مہینے کے اندر ہی اندر لڑکا لے۔ واللہ دوسرا کہتا تو خون پی لیتا۔ اس فقرے پر یار لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ کمرہ گونج اٹھا۔ اور شاہ جی کے آئے حواس غائب ہو گئے۔ دل میں تو کروروں ہی صلواتیں سنائی ہوں گی۔ اے حضرت! کیا عرض کروں، اس جوار میں لوگ انھیں معاذ اللہ خدا سمجھتے تھے۔ شاہ جی کبھی روپیہ برساتے تھے، کبھی بے فصل کا میوہ منگاتے تھے۔ کبھی گھڑے کو چکنا چور کر کے پھر ثابت کر دکھاتے تھے۔ غرض کہ سیکڑوں ہی اسیٹھین یاد تھیں۔ مگر میاں میرے سامنے تو ایک نہ چلی۔ نام سُنا تو ہکّا بکّا ہو گئے۔ صورت دیکھی اور تھرا اٹھے۔ جیسے شاہ چور سے اور سانپ مور سے ڈرے۔ میاں آزاد نے مسکرا کر کہا کہ واللہ شاہ اور چور کی اچھی تشبیہ دی۔ بھئی سنو آزاد! ہم گنوار آدمی تین پانچ تو جانتے نہیں۔ ہمیں بات کرنا کیا آئے۔ یار ہم تو دوست کے دوست ہیں، مگر ایسے قابو چیون کے البتہ دشمن ہیں۔ جہاں میں ہوں بھلا کسی سدھ یا شاہ جی، یا عامل کا رنگ جم تو جائے، کیا مجال۔ رگید رگید کر اور کھدیر کھدیر کر ماروں۔ ادمرا کر دوں تو، وجہ کیا میں تو زمانہ بھر کا نیاریا، چھٹا ہوا شہدا، ایک ہی کائیاں ہوں نہ۔ مجھ سے اڑ جائیں گے کہاں۔ نیچے پاتال تک کی تو خبریں لاؤں، اوپر آسمان میں تھگلی لگاؤں، مجھ پر بھلا وہ بیچارے کیا ہاتھ صاف کریں گے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک صاحب نے پوچھا کہ کیوں پیر و مرشد آپ انگریزی پڑھے ہیں؟ میاں آزاد نے کہا جی ہاں! کچھ شُدبُد جانتے ہیں آپ اپنا مطلب کہیں۔ یا حضرت ایک دوپٹی عرضی کا ترجمہ منظور ہے۔ میری ہفتاد پشت پر احسان کیجیے، اس کو فصیح انگریزی میں خوب نمک مرچ لگا کر لکھ دیجیے۔ نمک مرچ! نمک مرچ لگانا میں کیا جانوں۔ یہ کسی گول گپے والے سے کہیے۔ بندے نے کالج میں یہ علم پڑھا ہی نہیں۔

مصاحبت

ہمارے ندیم با فرہنگ، ہم سنگ دانایاں فرنگ، والا نژاد، فرخ نہاد، میاں آزاد کڑی کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے، اور سیدھے ریل کے اسٹیشن پر پہنچے۔ لگے

پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے۔ پل مارنے کی دیر ہوئی تھی کہ سامنے سے نور کا بکا نظر آیا۔ چکاچوند کا عالم تھا۔ ان کے کان کھڑے ہوئے کہ ایں گل دیگر شگفت۔

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اغل بغل، مشعلِ دستی روشن، اِدھر اُدھر مصاحبین رفقا خوشامد خورے، لیمو نچوڑ بیچ میں ایک امیر کبیر رئیس ابن رئیس، بڑے ٹھسّے سے آرہے ہیں۔ ہٹو بچو دور باش واداب کی آواز بلند ہے۔ سب کے پہلے اس جھنڈ کی نظر میاں آزاد پر پڑی، جو ہے انھیں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ یہ اس وقت وحشت میں جو آئے تو اور بھی ڈبل چال چلنے لگے۔ رئیس کے مصاحبین سب حاضر جواب، تیز طبیعت، زبان دراز، فقرہ باز، ٹھٹھول، ضلع جگت میں طاق، پھبتی کہنے میں مشّاق، آوازہ کسنے میں شہرۂ آفاق تھے۔ پھبتی نہ کہیں تو ذہن کند ہو جائے۔ ایک نے کہا حضور دیکھیے گا یہ فرنگی بھی واللہ عقل کے پتلے ہیں۔ آسمان میں انھوں ہی نے تھگلی لگائی۔ ذری دیکھیے تو بے پڑی کے چھوٹا موٹا انجن چبوترے پر چلا دیا۔ دوسرا بولا خدا کی قسم کیا لاگ ہے۔ تیسرے صاحب نے فرمایا خداوند یہ چلتا پرزہ ہے۔ چوتھے ماشاء اللہ! ذری اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے گا۔ یہ احتباس، یہ گرمی، اور آپ سیاہ بانات کا دگلا ڈاانٹے گھوم رہے ہیں۔ پانچواں بادۂ انانیت کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔ چھٹا یہ سر ہے یا دھیلے والا کدو، یہ توند ہے یا بانگر مؤ کا تربوز۔ ساتواں ماشاء اللہ کیا چہرہ نورانی ہے۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ پھبتیوں کا گراب ہی پڑنے لگا۔ جسے دیکھوئی سناتا ہے۔ جو ہے وہ بناتا ہے، تو پر پرزے جھاڑ کر یہ بھی جواب ترکی بترکی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ جیسے ہی ایک مصاحب نے کہا کہ ماشاء اللہ کیا چہرۂ نورانی ہے۔ میاں آزاد تڑ سے بول اٹھے واللہ اچھا غولِ بیابانی ہے۔ اب تک تو سیار اور سگ زرد برادر شغال ہی دور دور سے ہو ہو کیا کرتے تھے، اب برمھ راکس بھی اسٹیشن پر آنے لگے۔ میں تو اس روشنی ہی سے تاڑ گیا تھا۔ کہ غول بیابانی ہے۔

مصاحب : اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔

رفیق : اس کالی بانات کے دگلے پر مجھے دھوکا ہوا کہ کسم کے کھیت سے بندیلا نکل آیا۔

لیمو نچوڑ : ع۔ سب صورت لنگور ذرا دم کی کسر ہے۔

میاں آزاد نے اس کا مصرع اولیٰ پڑھ دیا۔ ع لاحول ولاقوۃ یہ کون بشر ہے، ایک اور صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا: اسمِ نامبارک۔ میاں آزاد نے کہا آپ مزاجِ پلید؟ دوسرے نے قہقہہ لگا کر کہا کس کھیت کے ہو۔ یہ بولے بھیڑیے کے بھاٹے سے کب نکلے بھئی؟ رئیس کو میاں آزاد کی باتیں ایسی بھائیں کہ پاس بلوا لیا۔ حضرت آپ اس وقت چونکھ لڑ رہے تھے یہ آپ ہی کا کام ہے۔ میاں آزاد جھک کر ایک فراشی سلام بجا لائے۔ رئیس با توقیر تو امیر کبیر تھے ہی جس سے خوش ہوئے دم کے دم میں نہال کر دیا۔ فرمایا کہ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہا کیجیے۔ خانۂ احسان آباد، بہت خوب ہمراہِ رکاب ہوں۔ جہاں حضور کا پسینا گرے میں خون گراؤں، کوئی تیکھی چتون سے دیکھے تو آنکھیں پھوڑ ڈالوں۔ مصاحبوں کو میاں آزاد کا نوکر ہونا کانٹے کی طرح کھٹکا۔

ایک : (دبے دانتوں) پیر و مرشد! استخارہ تو دیکھ لیں واجب آئے تو کیا مضائقہ۔

دوسرے : (جل بھن کر) خداوند! بے سمجھے بوجھے کیوں کر یہ رکھ لیے گئے۔ خدا جانے چور ہیں، اچکے ہیں، خونی ہیں، یہ ہیں کون بلا' اور یوں صورت سے تو مرد آدمی سب ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر کسی کے دل کا حال کیا معلوم۔

تیسرے : بیشک کیا چوٹٹوں کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔

چوتھے : حضور والا! یہ ایک دفعہ جعلی دستاویز بنانے کی علّت میں ماخوذ ہو چکے ہیں۔

پانچویں : اجی یہ تو برف بیچا کرتے ہیں۔ مگر واللہ اچھا نقشہ جمایا۔

چھٹے : خداوند ان کے چشمِ ازرق پر نظر ڈالیں یہ عین دلیل طوطے چشمی کی ہے۔

ساتواں : ناصاحب ان کا یہاں کہاں ٹھکانا۔

میاں آزاد سب کی ہا تک سن کر بولے: پیر و مرشد یہ سب چوٹٹے اٹھائی گیرے ہیں۔ جانبازوں میں بندہ درگاہ ہی ہیں۔ اچھا ایک کام نہ کیجیے اسٹیشن پر کوئی کام بتا دیجیے۔ دیکھیے کون حسنِ لیاقت سے انجام دیتا ہے۔

مصاحب : تو آپ تو ریل کے خلاصیوں میں کام کر چکے ہیں، آپ سے اس میں کون بھڑے۔

آزاد : اچھا حضور عروض میں کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھیے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔

اتنے میں ایک مصاحب نے جھلّا کر کہا: ابے واہی ہوا ہے۔ ٹیں ٹیں لگائی ہے۔

کہیں میں ایک گدّا نہ دوں۔ حضور کو بھولا بھالا سادہ مزاج دیکھ کر بہت چل نکلا ہے۔ چل الگ ہٹ۔

پری رخوں ہی کی میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں
میں ڈر نہ جاؤں گا آنکھیں دکھائیے نہ مجھے

میاں آزاد۔ یہ گیدڑ بھبکیاں! اے کیوں نہ ہو۔ شان خدا۔ آپ اور ہمیں گدّا دیں۔ سن او گاودی ہم گدّا کھانے والے نہیں کیا کہوں، ایک رئیس کے مصاحبوں میں نہ ہوتا تو اسی دم گردن ناپتا۔ مگر کل تم کو ٹھیک بناؤں گا۔ اس میں ایک اور رفیق نے ڈپٹ کر کہا، آپ ہیں کس بھکوئے رئیس کے مصاحب؟ میاں آزاد نے کہا دیکھیے خداوند نعمت! ایسے مصاحب ہیں حضور کے، ایک تو حضور کے سامنے گدّا دینے پر آمادہ ہیں۔ دوسرے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ تیسرے نے آپ کے دشمنوں کو بھکوا بنایا۔ چوتھے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے آقا بھولے سادے آدمی ہیں۔ اب کون نہیں جانتا کہ بھولا اور سادہ اس زمانے میں گاودی، احمق، گھامڑ سے مراد ہے۔ لاحول ولا قوہ۔ رئیس کو یہ کلمے ایسے بُرے معلوم ہوئے کہ فوراً مصاحبوں کو للکارا جس نے بھکوا کہا تھا وہ تو کھڑے کھڑے موقوف ہوا۔ کیوں بے نمک حرام! یہ کیا بات چیت تھی۔ جس کا نمک کھائے اسی کو بھکوا بتائے۔ ابھی موقوف۔ ان کو نکال دو۔ میاں آزاد نے (بہت خوب پیر و مرشد) کہہ کر ان کو تو اسٹیشن کے باہر نکالا۔ اب ان کی شامت آئی جو سادہ مزاج بتاتے تھے۔ کیوں بے مردک ہم احمق ہیں؟ بھولے ہیں؟ گدھے ہیں؟ ابھی دور ہو سامنے سے، اگر ڈیوڑھی پر آیا تو رئیس نے تو کہا ہی تھا کہ میاں آزاد نے فقرا پورا کر دیا تو وہ بے بھاؤ کی پڑیں گی بچّہ کہ سر پر ایک بال بھی نہ رہے گا۔ رئیس نے پوچھا کوئی ہے! حاضر پیر و مرشد، کہہ کر آزاد نے ان کی بھی گردن ناپی اور اسٹیشن سے بدر کیا۔ خبردار جو ڈیوڑھی پر آیا تو تو جانے گا۔ اب ان حضرت کی باری آئی جو گدا دیتے تھے۔ ہاں جی کیا تم نے کہا تھا؟ ذرا پھر تو کہنا۔ گدا دوگے؟ میری طرف دیکھو! گدا دوگے اللہ اللہ، اب آپ اتنے ہو گئے۔ کہ جس کو ہم نوکر رکھیں، اس کو آپ گدّا دیں۔ ہٹ سامنے سے۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ سب کے سب کا موقوف ہونا اچھا نہیں، تو کس مزے سے کہتے ہیں۔ اے خداوند! ان سے مجھ سے مذاق ہوتا ہے جانے دیجیے۔ دیکھو جی تم کو رئیسوں کی ابھی صحبت نہیں رہی ہے۔ کوئی اپنے آقائے نامدار کے سامنے ایسا کلمہ منھ سے نکالتا

ہے لے اب خطا معاف، اور کدورت صاف کراؤ، ہاتھ جوڑ د، قدموں پر ٹوپی رکھو۔ بیچارے نے ناچار ہاتھ جوڑے، اور کانپتے ہوئے کہا خداوند قصور ہوا۔ از خرداں خطا واز بزرگان عطا۔ اب سنیئے! کہ میاں آزاد نے کہا چلیے حضور ہوٹل گھر دکھادوں۔ رئیس گردوں مدار مع مشعل دستی ورفقا چلے، تو آزاد نے کہا حضور اگر میرا کہنا مانیں تو اس غٹ کے غٹ کو ساتھ نہ لے چلیں۔ ان لوگوں کو حکم دیجیے کہ باہر جہاں لکڑ والا بیٹھا ہے۔ وہاں ٹھہریں، اور دستی گل کردی جائے۔ حضور تشریف لے چلیں۔ کمترین ہمراہ رکاب ہو اور ایک خادم باادب بس ادھر رئیس مع میاں آزاد مصاحبِ خاص اور خادم باادب کے ہوٹل کی طرف چلے ادھر مصاحبین میں ہنڈیاں پکنے لگیں۔ واہ بھئی واللہ ہم سمجھے تھے کہ ہم ہی زمانے بھر کے فقرہ باز ہیں مگر یہ ہمارے بھی چچا نکلے۔ آدمی کیا بلائے بے درمان ہے۔ یہ وہ کالی ناگن ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اجی سونگھ جائے تو انسان ٹیں کرکے رہ جائے۔ ارے یار ہم جانتے تو اس بدبخت پر آوازے ہی کیوں کستے۔ کیا کہیں۔ شدنی۔ شدنی۔ دیکھو واللہ، چٹکیوں میں رنگ جمایا۔ آتے ہی کھڑے کھڑے دو کو نکلوا دیا۔ اور تیسرے کی خطا معاف کرائی۔ ایسے دخیل ہوگئے۔ اور سنیئے کس فقرے سے ہم سب کو اس وقت ٹہلایا، اور لکڑ والے سے مصاحبت گرمانے کا حکم دلوایا۔ ہات تیری دم میں موٹا سا رسّا باندھوں، مصاحب خاص بنے ہیں۔ چڈا۔ یار و بے ڈھب ہوئی۔ اب اس مردود کا نکلنا مشکل ہے۔ اس پر فقرہ چلنا سخت دشوار ہے۔ پرلے درجے کا مکّار طرّار عیّار ہے۔ واللہ ہنسی آتی ہے۔ جی تو آپ کو ہنسی آتی ہوگی۔ ہماری روح تو رو رہی ہے۔ بھلا ہنسی کا یہ کون موقع ہے جس طرح دودھ سے مکھی نکالی جاتی ہے۔ اس طرح ہم آپ برسوں کے رفیق نکال دیے گئے۔ کٹ جانے کا مقام ہے۔ لیجیے اس ملعون نے خدا اسے غارت کرے! آتے ہی دستی گل، دو مصاحب غائب۔ خود مصاحب خاص الخاص بن بیٹھے۔ اب کوئی ایسی فکر کرنا چاہیے کہ اب یہ جمنے نہ پائیں۔ ہم بتائیں۔ مشہور کردو کہ یہ بوچڑ ہیں، نیچ قوم۔ ہمارے حضور کو اس کا بڑا خیال ہے۔ بھئی جو ابھی موقوف نہ کردیں تو ہاتھ کٹاتا ہوں۔ ناک ناک بدتا ہوں۔ واللہ بوچڑ کی خوب سوجھی مگر کہے کون؟ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو لگادو۔ اُدھر رئیسِ خورشید کلاہ کو آزاد شیخو خیست پناہ نے ہوٹل دکھایا۔ لمونیڈ کا ایک جام پلایا، اور خراماں خراماں اسٹیشن کے باہر سیر کرانے لائے۔ مصاحبوں نے دیکھا کہ مصاحبِ خاص سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے

آتے ہیں۔ ایک شخص کو پہلے ہی سے سکھا پڑھا رکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر آوازہ کسا کہ واہ رے زمانے کے الٹ پھیر:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر یالاں   طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بنیم

شریف بیچارے تو نکالے جائیں اور قوم کے بوچڑ رئیسوں کی مصاحبت پائیں۔ اتنا سننا تھا کہ رئیس کے کان کھڑے ہوئے۔ ان کو نیچ قوم خصوصاً بوچڑوں سے بہت نفرت تھی۔ فوراً میاں آزاد سے بیساختہ پوچھ بیٹھے کہ کیا آپ بوچڑ ہیں۔ اتنے میں ایک مصاحب چلا اٹھے کہ حضور نہیں تو اور ہیں کون؟ دوسرے نے موقع پا کر کہا: ابھی کل تک تو کلیجی بیچتے تھے، آج حضور کے مصاحب خاص ہوئے۔ ایازؔ قدرِ خود بشناس، کیا مزے سے گر مار ہے ہیں۔ گوشت بیچتے بیچتے عمر گزر گئی۔ اب باتیں بناتے ہو۔ اور رئیس زادوں کو بہکاتے ہو۔ اب میاں آزاد حیران ہیں کہ یہ سر دست اچھی بٹی۔ خوب پچھاڑا۔ کیا دل گروہ ہے کہ کلہ بکلہ بوچڑ بنا رہے ہیں۔ الغرض میاں آزاد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مصاحبین کا داؤں چل گیا۔ میاں آزاد بیچارے بوچڑ بنا کر نکالے گئے۔ اور مصاحبین نے کہنا شروع کیا۔ کہ حضور تو اس بوچڑ والے کے دم میں اچھے آگئے۔ ہم برسوں کے جان نثار، پشت ہا پشت کے نمک خوار ٹکڑوالے کے سپرد کئے گئے اور وہ حضور کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی سیر کر رہا تھا۔ صاحب لوگوں نے دیکھا ہوگا تو کیا کہا ہوگا، کہ یہ امیر آدمی اور بوچڑ کے ساتھ ہوا کھا رہے ہیں۔ الٰہی توبہ! الٰہی توبہ!

کیا کمال ہے

زعفرانِ کشمیر کوچہ گردی، گیسوئے غدارِ دشت نوردی۔ دبستانِ جنون کے مسلّم الثبوت استاد، میاں آزاد۔ ایک روز بادۂ طرب کے نشہ میں چور، سرخوش و مخمور، تور کے تڑکے سبزانِ چمن اور خوبرویانِ گلشن کا جوبن لوٹتے چلے جاتے تھے۔ ہر سمت باغ و بہار

ؔ ایاز سلطان محمود غزنوی کا خوبصورت غلام تھا۔ محمود کو اس سے بے حد محبت تھی۔ نہایت عقل مند تھا۔ شعراء فارسی و اردو اکثر عشق محبت کے جذبات و واردات کے اظہار میں ایاز کا ذکر محمود کے معشوق کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

انفاس نسیم سحری عطر بیز و عنبر بار، آب جوئبار کا جھلکنا، مرغانِ خوش الحان کا چہکنا، غنچوں کا پیاری ادا سے چٹکنا، چکور کے قہقہے، بلبل کے چہچہے، ابر کی اٹھکھیلیاں، برق کی بیتابیاں، سبزے کی لہک، کلغی کی دمک سے فلک الافلاک پر دماغ تھا۔ سینہ فرطِ مسرت سے باغ باغ تھا۔ ایک دفعہ ہی چاروں طرف سے ابرِ تند و پرشور گھر آیا۔ فیلِ مست کی طرح جھوم جھوم کر گھٹا آئی۔ اور سیرِ باغ کی کیفیت دہ چند بڑھائی۔ پہلے تو ٹپ ٹپ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں، اور پھر چشم زدن میں رِم جھم موسلا دھار دونگڑا برس پڑا۔ آسماں برابر محیط ناپید اکنار اور سحاب پر میر بحر کا دھوکا ہوتا تھا۔ اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ ٹہنیاں پھٹ پڑیں۔ ادھر برق نے چشمک زنی کی، ادھر رعد گرجنے لگا۔ پتے جلترنگ بجاتے تھے۔ سارنگ گاتے تھے۔ کالی کالی گھٹائیں، لال لال انگار اسی بجلی کا لوتکنا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی حبشی کے جسم سے خون کے شراٹے بہ رہے ہیں۔ یا کسی گنوارن نے مانگ میں سیندور بھرا ہے۔ یا سونا کسوٹی پر کسا ہے۔ میاں آزاد ایک دکان میں دبکے دبکائے بیٹھے تھے۔ جب پانی کسی قدر کھل گیا اور سبزے کا غبار دھل گیا، تو میاں آزاد خراماں خراماں چلنے لگے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک یورپین معزز سوداگر ایک گل عذار کو بغل میں بٹھائے، برانڈی کے نشے میں دکرٹی دوڑائے زن سے نکل گیا پھر دور ہوا ءِ صبا رفتار ایک اسپ پاریختہ پر فرانسیسی ساز، اور دوسرے گلگون آہو شکار پر، ایک خاتون زہرہ جبین، کڑکڑاتے اور چمکاتے چلے جاتے ہیں۔ ایک جنٹلمین تاجر باوقار، زن جمیلہ طرح دار کو ساتھ لیے ہاتھ میں ہاتھ دیے، یہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے، وہ ناز و ادا سے قدم دھرتے میاں آزاد کے قریب سے نکلے۔ زن حسین و مہ جبین کی زلف پرشکن مشکبار ہے۔ الٰہی یہ زلف ہے یا عرق بہار یا فتنۂ روزگار۔ سامنے سے تین چار لیڈیاں غنچہ دہن سیم تن، ہم جولیوں سے چہل کرتی اٹھلا اٹھلا کر آ رہی ہیں۔ ادھر ایک عالیشان و سپہر توامان کوٹھی میں تین جنٹلمین، پیارے پیارے اونچے سروں میں کچھ الاپتے ہیں۔ اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک احاطۂ دلکشا اور فرح بخش میں چار پانچ لڑکے اور لڑکیاں سبزہ زار پر بہار پر اچک پھاند میں مصروف ہیں۔ میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ بہار عمر انھیں کو حاصل ہے۔ زندگی کے مزے یہی لوٹتے ہیں۔ کہیں باجا بج رہا ہے۔ کہیں گانا ہوتا ہے۔ کوئی بگھی پر ہوا کھاتا ہے۔ کوئی پیدل جاتا ہے۔ اس سہانے وقت اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں اور پھولوں کی بھینی بھینی مہک کی یہی داد دیتے ہیں۔ نوعروسان چمن کا جوبن دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ میاں بیوی خوش و خرم، خنداں و فرحاں،

تر دماغ و غزل خوان، یہ اس پر عاشق، وہ اس پر مفتون۔ ع " نی غم دزدنی غم کالا" سچی خوشی اسے کہتے ہیں۔ اب شہر کی طرف پلٹے تو بولے بد دماغ میں آنے لگی۔ کوئی پڑا سو رہا ہے، کوئی اپنی قسمت کو رو رہا ہے۔ ایک شخص نے ذرا سی بات پر اپنی بیوی کی کمر پر ایک لات کس کے لگائی اور پھر ایک چھڑی جمائی، اور دے گی۔ حلوائی اور حلوائن، نانبائی اور اس کی بیوی میں جوتی پیزار۔ نند بھاوج میں گل خپ اور تکرار۔ دیورانی جٹھانی میں مار دھاڑ۔ پٹوے اور پٹودن میں گالیوں کی بوچھار ہو رہی ہے۔ جس گلی کوچے میں نکل جاتے ہیں شورِ محشر بپا ہے، اور چو طرفہ سے یہی آواز آتی ہے کہ تڑ کا ہوا' اور لڑنے لگے۔ صبح صبح آدمی رام کا نام لیتا ہے۔ خدا کی یاد کرتا ہے۔ پیر پیغمبر کو مناتا ہے۔ یہ نہیں کہ تڑکے تڑکے جوتا چلنے لگا۔ خیر یہ تو نیچ قوموں کی بات چیت تھی۔ اب شرفاء کا حال سنیے! کوئی تو دروازے پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ کوئی لمبی تانے پڑے خرّاٹے لے رہا ہے۔ کوئی بیوی کو ڈپٹ رہا ہے۔ کوئی لہسن پیاز گوشت کی فکر میں ہے۔ اور کہیں میاں بیوی میں چیخ چل رہی ہے۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں افسوس کیا، کہ واہ رے ہم، اور ہمارے شغل۔ کجا وہ سجے سجائے بنگلے۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں، وہ پیاری پیاری ادائیں، وہ اودی گھٹائیں، آبی لباس کی جھلک، وہ مل جل کر گانا، وہ مزے مزے سے باجا بجانا، وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ چمن اور روشوں میں اٹھلانا، کجا یہ جنون خیز گلیاں۔ یہ وحشت انگیز کوچے، یہ عفونت بیز ہوا۔ یہ کیچڑ، یہ جوتی پیزار، یہ میاں بیوی میں تکرار، جسے دیکھیے گھر سے باہر نکلتا ہی نہیں جانتے۔ کوئی مُردوں سے شرط کر کے سویا ہے۔ کوئی انگڑائیاں لے رہا ہے۔ کوئی کروٹ پر کروٹ بدلتا ہے۔ ع " ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا" اتنے میں میاں آزاد ایک مکتب کے قریب پہنچے۔ بیس بائیس لڑکے جھوم جھوم کر بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ اور ایک کمسن طالب علم کو مولوی صاحب یہ پڑھا رہے ہیں۔

آں عشوہ "گر کرشمہ سنج "شیوۂ ساحری بکار بردہ وشعبدۂ ساحری آشکار کردہ مرآتے از بغل بر آوردہ درویش بمرکب اندودہ در محاذی آں بیدل لمحہ گذاشت۔ دیر گے چند از نار در آب ریختہ گفت: منزل من حصنی ست حصیں وحصاری ست بلند چوں چرخ بریں کہ در ہوائش پرواز گم کند۔ وسیمرغ در نیمہ راہش، بال مجال بریزد ہر زہ ہیونِ ہوس بسوی اجل میتازد۔ بیہودہ بکامِ نہنگ گام منہ۔ عبث باد پیمائے بادیۂ جنون مباش۔ وچوں مجنوں

بزنجیر رسوائی سر در مکن، کہ ذرہ بفرق خورشید دست نتواند زود۔ پشہ بر بام آسماں نتواند برید۔ ایں بگفت در راہِ منزلِ خود پیش گرفت۔ زرگر کہ خدنگِ دوز عشق آں جادو فطرت، ماہ فریب، تا سوفار در دل نشستہ بود۔ بر خاک بے قراری بر افتاد۔ میاں آزاد کے کان کھڑے ہوئے کہ ایں! یہ تو بہار دانش ہے۔ آگے بڑھ کر علیک سلیک کے بعد مولوی صاحب سے پوچھا: کہ جناب مولانا صاحب آپ کیا درس دے رہے ہیں۔ فرمایا بہار دانش کا سبق پڑھا رہا ہوں۔ کیا بہار دانش؟ اور مکتب میں؟ افسوس! کہیے بیدِ پنجم بھی پڑھایا؟ جی دو لڑکے تو ملک زادۂ ختن اور عشق مہر بانو کا سبق پڑھتے ہیں۔ اور ایک نے ابھی کوئی چالیس صفحہ تک پڑھا ہے۔ مولوی صاحب کیا بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ گردن پیرانہ سالی کے سبب سے ہلنے لگی، مگر ابھی تک عقل نہ آئی۔ یا یوں کہوں کہ آپ سٹھیا گئے۔ اے قبلہ! بھلا یہ کتاب اس لائق ہے کہ مکاتیب میں تعلیم دی جائے۔ سن شریف شصت وشش نازم باین ریش وفش۔ اسمیں کہیں عشقِ جنون خیز کا قصہ، کہیں بتانِ جادو فطرت کا فسانہ، کہیں گل فروش خونیں نگاہ کا ذکر، کہیں معشوقوں کی کج ادائی، کہیں عورتوں کی بے وفائی کا مذکور، یا جادوگروں کی حکایت، دیو اور جن کی شکایت ہے۔ از سرتا پا فحش، بلکہ افحش الافحاش۔ کم سن طلبہ کے دل پر اس کے مطلب کا کیسا خراب اثر ہوگا۔ حضرت از برائے خدا اس کتاب کو نہ پڑھائیے: واہ صاحب آپ کیا جانیں۔ یہ تو ہمارا علم ادب ہے۔ پھر آخر پڑھائیں کیا؟ میاں آزاد نے افسوس کیا کہ بعض گاودی مدرس کیسی کیسی واہیات کتابوں کا طلبہ کو سبق دیتے ہیں کہ معاذاللہ!

چُلّو میں الّو

میاں آزاد ایک روز چلے جاتے تھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک چوراہے کے نکڑ پر بھنگ والے کی دکان ہے اور اس پر ان کے ایک لنگوٹیے یار بیٹھے ڈینگ کی لے رہے ہیں۔ کہ ہم نے جو خرچ کر ڈالا وہ کسی کو پیدا کرنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ لاکھوں کمائے کروڑوں لٹاتے، کسی کے دینے ہیں نہ لینے ہیں۔ اتنے میں میاں آزاد نے جھک کر کان میں کہا: واہ بھئی استاد کیوں نہ ہو، لفاظی کے صدقے، اچھی لن ترانیاں ہیں۔ بابا تو آپ کے عمر بھر فالودہ بیچا کیے، اور دادا جوتے کی دکان رکھتے رکھتے بوڑھے ہوئے آپ نے کمایا کیا اور لٹایا کیا۔ یاد ہے کہ ایک دفعہ ساڑھے چھ روپیہ ماہواری کی محرری پائی مگر اس سے بھی نکالے گئے۔ اب آپ ڈینگ

کی لے رہے ہیں۔ اس نے کہا آپ بھی نرے گاؤدی ہیں۔ ارے میاں اب گپ اڑانے سے بھی گئے گزرے۔ بھنگ والے کی دکان پر بندۂ درگاہ تہذیب کو رفوچکر کر دیتے ہیں۔ تہذیب آئے تو بھنگ گھوٹنے کا سونٹا ہی لگاؤں۔ اور پھر اتنا تو سمجھو کہ یہاں ہمیں جانتا کون ہے۔ بھئی خیر بیٹھو یا جاؤ مگر از برائے خدا ہتھے پر نہ ٹوکو۔ میاں آزاد تو ایک سیلانی آدمی تھے۔ خود بھی تپائی پر ٹک گئے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک درخت کے تلے چھپر پڑا ہے مگر سرکی کا۔ صاف ستھرا ایک تخت بچھا ہے۔ دو تین تولیاں دو ایک گھڑے، ڈول رسی، لوٹے کونڈی بھنگ بھری دھتورا، شکر کالی مرچ، یہ سب سامان موجود ہے۔ بھنگ والا سِل پر رگڑے لگا رہا ہے سے لگے رگڑا مٹے جھگڑا۔ دو چار بگڑے دل دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ نہایت بیتابی سے غل مچا رہے ہیں۔ کہ داتا تیری دکان پر ہن برسے۔ ہاں ہاں، ایسی چکی پلا جس میں جوتی کھڑی ہو۔ آج تو دھتورا بھی چاہیے ذرا سا گبڑ دے۔ ہاں جس میں خوب سرور گٹھیں۔ ارے تیری دکان کے تو چھ ہے بھی بھنگیری ہوں گے۔ بھنگ والے نے دو تین کو خوب گاڑھی بوٹی پلائی۔ وہ رفوچکر ہوئے تو دو چار آئے۔ اتنے میں میاں آزاد کے دوست نے جن کو لوگ موٹاپے کے سبب سے بھد بھد کہا کرتے تھے، یوں ہانک لگائی: استاد آج تو دودھیا پلواؤ۔ مگر خوب چکی ہو۔ پیتے ہی لے اڑے، چلو میں الو ہو جائیں۔ استاد تو ان ایسوں کی قبر تک سے واقف تھے۔ دودھیا میٹھی کیوڑے سے بسی ہوئی پلائی۔ پہلے تو میاں آزاد نے کہا کہ کیا! بھنگ، نشے کی چیز، نا صاحب توبہ توبہ! عطائے تو بلقائے تو بخشیدم۔ بندہ درگذرا۔ تلی بخشنے چو ہا لنڈورا ہی جی جائے گا۔ نشے کا تو میں جانی دشمن ہوں۔ زرداون وو دردسر خریدن۔ کونسی دانائی ہے دام خرچ کر کے الو بننا۔ ذی ہوش ہو کر بے ہوشی کو ترجیح دینا۔ آدمی سے اونٹ بن جانا، انسانیت سے اپنے کو خارج کر دینا، حماقت ہے یا نہیں؟

بھد بھد: تو یہ کہیے، چنین وچناں کے پھندے میں پھنس گئے اور پڑھو۔ کہتے ہیں رفتہ رفتہ پاگل ہو جاؤ گے۔ لے اب پہلے تو آپ فصد کھلوائیں، پھر دماغ کا علاج کریں۔ میاں!

بہار عمر ملاقات دوستداران ست   چہ خط برد خضر از عمر جاوداں تنہا

ایک کلھڑ پیو۔ دیکھو تو کیسے سرور گھٹتے ہیں۔ نہ پیے تو ہمارا ہی خون پیے۔

بھد بھد نے اپنے ایک دوست ہر بجھ کو پلا دی اور سب مل کر چلے۔

بھد بھد: یہ چھوہارے کا پیڑ ہے۔

آزاد : ہاں ہم حرما ہم ثواب۔

بھد بھد : کیا خوب۔

آزاد : تسلیم !

راستے ہیں ہربھج نے پوچھا کیوں یار یہ کون محلہ ہے ؟ جی چینی بازار ہے۔ واہ کہیں ہو نہ۔ یہ چینا بازار[1] ہے۔ ماشاء اللہ یہ نیا نام سنایا۔ چینا بازار کیسا، چینی بازار ہے۔ آپ تو کہنا نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ چینا بازار ہے۔ کیا ؟ کہتے ہیں ؟ آپ ہیں کون جو کہتے ہیں۔ ہم گلی گلی، کوچے کوچے، چپے چپے سے واقف ہیں۔ آپ ہمیں راستہ بتاتے ہیں۔ اے تیری قدرت ! اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ اسی میں عمر بھر رہے۔ اسی میں اتنے بڑے ہوئے۔ آپ فرماتے ہیں چینا بازار، اور نہیں تو کیا آپ کی طرح چینی بازار کہیں۔ ناقبلہ بندۂ درگاہ کی زبان سے غلط لفظ نہ نکلے گا۔ جی ایسے ہی تو آپ بڑے محقق ہیں۔ بے خبردار اب چینا بازار نہ کہیے گا۔ میرے سامنے گنوار سا ہے۔ ابے چینا بازار کے کیا معنی مردک ؟ ہائیں کیا بکا۔ مردک ! بہ مردک کسے کہا ؟ میری شان میں اور یہ کلمہ شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ اچھا کسی ثالث سے پوچھو۔ آزاد نے دونوں کو سمجھایا کہ کیوں لڑے مرتے ہو۔ مگر سنتا کون تھا۔ اس وقت سامنے سے ایک آدمی چلا آتا تھا، آزاد نے بڑھ کر پوچھا کہ او میاں جانے والے ہوت ! بھلا یہ کون محلّہ ہے ؟ اس نے کہا کہ چینا بازار۔ اب بھد بھد اور ہربھج دونوں نے اس کو دق کرنا شروع کیا۔ چینی بازار کہ چینا بازار ؟ بولو، جلد بولو، چینا بازار کہ چینی بازار، بتاؤ جھٹ پٹ ! چینا بازار کہ چینی بازار، چینی بازار یا چینا بازار، سو سو دفعہ پوچھ رہے ہیں کہ چینی بازار یا چینا بازار، اور آدھ کوس تک اس کے ساتھ گئے۔ اس بیچارے کو ان بھنگڑ سلطانوں سے پیچھا چھوڑانا مشکل ہوگیا۔ بار بار ڈپٹ رہے ہیں کہ چینی بازار یا چینا بازار۔ اس نے صدہا مرتبہ کہدیا کہ صاحب چینا بازار اور چینی بازار دونوں صحیح ہیں۔ مگر ان کو تو کچّے گھڑے کی چڑھی تھی۔ انھوں نے سوائے اس کے اور کچھ بات ہی نہ کی کہ چینی بازار یا چینا بازار۔ جب آدھ کوس تک اس بیچارے رہرو کو رگید لے گئے، اور چینی بازار اور چینا بازار

---

[1] چینا بازار لکھنؤ کا ایک محلّہ تھا۔ پرانے زمانہ میں یہاں بازار بھی تھا۔ اب نہ بازار ہے نہ محلّہ ایک شاہی زمانہ کا ایک بڑا سا دو منزل کا دروازہ موجود ہے جو چینا گیٹ کہلاتا ہے، دوسری منزل پر محض اداروں کے دفاتر ہیں۔ نورانی

سنتے سنتے اس کے کان تک پک گئے تو وہ جھلّایا۔ اور ڈانٹ کر بولا کہ چپ رہو بدمعاش۔ چینی بازار اور چینا بازار دونوں کی ایسی تیسی، اور تمھاری ساتھ لے کر۔ اب بولے تو ہم کھوپڑی پر ایک ڈنڈا جمائیں گے۔ نامعقول، ہم کو بناتا ہے۔ ہم کوئی گنوار نہیں۔ تم اپنے دل میں سمجھے کیا ہو۔ ابھی آواز دوں تو تین سو تلور لیے تلواریں سوت سوت کر آن موجود ہوں۔ ایک گھنٹے سے جان عذاب میں کر دی کہ چینا بازار یا چینی بازار۔

ہت ترے بھد بھد کی ایسی تیسی۔ کہتے تھے مروک سے کہ ہم کو نہ پلانا مانا۔ دیکھ بھنگ سے کیسی مت بھنگ ہوئی۔

صنعت اور تجارت کے کرشمے

اُدھر خاتونِ شب نے شکست فاش پائی، اور عاملِ روز کی سواری بصد کر و فر آئی چراغوں نے برطرفی کا پروانہ پایا، اور سفیدۂ صبح نظر آیا۔ ادھر مجنونِ لیلانے دنیائے دوں۔ حدتِ تیغ کشور کشایانِ معرکۂ جنوں، وحشتِ کے نہنگ بحر آشام، شیطان سے زیادہ مشہور خاص و عام، شیخوخیت پناہ، میاں آزاد کوحشِ اللہ، چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بستی سے کوئی دو گولی کے ٹپے پر ایک جوئبار اور لبِ چشمہ سار بگلوں کی قطار ہے۔ اور ہر گلبن پر بلبل رنگین گفتار ہے غزل خواں، گلشن کی زبان صرف قصیدہ ہائے نوروزی، ہر سمت سامان طرب ہے اور اسبابِ عشرت اندوزی۔ ہر مرغ خوش الحان ترانہ سنج ہے۔ اور مرنجان مرنج۔ سبزہ مثل ساکنانِ خلد سبز پوش ہے۔ رندِ عالم سوز بھی بادۂ وحدانیت کے نشے میں سرخوش و مدہوش ہے۔ در و دیوار سے وجعلنا النّہار معاشاً آشکار، اور مفہوم وجعلنا سراجاً وہاجاً نمودار۔ چماں چماں اور خراماں خراماں، حضرت بھی گلگشتِ چمن کرتے چلے جاتے تھے، اور تماشائے نسرین و نسترن سے دل بہلاتے تھے! کہ دفعتہً ایک مقام پر پہنچے۔ مینو سواد ہر کوچہ و برزن آباد، چپہ چپہ رشک بہشت شداد، ذکور چست و چالاک، اُناث مست و فرحناک، مکانات فرح بخش و نغز آراستہ دکانیں بصد قرینہ پیراستہ، دلبر میوہ فروش۔ سبزتہ گلگوں کی پیاری صدا آنکھی چتون بانکی ادا۔ جس گل زمیں میں اس کی دکان ہے، وہ رو کش باغِ نعیم رشک جناں ہے۔ ثریا در سے خوشۂ انگور کوتا کے۔ امرود جلوائے بید دد۔ سیب دافعِ آسیب یہی قوت دل۔ انار راحِ روح۔ تنبولی کی دکان پر شوقین آدمی مصروف جاں سپاری ہیں اور ایک عالم مشغولِ

خریداری اور کیوں نہ ہو سرخروئی کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ سبز بخت کا خطاب پایا ہے۔ ادھر لگا ہاتھ میں لیا اُدھر چاندی کا ورق لگا کر بیڑہ دیا۔ کتھا کیوڑے کا بسا ہوا ایک گلوری کھائے تو غذائے ثقیل ہضم ہو جائے۔ مگھے کا منھ کالا۔ مہوبا گرد کر ڈالا۔ تمباکو والے کی دلکش دکان پر اور ہی آن بان ہے۔ نرالی سج دھج، انوکھی شان ہے جسے دیکھو اسی کا دم بھرتا ہے۔ نا کے پر پیچے تو مہنال دروازے تک تڑاقے کی آواز جائے۔ نیچہ کیا ہزار داستان ہے۔ ہر فصل میں چہک رہا ہے۔ تمباکو مشک و عنبر کی طرح مہک رہا ہے۔ آتش زبانی میں فرد۔ دود افگن کی گرم بازاری اس کے مقابلے میں سرد پھول ہے سدا بہار، یا کوہ ہے آتش بار، بقول رسا گل بھی ہے بلبل بھی ہے۔ نقل بھی ہے مُل بھی ہے۔ گیندِ لطافت کا سر طوقِ چنبر ہے۔ چلم گویا کلاہِ ناز بر سر ہے۔ چہچہہ زنی پر آمادہ ہوا تو اچھے اچھوں کے دھوئیں اڑا دیے۔ آتش نفسوں کے چھکّے چھڑا دیے۔ محفل کی رونق اس کے دم سے، مجلس کا لطف اس کے فیض قدم سے۔ خوبانِ شکر لب کے ساتھ دمساز ہے۔ ہوا خواہوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ دودِ عنبریں سرمہ کش چشم پری رخان فرخار، چانڈو بازوں کا لنگوٹیا یار، گندھی کی دکانِ عنبر بار کی طرف جو گزر ہوا۔ تو دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ خوشبو کیا فتنۂ روزگار ہے۔ کسی کنٹر میں عرقِ عروس کسی میں عرقِ بہار ہے۔ خراج خطا و ختن اس کا مول ہے۔ قنوج[1] اور جونپور اس کی چاہ میں ڈانواں ڈول ہے۔ لخلخہ درائحہ سے دماغ معنبر ہے۔ دور تک شمیم عنبریز عطر روح پرور ہے۔ دلدار چوٹری کے رشک سے یاقوت احمر ہیرا کھائے۔ صورت دیکھے جی للچائے۔ زاہد صد سالہ بھی دیکھ پائے تو بے دام چکائے خریدے جائے۔ رعبِ حسن سے مول تول کا لفظ زبان پر نہ لائے۔ چوڑی کیا مشاطۂ چابک دست ہے۔ جو ساعدِ سیمیں کے جوبن کو بھڑکا دے۔ ہاتنک دیرینہ روز کو محبوب چاردہ سالہ بنا دے۔ پھر جوہری کے دکانچۂ زرنگار پر جو نظر پڑی تو گویا پکھراج پری سے آنکھ لڑی فلک دیکھے تو لآلی آبدار پر انجم نثار کرے۔ ایک ایک درِّ یتیم کا مول خراج بدخشاں ہے۔ حاصلِ بحر ایک درِ مکنون کا بہانہ ہو۔ پھر بزازے کی طرف جو نکل گئے تو آبِ رواں کی جھلک پر خریداری کا شوق چرایا۔ روپیہ

---

[1] قنوج اور جون پور، اتر پردیش کے شہر ہیں جہاں کے عطر اور تیل بہت مشہور ہیں دونوں مقامات پر پھولوں کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔ جن سے عطر کشید کیا جاتا ہے۔

گاڑھے وقت کام آیا۔ زر بفت گلبدنوں کو بھایا۔ لالہ نین سکھ سے بھاؤ چکایا۔ انھوں نے کبھی دس کبھی پانچ دام بتائے۔ دھوپ چھاؤں نے گرگٹ کے ایسے رنگ بدل کو شرمایا۔ حلوائی کا میٹھا پکوان، غضب کا آب و تاب، ہم خرما و ہم ثواب۔ برفی دیکھے تو منھ میں پانی بھر آئے۔ گرسنہ چشم کا جی چاہے کہ تھال کے تھال کھا جائے۔ کتب فروش کی دکان پر شائقین علم و ہنر کی گرم بازاری۔۔ شمع کتب پر اہل قلم کا پروانہ وار ہجوم ہے۔ شعرا کے تذکرے دواوین، ندرت طراز مثنوی، کتب اخلاق۔ طب کے نسخے تاریخ علم ہیات اور طبعیات کے رسالے، شعرائے گرانمایہ ایران کا کلام فصاحت التیام علمائے عرب کے مصنفات۔ عاشق مزاجوں کے مطائبات ظرافوں کے ہزلیات، مزاح سمات۔ جدھر نکل جاتے ہیں۔ خوشی کی کھانچیاں بھری ہیں۔ مسرت کے انبار لگے ہیں۔ بازار نشاط کی گرم بازاری نے غم وزدنی غم کالا۔ عیش و عشرت کا بول بالا۔ میاں آزاد دل ہی دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ الٰہی یہ شہر ہے۔ یا خلد بریں۔ یہ زمیں ہے یا سواد اعظم عرش تمکین۔ راستے صاف۔ سڑکیں شفاف، کوئی خوشی کے شادیانے بجاتا ہے۔ کوئی رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کہیں دنگا نہ فساد ایک کو دوسرے سے رنج نہ عناد، چلتے چلتے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ یا حضرت! یہ کون گلزمیں ہے۔ میں تو اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ یہ سماں دیکھا نہ سنا۔ باشندے سب مرفہ حال، سیم وزر سے مالا مال بشرے سے خوشی ٹپکتی ہے۔ چہرے سے مسرت برستی ہے۔ میاں یہ شہر تقدس بنیاد، مینو سواد (چشمش مرساد) چندہی روز سے آباد ہے۔ لیکن ایسی ساعتِ سعید اور آوانِ حمید میں اس کی بنیاد پڑی کہ صناعی نے روز بہ ترقی پائی تجارت نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ دستکاری کو دن دونا رات چوگنا فروغ ہوا۔ حضرت یہ سب صنعت و تجارت کے کرشمے ہیں۔ علم وفضل میں بھی یہاں کے باشندوں نے ید بیضائے ناموری حاصل کیا۔ نثاری میں بے مثل عدیم و سہیم۔ شاعری میں فقید المثال نثر نثرہ نثار شعر شعری شعار، الغرض کسی فن کسی صناعی میں کم نہیں۔ سیم وزر کا لعدم نہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ نوکری کا کوئی شائق نہیں اور نوکری بھی کی تو اعلیٰ فنون کی اسسٹنٹ سرجن۔ ڈیکل افسر انجنیر۔ اکونٹنٹ تاجر اور دستکار، البتہ یہاں بکثرت موجود ہیں۔ کشمیر سے شال۔ ڈھاکہ سے ململ۔ مالوا سے افیون میتھرا سے پیڑے، لکھنؤ کی کامدانی اور چکن۔ دہلی کی سادہ کاری انگوٹھیاں۔ آگرہ کی دریاں، کانپور کے منڈے، بسوان کا

تمباکو۔ بمبئی کی اشیائے عزیبہ، عرب کے گھوڑے، شقلبنذ کے چاقو، مینچسٹر کا کپڑا، کابل کے انار بہی سیب، کشمیر کا بنفشہ، اجمود خراسانی، ساری خدائی کی مشہور چیزیں یہاں آتی ہیں اور دم کے دم میں بک جاتی ہیں۔ ایک ایک دلال نے کوٹھیاں بنالیں۔ لکھ پتی ہوگیا۔ میاں آزاد ایسے خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے نہ سمائے۔ واہ ری تجارت، تیرے قدم دھو دھو کر پیے۔ یہ تیرے ہی دم کا ظہور ہے۔ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں۔ یہ نہیں کہ الف بے پڑھی اور منڈاسا باندھ کر کچہری پہنچے۔ پریکر ختم کی اور چیخہ ڈانٹ کر کلار کی دکان پر ادھار کھا بیٹھے۔ برسوں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، مگر نوکری نہ ملی نہ ملی چاہیے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے تو وہ نوکری ہی پر لٹو رہیں گے۔ ہائے افسوس! یارو! از برائے خدا ذرا اس شہر کی حالت پر نظر ڈالو۔ نوکری کے پھندے سے چھوٹو۔ یہ چہل پہل، یہ رونق یہ کیفیت، یہ لطف تازہ اور سرور بے اندازہ نوکری میں کہاں۔

میاں آزاد مترجم

اس شہر مبارک بنیاد سے چلے تو ایک نئے مقام پر پہنچے۔ اب سنیے! کہ کڑکڑاتی دھوپ پڑ رہی ہے۔ کھوپڑی چٹخی جاتی ہے۔ ٹھیک دوپہر چیل انڈے پر انڈا چھوڑ رہی ہے۔ تو کے تھپیڑے وہ زناٹے کے چل رہے ہیں کہ الامان! دانہ زمین پر گرتا تو بھن جاتا۔ چو طرفہ سناٹا۔ ہو کا عالم، پرندا اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے دبکائے۔ حضرت انسان مکانوں میں جان بچائے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت آگئی۔ آفتاب سوا نیزہ پر ہو رہا۔ مگر واہ رے میرے شیر کیا کہنا۔ میاں آزاد گلی کوچوں میں چکر لگانے سے کب بند۔ گو:

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

لیکن میاں آزاد بے غل وغش شہر کے صدقے ہو رہے تھے۔ آخر کار پھرتے پھراتے، چلتے چلاتے، ایک جوہری کے دکانچۂ زرنگار کی طرف سے جو گزرے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کمسن لڑکا جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ میاں آزاد گھومتے گھومتے جہاں دیدہ ہو گئے تھے۔ چتونوں سے تاڑ گئے کہ یہ جوہری بچہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لفافہ دور سے دیکھتے ہی خط کا مضمون بھانپ لیا۔ سوچے کہ اس سے کسی طرح ملیں۔ مگر جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔

ملاقات کے لیے کچھ تو تقریب چاہیے۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پوچھا کیوں صاحبزادے اس گاؤں کا کیا نام ہے۔

جوہری بچہ : گاؤں یہاں سے کوئی دس بارہ گولی کے پٹے پر ہے۔ گاؤں کہیں اور ہوگا۔ گاؤں کی ایک ہی کہی یہ شہر ہے یا گاؤں ؟

آزاد : ہاں وہی شہر۔ لاحول۔ کیوں میاں یہاں میٹھا حلوا بھی بکتا ہے ؟

جوہری بچہ : (مسکراکر) اور کیا آپ کے گاؤں میں کھٹا حلوا بھی بنتا ہے۔ کیا کریلے کا حلوا بناتے ہیں یا نیم کا ؟

آزاد : میاں میں مسافر غریب الوطن ہوں سرا کا پتا بتا دیجیے تو احسان ہوگا۔

جوہری بچہ : پورب کی طرف ناک کی سیدھ پر چلے جاؤ بائیں ہاتھ کو راستہ گیا ہے دس ہی قدم پر چورا ہہ ہے۔ بس سامنے سرا کا پھاٹک نظر آتا ہے۔ یہاں آپ کا کس غرض سے آنا ہوا۔ کسی بھٹیاری سے رشتہ داری ہے ؟

آزاد : کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ ہم پر فقرہ بازیاں۔ اے تیری قدرت آپ بھی اتنے ہوئے، خدا رکھے میاں صاحبزادے ! ابھی نام خدا اٹھارہ برس کا سن ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ کل ہوش سنبھالا، آج ہم پر منھ آنے لگے۔ سنیے ! بندہ نواز، ہم یہاں مسافرانہ طور پر آئے ہیں۔ اگر ترجمہ در ترجمہ کہیں ملے گا تو فہو المراد، ورنہ چلتا دھندا۔ سو اگر آپ کے امکان میں ہو تو آپ ہی ترجمہ دلوادیں چہارم آپ کی بھی نذر ہے۔

کوشش کرد کارِ خیر ہے یہ

جوہری بچہ : واہ وا ازیں چہ بہتر، نیکی اور پوچھ پوچھ، مگر ترجمہ ایسا نہ ہو کہ لوٹیا فرستادو دھوتی رسید اور نہ ایسا کہ لکھے موسیٰ پڑھے خود آئے۔

آزاد : اجی ایسا ترجمہ کروں کہ آنکھیں کھل جائیں۔ ہم کیا کودوں دے کر پڑھے ہیں۔ خط دیکھیے موتی پروتا ہوں۔

جوہری بچہ : اچھا تو ہماری عرضی کا ترجمہ کر دیجیے، چوتی نذر کروں گا۔ ابھی ابھی دوں گا۔ کھری مزدوری چوکھا کام۔

آزاد : چوتی ! تو ایسے مترجم بہت مل جائیں گے۔ اچھا آپ لائیں تو سہی صبح صبح یوہنی سہی۔

جوہری بچہ : اوچھا جی۔ ابھی آپ کے نزدیک تڑکا ہی ہے۔ تو بس معاف کیجیے دوپہر

ڈھل گئی۔ آپ کے یہاں ابھی پوپھٹنے ہی کا وقت ہے۔ دن دہاڑے یہ اندھیر تو ترجمہ کیا بُرے کا سر کیجیے گا۔ بس قبلہ بس، خیر سن تو لیجیے۔

عرضی: کرم پرور، غریب گستر، نوشیروانِ ثانی، عادلِ زمانی سلامت! فدوی کے چھینگی پوتے ماشاءاللہ کھانچیوں بھرے ہیں۔ کوئی رتی بھر کا، کوئی ماشہ بھر کا، کوئی تولے بھر کا، کوئی چھٹنکی، کوئی پنسیری۔ دونی چونی، اٹھنی گنی، سب ہی رقم کے ہیں۔ میری مصیبت پر نظر ڈال کر کوئی عہدہ عطا فرمائیے، تو اس کے جلد وہیں خدا حضور کو فرانس کا پریسیڈنٹ کر دے! فدوی نے ایک کنڈے والے کی زبانی سنا ہے کہ آجکل دارو غگی بم پولیس بمشاہرہ تیس روپیہ ماہواری خالی ہے۔ چونکہ کمترین کو صفائی کا بہت خیال ہے۔ لہٰذا اس استحقاق کے بموجب عرض رساں ہے کہ عہدۂ مذکور پاؤں۔ واجب تھا عرض کیا۔ فدوی۔

آزاد: سبحان اللہ۔ عرضی کیا لکھی ہے کہ قلم توڑ دیے۔ کیوں بھئی کتنی صاحبزادیاں اور صاحبزادے آپ کے ہوں گے؟ ہیں کوئی آدھے درجن۔

جوہری بچہ: (ہنس کر) اجی یہاں تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی ہمارے چھوٹے بھائیوں تک کا بیاہ ہو گیا۔ چھما چھم کرتی بیویاں آئیں۔ مگر ہم ترس ہی رہے ہیں۔ لڑکے کیسے۔

آزاد: پھر یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ کھانچی بھر چھینگی پوتے ہیں۔

جوہری بچہ: اجی تو اب لکھنے سے بھی گئے گزرے۔ چور چوری سے گیا، ایرا پھیری سے بھی گیا۔ اب صاحب کو تو یہی پڑی ہے۔ کہ تحقیقات کرتے پھریں، میر محلہ سے پوچھیں، تھیلدار کے ذریعہ سے دریافت کریں۔ اور تو کچھ انھیں کرنا ہی نہیں آپ کی باتیں بھی واللہ لکھ رکھنے کے لائق ہیں۔

آزاد: عہدہ بھی چشمِ بد دور، وہ تجویز ہوا کہ زمانے بھر کا کوڑا۔ تڑ کا ہوا۔ اور بم پولیس جھانکنے لگے۔ کبھی بھنگیوں سے چخ چل رہی ہے کبھی بھنگیوں سے گلخپ ہو رہی ہے۔ بھائی ابھی جوان ہو، پڑھو لکھو، جم کر محنت کرو نوکری کی تمھیں کیا فکر ہے۔ لکھ پتی آدمی جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ دکان جھک جھک کر رہی ہے اور چلے تیس روپیہ کی نوکری کرنے۔ اے لعنتِ خدا۔

جوہری بچہ: ہائیں، ہائیں، کہاں تو عرضی لکھتے تھے کہاں لگے پانی پی پی کر کوسنے۔

آزاد: میاں پڑھنے لکھنے کا یہ ماحصل نہیں ہے کہ خواہ مخواہ نوکری ہی کرے۔ اور

نہیں تو داروغہ بم پولیس ہی سہی - خاصے جوہری بنے ہو - صدہا آدمی لالہ جی لالہ جی کہتے ہیں، لالہ جی کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی تو داروغہ، بم پولیس بن بیٹھے - ہات ترے کج خلقی کی دُم میں نمدا - ایسے شوق ملازمت کی ایسی تیسی - خدانخواستہ ایسا کیا گاڑھا وقت ہے کہ پندرہ بیس کی نوکری پر جان دیتے ہو - یارِ عزیز اپنی دکان کا کاروبار دیکھو، تیس روپیہ تو بات کی بات میں خیرات کر سکتے ہو -

میاں آزاد وہاں سے اٹھے تو سوچے کہ بھئی شگون اچھا ہے - جھپ سرِ چوک ایک کمرہ کرایہ پر لے مترجم بن بیٹھے اور دروازے پر ایک تختہ لگا دیا کہ "میاں آزاد مترجم"

اب دل لگی دیکھیے کہ صبح سے شام تک پچاسوں غرض مند آنے لگے - جیسے دیکھو مصاحبت گرماتا ہے - ایک لالہ صاحب قلمدان دبائے، عینک لگائے، تشریف لائے - آداب بجا لاتا ہوں کہہ کر دستگی سے کاغذ نکالا -

لالہ : بندہ پرور! اس عرضی کا ترجمہ کر دیجیے - جو کچھ ہو لیجیے -

آزاد: آخاہ یہ تو عرضی کیا امیر حمزہ کی داستان ہے - ذرا پڑھیے تو سہی -

لالہ : حضور، پر نور دام - بعد آدائے آداب بجا آوردہ معروض رائے فیض انجلائے گردا بندہ می آید، کہ چوں فی زمانہ، بفضل قادر یگانہ، عہدہ ہائے چند در چند بہ وجوہ انتزام دریا بردنی، و دریا برآمدنی خلوے خواہد شد اور فدوی جان نثار کئی ماہ سے سحر اور مساوظیفہ ترقی آپ کا اوپر زبان میمون کے لاتا ہے - لہذا تسدیا پرداز ہے کہ اگر عہدہ تحصیلداری عطا ہو تو پرورش ہے - اور کمترین ماہ تیں سے بند وبست میں محرر ہے - کمترین کے بڑے بھائی کی بیوی، یعنی کمترین کی پھوپھی جس سے مذاق کا رشتہ ہے اس کے باپ کے پہلے خسر کا چچازاد بھائی، داروغہ نہر بمشاہرہ اسی روپیہ ماہوار تھا - چوں کہ حکم ہے کہ عالی خاندان کی پرورش ہو گی، لہذا اس استحقیت پر ملحوظ رہے - اور بندہ آبکاری کے کام سے بخوبی واقف ہے - ازانجا کہ کارگزاراں کی پرورش، اوپر حاکمان کے کہ خداوند مجازی ان کو خواص دعوامان کہتے ہیں - اسی طرح لازم ہے، جس طرح مسلمان کو حج عتبات عالیات، اور ہم ہندوان کو تیرتھ (گنگوتری لہر ہمارے من بھائی) واجب ہے اگر عہدۂ مسطورۂ بالا عطا ہو تو خدا حضور، اور حضور کے بال بچوں اور بابا لوگ، اور قبیلہ کو الیاس کی عمر دے - الٰہی دولت کا ستارہ بلند رہے! فدوی -

میاں آزاد نے جو یہ عرضی سنی تو لوٹنے لگے۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اس قدر ہنسے، اس قدر ہنسے کہ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ لالہ جی عقل کے ناخن لیجیے۔ ہوش کی دوا کیجیے بیش پا افتادہ الفاظ کے املا میں تو ہزار جگہ آپ نے غلطی کی۔ معروض کو (معروق) یہ نئی گڑھت کا لفظ ہے۔ انتظام کی خرابی (انتزام) تصدیعہ کے عوض (تسدیا) ملحوظ کی جگہ (ملحوز) ماشاء اللہ! اور یہ دریا بردنی اور برآمدنی کی ایک ہوئی۔ (بعد آدائے آداب بجا آوردہ) سب سے افصح محاورہ ہے۔ عالی خاندان کے لیے (عالی خاندانان) بہت ہی خاصے (استحاقیت) باب استحقاقیت سے ہے۔ اور واللہ (گنگا توری لہر ہمارے من بھائی یہ تان تو ایسی، اڑائی کہ صاحب بھی ریجھ جائیں گے۔ واہ استاد اچھے گر یاد ہیں۔ عالی خاندانی کا ثبوت بھی کتنا صاف ہے کہ حضرت کے بڑے بھائی کی بھاوج کے باپ کے پہلے خسر کے چچا زاد بھائی اسی روپیہ مہینے کے نوکر تھے۔ اللہ اللہ اے حضرت آپ تو بڑے عالی خاندان نکلے اور یہ سمجھا دینا تو آپ پر قرض عین تھا کہ بھاوج سے آپ کو دل لگی کا رشتہ ہے۔ اس کے بغیر عرضی پھیکی رہتی۔ قبلہ بندہ سے اس کا ترجمہ نہ ہو سکے گا۔ ذری اتنا تو بتا دیجیے کہ آپ ہیں کون ٹھاکر؟

لالہ: جی بندہ تو اگن ہوتری ہے۔

آزاد: اگن ہوتری! یعنی بھڑ بھونجے۔ یہ کہیے تو پھر آپ کی عالی خاندانی میں کیا شک ہے۔ میاں آدمیت سیکھو۔ سات کی محرری سے تحصیلداری کے طالب ہو۔ بھلا کوئی بات بھی ہے۔

میاں بھڑ بھونجے بڑبڑاتے ہوئے چلے کہ واہ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ نام بڑے درشن چھوٹے۔ مترجم بنے ہیں۔ بڑا سا تختہ دروازے پر لگا دیا اور موٹے حرفوں میں لکھ دیا کہ میاں آزاد مترجم۔

اکڑ فون

میاں آزاد زمین کے گز بنے ہوئے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک بڈھے کھوسٹ نے ایک بانکے سے کہا کہ میاں! بیدھے آئے ہو، یا جان وبال ہے، یا زندگی دو بھر ہے، یا چھینکتے گھر سے چلے تھے۔ یہ اکڑنا اور برّرنا کیا معنی۔ یہاں گردن جھکا کر چلا

کیجیے ورنہ کوئی پہلوان گردن ناپے گا۔ تو یہ مشیخت ساری خاک میں مل جائے گا۔ تنّا اور اینڈنا بھول جائے گا۔ مفت میں کر کری ہوگی۔ اس سے کیا واسطہ۔ یہ شہر کشتی، پٹے، بانک لکڑی کی ٹکسال ہے۔ بہت سے لڑنے آئے مگر پٹخنی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی یہاں کے پہلوان پکڑ لائے، اور مارا چار دن شانے چت۔ تنگڑی پر اڑانے میں طاق۔ سواری کسنے میں مشاق کولے پر لادنے میں پڑاق۔ یہ سنتے ہی وہ میاں بانکے آگ بھبھوکا ہو گئے۔ جی! تو کہیں اس بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ بندہ پٹخنی کھانے والا آدمی نہیں ہے۔ بیچ کھیت پچھاڑوں تو سہی قربان اپنے استاد کے جنھوں نے ہمیں لکڑی سکھائی۔ ٹالوں کی لکڑی پھینکنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ مگر میدان کارزار میں ٹھہرنا البتہ کارے وارد۔ اور زبانی داخلہ تو اور ہی بات ہے۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں سے گہار لڑتے تھے، اور کون لوگ؟ ایسے ایسے گنوار گھامڑ نہیں۔ پڑھے ہوئے پٹھے جن پر ان کو ناز تھا۔ پھر یہ خیال کیجیے کہ تیس گتکے برابر پڑتے تھے۔ مگر تیسوں کی خالی جاتی تھیں۔ کبھی آڑے ہو گئے، کبھی گتکے سے چوٹ کاٹ دی، کبھی بدن کو سمیٹ لیا۔ کبھی پینترا بدل دیا۔ شاگردوں کو للکارتے جاتے تھے کہ لگا بڑھ کے ہاتھ آگھر کے اور وہ جھلا جھلا کے چوٹیں لگاتے تھے۔ مگر منھ کی کھاتے تھے۔ اور اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے تھے۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو گتکے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑے۔ مگر واہ رے استاد۔ ان کے وہی خم دم، وہی چتون۔ وہی تاؤ بھاؤ، پہروں لکڑی پھیکیں لیکن دم نہ پھولے اور جو کہیں بھڑ پڑے تو بات کی بات میں پرے صاف تھے۔ کسی پر پالٹ کا ہاتھ جمایا۔ کسی کو چاکی کا ہاتھ لگایا۔ پھر بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے، یا آتشبازی کی چھچھوندر ناچ رہی ہے۔ (استاد کی اچھی تعریف کی) یا چرخی چکر میں ہے۔ جنیو کا ہاتھ تو آج تک چار دانگ ہند میں کوئی روک ہی نہ سکا۔ وہ تلا ہوا پڑتا تھا کہ ادھر اشارہ کیا اُدھر تڑ سے پڑ گیا۔ جنیو کا ہاتھ کیا قضائے مبرم ہے۔ پیام اجل ہے۔ آفت ناگہانی ہے۔ بلائے بیدرماں ہے۔ گتکا ہاتھ میں آیا اور معلوم ہوا کہ بجلی لو نکنے لگی۔ ممکن نہیں کہ انسان کی آنکھ نہ جھپکنے پائے، اور آدمی بتورانہ جائے۔ للکار دیا کہ روک چاکی۔ پھر لاکھ جتن کیجیے بھلا روک تو لیجیے۔ نشانہ تو کبھی خالی ہی جانے نہیں پایا۔ تاکا اور بھرپور ہاتھ لگایا۔ پھری عمر بھر نہ چھوٹی۔ ایک انگ ہی لڑا کیے۔ ان کے ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ چھریرا بدن، سادہ مزاج، آدمی صورت دیکھے تو یقین نہ آئے کہ یہ استاد بے بدل ہیں۔ مگر ایک ذراسی

بانس کی کھپاچ دیکھیے پھر دل لگی دیکھیے، کہ کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ میاں ہم ایسے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ پٹے باتے نبوٹ کشتی لکڑی کسی میں بند نہیں۔ جی چاہے کسی سے بھڑوا کر دیکھ لیجیے۔ اتنے میں ایک گنوار کا لڑکا چلا جاتا تھا انھوں نے پکارا کہ ارے ذرا ادھر آنا! اِدھر اُدھر کی بات سنتے جاؤ۔ لڑکا قریب آیا تو پوچھا: کہ ان سے دو چوٹیں ہوتی ہیں۔ اس نے نظر بھر کر دیکھا اور کہا ہاں! ہم کسی سے دب کے نکلنے والے نہیں، جس کا جی چاہے ارمان نکال لے۔

بانکا: ابے جا ایسے دیہاتی چھوکرے، ہم نے بہت چرائے ہیں۔

گنوار: جی تو کہیں سوریاں چرائی ہوں گی۔ دیہاتی چھوکروں سے شیطان نے پناہ مانگی ہے۔ آپ ہیں کس شمار و قطار میں، ہم نے بھی شہر ہی میں تعلیم پائی ہے۔ ان گیدڑ بھبکیوں میں اور آتے ہوں گے۔

گنوار تو یہ فقرے سنا کر چلدیا۔ میاں آزاد اور بانکا پھر شہر میں چکر لگانے لگے۔ چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑتی ہے بانکا ترچھا ٹیکھا، چنت دار انگرکھا پہنے، ننکے دار کٹی ہوئی ٹوپیاں سر پر جمائے ہوتے، چست گھٹنے ڈانٹے، آنڈو پڑے ہوئے، ڈھاٹے باندھے ہوئے تنے چلے جاتے ہیں۔ تینچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی۔ دو دو دولاتیاں پڑی ہوئیں۔ باڑھیں چڑھی ہوئیں۔ قرابنیچ، پیش قبض، کٹار، سروہی، شیر بچہ، سب سے لیس۔ خاصے اوپچی بنے ہوئے۔ ایک بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار شامت اعمال سے کہیں ہنس پڑا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دن سے تینچہ داغ دیا۔ مگر حسن اتفاق سے خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں آقا کیوں بگڑ گئے؟ تیکھے ہو کر فرمایا: کہ ہم کو دیکھ کر بچہ جی مسکرائے تھے۔ ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے، اور اس جواب دنداں شکن سے ان کے بھی دانت کھٹے ہو جائیں۔ مگر زندگی تھی کہ گولی سے بچ نکلا۔ میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ بانکے تو بالکل ناخدا ترس ہے، ان کو زیر نہ کیا تو کچھ بات نہیں۔ ایک تنبولی سے پوچھا کہ کیوں بھئی اس شہر میں بانکے بہت ہیں۔ اس نے کہا میاں بانکا ہونا تو دل لگی نہیں۔ ہاں یوں کہیے کہ بے تکرے بہت ہیں۔ اور ان سب کے گرد گھنٹال وہ ذات شریف ہیں، جن کو لوگ یکرنگ کہتے ہیں۔ وہ صندلی رنگا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے ہیں۔ مگر مجال کیا کہ شہر بھر میں کوئی صندلی جوڑا پہن تو لے۔ یکرنگ صندلی جوڑا کوئی پہن نہیں سکتا۔ کوئی پہنے تو گولی بھی سر کر دیں۔ اس

کے ساتھ یہ بھی ہے۔

میاں آزاد سوچے کہ اس یکرنگ کا ٹیٹوا نہ لیا تو کھانا حرام۔ دوسرے دن حضرت بھی صندلی بوٹ، صندلی گھٹنا، صندلی انگرکھا، صندلی ٹوپی، دے کر نکلے۔ میاں بھی صندلی۔ اب جس گلی کوچے بازار سے گزر ہوتا ہے، لوگ تعجب کرتے ہیں، کہ یہ آج اس ڈھب سے کون نکلے ہیں۔ بھئی چو طرفہ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ شدہ شدہ حضرت یکرنگ کے چیلے چاپڑ نے ان کے کان میں بھی بھنک ڈال دی۔ سنتے ہی منھ لال چقندر ہو گیا۔ کپڑے پہن، ہتھیار لگا، چل کھڑے ہوئے۔ میاں آزاد تنبولی کی دکان پر جا کر ٹک گئے۔ ان کی وضع دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے اور منت کرنے کہ از برائے خدا میری ٹوپی دے لیجیے، یا جوتا بدل ڈالیے، ورنہ وہ آتا ہی ہوگا، مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ۔ ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی۔ یہ مانتے کب تھے۔ گلوری لی اور اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ارد گرد تماشائیوں کا ہجوم ہے، اور شہر بھر میں دھوم ہے، کہ آج یکرنگ سے تلوار چلے گی۔ اتنے میں حضرت یکرنگ بھی نمودار ہوئے۔ تنبولی نے میاں آزاد سے کہا کہ سنبھلیے! وہ، ع۔ آتے ہیں تنچے کو چڑھائے ہوئے کل پر، ان کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ تتر بتر۔ کوئی ادھر کترا گیا، کوئی اُدھر دبک رہا۔ کوئی گلی میں گھسا، کوئی کمرے پر چڑھ گیا۔ یکرنگ نے جوان کو دیکھا کہ از سر تا پا صندلی پوشاک پہنے ہے۔ تو جل ہی مرا۔ نظر قہر آلود ڈال کر کہا۔ ابے او ہولا خبط! اتار ٹوپی۔ بدل جوتا، گستاخ! ہمارے ہوتے ساتھی تو صندلی جوڑا پہن کر نکلے۔ تیرے اور یہ تم ودم۔ اتار۔ اتار۔ نہیں میں بڑھ کر کام تمام کر دوں گا۔ میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے، اور نہایت پھرتی سے یکرنگ کی توند پر تنچہ رکھ دیا۔ او خرنا مشخص جنبش کی اور دھواں اس پار، ہلا اور دھائیں کی آواز آئی۔ بولا اور لاش پھڑکنے لگی، مردک بڑا بانکا بنا ہے۔ صدہا شرفا کو بے عزت کیا۔ تم جیسے بدمعاش اور بانکپن کا دم بھرد۔ اتنے چابک ماروں گا کہ یاد کرو گے بچہ۔ ابھی اتار ٹوپی، اُتار اُتار، نہیں دھواں اس پار۔

اتفاق سے کہیں ایک درزی کا ادھر سے گزر ہوا۔ میاں خلیفہ کی گپڑی اتار یکرنگ کی چپت گاہ پر رکھی، اور یکرنگ کی صندلی ٹوپی اپنی جیب میں رکھ لی۔ ہات تیری ایسی تیسی۔ بڑے بانکے بنے تھے۔ شہر بھر میں کوئی یکرنگ جوڑا نہ پہنے۔ نادری حکم لگا دیا۔ زیر دستوں، غریبوں، شریفوں کو بہت ستاتے تھے، ہم سے ایک نہ چلی۔ حوصلہ ہو تو آ دو دو ہاتھ

بھی ہو جائیں۔ خبردار جو آج سے صندلی جوڑا پہنا تو تم جانو گے۔

شہر بھر میں یہ دھوم ہو گئی کہ میاں آزاد نے یکرنگ کے چھکے چھڑا دیے۔ گھگھی بندھ گئی۔ چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔ سچ ہے دبے پر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔ اب تو میاں آزاد پر بانکوں کی بھی نظر پڑنے لگی۔ جس ٹکڑی میں جاتے تھے لوگ بہ تعظیم پیش آتے تھے۔ ایک دن انھوں نے منادی کر دی۔ آج میاں آزاد ۶ بجے صبح سے آٹھ بجے تک اپنے فن کے کرتب دکھائیں گے۔ جن اصحاب کو شوق ہو آئیں، اور حظ اٹھائیں۔ روز معینہ کو ایک فراخ و وسیع میدان میں غٹ کے غٹ جمع ہوئے، اور میاں آزاد نے طرح طرح کے جوہر دکھائے۔ لیموں پر نشان بنایا۔ اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے۔ کسیرو اچھالا اور پانچ چھ مرتبہ میں چھیل ڈالا۔ تلوار کی باڑھ سے دس بارہ کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ چراغ جلایا، اور کھانڈا اچھیکتے پھیکتے گل کاٹ ڈالا۔ لو الگ، بتی الگ۔ ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھیں، اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں بلوہ بچ نکلیں۔ لکڑی ٹیکی اور چھت پر ہو رہے۔ گتکے کا ذرا اشارہ کیا، اور بیس ہاتھ اڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا، اور یہ صاف نکل بھاگے۔ پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے اس کو نکلنے نہ دیا، وہ لاکھ کوشش کرتا رہا مگر پھڑپھڑا کر رہ جاتا تھا۔ اتنے میں ایک پھکیت بولے اجی یہ شعبدہ بازی ہے، میدان کارزار میں سامنا ہو تو جانیں۔

آزاد: ہاں یہ دعویٰ۔ اچھا فہمیدہ خواہد شد۔ تمھارے یکرنگ رنگے سیار کا رنگ تو پھیکا ہو گیا۔ اب تم منھ آتے ہو۔ کسی دن گردن ناپوں گا۔

پھکیت: چونچ سنبھالو، نہیں ہم تمھاری خبر لیں گے۔

آزاد: یہی دلی خواہش ہے کہ تم جتنے گو کھے بانکے ہو، سب کو نیچا دکھاؤں، اور تمھارا ابل نکالوں۔ دیکھو صبح و شام تمھاری بھی قلعی کھلی جاتی ہے۔ تم لوگ بانکے نہیں مردم آزار، خونخوار، ناخدا ترس ہو، جس طرف سے نکل جاؤ ادھر آدمی کانپ اٹھیں کہ بھیڑیا آیا۔ کوئی ہنسا اور تم نے بندوق چھپائی کسی نے بات کی اور تم نے چوٹ لگائی، بھئی واہ اچھا بانکپن ہے، تو وجہ کیا جہاں دس ڈنڈ پیلے اور ابل پڑے۔ دس بارہ دن لکڑی پھیکی اور محلہ والوں پر شیر ہو گئے، ورنہ باکمال کو ہمیشہ بردبار ہی دیکھا تم ایسے تو:

باد شوند ار بچراغی رسند دود شوند ار بدماغی رسند

جب سے رذیلوں میں پھکیتی بنکیتی، بانا شروع ہو گیا، تب سے شرفا اس کو معیوب سمجھنے لگے اور یوں اونچی بن کر اور خوب تن کر، نکلنا تو سب ہی جانتے ہیں، مگر فن کا جاننا اور ہی شے ہے۔

اتنے میں میاں آزاد کے قریب سے ایک پہلوان اینڈتے ہوئے نکلے۔ چٹ لنگوٹ باندھے، ململ کی چادر اوڑھے، دو تین چھٹے ساتھ۔ ایک کسیرو والے کی چپت گاہ پر پہلوان نے خدا واسطے کو دھپ لگا دی، وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو ڈھو کا ڈھوہ آدمی۔ قہر درویش بر جان درویش۔ بولے تو خوب پٹا جائے۔ کان دبا کر دھپ کھا کر، دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا۔ ایک تھوڑی ہی دیر میں میاں پہلوان نے ایک خوانچہ والے کا خوانچہ الٹ دیا۔ تین چار روپیہ کی مٹھائی خاک میں مل گئی۔ جب اس نے خوب ہی غل غپاڑا مچایا، تو شاگردوں نے سر سہلایا۔ دو تین گدّے گھونسے، مکّے لگا دیے۔ دو چار لپڑ جما دیے۔ وہ بیچارا روتا چلاّتا، دہائی دیتا چلا گیا! دہائی ہے میرا خوانچہ لوٹ لیا۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شورہ پشت معلوم ہوتا ہے۔ کسی پر لپڑ، کسی پر تھپڑ۔ واہ کیا پہلوانی ہے۔ اس کی خبر نہ لی تو کچھ نہ کیا۔ اس نے تو شہر بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ سوچتے ہی میرا شیر جھپٹ پڑا، اور پہلوان کے پاس جا کر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے با اینہمہ تن و توش بیس لڑھکیاں کھائیں۔ اور سنبھلتے ہی ان کی طرف ڈپٹ پڑے۔ یہ بھی شیر نر کی طرح ڈکارتے ہوئے چلے۔ تماشائی تو سمجھے کہ پہلوان قوی ہیکل کس بل کا آدمی ہے بھُرتا کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے ہی سے وہ داؤ پیچ کیے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ حضرت کو یاد آیا۔ پہلوان نے جیسے ہی میاں آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا، انھوں نے داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ باندھا، اور اپنا چھڑا لیا، اور چٹکیوں میں کولے پر لاد، گھٹنا ٹیک کر مارا، چاروں شانے چت۔ یا علی! پہلوان اب تک کورا تھا۔ کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میاں آزاد نے جو سر بازار ایک پٹخنی بتائی، اور اس نے ہزاروں آدمیوں میں پچھاڑ کھائی، تو بڑی کرکری ہوئی، اور تمام عمر کے لیے داغ لگا۔ میاں آزاد نے شادان و فرحان، اور اس پہلوان نے نالاں و گریاں، وہاں سے اپنی اپنی راہ لی۔ اب تو میاں آزاد جگت استاد ہو گئے۔ یکرنگ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہلوان نے پٹخنی کھائی، اور وہ جوہر دکھائے کہ لوگ دم بھرنے لگے بنکیتی پھکیتی، کشتی شورہ پشتی، کی شہر بھر میں دھوم تھی۔ جدھر جاتے تھے لوگ تعظیم بجا لاتے تھے۔ جس سے چار آنکھیں ہوئیں اس نے فراشی سلام کیا۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور دبنے لگی۔ جہاں کسی زبردست نے زیردست کو دبایا، اور اس نے غل مچایا، دہائی میاں آزاد کی، دہائی استاد کی، اور یہ بانڈی لے کر آن موجود ہوئے۔ کمزور کو کسی مردم آزار نے ذرا

ایذا پہنچائی، اور اس نے دانت بتائی۔ ہائیں نہیں مانتے بلاؤں میاں آزاد کو، شہدے لچے، تورے پچے، میاں آزاد سے ایسے تھرّاتے تھے جیسے چوہے بلی سے، یا مریض تلی سے۔ نام سنا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔ الغرض شہر بھر میں ان کا ڈنکا بج گیا۔ چو طرفہ سکہ بٹھا دیا۔ ایک دن میاں آزاد سر دہی لیے اینڈتے جا رہے تھے، اور لوگ انگلیاں اٹھا رہے تھے کہ ایک درزی کی دکان کے قریب سے ان کا گزر ہوا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ تیرہ صدی کے ایک رنگیلے چھیل، بانکے ترچھے جوان، چھوٹے۔ پنجے کا چڑھواں مخملی جوتا پہنے زلفیں ٹکائے، چھری کمر سے لگائے، درزی سے تکرار کر رہے ہیں۔

بانکے : واہ میاں خلیفہ تم نے تو ہمیں الٹے استرے سے مونڈا۔ واللہ عجیب قطع کے آدمی ہو بھئی۔ میں تو زمین کا گز بن گیا۔ جب کہیں یکسوئی ہاتھ آئی، اور جو شے سلوانی ہوئی تم سے سلوائی مگر تم خدا جانے کس کتر بیونت میں رہتے ہو۔ سینا پرونا بخیر۔ ہاں زبان البتہ کترنی کی طرح چلا کرتی ہے۔ تم سے کپڑا سلوانا اپنے کو انگشت نما کرنا ہے۔ تمہارے رشتہ دار سب استاد ہیں۔ مگر تم نرے گھامڑ نکلے۔ ہاں دم دھاگا دنیا خوب جانتے ہو۔ ٹوپی ایسی بھونڈی بنائی کہ یارانِ سرپل نے پھبتی پر پھبتی سنائی واللہ ہمارے ایک شفیق کا درزی کیا ٹوپی سیتا ہے، کہ سر پر قالب کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

خلیفہ : اے تو حضور میں اس کو کیا کروں۔ میرا بھلا اس میں کیا قصور۔ آپ کا سر ہی کاداک ہے۔ میں ٹوپی بناتا ہوں سر بنانا نہیں جانتا۔

بانکے : او گیدی! چونچ سنبھال، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنا، نہیں مارتے مارتے الّو کر دوں گا۔ جامے سے باہر ہو جاتا ہے۔ بانکوں کے منھ آتا ہے۔ اور سینیے ہمارا سر داک ہے۔ ابے۔ تیرا سر۔ سانچے کا ڈھلا ہے۔ جو لغزائنا معقول، ابے تیرے ایسے ایسے درزی میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے لکڑی کھونس دوں ملعون کے حلق میں۔ منھ بند کر نہیں دوں گا۔ الٹا ہاتھ تو منھ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ اور تماشا دیکھیے۔ ہمارا سر گویا کدو ہو گیا۔ ہم چومغزے ہیں کان کتر لوں گا بچہ۔

درزی : حضور مالک ہیں، مل میری کھتا نہیں جیسا سر ویسی ٹوپی۔ ایسا سر تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ نئی گرہست کا سر ہے صاحب اپنچ پی ہزار نعمت کھائی۔ آپ پھر لیں، بس میں سی چکا، بھر پایا۔ جب دام دینے کا وقت آیا تو یہ فقرا سنا لیا۔ یہ سنتے ہی بانکے نے درزی کو چپڑ غٹو کیا۔ اور اس درجہ پیٹا کہ وہ بیچارہ بے دم ہو گیا۔ آخر کار کفن پھاڑ کر چیخا! کہ دہائی میاں آزاد کی! دہائی میرے استاد

کی۔ میاں آزاد دور سے کھڑے سیر دیکھ رہے تھے۔ جھٹ تلوار سوت عین موقع واردات پر پہنچ گئے۔ سنبھل او آکا کی دم۔ بانکپن کا دعوا اور تم پیچھے پھر کے دیکھا تو میاں آزاد جگت استاد۔

آزاد : اس ڈنڈ بل کے قربان۔ واہ بھئی پہلوان، تم تو رستم داستان ہو۔ خلیفہ بیچارے پر ساری چوٹیں صاف کر دیں۔ کبھی کسی کڑے خان سے بھی پالا پڑا ہے؟ کہیں گہار بھی لڑا ہے، یا غریبوں ہی پر شیر ہو۔ بڑے دلیر ہو تو آؤ ہم سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ تم ڈھیر ہو جاؤ یا ہم چرکا کھائیں۔ آئیے پھر پینترا بدلیے۔ اے ہے تو اب تامل کیا ہے۔ بے تیغ دودم۔ اور لگا بڑھ کر ہاتھ اِدھر یا اُدھر۔

بانکے : ہائیں ہائیں! استاد۔ ہمیں پر ہاتھ صاف کرنے کا داعیہ ہے۔ ہماری تلوار تم پر اور تمھاری سروہی ہم پر چلے۔ کیا مجال ہم ابھی نوسکھیے، تم گرو گھنٹال۔ کجا چر کوا کجا طاؤسِ زریں بال، اور اس کمینے درزی کی طرف سے آپ بولتے ہیں، اور شریفوں پر تلوار تولتے ہیں۔ سبحان اللہ! آیئے آپ سے کچھ کہنا ہے، آگے اپنا اپنا لہنا ہے۔ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن، مصیبت تکلیف سب کچھ سہنا ہے۔ اگر تم کمک کرو تو بیڑا پار ہے، ورنہ ہم ہیں اور منجدھار ہے۔

آزاد : اچھا توبہ کرو کہ اب کسی غریب زیرِ دست کو نہ دھمکائیں گے۔

بانکے : اجی حضرت دھمکانا کیسا ہم خود بلا میں پھنس گئے۔ خدا ہی بچائے تو بچیں۔ صاف صاف یوں ہے کہ یہاں ہمارا ایک پٹیت ہے کمیدان۔ بلا کا پھکیت، ستم کا بنکیت، قیامت کا ہاتھ ہے، اس سے ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ کل نوچندی جمعرات کو ہمیں درگاہ میں گھیرے گا۔ کوئی دو سو بانکوں کی جماعت سے ہم پر چڑھائی کرنے کا قصد ہے۔ اس طرف ساری خدائی ہے، اِدھر کچھ بھی نہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ درگاہ نہ جائیں تو بانکپن میں حرف آتا ہے۔ جائیں تو کس برتے پر، یار تم ساتھ چلو تو مزے ہیں۔ ورنہ بے موت مرے۔

آزاد : بس اتنے ہی کے واسطے، لو تمھارا ساتھ دیتے ہیں۔ بیڑا اٹھا لیا کہ تم کو کل لے چلیں گے۔ اور سب سے بھڑ پڑیں گے۔ وہ سو ہوں خواہ ہزار۔ ہم ہیں اور ہماری تلوار، خنجر ہے اور کٹار، اتنی کٹاریں بھوکوں کہ دم بند ہو جائے۔ مگر یہ بتادو کہ تمھارا قصور تو نہیں ہے۔

بانکے : نہیں استاد شہید کربلا کی قسم! جو میری جانب سے پہل ہو تو ناک کاٹ لیجیے، اور جو چاہیے سزا دیجیے۔ مجھ سے انھوں نے ایک دن اکڑ کر کہا کہ تو تلوار نہ باندھا کر، میں بھی آپ جیسے انسان ہوں، بشر ہوں، فرشتہ نہیں، ملک نہیں، مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا: دت۔ تو اور ہم سے ہتھیار رکھوانے۔ اے تیری قدرت! اتنے میں لگا بے نقط سنانے، اور پندرہ بیس آدمی اس کی طرف سے

بولنے لگے۔ مصلحت وقت سمجھ کر میں نے بھی دو چار باتیں کہیں دبا نہیں۔ مگر لڑ پڑنا خلافِ عقل سمجھا۔ بانکا ہوں تو کیا ہوا، لیکن بے سمجھے بوجھے بات نہیں کرتا۔ خیر اس نے بآواز بلند کہا کہ اچھا چڈا درگاہ میں سمجھ لیں گے، ان کی نوچندی میں یا ہمیں نہ ہوں گے یا تم ہی نہ ہوگے۔

آزاد: اچھا تم لیس رہنا میں دو گھڑی دن رہے آؤں گا۔ گھبراؤ نہیں۔ تمھارا بال بیکا ہو تو مونچھ منڈا ڈالوں۔ یہ دو سو آدمی دیکھنے ہی بھر کے ہوں گے۔ جانباز ان میں دو ہی چار ہوں گے، جو آزاد کی تیغ کی چمک، اور آبِ خنجر کی جھلک، کا سامنا کریں، ورنہ ایک سو چھیانوے نو کدم بھاگیں تو سہی۔ اجل کا مقابلہ کرنا دل لگی نہیں ہے۔ مرد میدان باید۔ بے بس اب رخصت کل ملیں گے۔

میاں آزاد دوسرے دن ہتھیار باندھ کر اونچی بنے ہوئے چلے۔ راستے میں وہی بانکے ملے۔ علیک سلیک کے بعد دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ جھٹپٹے وقت ٹہلتے ہوئے درگاہ پہنچے۔

نوچندی جمعرات، جس کے آگے بنارس کا بوڑھوا منگل مات، چو طرفہ چہل پہل۔ کہیں مہوشانِ غنچہ دہن، کہیں پری رویانِ سیمتن، تماشائیوں کا ہجوم، ہٹو بچو کی دھوم، ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ آدمی پر آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ میوہ فروش صدا لگا رہے ہیں۔ تنبولی بیڑے بنا رہے ہیں۔ گنڈیریاں ہیں کیوڑے کی۔ کلیجے ہیں کباب۔ میاں آزاد خراماں خراماں سیر کرتے، گھورتے گھارتے، پھاٹک پر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ سامنے تیس چالیس آدمیوں کا غول ہے۔ بانکے نے کان میں کہا۔ یہی حضرات ہیں۔ دیکھ لیجیے دنگے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ اور لطف یہ کہ کوئی نہتا نہیں۔

آزاد: بھلا یہاں تمھارا ابھی کوئی جان پہچان ہے۔ ہو تو دس پانچ کو تم بھی بلا لو۔ بھیڑ بھڑکا تو ہو جائے۔ لڑنے والے ہم کیا کم ہیں، مگر ذرا دو چار جمالی خربزے بھی چاہئیں۔ ڈالی کی رونق ہو جائے باقی ہاتھی کے کھانے کے دانت اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔

بانکے: ابھی لایا۔ دس بیس اچھے جیوٹ آدمی کٹ مرنے والے، آپ ٹھہریں، میں دم کے دم میں آیا۔ مگر باہر ٹہلتے تو اچھا ہے۔ یہاں جوکھم ہے۔

میاں آزاد پھاٹک کے باہر ٹہلنے لگے، اور ان کے بار چے چلے جیوٹ آدمیوں کی تلاش میں۔ کمیدان نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو باہم ہنڈیاں پکنے لگیں۔ وہ بھگایا، وہ ہٹایا، بھاگا ہے نو کدم، ہات تیری دم میں نمدا۔ ایک شخص نے کہا حضور وہ بھاگا نہیں ہے۔ واللہ ایک ہی کائیاں ہے۔ کسی فکر میں گیا ہے۔ ذری کسی آدمی کو دوڑا دیجیے تو خبر لائے۔ ایک بگڑے دل باہر گئے، تو دیکھا، بانکے پچھم کی طرف شتر بے مہار کی طرح گردن اٹھائے چلے جاتے ہیں اور میاں آزاد

پھاٹک سے دس قدم پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ الٹے پاؤں آکر خبر دی کہ واللہ بس یہی موقع ہے، چلیے چلیے مار لیا ہے اناڑی کو۔ بائیں ہاتھ چلا جاتا ہے، اور اکیلا ہے۔ بہ یک بینی و دو گوش، تلوار آزاد کے پاس ہے۔ وہ سب دوسرے پھاٹک سے بھڑ بھڑا کر چڑھ دوڑے۔ ٹھہر بے ٹھہر! ادھر اُدھر بس رک جا۔ آگے قدم بڑھایا، اور تلوار کا زخم کھایا۔ جنبش کی اور دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بچہ آج نوچندی جمعرات ہے۔ پندرہ بیس آدمیوں نے چو طرفہ سے گھیر لیا۔ اور لگا گالیوں کا چھرّا چلنے۔ کمیدان کی آنکھیں لال انگارا خون ٹپک رہا تھا۔ بدن مارے غصّے کے تھرتھرا رہا تھا۔ بانکے کو اکیلا پا کر رفقا بھی شیر ہیں۔ کوئی اکڑتا ہے کوئی بررتا ہے۔ اتنے میں دس پانچ نے مشیخت میں آکر تلوار کھینچ ہی تو لی۔ ہائیں ہائیں، ہائیں ہائیں۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں سر سے سر دہی میاں کے باہر تھی۔ بانکے کا رنگ فق کہ غضب ہی ہوگیا۔ اب کتے کی موت مرے۔ کس کس سے لڑوں گا۔ ایک دو اور نہ کہ سو، خیر، پھر ہرچہ باداباد۔ بیچارے میاں آزاد کو کوئی خبر کر دیتا تو وہ جھپٹ ہی پڑتے۔ مگر اب موقع کجا۔ جب تک کوئی جائے جائے ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔ ایک یار نے بڑھ کر بانکے بیچارے مصیبت کے مارے پر ایک لٹھ لگا دیا۔ تو بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس غل غپاڑے کی آواز میاں آزاد نے بھی سنی۔ انھیں کیا معلوم کہ ان کے یار پر کیسا وقت گزر رہا ہے۔ ٹہلتے ہوئے چلے اور بھیڑ کاٹ کر درّاتے ہوئے پہنچے۔ اہو ہو ہو۔ یہ بانکے یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ ہم ٹہلتے ہی رہ گئے، اور حریف جھانسا دے ہی گیا۔ تلوار کو ذرا ٹیکا اور زن سے اس پار آن پہنچے۔ بھئی کھلاڑی خبردار اناڑی۔ ہاتھ اٹھایا اور میں نے چپر غٹو کیا، اور ٹیٹوا لیا، بانکے کے دل میں ڈھارس ہوئی کہ تمسک ہے خداوندا! جان بچائی، از سرِ نو زندگی پائی، اتنے میں میاں آزاد نے کہا رو کو اور:

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں　　شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
آواز دی زمین نے کہ یا حافظ جہاں　　دہشت سے تھرتھرا گیا مرغِ آسماں

تلوار کا چمکنا تھا کہ سب ساتھی رفیق نام کے بانکے ہُر ہو گئے۔ میدان خالی۔ فقط میاں آزاد اور بانکے ایک طرف کمیدان اور دو شریف زادے دوسری طرف، باقی رفو چکر۔ ایک نے آزاد پر پنجہ چلایا دائیں۔ مگر خالی گیا، پھر کل پر چڑھایا اور دا غا مگر رنجک چاٹ گئی۔ آزاد نے جھپٹ کر ان کو تو ایسا چرکا دیا کہ تلملا کر گر پڑے۔ دوسرے حضرت دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بانکے سٹک گئے۔ اب میاں آزاد اور کمیدان۔ وہ کڑک پر جھکے، انھوں نے نہایت خوبصورتی سے چوٹ روک کر سر پر ہاتھ لگانا چاہا۔ اس نے ردکا، اور چاکی کا ہاتھ دیا۔ الغرض آدھ گھنٹے تک اِن کے اُن کے شپا شپ تلوار چلا کی۔

آخر کار انھوں نے بڑھ کر جنیو کا وہ کافر ہاتھ لگایا کہ بھنڈار اٹک کھل گیا۔ مگر کمیدان بھی گرتے گرتے باہرہ دے ہی گیا۔ طرفین سے خون کے تراٹے بہنے لگے۔ اِدھر یہ اُدھر وہ دھم سے گرے۔ انھوں نے کہا یا علیؑ! وہ بولے الااللہ!

بھولے بھالے نواب

کمال بھی کیا چیز ہے، واللہ ان کے ٹھاٹھ دیکھیے کہ کیا آن بان ہے۔ جدھر گزر ہوتا ہے انگلیاں اٹھتی ہیں۔ شدہ شدہ نوابوں رئیسوں میں بھی ان کا ذکر خیر پہنچا۔ رئیسوں کو مرض ہے کہ پہلوان، پھکیت، بنوٹیے کو ساتھ رکھیں۔ بگھی پرے کر ہوا کھانے نکلیں۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ اوپچی بنے ہوئے، دو دو ولایتیاں کمر سے لگائے، تنے ہوئے جا پہنچے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نواب صاحب اپنی ماں کے لاڈلے، اندھیرے گھر کے اُجالے، بھولے بھالے، مسند پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ تمام عمر زنان خانہ ہی میں حضرت نے پرورش پائی تھی۔ کبھی گھر کے باہر جانے تک کی نوبت نہ آئی تھی۔ گویا باہر قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یاروں دوستوں سے گپیں اڑانا، کبھی چوسر کا رنگ جما یا کبھی بازی لڑی، کبھی پو پر گوٹ اڑی، کبھی سہ بازی دینی پڑی، کبھی چکمہ اڑانے لگے۔ ۶ آفتاب آیا ہے سورج کنڈ میں۔ ۶ بزن ٹیپے کہ کفرستان بلرزو، تاج کی کھیل اعلیٰ، غلام نہ ارد، برات کا سر۔ یہ فقرے اڑے۔ پھر شطرنج بچھی۔ شاطر اپنے اپنے منصوبے کرنے لگے۔ کسی نے پیادیں کی۔ کسی نے گرد پیلا، مہرے کھٹا کھٹ پٹتے تھے۔ کشت بادشاہ کہ پھر کشت۔ وہ گھوڑا پیٹ لیا۔ وہ پیادہ ٹھپک لیا۔ رُخ پھرا دیے۔ فکر کے میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ جب دل گھبرایا تو مدک کا دم لگایا۔ چانڈو کے چھینٹے اڑائے۔ افیون کی چسکی پی۔ اس دن حضرت اپنے صاف ستھرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں میر آغا بیٹر کو موٹھ کرتے ہوئے تشریف لائے، اور آداب بجا لا کر دو زانو بیٹھ گئے۔ میر آغا ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پاتے تھے کہ اچھے مرزا پونڈا چھیلتے ہوئے آ ہی گئے۔ اور ایک کونے میں جا ڈٹے۔ میاں جھمن انگرکھے کے بند کھولے، گدی پر ٹوپی رکھے، کھٹ سے موجود۔ آکادنی دن سے داخل۔ پھر کیا تھا تو آ، میں آ، دس پندرہ حضرات جمع ہو گئے۔ مگر سب جھنڈے تلے کے شہدے، چھٹے ہوئے گرگے۔ کوئی چینی کی پیالی میں افیون گھول رہا ہے۔ کوئی چانڈو کا قوام بنا رہا ہے۔ کسی نے گنڈیریاں بنائیں۔ کسی نے امیر حمزہ کی داستان چھیڑی۔ سب اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہوئے۔ اتنے میں نواب صاحب نے میر آغا سے پوچھا کہ میر صاحب! آپ نے خشکی کا درخت

بھی ملاحظہ فرمایا ہے۔

میر آغا: حضور قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی ستر اور دو چوہتر (۷۰ بہتر لاحول مجھے تو گنتی بھی نہیں آتی)، بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن حضور ہو گا درخت بڑا جبھی کیا۔ ایک عالم کی اس سے پرورش ہوتی ہے۔ جسے دیکھو خشکے پر ستے لگاتا ہے۔ پھر آخر یہ آتا کہاں سے ہے؟

اچھے مرزا: قربان جاؤں درخت کے بڑے ہونے میں کیا منت ہے۔ کشمیر سے لے کر قربان جاؤں بڑے گاؤں تک اور لندھن سے تا بولایت، سب اس کے خوشہ چیں ہیں۔ مگر حضور بنگال میں خشکے کے پیڑ بڑے بڑے کوتی بلینڈی کے برابر ہوتے ہوں گے۔ وہاں تو اسی پر دار و مدار ہے۔

نواب صاحب: میرا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ درخت ہوگا عظیم الشان، لیکن ہاں! دریافت طلب یہ بات ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ مناسبت ہے۔ اگر یہ دریافت ہو جائے تو پھر جانیے کہ ایک نئی بات ایجاد ہوئی، اور بھئی سچ پوچھو تو تحقیقات کے بھی یہی معنی ہیں کہ جب تک ایک ایک بات کی خوب چھان بنان نہ ہو، تب تک لطف نہیں۔

میتا بیگ: حضور برگد سنا بڑا عظیم الشان درخت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب؛ نیم کا پیڑ تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کتابوں میں البتہ پڑھا ہے کہ۔ ؎ : برگد کی جٹائیں بال اس کے" اگر درخت بڑا نہ ہوتا تو شاعر مثال کیوں دیتے۔

چھٹن: ہم نے کیلے کا پیڑ، امرود کا پیڑ، گیندے کا پیڑ، خربوزے کا پیڑ، یہ سب انھیں انکھوں سے دیکھ ڈالے۔

آزاد: بھلا یہاں کسی صاحب نے واہ واہ کی پھلیوں کا پیڑ بھی دیکھا ہے؟

گپّی: جی ہاں حضرت! ایک دفعہ نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا، مگر شیر جوڑ کا راتو میں گیندے کے درخت پر جھپ سے چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ پتی کیسی ہوتی ہے۔

منے میاں: بھئی خشکے کے درخت کا کچھ تو حال دریافت کرنا چاہیے۔ یہ بھی فریکشن ہو گیا ہے کیا، کہ لاکھ جتن کیجیے، بھید ہی نہیں کھلتا۔ اور یوں گدّے بازیوں سے کام نہیں چلتا۔ پیپل سے بڑا درخت تو آج تک سنا ہی نہیں، حتیٰ کہ لوگ اس کے سایہ تلے کے لوگوں کی قسم کھاتے ہیں۔ مثلاً۔ ؎ "پیپل تلے کے بھتنے کے شیطان کی قسم"۔ انشاء اللہ کہہ گئے ہیں۔

؎ مشہور اردو شاعر انشاء اللہ خاں انشاء مراد ہیں متوفی ۱۲۳۳ھ

اچھے مرزا : قربان جاؤں ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار کیا۔ سب سنی سنائی کہتے ہیں۔ ع شنیدہ کی بود مانند دیدہ'' قربان جاؤں غلام نے وہ بات سوچی کہ سنتے ہی پھڑک جایئے۔ قربان جاؤں کہتے ہوئے لب بندھے جاتے ہیں۔

نواب صاحب : ہاں واللہ میر صاحب۔ آپ کو قسم ہے پنجتن[1] پاک کی جو نہ کہیے۔ حضرت اب اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔ ے واللہ ہے! مجھے یقین ہو گیا کہ آپ نے اس کی لم دریافت کر لی ہوگی۔ واللہ دور کی کوڑی لائے ہو۔

اچھے مرزا : قربان جاؤں (کتارے کو ٹیک کر اور نیم خیز ہو کر) اگر خشکے کا درخت ہوگا تو اس کتارے کے برابر ہوگا۔ جَو بھر بڑا نہ تل بھر چھوٹا۔

نواب صاحب : واللہ واہ! میر صاحب کیا بات نکالی ہے۔

مصاحبین : سبحان اللہ واہ اچھے مرزا واہ، میرزا صاحب قربان اس سوجھ بوجھ کے۔ کیا شیریں بیانی ہے۔ واللہ اس کتارے کے صدقے۔

آزاد : آپ تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ نکلے کیا بات پیدا کی ہے بھئی۔ معلوم ہوتا ہے سفر بہت کیا ہے۔

اچھے مرزا : کون؟ میں نے، سفر، ارے توبہ! قسم لو جو نخاس[2] سے باہر گیا ہوں۔ مگر میاں میں لڑکپن ہی سے ذکی تھا۔ والد مرحوم تو بالکل بے وقوف تھے، مگر اماں جان بلا کی عورت تھیں۔ اف فوہ! وہ بات میں بات پیدا کرتی تھیں کہ اچھے اچھے مردوں کی عقل دنگ ہو جائے۔ سترہ برس کی عمر تک انھوں نے ہمیں پالا پروسا۔ پھر بھلا ہم برق کیوں نہ ہوں۔

اتنے میں غل غپاڑے کی آواز آئی۔ ہائیں! خیر تو ہے بھئی آخر ماجرا کیا ہے۔ اندر سے مبارک قدم لونڈی، پاؤں ننگے، سر پیٹتی ہوئی آئی۔ حضور حضور میں صدقے واسطے خدا کے جلدی چلیے۔ یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے۔ پڑوس میں موئے سنڈے خون کیے ڈالتے ہیں۔ بڑی بیگم صاحب کھڑی رو رہی ہیں،

---

[1] یہ لفظ ان پانچ مقدس ہستیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت علیؓ۔ حضرت فاطمہؓ۔ حضرت امام حسنؓ۔ حضرت امام حسینؓ شہید کربلا۔

[2] نخاس لکھنؤ کا قدیم بازار ہے، جہاں پرانی چیزیں بکثرت فروخت ہوتی تھیں۔ ہفتہ میں ایک دن بہت بڑا بازار لگتا تھا۔ یہ بازار اب بھی موجود ہے، لیکن اب پرانی اشیاء کی خرید و فروخت برائے نام رہ گئی ہے

کہ میرے بچے پر آنچ نہ آجائے۔ اور سنیئے! پچاس قدم پر تو جھگڑا ہو رہا ہے، ان کے یہاں کھل بلی مچ گئی۔ نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے۔ دروازے سب بند۔ اب کسی کو حکم نہیں کہ زور سے بولے۔ اتنے میں ایک مصاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا کہ پیر و مرشد! میاں آزاد پھر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ گنڈیری چھیلنے کے کام کے نہیں۔ قوام بنانا نہیں جانتے۔ بیڑ مٹھیا نے میں جانگلو۔ ان کو بھیج کر دریافت نہ کرائیں کہ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے۔

مبارک قدم : ہاں ہاں بھیج دیجیے کہیے کتے کی چال جائیں، اور بلی کی چال آئیں۔

میاں آزاد نے ایک خدمت گار کے ہاتھ میں تیغ اسفہانی دی اور خود کٹارے کر اینڈتے ہوئے چلے، راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے ہیں کہ کیوں بھئی یہ فساد کیا ہے؟ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے؟ ایک نے کہا اجی چکمنڈی[1] میں بُز قصابوں میں چھیچھڑے پر چھری چلی۔ ایک شخص گوشت لینے آیا تھا اس کو سر دست یہ سوجھی کہ اپنے کتے کے لیے چھیچھڑے لے بھاگے۔ جب بوچڑ نے دبوچا، تو سب بوچڑوں کے نام لے لے کر کوسنے اور صلواتیں سنانے لگا۔ اس چھیچھڑے پر چھری چل گئی۔ ایک نے پچھاڑا۔ دوسرے نے تنگڑی لی۔ اور وہ تو چھٹنے سے چوری چکاری میں برق ہو گیا ہے۔ اس دل گردے کو تو دیکھیے کہ دن دہاڑے آنکھ میں خاک جھونک کر دکان پر سے مال غائب کیا۔ یہ چوری ہے یا سینہ زوری۔ پانچ چار قدم آگے بڑھے تو دو چار آدمی باتیں کرتے جاتے تھے، کہ میاں ہوا یہ کہ پنساری نے پڑیا میں جمالگوٹہ باندھ دیا، بس انھوں نے آتے ہی گردن ناپی کہ مغزِ کدو کے عوض جمالگوٹہ ملا دیا۔ اور دس قدم چلے تو ایک شخص نے کہا وہ تو کہیے خیریت گزری، کہ جاگ ہو گئی، نہیں تو بھیڑیا گھر بھر کو اٹھا لے جاتا۔ ہائیں بھیڑیا کیسا۔ جی حضور ایک منہار کے گھر سے بھیڑیا تین بکریاں، دو مینڈھے، ایک خرگوش، اور ایک خالی پنجڑا اڑا لے گیا۔ اس کی عورت کو بھی پیٹھ پر لاد چکا تھا، کہ منہار جاگ اٹھا۔ اب میاں آزاد چکرائے کہ بھئی یہ عجب بات ہے، جو ہے نئی سناتا ہے۔ انوکھی روایت بتاتا ہے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ پندرہ بیس آدمی مل کر چھپرا اٹھاتے ہیں۔ اور غل مچا رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ، کوئی کہتا تھا کہ چھیچھڑوں پر چھری چلی۔ کوئی پنساری اور جمالگوٹے کی کہانی سناتا تھا۔ ایک گرگِ باراں دیدہ، بھیڑیے کی روایت بٹ لائے۔ بس دس ہی قدم میں پچاسوں باتیں سننے میں آئیں، اور قریب آئے تو ٹائیں ٹائیں فش۔ معقول جتنے منھ اتنی باتیں۔ جتنی زبان اتنے ہی بیان۔ الاماں! اور واللہ ہنسی تو یہ آتی ہے کہ نواب صاحب کیسے بدحواس ہو کر غڑاپ گھر کے اندر ہو رہے

---

[1] لکھنؤ کے وسطی حصے میں ایک محلہ ہے جس میں قریش برادری کی اکثریت ہے۔

اور گھر میں کہرام مچ گیا، رفقا اور مصاحبین نے دروازے بند کر لیے۔ آخر کار ہم اس میدان میں چُن کر بھیجے گئے۔ اللہ ری وحشت، واہ میاں واہ، بانکپن ختم ہے۔

ایک دن کوچہ گردوں کے پیر پہلوان کشتی گیر منازلِ دہشت کے ہفت خواں، لٹھ تیتے جوان، میاں آزاد ادھر اُدھر ولایتی لٹکائے، بانکے بنے ہوئے، اکڑے اور تنے ہوئے، اپنے آقا نواب صاحب بہادر کے یہاں پہنچے۔ مجرا عرض کرتا ہوں حضرت! آیئے آیئے! آج تو میاں آزاد پورے اوپچی بنے ہیں۔ آپ ڈھال نہیں باندھتے؟ پیر و مرشد ڈھال تو زنانوں کے لیے ہے۔ ہم عمر بھر ایک انگ لڑا کیے تلوار ہی سے چوٹ لگائی، اور اسی پر چوٹ روکی، یا خالی دی، یا کاٹ گئے۔ یہ بنوٹ کے ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ کون ایسا فن ہے کہ جس میں ہم طاق نہیں، شہرۂ آفاق نہیں۔ واہ آکا کیوں نہ ہو دھوم ہے۔ یہ سب حضور کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ ایک دن حضور کو تلوار کے ہنسر دکھاؤں گا، اور حضور کی آنکھوں میں آبِ شمشیر سے سرمہ لگاؤں گا۔ صاحب بندہ درگزرا۔ یہ کھیل اجڈپن کے ہیں۔ میری روح کانپتی ہے۔ تلوار کی صورت دیکھے جوڑی چڑھ آتی ہے۔ ہاں میرا صاحب جیوٹ کے آدمی ہیں۔ ان کو چورنگ کیجیے۔ وہ اُف کرنے والے نہیں۔

مرزا جی : خداوند:

مرا ہچنیں چہرہ گلفام بود بلورنیم از شوخی اندام بود

مگر قربان جاؤں حضور:

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے یہ قصہ ہے جب کا کہ مرزا جواں تھا

اور اب تو:

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اب بال پک گئے۔ دانت چوہے کی نذر کیے۔ گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ کمر دوتا ہوئیں۔ بصارت نے ٹکا سا جواب دیا۔ ہوش و حواس چمپت ہوئے۔ بس ایک گرمٹ تو عصائے پیری ہے۔ باقی خدا کا نام۔ کیا کہوں حضور! جس وقت یار ان سربل گنڈیریاں چوستے ہیں۔ منھ دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ اور گنڈیری والا جب صدا دیتا ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔ اتنے میں حوالی موالی میاں دُنی، میاں گالی، آن موجود ہوئے۔ دربار گرم ہے۔ اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

مٹر گشت : خداوند آج تو بڑی تشویش کی بات سنی۔ میرے تو حواس فقرہ ہو گئے۔ شہر بھر

میں کھل بلی مچی ہے۔ اللہ بچائے! اب کی گرمی کی فصل خیر سے گزرتی نہیں سوجھتی۔ آثار برے ہیں۔

نواب : کیوں کیوں، خیر باشد کیا قیامت آنے والی ہے؟ یا آفتاب سوا نیزے پر ہو رہا یا دوسرا طوفان نوح کا خیمہ نصب ہو گیا ہے۔ یہ کھل بلی کیسے مچی آخر ماجرا کیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی؟ یہ تو بڑی بری سنائی۔ اللھم احفظنا من کل البلیات۔

مرزا : اے حضور! یہ جب آتے ہیں ایک نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں۔ خدا جانے کون فرشتہ ان کے کان میں پھونک جاتا ہے۔ اس وقت ایسی سنائی کہ واللہ نشہ ہرن ہو گیا۔ جمائیاں آنے لگیں۔ ابھی افیم گھولی تھی، ابھی ابھی ڈبیا کھولی تھی۔ حضور کے سامنے ہی چسکی پی۔ مگر ان کے آتے ہی نشہ ہرن ہو گیا۔ ان کی عادت ہے کہ جب آئیں گے کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ ضرور سنائیں گے۔ مفت میں نشہ اتر گیا۔

مٹر گشت : اجی آپ کس کھیت کی مولی ہیں؟ ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوئے ہیں۔ آپ نے تو جہاں افیون کا جوگا کھایا، اور آنکھیں بند کیں، بس پھر بولنا قسم ہے۔ کسی نے بات کی اور آپ کی پینک میں فرق آیا۔ جب پہلی تاریخ آئے گی تو آپ کی آنکھیں کھل جائے گی۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اور دو چار دن بڑھ بڑھ کر باتیں بنا لو۔ ماما پختیاں اڑا لو۔ لیجیے صاحب ہم تو ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر خبریں لائیں، آپ دن بھر پینک میں اونگھا اور مٹھائی ٹونگا کریں، اور ہمیں کو الّو بنائیں۔ اینڈی بینڈی سنائیں۔ پہلی کو قلعی کھلے گی بچہ۔ صورت بگڑ جائے تو سہی۔

نواب : کیا کیا پہلی تاریخ کیسی؟ ارے میاں تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو کچھ حال تو کہو۔ آخر پہلی کو کیا ہونے والا ہے؟

مٹر گشت : اے حضور یہ نہ پوچھیے۔ بس کچھ عرض نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک حلوائن ابھی جوان جہان ہے۔ کچوری کے ایسے پھولے پھولے گال، آنکھیں جیسے بتاسہ بھینی، کہیں اتفاق سے اونٹا ہوا دودھ جو مارے ہوکے کے پی گئی، تو پیٹ پھول کے کپا ہو گیا، کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ نسخہ پلایا۔ مگر وہ انٹا غفیل ہو گئی۔ اب سنیے کہ اس کا میاں اس کو بہت چاہتا تھا۔ جب چتا پر جانے لگی تو ایک دفعہ ہی کلبلا کر اٹھی۔ آئیں۔ ارے رام، ارے باپ رے باپ، توبہ توبہ، جیو کا بھیوا؟ حلوائیوں اور گنواروں نے وہ بم مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ ارے چیتی ہو۔ لو دیکھو۔ لہاس ہلت ہے۔ آخر کار دو چار حلوائیوں نے جی کڑا کر کے لاش کو چپکے سے گھسیٹ لیا، تو آہستہ سے کہتی کیا ہے۔ (ارے یو کا ؤ اندھیر مچا یو۔ ارے میں جلی جات ہوں رے) جھٹ پٹ کفن پھاڑ کر اس کو نکالا تو ٹیاں سی اٹھ بیٹھی۔ حضور قسم ہے خدا کی اس نے وہ وہ باتیں بیان کیں کہ سنتے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہنے لگی کہ جب مری تو فرشتوں نے مجھے فرش گل پر چلایا۔ اور

میری پیاری پیاری صورت پر عاشق ہو گئے۔ دو تین میں خوب گدّے بازی ہوئی۔ دونے تو خوب لڑھکی کھائی۔ ایک نے مجھے اٹھا کر خدا کے پاس پہنچایا۔ خدائن بیٹھی پوری بیلت رہی ہیں (نقل کفر کفر نباشد) ہم کا دیکھ کر خدا ڈپٹا کہ اس کو لے جاؤ۔ اتنے میں تم نے چتا ہی پر رکھ دیا۔ حضور مجھے اس کی بولی تو یاد نہیں مگر مطلب یہی تھا۔ پھر اس نے کہا کہ پہلی کو بڑا اندھیر اگپ چھا جائے گا، اور طوفان آئے گا۔ جتنے گنہگار بندے ہیں سب سے اس دن منکر نکیر سوال کریں گے۔ اور افیمی جس گھر میں ہوں گے اس کو فرشتے جلا کر خاک کر دیں گے۔

نواب : میرزا صاحب: بے بوریا بدھنا اٹھائیے۔ آپ کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ ناحق کہیں فرشتے میری کوٹھی پھونک دیں تو کہیں سنوائی بھی نہ ہو سکے۔ قبلہ اب میرا پیچھا چھوڑیے، بس بقچہ سنبھالیے کہیں اور بستر جمائیے۔

میرزا : پیرومرشد یہ بڑا اڑی مار بے ایمان آدمی ہے۔ حضور تو بھولے بھالے رئیس ہیں۔ جس نے جو کہا فوراً باور کر لیا۔ جو اس کی کچھ بھی اصلیت ہو۔ بھلا کہیں فرشتے گھر پھونکا کرتے ہیں۔ ذرا تو سوچیے اس مردود کے بھرّوں میں آن کر مجھ بڈھے کو نہ نکالیے۔ غلام پشتہا پشت سے اسی دربار میں پرورش پایا کیا ہے۔ اب کس کا دامن پکڑوں۔ حضور کا سایۂ دامن کافی ہے۔ اس مروک کی افترا پردازی پر نہ جائیے۔ یہ تو میرا جانی دشمن ہے۔ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔ ارے واہ رے فقرہ باز، اچھی بٹی۔ حلوائن کی چھوکری مری بھی، اور جی بھی اٹھی۔ جھوٹے کی ایسی تیسی۔ بھلا کسی نے بھی یہ باتیں سنی تھیں؟ اور سنیے کہتے لگے آنکھیں جیسے بتاس پھینی واہ بھئی واہ کیا مثال دی ہے۔

ظریف : حضرت یہ افیون کا تلازمہ تھا۔

میرزا : جی بس آپ بیٹھے رہیں کونے میں۔ دل لگی کا موقع نہیں ہے۔ آپ کو تو سوائے مسخرے پن کے دوسری بات ہی نہیں آتی۔

نواب : خیر صاحب یہ جھگڑا تو ہوا ہی کرے گا آپ اپنا سنبھلتا کریں۔ میرے باپ دادا کی ملکیت مفت میں فرشتے پھونک دیں تو میں کہیں کا بھی نہ رہوں گا۔ آپ ہیں کس مرض کی دوا۔ چارپائیاں توڑا کرتے ہو۔

میرزا : واہ ری قسمت۔ برسوں ریاض کیا۔ جان لڑا دی۔ بکری کی جان گئی کھانے والے کو مزہ نہ آیا۔ اس ملعون سے خدا سمجھے، جس نے میرے حق میں یہ کانٹے بوئے۔ خدا کرے اس کا آج کے ساتویں ہی دن جنازہ نکلے۔ جیسے ہی یہ آکر بیٹھا میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ سمجھا کہ کچھ دال میں کالا

ہے۔ سو یہ گل کھلا۔ اچھا بچہ چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔

نواب صاحب مصاحبوں کو یہ نادری حکم دے کر زنان خانہ میں گھس گئے۔ کہ میرزا صاحب کو نکلوا دو۔ وہ تو داخل دفتر ہوئے یہاں میرزا صاحب کی لے دے شروع ہو گئی۔

ہمارے بھولے بھالے اماں والے نواب صاحب کا زنان خانہ میں داخل ہونا تھا کہ ماں نے چٹ پٹ بلائیں لیں۔ ماما اصیلوں نے دعائیں دیں، چھوٹی بیگم صاحبہ نے آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔ سب نے منتیں مانیں۔ اب کی نوچندی خیر سے گزرے تو مسجد میں گھی کے چراغ جلائیں، کمال شاہ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں۔ ہے ہے پہلی تاریخ گیا آتی ہے جیسے کال آتا ہے۔ اے خدا کے لیے اس نگوڑے افیمی کو ٹہٹارو۔ موئے نے افیم گھول گھول کر اتنے دن سیہ کاری کی جب دیکھو سوگ نشینوں کی طرح ماتم میں رہتا ہے۔ ادھر باہر رفقا اور مصاحبین نے میرزا بے چارے کا ٹٹوا دبوچا۔ اور نکدم کر دیا۔

مٹر گشت : میرزا جی افیون کا ڈبا بغل میں دبائیے، اور چلتے پھرتے نظر آیئے۔ سرکار کا نادری حکم ہے۔ اور چھوٹی بیگم صاحبہ مہنا متھ مچا رہی ہیں کہ اس بڈھے خبیث کو کھڑے کھڑے شہر بدر کر دو۔ سو اب کھسکیے ورنہ بُری ہو گی۔

مسیتا بیگ : واجبی بات ہے۔ سرکار چلتے چلتے حکم دے گئے تھے ہم لوگ مجبور ہیں۔ اب آپ اپنا سیتھا کیجیے۔ ابھی سویرا ہے۔ نہیں ہم پر ٹپس پڑے گی۔ اور بھی جب فرشتوں کے آنے کا ڈر ہے۔ تو کوئی تم کو کیوں کر اپنے گھر میں رہنے دے۔ جوکھم ہے نہ، اور جو فرشتوں نے ایک ننھی سی چنگاری رکھ دی تو کہیے مکان جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائے گا یا نہیں؟ پھر کیسی ہو گی۔

میرزا : ابے نامعقول فرشتے کہیں گاؤں جلایا کرتے ہیں۔ وہی اوٹ پٹانگ باتیں بکتا ہے، جن کا سر نہ پیر۔ لو صاحب ہمارے رہنے میں جوکھم ہے۔ جو آٹھوں پہر ڈیوڑھی پر بنے رہتے ہیں۔ تم سے اٹھائی گیرے، اور ہمیں نکلوائیں۔ خدا کی شان۔ تم سب کی ملی بھگت ہے۔ ارے میں تو تمھاری قبر تک سے واقف ہوں اچھا اڑنگا دیا۔

جھمن : اڑنگا ورنگا میں نہیں جانتا، اب آپ کھسکنت کی ٹھہرائیں قبلہ! بہت دن بیٹھے ٹکڑے اڑائے، چغل خور۔ رئیس کا مزاج بگاڑ دیا۔ ذرا سی خطا کسی سے سرزد ہوئی، اور آپ نے جڑ دی۔ جھُس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی۔ صدہا تو خدمت گار تو نے موقوف کرائے۔ اور پچاسوں بھلے مانسوں کی روٹی لی۔ بندہ بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ یہ چغلی کھانا کیا معنی۔ ع اصل بد از خطا، خطا نکند۔ تو سہی

جو جہنم میں نہ ملا دوں۔ ۶ سڑی تو صاحبی، اس پر چبوترہ گچ گا، ٹکے کا آدمی اور لگا فرعون سے ٹکر لڑنے۔ پہلے اپنی ہستی کو دیکھ۔ غفور! میاں غفور! میرزا نے تمہاری بھی تو بیخ کنی کی فکر کی تھی۔

غفور : (خدمت گار) کون مرزا جی؟ یہ تو اپنے باپ کی جڑ کو کھودنے والے آدمی ہیں۔ اندر سے باہر تک کوئی ماما، کوئی اصیل، کوئی آدمی ان سے خوش نہیں۔ ایسے چرچرے تو دیکھے نہ سنے۔ آج ہی تو ہتھے چڑھے ہیں۔ ان کے سر پر تڑ تڑے پڑیں۔ پھر سیر دیکھیے، جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑک دیا۔

مسیتا بیگ : میرزا اگر غیرت ہے تو اس مصاحبت پر پا مردی سے لات مار دے۔ جس اللہ نے منھ چیرا ہے، وہ رزق بھی پہنچا دے گا۔

مبارک قدم : (لونڈی) غفور! غفور! چھوٹی بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ اس موئے افیمی کو شہر بدر کر دو، فرماتی ہیں کہ جب تک یہ دفان نہ ہو گا دہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔

مرزا : شہر بدر! کیا شہر شملہ ہے، کچھ لوٹ پڑی ہے۔ تمام شہر پر بیگم صاحبہ کا کیا اجارہ ہے۔ وہ ابھی کل آئیں یہاں اس گھر میں۔ عمر تیر ہو گئی۔ اب وہ ہمیں گدھے پر سوار کرا کر شہر بدر کرواتی ہیں۔ جیسے نواب ویسے مصاحب۔ ویسی ہی بیگم صاحبہ۔

اتنے میں یاروں نے جو شہ پائی تو چو طرفہ سے للکار اٹھے۔ ابے او نمک حرام! چھوٹا منھ بڑی بات، بیگم صاحبہ کے کہنے کو دلکتا ہے۔ اتنی پڑیں گی بے بھاؤ کی کہ یاد کرو گے بچہ، بہت لن ترانیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ کیسے بلون پر تھے۔ جب دیکھو نتھنے پھلائے بیٹھے ہیں۔ بات کی اور لپک کے چکت دی۔ آپ ایسے شیر ہو گئے کہ بیگم صاحبہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ چاند گنجی کر دی جائے گی۔ جو زیادہ ٹرائے۔

مرزا : اب جو یہاں پانی پیے تو اس کی ہفتاد پشت پر لعنت۔ چو طرفہ سے ہمیں پر بوچھار ہونے لگی۔ اٹھائی گیروں کا یہاں طوطی بولتا ہے۔ لو خدا حافظ: نظم

نواب کی چاہ دیکھے گا — مرزا کا نباہ دیکھے گا
لچوں سے کھڑے کھڑے سمجھ لوں — انشاء اللہ دیکھے گا
جوتی خورے ہمیں بنائیں — ماشاء اللہ دیکھے گا
افیوں کی لم میں یاں سے نکلے — تقصیر و گناہ دیکھے گا
مرزا کی اپچ افیم کا رنگ — سبحان اللہ دیکھے گا

مصاحبین : واہ کیا زٹل قافیہ ہے۔ بڑے شاعر کی دم بنے ہیں۔ ہات تیرے کی، چلیے نہیں گردن ناپی جاوے گی۔ ے بڑھو، نہیں دوں گا دھکا، بس لڑھکنیاں کھاؤ گے۔

مرزا بھی تو پیر فرتوت مگر تیکھے۔ جھٹ بھرا ہوا تپنچہ لے کر کھڑے ہو گئے۔ پاجیو! یہ لام کاف چہ معنی دارد۔ میں بھی ہمایوں[1] کی نسل سے ہوں، کوئی ایسا ویسا نہیں۔ تم ٹکڑ گدوں کی یہ مجال کہ ہم کو مارنے اٹھو۔ اس پر سب کے سب کھل کھلا کر ہنس پڑے، کہ واہ رے بڈھے بڑا تیکھا ہے۔ رسی جل گئی، رسی کا بل نہیں گیا۔ القصہ مرزا نے افیم کی ڈبیا اٹھائی اور چلے۔ لو بھئی:

رفتیم یاران تخفیف تصدیع گر درد سر بود از ما شمارا

خدمت گاروں نے ان کے جلانے کے لیے فقرہ چست کیا، کہ مرزا صاحب کبھی کبھی آ جایا کیجیے۔ ایک بولا لائیے ڈبیا میں پہنچا دوں۔ دوسرے نے کہا کہیے تو گھوڑا کسوا دوں۔

مرزا : جو ہاتھ اپنے سبزی کا گھوڑا لگا
تو سلفے کا اور اس کو کوڑا لگا

مرزا تو چار ناچار! بحسرت و ارماں نکلے۔ ادھر پہلی تاریخ آئی تو مڑ گشت چکرائے کہ اب میں جھوٹا بنا، اور ساکھ گئی۔ لوگوں نے نواب کو چنگ پر چڑھایا کہ حضور! جو ہم کہیں وہ کیجیے تو آج کی بلا ٹل جائے۔ نواب صاحب نے مصاحبوں کو سیاہ سفید کا اختیار دے دیا۔ اب سر شام سے کیفیت قابل دید تھی۔ ایک طرف تو برہمن بیٹھے استت پڑھ رہے ہیں۔ اور کھٹا کھٹ جاپ کر رہے ہیں سواہا سواہا کی آواز آ رہی ہے۔ دوسری طرف قرآن خوانی ہو رہی ہے، اور علما قرارت کے ساتھ عمل پڑھ رہے ہیں۔ امّن یجیب المضطر اذ دعاہ ویکشف السّوء۔ گھر بھر میں چراغاں کی بہار۔ اور چراغوں کی قطار، ہزاروں لمپ، جھاڑ کنول روشن ہیں۔ اور محفل رقص و سرود آراستہ ہے۔ قدسی تماشا دیکھیں تو لاہوت کو بھول جائیں:

جب تک کہ نہ دل کی بے کلی جائے
او دائرہ والے گت چلی جائے

حال اور چھیڑے جائے یہی آہنگ، یہی رنگ، فرشتوں کو پھانسنا کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ اس وقت تو حضرت جنون ہمارے مرشد کامل ہیں۔ ہیر پھیر کر جھنجھوٹی کی دھن ہے۔ سنا ہے کہ سبحان ملاء اعلیٰ اسی راگ پر مفتون ہیں۔ اور اب ان سے خوف ہی کیا ہے۔ وہ تو انچھیوں کی تلاش

---

[1] ہمایوں متوفی ۱۵۵۶ء ہندوستان کا مشہور بادشاہ دہلی میں اس کا تعمیر کرایا ہوا شاندار قلعہ موجود ہے۔ اکبر بادشاہ اس کا بیٹا تھا۔

میں آتے ہیں، میاں کوسوں افیمی کا پتا نہیں۔ مرزا اسد سدھارتے نہیں تو معاذ اللہ کا مقام ہوتا۔ اس وقت خدا جانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔

نواب : ہوتا کیا کوٹھی کی کوٹھی بھک سے اڑ جاتی۔ توبہ کی کہ اب کسی افیونی کو آنے تک نہ دوں گا۔ اس کالی بلا سے اللہ بچائے۔ چانڈو تک خیریت ہے۔ افیم کا بندہ دشمن ہو گیا۔ خبردار آج سے افیونی دہلیز کے پار نہ ہونے پائے۔ ہے ہے، جو کہیں مرزا ہوتے تو فرشتوں نے وہ دند مچائی ہوتی کہ توبہ ہی بھلی۔ دل مسوس کر رہ جاتا۔ پہلی تاریخ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ بارے صد شکر کہ بخیر گذشت۔

مسیتا بیگ : حضور میاں شوری کا ٹپا سنیئے گا؟ یا کوئی غزل چھیڑ دی جائے، اچھا غزل ہی سنیئے۔ ذرا اشارے کی دیر تھی دو تین طوائفوں نے مل کر یہ غزل گائی ے

مرا گھر کہاں ان کے آنے کے قابل — بلاؤں اگر ہوں بلانے کے قابل
کبھی بوسہ مانگا دہن کا تو بولے — چلو تم نہیں منھ لگانے کے قابل
ہنسا میں تو ہنس کر کہا اس نے مجھ سے — ہوئے آپ بھی مسکرانے کے قابل
کہا کچھ جو میں نے تو بولے وہ صفدرؔ — ہوئے تم بھی باتیں بنانے کے قابل

بھئی واہ! واللہ کیا دور کی سوجھی، کہ محفلِ رقص و طرب آراستہ ہو۔ فرشتوں کے پھسلانے کا نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ ماشاء اللہ!

میاں آزاد کئی دن سے ساری کیفیت چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ سوچے کہ ایسے رئیسوں کی سرکار میں نوکری کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ چغلخوری کا بازار ہر دم گرم، ایک کا ایک دشمن۔

ایک دن مرزا جی منڈی میں پونڈے چکار رہے تھے، اور سامنے سے میاں آزاد ہانڈی ہاتھ میں لیے جھومتے جھامتے، گھومتے گھامتے، آرہے تھے۔ جب دوچار ہوئے، تو باہم یوں گرم گفتار ہوئے

آزاد : تسلیم کا چھرا پھینکتا ہوں۔ سن سے بچیے!

مرزا : ہاں! تو میں بھی آداب داغتا ہوں، دن سے سنبھلیے!

آزاد : اللہ اللہ۔ ابھی تک چشمہ لفّاظی جاری ہے۔

مرزا : مگر یار چغل خوروں سے عقل عاری ہے۔

آزاد : کہیے اب کیا شغل، کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟

مرزا : پتنیچے کل پر چڑھے ہیں، آمادہ جنگ ہیں۔ حضرت میں نے دھوپ میں تو بال سفید کیے

نہیں ہیں، ایک در بند ستو در کھلے۔ مگر۔ ع بہر کجا کہ رسید یم آسمان پیداست، ایک اور رئیس کے یہاں گیا، اور جاتے ہی چینی کی رنگ برنگ، پیاری پیاری پیالیوں میں، اس حکمت کے ساتھ افیم گھولی کہ رئیس پیتے ہی پینک میں آ گئے، جس نے چسکی لگائی آنکھیں بند۔ ان ہاتھوں کے قربان، اجی مجھ میں تو وہ جوہر ہے کہ، جہاں جاؤں قدر ہو۔ افیم کا بول بالا، اور پینک کا منھ کالا۔ جب رئیس اور ان کے رفیقوں کو ذری ہوش آیا تو حقے کی پکار ہوئی۔ کوئی ہے؟ دس پانچ آدمی بول اٹھے۔ حاضر! حکم پیر و مرشد۔ ذرا پیچوان تازہ کر کے بھر لانا۔ بھائی ہماری سٹک بھی لاؤ۔ میاں ایک اچھی سی چلم پلاؤ۔ میں تڑ سے حقہ بھر لایا، اور مشکبو تمبا کو دھواں دھار رئیس کو پلایا۔ پینا وینا۔ بخیر، مینال منھ سے لگائے اونگھ رہے تھے۔ جب پھر ہوش آیا تو وہ چار کش پیے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ یہ حقہ کس خدمت گار نے بھرا ہے؟ اس کو ہماری دُلائی انعام دے دو۔ تب تو بندۂ درگاہ ہاتھ جوڑ کر سامنے آن کھڑے ہوئے۔ خداوندا! یہ غلام کی کارگزاری ہے۔ خدمت گار کو اشارہ کیا تو دلائی ایں جانب کے کاندھوں پر، جھک کر سات مرتبے فراشی سلام بجا لایا۔ حق تعالیٰ ایسے رئیسوں کو سلامت رکھے۔ دم غنیمت ہے۔ اس وقت حضور کا بارِ احساں بر دوش ہے۔

رئیس: یہ افیم بھی تو آپ نے گھولی تھی، واللہ مزہ آ گیا۔

بندہ: قربان جاؤں حضور، ایسی افیون پلاؤں کہ قیامت تک پینک رہے دخل کیا کہ بے کیف ہو جائے۔ ہاتھ تلے ہوئے ہیں۔ سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ پیر و مرشد کمال یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں سُرخا سرخ ہو جائیں۔ لال لال ڈورے رنگ جمائیں۔ بلبل کے زیر بال کا لطف حاصل ہو۔ کیا مجال کہ دوسرے کے ہاتھ کی افیم بھائے۔ اب شام کو حکم ہو تو غلام پھر پلائے۔

رئیس: ضرور! شام کیا معنی اب میں آپ کو جانے نہ دوں گا۔ آپ تو واللہ ڈبیا ہی میں بند رکھنے کے قابل ہیں۔ افیون تو کروڑوں روپیہ کی پی ڈالی، مگر ایسی کبھی آج تک نصیب ہی نہ ہوئی۔ واللہ کیا ہاتھ ہیں۔ جی چاہتا ہے چوم لوں۔ میں نے پھر جھک کر فراشی سلام کیا۔ حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ مگر بھائی اس وقت جتنے خوشامد خورے بیٹھے تھے سب کا رنگ فق، اور کلیجہ شق ہو گیا پیٹ میں چوہے چھوٹے کہ اس نے اچھا رنگ جمایا۔ ایسا نہ ہو ہم نظروں سے گر جائیں۔ کل کدھارے کو کہیں دھتا بول دیا جائے تو اُف قیامت ہی کا سامنا ہو۔ واللہ معاذ تدبیر کی کہ ہمارا جما جمایا رنگ پھیکا پڑ گیا، سنیے! فقرا پردازوں نے کیا شیطانی حرکت کی، ایک شخص نے کہا: حضور کی آواز اس وقت کچھ بھاری ہے، دوسرے نے فقرہ چست کیا کہ آواز سے کچھ ضُعف بھی پایا جاتا ہے۔ تیسرے

صاحب بولے نصیب اعدا کیا طبیعت بے لطف ہوگئی۔ چوتھے نبض پر ہاتھ لے گئے۔ اخاہ تپ چڑھی ہے۔ پانچویں نیم حکیم، پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ اُف فوہ! ماتھا کیسا جلتا ہے چھٹے صاحب نے فرمایا کہ حضور کی آنکھوں ہی سے نصیب دشمنان علالت پائی جاتی ہے۔ اب چو طرف سے یہی ہانک سنائی دی کہ رئیس علیل ہیں۔ جب سب نے مل کر کہنا شروع کیا تو وہ بھی گھبرائے۔ فرماتے کیا ہیں۔ ہاں آج تو کچھ بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں، اور نبض میں بھی سرعت ہے۔ اتنے میں ایک مصاحب نے کہا خداوند کیا عرض کروں کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔ خدا جانے کیا ہوگیا، دوسرے نے سر پکڑ کر کہا آف سر پھٹا جاتا ہے۔ تیسرے نے آنکھیں مل کر کہا بھئی آنکھیں نکلی پڑتی ہیں۔ الغرض سب نے ایک نئی بیماری بتائی۔ کسی کو بخار آیا۔ کسی کو جوڑی، کسی کا بدن گنگنا ہوگیا، کسی کا جی متلایا، سب سیکماں بن بیٹھے۔ ایک کانکھنے لگا، دوسرا ہائے ہائے کرنے لگا۔ ہم چکرائے کہ یا رِ خدایا یہ کیا بات ہے۔ یہ سب کے سب ایکدم سے بیمار کیوں کر پڑ گئے۔ ارے! پھر تو میں سوچا کہ یہ یارانِ سر پل کی کارستانی ہے۔ اکھاڑ امل کر۔

رئیس: آخر کچھ سوچیے تو کہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا گل کھلا۔ ابھی تو ہم سب بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ آناً فاناً میں یہ کیسی ہوا چلی کہ دردِ سر دردِ کمر تپ لرزہ نے آدبوچا۔ اس میں کچھ فیہ ضرور ہے۔

مصاحب: حضور کو جہاں کسی نے دو چار چکنی چپڑی باتیں سنائیں، بس دم میں آگئے۔ خدا جانے ان ذات شریف نے افیم میں کیا کیا ملایا تھا، کہ سب کے منھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں، کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

رفیق: کیا پتے کی بات کہی ہے۔ واللہ میری زبان سے لے گئے۔ جیسے افیم پی جی متلانے لگا۔ اور ایک ہم پر کیا فرض ہے۔ سب کا یہی حال ہے۔

لیمو نچوڑ: میں کہنے ہی کو تھا کہ یہ اکھیں تازہ دار حضرت کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں۔ اور حضور سچ کہوں مجھے تو یہ کوئی اٹھائی گیرے سے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیے آنکھوں ہی سے چوٹا پن برستا ہے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے۔ تو ضرور کسی فکر میں آئے ہوں گے۔ ضرور افیم میں کچھ ملا دیا ان کو تھانہ پر لے چلیے۔

خدمت گار: میرے سامنے انھوں نے کچھ جیب سے نکالا، اور افیم کے ساتھ گھولا۔ پھر حقہ بھرا تو تمباکو میں بھی کچھ ملایا۔ اب مجھے ان کی نیت کا حال کیا معلوم تھا۔ بھلا شکل صورت سے تو بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن کسی کے پیٹ میں تو بیٹھا ہی نہیں ہے۔

رئیس : واہ صاحب آپ کے جوہر تو اب کھلے۔ بھلے کو جلد آپ کی ذات پہچان لی، ورنہ آپ تو ایک آدھ کی جان لیتے، اور سنکھیا دے دیتے۔ اب خیر اسی میں ہے کہ آپ چپکے سے کھسک جائیں ورنہ بُری ٹھہرے گی۔

مصاحب : ہم تو ان کو بغیر ٹھیک بنائے نہ جانے دیں گے۔ وہ تو کہیے حضور کی نیک نیتی اس گاڑھے وقت آڑے آئی۔ ورنہ اس نے تو تسمہ تک نہیں باقی رکھا تھا۔ ان کو کوٹھڑی میں بند کر کے خوب ٹھونکے، اور پھر راہ خدا پہ چھوڑ دے۔ مگر ذری خیال رکھے کہ خون نہ نکلنے پائے۔

حضرت تب تو میرے ہوش اڑ گئے کہ خدا ہی خیر کرے بُرے پھنسے دُلائی کیا پائی کہ شامت ہی آئی۔ اب کروں تو کیا کروں۔ بھاگوں تو چور بنوں، بیٹھوں تو پٹھا جاؤں، مگر اتنی تشفی تھی کہ کوتوالی کوئی نہ دکھائے گا۔ ان میں اتنی جرائت کہاں۔ ایک دفعہ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی غنیمت سمجھے کہ از یں چہ بہتر۔ ایک نے دُلائی پر ہاتھ مارا۔ دوسرے نے ہر وتی چھین لی، تیسرے نے کہا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ لیجیے کہاں تو دلائی انعام میں پائی تھی، کہاں شجاع الدولہ[1] کے کوٹھوں کی ہروتی بھی ہاتھ سے دی۔ قہر درویش برجانِ درویش، بھاگا تو یہاں آکر دم لیا۔ رخصت فی امان اللہ!

میاں آزاد دل میں سوچے کہ بھئی رئیسوں کے دربار میں چغل خوروں کی بڑی گرم بازاری ہے۔ ان ملعونوں کی دم میں رسّا نہ باندھا تو آزاد نہیں۔ اس وقت سے بیڑا اٹھا لیا کہ ان کو ٹھیک بناؤں گا۔ پھر سوچے کہ کوشش ٹھکانے لگتا معلوم، ریل گھر پر تو ایک دفعہ بوچڑ بن چکے ہیں! اب کہیں منہار یا چمار نہ بنائے جائیں، کہ ساری مشیخت نکل جائے۔ بھئی کم کھائے غم نہ کھائے۔ اتنے میں میاں آزاد اپنے آقائے نامدار کی کوٹھی پر پہنچے۔ تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے نواب صاحب کو ایک خط دیا، اور کہا حضور مرزا جی نے یہ خط بھیجا ہے۔ اس کو ملاحظہ کر کے جواب عنایت کیجیے۔ مصاحبین کا چہرہ زرد، اور دل سرد ہو گیا: کہ اب اس نے یہ تدبیر نکالی کہ چٹھیاں بھیجنے لگا۔ اے حضور! اس ردی کو چاک کر ڈالیے۔ وہ اور خط بھیجے۔ اتنے ہوئے۔ اے تیری قدرت، یہاں تک آتے کیا پاؤں کی مہندی گھستی تھی۔ ایسے بڑے مشیخت پناہ ہو گئے۔ نواب صاحب نے کہا اچھا پڑھو تو لکھا کیا ہے۔

"مرزا صاحب کا خط"

حقوقِ خدمتِ صد سالہ لعبِ اطفال ست
بکشوری کہ درو کودکانِ خداوند ند

---

[1] اودھ کے دوسرے نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۷۵۳ء

افیمچیوں کے پشت پناہ، مدکیوں کے قبلہ گاہ، دام لعنۃ۔ لاکھ سکھایا پڑھایا مگر تم لونڈے ہی بنے رہے۔ ابھی جمعہ جمعہ اٹھوارے کی پیدائش، اور ہم پر عتاب۔ تمھارے دادا جان تک کی تو میں نے آنکھیں دیکھی ہیں، اور تمھارے لکڑ دادا کے دادا پیر تک کی قبر سے واقف ہوں۔ اس بڑھوتی وقت تم نے مجھکو نکالا۔ ناچ نچاؤں تو سہی۔ سنیے صاحب! ایک بدمعاش نے آکر زٹل قافیہ اڑایا، اور حضرت کو چنگ پر چڑھایا، کہ بیگم کو فرشتے گھر پھوکیں گے۔ ہات ترے جھوٹے کے دم میں رسا۔ اور نواب کو تو کیا کہوں وہ تو بچپا کے تاؤ ہی نکلے جس کو اتنی عقل بھی نہیں کہ فرشتے کہیں جھوپڑے جلایا کرتے ہیں۔ واہ ری عقل قربان، اس فہم و دانش کے۔ لو صاحب اب فرشتے پھس میں چنگاری ڈالنے لگے۔ ارے توبہ! ارے توبہ! ان بے ایمانوں پر آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔ اور دل لگی دیکھیے گا کہ حلوائن مر کر جی اٹھی۔ اس کذب پر شیطان کی پھٹکار۔

نواب اب ذرا تو دل میں غور کرو کہ ساری خدائی بھر میں کہیں بھی اندھیرا گھپ چھایا۔ کوئی بھی فرشتہ آیا۔ ایک بھی گھر جلایا۔ آپ کے یہاں مفت خوروں نے میری بیخ کنی کے لیے یہ بٹی، مگر آپ تو سادہ لوح ہیں۔ سنتے ہی نادری حکم دے دیا کہ نکال دو۔ افسوس ہے۔ "گو سالۂ ما پیر شد و گاؤ نشد"، نام خدا سیانے ہو، گھامڑ ہو، نہ دیوانے ہو، ذرا تو عقل سے کام لو۔ ذرا تو ان خوشامدیوں کے منھ میں کالک ملو، کل کو کہیں بے چاری بیگم پر آنچ نہ آ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی لم میں اس کو بھی شہر بدر کرائیں۔

واہ مچھی واہ۔ کیوں نہ ہو آگئے نہ جھانسے میں، کھا گئے نہ غچا چڑھ گئے نہ چنگ پر۔ ابھی کیا ہے، دیکھنا جو کہیں تو مہینے یہ لوگ جم گئے تو کوٹھے پر جھنڈی کا پھر ہرا اڑ رہا ہوگا۔ ڈگڈگی بجے تو سہی۔ کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں۔ اب تمھارے یہاں تو بندہ آنے سے رہا۔ لاکھ روپیہ دو، آنے والے کی دُم میں نمدا:

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود
دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

اب دل لگی دیکھیے، تمھاری قلعی نہ کھولوں تو مرزا نہیں۔ مجھے تو اندر باہر سب کا حال معلوم ہے نہ۔ وہ پتے پتے کی سناؤں کہ یاد ہی تو کرو۔ دریا میں رہ کر مگر سے بیر۔ ارے نادان نواب نوابی کے ٹھاٹھ ہی اور ہوتے ہیں۔ ریاست کے تیور ہی اور ہیں۔ وہ خم و دم ہی اور ہیں۔ تم تو دمڑی کے بوے ہی بنے رہے۔ نام کے نواب، میاں نواب بننے کا شوق چرّایا ہے، تو ہم ایسوں کو نوکر رکھو۔

داستان گوئی میں ہم بند نہیں۔ لفاظی میں ہم بند نہیں۔ خوشامد میں ہم بند نہیں۔ خیر اب بکے کون؛ آدمی ہو تو سمجھ جاؤ گے۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔

ہمارے گول مول، نواب صاحب ایک دن دونوں وقت ملتے، اپنی خوش سولو کوٹھی کے ایک رنگین کمرے میں بیٹھے، مصاحبوں رفیقوں سے چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں میاں آزاد نے دروازے میں سے گردن نکالی۔ مجرا عرض کرتا ہوں پیر و مرشد! آیئے میاں آزاد! کہیے کہاں سے سواری آتی ہے۔ اس وقت تو کچھ چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ کیا کسی سے جھوڑ ہوئی ہے؟ اے حضور آپ کی جوتیوں کے صدقے میں اس جوار میں تو کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے محلہ محلہ ہوا بندھی ہے۔ اچھے اچھے پہلوانوں نے پچھاڑیں کھائیں، ہم نے وہ وہ پٹخنیاں بتائیں، کہ چھٹی کا دودھ یاد آیا ہوگا۔ اس وقت بندہ ایک نانبائی کی دکان پر کوکو پلاؤ بنانا سیکھتا تھا۔ آنچ کے سامنے جو جم کے کچھ دیر بیٹھنا پڑا تو چہرہ لال انگارا ہوگیا۔ حاضے! توبہ کہیے نانبائی گری کا بھی شوق چرایا ہے۔ دماغ بیہدہ بحث و خیالِ باطل بست" خیر صاحب۔ "روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر" کیوں۔ بھئی معقولات میں بھی کچھ دخل ہے، یا لنگوٹا باندھ کر کشتی اور دھینگا مشتی ہی جانتے ہو؟ کون، میں، معقولات! ہونھ، عمر بھر کیا کیا کیے۔ اس فن کی وہ کون سی کتاب ہے جس پر ایں جانب نے نکتہ چینی نہیں کی، فقہ امامیہ، اور فقہ حنفیہ، اور کتبِ تفسیر و تصوّف، جس میں چاہیے۔ بحث کیجیے۔

مصاحب : حضور! اس شہر میں ایک عالم آیا ہے۔ کہتا ہے دنیا بھر کی کتابیں چاٹ گیا ہوں۔ خصوصاً علم مناظرہ میں تو یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ منطق کے زور سے جھوٹ کو سچ کر دکھائے، مگر خدا کو نہیں مانتا ہے۔ پکا ملحد اور منکر ہے۔

آزاد : واہ منطق کی اچھی قدر کی۔ حضرت ان کے تو ہم بھی مشتاق ہیں۔ واللہ خدا کا وہ کامل ثبوت دوں کہ وہ خود پھڑک جائیں۔ ذری یہاں تک لایئے تو سہی۔ بھاگے راہ نہ ملے۔ جو پھر اس شہر میں منھ دکھائیں تو آدمی نہ کہنا۔

نواب : ہاں ہاں میر صاحب ذری ان کو پھانس پھونس کر لایئے تو۔ میاں آزاد کے جوہر تو کھلیں۔ مگر میاں ان منکروں سے بھڑنا دل لگی نہیں، کسی کے قائل ہی نہیں۔ بس ایک مادّے کے قائل ہیں۔

اس پر میر صاحب نے زور سے دو چار دم لگائے، اور لڑھکتے ہوئے گئے، اور جھپ سے اس دہریے کو لائے۔ یہاں ہجوم عام تھا۔ وہ اژدھام تھا کہ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ بلکہ

نے آتے ہی پوچھا کہ کون بزرگوار بحث کریں گے ؟

میاں آزاد بولے، ہم ۔ اب سب منتظر ہیں کہ دیکھیں کیا سوال جواب ہوتے ہیں ۔ چوطرفہ کھچڑی پک رہی ہے کہ یہ مُلحد تو کسی سے آج تک قائل ہی نہیں ہوئے انھیں کوئی بند کیا کرے گا ۔

میاں آزاد : توحید میں مقام نہیں قال وقیل کا

ہے کس کو ناطقہ ترے ذکرِ جمیل کا

یا ایّہا السامعین ۔ اس دہریے کے دل گردے کو دیکھیے کہ اللہ میاں ہی کے قائل نہیں ۔ یہ شکل اور یہ صورت اور یہ خیال اے لعنت ،

مُلحد : پانی پی پی کر کوسنا اور بات ہے، اور بحث کرنا اور بات ہے ۔ ہمیں کوئی معقول کر دے تو البتہ جانیں ۔ یہ کیا کہ لگے گالیاں دینے ۔

آزاد : نامعقول کو معقول کون کرے ۔ کوئی سوال کیجیے تو ہم جواب دیں ۔ شک ہو، رفع کر دیں ۔

مُلحد : اچھا پہلے تو ان تین سوالوں کا جواب دیجیے پھر اور بحث چھیڑیں گے ؟

سوال اول : خدا ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آیا ۔

سوال دوم : شیطان ناری ہے، اور وہ دوزخ میں جلایا جائے گا ۔ واہ وا واہ ۔ بھلا ناری کو آگ کا کیا ڈر ہے ۔ اس سزا سے وہ ضرور نڈر ہے ۔

سوال سوم : جو کرتا ہے خدا کرتا ہے ۔ پھر انسان کا قصور کیا ۔

چوطرفہ سناٹا پڑ گیا ۔ کہ واللہ کیا عالم ہے ۔ اہو ہو ہو ۔ کیا کڑے سوال کیے ہیں ۔ سب کے اوسان خطا ۔ ہوش اڑے ہوئے ۔ بگڑے دل لوگ دانت پیس رہے ہیں، کہ باہر نکلے تو گردن ہی ناپیں ۔ کوئی دل ہی دل میں کوس رہا ہے کہ خدا کرے یہ مردک ابھی ابھی مر جائے ۔ کوئی قہر کی نگاہ سے گھور رہا ہے ۔ کہ اتنے میں میاں آزاد نے کہا یارِ عزیز ایسی باتیں نہ کرو، جہنم میں جلائے جاؤ گے ، جہنم میں اس نے مسکرا کر کہا کہ :

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن

دل کے[1] خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس پر میاں آزاد نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا کھٹ سے اس منکر کی کھوپڑی پر پڑا ۔ ہائے کر کے

---

[1] بعض نسخوں میں ہے ۔ دل کے خوش رکھنے کو ۔

بیٹھ گیا۔ اُف لاحول ولاقوۃ اچھے وحشی سے پالا پڑا۔ میں بحث کرنے آیا یا پپّاڈگی۔ جب تقریر میں ہارے کو گلوخ اندازی کرنے لگے، اور جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں تو پھر کیسی ہو بچہ جی۔ جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ دہائی ہے نواب صاحب کی بے وجہ بے سبب ہم پر ایک چھہار کا جھہار کھینچ مارا۔ سر بھنا گیا۔

نواب : بھئی آزاد ہمیں یہ تمھاری حرکت پسند نہیں آئی۔ یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنی؟ مانا کہ یہ ذات شریف کشتنی، سوختنی، گردن زدنی، ہیں مگر بحث کر کے معقول کیجیے۔ یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا۔ یا تان کے ایک ڈھیلا لگا دیا۔

آزاد : پیر و مرشد میں نے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدردان ہوتا تو اس وقت گلے سے لگا لیتا اور کروڑوں روپیہ انعام کے دیتا۔ سنیے!

پہلا سوال : خدا ہے تو ہمیں کیوں نظر نہیں آتا؟

جواب : اگر اس ڈھیلے سے ان کو چوٹ لگی، تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی۔

سبحان اللہ کا ڈونگڑا برس گیا۔ واہ استاد، واللہ کیا جواب ترکی بترکی دیا ہے۔

دوسرا سوال : شیطان کو نار جہنم میں جلانا بے کار ہے۔ وہ تو خود ناری ہے۔

جواب : ان سے پوچھیے کہ یہ مٹی ہی کے پتلے ہیں یا نہیں؟ ان کی کھوپڑی مٹی ہی کی بنی ہے یا سونے کی؟ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا تو سر کیوں بھنا گیا۔ ہات ترے کی، واہ میاں آزاد کیا جواب دنداں شکن دیا کہ دانت کھٹے ہو گئے۔

تیسرا سوال : جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔

جواب : پھر ڈھیلے لگانے کا جرم ہم پر کیسا؟

ٹوپیاں جو طرفہ اچھلنے لگیں، کہ واہ میرے شیر کیا کہتا ہے۔ اہو ہو ہو! کہو چڈا اگل خیر دِ۔ اب خدا کے قائل ہوئے یا اب بھی کچھ مین میکھ ہے؟ کروروں باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جب آپ ہی خاکی ہیں، اور مٹی ہی کا ڈھیلا مارا تو آپ کی کھوپڑی کیوں بھنّائی۔

لیجیے صاحب اب تک تو میاں آزاد پہلوان اور پھکیت ہی تھے، اب صوفی صافی، اور مولوی بھی مشہور ہو گئے۔ نواب نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھوکی۔ واہ کیوں نہ ہو۔ پہلے تو میں جھلّایا کہ یہ ڈھیلا بازی چہ معنی دارد، مگر پھر تو پھڑک گیا کہ واہ کیا نازک خیال آدمی ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک مصاحب بڑی سی رزائی جس میں کوئی دس سیر روئی پڑی تھی، اوڑھ کر تشریف لائے۔ ایں،

یہ رزائی کیسی۔ رزائی کیا لحاف کہیے، کیوں میاں یہ بے فصل رزائی اوڑھنا کیسا۔ واہ قبلہ اس بھید کو آپ نہ سمجھے۔ ارے بھائی رزائی تو طالب علم کی لنگی ہے۔ اوڑھیے تو گرم بچھائیے تو نرم، دیجیے تو دھرم، باندھیے تو بھرم۔ واہ بھئی قافیہ سنجی بھی ہو تو اتنی۔

صف شکن

ایک دن ہمارے باغ و بہار جوان، لڑنتیے پہلوان، میاں آزاد اپنے آقائے نامدار، نواب گردوں مدار کی کوٹھی میں دو زانو بیٹھے، مصاحبین سے گپ اڑا رہے تھے۔ کسی کو لکڑی کی چوٹیں، کسی کو کشتی کے داؤ بتا رہے تھے، کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا کیوں آزاد کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں؟ نیتِ شب بخیر۔ اب کی ربیع الاوّل میں وہ گھماسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ۔
مصاحب: میاں آزاد تم تو اپنے کو بڑا جہانیاں جہاں گشت سمجھتے ہو، مگر واللہ! یہ لڑائی نہ دیکھی ہوگی۔ اس طرح گتھ جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بٹیر کی لڑائی کے آگے تو توپ و تفنگ بھی گرد ہے۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب کے یہاں کی پالیاں۔ اُف فوہ! آج ہماری سرکار میں جتنے بٹیر ہیں اتنے تو مٹیا برج کے چڑیا خانہ میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا۔ نوک دم کے بنانے میں توڑے کے توڑے صرف ہو گئے۔ سیروں موتی مروارید تو میں نے اپنے ہاتھوں پیس کر کھلا دیے ہیں۔ کچھ دنوں روز کھرل چلتا تھا۔ مگر واللہ آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو، اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا۔ لے آؤ چلو تم کو سیر کرائیں۔ یہ کہہ کر بٹیر خانہ لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چو طرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں۔ اور کابکیں بھی وہ بیش بہا کہ اُہو ہو ہو! ہاتھی دانت کی تیلیاں۔ ان پر گنگا جمنی گمٹریاں، اور کار چوبی چھتیں، اور مقیش کی جھالر اس پر کام دار مخملی غلافیں، رنگ برنگ سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں جس میں بٹیر اپنی پیاری پیاری نکیلی چونچوں سے پانی پئیں۔ پانچ پانچ، چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں، ہر سمت ٹنگی ہیں۔ مکوٹیاں بھی رنگ برنگی۔ مصاحب ایک ایک کابک اتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پل باندھ دیے۔ ایک بٹیر کو دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کیا منجھولا جنور ہے۔" صف شکن جو آپ نے سنا ہو یہی حضرت ہیں، لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا۔ میری جان کی قسم ذری اس کی آن بان تو دیکھیے گا (بوسہ لیکر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں۔ دم کے دم میں لاکھوں پھونک دیے۔ روپیہ تو ٹھیکریاں سمجھا کیے۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو

شہر بھر کے پتنگ بازوں کو نہال کر دیا۔ کنکوے والے بن گئے۔ اجی اور تو اور لونڈے جو گلی کوچوں میں لنگر اور لگّے لے کر ڈور لوٹا کرتے ہیں، روز ڈور بیچ بیچ کر چکھوتیاں کرتے تھے۔ عیاشی میں بھی وہ نام روشن کیا کہ کوئی ڈوم ڈھاری غریب نظر نہ آیا۔ چانڈو کا شوق ہوا تو دقیانوس کے وقت کی نگالیاں ہزاروں روپیہ کو خرید لیں، اور فی سبیل اللہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو آدمیوں کو ایک ایک دن میں چانڈو پلا دیا۔ افیم اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپیہ سیر بکنے لگی۔ مالوا خالی، چین کھکھل، دن رات قوام کے چوٹھے کا منھ کالا، افیم کے ست کا بول بالا، جب دیکھو لمپ روشن۔ جاگتی جوت مکھیاں تک فیض سے محروم نہیں رہیں۔ بمبئی تک کے گنے آتے تھے، اور ہاتھی کے قد آدم چھلکوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔

آزاد: ہاتھی کے قدِ آدم بھی کتنا خوب۔

مصاحب: اللہ کی عنایت سے جو شوق کیا ایسا ہی کیا۔ پھر بٹیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا، اب یہ ایک صف شکن ان کے وقت کا باقی رہ گیا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بٹیر کیا ہفت خوان منازلِ پہلوانی ہے۔ ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ ان کی وفات کو کوئی بیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ بس یہ سمجھیے کہ محمد علی شاہ[1] کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی نٹو برس کا ہوگا۔ دو کم یا دو اوپر۔ مگر اس بڑھوتی وقت بھی وہ ہڈے لوتھڑے ہیں، کہ مرغ کو لپک کر لات دے تو وہ بھی چیں بول جاوے۔ جیسے باز اور پدے کی لڑائی۔ اور کیوں نہ ہو نمک کس سُور کا کھاتا ہے۔ اور نواب صاحب کے جیوٹ پنے کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ شاہی میں جب دگلے والی پلٹن بگڑی تھی تو ہمارے حضور ہی بھیجے گئے تھے۔ پار سال کی دل لگی سنیے! نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے۔ ان میں بھی ریاست کی بو ہے۔ کنکوا تو ایسا لڑاتے ہیں کہ میاں ولایتی ان کے آگے پانی بھریں۔ دو دو تولے افیم پی جائیں۔ اور وہی خم ودم۔ بٹیر بازی کا بھی پرلے سرے کا شوق ہے۔ آپ کا ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے۔ بٹیر کیا شیدی لندھور ہے۔ ڈھوہ کا ڈھوہ، جیسے خاصہ چھوٹا تیتر۔ خیر آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے۔ میرے منھ سے بے ساختہ نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا مدت سے شوق ہے۔ کروروں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے۔ مگر صف شکن

---

[1] محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں وفات پائی۔ لکھنؤ کا مشہور امام باڑا حسین آباد انھیں نے تعمیر کرایا تھا۔

سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

ماموں : ہونھ۔ اس کی اصل وحقیقت کیا ہے؟ ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں، عقل کے ناخن لیجیے، بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنی آپ کو نوک دم پالی باہر کر دے۔ حوصلہ ہو تو منگواؤں۔

نواب : اچھا ماموں جان پھر کل شد ہو جائے۔ ڈو ڈو چونچیں تو ہوں۔

ماموں : کیا مضائقہ۔ مگر اپنا بٹیر آپ مفت میں کٹوائیں گے۔ آپس کی لڑائی سے فائدہ، یا اچھا کل ہو ہی جائے۔ اِدھر یا اُدھر۔

الغرض دوسرے دن پالی ہوئی۔ ہزاروں آدمی جوق جوق آن موجود۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکہ کی جنگ ہے۔ بھئی قسم ہے رزق کی، دو چیزیں جس نے نہیں دیکھیں، اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ایک تو یہ پالی، دوسرے پیر دمل کی سوگھی۔ اُدھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے آیا کہ زمین ہل گئی۔ اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جب ہی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ کھلوا لیتے ہیں۔ پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے بلّی دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھڑکنے لگا۔ نواب سمجھے کہ بوندا ہو گیا۔ پھر تو ایسے دھاروں دھار روئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے نواب صاحب کو کبھی روتے دیکھا نہیں۔ مجالسِ عزا میں ایک آنسو نہیں نکلتا۔ جب بڑے نواب صاحب نے انتقال کیا تو اشک کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ بھئی یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے۔ اور سچ تو یوں ہے کہ اس نے اس دن نواب کی سات پڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ جو کہیں گھٹ جاتا تو بندہ تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جنگ میں آبرو ہی آبرو تو ہے، اور ہے کیا۔ خیر صاحب۔ جیسے ہی دونوں چکھی کھا چکے، ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ یہ ٹوری، وہ گھاگر۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا، اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مڑوڑیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب کا اس دم چہرہ فق ہو گیا۔ اور کلیجہ شق منھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ نصیب اعدا زہر کھانے کا وقت پہنچا، کہ اتنے میں صف شکن قلفی کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر! خوب پھرا۔ پالی بھر میں آواز گونجنے لگی۔ کہ اہو ہو وہ مارا ہے۔ ہاں بیٹے دے بڑھ کر لات۔ ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منھ پھیر دیا۔ منھ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر ایک جھنجھوٹی بتائی۔ واہ، واہ وا۔ اسی مقام پر ایک اور لات کس کر، اہو ہو، شاباش، واہ پٹھے۔ اوہو ہو ہو۔ اسی جگہ ایک اور۔ اہو ہو ہو۔

لگا ایک اور مرڈڑی۔ اہو ہو ہو۔ اتنے میں میاں ظفر پیکر قینچ کرکے نوک دم پالی باہر۔ پھر سے اُڑ گیا۔ پالی بھرنے کہا وہ بھگایا، وہ مارا، چوطرفہ ٹوپیاں اچھل گئیں۔ اور زنیل بجنے لگیں۔ واہ رے صف شکن۔ ظفر پیکر گھٹ گیا تو صف شکن کا دل اور بھی بڑھا۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ نواب کا ہزار ہا روپیہ بٹیروں کے پھیر میں ناحق گھوما جاتا ہے۔ ذہن کے پکے تو تھے ہی۔ سوچے کہ آؤ آج ان سب کو اڑا دیں تو اچھی دل لگی ہو۔ یہ سوچتے ہی مصاحب سے کہا کہ یار آج اچھی سی افیون گھول کر پلاؤ تو ہم بھی بسم اللہ کر دیں۔ مصاحب کی باچھیں کھِل گئیں، کہ اچھے کو چیلا کیا۔ بڑے مڈھ کو مونڈا' دوڑتے ہوئے گئے۔ کہ افیون گھول کر لائیں۔ ادھر میاں آزاد نے میدان خالی پاکر کابکوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ بٹیر سب پھر سے بھاگ گئے۔ صف شکن کو انھوں نے چھپا لیا۔ باقی سب ہوا میں موجیں لے رہے ہیں۔ ہات ترے کی۔ گھر بھر میں کتاب کا نام نہیں۔ کاغذ قلم دوات سے کام نہیں۔ کہیں اور کابک اور بٹیر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لو بچہ، اور پالو بٹیر۔

ہمارے رئیسِ نامدار، یعنی نواب عرش وقار، جھٹپٹے وقت اپنے باغیچہ پُر بہار میں فرشِ مکلّف پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ مصاحب اور رفقا خوشامد کی باتیں بنا رہے تھے، اور میاں آزاد صحبت گرما رہے تھے۔ اتنے میں دریائے اخضرِ فلک پر کشتی ہلال نظر آئی۔ یعنی مہ نو نے اپنی پیاری پیاری صورت دکھائی۔ چاندنی کا چھٹکنا تھا، کہ مصاحب بلبل کی طرح چہکنے لگے۔ نوابوں کے درباروں میں مسخروں کا کال نہیں۔ ایک افیمی پلاؤ کی چاٹ پر مسخرے بن گئے۔ چوطرفہ ان پر بوچھار ہونے لگی۔ ایک شخص نے پوچھا کیوں یار؟ واجد علی[1] تمھارے کون ہیں۔ بھائی ہیں؟ تو فرماتے کیا ہیں، جی واجد علی! میری خالہ جان کی بہن کے میاں کے لڑکے کے باپ کے بیٹے ہیں۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ فلکِ ہفتم تک آواز پہنچی۔ بھئی واللہ! یہ تیا رشتہ ہے۔ اچھی الٹ پھیر ہے۔ اور کیوں میاں تمھارے باپ تمھارے کون ہوئے، واہ وا اس میں کون سی مشکل بات ہے بھلا۔ ہوئے کون

---

[1] واجد علی شاہ اودھ کے آخری فرمانروا تھے۔ جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت سے معزول کر کے مٹیا محل کلکتہ،، میں نظر بند کر دیا تھا۔ وہیں ۱۸۸۷ء میں وفات پائی قیصر باغ لکھنؤ کی شاندار عمارتیں انھیں کی بنوائی ہوئی ہیں جن پر ۸۰ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ (بحوالہ واجد علی شاہ از مسعود حسن رضوی مرحوم) مطبوعہ میر اکیڈمی لکھنؤ

باپ ہوئے، اچھے رہے، اب ہمیں ایسا گھامڑ سمجھ لیا ہے۔ مجھے بھی کوئی گنوار مقرر کیا ہے۔ نواب صاحب نے کہا خوجی! اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں۔ پیر و مرشد اشرفیاں تو حضور کی جوتیوں کے صدقے میں بہت سی مل جائیں گی۔ مگر پھر جینا دوبھر ہو جائے گا۔ وہ نہ مرے سہی لیکن نکٹا جیا برے احوال۔ نا صاحب مجھے تو کوئی فی غوطہ ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ بیٹھوں۔ پانی کی صورت دیکھے بدن کانپ اٹھتا ہے۔ اور روح لرزنے لگتی ہے۔ بھئی واہ کیسے مردوے ہو جی۔ میاں نہاتے نہیں ؟ تو آپ کوئی قاضی ہیں۔ ہم نہیں نہاتے۔ پھر آپ کو کیا۔ اجی سرکار کا حکم ہے۔ چلیے آپ کی بلا سے کہنے لگے سرکار کا حکم ہے۔ پھر کوئی اپنی جان دیدے۔ حضور جو یہ اس وقت دھم سے حوض میں نہ کود پڑیں تو افیم اٹھیں نہ ملے۔ آپ بہت چل نکلے ہیں۔ کھلائیں حضور، کھائیں ہم، آپ کون بیچ میں بولنے والے۔ اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا آیا ہوں، اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں تو کہیے، مرا یا جیا۔ نواب صاحب نے کہا اچھا بھائی جانے دو۔ دودھ کھاؤ گے۔ واہ خداوند نیکی اور پوچھ پوچھ دودھ تو وہ شے ہے جس کو انسان ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی غٹ غٹ پیتا ہے۔ لیکن ذری مٹھاس خوب ہو۔ شاہ جہاں پور[1] کی سفید شکر، یا دوسری کوٹھی کا قند، یا کالپی[2] کی مصری گھولیے گا۔ اور تھوڑا سا کیوڑا ابھی گبڑ دیجیے گا تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا کہ بھئی ان کے واسطے دودھ لاؤ۔ کیوں جی تم حلوائی کا دودھ پیتے ہو یا گھوسن کا ؟ حضور جو مل جائے۔ آم کھانے سے کام ہے یا پیڑ گننے سے۔ غفور خدمت گار چاندی کے کٹورے میں دودھ لایا۔ خواجہ صاحب دودھ پیجیے۔ چپ نامعقول، اتنا بڑا لوطر ہوا! اب ابھی تک تمیز نہیں آئی۔ یہ دودھ پینا کہاں کا محاورہ ہے۔ گنوار دودھ کھانا نہیں کہتا۔ کٹوری یہاں رکھدے۔ میں ابھی آیا۔ ذری کتے بلی کو دیکھتے رہنا۔ کہاں کہاں ؟ خوجی کہاں ؟ اے دودھ تو کھائے جاؤ مرد آدمی۔ کہیں نہیں حضور ابھی آیا۔ خوجی جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے۔ اور کٹورا لبالب کرنے کے لیے حوض سے پانی لے کر بھر دیا۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی۔ جب خواجہ صاحب تھوڑی دیر میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمد ہوئے، اور کٹورے کو دودھ سے لبالب پایا تو باچھیں کھل گئیں، جاتے ہی منھ ڈال دیا۔ اتنے

---

[1] شاہ جہاں پور اتر پردیش کا مشہور شہر جہاں کی شکر اور گڑ مشہور تھا۔

[2] کالپی یہ بھی اتر پردیش کا ایک شہر ہے۔ جہاں مصری بھی بنا کرتی تھی۔

میں مچھلی بھی منھ میں آئی تب تو چکرائے کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے؟ غفور پر بہت ہی جھلائے۔ اور نواب صاحب سے بڑی شکایت کی۔ حضور اس کی کان گوشی واجب ہے۔ ایسا غافل ہوگیا کہ حوض سے مچھلی اچک آئی، اور انھیں کانوں کان خبر نہیں۔ اوگیدی! اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ حاضرین نے خوب قہقہہ لگایا۔ جیسے دیکھو لوٹ رہا ہے کہ واللہ اچھی دل لگی ہوئی۔ اس پر میاں آزاد نے کہا۔ ؟۔ ارے کھا جا یہ شیر ماہی ہے، تب تو میاں ایپچی نہایت ہی افسوس کرتے لگے کہ ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ شیر ماہی ہے۔ ورنہ کچا ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی میں یہ خاصیت ہے کہ اسّی برس کا بڈھا کھائے تو جوان ہو جائے نئے سرے دانت نکل آئیں۔ اس پر گھنٹوں دل لگی رہی، اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا کہ خواجہ صاحب لوگ آپ کے پدر بزرگوار کو باورچی بتاتے ہیں۔ واللہ ہم تو آپ کو شریف زادہ سمجھتے تھے۔ مگر آپ پاجی ہی نکلے۔ پاجی آپ! اور آپ کے باپ، کچھ بدھے تو نہیں ہو، یہ پاجی کی کونسی بات چیت ہے۔ ہم نے تو عمر بھر کبھی چولھا نہیں پھونکا۔ باپ دادا کا حال نہیں معلوم کون تھے۔ کون نہیں تھے۔ واہ میاں واہ۔ تو یہ کہیے آپ کو اپنے باپ دادا کا حال ہی نہیں معلوم۔ یہ لاعلمی تو بندہ نواز آپ کی عالی خاندانی کی قلعی کھل گئی۔ بس بس، اب آپ اس دربار کے لائق نہیں۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ارے میاں خوجی تم کو اپنی زبان سے بھی کہنا نہیں۔ یہ تم بک کیا گئے۔ کوئی اپنے باپ دادا کو بھی نہیں جانتا۔ واہ بے پاگل، ساٹھ برس کا ہوا، آدمیت نہیں آئی، سٹھیا گیا ہے۔ میاں آزاد نے پوچھا کیوں میاں صاحب آپ پٹھان ہیں یا شیخ؟ جی میں تو ہندوستانی ہوں۔ ایں! یہ بھی کیا خوب، ارے بھئی مسلمان ہو یا کافر، صاحب پیدا کہاں ہوئے۔ ہندوستان کے بیچ میں، پھر اس سے کیا واسطہ۔ اگر اصطبل کے بیچ میں پیدا ہوتے تو کیا لوگوں کے بیچ میں گھوڑے کہلاتے؟ اس معاملہ کے بیچ میں انصاف تو کیجیے، پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور حاضرین لوٹنے لگے۔

اب سنیے کہ ایک اور مسخر الدولہ آئے۔ حضور کو مجرا۔ اخاہ میر مذاق ہیں۔ آیئے! مشفق کہیے کوئی تازہ خبر؟ تازہ خبر یہ ہے کہ آج سے این جانب تارک اللحم ہوگئے۔ گوشت اب نہ چھوئیں گے۔ نباتات ہی پر دانت لگائیں گے۔ کیوں کیوں خیر باشد؟ یہ کیا بدپرہیزیاں ہیں۔ کیا باورچی نے گوشت نہیں دیا۔ غفور، حضور، محمد و کو بلاؤ۔ محمدو آیا۔ آداب بجا لایا۔ کیوں جی تم سے تو ہم نے کہہ دیا ہے کہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھا کرو (اتفاق سے میاں محمدو واحد العین تھے) حضور غلام

سب کو اسی ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جھوٹ کہتا ہو تو یہ (کانی کو دکھا کر) آنکھ اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے پھوڑ ڈالیے (بائیں ہاتھ کی چھنگلی نواب صاحب کی ندارد تھی) اس پر نواب صاحب ہنس پڑے۔ ان کا ہنسنا تھا کہ مصاحبوں نے بھی کھِل کھِلانا شروع کیا۔ مسخر الدولہ بولے کہ خداوند اس کا قصور نہیں۔ میں کچھ اور ہی عرض کرتا ہوں۔ وہ فرمایئے! حضور ایک بڑے عالم نے لکھا ہے کہ نباتات کھایا کرو، گوشت کھانا بُرا۔ سو حضور کچھ دن آپ بھی اس کا تجربہ کریں مصاحبوں نے جو یہ سنا تو پیٹ میں چوہے چھوٹ گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نواب سیدھے سادھے تو ہیں ہی گوشت دوشت کا کھانا چھوڑ دیں، تو پھر ہم منھ ہی تاکا کریں، یہ سیخ اور شامی کباب اور قورما، اور کوفتے، اور دو پیازا اور کوکو پلاؤ کھانے ہی میں نہ آئے۔ واہ بے بھاجی خور، اچھا آیا۔

۱۔ حضور ان کو تو سودا ہو گیا ہے۔ گرمی کے دن آئے، اور ان کے سر پر شیخ سدّو سوار ہوئے کہنے لگے گوشت نہ کھایئے۔ پھر کھائیں کیا۔ بُرے کا سر۔ آپ تو گھانس کھا گئے ہیں۔

۲۔ پیر و مرشد یہ ایسی ہی بے ٹھکانے بات بک دیا کرتے ہیں، جس کا سر نہ پیر، ایک عالم گوشت چکھتا ہے۔ ان کے یہاں ممانعت ہے۔ لو صاحب گوشت نہ کھائیں تو پھر کیا بھوسا کھائیں۔ سانی کھائیں، مہیلا کھائیں، چھپر کا پھوس کھائیں۔

۳۔ اجی ان کی فصد کھلوایئے۔ قطرب کی علامت پائی جاتی ہے حضور گوشت کبھی نہ چھوڑیے گا۔ یہ بڑی نعمت ہے۔

۴۔ میاں کیسی باتیں کرتے ہو۔ حضور چھوڑیں بھی تو کہیں چھوٹ سکتا ہے۔ رئیسوں سے گوشت بغیر ایک لقمہ تو کھایا نہ جائے۔ نہ کہ ترک کرنا۔ اور ان کی نہ کہیے۔ یہ تو دیوانے مشہور ہی ہیں۔ پائیں تو بکرے کا بکرا چکھ جائیں، اور ڈکار تک نہ لیں۔ مگر نصیحت کرنے میں آندھی ہیں۔ آپ کو قسم ہے جو آج سے گوشت کھایئے۔ گوشت کھاؤ تو مُردار، حرام، سور، کھو بلیش باو۔ بس رہ گئے؟

مسخر الدولہ: میاں سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ سو کئی صدی بعد گھانس پھوس کی بھی رتی چمکی۔ لے دیکھ لینا جو دس برس میں ایک گوشت خور بھی نظر آئے۔ سب گھانس خور ہو جائیں تو سہی۔

میاں آزاد ایک دن سویرے، منھ اندھیرے، بازار میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ بازار

بھر میں سناٹا۔ حلوائی بھٹی میں سو رہا ہے۔ مگر نانبائی برتن دھو رہا ہے۔ بزازہ بند۔ کنجڑوں کی دکان پر اردی نہ شکر قند۔ جوہریوں کی دکان میں قفل لگا ہوا ہے۔ مگر تمبا کو والا جگا ہوا ہے۔ خاک روب سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ میدے والا پسنہاریوں سے جائزہ لے رہا ہے۔ ادھر صدائے مرغ سحر، اُدھر ندائے اللہ اکبر۔ شوالے کا گھنٹا ٹھن ٹھن بج رہا ہے۔ کوئی اپنی دکان سج رہا ہے۔ میاں بُز قصاب دکان پر ڈٹے ہوئے کھٹا کھٹ چھُری پہلا رہے ہیں۔ کتے دم ہلا رہے ہیں۔ اور بوٹیوں کی خیر منا رہے ہیں۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص لنگی باندھے، افیم کی پینک میں جھوم رہا ہے۔ اور بوکھلایا ہوا چوطرفہ گھوم رہا ہے۔ ہاتھ میں چلم، دکان کے صدقے ہو رہا ہے۔ کہ کہیں سے ایک چنگاری مل جائے تو دم لگے۔ دھواں دھار حقہ اڑے۔ جہاں جاتے ہیں پھر مانگ کی آواز آتی ہے۔ بہت ہی چکرائے لاحول ولا قوۃ۔ بھئی ایسا شہر نہیں دیکھا منحوس، جہاں آگ مانگے نہ ملے۔ جانو اس میں بھی کوئی چھپن ٹکے صرف ہوتے ہیں۔ یا گرہ سے کچھ جاتا ہے۔ الغرض محلے والوں کو صلواتیں سناتے، اور دل ہی دل میں جھلاتے ہوئے نانبائی کی دکان پر حضرت پہنچے۔

حضرت : بڑے بھائی اک ذری آگ تو جھپ سے دے دینا۔ میرا یار لا تو جھٹ پٹ!

نانبائی : اچھا اچھا تو دکان سے الگ رہو۔ چھاتی پر کیوں چڑھے بیٹھتے ہو۔ یہاں تنو دھندے کرنے ہیں۔ آپ کی طرح کوئی بے فکرے تو ہے نہیں کہ تڑکا ہوا اور چلم لی، اور لگے کوڑی دکان مانگنے۔ مل گئی تو خیر، نہیں تو گالیاں دینی شروع کیں۔ صبح صبح، اللہ کا نام نہ رسول پیغمبر سے کام، نہ رام رام، چلم لیے دکان پر ڈٹ گئے۔ واہ اچھی دل لگی مقرر کی ہے۔ ایسی ہی طلب ہے تو ایک گنڈی کیوں نہیں گاڑ رکھتے، کہ رات بھر آگ ہی آگ رہے۔ اب ہم اپنا کام کریں، گاہکوں کو سودا دیں، یا آگ دیتے پھریں۔ اب کیا کوئی خوان لے بھاگے گا۔ یا گھراتا کاہے، یا سیخ پر دانت ہے۔ ایسے ہی اچکے تو چوری کرتے ہیں۔ آنکھ چوکی اور مال غائب۔ کیا سہل لٹکا ہے کہ چلم لے کر آگ مانگنے آئے ہیں۔ کسی دن عین چلم ولم نہ توڑ تاڑ کے پھینک دوں۔ تم تڑکے تڑکے دکان پر نہ آیا کرو جی! نہیں مفت میں کسی دن ٹھائیں ٹھائیں ہو جاوے گی۔

حضرت کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا جی چاہا کہ بھٹی ہی میں سر کھونس دیں، مگر سوچے کہ ہم آدمی، وہ نانبائی، گوشت پر اٹھے کھا کھا کر کپے کی طرح پھول گیا ہے ایسا نہ ہو کہ ایک ٹپنی بتائے۔ خیر دانت پیس کر رہ گئے۔ وہاں سے چلے تو حلوائی کی دکان پر پہنچے۔

حضرت : میاں ایک ذری سی آگ دینا بھائی ہوت!

اس وقت حلوائی کا دودھ بلّی پی گئی تھی۔ جھلّایا بیٹھا تھا۔ گھبراہٹ میں سمجھا کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے۔ کڑک کر اور جھڑک کر بولا: کہ اور دکان دیکھو۔ سویرے سویرے کوڑی کی پڑگئی۔ جاتا ہے کہ دوں دھکّا۔ رہیں کہیں، مریں کہیں۔ کوڑی مانگنے یہاں موجود۔ دنیا بھر کے مُردے نانا مُوگھاٹ۔ اب کھڑا گھورتا ہے کیا۔ دو لنوں کہیں پھوڑ نہ ڈالوں میں۔

حضرت : کچھ داہی ہوا ہے بے۔ ابے ہم کوئی فقیر ہیں۔ میں ایک گھِسّ پٹی نہ بتاؤں بچہ۔ لو صاحب ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں۔ یہ ہم کو بھک منگا بتاتا ہے۔ اندھا ہے بے کون؟

حلوائی : (دکان سے اتر کر) بھک منگا ناہیں تو ہے کون؟ لنگوٹی باندھ لیں، اور چلے آگ مانگنے تمھارے بابا کا کرج (قرض) دھرائت ہے۔

جب انھوں نے دیکھا کہ یہ لپاڈگی پر آمادہ ہو ہی گیا، اور لنگ کس کر دھم سے کود پڑا تو سوچے کہ بولے، اور پچھتے گئے۔ یہ اس وقت جھلّایا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دو چار گدّے کس کے لگا دے۔ تو بھُرکس ہی نکل جائے۔ چپکے سے کان دبائے، چل کھڑے ہوئے۔ آج تڑکے تڑکے، کس کا مُنھ دیکھا تھا کہ جہاں جاتے ہیں جھوڑ ہو جاتی ہے۔ آگ نہ ملی نہ ملی۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک سنار کی دکان پر آگ دہک رہی ہے۔ اوہو ہو ہو! بھئی یہ بے چارہ بھلے مانس آدمی ہے۔ بے عذر آگ دے دے گا۔ اتفاق سے اس وقت سُنار دکان پر نہ تھا۔ یہ تو حقے کی فکر میں چوندھیائے ہوئے تھے ہی۔ چھپ سے دکان پر چڑھ گئے۔ ان کا دکان پر چڑھنا تھا کہ سنار بھی اسی وقت آگیا۔ اور ان کو دیکھ کر آگ بھبھوکا ہوگیا، تو کون ہے بے؟ دیکھو بے تے نہ کرنا۔ سنار نے جھلّا کر ایک چپت جمائی، ابے تو ہے کون؟ اور سنیے صاحب خالی دکان پر کیا مزے سے چڑھ گئے؟ ایک اور دھپ سے جما کر اور جو کوئی عدد جاتا رہتا۔ میاں افیمچی نے دیکھا کہ اس نے تو "ایں جانب کا سرپنچوں کا سر مقرر کیا"، معاً چلم پھینک کر سامنے کھڑے ہوئے۔ بھلا اب کی تو ہاتھ چلا۔ سنار نے دیکھا کہ منحنی سا آدمی، دبلا پتلا، اور اتنا اکڑتا ہے، بڑھ کر ایک چانٹا اور رسید کیا، اور دے گا؟ اتنے میں تیس چالیس آدمی جمع ہوگئے۔ کیا ہے میاں کیا ہے؟ ہے کیا یہ ہماری دکان پر چوری کرنے آئے تھے۔ ہم نے گردن ناپی۔ تو میں چوری کرنے آیا تھا، میں چور ہوں، چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے؟

لوگ : کون! تم! ہمیں تو تم شاہیں چور معلوم ہوتے ہو۔ کال جواری۔ اچھا پھر تم ان کی دکان پر گئے کیوں۔ دکاندار نہیں تھا تو وہاں تمھارا کیا کام۔ اور جو سونا چاندی کا گہنا لے بھاگتے

تو یہ تھیں کہاں ڈھونڈھتے پھرتے۔

سنار : توبہ کرو صاحب! ان کا پھر پتا کہاں ملتا۔ یہ چانڈو خانے میں جاتے، یا جمنا اس پار۔ چلو تھانہ پر۔

لوگ : میاں اب جانے دو۔ تم اپنی طرف دیکھو جاؤ خبردار اب دکان پر نہ چڑھ جانا۔ نہیں پٹتے جاؤ گے بچہ۔

افیمچی کی جان اس مخمصے سے بچی، تو سب سے پہلے چلم کی فکر ہوئی۔ ایں! چلم کون لے بھاگا، بارے خدا خدا کر کے چلم ملی، سنار نے کہا اچھا آؤ آگ لیتے جاؤ۔ حضرت نے آگ پائی، اور گھر کی راہ لی۔ تڑکے تڑکے اچھی بُھنی ہوئی۔ چور بنے، مار کھائی، جھڑکے گئے، تب کہیں بعد خرابی بصرہ آگ پائی۔ ایسی طلب کو آگ لگے۔

میاں آزاد یہ دل لگی دیکھ کر آگے بڑھے۔ چلتے چلتے نواب کی ڈیوڑھی پر آئے اور آداب بجا لائے۔

نواب : آج اتنا دن چڑھ گیا کہاں تھے۔ کیا دربار گئے تھے؟

آزاد : حضور آج بڑی دل لگی دیکھنے میں آئی۔ واللہ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جایئے گا۔ طلب بھی کیا بُری چیز ہے، اور یہ افیمچی تو اور بھی ستم ڈھاتے ہیں۔ (ساری داستان کہ سنائی)۔

نواب : (کھِل کھِلا کر) واللہ اچھی دل لگی ہوئی۔ آگ کے عوض چپتیں پڑیں۔ ارے میاں ذرا خوجی کو بلانا۔ ہاں ذرا خوجی کے سامنے سنانا۔ کسی دن وہ بھی بہکیں گے۔

اتنے میں خواجہ صاحب تولہ بھر افیم پی کر، نشے میں غیں، جھومتے جھامتے لڑھکتے پڑھکتے آئے۔ غلام کو حضور نے یاد کیا ہے؟ جی ہاں، اس وقت کس فکر میں تھے۔ اے خداوند افیم گھول رہا تھا۔ اور فکر تو حضور کی بدولت قریب ہی نہیں پھٹکنے پاتی۔ میں فکر کیا جانوں، جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ دو وقتہ پلاؤ اڑانا اور افیم کی چسکی لگانا۔ حضور! اب تو لٹ گیا، نوابی میں غلام پر بھی جوبن تھا۔ چوک میں انگلیاں اٹھتی تھیں۔

مصاحب : (قہقہہ لگا کر) اچھی بے تکی سنائی، اس وقت جوبن اور ڈنڈ بل کا کیا ذکر تھا جی؟

اتنے میں ایک چوبدار برہنہ سر، پریشان و مضطر، لپکتا ہوا آیا۔ خداوند بڑا غضب ہو گیا۔ کیا؟ کیوں کیا کہوں، کہو۔ ایں خیر ہے۔ بولو تو!

سب کا رنگ فق کہ خدا ہی خیر کرے۔ نواب کا کلیجہ دہل گیا۔ میاں کچھ منھ سے بولو۔ سر سے

کھیلو، آخر کیا آفت آئی، کچھ معلوم تو ہو۔

چوبدار: (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اُڑ گئے۔

نواب: (ہاتھ ملتے ہوئے) سب! ارے سب اڑ گئے؟ ہائے! میرے صف شکن کو جو ڈھونڈھ لائے، ہزار نقد انقد گنوائے۔ اس وقت میں جیتے جی مر مٹا۔ اُف اُف! بھئی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنج کوسی دورہ کریں، جہاں صفِ شکن ملے سمجھا بوجھا کرلے ہی آئیں۔

مصاحب: خداوند سمجھانا کیسا، وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جنور لاکھ پڑھے پھر جنور ہے۔

نواب: کوئی ہے؟

رفقا: حاضر پیر و مُرشد خداوند جی حضور!

نواب: ان پر جوتے پڑیں۔ لو صاحب ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقا: حق ہے۔ اے حضور! وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔

دوسرے بولے خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔

تیسرے نے کہا قسم ہے پنجتن پاک کی میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

چوتھے ایک دن ہنس رہا تھا۔ پانچویں، اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔

نواب صاحب کو ان کل باتوں کا یقین آگیا۔ اس مصاحب بے چارے کی گدّی پر دو چار گدّے پڑ گئے۔

بٹیر کیا اڑ گئے کہ نواب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آنکھوں سے اشک جاری، ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں، کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں۔ ہائے میرا صفِ شکن! پیارا صف شکن:

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

مجھے تو اس سے عشق ہو گیا تھا جی۔ میں تو اس کی بانکی ادا پر جان دیتا تھا۔ یارو! وہ نکیلی چونچ وہ بے تابی سے کاکن چگنا، چکھی کھائی اور ڈٹ گیا، سیکڑوں معرکوں میں لڑایا مگر کورا آیا۔ دُو دُو چونچیں ہوئیں۔ اور بٹیر دُم دبا کر بھاگا۔ پھر سامنا ہوا اور منھ پھیر دیا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا۔ کہ پالی بھر تھرّا اٹھتی تھی، اور اس کی بساط ہی کیا تھی۔ پھوہڑ جنور۔ لیکن

بلا کا کس بل۔ اور قسم ہے صف شکن ہی کی، اس کی خوبیاں تو مجھ پر آج کھلیں۔ یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ حقانی جانور ہے۔ صورت بٹیر کی، مگر سیرت فقرا کی۔ اور ایک پنڈت نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہو گئی، نہیں تو اس کا بڑا درجہ تھا۔ اب سنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

مصاحب : حضور کو یاد ہو گا کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا۔ حضور سمجھے تھے بوندا ہو گیا، مگر میں تاڑ گیا کہ پابندِ صوم و صلوٰۃ ہے۔

خوجی : جلّ جلالہٗ۔ جلّ جلالہٗ۔ کیا شان کبریائی ہے۔ خداوند اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلادی، مگر واللہ باللہ ثم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ ہاں انکھڑیوں میں لال لال ڈورے تو پڑ گئے تھے۔

میر صاحب : پیر و مرشد! یقین جانیے پچھلے پہر سے سحرِ کاذب تک حق حق کی آواز کابک سے آیا کرتی تھی۔ غفور تم کو بھی تو ہم نے کئی بار جگا کر سنایا تھا کہ صف شکن، یادِ خدا میں مصروف ہیں۔

غفور : ہاں میاں پچھلے سے حق حق کیا کرتے تھے، اور اکثر دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہیں۔

خوجی : جلّ جلالہٗ۔ جل جلالہ۔ واہ میاں صفِ شکن علی شاہ۔

نواب : بھئی ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں۔

افسوس کہ عمر رفت و ہشیاری نیست　　　دردا کہ خیال خویشتن داری نیست

اُف اُف بھئی کوئی پنکھا جھلنا۔

مصاحبین : (غل مچا کر) پنکھا لاؤ۔ جلدی۔ سامنے کھڑے ہو کر جھلو۔

نواب :
پیتم جو میں جانتی کہ بیت کیسے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈھورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

خوجی : (پلنگ سے چونک کر) ہاں ذری اونچے سروں میں۔ واہ استاد چھیڑے جا۔ اس وقت تو میاں شوری کی روح پھڑک گئی ہو گی۔

نواب : چپ نامعقول، کوئی ہے؟ ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی صحبت کے قابل نہیں۔ مجھ کو بھی کوئی گویا مقرر کیا ہے۔ یہاں تو جی جلتا ہے، اور اندر ہی اندر پھک رہا ہوں، ان کے نزدیک قوالی ہو رہی ہے۔ کہنے لگے اونچے سُروں میں، میاں شوری[1] یاد آتے ہیں۔ تم ایسے

---

[1] شوری، نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں ٹپہ گانے میں کمال رکھتا تھا۔ گذشتہ لکھنؤ بحوالہ شرر

مفت خوروں کو کسی کے درد دکھ سے کیا سروکار۔ تم کو تو چکھوتیوں سے مطلب ہے، اور بس۔ فیرنی ہو، کھیر پکے، مزعفر پر ہاتھ پڑے، ٹکڑے کھائیے، دل بہلائیے، کپڑے پھٹے گھر کو آئے۔

خوجی: خداوند غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں۔ ہائے صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے ہوش وحواس سے چوکس رہوں۔ میرا معشوق نظر سے غائب ہو، تو طبیعت کیوں کر حاضر ہو۔ حضور نے اس وقت مجھ پر جبر کیا۔ افسوس! ہائے افسوس! ارے یارو صف شکن کو کہیں سے تو ڈھونڈھ لاؤ، کوئی تو پتا لگاؤ، چور گیدی سے خدا سمجھے۔

نواب: شاباش، خوجی شاباش، اس وقت طبیعت بہت ہی خوش ہوگئی۔ بے شک تم نمک حلال، تمھارے باپ دادا نمک حلال، ارے بھئی سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں؟

مصاحب: شجاعت علی سے کہو ابھی سانڈنی تیار ہو۔ اور تیج کوسی چکر لگائے۔ جہاں صف شکن ملیں ان کو سمجھا بجھا کرلے ہی آئے۔

شجاعت: جاتا تو ہوں مگر وہ تو منطق پڑھے ہیں، میری کیا سنیں گے۔ کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجیے ان سے بحثے گا کون۔ غلام تو کچھ اونٹ ہی چلانا خوب جانتا ہے۔ ان سے دلیل کون کرے بھلا۔

خوجی: خداوند قربان جاؤں۔ افیم چانڈو مدک چرس کی بحث ہو تو بندۂ درگاہ کو بھرا دیجیے! مگر وہاں تو حقانی باتیں ہوں گی، اس میں ایں جانب کو واجبی ہی واجبی دخل ہے۔ پھر دخل در معقولات دے کر الو بنوں مفت میں۔

میاں آزاد: پیرومرشد۔ بانک بنوٹ، لکڑی پٹے کا چرچا ہوتا تو بندہ بھی تلوار سوت کر عین موقع واردات پر جاڈٹتا، اور چرکے پر چرکا، نشتر پر نشتر، لگاتا۔ مگر منطق کی بحث کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ کسی جغادری مولانا کو بلوائیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا صاحب کو تجویزا، مولانا بے چارے پھٹے حالوں تھے۔ سمجھے کہ جو ملے غنیمت ہے۔ مگر یاران سرپل نے ان سے کل داستان نہیں بیان کی۔ چوبدار مکان پر گیا، اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ چلیے کسی بڑے عالم سے بحث ہوگی۔

مولانا: السلام علیکم۔ حضور نے آج یاد فرمایا ہے؟ زہے نصیب۔

نواب: وعلیک السلام۔ آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ میرا قرۃ العین، لخت جگر، نور بصر، ناراض ہو کر چلا گیا۔ مگر منطقی آدمی ہے۔ اسرار خدائی سے واقف، علم مناظرہ میں طاق، پابند روزہ ونماز۔ آپ بحث کیجیے، اور معقول کر کے لے آئیے۔

مولانا : انشاء اللہ۔ والدین کا بڑا حق ہوتا ہے۔ وہ کیسے نادان آدمی ہیں، کہ والد سے خفا ہو گئے۔ مقام استعجاب ہے۔

خوجی : مولانا صاحب۔ وہ بٹیر ہے، مگر خوش تمیز، عارف زاہد، عفت کوش، متقی، متشرع، منطقی، فلسفی، ہیئات داں، عربی خواں۔

میر صاحب: کیا صفِ شکن کا نام مولانا صاحب نے نہ سُنا ہوگا۔ وہ تو روم و شام تک مشہور تھے۔ قبلہ حقیقت حال یوں ہے کہ سرکار کا بٹیر صف شکن، کل کابک سے اڑ گیا۔ اب تجویز یہ ہوئی ہے کہ ایک سانڈنی سوار جائے، اور سمجھا بجھا کر لے آئے۔ مگر شتر باں، پھر شتر باں ہے۔ لاکھ صحبت یافتہ ہو۔ تو کیا لہٰذا آپ بلائے گئے، کہ سانڈنی پر سوار ہو جیے، اور ان کو بلطائف الحیل بُلا لائیے۔

مولانا : درست۔ آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کیجیے۔ خود مسخرے بنتے ہو، یا مجھے مسخرہ بناتے ہو۔ بٹیر منطقی کیسا، لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے مجھے بھی کوئی نقلِ محفل بنایا ہے۔ اور سنیے بٹیر اڑ گیا۔ اس کو سمجھا بجھا کر لاؤ۔ وہ بھی کوئی مولوی ہے، یا آدمی ہے۔ صف شکن ؟ کون لڑائی سر کی تھی۔ استغفر اللہ، اچھے گاؤدیوں کا مجمع ہے بندہ رخصت ہوتا ہے۔

نواب : یہ کس کوڑھ مغز کو لائے تھے۔ خاصہ جانگلو ہے۔

آزاد : اچھا حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اس اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا۔ لے اب غلام نے بیڑا اٹھا لیا، کہ جاؤں گا، اور لاؤں گا۔ ایک تو سانڈنی دیجیے باد رفتار، اور دو دن کی خوراک دیجیے، اور ایک خط اپنے دستخط مبارک سے لکھ دیجیے۔ تیسرے دن غلام مع صف شکن خاں بہادر کے ڈیوڑھی پر موجود نہ ہو تو موچھیں منڈوا ڈالیے۔

نواب : اچھا آپ جائیے، اور لیس ہو کر آئیے۔ میں یہاں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مگر ابھی آئیے۔ دیر نہ ہونے پائے۔ اتنا خیال رہے۔

میاں آزاد گھر گئے تو اور مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ یار دیہ تو بازی جیت لے گیا۔ پالا اسی کے ہاتھ رہا۔ اور جو کہیں صف شکن کو لے آیا، تو پھر ہم سب پر شیر ہو جائے گا۔ پھر آزاد ہی آزاد، چوطرفہ نظر آئیں گے۔ ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ اس کی فکر ضرور کیجیے۔

خوجی : حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں ؟

نواب : کہیے نہ یہ جان بخشی کا کون موقع ہے۔ کوئی عمدہ صلاح بتائیے۔ کوئی معقول تدبیر نکالیے۔

خوجی : حضور میاں آزاد ابھی دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں، ان کا اعتبار کیا۔ خدا جانے اچکے ہیں، اٹھائی گیرے ہیں، چور ہیں، گرہ کٹ ہیں، کوئی کیا جانے۔ اور جو سانڈنی ہی لے کر رفو چکر ہوں تو پھر کوئی کہاں ان کا پتہ لگاتا پھرے۔ انصاف سے کہیے گا کہ ایک خانہ برباد، خانہ بدوش آدمی کا ٹھکانا کیا۔ اور وہ کچھ بیدھا ہے کہ پھر واپس آئے گا۔

مصاحب : ہاں خداوند کہتے تو سچ ہیں۔

رفیق : پیرومرشد سڑی ہے تو کیا ہوا، مگر کہتا پتے کی ہے۔

میر صاحب : یہ خوجی صورت ہی سے ایسے معلوم ہوتے تھے، مگر بات کہی ٹھکانے کی۔ اے ہاں ایسے آزاد کا ٹھکانا کیا۔ سانڈنی کے کوڑے کرے اور اپنی راہ لے۔

مسیتا بیگ : ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو سانڈنی دیجیے، اور راہ خدا پر چھوڑ دیے، جو کم سے خالی نہیں۔

نواب : چلو بس بہت نہ بکو۔ تم اٹھائی گیرے، مفت خورے ہو نہ، سب کو اپنا ہی ایسا سمجھتے ہو آزاد کی چتون کہے دیتی ہے کہ وہ وزارت کے قابل ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی جوتی کی پھٹ پھٹ کو نہیں پہنچتا۔ اور فرض کرو کہ سانڈنی جاتی ہی رہے، تو کیا میں بھی کوئی ٹکڑ گدا ہوں کہ سانڈنی کے کھونے سے مجھے بھیک مانگنے کی نوبت آئے گی۔ اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں، سانڈنی کس میں ہے۔

پریوں کا دنگل بمبئی کے پارسیوں کا تماشہ

ہمارے سیلانی جوان، رنگیلے پہلوان، ظریفوں کی جان، زندہ دلوں کی روح رواں، میاں آزاد نے سانڈنی پر کاٹھی کسی، اور بھولے بھالے، دیوانے متوالے، نواب سے رخصت ہوئے۔ پیرومرشد رخصت خدا حافظ و ناصر ہے میاں آزاد :

یہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

خوجی : فی امان اللہ! میاں آزاد جس طرح بیڑا اٹھا کر جاتے ہیں خدا کرے اسی طرح سُرخ رو آئیں۔

میر صاحب : ذری سانڈنی سے چوکس رہیے گا، ہاں ایسا نہ ہو کہ۔ ع۔ چور جاتے رہے کہ اندھیارے ہی کا نقشہ ہو۔

آزاد : خداوند رخصت۔ مجرا عرض ہے۔ غلام کے حق میں دعائے خیر دیجیے۔

نواب : خدا حافظ و ناصر ہے۔ اور میرا تو رونگٹا رونگٹا دعا دے رہا ہے۔ بسم اللہ کیجیے۔

میاں آزاد نے پشت پھیری تھی کہ اتنے میں بٹ سے چھینک پڑی۔ ہات ترے کی ناک کاٹوں، ہتے پر ٹوکا، کم بخت نے لو میاں ذری جوتا بدل ڈالو، اور یہ گلوری کھالو۔ میاں آزاد پھر سب سے رخصت ہوئے۔ فی امان اللہ۔ خدا حافظ، اللہ کو سونپا۔ مگر سانڈنی کی خیر نہیں نظر آتی۔ بی مبارک قدم لونڈی، اور ماما اصیلوں نے چٹ پٹ بلائیں لیں اور دعائیں دیں۔

الغرض میاں آزاد سانڈنی پر سوار ہو کر ہوا ہوئے۔ یہ جا وہ جا، تھوڑی ہی دیر میں نظر سے اوجھل۔ بانکا صندلی عمامہ بر سر، اور جامۂ پہلوانی در بر، شتر بے مہار زیر ران، چھرہرا تنک و سبک رعناں، گھونگر و چھن چھن بولتے جاتے ہیں۔ کاٹھی پر قرمزی زریں پوش اور کارچوبی گوٹے سے اونٹنی کا جوبن دوبالا ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک پھاٹک پر بڑا لمبا چوڑا اشتہار دیکھ کر ٹھٹک رہے پڑھا تو باچھیں کھل گئیں۔

بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے

آؤ کھلاڑی آؤ! پریوں کے پوَن دیکھ جاؤ۔ بمبئی کے پارسی لکھنؤ چھتر منزل[1] میں، اندر سبھا کا وہ تماشا دکھاتے ہیں، کہ اس فن کے مبصر تک وجد میں آتے ہیں۔ وہ پیاری پیاری صورتیں، مٹی کی مورتیں دکھائیں، کہ ناظرین دنگ ہو جائیں۔ درجہ بندی تو ضرور ہے۔ پھر جیسا گڑ ڈالو گے ویسا مزہ پاؤ گے۔ مگر دیکھیں گے سب از برائے خدا آؤ آؤ اور ضرور آؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔

آزاد تو سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہی ہوئے تھے جھٹ سانڈنی کو لکھنؤ کے رخ سبک پو یہ کیا، جہاں تماشا ہونے کو تھا۔ سانڈنی بلا کی باد رفتار، آہو شکار دغا پسند و سربلند۔ گردن اٹھائے، دم دبائے، بلبلاتی، اور شتر غمزے دکھاتی، شہ گام جانے لگی۔ اور دن سے لکھنؤ کے پکے پل پر کچی دو گھڑی میں داخل۔ میاں آزاد کا دماغ فلک الافلاک پر کہ میری اونٹنی کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ بے پر کی پریوں کو مات کرتی ہے۔ وہاں سے ایک طرارہ بھرا، تو چھتر منزل میں کھٹ سے آن موجود۔ اہو ہو ہو! کیا مقام

---

[1] چھتر منزل لکھنؤ میں دریا گومتی کے کنارے شاندار عمارت ہے۔ اس کا اصل نام فرح بخش ہے۔ اس کو ایک انگریز کلارڈ مارٹین نے یورپین طرز پر تعمیر کیا تھا۔ آصف الدولہ نے اس کو پچاس لاکھ روپیہ میں خرید لیا تھا۔ یہ عمارت اب تک محفوظ ہے اور اس میں حکومت ہند نے ادبیات کا تحقیقی ادارہ قائم کر دیا ہے۔ نورانی

یعنو سواد ہے۔ الٰہی یہ زمین ہے یا بہشت شدّاد ہے۔ یہ رنگین دروازے ہیں، یا باب گلستان۔ یا ابوابِ جناں۔ اہاہاہا، آج جمعرات ہے۔ مشتری کی کرامات ہے۔ روز آدینہ، پر اس کو تقدّم بالزّماں ہے۔ سعد اکبر مشہور جہاں ہے۔ لیلائے شب کا دل پریشان، نوعروسانِ چمن مست و غزلخواں۔ اُدھر چشمہ سار کی روانی۔ ادھر بحر طرب کی طغیانی۔ تماشائی جوق جوق ڈٹ رہے تھے۔ ٹکٹ کھٹا کھٹ بٹ رہے تھے اتنے میں گھنٹی بجی، اور محفل دلہن کی طرح سجی۔ سامنے پردۂ زنگار، اور اس پر کہسار، اور دامنِ کوہ میں سبزہ زار، اِدھر اُدھر اشجار پر بہار، عقل دنگ ہے کہ الٰہی یہ پردہ ہے یا نگار خانۂ ارژنگ ہے۔ وہ گل بوٹے کہ واہ جی واہ۔ وہ نقش و نگار کہ سبحان اللہ۔ تماشائی پرانے رسیا تاڑ گئے کہ ع "کوئی معشوق ہے اس پردۂ رنگاری میں" اتنے میں پردہ اٹھا۔ تو آنکھ جھپک گئی۔ وہ چکا چوند کا عالم کہ نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ راجہ اندر تختِ جواہر نگار پر بڑی شان اور بان سے متمکن ہیں۔ تختِ فیروز بخت کو دیکھ کر حیرت تھی کہ باللعجب! یہ جواہر ثمین کی دکان ہے، یا تخت رواں ہے۔ تاج مکلّل کے گوہر شاہوار، افشاں جبیں، خوباں یغمانی، اور عکس یواقیتِ آبدار، نور مہر دلربائی، برنائی، اور خودنمائی، چہرے سے عیاں، شانِ کشور کشائی بشرے سے نمایاں:

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

پھر تو ہر در و دیوار سے چھن چھن، چھم چھم، کی آواز آنے لگی۔ اور محفل بھر کھل کھلانے لگی۔ ایک لولی غلمان نظیر نے عجب ادائے دلپذیر سے چمک چمک کر گانا شروع کیا، اور دائرہ والے نے گت بجانا شروع کیا:

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

اوں، اوں، ایں! یہ کیا؟ جی کالے دیو کی آمد ہے۔

ماشاء اللہ! انوکھی قطع، اور نرالی وضع، کے علاوہ خوش گلو بھی کتنے بڑے ہیں۔ اس گلے پر ٹڈیاں اور چوہے نثار۔ یہ ٹڈیوں اور چوہوں کی خصوصیت کیا تھی۔ کتے کیوں نہ صدقے کر دیے۔ واہ واہ ٹڈیاں اور چوہے تو کھیت کے کھیت ستیاناس کر جاتے ہیں، اور کتے رات بھر چوکی پہرہ دیا کرتے ہیں۔ انھوں نے آتے ہی وہ دھاند مچائی کہ ساری محفل لوٹ گئی۔ ماشاء اللہ خوش لقا ہی نہیں خوش ادا بھی ہیں۔ اللّٰھمّ زد فزد۔ راجہ اندر نے حکم دیا کہ میری پریوں کو بلاؤ، اور کہو اپنا اپنا جوہر دکھاؤ۔ پردہ پڑ گیا۔ اب تماشائی نرگس کی طرح دیدۂ حیراں ہیں، کہ کہیں پردہ

اٹھے۔ زبان حال سے پکار رہے ہیں کہ :

کیسا حجاب کس کی حیا، اور کہاں کی شرم
پردے سے ہاتھ، ہاتھ سے پردہ اٹھائیے

اتنے میں :

پل مارنے کی ہوئی جو دیری
سبحان اللہ شان تیری

یہ پردہ ہلا - وہ اٹھا۔ جل جلالہٗ۔ عم نوالہٗ۔ اہو ہو ہو! کیا پیاری پیاری صورت نظر آئی ہے۔ کیا شان کبریائی ہے۔ چھم چھم، چھم چھم، وہ برق دم، وہ خم وچم، کہ زہّادِ صد سالہ بھی آیۂ فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھیں۔ کیوں نہیں قدرت حق کا نمونہ ہے، یا باتیں۔ استعجاب تھا کہ یہ یاد بہاری ہے۔ یا پکھراج پری کی سواری ہے۔ یہ انسان ہے یا سچ مچ کی پری، آدم زاد اور پھر شان دلبری :

اس طراقے سے تھی وہ مہ پارہ — کہ پھسلتا تھا پائے نظارہ
روئے تاباں چراغِ گلشن نور — صبح رُخسار رو کش رخ حور

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

چھم چھم، چھم چھم - ہاں گت چلی جائے گت۔

پھر پردہ پڑ گیا۔ دیکھیں اب کی کس کا جھمکڑا نظر آتا ہے۔ کس برق وش، شعلہ رو، کا حسن گلوسوز، خرمنِ دل کو جلاتا ہے۔ کھٹ سے حجاب مرتفع ہوا۔ چھما چھم کرتی ہوئی نیلم پری آئی۔ اس مصور کے صدقے جس نے یہ نورانی صورت بنائی :

سبھا میں آمدِ نیلم پری ہے — سراسر وہ نزاکت سے بھری ہے
نہ دیکھا ہوگا ناچ ایسا کسی نے — بلا ہے سحر ہے جادو گری ہے

پھر پردہ پڑا، اور دم میں غائب، یا مظہر العجائب! لال پری چمکتی ہے، اور سر تا سرخ پوشاک دمکتی ہے۔

سبھا میں لال پری کی سواری آتی ہے
جمانے رنگ اب اندر کی پیاری آتی ہے

پھر دہ پردہ پڑ گیا۔ اب کی تو کچھ ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ پردہ بھی فرطِ مستی سے جھوم رہا ہے۔

اور اندر کے اکھاڑے کو بار بار چوم رہا ہے الٰہی! یہ کس مستِ صہبائے ناز، بتِ طنّاز کی آمد آمد ہے۔ ع "کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ" خدا ہی خیر کرے۔ اب کی تو قہر کا سامنا ہے۔ ابھی سے دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس پردۂ زنگار میں کوئی ترکِ زرّیں کمر ستم گر ضروری:

بعزم دل نوازیہا کہ می آید کہ در گوشم　　صدای آمد آمد می بر آرد دل طپیدنہا

وہ پردہ اٹھا اور نور کا بکا نظر آیا۔ جیسے دامنی دمکے، یا بجلی چمکے۔ الٰہی! یہ نور کی سواری ہے، یا خاتونِ حسن کا ہنڈولا ہے۔ نہیں نہیں، میاں یہ سبز پری کا اڑن کھٹولا ہے۔ جلّ جلالہٗ، جلّ جلالہٗ الٰہی یہ طوطیٔ زمرّدیں پر وبال ہے، یا طاؤسِ رنگیں خط و خال ہے۔ یا بتِ جادو جمال ہے۔ قیامت کی چھپ قہر کی چال ڈھال ہے۔ انکھڑیاں لگاوٹ باز، سرمستِ خوبی و محوِ ناز، گورا گورا مکھڑا، چاند کا ٹکڑا، غالیہ مو، قوس ابرو، نازک خرام، گلفام، وہ سبک روی رفتار، کہ نسیم فردوس اس پر نثار، خرام ناز، موجِ تسنیمِ بہار۔ ابرو بسم اللہ سورۂ نور، یا پیش طاق منظر سرور۔ زلفِ سیاہ کے قریب کانوں میں درِ خوش آب، جیسے اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب۔ وہ جڑاؤ پازیب، ملائک نظر فریب:

خشمگیں برقِ خرمنِ دل و جان　　چتون رہزنِ متاعِ تواں
غیرتِ چشمۂ حیات دہن　　روزنِ کوزۂ نبات دہن
سرو جس پر فدا وہ قامت ہے　　ناز پروردۂ قیامت ہے
نشۂ بادۂ شباب میں چور　　چال مستانہ حسن پر مغرور
شورِ خلخال برقِ خرمن ہوش　　عکسِ نورِ عذار جلوہ فروش

پھر دسے پر جو نظر پڑی، تو بے اختیار محفل کی محفل زبانِ حال سے کہنے لگی کہ:

خوش وسمہ کشیدی خم ابروئے دوتارا　　کردی چہ سیہ تاب دمِ تیغِ قضا را

جب اس ٹھٹے سے سبز پری آئی اور سوہنی کی دُھن میں امانت کی غزل گائی تو در و دیوار نے یہ صدا سنائی:

تو بدیں جمال و خوبی سوئے طور گر خرامی　　ارنی بگو بدآں کس کہ بگفت لن ترانی

لب سرخ پوشاک ہری۔ بقول استاد "چہرے میں زمرد سے سوا جلوہ گری" فیروزے سے خوش رنگ، اور کھری۔ آبِ گوہر سے منھ دھوئے ہوئے، بال بال موتی پروئے ہوئے۔ وہ چمک دمک کہ الاماں! وہ شوخی کہ الحفیظ! وہ قہر آلود نظر غلط انداز کہ الحذر! محفل کا رنگ ایسا جما، اور وہ سماں بندھا، کہ واہ جی واہ۔ وہ نازک آوازی، وہ لحن داؤدی، وہ صورتِ باربُدی کہ

اہو ہو ہو۔ ذرا مسکرا دیا تو عجمی بول اٹھے، کہ بابا ایں تبسم نازست۔ نظامی گنجوی نے تربت سے آواز دی کر "دکانِ شکر فروش بازست"، ناچنا شروع کیا تو دلِ عشاق پامال ہو گیا۔ شجرِ عاشقی نہال ہو گیا:

زر قصِ سبزہ پوشی مردہ زیر خاک می رقصند　　　تو گوئی در لباسِ خضر پیدا شد مسیحائی

زمزمہ جانفزا، نغمہ روح افزا۔

الغرض سبز پری کا شہزادۂ گلفام کو خواب ناز میں دیکھنا، اور شمعِ رخسارِ شہزادۂ شعلہ رو سے، آنکھیں سیکنا، انگوٹھی کا بدلنا، اور فرطِ عشق سے مچلنا، کالے دیو کو اس کی تلاش میں بھیجنا، اور شہزادے کا مع پلنگ آنا۔ اور سبز پری کا شانہ پکڑ کر ہلانا، اور خواب سے جگانا، اور شہزادے کا بیدار ہو کر نظرِ حیرت سے چو طرفہ دیکھنا، سبز پری کا اصرار، شہزادے کا انکار، پھر سبز پری کے ساتھ اندر کے اکھاڑے میں جانا، اور لطف اڑانا، اس خوبی و خوش اسلوبی سے ادا کیا، کہ ہر سمت شورِ تحسین بلند تھا۔ ہر تماشائی خرم و خرسند تھا۔ سبز پری نے راجہ اندر کی سبھا میں برج کی دھن میں "موری انکھیا پھڑکن لاگیں رے" اس ٹھمری کو گایا۔ اور راجہ کو لبھایا۔ اتنے میں لال دیو چغل خور نے چغلی کھائی، اور گلفام کی شامت آئی، اور سزا پائی۔ سبز پری بادۂ مطروح، و سینہ مجروح، جوگن بن کے "شہزادے کو ڈھونڈھن چلیں" ہاتھ میں سمرن دبائے، منہ پر بھبھوت رمائے، سر پر انڈوا جمائے، گردن میں سیلیاں پڑی ہوئی، درو دیوار سے آنکھیں لڑی ہوئیں۔ لٹ چھٹکا کر، بھیس بنا کر، "شہزادے کو ڈھونڈھن چلیاں"۔ اُف ری لگاوٹ، اور واہ ری بناوٹ، نقل کو اصل کر دکھایا۔ محفل بھر کو زار زار رلایا۔ اس جوگن پر اور ہی عالم تھا۔ شدہ شدہ راجہ اندر کو خبر ہوئی کہ ایک جوگن بن بن متوالے کی طرح گھوم رہی ہے۔ انھوں نے طلب کیا، اور محفوظ ہو کر پان دیا۔ گلفام اور سبز پری کا وصل ہونا یہ سماں قابل دید، بلکہ دید نہ شنید ہے۔ اور جس وقت سب پریاں مل کر مبارک باد گائیں، اس وقت تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہے۔ پریوں کی چمک، اور پاؤں کی تھپک، اور پازیب کی جھمک، اور نیلی ہری لال پوشاک کی جھلک، اور طبلے کی گمک، ستم ڈھاتی تھی۔ ہر سمت سے صدائے اَحسنت آتی تھی۔

الغرض چھل بل، ناچنے گانے، ٹھرک کر بتانے میں سب پریاں بلائے جان تھیں۔ مگر سبز پری سارے معشوقوں کی سرتاج تھی۔

پارسیوں کا عجیب و غریب تماشا

میاں آزاد پھر آپ جانیے ترنگی آدمی۔ پرلے سرے کے سیلانی۔ بلا کے رنگیلے، غضب کے چھیل چھبیلے، بمبئی کے پارسیوں کا تماشا دیکھا تو لوٹ ہو گئے۔ پیاری پیاری ادائیں آنکھوں میں کھپ گئیں۔ دوسرے دن سانڈنی کو املی کے پیڑ میں باندھ، گٹھری بقچہ بھٹیارن کو سونپ، بھاڑے کی بگھی پر سوار ہو کر چھتر منزل پہنچے۔ بھٹ سے ٹکٹ لے، جھپ سے درجۂ اول میں داخل۔ بگھیاں کھڑکھڑاتی ہوئی چلی آتی ہیں۔ فٹن آئی اور شہزادے اترے۔ نواب زادے آئے۔ یوروپین جنٹلمین اور عمائد رؤسا اور عوام جوق جوق امڈے چلے آتے ہیں۔ ادھر ٹھن سے نو بجے، ادھر دن سے تماشے شروع ہوئے۔ پہلے چھیل ٹبا داور موہنا رانی کا دلچسپ قصہ شروع ہوا۔ موہنا وہ پری چھم کامنی، کہ شیخ و شاب تک کا بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہے۔ چاہ زنخداں وہ جو کنویں جھکائے، وہ چلبلاہٹ، وہ اچپلاہٹ، وہ سجاوٹ، وہ لگاوٹ، وہ بناوٹ، کہ ایک ایک ادا پر انسان عش عش کرے۔ یوسف مصری بھی دیکھے تو عشق کرے۔ خماری انکھڑیاں، رسیلے نیناں، نکیلی، گلعذار، حاضر جواب، طرار، شوخ و شنگ، گل رنگ، رشک پری رخانِ فرنگ، فرطِ مستی میں خیالِ ناموس نہ پاسِ ننگ، طاؤسِ رنگیں خط و خال کی سی مستانہ چال، خرامِ ناز سے دلِ عشاق پامال:

چہ گردن کشتۂ او شمع کافور — بلورین دستۂ فوارۂ نور
نباید گردنش را داشتن دوست — کہ خونِ عالمی بر گردن اوست
صراحی تا نظر کردش بگردن — سرش فرسود از بس سجدہ کردن
نمودہ موج رنگِ پان زسینہ — برنگ موج مے در آنگینہ
خوشا آئینۂ بے رنگ زانو — کز و شد طوطی طبعم سخن گو

اب سنیے کہ یہ جادو جمال، مشتری خصال، رانی راجہ جے سنگھ راجپوت کے ساتھ کہ جوان رعنا، بلند بالا تھا۔ منسوب ہوئی۔ مگر ایک عورت دلالہ نے کچھ ایسا چھلاوا کر دیا، اور پڑھ کر وہ افسوں پھونکا کہ جے سنگھ سے اس پری رو کا دل پھر گیا۔ اور ایک جوانِ نوخیز و طناز، سرمست صہبائے ناز، پر جادو کے اثر سے ایسی مفتوں ہوئی کہ یہ غزل گانے لگی:

ساقیا برخیز! و در دہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر مے بر کفم نہ تا ز سر — بر کشم ایں دلقِ ازرق فام را

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

ادھر چھیل بٹاؤ کو سحر نے وہ پٹی پڑھائی کہ تیرِ عشق کلیجے سے پار ہوا۔ اور وہ زخم کاری لگا کہ بلبلا اٹھا:

کس سے کروں میں دعوے دل جاکے اے خدا　　　دلدادۂ زلفِ رخ دل بر ندیدہ ہوں

سچ ہے:

نہ تنہا عشق از دیدارِ خیزد　　　بسا کیں دولت از گفتار خیزد
درآید جلوۂ حسن از رہ گوش　　　زجاں آرام بر باید زدل ہوش

ہائے اس عشق کا بُرا ہو، جس نے فرہاد کی جان شیریں لی، جس نے مجنوں کو بن بن پھرایا، جس نے وامق کو کنویں جھنکائے، جس نے خسرو پر آفت ڈھائی، چھیل بٹاؤ بھی جوان نازک بدن سیمتن، غنچہ دہن تھا۔ دل میں ٹھان لی کہ پیاری موہنا رانی نہ ملی تو دم توڑ دوں گا۔ زندگی سے منھ موڑوں گا۔ شدہ شدہ، چھیل بٹاؤ کی بوڑھی ماں کو پاس پڑوس کی عورتوں نے خبر دی کہ تمھارا لڑکا چل نکلا۔ کسی رانی کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ ماں کی محبت! خون نے جوش کیا، اور ڈھاریں مار مار کر رونے لگی۔ ہے ہے! دنیا میں ایک لڑکا، اور اس کا یہ حال۔ اتنے میں چھیل بٹاؤ بھی سر پر خاک اڑاتا۔ رسیاں ٹراتا، افتاں و خیزاں، زار و نالاں، حیراں و ششدر، بے قرار و مضطر، اپنی ماں کے پاس گیا۔ دونوں کا مکالمہ سننے کے لائق ہے۔ ماں بیٹے جو ملے تو رو رو کر یوں کہنے لگے:

چھیل بٹاؤ : میری پیاری اماں! دودھ ہمیں بخش دو، میں صدقے، میری اماں! دودھ بخش دو! قسم لو جو پھر کچھ مانگوں۔ ہے ہے، مادرِ مہربان سے مادرِ نامہربان نہ بن جاؤ۔ اماں میری تو جان پر بنی ہے۔ ہائے عشق کے خنجر نے مجھے گھائل کر دیا۔ میرا کہا مانو دودھ بخش دو۔ اُف! اُف! ہائے کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے۔

ضعیفہ : میری جان! کوئی ایسا نادان ہو جاتا ہے۔ بہکی بہکی باتیں نہ کرو۔ یہ تو موئے شہدے نگوڑوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کر چل نکلا ہے۔ "باپ نہ مارے پِدڑی بیٹا تیر انداز" اچھا نام جگاؤ گے۔ شاباش برخوردار۔ آخرش کچھ منھ سے بولو تو۔ کس چڑھائی پر جاؤ گے، جو تیر کمان سے جوڑے کھڑے ہو۔ ارے لڑکے جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، ذرا ہوش کی باتیں کرو۔

چھیل بٹاؤ : اماں میں اپنا گلا آپ گھونٹ کر مر جاؤں گا۔ سنکھیا کھاؤں گا۔ مگر دودھ بخشواؤں گا۔ ہائے میرا دل تو موہنا نے موہ لیا۔ بیمارِ عشق کا بس یہی علاج ہے کہ شربتِ دیدار نصیب ہو۔ اماں

خدارا دودھ بخشو۔ تو میں اپنی موہنا پیاری موہنا کو ڈھونڈھ نکالوں۔ ہائے! وہ تو میری پتلیوں کی تارہ ہے، پری رخسار ہے، مہ پارہ ہے۔ موہنا! موہنا! موہنا رانی! ہائے موہنا دائے موہنا! بارِ خدایا کسی در و دیوار سے موہنا پیاری کی پیاری صورت دکھادے۔ اے خضر پے خجستہ راہ ہی بتا دیجیے!

یہ کہہ کر چھیل بٹاؤ، دیوانہ وار عشق کی ترنگ، اور جنون کی امنگ، میں بصد حسرت مستوں کی طرح جھومنے لگا۔ کبھی کنواں جھانکا، اور پکارا موہنا! کبھی اوپر نظر کی اور آواز دی موہنا! کبھی موہنا موہنا کرتا ہوا لوٹ گیا! کبھی موہنا کی یاد میں سر دھننے لگا۔ ابھی رو دیا، ابھی مسکرانے لگا، کبھی خاک سر پر اڑائی، کبھی کہا جنون کی دہائی ہے۔ یا مشکل کشا وقت مشکل کشائی ہے۔ یا علیؑ مدد دے! مرتضیٰ علیؓ مدد دے! ایک دفعہ ہی تنکے چُننے لگا۔ اور گریبان کو چیر سے چاک کر ڈالا۔

ضعیفہ: لوگو دوڑو (سر پیٹ کر) ارے لوگو دوڑو! (چھاتی پیٹ کر) ہے ہے، میری ستر برس کی کمائی لٹی جاتی ہے۔ میرے لال مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گا۔ ارے تو تو پوتڑوں کا رئیس ہے۔ ہے ہے! بن میں تجھے کون کھلائے گا۔ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی کون پلائے گا۔ یہ جلتی بلتی فصل، یہ گرما گرم لو، یہ چلچلاتی دھوپ، کہ ہرن کالا ہو جائے، مجھ نصیبوں جلی کو موت بھی بھول گئی، ارے نادان وہ راجا تو پرجا، کجا راجہ بھوج کجا گنگا تیلی۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ وہ بت مہوش، تو رند سبو کش، وہ شوخ عیّار، تو ناکردہ کار، وہ بلائے جاں، تو ناداں، وہ اپنے حسن و جمال پر مغرور، تو شرابِ عاشقی کے نشے میں چور، وہ راجہ کی رانی مہارانی، تو زمین گیر کوئے پریشانی، وہ نازک اندام و گلفام، تو نامراد و ناکام، وہ گل عذار جانانہ، تو نام پر دیوانہ، تیرا اس کا سامنا، مٹی میں ہوا کا تھامنا، اس کی چاہ نے اچھے اچھے شہزادوں کو کنویں جھنکائے، تو اور اس کو پائے، ناداں نہ بن۔ اس کا نہ نام لے۔ بات مان عقل سے کام لے۔ اس کا مکان پرستان، تیرا جھونپڑا کلبۂ احزاں، تیر نے سے سیکڑوں سودائی اس کے در پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مگر اس کی گل بدن سہیلیوں کی چھانھ نہیں پاتے ہیں۔ بیٹا اس خیال خام سے درگزرو، اور میری ضعیفی پر نظر ڈالو، ایسی سنانی پھر نہ سنانا۔ تمھارے ابا کو خدا بخشے! مرتے وقت مجھے تمھارے سپرد کر گئے۔ اب مجھے اس بڑھوتی وقت کہاں چھوڑ جائے گا۔

چھیل بٹاؤ: اماں۔ انھیں کی روح پاک کی قسم! اب بن جائے زیست محال، اور زندگی وبال ہے۔ اری موہنا پیاری میں صدقے ایک جھلک تو دکھا دے!

ضعیفہ جب سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی، تو تھک کر پڑوس کی ایک طرار جواں و حسین عورت کو لپک

کربلا لائی۔ وہ برق وش بجلی کی طرح چمکتی آئی۔ اور بیڑا اٹھا لیا کہ میں سمجھا بجھا کر پٹی پڑھا کر نہ جانے دوں گی، نہ جانے دوں گی۔

حسین : چھیل چھبیل۔ ہائیں! اے واہ میاں یہ آج آپ کا حال کیا ہے؟ وہ رنگ نہ وہ روغن، نہ وہ جوبن، وہ شباب نہ وہ آب و تاب، چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئیں، بال بکھرے، گریباں چاک دامن کا پتا ہی نہیں، انکھڑیاں لال انگارا، واہ اچھا سوانگ ہے۔ اب رنگ لائی گلہری۔ ہم نے سنا آپ موہنا رانی پر عاشق ہوئے ہیں۔ سچ ہے جیسی روح، ویسے فرشتے، جو عشق ہی چرایا ہے تو پیارے ہم کیا بُرے ہیں۔

چھیل بٹاؤ : پیارا تمھارا کوئی اور ہوگا، میں تو پیاری موہنا کا پیارا ہوں، ہائے! اس وقت پری خانہ میں سہیلیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی ہوگی۔

حسین : (جھڑک کر) بس جائیے دیکھ لیا، ہم پر رئیس زادوں، بادشاہ، وزیروں کی نظریں پڑتی ہیں۔ تم اپنی موہنا کے پھیر میں ہو۔ کیا میں چنچل نار چھیل چھبیلی کامنی نہیں ہوں؟ موہنا کہاں کی ایسی پدمنی ہے، جو بے جانے، بے دیکھے بھالے، اس پر ریجھ گئے۔ اتنی دور جانا کیا دل لگی ہے۔ اس سے پڑوس ہی میں کوئی شعلہ رو عنبر مو مل جائے تو دور کیوں جاؤ۔ کہا مانو، ہمارے ساتھ بیاہ کر لو، موہنا کو اپنی ایڑی چوٹی پر سے قربان کر دوں، میری رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

چھیل نے قہر کی نگاہ سے اپنی زبان دراز، اور بیباک ہمسائی کو دیکھا، اور ایک نعرہ مار کر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ بن بن، جنگل جنگل، کوہ و ہامون میں، گھومتا ہوا موہنا رانی کے راج میں پہنچا۔ ایک گنوار سے یارانہ پیدا کیا۔

چھیل : کاہے ہو بھیّا! بھلا موہنا رانی کبھیں گھر کے باہر نکلت ہیں، یا گھر ہی میں رہت ہیں؟ سنت ہیں بھل سندر ہیں۔ مانو لچھمی۔

گنوار : کو؟ موہنا رانی، ارے! وہ آکھن کا آس مٹکاوت ہیں جس کنہیا کا کیار بٹوا۔ بھائی اس مٹکٹ ٹپکت ہے جیسے گوڑیا۔

اب سنیے کہ وہی ساحرہ جس نے یہ کانٹے بوئے تھے آن موجود ہوئی، اور جادو کے زور سے وہ کرتب کیا کہ اہو ہو ہو۔ چھیل ایک دن چھیلا بنے ہوئے جوش عشق اور خمار صہبائے جنون سے نگری بھر میں گھوم رہے تھے۔ گویا اپنے وقت کے میاں آزاد ہو گئے۔ ادھر موہنا رانی نے شب کو خواب میں چھیل بٹاؤ کی صورت دیکھی، اور خواب ہی میں ہزار جان سے عاشق زار ہو گئیں۔

نیند اچٹ گئی۔ اسی وقت سہیلیوں کو جگایا، ذری میرے کلیجے پر تو ہاتھ رکھنا۔ دھک دھک کر رہا ہے۔ آج سپنا دیکھا کہ ایک جوان رسیلا، چھیل چھبیلا، رنگیلا، ایک کنوئیں کی جگت پر کھڑا ہے۔ جیسے ہی چار آنکھیں ہوئیں۔ جی چاہا بلائیں لوں۔ ہائے دیکھتے ہی کنوئیں میں دھم سے گر پڑا، اور دھماکے کی ایسی آواز ہوئی کہ آنکھ کھل گئی۔ ہائے اب اسے کہاں سے لاؤں، کیوں کر پاؤں، میں تو جیتے جی مر مٹی۔ نوجوان سہیلیاں تو باہم آنکھوں سے اشارے کرنے لگیں، کہ رانی کا کسی پرکالہ آتش پر دل آگیا۔ مگر ایک بڑھی سہیلی نے بڑھ کر کہا: کہ رانی میں بتاؤں؟ وہ کنواں نہ تھا، وہ تمہارے پیار کی چاہ تھی۔ دیکھ لینا صبح و شام ہی تمہارا دلدار تمہیں ملا چاہتا ہے۔

نور کے تڑکے موہنا رانی پیاری پیاری سہیلیوں کے ساتھ باغ میں اٹھکھیلیاں کر رہی تھی کہ اتنے میں چھیل بٹاؤ بھی سامنے سے آن موجود ہوا۔

موہنا : ارے! یہ تو وہی جوانِ سیم غبغب، دلبر شکر لب ہے۔ یہی پیارا پیارا مکھڑا تو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

چھیل : الٰہی یہ ابرو ہے یا خنجر برّاں، یہ سحر لطافت ہے یا چاہ زنخداں، یہ گردن ہے یا فوارۂ نور، الٰہی یہ رانی ہے یا حور، چشم بد دور، نورٌ علیٰ نور:

منم کہ دیدہ بدیدارِ دوست کردم باز چہ شکر گویمت اے کارساز بندہ نواز

موہنا : صد شکر کہ آفتابِ مقصود
از برج اُمید چہرہ بنمود

الغرض عاشق و معشوق میں دور ہی دور سے میٹھی میٹھی باتیں، اور رمز و کنایہ کی گھاتیں ہوتی تھیں، کہ موہنا کی ساس برآمد ہوئی۔ موہنا موہنا کچھ خیر ہے؟ ناحق بن ناحق کلنک کا ٹیکا لگائے گی۔ سات پیڑھیوں کا نام ڈبائے گی۔ یہ محل کے باہر بے حجاب، براگندہ نقاب، آنا اور اٹھلانا؟

موہنا : ہمیں ایک بات کی اجازت دیجیے کہ کل ہم دیو استھان جائیں، مگر سہیلیاں سب ہمارے ساتھ ہوں۔

ساس : اچھا آج منادی کراؤں گی، کہ کوئی مرد کل گھر کے باہر نہ نکلے۔

موہنا : تو میں جا چکی کیا کچھ ڈر پڑا ہے۔ یا شہر شملہ ہے۔ وہ جاگتی جوت ہے کہ کوئی نگاہ بد سے دیکھے تو آنکھیں نکال لوں۔ ہماری تو یہ خواہش ہے کہ ہم جائیں، اور دن دہاڑے بیچ کھیت جائیں۔

ساس : اچھا بہتر۔ تم خود مختار ہو جو چاہے سو کرو۔

دوسرے دن، پچھلے پہر سے موہنا نے زرد فوق البھڑک ساری زیب تن کی، اور سولہ سنگھار، بلا کا نکھار، کر کے چھم چھم کرتی دیبی کے مندر گئیں۔ کم سن، نو عمر، نوخیز، پری پیکر، رشک قمر سہیلیاں، ہجولیاں ارد گرد ہیں۔ اور چہل کرتی چلی جاتی ہیں۔

چھیل بٹاؤ سے تو کہہ ہی دیا تھا کہ کل فلاں مقام پر ملنا۔ دونوں کی آنکھیں ہوئیں چار، تو دل میں آیا پیار۔ یہ تیر نگاہ غلط انداز کا گھائل، اس کی طبیعت اس پر مائل۔ اتنے میں ایک سہیلی نے چمک کر کہا اے یہ مردوا یہاں کون ہے ؟

موہنا : (تنک کر) ہائیں! ہائیں! کوئی ہوگا۔ تم کو کیا تم کوئی خدائی فوجدار ہو۔ وہ بیچارہ تو گردن جھکائے دیو استھان میں بیٹھا ہے۔ تم کیوں گھبرائی جاتی ہو۔

اس کے بعد موہنا رانی گردن نیوہڑائے، بیش بہا ساری پھڑکائے، ہاتھوں میں مہندی لگائے، پٹیاں جمائے، گیسو کی لٹ لٹکائے، بوٹی بوٹی پھڑکاتی، اینڈتی، اٹھلاتی، کنویں کے ارد گرد پھیرے دینے لگی۔ سہیلیاں پرستان کی پریاں بنی ہوئیں ساتھ گھومتی تھیں۔ کوئی نوعمرا چپلاہٹ کے سبب سے پیش قدمی کرتی تھی ۔ کوئی شوخ و شنگ فرط مستی سے جھوم رہی تھی۔ کوئی چلبلے پن کے مارے، ہجولیوں کو چوم رہی تھی۔ مگر پیاری موہنا نظر غلط انداز سے اپنے معشوق طناز چھیل بٹاؤ کو دیکھتی تھی۔ اور اسی کے رخ آتشین سے آنکھیں سینکتی تھی۔ اس کا نکھیوں سے دیکھنا قہر ڈھاتا تھا۔ حشر توڑتا تھا۔ اِدھر سہیلیوں کی آنکھ چوکی اُدھر اس نے چٹ چٹ بلائیں لے لیں۔ جنون نے سلسلہ جنبانی کی، اور اس نے ہاتھ پھیر دیا۔

محفل بھر کی اسی سماں کی طرف نظر تھی۔ اور غلغلۂ جزاک اللہ ہر سمت سے بلند تھا، کہ واہ رے پارسیو۔ وہ تماشا دکھلایا کہ روح فرحناک ہوگئی۔ خصوصاً موہنا رانی کی پیاری پیاری صورت خماری انکھڑیاں، بے ساختہ پن، بلا کا پھبن، جبین مبین کی افشاں، اور بھی قیامت بپا کرتی تھی۔ چال تو ایسی مستانہ، دیکھی نہ سنی۔ اس ناز و ادا سے قدم دھرتی تھی کہ اہو ہو ہو۔ اس کی صنعتِ بالغہ کے صدقے! کہ ایسی ایسی رانیاں بنائیں، اور پارسیوں کے ہاتھ چوم لے جنھوں نے یہ نقلیں دکھائیں، اور چشم فسوں پرور کو قتل عام کی گھاتیں سکھائیں۔ الغرض، آخر کار جادو کا اثر جاتا رہا، اور طلسم ٹوٹا تو راجہ جے سنگھ اور موہنا رانی اور چھیل بٹاؤ اور سب سہیلیاں ہل مل خوب گائیں۔ مگر واہ ری موہنا کہ پاکدامن ہی رہی۔

پارسیوں کا نادر تماشا

میاں آزاد کو پارسیوں کے ایسا بھایا، اور تماشا ایسا بھایا، کہ دوسرے دن اِدھر گھڑیالی نے ٹھن ٹھن آٹھ کا گجر بجایا، ادھر میرا شیر تماشا دیکھنے آیا۔ پارسیوں نے تماشے کے آخر میں ایک نقل ایسی دکھائی کہ محفل بھر بے اختیار کھل کھلائی۔ پہلے ایک سیٹھ جی دُھتیا لٹکائے، گال پھلائے لال لال پگیا مستک گاہ پر جمائے، تشریف لائے، ماشاء اللہ! کیا قطع مبارک ہے۔ تڑخ تڑخ نور برس رہا ہے۔ آدمی ہے یا کشت زعفران، جس نے دیکھا لوٹنے لگا۔ توند کوئی پچاس ٹن کی، کھوپڑی تنو من کی، بوکھلاہٹ بشرے سے نمایاں، کائیاں پن چہرے سے عیاں، صورت سے تو چھپا کے تاؤ ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن بڑے ہی گھاگ، ایک ہی نیارے، بڑے بڑے چالاک آدمیوں کو کھڑے کھڑے نخاس میں بیچ لیں۔ اور اچھے اچھوں کو چٹکیوں میں غچّا دے دیں۔ اس کے بعد ان کی چاہتی بیوی عجب نازِ دلربایانہ اور اندازِ معشوقانہ سے چھماں چھماں آئیں۔ کمر پر رگ گل کا دھوکا ہوتا تھا۔ جو دیکھتا تھا عقل سے ہاتھ دھوتا تھا۔ بیر بہوٹی کی ایسی لال بھبھوکا ساری، سرخاسرخ، اور اس کے نیچے آستینوں دار ہری ہری کرتی، آستینیں پھنسی ہوئیں، سیٹھانی جی تنی ہوئیں، شوخی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حیرت تھی کہ یہ ہندنی ہے یا کوہ قاف کی پری ہے۔ گلِ رخسار کی وہ رعنائی کہ گلاب پانی پانی ہو جائے۔ دستِ سیمیں وہ حنائی کہ یاقوتِ احمر ہیرا کھائے، آنکھیں وہ شوخ کہ الاماں! یہ عورت ہے یا برقِ زماں، یا بلائے بیدرماں، یہ ابرو ہے یا فتنۂ دوراں، بلا کی ادا، ستم کا ناز، ایک ایک اشارہ سر لوحۂ دیباچۂ انداز۔ زاہد صد سالہ کو مرید بنائے۔ رگِ جاں میں نشتر لگائے۔ میاں بیوی میں خوب گھل گھل کر میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں۔

سیٹھ : پیاری آج تمھارا چہرہ اداس کیوں ہے مَطَبَل (مطلب) کی بات بولو تو ہم کو کھوش (خوش) کر دوں۔

سیٹھانی : (تنک کر) اجی تم کو میری کیا پڑی ہے۔ میں تو دل ہی دل میں کڑھا کرتی ہوں۔ آج یہ کیا جاتی دنیا دیکھی کہ اتنا پوچھا، یہ کدھر سے چاند نکلا ہے۔

راوی : اری واہ ری سیٹھانی، اللہ اللہ یہ خوش بیانی، بلا کی شوخ و چالاک، غضب کی بیباک، شین وقاف سے درست، چالاک و چست۔

سیٹھ : اچھا تو کچھ کو ہو (کہو) تو میرے سے۔ میرے کو تمھارا بڑو پیار ہے۔

سیٹھانی : اے آگ لگے تیرے ایسے پیار کو۔ موئے نگوڑی کنڈے والیاں، تک بچھوا، لڑیاں، ہنسلی، چمڑیاں پہنے رہتی ہیں۔ گہنے پانے سے گوندنی کی طرح لدی رہتی ہیں۔ یہاں نگوڑی کیل تک ناک میں نہیں۔ ناک چھوچھی، یہ لاکھوں کماتے ہو کس دن کے لیے؟ جب دیکھو گاڑھے کی لنگوٹی باندھے ہیں۔ یہ ڈھائی تلے کا چمڑ ودھا جوتا۔ کیا جانے ان کے دادا کے وقت کا ہے یا لکڑ دادا نے مول لیا تھا۔ یہ گانٹھ گانٹھ کے توڑے، کس کے لیے رکھتے ہو۔ میری یہ جوانی، ہے ہے، اٹھتی جوانی پہننے اوڑھنے کے دن، کھانے پینے کے دن، تم ایسے قصائی کے پالے پڑی۔ سکھ سپنے میں بھی نہیں دیکھا۔ روٹی کا نہ کپڑے کا۔ سیت میت کا بھرا۔

سیٹھ : ناک چھوچھی، کاہے کھاتر (خاطر) ہے؟ لاکھ کی کالی کالی کیل نہ بڑوا دوں گا۔ اس گورے گورے مکھڑے پر کالی کالی کیل کھوب (خوب) چھلکے گی۔

سیٹھانی : چمڑی جائے رہا دمڑی نہ جائے۔ کیل بھی ہو تو لاکھ کی۔ اچھا تم اپنا گہنا رہنے دو۔ ہمیں ایک آدمی نوکر رکھ دو۔ یہ گورے گورے ہاتھ یہ پیاری پیاری بہیاں روز ٹہل کرنے میں کالی نہ ہو جائیں گی۔ ہمیں ایک آدمی رکھ دو۔ میں صدقے، اجی اس میں تو کوئی چھپن ٹکے کا صرف نہیں ہے۔ اجی رانی بنی بیٹھی رہوں گی۔

سیٹھ : شاستر میں لکھو ہے کہ گرت (گرہست) کو کام کاج کرنا اچھا ہے۔ وہ بے کاج بیٹھے تو بُری باتاں کا کھیال (خیال) جاتا ہے۔

سیٹھانی : اجی تمھیں تو یہی سوجھتی ہے۔ نامحرم مردوے پر کبھی نظر بھی کی ہو تو تمھاری ہی آنکھیں پھوٹیں۔

راوی : دونوں "دائیں بائیں دونوں" واہ بی سیٹھانی کیا قسم کھائی۔ سیٹھ بیچارے کی آنکھیں کیا مفت کی پڑی پائی ہیں۔

سیٹھ : اچھا آج ہی کوئی کھتدمدار (خدمت گار) کی تلاش کرتا ہوں۔

اتنے میں ایک بابو صاحب تشریف لائے۔ یہ بڑے ہی رسیا نکلے۔ آئے تو تھے سیٹھ سے حساب کرنے، ان کی پری چہم بیوی کو جو دیکھا تو لوٹ ہو گئے۔ اب سیٹھ جی سے بات ہی نہیں کرتے سیٹھانی سے لسر کا لگایا۔

سیٹھ : بابو شاحب! میری جورو کو ایک چھوکرا کی تلاش ہے۔ کوئی بارہ برس کا آدمی لا دو گے مگر ایسا نہ ہو کہ کام تو کرے کم، اور کھائے بہت۔ کھائے سیر دس بارہ۔ اور کام میں ننھا بیچارہ۔ مگر

بارہ برس کا ہو جی۔

بابو : (مسکرا کر) بھلا چھ چھ برس کے دو نہ ہوں؟

سیٹھانی : (چمک کر) اجی بابو صاحب میں صدقے کوئی لا دو۔

سیٹھ : بش بش، اب متی بولیو۔ یہ صدکے بدکے کیوں بولی پرائے مرد سے بولنا کیا بات ہے۔

سیٹھانی : اجی بھلے مانس آدمی ہیں۔ دیکھو بیچارہ نیچی نظر کر کے دیکھتا ہے۔

سیٹھ : تو بابو شاحب ایسا ہو جو سیٹھانی کی کھندمد (خدمت) کرے اور لے کم۔

بابو : اچھا جب تک کوئی اور ملے، میں ہی نہ خدمت کیا کروں۔ اور دینے لینے کی کیا بات چیت ہے۔ تمھاری چیز ہماری، ہماری چیز تمھاری۔

سیٹھ : نہیں نہیں آپ جاؤ، ہم کھد (خود) تلاش کریں گے جی۔

سیٹھانی : اجی تکلیف تو ہو گی، رہا بابو جی تکلیف نہ ہو تو کبھی کبھی آدمی کو سکھا جایا کرو۔

سیٹھ : (گال پھلا کر) ہجار بار کہہ دیا کہ پرائے مردوے سے نہ بول، بکتی جاؤتی ہے۔ بش اب نہ بات کرنا کہہ دیا ہے۔ یہ سکھائے گا آدمی کو۔ کیا میرے کو سکھاونا نہیں آتا۔

سیٹھانی : بابو جی کب تک آدمی لاؤ گے۔

بابو : سیٹھ دکان پر جائیں تو ابھی لا دوں۔

سیٹھ : ہم آج دکان ہی نہ کھولوں گا جی۔ تم پرائی استری سے کیوں باتیں کرتے ہو گے جی۔

بابو : اجی سیٹھ جی تمھاری جورو بڑی ہسیار (ہوشیار) ہیں۔

سیٹھ : (غصہ میں) ہاں ہاں، شنو بابو شاحب، میں بھی بڑا ہسیار ہوں۔ لے آپ ادھر کھڑے ہو جیے۔

سیٹھانی : بابو جی صاحب اس وقت کے بجے ہوں گے؟

سیٹھ : (آنکھیں نکال کر) ارے میرے پاس تو ایک چھوڑ دو دو گھڑی رکھی ہے۔ تو بابو شاحب سے کیوں پوچھتی ہے۔

بابو : سیٹھ جی تمھاری عورت تم سے چالانک ہے۔

سیٹھ : نساں کھاطر (خاطر) رہو، ہم اس سے بھی چالانک ہے۔

سیٹھانی : اجی بابو جی تمھاری طرف کیا سب ایسے ہی گورے ہوتے ہیں؟

سیٹھ : (بگڑ کر) پھر بولی، اری تو بولی، تیرے کو گورے کالے سے کیا مطلب

ہے ری۔ بابو جی تم یہاں نہ آیا کرو، دکانڑ پر آیا کرو۔

سیٹھانی : اے واہ اچھے آئے، کوئی بھلے مانس آئے تو دتکار دیں۔

سیٹھ : ارے اس نے ناک میں دم کر دیو رے، (گدا لگا کر) لے اور لے گی۔

پھر بیچاری سیٹھانی نے رونا شروع کر دیا۔ ہائے یہ ہات ٹوٹ جائیں اور نگوڑے کی ٹانگ بھی ٹوٹے! جب دیکھو موا دانتا کلکل کیا کرتا ہے۔ کسی چنچل سے پالا پڑا ہوتا تو چاند گنجی کر دیتی۔ جب دونوں میں گتھم گتھا ہونے لگا تو بابو جی کی بن آئی۔ بڑی ہمدردی سے بیچ بچاؤ کرنے لگے۔ اب سنیئے کہ سیٹھ کے تو ہاتھ پکڑ لیے، اور سیٹھانی کو اشارہ کیا۔ تو لگی دھمڑ دھمڑ کوٹنے، اور جب سیٹھ کا وار ہوتا تھا تو حضرت بڑے ہی ہمدردی سے میر فیصل بن کر سیٹھانی کو چھپا لیتے تھے۔ آخر کار بابو جی آدمی کی تلاش میں گئے، اور میاں بیوی پھر ایک ہو گئے۔

بابو جی سٹر پٹر کرتے چلے جاتے تھے، کہ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک آدمی بانسری بجاتا چلا آتا ہے؛ ابے تو کون؟ ہم کون ہیں، ہم آدمی ہیں! آدمی۔ آدمی نہیں تو کیا جانور ہے۔ جانور نہیں تو کیا آدمی ہوں۔ آپ اپنا مطلب کہیں؛ ابے چل نوکری کر۔ ہاں ہاں (اچھل کر) اہو ہو مو کس کے یہاں۔ ایک سیٹھ ہیں۔ نا میاں وہ مجھے مارے گا۔ بھلا سیٹھانی بھی ہیں۔ ہاں ہیں۔ اچھا چلو رہا، صبح کو کھاؤں گا۔ نو بجے کھاؤں گا۔ دوپہر کو کھاؤں گا۔ تیسرے پہر کھاؤں گا۔ شام کو کھاؤں گا اور شام سے لمبی تانوں گا تو صبح کی خبر لاؤں گا۔ اور جو آنکھ کھلی تو سیٹھ جی یا سیٹھانی کھانا دے جائیں۔ اچھا چلو تو وہاں تک چلتا ہوں مگر کھانا بہت سا کھاؤں گا۔ ہزار خرابی بابو صاحب اس کو لے چلے۔ راہ میں کوئی اٹھارہ دفعہ ہی مچلا۔ بارے خدا خدا کر کے پہنچے۔

بابو : لو سیٹھ جی آدمی لے آئے۔

سیٹھ : کام اچھا کرے گا رے؟

آدمی : ہاں بہت کھاؤں گا دس دفعہ کھاؤں گا۔

سیٹھانی : ارے کچھ کام کاج بھی کرے گا یا دن بھر منھ ہی چلاتا جائے گا موئے۔

آدمی : دس دفعہ کھاؤں گا۔

سیٹھانی : اب میں کہیں چپت نہ جماؤں بڑھ کر۔

سیٹھ : ارے تو پھر بولی۔ عورت جات، اور چپت کی بات چپت۔

سیٹھانی : اجی تو کیا یہ تمھارا کوئی قبلہ گاہ ہے۔

الغرض وہ جھٹ سے نوکر ہوگیا۔ مگر برابر یہی کہتا گیا کہ دن بھر میں اٹھارہ بار کھاؤں گا۔

سیٹھ : ہم اپنی دکان پر جاتا ہوں۔ سیٹھانی جو کہیں وہ چپکے سے کان میں کہہ جانا۔

یہ کہہ کر سیٹھ جی تو دکان پر گئے، اور بابو صاحب سے حساب ہونے لگا۔

سیٹھ : (بہی کھول کر) آپ پر پانچ سو ہیں جی۔

بابو جی : ارے! پانچ سو؟ یہ ڈھائی سو کے پانچ سو ہو گئے۔

سیٹھ : اور سود نہیں چڑھا!

سیٹھانی : آدمی او آدمی! ارے تیرا نام کیا ہے؟

آدمی : فضیحت۔ اجی مجکو روٹی دو۔ بھوک لگی ہے۔

سیٹھانی : مرموئے آگ لگے تیرے پیٹ کو، جا سیٹھ جی سے دکان پر جاکر چپکے سے کہہ دے کہ گھر میں چاول نہیں ہے۔ رہا کان میں کہنا، الگ بلاکر۔

فضیحت : اجی روٹی تو دے دو۔ بڑی بھوک لگی ہے۔

سیٹھانی : اوئی دور ہو نگوڑے۔ چانول تو ہے نہیں کھائے گا کیا، انگارے،

فضیحت نے دکان پر جاکر، اور اشارے سے بتا کر سیٹھ کو علاحدہ بلایا۔ اب سیٹھ جی جوں جوں آگے بڑھتے آتے ہیں میاں فضیحت پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ آخر کار کان میں غل مچا کر کہا کہ چاول نہیں ہے۔

سیٹھ : دت گدھا۔ ارے گل (غل) کیوں مچایا۔ ہمارے یہاں چانول نہیں، اور تو سب کے سامنے جور (زور) سے کہتا ہے۔

بابو : دیکھو فضیحت جواب سیٹھانی جی بھیجیں تو ان کے کان میں کہنا جس میں کوئی اور نہ سُنے خبردار! کان میں کہیو۔ کان میں۔

سیٹھانی : ارے فضیحت کہہ آیا۔ جا اب ان سے کہہ دے کہ تمھاری ماں ابھی ابھی مر گئیں۔ جلدی جا دوڑتا ہوا۔ ہائے میری ساس بیچاری اٹھ گئی۔ ارے جلدی جانا۔

فضیحت : اجی مجھے کھانا تو دے دو۔ جلدی دو بڑی بھوک لگی ہے۔

سیٹھانی : بھاڑ میں جائے تیرا پیٹ موے۔ ارے مردہ گھر میں پڑا ہے۔ اور تو کھانا مانگتا ہے۔ ان کی تو ماں مر گئی، اور تجکو پیٹ کی پڑی ہے۔

فضیحت : اچھا مُردہ اٹھ جائے تو دوگی۔ تو لاؤ اُدھر سے اس بڑھیا کو بھی گڈھیا میں پھینکتا ہی

جاؤں، اور ان کو بھی لے آؤں۔ جس میں کھانے میں دیر نہ ہو۔ اچھا جاتا ہوں۔ دکان پر پہنچ کر اپنی بانسری بجائی، اور چپکے سے اشارہ کیا کہ یہاں آؤ، سیٹھ جی قریب آیا تو کہا: کان پاس لائیے اور کھسک آیئے۔ آپ کی بڑھیا ڈھلک گئیں۔ سیٹھ نے سر پیٹنا شروع کیا، اور میاں فضیحت پر ایک دو ہتھڑ ایسا لگایا کہ ان کے پُنھتر بگڑ گئے۔ بابو بیچ بچاؤ کرنے آئے تو ان پر بھی دو ایک پڑ گئیں۔

بابو: ارے بے وکوف (بے وقوف) یہ کون چھپانے کی بات تھی کہ تو نے کان میں چپکے سے کہا: ان کی ماں مر گئیں، اور تو چپکے سے کہتا ہے۔ جا گدھے روتے سر پیٹتے کیوں نہ آیا۔

سیٹھانی: ارے فضیحت! جا دوڑ کر کہہ آ کہ تمہارے گھر میں لڑکا ہوا۔ دوڑتا جا۔

فضیحت: اہو ہو ہو۔ اہا ہا ہا! اب تو روٹی کھلاؤ۔ اجی مجھے بڑی بھوک لگی ہے پہلے تو چانول نہ تھے غرضہ، پھر بڑھیا ڈھلک گئی فاقہ۔ اب لڑکا ہوا ہے۔ اسی بات پر کھانا کھلوا دو۔

سیٹھانی: ارے موئے میں تو زچاخانہ میں (ہوں)۔ ان کو بلا لا تو آج وہی منہ پھونکیں۔ لکڑیاں لیتا آنا۔

میاں فضیحت روتے سر پیٹتے غل مچاتے آنسو بہاتے دکان پر پہنچے۔ ہائے ہائے؟ ارے یہ کیا ہوا؟ ارے دوڑو! ہائے رے، اُف اُف! ارے آسمان پھٹ پڑا ارے! اوہ اوہ! سیٹھ جی بھی لگے سر پیٹنے کہ کیا جانے کیا واقعہ ہوا۔

بابو: ارے بتا تو ہوا کیا۔ آخر کوئی مر گیا ہے۔

فضیحت: اجی بابو جی! پہلے رو تو لو۔ خوب رو لو، ہائے ہائے ارے اُف یا خدا (اہل جلسہ کی طرف مخاطب ہو کر) تم بھی رو لو، (سیٹھ کے کان میں) آپ کے یہاں لڑکا ہوا ہے جلیئے منہ پھونکیے لکڑیاں لیتے جایئے گا۔

سیٹھ نے فضیحت کو خوب ٹھونکا، اس شخص کے یہاں تو لڑکا ہوا، وہاں سے روتا چلاتا چیختا غل مچاتا آیا، اور کہتا ہے کہ منہ پھونکو چل کر اور لکڑی لیتے چلو۔

بابو: ابے تو بڑا گدھا ہے بے۔

فضیحت: واہ بابو بڑے تو سیٹھ ہیں، ان سے اتر کر آپ۔

بابو: جا اب ایسی بات ہو تو شکر بانٹتا آنا، اور خوب کھل کھلا کر ہنسنا۔

سیٹھانی: ارے غضب۔ لو آگ لگ گئی۔ ارے فضیحت جلدی دکان پر جا۔ کہہ گھر میں آگ لگ گئی۔

فضیحت : اجی مجھے ردٹی تو کھلادو، ہائے میں تو مرا جاتا ہوں۔

میاں فضیحت دکان پر جاتے ہی خوب کھل کھلائے۔ اہو ہو ہو! اہاہاہا، قہ قہ قہ لو شکر کھاؤ۔ محلا بھر کو شکر بانٹیے اور دکان کی طرف سے جو نکلے اسے شکر کھلایئے۔

سیٹھ : کیا ہے؟ کیا کوئی اور لڑکا ہوا۔

فضیحت : گھر میں آگ لگی ہے۔ سیٹھانی گھر کے باہر منھ کھولے کھڑی سر پیٹ رہی ہے سیٹھ جی ایسے گھبرائے کہ بہی کو دکان پر چھوڑ، سیدھے گھر گئے، اور بابو صاحب نے موقع غنیمت جان کر بہی بغل میں دبائی۔ اور مع فضیحت کے چلے آگ بجھانے۔ وہاں پہنچے تو بہی کو بھی آگ میں "بھسم" کر دیا اور پانچ سو کے پانچ پیسے بھی نہ دیئے۔

پارسیوں کا دلربا تماشا

ادھر عروس عدن نے پرندِ مشکین سے رخِ انور کی جھلک دکھائی۔ اور لیلائے شب زلفِ عنبریں کھولے ہوئے آئی۔ اُدھر شاہنشہِ تختِ رہ نوردی، خدیو مصر[1] کوچہ گردی فلک سیر، دملک نہاد، میاں آزاد کو تماشے کی دُھن سمائی۔ پھر کیا تھا ڈنڈا اسنبھالا اور ڈبل چال کھٹ کھٹ کرتے، لمبے لمبے ڈگ بھرتے، ٹھنڈی ہوا کھاتے، سیر دریا کے مزے اڑاتے، چھتر منزل میں دھم سے آن کودے۔ دریا کی روانی، بذلہ سنجوں کی نکتہ رانی، بگھیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، معشوقوں کی اچپلاہٹ، تماش بینوں کے ڈٹاؤ، اور بے فکروں کے جٹاؤ دیکھ کر میاں آزاد ریشہ خطمی ہو گئے۔ ایک جگہ بیٹھنے کی تو انھوں نے قسم کھائی تھی۔ چلو اس وقت دریا میں کھڑی لگائیں، یا ملاحی چیریں یا چڑھاؤ کاٹیں۔ کپڑے ویڑے اتارنے ہی کو تھے کہ گھنٹی بجی ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن۔ ارے بھلے کو دریا میں کو د نہیں پڑا تھا۔ ورنہ غضب ہی ہو جاتا۔ جھٹ تنگ تو بڑا چڑھا کر، آپ بھی ایک کرسی پر جاڈٹے۔ سامنے زرنگار، اور پربہار، پردہ پڑا ہے، یہ ہلا، وہ اٹھا، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک تاجدار ثریا جاہ، زین الملوک، کج کلاہ، تخت

---

[1] خدیو مصر۔ ملک مصر کا بادشاہ۔ مصر کے ایک خاندان کے بادشاہوں کا لقب خدیو تھا۔ مصر پہلے ترکی کی حکومت میں شامل تھا۔ ترک حکومت کی طرف سے جو حکمراں مصر میں مقرر کیا جاتا تھا وہ خدیو کہلاتا تھا۔ جب تک ترکوں کا اقتدار رہا ہر حکمراں کے نام کے ساتھ "خدیو" ضرور ہوتا تھا۔ نورانی۔

ہمایوں بخت پر بیٹھا، آنکھیں مانگ رہا ہے۔ اوپر چتر سعادت اثر، اور تاج مکلل زیب سر، اپنے نور بصر شہزادۂ عالی مقام، تاج الملوک گلفام، پر جو شاہ گیتی پناہ کی نظر پڑی، تو چشم زدن، میں آنکھ کی بینائی غائب، یا مظہر العجائب:

مُہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
گھر گھر یہی ذکر تھا، یہی شور خارج ہوا نورِ دیدۂ کور

کوئی نسخۂ نور لایا، کوئی سرمۂ طور لایا۔ مگر آنکھوں میں اجالا نہ آیا نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سچ مچ کوئی اندھا ہی بیٹھا زبان حال سے پکار رہا ہے، کہ آنکھوں والے بابا انکھیاں بڑی نعمت ہیں۔ اتنے میں ایک کحّال فرید الدّہر، دقیانوس کے دادا کا ہمعصر، آیا اور اس نے خوب سوچ ساچ کر بتایا کہ:

ہے باغ بکاؤلی میں اک گل پلکوں سے اسی پہ مار چنگل

یہ سنتے ہی چار خوش پوش، خوش رو خوش ادا شہزادے بادشاہ سے رخصت ہوئے اور بوے گل کی طرح چمن وطن سے جنگل کی طرف چلے، چلتے چلتے راہ میں حسنِ اتفاق سے زین الملوک سے چار آنکھیں ہوئیں۔ پوچھا کدھر کی سدّھیاں ہیں۔ کسی لشکری نے ساری داستان کہہ سنائی اور تاج الملوک کو گل بکاؤلی کی دھن سمائی۔ پردہ پڑا، اور جب حجاب مرتفع ہوا۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ چاروں شہزادے بیٹھے شش و پنج کر رہے ہیں، اور دلبر بیسوا ان کو داؤ پر چڑھا رہی ہے۔ کھیلتے کھیلتے ان تک کو بازی میں جیت لیا۔ تاج الملوک بھی گرتے پڑتے کہیں وہاں پہنچے، اور انھوں نے دلبر کے چھکے چھڑا دیے۔ تب تو وہ چکرائی، کہ میاں میں تو مرشد تھی تم ولی نکلے۔ پھر پردہ پڑا۔ اور اٹھا تو تاج الملوک کے سر پر قضا۔ ایک دیو سر بفلک کشیدہ، کھڑا غرا رہا ہے۔ دیو تو ایسا بنایا تھا کہ بارہ صدی کے بنگالی۔ صورت دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے۔ الغرض دیو کو انھوں نے ایسا چیتے یار بنایا، کہ وہ بھی ان کا دم بھرنے لگا۔ پھر پردہ پڑا اب کی کچھ اور ہی ٹھاٹھ نظر آتے ہیں۔ وہ اٹھا، جل جلالہٗ، تیری بندہ نوازی کے صدقے! کیا گلزار پربہار

---

[1] پارسیوں کے اس ڈرامہ میں گل بکاولی اور تاج الملوک کا مشہور قصّہ دکھا رہا تھا۔ سرشار نے جتنے اشعار لکھے ہیں سب مثنوی گلزار نسیم سے ماخوذ ہیں۔ نورانی۔

دکھایا۔ یہ بکاولی کا چمنستان لطافت ہے۔ باغ کیا ہے، سچ مچ باغ و بہار ہے۔ اِلّا اللہ کہہ کر انھوں نے چپکے سے پھول توڑا اور:

گل لے کے چلا ایاغ بر کف — چوری سے چلا چراغ بر کف

ایک دفعہ ہی دیکھتے کیا ہیں کہ:

بارہ دری ایک سونے کی ہے — وہ خواب کہہ بکاولی ہے
گول اس کے ستون ساعدِ حور — چلمنِ مژگان چشم مخمور
پردہ جو حجاب سا اٹھایا — آرام میں اس پری کو پایا

شوق چرایا کہ اس مست نشۂ خواب ناز کو جگائیے مگر پھر:

سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی — ہے سانپ کے منھ میں انگلی دینی

اِدھر گلچیں تو جیب و دامن کو گلِ مقصود سے بھر کر چمن سے بوئے گل کی طرح چل کھڑا ہوا، اِدھر:

وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاولی گل اندام
جاگی مُرغِ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

بکاؤلی کا خوابِ ناز سے بیدار ہونا اور حوضِ لطیف پر منھ دھونا، پھول کا ہوا بتانا، اور گلچیں کا نیا گل کھلانا، بکاولی کا جھنجھلانا، سنبل سے تازیانہ منگانا، شمشاد کو سولی پر چڑھانا، ان سب باتوں کو اس خوش اسلوبی اور لطف سے ادا کیا کہ تماشائی عش عش کرنے لگے، اور پارسیوں ہی کا دم بھرنے لگے۔ اب بکاؤلی بھیس بدل کر گلچیں کی تلاش میں چلیں، اور حضرت کو ڈھونڈ ڈھ نکالا۔ جب دونوں میں ملاقات ہوئی، اس وقت کا لطف قابل دید تھا۔ پہلے وہ قہر کی نگاہ، پھر پیار اور چاہ، پہلے وہ تیکھی چتون، پھر عشقِ گلچیں و گلبدن:

بولی وہ پری بصد تامّل — کیوں جی تمھیں لے گئے تھے وہ گل

وہ شکر لب، اس بیساختہ پن سے بول رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، لبوں سے قند گھول رہی تھی۔

تاج الملوک بیچارہ سرگرداں و آوارہ نے:

کی عرض رضا ہے جو خوشی ہو — عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواد — کالے ناگوں سے مجکوڈسواؤ
تلوار سے قتل ہو جو منظور — ابرو کے اشارے سے کرد چور

القصّہ ساری داستان کو اس طرح ختم کیا کہ حاضرین جلسہ پھڑک گئے۔

اندھیر نگری چوپٹ راج

اس کے بعد اندھیر نگری کی نقل چھیڑی۔ ایک رنگے سیار باباجی، گیروے کپڑے پہنے ایک موٹے تازے چیلے کو ساتھ لیے، بھجن گاتے، کھنجڑی بجاتے، ایک نئی بستی میں وارد ہوئے۔

باباجی: بچہ کھاؤ کچھ نون تیل لکڑی لاؤ، روٹی پکاؤ، خود بھی کھاؤ ہم کو بھی کھلاؤ۔ اور دندناؤ۔

چیلا چلا، بازار میں پہنچے تو دکانیں جمی ہوئیں۔ کرارے تل کے لڈو، گول گپے مصالحے کے، مٹر وٹر، گنڈیریاں لوپونڈے کی، گلاب ریوڑیاں۔ اب جس دکان پر جاتے ہیں، اور جو سودا چکاتے ہیں، سب ٹکے سیر۔ چکرائے کہ ایں یہ کیا اسرار ہے۔ ٹکے ہی سیر مربّا، ٹکے ہی سیر اچار ہے۔ ایک خوانچے والے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ باباجی یہ ریوڑیاں ہیں' اور یہ؟ یہ بیسن کے لڈو ہیں۔ اور یہ؟ یہ دال موٹ ہے، اور یہ؟ یہ کھاجا۔ اہو ہو ہو، کھاجا تو کھاجا۔ ایک کھاجا چکھ گئے، پھر دوسرا اڑایا۔ اسی طرح خوب مٹھائی ٹونگی، اور کچھ کھائی اور باندھی۔ پوٹ، وہاں سے ماری لوٹ تو باباجی کے پاس۔

بابا: کیوں بچہ کچھ گھی شکر آٹا لایا؟

چیلا: ہونھ۔ گھی کیا کروگے کھاجا کھاجا۔ چکھوتیاں کرو، مٹھائی چکھو۔

بابا: اس نگری کا کیا نام ہے۔

چیلا: باباجی ہمیں تو مٹھائی کھانے سے کام ہے۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔

بابا: ہاں! بچہ یہ نگری رہنے کے لائق نہیں۔ چلو بھاگ چلیں۔

چیلا: واہ تم جاؤ میں تو مٹھائی چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔

پردہ پڑ گیا، اٹھا تو اندھیر نگری کے چوپٹ راجا برآمد ہوئے۔ واہ بھئی واہ اچھے راجا ہیں تو اندھیر نگری کیوں نہ ہو۔ راجہ صاحب شرابی، مدکیے، چرسیے، گنجیریے، بھنگیریے، چانڈو باز، افیمچی، نشے میں چور، سیہ مست و مخمور، کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مگر گرے پڑتے ہیں۔ اتنے میں ایک فریادی آیا۔

وزیر: جہاں پناہ! ایک فریادی آیا ہے۔

راجا: تمہارا دادی آیا ہے۔
وزیر: نہیں جہاں پناہ ایک فریادی آیا ہے۔
راجا: اچھا۔ ہوں۔ تو پانچ بلاؤ۔ (پاس بلاؤ)
راوی: یہ بہکی بہکی باتیں یہ بے تکا پن۔
فریادی: حضور کل دیوار گر پڑی، میرا لڑکا دب کر مر گیا۔
راجا: ہاں دیوار مر گیا، لکڑا دب گیا، دیوار کو سولی دے دو۔
وزیر: جہاں پناہ! دیوار گر پڑی اور اس کا لڑکا مر گیا۔
راجا: ہاں ہاں جہاں پناہ گر پڑا، اور دیوار پر لکڑا مر گیا۔ اچھا لکڑے کو پھانسی دے دو
وزیر: نہیں خداوند لڑکا دب کر مر گیا۔
راجا: معمار کو سولی دے دو۔
معمار: پیر و مرشد میں بے قصور ہوں! یہ مزدور کی شرارت ہے۔
راجا: مزدور کو سولی دے دو۔
مزدور: میں نے کیا کیا، سقّے کا قصور تھا۔
راجا: اچھا جاؤ سقّے کو سولی دے دو۔
سقّہ: حضور میری کیا خطا۔ آپ کا کوتوال جو آیا تو مارے ڈر کے پانی زیادہ گر گیا۔
راجا: کوتوال کو سولی دے دو۔
راوی: واہ رے چوپٹ راجا، تحقیقات کسی کی نہ کرو، جو ہے اسے پھانسی دے دو۔ پھانسی پر کوتوال صاحب چڑھائے گئے تو چوبدار نے عرض کیا کہ پیر و مرشد۔ پھانسی کا منھ بڑا ہے اور کوتوال دبلا پتلا۔
راجا: اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پکڑ کر پھانسی دے دو۔

موٹا اس اندھیر نگری بھر میں باباجی کا چیلا تھا، دھرے گئے۔ ہائے غضب بھئی ہم نے کیا کیا کہ پھانسی پر چڑھائے جائیں گے۔ واہ تم سب میں موٹے ہو، چور نگ کیسے جاؤ گے۔ ارے تو یار دیہ بھی کوئی جرم ہے، کہ موٹا تازہ ہوں۔ اتنے میں باباجی بھی حسنِ اتفاق سے سامنے نکلے۔ دیکھا کہ چیلا رو رہا ہے۔
بابا: کیوں بچہ، کیا کہا تھا کہ یہ اندھیر نگری چھوڑ دو۔ نہ مانا آخر وہی آگے آیا نہ۔

چیلا : باباجی بچاؤ! میری طرف سے پھانسی پر چڑھ جاؤ۔

بابا : ارے آج اچھا دن ہے، جو پھانسی پر چڑھے وہ سیدھا سرگ لوک کو جائے، میں پھانسی پر جاتا ہوں۔

چیلا : نہیں میں جاتا ہوں۔

اتنے میں راجہ بھی گرتے پڑتے آنکلے۔

راجا: وزیر پھانسی نہیں ہوئی ؟

وزیر : خداوند گرو اور چیلے لڑ رہے ہیں، کہ میں پھانسی چڑھوں، وہ کہتا ہے میں پھانسی چڑھوں۔ آج بڑا تیرتھ کا دن ہے، جو پھانسی چڑھے وہ بیکنٹھ میں جائے۔

راجا: ہاں، تو چل میں پھانسی پر خود چڑھ جاؤں۔

لیجیے چوپٹ راجا کھٹ کھٹ کرتے پھانسی پر چڑھ گئے۔

لیلیٰ مجنوں

بیا ساقی، بیا جانِ تماشا | نہاں در پردہ تا کی می کشی ہا
بیا ساقی، بیا، اے من مریدت | بدہ جامے کہ خواہم شد شہیدت
بیا ساقی بیا، اے عین جادو | بدستت ساغرِ می چشمِ آہو
بیا ساقی بیا، اے ابرِ احساں | بساغر کن می از خونِ رقیباں

سرت گردم، بجامی ساز شادم
کہ رنگین قصۂ آمد بیادم

ہمارے آوارہ وآزادہ، سربھیرا وادہ، میاں آزاد خانہ برباد، شب کو نواب کی برق وش، باد رفتار، سانڈنی پر سوار ہو کر بگولے کی طرح اُڑے تو لب جوئبار چھتر منزل کے ایوان جواہر نگار میں موجیں لینے لگے۔ دونوں ہاتھوں سے دعائیں مانگ رہے ہیں، کہ الٰہی کہیں جلد گھنٹی بجے، اور نقل سجے۔ اتنے میں پردۂ زرکار بندھا تو آنکھیں کھل گئیں:

بیا ساقی بیا، اے جانِ جمشید | بدہ جامی دآتش وہ بخور شید

کہ دارم از تمنائے دلِ ریش
خیال سیر مکتب خانہ در پیش

واہ کیا پری بزم، مکتب خانہ ہے۔ مدرسہ کیا عیش و طرب کا کاشانہ ہے۔ ہر طفل پریزاد فن دلبری میں بے بدل استاد، ستم ایجاد، بلائے جانِ وامق و فرہاد۔ میاں جی شمس بازغہ[1] کے عوض بدر منیر[2] کا سبق دیتے ہیں، اور کھڑے بلائیں لیتے ہیں۔ کج ادائی میں شہرۂ آفاق، دلربائی کے فن میں طاق، مولوی صاحب کی ریش مخضّب تا بناف۔ شریر لڑکوں پر شڑاپ شڑاپ قمچیاں جماتے ہیں، اور وہ اخوان الشیاطین حضرت کو بناتے ہیں۔ اتنے میں سامنے جو نظر پڑی تو ایک بُت غنچہ دہن، سیم غبغب، سے آنکھ لڑی۔ گیسو لیلۃ القدر، جبیں مطلع الفجر، نسیم گلشن دلربائی۔ شمیم زلفِ آشنائی، پر افشاں جبیں ناز، سراپا انداز، خوش وضع، خوش قد۔ قامتِ دلجو، زلفِ عنبر بار، چیں ابرو تیغ جوہردار، قامتِ کبریٰ سے دوش بر دوش، غارتِ گردن۔ رہزن ہوش، مصحفِ رخ سجدہ گاہِ آتش پرستان، ابروئے کج، قبلۂ کفر گزیناں۔ رو کشِ خوبانِ فرہنگ۔ نرگسِ مخمور صہبائے حسن سے گلرنگ، رنگین ادا۔ وہ بانکی ادا، وہ تیکھی چتون، وہ قہر بھری نگاہ، وہ جوبن کہ محفل بھر پھڑک گئی۔ یہ پیاری صورت اور چنچل پدمنی گھورنے ہی کے لائق تھی۔ گورا گورا مکھڑا، ایسا جیسے چاند۔ بلکہ چودھویں کا چاند بھی اس کے مقابل میں ماند۔ بال بکھرے ہوئے، بانکی ٹوپی سر پر دھرے ہوئے، عجب عُجب وغرورِ حسن سے متمکن تھی۔ اس کی کم سنی، اس کے الڑھ پتے کے دن۔ اس کی نزاکت، اور صباحت ستم ڈھاتی تھی:

سرتا قدمش کرشمہ و ناز ہم سرکش حسن و ہم سر انداز
افگندہ بدوش زلف چوں شست او بے خبر و نظارہ گرمست
معجونِ لبش مُدِر فشانی پروردہ بہ آب زندگانی

میاں آزاد آپ جانیے حسن پرست آدمی، رند شاہد باز، صورت دیکھتے ہی اس گلِ چمنِ نزاکت پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ لوگوں سے پوچھا کہ کیوں حضرت یہ پری چہرہ، خورشید لقا، مہ جبیں شیریں ادا، دخترِ گل رخسار، نازک اندام و طرار، کون بت عیار ہے؟ این! اجی واہ حضرت، آپ کو یہی نہیں معلوم۔ لبسنت کی خبر ہی نہیں۔ اے میاں یہ لیلیٰ مجنوں

---

[1] عربی زبان میں علم ہیئت اور فلسفہ کی مشہور کتاب جو عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔
[2] مثنوی بدرِ منیر جس میں عشق و محبت کی داستان ہے۔ مصنفہ میر حسن دہلوی متوفی ۱۷۸۶ء۔

کی نقل ہوتی ہے۔ محفل بھر عقل سے ہاتھ دھوتی ہے۔ اہو ہو ہو اب سمجھا۔ اس لیلیٰ پر تو ایک مجنوں کی طبیعت مائل تھی، مگر اس پیاری لیلیٰ کے تیز نگاہ سے ساری محفل گھائل ہے۔ یہ میاں جی لیلیٰ کے پدر بزرگوار ہیں۔ اور مکتب میں لونڈے پڑھا رہے ہیں:

یہ مکتب میرود طفل پریزاد — مبارک باد مرگِ نو باستاد
اگر باشد معلم خود فلاطون — باندک روز خواہد گشت مجنوں

اس مکتب خانۂ عشق کا شانہ، میں مجنوں بھی درس لینے آیا۔ اس طفل سیم بدن، غنچہ دہاں، سر تا بقدم آفتِ جاں، پر جو طلبہ کی نظر پڑی تو:

ز طفلان ہر طرف بر خاست فریاد — کہ یاراں آتشی در مکتب افتاد
بگفت استادش اے مجموعۂ ناز — کہ بسم اللہ زبسم اللہ کن آغاز
بہ پیش او الف چوں دال خم شد — میانِ عشقباز انشں علم شد

اب سنیئے کہ میاں جی نے اور سب لڑکوں کو تو چھٹی دے دی، اور خود بھی مٹر گشت کو چلدیے مگر لیلیٰ مجنوں دونوں وہیں رہے۔ لیلیٰ کی نظر جو اس سروِ گلشن رعنائی پر پڑی، اور مجنوں کی آنکھ جو اس بحر لطافت و خود نمائی سے لڑی۔ جوان طناز نے بت سراپا ناز کو پایا۔ اور صنم پری چہرہ کو امرد گل عذار نے وارفتہ و شیدا بنایا۔ خلوت میں دونوں نے لبوں سے قند گھولے اور باہم یوں ہنسے بولے:

لیلیٰ:
سر مستِ ناز آں بت بدمست می رود
خود می کند خرام و خود از دست می رود

مجنوں:
دستی دہم بہ یار کہ بدمست می رود
دستی بدل نہم کہ دل از دست می رود

لیلیٰ:
سبزۂ دامنِ نسرین ترا بندہ شوم
ابتدای خط مشکینِ ترا بندہ شوم

حرف ناگفتن و تمکین ترا بندہ شوم — طرزِ محبوبی و آئینِ ترا بندہ شوم
اللہ اللہ کہ ایں قاعدہ آموختۂ — کیست استاد تو اینہا کہ آموختۂ

مجنوں:
صد شعلہ جنون ریخت باشفتہ سرِ ما
زد پنجۂ مژگاں کہ بخوں جگر ما

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک مامک دیرینہ روز نے لیلیٰ کے باپ سے کچا چٹھا کہہ سنایا۔

ضعیفہ : لیلیٰ! پیاری لیلیٰ میری آنکھوں کی پتلی، اب اور ہی دھن میں ہیں۔ مجنوں پر ان کا، کہتے کلیجہ لرزتا ہے، اور مارے شرم کے گڑی جاتی ہوں۔ لیلیٰ کو اب رد کیے مجنوں نے اس کا دل، منھ سے وہ لفظ نہیں نکلتا۔

میاں جی : دت نابکار، میری لیلیٰ اور ایسی خوار، وہ رد پوش، عصمت کوش، ابھی نام خدا کم سن ہے۔ عاشقی معشوقی کی باتیں، رمز و کنایہ کی گھاتیں، کیا جانے۔ تو تہمت تراشتی ہے اور جھک مارتی ہے۔

الغرض وہ مامک دیرینہ، ایک روز ان کو ساتھ لے گئی، تو دیکھتے کیا ہیں کہ لیلیٰ اور مجنوں گلے مل مل کر میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ لیلیٰ کا سر مجنوں کے کاندھے پر اور مجنوں کا ہاتھ لیلیٰ کے دست حنائی میں، اور مجنوں کہہ رہا ہے کہ عمر بھر تیرے اس مکھڑے کی بلائیں لیا کروں:

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائی تو بود　　　سالہا سجدۂ گہہ صاحب نظراں خواہد بود

وہ فرط محبت سے بولیں:

معلمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت　　　جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت
من آدمی بچنیں خد و قد و روے و جمال　　　ندیدہ ام مگر ایں شیوہ از پری آموخت

لطف یہ کہ لیلیٰ کے والد بزرگوار، اور وہ زنِ عیار، دونوں کلے پر کھڑے چپکے چپکے سب سن رہے تھے۔ ہے ہے یہ کیا آسمان پھٹ پڑا، لیلیٰ اور مجنوں عاشق و معشوق کو داغ ہجران نصیب ہوا۔ پھر پردہ پڑا:

صحرا و کوہ در رہِ من خستہ و ضعیف　　　اے خضرِ پی خجستہ مدد دہ بہ ہمتم

پردہ کھڑکھڑایا، تو سامنے ایک لق و دق جنگل نظر آیا۔ سبحان اللہ! چھٹ منزل میں سچ مچ کا جنگل۔ وہی بیل، وہی بوٹے، وہی پہاڑیاں، وہی دشت، وہی ہامون، ادھر مجنوں ادھر مجنوں، سر پر خاک اڑاتے، پھونک پھونک کر قدم جماتے، جنگل جنگل بیچارہ گھوم رہا ہے۔ زار و نحیف، لاغر و ضعیف، بدن کی ہڈیاں ہڈیاں گن لیجیے۔ لب پر تبخالہ، زبان پر آہ و نالہ، چشم ترا بر گریاں، آہ آتشیں برقِ سوزاں، شہیدِ حسرتِ آغوش، سیاہ پوش، دردِ دل سے ایسا کراہتا تھا کہ سامعین کے کلیجے پر چوٹ لگتی تھی۔ وہ ڈاڑھیں مار مار کر رونا، اشکِ گلگوں چشمِ خونیں سے بہانا، غم و الم کی تصویر کھینچ دیتا تھا:

ما کوس بادشاہی دستِ جنوں زدیم　　　تخت رواں آبلہ در زیر پائی ماست

ادھر لیلیٰ بیچاری سوزِ غم سے شمع کی طرح جلنے لگی۔ گلِ رخسار کو نسیم ہجراں نے مرجھا دیا۔

غزل خواں، مو پریشاں، سینہ بریاں، دیدۂ گریاں، بصد حسرت و ارماں، لیلیٰ کی بے قراری و بیتابی دیکھ کر حاضرینِ جلسہ نے دل مسوس لیا، کہ ہے ہے یہ مہ پارہ اور یہ حال زار، باغِ حسن بدست خزاں گرفتار:

صد باغ و بزم چشم براہِ منت دمن — دستِ جنوں گرفتہ بویرانہ میردم

آخر کار دونوں کا وصال ہوا، مگر فرطِ مسرت سے لیلیٰ نے ملتے ہی ابدی جدائی کی اور ملکِ عدم کی راہ لی۔ عشق صادق اسے کہتے ہیں:

در ماتم تو دہر بسی شیون کرد — لالہ ہمہ خون دیدہ در دامن کرد
گل جیبِ قبائی ارغوانی بدرید — قمری نمدِ سیاہ در گردن کرد

بھلا اب یہ مجنوں کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے۔ معاً دم توڑا اور دنیائے دوں سے منھ موڑا۔ شہیدِ خنجرِ ناز ایسے ہوتے ہیں:

نیست پروائے عدم وازدۂ ہستی را — از قفس مرغ بہر جا کہ رود بستان مست

چہ می گوئیاں

آج میاں آزاد سرا میں لمبی تانے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

بھٹیارن: (پاؤں ہلاکر) اٹھیے اٹھیے! اے اٹھو بھی، آج تو جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہو، اے لو وہ آٹھ کا گجر بجا۔ اے واہ میاں، انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں، مگر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اجی میاں مسافر! (شانہ ہلاکر) اے میاں مسافر! آپ تو کہتے تھے، کہ ایک دن تماشا نہ دیکھیں تو کھانا نہ ہضم ہو۔ یہ آج بدپرہیزیاں کیسی؟ لے اٹھو بھی! بہت نخرے نہ بگھارو۔ اے ہوش کی دوا کر مردوے، اوئی!

چانڈو باز: اے بی تو تم کو کیا پڑی ہے سونے نہیں دیتیں، کیا جانے کس موج میں پڑے ہیں۔ ترنگی آدمی تو ہئی ہیں، مگر سچ کہنا کیسا دھادت سیلانی ہے۔ اف فوہ! کچھ ٹھکانا ہے۔ دوسرا اتنا گھومے تو ہلکان ہو جائے۔ ان کا تلوا ٹکتا ہی نہیں۔ کوئی خاکی ہوتا ہے کوئی ناری، یہ سیمابی ہے۔ اور جو جگانا ہی منظور ہے تو آفتابے کی ٹونٹی سے ذرا سا پانی کان میں چھوڑ دو، دیکھو کیسے کلبلا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

بھٹیاری نے چلو سے منھ پر قطرہ افشانی شروع کی۔ دس ہی پانچ بوندیں ٹپ ٹپ

گری تھیں، کہ میاں آزاد ہائیں! ہائیں! ہائیں! کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

آزاد : واہ خوب، اچھی دل لگی نکالی ہے۔ کیسی میٹھی نیند سو رہا تھا، کہ واہ جی واہ خواب میں وہ پری چھم صورتیں نظر آتی تھیں، کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔

بھٹیاری : واہ وا۔ تو نقد تیرہ ادھار اب تو پری چھم، آنکھوں کے سامنے ہے۔

آزاد : کون؟ آپ نہ!

بھٹیاری : اے آج حضور کی سواری چھتر منزل نہیں گئی۔ وہ دیکھو سانڈنی بلبلا رہی ہے۔

آزاد : ارے آج تو اتوار ہے، بی بی! آج چھٹیاں منائیں، کل سمجھا جائے گا۔

چانڈو باز : کیوں میاں، جٹاؤ تو خوب ہوتے ہوں گے، بھئی کل ہمیں بھی سانڈنی پر بٹھا لینا۔

بھٹیاری : ہیں واری، میاں مجھے ٹکٹ لے دینا۔

آزاد : ارے یار بس یہی تو افسوس ہے کہ آدمی تھوڑے ہی آتے ہیں، جو سب کے سب مل کر چلیں تو خوب ہی نقشے جمیں، اور وہ دل لگیاں ہوں کہ آدمی لوٹتے لوٹتے فرش ہو جائیں۔

چانڈو باز : سنیے بندہ نواز، رات کا وقت۔ نو بجے شروع ہو، بارہ بجے ختم، ایک بجے گھر پہنچے، محلہ بھر میں آگ ڈھونڈھے، سلگائے، حقہ بھرے، توا جمائے، گھنٹا بھر گڑگڑائے، پلنگ پر جائے تو نیند اچاٹ، کروٹیں پر کروٹیں لے، تب کہیں چار بجتے بجتے آنکھ لگے۔ پھر فرمائیے جو بھلے مانس چار بجے تڑکے سوئے، وہ دوپہر تک اٹھنے کا نام لے گا۔ بھلا لیجیے دن یوں گیا۔ رات و دن گئی۔ اب انسان چانڈو کب پیے! داستان کب سنے، قوام کب بنائے، بینک کے مزے کب اڑائے، بھئی کون جائے، مفت میں مٹی پلید کرنا۔ اس سے فائدہ کیا گلا بوشتا بو کے تماشے سے اچھا ہوتا ہو گا؟ اجی بس بیٹھیے بھی، جس وقت وہ مٹک مٹک کہتی ہیں (جنیا لال موں گی) واللہ چانڈو بے پیے نشہ چڑھ جاتا ہے، جو وہاں جائے تو اس سے ریچھ والے ہی کا تماشا نہ دیکھے۔ وہ ٹنچی دی اور وہ دے مارا۔ چاروں شانے چت۔ میاں اینٹھا منگھ کے مزے نہ اڑائے۔ بکری پر تنے بیٹھے ہیں۔ چھینک پڑی، اور کھٹ سے پھُندنے دار، ٹوپی الگ۔ اُچھیں، وہ پہنچی، ڈگڈگی بج رہی ہے۔ بندریا تھرک رہی ہے۔ ناچ کھلاڑی دھنک دھنا، بھئی کوئی بیدھا ہی ہو جو وہاں جائے۔ ہم تو نہ جائیں گے۔ اور میاں لوگ آئیں کہاں سے خلقت تباہ خستہ ہے۔ کسی میں دم کہاں، اور جب سے افیم سولہ روپے سیر ہو گئی۔ تب سے تو اور بھی خلقِ خدا کا دوالہ نکل گیا۔ اور رہا سہا یہ چانڈو کی ٹھیکیوں نے مار ستیاناس کر دیا۔ جائے تو

بند گوار ٹکے ہیں ۔ وہ ان کے اوپر جان دیتے ہیں، اور یہ ان پر مرتی ہے ۔ کئی آدمیوں کے سامنے وہ قبول چکے ہیں کہ ان کے ساتھ نکاح کریں گے، مگر آدمی ہیں تلوّن مزاج، ایسا نہ ہو کہ انکار کر جائیں ۔

بھٹیاری : حضور مجھ غریبنی سے کوئی چھپن ٹکے تو آپ کو ملنے نہیں ہیں، رہا اتنا ثواب کیجیے کہ کوئی تدبیر بتا دیجیے ۔ جس میں وہ شکنجے میں جکڑ جائیں، اور سرکار کے ذریعہ سے نکاح کرنا ہی پڑے ۔ اب اکیلے رہتے رہتے جی گھبراتا ہے ۔

ٹھٹھول : اگر نکاح ہی کرنے کا شوخ چرّایا ہے تو ہم کیا بُرے ہیں ۔ یہیں صدقے ہمیں سے نہ نکاح پڑھا لو ۔

جوان : اچھا تم نہیں ہم سہی ۔

احباب : ایک تم پر کیا فرض ہے ۔ جی یہاں سب جھنڈے تلے کے شُہدے، چھٹے ہوئے پلے جمع ہیں، تم جس کو پسند کرو اسی کے ساتھ نکاح ہو جائے، یوں سہی ۔ ہاں جوانو ۔ ذرا نکھر کر، اور اکڑ کر، بیٹھنا تو ہاں بے اب چیتیے ۔ خدا کرے ہمیں پر نظر پڑے ۔

وکیل : اچھا کل آؤ تو ہم وہ ترکیب بتائیں کہ تم بھی یاد کرو ۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے میاں کہاں ہیں؟

بھٹیاری : خدا گنج پہونچے ۔

وکیل : اوہ تو پھر کیا مشکل ہے ۔ کل تم ان سے کہو کہ چڑھے چاند کو بیاہ ہو جائے ۔ جو نہ مانے تو نالش داغ دو ۔

بھٹیاری : (جھک کر سلام کیا) مگر بندی نے کبھی سرکار دربار کی سکل (شکل) تک تو دیکھی نہیں آپ وکالت کیجیے گا ۔

جوان : ہاں ہاں جی ۔ ہمیں منت ہی کیا ہے ۔ مگر جانتی ہو یہ وکیل تو روپیہ کے آشنا ہیں ۔

بھٹیاری : واہ روپیہ یہاں اللہ کا نام ہے ۔ ہم ہیں چاہے بیچ لو ۔

وکیل : اچھا تم کل آؤ، پہلے دیکھو تو وہ کہتے کیا ہیں ۔

میاں آزاد کی پیاری اللہ رکھی بھٹیاری بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں ۔ نام خدا خوش سلیقہ تھیں، کچھ دیہاتن تو تھیں نہیں کہ دفعتاً فتنہ کی طرح اٹھ کھڑی ہوتیں، طبیعت کو تو کلفت ہو گئی تھی، لیکن مصرع ناموزوں کی طرح سکتے ہیں رہ گئیں ۔ جب بیکلی بڑھی تو کنکھیوں سے میاں چانڈو باز کی طرف دیکھا، اور چشم فسوں پرواز سے اشارہ کیا کہ اب بوریا بدھنا اٹھائیے، اور سرا میں بستر جمائیے، وہ ایک خرانٹ آٹھوں گانٹھ کمیت، چھوٹتے ہی تاڑ گئے کہ بی اللہ رکھی زلف مہوشانِ فرخار، کی طرح پریشاں

ہیں تو یوں منمناتے۔

چانڈو باز: اے حضور ذری گھڑی کو تکلیف دیجئے گا، دیکھیے تو کیا بجے ہیں؟

بھٹیاری: میں تو جانوں کوئی بارہ بجے ہوں گے اٹکل سے کہتی ہوں۔

چانڈو باز: میں بھی کہوں یہ جمائیوں پر جمائیاں کیوں آرہی ہیں۔ انگڑائیاں الگ بدن کا کچومر نکال رہی ہیں۔ ہڈیاں جدا چُرمُر ہو رہی ہیں۔ اب تو میں ٹھُس ہو گیا۔ نشے کا وخت ٹل گیا۔ کم بخت حلوائیوں کی دکانیں بھی بڑھ گئی ہوں گی۔ بالائی سے بھی گئے۔ آج بے موت مرے۔ صبح صبح میاں آزاد کی منحوس صورت دیکھی تھی، جب ہی ان دہاڑوں کو پہنچے۔ لے پیر و مرشد، اگر پروانگی ہو تو رخصت ہوں۔ اب تو چانڈو کی لو لگی ہے۔ مگر۔

بھٹیاری: اگر مگر تو رکھو چھپر پر۔ یہ میاں آزاد کا نام کیسا لیا۔ ہوش کی دوا کر مردوے۔ قدرت خدا کی۔ اب کی کہا تو کہا، اب ایسی اینڈی بینڈی سنائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ دست پناہ سے پکڑ کر زبان کھینچ لوں گی۔ چلو ہٹو ایسی باتیں ایک آنکھ یہاں نہیں بھاتیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو آئینے میں سویرے اپنا ہی منہ دیکھا ہوگا۔ ناحق بن ناحق کسی پر چھدّا رکھنا اچھا نہیں۔

چانڈو باز: کیوں مفت میں چلیتھڑوں سے بیزار ہوئی جاتی ہو۔ یہاں خود ستر ہوں کرم ہو گئے:

بیوی خطا معاف کرو میں نشے میں ہوں

شیشے میں مے نہ مے میں نشہ میں نشے میں ہوں

لے وکیل صاحب۔ اب ٹھیک وخت (وقت) بتا دیجیے! یہ تو ہندی کی چندی نکالا ہی کریں گے۔ یہاں اپنا قُل ہوا جاتا ہے۔ ایک آدھ چھینٹا اُڑائیں جی میں جی آئے، بے پتے نشہ چڑھ گیا۔

یارانِ سرِ پل: قدرت۔ ارے میاں قدرت! دیکھو دکانیں بڑھ نہ گئی ہوں، تو ان کو چانڈو یہیں پلوا دیں۔ ذرا دو گھڑی بی اللہ رکھی سے صحبت گرمائیں۔

قدرت: جانے کو کہیے میں جاؤں، ایک نہیں بیس دفعہ، پُل دکانیں کب کی بڑھ گئی ہیں ۸ بجے سے چانڈو خانے میں جانے کا حکم نہیں۔ کوئی بیدھا ہے جو اس وقت چانڈو بیچے گا۔ کتے بھونک رہے ہیں۔ سناٹا بزار (بازار) بھر میں پڑا ہوا ہے۔ چڑیاں چنگن تک سوتی پڑی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچار ہے ہیں۔ باغبان گوندنی کے کھٹکھٹے کو کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔

بھٹیاری: (تالیاں بجا کر) اے اوئی کیا آدھی رات ڈھل گئی باتوں باتوں میں یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ رات کدھر گئی۔ لے اب تو بندی رخصت ہوتی ہے۔

یارانِ سرپل : اے واہ، یہ اندھیری رات، آدمی نہ آدم ذات، (زاد) ٹھوکریں کھاتی، اس اندھیاری میں کہاں جاؤ گی۔ ساتھ میں ایک مردوا، سو بھی عورت سے بدتر، کیا پدی کیا پدی کا شوربا، آج رات یہیں نہ تیر کیجیے۔ فجر کو اپنے چل دینا۔ ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے کہتے ہیں، نہیں تو ہم پہنچا دیں۔

چانڈوباز : جی ہاں گود میں اٹھا لیجیے نہ :

حسن ہے تو عشق کا ہونا ضرور ہے
آنکھوں کی کچھ خطا ہے نہ دل کا قصور ہے

یہ چہرہ کیا پری کا ٹکڑا ہے۔ واللہ کیا گورا مکھڑا ہے۔

بھٹیاری : اب خوش گپیاں تو ہو چکیں۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں، نیند نے بوکھلا دیا، بس اب رخصت حضور بھولیے گا نہیں۔ اتنے دیر مزے سے باتیں کی ہیں۔ یاد رکھیے گا لونڈی کو۔

یارانِ سرپل : وہ ہنستے آئے یہاں سے ہمیں رلا کے چلے
نہ بیٹھے آپ۔ مگر دردِ دل اٹھا کے چلے

وکیل : دکھا کے چاند سا مکھڑا چھپا یا زلفوں میں
دو رنگی ہم کو زمانے کی وہ دکھا کے چلے

جوان : دکھایا ضعف نے زور اپنا جب مکان سے چلے
مثالِ نبض وہیں رہ گئے جہاں سے چلے

ٹھٹھول : ہوائے عشق سے ہے شہر بھر میں اب شہرہ
قلم کی طرح جدھر ہم چلے زبان سے چلے

وکیل : انیس بارِ علائق یہ اور بارِ گناہ
وہ بوجھ اٹھا کہ جو اس مشتِ استخواں سے چلے

داروغہ : نہ تھا جو کوچے میں اپنا قیام مدنظر
تو میرے بعد مری خاک بھی اڑا کے چلے

احباب : قسم حسینؑ کی! اس وقت دل مسوس کر رہ گئے۔ واللہ کیا پیاری صورت پائی ہے۔ شان کبریائی ہے۔ اس دم تو سب کے سب شہید نازِ مرغِ بسمل ہو رہے ہیں۔ (ہاتھ جوڑ کر) از برائے خدا اتنا تو اقرار کرتی جاؤ کہ کل ضرور ملوں گی۔ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

بھٹیاری : ہے ہے میرے دل کا تو عجب حال ہے۔ یہ کیا جادو کر دیا بھلے مانسو! بس رخصت۔

احباب : یہ بھی کوئی ہنسی ہے کہ رخصت کلے کے نام
سو بار بیٹھے بیٹھے ہمیں تم رلا چلیں

وکیل : آنکھوں آنکھوں میں لے گئیں وہ دل
کانوں کانوں ہمیں خبر نہ ہوئی

اتنے میں بی بھٹیاری چمک کر، آنا البرق کہتی ہوتی چل کھڑی ہوئی۔ میاں چانڈو باز سایہ کی طرح ساتھ ساتھ ہیں۔ اُدھر وہ نظر سے اوجھل ہوئیں، ادھر یارانِ بذلہ سنج ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ عورت ہے یا چھلاوا۔ جادو کر دیا۔ سحر کر دیا۔ ٹونا کر دیا۔ واللہ معشوق تو بہت دیکھے مگر یہ آنے دارد :

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

خیر بی اللہ رکھی، میاں چانڈو باز کو لے کر سرا میں پہنچیں۔ راہ میں وہ تو اپنے حسن و جمال، اور کبک دری سی چال، اور رنگین خد و خال، اور پیاری پیاری بول چال، کی تعریف کرتی جاتی ہیں۔ کیوں سب کے سب ہماری ادا پر لوٹ گئے نہ۔ میاں یہ تو فقیر کی دعا ہے کہ جس محفل میں جا کر بیٹھ جاؤں وہیں کٹاؤ ہونے لگے۔ راہ میں سیکڑوں شریف زادے آوازے کستے ہیں۔ ہزار دن عاشق مزاج ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے خدا کمر کو بچائے، کوئی کہتا ہے الٰہی اس مکھڑے کے صدقے، اس چھب کے واری، اس سج کے قربان، اس ناز کے نثار، قسم لو جو آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھتی بھی ہوں، اور جو کہیں کسی سے آنکھ لڑ گئی تو کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ بی اللہ رکھی تو اپنے حسن پر اتراتی تھیں۔ ادھر میاں چانڈو باز اپنی ہی سناتے تھے۔ سچ کہنا کیسے وکیل کے پاس لے گیا۔ صحبت کتنی اچھی ہے۔ میری جان کی قسم نہ کہو گی۔ ہم تو ہوا خور ہیں۔ دو نوں میں خوب چخ چلی۔ ہوتے ہوتے میاں آزاد سے سرا میں دو چار ہوئے۔

بھٹیاری : اللہ اللہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آج کیا ہے۔ جو پلک تک نہ جھپکی جی! یہ کس کی یاد نے نیند اچاٹ کر دی۔ ع۔ دل میری طرف نظر کہیں اور، "آثار تو کچھ بُرے ہیں۔

آزاد : ہاں جلاؤ، جلاؤ، ڈو ڈو بجے تک ہوا کھاؤ، اور ہم سے آن کر باتیں بناؤ، اور غراؤ، چلیے بس دیکھ لیا۔ یہ چلتر بازیاں رہنے دیجیے۔ میں ایک گھاگ ہوں، مجھ سے اڑ کر کہاں جاؤ گی۔ بھلا تم ڈال ڈال، تو میں پات پات، بندہ پرانا سیار ہے۔

بھٹیاری : اے واہ، یہ بدگمانی۔ تو میزان پٹ چکی۔ سنیے! اب ان کے مارے کوئی بھائی بہن کو چھوڑ دے۔ آخر ہم نے کیا کیا، وہاں گئے تو شہر بھر کی بھٹیاریاں جمع۔ خوب ڈھولکیں بجیں چہل

پھول رہی، دھما چوکڑی مچی، اب کی تم کو بھی لے چلیں گے۔

آزاد: ہاں ضرور، اور میاں چانڈو باز کیا کیا کیے؟

بھٹیاری: کون یہ اد ننگا کیے۔ آنکھیں بند، گردن زمین دوز، یہ گرے، وہ گرے، چل چل چل۔ دھم، وہ گر پڑے۔ اے لعنت خدا۔ اتنا پی کیوں جاتے ہو، جو پھر اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ خیر جی یہ دکھڑا تو ہوا ہی کرے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ نکاح کا کون دن قرار پایا ہے۔ ہم آج سب سے کہہ آئے کہ، میاں آزاد کے گھر پڑیں گے۔ پھر جھٹ پٹ نکاح پڑھوا لو۔ بکھیڑا جائے، یہ روز روز کی فکر کیسی (گردن میں ہاتھ ڈال کر) اچھے آزاد۔ اب کی چڑھتے چاند نکاح ہو جائے صبح شام کیوں لگاتے ہو، خوجانے (خدا جانے) ہاتھی چھوٹے گھوڑا اچھوٹے۔

آزاد: تم یہ کہتی کیا ہو۔ کیا سچ مچ تم سب سے کہہ ہی آئیں، غضب ہی کیا۔ واللہ کہیں ایسا کرنا بھی نہیں۔ میں دل لگی کرتا تھا۔ خدا کی قسم فقط دل لگی تھی۔ میں پردیسی آدمی۔ شادی بیاہ کے کیا معنی؟ اور پھر بھٹیاری کے گھر پڑوں، مانا کہ تم ہو پری چھم، مگر پھر بھٹیارن ہی تو۔ اپنی وضع کے خلاف ہے۔ چار دن کے لیے سرا میں آن کر ٹکے یہاں سے بلا ساتھ لے جائیں۔

بھٹیاری: (چمک کر) چونچ سنبھال مردوے۔ اور سنیے گا ہم بلا ہیں، جس پر سارے شہر کی نگاہ پڑتی ہے۔ بے تکا پن بھی کتنا۔ دوسرا کہتا تو خون خرابا کر ڈالتی۔ مگر کیا کروں قول ہار چکی ہوں۔ برادری بھر میں کلنگ کا ٹیکا لگے گا۔ انگلیاں اٹھیں گی۔ بلا کی اچھی کہی، تمہارے منہ سے میری ایڑی گوری ہے، چاہے ملا لو۔ آئے وہاں سے بڑے نخادین بن کے۔

آزاد: تو بی صاحب سنیے! اس خیال خام سے درگذر یے، تم کو میں دیکھتا ہوں گلے کا ہار ہو گئیں، کیسی شادی کہاں کا بیاہ کہاں کا نکاح۔ معقول۔

بھٹیاری: معقول معقول کیا کرتا ہے، نامعقول، کل ہی تو میں نالش داغتی ہوں۔ تو سہی جو ناچ نہ نچاؤں۔ کیا نکلے جاتے ہیں۔ اقرار کر کے مکر جانا خالہ جی کا گھر ہے۔ دیکھو یہ ستی پٹی سب بھول جاؤ گے۔ اے واہ (انگلیاں مٹکا کر) ذری ٹھہرے ہو گے، میاں میں جو اپنی والی پر آئی تو بڑا گھر ہی دکھاؤں گی۔ کسی اور بھروسے پر نہ بھولنا، مجھ سے برا کوئی نہیں۔

آزاد: توبہ! خدا کی پناہ! میں اب تک سمجھا تھا کہ میں ہی بڑا مقرر ہوں، مگر اس عورت نے میرے بھی کان کاٹے۔ بھلا دی ساری چوکڑی۔ ہاری مانتی ہے نہ جیتی۔ خداوندا کہیں تو کعبدی سے ہو، تو میں دوسری کوٹھری لوں۔

بھٹیاری : (ناک پر انگلی رکھ کر) رو دیے، رو دے، اس سے چھوکری ہی ہوتے ہوتے تو کسی بھلے مانس کا گھر بستا۔ واہ رے مردوے، بھلا مجال پڑی ہے۔ کہ کوئی بھٹیاری ٹھکائے۔

آزاد : تو سارے شہر بھر میں آپ کی حکومت ہے کچھ۔

بھٹیاری : ہئی ہے، ہئی ہے، دیکھ لینا نہ۔ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے، کل پرسوں تلک آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

آزاد : چلیے آپ کی بلا سے۔

چانڈوباز : بلا ولا کے بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ دو چار دن تا تھیا مچے گی۔

آزاد : ذری آپ چپکے بیٹھے رہیے گا۔ تو کون بولنے والا ہے۔ بے ٹکڑ گدے، جوتی خورے۔ یہ تو نازنین کامنی ہے۔ تمھاری مفت میں شامت ہی آ جائے گی۔

چانڈوباز : میرے منھ نہ لگیے گا۔ ہاں اتنا کہہ دیا ہے۔

میاں آزاد نے اٹھ کر دو چار چانٹے جڑ دیے۔ بی بھٹیاری نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں موئے کے، کیا نرما پا کر چپٹ چپٹ مارنے لگے۔ جانو، اس کی ہڈیاں مفت کی ہیں۔ لے کے پیٹ ڈالا۔

چانڈوباز کر ذر مار کھانے کی نشانی، بولے تو کیا بولے (میرے بھی دو ایک پڑ گئے جی) اس وقت تو سب کے سب لڑ جھگڑ کر سو رہے۔ تڑکے بی بھٹیاری اور چانڈوباز وکیل کے گھر پہنچے، ساری داستان سنائی، اور میاں چانڈوباز نے اور بھی حاشیہ چڑھایا۔ وکیل تو بی بھٹیاری پر ریجھ ہی گئے تھے، فوراً مسودہ عرضی تیار کیا۔

اللہ رکھی، مدعیہ ساکن سرائے مینڈو خاں، بنام میاں آزاد خانہ برباد، ولد نامعلوم ساکن وحشت آباد۔ اللہ رکھی مدعیہ حسب ذیل عرض کرتی ہے۔

۱۔ یہ کہ مدعا علیہ جو شکل صورت سے بھلا مانس معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اس مہینے میں کئی بار مدعیہ سے شادی کرنے کا اقرار کیا۔ کبھی کہا تم ارمتی ہو، کبھی کہا رشک نگار ارمنی ہو کبھی مستانہ چال پر ریجھا کبھی لال لال، گورے گورے، گالوں کی تعریف کی۔ کبھی پیاری بنایا۔

۲۔ یہ کہ مدعا علیہ کے وعدے نے ایک رئیس سے جن کو اس کے ساتھ بیاہ کرنے کا شوق چرایا تھا صاف انکار کر دیا۔ تو وجہ کیا اس خوش رو جوان کا حسن گلو سوز، دل میں کھپ گیا تھا۔

۳۔ یہ کہ رئیس سے انکار کرتے میں اس کا دو ہزار سات سو اکتیس روپیہ ۱۱ آنہ پانچ پائی کا نقصان ہوا۔

لہٰذا وادخواہ ہے کہ مدعا علیہ قرق کرلیا جاوے، اور مدعیہ کے ساتھ بیاہ دیا جاوے، اور زرِ مذکور مع سود بحساب ہے فی صدی مع ہرجہ مدعیہ کو دلایا جاوے۔

میں کہ نام میرا عرضی دعوا میں درج ہے اقرار کرتی ہوں کہ بیان دعوا میرے علم و یقین میں صحیح اور درست ہے، اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ شوہر مستقل دلایا جاوے۔

میاں آزاد تو سرا میں موجیں لے رہے ہیں' اور بی اللہ رکھی اس فکر میں ہیں کہ ان کے ساتھ بیاہ رچے۔ اب صبح شام نالش دغا ہی چاہتی ہے، اور کچہری جگا ہی چاہتی ہے۔ میاں چانڈو باز اور بھی ہتھے دے رہے ہیں۔ وکیل اور ان کے احباب بذلہ سنج کو گویا شگوفہ ہاتھ آیا۔ انھوں نے بی اللہ رکھی کو وہ پٹی پڑھائی کہ کھل گئیں۔ اب یہ فکر ہے کہ میاں آزاد قرق ہو جائیں۔ اچھی قرقی ہے، ان کو یہ حال معلوم نہیں کہ وہاں کیسا ہنڈیا پک رہی ہے۔ یہ تو یہاں کا حال ہوا۔

نواب کا دربارِ دُر بار

اب نواب نامدار کے دربارِ دُر بار کا کچا چٹھا سنیئے! ایک دن نواب صاحب زنان خانے میں بیٹھے بیگم صاحب سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔

بیگم : اے ہاں۔ آزاد کس کھوہ میں دھنس گیا۔ میں تو جانوں کوئی دُو مہینے سے کم نہیں ہوئے ہوں گے۔ جس دن سدا بہار کی لڑکی گل چمن کی ہنسلی بڑھائی گئی تھی، اسی دن لد پھند کر گیا تھا۔ میں کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

سدا بہار : اے وہ چمپت ہوا، موا چور۔

بیگم : بس انھیں باتوں پر تو میں جھلا اٹھتی ہوں، پھر کہتی ہے چھوٹی بیگم مجھ سے تیکھی رہتی ہیں۔ تیری باتوں سے میرا جی جلتا ہے۔

نواب : تو کٹی کیوں مرتی ہو بھلا، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، میرا آزاد میاں صف شکن علی شاہ کو لاہی چھوڑے گا۔ ہم جانتے ہیں علمی بحث ہو رہی ہے۔ اور پھر تم جانو علم تو وہ سمندر رہے۔ جس کا اَور نہ چھور۔

بیگم : (قہقہہ لگا کر) علمی بحث ہو رہی ہوگی۔ کیوں صاحب، میاں صف شکن علی شاہ علم بھی جانتے ہیں۔ (پھر قہقہہ) میں کہتی ہوں آخر اللہ نے تم کو کچھ رتی ماشہ تولہ عقل بھی دی ہے۔ موا بٹیر، ذری سا جنور، کاکن کے تین دانوں میں پیٹ بھر جائے، اس کو آپ بوڑھے حافظ سے بھی زیادہ

علم والا سمجھتے ہیں۔ (پھر قہقہہ) میرے میکے کے پڑوس ایک سٹری سودائی۔ دن رات واہی تباہی بکا کرتا ہے، اس کی اور تمھاری باتیں ایک سی ہیں۔

سدا بہار : نا بیوی (دانت کے تلے انگلی دبا کر) اوئی کوئی ایسا کہتا ہے، اس سودائی نگوڑے کو ان پر سے صدقے کر دوں۔ واہ وا۔

نواب : تم سمجھی نہیں سدا بہار۔ ابھی تو الھڑ پنے ہی کے دن ہیں۔ نہ ان کے۔ خدا کی قسم مجھے ان کی یہی باتیں تو بھاتی ہیں۔ یہ کمسنی کا سبھاؤ ہے اور دو تین برس، پھر یہ شوخی اور چلبلا پن کہاں، یہ جب جھڑ کتی یا گھڑکتی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔

سدا بہار : ہاں ہاں پھر جوانی تو باؤلی ہوتی ہی ہے۔

بیگم : اچھا سدا بہار سے کہو کہ اس کو اپنے بڑھاپے کی قسم، جو جھوٹ بولے۔ بھلا کیوں سدا بہار۔ بٹیر پڑھے لکھے بھی ہوا کرتے ہیں؟ منھ دیکھی نہ کہنا اللہ لگتی کہنا۔

سدا بہار: بڑھاپا! ہونھ، بڑھاپا کیسا، بیوی بس یہی باتیں تو اچھی نہیں لگتی ہمیں۔ میں بوڑھی کا ہے سے ہو گئی۔ بُرا نہ ماننا تو کہوں، آپ سے ابھی ٹانٹھی ہوں۔

اتنے میں غفور خدمت گار نے پکارا۔ فرخندہ! فرخندہ! اے بوا فرخندہ! سرکار سے کہو کہ پیچوان بھرا رکھا ہے۔ یہاں بھیج دوں یا بغیچے میں رکھوں۔ حضور باہر نہ آئیں گے کیا؟

نواب : وہ چاندی والی چھوٹی گڑگڑی بیگم صاحب کے واسطے بھر لاؤ۔ کل بسوان[1] سے تمباکو آیا ہے۔ وہی بھرنا اور پیچوان باہر لگا دو، ہم ابھی آتے۔

یہ کہہ کر نواب نامدار بیگم صاحب کے ہنسی ہنسی میں آہستہ سے ایک چٹکی لے کر مسکراتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ اور حالی موالی مصاحب رفقا ان کے جاتے ہی سر وقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آداب بجا لاتا ہوں حضور، کورنش ہے پیر و مرشد، تسلیمات عرض کرتا ہوں خداوند، عرض ہے حضور والا، چو طرفہ سے آداب و تسلیمات کے چھرے چلنے لگے۔

خوجی : اف اس وقت ملک الموت سے سامنا ہوا۔ ایسا دھکا لگا کہ کلیجہ بیٹھا جاتا ہے، اور بے اختیار رونا آتا ہے۔ ہات تیرے گیدی چور کی۔

---

[1] بسوان ایک مشہور قصبہ ہے جو ضلع سیتاپور (اتر پردیش) میں واقع ہے۔ وہاں کا خمیرہ تمباکو بہت مشہور تھا۔ اب بھی بسوان میں اچھا تمباکو ملتا ہے۔

نواب : کیوں خیر باشد۔

خوجی : پیر و مرشد اس وقت بٹیر خانے کی طرف گیا تھا وہاں۔

نواب : اف! (دھم سے گر پڑے)

مصاحبین : یا علیؑ۔

نواب : بھئی دل بے قرار ہے۔ طبیعت بے لطف ہو گئی۔ خوجی میاں تم کو تو ہماری تشفی کرنا چاہیے تھی نہ کہ الٹے خود ہی روتے ہو۔ جس میں ہمارے ہاتھ پاؤں اور بھی پھول جائیں۔ اب شاہ جی سے ہاتھ دھونا چاہیے، ہم جانتے ہیں کہ ان کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

رفقا : انّا للہ و انّا الیہ رَاجِعُون ہ[1]

خوجی : (پینک سے چونک کر) اسی بات پر پھر کچھ مٹھائی کھلواتے، منگواؤ تو کولی کی دکان کی مٹھائی۔

نواب : کوئی ہے؟ اس مردک کی گردن تو ناپنا۔ ہم تو اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں، یہ مٹھائی مانگتا ہے بے تکا نمک حرام۔

خوجی : دیکھیے دیکھیے، پھر میری گردن کُند چھری سے ریتی جاتی ہے۔ میں مٹھائی کچھ کھانے کے واسطے تھوڑا ہی منگواتا ہوں۔ میں تو اس لیے منگواتا ہوں کہ فاتحہ پڑھوں۔

نواب : شاباش جی خوش ہو گیا۔ خوجی مجھے معاف کرنا بے اختیار نمک حرام کا لفظ نکل گیا تم بڑے۔

مصاحب : حلال خُور۔ حلال خور ہو۔

اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب لوٹنے لگے۔ اور بیگم صاحب نے گھر سے لونڈی کو بھیجا کہ دیکھنا تو یہ کیا ہنسی ہو رہی ہے۔

نواب : بھئی کیا آدمی ہو، واللہ روتے کو ہنسانا اسی کا نام ہے۔ خوجی بے چارے کو حلال خور ہی بنا دیا۔

خوجی : حضور اب میں یہاں نہ رہوں گا۔ کیا بے وقت کی شہنائی سب کے سب بجانے لگے کہ توبہ ہی بھلی۔ افسوس! صف شکن علی کا کسی کو بھی خیال نہیں۔

---

[1] پینک ہم اللہ کے لیے ہیں اور پلٹ کر ہم اسی کے پاس لوٹ کر جائیں گے۔

اتنے میں نواب صاحب پلنگ پر دراز ہوئے، اور رفقا میں سے کوئی چانڈو خانہ پہنچا کوئی افیم گھولنے لگا۔

آزاد اور ستر پوش درویش

رند ساغر نوش، فتنہ ہمدوش، ستم ایجاد، میاں آزاد، سرائیں کھٹیا کی پاٹی پر مزے سے بیٹھے سرور کے ساتھ بلبل شاخسار معجز طرازی، حضرت لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی، جعل الجنۃ مثواہ کی یہ غزل، بہ لحنِ داؤدی لہرا لہرا کر پڑھ رہے تھے، اور اس سرمست صہبائے عرفاں کے کلام سحر نظام، پر احسنت و مرحبا کہہ رہے تھے:

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست — بیانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست
در آستینِ مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشم صراحی پیالہ خون ریزست

عراق و فارس گرفتی بشعرِ خوش حافظ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریزست

مقطع پر میاں آزاد لوٹ گئے، اور عین حالتِ وجدان میں غلغلہ، جزاک اللہ بلند کرنے لگے۔ اور چارپائی سے دس دس انگل اچھل پڑے۔ بار بار یہی سعرِ شیریں اور کلام رنگین زبان پر لائے کہ:

عراق و فارس گرفتی بشعرِ خوش حافظ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقت تبریزست

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ حُلّہ پوشانِ بہشت کی طرح جامہ سبز در بر اور شملہ بمقدارِ علم بر سر، سامنے آن کھڑے ہوتے۔ چہرے سے نورِ الٰہی برستا ہے۔ ریش مبارک یک مشت، و دو انگشت۔ میاں آزاد اور اس بزرگ قدسی نہاد کی چار آنکھیں جو ہوئیں۔ تو اس بزرگ موصوف نے یوں فرمایا:

آن سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست — چشم میگون لب خندان دلِ خرم با اوست
گرچہ شیریں دہنان بادشہانند و لے — او سلیمانِ زمان ست کہ خاتم با اوست

میاں آزاد نعرۂ حق سرہٗ بلند کرنے ہی کو تھے کہ ایک سیم تن، اور غنچۂ دہن، طفلکِ دہ سالہ آفت کے پرکالہ، نے ایرانیوں کے لب و لہجہ میں ان اشعارِ سحر بار کو ادا کیا۔ اور میاں آزاد کو لٹا دیا:

اے نسیمِ سحر آرام گہِ یار کجاست　　منزلِ آن مہ عاشق کش عیار کجاست

اس پر میاں آزاد کی پیاری، بی اللہ رکھی بھٹیاری بھی آنا البرق کہتی ہوئی آئیں اور یوں گائیں: ؎

شبِ تاریک ورہِ وادیِ ایمن در پیش　　آتشِ طور کجا موعدِ دیدار کجاست

ہمارے عارف باللہ ولی اللہ حق آگاہ، میاں آزاد درویش شیخوخیت پناہ تڑ سے کہہ اٹھے:

دلم از صومعہ وصحبتِ رنداں بگرفت　　باز تر سا بچہ وخانۂ خمار کجاست

سب کے آخر میں میاں چانڈو باز بھی منمنائے۔ انھوں نے دیکھا کہ سب بلبل ہزار داستان کی طرح اس وقت چہک رہے ہیں ایک ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں، کچھ بات نہیں، لہو مل کے شہیدوں میں داخل ہو گئے، اور بولے تو کیا بولے:

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　بے دو سہ چھینٹہ کشی روح ز میدان نہیم

اب میاں آزاد چکرائے! کہ خداوندا یہ اسرار کیا ہے۔ ان بزرگ نے اگر حضرت خواجہ حافظ طاب ثراہ کا کلام معجز نظام پڑھا تو مقام استعجاب نہیں۔ مگر بی اللہ رکھی اور حافظ شیراز کا شعر اس آب و تاب سے پڑھیں، اور شین قاف درست۔ فقرے اور بندش چست، حیرت تھی کہ یاللعجب یہ کیا بوالعجبی ہے۔ اور طرہ یہ کہ ذری سالونڈا، وہ بھی جھوم جھوم کر: ع "اے نسیمِ سحر آرامگہِ یار کجاست" پڑھ رہا ہے۔ اور میاں چانڈو باز، جن کو ٹھک اور چانڈو اور لمبو اور گرمٹ اور چھینٹے کے سوا دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہیں وہ بھی مصروفِ خوش الحانی، اور مشغولِ غزلخوانی ہو گئے۔ ایک نظر غلط انداز سے انھوں نے سب کو آنکھ بھر کر دیکھا، مگر لجۂ حیرت میں غوطے کھا رہے ہیں کہ الٰہی میں یہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ اس بھٹیاری کو حقانی کلام سے کیا سروکار۔ اور یہ سبز پوش کون بزرگوار ہیں، جن کے چہرے سے نورِ الٰہی اور صفاتِ ملائکہ نورانی آشکارا ہیں۔ واللہ قدسیوں نے لاہوت پر بھی یہ تماشا نہ دیکھا ہوگا، جو ہم یہاں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ خدا کرے کسی طرح یہ بھید ہم پر کھل جائے۔ واللہ اس وقت تو پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوئے ہیں۔ کہیں یہ سب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیں۔ تو ہم بی اللہ رکھی کی خوشامد کریں، کہ واسطے خدا کے کچھ حال ہمیں بھی تو بتاؤ۔ انھوں نے غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بزرگوار رنگے سیار ہیں، اور بی اللہ رکھی کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ ایک دفعہ ہی اس نے حق حق تین بار کہا۔ اور پھٹ سے زمین پر گر پڑا۔ تب تو یا علی کہہ کر میاں آزاد جھپٹے، اور ان کو تڑ سے اٹھایا۔ یا حضرت پیر جی! اتنا کہنا تھا کہ وہ بزرگ آنکھیں کھول کر مسکرائے، اور میاں آزاد کو جھک کر سلام کیا، اور کہا:

(حضور میرا انعام ہوا) سچ کہیے گا ایسے بہروپیے کم دیکھے ہوں گے، کیوں کیسا روپ بھرا؟ لونڈے نے کہا اور میں کیسی پارسی بولا۔ بی اللہ رکھی مسکرا کر بولیں: ہم نے بھی کیا جلد ٹنک ملا دیا۔ میاں چانڈو باز موچھوں پر تاؤ دیکر فرمانے لگے، کہ کیوں بھئی اس شعر خوانی میں بھی اپنے چانڈو کو نہ چھوڑا۔ میاں آزاد اس درجہ خفیف ہوئے کہ گویا عرق خجالت کے سیکڑوں گھڑے ان پر پڑ گئے۔ اب ایسے خوش ہوئے کہ بوکھلا کر بی اللہ رکھی کی فوق البھڑک دُلائی اس کو انعام میں جھٹ دے دی۔ بی صاحب نے دیکھا تو دلائی گئی، مگر ہشاش بشاش کہ آزاد نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ بہروپیے نے دلائی لی جھک کر سلام کیا اور لمبا ہوا۔ لونڈے نے دیکھا کہ میں ہی رہا جاتا ہوں، بڑھ کر میاں آزاد کا دامن پکڑا "ہمیں کچھ بھی نہیں"۔ حضور! میاں آزاد نے جیب سے ایک روپیہ نکال دیا کھن سے، بی اللہ رکھی سمجھیں کہ اس وقت میاں آزاد حاتم کی قبر پر لات مار رہے ہیں فرطِ شوخی سے جھک کر آگے بڑھیں، اور ہاتھ ایک عجیب ادائے دلربا سے بڑھا کر کہا (اور ہمیں)؟

آزاد: تمہارے لیے جان حاضر ہے۔

چانڈو باز: سب زبانی داخلہ، خالی خولی باتیں۔ اور بیوی کو یہ خبر ہی نہیں کہ دُلائی انعام میں دے دی گئی۔ میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر۔ ہو نہ الٹی چلی ہیں مانگنے۔ پٹری کی خبر ہی نہیں۔ بہروپیے کو کیا جھٹ سے دلائی اڑھا دی، یہ نہ ہوا کہ بی بھٹیاری کو بھی اودی اطلس کا پائجامہ بنوا دیں۔ پڑاتے کی چوڑی گوٹ لگی ہو۔ یہ نہ ہوا کہ چاندی کے چھڑے بنوا دیتے کہ سرا بھر میں چھاچھم کی آواز گونجتی، یہ نہ ہوا کہ کسی دن ہم کو دو چار روپیے دے ڈالتے کہ بھئی اتنے دن سانڈنی کی رکھوالی کی ہے۔ جاؤ میاں بس تم کو بھی دیکھ لیا۔ گون کے یار ہو۔ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔

بھٹیاری: (ہنستی ہوئی) اے واہ ری تیری ہانک، کہیں گرمی تو نہیں چڑھ گئی۔ ذرا چنڈیلکے پٹے کتر دا ڈال۔ نرا گو کھا ہی رہا۔ یہ چھڑی اور دمڑی کا کون موقع تھا۔

آزاد: ان کی نہ کہو یہ جوتی خورے ہیں پٹنے کا انھیں ڈر نہیں، جوتے کھانے کا انھیں خوف نہیں گالی کھانے کا انھیں لحاظ نہیں، خاصے پاک بیباک، چھٹے ہوئے گرگے ہیں۔ مردک کو کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ سانڈنی کی رکھوالی کی۔ اچھی رکھوالی کی، وہ تو کہیے قسمتوں سے مل گئی ورنہ ہم تو ہاتھ ہی دھو چکے تھے۔ اور اوپر سے باتیں بناتا ہے، شرمائیے نہ شرماتے دے۔

بھٹیاری: چلو یہ باتیں تو ساری عمر نہ ختم ہوں گی اب کہو نکاح کی کب تیاریاں ہیں۔

آزاد: ابھی نکاح کی امید آپ کے ہے۔ اللہ کتنی خوش عقیدہ ہو سچ ہے دنیا میں امید قائم۔

بھٹیاری : چہ خوش، چرا نباشد۔ معقول، کیا آپ نکل بھی جائیں گے۔ اے ہیں تو چڑھوں گی عدالت۔ واہ کہہ کہہ کر مکر جانا، کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ مجھے بھی کوئی ایسی ویسی سمجھے ہو۔ مجھ سے بری کوئی نہیں۔

آزاد : اخاہ۔ یہ خم وچم۔ یہ دعوا۔ واہ بی واہ۔ عدالت! اچھا کیا نالش کیجیے گا۔

بھٹیاری : کیوں کیا کچھ شک بھی ہے؟ کریں گے اور پیچ کھیت کریں گے۔ ہم کیا کسی کے دبیل ہیں۔ یہ چکنی چپڑی باتیں وہاں ایک نہ چلیں گی۔ دیکھیے گا مزے۔ وکیل ایسا ویسا نہیں ہے۔ معلوم ہوگی قدر آفیت (عافیت)

چانڈو باز : (داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) اور گواہ کو دیکھ رکھیے پیر و مرشد! دلائی کیا جھپ سے اٹھا دی۔ پراتی دلائی کے آپ کون دینے والے تھے۔ یہی ثبوت کافی ہے، اور میں تو وہ تقریر کروں کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ ایسے گواہ بھی نہ دیکھے ہوں گے۔

آزاد : اچھا تو میاں جھگڑا کا ہے کا۔ یہ شوق سے نالش کریں نہ، اور آپ گواہی دیں تو چشم ما روشن۔

چانڈو باز : کیا! چشم ما روشن، یا چشمانِ ما روشن، کیا ایک ہی آنکھ ہے۔

آزاد : اب ایسا نہ ہو کہ میں دونوں پھوڑ دوں۔

چانڈو باز : ذری میرے منھ نہ لگیے گا۔ ہاں میں نے عرض کر دیا میں پھر گداہی دوں گا۔

بھٹیاری : (جھڑک کر) چل ہٹ بڑا آیا وہاں سے گدّا دینے والا۔ ایسا ہی ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا۔ گدّا دیں گے۔ ابھی میں چمٹ جاؤں تو پٹخنی کھا جائے گدّا دیں گے۔ اور پٹ چکا ہے تیسر۔ بڑا بے حیا ہے۔

خیر میاں چانڈو باز تو اپنے گھر سدھارے، اور بی اللہ رکھی چھپر کھٹ پر سو رہیں۔ میاں آزاد کے پیٹ میں چوہے چھوٹے۔ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کیوں جی جو کہیں سچ مچ اس نے نالش داغ دی تو بڑی ہنسی ہوگی۔ وکیل کا نام لیا ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی وکیل چنگ پر چڑھ جائے۔ ان کی دو گھڑی کی دل لگی ہو، اپنا کام تمام ہو جائے۔ اسی سوچ میں میاں آزاد سو رہے۔

شوخ مدہوش، فتنہ ہم دوش، ستم ایجاد۔ جان آزاد بی اللہ رکھی بھٹیاری :

جاگی مرغِ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے (گلزار نسیم)

میدان نشہ بازی کے یکہ تاز، بی بھٹیاری کے ہمراز میاں چانڈو باز گرمٹ لیے۔ اللہ

پھندے، سامنے موجود۔

چانڈو باز: لگی بھی کیا بُری ہوتی ہے۔ ہونھ کہاں تو آٹھ آٹھ بجے تک پلنگڑی پر دراز رہتی تھی۔ راحت افزا پھولوں کی پنکھیا جھلا کرتی تھی۔ فجر کو چاندنی تان دی جاتی تھی، کہ دھوپ سے گورا گورا مکھڑا کمھلا نہ جائے، مگر پھر بھی چھن چھن کے شعاع آتی ہی تھی۔ گلِ شبّو چپی کرتی جاتی تھی۔ بی اللہ رکھی ہیں کہ مسہری ہی پر انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ کبھی ادھر کروٹ بدلی۔ کبھی ادھر لڑھک کر ہو رہیں۔ ململ کا لباس، اور اس پر عطرِ فتنہ کی بو باس، کوسوں بھینی بھینی مہک سے دماغ معتبر ہوا جاتا ہے۔ زلفِ چلیپا کیا مشکِ اذفر تھی، یا لخلخہ و عنبر تھی۔ یا آج دیکھیے تو سویرے سویرے، منھ اندھیرے، آنکھیں کٹورا سی کھلی ہوتی ہیں۔ بکھرے بال چہرے کی بلائیں لے رہے ہیں۔

آزاد: (چادر کو منھ سے اٹھا کر) جھوٹے پر خدا کی مار، شیطان کی پھٹکار، پلنگڑی! یہ نہیں کہتے ہو کہ ٹوٹی پھوٹی کھاٹ۔ اور وہ راحت افزا اور گلِ شبّو کہاں ہیں۔ اپنے ہاتھ سے تو بیوی پنکھیا جھلتی ہیں کہنے لگے مشک اذفر ہے۔ اور لخلخہ عنبر ہے۔ ہات تیرے خوشامد خورے کی دُم میں رسّا باندھوں دس بجے تک تو بیوی دھوپ میں پڑی رہتی تھیں۔ مسہری اور پھولوں کی پنکھیا کی ایک ہی کہی۔

چانڈو باز: جی ہاں آپ جلے پھپھولے پھوڑیے، فریاد کیجیے فریاد،

آزاد: کیسی شکایت، کس کا شکوہ "تقدیر سے گلہ ہے بتوں سے گلہ نہیں"۔

میں نہ فریادی بتوں کا ہوں خدا کے سامنے
آشنا کا کیا گلہ نا آشنا کے سامنے

اللہ رکھی: اے تو اس بکتا بکی سے مطلب کیا، جب سرکار کا پیادہ آئے گا۔ تب میاں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ کہہ کہہ کر مکر جانا، واہ کیا ہنسی ہے۔

چانڈو باز: چلو پھر اب دن چڑھتا جاتا ہے۔ وہاں ہو آئیں نہ ابھی کنگھی چوٹی میں تھیں گھنٹوں لگیں گے، اور وہ سرکاری درباری آدمی ٹھہرے، یک انار و صد بیمار، ایک انگور و صد زنبور، مقدمہ والے صبح شام ڈٹے رہتے ہیں۔ جب دیکھو بگھیاں ٹم ٹم، فٹن، جوڑی گاڑی گھوڑے، ہاتھی پالکی اکّے، یابو، فنس میانے، دروازے پر موجود۔

آزاد: بس چپ نہ ہو رہیے، بکتے جاؤ نہ۔ آج سرور خوب گٹھے ہیں معلوم ہوتا ہے۔

چانڈو باز: اجی یہاں بی اللہ رکھی کی بدولت روز ہی سرور گٹھے رہتے ہیں۔ میاں آپ

اپنی کہیے کہ ہر دم کے گھڑے ہی کی چڑھی رہتی ہے۔ اب دیکھیے نشہ ہرن ہوا چاہتا ہے۔ انشاء اللہ! بی اللہ رکھی نے کوٹھری میں جا کر سنگار کیا اور نکھر کر چلیں، تو میاں آزاد کی آنکھ پڑ ہی گئی۔ ہائے حسن بھی کیا بُری چیز ہے۔ چار آنکھیں ہوئیں، تو دونوں مسکرا دیے۔ میاں چانڈو باز کن انکھیوں سے دیکھ ہی رہے تھے۔ بولے کہ:

ان کو دیکھا تو یہ ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

ہنسے مجھ پہ ہنسے۔ ع "وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو"

آزاد۔ رعد کا شور ہو، موروں کی صدا سے پیدا | جھومتا ابرِ بہاری ہو ہوا سے پیدا
قد کشی آج وہ سروں سے ہیں کرتے جاتے | کل کی ہے بات ہوئے تھے جو ذرا سے پیدا
اے شہہ حسن ترے عشق میں مرنے کے لیے | لڑکے ہوتے ہیں فقیروں کی دعا سے پیدا

اتنے میں بی اللہ رکھی، یک ہری ہری نازک سی چھڑی لگائے۔ چانڈو باز کو ساتھ لیے ہوئے چھم چھم کرتی چلیں۔ بازار میں جدھر جاتی تھیں، یارانِ سرپل آوازے کستے تھے۔ جسے دیکھو مصروف نظارہ بازی ہے، مگر وہ غرورِ حسن سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتیں۔ چانڈو باز ہٹو، بچو، دوڑ دبک کرتے جاتے ہیں۔ ذری ہٹ جانا سامنے سے۔ ایں! واہ میاں، کیا چھکڑا آتا ہے۔ ہٹ جاؤ بائیں، کو یا وحشت! آخر کیا ہے کیا۔ کچھ معلوم تو ہو۔ اخاہ! یہ کہیے یہ ان کی آمد آمد تھی۔ کیوں نہیں۔ لو صاحب ہٹ گئے بس۔ مگر واہ رے زمانے اب بھلے مانسوں نے بس یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ ایک کو ساتھ لیا، کئی کے وارث بنے۔ بازار بھر میں غل مچاتے چلے جاتے ہیں۔ اے لاحول ولا قوۃ۔

عاشق تن: اس وقت تو بازار بھر غل بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔

بی اللہ رکھی اور میاں چانڈو باز آگے آگے پو قدمے جا رہے ہیں۔ اور میاں عاشق تن لڑھکتے پڑھکتے پیچھے آ رہے ہیں۔ طبع موزوں کا دریا ہے کہ امڈا آتا ہے۔ شعر پر شعر پڑھ رہے ہیں تک سے مطلب نہیں۔ کبھی دیوانِ ناسخ کا مطلع پڑھ دیا۔ کبھی عمر خیام[1] کی رباعی بک دی۔ کبھی ماقیما

---

[1] عمر خیام، مشہور ماہر نجوم و ریاضی ممتاز عالم۔ اور بلند پایا شاعر۔ اس کو اپنی رباعیوں کے باعث عالمگیری شہرت حاصل ہے نیشاپور (ایران) کا رہنے والا تھا۔ ء میں وفات پائی۔ ماقیما، نام کی ایک چھوٹی سی منظوم کتاب ہے بچوں کی فارسی تعلیم کے لیے۔

یاد کرنے لگے۔ کبھی خالق باری کے شعر وردِ زبان ہیں۔ ۶۔ جیل ہے درگوش کن گفتارِ من۔ اور سمجھاتے بھی جاتے ہیں کہ اس ذرا سے مصرعے میں "ہے درگوش کن گفتارِ من" اس قدر برائے بیت ہے۔

چانڈو باز نے دیکھا کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ ساتھ جو ہوا تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ اور منھ جو کھولا تو دیوانِ کے دیوان پڑھ ڈالے۔ ان سے کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہیے۔ اتنے میں عاشق تن نے کہا:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کچھ نہیں اور تو حسرت ہی سہی

چانڈو باز بولے کہ حضرت آپ کون ہیں؟ اور یہ ساتھ ساتھ آوازے کستے ہوئے آپ کیوں آتے ہیں؟ یا آگے بڑھیے، یا پیچھے چلیے۔ کسی بھلے مانس کو ستانا کیا معنی۔ اس پر اللہ رکھی نے چانڈو باز کے کان میں چپکے سے یوں کہنا شروع کیا۔ سنو تو بھلا، یہ بھی تو شکل صورت سے بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے۔ بس یا تو انھیں اپنے یہاں لے چلو، یا ان کے یہاں چلو۔ ہاں! تو یہ کہیے اب آپ ان پر ریجھ گئیں۔ اچھا ہمارا ہرج ہی کیا ہے۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ بیوی جو کہو منظور۔ مگر چلتی تو وکیل کے پاس تھیں۔ کیا عرضی دینے کی فکر میں تھیں۔ کہاں اس سڑی سودائی سے بال و پر ملانے کی فکر ہوئی۔ سچ ہے معشوقوں کے مزاج کا ٹھکانا ہی کیا۔ تو آخر تو بتا دو کہ اس سے کہوں کیا؟ "کہنا اور سننا کیا معنی، یہی کہو کہ ان کو آپ سے کچھ کہنا ہے"۔

چانڈو باز: یا حضرت ذری ادھر گلی میں آئیے گا۔ آپ سے کچھ کہنا ہے۔

عاشق تن: واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ چلیے اس گلی میں، مگر ان کو یہاں بیچ سڑک پر اکیلا کہاں چھوڑ جائیے گا۔ انھیں بھی ساتھ لیتے چلیے، بی تم بھی چلی چلو نہ۔

عاشق تن اور چانڈو باز، اور وہ تینوں گلی میں گئے تو دیکھا کہ اس گلی کے اندر ایک اور گلی ہے اس میں دھنسے۔ اس کے اندر ایک اور گلی تھی اس میں گھسے۔ "کہیے حضور کیا حکم ہے؟" "جی ان کو آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔ ہاں۔ زہے نصیب، زہے نصیب، اس وقت تو ہم نے منھ مانگی مراد پائی دل کی آرزو برآئی۔ یہ اور ہمیں بلائیں، آج اپنی قسمت پر ناز ہے۔ کہیے بی صاحب جو حکم۔ اے

لہ اسی طرح خالق باری، اردو فارسی زبانوں کے الفاظ کا منظوم لغت ہے۔ جو ابتدائی درجوں کے بچوں کے نصاب میں شامل۔ یہ کتاب امیر خسرو دہلوی کی تصنیف مشہور ہے لیکن اس کا اصل مصنف کون ہے اس میں اختلاف ہے۔

دام کس کے گھر سے لائے۔ سیلانی تو یہاں کا چوہا چوہا ہے۔ جسے دیکھو سیر سپاٹے پر لٹو۔ مگر ٹکٹ کا نام نہ ہو۔ اور بھئی صاف تو یوں ہے کہ ہم لوگ مفت کے تماشا دیکھنے والوں میں ہیں۔ میلا ٹھیلا تو کوئی چھوٹنے ہی نہیں پاتا۔ ایک بندۂ درگاہ ہی ہیں کہ ساون بھر عیش باغ کے میلے نہ چھوڑے۔ کبھی املیوں میں جھول رہے ہیں۔ کبھی بندروں کی سیر دیکھ رہے ہیں۔ بہت بڑھ کر حاتم کی قبر پر لات ماری، تو ایک گنڈے کے پونڈے لیے، ایک گنڈا اور بڑھایا اور بی ساقن کی دکان پر دم لگایا۔ چلیے پانچ چھ پیسے میں میلا ہو گیا۔ بھلا یہ بات یہاں کہاں۔ حقہ نوشی کی پہلے ہی سے قطعی ممانعت ہو گئی۔ نادری حکم ہے، کہ دھواں کوئی نہ اڑائے۔ نہیں تو ہم سوچے تھے کہ چانڈو کا سامان سب لیتے چلیں گے، اور مزے سے کسی کونے میں لیٹے ہوئے اڑاتے جائیں گے۔ اس میں کسی کے باپ کا کیا اجاڑا بندے کو خدا نے فعل کا مختار کر دیا، پھر اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ٹکٹ تو کرا دیجیے معاف، اور چنڈو کی دکان دیجیے کھول، اور دس دن پہلے ڈھونڈھورا پٹوائیے کہ فلاں تاریخ کو سرِ شام سے بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے ہوں گے۔ ٹکٹ ندارد۔ کڑم دھم، کڑم دھم، پھر دیکھیے جو لکھنؤ بھر نہ ٹوٹ پڑے تو نام نہ بدل ڈالوں۔

آزاد : جی بجا ہے۔ سوجھی تو خوب، چشم بد دور۔ دور کی کوڑی لاتے ہو۔

بھٹیارن : ہاں ہاں! اچھے آزاد پھر تو ہم بھی روز چلا کریں۔

آزاد : کتنی سادی ہو، یہ تو بھنگیا گئے ہیں۔ رہا تمھاری عقل بھی دیمک چاٹ گئی۔ ان کو کیا پڑی ہے بھلا۔ کہ بمبئی سے انگڑ کھنگڑ لے کر کوسوں اتنی دور آئیں۔ چلتے چلتے آندھی روگ آجائے اور یہاں آن کر آپ کو مفت تماشے دکھائیں، چپڑی اور دو دو ہی بے ٹھکانے بات کہتی ہو جس کا سر نہ پیر۔ ایسے آنکھوں کے اندھے، گانٹھ کے پورے، اللہ کے بندے، کہیں اور رہتے ہوں گے۔ ایسی تو خوبصورت بھی نہیں ہو۔

چانڈو باز : اچھا تو تمھاری خاطر ہی سہی تم بھی کیا یاد کرو گے۔ بھلا۔ ایک دن ہم بھی چونی گلائیں گے، چار آنے کا خون ہی سہی۔ کہاں تماشا ہوتا کہاں ہے؟ گول دروازے میں نہ۔

آزاد : ہیں گول دروازہ[1]، نہ، لمبا پھاٹک، چھتر منزل میں، یہاں سے دس قدم پر ہے۔

---

[1] لکھنؤ کے مشہور چوک بازار میں شمال کی جانب سے داخلہ کا شاندار دروازہ جو اصل حالت میں موجود ہے۔

چانڈو باز : ہونھ، تو بندہ جاچکا، دنس قدم کی ایک ہی کہی۔ ہاں تم کو البتہ پاس ہے، مینڈھ[1] خاں کی سرا سے نکلے، اور کھٹ سے داخل۔ یہاں سات بجے سے چلنا شروع کریں، تو دس بجے پہنچیں، آدھا تماشا ہو چکا ہو، مفت میں تو بنیں، اور کہیں پینک نے زور کیا تو خود تماشا بن گئے۔ بگھی کرایہ پر کریں، تو آٹھ آنے آنے کے، اور آٹھ ہی آنے جانے کے، ایک روپیہ ہوا، اور جو تین گھنٹے بگھی روک لی تو دو روپیہ اس نے اور ٹھونک دیے۔ مفلسی میں آٹا گیلا تین بجے گھر پہنچیں تو چخ چلے کہ اب تک میاں تھے کہاں۔ نا صاحب ہم نہ جائیں گے۔ اور میاں اتنی عمر تماشے ہی دیکھتے دیکھتے گزری ہے، اب تین اوپر ساٹھ برس کے ہوئے، مگر یار سنا ہے کہ سبز پری پر بلا کا نکھار ہے۔ جو شوقین ہے تو کسی روز چانڈو پینے آوے ہی گی۔ دیکھ لیں گے۔

آزاد : جی منھ دھو رکھیے۔ یہ مداری لال کی اندر سبھا نہیں ہے کہ چانڈو نہ ہو تو آواز ہی نہ نکلے۔ ارے نادان یہ سب تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ ترے گاؤدی ہی رہے۔ اچھا بھئی اب ان کو صلاح دیں گے کہ شہر میں بھی دو ایک دن کے لیے چلیں۔ وہاں تو آؤ گے؟

چانڈو باز : مونچھوں پر تاؤ دے کر ان شاء اللہ تعالیٰ، ضرور۔ خیال کیجیے کہ کجا چھتر منزل اور کجا نگریاں۔ دنیا کے اس سرے، چلتے چلتے پاؤں سوج جائیں، تین دن تک کھٹیا سے اٹھنا مشکل ہو۔ الٰہی توبہ! کیوں جی سنا اڑن کھٹولے آتے ہیں، اور سچ مچ کی پریاں آن کر گورا گورا مکھڑا دکھاتی ہیں۔ بھئی چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ایں جانب کل ضرور ڈٹیں گے۔ مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کوئی باہر نہ جائے۔ ایسا نہ ہو چار گھنٹے تک قید میں پڑے رہیں۔ بلا سے ہم باہر چنڈو اڑائیں گے۔ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ اندر سبھا تو دیکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ کل نتو کام چھوڑ کر جاؤں گا۔

بھٹیارن : واہ تو شہر میں ہم کیوں کر جائیں گے۔ اتنی دور بھلا۔ اچھا آزاد کی سانڈنی پر ان کے ساتھ ہی سوار ہولیں گے۔ مزے سے دل لگی دیکھ کر دو بجے تک سرا میں آجائیں گے۔ پیدل جانا کٹھن ہے۔

---

[1] مینڈھو خان اودھ کی شاہی فوج میں رسالدار تھا۔ اس کی بنوائی ہوئی سرائے بہت مشہور تھی۔ اس کے کچھ آثار اب بھی باقی ہے۔ نورانی۔

بلبل بیمار

بیا ساقی کہ خلوت خانۂ ما　　منور گشت از جانانۂ ما
بیا ساقی کہ شوقِ صحبتِ یار　　دلم را ہچو من بر دشت از کار
بدہ جامی کہ چوں چشم کشاید
نگاہم بر جمالِ دوست آید

ہمارے جواں مرد، جہاں نورد، میاں آزاد، فرح نہاد، سراپا ٹکٹ بانٹ، زرق برق کپڑے، ڈانٹ، سانڈنی پر کاٹھی کس کر، عطر و عنبر میں بس کر، بی بھٹیاری کو پیچھے بٹھائے، اونٹنی کو چمکائے، یہ جا وہ جا۔ شہر بھر میں دھوم ہے ہر سمت ہجوم ہے۔ جو ہے جو ہے کو معلوم ہے۔

بشہر امشب رسیدہ طرفہ جمعی　　شرر پروانہا بر گردِ شمعی
مقلد پیشۂ باطرز و انداز　　مشعبد سیر تان با نغمہ و ساز
بعلم رقص و تقلید او ستاداں　　مرادِ خاطرِ عشرت زاداں
بفن خویشتن استاد ہر یک　　گہی مرد و گہی زن گاہ طفلک
گہی سناسیانِ مو پریشاں　　گہی اسلامیانِ اہلِ ایمان
گہی رنگِ زنِ نوزادہ بر او　　بدمست دایہ گریاں زادۂ او
زہر قومی کہ خواہی جلوہ ساز ند　　بہر رنگی کہ گوئی جلوہ باز ند

اہو ہو ہو! آج تو محفل جگمگاتی ہے۔ آنکھ جھپکی جاتی ہے۔ ہر دیوار پرستان کا لطف دکھاتی ہے۔ بادِ عنبر بیرے باغِ نعیم کی لپٹ آتی ہے۔ سامنے پردۂ زمرد گوں، اور اس پر نقش و نگار بو قلموں، دامنِ کوہ میں لالہ زار، سراپا بہار قلۂ کوہ پر سپہر زرنگاری والا اعتبار، ایک دفعہ ہی پردہ میں سے زمزمۂ سحر آمیز، اور نغمۂ افسوں انگیز، سامعہ افروز ہوا۔ اور دلِ سامعینِ رنگین طبع مصروف آہ جگر سوز ہوا۔ ہر سمت شورِ تحسین بلند تھا۔ ہر فرد بشر آرزو مند تھا کہ کہیں گھونگھٹ کا طلسم ٹوٹے چاند گہن چھوٹے، نازک آوازی۔ اور جادو طرازی، کہے دیتی ہے کہ یہ پردے والی ابھی کمسن ہے۔

نامِ خدا الڑھ پنے کے دن:

بیا جانان کہ من از خویش رفتم　　زخود چندیں بیاباں بیش رفتم
شنیدم لحنِ خوبت رفتم از کام　　چہ خواہی کرد با من وقتِ دیدار

خدا خدا کرکے وہ کافر پردہ اٹھا۔ تو:

نظر پڑا اک بتِ پری وش، نرالی سج دَھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، یہ قہر و آفت غضب خدا کا

زہرہ کا کیا زہرہ کہ تاب جمال لائے، مہ انور کو شوقِ دیدار چرّائے، تو پہلے ستّو بار آبِ کوثر سے منھ دھوائے:

فروزاں شمع با حُسنِ گلو سوز — پر پروانہا یش صبحِ نو روز
پریش طرۂ پُر پیچ و تاب ست — سیہ مستی ز جامِ آفتاب ست

اس بتِ شکر لب اور دلبرِ سیم غبغب کا بلبلِ بیمار نام ہے۔ اور واقعی اس کی رسیلی آنکھ نرگسِ بیمار، ساقی رندانِ مے آشام ہے۔ اس محبوب چار[14] دہ سالہ کو اس کا دادا بچھیا کا ماما، ایک پیر فرتوت کے سپرد کر گیا۔ جس نے دقیانوس کے باپ کو گودیوں کھلایا تھا۔ اور بابا آدم کو بولنا سکھایا تھا۔ لو بھئی ہم تو سفر کر چلے۔ ایک مہینے ہیں جیتے بچورے تو فہو المراد، ورنہ تم جانو اور یہ پریزاد۔ فی امان اللہ! یہ کہہ کر اس پریزاد، بار بار نژاد، پری چہرہ کے جدِ امجد تو سدھارے۔ اور ایک مہینہ بات کرتے گزر گیا۔ انھوں نے آنے کا نام نہ لیا۔ اُدھر بڈھے میاں کو یہ بڑھ بھس ہوا، کہ اس برق دم، پری چھم، تدرد کو ہسارِ دلربائی، جدّتِ تیغ رعنائی کے ساتھ بیاہ رچے:

پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت ست — از شاخِ کہنہ میوۂ نو رس غنیمت ست

واہ بھئی بوڑھے میاں! واہ میاں لال خاں! بڑھوتی وقت ان سفید بالوں میں کالک لگانے لگے۔ کمر بہتّر جگہ سے خم، مگر یہ دم، ماشاء اللہ، منھ پچوق، رنگ فق، خاصے ہونق، گالوں پر کروروں جھرّیاں، آنکھیں اندھا کنواں، کانکھ کونکھ کے، لٹھیا ٹیکتے ہوئے، ذرا چلے تو بے پھسلن کے پھسل پڑے۔ دانت بتیسوں چوہے کے بل ہیں۔ اور خیال گدگدایا کہ اس پری پیکر کو عقد میں لائیں اور بیوی بنائیں، عقدۂ دل کھلے۔ ایک دن کمر و مر کس کر سفر کی تیاریاں کر دیں۔

پیرِ نابالغ: او بتِ عیّار! ترکِ ستم گار، نکیلی گل عذار، پیاری بلبل بیمار، میں اس چاند سے مکھڑے پر داری۔ میری جان، میری پیاری، وہ تو آج تک آتے ہی رہے، اور ہم مناتے ہی رہے۔ آج ہم سوچے کہ کسی ناخدا ترس کے پالے پڑو گی، تو میری روح پر صدمہ ہوگا۔ اس سے میرے ہی شبستاں کو اپنے چاند سے چہرے سے منور کرو تو کیا۔ ہم اپنی پرانی کھوپڑی پر نئی نئی پگیا جمائے، نوشہ بنائے، ٹٹو پر سوار ہو کر، پیں پیں کرتے آئیں، تم سولہ سنگار کیے،

گردن نیوہڑاتے، بیٹھی رہو۔

بلبل بیمار : (مسکرا کر) اے واہ میاں، (واہ میاں کا ڈونگڑا برس گیا)

پیرِ نابالغ : ادھر ساون بھادوں کے چھالے ہوں، ادھر ہم میں تم میں پینگ بڑھیں۔ دونوں جھولے پر چڑھیں۔ بانس گڑے ہوں، امریوں میں جھولے پڑے ہوں۔ بیوی ملار گائیں، میاں بغلیں بجائیں۔

بلبل بیمار : بغلیں نہیں، میاں تالیاں بجائیں۔ امریوں میں بور آجائیں۔

پیرِ نابالغ : اشرفی لقمہ کھلاؤں، پھولوں کی سیج پر سلاؤں۔

بلبل بیمار : اے واہ ری چاہ، بس اتنے ہی کے لیے بیاہ۔

پیرِ نابالغ : تمہارے دم کے لیے گرمی کی فصل میں خسں خانہ و برف خانہ ہو اور سردی کے دنوں میں شراب ناب، اور گرما گرم نرگسی کباب ہو۔

بلبل بیمار : یہ ٹھنڈی گرمیاں۔

پیرِ نابالغ : رات کو کہانیاں سناؤں، فرمائشی قہقہے لگاؤں۔

بلبل بیمار : یہ سوکھے ٹھٹے۔

پیرِ نابالغ : رات کو ہم ماں کی کوٹھری میں، تم مہتابی پر سو رہو۔

بلبل بیمار : (گردن نیوھڑا کر) پھر آگے کیا؟

پیرِ نابالغ : کہا مان، میری جان!

بلبل بیمار : (قہقہہ لگا کر) اے واہ جی میاں۔

پیرِ نابالغ : میں نہالِ عاشقی ہوں۔

بلبل بیمار : مگر نخلِ بے ثمر۔

پیرِ نابالغ : میں شمعِ محفلِ عشق ہوں۔

بلبل بیمار : مگر چراغِ سحری۔

پیرِ نابالغ : میں آفتابِ سپہر سرداری ہوں۔

بلبل بیمار : مگر آفتابِ لبِ بام۔

پیرِ نابالغ : اب تو عشق چرایا سو چرایا۔

بلبل بیمار : کس برتے پر؟

پیرِ نابالغ : بیاہوں گا۔ ضرور بیاہوں گا۔
بلبلِ بیمار : شرط جواں مردی ہے؟
پیرِ نابالغ :
کوچ کی اپنے اب تیاری ہے تیرا حافظ جنابِ باری ہے
بلبلِ بیمار : (انگلیاں مٹکا کر) نِچے دور!

اس بتِ عنبریں مو، قوس ابرو، کی اس حاضر جوابی، اور بوڑھے میاں کی بے قراری و بیتابی پر محفلِ عش عش کرتی تھی۔

بلبلِ بیمار کی تیکھی چتون، اور پیاری ادا، پر دل لوٹ لوٹ تھا۔ کلیجے پر چوٹ تھی۔ کس ناز و ادا سے تھرک تھرک، اور چمک چمک کر، پیر فرتوت کو دنداں شکن جواب دیتی تھی، کہ واہ جی واہ عنفوانِ شباب اور آب و تاب، اٹھتی جوانی، اور خوش الحانی، نازک آوازی، اور زبان درازی، نے ستم ڈھایا حشر بپا کیا۔ ستم بپا کرنے، اور آفت ڈھانے والی تھی۔ ساری خدائی سے نرالی تھی۔ بوڑھے میاں نے بوڑھی خرانٹ ماما عِصمت، کو بلایا۔ اور کہا کہ لو عِصمت ہم تو کچھ دن کے لیے باہر جاتے ہیں۔ گھر بار اور پیاری بلبلِ بیمار تم کو سونپ چلے۔ پنبے غلام حبشی کو طلب کیا، اور کہا: خبردار، چوکس رہنا، عصائے پیری تھام کر راہ لی۔

اب سنیے کہ وہ گلِ سدا بہار، یعنی بلبلِ بیمار ایک جوانِ سادہ کار، گُل رخسار، پر مفتوں تھی۔ اور وہ اس پر ہزار جان سے عاشق۔ سمجھا کہ ماما کہ دیرینہ روز، گرگِ باراں دیدہ ہے۔ چلو مطرب پسر، اور جنیا کر کے بھیس میں چلیں۔ بڑھیا رنگین مزاج، چمن طبع ہے۔ شاید ریجھ جائے، سارنگی بجائے، اور خوش الحانی سے ٹھمریاں گاتے، بلبلِ بیمار کے ایوانِ جواہر نگار کے پھاٹک پر پہنچے۔ پنبے کو شراب کی بوتل بطریق رشوت دی۔ اور بیٹھ کر گانا شروع کیا۔ (پیا کے آون کی بھئی بریاں، درد جوا نیٹا لاگ رہی) بلبلِ بیمار نے جو یہ آواز سنی تو بے قرار ہو کر دروازے کی سلاخوں کے پاس سے تاک جھانک کرنے لگی۔ ادھر بڑی بی نے للکارا۔

عصمت : پنبے پنبے! ارزر نیچے کیا ہے یہ طوفان
پنبے : عاشق اور معشوق ملے ہیں چپ رہ اے نادان
عصمت : منھ کالا ہو تیرا پنبے! کیا بکتا ہے بدنام
بڈھا ہم کو سونپ گیا ہے یہ دختِ گلفام

عاشق : کیا تڑ تڑ کرتی ہے بڈھی تجھ کو اس سے کیا کام

پلنبے : ارے یہاں قلف لگا ہے۔ اور قلفا۔ قلف کا بھی باپ۔

عصمت : ہے ہے اس بڈھے نے میرا ابھی اعتبار نہ کیا۔ تو عصمت جو اس فیاض جوانِ طناز کو گھر میں داخل نہ کر دوں۔ قفل لگا کا لگا ہی رہے۔ یہ کہہ کر عصمت نے دو سو کی تھیلی سیدھی کی، اور پچھواڑے کے دروازے سے، عاشقِ زار، کھٹ سے بلبلِ بیمار سے ہم کنار ہوا۔

عصمت : ارے جوانی میں، میں بھی آفت کی پر کالہ تھی۔ مجھ پر بھی عالم تھا۔ اتنے میں پیر نوّ سالہ سفر سے واپس آئے، دروازے کو دیکھا تو افیونیوں کی آنکھ کی طرح بند۔ میاں پلنبے کہیں اتفاق سے شراب لینے باہر گئے تھے۔ ان کی اُن کی چار آنکھیں ہوئیں۔

پیر : پلنبے پلنبے ارے کمبخت گھر بار کس پر چھوڑ گیا تھا؟

پلنبے : بلبلِ بیمار کے عاشق زار پر۔

پیر : ہائیں بلبلِ بیمار کا عاشق زار تو میں ہوں۔ کیا اور بھی پیدا ہوا؟

پلنبے : ہونھ۔ اب چار دن میں سُن لینا کہ لڑکا پیدا ہوا۔

پیر : (سر پیٹ کر) اُف! ہائے ستم! وائے ستم!

گھر میں گھسے تو بلبلِ بیمار اور عاشق زار بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اس وقت انھوں نے توبہ کی کہ اب اس سن میں شادی کرے تو اس پر لعنت۔

نواب صاحب اور رفقا کی چہ می گوئیاں

اب ادھر نواب کے یہاں کا حال سنیے! کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ جب کئی دن گزر گئے تو خوشامد خوروں نے چنگ پر چڑھایا، کہ پیر و مرشد دیکھا، ہم نہ کہتے تھے میاں آزاد، خانہ برباد کا ٹھکانا کیا۔ حضور نے نہ مانا آخرش سانڈنی کی سانڈنی گئی، اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی : اور بے وقوف کے بے وقوف بنے۔

میر صاحب : اور انعام و زاد راہ جو دیا کھاتے میں۔ اس کی گنتی ہی نہیں۔

غفور : ہجور اب وہ پھرتے بخیر نہیں آتے۔ دُو تین سو کی سانڈنی پر پانی پھر گیا۔

خوجی : ہونھ یہ دو ہی تین سو لیے پھرتے ہیں۔ اے میاں واہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے

والی ہے۔ ریل کی دُم میں باندھ دو دیکھو چندوسی[1] تک برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان سے ملک میں ویسی ایک تو نظر آتی نہیں۔ کیا دم خم ہے۔ بھئی میں دو ایک دفعہ سوار ہوا۔ واللہ سچ ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا پر جارہا ہوں، وہ ٹھمک ٹھمک چال کہ اہو ہو ہو، سواری اور اونٹ، بگھی، گھوڑا، پالکی، ہاتھی، سب اس کے مقابل میں گرد ہیں، اور بھئی سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اس کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب : واہ خواجہ صاحب آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ کجا بے زبان جانور، کجا ہمارے صف شکن سلمہ اللہ تعالیٰ۔ پاجی اور بھلے مانس کا مقابلہ کیا۔ ارے وہ اشرف الحیوانات ہے، ایسی ایسی ہزار ہا سانڈنیاں اس کی ایک لات پر نثار۔ کہنے لگے سانڈنی کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

نواب : اتنے بڑے لونبڑ ہوئے، مگر گوکھے ہی رہے۔ جو بات کریں گے۔ بے ٹھکانے، سانڈنی ٹکے کا جانور۔ گئی گئی اب اس کا رونا کیا۔ ہائے رنج تو یہ ہے کہ میاں صف شکن اب ہاتھ نہ آنے کے۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے۔ بھئی اس سے تو مجھے ہی موت آجاتی تو سمجھتا۔ بڑا خوش نصیب ہوں۔ افسوس!

مصاحب : حضور صبر کیجیے۔ ع "صبر تلخ ست ولیکن بر شیریں دارد" آتش کہہ گئے ہیں بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کر لیا۔ چچا حضور کو چھوڑ کر چل بسے تو حضور نے کیا کر لیا۔ دادا جان ساری ثروت سے منھ موڑ کر داغ جدائی دے گئے حضور نے کیا کر لیا۔ اب صبر کیجیے۔ صبر کیجیے!

نواب : میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں۔ مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دن بھی جدا ہونا کھلتا ہے۔ نہ کہ کابک سے اڑ جانا۔ خیر خدا ان کو بخشے، اس وقت دل ہے کہ بے اختیار امڈا چلا آتا ہے۔

خوجی : یہ کیا بک دیا کہ۔ صبر تلخ ست ولیکن بر شیریں دارد، آتش کہہ گئے ہیں۔ واہ ری معلومات۔ اے حضرت یہ سعدیؒ[2] کا شعر شیخ جی کا کلام ہے۔

---

[1] چندوسی اتر پردیش کا ایک بڑا قصبہ مرادآباد کے قریب واقع ہے۔

[2] ابو عبداللہ جعفر بن محمد اردوکی، فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ وہ پہلا باقاعدہ شاعر تھا اس نے ۳۴۰ ہویں وفات پائی۔

نواب : کیا خرافات بک رہا ہے۔ یہ شعر شاعری کی تحقیقات کا بھلا کون موقع ہے۔ وہ سعدی نہیں رود کی کہہ گئے سہی، پھر اس سے واسطہ معلوم ہے کہ آپ بڑے شاعر کی دم ہیں۔ عجب نا معقول آدمی ہے بھئی۔

مصاحب : اور غاد اونہ! یہ ان میں سخت عیب ہے کہ کسی نے بات کی اور انھوں نے چٹ کاٹ دی۔ یوں نہیں ووں ہے، وون نہیں یوں ہے۔ آم نہیں املی ہے۔ پوچھیے ہم تو اپنے آقا کی تسلّی کے لیے، تشفّی آمیز باتیں کر رہے ہیں کہ صبر کیجیے۔ یہ ٹیٹوے پر چڑھے بیٹھتے ہیں کہ اس کا نہیں سعدیؒ کا کلام ہے۔ جس میں لوگ سمجھیں کہ آپ بھی بڑے شاعر غرّا ہیں۔ اور املا تک درست نہیں۔ بھلا صَف شکن تو اس کا غذ پر لکھ دیجیے؟

خوجی : چلیے صاحب! وہ ہم گو کھے گھامڑ گاؤدی سہی۔ آپ تو اپنے وقت کے افلاطون ہیں نہ۔ بس چھٹی ہوئی۔

نواب : چھٹی وٹی کے بھروسے نہ رہیے گا چھٹی نہیں ہوئی، ایک بھلے مانس کو آپ نے دس آدمیوں کے سامنے ذلیل کیا۔ آپ کو ہم ذلیل کریں گے۔ غفور قلم دوات کاغذ خوجی کو دو۔ لکھیے قبلہ صف شکن کا لفظ لکھیے۔

مصاحب : نہیں حضور یہ فقرہ لکھوایئے کہ اس وقت ہوش و حواس دُرست نہیں۔

خوجی : نے یوں لکھا (اس وقت ہوش و حواس درست نہیں)

مصاحب :(ہنس کر) واہ وا واہ، کیا لیاقت ہے۔ حوش کو حائے حطّی اور ہواس کو آپ ہائے ہوّز سے لکھتے ہیں۔ یہ دیکھ لیجیے نہ۔

نواب : اے لعنت خدا! اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ گے۔ پھر کسی کو ٹوکو گے۔ بچّہ۔ اے میاں ہوش و حواس نہیں لکھ سکتے۔ اے پھٹکار شرمائے تو نہ ہو گے؟

میر صاحب : وہ شرما چکے۔ شرم چہ کُنی ست کہ پیش مرداں بیاید۔ شرم تو انھوں نے بھون کھائی ہے۔ تب تو شرمائے نہیں، جب بڑی بڑی محفلوں سے نکالے گئے۔

خوجی : حضور کے مزاج میں انصاف تو ضرور ہے۔ لیکن برب کعبہ اس وقت حضور نے میری گردن کُند چھری سے ریتی۔ ہائے ہائے اتنا تو سمجھیے، کہ اگر ہوش و حواس ٹھکانے ہوتے تو پیش پا افتادہ الفاظ کے املا میں بھلا کیوں غلطی کرتا۔ شاعر ہیں، نثار ہیں، مولوی ہیں، منشی ہیں، مگر جب ہوش بھی ہوں۔ ہائے! صف شکن کا پتا نہ ملے اور ہم ماما پختیاں اڑائیں۔

نواب : واہ خوجی واہ۔ اس وقت طبیعت تمھاری نمک حلالی دیکھ کر خوش ہو گئی۔ شاباش! کوئی ہے؟

مصاحبین : کوئی ہے؟ حاضر ہو جلد۔

پیرو : پیرو مرشد (دست بستہ) کیا حکم ہے ؟

نواب : داروغہ سے کہو کہ ہمارے رفیق، خواجہ صاحب کو وہ عباسی رومال اڑھادیں جو پرسوں خریدا تھا۔ لوخوجی! یہ ہم نے انعام دیا۔

واہ بھئی واہ "گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت دہند" کہاں تو خوجی پر عتاب تھا۔ کہاں اب انعام پایا۔ داروغہ نے طشت میں رومال لاکر خوجی کو اڑھادیا، خوجی نے استادہ ہوکر سات دفعہ سلام کیا اور کہا کہ واہ حضور کیا ریاست ہے۔ اب خدا گواہ ہے کہ اس وقت تہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد مع صف شکن علی شاہ کے کھٹ سے آ جائیں، اور حضور واللہ دل گواہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ بس صبح وشام آئے داخل۔

نواب : تمھارے منھ میں گھی شکر۔

مسیتا بیگ : حضور مٹھائی کا اقرار کرلیں۔

خوجی : اور سنیے، یہ بندۂ شکم گرسنہ چشم خوب بولا۔ ابے مٹھائی کیسی، وہ جلسے اُڑیں، وہ جشن ہوں، کہ واہ جی واہ۔ مہینوں طبلے پر تھاپ پڑے، اور دُور دُور سے طائفے آئیں۔ صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ گیدی کہیں کا۔

نواب : انشاء اللہ۔ پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں۔ وہ دھما چوکڑی مچے کہ واہ جی واہ۔

مسیتا بیگ : (میر صاحب کے کان میں چپکے سے) ذکر عیش بہ از عیش۔ آنا جانا ملنا ملانا معلوم۔ مگر واللہ آزاد بھی بلا کا جوان ہے۔ وہ جھانسا دیا کہ نواب بھی ساری عمر نہ بھولیں گے۔ سانڈنی تو بھئی اس نے بیچ لی۔ اونے پونے دام سیدھے کیے۔ صف شکن کی دُم میں نمدا۔

میر صاحب : (آہستہ سے) کیوں جی یہ ہمارے رئیس بھی کتنے بھولے ہیں۔ بٹیر سے صف شکن ہوئے، اور صف شکن سے اب صف شکن علی شاہ بنے (ہاہاہا) لاحول ولاقوۃ واللہ نرا گاؤدی ہی رہا۔

مسیتا بیگ : اجی خدا کرے ایسا ہی بنا رہے، مگر یہ یار خوجی کا عباسی رومال آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ یہ مردک بگڑی بات کو ایسا بنا لیتا ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔

میر صاحب : ہاں مگر آزاد ان کے بھی چچا نکلے۔ ان کے کان انھوں نے ہی کاٹے۔ اور بھئی آدمی بھی پر کالۂ آتش ہے۔ پڑھا لکھا، عالم فاضل، شاعر، نثار، پھر کشتی پٹے میں طاق۔

نواب : اب زنان خانہ میں جاتے ہیں ہم۔ رخصت!

شکر بی کی نقل

ہمارے رسیا یار چے، میاں آزاد کے کان میں بھنک پڑی کہ پونے نو کا عمل ہے۔ ارے توبہ۔ آج ہم نرے اُلّو ہی بنے۔ بی بھٹیاری ایک سیلانی لگی للکارنے۔ اجی بس چلو میاں۔ جاؤ بھی۔ آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ کنگھی چوٹی ہی سے مہلت نہیں ملتی، جب دیکھو ڈھاٹا بندھا ہے۔ پٹیاں جمائی جاتی ہیں۔ اوئی نگوڑی بیسوائیں بھی اتنا سنگار نہ کرتی ہوں گی۔ لے اب کمر کسو چلو گے، یا ٹھلے بازی ہی کیا کرو گے ؟

چانڈو باز: اے بی آخر ش جوان جہاں ہیں۔ آرائشِ سرودستار کے شوق پر لٹو ہیں۔ تم بھی تو بے بال سنوارے گھر سے قدم نہیں نکالتیں۔

بھٹیاری: آپ بھی پلنگ سے چونکے۔ آج چسکی کم پی تھی کیا۔ لو ایک چھینٹا اور نہ اڑا لو۔ ہمارے تو سنگار نکھار کے دن ہی ہیں میاں۔ الہنا کیا دیتے ہو۔

میاں آزاد نے لپ جھپ فوق البھڑک کپڑے ڈلنٹے، اور بی بھٹیاری کو پیچھے بٹھا کر اونٹنی کو کڑکڑا دیا۔ راہ میں بی صاحب رنگ لائیں، ہے ہے، اس موئی سواری پر خدا کی سنوار، اللہ سوں بارے ہچکولوں کے ناک میں دم آگیا۔ میاں آزاد ایک ٹھٹھول آدمی۔ ایک اڑ کا اشارہ جو بتاتے ہیں، تو سانڈنی اور بھی تیز ہوئی۔ تب تو آگ بھبھوکا ہو گئیں۔ اے مردوے کچھ خیر ہے۔ واہ اچھی دل لگی شرر کی ہے۔ مجھے بھی کوئی اور سمجھے ہو۔ واہ میں لاکھوں سناؤں گی۔ بے بس سیدھی طرح چلنا ہو تو چلو، نہیں میں جنجتی ہوں۔ پیٹ کا پانی تک ہل گیا۔ ایسی سواری کو آگ لگے۔ میاں آزاد نے ذرا لگام کو کھینچا تو سانڈنی بلبلانے لگی۔ بی بھٹیاری تو سمجھیں کہ اب جان گئی گزری۔ دیکھو یہ چھیڑ چھاڑ یہاں کسی کو گوارا نہیں۔ ہمیں اتار ہی دو۔ بس پیچ پی، ہزار نعمت کھائی۔ لو اور سنو ذرا سے، ہچکولے میں منہ کے بھل آ رہوں۔ تو چکنا چور ہی ہو جاؤں۔ تم مسٹنڈوں کو اس کا کیا ڈر ہے۔ روکو، روکو، روکو ہائے اللہ میں کس بلا میں پھنس گئی۔ میاں اپنے خدا سے خوف کرو۔ بس ہمیں اتار ہی دو۔ سانڈنی کیا نگوڑی جوڑی ہے۔ اتنے میں حسن اتفاق سے سانڈنی ایک درخت کا سایہ دیکھ کر، ایسی بھڑکی کہ چمک کر دنٹس قدم پیچھے ہٹ آئی۔

میاں آزاد تو راں پڑی جمائے ہی تھے وہ تو تلوہ بچ نکلے، آئی گئی بی بی صاحب کے ماتھے گئی۔ سانڈنی کا بچکنا تھا کہ وہ بھی ساتھ ہی دھم سے زمین پر، ازرزدھوں۔ خدا کی مار اس موے موذی

پر۔ وہ تو کہو خیر سے پکّی سڑک نہ تھی نہیں تو مفت میں ہڈی پسلی چور چور ہو جاتی۔

چانڈو باز : شاباش ہے تیری ماں کو۔ پٹخنی بھی کھائی مگر وہی تیور، وہی خم و دم ہیں۔ دوسری حیا دار ہوتی تو لاکھ برس تک سوار ہونے کا نام نہ لیتی۔ سواری کیا جنازہ رواں ہے۔ مگر جھاڑ پونچھ کر پھر موجود، بے حیا کی بلا دور۔

بھٹیاری : چلیے آپ کی جوتی کی نوک سے۔ ہم بے حیا ہی سہی آپ اپنی حیا کو چھپر پر رکھیے۔ عورت کوئی اور ہی ہوگی۔ بندی سوا مرد ہے۔ سوار کو کھڑے کھڑے گھوڑے پر سے آتار لوں۔ کیا جھانسے دینے آئے ہیں جس میں میں اتر پڑوں، اور آپ مزے سے جم جائیں۔ منھ دھو رکھیے۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

چانڈو باز : بیوی تو سہی، جو آپ کے ہاتھ پاؤں نہ ٹوٹے۔ سر نہ پھوٹے۔

الغرض بعد خرابی بصرہ میاں آزاد داخل منزل مقصود ہوئے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ محفل جمی جمائی ہشل نوعروسی سجی سجائی اتنے ہیں ایک پارسی نے آن کر کہا کہ صاحبان مجلس! علاؤالدین اور اس کے نادر چراغ کا ذکر آج ختم ہوا۔ اب شکربی کی کہانی باقی ہے۔ جس طرح آپ لوگوں نے آج آسرا دیا، اسی طرح ہمیں امید ہے کہ کل بھی آیئے گا۔

میاں آزاد : ارے! ایک داستان کی داستان ختم ہو گئی، اور ہم ندارد، آج مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔ کہیں بی بھٹیاری سے نوک جھونک ہوئی، کہیں بالوں میں حنا کا تیل ڈالا کیے، کہیں ڈاڑھی میں ڈھاٹا باندھا، واللہ بڑا ہی افسوس ہوا۔

اتنے میں شکربی کی کہانی شروع ہوئی۔ پہلے ایک مخارام آئے۔ واہ میاں تندیل۔ چشم بد دور۔ کیا قطعِ مبارک ہے۔ لال لال پگیا پر لٹو۔ صورت دیکھی اور ہنسی آئی، اور حضرت کی بھونڈی ادا اور بھی ستم ڈھاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سفر کی تیاریاں ہیں۔ دسیار و مال لینے جاتے ہیں۔ اس کے بعد نگارِ شوخ و طرار چمکتی ہوئی آئی۔ صورت سے چلبلاپن برستا ہے۔ رگ رگ میں شوخی۔ بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ کبھی دھوتی کو سنوارنا، کبھی بالوں پر ہاتھ پھیرنا، کبھی آنکھیں لڑانا، کبھی مٹکنا، کبھی اٹھلانا۔ ابھی یہ کھڑی تھیں۔ دم کے دم میں تڑپ کر وہ ہو رہیں۔ اُف ری شوخی، جو طرفہ کٹاؤ تھا۔ غضب کا بناؤ چناؤ تھا۔

میاں : ہم نے چھکڑا اوکڑا ٹھیک کر رکھا ہے۔ اسباب وسباب لد گیا ہے۔ سب سامان لیس ہے۔ تم میری جدائی میں گھبرانا نہیں۔ جب جی گھبرائے تو گردجی کو بلا لینا۔ دو گھڑی دل بہلانا۔ میں نے مال لیا اور لمبا ہوا۔ اب کی پو بارہ ہیں۔

شکربی: تسبیح گھڑی جاؤ، اور تو ڑے سے کر آؤ، رہا مجھے نہ بھول جانا، نہیں میں یہاں کڑھ کڑھ کر مرجاوں گی۔ آسمان سر پر اُٹھاؤں گی۔ ہے ہے! تمھاری دو گھڑی کی جدائی شاق ہے۔ جلدی آنا۔ میں واری۔ جلدی سے آجانا۔ کسی کے کلپانے سے کیا ملے گا بھلا۔ اچھا اب ٹھنڈے ٹھنڈے تاروں کی چھاؤں میں جاؤ۔

میاں مخارام تو چوبر دھے چھکڑے پر لد کر سدھارے۔ ادھر ان کے گروجی نے میدان جو خالی پایا، تو آن موجود ہوئے۔ اور لگے اختلاط کی باتیں، عشق کی گھاتیں کرنے۔ شکربی ایک طرار عورت تاڑ گئی کہ گروجی کی نیت ڈانواں ڈول ہے۔

گروجی: مخادام تو چلے گئے۔ ہم روز آئیں گے، اور میٹھی میٹھی باتیں، اچھی اچھی کہانیاں تم کو سنائیں گے مگر شکربی واہ واتم نے کتنی پیاری صورت پائی ہے۔ دیکھوں، میں صدقے۔ ذری مکھڑا تو دیکھوں چھلکی بجا کر اِدھر اُدھر، پیاری ادھر دیکھو! اس جوبن کے واری، کیا کامنی ہے یہ چھب ادا سب میں برق واہ۔

شکربی: ہم آپ کا مطلب آپ کی چتونوں ہی سے تاڑ گئے۔ رہا ایک بات مان لو تو ہم بھی تمھاری بات مان لیں۔ اس وقت تو ہوا کھاؤ، کل آٹھ بجے آؤ تو خوش روزہ منائیں، خوب گائیں بجائیں اب تو میدان خالی ہے۔

گروجی جو پورے گروگھنٹال تھے کھِل گئے، کہ کل آٹھ بجے، اور دھم سے یہاں آن کودے۔ پیاری شکربی اور ہم ایں جانب رسیادہ پری چھم۔ خوب مزے سے کٹے گی۔ آج کسی اچھے کی صورت دیکھ کر اٹھے تھے۔ گروجی مہاراج جو اس لائق تھے کہ دور ہی سے ڈنڈوت کرے، خوش خوش گھر چلے۔ مگر مچل مچل کر، پھر پھر کر دیکھتے جاتے تھے، اور اشاروں سے بتاتے تھے کہ ہم اب مفتوں ہوگئے شکربی لجا کر منھ پھیر لیتی تھیں۔ مگر اس لجانے ہی میں وہ جوبن تھا کہ گروجی ریشہ خطمی ہوئے جاتے تھے۔ جب خدا خدا کر کے گروجی سدھارے، تو شکربی ایک جگہ کھڑی ہو کر ڈھاریں مار مار کر رونے لگیں۔ ادھر سے کہیں کوتوال شہر برآمد ہوئے۔ اس بت گل عذار کا رخسار تاباں، اور پتلی کمر، اور نرگس بیمار دیکھ کر، ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔

کوتوال: اے پری پیکر، تو رشک قمر۔ جواں وطرح دار، شوخ وعیار ہے۔ مگر سر بازار رو رہی ہے۔ کیا کسی نے ستایا ہے۔ یا کسی پر دل آیا ہے۔ تیرے رونے سے اس وقت میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ از برائے خدا بتا تو یہ بات کیا ہے؟

شکر بی : یہاں میں کیا بتاؤں۔ اس وقت کلیجے پر چوٹ لگی ہے۔ کہتے شرم آتی ہے۔ میرے گرد جی مجھکو چاہنے لگے۔ آپ سے فریاد کرنے آئی ہوں۔

کوتوال : گرد، اور تجھ پر ریجھے۔ اس کی ایسی تیسی۔ ایسا ٹھیک بناؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ ساری چوکڑیاں بھول جائیں۔ میری عملداری میں اور یہ اندھیر، تجھ سی پری کے لائق ہم ہیں۔ یا وہ شیطان۔ واہ کیا رنگین طبع شوخ مزاج معشوق ہے۔ اس وقت دیکھا تو جی خوش ہو گیا :۔

حسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد   رُویت ہمہ سال لالہ گوں باد

اس حسن کے قربان، اس رخ کے صدقے، چلو تمہارے مکان چلیں۔

شکر بی : اچھا کیا مضائقہ۔ آئیے! مگر ایک بات مانو تو میں لونڈی ہو جاؤں۔ آج تو رونڈ پر ہو آؤ۔ کل نو بجے ملیں گے، اور گھل گھل کر باتیں کریں گے۔ عورت مرد راضی، تو کیا کرے گا قاضی۔

کوتوال : مگر ادھر دیکھو۔ ڈرتے ڈرتے ایک عرض ہے۔

شکر بی : اے ہے تو اس میں ڈر کاہے کا۔ کہہ تو دیا کہ کل نو بجے آؤ، بس سمجھ جاؤ۔

کوتوال صاحب خوش خوش چلے، اِدھر شکر بی نے پھر زار زار رونا شروع کیا۔ حسنِ اتفاق سے کہیں وزیرِ ریاست ادھر سے آ نکلے۔ ایں! یہ کون رو رہا ہے بھئی۔ مگر آواز ہے کسی چلبلی کی۔ اہو ہو ہو، کیا چاند سی صورت ہے۔ چاند بھی دیکھے تو بلائیں لے۔ عورت کیا پرکالۂ آتش ہے۔ کیوں چنچل نارکس نے دکھ دیا جو ڈاڑھیں مار مار کر رو رہی ہو۔ میں اسی شہر کا وزیر ہوں، جس نابکار نے ستایا ہو اس سے کھڑے کھڑے سمجھ لوں، اور میں تو تیری صورت پر دیوانہ ہو گیا، جو حکم دے بجا لاؤں۔

شکر بی : ہاتھ جوڑ کر عرض ہے، کہ اپنے کوتوال کو سمجھا دو، وہ مجھ پر بُری نگاہ ڈالتا ہے۔ اب آپ کے سوا کس سے کہوں۔

وزیر : میرا کوتوال اور ایسا بد اعمال، کیا مجال، ابھی اس لعین کو قتل کا حکم دوں تو وزیر۔ تیری اٹھتی جوانی، اور یہ پھبن، تو اس لائق ہے کہ وزیروں کے محل میں رہے۔ میں تو تیرا درم ناخریدہ غلام ہوں۔ جو حکم دیجیے بجا لاؤں۔ اشارے کی دیر ہے مگر۔

شکر بی : ہاں ہاں میں سمجھی۔ زہے نصیب۔ یہ اگر مگر کیا معنی۔ اس وقت تو اب آپ جائیں۔ کل دس بجے میرے مکان پر آئیں۔

وزیر : (دست بستہ) ذرا خوب بن ٹھن کر بیٹھنا۔ ہاں خوب نکھر کر کے، اب ہم جاتے ہیں۔

یہ حضرت بھی دفان ہوئے تو سنیے کہ بادشاہ سلامت تشریف لائے۔ ہائیں! ہائیں! تو کون ہے؟

عورت یا پری ؟ آج تڑکے تڑکے خدا نے اچھی صورت دکھائی۔ یہ کوہ قاف سے آئی ہے یا پرستان سے، حور ہے حور۔ تمھارا نام کیا ہے بی۔

شکر بی : مجھے شکر بی کہتے ہیں۔

بادشاہ : شکر بی! واہ کیا میٹھا نام ہے، اور کیوں نہ ہو، بات کرتے وقت لبوں سے قند گھولتی ہے۔ اپنے وقت کی شیریں ہے۔ اچھا پری پیکر یہ تو بتاؤ کہ صبح صبح یہ بے قراری اور آہ وزاری کیوں ہے۔ کیا کسی اگلے پچھلے کو روتی ہے۔ میرے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

شکر بی : اجی حضور کیا کہوں آپ کے وزیر کی مجھ پر بے طور طبیعت آئی ہے۔ وہ وزیر میں فقیر، میری عزّت اب آپ ہی کے ہاتھ ہے۔

بادشاہ : اوہ توبہ کتنی بری بات ہے وزیر کو ابھی بے دخل کیے دیتا ہوں، تو کہا مان، میرے ساتھ بیاہ کرلے۔ مزے سے راج کرنا۔ میں اب والہ و شیدا ہوگیا۔

شکر بی : اجی واہ تم بادشاہ، میں داد خواہ، تم راجا میں پرجا، کہیں گزی میں زربفت کا پیوند لگا ہے۔ تمھارے یہاں ایک ایک بیش خدمت مجھ سے اچھی ہوگی۔ میں ہوں کس میں۔

بادشاہ : کوئی میرے دل سے پوچھے۔ یہ نرگس غمزہ زن۔ یہ زلف پُر شکن، اہو ہو ہو۔ بلائے جان ہے۔ اب اتنا مان لے کہ۔

شکر بی : بس بس۔ اچھا۔ تو اتنا کہنا اس گھڑی آپ بھی مان لیں آج تو میں سب سامان لیس کر رکھوں۔ کل آپ گیارہ بجے آئیں بس شکر بی اور بادشاہ سلامت گھل گھل کر باتیں کریں گے۔

بادشاہ اور وزیر اور کوتوال اور گرو جی بشاش گئے، کہ پالا مار لیا۔ کل ڈٹیں گے۔ ادھر آٹھ بجے اُدھر گرو جی برآمد ہوئے مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ شکر بی کی سراپے کی جو تعریف کرنے پر آئے تو پُل باندھ دیے۔ شکر بی اپنے دل میں سوچتی تھی کہ یہ گھانس تو نہیں کھا گیا ہے۔ موا۔ یہ توند جیسے نقارہ، یہ سن و سال، یہ صورت، کالا کلوٹا اور میرا عاشق بنا ہے۔ اس موے کو تو ایڑی چوٹی پر سے بھی نہ قربان کردوں۔ واہ رے گرد، تیرا ستیاناس جائے۔ یہ گرھتوں میں آنے کے لائق نہیں رہا۔ رہ جا تیرا منھ نہ جھلسا ہو تو شکر بی نہیں۔ کیا مزے مزے سے میٹھی باتیں بنا رہے ہیں، اور خبر نہیں کہ ان کے بھی بابا آیا ہی چاہتے ہیں۔ اب گرو جی چشمک زنی کرنے لگے۔ شکر بی ٹال ٹال جاتی تھی۔ کبھی شرماتی تھی۔ کبھی مسکراتی تھی کہ واہ رے گرد۔ کیا بڑھ بھس ہے۔ گرو جی بڑے مزے سے پلتھا مارے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے کہ

اتنے میں کسی نے دروازہ کھڑکھڑایا۔ایں! یہ کون آیا۔ارے باپ رے باپ، یہ ہے کون ؟ کوتوال۔اف رے غضب، اب جان بچتی نظر نہیں آتی۔شنکر بی ذرا ہم کو کہیں بچاؤ۔یہ کون ؟ یہ کون ؟ آپ عاشق جو ہوئے ہیں۔ہات ترے گرو کی دُم میں نمدا۔رہ تو دیکھ تیری بوٹی بوٹی نہ چیلوں کو دوں تو شنکر بی نہیں۔ اے ہے اب کیا کروں۔شنکر بی ! شنکر بی! کہاں چلی کہاں۔کہیں دروازہ نہ کھول دینا۔میں تو باتوں ہی تک کا گنہگار تھا۔شنکر بی نے گروجی کی کھوپڑی پر جھلا کر دو تین ٹیپیں زناٹے سے لگائیں۔اور ایک بورے کے نیچے بٹھا کر دروازہ کھولدیا۔

کوتوال : شنکر بی آج شام کو اُس گرو کی خبر لوں گا، اور قید کر دوں گا۔تم میری معشوق ہو، اس موذی کی ایسی تیسی، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور یہ عشق چرایا۔تمھارے لائق تو ہم ہیں پیاری آؤ ادھر بیٹھو۔واہ کیا جمال ہے۔کیا مستانہ چال ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وزیر بھی آن موجود۔دھم دھم، دھم۔دھم دروازہ کھولو اجی شنکر بی دروازہ کھولدو۔کوتوال کے اوسان خطا، کہ غضب ہی ہوا لو وزیر اعظم آگئے۔اب میرا کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔الٰہی خیر! خداوندا بچائیو! ہائے کیا بُرے پھنسے۔دیکھ پائے گا تو رقابت کا خیال گدگدائے گا اور بوٹی بوٹی نوچ کھائے گا۔شنکر بی للّٰہ بچاؤ۔شنکر بی بولی موئے تیرا جنازہ نکلے، یہ تو کوتوالی کرتا ہے۔ میں تو گئی فریاد کرنے آپ مجھی پر ریجھ گئے۔اب جنازہ اٹھاؤ گے۔بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں سے یہ بدنیتی۔کیا شہر شملہ ہے۔چل اس صندوق میں بیٹھ، اور چپ چاپ بیٹھ۔یہ کہہ کر شنکر بی نے دروازہ کھولا تو وزیر برآمد ہوئے۔

وزیر : پیاری قسم لو جو کل رات کو آنکھ بھی جھپکی ہو۔کوتوال مردک کو تو آج ہی موقوف کرتا ہوں، مگر قسم دو کہ آج سے تم ہماری ہو۔میں تو آج ایک ایک ادا پر عاشق ہوں۔اب اِدھر اُدھر ناحق کہاں پھرتی ہو۔آؤ ادھر آؤ!

اتنے میں کسی نے دروازہ کھڑکھڑایا کون، یہ کون نابکار آیا۔چپ جہاں پناہ ہیں۔ارے! ستم ہی بپا ہو گیا۔میں کہاں جاؤں۔شنکر بی بچائے، واسطے خدا کے کہیں چھپا لے۔اُف! اُف! میں اس صندوق میں گھس جاتا ہوں تو بلا سے۔دروازہ کھولا تو جہاں پناہ برآمد ہوئے، شنکر بی چاند میں داغ ہے۔تیرے مکھڑے میں نہیں داغ۔آفتاب میں یہ چمک کہاں۔تو بادشاہوں کے لائق ہے۔ یہ ادا کوئی کہاں سے لائے، یہ بوٹی بوٹی کوئی کیوں کر پھڑکائے، تجھ کو دیکھ کر کہ خدا کی قدرت مجسم نظر آئے۔جل جلالہٗ۔اجی حضور میں آپ کے لائق کہاں۔آپ بادشاہ، ہم غریب آدمی۔ایں!

کسی نے دھم دھمایا کون شخص ہے۔ اس وقت کہاں سے یہ شخص آیا۔ ارے! ہٹو تو ہٹو توجی۔ یہ تو میرا میاں ہے۔ خوب مال لائے ہوں گے۔ اوشکر بی! اوشکر بی! میری عزت اب تیرے ہاتھ ہے کرسی کی آڑ میں ان کو بھی چھپایا۔ دروازہ کھولا تو مخارام دن سے داخل۔

شکر بی : آئیے آئیے میاں آئیے۔ سب خیر و عافیت ؟

مخارام : کئی آنکھ کے اندھے، گانٹھ کے پوڑھے مل گئے۔ اونے پونے بیچا اور دام کھرے کیے۔ اور یہاں تو سب خیریت ہے۔ گرو جی تو اچھے ہیں۔

شکر بی : آگ لگے موئے گرو کو، گاج پڑے اس پر۔ وہ تو کسی اور ہی گھات میں تھے۔ (بورا اٹھاکر) لیجیے درشن کیجیے۔

مخارام : لعنت ہے تجھ پر۔ مردک، ڈوب مر چلو بھر پانی میں۔ تھو تیری اوقات پر (چپت لگاکر) اے پھٹکار (دھول جماکر) اے پھٹکا۔

شکر بی : موذی جوتی خورے۔ شرم نہیں آتی۔ دیکھ پاک دامن عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔

مخارام : تم نے کوتوال سے کیوں نہ فریاد کی۔

شکر بی : بس چپ بھی رہیے وہ موا اس کا بھی چچا نکلا (صندوق کھول کر) یہ آپ کے کوتوال صاحب ہیں۔ یہ اپنے ہی ڈورے ڈالتے تھے۔ یہ کیا حرکت تھی، ٹھڑی ہے۔

مخارام : کیوں بے نالائق۔ جاؤں وزیر سے کہہ دوں ؟

شکر بی : واہ وزیر ان کے بھی گرو گھنٹال ہیں۔ (صندوق کی طرف اشارہ کرکے) یہ وزیر بیٹھے ہیں۔ اے لعنت۔ دیکھ حیا پروری اسے کہتے ہیں۔

مخارام : سلام صاحب سلام۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مر جاکر، تف ہے۔ تم نے جہاں پناہ سے ان سب کی کیوں نہ فریاد کی۔

شکر بی : ہو تھو وہ بھی اسی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ کرسی ہٹاکر یہ مجرا عرض کرو بادشاہ سلامت یہ چھپے ہوئے ہیں۔ واہ حضور۔

مخارام : ارے ستم! بادشاہ وقت اور یہ حال ؟

شکر بی : کیوں جہاں پناہ میں نے انعام کا کام کیا یا نہیں؟ واہ ری شکر بی۔

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

دوسرے روز میاں آزاد نے سانڈنی کی دُم میں نمدا باندھا، اور کرایہ کی گاڑی پر لد کے چلے تماشا دیکھنے۔ کوچبان کوچبان! گھوڑیوں کو کڑکڑا دو۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی غل غپاڑا مچایا۔ کہ کوڑے پھٹکارو، گھوروں کو للکارو، واہ اچھی بگھی ہے، نو دن چلے اڑھائی کوس۔ اے ہجور اب چلتے چلتے چلیں یا کہیں اڑنے لگیں۔ کیا ریل گاڑی مکرر کی ہے۔ بھاڑے کی گاڑی تو یوں ہی جائے گی۔ چاہے اتر پڑیے ابھی سویرا ہے۔ میاں اچھا اچھا باتیں پیچھے بنانا۔ چلو تیز ہائیٹ ہائیٹ، بارے خدا خدا کر کے پہنچے، اور ڈٹ گئے۔ لیلیٰ مجنوں کی داستان شروع ہوئی۔ آج تو پارسیوں نے محفل کو رُلا چھوڑا۔ مجنوں کا بن بن، جنگل جنگل، ٹھوکریں کھانا، جوشِ جنوں میں ہر در و دیوار سے لیلیٰ کو بلانا، دن کو گریہ وزاری، شب کو اختر شماری، چلاّ چلاّ کر رونا، اور اشکِ گلگوں سے ہر دم گلِ رخسار کو دھونا، ایسا ثابت کیا کہ حاضرین جلسہ پھڑک گئے۔ کبھی کسی شجر ارفع سے چمٹ کر پکارا، لیلیٰ لیلیٰ! کبھی لب جوئبار، اشجار و سبزہ زار، کا عکس دیکھ کر غل مچایا۔ لیلیٰ لیلیٰ! پاؤں میں کانٹے چبھے، مگر اُف تک نہ کیا۔ بدن گلا جاتا تھا لیکن زبان پر لفظ فریاد نہیں آتا تھا۔ یوں نام کو مجنوں بن جانا تو سب ہی جانتے ہیں، مگر وہی ادا، وہی بے قراری، وہی عشقِ صادق، ظاہر کرنا کارے وارد۔ ادھر لیلیٰ بھی تڑپ رہی تھی۔ آخر کار جذبِ دل نے رنگِ اثر دکھایا، اور عاشق و معشوق کو باہم ملایا۔ اس وقت لیلیٰ نے وہ ستم ڈھایا، کہ الاماں! اتنے میں مجنوں نے آنکھ کھولی، معشوق پری پیکر کو ہمکنار پایا۔ دیکھتے ہی دم توڑا۔ اور لیلیٰ بھی ساتھ ہی چھری بھونک کر چل بسی۔

اس مقام پر حاضرین جلسہ کا دل بھر آیا، اور بعض رقیق القلب آدمی ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ محفل سکتے کی حالت میں تھی۔ بس شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ جسے دیکھو مارے رنج کے بات نہیں چھوٹتی۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔

الغرض پارسیوں نے اس درجہ رقت اور عبرت ظاہر کی کہ جلسے کو ایک قسم کی مجلس کر دکھایا، اور حاضرین کو زار زار رلایا۔ سب کی گردن ہل رہی تھی، کہ اہو ہو ہو، اور باہم یہی گفتگو چپکے چپکے ہوتی تھی کہ آج تو غضب ڈھایا۔ اتنے دن سے تماشا دکھایا! مگر یہ حسرت کبھی نہ ہوئی تھی جو اس وقت ہوئی واہ واہ واہ۔ خصوصاً لیلیٰ کا مجنوں کی لاش پر رونا، اور بصد حرماں کہنا، کہ ہائے ہائے دل کی دل ہی میں رہی۔ مراد ایک نہ بر آئی۔ داغ جدائی نصیب ہوئی۔ صدمۂ ہجر سہا۔ اے وائے بخت۔ میاں آزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے تھے، اور ارد گرد کے حُضّارِ جلسہ رومال سے اپنے اپنے اشک پونچھتے تھے، اور بعض تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیتے تھے۔ اس درجہ محو ہو گئے کہ دو تین بد تمیز

آدمیوں کے عین اس وقت، جبکہ لیلیٰ نہایت حسرت میں ہجر کے صدموں کو رو رہی تھی، ہنس دینے پر محفل بھر قہر کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ جب پہلا تماشا ختم ہوا تو چوطرفہ سے واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ بارک اللہ جل جلالہ اہو ہو ہو، کا غلغلہ بلند تھا۔

میاں آزاد مٹر گشتی کے عادی، ڈھائی گھنٹے جم کر بیٹھنا پڑا تو گھبرا اٹھے۔ سوچے کہ چلو محفل بھر میں گھوم آئیں، دیکھیں تو لوگوں کی کیا رائے ہے۔ اب سنیئے کہ بیلنس منٹ درجہ دوم میں ادھر بیٹھے۔ ۵ امنٹ ادھر ڈٹے۔ پھر پھدک کر درجۂ سوم میں ہو رہے۔ وہاں چہ میگوئیاں کیں، اور چوتھے درجے میں کھٹ سے موجود۔ کئی آدمیوں کا مکالمہ سنا۔

ایک : یاران کے پاس ساماں تو خوب لیس ہے۔

دوسرا : واہ کیا کہنا، زرق برق پوشاکیں، اور لطف یہ کہ سب سچی، جھک جھک کر رہی ہیں اور پردے تو ایسے دیکھے نہ سنے۔ پس یہی یقین ہوتا ہے کہ بارہ دری کا پھاٹک ہے، یا پری خانہ ہے۔ جنگل کا ساماں دکھایا تو وہی بیل بوٹے، وہی دوب، وہی پیڑ وہی جھاڑیاں، وہی باڑیاں، وہی کہسار، وہی لالہ زار، بس بالکل سندر بن معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا : اور سبز پری کی تعریف ہی نہ کی۔

چوتھا : کون! حضرت واللہ ہے، جو وہ کہیں لکھنؤ میں چھ مہینے بھی تعلیم پائے تو پھر آفت ہی ڈھائے۔ یہ نورانی گلا، یہ ٹیپ دار آواز، یہ سن وسال، یہ حسن وجمال، واللہ لاکھوں لوٹ لے جائے۔ لاکھوں ہر رئیس کے یہاں سے بلوا آئے، اور جہاں جائے، کھنا کھن اشرفیاں پائے، اور جو مشاطہ سنوارے تو پھر دیکھیے، جوبن دونا ہو جائے۔

تیسرا : (پھر) جی ہاں کیا خوب بات کہی ہے۔ جو کہیں دو مہینے بھی یہاں تک جائیں تو پھر واللہ کلیوں دار پائجامہ نہ پہنا دیا ہو تو لکھنؤ نہیں۔ اصلیں پائنچے اٹھاتے جاتی ہوں، اور سبز پری جھوم جھوم کر آتی ہوں، اور حاضرین جلسہ پکار رہے ہوں، کہ خدا گھر کو بچائے۔ کہیں کلائی سیں موچ نہ آجائے۔ بھئی لکھنؤ پھر لکھنؤ ہے۔ ہاتھی لٹے گا تو پھر کہاں تک۔

دوسرا : (پھر) بھئی ان کے ساتھ میں وہ سپنے بڑا جید مسخرہ ہے۔ بس پورا بھانڈ ہے میاں۔

ایک طرف تو یہ باتیں ہوتی تھیں، اب درجۂ سوم میں جو گئے تو دو تین چانڈو باز شمسو اور میاں چمرو اور قنبر بیٹھے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

چمرو : اجی دھوپا ہی دھوپا ہے۔ کچھ ہیں نہیں۔

شمسو : ہاں ٹن ٹن کی آواز تو آتی ہے۔ باقی خیر صلاح۔

قنبر : اجی تم دونوں تو چانڈو کی پینک میں اونگ رہے تھے، نہ نقل دیکھی نہ کچھ، اور لگے گالیاں دینے۔ بھلا قسم تو کھاؤ کہ لیلیٰ مجنوں کا سارا قصّہ دیکھا۔ آنکھیں تو آپ کی بند تھیں، آپ کو سوجھا کیا خاک۔ تم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔ مزے تو ہم لوٹتے تھے۔ اس وقت اِس سرے سے اس سرے تک کہرام مچا تھا۔ سب کے سب ڈھاریں مار مار کر رو رہے تھے۔ آپ نے گھنٹا بھر کے بعد آنکھ کھولی تو بڑا اٹھے کہ دھوپا ہی دھوپا ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو تو۔

شمسو : کیا یار کی اندر سبھا سے بڑھ کر ہے۔

چمرو : اجی واہ۔ اندر سبھا کی ایسی تیسی، وہ لوگ کیا جانیں۔ یہ چمکتی دمکتی پوشاکیں، یہ روشنی، یہ حسن و جوانی، یہ سبز پری، کی غزل خوانی، ان کو نصیب کہاں۔ آپ بھی گزی اور شربتی کو ملاتے ہیں۔

قنبر : ہاں۔ اور نہیں تو کیا۔ اجی یہ سیکڑوں نقلیں کرتے ہیں۔ ایک اندر سبھا کیسی۔ لیلیٰ مجنوں کا قصّہ چھیل بٹاؤ اور موہنا رانی کی داستان، سات پریوں کا تماشا، گل بکاؤلی، شکر بی کی چٹک مٹک، میاں فضیحت کا مسخرہ پن، صدہا تماشے یاد ہیں، اور سب چوٹی کے۔ یہاں سے پھدک کر میاں آزاد درجۂ اول میں آئے۔

رئیس : ان لوگوں کو کمال حاصل ہے۔

مصاحب: ہاں پیرِ و مرشد یہ دیکھیے بڑے بلا کے نقّال ہیں۔

رئیس : بلا کے۔ اجی یوں کہو کہ نور کی طبیعت پائی ہے۔

مصاحب: بجا ہے خداوند! یہ دیکھیے گلے کتنے نورانی ہیں اور مانگ پر تو حضور یہ دیکھیے وہ جوبن ہے کہ واہ جی واہ۔ حضور یہ دیکھیے! محفل بھر اُسی کو گھورا کرتی ہے۔

خان صاحب: ہاں واللہ سچ کہیے گا کتنی پیاری ادائیں ہیں۔

رئیس: دو ایک کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔

مصاحب : ہاں خداوند۔ یہ دیکھیے بہت اچھی ہے، روشنی بہت ہی اچھی۔

رئیس: روشنی تو ہے ہی۔ میں آواز کو کہتا ہوں۔

مصاحب : بجا ہے حضور والا۔ آوازیں بھی نورانی ہیں۔ کوئی کیا گائے گا۔ اور گائے گا بھی تو یہ گلا کہاں سے لائے گا۔ یہ خداداد بات ہے۔ حضور کی قدر دانی پر اُن لوگوں کو بڑا بھروسہ ہے۔ حضور نے بڑی جوہر شناسی کی۔ یہ دیکھیے سب مداح ہیں۔

صاحب بہادر : دل لیلیٰ اچھا ہی تھی۔ پسند کیا۔
میم صاحب : او ویس بہت پسنڈ۔ کھوب پڑا اور بات کو سمجھاتا۔ اچھا۔ لیلیٰ کی شکل بھی گوری ہے۔

استنے میں بہادر شاہ ظفرؔ[1] کا حال شروع ہوا۔ واہ واہ واہ۔ یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اس میں اور ہی لطف ہے بھئی۔ ہائے دہلی کی تباہی کو اس طرح بیان کیا کہ لوگ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ جلسہ برخواست ہوا۔

تھانہ دار

ادھر دھوم دھڑکے سے خاتون شب کی سواری آئی۔ اور چراغوں نے پروانۂ تقرری کی خوشخبری پائی۔ اُدھر قبلہ کے رُخ سے جھومتی ہوئی گھنیری گھٹا چھائی۔ موریلوں کی سریلی آواز۔ اور پپیہوں کی پکار نے گھٹا کی کیفیت بڑھائی۔ استنے میں بجلی تڑپی، اور بادل گرجنے لگے ارے واہ کیا بے وقت کی شہنائی ہے۔ غضب ہی ہوگیا۔ اب تماشا و ماشا خیر صلاح ہے۔ یہ لیجیے وہ ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں میاں آزاد جھنجلا کر کہنے لگے :

کیا برستا ہے یوں برس کمبخت — کوہ سے لیکے ڈوب جائیں درخت

بارے ایک دفعہ ہی ہوا نے وہ زور باندھا کہ بادلوں کو اوپر ہی اوپر اڑا لے گئی۔ مطلع صاف۔ اہو ہو ہو اب تو لیلئ شب پر بلا کا نکھار ہے۔ غضب کا سنگار ہے :

مہتاب شبے چو وصل معمور — برروز کشیدہ پردۂ نور
در راہبری چو دور بیناں — در پردہ دری چو مہ جبیناں
ابروے افق گرہ کشادہ — اُفلاک صلائے نور دادہ
از خوشی طرب زمانہ سیراب — پالغز نظر زمین ز مہتاب

اللہ اللہ! رات کیا لیلۃ البرات ہے۔ بلکہ وہ بھی مات ہے۔ چاندنی سینۂ عارفاں حق پرست کی طرح صاف پرتو ماہ از قاف تا قاف، پردہ دار عاشقاں ہے۔ مضمون الآ زینا السماء بزینۃ الکواکب ہر در و دیوار

---

[1] بہادر شاہ ظفرؔ۔ خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ جن کو ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت نے اقتدار سے محروم کر دیا اور گرفتار کر کے رنگون (برما) میں نظر قید کر دیا جہاں ـــــ ۱۸ میں ان کا انتقال ہوا۔

سے عیاں ہے۔ شبِ معشوقِ سیہ پردہ ہے، تو چاند محبوب چاردہ سالہ۔ ہمارے صوفی صافی طینت، ریاضِ جنون کے زیب و زینت، میاں آزاد، بی بھٹیاری کے ساتھ اِکے پر سوار ہو کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے خوش گپیاں اڑاتے چلے۔ راہ میں ایک فقیر نے پیچھا کیا۔ جوڑی سلامت! میاں بیوی کی جوڑی سلامت، ان گورے گورے ہاتھوں سے ایک پیسہ دلوایئے سائیں کو۔

چانڈو باز: ہائیں میاں بیوی نہیں۔ بہن بھائی ہیں۔

فقیر: بھائی بہن کی جوڑی برقرار، ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔

میاں آزاد بہت ہی جھینپے۔ بی بھٹیاری خوب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اب تو ہمارے میاں ہوئے اور میاں سے بھائی جان۔ اب مکرنے کی سند نہیں۔ بولو دونوں میں کون پسند ہے۔ میاں آزاد اور بھی شرمائے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھئی آج سے تمہارے ساتھ آئے تو تمہارا ہی بھائی۔ خیر قہقہے لگاتے، اور اسّا اڑاتے، دن سے داخل۔ محفل پر آج ستم کا جوبن ہے۔ کہیں لولیانِ گل عذار، کہیں پری رخانِ شوخ و عیار، کھچا کھچ آدمی بھرے ہیں۔ اور شہر بھر ٹوٹ پڑا ہے اتنے میں نقل شروع ہوئی۔

ایک سیٹھ جی دستارِ گلنار سر پر جمائے، دھوتی کی لانگ لٹکائے، مچھندر کی صورت بنائے، دانتوں میں مسی لگائے، مٹکتے ہوئے آئے، اور ساتھ ساتھ ان کی نکیلی رنگیلی، البیلی چھیل چھبیلی، بیوی عجب ناز و دلربائی سے آئیں۔ وہ پھبن، وہ بانکپن، وہ نکھار، وہ سنگار، کہ زاہدِ صد سالہ بھی دیکھے تو کلیجے پر چوٹ کھائے۔ ہزار جان سے عاشق ہو جائے:

بھبھوکا روپ سج دھج قہر آفت چلبلاہٹ ہے
جھمکڑا نور کا مکھڑا غضب اس کی سجاوٹ ہے
خیر پیجیو یہ کس کے پاؤں کی اٹھکھیل آہٹ ہے
کہ ہر ٹھوکر پہ جس کی دل میں اٹھتی گدگداہٹ ہے
چکاچوندی نہ لگ جاوے بھلا کس طرح آنکھوں کو
بسانِ برق بیتابانہ اس کی اچپلاہٹ ہے

بہارِ باغِ رعنائی، افشاں جبیں دلربائی، تیز و گرم خیز، شکستہ دلوں کے لیے مومیائی، پیاری مائی۔

میاں: پیاری اس وقت تو رنگ فق، اور کلیجہ شق ہو گیا۔ اب جان پر بن آئی ہے۔ ملک الموت کی دہائی ہے۔ ہائے میرا یہ سن و سال، اور موت کا خیال۔ کیا بُرا دھڑکا ہے۔ کس مزے سے کٹتی تھی۔

بیوی : (روتی ہوئی) اجی کچھ کہو تو یہ ماجرا کیا ہے؟ خاصے جیتے جاگتے ہٹے کٹے، بنے کھڑے ہو۔ مرنا کیسا، ہوا کیا، ہائے میرا کلیجہ تو پھٹ گیا۔

میاں : جس سوداگر کا میں کمبخت نوکر ہوں، اس کی بیگم نے بلا کر کہا کہ وہ چل بسے۔ اور کہہ گئے ہیں کہ سیٹھ کو میرے پاس بھیج دینا۔ سو اب میں جاتا ہوں۔ رخصت۔ ہائے تیری محبت کا پانی پیٹ میں چلبلا رہا ہے۔ آؤ پیار کر لیں۔ یہ آخری پیار ہے۔ اب وہاں ملیں گے۔

بیوی : ارے میں تو کہیں کی نہ رہی۔ ہائے اس وقت آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ کس کو سونپے جاتے ہو (گلے چمٹ کر) اب گلے کس کو لگاؤں گی۔ ہائے میرا سوہاگ سوگ سے بدل گیا۔ رنڈاپا دیکھنا قسمت میں بدا تھا۔ جتنی ہنسی نہ تھی اتنی اب روؤں گی۔

میاں : آؤ پھر گلے مل جائیں، ارے اب پیار کون کرے گا؟ یہ آخری ملاقات، پیاری آخری ملاقات ہے۔ تمہارا پیارا اب تم سے جدا ہوتا ہے۔ کہا سنا معاف کرنا۔ یہ دم واپسیں ہے۔ خوب نظر بھر کر دیکھ لو۔ بس پھر وہاں دیکھنا نصیب ہوگا۔

بیوی نے دھاروں دھار رونا شروع کیا۔ ہچکیاں آنے لگیں سر پر خاک اڑائی۔ چوڑیاں چٹ چٹ توڑ ڈالیں۔ لوگو دیکھو رانڈ بیوہ کی صورت دیکھو۔ ہائے جیتے جی مرمٹی ہے ہے مجھی کو موت آئی ہوتی۔ ہائے میں بے حیا نہ مری۔ نہ مری۔ اب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مروں گی۔

میاں : واہ واہ۔ تو جب میں مروں گا تب رو لینا، ابھی تو سامنے کھڑا ہوں، اور تو کہتی ہے کہ میں رانڈ ہو گئی۔ میں سنڈا بنا ہوا ہوں تو رانڈ کیوں کر ہو گئی۔

یہ نقل اتنی ہو چکی تھی کہ میاں آزاد کو ایک سپاہی نے بلایا اور کہا چلیے تھانہ دار صاحب نے بلایا ہے۔

میاں آزاد مزے سے بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سیٹھ جی دستارِ گلنار اور زوجہ شوخ و ستمگار سیٹھانی کی جوانی، اور خوش بیانی، چلبلا پن، اور بھبن، دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ کہ دفعتاً عین کریال میں غل لگا۔ سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ برقنداز نے آن کر کہا کہ آپ کو تھانہ دار صاحب نے اس وقت بلایا ہے۔ چلیے ذرا جلدی اٹھیے۔

آزاد : کون تھانہ دار؟ ہم سے تھانہ دار سے واسطہ۔ کوئی وجہ بھی ہے، یا یوں ہی بلایا ہے۔ چلو چلو ایسے بہت بلایا کرتے ہیں۔ ہمیں بھی کوئی ایسا ویسا مقرر کیا ہے۔ کیا دل لگی ہے۔ جاؤ بلا لاؤ۔ ان سے کہیے کہ آپ کو خود میاں آزاد نے یاد کیا ہے ابھی حاضر ہو۔

بھٹیاری: ہوں ہوں رے بس بیٹھے رہو۔ بہت اجڈ پنا بھی نہیں اچھا ہوتا۔ واہ کہنے لگے ہم نہ جائیں گے سبب وجہ مفت میں بیٹھے بٹھائے لڑنا جھگڑنا۔ بڑے وہ بنتے ہیں۔ اور نہیں تو کیا۔ آخر تش سانڈنی کی رپٹ لکھوائی ہے کہ نہیں۔ پھر اب دوڑ دھوپ وگے نہیں تو بنے گی کیوں کر، اور وہاں تک جاتے کیا چوڑیاں ٹوٹتی ہیں، یا پاؤں کی منہدی گھس جائے گی۔ میں تو مرد ہوتی تو اب تک سانڈنی کی کھوج لگالی ہوتی۔ ان سے ذری تھانہ تک نہیں جایا جاتا۔ واہ یہ دھماچوکڑی تو روز ہی مچی رہتی ہے۔ کل آکے دیکھ لینا کیا تاؤ مارا جاتا ہے۔

آزاد: بھلا تماشا چھوڑ دوں۔ یہ پری چہرہ نازنین، یہ گلفام مہ جبیں، پھر کہاں سے نظر آئے گی۔

بھٹیاری: اے میاں اَدھی کے روغن میں تو وہ روپ نکل آتا ہے کہ آدمی سجدہ کرنے لگے۔ اچھا ہم تم کو سرای میں یہ رنگ و روغن نہ دکھادیں تو آدمی نہیں۔

آزاد: اچھا چلو چلیں مگر چلو تم بھی ساتھ چلو۔ راستے میں دو گھڑی دل لگی ہی ہو گی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ تھانہ دار سے اور ہم سے تو لاگ ڈانٹ ہے۔ اس دن چخ چل گئی تھی نہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوتوال کے چبوترے پر بیٹھ کر فرعون بے ساماں بن جائیں، اور ایک آدھ ادھی سنائیں، تو پھر میں رے ہی پڑوں گا۔ اتنا سمجھ لینا۔ میں آدھی بات سننے کا روادار نہیں۔ سانڈنی ملے یا جہنم میں جائے، اس کی پروا نہیں، مگر کوئی اینڈا بینڈا فقرہ سنایا، اور میں نے کرسی کے نیچے پٹخا۔ میں آدمی مراقی ہوں۔ اور پھر کیوں سنتے لگا، سبب کیا۔ چور نہیں کہ کوتوال سے ڈروں۔ جواری نہیں کہ پیارے کی صورت دیکھ کر جان نکلے۔ دوڑ کا خوف ہو، بدمعاش نہیں کہ منھ چھپاؤں۔ مریل نہیں کہ دو باتیں سہہ جاؤں۔ کوئی بولا اور ادھر بندے نے خنجر تولا۔ یا ہم نہیں یا وہ نہیں۔

بھٹیاری: تم کو تو خفخان (خفقان) ہے۔ میں دیوانی تو ہوں نہیں، وہ بے چارہ تو ایک ہنس مکھ آدمی ہے۔ رنگیلا جوان، لڑائی کیوں ہونے لگی۔

کانسٹیبل: چلیے یا نہ چلیے مگر ہمیں تو دیر ہوتی ہے۔ چلیے تو اچھا نہ چلیے تو کہہ دوں کہ وہ اس وقت نہ آویں گے، رہا ہم تو جاتے ہیں چلے ہی چلیے، دُو دُو باتیں کیجیے گا اور پھر ہیں آجائیے گا۔

آزاد: ارے ہاں ہاں تم تو تھانہ دار کے مزاج سے واقف ہو گے، بھلا گالی تو نہیں دے بیٹھتے ہیں۔

کانسٹیبل: (دانت کے تلے انگلی دبا کر) ناہی گالی دینا کوئی کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ آپ نشان کھاطر رہیں (نشان خاطر)۔

الغرض اس قیل وقال کے بعد میاں آزاد اور بی بھٹیاری اور کانسٹبل تھانہ پر چلے۔ راہ میں ایک آدمی اکڑتا ہوا جاتا تھا۔ میاں آزاد مست آدمی اس کا اینڈنا دیکھ کر آگ ہو گئے۔ قریب جا کر ایک دھکا جو دیتے ہیں تو کوئی پچاس لڑھکنیاں کھائیں، اور بازار بھر نے تالیاں بجائیں۔ بی بھٹیاری نے حضرت کے ڈنڈ مل دیے اور تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک شخص چادر بچھائے، جڑی بوٹی اس پر پھیلائے، بیٹھا گپ اڑا رہا تھا کہ اس بوٹی سے اسّی برس کا بڈھا جوان ہو جائے، اس جڑی کے استعمال سے بال سفید نہ ہونے پائیں، یہ چونتیس دن نہار منہ ایک ایک تولہ پیے تو بواسیر عمر بھر نہ ستائے، میاں آزاد اس کی طرف جھک پڑے کہو بھئی کھلاڑی یہ کیا کر کری خانہ پھیلا کر بیٹھے ہو؟ آج صبح سے کتنے گو کھے پھانسے؟ کتنے عقل کے اندھے، گانٹھ کے بوڑھوں کو چپّا دیا؟ کس کس کو مونڈا واللہ سوجھی خوب۔ بہت سے بے وقوف اُلو بنے ہوں گے۔ کہو سلاجیت بھی ہے۔ ہا ہا ہا۔ وہ ایک کائیاں تاڑ گیا کہ یہ بڑے حضرت ہیں۔ کان میں چپکے سے کہا کہ استاد جانتے تو ہو پھر یہ سب کے سامنے ہماری ہجو کرنا کیسا یہاں:

روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

میاں آزاد نے آہستہ سے ان کی کھوپڑی سہلا دی، اور چل کھڑے ہوئے، تو ایک تیلی جا رہا تھا۔ پوچھا کیوں میاں تیلی کتنا دن ہو گا؟ تیلی جو پیچھے پھر کے دیکھتا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ چپکا چل دیا۔ یہ دس قدم آگے بڑھے تھے کہ غل غپاڑے کی آواز آئی۔ ایک حلوائی گاہک سے تکرار کر رہا تھا۔

حلوائی: کھالی بھجیا ناہیں بکت ہے۔ ہمری دکان پر کس کس دے دینی بھلا؟

گاہک: ابے میں کہتا ہوں کہیں ایک گدّا نہ دوں۔

آزاد: گدّا تو پیچھے دیجیے گا، میں ایک گدّا آپ کی گدّی پر نہ جماؤں کہیں۔

گاہک: آپ کون ہیں، کہیں بیدھا تو نہیں ہوا ہے؟

آزاد: ان ہاتھ پاؤں پر یہ طیش۔ بھلا اس بے چارے کو جو تم للکارتے ہو تو اس کی وجہ۔

بھٹیاری: اے ہے، تو مردوے تو کوئی خدائی فوجدار ہے۔ اوئی کسی کے پھٹے میں تم کون پاؤں ڈالنے والے۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ اس کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی، مُل اس نے نہ مانا نہ مانا۔

آزاد: وہ تو کہو چل دیا نہیں میں گھس پٹی بتاتا۔

کانسٹبل: بھیّا یو بڑے لڑاکا۔ بس کا وکہی۔ جہاں دیکھو اڑ پڑت ہیں۔

یہاں سے چلے تو بی بھٹیاری نے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور کہا جو اب کسی سے تم بھڑے تو خون خچر کر ڈالوں گی۔ تھوڑی دیر میں تھانہ پر پہنچے۔

کانسٹبل : لے آیا وہ کھڑے ہیں ؟

تھانہ دار : اور یہ زنانہ ساتھ کیسا۔ اخاہ بی اللہ رکھی ہے۔ میں تو اس چلبلی مست چال ہی سے سمجھ گیا تھا کہ بی چکو ہیں۔ آؤ نہ۔ کوئی ہے ؟ کچھ بیٹھنے کو دو انھیں۔ سچ کہنا تمھاری چال سے کیسا پہچان گیا۔

آزاد : واہ بھئی واہ، واللہ دور کی کوڑی لائے، اور اپنے اپنوں کو سب ہی پہچان لیتے ہیں۔

تھانہ دار : یہ کون بولا ؟ ہادی حسن۔ کون ہے بھئی

بی بھٹیاری نے دیکھا کہ اب بات بڑھے گی۔ اور مفت میں ٹھائیں ٹھائیں ہو گی۔ آزاد مست آدمی۔ تھانہ دار کو حکومت کا غرّہ۔ یہ ایک کہیں گے تو میاں آزاد دس سنائیں گے عورت تھی چالاک سہ

ع بگڑی ہوئی بات یوں بنائی

چمک کر تھانہ دار کی طرف چلی۔

بھٹیاری : اے بس چلو دیکھ لیا۔ منھ دیکھے کی محبت ہے۔ یہ گھر کی تھانہ داری، اور تین دن سے موئی سانڈنی نہ ملی۔ تم سے تو بڑی بڑی امیدیں تھیں (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) آؤ مولانا صاحب آؤ، ادھر آن کر بیٹھیے (تھانہ دار کی طرف مخاطب ہو کر) اے ذری ہٹو جگہ دو۔ آخر بیٹھیں کہاں زمین پر۔

میاں آزاد نے مونڈھا اپنی طرف گھسیٹا اور ٹک گئے۔

تھانہ دار : کہو جی وہ سانڈنی تمھاری ہے نہ۔

آزاد : تم کی تقریر کا ایں جانب جواب نہیں دیا کرتے۔ آپ کہیے، میں کوئی چرکٹا نہیں ہوں۔

تھانہ دار : کیا ؟

بھٹیاری : (سر پیٹ کر) ہائے میرے اللہ! میں کیا کروں، یہ تو جہاں جاتے ہیں دنگا مچاتے ہیں۔ مجھ اجڑی ہوئی کو ان کے لچھن کیا معلوم تھے بھلا۔

تھانہ دار : کیا کچھ ان سے تعلق ہے ؟ سچ کہنا۔ تمھیں قسم ہے اپنے شیخ سدّو کی۔

بھٹیاری : لو تمھیں معلوم ہی نہیں۔ اے واہ اچھی تھانہ داری کرتے ہو، میں تو ان کے گھر بر گئی ہوں نہ۔

تھانہ دار : لانا ہاتھ۔

آزاد : بس الگ، کسی کی بیوی سے ہاتھ ملانا کیا دل لگی ہے۔ ذرا سنبھل بیٹھیے گا ہٹ کر۔

تھانہ دار : حضرت آپ کو بیوی مبارک ہوں۔ لے مجھے اس رشتے کا حال کیا معلوم تھا۔ بھلا

یہ عقدہ تو اب کھلا کہ عقد ہوگیا ہے۔ مبارک مبارک! چین کیجیے۔ آج ہماری بائیں آنکھ پھڑکی تھی۔

میاں آزاد سمجھ گئے کہ یہ بڑے ضعیف الاعتقاد ہیں۔ بولے حق۔ حق۔ حق۔ حق۔ اللہ باقی والکل فانی۔

اس کو جو میاں آزاد نے لہرا لہرا کر، بہ آواز بلند پڑھا، اور قرأت کے ساتھ ادا کیا تو تھانہ دار کے ہوش اڑ گئے، پڑھے لکھے بھی واجبی ہی واجبی تھے۔ لگے تھر تھرانے۔

تھانہ دار: (ہاتھ جوڑ کر) یا شاہ اجنہ۔ اگر کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو تو، وہ تو تو تو ہی کرتے رہے، میاں آزاد نے کڑک کر کہا کہ السعید من وا‌عظ بغیرہٖ[1]۔

تھانہ دار صاحب نے کانپتے کانپتے کہا کہ جو حکم! بی بھٹیاری بولیں کہ سانڈنی کانجی ہوس سے منگوا دو۔ تھانہ دار نے فوراً حکم دیا کہ ابھی سانڈنی لاؤ۔

کھٹ سے سانڈنی آن موجود ہوئی۔ میاں آزاد سوار ہوئے! اور پیچھے بی بھٹیاری مزے سے بیٹھیں۔

بھٹیاری: میاں تمھارا بایاں قدم رے۔ اخوہ۔ تم تو آدمی کیا بلا ہو۔ ہم تو مان گئے۔ ایمان کی قسم آج سے مان گئے۔ وہ ڈانٹ بتائی کہ تھانہ بھر تھرّا اٹھا۔

آزاد: (کڑک کر) الصدقہ صندوق العمل۔ الدّال علی الخیر کفاعلہٖ[2]۔

بھٹیاری: ذرا سنبھلے ہوئے، کہیں سانڈنی پر سے ڈھکیل نہ دوں، مجھے بھی کوئی ڈرپوک سمجھے ہو۔ مجھ سے ذری یہ شیخی بگھی نہ بگھیے گا۔ یہ نخرے کسی اور ہی سے بگھاریے۔

آزاد: ہائیں تم ہم سے نہیں ڈرتا؟

بھٹیاری: یادحشت۔

آزاد: ہم شاہ اجنہ ہیں۔

بھٹیاری: ہم تمھارا ابھی کان کاٹے گا۔

دونوں نے مل کر خوب قہقہے لگائے۔

آزاد: اے آج تو تم دس آدمیوں کے سامنے ہمیں اپنا میاں بنا چکی ہو۔ مکر نہ جانا۔

بھٹیاری: پھر تمھاری قسمت۔ ایسی قبول صورت بستی بھر میں کوئی دکھلا دو بھلا۔ مگر ہمیں غرض

ع[1] نیک بخت وہ ہے جو دوسروں کی نصیحت قبول کرے۔

ع[2] بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔

کیا۔ ہمارے یہاں آپ موجود ہیں جی۔

اتنے سرا پہنچ گئے۔ روز تو میاں آزاد سویرے منھ اندھیرے تور کے تڑکے کجر دم، بلکہ پچھلے سے اٹھتے تھے، آج کچھ ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ بی بھٹیاری پٹے سے صبح صبح اٹھنے کی عادی، مگر نو بج گئے، دس کا عمل ہے ابھی خرّاٹے ہی رہی ہیں۔ دونوں خواب خرگوش میں ہیں۔ دونوں کی چارپائیوں پر دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ خُر خُر خُر، خرار، خٹ خٹ، اے واہ، یہ وزن ہی نرالا ہے۔ اچھی خٹ خٹ اور خُر خُر نکالی ہے کیوں نہیں۔ سانڈنی پاتی ہے یا باتیں۔

بی بھٹیاری کھلی جاتی ہیں کہ میاں آزاد ہم پر فریفتہ ہو گئے۔ اب نکاح ہوا ہی چاہتا ہے۔ جب سے یہ خبط ہوا تب سے وہ بھی نخرے بگھارنے لگیں۔ جاگی تو ہیں، مگر مکر کیے پڑی ہیں۔ مٹکتی تک نہیں۔

اتنے میں میاں چانڈو باز آئے۔ آتے ہی پکارا میاں آزاد! میاں آزاد! بی بھٹیاری! بی بھٹیاری! صدائے برنخاست۔ یہ آج ہے کیا میاں۔ خدا ہی خیر کرے۔ افوہ بھلا کچھ ٹھکانا ہے دس کا عمل اور ابھی تک کھٹیا ہی پر پڑے ہیں۔ کل شب کو تماشا بھی نہ تھا۔ پھر یہ کیا کیا کیے؟ درخت کی طرف نظر پڑی تو سانڈنی بندھی ہوئی۔ اہو ہو ہو، یہ بی سانڈنی آگئیں۔ شکر ہے۔ جب ہی خوش خوش سو رہے ہیں۔ ارے بھئی آزاد ہوت! ارے میاں آزاد! ارے میاں کیا سانپ سونگھ گیا؟ یہ ماجرا کیا ہے۔ (ہاتھ ہلا کر) اٹھیے اٹھیے! آخر کب تک تخفتن کا صیغہ گردانیے گا۔ ہاں اللہ کہہ کر اٹھ تو بیٹھ، شاباش ہے میرے شیر۔

آزاد: (آزاد انگڑائی لے کر) اوں، اوودں، اوودں، اف کیا صبح ہوئی ہے۔

چانڈو باز: صبح گئی کھیلنے۔ آنکھ تو کھولو تڑکے کا باپ ہے، یا صبح ہے۔ اب کوئی دم کے دم میں بارہ کی توپ دغا چاہتی ہے۔ دن سے۔ دیکھنا آج دن بھر سستی نہ رہے تو کہنا۔ وہ تو جہاں ذرا دیر کر کے انسان اٹھا اور بس ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے۔ اب ایک کام کرو سر سے نہا ڈالو۔

آزاد: کیا بک بک لگائی ہے۔ سونے نہیں دیتا۔

چانڈو باز: اچھا ابھی سونے سے پیٹ نہیں بھرا آپ کا۔ تو یہ کہیے کوئی برس دو برس سوئیے گا۔ ایسی نیند بھی کیا، نیند نہ ہوئی روگ ہوا۔

بی بھٹیاری چپکے چپکے سب سن رہی ہیں۔ مگر اٹھتی نہیں۔ اتنے میں میاں چانڈو باز نے ان کی طرف بھی نظر عنایت سے دیکھا۔ اور غڑاپ سے چار پائی کی پٹی پر جا بیٹھے۔ اے اٹھ اللہ کی بندی۔ ایسا سونا بھی کیا۔ بکھرے ہوئے بال، جو زمین پر لٹک رہے تھے۔ ان کو اٹھا کر حضرت نے چار پائی پر رکھا۔ ہاتھ سونگھا تو وہ بوئے خوش کہ دماغ معتبر ہو گیا، ادھر میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ اور جاگے تو پہلے ہی سے تھے۔

چانڈو باز: (گدگدا کر) اٹھو میری جان کی قسم وہ ہنسی آئی۔ وہ مسکرائی۔

آزاد: او گستاخ یہ کیا حرکت تھی؟ الگ ہٹ کر بیٹھ۔ ہمارے سامنے اور یہ بے ادبی۔

چانڈو باز: اوہو، اوہو، بڑے وارث علی خان بن بیٹھے۔ بھائی آخر تم کو بھی تو جگایا تھا۔ اب ان کو جگانا شروع کیا تو تنکتے کیوں ہو بھلا۔ ہم تو سیدھے سادھے بھولے بھالے صاف طینت آدمی ہیں۔

آزاد: اس صفائی پر شیطان کی پھٹکار۔ ہمیں تو شانہ پکڑ کر جگایا، یہ معلوم ہوا کہ چار پائی کو جوڑی چڑھی۔ یا بھونچال آگیا، اور انھیں گدگدا کر جگاتے ہیں۔ کیوں بچہ؟

یہ سن کر بی بھٹیاری جاگی تو تھی ہی، کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اے ہٹ مردوے۔ یہ پلنگ پر آن کر بیٹھ جانا کیا معنی؟ مجھے بھی کوئی وہ مقرر کیا ہے۔ چانڈو باز نے طیش کھا کر کہا: واہ وا۔ پلنگ! پلنگ کی اچھی کہی۔ رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا۔ کبھی باوا راج میں پلنگ دیکھا تھا؟ کہنے لگیں پلنگ۔ اے تیری قدرت۔ میاں مجھ سے یہ جلی کٹی باتیں نہ کیجیے گا ذری، وہ ہم جھونپڑوں ہی میں رہتے سہی اور پھر اب تو ہم ایک بھلے مانس کے گھر پڑنے والے ہیں۔ کیوں میاں آزاد؟ ہے نہ یہ بات دیکھو مکر نہ جانا۔

آزاد: (مسکرا کر) واہ مکرتے کی ایک ہی کہی، نیکی اور پوچھ پوچھ، بیچ کھیت۔ ایسی بات ہے بھلا۔ جو کہا وہ نہ کریں۔ قول جان کے ساتھ ہے۔

بھٹیاری: ہاں اور کیا۔ مرداں جان دارد۔ تمھیں شرم نہیں آتی کہ اس نا محرم نے ہاتھ لگایا اور تم ٹکر ٹکر دیکھا کیے۔ ڈوب نہیں مرتے جا کر چلو بھر پانی میں۔ پھیری منھ پر لوئی، تو کیا کرے گا کوئی۔ دوسرا ہوتا تو مہنا منتھ مچاتا۔

چانڈو باز: کیوں لڑواتی ہو، اے بھلا مفت میں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

اتنے میں میاں آزاد حمام گئے، تو چانڈو باز اور بی بھٹیاری میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

چانڈو باز : آخر کہو تو یہ بات کیا ہے۔ واللہ تمہارا بایاں قدم ہے، پھانسا تو بڑے مڈھو کو۔ کیا سچ مچ نکاح پر راضی ہی ہو گئے۔ جانے نہ دینا۔ ایسا نہ ہو نکل جائے۔ بھئی قسم خدا کی عورت کیا بس کی گانٹھ ہے تو۔

بھٹیاری : مگر تم بھی کتنے بے شہور (شعور) ہو اس کے سامنے آپ نے گدگدانا شروع کیا، اب وہ کھٹکے نہ کھٹکے۔ تمہاری بھی جو بات ہے دنیا سے انوکھی، بلینڈی ساقد، بڑھاپا مگر تمیز چھو نہیں گئی۔

چانڈو باز : اب تم سے جھگڑے کون۔ میں کیا کچھ علم غیب تھوڑا ہی پڑھا ہوں، مگر پکی کر لو۔

بھٹیاری : ہاں پکی پوڑھی ہونی چاہیے۔ کسی اچھے وکیل سے صلاح لو۔ وہ کون وکیل ہیں جو کمید گھوڑے کی جوڑی پر نکلتے ہیں، اجی وہی گبھرو سے ہیں ابھی۔

چانڈو باز : اجی وکیلوں کی نہ پوچھو۔ وکیل تو تین سو ساٹھ ہیں۔ کسی کے پاس لے چلیں گے۔

بھٹیاری : نہیں واہ، ہونھ، کسی بوڑھے وکیل کے یہاں تو ہم نہ جائیں گے۔ ایسی جگہ چلو جو جوان ہو، اچھی صلاح دے۔ یہ نہیں کہ عورت کو دیکھا اور دو دو بک بتائی۔

چانڈو باز : اچھا آج اتوار ہے۔ شام کو میاں آزاد سے کہنا کہ ہمیں اپنی بہن کے یہاں جانا ہے۔ بس ہم پھاٹک کے اس طرف دبکے کھڑے رہیں گے۔ تم آنا ہم تم چل کر سب معاملہ بھگتا دیں گے کیوں کہ ہے نہ عقل کی بات؟

بھٹیاری : (قہقہہ لگا کر) اچھا، اچھا، اچھا۔ اہو ہو ہو، کیا سوجھی ہے۔

ادھر عامل روز نے بحر ظلمات کا راستہ لیا، اور مہ انور نے جلباب خفا سے رخ انور نکالا، ادھر بی بھٹیاری نے میاں آزاد پر فقرہ چست کیا۔

بھٹیاری : ہمیں تو آج بہن کے ہاں نیوتا ہے۔ کوئی گھڑی دو گھڑی میں آجاؤں گی۔ لو اب ہمیں جانے دو۔ تمہاری سالی نے بڑے پیار سے بلایا ہے۔

آزاد : ذرا سالی کی صورت ہمیں تو بھی تو دکھا دو۔ ایسا بھی کیا پردہ ہے۔ کہو تو ہم بھی ساتھ ساتھ نہ چلے چلیں۔ تھک جاؤ گی تو گود میں اٹھا لوں گا۔

بھٹیاری : بس رہنے دیجیے۔ یہ دل لگی تہ کر رکھیے۔ گود کسی اور کو بٹھائیے۔

یہ کہہ کر بی بھٹیاری تنک کر کوٹھری میں گئیں، اور سولہ سنگار کر کے نکلیں، تو میاں آزاد پھڑک گئے۔ اس وقت ان پر ظلم تھا۔ جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ پٹیاں جمی ہوئیں، گوری گوری ناک میں کالی کالی

لونگ، پیارے پیارے مکھڑے پر زلفِ عنبر بو، ہاتھوں میں کڑے پاؤں میں چھڑے، چھم چھم کرتی ہوئی چلیں۔ میاں چانڈو باز تو راہ میں منتظر کھڑے ہی تھے، جھپ سے ہاتھ میں ہاتھ دے کر لے چلے۔

چانڈو باز: ذرا ان کے سامنے چمک چمک کر باتیں کرنا۔ یہ نہیں جھیپنے لگو۔

بھٹیاری: مجھے اور آپ سکھائیں۔ چمکنا بھی کچھ سکھانے سے آتا ہے۔ میری تو بوٹی بوٹی یوں ہی پھڑکا کرتی ہے، نہ کہ ایسی جگہ آپ چلیں تو، جو میری باتوں اور میری آنکھوں پر نہ عاشق ہو جائیں، تو اللہ رکھی نہیں۔ بات تو انھیں کرنے نہ دوں، کچھ ایسا کرو کہ وہ بھی نکاح پر رضامند ہوں، تو ان سے اور آزاد سے ذری جوتی چلے۔

اتنے میں وکیل کے مکان پر پہنچے۔ اہو ہو ہو، مکان کیا بہشت بریں ہے۔ باغ نعیم ہے۔ وہ فرح بخش بنگلہ کہ روح خوش ہو جائے۔ پاگل جائے تو آدمی بن جائے۔ باغچۂ دلکشا میں تخت بچھے ہیں، اور ان پر ٹاٹ، اور اس پر دری، اور اس پر سفید چاندنی، جیسے بگلے کا پر۔ اور اس پر یارانِ بذلہ سنج بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اغل بغل کرسیاں، اس پر بھی احباب چمن طبع، رنگین مزاج۔

خدمت گار: (وکیل سے) گریب (غریب) پرور ایک عورت آئی ہے کہتی ہے کچھ کہنا ہے۔

احباب: کون کون؟ کیا، کون آیا ہے بھئی؟ ارے میاں عورت کیسی جوان ہے یا پیر زال۔

خدمت گار: اب حجور یہ تو دیکھنے سے معلوم ہو۔ مل ابھی ہے جوان۔

وکیل: کہو صبح کو آئے۔ اس وقت نہیں۔ آخر ہے کون؟

احباب: واہ واہ واہ۔ صبح کی ایک ہی کہی، اجی بلاؤ بھی، بھئی ہمارے سر کی قسم بلاؤ، ذرا واسطے خدا کے۔ کہو ٹوپی تمہارے قدموں پر رکھ دیں۔

بی بھٹیاری چھڑوں کو چھم چھم کرتی ہوئی، عجب مستانہ چال سے اٹھلاتی بڑی بوٹی پھڑکاتی ناز و انداز سے قدم دھرتی ہوئی، جہاں پہاں آئیں، جس نے دیکھا پھڑک گیا، کوئی چال پر عاشق ہوا۔ کوئی ناز دلربایانہ پر مرنے لگا۔ کسی کو پیاری پیاری صورت دیکھ کر بلبلِ تصویر کی طرح سکتا ہو گیا۔ لطف کی صحبت۔

یاران سر پل جمع، سب بنگیلے، عاشق تن۔ سودائی مزاج، ٹھٹول، بگڑے دل، مہذب شہدے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

نواب: وکیل سے یا حضرت آداب عرض۔ اجی قبلہ تسلیم، ما اینہمہ تہذیب یہ شاہد پرستی محمود اللہ۔

آپ کے مذاق پر صاد ہے۔ خدا کی قسم حسیناں روزگار ڈھونڈھ نکالی۔

منشی : بھئی صورت سے تو بڑے مہذب معلوم ہوتے تھے، لیکن ایک ہی مرشد نکلے۔

شمیم : میاں عالم جوانی ہاست۔ لیکن چیز خوب ہے۔ خوش رو، خوش خو، خوش سلیقہ، خوش تمیز۔

وکیل : بھئی اب ہم کچھ نہ کہیں گے اور کہیں کیا۔ چھا گئی، قسم نوجوان کی صورت بھی دیکھی ہو۔ بی صاحب آپ کس کے پاس آتی ہیں، کہاں سے آنا ہوا؟

بھٹیاری : الٰہی خیر ایسی اجیرن ہو گئی۔

جوان : اے نہیں۔ اے لو واہ۔ تم اور اجیرن:

گر بر سرِ و چشمِ من نشینی   نازت بہ کشم کہ ناز نینی

بیٹھیے، ادھر تخت پر آئیے! مزاج شریف، میں اور میرا خدا رعبِ حسن سے بات کرنا دوبھر ہے۔

بھٹیاری : ہاں بتائیے ہم تو سیدھے سادھے ہیں صاحب۔

جوان : ہائے تیرے اس بھولے پن کے صدقے۔ آپ بھولی ہیں۔ بجا ہے۔

وکیل : واللہ بڑی معزز معلوم ہوتی ہیں۔ عورت ہے یا پرستان کی پری ہے۔

احباب : (قہقہہ لگاکر) ریجھے، ریجھے، ریجھے، حضرت ریجھے، بولی اب پو بارہ ہیں۔

بھٹیاری : حضور ہم یہ پو بارہ، اور تین کاتے تو جانتے نہیں، ہمارا مطلب نکل جائے تو آپ سب صاحبوں کا منھ میٹھا کر دیں گے۔

احباب : آپ کی باتیں ہی کیا کم شیریں ہیں، اور حسن ہی کیا کم نمکیں ہے۔

بھٹیاری : کیا خوب، شیریں نمکین دونوں، تو یہ کہیے کھٹ مٹھی ہوں۔ واہ اچھی کڑوی تعریف ہے۔

ٹھٹھول : اللہ رے شوخی، اُف ری پھبن، بلا کا نکھار ہے، اور تقریر میں جادو ہی جادو ہے۔

اتنے میں میاں چانڈو باز برآمد ہوئے۔

وکیل : (گھبرا کر) کون؟ باہر ٹھہریے اس وقت۔ لاحول ولا قوۃ

بھٹیاری : میرے بھائی ہیں سگے۔ آپ ڈر ڈرائے دیتے ہیں۔

جوان : آئیے آئیے۔ آپ کی ہمشیرہ جان تو واللہ بلائے بے درماں ہیں۔

چانڈو باز : حضور عرض کروں یہ بی اللہ رکھی بھٹیاری ہیں۔ آج دور دور تک ان کا نام روشن ہے۔

جوان : اور آپ کا اور آپ کے باپ کا نام بھی انھوں نے خوب روشن کیا۔

چانڈو باز : بندہ نواز، سرا میں ایک خوش رو جوان کرارے پہلوان، زندہ دل، صبح نفس، روشن ضمیر،

تو اس گلیارے میں کیا کہوں۔ کوئی آئے، کوئی جائے، کھڑے کھڑے کہیں باتیں ہوا کرتی ہیں، ہمیں اپنے گھرے چلو تو خیر، کیا مضاقہ (مضائقہ) چلیے چلیے؛ واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ چانڈو باز سوچے کہ دوسرا گل کھلا چاہتا ہے۔ پوچھا کہ میاں تمھارا مکان یہاں سے کتنی دور ہے؟ جو کانے کوسوں ہو تو میں ایک کے بگھی کرایہ کر لوں۔ ان سے اتنی دور چلا نہ جائے گا۔ عورت ذات اور نازک، اور دھوپ اب زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کو تو مارے نزاکت کے چھتری ہی کا سنبھالنا دو بھر ہو گیا ہے۔ اتنی دور جائے گا کون؟ آندھی روگ، نا صاحب دور نہیں۔ بس کوئی دس قدم۔ آئیے ایک لمحہ میں پہنچتے ہیں چلے تو عاشق تن نے چھتری لے لی، اور خدمت گار کی طرح چھتری لگا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چانڈو باز نے دیکھا کہ اچھا گاؤدی ملا۔ اپنا بوجھ بھی اُن پر لادا، اور خود بھی چھتری کے سایہ میں رئیس بنے ہوئے چلنے لگے۔ گلیوں سے نکلے سڑک پر آئے۔ سڑک سے بائیں کو مڑے، تالے میں گئے، چڑھائی اترے پھر بازار ملا۔ چلیے کھٹ سے عاشق تن کے مکان پر تھے۔ صحن میں چوکیوں پر صاف ستھرا فرش بچھا ہے۔ جا کر بیٹھے۔ خدمت گار پنکھا جھلنے لگا۔

عاشق تن: وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

چانڈو باز: عشقِ بلبل میں اثر ہے تو قفس میں آتش
بوے گل پھاند کے دیوارِ گلستان آئی

عاشق تن: جب ہم چھٹے ہوئے گرگے بدمعاش تھے۔ تب تو ایک بھی معشوق پری پیکر نظر نہ آیا۔ اب جو توبہ کی تو یہ صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں:

یوں تو اے ابر پتا بھی نہیں ملتا تیرا — توبہ کرتے ہی چھلکتی ہے سیاہی تیری

مگر اپنا عشق بھی دنیا سے نرالا ہے۔ جس کو دل دیا اس کو دیا۔ پختہ مغز جنوں ہوں، جان جائے، مال جائے، عزت جائے، بدنام ہوں، ستم سہوں، یہ سب گوارا ہے۔ میں تو ہزار جان سے عاشق زار ہوں۔ کہو تو پانی میں کود پڑوں، کہو جلتا بلتا انگارا اٹھا لوں، ہمارا العشق خام نہیں، جان کا دینا یہاں بائیں ہاتھ کا کرتب سمجھتے ہیں:

تو عاشقانِ مسلم ندیدہ جائی — کہ تیغ بر سرِ خود بنادہ دار درپیش اند

چانڈو باز: ان کا اب مطلب سنیے! یہ بے چاری ابھی کوئی اٹھارہ انیس برس کی ہوں گی۔ ابھی کل تو پیدا ہوئی ہیں، مگر بلا کی شوخ طبیعت، اور چنچل، اور بات ایسی تاڑتی ہیں کہ

جس کا حق ہے۔ حسن و جمال پر تو آپ ہی ریجھے ہیں۔ اب سنیئے کہ ان کے میاں یہاں سے لڑ جھگڑ کر اور شاید کوئی بگڑا بھی کیا تھا خیر عرض کہ بھاگ کے حیدرآباد دکن گئے۔ وہاں کسی کو گھر میں ڈال لیا۔ اب یہ اکیلی ہیں۔ ان کا جی گھبراتا ہے۔ اور پھر آپ جانیے یہ شباب یہ حسن۔ شوق ہوا کہ بیاہ کریں۔ اِدھر اُدھر یہ اور یہ دونوں۔ مل کر خوش رو جوان ڈھونڈھتے تھے۔ کہ حسن اتفاق سے سرا میں ایک وجیہہ کرارا جوان آیا۔ ابھی مسیں بھیگتی ہیں۔

بھٹیاری: ہاں سے ٹھلے کے جوان ہیں، اور میاں آنکھیں تو ایسی رسیلی دیکھیں نہ سنیں۔ میں کیا کہوں تم سے بس دیکھنے سے تعلق ہے۔

چانڈو باز: اے تو مجھی کو اب کہنے دو۔ تم تو بات کاٹے دیتی ہو۔ ہاں تو حضرت میں کیا کہتا تھا ہاں اُن کی ان کی چار آنکھیں ہوئیں۔ تو ادھر وہ، اِدھر یہ دونوں گھائل ہو گئے۔ پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوا کیں، پھر کھل کے صاف کہہ دیا کہ ہم تم کو بیاہیں گے، مگر پھر مکر گئے۔ رہا ایک بات یہ تو ہے کہ جب ان کو دیکھ لیتے ہیں تو ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اور اُف اُف کرنے لگتے ہیں۔ اب ان کا قصد ہے کہ ان پر نالش جڑ دیں۔

عاشق تن: اجی ان کو بھاڑ میں جھونکو۔ جو بیاہ ہی کرنا ہے تو ہم سے نکاح پڑھوا لو۔ ان کو دھتا بتاؤ۔ واہ چاہیے تھا انھیں عاشق ہونا، الٹے تم ہی عاشق ہوئی جاتی ہو۔ ہمارے ساتھ عقد کر لو۔ دونوں کے دونوں مزے سے رہیں۔ پھر بولو بیوی کیا مرضی ہے؟

اللہ رکھی: سچ کہوں؟ تم مردوں کا ہمیں اعتبار دمڑی بھر نہیں۔ رہا اب جی نہیں چاہتا کہ کسی سے دل ملائیں، اور محنت کا (مفت کا) دکھ لیں۔

عاشق تن: تم نے ابھی ہمیں پہچانا ہی نہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ بھلا ہمیں بھی آزما دیکھیے۔ ہم شریف زادے ہیں بیوی۔

اللہ رکھی: سچ کہوں؟ لوگ ایرے غیرے تو ہمیں ساری خدائی یہی سمجھتی ہے کہ، اللہ رکھی بڑی خوش نصیب ہیں۔ مگر میاں میں کس سے کہوں، دل کا حال کوئی کیا جانے، انھوں نے چمک دمک دیکھی اور مرنے لگے۔ اب مجھ سے سنو کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی بد قسمت ہی نہیں۔ اس سن میں میاں ندارد۔ اٹھتی جوانی، اور یہ حیرانی، کہاں ماری ماری پھروں۔ دن رات اسی سوچ میں رہتی ہوں کہ کوئی بھلے مانس ملیں، تو نکاح پڑھوا لوں، سو میاں اپنے سوچ سمجھ لو اور مجھے قول دو۔

عاشق تن: قولِ مرداں جاں دارد (بہادر انسان وہ ہے جو اپنی کہی ہوئی بات پر قائم رہے)۔

چانڈو باز : یہ دیکھیے عرضی دعوا ہے۔

عاشق تن : ارے یہ کس پاگل نے لکھی ہے جی ؟ یہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔ سرکار یہ نہیں کر سکتی ہے کہ آزاد کو خواہ مخواہ تھیں دلوا ہی دے۔ ہاں اتنا ہو سکتا ہے کہ ہرجہ دلوا دے سو اس کا بھی ثبوت مشکل ہے ذرا۔

بھٹیاری : اجی ہو گا بھی مسودا (مسودہ) پھاڑ ڈالو۔ اب میاں آزاد سے مطلب ہی کیا رہا۔

عاشق تن : ہم بتائیں ؟ نالش تو داغ دو۔ ہرجہ ملا تو ہرج ہی کیا ہے۔ باقی بیاہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ ادھر تم مقدمہ جیتیں اُدھر ہم برات لے کر آئے، اور تم کو سکھپال پر بٹھا کر لے چلے۔

اللہ رکھی : تو چلو تم بھی وکیل کے یہاں تک چلے چلو نہ۔

عاشق تن : ہاں، ہاں، چلو۔ چلو،

عاشق تن اور میاں چانڈو باز اور بی اللہ رکھی چلیں وکیل کے یہاں۔

سانڈنی کے شتر غمزے

میاں آزاد ایک دن خواب خرگوش سے بیدار ہوئے تو سوچے۔ واللہ واہ رے ہم بے فکری بھی تو کہاں تک۔ آزادی تا کجا، واللہ گئے تھے تماشہ دیکھنے لیکن خود ہی تماشہ بن گئے۔ پہلے تو وہ فکر ہوئی تھی کہ سانڈنی شتر غمزے کرتی ہوئی سدھاریں۔ واہ میرے الٹی کے سنتے والے۔ اور اس کی کاٹھی اپنے ہی اوپر کستی پڑتی۔ پھر یہ گاج پڑی کہ بیاہ کا قول ہارے۔ مگر آنکھ کھلی تو پنشاخہ ہاتھ میں، برات نکل گئی۔ خود بدولت نئی سڑک پر پتا پوچھتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو کہیں نواب کے آدمی چھوٹیں تو پھر خدا ہی بھرمیں اپنا ٹھکانا نہ رہے، چور کے چور بنے، اور الو کے الو بنائے جائیں۔ اور طرّہ یہ کہ کسی کے منھ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔ کوئی کہاں تک بدنامیوں کا ٹوکرا اٹھائے۔ اس آزادی نے تو کلنگ کا ٹیکا لگایا۔ آبرو پر پانی پھر گیا۔ عزت خاک میں مل گئی۔ ابھی دیکھیے کیا کیا ہوتا ہے۔ کس کس کی ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں۔ کس کس کے آگے سر ٹیک کی نوبت آتی ہے۔ کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ کیسی کیسی زکیں پاتے ہیں۔ سلجھی ہوئی بات ہم نے الجھائی۔ دل کا دل دکھایا اور داغ کا داغ پایا۔ جب دیکھو تلوے کھجلایا کرتے ہیں۔ دنیا بھر کا راستہ ناپتے پھرتے ہیں۔ اس جنون کے صدقے، جس نے ہمیں دشت دکھلایا۔ فلکِ بے مہر نے کبھی نگہ رحم نہ فرمائی۔ کوئی دم چین لینے ہی نہ دیا، مگر پہلے کانٹا چبھتا ہے۔ پھر کہیں پھول ہاتھ آتا ہے۔ خدا کو اسی میں کچھ

مجھ غریب کی بہتری منظور ہو گی :

در دہر کسی بہ گل عذاری نرسید تا بر دلش از زمانہ خاری نرسید
در شانہ نگر کہ تا بصد شاخ نہ شد دستش بسر زلف نگاری نرسید

دفعتاً سرا میں غل مچا۔ لینا۔ لینا۔ لینا۔ یہ گڑ بڑا کر کوٹھڑی کے باہر نکلتے ہیں تو۔ع۔ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے" سانڈنی نے رسی وسی توڑ تاڑ کر پھینک دی ہے۔ اور سرا بھر میں اچکتی پھرتی ہے، مگر حقیقتِ حال، حضرت نہ سمجھے گا کہ ایک ٹھٹول تے دل لگی دل لگی ہیں رسی کو چاقو سے کاٹ ڈالا، اور بھُس میں جنگی ڈال جمالو بھاگ کھڑی۔ سانڈنی پہلے تو ایک مسافر کے ٹٹو کی طرف جھکی، اور اس کو مارے پشکوں کے بوکھلا دیا۔ مسافر بے چارہ ایک لگا لیے ہوئے کھٹا کھٹ ہاتھ صاف کر رہا ہے، مگر کہیں کھپاچوں سے اتنے بڑے جانور مانتے ہیں۔ پھر جو وہاں سے طرارہ بھرا تو دو تین بیلوں کا کچومر ہی نکال ڈالا۔ گاڑیبان ہائیں ہائیں کر رہا ہے۔ لیکن اس آئیں بائیں شائیں سے بھلا اونٹ سمجھا کیے ہیں۔ یہاں سے بلا کی طرح چھٹی تو ایک کمہار چپیٹ میں آگیا۔ دھم سے منھ کے بل زمین پر۔ مٹی کے بھولے بھالے کھلونا نے سب چکنا چور۔ پھر دُم دباتے ہوئے زقند بھری تو دو چار اکّوں کو گرا دیا۔ کسی کی کمانی توڑی۔ کسی کے انجر پنجر الگ، سرا میں چوطرفہ غل مچا ہوا ہے۔ ٹٹو والا اپنا سر پیٹتا ہے۔ گاڑیبان کھڑا رو رہا ہے۔ کمہار ادھ مرا ہو گیا۔ چانڈو باز تو بڑا دکھاتے پھرتے ہیں۔ ہنسوڑ آدمی۔ فقرے پر فقرے چست کر رہے ہیں۔ تھان ہے تھان، واہ ری اونٹنی، کیا کہنا ہے، دے بڑھ کر لات۔ چبا جا ایک آدھ کو۔ چانڈو باز سانڈنی کو پکڑنے دوڑتے ہیں، تو یار لوگ دور ہی سے تالیاں بجا دیتے ہیں۔ وہ اور بھی بوکھلا گئی۔ لگی بلیوں اچھلنے، جب چوطرفہ سے یارانِ سرِپل نے خوب ہی دق کیا تو لپک کر اس نے ایک ذات شریف کو دانتوں سے دبا کر اٹھا لیا۔ اور پھینکا دھم سے ہائے کچومر نکل گیا۔ گرے تو بے دم زخموں سے خون کے شراٹے بہنے لگے، اور حوالی موالی سب ففرد ہو گئے۔ ساری بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ تب تو چانڈو باز لپکے کہ نکیل لوں۔ وہ نام پوچھتی ہے۔ بارے جب خوب ہی شل ہو گئی۔ تو ان کے ہاتھ آئی۔ انھوں نے چمکار کر باندھ دیا۔ کمہار بھی جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیل بھی کنمنا کر بھوسے کی طرف جھکے، مگر ٹٹو کی بری نوبت ہے۔

ادھر کا تو یہ حال تھا اب اُدھر کا ذکر سنیے کہ میاں چانڈو باز اور عاشق تن اور بی

اللہ رکھی مل کر وکیل کے یہاں گئیں۔ لیکن بڑی دیر تک تینوں کے تینوں باہر ہی ٹاپا کیے۔ یہ رئیس آتے۔ وہ امیر آئے۔ کبھی کوئی مہاجن آیا، کبھی کسی بیوپاری نے اپنا مقدمہ سنایا۔ خیر عرصہ کے بعد انھوں نے بار پایا۔ وکیل جو دیکھتے ہیں تو آج وہ رنگ و روغن ہی نہیں، وہ جوبن ہی نہیں، وہ مسکرانا، وہ لجانا، سب بھولی ہوئی ہے۔ کیوں خیر باشد، آخر ماجرا کیا ہے بی؟ آج چہرہ اتنا اداس کیوں ہے؟ خدا ہی خیر کرے، ہماری جان کی قسم سچ سچ بتادو، مقدمہ تو گیا جہنم میں، یہ دو ہی دن میں ہو کیا گیا۔ کہاں تو وہ چمک دمک تھی، کہاں یہ حال، کہاں وہ شگفتگی تھی، کہاں یہ ملال، کہاں وہ جوشِ جوانی، کہاں یہ سراسیمگی و پریشانی، کہاں وہ رخِ انور غیرتِ ماہ، کہاں لب پر فغاں و آہ، کہاں وہ جھپ وہ چھبن، کہاں یہ رنج و محن، زلف پر شکن کا وہ پیچ و تاب نہیں، چہرے پر وہ آب و تاب نہیں، الٰہی یہ کیسی بندھی کہ حسن کا چراغ ہی گل ہو گیا۔ شوخی و مستی کا قتل ہو گیا۔ اتنے میں بی اللہ رکھی کا دل بھر آیا، اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ آنسو کا تار بندھ گیا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ وکیل سناٹے میں، کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ اس دن تو کھل کھلا کر ہنستی تھی آج آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔ یا تو ادائے دلربا میں لاکھ انداز تھے۔ کبھی سیاہی زلفِ چلیپا کی جھلک دکھائی، کبھی دُرِ دنداں کی چمک دکھائی۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا، ناز و انداز سے قدم دھرنا، آج بے قراری، اور اشکباری، اور گریہ و زاری ہے، ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لاکھ ضبط کیا مگر دامن تر ہی ہو گیا:

وال جھوٹ موٹ تم نے بناوٹ سے غش کیا

ہم سچ مچ ایسے روئے کہ یاں چٹ سے غش کیا

میاں چانڈو باز تو کل کارروائی سے واقف تھے۔ بی اللہ رکھی کے دردِ دل کو وہی خوب سمجھے، اور وکیل کی پریشانی دیکھ کر بولے! کہ حضرت یہ بڑی پاکباز، عفت کوش، حیا پرور عورت ہیں۔

بھٹیاری: جی وہ تو میری وزا (وضع) کہے دیتی ہے۔ اُف!

چانڈو باز: ان کی ظاہری وضع پر نہ جائیے گا یہ واقعی بڑی وضع دار ہیں۔ جیسی گل عذار، باغ و بہار، طرحدار، ہیں، ویسی ہی خدا کی قسم! وضع دار ہیں۔ گو سرتاب قدم نور ہے۔ پرستان کی حور ہے۔ چنچل، رنگین مزاج، بہار طبع، رنگین ادا، نازک آواز، فصیح نکتہ پرواز، چست و طرار، عالم فریب، ستم گار، مگر میرا خدا اور میں کہ بُری راہ چلتے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی پاک دامنی کی

قسم کھانی چاہیے۔ خیر اب یہ فرمائیے کہ مقدمہ کی کیا صورت کی جائے۔

عاشق تن: جی ہاں پیر و مرشد! کوئی فکر معقول بتائیے، مگر زبردستی تو یہ شادی نہیں کرا سکتیں۔ ہاں۔ ہر بے کا ثبوت ہو تو بیشک مل جائے۔ پھر ہرج ہی کیا ہے۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ کچھ تو دے ہی مریں گے۔

چانڈو باز: مریں ان کے دشمن، آپ بھی کتنے پھوہڑ ہیں۔ واہ۔

وکیل: اچھا تو یہ بتائیے کہ وہ رئیس کہاں سے آئیں گے، جو عدالت میں بیدھڑک کہہ گزریں، کہ ہم سے اور ان سے بیاہ کی ٹھہری تھی۔ پہلے کوئی تجویز تو کر لیجیے، ورنہ عدالت میں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔

عاشق تن: اب بتا ہی دوں؟ بندہ سمجھے صاحب۔ بندۂ درگاہ، کہیں گے کہ ہم سے مہینوں سے بات چیت ہے۔ بیچ میں میاں آزاد کود پڑے ہم منھ تاک کر رہ گئے۔ واللہ وہ جواب دوں۔ کہ آپ بھی خوش ہو جائیں۔

وکیل: واہ تو پھر کیا پوچھنا ہے۔ ہم آپ کو دو ایک کنایہ بتا دیں گے، پھر آپ فراٹے بھرنے لگیے گا۔ مگر دو ایک گواہ تو ٹھہرا لیجیے۔ بس ایک روپیہ سے گنیے۔ پٹی ہم انھیں پڑھا دیں گے۔

چانڈو باز: ایک گواہ تو میں ہی بیٹھا ہوں۔ فراٹے باز۔

خیر اب بات کو طول کون دے۔ بی اللہ رکھی سیدھی کچہری پہنچیں۔ جس پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھیں۔ وہاں وہ چٹا ؤ کہ الاماں۔ جدھر گزر ہوا کٹاؤ کر دیا۔ کچہری بھر کے آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ میاں چانڈو باز عظیم اللہ خانی حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ اور وارث علی خاں بنے بیٹھے ہیں۔ جاؤ بھئی اپنا کام کرو۔ آخر یہاں یہاں کیا میلا ہے۔ بھئی واہ اچھی دل لگی نکالی۔ کیا بھیڑ یا دھسان خلقت ہے۔

ایک: جی بھیڑ یا دھسان خلقت ہے، آپ لائے ہی ایسے ہیں۔

دوسرا: اچھا ہم کھڑے ہیں۔ آپ کا کچھ اجارہ ہے۔ واہ اچھے آئے۔

تیسرا: آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں؟

چوتھا: بھائی ذری ہنس بول لیں۔ آخر مرنا تو ہے ہی۔

خیر جب ایک بجا تو بی اللہ رکھی، ناز و ادا سے اٹھلاتی، دوپٹا پھڑکاتی، چھڑوں کو چھم چھم کرتی ہوئی چلیں عرضی دینے، چانڈو باز ایک ہاتھ میں حقہ لیے ہیں۔ دوسرے میں چھتری، خدمت گار بنے چلے جاتے ہیں۔ اب سنیے کہ کچہری کے دروازوں پر یارانِ سرپل ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگائے کھڑے ہیں۔

چانڈو باز تو برآمدے میں ٹھٹک رہے۔ اب بی اللہ رکھی کو کوئی بتاتا نہیں کہ عرضی کہاں لی جاتی ہے۔ ایک کہتا ہے داہنے ہاتھ جاؤ، دوسرا کہتا ہے نہیں نہیں، بائیں بائیں، تیسرا بولا میاں کیوں بہکاتے بے چاری کو دیکھو وہ سامنے کمرا ہے۔

الغرض بی صاحب چمکتی ہوئی منصرمی میں پہنچیں۔ عرضی دعوے دیا۔ منصرم صاحب پرانے رسیا خوب گھورا کیے۔ خیر اس نے پرچہ لیا، اور یہ چل کھڑی ہوئی۔

دوسرے دن نور کے تڑکے میاں آزاد چھپر کھٹ پر لیٹے ہوئے لہرا لہرا کر عین حالتِ وجد میں پڑھ رہے تھے کہ:

شگفتہ شد گلِ حمرا وگشت بلبل مست   صلائے سرخوشی اے عاشقان بادہ پرست
بیار بادہ کہ در بارگاہِ استغنا   چہ پاسبان وچہ سلطان چہ ہوشیار چہ مست

اتنے میں عدالت کے مذکوری نے سمن لا کر دیا، اور بی اللہ رکھی مسکرانے لگیں۔

مذکوری : سمن آیا ہے۔

آزاد : ؎ شبے صحبت غنیمت داں وداد خوش دلی بستاں
کہ مہتاب دل افروز ست وطرفہ لالہ زارے خوش

مذکوری : حضور سمن آیا ہے۔ گانے کو تو دن بھر پڑا ہے۔ لیجیے دستخط تو کر دیجیے۔

آزاد : بغفلت عمر شد حافظ بیا باما بہ میخانہ
کہ شنگولانِ سرمستت بیاموزند کاری خوش

مذکوری : اجی صاحب شعر ہی پڑھا کیجیے گا یا میری بھی سنیے گا؟

آزاد : کیا ہم سے کہتے ہو؟

مذکوری : جی! اور نہیں تو کس سے کہتے ہیں۔ یہ لیجیے آپ کے نام سمن آیا ہے۔

آزاد : (سمن لے کر) یہ سمن کیسا بھئی، ذرا پڑھیں تو۔

ازانجا کہ بی اللہ رکھی نے تم پر نالش کی ہے، لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ حاضر عدالت ہو، ارے واہ واداہ۔ یہ سچ مچ نالش ہی جڑ دی۔

چانڈو باز : کیوں میاں مذکوری! اگر ہم نہ جائیں تو کیا ہو؟

مذکوری : جی کچھ بھی نہیں۔ وارنٹ آنے سے رہا۔ یک طرفہ ڈگری ہو جائے گی۔

آزاد : اور جو روپوش ہو جائیں؟

مذکوری: تو کیا وارنٹ جاری ہو۔ بس دیوانی مذکوریوں کی حراست میں آئیں۔ مزے سے دو چپراسی ساتھ۔

مذکوری نے دستخط کرائے، اور بی اللہ رکھی کو گھیرا۔ آج تو ہاتھ گرماؤ، ایک چہرہ شاہی لاؤ۔ "اے تو اب سوت نہ کپاس، کوری سے لٹھم لٹھا جیتیں تو امام و نام دیں۔ محنت محنت میں کون دے بھلا؟" ای تم جیتی داخل ہو بی بی۔ ہمارا حق (حق) نہ مارو۔" اچھا کل آؤ تو لے جاؤ۔" اچھا۔

میاں آزاد کے پیٹ میں چوہے چھوٹے، کہ بڑی بے ڈھب ہوئی۔ شوہر بنے تو مزے ہیں۔ جب چاہیں گے بیوی کو ٹھکار کر چمپت ہو جائیں گے۔ لیکن جو کہیں جرمانہ ہوا تو کس کے گھر سے دیں گے۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اہو ہو ہو، خوب یاد آیا۔ نواب کی سانڈنی کے کوڑے کریں گے۔ پوبارہ ہیں۔ ع۔ این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔" لیکن بی اللہ رکھی ہشاش بشاش، چو طرفہ چمکنے لگیں، اور آس پاس کی بھٹیاریوں سے چلا چلا کر کہنے لگیں۔ اب تو چاندی ہے جیتے تو گھی کے چراغ جلائیں گے۔ یہ نہ کہا کہ منھ میٹھا کریں گے۔ گل گلے کھلائیں گے۔ دوسری نے کہا اللہ کرے جیتو تو نہ کھلاؤ گی، تو نکاح والے دن ڈھولک کون بجائے گا۔

میاں آزاد بُوحش اللہ نے جب سے سمن پایا، تب سے ان کے ہوش پتیرا ہوئے۔ آزادی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ سوچے اب کریں کیا۔" جائے ماندن نہ پائے رفتن۔" بھاگ کھڑے ہوں تو مذکوریوں کی حراست میں آئیں۔ نواب صاحب کے مصاحب حسد کے مارے خوب ہی خاک اڑائیں۔ ڈٹے رہیں تو یہاں والے قہقہے لگائیں، کچھ کرتے دھرتے بن ہی نہیں پڑتی۔ یار نہ مددگار۔ ع زمانہ برسرِ جنگ ست یا علیؑ مدد دے۔" ۶ یا علی مشکل کشا مشکل کشائی کیجیے! ایک دفعہ انھیں خیال آیا۔ کہ لو سوچ کاہے کا۔ چپکے سے چلتا دھندا کرو۔ کوئی کہاں ڈھونڈھتا پھرے گا۔ ٹھور نہ ٹھکانہ۔ یہ سوچتے ہی ان کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ ادھر بھٹیاری کی آنکھ چوکی۔ اُدھر چھپاک سے کاٹھی کس، بقچہ سنبھال، ڈنڈا لے، یہ جا وہ جا۔ ناکے تک تو ان کو کسی نے نہ ٹوکا۔ مگر جب ناکے سے کوئی کوتی بھر کے پٹے پر باہر نکل گئے، تو میاں چانڈو باز سے چار آنکھیں ہوئیں۔ ارے! غضب ہی ہو گیا اب دھر لیے گئے۔

چانڈو باز: اے بڑے بھائی کدھر کی تیاریاں ہیں۔ یہ بھاگ جانا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ بندہ پرور کر کاٹھی کسی اور چل کھڑے ہوتے۔ مگر تمھیں انھوں نے بھاگنے کیا سمجھ کر دیا بھئی؟ یا آنکھوں میں خاک جھونک کر چلے آتے۔ لے بس اُتر پڑو۔ آؤ ذری حقہ تو پی لو، دم تو لگاؤ۔

آزاد : اس دم میں ہم نہ آئیں گے۔ یہ فقرے کسی گنوار کو دیجیے۔ آپ اپنا حقہ رہنے دیں۔ بس اب ہم خوب پی چکے۔ ناکوں دم کر دیا بد معاشوں نے۔ چلے تھے مقدمہ دائر کرانے۔ اب جو ہماری چھاؤں بھی پاؤ! تو آزاد نہیں۔ ہات تیرے کی۔ کس مزے سے کہتے ہیں کہ حقہ پیے جاؤ۔ ایسے ہی تو بڑے ہمدرد ہیں۔ آپ اپنی ہمدردی نہ کر رکھیے۔

چانڈو باز : نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ ہم نے تو کہا اتنے دن ملاقات رہی ہے۔ آؤ بھئی تواضع تکریم، خاطر مدارا کریں، اب خدا جانے کب ملتا ہو۔

آزاد : خدا نہ کرے کہ تم ایسے منحوس، بے ایمان کی صورت پھر کبھی خواب میں بھی نظر آئے۔

اتنے میں چانڈو باز نے غل مچانا شروع کیا، کہ دوڑو چور رہے۔ لینا چور۔ چور۔ چور۔ میاں آزاد نے ادھر چانڈو باز پر شڑاپ سے کوڑا پھٹکارا اور ادھر سانڈنی کو جو ایک ایڑ لگاتے ہیں تو چھُن چھُن، چھُن چھُن، یہ پہنچ وہ پہنچ۔ شہر سے باہر ہوئے تو میاں آزاد کی روح فرحناک ہو گئی، صبح کا سہانا وقت، صبا نافہ نسیم عنبر بیز، طرف چمن غالیہ بار، ہر سمت باغ و بہار، سانڈنی اٹھکھیلیا کرتی جاتی ہے۔ سوچے کہ اللہ اللہ، آج بعد مدت روح نے غذا پائی۔ اور میدان کی صورت نظر آئی۔ چلو بڑے فتنے سے جان بچی۔ سستے چھوٹے۔ میاں آزاد سر اکی سرگذشت سوچتے چلے جاتے تھے، کہ راہ میں دو مسافر باہم یوں باتیں کرنے لگے۔

ایک : ارے میاں آجکل لکھنؤ میں ایک نیا گل کھلا ہے۔ کسی ذات شریف نے کروروں روپیہ کے جعلی اسٹامپ بنائے، اور لندن تک میں جا کر کوڑے کیے۔ سنا کابل میں دو جعلیے گرفتار ہوئے۔ مشکیں کس لی گئیں، اور ریل پر بند کر کے یہاں پہنچ گئے۔ مگر میاں اللہ جانتا ہے کیا جعل کیا۔ جو جو بھر بھی فرق معلوم ہو تو مونچھیں منڈوا ڈالو۔ سنا کئی برس سے بیچا کیے۔ کوئی ڈیڑھ سو دو سو برس سے بیچتے تھے، اور کچھ چوری چھپے نہیں، کھُلم کھلا۔ اور سنیے ایک میاں حسین بخش ہیں مصور، اور فوٹو گراف کی تصویر کھینچتے ہیں۔ وہ بھی اس چپیٹ میں آ گئے۔ کنہیا لال نامی ایک جعلیا ہے وہ بھی دھرا گیا، اور اس کے چیلے چار پڑ بھی پھنسے ہیں۔

دوسرا : واہ وا۔ دنیا میں بھی کیسے کیسے کانیے پڑے ہیں۔ ایسوں کو تو ہاتھ کٹوا ڈالے۔

ایک : واہ واہ۔ کیا قدر دانی کی ہے۔ کہنے لگے ہاتھ قلم کروا ڈالے، یہ نہ کہا کہ پھانسی دیدے واللہ ہے کہ انھوں نے تو وہ کام کیا کہ ہاتھ چوم لے۔ جاگیریں دے۔ کارے کردہ است برادر کارے کردہ است۔ واللہ کارے کردہ ست۔ اس سوجھ بوجھ کے صدقے۔

میاں آزاد کو پہلے مسافر کے مبالغہ اور تعریف پر بے اختیار ہنسی آئی، اور سوچے کہ ایسے ہی ذات شریف تو بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ کیا جھپ سے جعلیوں کو کابل تک پہنچا دیا۔ اور ہندوستان کے اسٹامپ لندن میں بکوائے۔ واہ ری عقل، اچھی پٹی۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ کیوں جی کیا کروروں کے اسٹامپ بیچ لیے۔ بھئی کمال کیا ہے واللہ۔ وہ دونوں سمجھے کہ یہ کوئی پولیس افسر ہیں، اور بھیس بدل کر سانڈنی پر سوار ہو چلے ہیں ٹوہ لینے۔ ایسا نہ ہو کہیں ہم کو بھی گرفتار کر لیں، کوئی کہہ دے کہ اہنہم بچہ اشتر ست تو پھر بیڈھب ہی ٹھہرے آؤ صاف مکر جاؤ۔ انگریزہ کل ہے دل لگی نہیں ہے، کہ بیچ میدان میں کھڑے ہو کر سرکار دربار کی باتیں کرنے لگے۔ اس سے بالکل انکار ہی کرنا اچھا۔

آزاد: کیوں صاحب کتنے کے جعلی اسٹامپ بیچے۔

مسافر: جی!

آزاد: آپ ابھی کہتے نہ تھے کہ جعلی اسٹامپ بیچنے والے دھرے گئے ہیں۔

مسافر: کون؟ ہم نہیں تو۔

آزاد: اجی آپ باتیں نہیں کر رہے تھے کہ اسٹامپ کس نے بنائے اور ڈیڑھ سو دو سو برس سے بیچتے چلے آتے، مگر اب پکڑے گئے۔ کیری پتوں کی آڑ میں کب تک چھپے گی۔

مسافر: (کانپتے ہوتے) حضور ہم کو تو کچھ معلوم نہیں۔

آزاد: (ڈانٹ کر) ابھی بتاؤ نہیں ہم تم کو بڑا گھر دکھائے گا، اور بیڑی پہنائے گا، تم بدمعاش، ابھی بتاؤ؟

میاں آزاد تو ان کی چتونوں سے تاڑ گئے کہ دونوں کے دونوں چونگا ہیں۔ مارے ڈر کے اسٹامپ کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ آؤ ان کو ذرا دق کریں۔ جیسے ہی انھوں نے ایک ڈانٹ بتائی اور ان کے اوسان خطا ہوئے۔ ایک تو بگٹٹ پچھم کی طرف بھاگا۔ دوسرا اکھڑ بڑ کرتا ہوا پورب کے رخ۔ انھوں نے سانڈنی کو ذرا تیز کیا، تو وہ بھی دوڑنے لگے۔ اس وحشت کے قربان۔

میاں آزاد چلے جاتے تھے تو راہ میں دو چار مسافر، ایک پیڑ کے سایہ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یوں گفتگو کرنے لگے۔

جوان: کوئی تدبیر ایسی بتایئے کہ لو نہ لگے۔ آج کل کے دن بڑے ہی برے ہیں۔ اب دوپہر یا کسی باغ میں منایئے چل کر۔

پیر مرد: لو نہ لگنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ پیاز کی گٹھی پاس رکھے جتنی لو چلے گی وہ سب اس

گٹھلی میں جذب ہوتی چلی جائے گی۔ یا دو چار کچے آم توڑ لو، اور ایک کنگری نمک کی، یا ذرا سی شکر ڈال کر اور ایک آبخورہ پانی ملا کر پی جاؤ۔ مگر آموں کو پہلے بھون لینا۔ جب خوب پلپلے ہوں تو گودا نکال کر چھلکا پھینک دو، اس سے سہل لٹکا ہی نہیں۔

جوان : اور جو کہیں اس وقت برف مل جائے تو پانی میں ڈال کر غٹ غٹ پی جاؤں، کلیجہ تک ٹھنڈا ہو جائے۔

پیر مرد : کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ نرے صاحبزادے ہی رہے۔ پانی میں تو برف ڈالنی ہی نہ چاہیے۔ برف کے پانی میں آبخورہ رکھ دیا۔ جب خوب ٹھنڈا ہو جائے تو آبخورے کا پانی پیے۔ ورنہ مضر ہے۔

جوان : واہ لاکھوں آدمی پیتے ہیں۔

پیر مرد : اجی لاکھوں آدمی جھک مارتے ہیں۔ لاکھوں چوریاں بھی تو کرتے ہیں۔ بس دیکھ لیا کہ لاکھوں آدمی ایسا کرتے ہیں۔ پھر اس سے مطلب۔ صدہا آدمیوں کو ہم نے دیکھا ہے، کہ گڑھیاؤں اور تالابوں کا پانی سفر میں پیتے ہیں، آپ بھی پیجیے گا۔ ہزاروں آدمی دھوپ میں کوسوں چل کر کھڑے کھڑے تین چار لوٹے پانی کے پی جاتے ہیں، مگر یہ کچھ اچھی بات تھوڑا ہی ہے۔

میاں آزاد کا ایک دلکش باغ کی روح افزا بہار، دیکھ کر جی للچایا کہ ذرا اٹک جائیں بسانڈنی پر سے دھم سے کود پڑے، ایک درخت کے قریب اس کو باندھا، اور زین پوش اُتار کر ایک صاف ستھرے مقام پر، پیڑ کے سایہ میں بچھا کر، لڑھک رہے، تو کیا سنتے ہیں کہ ایک گاؤں میں دو آدمی بیٹھے ہوتے باہم مزے مزے سے یوں گفتگو کر رہے ہیں۔

ہندو : ارے میاں کچھ اور بھی سنا؟

مسلمان : اب سونے دو بھئی، آخر منزل طے کرنی کچھ دل لگی ہے۔ بک بک بک لگا تی ہے۔ یہ سنو وہ سنو۔ یہاں آج مارے گرمی کے بھٹے بگڑے ہوتے ہیں۔

ہندو : اجی وہ بات سناؤں کہ نیند خواب میں بھی نظر نہ آئے۔ یاد ہو گا کہ اس بوڑھے کھوسٹ نے ایک جوان طناز شوخ سراپا ناز کو بیاہا تھا، اور خود جا کر دوسرے شہر میں بسے تھے۔ وہ انتا غفیل ہوتے اور ان کی بیوی نے سرا میں کچھ دکانیں سی بنوا کر رہنا، اور مسافروں کو بسانا شروع کیا میاں آزاد نامی ایک بھلے مانس ان پر ایسے لٹو ہوتے کہ روز اپنے ساتھ سانڈنی پر بٹھا کر تماشہ دکھانے لے جاتے تھے۔ ایک دن ایسے ریجھے کہ اس کے ساتھ بیاہ کرنے کا اقرار کر لیا۔ ادھر پھر

مکر گئے۔ اب اس نے نالش جڑ دی تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، یہ دیکھیے یہ لیٹے ہوئے ہیں۔

مسلمان : ہونھ کہنے لگے بھلے مانس، بھلے مانس ہوتے تو چھوڑ بھی دیتے۔ اجی مزے سے نکاح پڑھواتے اور اس کی جمع جتھا لے کر دھتا بول دیتے۔

میاں آزاد کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کہ یہاں بھی ہمارے پہچاننے والے موجود ہیں۔ جب ٹھنڈا وقت ہوا تو میاں آزاد پھر چلے۔ مگر افسردہ، اور پژمردہ، چلتے چلتے خدا خدا کر کے نواب کے شہر کے قریب پہنچے۔ جب کوئی دو ڈھائی کوس شہر رہ گیا۔ تو ایک کنوئیں پر پانی پیا، کہ اتنے ہیں ایک بھڈری آنکلا۔ ساعت بچاریں ساعت، سگن بچاریں!

بھڈری : (پوتھی سنبھال کر) تمھاری نواب صاحب کے یہاں بڑی تلاش تھی جی۔ تم گائب کہاں ہو گئے تھے، اونٹ کے کے، اب میں جا کر کہوں گا کہ میں نے پرشن دیکھا تو نکلا کہ آجاد (آزاد) پانچ کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جب تم ٹپ دینی پہنچ جاؤ گے تو پھر ہماری چڑھتی کلاں ہو گی۔ تم کو بھی آدھوں آدھ بٹا دیں گے۔ مگر بھانڈا نہ پھوڑنا۔ چڑھ باجی ہے۔ جو تم راضی ہو جاؤ تو چاندی ہے۔

آزاد : واللہ کیا سوجھی ہے۔ منظور ہے بس اب تم جاؤ۔ ہم بھی دم کے دم میں پہنچتے ہیں۔

بھڈری نے پشتک بغل میں داب کر راہ لی، اور نواب کے یہاں دھر دھمکے۔

خوجی : اجی جاؤ بھی تمھاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی اب کہو کچھ حکم لگاتے ہو؟

نواب : برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے برسوں۔ ایک دو دن نہیں برسوں برسوں۔ اس وقت کچھ پرشن درشن بھی دیکھو گے یا باتیں ہی بناؤ گے چکنی چپڑی۔ ہم کو تو مسلمان بھائی تمھاری وجہ سے کافر کہنے لگے۔ اور تم ذرا محنت کر کے کوئی اچھا سا حکم نہیں لگاتے۔

بھڈری : وہ حکم لگاؤں کر پٹ ہی نہ پڑے۔

خوجی : اجی جاؤ بھی دیکھ لیا۔ بس زبانی داخلہ۔ ڈینگیئے ہو خاصے۔ کہیں کسی روز میں قرولی نہ بھونک دوں۔ سوائے بے پر کی اڑانے کے بات سیکھی ہی نہیں۔ مرد آدمی سال بھر میں ایک دفعہ تو سچ بولا کرو۔

مصاحب : واہ سچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جاتے۔

نواب : یہ کیا وا ہیات گفتگو ہے۔

بھڈری : ناہیں ہم سے ان سے ہنسی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں کہتے ہیں، ہم انھیں۔ اب آپ کوئی پھول من میں لیں۔

نواب : یہ ڈھکوسلے ہمیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں صاف صاف بتادو کہ میاں آزاد کب تک آویں گے۔

بھڈری : (کچھ بڑبڑا کر) پانی کے پاس ہیں۔

مصاحب : واہ آسوں برکھا گھم گھم برسے۔ واہ استاد پانی کے پاس، ایک ہی کہی۔ لڑکی نہ لڑکا۔ دونوں طرح اپنی ہی جیت۔

بھڈری : یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں، جو نہ ہوں تو ناک کٹا ڈالوں۔

خوجی : آؤ آؤ، ناک ناک بدتے ہیں۔ وہ منزلوں کی راہ ہیں سانڈنی کے کوڑے کیے ہوں گے۔ گل چھرّے اڑا رہے ہوں گے۔ آپ تین کوس لیے پھرتے ہیں۔

رفقا : حضور یہ بھڈری بڑا فیلیا ہے۔ آپ تو پوچھتے ہیں کہ میاں آزاد کب آئیں گے، وہ کہتا ہے کہ تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ واہ رے جھپ جھالیے۔ سوائے جھوٹ۔ سوائے جھوٹ۔

بھڈری : تو بتاتے بتاتے بتائیں گے۔ یا ایک دم سے بتا دیں، سوچیں بچاریں بھی تو۔ ے ناک ناک کون بدتا ہے۔ کاٹ ہی لوں گا۔ ناکے کے پاس گوندنی والی بغیہ میں میاں آجاد بیٹھے ہوں گے، جاؤ دیکھ لو۔ پوتھی جلا دوں ناک کٹا ڈالوں جو جھوٹ نکلے۔

نواب : چابک سوار کو بلواؤ، اور حکم دو کہ ابھی سُرنگ گھوڑی پر سرپٹ جائے، اور دیکھے میاں آزاد ہیں یا نہیں۔ ہوں تو اس بھڈری کا آج گھر بھر دوں۔ بس آج سے اس کا معتقد ہی ہو جاؤں۔

چابک سوار نے بانکا منڈھا سا باندھا، اور سرنگ گھوڑے پر کاٹھی کس، یہ جادہ جا۔ پچاس ہی قدم گئے ہوں گے کہ گھوڑی بھڑکی، اور عین تیزی میں دوسرے ناکے کی راہ لی۔ چابک سوار بہت اکڑے بیٹھے تھے، مگر روک نہ سکے۔ دھم سے منھ کے بھل سڑک پر، گھوڑی چمپت۔

خوجی : حضور گھوڑی نے نادر علی خان کو دے پٹکا، اور کیا جانے کس طرف نکل گئی۔

نواب : چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم شرغہ ٹانگن کسواؤ، اور دوڑ جاؤ۔

خوجی : پیر و مرشد میں تو بوڑھا ہو گیا، اور رہی سہی سکت افیم نے لے لی۔ ٹانگن ہے بلا کا شریر۔ کہیں پھینک پھانک دے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، تو دین و دُنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے، اور ہم سب کو بھی بلا میں مبتلا کر گئے۔ حضور مجھے معاف کیجیے، شرغہ بُرا ہوتا ہے۔ اور یہ ٹانگن برسوں سے بندھا ہے، اور کاٹ کھاتا ہے۔ پتنگ اچھالتا ہے۔ دولتیاں جھاڑتا

ہے۔ خدائی بھر کے عیب تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ میرا تو بھُرکس ہی نکل جائے گا۔

میاں آزاد ادھر اُدھر ٹہلنے لگے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ مکان بنا ہے۔ مختصر و موزوں، خوشنما اور دلکشا، ارد گرد گلبن بھی ہیں۔ دوب بھی چو طرفہ جمی ہوئی ہے۔ سڑک پر سرخی بھی کُٹی ہے۔ شوق چرّایا کہ دیکھیں تو یہ کیا ہے۔ جب ہم تھے تب تو یہاں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ حال میں بنا ہے۔ خراماں خراماں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے، لکڑی ہلاتے پہنچے، تو دیکھا کہ کسی کا مقبرہ سا ہے۔ اخاہ یہ کسی بڑے شخص کا مقبرہ ہے کتبہ پڑھا تو یہ لکھا تھا:

شورے شد واز خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم

قرار پر انوار، مقبول بارگاہِ لم یزلی، ولی حق آگاہ، عارف باللہ، حضرت صف شکن علی شاہ۔ برد اللہ مضجعہ و انار اللہ برہانہٗ:

پختہ مکان کی طرح سے ہے فکر گور بھی
انسان جان دیتا ہے آرام کے لیے

رہتا ہے آدمی کا نشان اس جہاں میں
بنتی ہے قبر بعدِ فنا نام کے لیے

اے خاک تیرہ خاطر مہمان نگاہ دار
کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میاں آزاد نے جو یہ پڑھا کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ یہ کہیے یار لوگوں نے قبر بھی بنوا دی۔ واللہ کیا کیا فقرے باز ہیں۔

ادھر چابک سوار نے شبدیزِ آہو شکار سے پٹخنی کھائی، اُدھر ایک لونڈے نے تالی بجائی، مگر واہ رے شہسوار کچومر نکل گیا۔ لیکن وہی خم ودم، گرد پیچھے جھاڑی۔ پہلے نواب کے اصطبل میں گئے۔ اور ایک خوش خرام و تیز گام کمیت پر کاٹھی کس، سوار ہوتے ہی کڑکڑا دیا۔ ہوا سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے گوندنی والی بغیہ میں دھم سے جا کودے۔ دیکھا تو سانڈنی پر کا نگریزی جھول جھلک رہی ہے۔ اور اونٹنی گردن جھکائے چو طرفہ مٹک رہی ہے پکارا میاں آزاد، میاں آزاد ہوت! اخاہ۔ آپ ہیں۔ آئیے ذرا بغل گیر تو ہو جیے، مصافحہ، معانقہ، دونوں میں سے ایک تو ہو، بسم اللہ کہیے، مزاج معلّٰی۔ اجی ہمارے مزاج کی نہ پوچھو۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ۔ ابھی شیطان انگلی دکھائے تو ولی ہو رہیں۔ وہاں وحشت ٹیٹوائے تو دھماکے سے جبل پور پہنچیں۔ آپ کہیے نواب کے یہاں تو خیریت ہے۔ جی ہاں خیر صلاح کے ڈھیر ہیں۔ مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ ارے میاں کچھ اور بھی سنا۔ اس بٹیر کی قبر بنائی گئی ہے۔

سمجھے صاحب یہ سامنے وہی تو ہے، واللہ لانا ہاتھ تو۔ یار تمھاری ہی کسر تھی۔ کہو ہم نے سنا، خوب گلچھرے اڑائے۔ چلو پھر اب نواب نے یاد کیا ہے۔ ایں! انھیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہوگئی۔ بھئی۔ اجی اب یہ ساری داستان راہ میں سنا دیں گے۔ اچھا تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں۔ لائیے! ایک نہیں دس۔

میاں آزاد نے تڑ سے خط کھینچ ڈالا۔

آج قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ دماغ فلکُ الافلاک پر ہے۔ سینہ تختۂ گُل بن گیا۔ اور کیوں نہ ہو۔ میاں صف شکن علی شاہ، حق آگاہ قدس سرہ الشریف کی سواری آتی ہے۔

ساقی بنورِ بادہ برافروز جام ما — مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما

چنداں بود کرشمۂ و نازِ سہی قداں — کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

اے باد اگر بگلشنِ احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما

حضور کے نمک کی قسم! ادھر تحت الثریٰ، ادھر نہ کرسی آسمان تک، ہو آیا۔ تب کہیں جا کے کھوج پایا۔ شاہ جی صاحب ہر روز ڈاڑھیں مار مار کر روتے ہیں، اور الحقُّ مُرٌ الحقُّ مُرٌ کیا کرتے ہیں۔ کل میں نے عند التذکرہ لآنی ذکر خیر حضور بہ سلک بیان پر دیے، تو آہ سرد کھینچ کر فرمایا، کہ بہ خدا و بدرے شخصے کہ رحیم ست، وکریم ست، وعلیم ست، وحلیم ست، وحکیم ست، وعظیم ست، وسلیم ست، وقدیم ست، وشریف ست، ولطیف ست، وخبیر ست، وبصیر ست، وکبیر ست، ورؤف ست، وغفور ست، وشکور ست، وودود ست، ومراخلق نمود ست، وبود خالق آفاق، قسم می خورم، اکنو مرا ہیچ، از ہجو تو سروکار نبود ست۔ ولی از خرفت گشت، شروع ایں ہمہ اقوال مزخرف شنو! اے مردکِ ناداں، اندر دہنت آب زمزم، ومبدم، یا واللہ کی دم پر دم، خم اور چم، چم اور خم، امبو بھئی امبو:

ہو عطر سہاگ کا لگا کر مرور — آرام محل رکھ اسم دل کا اور حور

وہ طور دکھا ہم کو کہ گُل ہو معلوم — مو شے کا عالم اور وہ لمعۂ طور

سنیے! حضور پُرنور، بندہ جاں نثار نے وہ کام کیا ہے کہ خلعت دیجیے، انعام و اکرام دیجیے یاقوت اور جواہرات میرے اوپر سے صدقے دیجیے، اللہ اللہ یہ کار نمایاں کیا کہ، صف شکن علی شاہ غازی کو سمجھا بجھا، منا منوا کرلے آیا۔ بڑی بڑی دلیلیں چھانٹتے تھے۔ پہلے فرمایا کہ۔ ع۔ دیں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ شاہ جی۔ ع۔ کہ پروانگی داد پروانہ را

کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اور اشارے سے بلا لیا۔ رد برو گیا۔ تو خدمت گار سے "! رمضانی نکسانِ می آیند" میں نے بڑھ کر عرض کیا کہ پیر و مرشد۔ "ناکسان بیش کسان می آیند"۔ پیٹھ ٹھونکی، اور فرمایا کہ شاباش برخوردار نواب صاحب کے صحبت میں آپ بہت برق ہو گئے ہیں۔ الغرض کامل دو ہفتے تک مجھ سے رد و بحث رہی۔ آخر کار فرمایا کہ تمھاری سر مغزن سے یاد الٰہی میں فتور پڑتا ہے۔ میں نے قدم لیے، اور دست بستہ عرض کیا کہ آپ چلیے، ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ مجھے سمجھایا اور کہا، دیکھو یہ زندگی بہیں عطیۂ یزداں ہے۔ اس کو مفت میں رائیگاں کرنا خلاف عقل و سعادت ہے۔ مگر خیر تمھاری خاطر سے چلتا ہوں، لیکن وہ خوجی جو نواب صاحب کے مزاج میں دخیل ہیں، ان سے میری طبیعت نفور ہے۔ میں ایک شرط سے چلتا ہوں کہ جس وقت میں وہاں پہونچوں، تو نواب صاحب کے خوجی پر بیس مشکیں پڑیں۔ عرض کیا بیس نہیں بائیس، فرمایا کہ قول دو، عرض کیا کہ قول جان کے ساتھ ہے۔ تب کہیں آئے۔ اب آپ لوگوں کو ٹھاٹھ سے بھیجیے، تو دھوم دھام سے میاں آزاد کو ساتھ لائیں۔ اور اہل شہر ان کی زیارت سے استفادہ اٹھائیں۔ میں بالکل چُر مر ہو گیا ہوں۔ لیکن حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ اب جلوس جلد بھیجیے، تو شاہ جی صاحب تشریف لائیں۔

یہ خط لے کر چابک سوار روانہ ہوا۔

نواب کا کاملِ فن شہسوار، شبدیز باد رفتار، کو ران کے تلے دبائے، باگ اٹھائے، آسن جمائے، مہمیز کا اشارہ کرتا، اکڑتا برتا، کھٹا کھٹ جا رہا تھا۔ اور پھٹا پھٹ کوڑے جما رہا تھا۔ اصیل گھوڑا، اور اس پر کوڑا، تاب کہاں، بلا کی طرح جھپٹا۔ بگولا بن گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دریا لہریں مارتا ہے۔ ہوا بھی مقابلہ کو آئے تو پچھاڑیں کھا کے اس کی گرفت تک کو نہ پائے کیوں نہیں، نواب کے اصطبل کے گھوڑے، خاصے کے گھوڑے، پریزاد گھوڑے، دیو نژاد گھوڑے ہیں، کہ باتیں۔

الغرض میاں آزاد کا خط لے کر چابک سوار نواب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

چابک سوار : مجرا عرض ہے۔

نواب : سلام۔ کہو بیٹا کہ بیٹی؟ جلدی سے بولو، یہاں پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوئے ہیں۔

چابک سوار : حضور غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو جرمانہ دوں۔ بس گھوڑے کی پیٹھ پر آیا اور کڑ کڑا یا۔

خوجی : کتنے بے تکے ہو میاں۔ سوال دیگر جواب دیگر، کہیں کھیت کی سنیں کھلیان کی۔ بھلا اپنی کارگزاری جتانے کی یہ کون سو قع ہے جی۔ آزاد کا پتہ بتاؤ، مارے مشیخت کے دبلے ہی ہوئے

جاتے ہیں۔
چابک سوار : حضور گوندنی والی بغیا کے پاس زین پوش بچھاتے بیٹھے ہیں، اور حضور کو یہ عرضی دی ہے۔
نواب : لاؤ لاؤ، لاؤ لاؤ، بھئی لاؤ، کہیں لاؤ تو کوئی ہے؟ منشی صاحب کو آواز دینا۔
منشی : تسلیمات عرض کرتا ہوں پیر و مرشد!
منشی صاحب نے خط پڑھنا شروع کیا تو حاضرین جلسہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ع۔ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"

خیز دلا صبح سعادت دمید
فصلِ گل و بادِ بہاری وزید

از مددِ شیرِ خدا می ودود — صورتِ عنقا می طرب برکشود
...ذ کار قص چو طاؤس کرد — مست شدہ آہو صحرا نورد
طائرِ اقبال بہ نشو و نما — سایہ فگن گشت بسانِ ہما

بوقت صبح ہو یوں نشۂ شراب طلوع
کہ جیسے شرق سے کرتا ہے آفتاب طلوع

یکایک ابر سے شیشے کے ہو گیا ساقی — وفورِ نور سے خورشیدِ جام ناب طلوع

خوجی : خداوند جاں بخشی ہو تو غلام کچھ عرض کرے؟
نواب : جان بخشی کیسی۔ آج تو وہ خوشی ہے کہ بادشاہ قیدیوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اور یہاں تو اس وقت شادی مرگ کی نوبت ہو گئی ہے۔ قدسیوں نے لاہوت پردہ نہ دیکھا ہو گا۔ جو ہم نے ان آنکھوں سے اس دار الغرور میں دیکھ ڈالا۔ ایسی خوشی کے وقت جان بخشی بھی کیسی بے تکی بات ہے۔ کہو نا؟
خوجی : پیر و مرشد۔ اور تو میاں آزاد نے جو کچھ لکھا اس میں رتی بھر فرق نہیں، مگر غلام کا جو حال لکھا ہے وہ سب ڈھکوسلا ہے۔ جو ذری بھی اصلیت ہو تو ہاتھ کٹا ڈالوں۔
بھڈری : بس بیٹھے رہیے۔ تم پہلے بھی تو ناک کٹاتے تھے۔ اب کاٹ لوں جڑ سے ناک۔ ہجور غلام کا پرشن کیسا ٹھیک نکلا، جو ہے سو مانو نشانے پر تیر۔ کھٹ دینی بیٹھ گیا۔
نواب : ہاتھی گھوڑا جاگیر انعام اکرام جو کہو دیں گے، مگر ذرا میاں آزاد کو آنے تو دو، اور

کیوں بھئی رمّال نے تو بیان کیا تھا کہ صف شکن علی شاہ کے دشمن خدا نخواستہ داخل خلد ہوئے۔ یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے۔ خیریت ہے۔ کیوں میر صاحب واللہ اعلم یہ کیا اسرار ہے۔

میر صاحب: خداوند نعمت اس کی کُنہِ حقیقت تک پہنچنا امر محال ہے۔ جناب باری کے قصر رموز کا کنگرہ رفیع، اس درجہ بلند ہے کہ اس کے لب بام تک کمند اوہام کا پہنچنا دشوار ہے۔ ازبس دشوار ہے۔ ماعرفناک حق معرفتک۔ ماعبدناک حق عبادتک"۔

ہے تجھ کو جنون کی قسم اے جذبِ محبت
اس نور تجلی کی جھلک مجھ کو دکھا دے

رفیق: قربان جاؤں حضور! ہمیں تو کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوتا ہے۔ شق القمر تک تو جناب رسالت مآب نے کر دکھایا، اور اسند راج پر اعتبار ہو تو سمندر پھاند پھاند گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے فرشتوں نے بھی نہیں سنا کہ مردہ بٹیر از سر نو زندہ ہو جاتے۔ کیا لوٹ پوٹ کے پر پُرزے جھاڑ کر اٹھ بیٹھے ہیں۔ تو یہ کہیے جو سچ ہو تو ڈاڑھی منڈوا ڈالوں۔

اتنے میں اندر چھوٹی بیگم کو خبر ہوتی۔ مبارک قدم نے کچا چٹھا کہہ سنایا۔

بیگم: ہمارے میاں کا ایسا سُست اعتقاد کوئی خدائی بھر میں تو ہووے گا نہیں۔ تو پدّے کے برابر تو موا بٹیر، اور خوشامد خوردن نے ابھار ابھار کر مقبرہ بنوا دیا۔ میری باتیں تو انھیں بُری لگتی ہیں۔ میں خواہی نخواہی روز روز کہاں تک بکوں، مجھے تو ڈر ہے کہ کوئی مجھ پر کچھ طوفان نہ باندھ دے اسی سے میں چھیڑ خانی نہیں کرتی۔ ان کے پاس جو آتا ہے جھوٹوں کا سردار۔

مبارک قدم: بیوی بُرا مانو یا بھلا۔ تمھیں وہ راہیں ہی نہیں معلوم کہ میاں قابو میں آ جائیں۔ ہم نے تو نیک قدم کے ابّا کو شیشے میں اتار لیا تھا، رہا تمھیں تو بھونی مونگ سمجھتے ہیں۔ جھوٹے خوشامدیوں کی دھاڑ کی دھاڑ، جمع رہتی ہے۔ نوج ایسے کسی کے میاں ہوں، آپ تو جان بوجھ کر کے انجان بنی جاتی ہیں۔

بیگم: تم نے تو مبارک قدم دھوپ میں یہ چونڈا اسفید کیا ہے۔ میری جوتی کی نوک کو کیا غرض پڑی ہوئی ہے۔ جب تو میں ان دہاڑوں کو پہنچی، جو کلہ درازی کرتی تو جانے کیا ہوتا۔ ایک دن ذری سنھ پھلا کر بیٹھی تھی تو جرّاد کیل اگلے نے نہ بنوادی نہ بنوادی۔ تم اچھی پٹی پڑھاتی ہو۔

ادھر تو بیوی اور لونڈی میں یہ چخ چل رہی تھی اُدھر سنیے، کہ نواب قمر رکاب نے کل رفقا اور مصاحبین، اور حوالی موالی کو بلا کر حکم دیا کہ اصطبل کے سب ترکی عربی تازی گھوڑے اور فیل

خانے کے دیو نژاد مستیوں کی دھت، ہاتھی اور فٹن، اور بگھیاں، اور خاص بردار، اور جھنڈی بردار سپاہی، جتنے ہماری سرکار میں ہیں۔ سب سے کہو لیس ہو رہیں، اور شہر بھر کے امیروں اور رئیسوں سے جلوس طلب کر لو، اور سجا کر جاؤ۔ صف شکن علی شاہ کو ساتھ ہی لے آؤ، مگر انتظام ایسا ہو کہ لوگ دور دور تک تعریف کریں۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے۔ انگریزی باجا ضرور ہو۔

خوجی: اے پیر و مرشد انگریزی باجا تو آج کل دھوبیوں بھنگیوں تک کی برات کے ساتھ ہوتا ہے "اس میں کیا منت ہے۔ رہا جو دھوم دھام چاہتے ہوں حضور تو غلام کو افسر مقرر کیجیے، اور میر صاحب کو میری نیابت میں دیجیے۔ پھر مزہ دیکھیے انتظام کا۔

میر صاحب: بجا ہے۔ یہاں بادشاہوں کی مصاحبتیں کیا کیے ہیں اور آپ کے نائب ہوں۔

نواب: اچھا تم دونوں مل جل کر انتظام کر لو۔

پھر کیا تھا۔ اتنا اشارہ پانا تھا کہ لگے ہاتھوں سب بندوبست ہو گیا۔ کیل کانٹے سے درست چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑے کھڑے جلوس دیکھ رہی ہیں، اور دل ہی دل میں ہنس رہی ہیں کہ نواب کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ اس وقت کوئی خوجی کو دیکھتا۔ دماغ ہی نہیں ملتے تھے۔ اس کو ڈانٹ، اس کو ڈپٹ۔ کسی پر دھول جمائی، کسی کو چانٹا رسید کیا۔ اِس کو پکڑ لاؤ۔ اُس کو گرفتار کرو۔ کبھی مشعلچی کو گالیاں دیں، کبھی پنشانے والے کو بے نقط سنائیں۔

الغرض جد و جہد اور اہتمام بلیغ کے بعد، جلوس اس ترتیب سے چلا۔ سب کے آگے نشان کا ہاتھی۔ ہری ہری جھول پڑی ہوئی۔ مستک پر سیندور سے گل بوٹے بنے ہوئے، ایک دُنبا ملکنا ہاتھی جھوم جھام کر جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی باجا۔ گکڑ جھنیڑ۔ تڑ تڑ تڑ تڑ تڑ، دھم دھم، دھم دھم، اس کے بعد آرائش۔ پھولوں کے تخت، چنبیلی کھلا ہی چاہتی ہے۔ کلیاں چٹکنے کو ہی ہیں۔ کنیکی اب مہکی اور اب مہکی۔ جوہی پر نیا عالم ہے۔ موگرا کا تختہ جوبن پر ہے۔ گلِ لالہ کھلا ہوا ہے۔ رہس[1] منڈل وہ

---

[1] رہس، اصل میں داس ہے۔ جو کرشن جی کی لیلاؤں میں ایک لیلا ہے...... کرشن جی نے گوپیوں سے وعدہ کیا تھا جاڑوں کی راتوں میں تمہاری تمنا پوری کروں گا جب جاڑے کا موسم آیا تو کرشن نے بانسری بجا کر برج میں سب کو جمع کر لیا پھر خود غائب ہو گئے۔ گوپیاں بے چین رہیں کہ اچانک کرشن نمودار ہوئے اور ان کے ساتھ ناچ گانے اور تفریح میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح کرشن درمیان میں اور گوپیاں چاروں طرف سے ان کو گھیرے رہتی تھیں۔ اسی کو رہس کہتے ہیں (لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ مسعود حسن رضوی)

بنایا کہ جس نے دیکھا جی خوش ہو گیا۔ چانڈو بازوں کے تخت میں قلم توڑ دیے (ماشاء اللہ کیا تعریف کی ہے) دُو چار تو پینک میں غبن ہیں۔ دنیا کی خبر ہی نہیں۔ دس پانچ اوندھے پڑے ہوئے منھ سے دھوئیں کے بکّے اڑا رہے ہیں۔ کوئی بمبئی کا پونڈا لیے ہوئے، چانڈو بازانہ ادا سے چھیل رہا ہے، ایک گنڈیری چوس رہا ہے۔ گر مٹ تھک۔ افیم۔ نگالی، تیل کی کپّی، سب ہی کچھ ہے۔ شکار کا وہ سماں باندھا کہ واہ جی واہ۔ ایک شکاری بندوق چھپائے، گھٹنا ٹیکے، آنکھ دبائے، نشانہ لگا رہا ہے۔ دھائیں کی آواز بس آیا ہی چاہتا ہے۔ ہرن وہ چوکڑیاں بھرتے جاتے ہیں۔ خرگوش وہ کان دبائے لپکے آتے ہیں۔ اس کے بعد انگریزی باجا، تال سم و سر سے درست، اس کے بعد گھوڑے۔ کمیت کاٹھیا دار، کچھ سرنگ، کرنگ، نقرہ خنگ، کمیت سبزہ، ویلا، چھم چھم کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ دُو دُو آدمی تعینات، گھوڑے دلہن بنے ہوئے۔ منہدی کا رنگ رچائے، پرے جمائے، کمر نازک ذرا سی کھوتھنی، چوڑی پیشانی، کنوتیاں بدل رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر ارگن باجا، غول کے غول۔ اس کے بعد تامدان، فنس، پالکی، نالکی، سکھپال اس کے بعد پھر باجا۔ اس کے بعد پریوں کے تخت، نازنینان عربدہ جو، اور پری پیکرانِ عنبر مو تختوں پر تھرک رہی ہیں۔ صدہا تماشائی ان کے شمعِ رخسار کے پروانہ ہیں۔ اس کے بعد روشن چوکی والے ستم ڈھا رہے ہیں:

مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو
بادۂ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو
با صنمے چو لعبتے خوش بنشیں بخلوتے
بوسہ ستان بکام از و تازہ نو بنو

اس کے بعد ہاتھیوں کی قطار۔ جھومتے جھامتے سونڈ سے کھیلتے جاتے ہیں۔ روشنی کا انتظام بھی چوکس تھا۔ پنشاخے اور لالٹینیں جھک جھک کر رہی تھیں۔ سوئی گرے تو اٹھا لیجیے۔ رائی کا دانہ صاف نظر آئے۔ اس ٹھسے سے برات چلی۔ ارے توبہ! برات کیسی جلوس چلا کہ میاں صف شکن علی شاہ کو لائیں۔ جلوس کا جانا چکّر کھاتے شہر بھر کو دکھاتے:

آہستہ خرام بلکہ مخرام ۔ زیر قدمت ہزار جاں ست

شہنائی میں گاتے، بے فکرے بے تکی اڑاتے۔ اڑھائی چانول گلاتے چلے گوندنی والی بغیا۔ راہ میں جو دیکھتا ہے چکر میں آتا ہے کہ واہ اچھی برات ہے۔ دولہا کا پتا ہی نہیں۔ برات کیا گورگ دھندا ہے، ٹیم ٹام، دھوم دھام سب کچھ۔ مگر نوشہ ندارد، دولہا غائب۔

تمام شہر اور شہر کے گلی کوچوں، اور گلی کوچوں کے مکانوں، اور مکانوں کے در و دیوار، کے صدقے ہوتے جلوس غلین گوندنی والی بغیا پہنچا۔

اب سنیئے کہ میاں آزاد اپنی سانڈنی پر سوار صف شکن علی شاہ کو کابک میں بٹھائے سڑک پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ایں! صف شکن علی شاہ کہاں سے آگئے۔ اجی کسی ایڑ بٹیر کو ادھر اُدھر سے خرید لیا ہو گا۔ نا صاحب، وہی صف شکن۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ میاں آزاد نے اور سب بٹیروں کو تو اڑا دیا تھا۔ مگر صف شکن علی شاہ کو چھپا رکھا تھا، اب موقع پر ان کو نکالا۔ خیر خوجی آتے ہی ان سے بغل گیر ہوئے، اور میر صاحب گلے ملے، اور غفور خدمت گار نے سلام کیا، اور رفقاء مصاحبین۔

خوجی: مثل مشہور ہے کہ تنّو برس بعد گھوڑے کے بھی دن بہورتے ہیں، سو ہمارے تو آج دن بہورے، کہ آپ آئے، اور شاہ جی کو لائے۔ نواب کے یہاں سنّاٹا پڑا ہوا تھا۔ وہ چہل پہل ہی نہیں، وہ دل لگی ہی نہیں، صف شکن کے سوگ میں سب پر مُردنی چھائی تھی۔ نواب چونک چونک پڑتے تھے۔ کھٹ ہوا، اور پوچھا آزاد آئے، دھم ہوا، اور کنمنائے، مگر آپ نہ آئے نہ آئے۔ حاسدوں نے تو جڑ دی تھی کہ حضور وہ سانڈنی واتڈنی لے کر لمبے ہوئے۔ کیسے آزاد اور کہاں کے صف شکن، وہ پہنچے یہاں سے تنّو منزل پر۔ مگر یار ہم تمھارا جنبہ کرتے تھے۔

میر صاحب: جی ہاں اور ہم بھی آپ ہی کی طرف سے لڑتے تھے۔ ہم اور خواجہ صاحب دونوں۔

آزاد: بھائی کچھ پوچھو نہیں۔ واللہ آسمان میں تھگلی لگائی، تب کہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی۔ خدا جانے کن کن جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہوا، اور وہاں کیا کیا افتادیں پڑیں۔

خوجی: جی اس میں کیا شک ہے حضرت۔ یہاں لوگوں نے وہ گپیں اڑائی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کسی نے کہا بھانڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔ کوئی طوفان باندھتا تھا کہ کسی بھٹیاری کے گھر پڑ گئے۔ مگر سب بہتان۔ لوگ تہمتیں تراشتے ہیں۔ لیکن اب سب نے منہ کی کھائی مات تیرے گیدی کی۔

خلاصہ یہ کہ خوجی اور میر صاحب اور رفقا اور مصاحبین، سب کے سب مل کر میاں آزاد کو چیتے یار بناتے تھے، مگر ہمارے آزاد ایک ہی استاد، ان مردکوں کی قبر تک سے واقف تھے۔ خوب سمجھے کہ اب نواب کے یہاں جو ہمارا طوطی بولے گا، اس سے یہ سب ہمارے پارچے بن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک خوب گھل گھل کر باتیں ہوئیں، تو میاں آزاد نے کہا حضرت اب

رات جاتی ہے یا آتی ہے، چلیے نہ بس اب انتظار کس کا ہے۔ اچھا بسم اللہ کیجیے، پنشاخے چڑھاؤ، لالٹینیں جلاؤ گھوڑے چلاؤ، ہاتھی کے پرے جماؤ، باجا بجاؤ، تامدان بڑھاؤ، ہسب قرینے سے لگاؤ۔ جب جلوس آراستہ ہوا تو میاں آزاد ایک فیلِ فلک شکوہ پر جا ڈٹے۔ اور صف شکن علی شاہ کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ خوجی اور میر صاحب کو حکم دیا کہ خواصی میں بیٹھیں۔ ہائیں! واہ ہم بھی کوئی چوڑے چمار چرکٹے ہیں جو خواصی میں بیٹھیں گے۔ آپ بھی خوب کہتے ہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ اجی کچھ واہی سے معلوم ہوتے ہو، بیٹھ نہیں لیتے خواصی ہیں۔ کیا مشیخت میں بٹا لگے گا، یا شان کرکری ہو گی۔ خیر "قہر درویش برجانِ درویش" دونوں کے دونوں پیچھے بیٹھ لیے اور جلوس چلا۔ شہر میں تو پہلے ہی سے ہلڑ تھا کہ نواب والا ٹبر بڑے ٹھسّے سے آرہا ہے۔ لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے۔ چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ بھیڑ بھڑکا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ باجے کی آواز جو کانوں میں پڑی تو تماشائی چشم در راہ انتظار ہوئے۔ نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا، اڑاتا اٹکھیلیاں کرتا سامنے آیا۔ پھولوں کے تخت آگے تھے۔ انگریزی باجے نے کانوں کو سرور، نازنینانِ پری وش کے رخِ انور نے آنکھوں کو نور بخشا۔ جیسے ہی عین چوک میں میاں آزاد کا ہاتھی پہنچا، ویسے ہی دیوانی کے دو مذکوریوں نے ڈانٹ کر کہا کہ ہاتھی روک لے۔ آزاد کے نام وارنٹ آیا ہے۔ ارے! اوسان خطا ہو گئے۔ فیلبان نے جو دیکھا کہ سرکاری آدمی لال لال پگیا باندھے، کالی کالی وردی ڈانٹے، خاکی پتلون پہنے، چپراس لٹکائے، وارنٹ لیے، ہاتھی روکے کھڑے ہیں، تو اس کے ہوش پرّان ہو گئے۔ اور ہاتھی کو جدھر انھوں نے کہا اُدھر ہی پھیر دیا۔ میاں آزاد مع خوجی، اور مع میر صاحب و مع میاں صف شکن علی شاہ، اور مع فیلبان، اور مع ہاتھی، اور مع ہاتھی کی دُم مذکوریوں کے ساتھ ساتھ چلے۔ جلوس تتر بتر۔ کوئی تخت لیے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی جھنڈے لیے دبکا پھرتا ہے۔ گھوڑے تھان پر پہنچے۔ تامدان اور پالکیوں کو چھوڑ چھوڑ کر کہار اڈے پر ہو رہے۔ جلوس کا پتا نہیں۔ برات ورات سب غائب غلّہ۔ اب نئی سڑک کا پتا پوچھتے جاتے ہیں۔ خوجی ابھی افیم کی پینک ہی میں ہیں۔ میر صاحب چانڈو کے نشے میں غیں۔ اچھی دل لگی ہوئی۔ الٰہی یہ کیسی ہوا بندھی کہ ایک ہی جھونکے میں برات کا چراغ گُل، جلوس غائب۔ میاں آزاد لدے پھندے، خوجی اور میر صاحب خواصی میں بندھے، میاں صف شکن علی شاہ جور و جفا سہتے ہوئے اور فیلبان بُری اور دھت کہتے ہوئے، چلے۔ نئی سڑک کا پتہ پوچھتے پنشاخہ ہاتھ میں، دو مذکوری ساتھ میں۔ اب سنیے کہ ہاتھی اک اتفاقیہ قسمت:

گویا خرطوم اژدہا تھی صورت دیوار قہقہہ تھی

سنسان بیابان، ہو کا عالم، پرندہ کہیں نہیں مارتا تھا! اتنے میں ہاتھی جو گرجا تو جنگل بھر میں ہوک پڑگئی، اور خوجی اور میر صاحب ایک دفعہ ہی پلنگ سے چونک پڑے۔

خوجی : ایں پنشاخے چڑھاؤ، پنشاخے، ابے یہ کیا اندھیر مچایا ہے۔ (آنکھیں ابھی نیم باز ہیں) اور سنیے گا۔ ذری یوں ہی آنکھ جھپک گئی تو کی کرائی محنت ساری خاک میں ملادی۔ اب میں اتر کر کوڑے پھٹکاروں گا۔ تب مانیں گے۔ وجہ کیا باتوں کے آدمی کہیں لاتوں سے مانتے ہیں۔ (کہتے کچھ ہیں منھ سے نکلتا کچھ ہے)

میر صاحب : ہائیں! ہائیں! ہائیں! او فیلبان! یہ کہاں گلی میں آیا۔ یہ کیا آتش بازی سے بھڑکتا ہے ہاتھی۔ بڑھائے چلو۔ میل میل، دھت، دھت، (آنکھیں کھول کر) ایں! ارے میاں خوجی! یہ کس چٹیل میدان میں آنکلے۔ ذری خواب خرگوش سے جاگو۔ بھاگو بھاگو۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ بھئی میاں ذری دیکھو تو، الٰہی خیر اللّٰھم احفظنا من کلّ البلیاتِ۔ یا اللہ بچائیو!

یا علیؑ مشکل کشا مشکل کشائی کیجیے

خوجی : (چونک کر) پنشاخے چڑھاؤ پنشاخے۔ اور یہ باجے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ذرا زور زور چھیڑے جاؤ۔ اب تو بھاگ کا وقت ہے بھاگ کا۔

میر صاحب : آنکھیں تو کھولیے، روشنی کا چراغ گل ہوگیا۔ آپ کا اور میرا دونوں کا قبل ہوگیا۔ باجے والوں کی دُرگت ہوگئی۔ آپ وہی بے وقت کی شہنائی بجا رہے ہیں۔ اس جنگلے میں آپ کو بھاگ کی دُھن سمائی ہے۔

خوجی : پنشاخے چڑھاؤ، پنشاخے، نہیں میں کچا پیسا تو دوں گا نہیں۔ جھپ سے چڑھا نا تو پنشاخے شاباش ہے بیٹا!

میر صاحب تو جلے بھنے بیٹھے ہی تھے، خوجی نے جب کئی بار یہ ہانک لگائی کہ پنشاخے چڑھاؤ تو وہ جھلا اٹھے۔ ایک دفعہ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، خوجی بے چارے کو دھم سے ہاتھی پر سے نیچے ڈھکیل ہی تو دیا۔ ارر دھوں، کون گرا کون گرا؟ ذری ٹوہ تو لینا کون گرا کون، اے حضرت ٹوہ کیا لیں آپ ہی تو لڑھکے ارے! میں؟ ہائے ہائے! وہ تو کہیے ہڈی پسلی بچ گئی۔ نہیں شیطان نے تو تسمہ تک باقی نہیں رکھا تھا۔ یار وذری دیکھنا تو ہمارا سر بچا یا نہیں۔ واہ رے میرے گرنے، بس یہی معلوم ہوا کہ کوئی ڈوہ کا ڈوہ ہاتھی گرا۔ اللّٰھم احفظنا من کلّ البلیات۔

مذکوری : چلو، بس کل بلیار ہنے دو۔ ہو نہ کلبلیا، وہ تو کہو تیل ہتا، نا ہیں کلبلیا نکل جات۔ پھر

پہن سنھنا، اور چلے کلبلیاے۔ ادھر آؤ اٹھاؤ اٹھاؤ۔ (اپنا بوجھ ایک مذکوری نے خوجی پر لادا۔)

خوجی : ہائیں! کیا کوئی مزدورا مقرر کیا ہے، یا سر بوجھیا بنایا ہے ؟ شریف اور پاجی کو نہیں پہچانتا۔ ے اب اتارتا ہے بوجھ یا نالے میں پھینک دوں ؟ یا باپ کا سر سمجھ کر بوجھ لاد دیا جانو ہم گدھے ہیں۔ اوگیدی لانا قرولی۔

میر صاحب : گدھے نہیں اور ہو کون۔ تم نے بوجھ اٹھایا ہی کیوں۔ بڑا پاگل ہے۔ جب بوجھ سر پر رکھ لیا تب جھگڑتے ہیں سزا سزا سزا اب اور سینیے گا بوجھ سر پر رکھ لیا اور لگے گالیاں دینے۔ مزدورا کہیں کا۔

دوسرا مذکوری : تین کوس رے۔ ارے تین کوس اُتر ہاتھی پر سے اترت ہے۔ کہ ہم پہنچے پھر۔ ہائیں منھ میں ناہیں بولت ہے یو تو ارے ہم بکت ہیں، اددں پھر۔ تین اَس نہ منجھے۔

میر صاحب : کہتا کس سے ہے ؟ ارے کس سے کہتا ہے، کچھ بیدھا تو نہیں ہے۔ اور سینیے گا صاحب ارے کی یہ کیا تقریر ہے بچہ، ارے ترے کیسا۔ اور آنے میں کیا ہم کچھو نا بر کھوڑا ہی ہیں، لو آئے (دھم) ۔

دوسرا میر صاحب : اٹھا یہ بوجھ اٹھا، لکڑی ہے، ایک تھریا ایک لوٹیا، رکھ موڑے پر اور آگو آ۔

میر صاحب نے نیچے اتر کر دیکھا تو سرکاری پیادہ، لال پگیا جمائے، وردی ڈانٹے کھڑا ہے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ لگے تھر تھر کانپنے۔ چپ چپاتے تھالی لوٹا اٹھایا، اور مچل مچل کر چلنے لگے۔ مذکوری دونوں کے دونوں خواصی میں جا بیٹھے۔ اب خوجی اور میر صاحب دونوں مزدور بنے ہوئے لدے پھندے، گرتے پڑتے جانے لگے۔

خوجی : واہ ری قسمت۔ کہاں تو فیل نشین تھے۔ کہاں اب سر بوجھیے بنے چلتے ہیں۔ واہ کیا زمانے کا نشیب و فراز ہے۔ کیوں جی میر صاحب! ہم تو یادالٰہی میں تھے۔ یہ تم کو کیا ہوا تھا تم کہاں تھے۔

میر صاحب : جہاں حضور تھے وہیں بندہ بھی تھا۔ آپ بھی پینک میں تھا، میں بھی پینک میں تھا۔ دونوں عین۔ واللہ باللہ تم باللہ یہ آزاد چکما دے گیا۔ یہ اسی کی ساری کارستانی ہے۔

خوجی : خدا سمجھے، ایسا شریر آدمی تو دیکھا ہی نہیں، واللہ ہے۔

آزاد : ذرا چونچ سنبھالے ہوئے، نہیں اترتا ہوں، پھر آؤں، کردوں مرمت ؟

خوجی : بھائی فیلبان ہوت! تم کو خدا کا واسطہ، اتنا بتا دو ذری کہ یہ ہوا کیا ؟ یہ برات

کدھر رفو چکر ہوئی، انشاخے پنشاخے سب غائب غلہ، یاجا واجا سب تین تیرہ، نہ وہ روشنی نہ وہ گھر۔ فقط ہم اور بارِ دو خر۔ واللہ طلسمات کا ساماں، نظر آتا ہے۔ یہ سب جادو کی کرامات ہے۔

چلتے چلتے تڑکا ہو گیا تو خوجی بولے: لو بھئی ہمارا تو بھور ہی ہو گیا، اب جو بوجھ اٹھا کر لے چلے، اس کی ہفتاد پشت پر لعنت' (بوجھ پھینک کر) اے جس کا جی چاہے اٹھائے، مذکوریوں نے بوجھ ٹرے اٹھا لیا۔ اور ان دونوں کو بھی ہاتھی پر بٹھا لیا۔ جب ذرا دن چڑھا تو ایک مذکوری نے کہا: بھئی پھیلبان سامنے ہاتھی روک لینا، ہم ایک دو گوتے (غوطے) تو لگالیں، جھپاک سے بے نہائے چین نہیں۔

فیلبان: یہ کیوں۔ کیا کُتیا گھسیٹی ہے؟

مذکوری: ہاں تم کو کیا، تم تو چاہے بیس بیس دن نہ نہاؤ، ہم تو جات باہر کر دیے جائیں۔

فیلبان: اجی تو ایسا نہانا بھی کیا، تالاب دیکھا، اور کود پڑے، گڑھیا ملی اور پھاند پڑے۔ واہ نہانا بھی کچھ قضا ہے کہ ٹلے ہی نہیں، اچھے رہے، تم گنوردل ہی رہنے۔

مذکوری: ہاں تمھرے تروں (طرح) عید بکرید نہائیں تو گنوردل نہ رہیں۔

آزاد: خوجی کہو یار چے نہاؤ گے؟ بھئی ایک غوطہ لگاؤ، ہماری خاطر سے، واسطے خدا کے۔

خوجی: یوں ہی نہ زہر کی پڑیا دے دو، گلا گھونٹ ڈالو نہ، یہ دل لگی ہمیں پسند نہیں۔

خیر صاحب خدا خدا کر کے کہیں شہر میں داخل ہوتے، آزاد نے متحیر ہو کر کہا کہ ایں استاد دن چڑھ گیا۔ اب سنیئے، کہ سب سے پہلے تو میاں چانڈو باز کی منحوس صورت نظر پڑی۔

چانڈو باز: بڑے بھائی سلام۔ کہو خیر سلا۔ چینگی بوٹے، کچ بچ، سب اچھے، یار کروروں منتیں مانیں، تب میرے اللہ نے تمھاری صورت دکھائی۔ بھائی آنکھیں تم کو ڈھونڈھتی تھیں۔ ترس گئے یار ترس گئے۔ اب کہو، بناؤ کی بھی کوئی صورت ہے؟ ہمارا کہا مانو تو اس فضیحتی سے بچ جاؤ۔ بی اللہ رکھی نے یہ خط دیا ہے چپکے سے پڑھ کر جواب لکھ دو اور کہا مان لو۔ اپنا خاکا اڑانا مفت میں اپنے تئیں ہنسوانا اس سے فائدہ۔

یہاں آزاد نے خط لیا کھولا، پڑھا۔

بی اللہ رکھی کا خط

صدقے آنکھوں کے تیرے ساقی   ہے مجھ کو ہوس ابھی تو باقی

ایسی ہی شراب دے دھواں دھار — بڑھ جائے یہ جس سے شکر کا تار
اطرافِ حبش میں جو بنی ہو — انگور سیاہ کی جنی ہو
تیزی میں سیاہ مرچ سی ہو — جھونک اس کی نکیلی کرچ سی ہو
جس سے جھٹ چاندنی کرے کھیت — چمکے تاروں کی وضع سے ریت
بادل آئے ہیں عیش کے جھوم — اس وقت نہ رکھ تو مجکو محروم
جس سے کہ سرور یاد آئے — اللہ رکھی مراد پائے
گہری دلدار سے چھنی ہے — آزاد سے عقد کی ٹھنی ہے

میاں مجرا عرض ہے۔ کیوں جی، اسی منھ سے کہتے تھے کہ میاں آزاد کی پیاری، بی اللہ رکھی بھٹیاری۔ کیوں حضور بندی کا قصور، آپ تو مفت کے بھپارے دے کر سدھارے، مگر اپنا دل کراہا کرتا ہے۔ ہے ہے اندر والے کو کوئی کہاں تک سمجھائے، یہ کسی کے مان ہی کا نہیں، انھیں کرتوتوں تو اس درجہ کو پہنچا۔ ہائے یہ کیسا از غیب کا تھپیڑا، خدا کے واسطے کا بکھیڑا ہے۔ دیکھیں ابھی کیا کیا جھک جھوڑے جھیلنے، اور کیسے کیسے پاپڑ بیلنے ہیں۔ بن بیاہ کے تو میاں یہ بیل منڈھے نہ چڑھے گی۔ یہ عشق بھی حد بھر برا عارضہ ہے۔ خدا جانے مجھے یہ ہوا کیا۔ گھر گھاٹ نہ سوچا، اور ساری آبرو دکھاری کنوئیں میں ڈبائی۔ اور روز کی داستا کل کل، اور ان تمہارے چوچلوں سے اور بھی میرا جی جلتا ہے۔ جو ہمارے ساتھ بیاہ رچے تو تمہارا نصیبا جاگ اٹھے۔ میاں میں شوخ محبوب، تم مست و مجذوب، میں چندے آفتاب، چندے مہتاب، تم خانہ بدوش، خانماں خراب، میں مہ پارہ، تو ہیچکارہ، میں باغ و بہار، تو دل فگار، میں ستم ایجاد، تو خانہ برباد، میں فتنہ ہمدوش، تو خود فراموش، میں برقِ شرر بار، تو رند بادہ گسار، ذری اپنا منھ تو دیکھو۔ میاں چہرہ زرد۔ دل سرد، کپڑوں میں تو من گرد، رہ نورد، عورت سے بدتر نام کا مرد۔ میں بت طناز، سراپا انداز، سرمست خوبی، محو ناز، نازک آواز، گل عذار، گل بدن، گلرخ گلرنگ، رنگین ادا، شوخ و شنگ، چست و طرار، مردم آزار، آتشیں رو، یاسمین بو، میں آشوبِ دوراں تو شکست پیماں:

نمی گویم کہ تو نامردی آزاد — ولیکن بو العجب بیدردی آزاد
بجانِ من بلا آوردی آزاد — جہازم را تباہی کردی آزاد
ترا من ناخدا دانستہ بودم

زجورت جان من برلب رسیدہ　　جگر خون گشتہ از مژگان چکیدہ
بمردن کارم از دستت رسیدہ　　دلت دادم مسلمان زادہ دیدہ
نہ کافر ماجرا دانستہ بودم

پاک پروردگار کی قسم! جو ہمارے میاں ہو تو وہ پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئیں، کہ پرستان کو بھول جاؤ، دھاڑے کا دھاڑا، راجہ اندر کا اکھاڑا، جو ہے وہ پری چھم، جو ہے وہ جانِ عالم۔ مگر تم تو وہی ہیر پھیر کے وحشت ہی کی لیتے ہو۔ پہلے اتنے ہو تو لوکر کوئی نازک بدن محبوب چار دہ[1] سالہ تم پر مرے۔ سچ ہے:

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

خاتونِ جنّت[1] کی قسم! جو کہیں ہم سے تم سے بیاہ رچے تو کیسی مزے مزے سے کٹے۔ اور پھر لطف یہ کہ جہاں کہیں ہم کو اپنے ساتھ لے جاؤ، وہاں خدائی بھر تمہاری ہی خوشامد کرے، اور نہیں تو کیا۔ اور کیوں صاحب یہ دھاندلی کیسی؟ بھلا نہا دھو کر اور صاف پاک ہو کر، قرآن شریف پر ہاتھ دھرو کہ بیاہ کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر فرمائیے ہمیں گنجائش شکوہ سنجی ہو یا نہ ہو۔ کیوں ناحق انصاف کا گلا کند چھری سے ریتتے ہو۔ چلو اب ہنسی دل لگی تو ہو چکی، کہیے اب وحشت دور ہوئی یا نہیں؟ تم پھولوں کی سیج پر سوؤ گے۔ سونے کو خسخانہ، پینے کو برف آب، صبح کو شراب، شام کو کباب، چٹری اور دُو دُو۔ بے مرّوت اب اس خط کا جواب تو لکھ دینا۔ نہیں میں اپنی جان دوں گی اب جواب کے بدلے کہیں ٹکا سا جواب نہ دے بیٹھنا۔

"میاں آزاد کی پیاری بی اللہ رکھی بھٹیاری"

میاں آزاد، پھر جانیے عاشق تن آدمی، اور بی اللہ رکھی کی پیاری پیاری ادائیں، تو دل میں کھپ ہی گئی تھیں۔ وہ اچپلاہٹ، وہ چلبلاہٹ، آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ خط کو سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ اور جواب میں لکھا مگر دو ہی باتیں۔

سنو بیوی! ہم جنٹلمین ہیں۔ کوئی اُٹھائی گیرے نہیں ہیں۔ تم لیڈی ہوتیں تو خیر مضائقہ نہیں۔ مگر ٹھہریں بھٹیاری۔ بھلا پھر ہم سے کیوں کر بنتے۔ مانا کہ آشوب دوراں بلائے جسم و جان ہو۔

---

[1] خاتونِ جنّت حضرت فاطمہ زہرہ کا لقب ہے۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور حضرت امام حسین شہید کربلا کی والدہ ماجدہ تھیں۔

لیکن شریف زادی تو نہیں۔ زر بفت میں زر بفت ہی کا پیوند لگتا ہے۔ گاڑھے کا پیوند بے تکا پن ہے۔ اللہ اللہ آپ بھی اتنی ہوئیں کہ ہماری چاہتی بیوی بنیں۔ اے تیری قدرت، شانِ خدا۔ مگر سچ کہوں جس وقت وہ زلف چلیپا یاد آتی ہے، کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ وہ چال، وہ بال، اچھا پھر اب کیا کہتی ہو؟ بیاہ کروگی تو خیر ہم بھی موجود ہیں۔ جب کہو سہرا بندھے۔ بس اب خوش ہوئیں، وہ ہنس دیں۔ اس مسکراہٹ کے قربان، لو قول دیا۔ اب بیاہ رچے، چلو اس مقدمے کی جھنجھٹ ہی سے بچے سہی۔ اب کوئی کہاں تک بکے۔ اس وقت تو نیند آرہی ہے۔ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ والسلام

"خانہ برباد میاں آزاد"

چانڈو باز نے جو یہ خط پایا تو۔ ع۔ پتّا ہوا اور پتّے پہ آیا۔

چانڈو باز: بی اللہ رکھی! اے بی اللہ رکھی! اے لو سو رہیں، اے واہ، دن دہاڑے خرّ خرّ خرّاٹے لینے لگیں۔ دیکھو تو میں لایا کیا ہوں۔

اللہ رکھی: دور کی کوڑی لائے، کیا ہوا اپنا سر۔ میٹھی نیندیں جگا دیا ہے کے بڑے وہ بنے ہیں۔

چانڈو باز: بڑے چھوٹے کے برتے پر نہ رہیے گا۔ دیکھو تو میں کیا لکھوا لایا۔ آزاد نے تو اپنے ہاتھ ہی کاٹ دیے، لو اب کیا پوچھنا ہے۔ اب تو چڑھ بنی۔ آج کے دسویں دن دولہن بنو میاں پائے۔ بیاہ مبارک، ہمارا حق دلواؤ۔ جس طرح وکیل صاحب نے پٹی پڑھائی تھی، اسی طرح کل کارروائی بھگت گئی۔

اللہ رکھی: چین کرو یہ لکھا ہے کہ نکاح کرلوں گا، جو یہ نہیں لکھا تو پھر کچھ بھی نہیں۔ جاؤ وکیل کو خط دکھادو۔ اور جو کہیں وہی کرو۔

قسمت کو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

نواب پھول کے کپّا ہو گئے تھے، جیسے خاصہ ہاتھی کا پاٹھا۔ مارے خوشی کے ایسے پھولے، کہ سچ مچ جامے میں نہ سمائے۔ بند چٹ چٹ ٹوٹ گئے اور کیوں نہ ہو غنچۂ دل کھل گیا تھا۔ بڑے ٹھسّے سے بغیچے میں جھوم جھوم کر ٹہل رہے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جاتے ہیں، کہ جلوس اب آیا۔ کڑک دھوں کی آواز اب آئی، اور اب آئی۔ نشان کے ہاتھی کا پھریرا اب سامنے اُڑا، اور اب اڑا، اب اُڑا۔ صف شکن علی شاہ کی زیارت اب نصیب ہوئی، اور اب نصیب ہوئی۔ ایک دفعہ ہی چوبدار بد حواس دوڑتا ہوا آیا۔

چوبدار : خداوند لُٹ گئے لٹ گئے لٹ گئے۔ ہائے لُٹ گئے! وہ دیکھو صاحب تمہارے لٹ گئے۔

نواب : ہائیں! ہائیں! یہ کوئی بہروپیا تو نہیں ہے۔ میاں لٹ کیا گئے کچھ کہو گے بھی۔ یا لٹ گئے۔ لُٹ گئے، ہی بکا کرو گے۔ کہیں پاگل خانے سے تو نہیں بھاگ آیا ہے۔

چوبدار: خداوند برات کو اُٹھائی گیروں نے لوٹ لیا۔ مع ہاتھی غائب۔

نواب : ہوں۔ برات! برات کس کی؟ کہیں شاہ جی صاحب کی سواری سے تو نہیں مطلب ہے۔ ارے یارو جلدی بتاؤ۔ اُف ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

چابک سوار : غلام عرض کرے، جو جان بخشی ہو تو؟

نواب : اے ہے تواب ان چوچلوں کا بھلا کون سا موقع ہے۔ میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔

چوبدار: وہ دیکھو صاحب تمہارے۔ برات پھرتی پھراتی، گھومتی بڑے ٹھٹے سے آرہی تھی۔ چوک میں تماشائیوں کا یہ عالم کہ چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ ایک پر دس، اور دس پر سو گرے پڑتے تھے۔ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ آتشبازی سے برات کا جوبن اور بھی دونا ہو گیا۔ کوئی پھلجھڑی پر لٹو ہے، کوئی چرخی کو دیکھ دیکھ خوش ہوتا ہے۔ اور تخت رواں۔ اجی وہی دیکھو صاحب تمہاری پریوں کا تخت تو بس اڑن کھٹولے تھے۔ وہ دیکھو صاحب، تمہارے بس جیسے بادشاہوں کی سواری نکلتی ہے۔ مدامیناں جیسے ہی بیچ چوک میں پہنچے کہ بس دو چپراسیوں نے للکارا کہ ہاتھی روک لو، ہاتھی ابھی پھیر دے۔ ہاتھی پھیر اُدھر۔ بس وہ دیکھو صاحب تمہارے ہاتھی اُدھر جھک پڑا۔ اب ادھر صاحب تمہارے پنشاخے تو یار لوگ لے اڑے۔ اور دو چار چوٹٹے بد معاشوں نے ٹوپیاں دوپیاں بھی اتار لیں۔ سب تتر بتر غائب غلہ۔ وہ دیکھو صاحب، تمہارے کہاں تو باجے بج رہے تھے کہاں سناٹا۔

نواب : بھلا شاہ جی کہاں ہیں؟

چوبدار: اجی حضور شاہ جی کو لیے پھرتے ہیں یہاں دیکھیے صاحب تمہارے۔

نواب : کوئی ہے؟ ادھر آنا۔ ان کے کلّے پر کھڑے ہو۔ جتنی مرتبہ (وہ دیکھو صاحب تمہارے) ان کی زبان سے نکلے، اتنے جوتے ان پر پڑیں۔ وہ دیکھو صاحب تمہارے۔ انھوں نے کہا اور جوتا پڑا تڑ سے، نا معقول، ایک لفظ بولتا ہے تو تین سو ساٹھ بار وہ دیکھو صاحب تمہارے۔

چابک سوار : اجی خداوند! اب اس وقت غصے کا موقع نہیں ہے۔ اب کوئی فکر ایسی کیجیے کہ شاہ جی صاحب تو چھوٹ آئیں۔

نواب : ایں کیا وہ بھی گرفتار ہو گئے؟

چابک سوار : جی اور میر صاحب بھی۔

چوبدار : اور خوجی بھی۔

غفور : اور میاں آزاد بھی۔

چوبدار : اور ہاتھی بھی اور اس کی دم بھی۔

نواب : اخاہ تو یہ کہیے بیڑے کا بیڑہ گیا ہے، واہ ۔ع۔ کارے کہ خدا کند فلک را چہ مجال" اب ہمیں یہ کیا معلوم تھا بھلا، ورنہ ایک گارو ساتھ کر دیتے ۔ چلو خیر، اب تو جو ہوا سو ہوا ۔ افسوس صف شکن علی شاہ کی زیارت نصیبوں میں نہیں ہے ۔ آخر کچھ معلوم بھی ہوا کہ یہ دھڑ پکڑ کیسی تھی بھئی ۔ سچ تو یوں ہے کہ اس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہم سے تو کچھ امید نہ رکھو، روپیہ ہم سے لو اور فکر تم کرو۔

مصاحبین کی بن آئی اب کیا پوچھنا ہے ۔ چین لکھتا ہے ۔ پانچوں گھی میں، اب تو چاندی ہے ۔ آپس میں ہنڈیا پکنے لگیں کہ واللہ ایسا موقع پھر تو کبھی ہاتھ نہ آئے گا، جو کچھ لینا ہو لے لو ۔ اور عمر بھر چین کرو ۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا ہے، جو کہو گے بے دھڑک دے نکلے گا، لیکن ایک کام کرو۔ دس پانچ آدمی مل جل کر باتیں بناؤ، اور چنگ پر چڑھاؤ، ایک آدمی کے کیے کچھ بھی نہ ہو گا ۔ کہیں بھڑک گئے تو پھر غضب ہی ہو جائے گا ۔ اکیلی تو لکڑی بھی چولھے میں نہیں جلتی ۔ چلو سب کے سب ہم صغیر ہو کر الو بنائیں ۔ آج تو واللہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ہے ۔ خدا کرے روز اسی طرح وارنٹ جاری ہوں تو دل لگی ہے ۔ مگر اتنا یاد رکھیے گا جو کہیں زنان خانے میں خبر ہوئی تو چھوٹی بیگم واللہ چھچھوندر ہی کی طرح سے ناچیں گی، اور ماما، چھوچھو، اصیلیں، اور بھی مہنا ستھ مچائیں گی پھر آپ کے کرتے دھرتے کچھ بھی نہ بن پڑی گی ۔ ہاں اتنا سمجھے رہیے گا ذری۔

اب سنیے کہ مبارک قدم دروازے کے پاس کھڑی سب سن رہی تھی ۔ نواب تو بغیچے میں ٹہلتے تھے ۔ اور مصاحب ادھر چہ می گوئیاں کر رہے تھے ۔ اور بی مبارک قدم چپکے چپکے، ساری داستان سن سن کر مسکراتی جاتی تھیں ۔ لپک کر گئیں، اور چھوٹی بیگم کو بلا لائیں ۔ ذری چلیے تو سبھی میں صدقے ۔ ذری جلدی جلدی قدم اٹھائیے، آئیے، آپ کو کچھ باتیں سنوا لائیں ۔ یہ موئے خوشامد خورے کیا واہی تباہی بک رہے ہیں ۔ منھ جھلس دے پکڑ کے، اور نہیں تو بیگم دبے پاؤں گئیں، ذرا چاپ بھی نہ معلوم ہوئی ۔ آہٹ کیسی، وہ بے فکری سے نواب کو صلواتیں سنا رہے تھے اور گھاتیں باہم بتا رہے تھے ۔ بیگم صاحب نے تھوڑی دیر میں مبارک قدم سے پوچھا ۔ کیوں مبارک

قدم یہ گورا گورا جوان سامنے کون بیٹھا ہے؟ وہ کیا ہیں سامنے چھریرا چھریرا بدن ہے۔ اور ابھی مسین بھیگتی ہیں؟ وہ بولی: اے حضور! یہ بھی رئیس زادے ہیں۔ کوئی ایسے ویسے تھوڑا ہی ہیں۔ ان کے یہاں ابھی کل کی بات ہے ہزاروں مصاحب نوکر چاکر تھے۔ ان کے باپ فیل نشین تھے۔ یہاں چھوٹا بڑا ایسا کون ہے جو انھیں نہیں جانتا ہے۔ اب نواب صاحب سے سب باتیں کہو گی کہ نہیں؟ میں تو ابھی ابھی جڑ دوں گی۔ لو جس پتیلی میں کھائیں اسی میں چھید کریں۔ بیگم کڑکڑا کر بولیں۔ اچھی مبارک قدم اور سب کی جڑنا۔ رہا اس بے چارے کا نام نہ لینا۔ بھلا ان کی عمر کیا ہوگی؟ مبارک قدم نے مسکرا کر کہا میں تو جانوں کوئی ہوں گے برس بیس ایک کے۔ اے ابھی کل کا لڑکا ہے۔ مسین بھیگتی ہیں۔ رہا ہیں ہنس مکھ اور بانکے آدمی۔ ان کا نام نواب سے ہم نہ لیں گے۔

بیگم : ہاں مفت میں کسی کی روٹیاں کیوں لو بھلا۔

اتنے میں بی مبارک قدم گئیں نواب کو بلالائیں۔

بیگم : اے میں کہتی ہوں آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ منھ دیکھنے کو نگوڑا جی ترس گیا۔ دن رات کڑھا کرتی ہوں، اوپر سے نیچے، اور نیچے سے اوپر، میرے جی کا حال اللہ ہی جانتا ہے یا میں جانتی ہوں۔ آپ کا یہ حال ہے کہ جو بیسویں دن صورت بھی دکھائی تو جیسے آگ لینے آئے تھے۔ آخرش یہ کس گاؤں کی ریت نکالی ہے۔ اے واہ بس چلیے زبانی اختلاط دیکھ لیا آپ کا۔

مبارک قدم : یہ حضور کے مصاحب اللہ جانتا ہے کہ ایک ہی اڑی مار ہیں۔ جن کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ پلاؤ پر ہتے لگائے اور اڑن چھو ہوئے۔ جو ہے وہ جھوٹوں کا سردار۔ مگر حضور ان کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں۔ میری تو عقل گم ہے، جو مزدور ادھر ادھر ایڑیاں رگڑتے تھے، وہ لگے بگھیوں پر آپ کی بدولت سوار ہونے۔ پھر ان کا دماغ کہاں سے ملے۔ ایسے ہی جھوٹے خوشامدیوں نے تو لکھنؤ کو ستیاناس کر دیا۔ پچھوا ہوا چلتی تو ٹھنڈا پانی پیتے، اب دن بھر شورے کا جھلا پانی ملتا ہے پینے کو، اور خدا نے نیامت (نعمت) کھانے کو دی۔ پھر انھیں دور کی نہ سوجھے تو کیسے سوجھے۔

نواب : یہ آج کیا ہے کیا؟ بیوی بھی ناک بھوں چڑھائے ہیں۔ لونڈی بھی منھ پھلائے ہے۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ آتے ہی شکایت کے دفتر کھل گئے۔

مبارک قدم : ہوںھ۔ لونڈی! آج تک کسی نے لونڈی نہیں بنایا تھا۔ بڑے نواب صاحب کو خدا بخشے! جب کہا بی مبارک قدم صاحب ہی کہا۔ آپ لونڈی بناتے ہیں۔ سنتی ہو ماما جی۔

ذری سنو تو ہم لونڈی ہیں۔

ماماجی : بیٹا انھیں آنکھوں آصفؔ دولہ[1] (آصف الدولہ) کا زمانہ دیکھا۔ انھیں آنکھوں امجد علی شاہ کی عملداری دیکھی۔ ان آنکھوں جانے کیا کیا دیکھ ڈالا۔ بڑے بڑے شہزادوں نے ہماری گود پھولوں سے بھری۔ ہمارا بھی کوئی زمانہ تھا۔ جس وقت گلابی پشواز پہن کر نکلتی تھی، اچھے اچھوں کی آنکھیں پڑتی تھیں۔ جب ہماری یہ بے قدری ہے تو تم کس کھیت کی مولی ہو۔

مبارک قدم : جی ہاں! دریں چہ شک۔ ستر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ ہم کوئی ایسے ویسے ہیں۔ آپ بڑی وہ بنی ہیں۔

بیگم : اے تو اس جھنجھٹ سے کیا مطلب؟ (نواب کی طرف مخاطب ہو کر) چلو ہمیں تخلیے میں کچھ مشورہ کرنا ہے۔

میاں بیوی دونوں کے دونوں تخلیے میں گئے۔ کیا جانے چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ اب کہیں کل بات پھوٹے گی۔

میاں آزاد جس دن شہر میں داخل ہوئے اس دن اتفاق سے تعطیل تھی۔ دوسرے دن پھر تعطیل۔ کچہریاں بند، لیکن جس گلی کوچے بازار کی طرف سے نکل جاتے ہیں۔ انگلیاں اٹھتی ہیں۔ لوگ آپس میں پوچھتے ہیں کہ کیوں بھئی، یہ کہاں کے رئیس ہیں۔ ایک بولا راجہ ہیں کہیں کے۔ دوسرے نے کہا کہ کوئی ٹھاکر ہیں۔ اور اس وقت تو یہ رئیس، ابن رئیس، ابن رئیس بنے ہی تھے۔ فیل نشین خواصی میں دو شریف بیٹھے ہوئے۔ اغل بغل چپراسی، یہ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ میاں کے نام وارنٹ جاری ہوا ہے۔ مذکوریوں نے حضرت کو ایک باغ میں اتارا، آپ الااللہ کہہ کر ہاتھی پر سے دھم سے کود ے۔

خوجی : میاں فیلبان۔ بھئی ذری زینہ لگا دینا۔

فیلبان : کیا! زینہ، اچھے آئے، اب آپ کے لیے زینہ بنواؤں، ایسے تو خوبصورت بھی نہیں ہیں آپ۔

میر صاحب : ہونھ زینہ ڈھونڈھتے ہیں۔ پاڑنہ بندھواؤ ہاتھی پر سے کودنا کتنی بڑی بات ہے۔

---

[1] نواب آصف الدولہ متوفی ۱۷۹۵ء اودھ کے تیسرے نواب وزیر، جنھوں نے لکھنؤ میں بڑا امام باڑا بنوایا تھا۔ سخاوت میں مشہور تھے۔

یہ کہہ کر میر صاحب بہت ہی بربر کر دُم کی طرف سے کودے۔ تو اس بوکھلاہٹ میں کہ نیچے اور پاؤں اوپر۔ روک، روک، ہات تیرے فیلبان کی، سچ ہے گاڑی بان، شتربان، کوچ بان، فیل بان یہ جتنے بان ہیں، سب شریر سب متفنّی۔ لاکھ بچے مگر اوندھے ہی ہو گئے۔ واہ ہمارا ہی کلّہ جانتا ہے۔ کھٹ سے بولا۔ وہ تو کہیے میں ہی ایسا بے حیا ہوں کہ باتیں کرتا ہوں۔ ورنہ دوسرا تو پانی نہ مانگتا خوجی بہت کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہات تیرے کی ہم نے جو زینہ مانگا تو ہمیں بنانے لگے۔ مگر بے حیائی کی بلا دور۔ دوسرا ہوتا تو گھنٹوں سینکا کرتا ان کے بھاؤ میں کچھ بھی نہیں۔ میاں اترتے ہو کہ میں دوں دھکا؛ خوجی بے چارے جان پر کھیل کر جیسے ہی اترنے کو تھے کہ اتفاق سے ہاتھی اٹھ کھڑا ہوا۔ یا علی! یا علی بچائیو! خداوندا، خداوندا! میں گنہگار بندہ ہوں۔ گنہگار، گنہگار، تو رحیم و غفور ہے۔ قہار ہے جبار ہے:

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں　　　منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے۔

(سنی) تک کہہ چکے تھے کہ فیلبان نے سچ مچ ڈھکیل ہی دیا۔ دھڑ ررر دھم، ارے او ظالم! فیلبان کا ہے کو شمرؔ[1] ہے مردک، اور جو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی تو کیسی ہوتی۔

ہونھ۔ ٹوٹ جاتی ٹوٹ جاتی۔ ہونھ دو دھ کے بھروسے نہ رہیے گا۔ ذری ہاں، میں تے جتا دیا۔ ہے۔ اچھا تو ہڈی پسلی ٹوٹتی تو سمجھ لیتے۔ اب پیڑ کے تلے لوٹ ماریے۔ ہاں بھئی پھر لوٹ نہ ماریں گے تو کریں گے کیا۔ بھلا یہاں کچھ کھانے والے کو بھی ملتا ہے۔ جی ہاں گھاس چھیل چھیل کے کھائیے۔ ہم تو آج میاں آزاد کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ استاد دیکھو تکلیف نہ کرنا۔ بس اپنے اور ہمارے برابر پکوانا۔ کوئی دو سیر کا قورمہ ہو۔ ایک تین پاؤ کی سیخ اور شامی کباب اور کوئی سیر بھر کا پلاؤ، اور دھنیے کا دوپیازہ، اور کچھ پراٹھے، اور نان پاؤ ہوں۔ بس زیادہ بکھیڑے سے مطلب۔ سنا بھئی آزاد؟ آج تمھارے ہی ساتھ کھائیں گے۔ میاں آزاد ایک کانیئے بولے کہ ہم اس وقت کھانا ہی نہ کھائیں گے۔ سوء ہضمی کی شکایت ہے۔ شام کو مونگ کی کھچڑی اور دو پھلکے کھائیں تو کھالیں ورنہ نغرہ۔

صنعتِ لف و نشر کی بحث

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میاں آزاد نے دیکھا کہ باغ کے ایک گوشے محل میں ایک دخترِ دہ سالہ

---

[1] شمر حضرت امام حسینؓ کے قاتل کا نام ہے۔

ململ کا دوپٹہ اوڑھے، چھڑے پہنے ہوئے، ایک پیر مرد سے پوچھ رہی ہے کہ کیوں ابا صاحب لف و نشر کسے کہتے ہیں۔ اس کی کو مثال تو دیجیے۔

پیر مرد: لف کے معنی لپیٹنا، اور نشر کے معنی پھیلانا، یہ ایک صنعت کا نام ہے۔ مثال:

لپیٹ کر جو چلا کوئی چاندنی اپنی   کھلا یہ راز کہ اب راہ اس نے لی اپنی

آزاد: الغلط، الغلط، الغلط، لف و نشر کی یہ مثال ہی نہیں، اور واللہ شعر بھی کتنا برجستہ پڑھا ہے: چہ خوش گفت ست تلسی داس درحو۔ کالا اُجلا سیہ سفید:۔ اس لپیٹنے اور کھلنے نے شعر میں جان ڈال دی۔ لف و نشر کی دو قسمیں ہیں۔ مرتب اور غیر مرتب۔ مرتب کی مثال لیجیے۔ ؎

سرو و گل شوق میں تیرے قد و عارض کے سدا
نالہ کرتے ہیں بہم قمری و بلبل کی طرح

سرو کے لیے قمری۔ اور گل کے لیے بلبل۔ یہ اس پر فدا وہ اس پر شیدا۔ اور مثال سُنیے:

بروزِ نبرد آن یلِ ارجمند   بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست   یلان را سر و سینہ و پا و دست

شمشیر کے لیے برید اور خنجر کے لیے درید اور سینہ گزر کے لیے شکست اور پا کمند کے لیے یہ ببست اور دست۔ بعض اس کو تفسیر جلی بھی کہتے ہیں اور مثال دوں؟ لیجیے:

امین ہلاہل مد بھرے سویت شیام رتنار
جیت مرت جُھک جُھک پرت اجیہہ چتوت اکبار

ہائے قربان اس کتبائی کے۔ واہ واہ، واہ واہ، واہ واہ، امین کے معنی آب حیات کے اس کے لیے سویت یعنی سفید اور جیت لائے، ہلاہل یعنی زہر۔ اس کے لیے شیام۔ یعنی سیاہ اور مرت لائے رتنار یعنی بادۂ احمر۔ اس کے واسطے جُھک جُھک پرت۔ اہو ہو ہو۔ یہ معشوق کے آنکھ کی تعریف ہے۔ اب لف و نشر غیر مرتب کی مثال سنیے ؎

روئے پیٹے مرے ماتم میں وہ اتنا اے قدر
ہاتھ کی منہدی چھٹی آنکھ کا سرمہ چھوٹا

---

[1] جمال الدین عرفی شیرازی متوفی ۱۵۹۲ء فارسی کا مشہور شاعر، ہندوستان آکر جہانگیر بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوا۔

پہلے مصرعے میں رو دیئے، پہلے ہی پیٹے اس کے بعد رونے سے آنکھ کا سرمہ چھوٹتا ہے۔ وہ مصرعہ ثانی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اور پیٹنے میں ہاتھ کی منہدی چھٹتی ہے، وہ مصرعہ ثانی میں اول نمبر پر ہے۔ یا:

یاد میں اُس طرۂ رخسار کے
ہاتھ سر پر مارتا ہوں صبح و شام

سمجھے صاحب۔ طرّہ کے لیے شام، اور رخسار کے لیے صبح ہے۔ لیکن پھیر پھار کے ساتھ۔

پیر مرد: شاباش تم تو اپنے وقت کے عرفی ہو بھائی۔

آزاد: آپ کی صاحبزادی نے جو میری پیاری بہن ہے۔ عرفی کے بھی کان کاٹے۔ یہ سن و سال اور اس درجہ بدیع الخیال۔

پیر مرد: جہاں آرا ذرا یہاں آؤ؟

جہاں آرا: حاضر ہوئی ابا جان۔ ابھی آئی۔

جیسے ہی جہاں آرا نے باہر قدم رکھا، اور میاں آزاد سے آنکھیں چار ہوئیں، ویسے ہی نامحرم کو دیکھ کر دیوار سے ٹھٹھک رہی)۔ لیکن عجب الڑھ پن کی ادا سے۔

پیر مرد: آؤ آؤ! شریف زادے ہیں۔ آؤ بیٹا! اتنا نہیں سمجھتی کہ بھلا میں نامحرم کے سامنے تم کو خدا واسطے کیوں بلاتا۔ کیا ستر برس بھاڑ جھونکا کیا ہوں۔

جہاں آرا: حاضر ہوئی (میاں آزاد کو) آداب بجالاتی ہوں۔

آزاد: زندہ باش! جانِ برادر زندہ باش!

کچھ دیر تک آزاد نے خوب گھل گھل کر باتیں کیں، اور دل میں سوچے کہ واہ ری لڑکی، حیا پرور۔ پاک نظر، اور بلا کی ذہین۔ نازنین حسین و مہ جبین، خدائی بھر کی صفتیں اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ بھئی ہم کو یہ مل جائے تو ہم اس کو خوب ہی پڑھائیں، اور جو کہیں پڑھ جائے تو واہ واہ ہندوستان بھر کا نام روشن کرے۔

جہاں آرا: اچھا ابا کوئی اور صنعت بتاؤ۔

آزاد: ہم سے پوچھو بہن، ہم بتائیں۔ ہجو ملیح۔ یعنی اس طرح ہجو کہ بادی النظر میں وہ تعریف معلوم ہو، مگر سمجھنے والا سمجھ جائے کہ ہجو کر رہا ہے: ؎

یک قطرہ بود پیشِ دہانت یم قلزم

وصفِ دہنِ تنگ ترا ہیچ نہ گفتم

ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا معشوق کے دہنِ تنگ کی بڑی ہی تعریف کی کہ اس کے منھ کے سامنے ایک قطرہ گویا یم قلزم ہے۔ اتنا سا منھ۔ مگر در پردہ مطلب یہ کہ تیرا منھ سمندر کا قبلہ گاہ ہے، جس کے مقابل میں یم قلزم ایک قطرہ ہے۔

پیر مرد : اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو مشہور صنعتیں مع مثالوں کے جہاں آرا کو لکھ دیجیے تو یہ یاد کرلے۔

آزاد : بسر و چشم۔ ضرور بالضرور۔ چشمِ ما روشن دل ما شاد۔

جہاں آرا : خانۂ احسان آباد۔

میاں آزاد اس فکر میں تھے کہ اسی دم جھپ سے ایک رسالہ کا رسالہ لکھ ڈالوں۔ کیوں کہ اس پیاری لڑکی کی بھولی بھالی ادا ان کے دل میں کھُب گئی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اپنی سگی بہن کی طرح اس کو پیار کریں، پڑھائیں لکھائیں، اور اچھے گھر بیاہیں۔ اتنے میں لونڈی نے آن کر کہا کہ میاں کھانا پکا ہے، چلیے پیر مرد نے میاں آزاد سے کہا کہ آپ کو تو سوءِ ہضمی کی شکایت ہے۔ آج کل کے دن ہیں خراب، بندہ اصرار نہ کرنے کا مگر شام کو کھچڑی یا مونگ کی دال اور پھلکا غریب خانہ ہی پر تناول فرمائیے گا۔

یہ کہہ کر وہ تو گھر میں گھس گئے، اور ان کی دختر دہ سالہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی پیچھے پیچھے اٹکھیلیاں کرتی چلی۔ میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ واللہ اچھے پھنسے۔ زبان سے کہنا ہی نہیں۔ ہم نے تو دل لگی دل لگی میں کہا تھا کہ اس وقت سوءِ ہضم کی شکایت ہے، یہ اگلے وقتوں کے لوگ سچ مچ ہی سمجھ بیٹھے۔ اور لطف یہ کہ شام کو مدعو بھی ہوئے تو کھچڑی اور دال مونگ۔ واہ ری قسمت اب اس وقت روزہ ہے شام کو بھی غرّہ مرے بے موت۔

میاں آزاد یہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ سامنے سے ایک جوان طناز اکڑتے ہوتے آئے۔ علیک سلیک کے بعد وہ بھی کرسی پر جا ڈٹے۔ ایں! یہ اجنبی کون ہے بھئی؟ ہے تو آدمی سُرخ و سفید، اور سفید پوش۔ مگر یہ یہاں کہاں پہنچے۔

جوان : آپ کا کہاں سے آنا ہوا۔

آزاد : بندہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر رہتا ہے۔ اس وقت ایک ضرورت سے یہاں باغ میں فروکش ہوا، تو پیر مرد کی پیاری بیٹی کی بھولی بھالی باتیں سُن کر جی خوش ہوگیا۔ ذرا دو گھڑی یہاں ہی آ بیٹھے :

جوان : من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

میاں یہ تو بھولی بھالی لڑکی ہے۔ اس کی بہن کو آپ نے نہیں دیکھا۔ اس میں معشوق پن کی ساری باتیں خدا نے کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اور ایسی خندہ پیشانی ہنس مکھ عورت تو دیکھی ہی نہیں۔ لیکن بوڑھے میاں اس سے ناراض ہیں۔ وجہ سنیئے! اجی یہ تو تیرہ صدی ہے، اور وہ ٹھہر حضرت نوح کے وقت کے۔ اُف ری جوانی کی اُمنگ، اور ہائے رے شباب کی ترنگ، اس زمانے کی نادان لڑکیاں دانند مچاتی ہیں، آسمان سر پر اٹھاتی ہیں، سسرال جانے کی خوشیاں مناتی ہیں۔ ان بڑے میاں کو دیکھیے کیا بڑھ بھس لگا کر اٹھارہ برس اپنی بڑی صاحبزادی کی شادی نہ کی۔ تب تو اس شوخ، فتنہ بیدوش، نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ اماں جان اب تو تم صاف صاف کہلواتی ہو۔ آخر میرا کیا اچار ڈالو گی، جو ایک مہینے سے اندر شہنائی کی آواز دروازے پر نہ آئی تو ہم ہیرے کی کنی کھا کر مرجائیں گے۔ خاتون جنّت کی قسم! پھر آپ کو اپنی صورت نہ دکھائیں گے۔ پاس پڑوس کی عورتوں نے سمجھایا کہ بیوی اب یہ ماشاء اللہ سیانی ہوئیں، کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ اب بیاہ نہ ہوگا تو کیا جب سر ہلنے لگے گا تب ہوگا۔ اس کی یہ کیفیت کہ چٹاخ پٹاخ ہجولیوں میں کسی کو منہ چڑھایا، کسی کو بنایا، اُف رے تیری شرارت، اللہ رے تیری شوخی۔ الغرض عمدہ جگہ ایک اونچے گھر میں نسبت ٹھہری تو ماں نے کہا۔

ماں : لے بیٹی مبارک ہو۔ تیری شادی ٹھہر گئی۔

لڑکی : اماں ہمیں یقین نہیں آتا۔

ماں : اوئی بٹیا تمھارے ابا نے خود ٹھہرائی ہے۔

جب منگنی ہوگئی تو پھر ماں نے کہا کہ۔

ماں : لے بیٹی مبارک ہو اب تو منگنی بھی ہوگئی۔

لڑکی : اماں جان مجھے تو ابھی ہرگز ہرگز یقین نہیں آتا۔

ماں باپ نے جھٹ پٹ سامان درست کیا اور مانجھے بٹھایا۔

ماں : لو بٹیا اب تو مانجھے بھی بیٹھیں۔

لڑکی : نا اماں مجھے یقین نہیں آتا۔

آٹھ دس دن کے بعد ساچق آئی چڑھا وا چڑھا۔

ماں : لو بیٹی مبارک اب تو ساچق بھی ہو چکی۔

لڑکی : (شرماکر) اماں جان مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔

دوسرے دن منہدی کی رسم ہوئی۔ دلہن کو منہدی لگائی گئی، اور وہی جھوٹی چھاٹی دولہا کو بھیجی گئی۔

ماں : لے بیٹی۔ اب تو منہدی رچی۔ اب تو مبارک ہو۔

لڑکی : (لجاکر) اماں جان کہو تمہاری خاطر سے کہہ دوں ورنہ مجھے تو ابھی یقین نہیں آتا۔

راوی : یقین کیوں کر آوے :

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

اے لو صاحب دوسرے دن بڑے دھوم دھام سے برات آئی، دروازے پر دھما چوکڑی مچی ہوئی سمدھنیں زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ چھما چھم کرتی اترنے لگیں۔ ادھر گالیوں کی بوچھار ہوتی۔ ڈومنیوں نے تھرک تھرک کر گانا اور دست حنائی سے گہری گہری ندیا بتا تا شروع کیا۔ باہر ناچ ہونے لگا۔ مولوی صاحب آئے۔ نکاح پڑھا گیا۔ دولہا اندر آیا۔ ریت رسم ہوئی۔ وقت رخصت ماں نے چپکے سے بیٹی کے کان میں کہا کہ۔

ماں : لے بیٹی مُبارک ہو، اب تو دولہا کے گھر چلیں۔

لڑکی : (مُسکراکر) اماّ جان۔ ابھی یقین نہیں۔

الغرض برات چلی۔ یہ گئی وہ گئی۔ دوسری صبح کو دلہن اپنے میکے آئی۔

ماں : لے بیٹی مُبارک اب تو شادی ہو گئی۔

لڑکی : (آنکھیں نیچی کرکے) اماں جان بندگی (دبے دانتوں) جی ہاں بندگی، سمجھیے قبلہ وہ ایسی تھیں۔

آزاد : حضرت خدارا ان کے مکان کا پتا تو ہمیں بتائیے؟ واللہ کیا گرما گرم فقرے سنائے ہیں۔ وہ تو خدا کی قسم زیارت ہی کے قابل ہے۔ ہائے ہائے یار ایسی ہی بیوی تو ہم چاہتے ہیں، تو پھر سچ سچ بتائیے، کیا سچ مچ بیاہ پھر ہو ہی گیا۔؟

جوان : اللہ ری بدگمانی۔ حضرت اس کو تو یقین ہو ہی گیا۔ لیکن آپ کو اب تک یقین نہ آیا۔ اللہ ری بدگمانی، اللہ ری بدگمانی، اجی بیاہ ہو گیا یا اب۔ ع۔ پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا، اور۔ ع۔ امید کے تحل نے دیا بار۔

آزاد : سچ کہو واللہ! وہ تو اس ہی لائق ہے کہ اس کے قدم دھو دھو کر پیے۔ کیونہ کہے صاحب، جب

ماں باپ پاگل بنا کریں تو کیوں کر نہ کہے۔

وہ جوان تو یہ داستان دلچسپ سنا کر، اور میاں آزاد کو وائہ وشیدا بنا کر لمبا ہوا۔ یہاں کیا سنتے ہیں کہ دُو آدمی باہم یہ باتیں کر رہے ہیں۔

ایک: بھئی آخر منھ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟ یا کیا منھ ایسا ہی ہے۔ ہاں عشرے کے دن تو پیارا ہی ہوئے تھے۔

دوسرا: ہاں یار جس کو نہووے بوائی، وہ کیا جانے پیر پرائی۔ یہاں جان پر بنی ہے۔ آپ عشرۂ محرم لیے پھرتے ہیں۔ ابھی ہم نے بی اللہ رکھی سے دو سو روپیہ مہینے بھر کے وعدے پر لیے تھے۔ سو اس کو آج کوئی دُو برس ہونے آئے۔ اب وہ کہتی ہیں کہ یا تو ہمارا روپیہ دو، یا ہمارے مقدمے کے گواہ ہو جاؤ، نہیں تو ہم داغ دیں گے، اور جیل خانہ دکھائیں گے۔ وہاں چکی پیسنی ہوگی، اور سڑک پر درمٹ چلانا ہوگا۔ رام بھج، رام بھج، سو اب ہم سوچتے ہیں کہ کریں تو کیا کریں، مصیبت میں پڑ گئے بھائی۔ گواہی دیں تو کس برتے پر، میاں آزاد کی تو صورت ہی سے آشنا نہیں، اور نہ دیں تو وہ نالش جڑ دیتی ہیں۔ اور یہاں دو سو کیا معنی پچاس روپیہ کا دینے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ پس سوچ لیے ہیں کہ آج شام کو جھپ سے چل کھڑے ہوں، ریل کو خدا سلامت رکھے بھاگوں تو پتا بھی نہ ملے۔

دوسرا: ارے میاں وہ ترکیب بتاؤں جس میں سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ تم میاں آزاد سے مل جاؤ۔ اور انھیں کے مفید مطلب گواہی دو۔ ادھر اللہ رکھی سے بھی ملے رہو، اور میرے دونوں میٹھے کہتے ہوئے عدالت سے سرخرو آؤ۔ تمھارا آتو کہیں نہیں گیا ہے۔ اور بچہ تم ہو کس بھروسے پر، چار چار گنڈے میں تو وہ گواہی ملتے ہیں جو تڑسے جھوٹا قرآن، یا گنگا اٹھا لیں۔ اور جھوٹ کے پل باندھ دیں۔ آپ ہم کس میں ہیں، ہم کو کوئی دُو ہی روپے دے، قرآن اٹھوا لے، جو چاہے کہوا لے۔ آخر ہماری طرف سے کوئی ڈبلیو ہوگا یا نہوگا۔ پھر واہی ہو خاصے، میاں دو سو ملتے ہیں دُو سو۔ اللہ رکھی کی طرف سے ضرور گواہی دو۔ اور بیچ کھیت گواہی دو۔ جھوٹے سچ سے واسطہ۔ سچ وہی جس میں دُو سو ملیں بھئی۔ یہ تو کلجگ ہے۔ اس میں سچ بولنا حرام ہے۔ اور جو کتّے نے کاٹا ہو تو سچ ہی بولیے۔

ایک: حضرت سنیے سچ پھر سچ ہے، اور جھوٹ پھر جھوٹ ہے۔ اتنا یاد رکھیے گا۔

دوسرا: ابے جا۔ لایا وہاں سے، جھوٹ پھر جھوٹ ہے۔ ارے نادان اس زمانے میں جھوٹ ہی سچ ہے۔ اک ذرا سے جھوٹ بولنے میں دو سو چہرے شاہی آئے گئے ہوتے ہیں۔ ذرا زبان ہلا دی اور دو سو ہضم۔ دو سو کا خیال کیجیے۔ کتنی رقم کثیر ہے۔ دل لگی نہیں ہے۔ دو سو کیا کچھ تھوڑے ہوتے

ہیں۔ جیسی کسی سے تم دو گنڈے ہی دلوا دو، دیکھو حلف اٹھا لیتے ہیں یا نہیں۔ سو بھائی جو عقل سے کام لو تو ہمارا کہا مانو، ورنہ تم جانو تمھارا کام جانے۔

آزاد: کیوں بھئی جوانو! اور جو اقرار کر کے مکر جاتے تو پھر کیسی ہو۔ عورت کی بات کا اعتبار کیا۔ اس سے بہتر ہے کہ اللہ رکھی سے اسٹامپ کے کاغذ پر لکھوا لو۔

ایک: اچھا اچھا واللہ کیا سوجھی ہے۔

دوسرا: کیا میاں؟ کیا کہتے ہو؟ اسٹامپ کیسا ہم کیا جانے کیا مشورہ کر رہے ہیں۔ آپ آئے وہاں سے۔ اسٹامپ پر لکھوا لو۔ ہم کیا کوئی چور ہیں۔

ایک: اجی وہ تمھارے ہی بھلے کے لیے کہتے ہیں۔ تم تو سمجھتے ہی نہیں۔

دوسرا: (چپت لگا کر، چُپ گو کھے) نامعقول۔ ایسی باتیں کہیں راہ چلتوں سے کہہ دیا کرتے ہیں۔ آخر وہ آپ کے ہیں کون، پھر بھلا ان سے راز دل بتانا حماقت ہے یا نہیں؟ مجھ کو بھی لے کر دھرواؤ گے، معلوم ہوتا ہے۔ بس اب تم سے مشورہ کرے تو اس پر لعنت۔

آزاد چپکے سے جا کر دونوں مذکوریوں، اور خوجی اور میر صاحب اور فیلبان کو بلا لاتے تھے اور کہا تھا کہ ساری داستان سن رکھیے گواہی دینی ہوگی۔

خوجی: سننے کو تو سب سنا لیکن میاں گواہی دواہی ہم نہ دیں گے۔ اور جو زبردستی کرو گے تو تم کو دھروا ہی دیں گے۔

میر صاحب: اجی ہم گواہی دیں گے، اور ڈنکے کی چوٹ۔

فیلبان: جو سنا وہ کہہ دیں گے۔

میاں آزاد مذکوریوں کی آنکھ بچا کر چل دیے۔ یہ جا وہ جا، اسٹیشن پر داخل۔ اور جھٹ سے ٹکٹ لے کر ریل کے ایک درجے میں بیٹھے جا رہے تھے، کہ اتنے میں ایک بڑے اسٹیشن پر ریل ٹھہری، اور آپ کھٹ سے اتر پڑے۔ رات کا سماں، چوطرفہ اندھیرا گھپ گھٹا ٹوپ، ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ انھوں نے ریل سے اترتے ہی، دھاندلی مچائی کہ کوئی قلی ہے، کوئی مزدور ہے؟ خدا کے فضل سے زمانہ بھر کو ٹھگ کر آئے تھے۔ کپڑے کی گٹھری، چینی کی پیالی، دو ڈھائی سو روپیہ کی پوٹلی، میوہ کا ٹوکرا، بیگ، بقچہ، بچھونا، الم غلم۔ کئی گدھوں کا بوجھ ان کے پاس تھا۔ قلیوں کے سر پر لاد کر باہر نکلے۔ آئیے حضور! ہم گاڑی دیں لیجیے یہ پالکی گاڑی آپ ہی امیروں کے لائق ہے۔ اجی یہ کمانی دار یکہ کر لیجیے۔ ہوا کے موافق مشکی بابو جاتا ہے۔ چھن چھن کرتا ہوا۔ اجی ادھر آئیے میاں! ہم بگھی دیں کہاں

چلیے گا کہاں؟ کیا لوگے؟ کہا جائیے گا؟ سرا۔ سرا تو یہاں ایک چھوڑ دس دس ہیں۔ جو سب میں بڑی ہو، مگر صاف ستھری۔ اچھا ایک روپیہ ہوا۔ واہ پہلے گھنٹے کے (چھ آنے) اور دوسرے گھنٹے کے (تین آنے) اور اوپر پندرہ منٹ کی راہ جس کے سولہ گنڈے مانگتے ہو۔ ہم پانچ آنے دیں گے۔ ہزار دفعہ غرض ہو، چلو نہیں نہ سہی۔ اچھا چلیے پہنچا دیں۔

میاں آزاد نے اسباب کو بگھی پر لادا۔ اور چل کھڑے ہوئے۔ کھٹ سے سرا میں داخل۔ سرا کے معاملے اور بھٹیاروں کے ہتھکنڈوں سے تو یہ خوب ہی واقف ہو چکے تھے۔ ایک کوٹھری میں جا ڈٹے۔ اور بچھونا بچھا کے خوب لہرا لہرا کے با آواز بلند گانا شروع کیا۔ ؎

بیا ساقی آں مے کہ حورِ بہشت — عبیرِ ملائک دراں می سرشت

میاں آزاد بڑے ذوق اور جوش شوق سے گاتے تھے کہ ایک آواز آئی۔ بس زبانی داخلہ ہے، یا اور کچھ بھی۔ اس کے بندۂ درگاہ قائل نہیں۔ ایسا کر دکھائیے تو جائیں۔ اگر شوق چرایا ہو تو دوں ایک ساغر آبِ اندیشہ، و بادۂ جاں پرور، گلگوں، احمر قدحِ ارغوانی۔ لطف زندگانی، کیمیائے فتوح، جوہر روح، صبح کا سہانا سماں ہے۔

میاں آزاد نے جو یہ آواز سنی، تو چونکنا ہو کر لگے ادھر اُدھر دیکھنے۔ کوئی بھی نہیں۔ بھئی یہ کس گوشے سے آواز آئی۔ ہے کوئی طرار آدمی، الفاظ چست، لب و لہجہ درست، معجز بیاں، طلیق اللسان، بلبل ہزار داستان ہے۔ اتنے میں ایک صاحب برآمد ہوئے۔ فالسئی تہ بند، شربتی کا زعفرانی پیرہن زیب تن کیے ہوئے۔ مانگ نکالے، پٹوں میں حنا کا تیل ڈالے، آنکھوں میں سرمہ لگائے، ہاتھوں میں مہندی رچائے، ایک زنِ ملیح و سبزہ رنگ، جوان شوخ و شنگ کی طرف مخاطب ہو کر حضرت نے یوں فرمایا:

اے پیکِ پی خجستہ چہ نامی فدیتُ لک
ہرگز سیاہ چردہ ندیدم باین نمک

علیک سلیک کے بعد آزاد کے چھپر کھٹ پر ڈٹ گئے۔ بابا ہم شاہ جی ہیں، قدسی شاہ، ہمارا نام ہے۔ عشق بتاں ہمارا خاص کام ہے۔ اس وقت جو آپ نے ہمارے مرشدِ کامل حضرت حافظِ شیراز رند شاہد باز، کا شعر بلحنِ داؤدی پڑھا تو طبیعت مسرور ہو گئی، اور دنیا و مافیہا کی فکر دور ہو گئی۔ لیکن بابا کبھی بادۂ آتش فشاں کا جام نوشیں رواں بھی دیکھا تھا۔ سچ کہنا معلوم ہوتا ہے چوری چھپے پیا کیے ہو، مگر فعلِ نیک میں محتسب کا ڈر، نہ قاضی کا خوف:

زیادہ خوردنِ پنہاں ملول شد حافظ
بہ بانگِ بربط و نی رازش آشکارا کنم

آزاد : شراب تو بندۂ درگاہ نے ترک کر دی۔ کب کی توبہ کر چکا۔ اب تو اس مردار کو چھوڑا آپ پیتے ہوں تو پیجیے :

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ
مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

شاہ جی : نا بچہ۔ توبہ کیسی۔ یاد رکھ توبہ توڑنے کے لیے اور قسم کھانے کے لیے ہے۔ بہار توبہ شکن ہے۔ ساقی گل عذار توبہ شکن ہے۔ یہ مرغزار توبہ شکن ہے۔ یہ رود بار توبہ شکن ہے۔ وہ جھومتی ہوئی گھٹا آئی۔ وہ گھنگھور گھٹا چھائی :

توبہ زمے کردم و آمدِ بہار
ساقی توبہ شکنم آرزو ست

یہ کہہ کر شاہ جی نے جھولی میں سے سونف کی ولائتی میٹھی شراب نکالی۔ دھانی بوتل اور کہا کہ :

سبز بوتل میں لال لال شراب   خیر ایماں کا خدا حافظ
شاہ جی مے کدے میں بیٹھے ہیں   اس مسلماں کا خدا حافظ

آزاد : یا حضرت! ایں جانب نے تو قسم کھائی ہے کہ جب تک کوئی زنِ جواں، وزہرہ جبیں، گل رخسار نازنین، اپنے دست حنائی سے شراب آتش خواص نہ پلائے گی، اور سیکڑوں قسمیں نہ کھلائے گی کہ اگر یہ پیالہ غٹ غٹ کر کے نہ پی جائے، تو ہمارا ہی لہو پیے تب تک ایک قطرہ نہ پیوں گا :

کردہ ام توبہ بدستِ صنم بادہ فروش
کہ دگرے نہ خورم بے رخِ بزم آرائے

شاہ جی : اس پر ہم نے جھٹ پٹ میں مصرعے لگائے تھے سنیے گا ذری : ؎

واعظا چوں لبطِ می چند در آئی بخروش   کہ بیا در چمنِ خلد و می کوثر نوش
گیرم آں خود ہمہ نوش ست ولیکن من دوش   کردہ ام توبہ بدستِ صنم بادہ فروش
کہ دگر می نخورم بے رخ بزم آرائے

آزاد : بارک اللہ خوش گفتی، بلکہ دُر سفتی :

قدسی بہ فصاحت و بلاغت   گویا سلمان ساؤجی ہے

قدسی شاہ سمجھے کہ اب میاں تیم راضی ہوگئے۔ اشارہ سے اس جوانِ سراپا انداز، سرمست صہبائے ناز کو بلایا، ادھر وہ ایک ادائے دلربا سے قدم دھرتی، چھما چھم کرتی، میاں آزاد کے چھپر کھٹ پر غڑاپ موجود ہوگئی۔ اتنے میں بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو بجلی کی طرح چمکتی ہوئی آئی، اور اس درجہ چیخی چلائی، کہ الاماں! اے واہ میاں اٹھارہ اٹھارہ سنڈوں کو لے کر کھٹیا پر بیٹھتے ہیں۔ اور جو پاٹی کھٹ سے ٹوٹ جائے تو کس کے ماتھے۔ ایسے بھی مسافر نہیں دیکھے، ایک تو ماشاءاللہ سے خود تھنے سے آدمی ہیں۔ دوسرے دنس دنس کو لے کر بیٹھے ہیں۔ لے چرپائی خالی کیجیے۔ ہم ایسے کرایہ سے درگزرے۔ چرپائی نگوڑی کی بساط ہی کیا ہے۔ میاں آزاد کی تو بھٹیاری کے نام سے روح تھراتی تھی، چپکے سے چارپائی خالی کر دی، اور پاٹی چھرکو اکر دری بچھوا کر مزے سے شاہ جی اور اس نو عروسِ سرمایۂ ناز کو لے کر بیٹھے اور دور چلنے لگا۔

وہ گل بدن اپنے پیارے ہاتھوں سے بھر بھر کے جام شرابِ ناب پلاتی جاتی تھی، اور میاں آزاد کے جسم میں گویا جانِ تازہ آتی جاتی تھی۔ شاہ جی نے ایک جرعہ لیا۔ اُس غنچہ دہن نے ایک گھونٹ پیا، میاں آزاد نے مزہ چکھا، اسی طرح جام پر جام لنڈھایا جاتا تھا۔ اور دونوں کو شیر مادر کا مزہ آتا تھا:

دور چلے دور چلے ساقیا اور چلے اور چلے ساقیا

اور سہی۔ پھر دور چلا۔ اب کی کورے سکورے میں۔ انگور کی شراب ہو یہ بھی سہی۔ پہلے اس سیم تن نے چسکی لگائی، پھر چھوٹی چھاٹی میاں آزاد نے اڑائی، بچی بچائی میاں قدسی شاہ کے حصے میں آئی۔ ابھی دور کا قل نہیں ہوا ہوش باقی ہے۔

دور چلے دور چلے ساقیا اور چلے اور چلے ساقیا

اتنے میں میاں آزاد تو غین ہوگئے۔ مدہوش و سیہ مست سر و پا کی خبر نہیں۔ ایک دفعہ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اٹھتے ہی دھم سے گرے، گرے تو پا بدستِ دگرے دست بدست دگرے۔ ادھر شاہ جی تو اسی گھات میں آئے ہی تھے، چھپاک سے کپڑے وپڑے باندھے، جما جمالی اور چلتا دھندا کیا۔ سیم تن بھی ان کے ساتھ ساتھ لمبی ہوئیں۔ میاں آزاد رات بھر بے ہوش پڑے رہے۔ سحر کاذب کے وقت ان کی آنکھ کھلی تو حال پتلا۔ یکہ و تنہا۔ نہ قدسی شاہ، نہ وہ گوہر درجِ دلربائی۔ فقط میاں آزاد اور ان کی چارپائی:

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

تہی خمخانہا کردند و رفتند

پیاس کے مارے گلے میں کانٹے پڑے جاتے ہیں۔ ساتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں۔ جی مالش کرتا ہے۔ طبیعت گھبراتی ہے:

دوشینہ بکوئے می فروشاں — پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنوں ز خمار سر گرانم — زر دادم و دردِ سر خریدم

اٹھے تو لڑکھڑاہٹ نے پاؤں لیے۔ لڑھک گئے۔ پھر اٹھے پھر منہ کے بل گرے۔ بارے خدا خدا کر کے بہزار خرابی آفتابہ سے پانی لیا۔ آب سرد خوشگوار نے کسی قدر تقویت بخشی۔ لیٹے تو آنکھ لگ گئی۔ پھر اٹھے پھر پانی پیا، پھر پیا، پھر پیا۔ لیجیے تڑکا ہو گیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ سرہانے پر ایک خط رکھا ہے کھولا پڑھا:

خط

ساقی بہوش باش کہ غم در کمینِ تست
مطرب نگاہدار ہمیں رہ کہ میزنی

کیوں بچہ اور پیو گے؟ اب پیو گے تو پھر جیو گے بھی نہیں۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ہے۔ ہو کا بھی تو کتنا۔ بوتل کی بوتل منہ سے لگالی، اب خمیازہ کھینچا۔ ہات تیرے کی۔ کیا مزے سے معشوق پری پیکر رشکِ قمر کے پاس بیٹھے ہوتے غٹ غٹ اڑا رہے تھے۔ گٹھری دھٹری گھوم گئی نہ، ہات تیرے کی، اب کہو اُستاد صبوحی نہ اڑیں گے؟ بھئی ہماری خاطر سے ایک جام تو لو۔ کہو تو اسی کے ہاتھ بھیجوں۔ ہات تیرے کی۔ مثل مشہور ہے کہ انسان کچھ کھو کے سیکھتا ہے۔ مگر تم کھو کے بھی نہ سیکھے۔ یاد ہے ریل پر ہم نے تمہارا بقچہ اڑا دیا تھا۔ اب چیتے بھئی۔ وہی شاہ جی ہم ہیں۔ مگر ہاں تب اور روپ میں تھے، اب اور بھیس ہے۔ تب بھی چکما دیا تھا۔ اب کی بھی غچّا دیا۔ جو تم انسان ہوتے تو ہمارے بھرّوں میں نہ آتے۔ لے اب ہم جتائے دیتے ہیں خبردار مسافر کا اعتبار نہ کرنا، اور سفر میں تو کسی پر بھروسا رکھنا ہی نہیں۔ دیکھو آخر ہم لے دے کے چل دیے نہ تم نے عمر بھر سفر کیا، مگر آدمی نہ بنے۔

"درویش مشیخت پناہ قدسی شاہ"

یہ خط پڑھ کر میاں آزاد پر گویا عرق خجالت کے سیکڑوں گھڑے پڑ گئے، اور اتفاق وقت بی ہنسیا کلوارن بھی اُدھر سے چہکتی ہوئی گزریں۔

لیجیے چور کے گھر چور پیٹھے، ڈاکو کے یہاں ڈاکہ پڑا۔ گٹھ کٹے کی جیب کتری گئی۔ بڑے نیاریے نے غپّا کھایا۔ میاں آزاد سب کو موس لاتے تھے۔ مگر یہاں بقچہ دقچہ، گٹھری دھٹری، روپیہ پیسہ، جمع جتھا، سب غائب غلّہ ہوگیا۔ دکھن کی کمائی کاندو کے نالے میں گنوائی۔ ساری چوری سرا میں لٹائی، اب ٹکا کفن کو پاس نہیں، کوڑی کوڑی کو محتاج۔

بہت کچھ غُل غپاڑا مچایا۔ سرا بھر کو سر پر اٹھایا۔ بھٹیارے کو دو چار چپتیں لگائیں۔ بھٹیاری کو بے نقط سنائیں، مگر مال نہ ملا نہ مِلا۔ شاہ جی رفوچکر ہوئے، مگر نام کیا متبرک رکھا تھا قدسی شاہ۔ شاہ یا چوروں کے پشت و پناہ، اور ڈاکوؤں کے قبلہ گاہ۔ لوگوں نے صلاح دی کہ جاؤ تھانہ پر رپٹ لکھاؤ۔ گرتے پڑتے چلے تھانہ پر۔

اثنا راہ میں پنساری کی دُکان پر ایک شخص اخبار پڑھ رہا تھا۔ میاں آزاد اپنا نام اس کی زبان سے سنکر چونکّا ہوئے۔ ایں! ہمارا ذکر خیر اخبار میں کیسا؟ سنتے ہی ٹھٹک رہے۔ کیوں قبلہ ذرا یہ اخبار ہم بھی پڑھ سکتے ہیں؟ جی ہاں! جو پڑھے لکھے ہیں آپ تو پڑھ سکیے گا، ورنہ خیر صلاح کے ڈھیر، لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔ وہ تو گلقندِ آفتاب لے کر رفوچکر ہوئے۔ یہ اخبار پڑھنے لگے۔

میاں آزاد! میاں آزاد! میاں آزاد!

نگوڑی چاہت کو کیوں سمیٹا عبث کے جھک جھورے جھیلنے کو
دوگانہ پڑ جائے پٹکی ایسی تمھارے اٹھکیل کھیلنے کو
نصیب جاگیں گے میرے جس دم تو میں بھی اک رت جگا کروں گی
ابھی تو آزاد سے ہمیں ہاں پڑے ہیں پاپڑ سے بیلنے کو

پر بیتی کون کہے۔ ہماری بیتی سنو! سرا میں ایک گورا گورا لانبا لانبا، جوان خوبرو آکر ٹکا، ٹکا کیا بلکہ جم گیا۔ اور جمتے ہی ہم سے نکاح کا وعدہ کیا۔ ہم تو سیدھے سادھے ہیں۔ ہمیں اس کے ہتکھنڈے کیا معلوم، ہم بھی نکاح پر جھپ سے راضی ہوگئے۔ اے جب نکاح کے دن قریب آئے تو مُوا ٹکر گیا۔ ہم نے نالش داغدی تو بھاگ گیا۔ سرکار نے اس کو پکڑوا بلایا۔ پھر چمپت ہوگیا۔ تو جو کوئی ڈھونڈھ لائے ہم اس کے ساتھ نکاح کریں گے۔

"اللہ رکھی بھٹیاری"

یہ اشتہار میاں آزاد پڑھ ہی چکے تھے کہ دوسرا نظر سے گزرا۔

لوٹ لیا! لوٹ لیا! لوٹ لیا!

چل دیا دے کے جُل ہمیں مکار نے ایسے شیطان پر خدا کی مار

ہائے ہے! دہائی ہے! وقت مشکل کشائی ہے۔ بس اب جان پر بن آئی ہے۔ میں بوڑھا مہاجن اگلے وقتوں کا ریزہ۔ کچہری دربار، عدالت سرکار سے ناواقف۔ ایک چوروں کے قبلہ گاہ، ڈاکوؤں کے پشت پناہ، ذات شریف کے چنگ پر چڑھ گیا، تو اس کو اڑھائی سَو ۲۵۰ روپیہ نقد کھنا کھن گن دیے۔ اب سنیے کہ تمسک تو ہمارے پاس ہے، مگر اس کا ستیاناس ہو، کیا جانے کہاں چل دیا۔ میاں آزاد کے ساتھ آیا تھا۔ جو کوئی اس کو پکڑ لائے، ہم اس کو دو روپیہ انعام دیں گے۔ "لالہ گوبر مل مہاجن"

اس کے بعد ایک تیسرا اشتہار پڑھا:

موس لیا! موس لیا! موس لیا!

ہائے تیرے چور کی دُم میں موٹا سا رسّا باندھوں۔ نابکار چھ سات روپیہ کا میوہ لے کر جھانسا دے کر چل دیا۔ آزاد نامی ایک صاحب ان کے ساتھ تھے۔ صبح کو کافور ہو گیا۔ یہاں سے منزلوں دور ہو گیا۔ اگر کوئی صاحب ان کا پتہ لگائیں، تو بے فصل کے آم کھلواؤں۔

"جمالیا مالی"

یہ تینوں اشتہار پڑھ چکے تو ایک چوتھا اور نظر آیا

لینا! لینا! لینا!

جانے نہ پائے۔ جانے نہ پائے۔ چور، چور، چور، بلکہ سینہ زور۔ واضح ہو کہ میاں آزاد کے ایک دوست نے ہماری کوٹھی سے کئی روپیہ کا مال جا کر خریدا، اور وعدہ کیا کہ تڑکے دام بھیج دیں گے۔

ہم تو سادے غریب کیا جانیں
اس مزور کو کیوں کر پہچانیں

سمجھے کہ شکل صورت سے بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ جھوٹ کیا بولیں گے۔ وہ تڑکے لے دے کے چل دیے، تو آج تک آتے ہی ہیں۔ اسی سے تو کسی کی ساکھ نہیں رہی۔ اگر کوئی بزرگوار اس بے ایمان کو گرفتار کرا دیں، تو ہم دس گز ریشمی کپڑے سے کٹیں۔

"کلاتھ اینڈ کمپنی سوداگر"

پانچواں اشتہار بھی موجود۔

ٹھہر تو جا! ٹھہر تو جا! ٹھہر تو جا!

آزاد نامی ایک عروض داں، اور سخنداں، ہمارے باغ میں ٹکے تھے۔ دو چار دن ہمارے ساتھ خوب بیٹھے ٹکڑے اُڑائے۔ آخر کار ان کے دوست جوان کے ساتھ تھے، کوئی پانچ چھ روپیہ کے چینی کے پیالے بھی لے بھاگے۔ سو بھئی آزاد جو یہ اشتہار پڑھو تو واسطے خدا کے وہ پیالے اپنے دوست سے دلوادو۔

"پیر مرد"

ابھی ایک اور باقی ہے۔

پھنسا دیا! پھنسا دیا! پھنسا دیا!

ہم ایک برات میں ہاتھی لے کر گئے تھے۔ شامت اعمال سے اشتہاری مجرم اُسی ہاتھی پر سوار سوا۔ سرکاری مذکوریوں نے ان کو گرفتار کر لیا، اور یہاں لے آئے۔ اب وہ تو خود چل دیے، اور ہم کو مع ہاتھی اور ہاتھی کی دُم کے قرق کرا گئے۔ یارو جوان کو پاؤ تو لاؤ۔

"فیل بان"

ادھر میاں آزاد تو اس جھنجھٹ میں پڑے تھے اُدھر نواب کے یہاں کا حال سُنیے! کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھے۔ جب برات لُٹ گئی تو لوگ رو رو کر یوں کہنے لگے:

ہوا آزاد پر وارنٹ سرکار
کچہری میں گئے ہو کر گرفتار

غضب ہشیار تھے بیباک تھے وہ ہوئے مغرور کیا چالاک تھے وہ
ازل سے نام جب ان کا ہے آزاد وہ سہتے کس طرح مجلس کی بیداد

دوسرا: گئے تھے ہو کے جس ہاتھی پہ سوار
ضمانت میں اُسے لکھوایا اکبار

امانت میں انھیں کے قرق ہے وہ ضمانت میں انھیں کے فرق ہے وہ

تیسرا: گئے خالی وہاں سے بھی نہ حضرت ہر اک کو موس کر لے بھاگے دولت

چوتھا: کسی سے پیالیاں چینی کی لی تھیں

فقط تڑکے ہی کے دھاوے پہ دی تھیں
انھیں بھی ہضم حضرت نے کیا ہے — وہ بوڑھا بیا لی والا رو رہا ہے

پانچواں : تھے بزازوں سے جا کر مال لائے
انھیں بھی خالی سُتھنے ہی بتائے

چھٹا : مہاجن سے لیے تھے ڈھائی سو قرض
ادائی ان کی تھی آزاد پر فرض

ساتواں : ہمیشہ سے یہی تھا ان کا شیوہ
لیا اک میوہ والے سے تھا میوہ
عجب کھوٹی ہے کچھ ان کی بھی نیت — اسے بھی آج تک دیتے ہیں قیمت

آٹھواں : سوار اک گاڑی پر ہو کر گئے تھے
کئی گھنٹے اُسے چکر دیے تھے
غضب کا پیٹ ہے اللہ اللہ — کرایہ نوش اس کا کر گئے واہ

نواب : بڑا افسوس ہوتا ہے ہمیں یاں
نہ تھے اس طرح کے ہرگز وہ انسان
نہایت ہی دیانت دار تھے وہ — نہ تھے خائن امانت دار تھے وہ

راوی : واہ اچھی بے پر کی اڑ رہی ہے۔ اس شاعر کے صدقے۔

میاں آزاد تھانہ تک جاتے جاتے، راہ میں کوئی اٹھارہ ہی جگہ پر ٹکے ہوں گے۔ تھانہ پر جانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ اخبار میں درجن بھر اشتہار پڑھے، تو ماتھا ٹھنکا کہ خدا ہی خیر کرے، اور طرّہ اس پر یہ کہ بی اللہ رکھی نے ٹوہ لگا کر خط بھی بیرنگ روانہ ہی کر دیا۔ اب "جائے رفتن نہ پائے ماندن" ضغطے میں جان ہے۔ خوف یہ کہ تھانہ پر جائیں تو مبادا کوئی حلیہ ملائے، مفت میں دھر لیے جائیں بارے:

ما کارِ خویش را بخداوندِ کارساز
بسپردہ ایم، تا کرم او چہا کند

کہتے ہوتے تھانہ پر دل سے داخل ہو گئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ تھانہ دار صاحب چھپر کھٹ بچھائے بیٹھے ہانک رہے ہیں کہ میں نے فلاں گاؤں میں ۱۸۔ ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا اور ۲۴۔ برس کی

چوری برآمد کی، اور گلبازسے نامی چور کو گرفتار کر لایا۔ کانسٹبل ہاں میں ہاں ملاتے، اور بھرے دیتے جاتے تھے، کہ آپ ایسے، اور آپ ایسے، اور آپ ڈبل پیسے۔

اتنے میں ان کے اور تھانہ دار صاحب کے ساڑھے تین آنکھیں ہوئیں این! یہ ساڑھے تین چہ معنی دارد؟ تھانہ دار کی ڈیڑھ ہی آنکھ تھی۔ آدھی ڈاکوؤں کی نذر کر چکے تھے۔

آزاد : السلام علیکم۔

تھانہ دار : وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج اقدس؟

آزاد : عالم بالا پرے، اب گٹھری دلواؤ اُستاد جی۔

تھانہ دار : اُستاد جی کس بھکوے کا نام ہے۔ یہ اُستاد جی کہاں رہتے ہیں! اور گٹھری کیسی؟ یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

آزاد : واہ ری تیری تھانہ داری۔ ماشاء اللہ صورت سے نہیں پہچان جاتے کہ مستغیث مظلوم ہے۔

تھانہ دار : کیا کوئی واردات ہو گئی۔

آزاد : جی اور نہیں تو کیا، کتے نے کاٹا تھا جو میں خاک پھانکتا ہوا یہاں آتا۔

تھانہ دار : اچھا پھر آپ روزنامچے میں رپورٹ لکھوائیے، منشی جی لکھ لو۔

منشی جی : آپ کا کیا نام ہے؟

آزاد : اس سے آپ کو کیا کام ہے۔ آخر آپ کو ناؤں اور گاؤں سے کیا واسطہ؟

میاں آزاد اور تھانہ کے منشی سے آدھ گھنٹے تک گلچپ رہی۔ میاں آزاد کو نام بتانے میں انکار، منشی کو اصرار، اور میاں آزاد نام بتاتے تو بتاتے کیوں کر میاؤں کا جو خوف تھا۔

خیر آخر کار بڑی غر فش کے بعد نام بتایا، مگر مصنوعی۔ اچھا لکھ لیجیے، ہمارا نام جنٹلمین ہے۔

منشی : کیا جنٹلمین؟ بھئی واللہ یہ تو انوکھا نام ہے۔ آپ کرسٹان ہیں؟ ہندو مسلمان کا تو ایسا نام آج تک سنا نہیں۔

آزاد : آپ کوئی قاضی ہیں۔

منشی : آپ کا اسباب وسباب نہیں کھویا ہے، بس معلوم ہو گیا، آپ فقرہ باز آدمی ہیں۔ نو برس سے ہم منشی تھانہ ہیں، ایسے منطقی دیکھے ہی نہیں جیسے آپ ہیں۔ سوائے السیٹھ کے دوسری بات نہیں یاد ہے۔ اگر بے وجہ بھی کسی سے پوچھیں کہ آپ کا اسم مبارک کیا ہے، تو اس کو بتاتے میں اغماض نہ ہو، مگر آپ کی عقل کے قربان، آتے ہیں رپٹ لکھانے اور نام بتانے میں مچلتے ہیں۔

آزاد: مجھ سے زبان نہ ملائیے گا، اتنا میں نے کہہ دیا ہے۔ ذری میں ٹیڑھا آدمی ہوں۔

تھانہ دار: اچھے اچھے ٹیڑھوں کو تو ہم نے سیدھا بنایا۔ آپ ہیں کس کھیت کی مولی۔ کوئی ہے! گیان سنگھ! وہ حلیہ تو ملاؤ۔ بالکل ویسی ہی شکل وصورت ہے۔

گیان سنگھ نے حلیہ جو ملایا تو سرِ مو فرق نہیں۔ غضب ہی ہو گیا، مگر اس وقت کر کیا سکتے تھے، دھر لیے گئے۔ فوراً حوالات میں دندنانے لگے۔

میاں آزاد مصیبت رسیدہ، ایک ہی گرگِ باراں دیدہ، پرلے سرے کے نیار یے، ترانوٹوں کے قبلہ گاہ، استادوں کے پشت پناہ، بھلا وہ اور حوالات میں رہیں۔ واہ رہ چکے۔ یہ ستم سہہ چکے۔ کانسٹبل کو وہ وہ بھرّے دیے کہ چنگ پر چڑھ گیا۔ باتوں باتوں میں یارانہ پیدا کر لیا۔ دم کے دم میں وہ پینگ بڑھاتے کہ اُن کا دم بھرنے لگا۔ اب اسے فکر ہوئی کہ ان کو حوالات سے ٹہلا دے۔ حوالی موالی، سنتری گھڑیالی، کی آنکھ چوکی، اور میاں آزاد اس طرح غائب ہوئے، جیسے جان تن سے، یا بوئے گل چمن سے:

کب سبک دوش رہے قیدیِ زندانِ وطن
بوئے گل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

دائیں بائیں دیکھتے، چُپ چاپ دبے پاؤں جانے لگے۔ ذرا آہٹ ہوئی، اور ان کے کان کھڑے ہوئے، کہ پکڑے گئے۔ کھٹ کی آواز آئی، اور ہوش پرّان۔ کسی نے کسی کو پکارا، اور میرے شیر نے قدم بڑھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ کافر راستہ طے کیا۔ اور دن سے سرا میں داخل ہوئے۔ جاکٹ پتلون ڈانٹا، ہاتھ میں ایک موٹا بید لیا۔ اسباب کا بقچہ سنبھال، بیگ گلے میں ڈال، بی بھٹیاری کو بھاڑا دے کر، عینک چڑھا، قدم بڑھا، یہ جا وہ جا۔ اب راہ میں ایک ایک سے پوچھتے ہیں کہ کیوں حضرت اسٹیشن کی راہ کدھر ہے؟ کیوں میاں ریل کا راستہ کس طرف ہے؟ دل لگی باز آدمی، پھر آپ جانیے کہ ایک ٹھٹھول کوئی پچھم بتاتا ہے، کوئی پورب۔ ایک مزدور گٹھا لیے ہوئے اُتّر کی طرف چلا۔ دوسرے نے دکھن کی راہ لی۔ سوچے کہ ابھی ہم پورے جنٹلمین نہیں بنے، جھپاک سے ایک گاڑی کرایہ کی، اب ٹھیٹھ جنٹلمین بن گئے۔ بگھی کھڑکھڑاتے ہوئے اسٹیشن پر داخل۔ ان کو تحقیقات کا عارضہ، لگے ہر ایک سے ادھر اُدھر کی گپ اڑانے۔ آدمی تھے مشٹنڈے، جاکٹ پتلون اور البرٹ فیشن کے بال دیکھ کر لوگ سمجھے کہ کوئی جلیل القدر عہدہ دار ہیں۔ دس پندرہ آدمیوں سے ساری خدائی کے تذکرے کر کے ایک صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ ان کی آنکھوں سے تاڑ گئے کہ آدمی چمن طبع، اور باوضع ہے۔ انھوں نے جو اُن پر نظر ڈالی تو دیکھتے ہی بھانپ گئے کہ رنگین مزاج، اور خوش فکر، باغ و بہار آدمی

ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلے بولیں، وہ کہتے ہیں یہ اقدام کریں۔ آخرکار میاں آزاد نے سکوت کا کفر توڑا۔

آزاد : یا حضرت سچ کہیے گا کیا فرمائش گرمی پڑتی ہے۔ ہر بن مو العطش گویاں ہے۔

جواب : عرض کروں حضرت! العطش تک توخیریت ہے، جو کہیں خدا ناکردہ ہفتہ عشرہ یہی چلچلاتی دھوپ پڑی، اور امساکِ باران کی یہی کیفیت رہی، تو ہر بن مو سے الجوع کی صدا نکلے گی۔ غلہ صاف جواب دے جائے گا۔ خداوندا بچائیو! اور جو کہیں جھڑی لگ جائے تو پھر مزے ہیں۔ کھیت لہلہائیں، لوگ ملار گائیں، کسان بغلیں بجائیں۔ امریوں میں جھولے پڑیں۔ اور ان پر مہوشانِ طناز جھولیں۔ تماشائی سیر دیکھیں۔ عاشق تن آنکھیں سینکیں۔

آزاد : اسم شریف؟

جواب : موج! اور آپ کا اسم مبارک؟

آزاد : آزاد خانہ برباد۔ کہیے کس طرف کے عزم ہیں۔ مضائقہ نہ ہو تو ہمارا آپ کا ساتھ ہو۔ ایک ہی درجے میں بیٹھیں، خوب گپیں اڑیں، کسی طرح راستہ تو کٹے۔

موج : میاں ع۔ ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی۔ لیکن حضرت راستہ کاٹنے کا یہ طریقہ ہی نہیں بندہ ریشائیل آپ مچھا کڑا بیگ، راستہ کٹنے کی یہی صورتیں ہیں۔ بھلا ہاں اگر کوئی عروسِ نوخاستہ ساتھ ہو تو راستے کے لطف دیکھیے، واللہ یہی دعا مانگوں کہ الٰہی آج کی رات سحر ہی نہ ہو۔ اسٹیشن کا پتہ ہی نہ ملے۔

آزاد : لانا ہاتھ۔ واللہ استاد کیا کہتا ہے۔ بھئی ہم تو چتونوں ہی سے تاڑ گئے تھے کہ اسٹیشن بھر پر ہمارے مذاق کے بس ایک تم ہی تو ہو۔ پھر چلیے کوئی رنگیں کمرہ ڈھونڈھیں۔ ع وہ گھری چھنگی آج کسی گل عذار سے" واللہ بس ہمارا ابھی یہی نشن ہے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک دفعہ ہی چھما چھم کی آواز آئی۔

آزاد : یا وشں بخیر:

دلِ گواہ است کہ در پردہ دل آرائی ہست
ہستیٔ قطرہٗ دلیل ست کہ دریائی ہست

الٰہی یہ کس متوالی کی آمد آمد ہے، کہ چھڑوں کی جھنکار سنتے ہی ایسے مست ہو گئے جیسے بسنت کی رت میں بھونرا۔ گمر ارے لاحول ولا قوۃ۔ ہم سمجھے تھے کہ اس نقاب سے کوئی جھلکتا ہوا رخِ انور غیرتِ شمس و قمر، جلوہ کناں ہوگا، مگر وہ حسنِ گلو سوز نہ وہ نورِ عالم افروز، کالا بھجنگا ہفتہ کار دز۔

اتنے میں تیسری گھنٹی ہوئی، اور میاں آزاد اور میاں موج! ریل پر تڑسے جا بیٹھے، اور انجن بھک بھک کرتا ہوا چلا۔ اب راہ کی دل لگی سنیے! کہ میاں آزاد کے درجے میں بہت سے مسافر بیٹھے تھے، اور سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ انھوں نے جو سب پر نظر کی تو ان کو جنٹلمین کوئی نہ نظر آیا۔ (بجز اپنے) ٹو پی کو تو انھوں نے تڑسے پھینکا۔ آچھیں، ٹانگیں پھیلا کر ناول پڑھنے لگے۔ (مانٹی کرسٹو) پندرہ[15] بیس[20] منٹ میں ناول کو بھی پھینکا، اور لگے ٹہلنے۔ گلاس نکالا اور لمینڈ کی بوتل کو کھولا۔ کاگ دن سے اڑا کر غٹے غٹے پی گئے۔ رومال سے منہ پوچھا۔ پھر ٹہلنا شروع کیا، پھر ناول پڑھا، پھر شراب کی بوتل بیگ سے نکالی (کارلوڈنر) چسکی لگائی کہ اتنے میں سامنے دو[2] باپ بیٹوں میں تکرار ہونے لگی۔

باپ : تو بڑا شہدہ ہے بے!

بیٹا : آپ تو ناحق، بن ناحق، کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ قبلہ و کعبہ آپ کے ہوتے ساتھی بڑا میں کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ بڑے آپ، چھوٹا میں۔

باپ : محض بے وقوف ہے۔

بیٹا : دریں چہ شک۔ آپ کی بے وقوفی میں ہی تو ہوں۔

باپ : الّو کہیں کا۔

بیٹا : اُلّو نہیں اُلّو کا پٹھا سہی۔

درجے بھر میں اس حاضر جوابی پر قہقہے پڑنے لگے۔ میاں آزاد کو تحقیقات کا مرض۔ گھنٹوں دریافت کیا کیے کہ آخر لڑکے کی گستاخی کا سبب کیا۔ تو معلوم ہوا تعلیم اچھی نہیں ہوئی، ماں نے لاڈ کیا۔ باپ نے طرح دی۔ مولوی صاحب دن بھر اونگھا کیے۔ لونڈا اخدائی خوار گدھے اسوار، زمانہ بھر کے گنڈوں، لقوں، شہدوں، لچوں کے ساتھ پھرنے لگا۔

میاں آزاد صافی مذاقوں کو اشعار آبدار سناتے۔ کن رسوں کو سُریلی آواز سے رجھاتے۔ کُشتی گیروں کو بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھوں ہاتھ دستی اور ردم تلاجنگ، اور حلقوم کے داؤ پیچ بتاتے۔ ہنستے کھل کھلاتے ریل پر چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ہی ریل ٹھہری اور اسٹیشن کے چبوترے پر ایک شخص نے کفن پھاڑ کر چلانا شروع کیا۔ ہو ہو ہو! ایں! یہ وزن ہی نرالا ہے۔ وحشت کا بول بالا ہے۔ ان کی سنیے کہ چبوترے کے اس سرے تک اپنی ہی ہانک رہے ہیں۔ "ہو ہو ہو" الٰہی خیر۔ ٹھٹھول مسافروں نے آوازے کسنے شروع کیے۔ دماغ پر گرمی چڑھ گئی۔ شیطان نے دور سے انگلی دکھادی۔ یا وحشت! ٹھہرے ہوئے۔ فصد کھلواؤ عصد، آخر یہ ہو ہو ہو کے معنی کیا؟ بھئی تو کہتا کیا ہے؟ واہ معنی۔ کیسے؟ معنی کسی مولوی سے پوچھیے۔

ہو ہو ہو! ہائیں! پھر وہی ہو ہو ہو، اسٹیشن ماسٹر دیکھیے یہ پاگل ہو ہو ہو کر کے ہم کو ڈراتا ہے۔ ہائیں، نہیں، پاگل نہیں، چاپ راسی (چپڑاسی) ہے اسٹیشن کا نام بتاتا ہے بھیوٗمو۔ کیا؟ بھیوٗمو؟ لاحول ولا۔ وہ تو ہو ہو ہو کر رہا ہے ہاں دِل جولدی۔ جولدی (جلدی) بولتا ہے۔ اجی ایسی جلدی پر شیطان کی پھٹکار۔ آخر گھبراہٹ کیا ہے۔ بارے چلتے چلتے ایک اور اسٹیشن پر پہنچے۔ اخاہ کچھ ٹھکانا ہے، یہاں تو مسافر پٹے پڑے ہیں۔ اسٹیشن پر بنارس کے بڑھوا منگل، آگرے کی تیراکی کا ایسا جماؤ ہے۔

اسٹیشن ماسٹر: (ایک مسافر سے) یہ لاکھوں من کا بوجھ تم کیسے لے جانے پاوے گا؟

مسافر: لاکھوں من کا بوجھ تو سوجھا، مگر یہ کروروں آدمی نہ سوجھے۔

اسٹیشن ماسٹر: دل تو اتنا آدمی کہاں ہے؟

مسافر: دل تو پھر اتنا بوجھ کہاں ہے۔ تم نے سیروں بوجھ کو منوں کہا۔ ہم نے پچاسوں مسافروں کو کروڑوں کہا۔ چلیے برابر ہو گئے نہیں۔ تم لوگوں کا قاعدہ ہے، کہ ناحق بن ناحق چلتے بیل کے سینگ پکڑتے ہو۔ گیارہ آدمی اور چوبیس سیر بوجھ۔ کیا بہت ہوا جو چیں چپڑ کرتے ہو۔

اتنے میں تیسری گھنٹی ہوئی۔ گارڈ نے جھنڈی کے عوض ہاتھ دکھایا، اور ریل کھڑکھڑاتی ہوئی چلی، تو کھٹ سے اسٹیشن پر داخل، اب مارے پیاس کے مسافروں کے گلے میں کانٹے پڑ گئے۔ جو طرفہ چل پوں مچی ہوئی ہے۔ پانی والا! پانی والا! میاں بھشتا ہوت۔ مصر جی مصر جی پانی والے مصر جی! اتنے میں اسٹیشن ماسٹر نے غل مچایا۔ مسافر لوگ کو بھورنگ (فوراً) جال (جل) پلاؤ۔ ایک طرف مصر جی دھوتی باندھے، دوسری جانب میاں بھشتا پائنچے چڑھائے، پانی پلانے لگے۔ مگر آدھا لوٹا پلایا، اور دن سے دوسرے گاڑی میں۔ پانی کی جھلک دکھائی، اور جھپاک سے پچاس قدم پرے ہو رہے۔ اب مسافروں کا ریلا آیا۔

میاں آزاد کوٹ پتلون ڈانٹے، جنٹلمین بنے ہوئے تھے۔ مجال کیا کہ کوئی ان کے درجے میں قدم تو رکھے۔ پھر ریل چلی، گھڑ گھڑ، بھک بھک، چھنک چھنک، دھمک دھمک، ایں! یہ چھنک چھنک، دھمک دھمک کے کیا معنی۔ جی یہ ریل گنگا کے پُل پر سے جا رہی ہے۔ بہت ہی خاصے۔ ایک دفعہ ہی ہندوؤں نے غل مچایا کہ۔ بول سری گنگا جی کی جے۔ ریل بھر گونج اٹھی جے۔ میاں آزاد بھی الاپنے لگے۔ گنگا توری لہر ہمارے من بھائی۔ گنگا توری لہر۔ بلہاری بلہاری ریل ہوا ہوئی، اور دھماک سے اسٹیشن پر موجود۔ میاں آزاد کھٹ سے ہوٹل میں پہنچے۔ حکم دیا کہ ایک گلاس شیری، ایک بوتل لمونیڈ اور برف لاؤ۔ غٹ غٹ پی گئے۔ کیا دام ہوئے؟ ہجور شیری کے ۸ ر لمنیڈ کے ۴ ر برف کے ۲ ر آٹھ اور چار بارہ،

بارہ اور دو چونّہ، آنے ہوئے۔ روپیہ دیا دو آنے واپس لیے، اور ریل کے درجے میں تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جوانِ رعنا، بلند بالا بیگ گلے میں ڈالے، درجے کی تلاش میں گھوم رہا ہے، مگر چہرہ اداس، صیدِ حسرت و یاس، آنکھوں سے جوئے اشک جاری، اور ایک غشی سی طاری۔ حیرت تھی کہ بارے خدا یہ کیا اسرار ہے۔ گبھرو جوان، تک سک سے درست، یہ رونی صورت کیوں بناتے ہوتے ہے۔ جھپ سے اپنے درجے کی کھڑکی کھولی، اور کہا آئیے یہاں آئیے۔ وہ بے چارہ مصیبت کا مارا چپکے سے آن بیٹھا۔ ریل چلی تو میاں آزاد سے یوں مکالمہ ہوا۔

آزاد : کیوں میاں صاحبزادے بھلا بتاؤ تو۔ کس کے ستم رسیدہ ہو کس کے ستائے ہو۔ آخر یہ کیوں منھ بناتے ہو؟

جوان : جی صورت ہی ایسی ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

آزاد : نا صاحب! صورت سے صاف برستا ہے کہ آپ شگفتہ جبیں ہیں، مگر اس وقت سر کہ جبیں ہونے کا سبب کچھ اور ہی ہے۔ ہم نے بھی اس کوچے میں خاک اڑائی ہے۔ بس تاڑ گئے کہ کسی بتِ حور وش پر حضور کی طبیعت آئی ہے، اور کسی ترکِ ستم گار نے تاک کر عین جگر پر نظر کی برچھی لگائی ہے۔

جوان : حضرت اس وقت آپ کی تقریر سے دل بھر آیا۔ اور پرانا قصّہ از سر نو یاد آیا۔ اصل حال یوں ہے کہ خدا ہر شریف کو صحبت بد سے بچائے:

کم نشیں با بدان کہ صحبتِ بد　　گرچہ پاکی ترا پلید کند

صحبت بد وہ کالی ناگن ہے جس کا کاٹا منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔

آزاد : حق ہے مگر صاف صاف حال کہیے۔

جوان : عشق خانہ خراب نے ہمیں ادھر کا رکھا نہ ادھر کا، دین کا رکھا نہ دنیا کا:

ایں عشق ندانم از کجا خاست　　گز ہر رگ و ریشہ ام بلا خاست

اف ایک روز گھنگھور گھٹا چھائی تھی۔ بادل جھوم جھوم کر منڈلا رہے تھے۔ یارانِ سر پل ملار گا رہے تھے، اور بندۂ درگاہ چوک میں چکر لگا رہے تھے، کہ دفعتہً ایک رنگین کمرے پر نظر پڑی، تو دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ صورت سے لوگ بھانپ گئے کہ عشق چرّایا۔ لاکھ چھپایا، مگر عشق چھپائے چھپتا ہے۔ اے تو یہ۔ پھر صورت وہ کہ پری یا چاند کا ٹکڑا، یارانِ سر پل نے سمجھاتا تو در کنار اور الٹا

پھنسوا دیا، اور روز بندۂ درگاہ شہدوں کے ساتھ وہاں پہنچنے لگے۔ خوب گلچھڑے اڑنے لگے۔ مگر زبانی داخلہ۔ ہاں اتنا تو ضرور کہوں گا کہ اس کو بھی گونہ لطف تھا۔

خیر ایک دن یارانِ سرپل اس کو میلے لے گئے۔ اب سنیے پہلے ہی دن پیڑ کے تلے شرابیں لنڈھائی گئیں۔ اکشا نمبروں ایک بوتل شامپین ایک بوتل، روز ایک بوتل، وسکی ایک بوتل، اوڈ ٹام ایک بوتل، اور پیل برانڈی ایک بوتل، کل چھ بوتلیں، اور دس آدمی پینے والے۔ ساقی اور صنم بادہ فروش وہ خود ہیں۔ ساڑھے چار بوتلیں تو یارانِ سرپل نے پیں، اور مارے ہَو کے وہ خود ڈیڑھ بوتل اڑا گئیں۔ شام کو گھر آئیں، تو مخمور نشے میں چور، بارہ بجے سے طبیعت گھبرائی۔ اس کی بہن ایک فنس پر سوار کر کے اس کو اسپتال لائی۔ مگر آتے ہی آتے، نور کے تڑکے دم توڑا۔ دنیا تے دون سے منھ موڑا۔ یارانِ سرپل کو خبر ہوئی کہ چل بسیں۔ سر پر خاک اڑاتے اور چلّاتے وہ بھی پہنچے: ؎

قبر پر آئے بہت روئے کیا یاد مجھے
خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

اسپتال میں چو طرفہ کہرام تھا۔ فنس کے اردگرد ازدحام تھا جسے دیکھو مصروف گریہ وزاری۔ ہر آنکھ سے اشک جاری۔ ہے ہے گلِ نوخیز گلستانِ صباحت مرجھا گیا۔ ہے ہے، پھلا پھولا، ہرا بھرا گلبُن کمھلا گیا۔

یہاں اس حادثۂ نادیدنی اور سانحۂ ناشنیدنی کی کانوں کان خبر ہی نہیں، مگر تڑکے بستر سے جو اٹھے تو میٹھا میٹھا درد سا ہونے لگا۔ سوچے کہ ڈاکٹر سے رجوع لائیں، اور دوا کھائیں۔ اسپتال میں آئے تو انبوہ کثیر، جم غفیر، ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع، کیوں کیوں خیر باشد؟ حضرت خیر کجا۔ ایک بے چاری کی مفت میں جان گئی۔ ہائے ابھی اٹھتی جوانی تھی۔ حُسن پھٹا پڑتا تھا۔ مگر رہے نام اللہ کا۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ خدا ہی خیر کرے کچھ دال میں کالا ضرور ہے:

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانو کچھ ہوئے
جِنکے کارن میں جوگن بھئی وہی نہ جلتا ہوئے

فنس کے قریب گئے تو شک دور، اور گمان کافور ہو گیا۔ ہائے جوانی کا یہ جوش اور کفن پوش۔ ہے ہے یہ کیا ہوا۔ میں تو جیتے جی موا۔ طبیعت بے قرار، سینہ فگار، حالت زار، آنکھیں اشکبار، دنیا کی فکر نہ عقبیٰ کا ہوش۔ بادۂ محن کے نشے میں مدہوش، میں خرقہ پوش، خونابہ نوش، رند شاہد باز، بندۂ بتاں طناز، خوگر راحت، اب یہ مصیبت سہنی پڑی۔ جوشِ سودا نے وہ رنگِ اثر دکھایا کہ فکرِ بیگانہ نہ خیالِ خویش

ہیں اور دل ریش :

زہرِ عضوم طپیدن زد چناں سر   کہ شد پیراہنم بالِ کبو تر

اُف اُف! اف! دوستوں نے سمجھایا کہ مردِ خدا عقل کے ناخن لو، دیکھو رسوا ہو جاؤ گے۔ اب عشوق کا زندہ ہونا معلوم۔ پھر گریۂ ڈیکا سے فائدہ۔ مگو ہوشِ جنونِ اور وعظ یعنی چہ :

پر پندِ عاقبت طلبان گوش کے نہیم
کیں مومیائی است کہ خواہد شکست ما

کسی حضرت نے جرڑی کہ زہر دیا گیا تھا۔ حکم ہوا کہ لاش چیری جائے۔ ہائے ستم کے یہ کام اُس نواجوان کے سپرد ہوا، جو اس پری پیکر کے عشاق زار میں سے تھا۔ مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ ناچار "قہر درویش بر جان درویش" کہہ کے، رنج والم سہہ کے، چھری لے کر کمرے میں گیا، تو اپنے معشوق زہرہ تمثال، مشتری خصال، کی نورانی صورت، گورے گورے مکھڑے، سُرمگیں آنکھ، لب لعل شکر خاؤ دستِ حنائی کو آغشتہ خون و خاک دیکھ کر ایک چیخ ماری، اور چھری پھینک کر بھاگا۔ تو دھم سے زمین پر۔ کسی اور تے جرڑوی کہ یہ بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ حالانکہ ہمارے فرشتہ خاں کو بھی خبر نہیں۔ مگر مجرم ہیں تو صرف اس قدر کہ دو چار بار آئے گئے۔ لیکن صحبت بد کا برا ہو کہ رجسٹر پر ناکردہ گناہ، ایں جانب کا نام بھی درج ہو گیا۔ مگر خدا ہی خوب جانتا ہے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ ہاتھ بھی لگایا ہو تو ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ کبھی اشارہ بھی کیا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ خدا صحبتِ بد سے بچائے۔ شہدوں کی ٹکڑی میں بھلے مانس کو نہ پھنسائے :

اے طالبِ لذتِ غذا ہائے لذیذ   جویائے حلاوتِ مربائے لذیذ
با نانِ جویں بسازو، پیش دو نان   کف کفچہ مکن از پی حلوائے لذیذ

میاں آزاد ریل پر بیٹھے، ناول پڑھ رہے تھے، کہ دوسرے درجے سے ایک شخص نے پوچھا۔ یا حضرت! دو ایک دم لگائیے تو یہ پیچوان حاضر ہے۔ واللہ وہ مشکبو دھواں دھار، پلاؤں کہ پٹھانا کی دکان کی تمباکو کا مزہ حاصل ہو۔ لیکن قبلہ اتنا یاد رہے کہ :

حقہ یک دم دو دم سہ دم باشد   نہ کہ میراث جدو عم باشد

ایسا نہ ہو کہ آپ بھیتسیا جونک بن جائیں۔ جی ذری اتنا خیال رہے۔ ایں! حقہ یہاں ریل پر کیسا؟ پیچھے پھر کے میاں آزاد نے کہا، تو ایک بگڑے دل مزے سے بیٹھے ہوئے بے غل وغش پی رہے ہیں۔

آزاد : یہ کیا اندھیر ہے بھئی! واللہ کیا بگڑے دل جمع ہیں۔ آپ ریل ہی پر گڑگڑاتے لگے دھواں دھار،

اور طرفہ اس پر یہ کہ حقہ بھی نہیں، بیچواں اور اینٹ کا جنگی تو ا، جو پہروں کی خبر لائے، جو کہیں گارڈ یا اسٹیشن ماسٹر دیکھے گا تو الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چڈا اور جو آگ لگ جائے گا۔

بگڑے دل : اور جو مینھ بھی ساتھ ہی برس پڑے، اور جو آگ لگتے ہی بجھ جائے، اور جو ریل ہی ٹکرا جائے، اور جو آسمان پھٹ پڑے، اور جو بجلی گرے۔ اس (اور جو) کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ پیجیے گا۔ یا باتیں بنائیے گا۔ دیکھئے کیا خمیرہ ہے۔ کوڑی نہ دیجیے دم تو لگا لیجیے۔

آزاد : یہ دم کسی اور کو دیجیے گا۔ بندہ مہنال دروازے میں رہتا ہے۔ آپ ضامن ہوتے ہیں کہ ریل پر حقہ پینا جرم نہیں ہے۔

بگڑے دل : اجی یہاں تو بے حقہ گڑگڑائے چین ہی نہیں آتا۔ دوزخ جانے میں اپنی جانب خوش کا ہے سے ہیں۔ اسی سے کہ وہاں جلتے بلتے انگارے ملیں گے۔ یاروں کے توے خوب مزے دیں گے بچے اور پکے کوئلوں کی ان کے آگے اصل و حقیقت ہی کیا ہے۔ اے توبہ! اجی جائیے بھی آپ تو باتوں میں لگاتے ہیں، یہاں حقہ بھڑکا جاتا ہے۔

دو چار بے فکروں نے خوب مزے سے حقہ پیا۔ دو چار نے چلم ہی پر کفایت کی جب اسٹیشن قریب آیا تو آگ گل، چلم غائب۔

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ دھت بھی کیا بُری چیز ہے۔ چاہے جرمانہ ہو جائے، دھر جائیں، ذلیل و خوار ہوں، مجرم بنیں، مگر حقے کا دم نہ چھوٹے۔ ایسی دھت پر تین حرف۔

ایک اسٹیشن پر ریل ٹھہری، تو خربزے اور آم پٹے ہوئے، کھانچیوں کی کھانچیاں لدی پڑی ہیں۔ شاخیں آم کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں۔ ٹپکا لگا ہے۔ آم ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ کوئل کی سُریلی جھنکار ستم ڈھاتی ہے۔ پپیہوں کی پیاری پیاری صدا کانوں میں آتی ہے۔ اللہ اللہ یہ اسٹیشن ہے یا آم کی دکان۔ یا خربزے کی کھان۔ کیوں بھئی یہ آمپور یا خربزہ نگر۔ جدھر نظر اٹھتی ہے آم اور خربزہ ہی نظر آتا ہے۔

ایک مسافر بولے اجی نظر نہ لگائیے حضرت! اب کی فصل تو کھا لینے دیجیے۔ یہاں اسی پر تو زیست ہے خدا جھوٹ نہ بلائے ہم بھی کس آفت کے بندے ہیں۔ الغلط۔ اچھا خدا کے بندے سہی۔ تلفظ اور املا غلط اچھا اپنے آپ کے بندے سہی۔ انشا غلط، اچھا صاحب شیطان کے بندے سہی۔ از سر تا پا غلط۔ ایسے بھئی کھاؤ بیر کے بندے سہی۔ پیٹ کے بندے سہی۔ ہاں یہ مانی۔ اس کے ساتھ زبان کا چسکا بھی ایسا ہی ہے کہ خدا کی پناہ۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح منھ چلا جاتا ہے۔ آتم غلم خدا جانے کیا کیا زہر مار کیا کرتے ہیں۔ یہ سال بھر کے چھٹے کا سَت ہے۔ مگر خربزہ اور آم کی فصل میں اور ہی مت ہے۔ اور سچ پوچھو تو

درگت ہے۔ فالیز میں بیل بڑھی اور یہاں کچے گھڑے کی چڑھی۔ آم بازار میں آئے اور ایں جانب بوارائے۔ ایں یہ بورانا چہ معنی دارد؟ لاحول ولا، آپ بھی کہیں گے میں آدمی ہوں۔ نرے چونچ ہی رہے، واللہ۔ بس جمالی خرپزے ہی نکلے۔ اس طبعی کھدری سمجھ پر تین حرف۔ ذرا تو مغزِ سخن کو بہتچو بندۂ درگاہ تو خرپزے اور آم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ کپڑے بیچ کھائیں۔ باسن نخاس پٹیل لائیں۔ بدن پر لتا نہ رہے چوطھے پر توا نہ رہے۔ اُدھار لیں، اُستھنا تک گرو رکھیں۔ بگڑا کریں، جھگڑا کریں، مگر خرپزے پر چُھری ضرور تیز ہو۔ ما بدولت ہوں اور فالیز ہو۔ تڑکا ہوا، چاقو ہاتھ میں لیا، اور بندہ چلا۔ بازار ہے کہ مہک رہا ہے۔ کھانچیوں کی کھانچیاں۔ کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ تو عمر سن کرنین عجیب نازِ معشوقانہ سے ہانک لگا رہی ہیں ؎

لختے بردازدل گذرد ہر کہ زپیشم
من قماش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

خریدار ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں۔ یہ کھانچی ہماری، وہ ڈھیر ہمارا۔ دلبر میوہ فروش، جوانی کی امنگ، اور شباب کی ترنگ، میں فرطِ غرورِ حسن سے اچھے اچھوں کو ڈانٹ بتاتی ہے۔ میاں الگ رہو۔ کھانچی پر نہ گر پڑو۔ بس دور ہی سے بھاؤ تاؤ کرو۔ واہ محنت (مفت) کی جھنجھٹ۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ ابھی کنجرا بولے تو دھپ کھائے۔ وہ دنش کے بنیئں ہاتھوں ہاتھ لے لیں۔ ایک تراشا، دوسرا تراشا، تیسرا تراشا۔ خوب چکھے۔ آنکھ چوکی تو دو چار منھ میں دبائے اور چلتے پھرتے نظر آئے۔ واہ آدمی کیا بندر ہو گئے۔ میاں سچ تو یوں ہے کہ لکھنؤ کے ایسے کھرے خرپزے، ساری خدائی میں نہیں دیکھے نہ سُنے۔ لذیذ و شیریں، اور پھر اب کی سال تو یاروں کے پوبارہ ہیں۔ گرمی کی شدت آفتاب کی حدت، دھوپ کی تمازت، زمین کی حرارت نے وہ اعجاز دکھایا کہ ایک ایک پھل کو کوزۂ قند و نبات بنایا۔ کابل کے سردے کا بازار سرد ہے۔ کشمیر کا گلاس گرد ہے۔ ادھر خربوزوں کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اُدھر آم کی فصل آئی، پھر کیا تھا، منھ مانگی مراد پائی۔ جدھر دیکھیے ڈھیر کے ڈھیر چنے ہیں۔ جس طرف نظر کیجیے انبار کے انبار لگے ہیں: بمبئی، سلٹے، مالدا، شاہ پسند، زعفرانی، پیوندی، تخمی، قلمی، وزیر پسند، سفیدا، الفن، جعفر باغ، فقیر والا، لنگڑا، کھچا کھچ کھانچیوں میں بھرے ہیں۔ شیرہ شیریں، خوشگوار، بوباس میں تار تار، مہک میں طبلۂ عطار، شیرینی میں شہد کی گپّی یا تنگ شکر۔ نکہت انگیزی میں کشتِ زعفران یا مشک اذفر ؎

معطر چو جیب سمن غب غبال

از لب چشی کام شیریں بیان

سفیدا رنگ دبو میں ضرب المثل - یہ سرخا ہے یا کرنمدی روز کی بوتل - یہ پونڈے کا قلم بناؤں تب تو شیرینی کی تعریف لکھ پاؤں - واہ کیا بات ہے - آم کیا ہمشیرۂ قند و نبات ہے - یا یوں کہوں کہ چاشنی بخش حیات ہے - شاخِ نبات ہے - سچ تو یوں ہے کہ اس کا شیرہ آبِ حیات ہے - ریشہ ریشہ مسرت دلہائے ریش میں دوڑ آئے - شکرلیوں کے منھ میں پانی بھر آئے - یہ اصل قند نقل ہے - عسل کی بھلا کیا اصل ہے - یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ دیکھا اور جھپاک اٹھایا - اٹھایا اور تراشا - تراشا اور کھایا - کھایا اور لوٹ ہو گئے - دمنقد آدمی ٹھہرے - مال اسباب کے کوڑے کیے، اور بے گنتی لیے - کھانے بیٹھے تو دو ڈاڑھی کھا گئے - چار ڈاڑھی کھا گئے - ایں! یہ ڈاڑھی کھانا کیسا - اجی حضرت آم اتنے کھائے اتنے کھاتے کہ - الٰہی خیر، کچھ کہو گے بھی ؟ اجی اتنے کھائے کہ ڈاڑھی اور ٹھوڑی تک انبار لگ گئے -

حضرت گرسنہ چشم، یہ ڈینگ ہانک ہی رہے تھے، کہ ریل ٹھہری، اور ایک اہلکار سرکار نے ان کے درجے میں آن کر پوچھا کہ فلاں شخص کہاں ہے ؟

میاں آزاد آپ جاتیے ایک ہی کائیاں آدمی - دنیا بھر کے نیارے بھانپ گئے، کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے - بولے کہ ہم مسافر آدمی ہمیں بھلا کیا معلوم کہ کون کہاں ہے - ہم کیا کوئی خدائی فوجدار ہیں -

اس پر حضرت بندۂ شکم نے چادر سے منھ لپیٹ کر روپوشی کی، اور وہ اہلکار دوسرے درجے میں تلاش کرنے لگے -

میاں آزاد نے دبے دانتوں کہا کہ استاد تم جو روپوش ہوئے تو اس میں کچھ (فیہ) ضرور ہے - بھئی اور کسی سے کہو یا نہ کہو، یاروں سے تو نہ چھپاؤ -

اس نے کہا کیا ؟ روپوشی، ماشاء اللہ اچھی کہی - کیا کسی کا قرض دھراتے ہیں - یا مال مارا ہے - یا کسی کا باپ مارا ہے یا کہیں خون کر کے آئے ہیں -

آزاد : آپ بہت سیکھے ہو جیسے گا تو بندہ دھروا ہی دے گا - بے لس کچّا چٹھا کہہ سناؤ ورنہ میں پکارتا ہوں پھر -

ارے نہیں نہیں، ایسا غضب بھی نہ کرنا، یار چپے! میاں صاف صاف بتا دیں، ہم نے اب کی فصل میں خربزے اور آم خوب چھک کر چکھے، مگر ٹکا کفن کو پاس نہیں - پوچھو لائے کس کے گھر سے ؟ پہلے تو قرض دام لیا، پھر ایک دوست کا مکان اپنے نام سے بیٹیل ڈالا - کوڑے کیے اور آم لیے - اب نالش ہوئی ہے، سو ہم بھاگے جاتے ہیں -

آزاد : ایسے آم کھانے پر بھی چار حرف۔ ل، ع، ن، ت، ارے ناداں سے

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست — تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن ست

دیکھیے نادان واددان نہ بنایئے گا۔ یہ چلے کے فقرے کسی اور کو سنایئے گا۔ ورنہ بیڈھب ٹھہرے گی۔

ہاں یہ کہیے تو بیڈھب ٹھہرے گی۔ اچھا بلاؤں چپراسی کو دھر دادوں پھر۔

نا بھائی چاہے دو چار صلواتیں اور سنا لو۔

اتنے میں ایک مسافر نے کئی درجے پھاندے۔ وہ اچکا یہ آیا، یہ جھپٹا، وہ پہنچا، اور دھم سے میاں آزاد کے پاس ہو رہا۔

مسافر : (میاں آزاد سے) غریب پرور! غریب پرور!

آزاد : کس سے کہتے کس سے ہو؟ ہم سے؟ آج تو کہا اب نہ کہنا۔ ہم غریب پرور نہیں۔ امیر پرور ہیں رئیس پرور ہیں۔

مسافر : حضور امیر لوگ غریبوں کی بھی سنا کرتے ہیں۔

آزاد : ہاں تو جو امیر ہو نہ۔ ایں جانب تو امیر پرور، رئیس گر ہیں۔ امیر پرور بن کر اب غریب پرور ہمارے دشمن ہوں۔

مسافر : چلو صاحب وہ امیر پرور نہیں۔ امیر کے باپ پرور، دادا پرور سہی۔ ذری ہماری بھی تو سنو۔ ہم بھی امیر زادے ہیں۔ رئیس کے لڑکے ہیں۔ اس وقت ایک سوال ہے۔

آزاد : سوال اسکول کے لڑکوں سے کیجیے۔ یا وکالت کے اُمیدواروں سے۔

مسافر : داتا ذرا سنو تو۔

آزاد : داتا بھنڈاری باورچی کو کہتے ہیں۔ داتا کہیں اور رہتے ہوں گے۔

مسافر : الٰہی توبہ اچھے سوم سے سوال کیا۔ کسی سخی سے مانگتے تو گھر بھر دیتا۔

آزاد : کہو تو تمہارا منہ ہم بھی موتیوں سے بھر دیں۔ اب کچھ کہو گے بھی یا بکتے ہی چلے جاؤ گے۔

مسافر : کہوں کیا۔ صورتِ سوال ہے۔ ایک روپیہ دلواؤ۔ تو دعائیں دیتا جاؤں۔

آزاد : اوہ جی۔ دعا کے تو ایں جانب قائل ہی نہیں۔

مسافر : اچھا تو پھر گالیاں دوں، صلواتیں سناؤں؟

آزاد : گالیاں دو تو بتیسی حلق میں ہو۔ اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔

مسافر : یا الٰہی یوں چین، نہ دوں چیں۔ ارے غضب۔ اے لو اسٹیشن قریب آگیا۔ اب مفت میں

بے عزت ہوں گے۔

آزاد: یہ کیوں؟

مسافر: کیوں کیا، ٹکٹ پاس نہیں، گھر سے دو روپیہ لے کر چلے تھے۔ شامتِ اعمال بنارس کا لنگڑا آم نظر پڑا۔ بندۂ درگاہ کھاؤ پیر کے مُرید۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دو روپیہ ٹینٹ سے نکالے، اور آم پر چھری تیز کی۔ اب گرہ میں کوڑی، نہ پاس لتا، کٹے کھائیں البتہ۔

آزاد: واہ بے پیٹو۔ بھلا پھر یہاں تک آئے کیوں کر۔

مسافر: اس کی نہ پوچھیے، یہاں سیکڑوں ہی اسٹیشن یاد ہیں لیکن اب ایک نہ چلے گی۔ اب تو اسٹیشن آ گیا۔

اتنے میں ریل کوکی اور اسٹیشن موجود۔ ٹکٹ بابو کی کالی کالی ٹوپی اور سفید کھوپڑی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ٹکٹ۔ ٹکٹ، ٹکٹ، نکالو۔ میاں آزاد تو ٹکٹ دے کر بے ہوتے۔ بابو نے ان سے ٹکٹ مانگا تو لگے بغلیں جھانکنے۔ دلِ تمھارا ٹکٹ کہاں؟ صدائے بر نخاست، وہ سر کھجلا رہے ہیں۔ دل ٹکٹ نکالو۔ تم کیسا آدمی ہے۔ بابو جی ہم پر تو اب کی سال ٹکس وکس نہیں بندھا۔ یو فول الو آدمی معقول۔ الو آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ آپ کے بنگال میں ہوتا ہوگا۔ ادھر تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ تب تو بابو جھجھلایا۔ کانسٹبل کانسٹبل! اس کو حوالات کرو۔ ٹکٹ نہیں دکھاتا۔ اور اول فول بکتا ہے شالا۔ کانسٹبل نے حضرت کی گردن ناپی، اور حضرت گرسنہ چشم، ع۔ زنداں کو چلے مچل مچل کر۔

سرآمدِ محفل آرایاں بزم رہ نوردی۔ جوہر شمشیر کشور کشایانِ معرکۂ کوچہ گردی، میاں آزاد خانہ برباد، گردو دن دودی میں خوش گپیاں، اڑاتے، لطیفے سناتے، قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ ریل کیا ان کے حساب خالہ جی کا گھر تھا۔ ایک دفعہ ہی کیا دیکھتے ہیں کہ:

قطرہ زناں میرسد ابر بہاری زراہ
وقت گل ولالہ خوش مژدہ بخار دگیاہ
نامیہ خیاط وار زا طلسِ گل گوں دگر
فرق گل ولالہ را دوختہ رنگین کلاہ
لشکرِ گرد و غبار چوں نگریزد کہ باز
بر سرش ابر سیہ راندہ زبان راسیاہ

ہر سمت جوشِ بہار ہے۔ ہر طرف فیض سحاب آزار ہے۔ زاہد پرہیز شعار بھی رندِ بادہ گسار

ہے۔ ہر طرف چمن غالیہ بار ہے۔ نسیم سحر کی مشک بیزی، اور بادۂ طرب انگیز کی نافہ ریزی سے غنچۂ دل تک کھلا جاتا ہے۔ ہر مرغِ چمن ہزار زبان سے شکر الطاف خداوندی بجا لاتا ہے۔ عندلیب نالاں کو وظیفۂ گل، نوک زبان ہے۔ طاؤس طناز فرط ابتہاج سے رقصاں ہے۔ قمریوں کا شمشاد پر ہجوم ہے۔ کوکو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم ہے:

عیش و شور از در و دیوار پدیدست پدید
لوحش اللہ ازیں دور ہمایوں آثار

ریل پر جو مینھ برسے، تو فرمایئے لطف بے اندازہ ہو یا نہ ہو؟ ریل پر موسلا دھار پانی پڑے تو مسرت تازہ ہو یا نہ ہو؟ رنج و ملال کی گرد میاں آزاد کے دل سے دُھل گئی، اور ریل ہی پر لگے اڑانے اور تان لگانے۔ اسٹیشن پر ریل ٹھہری تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت جوان کوئی بیس اکیس برس کا سن پڑھنے لکھنے کے دن۔ گیروے کپڑے پہنے ہاتھوں میں ہتھکڑی پاؤں میں بیڑی ہے، اور دو کانسٹبل ساتھ گردن نیوڑائے، آنکھیں جھکائے، منھ بنائے، ان کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پیچھے ایک پیر فرتوت آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ وہ گریۂ تلخ کہ الاماں، اسٹیشن بھر پر ایک کہرام سا مچا ہے۔ جوان و پیر جسے دیکھو مصروف آہ و بکا ہے۔ میاں آزاد رقیق القلب آدمی ان کا بھی دل بھر آیا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اتنے میں میاں آزاد کے قریب کے درجے میں کانسٹبل اس نوجوان کو لے کر بیٹھے، اور پیر مرد نے بہ خشوع و خضوع میاں آزاد سے روتے روتے کہا، کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو میں آپ کے پاس بیٹھوں تاکہ اس کمبخت لڑکے کی قربت رہے۔ میاں آزاد کا تو دل بھر ہی آیا تھا۔ معاً بلا لیا۔ اور بڑے تپاک سے بٹھایا جب ریل کوکی۔ اور گھڑ گھڑاتی ہوئی چلی تو میاں آزاد نے پیر فرتوت سے یوں گفتگو کی۔

آزاد: کیوں قبلہ! اگر بے ادبی معاف ہو تو بصد عجز دریافت کروں، کہ اس اشکباری اور گریہ و زاری کا کیا سبب ہے۔ دل گواہی دیتا ہے کہ آپ نے وہ چوٹ کھائی ہے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ روتے آپ ہیں مگر آواز میرے کلیجے کے پار ہوتی ہے۔ اور خلق خدا یہ گریۂ و زاری سُنکر روتی ہے:

پیر مرد: دست الم سے اے وائے ویلا
سوتے نہ پائے ٹک پاؤں پھیلا

کیا کہوں۔ کل تک بھلا چنگا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ مصیبت زدہ، ستم رسیدہ، ساری خدائی میں کوئی نہیں۔ آنکھوں میں نور نہ رہا۔ قوتِ سامعہ سے بے بہرہ ہو گیا۔ تاب و طاقت نے ٹکا سا جواب دیا۔ کمر پیرانہ سالی کے سبب سے تو خم ہو ہی گئی تھی، اس سانحۂ نادیدنی نے اور خم کر دی۔ یہ جوان بدبخت

میرا داماد ہے۔ ریاضِ خاندان کا زیب وزین۔ دل کا چین۔ ایک لڑکی کے سوائے اور کوئی اولاد نہیں۔ لیکن صحبتِ بد۔ خدا سمجھے، جس نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ اور آج یہ دن دکھایا کہ میں اس اسّی برس کے سن میں اس کو ایسی حالت زار میں دیکھتا ہوں، جو خدا کسی کو نصیب نہ کرے۔ اُف ساتویں دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ (لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر:

انچہ کردی تو بہ من ہیچ بہ انسان نہ کند

مرگ باجاں نکند کفر بہ ایمان نہ کند

اف۔ ستم ستم، غضب غضب، جب اس کی شادی ہوئی تو یہ کوئی گیارہ برس کا تھا مگر اسی سن سے اس کے ماں باپ نے اس کو بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا تھا۔ بازاروں میں بے غل دغش گھومنا، بات بات پر زبان سے گالی نکالنا، کسی کو دھول کسی پر چپیت جمانا، دو دو دن گھر میں نہ آنا۔ ہر بات پر مچل جاتا، اس میں یہ خوب ہی طاق تھے۔ اس کے پدر بزرگوار کو اس کا اصلاح خیال نہ تھا۔ میں نے جو دو چار بار سمجھایا، کہ بھائی دیکھو لڑکا خراب ہوا جاتا ہے، تو مجھے للکارنے، اور صلواتیں سنانے لگے، کہ واہ آپ ٹوکنے والے کون۔ کیا خانہ داماد بنایئے گا، یا غلام بنانے کی فکر ہے۔ آپ نے لڑکی کیا بیاہی کہ اتالیق بن بیٹھے۔ رفتہ رفتہ صاحبزادۂ بلند اقبال نے چوری چوری اسباب کے کوڑے کرنے شروع کیے، کبھی آفتابہ غائب، کبھی زیور کا پتا نہیں۔ کبھی میوہ فروش دروازے پر غل مچا رہے ہیں، کہ دو مہینے سے ڈھائی روپیہ نہیں دیا۔ اب باہر نکلو گے نہ بچہ۔ کبھی تنبولی نے نالش جڑ دی کہ گیارہ روپیہ کی گلوریاں چکھ گئے۔ دام مانگتا ہوں تو اوپر سے غراتے اور آنکھیں دکھاتے ہیں۔

آخر کار یہ نوبت پہنچی کہ آج پا بجولان ہیں۔ افسوس صد افسوس۔

آزاد : حیف صد حیف۔ پھر اب علاج۔

پیر مرد : علاج، علاج اب کیا۔ ؏۔ علاجِ واقعہ قبل از وقوع باید کرد، مگر وکیلوں نے رائے دی ہے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ مقدمہ جان دار ہے۔ اپیل میں رہا ہو جائے گا۔

آزاد : خدا ہم چنیں کند۔

پیر مرد : پھر۔ باز چہ۔ اب کی اگر رہا بھی ہوئے تو آگے چل کر کیا ہونا ہے۔ اگر یہی حرکت ہیں تو خدا ہی حافظ ہے۔ ان کے ہتھکنڈے نہ چھوٹیں گے۔

خوے بد در طبیعی کہ نشست

نرود جز بوقت مرگ از دست

میاں آزاد بڑی دیر تک اس نوجوان کو سمجھایا کیے، بعدازاں دوسرے اسٹیشن پر وہ نوجوان اور پیر مرد دونوں اُتر گئے :

بیا ساقی بیا اے من مریدت
بدہ جامی کہ خواہم شد شہیدت
سرت گردم بجامی ساز شادم
کہ رنگین قصہ آمد بیادم

مشاطگانِ عرائسِ روایاتِ دل نشین، اور نگار بندانِ عرائسِ حکایاتِ رنگین نے شاہدِ مضمون کو یوں جلوہ پرداز بیان کیا ہے۔ کہ عروسِ وحشت کے برقع کشا، جرعہ نوشِ جامِ بلا، نمک پاشِ تمارِ خوانِ عشق، اسیرِ زندانِ عشق۔ میاں آزاد، خانہ برباد، ریل پر سے اترے، تو اندھیرا گھپ۔ اسٹیشن بھر گپ چُپ :

بود شبے چوں دل گمرہ سیاہ
تیرہ دروں چوں مژہ شمعِ نگاہ

الٰہی یہ رات ہے، یا نمونۂ ظلمات ہے۔ بلکہ وہ بھی اس کے مقابلہ میں مات ہے۔ گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہے۔ کالا متوالا بادل جھوم جھوم کر قبلہ کے رخ سے آیا ہے۔ وہ گھنیری گھٹا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے بارخدایا یہ شب تار ہے یا طالعِ عشاق زار ہے۔ یا زلفِ مہوشاں فرخار ہے۔ تاریکی نے کچھ ایسی ہوا باندھی، کہ چراغ ماہ گل ہوگیا۔ فوج انجم کا قتل ہوگیا۔ یہ شب ہے یا تیرہ دردنوں کا دل۔ یہ شب ہے یا جنوں کی پہلی منزل۔ ہر فردِ بشر جریب ٹیکتا ہوا چل رہا ہے۔ مگر کلیجا دہل رہا ہے، کہ کہیں ٹھوکر نہ کھائیں۔ کہیں منھ کے بھل زمین پر نہ لڑھک جائیں۔

اب میاں آزاد کے آئے حواس غائب، کہ یا مظہر العجائب۔ پردیس کا واسطہ، مسافر آدمی، جاؤں تو کدھر جاؤں۔ سرا کا پتا پاؤں تو کیوں کر پاؤں۔ ایک دفعہ ہی کسی شخص سے سر ٹکرایا، کھٹ کھٹ ہائیں بے اندھا ہے۔ کون؟ تو کون، جاتا ہے کہ دوں؟ ایک کہیں بیدھا تو نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو ایک جمادوں، تو پھر روتے ہوئے جاؤ۔

میاں آزاد نے جو دو چار گرما گرم فقرے چُست کیے۔ تو ان کی عقل سرد ہوئی۔ تاڑ گئے کہ اس سے بولوں گا تو خوب پِٹا جاؤں گا۔ آؤ چپکے ہو رہو۔ اور دو قدم بڑھے تو ایک مسافر نے للکارا کون آتا ہے؟ میاں ذری سنبھلے ہوئے، دیکھو پتنگ رکھے ہیں، دب کے جانا۔

آزاد : ایں معقول، راستے میں پتنگ کیسے؟ واہ اچھی بے پر کی اڑائی۔

پتنگ باز : بھئی ریل پر بھی واللہ کیا کیا بگڑے دلوں سے سابقہ ہو جاتا ہے۔ ہم تو بجاجت سے کہتے ہیں کہ میاں ذری دب کے جاؤ، آپ تیکھے ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد : دب کے جاؤ! ہونھ دب کے کوئی اور جاتے ہوں گے ہم دبنے والے آدمی نہیں۔ اور واللہ کتنے گو کھے ہو۔ ارے نادان یہاں ہاتھ کو ہاتھ سوجھتا ہی نہیں، پتنگ کس بھکوے کو سوجھیں گے۔

پتنگ باز : کیا رتوندی آتی ہے؟

آزاد : اچھی کہی۔ ع۔ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی" کہا نا بگے چیتے جاتے ہو۔

پتنگ باز : لاحول ولا قوۃ، کتنے بے تکے آدمی ہو۔ ہم خود گھر کے امیر آدمی ہیں۔ پتنگ بیچیں ہمارے دشمن۔ کوئی اور کہتا تو گردن ناپتا۔

آزاد : گردن تو پیچھے ناپئے گا، ذری ڈنڈ بل میرے دیکھ لیجیے گا۔

پتنگ باز : ارے بھئی یہاں سے کوئی چار کوس پر ایک قصبہ ہے وہاں ایک رئیس زادے ہمارے لنگوٹیے یار ہیں۔ ان سے ہم سے پتنگوں کا میدان بدا گیا تھا، ہم اپنے رفقا کو لے کر ایک بارہ دری کے کوٹھے پر تھے، وہ اپنے دیوان خانے کی چھت پر، حوالی موالی کو لیے ہوئے تھے۔ کوئی سات بجے سے ادھر بھی پتنگ چھپکے، اُدھر بھی بڑھے، خوب لم ڈورے لڑے۔ پانچ روپے فی پیچ بدا تھا۔ یار ایک پتنگ خوب لڑا، ہم نے مانگ دار بڑھایا تھا۔ اور اُدھر سے گول دو پنا، کل پتا، چھپکا دیا۔ دس بارہ منٹ داؤ گھات کے بعد پیچ پڑ گئے۔ پہلے تو ہمارے کنے نخ گئے۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سمجھے کہ اب کٹے اور اب کٹے، مگر واہ رے استاد، ایسے کنے چھڑائے کہ واہ جی واہ۔ پھر پیچ لڑ گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو پنسیری یوں ڈور پلا دی۔ کنکوا آسمان سے جا لگا۔ جو کوئی دم اور ٹھہرتا تو جل بھن کے خاک ہو جاتا۔ کرۂ نار تک پہنچنے ہی کو تھا، اتنے میں ہم نے غوطہ دے کر ایک جھپکا جو دیا تو وہ کا ٹا دہ کا ٹا۔ فریق ثانی ارے کر کے رہ گئے۔ اب کوئی کہتا ہے کہ ہتے پر سے اکھڑ گیا، کوئی کہتا ہے ڈور اُلجھ گئی تھی، مگر یہ باتیں ہیں۔ اب سنیے! حماقت نے جو گھیرا تو چلے چمانے۔ کھٹ سے الگ تھا۔ بیوی گئی تھیں نماز بخشانے، رد زے گلے پڑے۔ ایک خربوزیے کنکوے سے ہم نے کوئی نو دن کے قریب کاٹے، مگر پھر تو کچھ ایسی ہوا چلی کہ تو بہ ہی بھلی ان کی طرف کوئی بلا کا استاد آ گیا، اس نے تو حضرت کھینچ کے وہ وہ ہاتھ دکھائے کہ الاماں! ہاتھ ہی توڑ دیں مردک کے، چھکے چھوڑا دیے۔ کبھی سڑ سڑ کرتا ہوا نیچے سے کھینچ گیا۔ کبھی اوپر سے پتنگ پر چاپ بیٹھا۔ کبھی دھوکا دے کر دُہرا نکال لے گیا۔ آخر ہیں نے حساب جو لگایا تو نچّا کے پیٹے میں گئے، اور

یہاں ٹکا پاس نہیں۔ ہم نے بھی ایک مال تک لیا ہے۔ گھر کے سونے کے کڑے کسی کے ہاتھ پٹیلیں گے۔ کوئی دس تولے کا ہوگا۔ چپکے سے اُڑا دوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر ہو تو ہاتھ کٹوا ڈالوں۔ آئی گئی نوکروں ماماؤں اصیلوں کے ماتھے جاتے گی۔

آزاد : آپ کے والد کیا پیشہ کرتے ہیں حضرت!

پتنگ باز : جی زمیندار ہیں، مگر ایں جانب کو زمینداری سے نفرت ہے۔ زمیندار کی صورت سے نفرت۔ اس پیشہ کے نام سے نفرت شریف آدمی اور لٹھ لیے ہوتے میٹر میٹر گھوم رہے ہیں۔ ہم سے یہ نہ ہوگا۔ انگریزی فارسی پڑھ کر کسانی کرنا چہ معنی دارد۔ ہم کوئی مزدور ہے تو ہیں نہیں۔ یہ گنواروں ہی کو مبارک رہے۔

آزاد : حضور نے تعلیم کہاں پائی ہے؟ واللہ آپ کے خیالات تو حکیمانہ ہیں، آپ تو لندن کے عجائب خانہ میں رکھنے کے لائق ہیں۔

پتنگ باز : یہیں کے تحصیلی اسکول میں کچھ دن گھاس چھیلی ہے۔

آزاد : کیا گھسیارے بننے کا شوق چرایا تھا۔ کہیں گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟

پتنگ باز : بھائی کوئی چھ سات برس پڑھے، مگر گنڈے دار پڑھائی، ایک دن حاضر تو دس دن غرہ۔ اتنے میں پہلے درجہ کا امتحان دیا، مگر لڑھک گئے۔ پھر دیا پھر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ وظیفہ ملا نہیں، ادر ابا نے کہا کہ بلا وظیفہ ہم نہ جانے دیں گے۔ ورنہ ضلع اسکول میں ہم تعلیم پاتے۔ خیر اس جھنجھٹ سے نجات پائی تو پیشکار صاحب کے منجھلے صاحبزادے سے دوستی بڑھائی۔ تب تک ہم نرے جانگلو ہی تھے۔ بس انتہا یہ ہے کہ حقہ تک پینا نہیں جانتے تھے۔ تو وجہ کیا اچھی صحبت میں کبھی بیٹھے ہی نہ تھے چھوٹے مرزا بچارے نے ہمیں حقہ پینا سکھایا۔ شدہ شدہ چانڈو کے چھینٹے ان کے ساتھ اڑائے۔ پہلے آپ مجھے دیکھتے تو کہتے قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ بدن میں گوشت کا نام ہی نہیں۔ ہڈی ہڈی گن لیجیے۔ اب جب سے چھوٹے مرزا کی صحبت میں تاڑی پینا شروع کی تب سے ذری ہرا ہوں۔ پہلے ہم بالکل گاؤدی ہی تھے۔ یہ پتنگ اڑانا تو اب آیا ہے، مگر اب کی پچاس کے پیٹے میں آ گئے۔ منجھلے میاں سے ہم نے تدبیر پوچھی، واللہ تڑسے بتایا کہ جب بہن یا بھاوج یا بیوی کی آنکھ چوکے تو کوئی طلائی عدد صاف اُڑا دو۔ بھئی ضلع اسکول میں پڑھتا تو ایسی اچھی صحبت نہ ملتی یار جی۔

آزاد : واللہ آپ تو خراد پر چڑھ گئے۔ آٹھوں گانٹھ کمیت۔ سب گنوں پورے، تمھیں کون کہے لنڈورے۔

پتنگ باز : آپ یہاں کہاں فروکش ہوں گے۔ چلیے! اس وقت غریب خانے ہی پر ماحضر تناول

فرمائیے، اور شب باش ہوجیے۔ ع۔ شاہان چہ عجب گر بنوازند گدارا " سرائیں تو تکلیف اٹھائیے گا۔ ہاں جو کوئی تعلق ہو، یا پیدا کرنے کا شوق چرّایا ہو تو کیا مضائقہ۔ مسکرا کر سچ کہنا استاد۔ کچھ لسر کا ہے۔ یا ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے ؟

آزاد : میاں یہاں۔ ع۔ دل ہی نہیں ہے پاس محبت کریں گے کیا " مگر خیال خاطر احباب مزود چاہیے، چلیے آپ ہی کے مہمان ہوں۔ یہاں تو بے ٹھکری کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ مگر استاد اتنا یاد رہے کہ بہت تکلیف نہ کیجیے گا بندہ تکلف کا دشمن ہے۔ ے

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

پتنگ باز : ہائے واللہ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بس ایک دس سیر کا پلاؤ تو بنوائیے گا مگر تکلف نہ کیجیے گا، اور کوئی آٹھ دس قسم کا گوشت بھی ہو۔ مگر میرے ہی برابر۔ واللہ مانتا ہوں آپ کا بایاں قدم لے

اتنے میں میاں آزاد اور پتنگ باز رتھ پر سوار ہوئے، تو خوشامد خوروں، لیموں نچوڑوں، نے کہا آداب بجالاتا ہوں حضور! رخصت ہوتا ہوں پیر و مرشد! کورنش عرض ہے خداوند! کل تو ر کے تڑکے حاضر ہوں گا۔ جناب میں بھی دوپہر کو کھانا کھانے کے قبل پہنچ جاؤں گا۔ رتھ چلا تو ہوا سے باتیں کرتا ہوا کھٹ سے مکان پر داخل۔ آیئے آیئے منجھلے میاں آیئے۔ اندر سے باہر تک خبر ہوگئی کہ منجھلے میاں تشریف لائے۔ میاں آزاد اور وہ دونوں اترے۔ صاف ستھرے کمرے میں مکلف فرش پر جا کر بیٹھے اتنے میں ایک لونڈی اندر سے آئی۔

لونڈی : منجھلے میاں چلیے، بڑے صاحب نے آپ کو اندر یاد کیا ہے۔

منجھلے میاں : (وہی پتنگ باز) اے ہے ناک میں دم کر دیا۔ آتے دیر نہیں ہوئی، بلاتے ہیں۔ چلو آتے ہیں نبی بخش آپ کے لیے حقہ بھر لاؤ، اور خاصدان میں گلوریاں تیار کرو۔ (آزاد سے آپ اجازت دیں تو ذری والد سے مل آؤں، ابھی آیا۔ آپ تب تک حقہ نوش جان فرمائیے۔ گانا وانا سنیے تو بلواؤں کسی کو؟ مغنی ہو، مطرب ہو، قوال ہو، صنم خوش جمال، زہرہ تمثال ہو، شراب ناب ہو، نرگس کباب ہو، یہ کہہ کر منجھلے میاں تو ایک خادم باادب سے علاحدہ چپکے چپکے کچھ میگوئیاں کرنے لگے اور لونڈی اندر پہنچی۔

لونڈی : میاں، میاں! ان کے پاس تو کوئی اُن کے دوست مسند تکیہ لگائے زانو سے زانو بھڑائے بیٹھے ہیں۔

میاں : ان کے دوستوں کی نہ کہو، شہر بھر کے خدائی خوار، گدھے سوار، بدمعاش عیار، چور

مکار، جھوٹوں کے سردار، ان کے لنگوٹیے یار ہیں۔ بھلے مانس سے تو ملتے جلتے انھیں دیکھا ہی نہیں۔

لونڈی : نامیاں! شکل صورت وضا (وضع) سے شریف خاصے بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ مل ہیں بڑے لسان۔ ابھی جوان جہاں، کلے ٹھلے کے گبھرو ہیں، اور قبول صورت، ہنس مکھ، میں تو جانوں کہیں باہر سے آتے ہیں۔ بی بی انھیں اچھی طرح کھلانا پلانا۔ دوڑ دوڑ کو میں موجود ہوں، اور لونڈیوں اصیلوں کی دھاڑ کی دھاڑ موجود ہیں۔ رہا منجھلے میاں سے دوستی نبھتے نہ دیکھی چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ۔

خیر شب کو میاں آزاد اور منجھلے میاں نے خوابِ ناز کے لطف اٹھائے، صبح کو حوالی موالی جمع ہوئے۔

لفاظ : حضور کل تو خوب خوب پیچ لڑے، اور ہوا بھی خوب ہی موافق تھی۔

منجھلے میاں : پیچ کیا لڑے پچاس کے ماتھے گئے۔ خیر اس کا تو یہاں غم ہی نہیں مگر کرکری بڑی ہوئی۔

طرّار : واہ حضور، کرکری کی ایک ہی کہی قسم خدا کی، وہ کم ڈورا پیچ نکالا کہ بایدوشاید۔ ہزار پیچ بھی جو کٹ جاتے تو اس کے آگے گرد تھے۔

فقرہ باز : دریں چہ شک۔ حق ہے حضور! واللہ باللہ ثم باللہ زمانہ بھر یہی کہتا تھا کہ بھئی پیچ کیا کاٹا کہ کمال کیا۔ کچھ انعام دلوائیے خداوند!

لسان : خداوند آپ کے قدموں کی قسم ہے۔ آج شہر بھر میں اس پیچ کی دھوم ہے، اور قرباں جاؤں پیرو مرشد! چالیس پچاس روپیہ کی بھلا کوئی اصل وحقیقت ہے، اے یہ تو ہاتھ کا میل ہے۔

رند : حضور آج منجھلے آغا کے یہاں مشاعرہ ہے۔ تشریف لے چلیے گا۔

آزاد : ضرور۔

مشاعرہ کی دھوم اور شعرا کا ہجوم

در نظم پیچ دور فن او   چوں اکذب او ست احسن او

شام کے وقت میاں آزاد اور ان کے حبیب بلبلِ شاخسار معجز طرازی حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی نوراللہ مرقدہٗ کے مطائباتِ رشیقہ، اور غزلیات انیقہ، بامعانِ نظر، مطالعہ کر رہے تھے۔ شیخ مبارک نہاد کے کلام ندرت التیام نے آزاد کو کہ خود سخن سنج، بلیغ الکلام، شیریں مقال، ذکی الطبع، بدیع الخیال، ہیں، ایسا مستِ الست کر دیا جیسے بسنت کی رت میں بھونرا کلیوں کے

رس سے مست ہو جاتا ہے۔ عین حالتِ وجد میں جھوم جھوم کر یہ اشعارِ آبدار، بلحنِ داؤدی پڑھ رہے تھے۔

اے نقش خرّم بادِ صبا — از بر یار آمدہ مرحبا
قافلۂ شب چہ شنیدی ز صبح — مرغ سلیماں چہ خبر از سبا
بر سر خشم ست ہنوز آں رقیب — یا سخنی میرود اندر قفا

کہ یکا یک ایک مردِ معمّر و سن رسیدہ، گرگ باراں دیدہ، مولویانہ قطع بنائے ٹیٹی دستار کھوپڑی پر جمائے، کانی آنکھ کو اس کے خم و پیچ میں چھپائے، دوسری میں سرمہ بریلی کا لگائے عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں دبائے، کھٹ کھٹ کرتے کمرے میں درّاتے چلے آئے۔ السلام علیکم۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف؟ الحمد للہ علیٰ کلِّ شیٔ قدیر۔

خیر ان تکلفات ضروری کے بعد، حبیب نے ایک اشتہار نکالا، اور آزاد کی خدمت میں بصد ادب بطریق نذر پیش کش کیا۔

اشتہار

فصحائے گرانمایہ کو مژدۂ تازہ، اور شعرائے بلند پایہ کو نوید بے اندازہ ہو کہ ۳۱/ فروری کو روزِ آدینہ، وقت شام، نواب بلیغ الدولہ بہادر کی گلابی بارہ دری میں صحبتِ مشاعرہ قرار پائی ہے۔ خاکسار میرِ مشاعرہ نے اِنصرام وانتظام کارِ خیر میں بڑی محنت شاقہ اٹھائی ہے۔ لہٰذا ناظرین تقدس آئین، کی خدماتِ رفیع البرکات میں بصد خشوع وخضوع التماس عجز اساس ہے کہ بروقت مقررہ و تاریخ معینہ نتو کام چھوڑ کر عبادتِ الٰہی سے منھ موڑ کر، مشاعرے میں قدم رنجہ فرمائیں۔ عزت بخشیں۔ رتبہ بڑھائیں۔ مصرع ہائے طرح درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہم سے اس شوخ نے عیاری کی، ۲ پریشاں گشتہ ام جاناں ز بخت واژگوں خود:

مولانا صاحب تو اشتہار دے کر اور اشتیاق دلا کر، الوداع کہتے ہوئے، الٹے پاؤں ملبے ہوئے۔ یہاں حیرت دامنگیر ہے کہ یا للعجب فروری تو ۲۹، اور کبھی ۲۸ ہی دن کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہ ۳۱ فروری چہ معنی دارد۔ بارے معلوم ہوا کہ اسی وقت مشاعرہ تھا۔

خیر میاں آزاد اور ان کے دوست نہایت شوق اور غایت ذوق سے پتا پوچھتے ہوئے گلابی بارہ دری میں داخل ہوئے۔ حبیب لبیب نے اس دلکشا بارہ دری کی تعریف میں زبانِ فیض ترجمان

سے شاعرِ آتش زبان، خواجۂ آتش لکھنوی جعل اللہ مقامہ فی الجنان کا یہ معرکہ کا شعر فرمایا :

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے   زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

آگے بڑھے تو ایک گلزارِ پر بہار، لطیف و خوشگوار، روکشِ فرخار، نظر سے گزرا :

ذر دامنِ ہر شگوفہ باغے   ہر برگ گلے چو شب چراغے

سیرابیٔ سبزہ ہائے نوخیز   از لولو تر زمرّد انگیز

غرض کہ عجیب سماں ہے۔ بارہ دری کیا ہفتم آسماں ہے۔ فرشِ مکلف سے آراستہ اور تکلفاتِ اہلِ لکھنؤ سے پیراستہ۔ شمعِ کافوری نور بخشِ چشمِ نابینائے مادرزاد۔ چپہ چپہ فصحائے نکتہ پرور کے فیضِ قدم سے آباد۔ در و دیوار سے نور برستا ہے۔ اس زمین کی لطافت دیکھ کر پیرِ فلک ترستا ہے۔ نئی نئی وضع، نئی نئی قطع، نئے نئے لباس، نئے نئے نشن کے لوگ جمع ہیں۔ کسی کا دماغ ہی نہیں ملتا ہے۔ جو ہے اپنے خیال میں مست، تاناشاہ بنا بیٹھا ہے۔ ہفت اقلیم کی بادشاہت کو جوتی کی نوک پر مارتا ہے۔ عظیم اللہ خانی حقوں کے تڑاخوں سے لطفِ صحبتِ دیرینہ آنکھوں میں پھر گیا : ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اربابِ صافی مذاق و آزادہ، اصنامِ شعر و سخن کے عاشق و دلدادہ، سیہ خیمہ لیلائے تکلم کے دائے مجنوں، دلبرِ نظم طرازی کے مفتوں، جوق جوق امڈے چلے آتے ہیں۔ شعرا اور سامعین کھچا کھچ بھرے ہیں۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ غرض کہ جب رات بھیگی۔ اور چاندنی خوب نکھری، مشاعرہ شروع ہوا :

طرۂ دستارِ کلامِ کلیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شعرائے طلیق اللساں اور فصحائے رنگین بیاں کے گلدستۂ اشعار لطافت بار نے وہ رنگ اثر دکھایا، کہ گلابی بارہ دری میں گل لالہ کھل گیا۔ جسے دیکھو بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہا ہے۔ کوئی عالمِ تصور میں نرگسِ غمزہ زن سے چشمک زنی کرتا ہے۔ کسی کا دل زلفِ پرشکن کے پیچ و تاب میں پھنسا ہے۔ بلبل کی خوش نوائی گل کی کج ادائی، ایک پرانے مردے کو اکھیڑ کر منصور[1] کو ازسرِ نو دار پر کھینچتا ہے۔ دوسرا

---

[1] منصور حلاج ؒ متوفی ۳۰۹ ہجری۔ مشہور صوفی تھے، انھوں نے حالت خودی میں انا الحق کہنا شروع کیا تھا۔ یعنی میں خدا ہوں، اس جرم میں ان کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ وہ آخر وقت تک انا الحق کہتے رہے۔ یہ خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کے عہد کا واقعہ ہے۔

صد ہا سال بعد سَرمدؔ[1] سر دار کا گلا رتیتا ہے۔ کوئی دُر دنداں کے مقابل میں سلک گہر کو بے آبرو بناتا ہے۔ کوئی رقیب رو سیاہ کو سگ حضور بناتا ہے۔ کوئی زلف چلیپا کو طولِ امل سے زیادہ طول دیتا ہے، کوئی عالم خیال میں چاند سے مکھڑے کی بلائیں لیتا ہے۔ قدردان کی ہر جگہ خرابی ہے۔ ارباب دلوالالباب، دادِ سخن دینے پر آئے، تو اس درجہ چیخے چلائے کہ لب اور گلو سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ اہو ہو ہو! واہ واہ، اے سبحان اللہ شاعر نے پورا شعر پڑھا ہی نہیں کہ یار لوگ لے اڑے حاصل زمین واہ حضرت کیوں نہ ہو۔ قسم حسنین کی قلم توڑ دیے۔ واللہ آج اس لکھنؤ میں یکتا ہو۔ ایک پستہ قامت، زیبا اندام، تیز طبیعت، ملیح الکلام، شاعر بلگرام، تربیت یافتہ لکھنؤ نے طرح کے مصرع پر ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر درج ذیل ہے ؎

ہم کو دیکھا تو وہ ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

سامعین : گاڑی کی۔ بارک اللہ کیا نایاب شعر فرمایا۔ کیا گاڑی کی۔ اب جسے دیکھیے غل مچا رہا ہے۔ گاڑی کی، گاڑی کی، شاعر بیچارہ چیختا ہے، کہ حضرت گاڑی کی نہیں، یاری کی، مگر غل غپاڑے میں سنتا کون ہے۔ تب تو میاں آزاد نے جھلا کر کہا کہ صاحبو! اگاڑی نہ پچھاڑی، چوپہیا نہ پالکی گاڑی۔ واسطے خدا کے پہلے شعر سن لو، پھر تعریف کے پل باندھو۔ گاڑی کی نہیں یاری کی۔ ؏ آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی : واہ کیا نیچر ہے۔ شاعر بھی کھِل گئے، کہ خیر سچے کلام کی سچی داد دینے والے بھی موجود ہیں۔

دوسرے شاعر خوش فکر و نکتہ سنج، نے اپنی پُرانی غزلوں میں سے ایک غزل پڑھی۔ پڑھتے پڑھتے یہ شعر فرمایا۔

امیدِ روزِ وصل تھی کس بدنصیب کو
قسمت اُلٹ گئی مرے روزِ سیاہ کی

سامعین : نگاہ کی۔ جلّ و جلّ۔ حضرت یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔

---

[1] سرمد، ایک مجذوب صفت بزرگ، ایران سے ملتان ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ جامع مسجد شاہ جہانی کے اطراف میں۔ مست و بے خود پھرا کرتے تھے۔ عرصہ تک عشق مجازی میں مبتلا رہے، پھر عشق حقیقی کا اثر غالب آیا۔ مگر نہ نماز پڑھتے تھے نہ شرعی احکام سے کوئی واسطہ تھا بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کو اس جرم میں قتل کرا دیا۔ ان کی قبر جامع مسجد کے بڑے دروازے کے قریب زیارت گاہ عوام ہے۔

شاعر : قبلہ نگاہ نہیں، روزِ سیاہ۔ نگاہ تو بالکل مہمل و بے معنی لفظ ہوگا۔
آزاد : واللہ کیا مار چال ہے، اور کیا صاف بول چال ہے۔
شاعر صاحب جھک کر آداب بجا لائے، اور پھر اسی شعر کو بآواز بلند فرمایا۔ اس مرتبہ سیاہ کے لفظ پر خوب زور دیا کہ کوئی ذات شریف پھر نگاہ نہ کہہ اٹھیں۔
واضح ہو کہ مار چال ہندی کی شاعری میں ایک صفت کا نام ہے۔ روزِ سیاہ کی قسمت اُلٹ گئی، یعنی بختِ خفتہ بیدار ہو گیا۔ چونکہ شاعر موصوف کبتائی میں بھی دخل رکھتے ہیں، اس سبب سے ان کا کلام درد انگیز اور عشق خیز ہے۔ اس صفتِ مار چال کو تو حضرت سمجھے نہیں، اور تعریف کے پل باندھ دیئے۔
تیسرے شاعرِ غرّا نے فارسی طرح پر یہ مطلعِ دلکش، فصحائے خطۂ پاکِ ایران کے لب و لہجہ میں پڑھا :

شستم تا کمر در خوں ز چشم لالہ گونِ خود
تو چوں دشمن شدی من ہم

سبحان اللہ! ارشدک اللہ! ایں اور میرا خدا، کہ آپ نے مشاعرے بھر کی ناک رکھ لی۔ میدانِ فصاحت میں کل فصحائے دہر سے گوے سبقت لے گئے۔ اب ذرا اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے، کہ شاعر نے مصرعۂ ثانی نصف بھی نہ پڑھا تھا کہ تعریف کی بوچھار ہونے لگی۔ توصیف کی جھڑی لگ گئی۔ پھر شاعر نے مجبور ہو کر دوسرا مصرعہ پڑھا۔

تو چوں دشمن شدی من ہم کمر بستم بخونِ خود

اب سنیئے! کہ خون کا خون کر کے اس لفظ کو ایک رکیک لفظ سے بدل دیا۔ اور لگیں ٹوپیاں اچھلنے بارک اللہ کا غل فلکِ ہفتم سے پار ہو کر لامکاں تک پہنچ گیا۔ کوئی لوٹ رہا ہے۔ کوئی ہو حق کر رہا ہے۔ شور محشر بپا ہے۔ واہ وا کی صدا سے پڑوسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ شاعر نے غل مچانا شروع کیا کہ جناب یہ لفظ خون ہے، مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ من چہ می سرائم و طنبورۂ من چہ می سراید۔

الغرض تین بجے تک وہ دھوم اور وہ ہجوم تھا کہ باید و شاید۔ مجال کیا کہ کان پڑی آواز سنائی دے۔ ایک ایک شعر کے پڑھنے کی چار چار دفعہ فرمائش ہو رہی ہے، اور بیس بیس مرتبہ اٹھا بیٹھی۔ سلام پر سلام اور آداب پر آداب۔ اور کورنش پر کورنش۔ اچھی قواعد ہوئی۔ غزل ختم ہوئی تو دم ٹوٹ گیا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ بعض بعض شعرائے تلامیذ الرحمٰن، معدن طبع

دغا و غالی خیال، وخوش فکر نے البتہ وہ وہ اشعارِ فصاحت بار سنائے کہ سمجھنے والوں کو حال آگیا۔ اور بے اختیار بول اٹھے کہ بھئی یہ غزل نہیں خدائے سخن کا کلام مجید ہے۔ احسنت و مرحبا کی آواز گونج رہی تھی خوش وقت رائے، حمار، اور خرسند رائے بعیر تین تین سو شعر کی غزل کہہ لائے ہیں جس کا ایک شعر درست، نہ ایک مصرعہ چست۔ سات بجے سے پڑھنے بیٹھے تو آٹھ کا گجر بجا دیا۔ لوگ کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں۔ مگر وہ موجیں لے رہے ہیں۔

حقیقتِ حال یوں ہے کہ جو بزرگوار شاعری کے رموز سے واقف ہیں، وہ ٹھیک موقع پر دادِ خوش کلامی دیتے ہیں۔ ورنہ چپ رہتے ہیں۔ برعکس اس کے بعض کم علم، کم عقل، کم فہم، بفحوائے "ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں" تعریف کے دریا بہا دیتے ہیں۔ جس کے پاٹ کی ابتدا ہے، نہ انتہا۔ جو مضامین منافی نیچر اور خلافِ طبیعت ہیں ان کو خیر باد کہہ کر معشوقۂ خیالاتِ مغربی کو اپنی زبان کے لباس میں مزیّن اور مشین کریں، تو پھر دیکھیے شاعری کیسی چمکتی ہے۔ افسوس ہے کہ نوجواں، نوخیز، انگیا اور چوٹی، اور سوباف، اور نارِ پستاں، اور موئے میاں، پر اس درجہ لٹو ہیں کہ فنِ شاعری کے پھتر بگاڑ دیے۔ الکذب احسنہ نے کمیتِ وحشت پر اور بھی ایک کوڑا جا دیا۔ پھر کیا پوچھنا تھا، لگے زمین آسمان کے قلابے ملانے۔ قد کو تاڑ اور زلف کو سنبل بتانے۔

وہاں سے میاں آزاد دو بجے، اور منجھلے میاں تڑکے آئے، صبح کو یوں باتیں ہوئیں۔

آزاد : اجی حضرت تسلیم! آج تو آپ بڑے سویرے اٹھے، ابھی تو دس ہی بجے ہیں۔ بھئی بڑے سونے والے ہو۔ آپ کے یہاں گویا اب تڑکا ہوا۔

منجھلے میاں : بجا ہے۔ کل تو مشاعرے میں تڑکا ہی ہو گیا۔ اپنا تو بھور ہو گیا، مگر واللہ کیا کیا غزلیں سنی ہیں، کہ واہ جی واہ۔ اب خیال کیجیے کہ جب انسان تڑکے سوئے، تو دس بجے خواہ مخواہ اٹھا ہی چاہے، اور سچ تو یوں ہے کہ ابھی اور سونے کو جی چاہتا ہے، لیکن کچھ مشاعرے کے جھگڑے کا حال بھی سنا؟ ارے میاں بڑی شکر رنجی، اور بے لطفی ہو گئی۔ تم تو کوئی چار بجے سو رہے تھے۔ ہم نے ساری داستان سنی، اور سنی کیا معنی آنکھوں دیکھی۔ لاحول ولا قوۃ بڑی چخ چل گئی۔ مولوی بدر اور منشی نثار میں تو لکڑی چلتے چلتے رہ گئی۔ جو میاں رنگین نہ ہوں، تو دال میں جوتی بٹے۔ بارے بخیر گذشت، لیکن ابھی دل کے بخار نہیں نکلے۔

آزاد : کیوں کیوں خیر تو ہے؟

منجھلے میاں : آپ تو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے تھے۔ ہم سے پوچھیے جو تڑکے تک وہاں ڈٹے رہے۔

اُف ! واللہ میں تو سمجھا کہ اب لکڑی چلی، اور اب چلی، اور خرابی یہ کہ دو ہیں پھنکیت بھی موجود تھے ان کو اپنی پھنکیتی کا دعویٰ۔

آزاد : تو مشاعرہ کیا پالا تھا۔ پوچھیے شاعری کو لکڑی اور بانک سے کیا واسطہ، روز قلم دکھانا چاہیے تھا یا زور بازو۔ افسوس ہے، کہ مشاعرہ بھر بھنڈ ہوگیا، اب جمنا محال ہے۔ کسی طور پر بدر اور فشار میں ملاپ کرا دیجیے۔

منجھلے میاں : اے توبہ! ملاپ، کیا محال، ملاپ ہو چکا۔ بدر کے چہرے سے جلال برستا ہے۔ ایسے مغلوب الغضب تو عمر بھر آنکھوں سے نہیں دیکھے۔ بات کی اور غصہ آگیا۔ اور میاں فشار ان کے بھی چچا ہیں۔ یہ بات پیچھے کرتے ہیں، چانٹا پہلے رسید کرتے ہیں۔ پھر پھوٹ کیوں کر نہ ہو میل کی اب کون صورت ہے:

اگر در ہر دو جانب جاہلانند   اگر زنجیر باشد بگلانند

ایک حلیم الطبع ہو تو بات بن جائے، اور جب دونوں طرف سے اجہل ہوں تو بات بن چکی۔

آزاد : آخر بکھیڑے کا سبب کیا؟

منجھلے میاں : حضرت اس بغض اور حسد کا بُرا ہو کہ انسان کی آنکھ پر پٹی باندھ دیتا ہے ہوا یہ کہ فشار نے پہلے پڑھا۔ اس پر مولوی بدر بگڑ کھڑے ہوئے۔ اس وقت تو کچھ بولے نہیں، جب ان کے پاس یکہ (آگرہ) گیا تو جھٹ گرمائے، کہ واہ ہم پر ان کو کیوں ترجیح دی گئی۔ ان میں کیا بات ہے۔ ہم بھی تو استاد زادے ہیں آخر۔ یہ بیچارے ہیں کیا۔ آپ بھی اتنے ہوئے۔ اس پر فشار بولے کہ میاں صاحبزادے! ابھی بوئے شیر دہن سے آتی ہے۔ ۶۔ اک ذرا ہوش سنبھالو ابھی دنیا دیکھو، تم ابھی پیش پا افتادہ، الفاظ کے ہجے تو جانتے ہی نہیں، شاعری کیا جانو۔ کچھ دن استاد کی جوتیاں سیدھی کرو۔ خدمت کرو تو آدمی بنو۔ شانِ خدا آپ اور ہم پر منھ آئیں، اے تیری قدرت:

بت کریں آرزو خدائی کی   شان ہے تیری کبریائی کی

بدر بہت گرمائے، اور خوب ہی جھلائے۔ آستینیں الٹ لیں اور چڑھ دوڑے۔ فشار کے شاگردوں نے بھی ڈنڈا سیدھا کیا۔ اس پر تو ایں ہائیں! ہائیں جانے دو، جانے دو، لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا، مگر مشاعرہ بھر آمادہ ہوگیا تھا کہ بیچ چلے تو خوب بات ہارے۔ ۶۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

ہمارے وحشی مزاج میاں آزاد کا بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ تلوے کھجلائے، اور وحشت نے سیر صحرا کی یاد دلائی۔ اپنے شفیقِ باتحقیق منجھلے میاں سے کہا کہ قبلہ! اب تو ایک جگہ بیٹھے بیٹھے پھپھوندی لگ گئی چلیے ذرا چار پانچ کوس سیر تو کر آئیں۔ منجھلے میاں نے چار پانچ کوس کا نام سنا تو چکرائے، کہ خدا ہی خیر کرے۔ یہ بے چارے مہین آدمی، آدھ کوس چلنا بھی دوبھر تھا، دس قدم چلے، اور ہانپنے لگے۔ ذرا چکر کھایا اور چکر آیا۔ بھلا دس میل کون جاتا۔ قدم ڈگمگانے لگتے اور واقعہ ہی ہو جاتا۔ جو کہیں گئے بھی تا نگھن پر یا فنس پر لد لیے۔ یا رتھ کی سواری۔

آزاد : اب کہیے چلیے گا نہ۔ بس اک پانچ کوس کا چکر لگائیں گے، اور دم کے دم میں واپس آئیں گے۔ کھانے کے وقت یہاں ہی ہوں تو سہی۔

منجھلے میاں : حضرت بندہ اس سیر سے درگزرا۔ آپ کو تو ڈاک کے ہرکاروں میں نوکری کرنی ہے۔ بندۂ درگاہ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے۔ مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے کہ بے وجہ بے سبب پنج کوسی چکر لگاؤں، اور آدمی سے اونٹ بن جاؤں۔ آپ جائیں، مگر جلد آئیے گا۔ یار سچ کہتے ہیں کہ لمبا آدمی عقل کا دشمن ہوتا ہے۔ یہ گپ اڑانے کا وقت ہے، یا جنگل میں گھومنے کا۔

مصاحب : بجا ہے پیر و مرشد۔ بھلے مانسوں کو کبھی جنگل کی دھن سمائی ہی نہیں، اور حضور کے یہاں رتھ، پالکی، گھوڑا، بابو، بگھی، سب سواریاں اللہ کی عنایت سے موجود ہیں۔ پیادہ پا جوتیاں چٹخاتے ہوئے آپ کے دشمن چلیں۔ آپ ایک نازک رئیس ہیں۔ کبھی پیدل چلنے کا اتفاق کا ہے کو ہوا۔

آزاد : بھئی ان خوشامدخوروں سے تو اور بھی ناک میں دم آگیا۔ یہ نزاکت نہیں، اس کو تپِ دق کہتے ہیں۔ اے صاحب آپ پانچ کوس نہ چلیے، دو ہی کوس چلیے، آدھ ہی کوس چلیے۔ ایسی بھی کیا نزاکت ہے لاحول ولا قوۃ۔

مصاحب : نا صاحب حضور نہ جائیں گے۔ آپ اپنے جائیے، اور جو سوءِ ہضم کی شکایت ہو، تو کھانے کا وقت ٹال جائیے گا۔ بہت ہَو کا اچھا نہیں ہوتا۔

آزاد : کہیں اس بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ بندہ بلا نوش آدمی ہے۔ پاؤں تو آپ تک کو چٹ کر جاؤں۔

میاں آزاد لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے، ڈاڑھی چڑھاتے، پچھم کی طرف چلے۔ اونٹ جب بھاگتا ہے پچھم کی سمت، چلتے چلتے رستوگی ٹولہ پہنچے، اس محلے میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ غل غپاڑے کی آواز سنی کہ الاماں! شورِ محشر بپا تھا۔ کان پڑی آواز کا سننا مشکل، زمین لرزنے لگی۔ در و دیوار

غل کی دھمک سے کانپ رہے تھے۔ گھبرائے کہ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ بجلی گری، یا آسمان پھٹ پڑا، یا آگ لگی، یا بھیڑیا دن دہاڑے نکل آیا، خداوند بچائیو! سوچے کہ بھئی یہاں سے بھاگ چلو۔ انگریزی زمانہ ہے۔ کہیں فوجداری ہو رہی ہے تو گواہی میں دھرے جائیں، اب وہ ہڑبونگ کا وقت تو ہے نہیں کہ ہر روز خانہ جنگیاں ہوتی ہیں۔ چوطرفہ تلوار میان سے باہر ہے۔ شڑاپ، شڑاپ، شٹر شٹر کی آوازیں آرہی ہیں۔ خون کی ندیاں بہ گئیں، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ جب بانکے تلوار لیے، مار کوٹ کر چل دیے، تو روندائی۔ دھوتو، دھوتو، دھوتو، وہاں میدان صاف۔ آدمی نہ آدم زاد۔ دو ایک دُکان داروں کو دھمکایا۔ ذرا غرفش کیا۔ چلیے تحقیقات ہو چکی۔ اب قضیہ بالعکس ہے یعنی ہم گواہی شہادت سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ یہاں سے پولیس کی چوکی پر جائیں، وہاں سے تھانے پر، وہاں سے مجسٹریٹی، وہاں سے اگر گڑبڑائے تو جیلخانہ۔ چلیے اب چکّی پیس رہے ہیں۔ آئے تھے سیر سپاٹے کو مفت میں مصیبت جھیلیں۔ بھاگنے ہی کو تھے کہ ایک آدمی سے پوچھا۔

آزاد : کیوں میاں یہ غل غپاڑا کیا ہو رہا ہے؟ وہ شور ہے کہ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ الٰہی توبہ!

آدمی : (ہنس کر) "کلّ طویلٌ احمقٌ"، تو برسوں سے سنتے آئے ہیں، مگر آنکھوں آج ہی دیکھا۔ یہ بلینڈی ساقد، کس گاؤں میں بڑھایا ہے؟ بانس بریلی[1] کے پاگل خانے سے تو زنجیر توڑا کر نہیں چلے آئے؟ سچ کہتا استاد۔ کرسی میں مکان ہے کیا؟ ہوش کی دوا کیجیے۔ عقل کے ناخن لیجیے۔ کیسی لڑائی، کیسا جھگڑا۔ کہاں کی گلخپ کس کا بگڑا۔ نہ کہیں فساد ہے نہ کچھ۔ گروجی لڑکے پڑھا رہے ہیں۔

آزاد : ارے! لاحول۔ گروجی بھی بس نرے گروجی ہی ہیں۔ بندہ ناخواندہ تو ہے نہیں، ہم نے بھی کئی مکتبوں کی خاک چھانی ہے، لیکن معاذاللہ یہ غل غپاڑے، ایسے شور پر تین حرف، یہ گدڑی بازار ہے یا مکتب خانہ، یا وحشت کا کاشانہ۔ لاحول ولا قوۃ پاگل خانہ میں اتنا غل مچے تو مضائقہ ندارد۔ چلیے ذری گروجی کے درشن تو کریں۔ واللہ زیارت ہی کے قابل ہوں گے۔

آدمی : ہاں جائیے ضرور جائیے۔

---

[1] بانس بریلی، اتر پردیش کا مشہور شہر جو روہیل کھنڈ کے علاقے میں واقع ہے۔ وہاں انگریزی حکومت کے زمانہ میں۔ پاگلوں کے علاج و دیکھ بھال کے لیے پاگل خانہ بنایا گیا تھا۔ جو اب بھی موجود ہے۔ بریلی کا پاگل خانہ عام طور پر مشہور ہے۔

میاں آزاد جو اُدھر گئے، تو دیکھتے کیا ہیں، کہ گروجی مہراج دھوپ میں ایک چھپرکھٹ پر اُتانا چت پڑے ہیں۔ قطع وضع، چال ڈھال، دیکھی تو اللہ ہی اللہ۔ ماشاءاللہ آپ ہیں اسی لائق، کہ بایاں قدم لے، اور دور ہی سے ڈنڈوت کرے۔ لونڈوں کی مٹی پلید کرنا ہو تو اس مکتب میں بھیجے۔ گروجی مہراج ذرا چیتے۔ دیکھیے تو لڑکے کہہ کیا رہے ہیں۔

اتنے میں دو چار لڑکے اور آئے۔ گروجی رام رام۔ گروجی سیتارام۔ جیتے رہو۔ آؤ بیٹھو۔ آج ابیر کر کے کیوں اَئے گروجی آج نیوتا تھا۔ دیابھتی رگھناتھ کی، توبلئی دونوں جون۔

یہ مقام لکھنؤ کے متصل ہے جہاں کے آدمی مثل بھونگام مشہور دیار ہیں۔

بھلا ہمارے کھاتر کیا لائے ؟

رام اوتار : کچھونا ہیں۔

گروجی : دھپ جما کر، دُت بے وکوف، سب لڑکے اس کے کان گر مادد۔

انندسروپ : گروجی دو پوریاں اور گوجھے لایا ہوں۔

گروجی : تم چلو بیٹھو۔ دیکھو لڑکو، انندا ہماری کیسی کھاتر کرتا ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اگلے دن کے پہاڑا تو سنا دیو، سب لڑکے مل کے۔ کھبردار ! آگے پاچھو مت رہیو چلو۔ ارے چلو۔ ایکنا ایک، دونے دو، ترکو تین، چوکے چار، پنجے پانچ، چھکو چھ، ستو سات، اٹھو آٹھ، نیا نو، دہام دس۔ دوکا دو، دودنا چار، دوتیا چھ، دوچو کو آٹھ، دو پنجے دس، دو چھنگ بارہ، دوست چودہ، دواٹھ سولہ، دونواں اٹھارہ، دودہام بیس۔

ایک ایک سویاں، دوسری اڑھیاں، تیسر پونے چار، چار سویاں پانچ۔ پانچ سویاں سوا چھ، چھ سوائیں ساڑھے سات، سات سوائیں پونے نو، آٹھ سوائیں دس، نو سوائیں سوا گیارہ، دس سوائیں ساڑھے بارہ، ایک ایک ڈیوڑھے، دو ڈیوڑھے تین، تین ڈیوڑھے ساڑھے چار، چار ڈیوڑھے چھ، پانچ ڈیوڑھے ساڑھے سات، چھ ڈیوڑھے نو۔ الخ

اوناماسی ڈھنگ۔ کاکھا گاگھا نا۔ چاچھا جاجھا ما۔ ٹاٹھا ڈاڈھانا۔ پاپھا بابھا ما۔ جارلا داشا کھاسا ہا۔

اس پر میاں آزاد نے ہانک لگائی کہ ٹیسو آئے دھوم سے ٹکا نکالو سوم سے۔ سوم سوم، تورا بھلا نہ ہوئی۔ ہاتھ کی ڈنڈی لاگی کائی، چھوٹیا کا چھوٹا بھائی۔ خوب قہقہہ پڑا اور کئی بازاری جمع ہو گئے۔ اور گروجی بے چارے پر آوازے کسنے لگے۔

اتنے میں بارہ کی توپ دغی۔ دن۔ لونڈوں نے غل مچایا کہ گرو جی جیو آئیں، کھائے آئیں۔ ہاں جاؤ۔ دوٹی کھاکے جھپ سے آجاؤ نا۔ دیر مت لگاؤ نا۔ پاٹی تیری کھڈری ہے کنول رام، بدل لائیو۔ بابو سے کہیو کہ پاٹی بدل دیں۔ لڑکے بھڑبھڑا کر نکلے۔ کسی نے لکڑی کا گھوڑا بنایا، کسی نے گھٹنوں پر دو ہتھڑ لگایا، غل غپاڑا مچاتے آسماں سر پر اٹھاتے چلے۔

میاں آزاد ایک دکان پر ٹک گئے، کہ ان کی سیر ذرا تو دیکھیں۔ جب لڑکے واپس آئے، تو گرو جی نے دو ایک سے پوچھا، کہ کہو پاٹی کھریدی؟ گرو جی کہن ہیں کہ دو چار روج میں کا لھ یا پرو ں جرور آجہیے۔ دیر کیوں لگا ئیس رے؟ گرو جی رسوئیاں میں ابیر ہتی۔ دیکھو گرو جی یو ہمرے باپ کا گریا وت ہے۔

گرو جی: بھلا بے کہا ناہیں مانت رے۔ چپائے رہ، ہم تم کا کھوب جانت ہیں، جو ہے سسر۔

آزاد: اچھا سسر کی ایک ہی کہی:

گر ہمیں مکتب ست واہیں ملا   کارِ طفلاں تمام خواہد شد

جب چھٹی کا وقت ہوا تو گرو جی بولے، چوپائیاں کہو۔ سری گنیش جی کرپا کریں، لکھیں چوکڑی ماں باپ پوجیں، وہ گھڑی ایسی گھڑی رام چندر لاویں۔ گرو جی آویں، مٹھریں پاویں، وہی برفی کھائیں کھائے کھوئے کے دیں اسیس، لڑکے جیویں لاکھ برس۔ آئے بسنت مہا سکھ دائی۔ دچھیا کریں کا لکا مائی،

اور ڈنڈے بجاتے جاتے تھے۔ کھٹا کھٹ۔ گرو جی مہنت بنے ہوئے سن رہے تھے، اور سوچتے جاتے تھے کہ برفی دہی کی دعا روز مانگی جاتی ہے، مگر کھانے میں ایک دن نہیں آتی۔

ڈاک

میاں آزاد خانہ برباد، بوئے گل کی طرح سبک سیر، ایک دن کیا معنی، دو دن کہیں ٹک جائیں، تو تلوے کھجلانے لگیں۔ دامن نرگس یاد آئے۔ سیر دشت کو جی چاہے۔ سیلانی آدمی، سیر سپاٹے کے عادی، منجھلے میاں کے یہاں چار پانچ روز جو جم گئے تو طبیعت گھبرانے لگی۔ کھانا پینا حرام ہو گیا۔ ہنسنا بولنا وبال، سیر سپاٹا جنجال ہوا۔ جنگل کی دھن سمائی، دل میں ٹھان لی کہ اب نہ ٹکیں گے، نہ ٹکیں گے، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ بوریا بدھنا اٹھایا، اور مصافحہ کر کے ڈاکخانہ کی طرف چلے۔ راہ میں پوچھتے جاتے ہیں کیوں بھئی امام بخش کا ڈاکخانہ کہاں

ہے ؟ زمری صاحب کی ڈاک کا راستہ کس طرف سے ہے پہلے تو امام بخش کے یہاں پہنچے ۔ آئیے ؟ کہیے کیا چاہیے ؟ ڈاک ہوگی ، ہاں ایک سواری ، اچھا تو دو روپیہ ہوئے ۔ دو روپیہ ؟ اچھا آپ ذرا کم دیجیے ، لائیے بیعانہ بائیں ہاتھ سے داخل کیجیے ۔ ہم سوا روپیہ دیں گے ۔ نہیں صاحب سوا میں نہ ہوگی ۔ اچھا آئیے ڈیڑھ روپیہ دیجیے ۔ آئیے حضور آپ تو چلے جاتے ہیں ۔ میاں آزاد یہاں سے زمری صاحب کے ڈاکخانہ پہنچے ۔ ایک سواری کا کیا لوگے ؟ ڈیڑھ روپیہ ، اچھا ہم چلیں گے ۔ بیعانہ داخل کیجیے ! لو ایک روپیہ ، اب کس وقت جائے گی ڈاک بس اب چالان چھوٹتا ہے ۔ اسباب وسباب رکھیے ۔ اجی یہاں اسباب خدا کا نام ہے ۔ فقیروں کو انگڑ کھنگڑ سے بھلا کیا کام ہے ۔

اتنے میں سامنے سے ایک ڈاک نکلی ، یہ کس کے یہاں کی ڈاک ہے جی ۔ کون ؟ یہ ؟ یہ امام بکس کی ڈانک ہے ۔ پہلے ہی روانہ ہو جاتی ہے وہ چاہے جب روانہ ہو ۔ کل ۱۲ بجے کے ادھر پہنچنے سے رہی ، اور آپ رات ہی کے چار بجے دَنُ سے داخل ہو جائیے گا ۔

خیر میاں آزاد اور دو مسافر ڈاک پر بیٹھے ، اور شکرم کھڑ کھڑاتی ہوئی زناٹے سے چلی ۔ تو راہ میں ایک گنوار جو میاں آزاد کے قریب شکرم پر بیٹھے تھے ، لگے بے تکی اڑانے ۔ میاں آزاد تو آپ جانیے خوش گپ آدمی ، انھوں نے بنانا شروع کیا ۔

گنوار : کاہے ہو ! ارے تم سے کہت ہے کوچ بکس ۔

آزاد : (کوچمین سے) بولو بھئی کوچ بکس ؟ ارے میاں کوچ بکس بولتے نہیں ؟

گنوار : کاہے ہو ، ہم تم سے پوچھت ہیں ، کہ یو ادنٹ گاڑی ہے کہ بیل گاڑی ؟

آزاد : گدھا گاڑی ۔

جب رات ذرا بھیگی تو آزاد کی آنکھ جھپک گئی ۔ آنکھ کا جھپکنا تھا کہ کھٹ سے داخل ۔ ایں کیا پہنچ گئے ؟ جی حضور ! دیکھیے ٹھیک چار بجے پہنچایا ۔ انعام ہو حضور !

آزاد : انعام ہوا ؟ بیشک ہوا ۔ ہماری ڈاک بڑی تیز آتی ہے ۔ میاں امام بخش کی شکرم تو ابھی راستے ہی میں ہوگی ۔

مسافر : (شکرم کی چھت پر سے) ہم سے سنیے ! شامتِ اعمال نے جو گھیرا ، تو ہم پرسوں یہاں سے امام بخش کی ڈاک پر گئے تو بہی بھلی ، رو رو دیے راستے میں ۔ خدا کسی بھلے مانس کو نہ لے جائے ۔ حول ولا قوۃ ، ہم سے کہا کہ سات بجے گاڑی چھوٹ جائے گی ۔ آپ ساڑھے چھ بجے ضرور آ جائیے ۔ ہم دئی پونے سات بجے لدے پھندے ، مزدوروں کو ساتھ لیے گھر سے چل کھڑے ہوئے ، مگر بدحواس

راہ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے، مزدوروں کو للکارتے چلے آتے ہیں، کہ تیز چلو۔ قدم جلد اٹھاؤ۔ اور جہاں سنسان مقام پایا، وہاں تھوڑی دور دوڑنے بھی لگے، کہ وقت پر پہنچیں۔ ایسا نہ ہو کہ دیر لگے۔ وہاں ٹھیک سات بجے پہنچے تو گاڑی، اگاڑی نہ پچھاڑی، سناٹا پڑا ہوا۔ آدمی نہ آدمزاد — ارے یہاں چپراسی! منشی جی اجی منشی جی! کیا سانپ سونگھ گیا؟

اتنے میں ایک چپراسی آیا۔ کہیے کیا ڈاک کیجیے گا۔ ایں! اور سنیئے ڈاک کیجیے گا کی تو ایک ہی کہی۔ میاں بیعانہ کا روپیہ بھی دے چکے۔ ہاں تو اس گھانس پر بستر جمائیے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے مزے اڑائیے، یا ذرا بازار کی سیر کر آئیے۔ ایں، سیر کیسی؟ ڈاک چھوٹے گی آخر کس وقت؟ کیا معلوم۔ دیکھیے منشی جی سے پوچھوں۔ (منشی جی آئے) ارے صاحب سات بجے بلایا تھا، جس کے ساڑھے سات ہو گئے۔ جناب آج تو آپ ہی آپ ہیں۔ اور کوئی مسافر ہی نہیں، پھر ایک آدمی کے لیے چالان تھوڑا ہی چھوڑیں گے۔ ایں! واہ وا۔ کہیں اس بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ بندہ بیعانہ دے چکا ہے۔ اچھا ٹھہریے! آٹھ بج گئے، تو بج گئے، دس بج گئے۔ یا الٰہی کب تک ٹھہرے رہیں۔ اب طبیعت پریشان ہو گئی۔ جی چاہا کہ بھاگ جاؤں۔ کہ اتنے میں تین مسافر آئے، ایک سے دو روپیہ لیے، دوسرے سے سوا روپیہ، تیسرے سے ۱۲؁ اور ہم سے ڈیڑھ روپیہ۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے بیٹھے، اور چلے۔ اب منزل منزل، وہ خراب چوکی، چوکی کا حال سنیئے!

پہلی چوکی : ایک سرنگ ڈگا۔ دوسرا سبزہ، میانہ قامت، کوئی آدھ کوس تو دونوں گھوڑے تیزی کے ساتھ گئے، اور پھر سرنگ بول۔ اب سبزہ تو گرمایا اور چلا، لیکن سرنگ کے جی چھوٹ گئے یہ گراوہ گرا۔ کوچبین نے گھوڑے پر کوڑے جمانے شروع کیے، مگر اس نے بھی عہد کر لیا کہ ٹلوں ہی گا نہیں۔ کھسکا اور وضع کے خلاف نہ ہلا، نہ ہلا۔ کوچبین۔ یارگیر، گھسیارا، سب کے سب ٹھونک رہے ہیں، مگر وہ کھڑا ہانپتا ہے۔ خدا خدا کر کے:

آہستہ خرام بلکہ مخرام　　زیرِ قدمت ہزار جان ست

کہتا ہوا پھونک پھونک کے قدم رکھا۔ راہ میں ناکوں دم آ گیا۔ جان عذاب میں ہو گئی۔

دوسری چوکی : ایک ٹٹو دبلا پتلا شرخہ، دوسرا گھوڑا مرا ہوا۔ ہڈیاں ہڈیاں گن لیجیے۔ یہ پہلے ہی سے رنگ لائے۔ کوچبین نے حسب معمول شڑاپ شڑاپ کوڑے جمائے۔ بعد خرابی بسیار کہیں چلے۔ دس قدم چلے تھے کہ پھر دم لیا۔ اور لگے ہانپنے۔ سائیس نے آنکھیں بند کر کے رسّی پھٹکارنی شروع کی، پھر دس بیس قدم آہستہ آہستہ بڑھے، اور ٹھہر گئے۔ خیر بہزار خرابی چوکی آئی۔

تیسری چوکی : ایک دُبلا پتلا، گلامر اگھوڑا مشکی رنگ کا، دوسرا نقرہ، پہلے ذرا چین چپڑ کیا۔ مگر چلے۔ ایک آدھ کوس گئے تھے کہ کیچڑ ملی۔ بس قبلہ پھر تو قیامت کا سامنا تھا۔ گھوڑے تھان کی طرف بھاگتے تھے۔ کوچ مین راس تھامے ٹخ ٹخ کرتا جاتا تھا۔ بارگیر پہیوں پر زور لگاتے تھے۔ مسافروں کو حکم ہوا کہ اتر آئیے، ذرا ہوا کھائیے۔ اترے بے چارے۔ آدھ کوس تک پیدل چلے، اور گھوڑے قدم قدم پر منھ موڑے دیتے تھے، اور جی چھوڑے دیتے تھے۔ وہ غل مچتا تھا کہ الاماں! شورِ محشر بپا تھا۔ آدھ کوس کے بعد حکم ہوا کہ اپنا اپنا بوجھ اٹھاؤ، گاڑی بھاری ہے۔ چلیے صاحب سب نے گٹھریاں سنبھالیں، بقچہ سنبھالا، سر پر اسباب لادے، چلے جاتے ہیں۔ واہ میری الٹی کے سننے والے۔ مانگا تھا نیچے، دیا اوپر۔ تین گھنٹے میں کہیں چوکی طے ہوئی۔ مسافروں کا ادھر دم ٹوٹ گیا، اور اُدھر گھوڑوں کی ناف ٹل گئی۔ کوچمین اور سائیس کے ہاتھ کوڑے مارتے مارتے، اور پہیوں پر زور لگاتے لگاتے تھک گئے۔ اب سنیے کہ چھ سات گھنٹے گزر گئے، اور ابھی تین ہی چوکیاں طے ہوئیں، لیکن مسافر، گھوڑے، آدمی، نوکر، چاکر، سب بیدم۔

چوتھی چوکی : ٹگا شرغہ، دور کا یہ نقرہ، ہاں یہ جوڑی ہے۔ اب کی کبھی تیز جائے گی۔ مگر، ع۔ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم "، یہ گھوڑے تو جمالی خربوزے ہی نکلے۔ بس دیکھنے ہی بھر کے تھے۔ نام بڑے درشن چھوٹے۔ کوچبان اور بارگیروں نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ چلیں، مگر انھوں نے ذرا کان تک نہ ہلایا۔ کنوتی تک نہ بدلی۔ بت بنے کھڑے ہیں۔ میدان میں اڑے ہیں۔ اڑے سواڑے۔ کوئی تو گھاس کا مٹھا لاتا ہے۔ کوئی تو بڑا دور سے دکھاتا ہے۔ کوئی پہیے پر زور لگاتا ہے۔ کوئی اوپر سے کوڑے جماتا ہے۔ آخر کار مسافروں نے بھی اُتر کے زور لگایا، مگر ٹائیں ٹائیں فش۔ ناچار گھوڑوں کے عوض بیل جوتے، اور ملار گاتے، میاں امام بخش کو ہزاروں صلواتیں سناتے چلے۔ لیجیے صاحب دام دیے شکرم کے، سوار ہوئے بیلوں پر۔ چلتے چلتے چوکی ملی، تو جان میں جان پڑی۔ کوچمین اتنے میں خوب سو چکے تھے۔ ان کی چاندی تھی۔ یہاں خوب حقے اڑائے۔

پانچویں چوکی : بابا آدم کے وقت کا ایک گھوڑا آیا۔ گھوڑا کیا اسپ خرس نما، عمر تو نہیں معلوم :

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے　　　شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

آنکھیں مانگ رہا ہے۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں۔ رات کو بھی مکھیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

مسافر : ارے بھئی اب چلو۔ آخر یہاں کیا ہو رہا ہے۔ راستہ چلنے ہی سے کٹتا ہے۔

کوچ مین : اے لو صاحب! گھوڑے کا تو بندوبست کر لیں۔ ایک ہی گھوڑا تو اس چوکی پر ہے

آزاد: اجی دوسری طرف بھینس جوت دو نہ۔

مسافر: یار ہم ایک سہل تدبیر بتائیں۔ ایک کام کیجیے۔ مسافروں سے کہیے کہ اتر جائیں۔ بوجھ اپنا اپنا سر پر لادیں، اور زور لگائیں، بگھی کو ایک چوکی تک ڈھکیل لے جائیں۔

اتنے میں ایک بھٹیارہ، ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا چلا آتا ہے۔ کوچ بان کی جان میں جان پڑ گئی۔

کوچ مین: کہو بھئی بھاڑا کرتے ہو جی؟ چاہے سو مانگو دیں گے، نقد دام لو اور بگھی پر بیٹھ جاؤ ایک چوکی تک تمہارے ٹٹو کو بگھی میں جوتیں گے۔ نشان کھاتر (خاطر) دھو آہستہ آہستہ لے جائیں گے۔ ایک چوکی کے بعد تم اپنے چلے آنا۔ چار آنے، آٹھ آنے، روپیہ تک دیں گے۔

بھٹیارا: واہ اچھے آئے، ٹٹوا کبھی گاڑی میں جوتا بھی گیا ہے۔ مرغی کے برابر ٹٹو، اور جوتنے چلے ہیں تسکرم میں۔ یہ سلطانی ڈاک ہے، یوں چاہو بیٹھ پر سوار ہو لو۔ مزے سے ایک چوکی، دو چوکی چلے چلو۔ مدا ڈاک گاڑی میں کیسے جائے سکت ہے۔

کوچ مین: ارے بھئی تم کو بھاڑے سے مطلب ہے، یا تکریر (تقریر) کروگے، ہم تو اپنی ترکیب سے جوت لیں گے۔ لو چہرہ شاہی لو، اور چلو۔

ہم نے بھٹیارے سے کہا کہ تم تو واہی سے ہو، چپکے ہو رہو۔ روپیہ ٹینٹ میں رکھو، اور کہو اچھا جوتو۔ دل لگی ہے، کچھ تھک تھکا کر آپ ہی ہار جائیں گے۔ روپیہ تمہارے باپ کا ہو گیا، پو بارہ ہیں۔ ہم نے دل لگی دیکھنے کے لیے بھٹیارے کو چنگ پر چڑھایا، اور وہ گاؤدی آدمی، جھپ سے راضی ہو گیا۔ گھنٹوں تدبیریں کیں کہ ٹٹو کو جوتیں، مگر اس نے سیکڑوں ہی بار پشتک اچھالی، اور دولتیاں جھاڑیں، مگر گاڑی کے قریب نہ گیا نہ گیا۔ اس پر ایک شخص نے ٹٹو کو کوڑا مارا، تب تو بھٹیارا آگ بھبھوکا ہو گیا۔ اے واہ میاں اچھے ملے۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارا جانور بگھی میں نہ چلے گا۔ آپ نے زبردستی کی، اب مفت میں گدھے کی طرح گد گد پیٹنا کیا معنی، بھلا خیر کسی نہ کسی طرح اس نے تو اپنا پیچھا چھڑایا اور ٹٹو کو بغل میں داب لمبا ہوا۔ یہاں تسکرم عین میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ مسافر بے چارے مصیبت کے مارے، اللہ بھیج، مولا بھیج کہتے جاتے ہیں۔ سائیس چلم پر چلم اڑاتے ہیں، اور مسافروں کو جلاتے ہیں۔ بگھیاں تسکرین، کھڑکھڑاتی ہوئی زناٹے سے آئیں، اور نکل گئیں۔ بگل بھوں پو بھو پوں بج رہا ہے۔ یہاں پڑے آنکھیں مانگ رہے ہیں۔ سب مسافروں نے مل کر قسم کھائی کہ اب بھولے سے بھی امام بخش کی ڈاک پر نہ چڑھیں گے، ادھر تو رخ ہی نہ کریں گے۔ خدا جانے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ مصیبت سہی۔ اب پیچ پی ہزار نعمت پائی۔ کان پکڑے توبہ کی۔ پیدل آنا، اس سے

اچھا۔ ایسی شکرم پر تین حرف۔ سر بوجھ بنے۔ مزدور بنے۔ قلی بنے۔ بگھی کو ڈھکیلا۔ پہیوں پر زور لگایا۔ کیچڑ میں لت پت، بیدم ہو گئے بیدم۔ لاحول ولا قوۃ۔ توبہ توبہ! خداوندا بچائیو!

خلاصہ یہ کہ بہزار خرابی رد و کے یہاں تک آئے۔ جیل خانہ اچھا یہ ڈاک نہیں اچھی۔ اور بھی ہندوستانی کارخانہ ہے نہ، بس دو کوڑی کا۔ رمزی صاحب کی ڈاک واہ جی واہ، کیا انتظام ہے، غواص محیطِ سداد، میاں آزاد خانہ برباد تے دو دن اُس شہر مینو سواد میں خوب سیر سپاٹا کیا۔ دوسرے دن شیطان نے انگلی دکھائی کہ بس اب بھاگو۔ دو دن کچھ تھوڑے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ کیا یہاں چھاؤنی ڈالنے کا قصد ہے۔ چلیے جب ان کے پیر نے ڈانٹ بتائی تو پھر کیا تھا، بقچہ سنبھالا اور لپیے ہوئے۔ قسم کھائی تھی کہ میاں امام بخش کی شکرم پر نہ جائیں گے نہ جائیں گے، چاہے اُدھر کی دنیا اِدھر ہو جائے۔ یہ مصیبت کون سہے، کہ دو دو کوس پیدل چلے، اور پھر لطف یہ کہ سر پر بوجھ رکھے اور اس پر بھی قناعت نہیں۔ گاڑی کو ڈھکیلو اور پہیوں پر خوب زور لگاؤ۔ قلی بنتا ہو تو البتہ ایسی شکرم پر جائے۔ ورنہ اپنے حساب اس پر تین حرف، لاحول ولا قوۃ، رمزی صاحب کی ڈاک خوب ہے بیٹھے اور تڑ سے چوکی پر داخل۔ ذرا آنکھ جھپکی اور کھٹ سے منزل مقصود پر پہنچے۔ رمزی صاحب کے ڈاکخانہ گئے۔ پوری گاڑی کیجیے گا۔ نہیں بھئی ایک سواری، سوا روپیہ ہوا۔ لو بیعانہ۔ چوَنی ہے۔ آیئے تو حضور! اب آپ جاتے کہاں ہیں؟ گاڑی چھوٹا ہی چاہتی ہے بس۔ ہاں تو روپیہ بھی لو۔ لایئے اسباب میں رکھ دوں، اور کچھ ہے؟ نا صاحب، اور درویش کے پاس کیا خاک ہے۔ یہاں ٹکا کفن کو نہیں، آپ اسباب لیے پھرتے ہیں۔ چپراسی نے اور مسافروں کو پکارا۔ رسالدار صاحب آیئے! وہ کہاں ہیں لالہ پلٹو؟ آؤ جی گاڑی چھوٹتی ہے۔ تین مسافر اندر بیٹھیں گے۔ ایک اوپر کے درجے میں، ہاں تو پھر تو چین ہی چین لکھتا ہے۔

الغرض، شکرم روانہ ہوئی۔ کوئی آدھ ہی کوس گئی ہوگی کہ لالہ پلٹو نے گل کھلایا۔ ٹھرّے کی بوتل نکالی، اور لگے کپّی پر کپّی اڑاتے۔ میاں آزاد کا مارے بدبو کے دماغ پراگندہ ہو گیا۔ گو مذہبی خیالات سے ان کو اصلاً واسطہ نہ تھا۔ کیوں کہ خدا کے سوا اور کسی کو مانتے ہی نہ تھے۔ الہام اور وحی، اور منہیات، اور مغیبات کے اصلاً قائل نہ تھے۔ بہشت کو مانیں نہ دوزخ کو جانیں لیکن بوئے بد نے ان کی طبیعت کو بے چین کر دیا، رسالدار صاحب کی جان عذاب میں تھی۔ یہ شراب کے نام پر لاحول پڑھتے تھے اور اس کی بو سے منزلوں بھاگتے تھے، لیکن قہر درویش بر جان درویش میاں آزاد سے رسالدار صاحب نے چپکے سے کہا کہ:

رسالدار: حضرت یہ تو بیڈھب ہوئی۔ اب کہیے تو ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ واسطے خدا کے اس وقت نہ پیجیئے۔ معاف کیجیے۔ ہم پر احسان ہوگا، ورنہ تھوڑی دیر میں ہم اور آپ دونوں کو گالیاں نہ دینے لگیں تو کچھ ہارتا ہوں۔ ذرا آنکھ دکھا دیجیے جس میں بہت بڑھنے نہ پائیں۔

آزاد: خدا کی قسم اس وقت روح پر صدمہ ہے، اور دماغ تو پھٹا جاتا ہے۔ مگر جائی ماندن نہ پائی رفتن۔ آپ ڈٹ کر للکار دیجیے، نہ مانے تو بندہ مستعد ہے، کان گرما دوں گا۔

رسالدار: کہیں ایسا بھی غضب نہ کیجیے گا۔ پنجے جھاڑ کے لڑنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ شرابی کے منھ لگنا کس نے کہا ہے۔ بھلا کسی حکمت سے ان کو راہ پر لائیے، تو خیر، ورنہ چپکے ہو رہیے۔

میاں آزاد اور رسالدار میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں لالہ پلٹو نے ہانک لگائی، ہات تیرے کی۔ ہرے ہرے باغ میں گولا، بولا، بولا، آن بولا، (ہنس کر) پگ آگے پک پیچھے۔ ہہاہہا یہ بے تکی کہہ کر ایک دوہتڑ جو لگاتے ہیں تو رسالدار کی دونوں ٹانگوں پر شراب کی چھینٹیں پڑ گئیں۔ ہائیں! ہائیں! او نامعقول، مردود، خبیث، مروک، الگ ہٹ، دیکھتے ہو بدبخت کی باتیں، اور اوپر سے آنکھیں نکالتا ہے (کٹر تان کے) دوں ایک مردود، اور سنیے ابھی دل لگی نکالی ہے۔ اٹھ جا یہاں سے رسالدار نے خوب ہی ڈانٹ بتائی۔ مگر وہاں سنتا کون ہے۔ ہوش کسے۔ ہواس کجا، بولے تو کیا بولے۔

پلٹو: ہمارا بے وقوف باپ جہنم کا باپ، بڑا گدھا۔ بہت بڑا ہہاہہا۔ (ماشاءاللہ وزن ہی نرالا ہے) سمجھے؟ دھنی کے برابر دیو، لیو نہ دیو، اکبر اور بیربل۔ پرسو رام جھڑاکے سے رسالدار کی بڑھیا مر گئی فاقہ سے۔

رسالدار: (گھونسا تان کر) چپ مروک۔ کھونس دوں بالنس منھ میں مروک۔

پلٹو: اجی تو ہنسی ہنسی میں روئے کیوں دیتے ہو۔ آپ تو ڈپٹے لیتے ہیں۔ واہ ہم تو اپنے باپ کو برا کہتے ہیں۔ یہ اپنے تئیں گدھا سمجھتے ہیں۔

آزاد: کیا تمہارے باپ گدھے تھے؟

پلٹو: ہونھ۔ یہ بھی کوئی چھپی ہوئی بات ہے، اور نہیں تو تھے کون، آخر آپ ہی بتائیے؟ عمر بھر ڈولی اٹھائی، مگر مرتے دم تک نہ اٹھانی آئی۔

آزاد: ارے غضب کیا مر گیا بے چارہ؟ افسوس خوب آدمی تھا۔ بڑا رنج ہوا۔

راوی: جی بجا ہے۔ آپ کو رنج نہ ہوگا تو کس کو ہوگا، گویا آپ سے ملاقات ہی تو تھی نہ۔

رسالدار: اور ڈولی اٹھانا کیا معنی، کیا کہار تھا؟

پلٹو : اور نہیں تو کون چمار تھا، یا بیلدار تھا، یا چور چکار تھا، یا وہ بھی آپ کی طرح رسالدار تھا۔

آزاد: ہے نشے میں تو کیا ہوا، بات پکّی کہتا ہے۔

رسالدار : جی ہاں درست ہے۔ آپ پکّا کر کے بے نقط سنوایئے گالیاں دلوایئے۔

پلٹو : اجی اس میں چوری کیا ہے۔ ہم کہار، ہمارا باپ کہار، دادا کہار، پردادا کہار۔

آزاد : کہیے آپ کی مہری تو بخیر و عافیت ہیں ؟

پلٹو : چل شکرم، چل گھوڑے، چل کوڑے، بجے بگل بھوں پو، بھوں پو بھوں پو۔ اگلے وقتوں کے لوگ سمجھتے کہ اور کیا۔ ہہا ہہا۔ خہ خہ خہ خہ۔ یہ کہہ کر دھم سے گرے۔ سر بولا کھٹ، پھر سنبھلے، پھر لڑھکے، پھر اٹھے، پھر دھم، اب لگے واہی تباہی بکنے۔ ہم، ہم، ہم کو کوئی جاتے۔ سامنے کانٹا، دکان میں آنٹا، کبڑیے کے یہاں بھانٹا، رسالدار کو لگاؤں چانٹا۔

رسالدار : اب ایسا نہ ہو کہ میں نشہ وشہ سب ہرن کر دوں۔ نامعقول بیہودہ بکتا ہے۔ زبان کو لگام دے۔

پلٹو : کیا، لغام ؟ سائیس سا معلوم ہوتا ہے۔

آزاد : میاں سئیسی علم دریاؤ ہے۔

پلٹو : تیراسر تاؤ ہے، تو بن بلاؤ ہے۔

رسالدار : کوچ مین بگھی ٹھہراؤ۔

پلٹو : کوچ مین بگھی چلاؤ۔ گھوڑو، اے گھوڑو! ٹٹوؤں اور ٹٹوئیوں گرماؤ، گرماؤ، خوب گرماؤ، تیز، تیز، خیز، بریز، بریز، چلی چل چل۔ نخرے نہ کر۔ آنٹا گوندھ گیلا نہ کر۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ رسالدار کا چہرہ مارے غصّے کے لال انگارہ ہو گیا، جیسے چقندر۔ اور اب کوئی دم میں پلٹو مہرا پر ایک آدھ چپت جمایا ہی چاہتے ہیں۔ انھوں نے بات ٹال دی اور پوچھا کہ کیوں پلٹو مہرا سچ کہنا استاد تم نے تو کبھی ڈولی نہیں اٹھائی ؟ پلٹو بولے، نہیں کبھی نہیں۔ برتن البتہ مانجے ہیں، مگر ہوش سنبھالتے ہی مدرسے میں پڑھنے لگے، اور اب تار گھر میں نوکر ہیں۔ ہم اور پیوں گا۔ رسالدار جی لو پیتے ہو؟ رسالدار کے منھ کے پاس کبھی لے جا کر کہا، کہ پیو پیو! پی پی! اتنا کہنا تھا کہ رسالدار جل بھن کے خاک ہو گئے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، تڑ سے ایک چانٹا رسید کیا، دوسرا اور دیا، تیسرا پھر، چوتھا اس پر اور، پانچواں گھانے میں۔ بوکھلا دیا۔ لالہ پلٹو مزے سے بیٹھے چپتیں کھایا کیے، اور جب خوب تھک چکے، تو ایک قہقہہ لگا کر فرمایا کہ ابے جا بڑا رسالدار بنا ہے۔ نام بڑا اور شن چھوٹے۔ ایک جوں بھی نہ مری۔ رسالداری کیا خاک کرتے تھے۔ تم رسالدار، رسالدار، رسالدار، چلو اب تو ایک

بکی بّ پیو۔ تھیں قسم ہے۔ اپنے بڑے سر، اور کنجی آنکھوں کی۔ دوں پھر بولو جھٹ پٹ، لو پیو۔

رسالدار: بھئی اس نے تو ناک میں دم کر دیا۔ پناہ خداوندا پناہ، ہار ہی مانتا ہے نہ جیتی۔ پیٹتے پیٹتے ہاتھ تھک گئے، مگر اس کے خم و دم ویسے ہی ہیں۔ ذرا فرق نہیں۔

کوچ مین: رسالدار صاحب یہ کیا غل مچ رہا ہے؟

آزاد: بڑی بات کہ تم جیتے تو بچے۔ ہم سمجھے تھے کہ سانپ سونگھ گیا۔ یہاں مار دھاڑ بھی ہو گئی، مگر تھیں اطلاع ہی نہیں۔

کوچ مین: مار دھاڑ، یہ مار دھاڑ کیسی؟ دیکھوں (اتر پڑے)

رسالدار: دیکھو یہ بے حیا سور بیٹھا شراب پی رہا ہے، اور سب کو بے نقط سناتا جاتا ہے۔ میں نے خوب ہی درست کیا۔ ایسا پیٹا ایسا پیٹا کہ یاد ہی تو کرتا ہو گا۔

پلٹو: جھوٹے پر لعنت، کہو بیش باد۔ کہو بس اب کہو نہ۔ اے پھٹکار، لعنتِ خدا، یہاں تو کان پر جوں بھی نہ ریں گی۔

کوچ مین: تھوڑی سی ہم کو نہیں پلاتے؟

پلٹو: اوداہ وا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ، ہم تو چاہتے تھے۔ کہ کوئی ساتھی ملے۔

الغرض لالہ پلٹو اور میاں کوچ مین دونوں کے دونوں کوچ بکس پر جا کر بیٹھے، اور بجیوں کا دور چلنے لگا۔ جب دونوں بدمست ہوئے، تو باہم خوب ہی گل خپ ہوئی۔ اس نے اس کو لپڑ لگایا۔ اس نے اس کو ناک کے ڈک جمایا۔ پلٹو نے دھپ دی۔ اس نے ایک ٹیپ جڑی۔ اس نے اس کو رلایا۔ اس نے اس کو ڈھکیلا، اور پلٹو زمین پر ہو رہے۔ گرتے ہی ٹانا ٹنگ پکڑ کر گھسیٹا، تو کوچ مین بھی دھم سے گرے گرتے ہی چمٹ گئے، چمٹتے ہی وہ بھی گتھ گیا۔ ایک نے کولے پر لادا۔ دوسرا بغلی ڈوبا۔ اس نے دستی کی، اس نے ہفتے گا نٹھنے، کے لیے پیش دستی کی۔ اتنے میں دونوں چمٹ گئے۔ اور لگا مکّا چلنے۔ دائیں، دھائیں، دھم دھم، دھس دھس، تڑ۔ تڑ، تڑاق۔ پڑاق، دھوں دھائیں، کوچ مین نے جھپٹ کے میاں پلٹو کی ٹنگڑی لی۔ اس نے پٹے پکڑے۔

اتنے میں رسالدار نے پلٹو کو بے بھاؤ کی چپتیں لگائیں، ایک دو تین چار کر کے کوئی پچاس تک گن گئے۔ آزاد نے دیکھا کہ میں خالی کھڑا ہوں۔ انھوں نے کوچ مین کو چپتیانا شروع کر دیا۔ اب سنیے کہ بارگیر اور سائیس، اور ایرے غیرے، سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ دونوں کا نشہ جب ہرن ہو گیا تب جا کے کہیں چھوڑا۔

آزاد: کیوں بچہ پھر پیوگے شراب؟ کیوں چڈّا گل خیرو، اور شراب منگواؤں؟ نامعقول! گاڑی چلاتا ہے یا شراب پلاتا ہے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے کردوں گا۔

رسالدار: ہاتھ تیرے کی۔

پلٹو: تو کیا آپ اکڑ رہے ہیں؟ آپ کی رسالداری تو ہم نے دیکھ لیا۔ آپ کے ہاتھ میں سکت ہی نہیں۔ دیکھو کوچ مین کے سر پر آدھے بال رہ گئے۔ یہاں بال تک بیکا نہ ہوا۔

رسالدار: بس اب ہم ہار گئے۔

اب سنیئے کہ اس ٹھائیں ٹھائیں، اور جھنجھٹ، اور مار پیٹ کو کچھ عرصہ ہوا۔ لیکن کوچ مین نے مارے خوف کے گھوڑے ایسے تیز چلائے کہ عین وقت پر بگھی پہنچ گئی۔ ذرا دیر نہ ہوئی، جو کہیں لالہ بھگویا، میاں امامی، کی ڈاک ہوتی تو دو ہی دن میں پہنچتی۔ لیکن ہندوستانی کارخانہ پھر ہندوستانی ہے۔ وہ قواعد کی پابندی کجا، ضابطے کی فکر کس کو۔

ایں سبزہ وایں چشمہ وایں لالہ وایں گل
آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید

ہمارے شفیق نیک نہاد، کوچہ گرد، خانہ برباد، وحشی مادر زاد، اسم بامسمّٰی، وارستہ و آزاد، رنگیلے جوان بنے ہوئے بڑی آن بان سے تنے ہوئے، شکرم پر سے اُترے، تو نئے شہر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ ہر محلہ آباد، کوچہ و برزن خوش سواد، ہر سمت لطف خداداد، الٰہی! یہ شہر ہے یا بہشت شداد۔ سڑکیں صاف، چپہ چپہ شفاف، کوڑے کرکٹ سے کام نہیں۔ گندگی و عفونت کا نام نہیں۔ کہیں گرد نہ غبار، در و دیوار ندرت یار، ہر سمت سبزہ زار، ہر باغ رشکِ فرخار، چو طرفہ گلزار، اور گلہائے بے خار، پت جھاڑ سے واسطہ، نہ خزاں سے سروکار، دماغ طبلۂ عطار، نسیم عنبر بار، اور روکشِ صد ہزار، نافۂ تاتار۔ اس میں ایک رنگین کوٹھی جو نظر آئی تو آنکھوں نے چشم بددور، وہ طراوت پائی کہ واہ جی واہ۔ اس کی بناوٹ اور سجاوٹ، ایسی بھائی کہ سبحان اللہ! بس دل میں کھپ ہی تو گیا۔ روشیں دنیا سے نرالی، بیلیں ساری خدائی سے انوکھی، پودوں پر وہ جوبن کہ انسان برسوں گھورا کرے۔ درختوں پر وہ پھبن کہ دیکھنے سے سیری ہی نہ ہو۔ سرو شبیہِ قامت مہوشانِ فرخارِ آزاد، سبزانِ چمن خنداں وشاد، زمین زمرد رنگ، کوہ زمرد کے ہم سنگ۔

چمنِ زمرّدینِ فلک، اس زمرّد رنگ کو دیکھے تو شرما جائے۔ گُل لالہ کے تختہ پر یاقوت احمر ہیرا کھائے۔ صبح ہو اور شام ہو، یہ باغ زیبا ہو، اور دل آرام گل فام ہو۔ تبارکَ اللہ، یہ باغ نزہت فزا ہے یا ارمِ

آراستہ، یہ گلشن پرفضا ہے، یا نگارِ پیراستہ، گلزار ارم اس کے مقابل گرد ہے، باغِ نعیم کا چہرہ زرد ہے۔ الٰہی یہ باغِ جنان ہے، یا روضۂ رضوان ہے۔ جو نہال ہے عشوہ ریز، جو پٹری ہے بہجت خیز، جو پھول ہے رنگ آمیز، اور مشک بیز۔ نرگس مثل چشم آہو چشمانِ چگل ملائک نظر فریب، سنبل مثل طرۂ تابدارِ پری رخانِ فرحان، آشوبِ زمانہ، و عدوئے شکیب۔ رضوان دیکھے تو مارے شرم کے عرق عرق ہو جائے۔ فردوسیؔ[1] دیکھ پائے تو گلچیں بن جائے زمین زمین شعر کی طرح رنگین۔ ہوا عنبر بار و عطر آگیں۔

میاں آزاد نے ایک ہرے بھرے درخت کے سایہ میں، جس کے زمرّدیں پتے، حلّہ پوشانِ بہشت، اور سبزانِ ہند کی یاد دلاتے تھے، زین پوش بچھایا۔ سبزۂ بیگانہ کو اپنا مسکن خاص بنایا۔ ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے مستوں کی طرح جھومتی تھیں، اور فرطِ میوہ سے زمین کو بار بار چومتی تھیں۔ چو طرفہ فرشِ زمرّدیں اور گلہائے رنگین۔ غنچوں کا چٹکنا، شاخوں کا جھومنا، پھولوں کی مہک، سبزے کی لہک، سوسن کی زبان درازی، نرگس کی نظارہ بازی، آنکھوں کو سرور بخشتی تھی، اور روح کو لطفِ موفور۔ جہاں تک بیکِ نظر کی رسائی تھی، قدرت نے عجب کیفیتِ خداداد دکھائی تھی۔ اور ہر سمت سے نمایاں شانِ کبریائی تھی۔ لیکن اس رنگین کوٹھی پر اور ہی عالم لطف دوبالا تھا۔ اس کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ گلابی رنگ، سبز دروازے، لاجوردی پردے، جن کے دیکھنے سے بادامِ تر کی طرح آنکھ سبز ہو جائے، اور قوتِ باصرہ خضارت پائے۔ اِدھر اُدھر دوب ہری بھری، اور اس کے بیچوں بیچ میں رنگین بارہ دری۔ چو طرفہ چشمہ، اور ادھر اُدھر سبزہ لہلہا رہا ہے، اور مرغ چہچہا رہا ہے، گرداگرد چشمہ سار، اور جوئبارِ پُر بہار، سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ جزیرہ ہے۔ ایک رہرو سے میاں آزاد نے پوچھا کہ!

آزاد: یا حضرت ذرا ادھر تو آئیے!

رہرو: الامر فوق الادب۔ لیکن قبلہ کہیں وہی سوار والی مثل نہ ہو کہ ایک مجہول آدمی نے ایک سوار کو

---

[1] فردوسی طوسی متوفی ۴۱۱ھ یہ فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس نے سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر قدیم ایران کی تاریخ ۶۰ ہزار اشعار میں نظم کی، اس کا نام شاہنامہ رکھا۔ محمود نے ہر شعر کے عوض ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا تھا مگر جب فردوسی نے شاہنامہ پیش کیا تو اس نے اپنے وزیر حسن میمندی کے بھڑکانے پر چاندی کے سکّے دینے کا حکم دیا۔ فردوسی کو رنج ہوا۔ اور بغیر انعام لیے واپس چلا گیا۔ بعد میں محمود کو اس بے انصافی پر افسوس ہوا تو اس نے ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس بھیج دیں مگر جس دن یہ رقم اس کے شہر اسی دن اس کا جنازہ شہر کے باہر قبرستان لے جایا جا رہا تھا۔ اس کی لڑکی نے بھی یہ رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاہنامہ فارسی ادب کا عظیم شاہکار ہے۔

جو فرس تند خو کی باگ اٹھائے، کڑکڑاتا چلا جاتا تھا، دور سے پکارا، میاں سوار، میاں سوار، تمھیں قسم ہے خدا کی جو ادھر نہ آؤ۔ سوار بے چارہ سمجھا کہ کوئی شخص مصیبت کی حالت میں پڑا سسک رہا ہے، چلو مدد کو پہنچو۔ گھوڑا پھیر دیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک آدمی صاحب تن و توش، خاصہ ہٹا کٹا، موٹا تازہ، ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہے، مگر چت، آنکھیں آسمان کی طرف۔ پوچھا۔ کیوں بلایا؟ تو فرماتے کیا ہیں کہ بھئی پھلیندا ٹپ سے چھاتی پر گر پڑا، ذری اتنا احسان کرتے کہ چھاتی پر سے اٹھا کر کھلا دیتے۔ تب تو سوار چکر میں آیا کہ لاحول ولا قوۃ، اچھے نامعقول مجہول، آدمی سے پالا پڑا۔ دو کوس سے ہمیں بلایا، اور یہاں بلا کر الو بنایا، تو حضرت اگر کچھ ضروری بات ہو تو خیر ورنہ رخصت۔

آزاد : یہ ندی کہاں سے نکلی ہے، اور گرتی کہاں ہے؟ طول اور عرض کیا ہے، اور اس پر کون شہر بستا ہے، اور پل کتنے بنے ہیں؟

رہرو : لے اب سیدھے چلے جاؤ، داروغہ پاگل خانہ بے چارے پر کیوں جرمانہ کراؤ گے مفت میں۔ واہ کیا سہل بات پوچھی ہے۔ ندی نکلی کہاں سے ہو نہہ۔ یہ اچھی سوجھی۔ اجی پہاڑ سے نکلی ہے، اور کہاں سے نکلی ہے۔ کیا املی کی جڑ سے نکلی ہے۔ گرنے کا حال خدا جانے۔

آزاد : اس کوٹھی اور بارہ دری میں کون رئیس رہتا ہے؟

رہرو : رئیس نہیں ایک رئیسہ رہتی ہیں۔ بڑی مالدار ہیں۔ اب تو کوئی ساٹھ برس کی ہوں گی۔ رات کو روز بجرے پر دریا کی سیر کو نکلتی ہے۔ ان کی دو لونڈیاں صاحب زادیاں بھی ہوتی ہیں، اور دو تین ماما اصیلیں، مغلانیاں، ایک پینز کتا دو مانجھی، روز بلا ناغہ جاتی ہیں۔

آزاد : تو بجرہ کیا حضرت نوح کی کشتی ہے۔ (بلا تشبیہ) بھلا کیوں صاحب! صاحبزادیوں کی عمر کیسا ہو گی؟ بیاہی ہیں کہ بن بیاہی؟

رہرو : اب سن و سال کا بندہ کو کیا معلوم، مگر سیانی ہیں۔ کوئی تیرہ[13] تیرہ[13]، چودہ[14] چودہ[14]، برس کی ہوں گی۔ بس اور کیا۔ شریف زادیاں رئیس زادیاں ہیں۔ بڑی تمیز دار، بڑی سلیقہ شعار، بڑی خوش فکر، اور بڑھیا تو بقراط ہے اپنے وقت کی۔ ایسی منتظمہ تو دیکھی نہ سنی۔ بڑی باکیاز، بڑی راستباز، خیر، جواد، غیور، خوش خلق، اور تربیت یافتہ۔ لڑکیاں بھی اپنی ماں کے قدم بقدم ہیں۔ آنکھوں میں شرم، مزاج میں آزرم، روپوش، عفت کوش، حیا پرور، پاک نظر، ناز و نعم پروردہ، مگر خواندہ۔ یہ نہیں کہ الف کے نام بے نہ جانتی ہوں۔ رات کو بڑی سیر ہوتی ہے۔ جس وقت بجرہ فراٹے سے بہاؤ پر جاتا ہے،

لطف آتا ہے واہ، وا۔ شبِ ماہ میں البتہ کیفیتِ مزید حاصل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ کھانا بھی بجرے ہی پر نوش جان فرمایا تھا۔ بڑی دل لگی ہوتی۔ چھوٹی صاجزادی نے کھاتے کھاتے فرمایا کہ:

دریائے اخضر؟ فلک وکشتیٔ ہلال

ہستند غرقِ نعمت حاجی قوام ما

واللہ کیا کہی ہے۔ کیا برجستہ سوجھی ہے۔ بڑی صاجزادی نے ایک لطیفہ غضب کا سنایا۔ ان کی اماجان نے کہا کہ باقر روٹیاں خوب پکاتا ہے۔ (باقر اُن کے باورچی کا نام ہے) تو اس پر بڑی صاجزادی مسکرا کر فرماتی کیا ہیں ہاں ہاں اماں جان وہ نہیں تو اور کون پکائے گا اسی کے نام سے باقر خانی مشہور ہے سبحان اللہ!

آزاد: شادی ابھی نہیں ہوئی، بھلا کہیں پیغام ولیغام ہے؟

رہرو: ابھی شادی نہیں ہوئی، نہ کہیں بات چیت ہے۔ دونوں بہنوں کو مطالعہ کتب کا ازبس شوق ہے۔ پڑھنے لکھنے، اور سیر دریا، یا گلگشت چمن کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ اصغری اور اکبری کا قصہ، اجی وہی مراۃ العروس اور بنات النعش، اور فسانۂ حامد، اور تزکِ جرمنی، اور علی بنار اور اخلاق کاشی، وغیرہ کتب نو تصنیف مطالعے میں رہتی ہیں، اور ان کو دل لگا کر پڑھتی ہیں سینے پرونے کاڑھنے میں بھی دو توں بہنیں برق ہیں۔ کھانا بھی خوب پکا لیتی ہیں۔ صفائی کا دونوں کو خیال ہے۔ میلے کچیلے مکان میں دم بھر نہ بیٹھیں۔ ہوادار کمروں پر لوٹ ہیں۔ خدا کرے ان کی شادی اچھے گھروں میں ہو!

غالبؔ ان سیمیں تنوں کے واسطے

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

آزاد: بندہ نواز! ہم تو اس وقت ریشہ خطمی ہو گئے۔ پوچھیے وجہ سنیے! جہاں ہم نے اپنے وطن کی کسی تعلیم یافتہ، پڑھی لکھی لڑکی کا حال سنا، اور بس باچھیں کھل گئیں۔ خدا کرے تعلیم نسواں اس ملک میں روز بروز ترقی پائے، اور ہر ایک لڑکی فارسی یا ناگری پڑھ جائے، آمین! لیکن واللہ! اب دلی خواہش یہ ہے کہ کسی ترکیب سے بجرے کو دیکھیں، اور خدا کا شکریہ ادا کریں، کہ اس ملک میں بھی ایسی خوش فکر، شریف زادیاں ہیں، جو تعلیم و تربیت کو گناہ نہیں سمجھتیں۔

رہرو: تو پھر اسی جگہ بستر جما رکھیے۔ میں سرِ شام ہی آجاؤں گا۔

آزاد: حضرت میں مسافر غریب الوطن آدمی ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپ شام کے عوض صبح کو بھی نہ

آئیے، اور یہاں میدان لق و دق میں اپنی جانب کو بھیڑیا اٹھالے جائے۔

رہرو: آپ بڑے دل لگی باز معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو تو سات اژدہن سے بھی خوف نہیں۔ آپ ٹھہریں۔ میں دم کے دم میں آیا۔

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

غوّاصِ قلزم شرر فشانی، آشنائے محیطِ پریشانی، مصباحِ مجالسِ وداد، وحشی مادرزاد، میاں آزاد خانہ برباد، زلف کی طرح خانہ بدوش و پریشان روزگار، شام تک اس یارِ وفادار کے انتظار میں سر دھنا کیے، اور مُرغانِ خوش رنگ، اور خوش آہنگ، کے ترانے سنا کیے۔ تدروِ خوش خرام کا قہقہے لگانا، عندلیبِ شیدا کا چہچہانا، موریلوں کی سریلی جھنکار، پپیہوں کی پکار، رامش گری، مرغانِ چمن زار، دمستانہ ردی آبِ رود بار، و مرغزارِ پُر بہار، کی نمک ریزی، نسیم بہجت انگیز کی عطر بیزی، شاخ گل کی مہک، سبزۂ زمردیں کی لہک، دریا کی روانی، بحر مسرت کی طغیانی، اہو ہو ہو، اہاہا! جو مرغ چمن ہے رنگین ادا، خوش نوا، ہر طرف مشاطۂ صبا کی گلکاری تھی۔ اور نسیم عنبر شمیم کی فیض باری۔ چشمہ سار کا پانی جو نوش جان فرمایا، تو گویا قند و نبات کا مزہ پایا؛ بلکہ آبِ حیات یاد آیا۔ ہر سمت نکہت روح افزا، اور رائحۂ دل آرا، امرود، حلوائے بے دود، سیب دافعِ آسیب، ترنج مشک آگیں، رشکِ آہوے چین، عنّاب بالبِ شکر لبان، دشکر لب شفتالوے کاردی وآردی کچھ سُرخ، کچھ سبز، گویا سبزانِ ہند گلابی پوش ہیں، یا یادِ معشوق میں خوننابہ نوش ہیں، انبہ پیوندی نوش پیوند ہے۔ دلپند بادشاہ پسند ہے۔ سبزہ ہمشیرہ جانِ شیریں۔ انار حقہ، حقۂ یاقوت نگار، و حلاوت آگیں۔ میاں آزاد وحشی مزاج کو لطفِ بہار ایسا بھایا کہ بے اختیار لہرا لہرا یوں گایا:

شب شنبہ و عید و ابر بہار سرت گردم اے ساقی عشوہ یار
مہر و مطرب از ہر ج دیدم خوش ست شبِ شنبہ از روزِ عیدم خوش است

میاں آزاد کا جنون بہار فروش تھا! اور ستم کوش سوچے کہ جناب باری نصیب آزاد، دیدار یار جانی کرے۔ دعاے حزیں گل زمینِ اجابت میں ریشہ ودانی کرے۔ کبھی دھتّا دینے کا شوق چرّایا، کبھی بھاگ جانے کو جی چاہا۔ کبھی سر دھنتے تھے۔ کبھی تنکے چُنتے تھے۔ آشنا نہ بیگانہ، خویش نہ یگانہ، ہے ہے یہ بہار، اور یار کا انتظار، فرقت کا دھڑکا، ہجراں کا کھٹکا:

سوختم از غصّہ دریں نو بہار بادۂ من در خُم و من در خمار

دل ہی دل میں یوں سوچنے لگے۔ وہ رہرو تو واللہ جھانسا ہی دے گیا، اب شام میں باقی کیا ہے۔

آنا ہوتا تو آگیا ہوتا۔ بس آچکا، اور بجر ادکھا چکا۔ ہائے یہ چاہ کنویں جھکائے گی، تنکے چنوائے گی۔ مگر۔ ۶، دل کو میرے آفریں یہ جوڑ ٹا سوڈ ٹا۔ میں بھی نہ ملوں گا، نہ ٹلوں گا۔ ۷۔ اب تو آزاد نے اس در پہ جمایا زانو،

ہندوستان میں ایسی شریف زادیاں نظر کہاں آتی ہیں، جو زیور علم و فضل سے متجلّی ہوں۔ حلۂ شائستگی سے متجلّی ہوں۔ کسی کو فکر پوری و دال ماش، کسی کو شوقِ تراش و خراش۔ اللہ اکبر، اس درجہ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ ہندیوں کا ادبار آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔ کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہمدردوں کا جی جلتا ہے، اور فرطِ جوشِ حبِّ وطن سے سینہ مثلِ دیگ ابلتا ہے۔ پرانے فشن کے اکثر بزرگ لکیر کے فقیر ہیں۔ جدّت سے طبیعت نفور شائستگی کی باتوں سے منزلوں دور۔

میاں آزاد عین حالتِ پریشانی میں یہ سوچ رہے تھے کہ رہرو نے کہا امساکم اللہ بالخیر۔

آزاد : عمرت دراز باد۔ خانہ احسان آباد۔ آپ کے فراق نے کنویں جھنکائے، مگر خیر وقت پر آئے، پھر اس فرش زمردگوں پر بستر جمائے، سبزۂ بیگانہ کو اپنا مسکن بنائے۔ سچ کہیے گا کیا سہانا وقت ہے۔ ہر عروسِ چمن سبز بخت ہے:

کشیدہ ام زجنون ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیرِ می فروش نماند

نرگس کی طرح دیدۂ حیراں ہوں، اور مثلِ گل چاک گریباں ہوں:

ماکوسِ بادشاہی دشتِ جنوں زدیم تختِ روانِ آبلہ در زیرِ پائے ماست

آج اس بہار، کافر بہار نے ہمارے سمندِ جنون پر اور بھی تازیانے کا کام کیا:

ہر صبح میزند چو شفق جوش خونِ ما موقوف بر بہار نباشد جنونِ ما

رہرو : اگر یہی رنگ بہار ہے، اور یہی لیل و نہار ہے، تو مجنوں کا کوئی نام بھی نہ لے گا:

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتے تھے القاب مجھے

آزاد : حضرت یہاں تو جنونِ نیک فال سے سروکار، نہ عشقِ پری برخانِ گل رخسار، نہ شوقِ اصنامِ طرحدار، مطلبِ سعدی دیگر ست۔ اصل منشا تو یہ ہے کہ ہندوستان کی عالی خاندان، معالی دودمان، نجیب الطرفین، و شریف الجانبین، رئیس زادیوں کو تربیت یافتہ اور شائستہ دیکھیں، اور جنابِ باری کی درگاہ میں شکریہ ادا کریں۔ ہم تو ہندوستان کے نام پر فدا ہیں۔ اسی کے عاشق و شیدا ہیں۔ عاشقی

و معشوقی، روحِ مجنوں دوامق ہی کو مبارک رہے۔ ہم ایسے ویسے محبوب کو دل نہیں دیتے۔ دل کا سودا دل لگی نہیں ہے:

شاہد آن نیست کہ موی رومیانی دارد
بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنی دارد

رہرو: الحمد للہ! الحمد للہ! لو منھ مانگی مراد پائی۔ وہ سامنے سے پالکی آئی۔ لے اب سجدہ کرو اور نماز شکریہ پڑھو۔

دیکھ لو وہ سامنے سکھپال ہے   وہ میاں، وہ جس کا پردہ لال ہے

آزاد: (عینک کو کپڑے سے صاف کر کے) کہاں! کہاں! کدھر میاں بتاؤ، بتاؤ؟

رہرو: اینسٹ کی عینک لگاؤ۔ اتنی بڑی پالکی نہیں دیکھ سکتے، کیا رتوندھی آتی ہے؟

آزاد: آنکھیں ہی پھوٹیں جو نظر پڑی ہو۔ اندھا ہی ہوں جو پالکی سے آنکھ لڑی ہو۔ اہاہا، وہ دیکھی، ایں! وہ تو درخت کے سایہ میں رُک رہی جی۔ یہ کیا:

قسمت کو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

رہرو: گھبرائیے نہیں۔ آپ کے تو ہوش ہی بیترا ہوئے جاتے ہیں، بیکار ہاتھ پاؤں پھوتے جاتے ہیں۔ اب کوئی اور ذکر چھیڑیے، جس میں معلوم ہو کہ دو مسافر تھک کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

آزاد: سوجھی تو اچھی۔ اب میں کوئی اور ذکر چھیڑتا ہوں۔ کیوں صاحب اب کی آم کی فصل خوب ہوئی۔ جدھر دیکھو پٹے پڑے ہیں۔ شیرہ شکر ریز ہے۔ آم پر چھری تیز ہے۔ منڈی جائیے، کھانچیوں کی کھانچیاں تربوز کی دیکھ آیئے۔ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا، اور آم کے سامنے تربوز کو کون ہاتھ لگائے، بھئی ہمیں تو بمبئی پسند ہے، اور آمن تو قیامت کی شیریں ہے۔

رہرو: دیکھیے کہیں فرہاد کی روح کے منھ میں پانی نہ بھر آئے بھئی، امسال تو ہم نے خوب ہی آم کھائے۔

کچھ دیکھا؟ وہ دیکھو! ہاتھی آرہا ہے۔ ہاتھی کیسا کوہ کا کوہ ہے۔ فیل فلک شکوہ ہے:

بہ پیشانیش شنگرف ست دلکش   زکوہِ طور رخ بنمودہ آتش

اب سب آگئے، وہ دیکھو کراتیار ہو رہا ہے۔ اس فیل مست پر دونوں بہنیں بصد نازِ دلربائی، و ندازِ زیبائی، متمکن ہیں، اور پالکی میں بڑی بیگم صاحبہ جلوہ فگن ہیں۔ اب بجرے پر سوار ہی ہوا چاہتی

ہیں۔

یہ میٹھی میٹھی باتیں ہو ہی رہی تھیں، کہ ایک دفعہ ہی قبلہ کے رخ سے کالی گھٹا، متوالی گھٹا، جھومتی ہوئی اٹھی، اور بجلی نے لونکنا شروع کیا۔ رعد کی گرج سے کان پڑی آواز کا سننا محال تھا، اور رم جھم لگا مینھ برسنے:

زفیضِ ابر، سرخوش میگ ساراں ہوا زتار بند از تارِ باراں
کند قوس و قزح باران سگالی چنیں باشد گمانِ برشگالی
زفیضِ ابر گلشن کامیاب ست صدائے رعد چوں بانگِ رباب ست
فروغِ برق بین در ابرِ سیراب بعینہٖ ہمچو عکسِ لالہ در آب

ادھر قطرہ افشانی ہوئی، ادھر فیل بان نے ہاتھی کا رخ پھیر دیا۔ کہاروں نے پالکی کو لیا، اور چلے گھر کی طرف۔ اے چرخِ ستمگار نے بیٹھے ہی پر ٹوک دیا۔ آتے آتے روک دیا۔ بجرے کی روانی، اور دریا کی طغیانی، اور باران رحمت کی قطرہ افشانی، کیا کچھ لطف نہ دکھاتی۔ دل کی کلی کیسی کھل کھلاتی۔ مگر۔ قسمت:

ساقی و جام مے و گوشۂ دلبر ست اینجا للّٰہ الحمد کہ احوالِ بخیر ست اینجا
نکتۂ عشق میرسید کہ ہوشم باقی ست سخن از یار مگوئید کہ غیر ست اینجا

اس شہرِ نشاط آباد، و خوش سواد، میں میاں آزاد خانہ برباد نے بادل شاد شبِ دلاویز کو بستر استراحت پر آرام فرمایا، تو رات بھر کروٹ تک نہ لی، نور کے تڑکے نسیم طرب انگیز نے جگایا اور بہار توبہ شکن نے ایسا لبھایا، کہ دل سیر کو چاہا۔ خیالِ گلگشت چمن و تماشائے نسرین و نسترن، نے گدگدایا۔ شوق چرایا کہ احباب بذلہ سنج، مرنجان مرنج ہوں، اور اربابِ لطیفہ گو و نکتہ سنج ہوں۔ اٹھے تو اشعارِ آبدار وردِ زبان، غنچۂ دل گل خندن:

بکوئ عاشقی چوں من نخواہد بود رسوائی
دلم صد پارہ د ہر پارۂ عاشق بیک جائی

رہرو: الٰہی خیر! صبح صبح رسول پیغمبر سے کام، نہ خدا کا نام، بس ایک ذکرِ جام، دوسرے خیالِ دل آرام:

محبت مے و معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسم خضاب آیا

آزاد: میاں یہ سب بوڑھوں وقت کے خیال ہیں۔ یہاں تو حضرت دل خرام ناز کے پامال ہیں۔ مگر ہم ترک زریں کمر ہوئے میاں کے دلدادہ نہیں۔ عاشق جام و بادہ نہیں۔ یہاں اور ہی دھن ہے۔ اور ہی ادھیڑ بن ہے۔ ہندوستان کے عاشق زار ہیں۔ اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ دل سے لگی ہے کہ ہندی آدمی بن جائیں۔ میدان تہذیب میں علم وحدت اٹھائیں۔ ذکور حلیۂ شایستگی سے مشین ہوں۔ اناث زیور علم سے مزین ہوں:

ہم کو سودا بھی ہوا تو میرزایانہ ہوا

بہار ست اے ساقی لالہ رنگ　　بدہ ساغر مے مرا بید رنگ

اس وقت تو در و دیوار عشرت بار ہے۔ رندو چلو عالم بہار ہے۔ خزاں کا بازار سنسان ہے۔ اللہ اللہ فصل گل کی بھی کیا آن بان ہے:

ہے شوخیوں پہ حسنِ طرحدار آج کل　　بال پری ہے طرۂ دلشاد آج کل

رہرو: لیجیے منھ دھوئیے۔ حمام خانے جائیے۔ ما حضر تناول فرمائیے۔ اول طعام بعدہٗ کلام راحتِ الروح فی قلۃ المنام۔ ہاں! اے اب اللہ اکبر کہہ کر اٹھ تو بیٹھیے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم، سستا کر آٹا اور مہنگی کرا فیم۔ ادھر آفتاب نے رخ انور کی جھلک دکھائی، ادھر میاں آزاد کو سیر دریا کی دھن سمائی۔ رہرو کو ساتھ لیا، ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور اشعار سناتے، رہرو کو وجد میں لاتے، گاتے لہراتے، پھونک پھونک کر قدم جماتے، باد بہاری اور قدرت کی گل کاری کے مزے اڑاتے چلے۔

اب سنیئے کہ شام کا سہانا وقت۔ ہر عروسِ چمن شاد کام، و سبز بخت، ٹھنڈی ہوائیں، اودی گھٹائیں، کلیوں کا مسکرانا، پھولوں کا کھل کھلانا، نرگسِ شہلا کی چشمک زنی، عندلیبِ شیدا کی جانکنی، ادھر جوئبار، ادھر بگلوں کی قطار، کہیں انہار آبدار، کہیں ازہار، مسرت بار، کہیں فاختہ دستک زناں، کہیں قمری کوکو کناں، لالہ کا بباس گلگوں، کہیں نمونۂ قدرت بیچوں، کہیں روشِ دلکش، کہیں بوئے خوش، ہوا فیض بیز، عنبر افشاں و بہجت انگیز، گل قدم کی زبان سے صدائے اللہ اکبر بلند ہے۔ مشک دانہ کا لباس زعفرانی دل پسند ہے۔ گل چنپہ در خوش آب ہے۔ گل منہدی کی رنگینی اور طراوت لاجواب ہے۔ یہ تختہ گل فرنگی ہے۔ بارک اللہ کیا تازہ رنگی ہے۔

لبِ جو دونوں دوستانِ صادق اور یارانِ موافق نے جاکر دم لیا، اور حدیثِ حسن و عشق کو سر کیا۔ میاں آزاد خانہ برباد، اس بہار روح افزا اور گھنگھور گھٹا پر ہزار جان سے عاشق تھے۔

چوں نکہتِ گل چمن در آغوش　　چوں زلفِ نسیم خانہ بردوش

خاتون شب نے برقع نیلی سحاب سے صورت زیبا چھپائی اور کالے کوسوں تک وہ تاریکی چھائی کہ الحفیظ! الٰہی یہ شب دیجور ہے یا گیسوے حور ہے؟ جدھر دیکھو سیاہ ہی سیاہ، مہر نہ ماہ ہے۔ خونابۂ دل کا یہ جوش، اور شب اس درجہ قیامت در آغوش، ماتموں کی طرح سیہ پوش۔

آزادـ

آہ کیا قہر کیا، تفرقہ پردازوں نے
کردیا جلسہ ہی برہم خلل اندازوں نے

رہرو: یہ بھی اپنی قسمت کی خوبی ہے۔ اس تیرہ بختی کے قربان، کہ شبِ ماہ شبِ تار سے مبادل ہوگئی۔ بس اب تو یہ صحرائے جنوں خیز دشتِ وحشت بار ہے۔ ہم ہیں، اور دلِ داغدار ہے۔ نہ لطف سیر نہ دیدارِ مہوشاں برق رفتار:

دردِ ہر کسے بہ گل عذاری نہ رسید — تا بر دلش از زمانہ خاری نہ رسید
در شانہ نگر، کہ تا بصد شاخ نہ شد — دستش بسرِ زلف نگاری نرسید

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دفعہ کچھ آواز سی کان میں آئی۔ معلوم ہوا کہ بڑی دور سے کئی سوار رہوارِ آہو شکار، دبرق رفتار، کڑکڑاتے اور چمکاتے ہوئے، آرہے ہیں۔ میدان بھر گونج گیا۔ ایں! اس وقت ہماری طرح کس کو تباہی آئی کہ سیر صحرا کی دُھن سمائی۔ تڑ تڑ تڑ تڑ کرتے ہوئے، بادرفتار گھوڑے چار تپلیوں سے اڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ کھائی پھاندی دن سے، وہ نالی پر سے اچک آئے زن سے، ایک دفعہ ہی بجلی جو چمکی تو گھوڑوں پر سوار، سبزہ زار پر بہار میں، اشجارِ تناور کے سایہ میں کھڑے ہیں۔ گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ چمک رہے ہیں۔ یہ کڑکڑائے، وہ پہنچے وہ چکے، یہ آرہے۔ جو شیدیز ہے۔ سبک خیز ہے۔

آزاد: کیوں قبلہ۔ یہ جوان رعنا بلند بالا گل عذار طرح دار ہیں، کہاں سے آئے؟ کدھر کے عزم ہیں؟ ذرا دریافت تو کیجیے۔ مگر واللہ کیا کیا رنگیلے جوان ہیں، اور گھوڑے تو سبحان اللہ! زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ گھوڑے ہیں یا پری، اللہ اللہ یہ شانِ دلبری، رگ رگ میں سرعت بھری ہے۔ جیسے دیکھو برق دم پری جھم:

قدم باز ایسے گویا زیرِ پا مواج دریا ہے
سبک خیز اس قدر ہلنے نہ پائے پیٹ کا پانی

رہرو: ادھر آسمان پر ادھر زمین پر بجلی چمک رہی ہیں۔ ابھی اڑان بھریں تو فلک الافلاک پر تھگلی لگائیں۔ لیکن حضرت یہ فوجی آدمی ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے ذرا ادرح کانپتی ہے۔ یہ لوگ بات پیچھے کرتے ہیں چانٹا پہلے دیتے ہیں۔

آزاد : ہو نھ - چانٹا ؟ اس کا تو ذکر ہی نہ کیجیے - یہاں مرد میداں ہیں - دیکھیے ہم پرو بال ملاتے ہیں - ابھی باتوں میں لگاتے ہیں - دیکھیں تو ہیں کون ، آئے کہاں سے ، عزم کدھر کے ہیں - یہ کہہ کر میاں آزاد نے :

پوچھا تم لوگ خیل کے خیل جاتے ہو کدھر کو صورتِ سَیل

شہسوار : نہیں تاب کہ دیکھوں جمالِ صنم مجھے خوبی دیدہ دری کی قسم
رخِ حُسن کی جلوہ گری کی قسم غمِ عشق کی پردہ دری کی قسم

اے صنم یہ ستم خدا سے ڈر عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
قافلے والو اک ذرا ٹھہرو پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم
تم کو چاہا بڑا گناہ کیا ہاں سزاوارِ ہر سزا ہیں ہم
عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں حال میں اپنے مبتلا ہیں ہم

آزاد : اہاہا - آیئے مصافحہ تو کریں ہم - آپ بھی عاشق مزاج ، چمن طبع ، باغ و بہار ، جوان طرحدار ، نکلے :

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

شہسوار :

بنالِ بُلبُل اگر بامنت سرِ یاری ست
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاری ست

رہرو : معقول ! یہ اچھی ہوئی واللہ ! دونوں سودائی مل گئے اب دیکھیے کوئی دیر میں دال میں جوتی بٹا ہی چاہتی ہے - خوب ہی گلخپ ہوگی -

پانچوں سوار گھوڑے پر سے اتر پڑے ، اور سب نے میاں آزاد سے مصافحہ کیا - رہرو کے ہوش پران ، کہ واہ رے آزاد کیا دم کے دم میں پرو بال ملا لیے ، گویا برسوں کی ملاقات ، دانت کاٹی روٹی ہے -

اتنے میں موسلا دھار مینھ برسنے لگا ، اور میاں آزاد رہرو کا ساتھ چھوڑ کر سواروں کے ساتھ ہو رہے -

آزاد : یہ باغ ہو ، اور چو طرفہ راغ ہو ، اور احباب لطیفہ گو ہوں ، اور اصنام عربدہ جو ہوں -

شہسوار : حضرت آپ ہمارے ساتھ چلیے ، تو ساری داستان سنیے ، مگر رقابت کی سند نہیں -

ہاتھ پر ہاتھ مارے، قول ہارے، پرسوں یہاں ایک پری وش نظر پڑی جس دم سے آنکھ لڑی۔ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ فہم کو رو بیٹھا۔ دن ہے اور گریہ وزاری شب ہے اور اختر شماری :

صد شعلہ جنون ریخت بہ آشفتہ سر ما
زد پنجۂ مژگاں کہ بخون جگر ما

دوسرا سوار : (آزاد کے کان میں چپکے سے) ان کو بہت منھ نہ لگایئے گا، ورنہ پچھتایئے گا۔ اور دستِ حسرت مل کر رہ جایئے گا۔ یہ گھر بار چھوڑ کر وطن سے منھ موڑ کر، جنون کی امنگ اور وحشت کی ترنگ میں، اس طرف نکل آئے ہیں۔ یہاں ایک کافر پر نظر پڑ گئی، اور بتِ عربدہ جو، غالیہ مو سے نظر لڑ گئی۔ لیکن وہ عفیفہ پاک دامن عصمت مآب، عفت قباب ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے :

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام   قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

اس کے جمال باکمال نے آپ کی آتش جنون پر اور بھی تازیانے کا کام کیا، بلکہ ان کا کام ہی تمام کیا۔ اب آپ ہاں میں ہاں نہ ملایئے گا۔ بات ٹال جایئے گا۔ ورنہ ان کا خدا حافظ ہے۔ آیندہ اختیار بدست مختار۔

تیسرا سوار : حق یوں ہے کہ بلا کی صورت پائی ہے۔ کیا آن بان، کیا شان دلربائی ہے۔ اول تو شباب اس پر یہ آب و تاب، جوش جوانی اور شکل نورانی، قادر مطلق نے کل خوبیاں جو معشوقان طناز و سراپا ناز میں چاہییں، اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ رگ رگ میں شوخی، لیکن پاکباز، پاک دامن :

حیا بہ پیشِ رخست چشم بستہ می آید
ادب بہ بزم تو صد جا نشستہ می آید

آزاد : دیکھیے میں سراغ لگاتا ہوں، کل ہی تو کچا چٹھا سناتا ہوں۔ سچ کہوں ؟ صورت دیکھی ہو تو آسمان پھٹ پڑے۔ لیکن :

کس سے کروں میں دعویٰ دل جاکے اے خدا   دلدادۂ زلفِ رخِ دلبر ندیدہ ہوں

چوتھا سوار : کیا خوب، یک نہ شد دو شد۔ مسیحا خود مبتلائے مرض ہیں، تو مریض اچھا ہو چکا ! بس۔ اب مریض عشق کا خدا ہی حافظ ہے :

مژدہ باد اے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہیں

الغرض، ہوا کھاتے، اور گپیں اڑاتے ہوئے سب کے سب داخل منزل مقصود ہوئے۔

آم کی فصل

میاں آزاد تو وحشیوں کے استاد، ادب آموزِ وامق و فرہاد ٹھہرے ہی! رات بھر سواروں کی ٹکڑی میں چین سے بسر کی، لیکن ادھر مرغ سحر نے بانگ دی، ادھر میرے شیر نے کچھار کی راہ لی۔

کہاں کہاں؟ اے حضرت کدھر کی سدھیاں ہیں؟ تڑ کے کیا وحشت نے گھیرا کہ پاؤں پر سنیچر سوار ہوگیا۔ خدا ہی خیر کرے! تو میاں آزاد کیا کہتے ہیں، حضرت چلیے ذرا شہر کی تو سیر کر آئیں۔ کسی سے پوچھیں کہیں پتا لگائیں۔ جی چاہے تو آپ بھی چلے چلیے نہ، دو ایک بگڑے دل سیلانی جوان، کمرکس کے لیس ہوگئے۔ بسم اللہ چلیے چلیے! تو مست و غزل خواں، کبھی خنداں، کبھی گریاں، چلتے چلتے شہر میں داخل ہوئے۔ اہو ہو ہو۔ شہر تو خوش سواد ہے، لیکن بھئی مکھیوں کی بھن بھن نے ستم ڈھایا۔ ناکوں دم آگیا۔ جس گلی کوچے بازار منڈی میں جاؤ بھن بھن بھن۔ الٰہی توبہ! کیا جانے مکھیوں کو یہاں کے باشندوں سے کیوں عشق ہے۔ ایک رہرو نے سنا تو جوشِ وطن سے بولا کہ قبلہ یہ اس شہر کا قصور نہیں، آپ کی آنکھوں کا فتور ہے۔ عینک چڑھائی مگر پھر بھی بات سمجھ میں نہ آئی۔ ایں! سمجھو تو عینک سے کیا کام ہے۔ معقول ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ اے صاحب! مطلب یہ ہے کہ عقل کی آنکھوں سے کام لیجیے۔ مکھیاں کیوں کر نہ ہوں بھلا۔ آخر آم کی فصل ہے کہ دل لگی، اور اب کی آم سا آم ہوا۔ ہمارے ہوش میں تو اس کثرت سے کبھی بور ہی نہ آیا۔ شاخیں جھٹی پڑتی ہیں۔ منزلوں سفر کیجیے آم ہی آم، چو طرفہ باغوں میں نظر آئیں، اور بور کی خوشبو تو واہ جی واہ۔ جی خوش ہو جاتا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ باغوں ہی میں لوٹ لگائیں۔ غلہ کی گرانی سے جو حشر ٹوٹا تھا وہ آم کی ارزانی سے دور ہو گیا۔ اب غریب غربا دو وقتہ آم ہی آم چکھتے ہیں۔ ہمہ شما بھی روٹی اور گوشت کے ساتھ انبہ شیریں پر چاقو تیز کرتے ہیں، لیکن حضرت جو لوگ باغوں میں آم کھا رہے ہیں، ان کی بدمزاجی پر شیطان کی پھٹکار۔ آم تو گلی کوچوں میں پٹے پڑے ہیں۔ ٹکے سیر نہیں ٹکے ہزار لگا دیے، لیکن جہاں کسی بھلے مانس نے راہ چلتے کوئی آم اٹھا لیا اور بس چمٹ پڑے۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ یہاں سے کوئی چار کوس پر ایک مسافر میدان میں راہ راہ چلا جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک کانا کھدرا آم ٹپ سے زمین پر ٹپک پڑا۔ مسافر کو کیا معلوم کہ کون اِدھر اُدھر تاک رہا ہے۔ دیکھا تو سناٹا، چپکے سے آم اٹھا لیا۔ لیکن۔ ع۔ مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے، اٹھانا تھا کہ دو گنوار دل لٹھ کاندھے پر ڈالے۔ مار سارے کا، مار سارے کا، کرتے ہوئے نکل آئے۔ کھڑبڑ کھڑبڑ، مسافر نے آم جھٹ زمین پر پٹک دیا، لیکن ایک گنوار نے آتے ہی بے نقط سنانا شروع کیں، اور دوسرے نے

گھونستا تانا۔ مسافر بھی چھتری آدمی، آگ ہوگیا، اور مارے غصّے کے بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ ایک دفعہ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑھ کے جو ایک چانٹا دیتا ہے، تو ایک گنوار لڑکھڑا کے لڑھکنیاں کھاتا ہوا دھم سے زمین پر۔ دوسرے نے جو یہ کیفیت دیکھی تو لٹھ تانا۔ لٹھ کا تاننا تھا کہ راجپوت بغلی ڈدپ کر جا پہنچا، اور ایک آنٹی جو دیتا ہے، تو حضرت چاروں شانے چت۔ جیسے گوں کو کوئی شخص بھیتیسے پر سے لڑھکا دے۔ ارا ارا دھوں، ہات تیرے کی! پھر اٹھا، پھر چھتری نے اڑنگا دیا تو دھم سے زمین پر آرہا۔ دوں دھوں، ہات تیرے کی۔

الغرض ایک گنوار تو چانٹا کھا کر، اپنا سا منھ لے کر رہ گئے، اور دوسرے کا کچومر ہی نکل گیا، اور کل ہم بھی پھنسے تھے۔ شامت جو آئی تو ایک درخت کے سائے میں دوپہریا منانے بیٹھ گئے۔ بیٹھنا تھا کہ ایک نے تڑسے گالی دی۔ اب سنیئے کہ گالی تو دی ہم کو لیکن ایک پہلوان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ سنتے ہی چمٹ گیا۔ اور چمٹتے ہی کولے پر لادا، اور لادتے ہی زمین پر ٹپکا، تو دھاک سے گرے۔ مگر منھ کے بھل۔ پہلوان تو داؤ پیچ سے واقف، معاً چھاپ بیٹھا، اور فوراً ہنستے گانٹھ لیے، اور ہل سینگڑا باندھ کر آسمان دکھا دیا۔ اور اپنے شاگردوں سے کہا کہ چڑھ جاؤ پیڑ پر، اور آم، پتے، بور، ٹہنی، جو پاؤ توڑ توڑ کر پھینک دو۔ پیڑ نوچ ڈالو۔ لیکن لوگوں نے سمجھایا کہ نا استاد جانے دو۔ اجی گالی دینا تو اُن کا ادنے سا کام ہے۔ یہ تو ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں۔ یہ اسی لائق ہیں کہ خوب دھنیں۔

آزاد : وجہ، آخر کوئی وجہ تو دُھنے کی بیان کیجیے۔ اے صاحب ایسا نہ کریں تو باغ بھر مسافروں ہی کے لیے وقف ہو جائے۔ ایک ایک مسافر پیڑ کا پیڑ مع جڑ اور پھننگی کے چٹ کر جائے۔ اور ڈکار تک تو لے نہیں۔ آپ تو سمجھے کہ یہ ایک آم پر کٹ مرا، مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ایک ہی ایک کر کے ہزار ہوتے ہیں۔ اس تاکید اور احتیاط پر تو یہ حال ہے کہ ہزاروں آم مسافر لوگ نوش جان کر جاتے ہیں، اور جو کہیں اتنی تو تو میں میں نہ ہو تو معاذ اللہ! خدا جانے کیا ستم برپا ہو۔ باغ والا تو پلٹ ہی جائے۔

ظرّاف

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں، کہ ایک مرد آدمی اپنے لڑکے کو گودی میں لیے ہوئے، تھپکی دے دے کر سلا رہا ہے، اور بہلا رہا ہے کہ آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا۔ میرے بالے کو گود سلا کیوں نہ جا۔ میاں آزاد ایک دل لگی باز آدمی، قریب جا کر اس سے پوچھتے کیا ہیں۔ کیوں میاں! یہ تمھاری گود میں کس کا پلّہ ہے۔ وہ بھی حاضر جواب آدمی جیسے ہی انھوں نے پو[illegible] ہے، ویسے ہی اس نے کہا کہ مت بھونک پلا

پڑتا ہے۔ ڈورئیے کا انگرکھا پہن لیا، اور چلے مشیخت پناہ بن کر۔ بڑے نستعلیق پیدا ہوئے ہیں۔ میاں آزاد کی باچھیں کھل گئیں، کہ خیر سے ایک ظرّاف تو ملا۔ فوراً ہاتھ ملایا گلے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا، اور کہا یار اس وقت تمہاری حاضر جوابی سے جی خوش ہوگیا۔ واللہ خوش مذاق آدمی ہو۔ کیوں نہ ہو استاد۔ ے اب چلو ذرا اپنے شہر کی ہمیں سیر تو کرالاؤ۔ کچھ عجائب و غرائب، کچھ حسن و جمال، کچھ علمائے باکمال، کا ذکر مذکور فرمائیے۔ ہم غریب الوطن مسافر ہیں:

خسرو غریب ست و گدا افتادہ در شہر شما ،

باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

ظریف : ہم تاڑ گئے۔ ہم بھانپ گئے۔ شہر کے باہر دیکھئے گا لطف یا اندر ؟

آزاد : جہاں جائیے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

ظریف : سنیے قبلہ! اس شہر مینو نزاد میں ایک محلّہ ہے خوش سواد' محلہ کا ہے کو مکان ہے بلکہ مکان کیا باغ جنان ہے۔ پھر جہاں جنان ہو، وہاں حور کیوں نہ ہو۔ لیکن حور دور از قصور ہے۔ دشمن صبر و شکیب ملائک نظر فریب۔ مگر مجال کیا کہ کوئی تاب نظارہ لا سکے۔

آزاد : پھر کب ؟

ظریف : کل شام کو جھٹپٹے وقت۔

آزاد : اچھا رخصت۔

ظریف : فی امان اللہ!

میاں آزاد کی رگوں میں خون کے عوض پارہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھر ایک جگہ ان کو چین کہاں کبھی اس محلے میں کبھی اس محلے میں، جو طرفہ باولے کتے کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ شب کو سواروں کے پاس بستر جمایا۔ بسیرا لیا۔ صبح تڑکے گجر دم اٹھے، اور رواں۔ پہنچے ظراف کے مکان پر۔ کیوں حضرت اب لمبی تانے پڑے سویا ہی کیجیے گا۔ یا اٹھیے گا بھی ؟ یا الٰہی!

شب نیمہ گذشت و صبح سر زد   اے مردِ خدا بخواب تا کئے

کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو بھئی، الٰہی خیر! واہ رے ماچا توڑ، اہو ہو ہو، کیا وقت بہار ہے۔ اور کس جوبن پر سبزہ زار ہے۔ اے غافلو اٹھو! یہ وقت خواب نہیں۔ عالم بہار ہے۔ نسیم سحری عنبر بار ہے۔ یہ پڑے خرّاٹے لیتے ہیں۔ بارے میاں ظراف کلبلا کر اٹھے، اور پھر دھم سے چھپر کھٹ پر

ایں، ماشاء اللہ میاں خدا کا نام لے کر اٹھو تو کھڑے ہونا، جھپاک سے، شاباش ہے، نیم خیز ہو کر پھر لڑھک رہے۔ تب تو میاں آزاد نے ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ مشفق! مشفق! اجی مشفق۔ یہاں سات بج گئے۔ اٹھے مگر آنکھیں نیم باز۔ پھر کھٹ سے پائنتی کی طرف سر کر کے پڑ رہے۔ اتنے میں ان کے دو چار دوست آشنا اور آئے۔ اللہ اللہ ہم دو کوس سے آئے، یہاں ابھی چھپر کھٹ بھی نہ چھوٹا۔ بھئی بڑا سونے والا ہے۔ اُف فوہ! کچھ ٹھکانا ہے۔ ہم نے غسل کیا، حقہ پیا، دو چپاتیاں کباب کے ساتھ کھائیں، منھ ہاتھ دھویا کپڑے پہنے، ان سب کو ان کے گھروں سے لیا، پو قدمے خراماں خراماں، یہاں تک آئے، یہ ابھی خفتن ہی کا صیغہ گردان رہے ہیں۔

دوسرے نے کہا: اجی ان پر پانی ڈالیے، یاران سرپل نے منھ پر چھینٹے دینے شروع کیے۔ کسی نے کان میں پانی ڈالا۔ کسی نے بستر پر۔ تب تو حضرت کلبلائے، اور انتہا کے جھلائے۔ دیکھو دیکھو! ہائیں ہائیں! نہیں مانتے۔ واہ اچھی دل لگی نکالی ہے۔ لگے صلواتیں سنانے۔ اے صاحب ذرا آنکھ تو کھولیے۔ نہیں کھولتے، آپ کا کچھ اجارہ ہے۔ دیکھیے یہ میاں آزاد تشریف لائے ہیں۔ بے حمیتی بھی تو کتنی، اٹھیے! ادھر مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ ان سے تو ملیے۔ یار عزیز! ع۔ نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے" سُوسُو کے نحوست پھیلا رکھی ہے۔

مولوی صاحب : اجی حضرت!

ظراف : بھئی دق نہ کرو ہمیں سونے دو۔ واہ لائے وہاں سے، اجی حضرت یہاں مارے نیند کے بُرا حال ہے، آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ بس اب ہم سے نہ بولیے گا۔ آپ کو تو کچھ کرنا نہیں ہے۔

آزاد : یا حضرت کورنش ہے!

ظراف : اور سنیے یک نہ شد دو شد۔ آپ اور آئے وہاں سے جان کھانے۔ سویرے سویرے آپ کو بلایا کس نامعقول نے تھا۔ بھلے مانس کے مکان پر جانے کا یہ کون وقت ہے۔ بھلا تڑکے تڑکے مستعد۔ کچھ بندہ آپ کا قرض تو نہیں چاہتا ہے۔ چلیے بس بوریا بدھنا اٹھائیے۔ تڑکا ہوا اور مستعد۔ کہیں اور جگہ نہیں ملتی شاید (آنکھیں کھول کر) اخاہ آپ ہیں؟ معاف کیجیے گا حضرت آزاد میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی۔

مولوی صاحب : میں بھی مجرا عرض کرتا ہوں کہیے خاکسار کی آواز تو پہچانی، یا کچھ میں میکھ ہے؟

ظراف : اخاہ جناب مولانا ہیں تسلیمات عرض ہے۔ معاف فرمائیے گا میں اپنے آپے میں نہ تھا۔

مولوی صاحب : اے حضرت اتنا بھی نیند کے ہاتھ بک جانا کیا، بھلا کوئی بات بھی ہے۔ آٹھ بجا چاہتے ہیں، اور آپ پڑے سو رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا کل رات جگا تھا۔ خیر بندہ تو اب رخصت

ہوتا ہے ریل کا وقت قریب ہے، آپ حکیم صاحب کے نام خط لکھ بھیجیے گا، مگر ابھی ابھی۔ ہاں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ کہیں پھر نہ لڑھک رہیے گا۔ آپ کی نیند سے ہم ہارے۔ معاذ اللہ! لے اب رخصت۔

ظرّاف : بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

سب صاحبوں کو خدا کو سونپا۔

لفافہ کیا شیطان کی آنت ہے

ظرّاف : اور باتیں تو پیچھے ہوں گی۔ پہلے آپ اس بات کا جواب دیجیے کہ آپ کھانے دانے سے تو فراغت کر کے آئے ہیں نہ؟ یا یہاں ہی ڈھئی دیجیے گا۔ آج ماما علیل ہو گئی ہے، اور گھر میں کچھ طبیعت ناساز ہے۔ بندے نے روزے کی نیت کی ہے۔ آپ بھی روزہ رکھ لیں۔ خوش روزے کا خوش روزہ، اور اجر کا اجر، اور پھر حکمتِ عملی کی رو سے بھی روزہ جائز ہے۔ ع۔ چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔

آزاد : ایسے خوش روزے پر تین حرف۔ اجر کی یہاں خواہش نہیں، اللہ میاں ہمیں یوں ہی بخش دیں گے اور حکمت کو آپ گل حکمت کر رکھیے۔ اچھی سنائی۔ واللہ تم بڑے دل لگی باز آدمی ہو۔

ظرّاف : جی، تو کہیں دل لگی کے بھروسے بھی نہ رہیے گا، ہاں بندہ کھرا آدمی ہے۔ اہو ہو ہو۔ خوب یاد آیا مولوی صاحب خط لکھنے کو کہہ گئے ہیں۔ خیر دو پیسے کا یہ بھی خون سہی۔ کل بھی روزہ رکھنا پڑا۔

آزاد : ہم تو آپ کے خیر خواہ ہیں۔ وہ تدبیر بتائیں کہ ٹکے کے عوض میں پیسا ہی صرف ہو، مگر ڈبل۔

ظرّاف : وہ تدبیر کیا ہے بھئی، ذرا بتایئے تو، ہم بھی سن رکھیں، داشتہ آید بکار۔

آزاد : اجی اب پیسے والے ٹکٹ جاری ہوئے ہیں۔ پوسٹ کارڈ، لفافہ، اور خط سب ایک میں۔ ایک طرف مطلب لکھیے، دوسری جانب لفافہ، کوئی ایسی ہی پوشیدہ بات لکھنی ہو تو مجبوری ہے، ورنہ ایک پیسا کافی ہے۔ چار دمڑی کا پیسا ڈال دیا، اور خط روانہ کیا۔

ظرّاف : واللہ! ارے میاں۔ ایک ڈبل کا خط، بھئی انگریز بڑے حکمتی ہیں۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ وہ وہ ایجادیں کیں کہ عقل خود دنگ ہے۔ کلیں وہ ایجاد کیں کہ واہ جی واہ! فوٹو گراف میں وہ حکمت نکالی کہ سبحان اللہ ایک روپیہ دیجیے، دم کے دم میں تصویر لیجیے۔ کیوں صاحب وہ پوسٹ کارڈ کہاں بکتے ہیں؟ ہم ابھی منگوائیں گے۔

آزاد : پوسٹ کاڈ نہ کہیے، پوسٹ کارڈ کہیے، ڈاکخانہ میں ملیں گے۔

ظرّاف : روشن علی! روشن علی! ڈاکخانہ سے جا کے ایک آنے کے پوسٹ کارڈ لے آؤ۔
روشن : (مسکرا کر) میاں میں دیہاتی آدمی ہوں۔ انگریجی نہیں پڑھا ہوں۔
ظراف : ارے بھئی تم کہنا کہ حضور! وہ لفافے دیجیے جو پیسے پیسے بکتے ہیں، اور جس میں خط اور لفافہ دونوں ہوتے ہیں۔ جا جھٹ سے کتّے کی چال جانا، اور بلّی کی چال آنا۔
روشن : اجی مجھ سے کہیے تو میں گدھے کی چال جاؤں، اور بس کھوپڑے کی چال آؤں وہل میاں ڈاک والے مجھ کو پاگل بنائیں گے، اور تم تو ہو ہی۔ جس نے جو کہہ دیا مان لیا، بھلا آج تک کبھو پیسے کو پپھاپھا (لفافہ) ملا ہے۔
ظرّاف : ابے مردود تجھے اس حجت سے کیا واسطہ ہے۔ بھئی کیا زمانہ ہے آدمی وہ بھی ملا منطقی۔
روشن : (تھوڑی دیر کے بعد) لو میاں لے آیا' سچ کہتے تھے۔ پل پپھا پھا کیا کھلونا ہے۔
ظرّاف : لاؤ دیکھوں تو۔ واہ واہ واہ۔ اہاہا ہا، اہو ہو ہو، کیا بات نکالی ہے کہ بس۔ قلم دوات لاؤ، جلد لاؤ ابھی لاؤ، ارے لایا؟ پہنچا، جلد قدم بڑھا، چلا کہ میں پہنچوں؟

روشن جو جلدی جلدی دوڑے کہ میاں ٹھوکیں نہیں، تو کیچڑ میں پاؤں پھسلا اور دھم سے وہ گرے گڑ گڑ۔ کمبخت گڑ جاویں نابکار، تجھ پر خدا کی مار۔ ٹانگ کی ٹانگ ٹوٹی اور اوپر سے گالیاں کی گالیاں سنیں۔ بکری کی جان گئی کُل کھانے والے کو مجا (مزہ) نہ آیا۔ چل بیٹھ دور ہو میرے سامنے سے میں خود لے آؤں گا۔ میاں ظرّاف جھپٹ کے قلم دوات لائے، اور بڑی خوشی سے لکھنے بیٹھے۔ اب ذرا دل لگی دیکھیے۔ حضرت نے لکھنا شروع کیا۔

بجناب فضیلت انتساب، عُمدۃ المحققین زبدۃ المدققین، مجمع کمالاتِ صوری و معنوی، واقفِ السنۂ پہلوی دوری، دبیرِ نکتہ داں، بلیغ، طلیقُ اللساں، گلِ سرسبزِ بوستانِ فصاحت، کدیورِ گلزارِ بلاغت، مسیح الزماں، سحبانِ گیہاں، افصح الفصحا، ابلغ البلغا، اکمل الکملا، المشہور فی المشارق والمغارب، زندہ دلوں کی جان ورد ح، المعزز من ممدوح، خلیل باصفا، دوستِ باوفا، مہرِ سپہرِ نکتہ رانی، افشاں جبینِ خوش بیانی، رد کشِ بوعلی سینا، حضرتِ حکیم مولانا مفتی مسیح الزماں خان بہادر مادام شموس ظلالکم لاسعۃ اِلیٰ النشور۔ بعد تسویغِ لوازمِ تعظیم، و تبلیغ مراسمِ تسلیم، و تفہیم، کہ در خورِ ما فدیانِ عقیدت شعارست۔ معروضِ رائے فیض انجلائے، ارے! لاحول ولا قوۃ، یہ تو پیسا ہی غارت گیا۔ مطلب خاک نہ نکلا۔ اب لکھیں کہاں، جگہ تو باقی ہی نہیں۔ بُری ٹھہری۔ مفت میں ایک پیسا گیا گزرا۔
آزاد : چلو جانے دو۔ اب غم کاہے کا ہے۔ دوسرے پر لکھیے۔

ظرّاف : (بہت خوب کہہ کر لکھنے بیٹھے تو لکھتے کیا ہیں کہ) حضرت طویل القاب، اور لمبا چوڑا آداب، اور تکلف کی باتیں اور رنگین نویسی، اور منشی گری، اور نوک جھونک، اور فصاحت و بلاعت سب برطرف۔ ہم نے طول نویسی کو اب طلاق دے دیا۔ اختصار مد نظر ہے اور میاں۔ ؎

کار دنیا کسے تمام نہ کرد   ہر چہ گیرید مختصر گیرید

بس اب دو پٹی باتیں کریں گے۔ تو چل میں آتا ہوں۔ لوٹیا فرستاد، دھوتی رسید۔ وہ دل کے ولولے، وہ جوش و خروش، کی باتیں، وہ رمز و کنایہ کی گھاتیں، سب کو برطرفی کا پروانہ دیا۔ وہ بیگھے بھر کے آداب، وہ دس دس کھیت کے برابر القاب، وہ مزاج پرسی، وہ دعائے خیر، سب پر اوس پڑ گئی۔ وہ کچا چٹھا کہہ سنانا، چینگی بوٹوں کا حال بتانا۔ کچ بچ انڈے بچوں کی خیر و عافیت، سب روانہ ہوئے کالعدم کالعدم کالعدم، اب ہم بالکل مختصر لکھیں گے۔ قسم کھائی ہے کہ جب قلم اٹھائیں گے۔ دس سطروں سے زیادہ نہ لکھیں گے، نہ لکھیں گے۔ بھئی قسم قرآن کی نہ لکھیں گے۔ اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، چاہے آسمان کا آسمان پھٹ پڑے، چاہے جو ہو سو ہو۔ بس قولِ مرداں جاں دارد۔ اور اب آپ بھی اس پرانے فیشن کو چھوڑ دیجیے۔ ہم تو صرف مطلب سے مطلب رکھیں گے۔ حشو و زواید دور پچھے دور۔ اطناب جمل سے طبعِ خاکسار ملول۔ وہ خط لکھوں کہ عرض ہو نہ طول۔ خیر اب حاصل مطلب تو سنیے، وہ یہ کہ مولوی۔ ارے! آگے آیت یہ خط بھی گیا گزرا۔ اب جگہ تو تل رکھنے بھر کی بھی باقی نہیں۔ لاحول ولا۔ اچھی کفایت پر کمر باندھی تھی۔ لیجیے بات کرتے کرتے دو پیسے کا خون ہو گیا، اور مطلب نہ نکلا۔ اس سے دو پیسے کا ٹکٹ لاتے تو واللہ ہے کھرّے کا کھرّا لکھ ڈالتے، اور نہیں تو کیا۔

آزاد : میں دیکھوں تو آپ نے لکھا کیا ہے۔ اللہ اکبر! یہ پوا ڑا، کچھ ٹھکانا ہے۔ یہ تو آپ نے اپنی چٹھی کا کچا چٹھا کہہ سنایا ہے۔ اے صاحب مطلب سے مطلب رکھیے، بے ہودہ نہ بہت بکیے۔ خیر اب سے آئے گھر سے آئے۔ اب بسم اللہ کر کے تیسرے خط کو داغی کیجیے، مگر ذرا شبدیزِ قلم کو روکے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ اب کی پھر جولانی پر آ جاتے، اور منھ کے بھل گر کے وہ ٹھوکر کھائے کہ بول ہی جائے۔ بس خاص مطلب لکھو۔ یہ بحرِ طویل، واہی تباہی، خرافات واہیات مجنوں کی سی بڑ، آپ کیا لکھ مارا کرتے ہیں۔ اب کی سنبھل کے لکھیے وحشت بھی تو کتنی۔

ظرّاف : اچھا صاحب یوں سہی اب کی خاص خاص باتیں لکھوں گا، بس حشو و زوائد پر طلاق۔ (لکھنے لگے)۔

جناب فضیلت انتساب، مولانا محمد مسیح الزماں خان بہادر مد ظلکم العالی الی یوم النشور، سپس تسلیم،

بعدِ عجز و الحاح و ہزاراں ہزار خشوع و خضوع، التماس می رود کہ احوال ایں جا بفضلِ ایزد منّان۔ مقرونِ صحت ست و اعتدالِ مزاج از بارگاہِ صمدیت نیکو خواست گار۔ ماحصل اس تحریر کا یہ ہے کہ اختصار کے ساتھ لکھوں جس میں ایک ہی پیسا صرف ہو، کل باتیں بالتفصیل و التوضیح، لکھنا خلافِ عقل و حکمت، و منافی آدابِ ڈاک خانہ و مصلحت و کفایت ہیں۔ اب اصل حال عرض کردوں، قبلہ و کعبہ کو گنجائش خیالات بہت اس پیسیلے لفافے پر بہت خیالات بیشمار کا لکھنا آب دریا بکوزہ پیمودن ست و آفتاب بگز، تاہم جس قدر لکھ سکتا ہوں اس سے دریغ نہ کروں گا۔ مگر میں لکھوں کیا کاغذ کو جو دیکھتا ہوں تو ایک رخ سب کا سب لپ گیا۔ دوسرا رخ لکھنا پڑا۔ مگر۔ ع۔ عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت " ابھی اب مطلب سنو! باتیں ہوا ہی کریں گی۔ واللہ اس وقت جی چاہتا ہے، کہ قلم کو کڑکڑا دوں۔ میں تو توسنِ خامہ کو ایڑ لگاتا ہوں۔ اور جولانی طبع دکھاتا ہوں، پھر اس میں، ع، ہرچہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم"، مگر یہ ڈوبی وہ ڈوبی، چل چل چل چل۔ اے لو وہ تہ پر پہنچ گئی۔ ارے! ارے غضب! لو صاحب تین پیسے ہوئے، یہ سب میاں آزاد کے نام لکھے گئے۔ میرے تین پیسے بات کی بات میں آپ کی نذر ہوئے۔ حضرت یاد رکھیے گا۔ آپ چاہے دیں ٹکا نہیں، حسابِ دوستاں در دل۔ لیکن صلاح حضور ہی نے دی تھی۔

آزاد : اے حضرت ہوش کی باتیں کیجیے۔ عقل کے ناخن لیجیے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ تاریخ فرشتہ[1] خط میں لکھ کر بھیج دیجیے یہ خط ہے یا طومار، یا طولِ عمل، یا شیطان کی آنت۔ خط کیا رانڈ کا چرخہ ہے۔ خلاصہ، ماشاء اللہ اتنے بڑے ہوئے خط لکھنے تک کی لیاقت نہیں۔ چلیے بس چپکے ہو رہیے، کہ دیا، سمجھا دیا، پڑھا دیا، کہ بس مطلب سے مطلب رکھو۔ آپ نے جو القاب شروع کیا تو خط ہی لیپ ڈالا۔ ایسے خط کا منھ کالا۔ تم لوگ پرانے منش کو نہ چھوڑو گے نہ چھوڑو گے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں آخر اس اتنے بڑے القاب کی کیا ضرورت تھی، کہ دبیر نکتہ داں، اور بلیغ طلیق اللساں، اور افشاں جبیں، حماقت اور مہر سپہر بلادت و جہالت، یہ خط ہے یا کسی کتاب کی تقریظ، اور پھر دعا بھی وہ دی، جس کے لکھنے کو دس تختے چاہئیں۔ مادام شموس ظلالکم لامعۃ۔ اس پر اکتفا نہیں۔ اس میں الیٰ یوم النشو، اور بڑھایا اے واہ بے ناداں، لاحول ولاقوۃ۔ واللہ تمھاری صورت سے نفرت ہوگئی۔ بس بے تکے پن کا آپ پر خاتمہ ہے۔

ظراف : واہ ری قسمت، تین پیسے گرہ سے گئے اور اُلّو کے اُلّو بنے، اور میاں آزاد الگ للکارتے

---

[1] "تاریخ فرشتہ" ہندوستان کی مشہور و مستند تاریخ مصنف ابوالقاسم فرشتہ۔

لے۔ سچ ہے یکے نقصانِ رایہ دیگر شماتتِ ہمسایہ۔ اس ہدایت کے صدقے کہ القاب نہ لکھو۔ آداب کو توپ دو۔ مزاج پرسی کو چھپر پر رکھو۔ ماشاء اللہ۔ بھلا آپ ہی لکھیے تو جانیں لیکن۔ قبلہ اب ایک ہی ٹکٹ رہ گیا ہے۔ خدا کے لیے بندۂ درگاہ پر رحم کیجیے گا ذری۔ ورنہ روشن علی کو پھر ڈاکخانے دوڑانا پڑے گا۔ بسم اللہ پھر قلم اٹھائیے، دیکھیں تو سہی آپ اس ذرا سے کاغذ پر کل مطلب کیوں کر لکھتے ہیں، اس کے لیے تو مانی و بہزاد، اور کامل فن استاد چاہیے جو پستے پر ہاتھی اور شیر اور گینڈے اور چیتے کی دس دس تصویریں بنا دیں۔

آزاد : آپ اپنا مطلب خاص مجھ سے فرما دیں تو پھر ابھی لکھوں، میں کچھ سڑی تو ہوں نہیں آپ کی طرح۔

ظرّاف : میرا مطلب سنیے! یہاں خیریت۔ آپ کی خیریت مطلوب۔ مولوی ضامن علی صاحب خدمت شریف میں پہنچے ہوں گے، ان کو اس تیس روپے کی اسامی پر نوکر رکھا دیجیے، آپ کا عمر بھر احسان ہوگا۔ اور دعائے خیر دوں گا۔ یہ گھاتے میں ہے۔ خیر و عافیت مزاج سے اطلاع بخشتے رہیے۔ بس اسی کو خوب بڑھا دیجیے۔

آزاد : معاذ اللہ۔ بڑھا دیجیے ہی پھر کہا۔ پھر وہی جھک مارا۔ یہ نہ کہا کہ بس اسی قدر مطلب ہے۔ اس کو اختصار کے ساتھ لکھیے، خدا کی مار اس عقل پر۔ لاؤ لفافہ دیکھو یوں لکھتے ہیں۔

حضرت سلامت۔ مولوی ضامن علی صاحب پہنچے ہوں گے۔ وہ تیس روپیہ والا عہدہ ان کو دلوا دیجیے تو احسان ہوگا۔ خیریت مزاج کا طالب ظرّاف، لو دیکھا، اتنی سی بات کو اس درجہ طول دیا کہ تین تین خط لکھے اور چاک کیے، اور دونوں رخ لیپ ڈالے۔ لاحول ولا قوۃ، آدمیت نہ آئی۔

ظرّاف : معقول یہ اچھا بریدہ دم کٹا۔ لنڈورا خط ہے اور سچ پوچھو تو خط کیا دیوانِ غنی ہے۔ جس میں ایک دو دو شعر کی غزلیں لکھی ہیں۔ اچھا اب لفافہ بھی تو لکھیے۔

آزاد : لائیے پتا بتائیے!

جبلپور۔

جناب حکیم مسیح الزماں بہادر۔

لیجیے لفافہ ہو گیا۔

ظرّاف : دیکھوں! ماشاء اللہ۔ اجی بعونہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اجی لفافہ ہذا اور شہر جبل پور کہاں ہے۔ بملاحظۂ اشرف واقدس جناب مستطاب، حضرت حکیم مسیح الزماں خاں بہادر کہاں ہے؟ بوقتِ

نیک درآید کہاں ہے؟ تاریخ کہاں ہے؟ میرا نام کہاں ہے؟

آزاد : آپ کا نام بے وقوفوں کی فہرست میں ہے۔ تاریخ کتب فروش کی دکان پر۔ اگر بوقت نیک نہ لکھیے گا، تو شاید خط نہ پہنچے گا۔ کیوں؟ واہ ری عقل۔

ظرّاف : اچھا صاحب تو خط میں ابھی گنجایش ہے۔ لائیے میں بھی دو چار سطریں بڑھادوں۔

حضرت نے جو لکھنا شروع کیا تو لفافے کی طرف بھی لکھ ڈالا۔ اور لکھتے کیا ہیں کہ:

تھوڑے لکھنے کو بہت سمجھیے گا۔ اختصار کو گستاخی پر محمول نہ فرمائیے گا۔ بندہ نیاز مند قدیم اور نمک پروردہ ہوں۔ اب کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی:

از دست گدائے بینوا نایدہیچ   جز آنکہ بصدق دل دعای بکند

یہ شعر کسی فصیح شاعر کا ہے۔ مگر مصداق حالِ خاکسار۔

آزاد : ہائیں، ہائیں، ہائیں! غارت کیا نہ اس کو بھی۔

ظرّاف : کیوں؟ کیوں آخر میں نے کیا کیا۔ جگہ باقی تھی پیسا پورا تو وصول کرنے دو۔

آزاد : جی پیسا نہیں ایک آنہ وصول ہو گیا۔ اس کی بھی خبر آگئی۔ اب اور منگوائیے۔ ایک ہی طرف مطلب لکھا جاتا ہے، دوسری طرف فقط لفافہ۔ آپ سے تو عرض کر دیا تھا ہم نے۔

ظرّاف : لاحول ولاقوۃ۔

روشن : میاں اب میں نہ جانے کا۔ آپ ہی ڈاک خانے جائیں، میں یہاں گھر رکھاتا ہوں۔

ظرّاف : (ہاتھ مل کر) توبہ توبہ توبہ!

میاں آزاد اپنے شفیقِ نیک نہاد و فرخ نژاد ظرّاف کو ساتھ لیے ہوئے سیر کو چلے۔

آزاد : نئے شہروں میں جب جائیے عجائب و غرائب ضرور دیکھیے۔ خدا کی خدائی ہمارا تماشا۔ یوں ہی تو کامل تجربہ ہوتا ہے۔ ع۔ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی" آگرے میں تاج محل[1] دیکھ کر روح خوش ہو گئی۔ مولوی غلام امام شہید نے خوب ہی کہا ہے کہ:

"پھر جو روضۂ نظر آیا، تو وہ سماں آنکھوں میں سمایا، کہ نہ دیدنے" خواب کی آنکھوں سے کبھی

---

[1] مغل شاہنشاہ، شاہ جہاں کا بنوایا ہوا خوبصورت روضہ تاج محل آگرہ میں ہے جو اس نے اپنی بیوی ممتاز محل کی یادگار کے طور پر اس کی قبر پر بنوایا تھا۔ سفید سنگ مرمر کی یہ عمارت دنیا کے عجائبات میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی تعمیر ۱۶۔۶ء میں ہوئی تھی۔

دیکھا، نہ شنید نے خیال کے کانوں سے کہیں سنا۔ الٰہی یہ روضہ ہے یا خلد بریں، آسماں ہے یا زمیں سنہرا کلس ہے یا سورج کی کرن، گنبد ہے یا نور کا مسکن، قبرستان ہے یا روضۂ رضواں، مکان ہے یا جواہرات کی کان۔ جو پتھر ہے جواہرات سے بہتر ہے۔ صبح نے مرمر کے ایسی صفائی پائی، تب سنگ مرمر کی صورت بنائی۔ سنگ موسیٰ کو شعلۂ تجلی نے طور پر جلایا، تب اس درگاہ کے صرف میں آیا۔ کلس کا سایہ دریا میں ایسا رہتا ہے، جیسا برجِ آبی میں آفتاب۔ حوض میں چاند ایسا نظر آتا ہے۔ جیسے دریا میں حباب۔ دیوار میں منھ نظر آتا ہے، گویا آئینہ ہے۔ جلا کیا ہوا۔ گنبد سے دماغ تازہ ہوتا ہے، گویا قرابہ ہے گلاب سے بھرا ہوا۔ صبح کی طباشیر استر کاری کے صرف میں لائی گئی، جواب تک وہی نور کا عالم دکھاتی ہے۔ رات کا مشک، اور شفق کی زعفران، پیس کر گارے میں ملائی گئی، جو آج تک وہی خوشبو دماغ میں آتی ہے۔ آفتاب کے ترنج کا عرق نچوڑ کر ماہتاب کے پیالے میں موتی کی آب سے ملایا تھا، جو چونے میں یہ نور اور ایسی صفائی ہے۔ بہشت کے کافور کو شفق کے ساتھ آفتاب کی کھرل میں پیس کر، صبح کے دامن میں چھانا تھا۔ جو رنگ نے یہ آب و تاب پائی ہے۔ جالیوں کی نزاکت میں عقل کام نہیں کرتی، کہ پتھر کو موم کر کے بال کا قلم پار کر دیا، یا خیال کا جالا سمجھ کر نگاہ کی نوک سے جیسا چاہا کام بنا لیا۔ ہر ایک جالی میں وہ ملاحت ہے کہ دیکھنے میں پنیر کی حالت ہے۔ کاغذ کی وصلی پر حرفوں کا ابھرا پن، تو معلوم بھی ہوتا ہے۔ یہاں پتھر پر پتھر کی پچہ کاری کا نہ جوڑ نظر آتا ہے۔ نہ پیوند۔ اور جوڑ نہ کہیں سے پست ہے نہ بلند، بس شہید بس کر، اب لکھنے کی مت ہوس کر، کلام کو طول ہوا جاتا ہے۔ حاکم کے حکم سے عدول ہوا جاتا ہے۔ سحر بیانی تیری مشہور ہے۔ تیرے قلم کو ہر طرز کی تحریر کا زور اور مقدور ہے، پر فرمائش سے مجبور ہے، کہ رنگین عبارت لکھنے کی اجازت نہیں۔ نہیں تو تجھے کس طرز کی تحریر کی طاقت نہیں، لیکن یہاں بھی عجب کام کیا ہے، کہ سادگی میں رنگینی کا رنگ دکھا دیا ہے۔ سو یہ دوستوں کے سیر کے لیے گلزار ہمیشہ بہار ہے۔ اور حاسدوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوا خار ہے۔ دہلی میں جامع[1] مسجد کی زیارت کرتے ہی ہم نے جناب باری کا شکریہ ادا کیا، اور معاً نماز پڑھی، اور سر بسجود ہوئے۔ جے پور گئے تو صلِّ وجلِّ بس صفائی کا اس شہر پر خاتمہ ہے۔ اس کی صفائی کی تو قسم کھانی چاہیے۔ ایسا نادر

---

[1] جامع مسجد دہلی شاہ جہاں بادشاہ نے ۵۲-۱۶۵۱ء میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ دنیا کی عظیم الشان خوبصورت مساجد میں شمار ہوتی ہے۔

اور دلکش شہر خواب میں بھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ ایک ایک مکان نمونہ جنان، ایک ایک محلہ غیرت گلستان ہے۔ واہ کیا بات ہے۔ باغ ارم بھی اس کے مقابلہ میں مات ہے۔ بنارس سبحان اللہ:

از بنارس نر دم معبدِ عام ست اینجا ہر برہمن پسر لچھمن و رام ست اینجا

صدہا مندر، جو ہے سر بفلک کشیدہ۔ آسماں سے باتیں کرتا ہوا۔ صبح و شام گھنٹہ ٹھنا ٹھن بج رہا ہے۔ کوئی پجاری دیوتا کو سج رہا ہے۔ کہیں نوبت، کہیں نقارہ، پنڈتوں کے پو بارہ، جب دیکھو دریائے گنگ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ ایک ایک بچہ وہ پیرتا ہے کہ بارک اللہ! کوئی گھڑی لگاتا ہے، کوئی شیر کی پیرائی سیکھتا ہے، کوئی ملاحی چیر رہا ہے۔ جس گھاٹ پر جائیے۔ وہ چہل پہل کہ میلا سا جما ہوا رہتا ہے گہرے گھاٹ کشتی پر کشتی آتی ہے، اور ڈونگی پر ڈونگی جاتی ہے، اور کلکتہ تو بس دید ہے نہ شنید ہے۔ اک دارو ے مرگ تو وہاں نہیں، باقی چڑیا کا دودھ تک موجود۔ ہفت اقلیم کی نعمت وہاں لے لیجیے، مگر ہاں ذرا گرانی ہے۔ پھر بڑے شہروں میں گرانی تو ہوا ہی چاہیے۔ گوشت گراں، ترکاری گراں، مکان کا کرایہ گراں، آدمی گراں، بس انتہا ہے اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ بمبئی بھی قابل دید ہے۔ ایسا بندر نہ دیکھا ہوگا۔

ظرّاف: واللہ یہ باتیں سُن سُن کر جی بے اختیار بھر بھر آتا ہے، کہ ابھی ابھی چلیں، مگر سمندر کا سفر تو خوب بات ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ:

بدریا در منافع بیشمار ست اگر خواہی سلامت بر کنار ست

آزاد: خیر صاحب، یہ باتیں ہوا ہی کریں گی۔ پہلے آپ اس شہر کی تو سیر کرا لائیے۔

ظرّاف: اچھا پھر آپ بھی کیا یاد کیجیے گا۔ آئیے چلیے! (دونوں کے دونوں ساتھ چلے)۔ دیکھیے یہ اسکول ہے۔

اتنے میں دو چار لڑکے اسکول سے نکلے۔ سب ہم سن اور کم سن، مگر ان میں سے ایک بڑا شریر، انتہا کا متفنی، کسی پر دھپ جمائی، کسی کو چپت لگائی، کسی کے کان گرما دیئے، اپنے سے ڈیوڑھوں دونوں تک کو چپتیاتا تھا۔ اور کالا کویلا، چیچک رو بد قطع، بد وضع، کپڑے سب پھٹے پھٹے پرانے دھرانے۔ میلے کچیلے، روشنائی سے آستین اس کی صورت کی طرح سیاہ، ہاتھ پاؤں پر اس درجہ گرد کہ خدا کی پناہ، معاذاللہ! آزاد نے ظرّاف سے پوچھا کہ کیوں صاحب یہ حضرت تو بڑے مرشد پرلے سرے کے بدمعاش ایک ہی گُرگے معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو اپنے سے دونے تک کی خبر لیتا ہے۔ مگر دیکھ لیجیے گا۔ کوئی ان کا بھی گرو پیدا ہو ہی جائے گا۔ کسی روز ٹھونکے جائیں گے۔ بس پھر یہ سب باتیں بنانا بھول

جائیں گے۔ طرّاف نے مسکرا کر چپکے سے کہا کہ میاں خدا کے لیے ان کے منہ نہ لگنا۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ یہ اسکول بھر میں مشہور ہیں۔ جس طرف نکل جاتے ہیں، انگلیاں اٹھتی ہیں۔ دو دفعہ تو چوری کی علّت میں دھرے گئے۔ ایک مرتبہ مار پیٹ کی وجہ سے چالان ہوا۔ کچھ پوچھیے نہ۔ ان کے مارے محلے بھر کا ناکوں میں دم ہے۔ ایسا خدائی خوار تو کوئی دیکھا ہی نہیں۔ ایک روایت سنیے! ایک دفعہ حضرت کو شوقِ شرارت چرّایا، پھر سوچنے اور غور خوض کرنے کی حاجت نہ تھی معاً سوجھتی ہے معاً۔ تو وجہ کیا ان کی شرارت میں کچھ آورد تو ہے نہیں، آمد ہے۔ اس کا ملکہ ہو گیا ہے۔ خیر صاحب فوراً سوچے، ایک پاؤں کا جوتا نکال کر حضرت نے ایک الماری پر رکھ دیا، اور اسی الماری پر ایک طالب علم کی کتابیں بھی رکھی تھیں۔ ان کتابوں پر آپ نے جوتا باحتیاط تمام رکھ دیا، اور تھوڑی دیر کے بعد اسی طالب علم سے کہا کہ، ارے یار ذری اس وقت اُقلیدس تو دینا، شب کو سو رہے ایک شکل بھی نہیں یاد کیا۔ آج ماسٹر صاحب بے طور ٹھوکیں گے اب بچنا محال ہے۔ لاؤ بھائی ذرا بستے سے اقلیدس نکال دو۔ سب نہیں تو کچھ تو یاد کر لیں گے وہ سیدھا سادھا لڑکا:

وہ تو سادہ غریب کیا جانے   اس مزّور کو کیوں کر پہچانتے

چپکے سے اٹھا کہ تحریرِ اقلیدس نکال دے۔ جیسے کتاب الماری پر سے اٹھائی، بس ویسے ہی جوتی منہ پر آئی، اور اچھل کر قریب کے ایک اور طالب علم کے شانے سے چھو کر زمین پر گری تڑ سے، اور کلاس میں فرمایشی قہقہہ پڑا۔ سب لڑکے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ماسٹر صاحب یورپین جنٹلمین وہ الگ چونک پڑے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ان کا چہرہ سُرخ ہو گیا: ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"، بہت ہی جھلا کر پوچھا کہ یہ کس کی جوتی کا پاؤں ہے۔ اب آپ چپ چاپ بیٹھے جغرافیہ پڑھ رہے ہیں۔ گویا ان سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ کانوں کان خبر ہی نہیں۔ مگر ان کا تو درجہ بھر دشمن تھا۔ کیوں کہ یہ سب کو چھیڑا کرتے تھے۔ کسی لڑکے نے اشارے سے جڑ دی کہ حضرت ہیں۔ زور سے چلا کر نہیں کہا کہ ایسا نہ ہو باہر نکل کر گدّے جمائے۔ صاحب نے ان کو میز کے قریب بلایا، اب قلعی کھل گئی۔ حضرت کی قطع مبارک ملاحظہ فرمائیے گا۔ بال بکھرے ہوئے سر پر خاک، بدن پر مٹی، ایک پاؤں میں بوٹ دوسرے میں صفایا۔

ماسٹر : ول دوسرا پاؤں کہاں ٹمارا، دوسرا پاؤں کدّر (کدھر) ؟

جواب : جناب پاؤں تو میرے دونوں مستعد ہیں (پاؤں دکھا کر) لیجیے ایک۔ اور دوسرا۔ بس دونوں ہو گئے یا نہیں۔

ماسٹر : ول جوتا۔ جوتی۔ جوتو ؟

جواب : بہت ہی خاصے۔ جوتا مذکر مردانہ۔ جوتی مؤنث زنانی، اور جوتو، جیسے چمار کہتے پھرتے ہیں کہ جوتو بنوالو جوتو،

ماسٹر : بے حیا بنچ پر کھڑا ہو۔

جواب : (گڑگڑا کر) میں ڈنڈ پیل جوان۔ یہ ریش دراز، اور کھڑا ہوں، بنچ پر۔ نا صاحب! کوئی اور سزا تجویز یئے۔

ماسٹر : اچھا کل کے سبق کو سو بار کاغذ پر لکھ لانا۔

جواب : کتنے کتنے کتنے مرتبہ؟ سو اور سبق کب یاد کروں گا۔ نا قبلہ! کوئی اور سزا تجویز یے۔

ماسٹر : دل ایک درجہ ہم نے گھٹا دیا تمھارا۔

جواب : دیکھیے انصاف کا خون نہ کیجیے، قصور میں کروں، مجرم درجہ ہو، درجے بے چارے نے کیا کیا۔ وہ تو اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

ماسٹر : اچھا آٹھ آنہ جرمانہ (جُرمانہ)

جواب : (اس طالب علم کی طرف مخاطب ہو کر جس بے چارے پر بوٹ گرا تھا)۔ لو بھئی پھر بھنائے کون۔ کہو تو پورا روپیہ ہی نہ لیتے آئیں سمجھے۔ اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا، اور درجہ بھر لوٹنے لگا۔ اب صاحب حیران ہیں آخر یہ سب کے سب ہنسے کیا سمجھ کر، مگر وہ اس روایت کو کیا جانیں۔ خیر جب چھٹی ہوئی تو آپ ہاتھ باندھ کر صاحب کے سامنے کھڑے ہوئے، حضور آپ بجائے میرے باپ کے ہیں۔ استاد اور باپ کا ایک درجہ ہوتا ہے۔ جرمانہ میں نہ دے سکوں گا۔ آپ کل ضرور ضرور یاد کر کے آٹھ آنے ساتھ لیتے آیئے گا۔ بھولیے گا نہیں۔ خیر دوسرے دن آپ جرمانے کے آٹھ آنے ساتھ لائے، تو موٹے پیسے کھٹ کھٹ کر کے میز پر ڈال دیے۔ ایں! یہ کیا؟ حضور پیسے ہیں۔ دِل اٹھنی کیوں نہیں لایا۔ قبلہ و کعبہ یہ شرط نہ تھی۔ اور لطف یہ کہ لائے بھی تو پورے آٹھ گنڈے مگر موٹے پیسے زیادہ چلتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے ایک کتے کی دم میں کپڑا باندھا، اور اس میں چھچھوندر باندھی، اور آگ دکھا دی۔ پھر لطف دیکھیے کہ چو طرفہ کتا ناچتا تھا۔ سگ پا سوختہ آپ نے سنا ہوگا، مگر ان میاں نے دکھا ہی دیا۔ کئی چھپر پھونک دیے۔ کئی دُکانیں جھلس دیں۔ کئی آدمیوں کے کپڑے جلا دیے۔ بستی بھر میں شور تھا، بارے خدا خدا کر کے آگ بجھی، مگر اس بے زبان بے چارے کی جان ہی پر بن آئی۔ اور سنیے! ایک بھلے مانس کے یہاں کہہ آئے کہ تمھارے لڑکے کو اسکول میں ہیضہ ہوا۔ جلدی جاؤ اور ابھی لاؤ۔ ان کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ اس لڑکے کا باپ اور بھائی اور چچا اور ماموں، سب دوڑتے ہوئے اسکول پہنچے

اور عورتوں نے اُٹھ اُٹھ آنسو رونا شروع کیا۔ کوئی سر پیٹتی ہے، کوئی نام لے لے کر پکارتی ہے وہ لوگ جو اسکول گئے تو دیکھتے ہیں کہ لڑکا مزے سے باتیں کرتا ہوا اور طلبا کے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ گلے ملے اور خدا کا شکریہ ادا کیا، آخر کار معلوم ہوا کہ انھیں ذات شریف کی کارستانی ہے۔ انتہائے شرارت یہ ہے کہ اپنے باپ کو ایک مرتبہ نمک کے عوض پھٹکری کھلادی اور جان بوجھ کر۔ طرّہ اس پر یہ کہ بڑے فخر سے آپ نے فرمایا کہ ابا سچ کہنا کیں گھرا چکھا ہوا ہے کیوں نہ کہو گے۔

آزاد: واہ وا یہ تو ایک ہی مرشد نکلے۔

ہے یہ وہ درد کہ جس درد کا چارہ ہی نہیں
واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گزارہ ہی نہیں

صبحی بفروغ دلکشائی ۔۔۔ بگداختہ شب بروشنائی
روشن چو جبین صبح خیزاں ۔۔۔ فیض از درد بام چرخ ریزاں
دریائے حضور موج در موج ۔۔۔ خورشید ظہور اوج در اوج

بارقہ ہفت اختر رہ نوردی۔ افشاں جبینِ کوچہ گردی، ادب آموز وامق و فرہاد۔ میاں آزاد خانہ برباد، لوحش اللہ نے عروس بہار کی جوانی، اور صبح مسرت کی گلفشانی دیکھی تو غنچۂ دل اہتزاز نسیم بہجت سے کھل گیا۔ گویا قارون کا خزانہ مل گیا۔ نقشِ مراد کرسی نشین ہوا۔ تیر دعا بہدفِ اجابت قرین ہوا۔ آرزوئے دلی برآئی۔ منھ مانگی مراد پائی۔ سیر دریا کا مزہ آیا۔ گلگشتِ چمن کا شوق چرّایا۔ چلے تو نوجوانِ چمن محو نازِ نرگس کی چشمک زنی میں لاکھ لاکھ انداز۔ بادِ بہاری صبح خیز، نکہتِ گل عطر بیز، چرخ کہن فرطِ طرب سے رقّاص ہے۔ میاں آزاد کے لیے عشرت خاص ہے۔ زمانہ محوِ خود آرائی، خلق خدا تماشائی، غایتِ مستی سے نسیمِ سحری، لڑکھڑاتی ہوئی چمن میں قدم دھرتی ہے۔ شاخ گل جھوم جھوم کر کورنش پر کورنش کرتی ہے۔ بلبل اگرچہ کاہل نہیں۔ لیکن بقول غنیمت فارسی زبان ہے، زابلی[1]، نہیں۔ مگر رستمِ ہزار داستان ہے۔ طاؤس طنّاز کے زرّیں پر و بال، نیرنگی قدرت حق پر دال، جو عروسِ چمن ہے، ستم کا جوبن ہے۔ قیامت کا چھبن ہے۔ شگفتہ جبیں، نازک آئین، کہیں گل رخاں، کہیں عشق پیچاں، وہ حسنِ برشتہ پر مغرور، یہ رشکِ طرۂ حور، ادھر گلنار، اُدھر سدا بہار، دخترِ زر بیباک، بنتِ العنب چست و چالاک، انگور کی ٹٹیوں سے نوجوانانِ ساغر نوش کی تاک جھانک ہے۔ سر برگ

---

[1] زابلستان، ایران میں ایک علاقہ ہے وہاں کے رہنے والے کو زابلی کہتے ہیں۔ مشہور پہلوان رستم وہیں کا باشندہ تھا۔

کی طراوت، سبزۂ تو دمیدہ کی خضارت، الٰہی یہ کشمیر ہے یا باغ مینو نظیر ہے۔ جو مقام ہے بہشت بہجت، جو شجر ہے طوبیٰ طراوت، گل زمیں ہے، یا زمینِ شعر کی طرح دلکشا۔ نسیم ہے۔ یا مثل آب غزل ہائے رواں، روح افزا:

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک   شرمائے جس سے اطلسِ زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک   ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

پھر جو چشمہ سار نظر آیا، تو آنکھوں نے وہ نور پایا، کہ واہ جی واہ۔ دم تحریر کلکِ سیہ مست، جھوم رہا ہے۔ ناطقہ زبان کو چوم رہا ہے۔ میاں آزاد نے ٹوپا اچھالی، شیخ و شاب نے پگڑی سنبھالی رندان ساغر نوش کو می کی گلابی یاد آئی۔ آزاد چلا اٹھے کہ رندو چلو، فصل بہار آئی۔ اور ایک دفعہ ہی کالی متوالی گھٹا چھائی، بادہ کشوں کی بن آئی، دَور چلنے لگے، قرابے ابلنے لگے۔ رندوں نے دن سے کاگ اڑائے اور چسکی لگائی۔ اب سنیے کہ بیچوں بیچ میں جو بار، اور لبِ چشمہ سار، عشاق زار، اِرد گرد بادہ گسار، چو طرفہ سبزہ زار، اور اشجار پُر بہار، اور دشتِ جنوں خیز میں بہار، نسیم مشک بیز، و عنبر باز، اور دیدار یار کا انتظار۔

آزاد : آج تو یہاں ازدحام عام ہے، مگر جس کو دیکھو رندی آشام ہے۔ کیا تیراکی کا میلہ ہے۔ جیسے دیکھو نقارۂ بادشاہی دشتِ جنوں بجا رہا ہے۔ روح مجنوں و فرہاد کو شرما رہا ہے:

گر جنون آید بسویم رہ بدہ بیگانہ نیست   در خرد پرسد سراغ من بگو در خانہ نیست

ظرّاف : میاں آمد آمدِ یارِ جانی ہے۔ وقت جاں فشانی ہے۔ اجی تیراکی کا میلا کیسا، یہ کچھ اور ہی جھمیلا ہے۔ ان دونوں تو عروسانِ زہرہ تمثال، اور مہوشانِ مشتری خصال، کی چشم فتان، اور موئے میاں، اور گلِ رخسار اور ناز کی رفتار نے ایک عالم کو مفتون کر دیا۔ لیلائے زلف تابدار، و عنبر یار، نے خلق خدا کو مجنوں کر دیا۔ دیکھو یواقیتِ سرشک چشم خونبار سے رواں ہیں۔ طفلِ اشک ہر سو دواں ہیں۔ غشی سی سب پر طاری ہے۔ عقل عاری ہے۔ کبھی اشکباری، کبھی گریہ وزاری کبھی دل کی بے قراری:

نہ اشک ست اینکہ از چشم منِ مہجور می آید
برائے دیدنت شخصے غریب از دور می آید

جب شام ہوئی تو وہ پانچوں سوار نوجوان طرح دار افراس تند خو کو کڑکڑاتے، اور چمکاتے آن موجود ہوئے۔ کالے کوسوں تک بجلی لو کنے اور رعد کڑکنے لگا، اور تاریکی چھا گئی۔ وہ گھنگھور گھٹا کہ الاماں۔ ایک دفعہ ہی دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی، اور تماشائیوں نے نعرۂ فتبارک اللہ احسن الخالقین بلند کیا۔ اتنے میں گھوڑے قریب آئے تو شک دور ہوگیا۔ اور شبہہ کافور۔ کیا دیکھتے ہیں، کہ ایک شبدیز سبک خیز پر ایک نوعروسِ سرمایۂ ناز بت شیریں انداز، ملائک نظر فریب، بلائے جاں، عدوے شکیب، بت شکن کفر گزیناں، رو کش زہرہ جبیناں، چست و طرار، باغ و بہار، عنبریں مو قوس ابرو سوار، اٹھکھیلیاں کرتی چلی آتی ہے۔ میاں آزاد نے اس بتِ رنگین ادا مہ، لقا کو پشت توسن پر دیکھا۔ دوسرے سمندِ دغا پسند پر ایک حسین، مہ جبین، زن نازنین، آفتِ جانِ ناتواں، بلائے بے درماں، ناوک نگاہ، مگر پاک داماں۔ ترش رو، مگر شیریں زبان، تُند خوا، سراپا جاوو سرد قد، یاسمین بو تنی ہوئی بیٹھی۔ فرسِ سبک عناں کو جولاں، کرتی ہوئی آتی ہے:

بتِ رنگین سمندِ ناز جولاں کردہ می آید
ٹکہ بر سر کج وکاکل پریشاں کردہ می آید

فرس تند خو اور شبدیز جنگجو، سے دونوں بہنیں ایک عجب ادائے دلربا سے اتر پڑیں، اور اترتے ہی بجروں پر چڑھیں۔ ادھر چشمہ سار، لطافت بار میں بجرے رواں تھے۔ ادھر سبزہ زار میں عشاق دل فگار دواں تھے۔ ادھر بہاؤ پر بجرے فراٹے سے جاتے تھے۔ ادھر قدم لڑکھڑاتے تھے۔ ادھر شباب اور آب و تاب، ادھر دلِ پُر اضطراب۔ وہ حسن و جمال کے چشم و چراغ، یہ خونابۂ دل در ایاغ۔ ادھر بادۂ جوانی کا سرور، ادھر نشۂ شرابِ خم عشق سے آنکھیں چور۔ ادھر دریا کی طغیانی اور بجروں کی رواتی اور جوشِ جوانی۔ ادھر شرابِ ارغوانی، آبِ زندگانی، اور شوقِ نظارۂ یار جانی۔ ادھر موج مستوں کی طرح آشفتہ دستار، اور بجرا گرم رفتار، ادھر جنون سر پر سوار، اور موج خیز گریۂ زار۔ اتنے میں میاں آزاد کو ایک:

نمک پروردہ ملّاح ملیحی　　　چو کلک نکتہ پردازاں فصیحی

نظر پڑا، اور اس سے انھوں نے بآواز بلند بصد حسرت و حرماں، نالاں و گریاں یوں کہا:

آزاد :　　دریا زکوہ در رہِ من خستہ و غریب
　　　　اے خضر پے خجستہ مدد دہ ہمتم

زر لو، جواہر لو، مگر مدد دو:

چو داغِ لالہ اے آشفتہ کردار
زرِ خود را بدست خود نگہدار

یہ سن کر ملاح خرد پرور نے لب پر انگلی رکھی، اور اشارہ کیا کہ خاموش:

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار

اب سنیے کہ میاں آزاد نشہ میں ایسے غین ہو گئے کہ سر و پا کی خبر نہیں۔ یہ گرے وہ گرے: پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے۔ ملاح صبح نفس دو دقیقہ رس چتون سے تاڑ گیا کہ بدانِ طنّاز و نازک آواز ان دونوں مہوشانِ گل عذار رشکِ شاہدانِ فرخار کا عاشق زار ہے، اور تیر عشق کلیجے کے پار ہے۔ ان دونوں بہنوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ:

نمایاں شد باوجِ آفتابی
فروزاں اختری از برجِ آبی
رخے چوں برگِ گل بسیار نازک
تنے ہمچوں دلِ بیمار نازک
ہنوزش خط زستہ از بناگوش
بمرگِ عاشقاں زنقش سیہ پوش

بس یہی کہا کہ ان دونوں پر جان جاتی ہے۔ ہائے موت بھی نہیں آتی ہے۔ لیلۃ المعراجِ گیسو میں دل پھنس گیا۔ خدا گواہ اور صداقتِ مقال گواہ ہے کہ ایسا جوان، طلیق اللساں، فصیح البیان، شاعرِ غرّا سخندانِ بے ہمتا۔ خوش رو، خوش خو، حسین و مہ جبین، دیکھا نہ سنا، اور نام خدا ابھی اٹھتی جوانی ہے:

ہنورش گردِ گل تار ستہ شمشاد
زخوبی سردارِ چوں سرِ آزاد

اُن بتانِ جادو جمال، و زہرہ تمثال نے فرطِ شوق سے جانب ساحل ایک نظر غلط انداز ڈالی، تو میاں آزاد شکرِ خواب میں تھے۔ نشے نے وہ زور باندھا کہ سبزہ زار پر دھم سے گر پڑے۔ ہائے کس موقع پر کیا ہوا، پیر مرد بھانپ گیا کہ:

تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

ذکرِ خیرِ جوان طناز سن کر ان کو بھی شوقِ دیدار چرّایا۔ مگر محبوبِ مطلوب کو نہ پایا۔ ہائے اس شراب خانہ خراب کو خدا غارت کرے، جس نے میاں آزاد کے ساتھ وہ کیا، جو مرگ جاں، اور کفر ایمان کے ساتھ کرتا ہے۔ ہائے کس شوق و جوشِ صادق سے آئے تھے۔ اور کیا حالت ہو گئی:

ہائے صیّاد جفا پیشہ تے کیا گل کترے
دور رے جا کے چمن سے پر بلبل کترے

میاں آزاد نشے میں چور، سرشار مخمور، سبزۂ نو دمیدہ کے فرش زمرّدیں، و رنگین، پر خدیو مصرِ

مستی، اور شاہنشہِ ملک بادہ پرستی، بنے ہوئے غیں پڑے تھے، اور ان کے حبیبِ لبیب میاں ظرّاف سرہانے بصد حسرت و حرماں کھڑے تھے۔ ایک دفعہ ہی میاں آزاد ذرا کلبلائے اور کفن پھاڑ کر یوں چلائے :

خوشتر ز عیش و صحبتِ باغ و بہار چیست
ساقی کجاست، گو سبب انتظار چیست

ظرّاف : بس بس ذرا شبدیزِ سبک خیز زباں کی باگ روکے ہوئے، دیکھیے سنبھلے کہیں ٹھوکر نہ لے۔

آزاد : اے سبحان اللہ! کیا بھٹیارے کا ٹٹّو مقرر کیا ہے۔ اے قبلہ یہ دو باگے گھوڑے ہیں ؎

اشاروں پر چلا کرتے ہیں یہ شایستہ گھوڑے ہیں
کہ صورت ان کی حیوانی ہے سیرت ان کی انسانی

ٹھوکر کوئی اور کھاتے ہیں۔ یہ طرّارہ بھر کے شیر گردوں کو ٹاپیں مار آتے ہیں :

تصویر لکھے اس کی مصوّر تو پڑے دھوم
سرعتِ قدم توسنِ تصویر کو دے چوم
کوڑا اپے تعزیر جو چاہے کرے مرقوم
اک آن میں تصویر کا سب رنگ ہو معدوم
نقّاش کا دل نقش پہ آمادہ ہی رہ جائے
بس ہاتھ میں اس کے ورقِ سادہ ہی رہ جائے

ظرّاف : چلو بس چپ بھی رہو گے، یا فرّاٹے ہی اڑایا کرو گے۔ کہنے لگے صحبتِ باغ و بہار، اور طرفہ جوئبار اور می خوشگوار اے پھٹکار، کچھ اپنی حالت بھی دیکھتے ہو۔ یارندانِ مست ہی کی یاد پر لٹّو ہو۔ حیادار ہو، تو ایک چلّو کافی ہے، مگر بے حیا کی بلا دور، یا بے حمیتی! تیرا ہی آسرا ہے۔ ہائے جس کے عشق میں خون تھوکا اس سے آنکھیں بھی چار نہ ہوئیں۔ عین وقت نظارہ بازی بے ہوش اور دین و دنیا فراموش۔ ہائے کن کنکھیوں سے نظر ڈالتی تھی، مگر یہاں میاں گھانس پر لوٹ رہے تھے۔ اس شراب خانہ خراب سے خدا سمجھے۔ ہمیں تو رونا آتا ہے۔ اور تمھارا تو دل روتا ہوگا۔ اب ہمارے سامنے کبھی ساقی مہ وش، اور بادۂ دلکش، اور وقت خوش، اور بادۂ ناب، اور ارغوانی شراب، کا ذکر نہ کرنا۔ آبِ زندگانی شرابِ ارغوانی، ہونھ! اچھا آبِ زندگی ہے۔ جس کے پیتے ہی انسان زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ اور اچھی شراب ارغوانی ہے جس کا ایک چلّو انسان کا منھ کالا کر دیتا ہے۔ واسطے خدا کے اب دیوانِ حافظ کو طاق پر رکھیے۔ بادۂ گلگوں کو مصفّا جواہر نہ سمجھیے۔

آزاد : صد غنچہ بشگفت الّا دل من
ای وا دلِ من ای وا دلِ من

اس دل کی کلی نے چٹکنا سیکھا ہی نہیں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد خانہ برباد، اٹھ کھڑے ہوئے، اور بیتابانہ اس ایوانِ کیوان نشان کی طرف چلے، جوان بتانِ نازنین، ردکش لعبتان چین، کا مسکن تھا۔ اور جس کی گل زمین کا چپہ چپہ چرخِ بریں، اور خلدِ علیّین پر طعنہ زن تھا۔ ظرّاف نے جو یہ کیفیت دیکھی تو جھپٹ کر میاں آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا، اور یوں سمجھانا شروع کیا۔ اس بے قراری اور اشکباری سے مطلب برآری معلوم۔ ناحق ناحق سر دھننا اور تنکے چننا فعلِ عبث ہے۔ اس وقت جنون کی امنگ، اور عشق کی ترنگ نے تمھیں دیوانہ بنا دیا۔ آخر یار عزیز ذرا تو دل میں سوچو، کہ جاتے کہاں ہو۔ کوئی تمھیں جانتا بھی ہے، کوئی پہچانتا بھی ہے۔ آشفتہ دستار، خلائی خوار بن کے جانا اور در و دیوار سے سر ٹکرانا یعنی چہ ؟

آزاد : اب تو یہ سر ہے، اور وہ در ہے۔ بس آزاد ہے اور کوئے بتانِ ستم ایجاد ہے۔ دل ہے اور بیتابی، عشق ہے، اور خانہ خرابی چشم ہے، اور خونباری، طبیعت ہے، اور بے قراری۔ سر ہے اور سودا ہے۔ سودا ہے اور پریشانی ہے۔ سرگرانی اور گراں جانی ہے۔

ظرّاف : اس کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ یہ محض نادانی ہے۔ یاد رکھو بس یہی حماقت کی نشانی ہے۔

آزاد : فاش میگویم واز گفتۂ خود دلِ شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

سایۂ طوبیٰ ودلجوئی حور و لبِ حوض — بہوائے سر کوی تو برفت ازیادم
کوکبِ بخت مرا ہیچ منجّم نشناخت — یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم
نیست بر لوحِ دلم جز الفِ قامت یار — چکنم حرف دگر یاد نداد استادم

گر خورد خون دلم، مردمکِ دیدہ رواست
کہ چرا دل بجگر گوشۂ مردم دادم

ظرّاف : تم تو (آیا پانا) پی کر نشے میں چور، اور سیہ مست و مخمور، لڑکھڑا کر سبزے میں لوٹ گئے، مگر ہم پر ستم ڈھایا۔ اپنا تو کلیجہ منھ کو آیا۔ اس ملّاحِ ملیح و دجیہ، نے تمھارے حسن و جمال اور خط و خال، اور مستانہ چال، اور اٹھتی جوانی، اور نکتہ دانی، عالی خاندانی، اور معانی دوانی، کی اس درجہ تعریف کی کہ وہ دونوں پری زخانِ زہرہ جبین، و نازنین، نظر غلط انداز سے بعد

شوخی وناز دیکھنے لگیں۔ ان کا دزدیدہ نگاہ دیکھنا، اور فرطِ شوق سے چپکے چپکے آنکھیں سیکنا، ستم بپا کرتا تھا، حشر ڈھاتا تھا۔ آخرکار ملّاحِ عیّار استادِ کامل فن، سخنداں، پروردہ پیر کہن نے بگڑی ہوئی بات بنائی، اور کہا کہ آزاد پر غشی چھائی۔ تابِ نظارہ نہ لاسکا۔ اب صلاح یہی ہے کہ پہلے اس ملّاح سے پر و بال ملاؤ۔ کچھ چٹاؤ، پھر اس کے مشورے کے مطابق عمل میں لاؤ۔ ورنہ بے سمجھے بوجھے جانا، اور اپنا سا منھ لے کر واپس آنا، نشانِ بالغ خردی نہیں:

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

الغرض میاں آزاد، وحشی مادرزاد، اور ظرّاف نیک نہاد، دونوں مل کر چشمہ سار کی طرف چلے، تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہی پیر مردِ ملّاح ملیح ایک ڈونگی کھیتا ہوا آرہا ہے۔ ان کو دیکھا تو اشارہ کیا کہ ٹھہر تا میں آتا ہوں۔ ڈونگی کو دم کے دم میں کنارِ جویبار لاتا ہوں۔ میاں ظرّاف کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مرادیں مل گئیں، اور آزاد تو ریشہ خطمی ہی ہو گئے۔ شادی مرگ کی نوبت آئی۔ منھ مانگی مراد پائی، پیر مرد ڈونگی سے اترا تو آزاد نے یوں کہا:

خیر مقدم، مرحبا اے طائرِ ہیموں قدم — شاد مان کردی مرا نازم ترا سر تا قدم
تا بدانی تو کہ ہجراں خونِ عاشق می خورد — نالۂ شب گیر در کار ست و آہِ صبحدم

پیر مرد: کیسا نالۂ شب گیر۔ کس کی آہِ صبحدم کس کا طاق کسریٰ۔ کیسا جامِ جم، بھئی گبھرو ہم تو تمھارے سچے مددگار، اور پکّے طرفدار ہیں، لیکن حسن وعشق کا جھگڑا چکلا نا، عاشق و معشوق کا ملانا، خالہ جی کا گھر نہیں۔ بخونِ پاکِ حسینؓ اور بحقِ دین محمدؐ، وہ دونوں شکر لبانِ زہرہ تمثال، اور مہوشانِ مشتری خصال، حیا پرور ہیں۔ پاک نظر ہیں۔ عفت کوش ہیں۔ روپوش ہیں۔ وہاں پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ فرشتے سر کے بھل چلتے ہیں۔ زہاد صد سالہ سجدے کرتے ہیں۔ مسیحانِ ملاء اعلیٰ پھونک پھونک کر قدم دھرتے ہیں۔ بوئے گل کو خبر نہیں۔ بادِ صبا کا گزر نہیں۔ اس سرزمین کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اس ایوانِ سپہر توامان کا درجہ فلک الافلاک سے بھی اعلیٰ ہے، مگر میری گود کھلائی ہیں۔ میں تقریب کروں گا۔ نکاح کا منشا ظاہر کروں گا۔ دونوں بہنیں پری زاد ہیں، اور طرّہ اس پر یہ کہ تربیت یافتہ اور عالی نژاد ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ایک اونچے گھر سے پیغام آیا ہے۔ ان کی ماں کو شوق چرّایا ہے، کہ وہاں ہی بیاہ ہو، بشرطیکہ داماد خرد آگاہ ہو۔ تم خاطر جمع رکھو خدا کی عنایت پر شاکر رہو:

غم مخور حافظ بہ سختی روز و شب — عاقبت روزے بیابی کام را

دل کو ڈھارس دو۔ بہت وحشت کی نہ لو۔ اب اس وقت تو جاؤ، مگر کل نور کے تڑکے یہاں آؤ،

میاں آزاد الوداع کہہ کر چلنے ہی کو تھے کہ اتنے میں :

پل مارنے کی ہوئی جو دیری سبحان اللہ شان تیری

کیا دیکھتے ہیں کہ وہ دونوں بتانِ سیم غبغب، ونوش لب، جادونگاہ غیرتِ مہر و ماہ، جھروکے سے جھانک رہی ہیں :

منم کہ دیدہ بدیدارِ دوست کردم باز
چہ شکر گویمیت اے کار سازِ بندہ نواز

آزاد : منم غریب دیار و توئی غریب نواز
دمے بحالِ غریب دیارِ خود پرواز

بہر کمند کہ خواہی بگیر و بازم بند بشرط آنکہ ز کارم نظر نگیری باز
بر آستینِ خیال تو میدہم بوسہ بر آستین وصالِ تو نیست دست نیاز
درون سینہ دلم چوں کبوتران بطپید چہ آتشی ست کہ برجان مانہادی باز

برد، منال ز شامی کہ صبح در پے اوست
کہ نیش و نوش بہم باشد، ونشیب و فراز

اتنا سننا تھا کہ میاں آزاد کی جان پر بن آئی، اور آنکھ فرطِ شادی سے آنسوؤں ڈبڈبا لائی۔ وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ میاں آزاد کو حیرت تھی کہ یا للعجب یہ کیا بوالعجی ہے۔ یہ چھلاوا تھا، ٹوناتھا، سحر تھا، جادو تھا، آخر تھا کیا۔ طلسمات کا سا سماں ہے۔ عقل خود حیران ہے۔

اتنے میں پیر مرد نے اشارے سے کہا کہ بس اب جاؤ اور حسب مشورہ تڑکے گجردم آؤ۔ دونوں یارانِ موافق، اور محبانِ صادق خوش وخنداں مست و غزل خواں چلے۔

ظرّاف : کیوں استاد کیا ترکیب بتائی ہے۔ سچ کہتا کیا دور کی کوڑی لائی ہے۔ اس ملّاح کا خدا بھلا کرے، اور اس کو خواجہ خضر کی عمر عطا کرے۔ واللہ خدا جانے یہ کون ہے۔ کیوں جی کہیں سچ مچ حضرت خضرؑ پے خجستہ ہی نہ ہو۔ کیا اے ہے!

ؔ حضرت خضر علیہ السلام ایک پیغمبر کا نام ہے جنھوں نے آبِ حیات پی کر حیات دوام حاصل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھولے بھٹکے لوگوں کی دشوار گزار مقامات پر رہنمائی کرتے ہیں۔ اور مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔

آزاد : یار یہاں ان باتوں سے نفرت ہے۔ ضعیف الاعتقادی کے بندۂ درگاہ دشمن جانی ہے۔ خواجہ خضر کا ذکر آپ تہ کر رکھیں، وہ مقدس بزرگ ہیں۔ ہم ایسے رندانِ مست ہیں ان کا کیا کام۔

ظراف : اس وقت تو حضور کا چہرہ گلنار ہے۔ طبیعت باغ و بہار ہے سچ کہنا کیا صورت زیبا پائی ہے۔ کیا کج ادائی ہے اور دلربائی ہے۔ خدا نے یہ صورت، پیاری پیاری مورت اپنے ہاتھ سے بنائی ہے:

اے خوش آن صبح کہ عاشق ز سکرِ خواب وصال
دست در گردن معشوق حمائل بر خاست

آزاد : وزیدا نیک نسیم وصل خوش در گلشن جانم
چناں شادم کہ غم با من دریں غم خانہ می قصد

عُروسِ وحشت کے برقع کشا۔ جرعہ نوشِ جام بلا۔ روح رواں، عشق نمک پاشِ متاع خوان عشق۔ میاں آزاد خانہ برباد، ایسے بشّاش ہوئے کہ ایوان سپہر توا ماں، جب نظر سے اوجھل ہوا، اور سنسان بیابان کف دست میدان آیا۔ تو خوب اچکے پھاندے، اور پھر پھر کے اسی طرف جھانکنے لگے، اور آپ ہی آپ مجذوبوں کی طرح یوں بڑبڑانے لگے۔ ایک دسمہ ابروئے دلربائی۔ دوسری افشان جبینِ خوش ادائی۔ ایک کے رخ انور سے نورِ سعادت عیاں، دوسری کے سر پر بال ہما کا سائبان۔ ایک چست و چالاک، دوسری شوخ و بیباک۔ میاں ظراف نے سمجھایا کہ دیکھیے دیکھیے! پھر وحشت کی دھن سمائی۔ پھر شیطان نے دور سے انگلی دکھائی۔ پھر وہی بے تکی باتیں، پھر وہی حرکتیں، جس میں شہر بھر واقف ہو جائے کہ۔ ع۔ یہ بھی ہیں پانچویں سواروں میں" تم تو خدا جانے کہاں کے خدائی خوار ہو۔ آج آئے کل ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ گے۔ چلتے پھرتے نظر آؤ گے۔ یہاں اسی شہر میں رہنا ہے۔ ہم سے پڑوسیوں کے طعنے نہ سنے جائیں گے۔ یاران سرپل ضرور منھ آئیں گے۔ اس سے وہ بات کر دکہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ آخر متانت بھی تو کوئی چیز ہے، یا بالکل عشق ہی کے ہاتھ بک گئے۔ آج چل کر غریب خانے پر شب باش ہو، نور کے تڑکے ہم تم دونوں آئیں گے۔ لیکن حضرت واسطے خدا کے میرے گھر پر یہ حرکتیں نہ کیجیے گا، کہ بیٹھے بیٹھے کودنے لگے، یا یہ اچکے وہ آئے۔ وہ کودے یہ پہنچے۔ اب آپ بچوں میں نہیں ہیں، جوان ہو۔ مسین بھیگتی ہیں تو کیا ہوا۔ ایسی فکر نہ کیجیے گا کہ میری بیوی کو خبر ہو جائے، کہ میاں بھی عاشق زار بن بیٹھے ہیں، ورنہ ہماری زندگی تلخ ہو جائے گی، اور جان پر بن آئے گی۔

آزاد : طلب دنیا کی کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

کیا بیوی سے آپ اسدرجہ خائف ہیں؟ خدا ہی خیر کرے۔ ارے میاں اتنا خوف۔ روح ہی فنا ہوئی جاتی ہے۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ لاحول ولا۔ ایسے زن مرید بھی کم ہوں گے۔ آخر خوف کاہے کا۔

ظرّاف : خیر آپ کو اس جھگڑے سے کیا سروکار۔ مگر وہاں چل کر متانت سے رہیے گا، یہ نہیں کہ غُل مچانے لگے۔ چلانے لگے۔ مذاق میں مضائقہ نہیں۔ لیکن سنجیدگی ضرور ہو۔

آزاد : یار سنتے ہو! بیوی تم پر حاوی ہیں۔ بھئی، مگر خیر ہم کو یار کی یاری سے کام۔ اس کے فعل سے کیا واسطہ۔ آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے۔

الغرض میاں آزاد اور ظرّاف گھر پہنچے۔ روشن نے کہا: حضور! بیگم صاحب آپ کو کوئی بیس بیر پوچھ چکی ہیں۔ اتنے میں لونڈی اندر سے آئی: میاں گھر میں بلاتی ہیں، میاں ظرّاف نے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دن دن بھر آپ غائب کہاں رہنے لگے؟ اب تو خیر سے بڑے سیلانی ہو گئے۔ صبح کو نکلے نکلے شام کو خبر لی۔ چلو میرے سامنے سے جاؤ۔ مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ پس آج کھانا دانا خیر صلاح ہے۔ یہاں کچھ پکّا وکّا نہیں۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کی فاتحہ پڑھو تنوری روٹیاں اڑاؤ۔ یہاں کسی کو کتّے نے نہیں کاٹا ہے کہ وخت بے وقت چولھے کا منھ کالا کیا جائے۔ بھلے مانس آدمی دو ایک گھڑی کے لیے کہیں ذری گئے تو گئے، یہ نہیں کہ دن دن بھر پتا ہی نہیں۔ اچھے ہتکھنڈے سیکھے ہیں۔ ظرّاف نے چپکے سے کہا کہ نیک بخت ذرا آہستہ آہستہ باتیں کر، باہر ایک بھلا مانس ٹکا ہوا ہے۔ اتنی بھی کیا بے حیائی ہے۔ اس پر وہ چمک کر بولی کہ بس بس زبان نہ کھلواؤ بہت۔ تمھیں جو دوست ملتا ہے خدائی خوار، گھر نہ بار، جاتے کہاں کے الفتے ان کو مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی شریف زادے سے دوستی کرتے دیکھا نہیں۔ چلیے، اب دور ہو جیے۔ نہیں تو ہم بے طور پیش آئیں گے۔ مجھ سے برا کوئی نہیں۔ میاں ظرّاف بے چارے کی جان عذاب میں، کہ گھر میں بیوی بے نقط سنا رہی ہیں۔ اور باہر میاں آزاد لاکھوں ہی گالیاں دیں گے، کہ آپ کی بیوی نے آپ کو تو خیر جو کچھ کہا تھا وہ کہا ہی تھا۔ مجھے کیوں لے ڈالا۔ میں نے کیا ان کا بگاڑا تھا۔ اپنا منھ لے کر باہر نکل آئے، اور آزاد سے کہا کہ یار آج روزے کی نیت کر لو۔ بیوی فوجداری پر آمادہ ہیں۔ بھئی ایسی ترش مزاج، سرکہ جبیں، تو دیکھی ہی نہیں۔ بات ہوئی اور تنک گئیں مہینوں روٹھی ہی رہتی ہیں، مگر کیا کروں امیر کی لڑکی ہے۔ ورنہ میں ایک جھلّا۔ مجھے یہ بدمزاجی پسند

کہا ں لیکن :

ما ہمیں مرد مان بیا یدساخت چہ توان کرد مرد مان ایں اند

سوجھی آج فاقہ ہے، فاقہ ہی سہی۔ قہر درویش برجانِ درویش۔ آزاد بولے فاقہ آپ کے دشمنوں کو، چلیے نان بائی، حلوائی، کسی کی دکان پر مزے سے چل کر کھانا چکھ آئیں، اور دندنائیں۔ انھوں نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ اتنے ہی ہوتے تو پھر بیوی کی کیوں سنتے۔ میاں پیسا ٹکا پاس نہیں، حلوائی کیا ہمارا ماموں ہے۔ آزاد ایک ہی خرانٹ گرگ بازاں دیدہ، بولے کہ واہ اس کی فکر کسے ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور مزے سے مٹھائیاں چکھیے۔ مگر جو تدبیر بتادیں اس میں سر مو فرق نہ آنے پائے۔ ہاں ذری اس کا خیال رہے۔ چلیے بس اب ہمراہ رکاب۔ وہ سوجھی ہے کہ کبھی پلے ہی نہ پڑے۔ سونے کی چڑیا ہتھے چڑھے۔

حلوائی کی شامت آئی

الغرض میاں آزاد حضرت ظرّاف کو لے کر بازار پہنچے، اور حلوائی کی دکان کے قریب سے یہ آگے بڑھ گئے۔ آزاد ذرا پیچھے رہ گئے۔ ظرّاف سکھائے پڑھائے سجھائے بجھائے تو تھے ہی جاتے ہی حلوائی سے کہا کہ میاں آٹھ آنے کے پیسے دو، اور آٹھ آنے کی پنج میل مٹھائی۔ حلوائی نے پنج میل مٹھائی خاصی تازی تازی تول دی، اور آٹھ آنے ڈبل گن دیے۔ پیسے تو میاں ظرّاف نے ڈوپٹے میں باندھے اور مٹھائی اسی کی دکان پر چکھنے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد نمودار ہوئے۔ بھئی لالہ ذرا عمدہ تازہ لڈّو تو ایک روپیہ کے تول دینا، مگر نخودی کے ہوں۔ اس نے ایک روپیہ کے لڈّو تول کر چنگیل ان کے ہاتھ دھری۔ اتنے میں حضرت ظرّاف نے پیسے اور مٹھائی جو حلوائی سے پہلے لی تھی، سنبھال کر چلنے کا قصد کیا، اور بسم اللہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب تو حلوائی نے للکارا کہ میاں چلے کہاں ذری پہلے بائیں ہاتھ سے پیسے تو رکھے جاؤ۔ وہ پیسے کہتا ہوں، روپیہ۔ خوب اچھا مزا ہے۔ ایں! ابے روپیہ کیا تو نے پایا نہیں؟ پہلے روپیہ دیا پھر سودا لیا۔ کیا چوروں اچکوں سے سابقہ رہا ہے۔ اور سنیے صاحب اچھے ملے۔ دو دو مرتبہ روپیہ دیں لیے مرتے ہو۔ کہیں میں رپٹ نہ لکھوا دوں۔ مجھے بھی کوئی گنوار سمجھے ہو۔ ارے نامعقول چہرہ شاہی تو ابھی دے چکا ہوں۔ اب کیا کسی کا گھرے گا۔ اس پر حلوائی اور ظرّاف میں تکرار ہونے لگی اور اس درجہ بڑھی کہ تو تو میں میں ہونے لگی۔ لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ ان کی دو گھڑی کی دل لگی ہوئی۔ ارد گرد سب حوالی موالی۔ بازاری تماشائی ٹوٹ گئے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے

ہیں۔ کوئی کہتا ہے لالہ کھانس کھا گئے ہو۔ کوئی کہتا ہے میاں ایک روپیہ کے لیے نیت ڈانواں ڈول نہ کرو۔ اتنے میں میاں آزاد نے کہا، کہ میاں حلوائی اب کہیں اسی طرح میرا روپیہ بھی نہ بھول جایئے گا۔ کیا آپ کا روپیہ! آپ نے روپیہ دیا کس کو چلیے یک نشد، دو شد، اب جو سنتا ہے وہ اس حلوائی ہی کو اُلّو بناتا ہے۔ چو طرفہ سے اس پر لے دے ہونے لگی۔ اور لوگوں نے بہت کچھ لعنت ملامت کی، کہ شریف آدمیوں کو بے عزّت کرتے ہو۔ روپیہ کے خوب مکر جاتے ہو۔ لالہ ساکھ جاتی رہے گی، اتنے میں اس حلوائی کا بڈھا باپ جو آیا، تو دیکھتا کیا ہے کہ دکان کے ارد گرد اژدحامِ عام، اور جمِّ غفیر ہے۔ پوچھا کیا ماجرا ہے۔ کیا دکان لٹ گئی ہے؟ ایک بگڑے دل نے کہا۔ اجی لٹ تو نہیں گئی مگر اب تمھاری دکان کی ساکھ جاتی رہی۔ ابھی ایک بھلے مانس نے کھن سے روپیہ پھینکا۔ اب کہتا ہے کہ ہم نے روپیہ پایا ہی نہیں۔ اس کو چھوڑا تو دوسرے بے چارے شریف کا دامن پکڑ لیا کہ تم نے بھی روپیہ نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بے چارے سیکڑوں قسم کھاتے ہیں کہ میں دے چکا ہوں۔ حلوائی بڑا تیکھا بڈھا تھا۔ سنتے ہی آگ ہو گیا۔ اور جھلّا کر اپنے لڑکے کی کھوپڑی پر تان کے ایک ٹیپ لگا بیٹھا۔ ہات تیرے کی، کہتا ہوں کہ بھانگ نہ کھایا کر۔ مانتا ہی نہیں۔ کیوں پھر کھائے گا بھانگ؟ جا بیٹھ دکان پر۔

ظرّاف اور میاں آزاد نے مزے سے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی باندھ لی اور آٹھ آنے کے پیسے مزید براں۔ راستے میں قہقہے لگاتے چلے۔ جب گھر پہنچے تو خوب لڈّو اور برفی اور پیڑے چکھے بچے بچائے اندر بھیجے۔ اب آزاد سے میاں ظریف نے کہا، یار اسی طرح روپیہ کی فکر نہیں کرتے۔ کہیں سے روپیہ دلواؤ تو جانیں۔ انھوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے استاد ہمارا ذمّہ۔ ابھی ابھی چلو۔ مگر کسی سے مانگ مونگ کر کچھ اشرفیاں کلدار نکالیں، اور کہا لیجیے۔ مع ہمیانی کے موجود ہیں۔ اس کے بعد ہمیانی اٹھائی اور آزاد و میاں روشن علی کو ساتھ لیا۔ بازار چلے۔ پہلے ایک مہاجن کو اشرفیاں دکھائیں، اور پرکھائیں، بیچتے ہیں کھری کھوٹی دیکھ لیجیے۔ مہاجن نے ان کو خوب کسوٹی پر کسا، اور کامل عیّار پایا، اور کہا انیس کے حساب سے لیں گے۔ ظرّاف دوسری دکان پر پہنچے اور وہاں بھی اشرفیاں گنوائیں، اور پرکھوائیں، اور چلتے ہوئے۔ اب اثنائے راہ میں میاں آزاد سے کہا کہ یہاں ایک کوٹھی بھی ہے۔ ایک کوٹھی کیا بلکہ بیس۔ چلو وہاں چلیں۔ الغرض ایک مہاجن کی کوٹھی پر پہنچے، مگر اشرفیاں راستے میں آزاد کو دے دیں، اور کہا تم سیدھے گھر کی راہ لو۔ کوٹھی پر پہنچ کر کہا کہ ہم کو دو سو اشرفیاں، خریدنی ہے۔ مہاجن نے دیکھا کہ آدمی متین ہیں۔ اور ریاست چہرے سے برستی ہے۔ کپڑے بھی

نفیس اور قیمتی زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ فوراً دو سو اشرفیاں ان کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ظرّاف نے پوچھا کہ در کیا ہے۔ بولے خریدتے ساڑھے انیس کے حساب سے ہیں اور بیچتے بیس روپیہ کے درسے ہیں۔ اخاہ اتنا فرق اچھا دو سو اشرفیاں کا حساب ساڑھے انیس کے درسے کسی کاغذ پر لکھ تو دو۔ مہاجن کے منیب جی نے ایک پرچے پر حساب لکھ دیا۔ حضرت نے وہ کاغذ تو جیب میں رکھا اور اشرفیاں باندھ کر کھڑے ہوئے، اور طرّارہ بھر کے کوٹھی کے باہر تھے۔ ہائیں، ہائیں، ہائیں! ہاں لینا لینا! کہاں کہاں، ظرّاف پیترا بدل سامنے کھڑے ہو گئے۔ بس دور ہی سے بات چیت ہو، سامنے آئے اور میں نے تلا ہاتھ دیا۔ اے صاحب روپیہ تو دیجیے! کیسے روپیے؟ آخر روپے کیسے؟ ہم نہیں بیچتے۔ کیا کہا؟ نہیں بیچتے۔ کیا اشرفیاں آپ کی ہیں۔ جی اور نہیں تو کیا آپ کے باپ کی ہیں۔ ہم نہیں بیچتے آپ کا اجارہ ہے کچھ۔ آپ ہیں کون زبردستی کرنے والے۔ اتنے میں آزاد بھی آن پہنچے۔ ظرّاف بولے ساڑھے انیس کے حساب سے ہم کیوں بیچنے لگے بھلا۔ مہاجن اور ان کے منیب جی اور چیلے چاپڑ غل مچا رہے ہیں کہ تم اشرفیاں لائے کب تھے۔ وہ ایک نہیں سنتے۔ اتنے میں کوئی دو سو آدمی جمع ہو گئے اور اہل پولیس بھی آن موجود۔

جمعدار: یہ کیا فساد ہے لالہ چنّا مل، وہ نہیں بیچتے تو زبردستی کیوں کرتے ہو۔ اپنے مال پر سب کو اختیار ہے۔ وہ بیس چھوڑ بائیس کے حساب سے دیں، پھر آپ کون۔ مفت میں دروازے پر فساد کرنا کون سی دانائی ہے۔ بھلا۔ چلو اب جاؤ اپنا کام دیکھو۔

مہاجن: آپ اچھے میر فیصلی بنے۔ یہاں چار ہزار روپیہ پر پانی پھرا جاتا ہے، آپ کہتے ہیں جانے بھی دو۔ یہ تو ہماری اشرفیاں ہیں۔ یہ خریدنے آئے تھے، ہم نے گن دیں۔ بس باندھ بوندھ کر چل کھڑے ہوئے۔

تماشائی: واہ بھلا کوئی بات بھی ہے، یہ اکیلے آپ دس۔ جو ایسا ہوتا تو یہ کوٹھی کے باہر بھی آنے پاتے۔ آپ سب مل کر ان کا اچار نہ نکال ڈالتے۔ اب تک کچومر نکل گیا ہوتا۔ اتنے بڑے مہاجن اور دو سو اشرفیوں کے لیے ایمان چھوڑے دیتے ہو۔

جمعدار: حد بھر بری بات ہے۔

ظرّاف: دیکھیے آپ بازار بھر میں دریافت کریں کہ ہم نے کتنی دکانوں میں یہ اشرفیاں دکھلائیں اور رکھوائیں، بازار بھر گواہ ہے۔ کچھ ایک دو آدمی وہاں تھوڑا ہی تھے۔ اس کو بھی جانے دیجیے یہ پرچہ دیکھیے اس میں ساڑھے انیس کے درسے حساب لگایا ہے یا کچھ اور؟ اگر یہ بیچتے ہوتے تو بیس کے درسے حساب لگاتے، یا ساڑھے انیس سے، ملان کر لیجیے یہ انھیں کے ہاتھ کا پرچہ ہے یا اس سے بھی ان کو انکار ہے۔ مفت میں ایک شریف کے پیچھے پڑے ہیں لینا ایک نہ دینا دو۔

جمعدار : یہ تو خوب ثبوت دیا۔ لالہ جی افسوس ہے کہ آپ اور یہ بگڑا، آخر یہ آپ کے منیب کے دستخط ہیں یا کسی اور کے، پھر جھگڑا کاہے کا' بھلا سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ بازار میں چلیے۔ دیکھیے ان کے پاس اشرفیاں تھیں یا نہیں تھیں۔ اچھا اس وقت وہاں اور بھی کوئی تھا ؟

روشن : جی ہاں میں تھا۔

جمعدار : تم نے کیا دیکھا۔

روشن : یہ یہاں آئے اور جبر دجرد (زرد) اشر بھی (اشرفی) انڈیل دی۔ لالہ سے بھاؤ تاؤ نہ ہوا، بس باندھ کے لے گئے۔ تو لالہ نے غل مچایا کہ لوٹ لیا۔ لوٹ لیا۔ بس اور کچھ نہیں دیکھا۔ ایمان نہیں چھوڑنا ہے۔

جمعدار : تو اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا۔ اب چلو بازار بھی چلیں۔

الغرض میاں ظرّاف اور ساہوکار۔ ان کے منیب' اور جمعدار اور تماشائی سب مل کر بازار چلے، وہاں تحقیقات کی تو دلالوں' مہاجنوں نے گواہی دی کہ بیشک ان کے پاس اشرفیاں تھیں، اور انھوں نے پرکھوائی بھی تھیں۔ ابھی ابھی یہاں سے گئے تھے۔

جمعدار : لالہ صاحب اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے ہو رہیے۔ ورنہ بیڈھب ٹھہرے گی۔ ثبوت کافی موجود ہے۔ آپ کی ساکھ جائے گی۔ اور منیب کی تو شامت ہی آئے گی۔ آیندہ آپ کو اختیار ہے۔

مہاجن : کیا اندھیر ہے۔ چار ہزار روپیہ پر پانی پڑ گیا ٹبے کھاتے ہیں، اتنا روپیہ کبھی عمر بھر میں نے جمع ہی نہیں کیا تھا۔ آج تک اور جو ہے ہمیں کو اتو بناتا ہے۔ خیر ہاتھ دھویا۔

میاں آزاد تو کھسکے' اور روشن ہشّاش بشّاش ان کے ساتھ چلے۔ میاں ظرّاف کے گھر پہنچے تو چہرہ گلنار۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ جاتے ہی دو سو اشرفیاں کھن کھن کر کے سامنے ڈال دیں۔ دیکھا یوں لاتے ہیں۔ لو یہ اب اشرفیاں ہماری بھابھی جان کے پاس رکھو۔ خدا کی قسم تم نے وہ جعل کیا ہے کہ واہ جی واہ' تم سے بڑھ کر نیار یا اور کون ہو گا بھلا۔

ظرّاف : بایاں قدم ہے۔ واللہ ہم سب گن پورے' ہمیں کون کہے لنڈورے۔ اف فوہ' واہ رے استاد' بھائی یہ فن تم بھی سیکھ لو۔ آج سے ہمارے شاگرد ہو۔

آزاد : یہ زبانی داخلہ پسند نہیں۔

ظرّاف : مٹھائی ؛ رکھو سامنے۔ دل لگی نہیں ہے۔ ڈیڑھ روپیے کی مٹھائی۔

آزاد : لے بھابھی سے تو خوشخبری کہہ دو۔ بہت منھ پھلائے بیٹھی تھیں۔

ظرّاف : (گھر میں جاکر) کہاں ہو کیا سو رہیں۔

بیوی : کیا کمائی کر کے لائے جو ڈپٹ رہے ہو۔ سو نہ رہیں تو کیا تمہاری طرح رات بھر چوکی پہرا دیں۔

ظرّاف : (اشرفیاں کھٹکا کر) لو ادھر آؤ۔ بہت صلواتیں نہ سناؤ۔ یہ لو دس ہزار کی اشرفیاں۔

بیوی : واہ یہ بتے کسی اینلی کو دیجیے گا۔ یہ تو وہی اشرفیاں ہیں، جو چچا جان امانت رکھوا گئے ہیں۔ اڑتے ہیں آپ۔ شانِ خدا!

ظرّاف : وہ یہ ہیں۔

بیوی : دیکھوں (کھل کھلا کر) واہ وا واہ کیا کسی کے یہاں پھاندے تھے۔ آخر ش یہ لائے کس کے گھر سے۔ بس چپکے سے صندوقچے میں ہمارے رکھ دو۔

ظرّاف : جی بجا ہے۔ آپ کا صندوقچہ ایسا ہی تو بڑا ہے۔

بیوی : (ہنس کر) واہ اے واہ، الائچی رکھنے والا نہیں وہ بڑا صندوق جس میں ہمارا زیور رہتا ہے۔

ظرّاف : یہ اشرفیاں وہی لائے ہیں جن کو تم اَنْقَتے اور رِقّے بناتی تھیں، اور ہم نے مدد دی۔

بیوی : (ہاتھ جوڑ کر) میاں قصور معاف کر دو۔ ہماری خاطر سے کہا سنا بھول جاؤ۔ انسان کی طبیعت ہمیشہ ایک سی تھوڑا ہی رہتی ہے۔ میں تو تمہاری لونڈی ہوں۔ بیوی، پیاری بیوی ہوں۔

آزاد : (باہر سے) ہم بھی سن رہے ہیں بھابھی صاحب، ابھی تو آپ نے ہمارے بھائی بیچارے کو ڈپٹ لیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا صلواتیں سنائیں، گھر سے باہر کر دیا، کھانا نہ دیا۔ کھڑے کھڑے نکال دیا، اور ہم کو جو بے نقط سنائیں، وہ گھاتے میں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اب جو زر دا زرد اشرفیاں دیکھیں، تو پیاری بیوی بن گئیں، خیر چلو بھائی تو بچ گئے۔ اب نہ للکاریے گا۔ اب ان کا بھی پوٹا تر ہے۔ اور جو کہیں ہم برس چھ مہینے ٹمک گئے تو سونے کی اینٹوں سے مکان بنوا لیجیے گا، مگر ذری ان کے کان نہ گرمایا کیجیے۔ یہ بیچارے بے باپ کے ہیں۔

بیوی : (قہقہہ لگا کر) اب آپ ہمارے مہمان ہیں آپ کو کیا کہوں، آپ تو ہنسی ہنسی میں دو چار فقرے چست کر گئے۔ مگر آپ کی ہنسی ہمارے سر آنکھوں پر۔

بے دیکھے بھالے شادی

چہرہ پردازِ ہیولائے رہ نوردی، جرعہ نوشِ جامِ کوچہ گردی، سر بھرا دادہ، میاں آزاد آزادہ۔

سحر کاذب کے وقت خواب کیا دیکھتے ہیں کہ مہر جہاں تاب نے جلباب خفا سے رُخ انور نکالا ہے۔ اور ظلمت شب دور چو طرفہ اجالا ہے۔ اور ان کے سرہانے ایک بلبل ہزار داستان نشۂ راح ریحان نسیم میں سرخوش و مخمور، چہک چہک کر یوں کہہ رہا ہے:

صبح ست ساقیا قدحی پر شراب کن
دورے فلک درنگ ندارد شتاب کن

ایک دفعہ ہی آنکھ کھلی تو نہ نغمۂ عندلیب بے تاب، نہ رباب، فقط میاں آزاد اور دلِ پُر اضطراب۔ آسمان کی طرف نظر پڑی تو تیرہ و تار، بجلی یہ چمکی وہ آسمان کے پار، سوچے کہ ہم مانیں یا نہ مانیں ہے فال نیک۔ اللہ کہہ کر شکر خواب سے اٹھے۔

اتنے میں شوالوں میں ٹھنا ٹھن گھنٹوں کی آواز آنے لگی۔ امرا کے یہاں نوبتی نوبت بجانے لگے۔ مسجدوں میں موذنوں نے نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا۔ بادہ گساروں کو صبوحی یاد آئی۔ مرغِ سحر خیز نے لکڑوں کوں کی بانگ لگائی۔ چلیے تڑکا ہوگیا۔ ادھر میاں آزاد بن ٹھن کر تیار ہوئے، اور اُدھر میاں ظرّاف کمر کس کر دن سے آن موجود، دونوں چلے:

علی الصباح کہ مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ محبت بکوی یار روند

آپس میں میٹھی میٹھی باتیں ہوتی جاتی ہیں، کہ ملاح بلیع کیا میرزا منش بزرگ ہے۔ دیکھیں آج کیسی گزرتی ہے۔ خدا نے چاہا تو گہری چھنے۔ آج پو بارہ ہے۔ اس بہار اور لبِ جوئبار، اور طرف گلزار، اور قدرت کے نقش و نگار، کا لطف بے گل عذار کیا، سچ ہے:

گل بی رخِ یار خوش نباشد	بی بادہ بہار خوش نباشد
طرف چمن و ہوائی بستان	بی لالہ عذار خوش نباشد

اب اُدھر کا ذکر سنیے! کہ وہ دونوں بہنیں نام خدا سیانی تھیں، اور مست بادۂ جوانی تھیں، لیکن ابتدا ہی سے انتہا کی حیا پرور، اور پاک نظر، اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ تعلیم اعلیٰ درجہ کی پائی۔ کتبِ اخلاق و پند و موعظت کی خوب ہی سیر فرمائی، لیکن ان کی بوڑھی اماں جان پُرانے فیشن کی رئیس زادی، ضعیف الاعتقادی، تو ان کا خاص حصّہ تھا۔ اُنھیں پرانی باتوں پر لٹو تھیں۔ بلّی اگر گھر میں کسی روز آوے، تو ستم ہو جائے۔ اُلّو بولا، اور ان کی روح فنا ہوئی۔ اب صبح تک تالیاں ہی بجا

کریں گی ۔ جوتے پر جوتا دیکھا اور آگ ہوگئیں ۔ کسی نے سیٹی بجائی اور انھوں نے کوسنا شروع کیا پاؤں پاؤں پر رکھ کر کوئی سویا، اور آپ نے للکارا ۔ ہجر یا غم دالم کا شعر کسی نے زبان سے نکالا، اور انھوں نے فوراً روک دیا ۔ کتا گلی میں رویا اور ان کا دم نکل گیا ۔ کتیا نے کان پھٹ پھٹائے اور انھوں نے تھو تھو کرنا شروع کیا ۔ راستے میں کانا ملا، اور انھوں نے فنس پھیر دی ۔ تیلی کی شکل دیکھی، اور دد بلی خون خشک ہوگیا ۔ کسی نے لکیر بنائی اور اس کی شامت آئی ۔ جو کہیں جاتی ہوں، اور کوئی ٹوک دے، تو پھر اللہ دے اور بندہ لے ۔

ہندوؤں کی طرح ساون کے مہینے میں چارپائی بنوانے کی قسم کھائی تھی ۔ دن رات بوڑھا چونڈا ہلانا، اور باتیں بنانا، مگر تھیں بڑی مالدار ۔ الغرض اس بڑھاپے میں بھی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا اور منھ سے انگارے برستے تھے ۔ جب دیکھا کہ لڑکیاں سیانی ہوگئیں، تو سوچیں کہ کنوار پنے کے دن کب تک کاٹیں گے، بڑی لڑکی کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی، اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے، اور کیوں نہ آتے ۔ ایک تو نوجوان دوسرے آن بان ۔ تیسرے مالدار، چوتھے شوخ وطرار، پانچویں، فہمیدہ وسنجیدہ، چھٹے گلفام نازک اندام، ایک زمانے کا دل ان پر آیا تھا ۔ مکھڑا چاند، بلکہ بن گہنا چاند بھی ان کے مقابل میں ماند ۔ قامت زیبا، سرِ آزاد بلکہ رشکِ شمشاد ۔ زلفِ چلیپا بلائے بے درماں ۔ غارتِ گردین وایمان ۔ ابرو شمشیر براں یا تیغ اصفہاں :

بہ قامتِ از قامت مژدہ دادہ	بہ بالا از بلا حرفے زیادہ
براندامش فتد گر پرتوِ ماہ	نزاکت سازدش در خواب آگاہ
بفرقش گل کند گر سایہ بانی	قدش خم گردد از بارِ گرانی
نگاریں پائی اور نرگیس نذر دی	شگفتہ لالۂ پر پائے سردی

بڑی بیگم نے ایک رئیس با توقیر کے صاحبزادے اکبر کے ساتھ اپنی بڑی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہا، اور ان کے پیغام کو قبول کرلیا ۔ بڑی لڑکی حسن آرا بے چاری ششدر اور حیران و مضطر، کہ یا الٰہی اب میں کیا کروں ۔ میاں جو ہونے والے ہیں ان کی صورت کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ۔ ہمجولیاں مبارک سلامت کہتی ہیں کہ یہاں بلیوں خون خشک ہوا جاتا ہے، اور کلیجہ منھ کو آتا ہے، کہ خدا جانے بد قطع ہے، بد وضع ہے، پڑھا لکھا ہے، یا جاہل ناخواندہ ۔ واللہ اعلم خیالات کیسے ہیں، یا الٰہی کیا کروں، کہاں جاؤں ۔ رازِ دل کس کو سناؤں ۔ بولوں تو اڑوس پڑوس کی عورتیں طعنے دیں کہ واہ لڑکی کیا بلائے بیدرماں ہے ۔ یہ تو سوار کو کھڑے کھڑے گھوڑے پر سے

اتار لے۔ اے ہے! ایسی لڑکی فوج کسی کی ہو۔ یہ دیدہ دلیری! ؎

عجب درد لیست جانم را اگر گویم زبان سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

دل ہی دل میں بے چاری کڑھنے لگی۔ اپنی پیاری چھوٹی بہن سے درد دکھ کہتی تھی، اور کس سے کہتی۔ وہ بیچاری بھی سن کر اداس ہو گئی۔ وہ اٹھکھیلیاں سب بھول گئی۔

ایک دن بڑی بیگم جو صبح کو پلنگ سے اٹھیں تو پٹ سے چھینک پڑی۔ چھینک کا پڑنا تھا کہ ان کے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ اور کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ضعیف الاعتقاد تو تھی ہیں، سمجھیں کہ فال بد ہے۔ اب سنیے کہ خواہ مخواہ یہ بھی سمجھ بیٹھیں کہ میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اب کوّا بھی بولتا ہے، تو ماتھا ٹھنکتا ہے، کہ فال بد ہے۔ تیور آنے لگے۔ بڑی بیگم کی تو یہ کیفیت تھی۔ اب حسن آرا کا ذکر سنیے کہ وہ اور اس کی چھوٹی پیاری بہن سپہر آرا شہ نشین میں فرش مکلّف پر بصد شانِ دلبری بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ پڑھتے پڑھتے کیا دیکھتی ہیں کہ ایک مضمون کی یہ سرخی ہے (شریر لڑکا) کیا؟ شریر لڑکا۔ آؤ اس کو پڑھیں۔ دیکھیں کس شریر لڑکے کا حال ہے۔

شریر لڑکا

کم سن لڑکوں کو تو حکماً اور علماً اخوان الشیاطین کہتے ہی آئے ہیں۔ لیکن جس شریر لڑکے کا ہم ذکر کرتے ہیں، وہ شرارت میں شیطان کے بھی چچا ہیں۔ اِن نالائق کی حرکتیں اب اس لائق نہیں کہ ہم ان سے اِغماض کریں، بلکہ ہم پر بحیثیت وقائع نگار فرض ہے کہ ان کو طشت از بام کریں، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو، اور شریف بزرگوار ایسے بد وضع لڑکے کی صحبت میں اپنے صاحبزادوں کو نہ بٹھائیں بلکہ اس سے احتراز و اجتناب کریں۔ یہ شریر لڑکا اسکول میں پڑھنے جاتا ہے۔ مگر دار پڑھائی۔ دو دن گئے چار دن غائب۔ تین گھنٹے درجے میں بیٹھے رہے، اور بس بھاگ کھڑے ہوئے۔ پتا۔ جی نہیں۔ گھر سے دس دس دن غائب غلہ۔ کنوؤں میں بانس پڑ پڑ گئے، مگر وہ چانڈو خانے سے نہ نکلے نہ نکلے۔ اور اگر برآمد بھی ہوئے تو جوا خانے پہنچے۔ مدرسے میں کُل طلبا ان سے نالاں۔ کسی پر دھپ جمائی، کسی کو دھول لگائی، کسی کی کتاب کو پھاڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ کسی کی سلیٹ کو توڑ ڈالا۔ کسی کے قلم کو پاؤں سے کچل دیا۔ کسی کے کپڑے چاک کر ڈالے۔ ماسٹر روز بنچ پر کھڑا کر دیتے تھے، اور سزائے سخت دیتے تھے، مگر وہ چکنا گھڑا پانی کی بوند پڑی، اور تڑ سے زمین پر۔ دو دفعہ

قید بھی رہ چکا۔ مگر بے حیا، پاک بیباک، اور افسوس تو یہ ہے کہ ذات شریف ایک رئیس کے صاحبزادے ہیں۔ خوب نام روشن کیا۔ افسوس صد افسوس! اسکول میں کئی بار لڑکوں کی کتابیں بھی چرائیں اور قلم اور پنسل کے توان سے بڑھ کر چور دیکھے نہ سنے، درجے بھر میں قلم بچنے ہی نہیں پایا۔ لاحول ولاقوۃ یہاں تک تو خیر خیریت تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ شرارت کی، پرسوں سب کو ایک مہاجن کے یہاں کودے، اور کوٹھری کے قفل کو توڑ کر اندر گھسنے لگے، اتنے میں اس مہاجن کی چار دہ سالہ لڑکی نے جو آہٹ پائی تو کلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کو جگایا۔ اماں! اماں! او اماں! ذری جاگو تو بلّی نے تیل کا گھڑا گرا دیا۔ بھشت بھشت! بل بل! اس کی ماں گڑبڑا کر جو اٹھی تو حضرت کوٹھری کے باہر ایک چارپائی کے نیچے دبک رہے۔ اس نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ وہ ڈنڈ پیل جوان خم ٹھونک کے ایک مرتبہ دھم سے چارپائی پر سے کودا۔ چور کے پاؤں کتنے۔ چارپائی کے نیچے سے گھبرا کر نکلا۔ مہاجن کا لڑکا بھی اس کی طرف جھپٹ ہی تو پڑا۔ اس کا جھپٹنا تھا کہ وہ ذات شریف ہاؤ ہاؤ کر کے اس کو ڈرانے لگے۔ چھتری کٹ مرنے والے۔ اور طرّہ اس پر یہ کہ ڈنڈ پیل جوان، خاصے پہلوان ایک تو کڑوا کریلا، دوسرے چڑھا نیم ان کو تاب کہاں، جاتے ہی چمٹ گئے۔ دونوں میں خوب پٹختیاں ہوئیں۔ آخر کار مہاجن کے لڑکے نے ان کو اٹھا کر دے مارا۔ اتنے میں اس کمبخت لڑکے نے کمر سے چھری نکالی، اور بھونک دی۔ بیچارے کی آنتیں نکل پڑیں۔ اس کی ماں نے سر پیٹنا اور چلّانا شروع کیا۔ پڑوسی اور خدمتگار باری اور کہار، پاسی اور برقنداز، فوراً دوڑ پڑے، اور صاحبزادے صاحب کو ہاتھوں ہاتھ گرفتار کر لیا۔ خاکسار اڈیٹر کو یہ بات لکھتے ہی بے اختیار رونا آتا ہے، کہ مہاجن کا لڑکا دو دن کے بعد جاں بحق تسلیم ہوا، اور وہ رئیس زادہ جو چوری کرنے گیا تھا اب حوالات میں بند ہے، اور ضرور پھانسی پائے گا۔ افسوس صد افسوس کہ اس رئیس زادے کی شادی ایک تربیت یافتہ اور حسین رئیس زادی کے ساتھ قرار پائی تھی، جس کا نام حسن آرا ہے۔

یہ پڑھ کر حسن آرا آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ اس کی پیاری چھوٹی بہن گلے سے چمٹ گئی، اور اس کی بہت کچھ تشفی کر کے اخبار اپنی بوڑھی ماں کے پاس لے گئی، اور روتے روتے بصد حسرت و حرماں کہا، کہ اماں جان دیکھیے کیا غضب ہو گیا تھا، آپ نے بے دیکھے بھالے بے سمجھے بوجھے، شادی منظور کر لی تھی۔ اس کے بعد اخبار کا کل مضمون از سرتاپا پڑھ کر سنا دیا۔ ان کی اماں روتے روتے بولیں، کہ بیٹا آج تڑکے جب میں پلنگ سے اٹھی تو پٹ سے کسی نے چھینکا۔ اور میری بائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی ہے! اسی دم پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ میں تو سمجھی ہی تھی بابا، کہ آج کچھ سنائی سنیں گے،

چلو اللہ نے بڑی خیر کی حُسن آرا کو میری طرف سے چھاتی سے لگاؤ، اور کہہ دو کہ جو شریف زادہ تم کو پسند ہو اس کے ساتھ نکاح کر دوں گی۔ مگر پڑھا لکھا ہو۔ عالی خاندان ہو۔ دس آدمی اچھا کہیں۔ گو اس بات پر اکثر آدمی ہم کو ہنسیں گے، مگر تم سوائے حُسن آرا کے اور کسی سے ذکر نہ کرنا۔

خاتون مہ لقا حُسن آرا کی پیاری بہن سپہر آرا اپنی بوڑھی ماں کے پاس سے آئی، تو باچھیں کھلی ہوئیں۔ ہنسی ضبط نہیں ہو سکتی، آنکھوں سے خوشی برستی ہے۔ کلیجہ گز بھر کا، گویا قارون کا خزانہ مل گیا۔ آتے ہی بڑی بہن سے چمٹ گئی، اور کہا لو بہن مبارک، پیاری بہن مبارک ہو! لو اب تو منھ مانگی مُراد پائی۔ دلی تمنا بر آئی۔ اب اداس کیوں بیٹھی ہو، اچھی بہن ذری مسکرا دو، میری خاطر سے (گلے سے چمٹ کر) میں صدقے نہ ہنسے تو ہماری بھنی کھائے۔ ہم کو روئے، آخر شش اب رنج کا ہے کا۔ اللہ سوں وہ خوش خبری سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔

حُسن آرا : اے ہے تو کچھ کہو گی بھی۔ یہاں کیا جانے اس وقت کس غم میں بیٹھے ہیں۔ انھیں دل لگیاں سوجھتی ہیں۔ یہ خوشی کا کون موقع ہے بہن۔ تم نے تو اور کلیجہ پیپ کر دیا۔

سپہر آرا : اے واہ۔ یوں ہم بتا چکے۔ بلا مٹھائی لیے نہ بتائیں گے۔ بات یہ ہے کہ میں نے امّاں جان کو جا کر سب مضمون سارا کا سارا سنا دیا، وہ بھی اداس ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ دیکھا آج سویرے سویرے میری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی۔ سو یہ سنانی سننے میں آئی۔ تب تو میں نے کہا کہ امّاں جان اس کو آپ سنانی سمجھتی ہیں، شکر نہیں بھیجتیں کہ لڑکی اتنی بڑی بلا سے بچی۔ نہیں جانے کیا کچھ ہو جاتا۔ اللہ نے بڑی آبرو رکھ لی۔ ہے ہے! غضب خدا آپ نے تو اندھے کنوئیں میں لڑکی کو ڈھکیل دیا تھا۔ مگر خدا بڑا کارساز ہے۔ آپ تو آج گھی کے چراغ مسجد میں جلائیں کہ بڑی آئی ہوئی ٹل گئی۔ کیا جانے کس کا دیا آڑے آیا۔ اف میں جب سوچتی ہوں تو میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ سو بہن پیاری امّاں یہ سن کر بولیں کہ اب میں نے حُسن آرا کو ان کے فعل کا مختار کر دیا جس کے ساتھ جی چاہے شادی کریں۔ ان کی پسند پر ہے۔ میں اب دخل نہ دوں گی۔ مگر شریف زادہ ہو، اور عالی خاندان۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور کہا کہ امّا جان اپنے قول پر رہیے گا۔ انھوں نے چھوٹتے ہی میری اور تمھاری دونو دونوں کی قسم کھائی کہ اپنے اپنے نکاح کا تم کو اختیار ہے، لیکن شریف زادہ ضرور ہو۔ خاندان کا نام نہ ڈبونا۔ پسند تمھاری منظوری ہماری۔ جس کو تم پسند کرو بشرطیکہ ہم بھی منظور کریں، اسی کے ساتھ نکاح ہو، مگر باجی خبردار کسی سے ذکر نہ کرنا کوئی مرد حسین تمھارے واسطے تجویز کریں گے۔

حسن آرا : (مسکرا کر) یہ کیوں، حسن تو عورتوں کے لیے زیبا ہے۔ مردوں کو اس سے کیا کام۔

ہاں سخن سنج ہو، سخندان ہو، سخنور ہو، خاندان کا اچھا ہو، بد قطع، چیچک رو، کالا کلوٹا، نہ ہو۔ بس۔

سپہر آرا: بس دس میں نہیں جانتی۔ آپ اتنا یاد رکھیے گا کہ جو دولھا بھائی کالے بھجنگا ہوئے تو ہم سے نہ بنے گی۔ اللہ نے حسن کو بڑا رتبہ بخشا ہے۔ آدمی آدمی انتر۔ کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اور پھر تمھارا یہ چاند سا مکھڑا۔ کیا چاند میں گہن لگاؤ گی۔ لوگ نہ کہیں گے کہ بی بی کا یہ حسنِ گلوسوز (سالی کا یہ نورِ عالم افروز) اور میاں کالے بھجنگا ہفتے کا روز۔

حسن آرا: (ہنس کر) اے تو۔ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ خاطر جمع رکھو مجھے اس کا خود خیال ہے۔ مگر بات وہ کرنی چاہیے کہ پاس پڑوس کی عورتیں ہجولیاں طعنے نہ دیں۔

اتنے میں پیر بخش بڈھے نے آواز دی۔ بیٹا کہاں ہو؟ میں بھی آؤں؟

سپہر آرا: آؤ آؤ تمھاری ہی تو کسر تھی۔ یوں آؤ۔ آج سویرے سویرے کہاں تھے۔ شام کو ہم بجرے پر ضرور ہوا کھائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ جو مطلع صاف رہا تو، اور جو آج پھر گھٹا چھائی تو بندی نہ جانے کی۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) حاشا ہیں نہ جانے کی۔ کل تو بجرا ایسا ڈانواں ڈول ہوتا تھا کہ میں سمجھی اب ڈوبی، اور اب ڈوبی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے تنکا بہا چلا جاتا ہے۔ میں اِن کا منھ تاکتی تھی یہ میرا۔ اُف، کلیجہ دھک دھک کرتا تھا اور پانی بلّیوں اُچھلتا تھا۔

حسن آرا: اس وقت تو میری جان پر بن آئی تھی۔ بارے بخیر گذشت۔

پیر بخش: تم سے کچھ کہنا ہے بیٹا! دیکھو تم ہماری پوتیوں سے بھی چھوٹی ہو تم دونوں کو میں نے گود میں کھلایا ہے، اور تمھاری ماں ہمارے سامنے بیاہ آئی ہیں۔ تمھارے ابا کو خدا بخشے ان تک کو میں نے پالا تھا۔ مگر رہے نام اللہ کا۔ میں تو تمھارے دادا کے یہاں داروغہ تھا۔ ملّاحی تو شوقیہ سیکھی، کچھ میرا پیشہ تو ہے نہیں۔ تم دونوں کو میں اپنے فرزند سے زیادہ چاہتا ہوں۔ جو میں کہوں اسے کان دھر کے سننا۔ تمھارے بھلے کو کہتا ہوں۔ سنو! تم اب سیانی ہوئیں۔ اب تمھاری شادی کی ہمیں فکر ہے۔ پہلے تم سے مشورہ کر لوں، پھر بیگم صاحب سے عرض کروں۔ یوں تو کوئی لڑکی آج تک بن بیاہی رہی ہی نہیں، لیکن دولھا انھیں لڑکیوں کو اچھا ملتا ہے، جو خوش قسمت ہیں۔ تمھاری ماں کو پردے کا کچھ کچھ خیال ہے۔ ہاں اور اُمور میں پرانی ہی لکیر کی فقیر ہیں۔ وہی دقیانوسی خیالات، مگر یہ میرا ذمّہ کہ جس شریف کو تم پسند کرو، اس کو وہ بھی منظور کر لیں گی۔ اور تم بھی نامِ خدا سیانی، اور فہمیدہ ہو۔ تمھاری پسند کچھ ایسی ویسی تھوڑا ہی ہوگی۔ آج کل یہاں ایک جوان نوخیز وارد ہوئے ہیں۔ صورت شہزادوں کی سی، سیرت فرشتوں کی سی، وضع بھلے

مانسوں کی سی، مگر بانکپن لیے ہوئے حُسن کا یہ عالم کہ انسان گھنٹوں گھورا کرے۔ بدن چھریرا، مگر کسیلا۔ مسیں بھیگتی رہیں۔ ڈاڑھی مُوچھ کا نام نہیں۔ ابھی اُٹھتی جوانی ہے، اور طبیعت وہ نور کی پائی ہے کہ اہو ہو ہو۔ شعر گوئی میں برق، بول چال، روز مرّہ ان کا حصّہ ہے۔ علم و فضل میں یکتا۔ خوشنویسی میں دوسرے یاقوت رقم خان۔ تصویر ایسی کھینچیں کہ نقل کو اصل کر دکھائیں۔ بانک پٹے کشتی نبوٹ میں نظیر نہیں رکھتے۔ نثر نثرہ نثار، شعر شعرِیٰ شعار۔ غرض کہ اس قدر اوصافِ حمیدہ، جناب باری نے اس جوانِ نوخیز کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، کہ شاید ایک متنفس میں تو اتنے اوصاف نہ ہوں گے۔ عالی خاندانی چہرے سے برستی ہے۔ خدا ایسا کرتا کہ حُسن آرا کے ساتھ ان کا نکاح ہوتا، تو خوب بات تھی۔ تم دیکھ لو، جو تم کو پسند ہو، تو تمھاری ماں سے ذکر کروں۔ نہیں تو کہہ کر بات گنوانے سے فائدہ! ہاں خوب یاد آیا، یہ وہی جوان ہے جو بجرے کے ساتھ تم کو دیکھتا ہوا باغ میں جا رہا تھا۔ سمجھیں؟ یاد آیا؟

حسن آرا: (آنکھیں نیچی کر کے) وہاں تو بہت سے آدمی تھے۔ کیا جانے کس کو کہتے ہو؟ چلو خیر؟ بے دیکھے کوئی کیا کہے۔

سپہر آرا: مطلب یہ کہ دکھا دو۔ بھلا دیکھیں تو ہیں کیسے۔ آپ نے تو تعریف کے پُل ہی باندھ دیے۔ خوبصورت اور تربیت یافتہ، اور عالی خاندان، اور کم سن ہوں، اور چاہے کوئی صفت ہو یا نہ ہو، تو چشم ما روشن ورنہ بخیر۔

پیر بخش: بابا جب دیکھو گی تو خدا کا شکریہ ادا کرو گی کہ ایسی پیاری پیاری صورت دکھائی۔ ایسے جوان ہم نے تو آج تک کبھی دیکھے بھی نہ تھے۔ وہ نور ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ نظر کا پاؤں پھسلا جاتا ہے۔ اور تربیت یافتگی تو ان کی تقریر ہی سے ظاہر ہے۔ قسم خدا کی، جو بات کرے ریجھ جائے۔ اور ابھی مسین بھیگتی ہیں۔ ابھی سن ان کا کیا ہے۔ حسن آرا کا اگر ان کے ساتھ نکاح ہو تو ان کی خوش نصیبی۔ ہم تو تم کو اپنی لڑکیاں سمجھتے ہیں۔ تمھارے باپ ہم کو دادا کہا کرتے تھے۔ تمھارے دادا البتہ ہمارے ہم سن تھے۔

سپہر آرا: یہ تو تم تب کہو، جب کوئی تمھارا کہنا نہ مانے۔ اچھّا پھر ان کو کب دکھاؤ گے، اور وہ یہاں آنے کیوں لگے بھلا۔ ہم کسی کے مکان پر جا یا نہ چاہیں۔ چلو بس دیکھ چکے ٹائیں ٹائیں فش۔

حسن آرا: ہم بتائیں جب ہم بجروں پر ہوا کھانے چلیں تو وہ بھی کسی ترکیب سے وہاں ہوں۔ بجرے پر تو ہم آنے نہ دیں گے مگر وہ کنارے پر کھڑے رہیں۔ ہم ان کو بخوبی دیکھ لیں گے۔ تو ماں سے کہیں اور پھر ان کو مکان پر بلوائیں، اور باتوں باتوں میں ان کا امتحان لیں۔ دیکھیں تو پڑھے

کتنا ہیں۔ جو اچھی تعلیم نہ پائی ہوگی تو ہماری نظروں سے گر جائیں گے۔ جو میاں اور بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں، تو خوب ہی مزے سے کٹے۔ میں نے تو دل میں ٹھان لی ہے کہ عمر بھر بن بیاہی رہوں گی، یا اگر شادی کروں گی تو کسی ایسے کے ساتھ جو زیورِ علم وفضل سے متجلّی ہو، اور حسین بھی ضرور ہو۔ وہ میاں کیا جو الف کے نام بے نہ جانتے ہوں، جن کو میں خود برسوں پڑھانے کا دم بھروں۔ مجھے تو مر جانے کے برابر ہے، کہ میاں بالکل جاہل گنوار ہیں، اور ایک مجھ پر کیا فرض ہے، جو پڑھی لکھی ہوگی، وہ پڑھے لکھے ہی کو چاہے گی۔ ہاں مورکھ عورتیں چاہے اس کی فکر نہ کریں۔ مگر ہمیں تو شاق گذرے۔ لُطف یہ ہے کہ میاں کتاب پڑھ رہے ہیں، بیوی مزے مزے سے سُن رہی ہیں۔ بیوی نے پڑھا کبھی میاں کو سنایا، کبھی اخلاق کی بحث ہو رہی ہے۔ کبھی شعر شاعری کا چرچا ہے۔ کبھی کوئی دلچسپ قصّہ پڑھ رہے ہیں۔ مذاق کی باتوں پر میاں بیوی دونوں کے دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ یہ ان کو صلاح نیک دیں، وہ ان کو مشورہ دیں۔ ان پڑھ لاکھ ذکی ہو پھر جاہل ہے۔ عورت جب تک خواندہ نہیں کوئی صلاح معقول نہیں دے سکتی۔ وہ تو ہزار باتوں کی ایک بات کہہ دے گی کہ میں مورکھ جاہل یہ باتیں کیا جانوں۔ بھلا میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ بن پڑھی بیوی سے تربیت یافتہ خوش کیوں کر رہتے ہیں۔ مگر ہاں ان کو یہ ڈھارس ضرور ہوتی ہوگی کہ کریں کیا۔ تمام ہندوستان میں اگر مشعل لے کر ڈھونڈھیں تو بھی خواندہ اور تربیت یافتہ عورتیں شاید دو ہی چار ملیں گی۔ ہم نے دو ہی چار کا نام سنا ہے۔ ایک رامابائی۔ دوسری چندر مکھی۔ اور دو چار ہوں گی باقی اللہ اللہ خیر صلاح"۔

حُسن آرا یہ گفتگو کر ہی چکی تھیں کہ پیر مرد نے کہا: تم ٹھہرو میں ابھی ابھی آتا ہوں، اور خدا نے چاہا تو آج ہی سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب دیر اچھی نہیں۔ کسی تدبیر سے میں تم کو دکھا دیتا ہوں۔ ان سے رخصت ہو کر پیر مرد باہر گئے، اور انتظار میں کھڑے ٹہل رہے تھے کہ میاں آزاد اب آئیں، اور اب آئیں۔

اور ان کی کیفیت سنیے کہ ظرّاف کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے جہاں جہاں چلے آتے ہیں۔ چو طرفہ اودی گھٹائیں، اور ٹھنڈی ہوائیں۔ ہر سمت بہار اور لالہ زار، اور طرفِ چمن غالیہ بار، اور میدان بھر میں میاں آزاد، اور ان کے یار میٹھی میٹھی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔

ظرّاف : اب گھبراہٹ کیا ہے میاں۔ اب تو کوئے دِلدار سامنے ہے۔

آزاد : سنا نہیں؟

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتشِ شوق تیز تر گردد

ایک ایک قدم اس وقت ایک ایک منزل ہے۔ چلنا دوبھر ہوگیا۔ بس یہی شوق ہے کہ پر لگا لیتا اور راڑ بھاگتا۔ اور پھدک کر اُس ایوان کیوان نشان پر ہو رہتا۔ جو اس وقت دھوپ نکل آئے تو موت ہی کا سامنا ہو۔

ظرّاف : یار تمھاری وحشت سے ہم بہت ہی گھبراتے ہیں، مگر واسطے خدا کے وہاں وحشت کی نہ لینا۔ ورنہ کی کرائی محنت سب خاک میں مل جائے گی۔ ذرا آدمیت کے زمرے سے خارج نہ ہو جائیے گا۔

اتنے میں سامنے سے آٹھ دس گدھے آ رہے تھے، اور گدھے والا تڑاتڑ کوڑے ان سب پر پھٹکار رہا تھا۔ میاں آزاد نے کہا کیوں بھئی آخر ان گدھوں نے تمھارا بگاڑا کیا ہے؟ جو پیٹتے جاتے ہو۔ راہ راہ بیچارے جاتے ہیں، اور تو خواہ مخواہ ان کو اس بیرحمی سے ٹھونکتا جاتا ہے۔ آخر کچھ خدا کا بھی خوف ہے یا نہیں؟ گدھے والے نے اس کا تو کچھ جواب نہ دیا، اور گدے سے ایک اور جمائی۔ تب تو میاں آزاد آگ ہو گئے، اور انھوں نے بڑھ کر ایک ڈگ جمایا، اور پھر دوسرا دیا، اور پھر تیسرا، اور بے گانا معقول؟ ابے آخر تیرے نزدیک ان میں جان ہی نہیں ہے۔ اگر نہ چلتے تو ہم کہتے کہ لو بھئی خیر یو بھی سہی۔ خاصے جا رہے ہیں، کھٹا کھٹ اور آپ پیٹ رہے ہیں۔

ظرّاف : بس اسی کو تو وحشت کہتے ہیں۔ کوئی پوچھے آپ کون آخر۔ آپ کو کسی فعل سے کیا واسطہ آپ کوئی قاضی ہیں، کوتوال ہیں، مفتی ہیں، اس کے گدھے ہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آپ بیچ میں بولنے والے کون۔ آخر کوئی وجہ بھی تو ہو؟ کہنے لگے گدھوں کو کیوں پیٹا۔ اس نے خوب کیا آپ بولنے والے کون۔

آزاد : بھئی پھر جو ہو ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا، کہ کسی بے زبان زیردست کو کوئی ظالم زبردست دق کرے اور ہم ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم، کے مضمون پر عمل کریں۔

کوئی دس ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دیکھا ایک چریمار بیگ لیے لاسا کپے میں لگائے جانوروں کے فریب دینے کو ٹٹی پر پتے جمائے، جال لٹکاتے ہوئے، جانوروں کو پکڑتا پھرتا ہے ایک دفعہ ہی ایک طوطا پھنسا تو چڑیمار نے حسبِ معمول بڑی بیدردی سے اس کو جھولے میں ڈالا۔ میاں آزاد آگ بھبھوکا ہو گئے، اور غل مچا کر للکارا کہ او چڑیمار! چھوڑ دے اس طوطے کو ابھی چھوڑ، ابھی ابھی چھوڑ، چھوڑتا ہے یا میں آؤں؟ چڑیمار ہکا بکا، کہ یا الٰہی میں کروں تو کیا کروں۔ یہ تو عجب وحشی آئے۔ اس نے کہا صاحب یہ تو ہمارا پیشہ ہی ہے۔ آخر اس کو چھوڑ دیں تو کریں پھر کیا؟ آپ بولے کہ بھیک مانگ، مزدوری کر، مگر یہ چھوڑ دے۔ تب تو میاں ظرّاف اور بھی بگڑے۔

لاحول ولاقوة - آخر آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں۔ آپ ہیں کون؟ سنیے! وہاں اس گدھے والے سے لڑ پڑے۔ یہاں چڑیمار کی شامت آئی۔ ایسا تو مزاج ہم نے کسی کا دیکھا ہی نہیں آج تک۔ جس سے دیکھو لڑنے پر آمادہ۔ خم ٹھونک کے کشتی کے لیے موجود۔ میاں آزاد نے جھپٹ کر جھولا وولا، کپا وپا، جال وال، سب چھین چھان لیا، اور جھولے کو جو کھولا تو جانور سب پھر سے اڑ گئے۔ ایک مشرق، دوسرا مغرب، تیسرا شمال، چوتھا جنوب کی سمت پھُر پھُر۔ جانوروں نے جو قید سے آزادی پائی، تو جنگل کی خوب ہوا کھائی، مگر چڑیمار کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا کہ اتنی دیر دوڑ دھوپ کر کے چند جانور ملے تھے، وہ یوں گئے۔ میاں آزاد کو صرف اتنے ہی پر قناعت کہاں۔ کپے کو کھٹ سے کاٹ کوٹ کے پھینکا۔ جال کو بھی نوچ ناچ کے برابر کیا۔ چڑیمار۔ قہر درویش بر جانِ درویش، کہہ کر چپ ہو رہا۔ لیکن میاں ظرّاف کا چہرہ مارے غصّے کے سُرخ۔ آزاد نے جیب سے نکال کر دس روپیے چڑیمار کو دیے، اور بڑی دیر تک فہمایش کی۔

آزاد : کیوں قبلہ اب تو منزلِ مقصود قریب ہے؟

ظرّاف : قریب وریب میں نہیں جانتا۔ آپ کا دماغ صحیح نہیں ہے۔ ہماری تو یہی رائے ہے کہ آپ کسی طبیب حاذق سے رجوع لائیں۔

آزاد : بھائی تم سمجھتے ہی نہیں، کہ میرا اصل مطلب کیا ہے۔

ظرّاف : بس قبلہ اپنا مطلب آپ رہنے دیجیے سلام!

آزاد : سنیے تو سنیے تو! کہاں چلے کہاں؟ خدا کا واسطہ جو آگے بڑھے۔

ظرّاف : آپ کو شاید جوا ور کھٹکا ہو تو مطمئن رہیے گا۔

آزاد : اجی لاحول ولاقوۃ۔ ؎

قرار در کفِ آزادگان نگیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

لے اب غصّے کو تھوک دیجیے، اور چلیے ہمارے ساتھ۔

ظرّاف : اب تو راستے میں نہ لڑ پڑیے گا؟

آزاد : کیا مجال۔

الغرض میاں آزاد اور ظرّاف چلے۔ چلے تو دیکھتے کیا ہیں کہ راہ میں ایک گاڑیبان بیل کی دُم اینٹھ رہا ہے۔ آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دفعہ ہی للکارا، کہ او گاڑیبان خبردار جو آج سے بیل

کی دُم اینٹھی - ظرّاف نے قل مچایا کہ کیوں صاحب پھر وہی - کیوں صاحب آتی جلد قول و قرار بھول گئے -
یہاں میاں آزاد چپ چاپ چلنے لگے - تھوڑی دیر میں دونوں اس ایوان کے قریب پہنچے -

یہ نرالا امتحان ہے

دلدادۂ جمال جانانہ، میاں آزاد موزوں ترانہ، اپنے شفیق رفیق، اور خلیل بالتحقیق، میاں ظرّاف کے ساتھ اس ایوانِ سعادت توامان کے قریب چماں چماں اور خراماں خراماں جانے لگے تو کیا دیکھتے ہیں، کہ ملّاحِ ملیح یعنی وہی پیر مرد وجیہ، پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا سامنے سے آرہا ہے -

آزاد : السّلامُ عَلیکُم -

پیر مرد : عَلیکُم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ -

ظرّاف : مزاج اقدس حضور کا -

آزاد : مزاجِ معلّٰی -

پیر مرد : آپ اپنے مزاج کی کیفیت فرمائیے - میرا مزاج تو آج اَوجِ عُیُوق پر ہے -

آزاد : ہاں تو پھر ہمارا دماغ بھی عالمِ بالا کی سیر کر رہا ہے - بے پر کی آج اُڑا رہا ہے - آپ کے چہرے سے خوشی برستی ہے :

مرحبا طائر فرّخ پے و فرخندہ پیام
خیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام

ظرّاف : راہ تو وہ نکالی ہے کہ ہم آپ کے لیے خضر ہو گئے، اور یار خواب ناز میں ہے -

آزاد :
تو بخواب ناز بودی و من از رقیب پنہاں
کفِ پائے تو بوسہ دادم رُفقا شنیدہ باشی

ظرّاف : درست تو رقیب بندہ ہوا -

آزاد : کہیے پھر کچھ کہیے، تو مژدہ سنانے میں اتنی دیر -

پیر مرد : آئیے غریب خانہ تک قدم رنجہ فرمائیے! وہ سامنے کلبۂ احزاں ہے - چل کر آرام تمام تشریف رکھیے، اور داستان سنیے! فتح ہے فتح -

آزاد : ع - اے وقتِ تو خوش کے وقتِ ما خوش کر دی - خانۂ احسان آباد -

پیر مرد : اے حضرت یوں تشریف رکھیے میاں ظرّاف صاحب میری خاطر سے آپ ہی یوں آئیے -

یار دُجھ بوڑھے کا اتنا تو کہنا مانو۔ خیر صاحب۔ ع۔ صدر ہر جا کہ نشیند صدر ست، سنیئے! بندہ آج صبح کو ان دونوں کے پاس گیا۔ اور آپ کی اس درجہ تعریف کی کہ پُل باندھ دیے، اور پھر آپ جانیئے بندہ گو عالِم نہیں، فاضل نہیں، منشی نہیں، مولوی نہیں، لیکن آخر عُلما اور فضلا اور کُملا اور شعرا کی آنکھیں تو دیکھی ہیں، بڑے بڑے نکتہ پردازوں، اور جادو طرازوں کی صحبت میں باریاب رہا ہوں۔ اس لسّانی اور لفّاظی سے تقریر کی کہ اب آپ کے جمالِ باکمال دیکھنے کو لعل در آتش ہیں۔ کئی بار کہہ چکیں کہ صورت تو دکھا دو۔ لو حضرت معاملہ تو سب لیس ہے۔ ذرا کسر نہیں۔ لیکن بڑی بڑی پیچ ہے۔ وہ آپ کا امتحاں لیں گی۔ سوالات کے جوابات آپ کو دینے ہوں گے، ہاں یہ بڑی سخت شرط ہے۔ دونوں کی دونوں پر کالۂ آتش ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھیں اور آپ بغلیں جھانکنے لگیں۔ یہ البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ جو رائے ہو اس سے اطلاع دیجیے۔ خدا کی قسم انھوں نے قسم کھائی ہے کہ جاہل مورکھ ان پڑھ کے ساتھ نکاح نہ کریں گے، نہ کریں گے۔ ہرگز نہ کریں گے۔ آپ سوچ سمجھ لیجیے۔

آزاد:
اے خدا قربانِ احسانت شوم
ایں چہ احسان ست قربانت شوم

واللہ منھ مانگی مراد پائی۔ جو تمنّائے دلی تھی وہ بر آئی۔ ایک نہیں ہزار بار امتحان لیں، تو کیا پروا ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ ہمیں بھی آپ کوئی گوکھا سمجھے ہیں کیا۔ ہم تو لاکھوں میں امتحان دیں۔ ہمیں منظور ہے بسم اللہ چاہے جو امتحان لے، اور اگر وہ خود امتحان لیں تو واللہ روح خوش ہو جائے۔ ازیں چہ بہتر۔ ہمارے جوہر تو کسی طرح ان پر کھلیں۔ منطق میں، فقہ میں، ادب میں، فلاسفہ میں، ریاضی میں، ہیأت میں، نظم میں، نثر میں، جس میں چاہیں امتحان لیں، بھئی جو نکل جاؤں تو آزاد نہیں۔ عمر بھر آخر کیا کیا کیے۔

ظرّاف: بھائی امتحان کا نام بُرا۔ شاید رہ گئے تو پھر؟

آزاد: پھر آپ کا سر۔ رہ جانے کی ایک ہی کہی۔ اور امتحان کے نام سے آپ جیسے گوکھوں کی روح فنا ہوتی ہے یا ہماری خیر، آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں ہم اپنے سمجھ لیں گے۔

پیرمرد: میں جاکر کہہ دوں کہ وہ آئے ہیں۔ بسم اللہ! امتحان لیجیے۔ انھیں بسر و چشم منظور ہے۔ لیکن انھوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہم بجرے پر سوار ہوں، اور اس وقت ان سے آنکھیں چار ہوں۔ مگر شرط یہ کر دی ہے کہ چاہے بدلی ہو، لیکن منھ نہ برستا ہو، اور ہوا بہت تیز نہ ہو۔ سو اس وقت بدلی بھی چو طرفہ چھائی ہوئی ہے، اور ہوا تو اِس زنّاٹے سے چلتی ہے کہ دُبلا پتلا آدمی شاید بتّانے لگے۔ اچھا آپ بیٹھیں میں آتا ہوں۔

کہیں تو چل میں آتا ہوں کے مطابق ہی عملدرآمد نہ کیجیے گا۔

الغرض پیرمرد رخصت ہو کر اور اجازت لے کر، محل میں گئے۔

حُسن آرا : کہیے آپ کیا خبر لائے۔ کچھ خوش خوش آرہے ہو۔

پیر مرد : وہ آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی باچھیں کھل گئیں۔ کہیے تو بلالاؤں بیٹی۔ دیکھتے ہی جی نہ خوش ہو جائے تو سہی۔

سپہر آرا : نامحرم کا کھٹ سے گھر میں چلا آنا کیسا پہلے ان سے کہیے کہ باغ کی سیر کریں۔ رَوِشیوں میں ان کو لے کر ٹہلیے۔ ہم جھروکوں سے دیکھیں تو سہی۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا پچ کلیاں جو آیا داخل۔ واہ!

حُسن آرا : ہاں کہتی تو سچ ہے ابھی بے موقع ہے۔

پیر مرد باہر گئے اور کہا کہ ابھی آرام میں ہیں۔ آئیے تب تک ہم آپ مل کر گل گشت چمن کریں۔ دیکھے تو باغ میں کیا فضا ہے، اور روشوں میں سُرخی پر قیامت کا جوبن ہے۔ بھئی چلو باغ میں ٹہلیں۔ اِدھر میاں آزاد اور میاں ظرّاف اور پیر مرد باغ کی روشوں میں ٹہلنے لگے، اور اُدھر جھروکوں سے ان دونوں زہرہ جبیں، نازنین، رشک قمر، پری پیکر، خاتونوں نے دزدیدہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ میاں آزاد مہر طلعت، مہ لقا، سبزہ آغاز، شوخ و طنّاز، حسین و مہ جبین، اودبی بنے ہوئے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ دیکھتے ہی پھڑک گئیں۔ بڑی بہن نے تو ضبط کیا مگر چھٹکی سے نہ رہا گیا۔

سپہر آرا : اہو ہو ہو۔ کیا رنگیلا چھیل چھبیلا جوان ہے۔ کیا نورانی صورت ہے۔ بہن یہ تو تمھارے ہی لائق ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑی اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ میری اچھی باجی جان ہماری خاطر سے ان کے ساتھ بیاہ کرلو میں صدقے گئی مان لو۔

حُسن آرا : اے واہ کیسی نادان ہو۔ بھلا شادی بیاہ بھی کہیں کسی کی خاطر سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ دل کا سودا ہے۔ ہم بے سمجھے بوجھے دل سی پیاری چیز کسی کو نہ دیں گے (جھلّا کر) اور پھر ایسی ہی تم گرویدہ ہو تو تم ہی سہی۔

سپہر آرا : (گردن نیچی کر کے) بڑی بہن ہو کیا کہوں۔

اُدھر وہ سب سبزہ و لالہ و گل و سُنبل کے جوبن لوٹتے تھے، اور وہ دونوں گل بدن، سیم تن، دزدیدہ نگاہ میاں آزاد پر ڈالتی تھیں کہ ایک دفعہ ہی دو سوار سُبک خیز اور بلا کے تیز گھوڑوں پر سوار، عجب بانکی ادا سے آن موجود ہوئے۔ انھوں نے میاں آزاد کو اور میاں آزاد نے ان کو تیکھی چتون سے دیکھا۔

آزاد : (پیر مرد سے) یہ تو اچھے رقیب پیدا ہو گئے۔ بغلی گھونسا۔ ان کو کسی ترکیب سے ٹال دیجیے۔

پیر مرد : یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ان دونوں کے منھ سے تو انگارے برستے ہیں۔ فوجی آدمی ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ مگر ہیں رئیس زادے یہ بھی، اور فوج کے افسر ہیں۔ آپ ادچی بنے ہوئے ہیں۔ آپ کی تلوار ہر دم میان سے دو انگل باہر رہتی ہے۔ آج خون ہونا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ اگر ایک بھی حلیم مزاج ہو تو بات بن جائے، اور جو دونوں کے دونوں مغرور المزاج ہوئے تو پھر وہی شعر صادق آتا ہے :

دگر در ہر دو جانب جاہلانند

اگر زنجیر باشد بگسلانند

ایک کام کیجیے آپ کا اور ان کا سب کا امتحان لیا جائے۔ جو اول رہے اسی کے نام کی فتح۔ سچ کہیے گا کیا فیصلہ کیا ہے۔

آزاد : منظور۔

پیر مرد نے محل میں جا کر حسن آرا اور سپہر آرا سے کہا کہ وہ دونوں گھر دجوان بھی سامنے گھوڑوں پر سوار کھڑے ہیں۔ میاں آزاد ان کو اور وہ ان کو قہر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تو میں نے یوں فیصلہ کیا کہ تم سب کا امتحان لیا جائے۔ دیکھیں کس کا ستارہ چمکتا ہے۔ قسمت آزمائی ہے۔ انھوں نے میرے اس مشورے کو پسند کیا، مگر سپہر آرا سوچ کر بولی، نہیں بہن۔ آزاد ہی کے ساتھ بیاہ رچے تو کیا بات ہے۔ خیر پیر مرد خوش خوش باہر گئے، اور ان دونوں جوانان رعنا تن سے یوں گفتگو کی۔

پیر مرد : اترو بھیّا! گھوڑوں کو سائیس کے سپرد کر دو، آؤ بیٹھو!

اِلّا اللہ کہہ کر وہ دونوں دھم سے اتر پڑے، تو پیر مرد نے کہا، سنو بھائی ان دونوں مہ وشان جاہ و جلال پر اگر آپ کا دل آیا ہے تو ہم ایک سہل سی تدبیر بتا دیں۔ یہ بے سمجھے بوجھے بیاہ نہ کریں گی۔ اتنا سنّا تھا کہ ایک کڑک کر بولا، کیا کہا؟ دوسرے نے کہا داغ دے دھواں اس پار ہو۔ پیر مرد کے ہوش پرّاں کہ بُرے پھنسے، آہستہ سے کہا کہ وہ امتحان لینے کو کہتی ہیں۔ امتحان چہ معنی دارد؟ سٹھیا گیا ہے بڈھے کیا؟ ارے صاحب۔ ارے نرے کہاں کی نکالی نامعقول۔ اجی حضور وہ علم و فضل میں امتحان لیں گی۔ کیا؟ علم و فضل۔ ہم کیا کچھ مکتب خانے کے لونڈے ہیں۔ ہمارا علم ہماری تلوار (سڑاپ سے میان کے باہر نکال کر) یہ چمکتی دمکتی تلوار دوسرے یہ تلوار (تڑ سے میان کے باہر تھی) اب پیر مرد ہکّا بکّا کہ بات کرتے ہی تلواریں اگل پڑیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ بھئی اچھے اجہلوں سے سابقہ پڑا ہے۔

بولیے کہ آپ امتحان دیں گے یا نہ دیں گے ایک نے کہا دیں گے، دوسرے نے کہا پہلے تیراسر کاٹ لیں گے تب تو پیر مرد بھی کس قدر تیز ہوئے۔ بس میاں بس۔ بہت بانکپن کی نہ لو، میرے پوتے کے برابر ہو، اور مجھی کو للکارتے ہو، اور تلوار دکھاتے ہو۔ بڈھوں کے منھ لگتے ہو (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) توبہ توبہ بانکپن کے یہ معنی نہیں کہ بڈھوں پر تیز ہو۔ یہاں منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ہم تو اب حلوا کھانے کے کام کے ہیں۔ لڑنے بھڑنے کا زمانہ اب کہاں رہا۔ ایک جوان نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ معاف کیجیے گا دوسرے نے قدموں پر ٹوپی رکھی کہ قصور ہوا۔ خیر اب اصل حال، اور کل داستان کا لُبِّ لُباب سنیے! کہ حسن آرا سپہر آرا سولہ سنگار کر کے ایک پُر تکلف کمرے میں جلوہ گر ہوئیں، اور میاں آزاد کو بلوایا۔ یہ مژدۂ روح افزا سنتے ہی میاں آزاد کے رخسارِ تاباں پر فرطِ طرب سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ قدم بڑھاتے ہوئے کمرے میں پہنچے، تو دیکھتے کیا ہیں کہ کمرا دُلہن کی طرح سجا ہوا ہے۔ مشک و عنبر کی چوطرفہ خوشبو آتی ہے۔ جو شے ہے بے بہا، جو چیز ہے دلربا، فرش مکلّف کرسیاں رنگین، در و دیوار غیرت آگیں:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

سامنے جو نظر کرتے ہیں تو ایک زرنگار اور پُر بہار پردہ پڑا ہے، اور وہ دونوں خواتین ملائک نظر فریب۔ مہ لقا اور جادو نگاہ، ورنگین ادا متمکّن ہیں۔ مگر پردہ حائل۔ نور نظر سے غائب۔ تب تو میاں آزاد بے اختیار بلحنِ داؤدی کہہ اٹھے:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی　　بازارِ خویش و آتش ما تیز می کنی
طالبِ نظارہ ام، پردہ برافگنِ زرخ
پیشِ صفِ راستان شعبدہ بازی مکن

حُسن آرا: مزاج شریف؟

آزاد:
حُسنِ تو ہمیشہ در فزون باد
رویت ہمہ سال لالہ گون باد

حُسن آرا: یا الٰہی دیوان کے دیوان نوک زبان میں ہیں۔ میں مزاج شریف پوچھتی تھی۔

آزاد:
خجالت آفتابِ ہر نظر باد
زخوبی روئے خوبت خوب تر باد

سپہر آرا: کوئی فی البدیہہ شعر سنائیے۔

آزاد:
کے شعر تر انگیز و خاطر کہ حزیں باشد
یک نقطہ دریں معنی گفتیم ذہین باشد

حضرت اب تاب گفتگو نہیں، روح پر صدمہ ہے۔ واسطے خدا کے بمار ا اور رقیب روسیہ کا امتحان لیجیے۔

الغرض پیر مردان دونوں جوانانِ طنّاز و سراپا انداز کو بھی لے آئے اور امتحان شروع ہوا۔

حُسن آرا: اس مصرعہ کا دوسرا مصرعہ فرمائیے۔ مگر مطلع ہو۔ ع۔

شب چو آمد ماہِ ما بر بامِ ما

جوان۔ ؎
شب چو آمد ماہِ ما بر بام ما
پُر شدہ از جوہر دل جامِ ما

آزاد: الغلط شراب کو فصحائے نکتہ پرور، اور شعرائے ذی ہنر نے جوہرِ روح باندھا ہے۔ جوہرِ دل نیا محاورہ ہے۔ لسان الغیب حافظ شیراز کا شعر ہے:

بدہ ساقی آں جوہرِ روح را دوائے دلِ ریشِ مجروح را

دیکھو مصرع یوں لگاتے ہیں ؎

شب چو آمد ماہِ ما بر بامِ ما
خندہ زد بر صبحِ روشن شامِ ما

حُسن آرا: بارک اللہ۔ ایک بوڑھا اپنی نئی شادی کرنے کی ٹھانے مگر لڑکی چھوٹی ہو ۱۲۹۶ ہجری میں بیاہ قرار پایا، مادۂ تاریخ تو اس وقت موزوں کیجیے۔

آزاد: پیر نابالغ۔

سپہر آرا: دیکھوں پیر کے دو اور دس بارہ اور دو سو۔ دو سو بارہ ہوئے اور نا کے پچاس، اور ایک اکیاون، اکیاون اور دو سو بارہ کتنے ہوئے دو سو ترسٹھ، اور با کے تین۔ دو سو چھیاسٹھ اور ت کے تیس اور ہزار ایک ہزار تیس، اور دو سو چھیاسٹھ بارہ سو چھیانوے ہوئے۔

حُسن آرا: واہ۔ واہ وا۔ سبحان اللہ کیا موزوں طبیعت پائی ہے۔ چشم بد دور، کیا ذہن کی رسائی ہے۔ کیا برجستہ تاریخ فرمائی ہے۔ وہ دونوں جوان سخت شرمائے اور گو بڑے کرارے اور طاقت اور فنون سپہ گری میں طاق تھے مگر آزاد پر نظر ڈالی تو ان کے حُسن اور کس بل، اور قد و قامت اور رعنائی کے مقابل میں جھیپ کے چل دیے:

بیا ساقی کہ فتح ماست امروز شکستِ توبہ ہا برخاست امروز
بیا ساقی کہ خلوت خانۂ ما منور گشت از جانانۂ ما
بدہ جام مے از میخانۂ عشق کہ بیخود سر کنم افسانۂ عشق

اب میاں آزاد افلاک الافلاک پر ٹھگلی لگا کر لامکاں کے پار ہو گئے، اور کیوں نہ ہو۔ ایک مہ پارہ شوخ و سنگ، روکش پری رخانِ فرنگ سے دو چار ہو گئے۔ ادھر آزاد شیفتہ و دیوانہ شمع رخسار آتشیں، پر پروانہ، ادھر پری خانہ، اور جان جانانہ۔ ایک دفعہ ہی بادِ بہاری نے اس پردۂ زرنگاری کو جو اٹھایا۔ تو نور کا ٹکا نظر آیا۔ حسن آرا بے حجاب۔ سپہر آرا برافگندہ نقاب، دونوں نکھری ہوئیں۔ زلفیں بکھری ہوئی۔ پردے کا گرنا، اور نا محرم پر نظر پڑنا ہی تھا کہ وہ دونوں انا البرق کہتی طرارہ بھر کے بدن کو چھپاتی ہوئی، وہ ہو رہیں۔ اس وقت ان دونوں کا بیتابانہ پھرتی کے ساتھ اچکنا اور بجلی کی طرح چمکنا میاں آزاد کی آنکھوں میں کھپ گیا۔ سپہر آرا کی تو رگ رگ میں شوخی بھری تھی، وہ تو دم کے دم میں چمک دمک کر ایک ہی ذقند میں نظر سے اوجھل ہو گئی، مگر حسن آرا کسی قدر نستعلیق تھیں۔ عمداً ذرا لڑکھڑانے لگیں۔ اس بتِ طنّاز کو میاں آزاد خانہ برانداز نے نظر بھر کر دیکھ لیا:

نگاریں دختری بردش زمہر ہوش چہ دختر از قیامت دوش بر دوش
نہاں در گیسوا و لیلۃُ القدر عیاں از جبہۂ او مطلع الفجر
غزالِ چشمِ تکلیف رَم ہوش نگاہِ مست صد میخانہ در جوش
دراز از زلف او عمر تسلسل عیاں از پیچ و تابش مرگِ سنبل
لبش با آب حیوان در تکلّم نمودہ عرض جاں ہا در تبسّم
حنائی پنجہ اش خورشید دلہا ہلالِ ناخنش صیدِ تماشا

سپہر آرا : اس ہوا کو آگ لگے۔ اس پر بتگی پڑ جائے۔

آزاد : اب تو آپ ہوا سے بھی لڑنے لگیں۔ خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا : جی ہاں آپ تو کہیے ہی گا، آپ اس کی ہوا خواہی کا دم نہ بھریں گے تو کون بھرے گا۔ پردہ اٹھا دیا نہ۔

آزاد : ہوا نے در پردہ فہمایش کی کہ بھلے مانسوں سے بھلے مانسوں کو پردہ کیسا:

کس کا حجاب کیسی حیا اور کہاں کی شرم
پردے سے ہاتھ، ہاتھ سے پردہ اٹھائیے

حُسن آرا : ماشاء اللہ ابھی شاید کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑی۔ بے نقاب تو دیکھ لیا، اب اور کیا چاہتے ہو۔ بندہ پرور کچھ تو قناعت چاہیے :

آزاد : قانع بہ تجلّی نشود شائق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلّی نہ تواں کرد

حُسن آرا : صاحب سنیئے! یہ دل کا سودا ہے، دل لگی نہیں ہے۔ تعجیل کارِ شیطان ہے۔

آزاد : ع درکار خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست۔

ملّاح : سُنو بھئی آزاد۔ ایسی جلد بازی ہمیں پسند نہیں، ذرا التاخیر من الرحمٰن والتعجیل من الشیطان کے مفہوم پر بھی نظر ڈالئے۔ یہ اپنی امّاں جان سے تو پُوچھ لیں۔ یہ بھی کوئی گڑیا گڈوں کا بیاہ ہے۔

آزاد : منم غریب دیار و توئی غریب نواز
دمے بحالِ غریب دیار خود پرداز

سپہر آرا : (قہقہہ لگا کر) سائیں اس وقت پھر مانگئے۔ ہاتھ خالی نہیں ہے۔
غرور حُسن اجازت مگر نہ داد ائے گل
کہ پُرسشی بکنی عندلیبِ شیدا را

ملّاح : آپ کا عشق اب دائرۂ اعتدال سے قدم باہر نکالنے لگا۔

آزاد : فاش می گویم واز گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

ملّاح : آج تو آپ جائیں، کل تشریف لائیں۔ معاملہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا ان کی بوڑھی ماں کو بھی تو اطلاع دے دیں۔ کل ان کے سامنے ذرا خوب مولویانہ تقریر کیجیے گا اور ایک بات اور دیکھیے تیمور لنگ ہی سے اپنا شجرہ ملائیے گا۔

آزاد : واہ یہ بھری کسی انیلے کو دیجیے۔ بندہ لنگڑے لولوں کا پوتا نہ بنے گا، مگر پدرم سلطان بود ضرور کہوں گا۔ اب بندہ رخصت ہوتا ہے، لیکن خدا کی قسم عمر بھر شکایت رہے گی کہ منہ دکھاتے ہی نظر پھیر لی:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی
بازارِ خویش وآتش ما تیز می کنی

رخصت!

سپہر آرا : امام ضامن کو سونپا۔

حُسن آرا : فی امان اللہ۔

ظرّاف فرخ نہاد اور میاں آزاد چلے تو آزاد کے انگرکھے کے بند چٹ چٹ ٹوٹ گئے۔ ظرّاف کہا اللہ اللہ آج تو آپ جامے میں پھُولے نہیں سماتے ہیں۔ انگرکھے کے بند تک ٹوٹے جاتے ہیں۔ ہم یہاں کھڑے ٹاپتے تھے، اور راستہ ناپتے تھے۔ رستہ دیکھتے دیکھتے طبیعت گھبرا گئی۔ میں تو جانے ہی کو تھا کہ آپ آ گئے۔ کیسے کیسی گذری۔ بامراد آئے یا ناکام ؟ اجی ناکام آئیں ہمارے دشمن، جو ہماری طرف دیکھ نہ سکیں۔ ہم بامراد آئے۔ پیغام کون لاتا تھا اندر سے ؟ پیغام ! کیا خوب ! اجی حضرت پردۂ زنگاری بیچ میں حائل تھا۔ اور وہ بھی زرق برق بخود نمائی مائل تھا۔ حُسنِ اتفاق سے بادِ بہاری نے اُس پردۂ زنگاری کو بھی اڑا دیا، تو شمس و قمر ایک برج میں دیکھ کر قران السّعدَین کا دھوکا ہوا نظر کا ٹھہرنا محال تھا :

چو دیدم روے خودم سجدہ کردم بحمد اللہ نکو کردارم المشب

قربان صنعتِ قلم آفریدگار۔ کیا کیا صورتیں۔ پیاری پیاری مورتیں، بنائی ہیں کہ اہو ہو ہو۔ دونوں چندے آفتاب، چندے مہتاب، مگر اس پھرتی سے طرار ابھرا ہے کہ جیسے بجلی لونک جائے۔ بس نظر کی طرح غائب۔ پھر حضرت وہ وہ کڑے سوال ہوئے ہیں، کہ اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جائیں۔ مگر قربان اپنے استاد کے برجستہ جواب دیے ہیں۔ بھئی یہاں سوال و جواب کا دماغ کجا۔ نکیرین کے سوالات تک کا جواب تو دوں نہیں۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ لیکن اس بُتِ نازنین۔ غارت گیر ہوش کے حکم کی تعمیل بسر و چشم منظور تھی۔ اب کل بلایا ہے۔

ظرّاف : پھر کیا ہے پانچوں گھی میں۔ اسی اٹھوارے میں انشاء اللہ! لال لال گلنار خلعت فاخرہ پہنے ہو تو سہی۔ دولہا نیو۔ پار ہو قسمت کے دھنی اچھی دلہن پائی، مگر ہندوستان میں کبھی دلہنوں نے امتحان لے کر شادی نہیں کی ہے۔

بڑی بیگم

ادھر تو یہ خوش گپیاں ہوتی جاتی تھیں۔ اُدھر کا حال سُنیئے، کہ سپہر آرا مچل گئی کہ بہن تم دس دن کے اندر ہی اندر میاں آزاد کے ساتھ بیاہ کر لو۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ مہنا متھ مچاؤں گی۔ آسمان سر پر اٹھاؤں گی۔ اب پیر مرد اور حُسن آرا دونوں سمجھاتے ہیں کہ سنو سنو! ٹھہر و ٹھہرو، کس کا سننا میں ایک نہ مانوں گی۔ میں روؤں گی جب تک بہن میری بات نہ مانیں گی۔ ہم کسی کی تو سننے کے نہیں۔ پیر مرد نے سمجھا کر بسہولت کہا کہ تم اس وقت ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو۔ تم سے بجتے کون۔ آخر اس اسّی برس

والی بوڑھی دادی سے بھی پوچھو گی یا تمہیں ان کی بڑی بن بیٹھیں۔ الڑھ پنے کی باتیں کرتی ہو چلو پہلے بڑی بیگم صاحب سے کہیں ان کی رائے لیں۔ ان کو سمجھائیں۔ صلاح مشورہ ہو، بیاہ نہ ہوا ہنسی ٹھٹھا ہو گیا۔ سپہر آرا اور پیر مرد بڑی بیگم کے پاس گئے، اور آداب بجالا کر، پیر مرد نے کہا کہ حسن آرا آپ کے سلام کو حاضر ہوئی ہیں، اور کچھ عرض کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے گردن ہلا کر کہا آؤ بابا آؤ۔ کہو! اب تو میں نے شادی تمھاری ہی رائے پر چھوڑی۔ مگر شریف زادہ ہو۔ آج کیا جانے کیا خوشخبری سننے میں آئے گی کہ فجر سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ پیر مرد ایک جہاں دیدہ، خرانٹ سوچا کہ بس یہی موقع ہے۔ کہا کہ حضور اس سے بڑھ کر اور مژدہ کیا ہوگا، کہ حسن آرا اپنے نکاح کا کچھ حال کہنے حاضر ہوئی ہیں مگر شرماتی ہیں۔ لجاتی ہیں۔ کہہ نہیں سکتیں۔ یہاں ایک شریف زادہ آجکل آیا ہوا ہے۔ بس بلا تشبیب یوسف ہے۔ انتہا کا حسین و مہ جبین اور علم کا یہ حال کہ عجب نورانی طبیعت پائی ہے۔ شاعری میں ان کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ نثر لکھنا ان کا حصہ ہے۔ اور شریف مسلمان نجیب الطرفین۔ تیمور کے گھرانے سے ہیں۔ عربی فارسی، انگریزی، حساب کتاب، سیاق سیاق سب میں برق، اور تقریر سے تو جادو ہی ٹپکتا ہے۔ اور ابھی نام خدا مسیں بھیگتی ہیں۔ بس اللہ نے یہ جوڑی سچ مچ اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ کیا خوبصورت رئیس زادہ ہے کہ واہ۔ سپہر آرا بولی کہ میں نے تو آج تک ایسا خوبصورت آدمی دیکھا ہی نہیں، اور لطف یہ کہ شریف، ہنس مکھ اور پڑھے لکھے۔ اماں جان آپ بھی ایک دن دیکھ لیں۔ اور آپ ان کو اجازت دیجیے۔ اتنے میں حسن آرا کو بڑی بیگم نے بلوایا۔ بیچاری لجائی جاتی تھی، اور فرط حیا سے ہاں یا نہیں کچھ زبان پر نہ لاسکتی تھی۔ نیچی نظروں سے چپکے چپکے پیر زال کے چہرے کو دیکھتی جاتی تھی۔ کہ بشاش ہیں، یا ملول۔ اتنے میں بڑی بیگم نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگایا، اور ہنس کر کہا کہ لڑکی مجھ سے اڑتی ہے۔ سکھائی پڑھائی آئی ہے۔ اچھا کل ہم بھی انھیں دیکھ لیں تو پھر مشورہ کریں۔

حسن آرا اور سپہر آرا تو چلی آئیں مگر پیر مرد تھوڑی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کیا کیے۔ جہاں تک زبان نے یاوری کی انھوں نے میاں آزاد کی خوب ہی تعریف کی، اور یقین دلا دیا کہ حسن آرا کے لیے آزاد ہی سا شوہر موزوں ہے۔ وہ بہت ہی خوش ہوئیں، اور دعائیں دیں کہ حسن آرا کا جیسا تم نے خیال رکھا ویسا خدا تم کو اجر دے۔

دوسرے دن میاں آزاد یکہ و تنہا وہاں پہنچے۔ ظرّاف کی دم میں بھی رسا باندھا پہلے تو پیر مرد کے یہاں گئے۔ ان سے کچھ دیر گلخپ رہی، اور انھوں نے یہ مژدہ فرح بخش سنایا کہ بڑی بیگم نے بھی نکاح منظور کر لیا، مگر ایک دفعہ آپ کو دیکھیں گی ضرور۔ آج یا کل چلیے ہمارے ساتھ۔ انشاءاللہ وہ بھی

خوش ہوں تو سہی۔

میاں آزاد ملاّحِ ملیح کو لے کر حسن آرا کے پاس گئے۔ مگر وہی پردے کی ملاقات۔

آزاد : بندہ حاضر ہے۔

حسن آرا : مزاج معلّیٰ؟

آزاد : الحمدللہ!

سپہر آرا : بندہ پرور آج پردہ خوب مضبوط بندھا ہے۔ آج تو ہوا کیا معنی آندھی بھی آئے تو ذرا نہ ہٹے. گر پڑنا کیا معنی۔

آزاد : نہیں روزن جو قصرِ یار میں پردا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

حسن آرا : کل تو آپ کے فیضانِ صحبت سے ہم نے بہت سی باتیں سیکھیں۔ ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ تقدّم کی دو چار قسمیں بیان کیجیے؟

آزاد : تقدّم بالزّماں۔ تقدّم بالشّرف تقدّم بالعلّتِ تقدّم بالمکان۔

حسن آرا : علم منطق کی تعریف کیجیے؟

آزاد : آلۃٌ قانونیۃٌ نعصم مراعاتہا الذہن مِنَ الخطاء فی الفکر۔

حسن آرا : جذبِ شعری کس قوت کا نام ہے؟

آزاد : تجاذیب انابیت شعری، اس قوتِ کشش سے عبارت ہے جس کے ذریعے سے پانی اور اسی قسم کی اشیاء، رقیق چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے وسیلے سے اپنی سطح سے کسی قدر اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ اور وہاں قائم رہتی ہیں۔ شعر بالفتح عربی میں بال کو کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ کہ جس قدر نَے کا سوراخ چھوٹا ہوگا اسی قدر اشیاء رقیق زیادہ بلند ہوں گی۔ اگر بال کے برابر باریک ہوں تو اشیاء بہت زیادہ اونچی ہو جائیں۔

حسن آرا : یہ اتنے پہاڑ اللہ میاں نے دنیا میں کیوں پیدا کر دیے آخر فائدہ؟

آزاد : جو بیشمار اور غیر محدود فوائد پہاڑوں سے حاصل ہوتے ہیں وہ خدائے پاک کے فضل و کرم پر دال ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیاں بادلوں کے پانی کو جذب کر لیتی ہیں۔ جس سے انسان فائدہ کثیر اٹھاتے ور پودے نشوونما پاتے ہیں۔ پہاڑ نہ ہوتے تو مینھ کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا! اور چو طرفہ دلدل

ہی ہوتی۔ جو ابخرے کشش آفتاب سے صعود کر کے ہوائے جو میں منتشر ہوتے ہیں۔ ان کے سدِ راہ ہوکر ان کو ایک جگہ مجتمع کرتے ہیں۔ اور یہ بخارات اعتدال اور ہوائے محیط ارضی کے مطابق اولے یا برف، یا بارش ہوکر زمین پر برستے ہیں۔ جو رطوبات اس طرح حاصل ہوتی ہیں۔ وہ پہاڑوں کی درزوں اور مسامات میں منجذب ہوکر زمین کے ابتدائی طبقوں میں جمع ہوتی ہیں اور انجام کار چشموں، اور ندیوں اور نہروں وغیرہ کی مبدا ہو جاتی ہیں۔

حسن آرا : آپ کی ذکاوت اور طباعی برصاد ہے۔ آپ بڑے ذی لیاقت آدمی ہیں۔

آزاد : پھر آپ زکاۃ حسن تو دیجیے؟

تو صاحب نعمتی من مستحقم　　زکوٰۃ حسن وہ حق دارم امشب

حسن آرا : گھبرائیے نہیں، ذرا استقلال بھی چاہیے۔

آزاد : عیشم مدام ست از لعلِ دلخواہ
کارم بکام ست الحمدُ للہ

اے بخت سرکش تنگش ببر کش　　گہ جام زر کش گہ لعلِ دلخواہ
ما را بمستی افسانہ کردند　　پیراں جاہل شیخاں گمراہ
شوقِ رخت بُر دازیاد آزاد　　دردِ شبانہ درسِ سحرگاہ

پیر مرد : (آزاد سے) حضور تشریف لائی ہیں۔ آداب بجا لائیے، جھک کر۔ حسن آرا کی اماں جان ہیں۔ یہی میاں آزاد ہیں۔ حضور!

آزاد : (زمیں دوز ہوکر) آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم : جیتے رہو بیٹا۔ آؤ ادھر آکے بیٹھو۔ مزاج اچھے؟

آزاد : دعا کرتا ہوں، ایک عرصۂ دراز سے حضور کی قدم بوسی کا تہِ دل سے اشتیاق تھا۔ بحمد اللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ بزرگوں کی زیارت بڑے خوش قسمتوں کو نصیب ہوتی ہے۔

بیگم : سپہر آرا تمھاری بڑی تعریف کرتی تھی، اور بیشک تم اسی لائق ہو کہ تعریف کی جائے۔ چشم بد دور۔ لئیق اور خوبصورت اور ابھی بچے ہو، اس وقت تم کو دیکھا بہت ہی طبیعت خوش ہوئی۔ اچھا پھر اب پرسوں ہم سے ملنا۔

آزاد : (اُٹھ کر) آداب بجا لاتا ہوں، اور اس وقت رخصت ہوتا ہوں، پرسوں بشرط زیست ضرور حاضر ہوں گا۔

بیگم : امام ضامن کو سونپا۔

میاں آزاد اور پیر مرد دونوں باہر گئے، پیر مرد نے کہا کہ لو میاں مبارک۔ فال نیک ہے۔ اب پرسوں آنا کل نہ آنا۔ لے خدا حافظ اب آپ نے پالا جیتا۔ ہو قسمت کے دھنی :

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

ادھر مہرِ عالم افروز، بصد کر و فر نور افشاں ہوا۔ اُدھر سر تاجِ عشاقِ زار، جواب مصرعۂ زلفِ مہوشان فرخار، یعنی میاں آزاد کوی یار کی طرف سر کے بھل رواں ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں، کہ برہمن چندن لگائے، دھوتی بغل میں دبائے، دریا سے نہا کر آرہے ہیں، اور پوجاری شِوالوں میں سنکھ بجا رہے ہیں۔ ملّا سرگرم گفتگو نماز بہ تہیۂ وضو لو بتی نوبت بجا رہے ہیں۔ بادہ گسار جھومتے ہوئے میخانے جاتے ہیں۔ برقندار جابجا ڈٹے کھڑے ہیں۔ بدمست خوابِ خرگوش میں پڑے ہیں۔ حلوائی بھٹی پر سوتا ہے۔ کنابروں کی قسمت کو روتا ہے۔ افیونی غیں، چانڈو باز ٹیں۔ نئی روشنی والے ہوا کھاتے ہیں۔ مسافر لدے پھندے جاتے ہیں۔ کوئی بھجن گاتا ہے۔ کوئی مثنوی سناتا ہے :

سپیدہ دم کہ صبا بوی گلستان گیرد — چمن زلف ہوا نکہت جنان گیرد
نوائے چنگ بد انسان زند صلائے صبوح — کہ پیر صومعہ راہِ درِ مغاں گیرد
یہ بزم گاہِ چمن رو کہ خود تماشائی ست — کہ لالہ کاسۂ نسرین دراز غواں گیرد

اتنے میں ایک رندِ ساغر نوش، بادۂ گلگوں کی بوتل دبائے لڑکھڑاتا، اور پیترا بدلتا ہوا آنکلا۔

رند : استاد جام حاضر ہے۔ بادۂ ریحانی شراب ارغوانی۔

آزاد : نوش جان۔ آپ ہی کو مبارک رہے۔ یہاں بے پیے ہر دم کچے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے۔

رند :
وقتیکہ طلوعِ صبح ازرق باشد
باید کہ بکف جامِ مروق باشد

میاں خدارا ذرا تو چسکی لگاؤ۔ اس میں عجیب خاصیت ہے۔ کہ ٹھنڈک کے وقت پیو تو گرما جاؤ اور لُو میں پی کر نکلو تو جوڑی چڑھ آئے۔

آزاد : جی بجا ہے۔ بندہ اس کی خاصیت سے خوب واقف ہے، اور ہم نے تو سنا ہے کہ شراب پی کر آگ میں پھاند پڑے تو آگ گل ہو جائے، اور جو سمندر میں کود ے، تو انسان سے پل ہو جائے، اور جو زیادہ پی جائے تو بس قُل ہو جائے۔ بس دور ہی دور سے باتیں کیجیے گا۔ الگ الگ۔

دس قدم آگے بڑھے، تو دیکھا دکان پر ایک افیونی نے چینی کی پیاری پیاری، چھوٹی رنگا رنگ پیالیوں میں، افیون کو گھولا، اور میاں آزاد سے کہا کہ کہو بھئی کہاں کی سدھیان ہیں ؟ آؤ ذرا چنیا بیگم سے تو علیک سلیک کرتے جاؤ۔ میاں آزاد نے کہا جی بس، چنیا بیگم کو دُور ہی سلام ہے اس کالی بلا سے یہاں کیا کام ہے۔ اور دو چار قدم بڑھائے تھے کہ ایک بھنگر د سلطان سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک چُلّو میں اُلّو بہرائچ کی بوٹی اڑائیں۔ ذرا ادھر تو آئیے! خانۂ احسان آباد۔ یہاں کوئی بنگ نوش نہیں ہے۔ آپ اپنی بوٹی رہنے دیں۔ اور آگے چلے تو دو چار آدمی اپنے بختِ برگشتہ کی طرح اوندھے پڑے، بھک بھک چانڈو اڑا رہے ہیں، اور حقے کے دم لگا رہے ہیں۔ ایک چھیٹا پیے جائیے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔ جی بس، عنایتِ خدا اس بلائے بیدرماں سے بچائے۔ یہ مرحلے طے کر کے میاں آزاد کفِ دست میدان سنسان، بیابان میں آئے تو پھولوں کا مہکنا اور کلیوں کا چٹکنا ستم بپا کر رہا ہے۔ شاہد بہار کے خوب جوبن لوٹے۔ اور چلتے چلتے دن سے داخل منزلِ مقصود، پیر مرد سے چار آنکھیں ہوئیں، تو دونوں مسکرا کر باتیں کرنے لگے۔

آزاد : کورنش عرض ہے قبلہ!

پیر مرد : زندہ باش۔ آج بڑا کڑا امتحان ہے۔ بڑی بیگم صاحب امتحان لیں گی۔ اگر پورے اترے تو ہاتھوں ہاتھ انعام دیں گی۔

آزاد : یا قسمت یا نصیب! آج بھی پالا جیتوں تو سہی۔ خدا کرے کوشش ٹھکانے لگے۔ حضرت بحقِ قوتِ جبرئیلؑ و بحقِ صور اسرافیل و بحق دین محمدؐ و بحق خلیل، کچھ بتا تو دیجیے کہ کس میں امتحان لیں گی اور کیا انعام دیں گی۔

پیر مرد : میاں وہ پرانے فیشن کی آدمی ہیں۔ کوئی دقیانوسی باتیں پوچھیں گی۔ اللہ پر شاکر رہو بھائی اور انعام کو کیا پوچھتے ہو، وہی جانِ آزاد بتِ ستم ایجاد انعام ہے۔ اس میں غور و فکر کا بھلا کیا مقام ہے۔ یہ انعام بڑے خوش قسمتوں کو ملتا ہے:

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چلیے پھر بسم اللہ۔ آپ بیگم صاحب تک لے چلوں۔

آزاد : (بڑی بیگم سے) آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم : جیتے رہو بیٹا! اے فرخندہ۔ ذری پنکھیاں جھلو آپ کے۔ آپ کا سنِ شریف کیا ہوگا؟

آزاد : یہی کوئی انیس بیس برس کا۔

بیگم : اللہ رکھے۔ بوڑھے ہو!

آزاد : (جھک کر) آداب عرض ہے۔ اس وقت آپ نے وہ دعا دی کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ سچ ہے بڑے بوڑھوں کی کیا بات۔

بیگم : اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر انسان کا سجدہ جائز ہوتا تو بیویاں اپنے شوہروں کا سجدہ کرتیں۔ اور ان کے قدم پر سر دھرتیں کیا شان کبریائی ہے۔ صدقے صدقے۔

آزاد : جلّ جلالہٗ :

صدقے اس بندہ نوازی کے ترے ہم جائیں
باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و اشفق

بیگم : کیوں بیٹا ہاتھی کو خواب میں دیکھے تو کیسا؟ اس کی تعبیر کیا ہوگی؟

آزاد : بُرا۔ ہاتھی کی تعبیر بلائے جان۔ مگر ہاں ایک بات ہے کہ اگر ہاتھی کسی پر اپنی سونڈ پھیر رہا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔

پیر زال : شاباش تم بڑے لئیق آدمی ہو۔ چشم بد دور۔ تھوڑا سا کالا دانہ ان پر سے جلادو۔

الغرض بیگم صاحب نے میاں آزاد کو دن بھر بٹھایا۔ اور ساتھ ہی کھانا کھلایا، اور خوب دیکھا بھالا، جانچا پرتالا۔ میاں آزاد گربۂ مسکین بنے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں، اور دل ہی دل میں کھل کھلاتے جاتے ہیں۔ جب دن قریب اختتام ہوا، اور وقتِ شام ہوا، تو پیر زال، خجستہ خصال نے کہا کہ بھائی اب دو گھڑی حسن آرا اور سپہر آرا کے پاس بھی جاؤ۔ دو گھڑی وہاں بھی خوش گپیاں اڑاؤ۔ پیر مرد کو کنکھیوں سے اشارہ کیا کہ سایہ کی طرح قدم قدم پر ساتھ رہو۔ میاں آزاد اور پیر مرد اُٹھے اور بڑی بیگم سے رخصت ہو کر حسن آرا کے کمرے میں گئے۔ آزاد نے پیر مرد سے کہا حضرت ہمیں حیرت ہے کہ با ایں ہمہ ضعیف الاعتقادی، اس قدر بے تکلفی۔ کسی اور پُرانے فیشن کے خاندان میں یہ بے تکلفی کب جائز رکھی جائے گی۔ پیر مرد نے کہا یہ سچ ہے، مگر مجھے نصیحت ہو رہی ہے کہ خبردار ساتھ نہ چھوڑنا۔

آزاد : بندہ حاضر ہے۔

سپہر آرا : بسم اللہ آیئے بسر و چشم۔ کہیے اماں جان سے کیا بات چیت ہوئی؟

آزاد : آپ کی اماں تو بالکل سفید آدمی ہیں، مگر بلا کی ضعیف الاعتقاد، آج تمام دن بھوت پریت، چڑیل بن مانس، چھلاوے جادو ٹونے کی باتیں کرتی رہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ آخر اور کیا کرتا۔ مصلحت وقت کا تقاضا ہی یہ تھا۔

حُسن آرا : اے تو بوڑھی عورت، اور پڑھی لکھی نہیں۔ پھر ان باتوں کو نہ کیسے مانیں۔
آزاد : اب تو اس گھونگھٹ کے طلسم کو توڑیئے۔ مانا کہ آپ مہ پارہ ہیں مگر ہم بھی طالبِ نظارہ ہیں۔ اتنا بھی بخل کیا۔ روز مصاحبت گرماتے ہیں، مگر صورت دیکھنے کو ترس ترس جاتے ہیں۔
سپہر آرا : چلیے آج ساتھ ساتھ سیر دریا کریں۔

بجرے کی روانی اور جان جانی

شب کو گھڑی بھر رات گئے حسن آرا اور سپہر آرا ہر ہفت آرایش سے مجلّی اور محلّیٰ۔ پیرائش سے مزین ہو کر اس زرق برق سے اور اس شان سے نکلیں کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ پرستان سے پریاں اتر آئی ہیں۔ مگر دونوں کے چہرے پر نقاب، ہر امر میں حیا و حجاب۔ اتنے میں بتِ رنگین ادا حُسن آرا اور معشوق دلربا۔ سپہر آرا، اور آزاد کرنگ اور سرنگ اور نقرہ خنگ، پر سوار گھوڑوں کو جماتے اور چمکاتے لبِ جوئبار آ کر اُتر پڑے، اور اترتے ہی بجرے پر چڑھے :

بہار آئی اے ساقی گل عذار — کھِلے گل ہوا لطفِ سیر و شکار
مرقع ہیں سبزے سے دشت و جبال — ہرن مست ہیں شوخیوں پر غزال
گھٹاؤں کی آمد ہے بارش کا تار — کبھی ہے تقاطر کبھی ہے پُھہار
چمن میں عنادل ہیں جنگل میں مور — وہ کوئل کی کوکو پپیہوں کا شور
کہیں جدولِ آب کی آب و تاب — کسی جا ہے لالہ کسی جا گلاب
گلستاں کا ہے اب سبق بر زبان — وہ موسم ہے کانٹے بھی ہیں تر زبان
شکار بطے ہے مدِ نظر — دکھا سیر مینخانہ اے باخبر
نہیں دخترِ رز کو خلوت پسند — پری اب رہے گی نہ شیشے میں بند

اِدھر بجرا دریا میں رواں ہوا۔ اُدھر میاں آزاد کو گلستاں کا باب[1] پنجم درد زباں ہوا۔ موریلوں کی چہکار پپیہوں کی پکار۔ تھوڑی تھوڑی پھوہار۔ حُسن آرا کی ہنستی پیشانی۔ سپہر آرا کا جوشِ جوانی۔ چاہِ زنخداں وہ جو کنوئیں جھنکائے۔ زلیخا کا دل اس کی چاہ میں ڈانواں ڈول ہو جائے۔ رگ جان میں آفت

---

[1] گلستانِ سعدی کا باب پنجم کا عنوان ہے "در عشق و جوانی" اس باب میں حسن و عشق کے متعلق عجیب حکایات ہیں مدرسوں کے بچوں کے نصاب سے یہ باب خارج کر دیا جاتا ہے۔

اٹھائے۔ یوسف مصری کو شرمائے۔ ان دو گل بدنوں کے عکس سے دریا کا پانی گلاب ہوگیا۔ فرطِ خجالت سے گل آب آب ہوگیا۔ الٰہی یہ سرو قامت ہے یا قیامت ہے۔ یہ سرد ہے یا شمشاد، یا الفِ جان آزاد۔ گردن رشکِ شمعِ کافور۔ فوارۂ نور، رخسارے گلِ تر، رشکِ قمر، بینڈھا دریا میں اُچھل رہا ہے۔ فرطِ جوش سے سینہ مثل دیگ اُبل رہا ہے۔ چوطرفہ بہار ہے۔ اِدھر سبزۂ نورمیدہ، اُدھر مرغزار ہے۔ نہ بیچوں بیچ میں چشمہ سار لطافت بار۔ اور بجرے پر دہ دونوں پری رخانِ طرح دار۔

آزاد :
صنم موسئی نقاب از چہرہ بردار
نمی آید خوشم ایں لن ترانی

الٰہی یہ عارض تاباں پر نقاب ہے، یا مہرِ عالم افروز تہِ سحاب ہے۔

سپہر آرا :
حیا کنم نہ چرا را اُرخِ نقاب ہنوز
مرا حجاب بدست بہ حجاب ہنوز

حُسن آرا : حضرت وہ لگاوٹ یا ز انکھڑیاں کہیں اور ڈھونڈیئے۔ یہاں چشم حیا پرور ادب آمیز نگاہ ہے۔ حیا بھی سامنے آئے تو آنکھیں بند کر کے بوئے گل تک گریبان کو چاک نہ دیکھے۔

اب سنیے کہ ادھر استغنائے ناز اُدھر آئیں، نیاز ادھر نقاب و حجاب، اُدھر طالب نظارہ کا دل پُر اضطراب۔ ادھر کلیجہ فرطِ انبہاج سے باغ باغ۔ ادھر نقاب رنگین سے دل داغ داغ حُسن آرا کا دھانی اور سپہر آرا کا ارغوانی لباس اور اس پر عطرِ عروس کی بو باس۔

آزاد :
لباسِ سبز در بر کردہ سرد من برعنائی
برآید آفتابِ طالعم از چرخِ مینائی

حُسن آرا :
توان شناخت بیک روز از شمائل مرد
کہ تا کجاش رسیدست پائگاہ علوم
ولے ز باطنش ایمن مباش وغرہ مشو
کہ خبثِ نفس نگردد بسالہا معلوم

آزاد : سبحان اللہ! یہ لب شیریں، در بہ جواب تلخ۔ تیوری چڑھا کر یہ اچھی جھڑکی دی۔ بس سخن طرازی اور نکتہ پردازی آپ پر ختم مگر مہمانوں سے کوئی ایسی بد کلامیاں کرتا ہے:

صبحدم مرغِ چمن با گلِ نوخاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے
ہیچ عاشق سخنِ تلخ بمعشوق نگفت

حُسن آرا : (گردن نیوڑھا کر) آپ بھی کیسے انجان بنے جاتے ہیں ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھاتے

ہیں۔ بادل کی یہ اٹھکھیلیاں، بجلی کی یہ شوخیاں۔ پھر میں نے بھی شوخی کی تو کیا گناہ کیا۔ ہمارا حریفانہ جواب، اور تمھارا عِتاب، اور خیر سے آپ معشوق کس کے بنے ہیں۔ اے تیری قدرت، آپ بھی اتنے ہوئے خیر مہان ہو کیا کہوں۔

آزاد :
خوبرو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

سپہر آرا کے تو اس وقت بڑے کڑوے تیور پڑتے ہیں۔ ذرا ہماری خاطر سے مُسکرا دیجیے۔ غریبوں کی ہفتاد پشت پر احسان کیجیے :

برآسمانِ چہارم مسیح بیمار ست
تبسّمِ نوز بہرِ علاج مے خواہد

پیر مرد : میاں یہ عروس شرمگیں اور عصمتیاں پردہ نشیں ہیں۔ حیا اور مزاج جیسے بو در گل ادب اور طبیعت جیسے کیف در مل۔ خدا کا شکر کرو کہ ایک رنگین و پر بہار بجرے پر ایسے سہانے وقت یہ رو کشِ شاہدانِ فرخار تمھارے قریب ایسی شانِ برنائی اور زیب و خود نمائی سے بیٹھی مذاق کر رہی ہیں۔ پہلے کوئی آتا ہو تو ے صبر کرو۔

آزاد :
عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر و تحمّل
وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

اتنے میں وسطِ دریا میں ایک رنگیں و عشرت آئیں، دخوشنما اور مائزئیں، کوٹھی نظر آئی، اور سپہر آرا اس کو مشاہدہ کر کے خوب ہی کھلکھلائی۔ حُسن آرا بول اٹھی کہ لو وہ کوٹھی آئی، وہ کوٹھی آئی پیر مرد نے کہا چلو اب بن آئی۔

سپہر آرا : یہ کوٹھی ہے یا روضۂ رضواں۔ یہ مکان ہے یا چوتھا آسمان یہ دریا ہے یا سلسبیل۔ یہ باغ ہے یا گلزارِ خلیل۔ سبزہ چوطرف لہلہایا، گلستانِ عالم پر ابرِ مسرت چھایا۔ کہیں کوئل کی کوک، کہیں موروں کی ہوک، اُدھر دریا رداں، بیچ میں ایوان سپہر توامان۔ چلیے یہاں لطفِ صحبت اٹھائیں، سب سے الگ تھلگ بستر جمائیں۔

آزاد : واہ کیا پری خانہ ہے کہ پرستان بھی اس کے آگے مات ہے۔ یہ رات ہے یا شب برات ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ سعدِ اکبر کی کرامات ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ یہ سب طلسمات ہے۔ ساری کلفت دُور ہو گئی۔ دل کی بیتابی کافور ہو گئی :

نظر آیا کوثر کی موجوں کا نور نہ ٹھہرے گا دل بے شراب طہور

میاں آزاد اور پیر مرد فرّخ نہاد اور وہ دونوں پیاری بہنیں، لطفِ بہار اٹھاتی سیر دریا کرتی چلی جاتی تھیں۔ بجرے بہاؤ پر فراٹے سے رواں، بادِ بہاری چماں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، کالی کالی گھٹائیں، سپہر آرا کی پیاری پیاری باتیں، حُسن آرا کی رمز و کنایہ کی گھاتیں، بوندوں کا گرنا، اور آب جوئبار کا جنبش کرنا، عجب بہار دکھاتا تھا۔ دریا کا پانی لہریں مارتا ہوا جاتا تھا ایک دفعہ ہی ہوا نے وہ زور باندھا کہ بینڈھا اچھلنے لگا۔ اب بجرے کی یہ کیفیت ہے کہ ڈانواں ڈول، تہ و بالا ہو رہا ہے۔ یہ گرا، وہ گرا، یہ ڈوبا وہ ڈوبا۔ یہ لہرائی وہ ہو رہا، وہ تھپیڑا کھایا یہ آیا۔ پیر مرد بیچارہ گو جہاں دیدہ اور خرانٹ تھا لیکن اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سیر دریا کی کہانیاں سب بھول گئے۔ چہرے پر عرق ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ بدن بھر میں رعشہ۔ حُسن آرا کا چہرہ زرد۔ سپہر آرا کا دل سرد دونوں بہنیں ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ سپہر آرا کی آنکھوں سے جوئے اشک جاری۔ حُسن آرا مصروف بگریہ وزاری، میاں آزاد خستہ و خراب، بادل پُر اضطراب، حیران و پریشان کہ یا الٰہی کیا بُرے پھنسے۔ کنار دریا کو جو دیکھتے ہیں تو کالے کوسوں۔ بیچوں بیچ میں بجرا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ ہی بجلی اس زور سے تڑپی کہ حُسن آرا ڈر کر میاں آزاد سے چمٹ گئیں۔ میاں آزاد اس وقت بے اختیار رو دیے کہ معشوق گلے بھی ملا تو اس نازک حالت میں۔ یہ پہلا ہی مرتبہ تھا، کہ میاں آزاد کو کسی نے روتے دیکھا ہو۔ حُسن آرا اور میاں آزاد خوب پھوٹ پھوٹ کر گلے مل مل کے روئے۔ اتنے میں ایک دفعہ پھر بجلی لونکی اور رعد اس زور سے گرجا کہ سپہر آرا ڈر کر دوڑی اور افسوس صد افسوس کہ مارے گھبراہٹ کے ندی میں گر پڑی۔ ڈوبتے ہی پہلے غوطہ کھایا۔ اور لگی ہاتھ پاؤں پھٹ پھٹانے اور بھی نیچے ہو رہی۔ اتنے میں اُبھری، اور پھر غوطہ کھایا۔ حُسن آرا سکتے کے عالم میں میاں آزاد نے جو یہ کیفیت دیکھی، تو جھٹ پٹ کپڑے اتار کر دھم سے کود ہی تو پڑے۔ اب حُسن آرا بیچاری سمجھی کہ سپہر آرا اور میاں آزاد دونوں کے دونوں ڈوبے۔ لگی دوہتڑ پیٹنے۔

میاں آزاد نے غوطہ کھایا، تو سپہر آرا کی زلف پریشان ہاتھ آئی۔ انھوں نے جھپ سے زلف کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ اُبھری۔ یہ وہی سپہر آرا ہے جو پردۂ زنگاری کے اٹھتے ہی عجب ادائے دلربا سے بھاگی تھی۔ یہ وہی حُسن آرا ہے جو نامحرم کو مقابل دیکھ کر بدن کو چھپاتی تھی۔ اور پھرتی سے بھاگ جاتی تھی۔ کل یہ پردہ تھا آج گلے لپٹی۔ الغرض میاں آزاد سپہر آرا کو ساتھ لیے ملاحی چیرتے اور کھڑی لگاتے ہوئے چلے کر بجرے کی طرف لے چلیں۔ لیکن بجرا ہے کہ ہوا سے باتیں کرتا چلا جاتا

ہے اور پانی بلیوں اچھلتا ہے۔ ایک دفعہ ہی آزاد نے باآواز بلند پکارا۔ پیر مرد۔ پیر مرد، ملاح۔ ملاح بجرہ روکو۔ واسطے خدا کے روکو۔ پیر مرد کے اس وقت ہوش وحواس اڑے ہوئے تھے، اور حسن آرا غش میں پڑی تھیں۔ بجرا خدا کی راہ پر جدھر چاہتا تھا جاتا تھا۔ ہو ملاح اور خدا ناخدا۔ میاں آزاد گو بیراک بہت اچھے تھے، لیکن برسوں سے مشق چھوٹی ہوئی تھی۔ دم پھولنے لگا۔ اتفاق سے ایک بھنور میں پڑ گئے اس کے پانی نے ایسا چکر کھایا کہ یہ بیخود ہو گئے۔ لاکھ طاقت کی مگر ایک چل نہ سکی۔ اور ستم پر ستم یہ ہوا کہ سپہر آرا چھٹ گئی اور چھٹتے ہی نہ پر تھی۔ میاں آزاد کی آنکھوں سے پھر بے اختیار آنسو نکل پڑے، اور یہ دوسرا مرتبہ تھا کہ میاں آزاد عمر بھر میں کبھی روئے۔ اب کی یہ بڑی پھرتی سے جھپٹے، اور معاً لاش کو ابھارا اور پھر لاد کر چلے مگر بجرے کا کہیں پتا ہی نہیں۔ وہاں حسن آرا تختے پر غش میں پڑی ہوئی تھی، اور ملاح نے بجرے کو راہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے پھر پکارا کہ ملاح او ملاح۔ بجرے کو روک لو! دل میں سوچے کہ معلوم ہوتا ہے بجرا غرقاب ہو گیا، اور حسن آرا اور ملاح دونوں کے دونوں لقمۂ نہنگ اَجل ہوئے۔ اب میں سپہر آرا کو لادے لادے کہاں تک جاؤں، اور کیا کروں۔ لیکن آزاد نے دل میں ٹھان لی کہ چاہے بچوں چاہے ڈوبوں جب تک جان میں جان ہے سپہر آرا کو نہ چھوڑوں گا۔ نہ چھوڑوں گا۔ اتنے میں پھر پکارا کہ یارو کوئی مدد کو آؤ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لبِ چشمہ سار ایک ٹیکرے پر ایک مقدس بزرگ کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اس نے آزاد کو اس حالت زار میں دیکھ کر آواز دی کہ شاباش برادر شاباش! ع۔ ایں کار از تو آید و مردانِ چنیں کنند۔ کارمی کردہٗ بابا کارمی کردہٗ۔ باش باش کہ من ہم می رسم۔ اس کے بعد اس پیر مقدس نے کپڑے اتارے، اور لنگوٹ باندھ کر دھم سے کود ہی تو پڑا۔ الااللہ اس الااللہ کی آواز کو سننا اور اس پیر قدسی صفات کا رونا تھا کہ میاں آزاد کو ڈھارس ہوئی اور تیزی کے ساتھ چلنے لگے۔ پیر مقدس بوڑھا، سفید آدمی، دو ہی ہاتھ کھڑی کے لگائے تھے کہ سانس پھول گئی۔ اور پانی نے اس زور سے تھپیرا دیا کہ پچاس گز کے فاصلے پر ہو رہے۔ اب نہ میاں آزاد کو وہ سوجھتے ہیں اور نہ ان کو میاں آزاد نظر آتے ہیں۔ ملاح نے اس پیر مقدس کو اس کیفیت میں دیکھ لیا اس وقت اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب سمجھا کہ میاں آزاد ہیں۔ تب تو اس نے آواز دی کہ آزاد بھائی! آزاد ارے بھائی ذرا زور کر کے بجرے کی طرف آؤ۔ پیر مقدس نے بڑی کوشش کی کہ بجرے کی طرف جھپٹے مگر نہ جا سکا۔ اتنے میں ملاح نے ڈنڈ دار کو ہاتھ میں لے کر کھینا شروع کیا۔ قریب ہی۔ پہنچ گیا تھا کہ ایک ناگ نے اس بوڑھے بیچارے کو بھاڑ سا منھ کھول کر ہضم

کرلیا - ملاح نے ڈنڈوار کو پھینک کر، سر پیٹنا شروع کیا - ہائے ستم وائے ستم! واحسرتا! آزاد - آزاد - آزاد! ہائے چل بسے - تم بھی چل بسے - سپہر آرا بیچاری کا ساتھ دیا - یار داغ جدائی دے گئے - آزاد ارے میرے آزاد! سپہر آرا پیاری سپہر آرا! ہائے ہائے! تجھے کس ناز نعم سے پالا تھا - تیرے دم سے گھر کا اجالا تھا - پیارے آزاد جواں مرد آزاد! اُف! اُف! اُوف! یہ آواز میاں آزاد کے کان میں بھی پڑی - لیکن بُعد کے سبب سے کچھ سمجھ نہ سکے - کہ کون ہے - سمجھے کہ وہی پیر مقدس جو ٹیلے پر سے کودا تھا غل مچا رہا ہے - تھوڑی دیر میں ان کو بجرا نظر آیا تو باچھیں کھل گئیں - اب یہ بالکل خستہ اور شل ہو چکے تھے لیکن نہایت ہی استقلال اور جواں مردی سے انھوں نے کھڑی لگانی شروع کی - ملاح نے دور سے دیکھا کہ کوئی شخص آ رہا ہے - آزاد کو تو یہ سمجھ گئے کہ ڈوب ہی چکے تھے اور سپہر آرا کے دیکھنے کی ان کو ذرا بھی امید نہ تھی - اب ان کو حیرت تھی کہ یا الٰہی یہ ہماری طرح اور کس بیچارے پر مصیبت پڑی کہ اس وقت پیرتا چلا آتا ہے - آزاد نے پکارا کہ جیتے بچے - شکر ہے اُف ری تباہی، اللہ نے عزت بچائی کہو حسن آرا کہاں ہیں؟ پیر مرد نے بغور دیکھا ایں! یہ حسن آرا کا نام کس نے لیا - پوچھا کہ آپ کون ہیں آئیے بجرا حاضر ہے - ایک سے دو بھلے - ہائے واویلا - آزاد نے کہا آپ اس وقت مستقل مزاج ہیں - میں آزاد ہوں - اتنا سننا تھا کہ پیر مرد کی باچھیں کھل گئیں - سوچے کہ الٰہی یہ خواب دیکھ رہا ہوں - یا سچ مچ آزاد ہی ہے -

جب میاں آزاد فرخ نہاد بجرے کے قریب آ گئے تو پیر مرد یعنی ملاح ملیح نے پہچانا اور فرط طرب سے تالیاں بجانے لگے - آزاد نے سپہر آرا کو بجرے میں لٹا دیا - اور پیر مرد سے کہا کہ آئیے آپ اور ہم ان کو کسی طرح ٹانگیں اور ان کے مُنھ سے پانی نکالیں - یہ اتنی دیر میں کیا جانیں کس قدر پانی پی گئی ہیں - پیر مرد اور میاں آزاد نے سپہر آرا کو خوب مضبوط پکڑا اور ٹانگا تو بہت سا پانی منھ سے نکلا - اس کے بعد بجرے میں لٹا دیا اور بیگ کھول کر کسی دوا کا ایک جام اس کو فوراً پلا دیا - اب حسن آرا کی فکر ہوئی - وہ بیچاری غش میں پڑی تھی آزاد نے اس کے مُنھ پر پانی کے خوب چھینٹے دیے تو ذرا ہوش آیا مگر آنکھیں بند - ہوش آتے ہی پوچھا کہ پیاری سپہر آرا کہاں ہے - آزاد جیتے بچے؟ پیر مرد نے پکار کر کہا کہ آزاد تمھارے سرہانے بیٹھے ہیں - اور تمھارا سر انھیں کے زانو پر ہے - اور سپہر آرا صحیح و سلامت تمھارے پاس لیٹی ہیں - اتنا سننا تھا کہ حسن آرا نے میاں آزاد کے زانو پر بوسہ دیا - اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ حسن آرا نے اپنے سچے عشق کا حال کسی طرح مُنھ یا زبان یا لب سے ظاہر کیا ہو، جب حسن آرا نے آنکھ کھولی اور آزاد کو دیکھا تو کہا:

حسن آرا : آزاد میری روح اگر تم پر سے فدا ہو جائے تو اس وقت مجھے اس سے زیادہ خوشی ہو جس قدر سپہر آرا کے بچ جانے سے ہوئی۔ سنو آزاد میں صدق دل سے کہتی ہوں کہ مجھے تم سے سچا عشق ہے۔ یہ کہہ کر حسن آرا نے آزاد کا ہاتھ چوم لیا۔ اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ میاں آزاد کے ہاتھ پر کسی مہوش کے بوسے کا نشان پڑا ہو۔

اتنے میں دوا کا اثر جو پہنچا، تو سپہر آرا بھی آہستہ سے اُٹھ بیٹھی اور اٹھتے ہی حسن آرا کو جھپٹ کر فرطِ شادی و مسرت سے رونے لگی۔ حسن آرا بھی خوب دل کھول کر گلے ملی، اور اشارہ کیا کہ میاں آزاد نے جان بچائی۔ سپہر آرا نے میاں آزاد کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور رو رو کر کہا کہ میاں آزاد میں تم پر سے صدقے، میں تم پر سے واری جاؤں، میں تم پر سے قربان جاؤں، تم نے آج وہ کیا جو ساری خدائی میں کوئی ایک اجنبی کے ساتھ نہ کرتا۔ پیر مرد نے سپہر آرا کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور میاں آزاد کو صد ہا دعائیں دیں۔ اس مصیبت ناک کارروائی میں عرصہ گذرا اور وہ ایوانِ کیوں النشان جو دریا کے بیچوں بیچ میں واقع تھا، نظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہوا اب بندھ گئی تھی، اور دریا میں مینڈھا بھی نہیں اُچھلتا تھا۔ بجرا آہستہ آہستہ کنارے پر آ لگا۔ اور سب کے سب اس پر سے اتر پڑے۔

آزاد : (آزاد گھانس پر لیٹ کر) اُف، مر مٹے۔ ارے توبہ! کیا ناشکری کا کلمہ منھ سے نکل گیا (گال پر تھپڑ لگا کر) یوں کہنا چاہیے کہ جی اُٹھے۔

حسن آرا : بیشک بے شبہہ۔ سپہر آرا کی جان بچائی۔ میری جان بچائی اماں جان کی جان بچائی۔ اس بیچارے بوڑھے کی جان بچائی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ تم تو ہمارے لیے مسیحا ہو گئے۔ خدا اس کا تمھیں اجر دے۔

آزاد : (ہنس کر) شکر ہے۔

حسن آرا : (لجا کر) خیر جان بچائی ہے۔

ملاح : میاں آزاد۔ خدا تم کو ایسا بوڑھا کرے کہ تمھارے پر پوتے مجھ سے بڑے بڑے تمھارے سامنے کھیلیں۔ میں کچھ اور ہی سمجھا تھا ایک شخص پیرتا ہوا جاتا تھا میں سمجھا تم ہو۔

آزاد : ہاں ہاں لو میں تو بھول ہی گیا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا۔

ملاح : کیا کہوں اس کو تو ایک ناکا کھا گیا۔

آزاد : کھا گیا۔ ارے۔ توبہ!۔ افسوس۔ کیا جری آدمی تھا۔ جب میں سپہر آرا کو لیے ہوئے ملاحی چیرتا تھا، کبھی کھڑی لگاتا جاتا تھا تو میں نے غل مچایا کہ یارو دوڑو! وہ بیچارہ ایک ٹیلے پر سے دھم سے کودا اور اس طرف چلا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد تلاطم آب نے اس کو بھی کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر

ہٹا دیا۔ہائے اب سنا کر وہ ڈوب گیا۔

سپہر آرا : ڈوب نہیں گیا ناکا کھا گیا۔ ہائے کیا مرگ مفاجات تھی۔ افسوس یہ مجھ کمبخت کے سبب سے اس بیچارے کی جان مفت میں گئی۔ میرا دل اس وقت بھر آیا۔ میری آنکھوں میں تاریکی سی چھائی ہوئی ہے ہائے یہ دریا' اس کا ستیاناس ہو جائے' اس وقت کال نظر آتا ہے۔ اُف! جس وقت میں اپنا گرنا اور غوطے لگانا یاد کرتی ہوں رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے' اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ جیسے ہی میں گری میرے ہوش اڑ گئے۔ پہلے تو خوب ہاتھ پاؤں مارے' مگر پھر جب تہہ پر بیٹھ گئی! تو منھ میں پانی جانے لگا۔ منھ کو میں نے دونوں ہاتھوں سے بند کیا۔ تو اُبھری۔ اُبھری تو پھر پانی نے بٹھا دیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

حسن آرا : میاں آزاد بڑے گاڑھے وقت میں کام آئے۔

آزاد : کس ملعون کو اپنے حسابوں یقین بھی ہو کہ جیتے بچیں گے دو مرتبہ سپہر آرا ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گئیں۔ بارے خدا نے بچایا' مگر اس وقت میرے بدن کا یہ حال ہے کہ میں ہی جانتا ہوں۔ جیسے کسی کو مہینوں کا بخار ہو۔ بس وہی کیفیت ہے۔ شل ہوں۔ شل' مگر شکر ہے۔

ملّاح : اب آپ ذرا سو رہیے' تو تھکاوٹ کسی قدر کم ہو جائے۔ اور بیگ یہ لیجیے حاضر ہے۔ دم کے دم آپ سو رہیں۔

میاں آزاد اور سپہر آرا' اور حسن آرا' اسی سبزہ نو دمیدہ کے فرش زمردگوں پر لیٹے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ہوائے خنک کا چلنا تھا کہ تینوں کی آنکھ لگ گئی۔ ملاح نے ان کی حفاظت کی۔ سوئے تو گھوڑے بیچ کر۔ دنیا و مافیہا سے بےخبر' ہوش ہی نہیں۔ چار گھنٹے کامل سویا کیے۔ اس کے بعد اٹھے تو میاں آزاد نے منھ ہاتھ دھویا۔ حسن آرا و سپہر آرا نے سنگار کیا' اور پیر مرد نے کہا : ان کو تو تم اپنے حساب غرقاب سمجھ بیٹھے ہو گے۔

آزاد : قبلہ اب یہ تذکرہ ہی جانے دیجیے۔ وحشت ہوتی ہے۔ کتابوں میں کشتیوں کے ڈوبنے کا حال پڑھا کرتے تھے۔ آج دریا کے مصائب کو اپنی آنکھوں دیکھا' اور بچشم تجربہ کیا۔ خود اپنے اوپر بیتی' اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ اس گفتگو کے بعد پیر مرد نے کہا کہ اُس فرح بخش ایوانِ عالی شان میں کیوں کر جائیے گا' بجرے پر تو اِس وقت سوار ہونا حماقت ہے۔ میاں آزاد نے قہقہہ لگایا۔ اور فرمایا کہ واہ ایسا بھی کیا خوف ہے۔ اب کیا ہر دم طوفان ہی آیا کرتا ہے۔ کچھ حسن آرا اور سپہر آرا نے کہا قسم ہے خدائے پاک کی کہ اس وقت تو ہم بجرے پر نہ چڑھیں گے' چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

آزاد : جو اس وقت جھجک گئیں تو عمر بھر خوف ہی دامن گیر رہے گا۔

حُسن آرا : آپ کی بلا سے۔

سپہر آرا : چلیے رہنے دیجیے۔ اب تو مارے تھکاوٹ کے آپ کے بدن میں اتنی سکت بھی نہ رہی ہوگی کہ کسی کی لاش کو دو قدم بھی لے چلیے۔ ناصاحب بندی نہ جانے کی۔ ہے ہے بجرے کی صورت دیکھنے سے بدن کانپتا ہے۔ تم بڑے دلیر ہو۔ ہم تمھیں بھی نہ جانے دیں گے۔

آزاد : واہ۔

سپہر آرا : دیکھ لیجیے گا۔ آپ اُدھر بجرے پر بیٹھے اور ادھر ہم دریا میں پھاند پڑے۔

آزاد : اچھا پھر بجرا پیر مرد لائیں آپ اور ہم کنارے کنارے خشکی خشکی آئیں۔

ملّاح : جی میں ہی تو ایک فالتو ہوں۔ اچھا تجویزا۔

القصہ پیر مرد تو بجرے پر گئے اور یہ تینوں کے تینوں خشکی کی راستے چلے۔

پیر مرد جیہ تو ادھر چشمہ سار میں بجرا چلا رہے تھے۔ اُدھر میاں آزاد ان دو نوں شاہدان طناز اور سراپا ناز کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ دریا کی روانی دیکھ کر سپہر آرا کانپ کانپ اٹھتی تھیں، اور حُسن آرا صرف آزاد کے چھیڑنے کو نقاب سے مُنھ ڈھانپ رہی تھیں۔

آزاد : بس یہی تو قہر ہے۔ اب ہم سے پردہ کیسا؟

حُسن آرا : ہم نا محرم سے بات کرنا وضع کے خلاف سمجھتے ہیں۔

آزاد : ہاں: ذرا اِدھر چار آنکھیں تو کیجیے۔ پھر تو فرمائیے: نا محرم! ہم نا محرم ہیں۔ کیوں سپہر آرا بیگم۔ ان کی باتیں تو سنو ہمیں نا محرم بتاتی ہیں۔

سپہر آرا : آپ اور نا محرم۔ اس وقت تو دریا کو دیکھ کر میں سہمی جاتی ہوں۔ اُف! رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اللہ بچائے۔

ملّاح : ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔

حُسن آرا : (گھانس پر بیٹھ کر) اُف بھئی ہم سے تو اب ایک قدم نہ چلا جائے گا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ آپ جائیں ہم نہ جائیں گے۔

آزاد : اللہ اللہ اتنی آپ ہوئیں کہ اس چٹیل میدان، سنسان بیابان میں تنِ تنہا گھانس پر لوٹیں چلیے بس اب تھوڑی دُور تو ہے ہی۔ ہماری خاطر سے چلی چلو۔

حُسن آرا : اللہ جانتا ہے جو اٹھا بھی جاتا ہو۔ آپ کچھ فکر کیجیے۔ ہم سے تو ہمسا تک نہیں جاتا۔ آخر چلنے کا کچھ ٹھکانا بھی ہے۔

آزاد : اب آپ بجرے پر سوار ہوں میں ساتھ ہوں۔

سپہر آرا : (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) معاذ اللہ۔ خدا کی قسم ہم نہ جانے کے۔ بجرے پر سوار ہوتے تو روح فنا ہوتی ہے۔ بس بجرا دجرا رہنے دیجیے۔

حسن آرا : نہیں بہن بجرے پر میں خود ہی نہ سوار ہوں گی۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ میاں آزاد نے پیر مرد کو کنارے کی طرف پکارا اور کہا کہ بجرا روک کر اتر آؤ۔ جب پیر مرد نے بجرے کو چھوڑا اور کنارے پر آیا تو آزاد نے کہا کہ گھر جا کر گھوڑے یا فنس لے آؤ۔ حسن آرا تھک گئی ہیں۔ مگر واسطے خدا کے سپہر آرا کے ڈوبنے ڈابنے کا حال وہاں کچھ نہ کہنا۔

حسن آرا : تم اتنا کہہ دینا کہ کل تک ہم سب آئیں گے اور سب خیریت سے ہیں۔

شطرنج

الغرض پیر مرد تو سواری لینے گئے۔ ادر میاں آزاد اور سپہر آرا اور حسن آرا بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ شطرنج کا ذکر حسن آرا نے چھیڑ دیا۔ اور کہا کہ آپ تو علم صحبت کے بادشاہ ہیں۔ کہیے کبھی شطرنج کا بھی شوق رہا ہے۔ ایک نقشہ حل کیجیے تو جانیں۔ خدا کی قسم رُخ چھُوٹ چھُوٹ جائیں۔ زچ ہو جائیے تو سہی بڑا پیچیدہ نقشہ ہے، اور چار چال کا۔ کچھ کچھ بدلیجیے تو کیا مضائقہ ہے۔

آزاد : بسم اللہ کچھ فرمائیے۔ اسی بالو پر نقشہ بنا دیجیے ابھی حل کرتا ہوں۔

حسن آرا : دیکھیے یہ نقشہ ہے۔

سبز بازی

					وزیر سُرخ		
	فیل سُرخ		پیادہ سبز				
				شاہ سبز			
	پیادہ سُرخ						
	شاہ سُرخ						

سُرخ بازی۔ چار چال میں مات کرے

آزاد : چار چال میں مات ہے۔ اچھا پہلے کون چلے۔ سبز یا سُرخ ؟

حسن آرا : واہ واہ تو آپ نقشہ حل کر چکے جو مات کرتا ہے۔ وہی پہلے چلتا ہے۔ نقشے کا یہ قاعدہ ہے۔ بس آپ حل کر چکے۔ قابلیتِ حضور معلوم کردم۔

آزاد : اچھا چلیے کشت۔

حسن آرا : (قہقہہ لگا کر) واہ کشت کی اچھی کہی نقشے میں پہلے ہاتھ کشت تو دی نہیں جاتی۔

آزاد : تو ہم حل کر چکے۔ مگر ذرا غور کرنے دیجیے چار چال کی بخ بڑی ہے۔ اچھا سوچیں تو۔ وہ حل کر لیا۔ نہ کہو گی۔ اول چال شاہ سرخ نجانۂ دوم فیل کھیلے۔ دوم پیادہ سرخ ایک گھر چلے۔ سوم فیل سرخ نجانۂ چار وزیر کھیلے۔ چہارم وزیر کی شہ مات ہو گی۔

حسن آرا : اس کی تشریح کیجیے۔

آزاد : اول چال شاہ سرخ نجانۂ دوم، فیل کی ہر طرح رہے گی۔ اب اگر حریف شاہ سبز کو نجانۂ چہارم بادشاہ سرخ کھیلے تو مات کرنے والا۔ پیادہ سرخ چلے۔ اگر شاہ سبز نجانۂ وزیر یعنی جس گھر پر تھا۔ جاوے تو شاہ سرخ کو نجانۂ سوم وزیر چلے۔ شاہ سبز کو حکمی پیادہ چلنا پڑے گا اور فیل کی شہ مات ہو گی۔

حسن آرا : سبحان اللہ۔ آپ واقعی بڑے ذکی الطبع آدمی ہیں۔ کیا چٹکیوں میں نقشہ حل کیا ہے۔ ہم نے تیس دن میں بڑے غور کے بعد کہیں حل کیا تھا۔ آپ نے دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ نکال لیا۔

لطیفہ

اتنے میں ایک آدمی سامنے سے آنکلا، تو حسن آرا اور سپہر آرا دونوں نے منہ پھیر لیا کہ اجنبی کی نظر نہ پڑے۔ میاں آزاد نے اس سے پوچھا کہو بھئی تم کون ہو، اور کہاں جاتے ہو۔ اِدھر تمھارا کیا کام!

اجنبی : حضرت میں ایک ایرانی کے پاس نوکر تھا، پہلے تو کچھ عرصے تک اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا کیا کہیں روزگار نہ ملا۔ ایک دن گھومتا گھومتا سرا میں جا نکلا تو ایک ایرانی بڑا سا عمامہ باندھے بیٹھے تھے۔ تین روپیہ ماہواری اور خوراک پر نوکر رہا۔ مگر ان کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بک کیا رہے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ لو یہ رکابی لو اور اس کو دو کر لاؤ۔ میں نے پوچھا کہ وجہ؟ تو فرمایا کہ تم کون۔ وجہ سے تم سے کیا واسطہ۔ جاؤ اس کو دو کر لاؤ۔ تب تو میں گیا اور ایک بٹا جو رکابی پر مارتا ہوں تو اتفاق سے تین ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے اب ماریں ڈالے گا۔ اس نے کہا تھا دو کر لاؤ۔ ہم نے تین ٹکڑے کر دیے خیر میں نے کہا پھر اب چاہے جو ہو۔ میں ڈرتا ڈرتا وہ رکابی ان حضرت کے پاس لے گیا اور جا کر چپکے سے کونے میں کھڑا ہوا۔ اس وقت وہ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جب میری طرف دیکھا تو آگ ہو گئے۔ پوچھا کہ یہ تم کیا کر لائے۔ میں نے کہا خداوند کر کیا لائے ایک کے تین کر لائے۔ آپ نے دو ٹکڑے کہے تھے میں تین کر لایا۔ بٹا جو پڑا تو ایک ٹکڑا زیادہ ہو گیا۔ معاف

بھیجیے! اتنے میں ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس رکابی کے دو ٹکڑے کس غرض سے مانگے تھے۔ انھوں نے کچھ فارسی میں جواب دیا تو معلوم ہوا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس رکابی کو دھو کر لاؤ۔ مگر دھو تو مُنھ سے نکلا نہیں۔ کہا دو کر لاؤ۔ میں دو کے اور تین کر لائے۔ جب سمجھا تو بہت ہی ہنسا کہ بڑا دھوکہ ہوا۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کی جہاں شادی ہوئی ہے وہاں میں جاتا ہوں۔

اتنے میں ملّاح سواریاں لے کر آئے۔ فنس پر سپہر آرا۔ سوار ہوئیں، اور ایک ترکی پر حُسن آرا، اور ایک عربی رہوار پر میاں آزاد سوار ہو کر پوقدمے جانے لگے۔ اب راہ میں وہ ہیں، اور حُسن آرا، تیسرا کوئی نہیں۔ ملّاح اپنے بجرے پر جاتے تھے۔ راہ میں آزاد نے بڑی بے تکلفی سے گفتگو شروع کی اور دردِ دل شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا، اور کہا کہ اس مرض کی دوا حکیم کے پاس ہے نہ ڈاکٹر کے پاس۔ فقط تمھارے ہاتھ میں ہے۔ چاہو جلاؤ چاہو قتل کر ڈالو۔ مختار ہو جو چاہو سو کرو۔

چین ہی چین لکھتا ہے

پلا ساقی گلبدن جامِ مُل — کھلا چاہتا ہے اب اک اور گل
کیا مست دورِ فرحناک نے — لگی دُخت رز جھانکنے تاکنے
سمجھ دیکھ کر رنگ صحبت ذرا — مبارک ہو یہ جشن ہے دوسرا
چٹکتے ہیں غنچے کھلا لالہ زار — ہوئیں بُلبلیں مست آئی بہار
لڑی آنکھ نرگس کی شمشاد سے — کیا ربط مہوش نے آزاد سے
یہاں شیشۂ و جام میں ربط ہے — نہ اب تاب نے طاقتِ ضبط ہے
یہ قلقل ہے پیغامِ عیش و سُرور — دمِ بے حجابی ہے اے ذی شعور
دکھایا جوانوں کی صحبت نے رنگ — اِدھر ہے ترنگ اور اُدھر جل ترنگ
جدھر دیکھیے دید و داد ید ہے — صراحی کے ہیں قہقہے عید ہے
نہ ہے محتسب بر سرِ احتساب — نہ قاضی کا ڈر ہے نہ فکر حساب
یہی وقت ہے جام دے جام بر — خدا کے لیے اب تو صرفہ نہ کر

غنیمت ہے یہ ولولہ یہ شباب
یہ صحبت یہ جلسہ یہ دورِ شراب

بہار عاشقی کے رنگ و بو، دلدادۂ جمالِ اصنامِ سنبل مو، میاں آزادؔ خانہ برباد، اور نوعروسِ

ستم ایجاد، بلائے جانِ آزاد، بتِ رنگین ادا، یعنی حسن آرا، دور کابے گھوڑوں پر سوار، لطف بہار دیکھتے سنبل پرشکن، اور نرگسِ غمزہ زن سے آنکھیں سینکتے۔ شبدیز سبک خیز چمکاتے کبھی دوڑاتے کبھی چمکارتے چلے جاتے تھے۔ اور بہار گلکاری قدرت دادِر دادار کے مزے اڑاتے تھے۔ ادھر معشوق زہرہ تمثال مشتری خصال، سپہر آرا فنس پر خواب ناز میں تھیں، اور چشمہ سار میں پیر مرد بجرے پر، قدرت حق دیکھ دیکھ کر وجد کر رہے تھے۔ میاں آزاد نے جو حسن آرا کو بے نقاب و بحجاب پایا تو مدعائے ضروری الاظہار زبان پر آیا۔ مگر رمز کنایہ میں۔ حسن آرا چتونوں سے تاڑ گئی کہ جلد باز آدمی ہیں۔ مطلب کی بات چبا گئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ کبھی لجائی۔ کبھی مسکرائی۔ کبھی شرمائی۔ کبھی بات بنائی۔ مگر نکاح کا لفظ زبان پر نہ لائی۔ اتنے میں سب کے سب اس ایوان سپہر توامان میں پہنچے۔ جو وسطِ چشمہ سار میں واقع تھا۔ اس عالی شان اور دلکشا فرح بخش و نزہت انتما محل میں جو میاں آزاد نے قدم رکھا تو بے اختیار کہہ اٹھے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا است

فرش و فروش بیش بہا۔ شیشہ آلات خوشنما۔ یہ قالین ہے۔ یا نگار خانۂ ارژنگ، یہ سوزنی ہے یا تختۂ تصویر فرنگ، رنگین سائبان چھت گیری زرفشاں۔ پردے خوش نقش و نگار، در و دیوار مسرت بار، پاندان مکلّل و رنگین نشان، ہوائے لخلخہ سے بہشت کی لپٹ آتی ہے۔ نسیم عنبر بیز دماغ کو طبلۂ عطار بناتی ہے۔ بزم طرب عطر روح پرور سے مست ہوئی جاتی ہے۔ طائر کلک نسرین سلک توصیف بزم طرب میں خس بدنداں ہے۔ اور کیوں نہ ہو ایک ایک ذرہ رشکِ خورشید تاباں ہے۔ روشنی کا وہ عالم کہ مہتاب جگنو نظر آتا تھا۔ خورشید عالم افروز فرط غیرت سے بحرِ ظلمات میں ڈوبا جاتا تھا۔ کہیں چراغوں کی قطار، کہیں کنول اور جھاڑ۔ جدھر نظر ڈالو جلوہ رعنائی۔ جدھر دیکھو رنگ خود نمائی۔ ہر سمت فیض کا ظہور۔ ہر طرف نور سو فور، ہر شے سے صناعان چابک دست کی صناعی نمودار ہے۔ اور حضرت نور الانوار کی صنعت بالغہ آشکار۔ چو طرفہ آرایش کا سامان اور لطف کا سماں۔

میاں آزاد خانہ برباد، چاروں طرف حیرت زدوں کی طرح گھومتے تھے۔ اور نشہ بادۂ طرب سے ہر قدم پر جھومتے تھے۔ کبھی جھروکے سے دریا کی روانی دیکھی۔ کبھی چراغاں کی نور افشانی دیکھی حیرت تھی کہ یا للعجب یہ جشنِ جمشیدی ہے یا بزمِ فریدونی ہر سمت بہجت و شادمانی۔ ہر طرف طرب و کامرانی۔ بادۂ ابتہاج جام سرور میں موج زن ہے۔ بزم طرب پر دلہن کا ایسا جوبن ہے :

امشب این مجلس رنگین زخنا بند انست
نتوان گفت بہشت ست کہ صد چند انست

اتنے میں :

پل مارنے کی ہوئی جو دیری
سبحان اللہ شان تیری

میاں آزاد کیا دیکھتے کہ چار مہوشان گل رخسار حسن آرا ، اور سپہر آرا کے ہم کنار ہوتی ہوئیں چھما چھم کرتی چلی آتی ہیں ۔ چاروں طرحدار ، باغ وبہار ، چاروں کم سن ، الڑھ پن کے دن جیسے دیکھو جوش شباب سے اکڑتی ہے ۔ جوانی پھٹی پڑتی ہے ۔ آرائش اس حسن پر جان دے ۔ اور حُسن خود بلائیں لے ۔ کسی کے ماتھے پر افشاں ، کسی کے جبین میں سے نور سعادت عیاں ، جو ہے ، پری زاد ، ستم ایجاد ، سرو قامت ، رشک شمشاد ، ایک کی پتلی پتلی کمر لچکتی ہے ۔ دوسری انا البرق کہتی ہوئی بجلی کی طرح چمکتی ہے ۔ یہ کوہ قاف کی پریاں ہیں یا جنت کی حوریاں ۔ نہیں نہیں ۔ پریوں میں یہ خود نمائی کہاں ۔ حوروں میں یہ کج ادائی کہاں ۔ ابرو قبلہ بے دل و دیناں ، سجدہ گاہ زہرہ جبیناں ۔ انکھڑیاں لگاوٹ باز ، سرمست خوبی و محو ناز :

محفل ہے حسینوں کی یا کوئی مُرقّع ہے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

حسن آرا کی زلف پریشاں دیکھ کر میاں آزاد آشفتہ حال ہو گئے ۔ گیسوئے معنبر جان کے وبال ہو گئے ۔

بتوں کے عشق میں اللہ کا جلوہ نظر آیا
حقیقی عشق پیدا ہو گیا عشق مجازی سے

حُسن آرا اپنی ہمجولیوں کو ساتھ لائی تھیں ، اور وہ بڑے شوق سے آئی تھیں کہ میاں آزاد کے جمال پر نظر ڈالیں ، دیکھتے ہی عش عش کر گئیں کہ واہ کیا جوان رعنا بلند بالا ہے ۔ آدمی کیا آفت کا پتلہ ، آتش کا پر کالہ ہے ۔ گیتی آرا بیگم جو حُسن آرا کی خالہ زاد بہن تھیں کہنے لگیں ۔

گیتی آرا : حُسن آرا بہن تمھاری پسند پر صاد ہے ۔ یہ انسان ہے یا پری زاد ہے جوش جوانی ، ہنستی پیشانی ۔ طاؤس مست کی طرح جھومنا ، اور شیر ژیاں کے مانند تنا :

شگرفی چابکے چست و دلیری بہر آہو بہ کینہ تند شیری .

سپہر آرا : (حسن آرا سے) باجی سلام۔ ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد ساطرحدار جوان کوئی کم نظر آئے گا۔ ے جناب مشکل کشا علیؑ کی قلم مشعل لے کر بھی ڈھونڈھیے تو نہ پائیے۔ یں صرف ظاہری صورت اور چاند سے مکھڑے کی نہیں کہتے۔ حُسنِ باطن پر نظر ڈالو تو نورٌ علیٰ نور، اور حُسنِ ظاہری تو ظاہری ہے۔ ع۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے " نظارے تک کے پر جلتے ہیں۔ گیتی آرا بہن بھی دیکھتے ہی لوٹ ہو گئیں۔ اور میری تو بے دست و پائی کی حالت میں انھوں نے دستگیری کی ہے۔ کفرانِ نعمت اپنا شِعار نہیں۔ جب تک جیوں گی ان کا دم بھروں گی۔

جہاں آرا : (گیتی آرا کی بہن) کیوں جی (پیر مرد سے) اس سن سے سفید بالوں میں خضاب کیوں نہیں لگاتے۔ پہلے منہدی کا استر دیجیے۔ پھر وسمہ کا ابرہ لگائیے۔ اب تو آپ نام خدا کوئی دو سو سے اوپر ہوں گے۔ کیا عاقبت کے بورلے ٹورو گے، یا مرنا بالکل بھول بیٹھے۔ تمھیں ملک الموت نے بھی چھٹّے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا۔

ملّاح : اونھ جی۔ خضاب وضاب سے کیا ہوتا ہے۔ بہت کٹ گئی تھوڑی باقی ہے۔ یہ بھی کٹ جائے گی۔ خضاب لگا کر روسیاہ کون ہو :

من موئے خویش رانہ ازاں میکنم سیاہ ۔۔۔ تا باز نوجوان شوم و نوکنم گناہ

گیتی آرا : کیوں بہن۔ میاں آزاد کچھ شعر بھی کہتے ہیں۔ صورت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر آدمی ہیں۔

حُسن آرا : کیا خوب، ماشاء اللہ قیافہ شناس بھی آپ ہیں۔ پھر آپ انھیں سے نہ پوچھئے۔ یہ گھونگھٹ کیسا۔

گیتی آرا : کبھی کی جان پہچان ہوتی تو خیر مضائقہ نہ تھا۔ بے جانے بوجھے نامحرم سے باتیں کرتے شرم آتی ہے۔

آزاد : فقیرِ بینوا سے جان پہچان کیسی۔ درویش گوشہ نشین سے۔ جھجھک یعنی چہ ؟

گیتی آرا : یہ فقیر بینوا آپ کب سے ہوئے۔

آزاد : جب سے سلطانِ خوبان کی صحبت میں باریاب ہوا۔

گیتی آرا : (مسکرا کر) چہ خوش۔ اچھی اُلٹی گنگا بہائی۔ بادشاہوں کی صحبت میں تو گدا تک مستغنی ہو جاتا ہے۔ آپ کے سلطان خوبان اچھے خسرو ہیں کہ آزاد کو گدائے بینوا کر دیں۔

آزاد : (جھیپ کر) اپنی اپنی قسمت۔

گیتی آرا: واہ یک نہ شد، دو شد۔ قسمت کو تو نہ اُلہنا دیجیے۔ قسمت نے تو سلطان خوبان کے درِ دولت تک پہنچا دیا۔

آزاد: (پھر مُنھ کی کھائی) اس وقت بُلبلِ شیدا کی طرح دلفگار ہوں دماغ صحیح نہیں۔

گیتی آرا: (قہقہہ لگاکر) کیا خدا ناکردہ خشکی زیادہ ہے۔ روغنِ گُل ملیے۔

آزاد: سبحان اللہ اس گویائی کے صدقے۔ بُلبل کے لیے روغنِ گُل اور دماغ کے لیے خشکی بھی اچھی رعایت ہے۔ یہ عروسِ فصیح البیان ہے، یا طوطی ہندوستان۔ یہ بتِ نازک آواز ہے یا بُلبلِ شیراز۔ میرا تو ناطقہ بند کر دیا۔

گیتی آرا: (مسکراکر) آدمی ہیں منصف۔

حسن آرا: (گردن پھیر کر) چشم بد دور۔

گیتی آرا: اگر طبیعت حاضر ہو اور دماغ چاق تو اس مصرعے پر ایک غزل موزوں فرمائیے:

مرضِ عشق لادوا دیکھا

آزاد: طبیعت کی تو نہ پوچھیے ہر وقت حاضر رہتی ہے۔ غائب ہونا تو جانتی ہی نہیں۔ باقی رہا دماغ اس میں شمیم زلف عنبریں سمائی ہے۔ اس وقت اور شعر و سخن؟ مگر الامر فوق الادب بسم اللہ سنیے!

شیخ کعبے میں تم نے کیا دیکھا — اسم بتوں سے ملے خدا دیکھا
سُوزِ نالہ نے کچھ اثر نہ کیا — ہم نے یہ ساز بھی بجا دیکھا
آہ نے میری کچھ نہ کام کیا — ہم نے یہ تیر بھی لگا دیکھا
آئینہ کب مقابل دل ہو (ق) — گرچہ دونوں کو باصفا دیکھا
وہ دکھاتا ہے عکسِ کم یہ کیف — اِس میں رُو اُس میں مُدعا دیکھا
ہر مرض کی دوا مقرر ہے — مرضِ عشق !! لادوا دیکھا
شکل ناخن ہے گرچہ ابرِ دیار — پر نہ اس کو گرہ کشا دیکھا
ہم نے دیکھا نہ عاشق آزاد
اور جو دیکھا تو مبتلا دیکھا

گیتی آرا: بارک اللہ آپ تو شاعر غرّا نکلے۔ کیوں حسن آرا اب ہماری قیافہ شناسی کی آپ قائل ہوئیں۔ یا اب بھی شک ہے۔

حسن آرا : قائل! ای بہن ہم معتقد ہیں۔ قائل کیا معنیٰ۔

گیتی آرا : کیا طبیعت حاضر ہے۔ واہ وا واہ۔ خصوصاً مطلع۔ تو مطلع آفتاب سے روشن تر ہے۔

شیخ کعبے میں تم نے کیا دیکھا　　ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا

اور وہ آئینہ والا قطعہ کتنا دلکش ہے کہ واہ جی واہ۔

آزاد : اب انصاف تو اسی کا متقضی ہے کہ میں نے آپ کو خوش کر دیا آپ مجھے مسرور کیجیے۔

گیتی آرا : دل و جان سے منظور۔ آپ کچھ فرمائیں میں سعی کروں گی۔ شاید میری ہی کوشش ٹھکانے لگے۔

آزاد : صورتِ سوال ہے۔ حسن آرا کے حسنِ گلوسوز نے خرمنِ صبر و طاقت جلا دیا۔ نکاح کا سوال ہے۔ ع۔ کوشش کرو کار خیر ہے یہ۔

گیتی آرا : یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جناب! دل کا سودا دل لگی نہیں ہے۔ آخر حسن آرا میں کیا بات ہے جو آپ لٹو ہو رہے ہیں، یا نام ہی پر عاشق ہو گئے۔ (حسن آرا سے) بہن مان لو۔

حسن آرا : اے واہ کیا سفارش ہے۔ کیوں مان لیں یہ ہنسی ہم کو گوارا نہیں۔

آزاد : ے

رحمی بدلم اے ستم ایجاد نہ کردی　　ایں خلنۂ ویراں شدہ آباد نہ کردی

دلجوئی من آہ زبیداد نہ کردی　　گوشے بہ فغاں دلِ آزاد نہ کردی

پیشت ہمہ تن گرچہ زبانم چہ توان کرد

حسن آرا : چہ خوش چرا نباشد۔ اب ایسا عشق چرایا کہ ذرا ضبط نہیں کر سکتے، اس نالۂ شور انگیز کو تہ کر رکھیے۔ اور میٹھی میٹھی باتیں کیجیے۔

آزاد : تلخ کامی میں میٹھی میٹھی باتیں کیسی۔

حسن آرا : سنیے بندہ پرور میں بے سمجھے بوجھے ہاں نہ کروں گی۔

آزاد : تو نہیں بھی تو نہ کیجیے۔

حسن آرا : ع۔ عشق بازی را تحمل باید ای دل پائے دارد۔ سنیے (کان میں) میں آپ کی ادا، آپ کی وفا، آپ کے خط و خال، آپ کی چال ڈھال، آپ کے حسن گلوسوز، آپ کے نور عالم افروز، آپ کی بناوٹ، آپ کی سجاوٹ، آپ کے فضل و علم، آپ کی متانت و حلم، آپ کی فصاحت۔ آپ کی ذکاوت پر ہزار جان سے عاشق ہوں، جو ایسے گل بدن کے ساتھ میرا عقد ہو تو جانے میں

پھولے نہ سماؤں۔ باغ باغ ہو جاؤں۔ زہے نصیب کہ تمھارا سا شوہر ملے۔ زہے بخت کہ کوئی تمھاری بیوی بنے۔ مگر یہ یاد رکھیے گا کہ میں وہ فعل کرنا نہیں چاہتی جس سے تربیت یافتہ عورتیں بدنام ہوں۔ اور وہی مثل صادق آئے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ میری دلی خواہش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ شریف زادیاں ایسا چال چلن رکھیں جو اوروں کے لیے نمونہ ہو، تاکہ اور شرفازادیاں بھی ہمارے نقشِ قدم پر چلیں، اور زیورِ علم وفضل سے آراستہ وپیراستہ ہو کر اپنے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔ بچّوں کی تعلیم میں مدد دیں۔ حیا پرور ہوں، پاک نظر ہوں، عصمت ہاتھ پاؤں پھیلائے، عفت دن دونی رات چوگنی ترقی پائے۔ میں جو بے سمجھے بوجھے آپ کے ساتھ نکاح کر لوں، تو آس پاس کی عورتیں طعنے نہ دیں گی کہ واہ چٹ تیری منگنی اور پٹ تیرا بیاہ۔ آج دیکھا کل نکاح۔ بوڑھی دادی کو طاق پر بٹھایا، اور آپ بیاہ رچایا۔ میرے چال چلن پر ہزاروں کی نظر ہے۔ اس شہر کی سُب مائیں اور سب بیٹیاں مجھے غور سے دیکھتی رہتی ہیں، کہ دیکھیں اس نے جو ایک نئی بات کی کہ فارسی عربی پڑھی، تو اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہمارے خاندان بھر پر لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں۔ ایک مجھ پر کیا فرض ہے جتنی بہنیں ہیں سب پڑھی لکھی۔ کیا گیتی آرا بیگم کچھ کم ہیں۔ یا جہاں آرا ان پڑھ ہے۔ میرے خاندان اور میری ہمجولیوں میں کوئی جاہل نادان مُورکھ نہیں۔ ہم جب کوئی بات کرتے ہیں آپس میں مشورہ کر کے۔ یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑیں۔ ہم چاہے مر جائیں، لیکن یہ نہ ہوگا کہ ننگ وناموس میں دھبّا لگائیں۔ شادی کرنے سے انکار نہیں، لیکن خوض کر کے دیکھو میاں اور بیوی کو عمر کا ایک معتد بہ حصّہ باہم صرف کرنا پڑتا ہے۔ اگر نہ بنی یا پھوٹ ہو گئی۔ یا چنچ چلی، یا شکر رنجی ہوئی تو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ میاں نے کس کر بیوی پر ایک لات لگائی، بیوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چٹ چٹ کوسنا شروع کیا۔ وہ الگ منھ پھلائے بیٹھے ہیں، یہ الگ روٹھی ہوئی ہیں۔ ایسے میاں اور ایسی بیوی کو دُور ہی سے سلام ہے۔ آپ کی ایک ایک ادا دل میں کھپ گئی ہے۔ آپ سے اچھا بیشک مجھے نہ ملے گا۔ لیکن آپ کو میاں کوئی جانتا بھی تو نہیں ہے۔ آپ دو تین مہینے یہاں رہیے اور جو میں کہوں وہ کیجیے۔

۱۔ پندرہویں دن آپ کے یہاں مشاعرہ ہو تاکہ اس صحبت سے آپ کا نام ہو، اور لوگ آپ کو جانیں کہ آپ بھی کوئی ہیں۔

۲۔ کوئی عمدہ اور خوشنما بنگلہ یا کوٹھی کرایہ پر لیجیے۔ مگر سرِ راہ اور اس کو نفاست سے آراستہ کیجیے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ خوش سلیقہ آدمی ہے، اور روپیوں کو محتاج نہیں ہے۔

۳- شریف زادوں رئیس زادوں علما فضلا، شعرا کے سوائے اور کسی ایسے ویسے سے صحبت نہ گرمائیے۔ شہدوں بدمعاشوں اوباشوں کو نہ آنے دیجیے:

ہم نشینِ تو از تو بہ باید   تا ترا عقل و دیں بیفزاید

۴- نماز جمعہ پڑھنے کے لیے ہر بار مسجد جایا کرو۔ جس میں مسلمان یہ نہ کہیں کہ پابند صوم و صلوٰۃ نہیں۔ لامذہب آدمی کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ خیالات چاہے جو ہوں۔ لیکن دنیا پرستی اور ظاہر پرستی بھی کسی قدر ضرور ہے۔

۵- ایک سواری رکھیے۔ اور صبح و شام ہوا کھانے جایا کیجیے۔

۶- اماں جان سے کبھی کبھی ملا کیجیے۔

اگر ان باتوں کو آپ پسند کریں اور میرا کہنا مانیں تو مجھے شادی کرنے میں اصلاً عذر نہیں۔ غور کر کے اس کا جواب لطف فرمائیے۔ یوں تو میں اور سپہر آرا دونوں ممنون ہیں۔ آپ نے اس کی جان بچائی۔ آپ کی عنایت سے اس نے دوبارہ زندگی پائی۔ میں تو آپ کی لونڈی ہوں۔ لیکن چونکہ آپ عالم آدمی ہیں، اور فہمیدہ اور سنجیدہ۔ لہٰذا صاف صاف سمجھا دیا۔ جو آپ جاہل ہوتے تو بڑی مصیبت پڑتی۔

آزاد: ایسے عالم ہونے سے ہم درگذرے، ہم نے علم و فضل کو ابھی سے استعفا دیدیا۔ ہم جاہل ہی سہی بلکہ اور گنوار کالٹھ کندۂ ناتراش۔ اچھا آپ نے جو کچھ کہا یہ سب منظور لیکن واسطے خدا کے دوسرے تیسرے دن مجھ غریب الوطن کو اپنے پاس تک تو آنے کی اجازت دیجیے اور یہ سب بھی آپ کے یہاں رونق افروز ہوں۔

گیتی آرا: ذرا پھر تو فرمائیے گا۔ چہ خوش۔ پہنچا دیتے ہی ہاتھ پکڑ لیا۔ آپ کو اپنی حسن آرا سے کام ہے یا ان کی بہنوں سے ذرا سمجھ بوجھ کے کہا کیجیے۔ حسن آرا جو تقریر دلپذیر کی اس کو گوشِ دل سے سنیے، اور سمجھیے۔ ہم اور وہ سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ کے ساتھ ان کا عقد ہو۔ لیکن ابھی جلدی نہ کیجیے گا۔ سچ کہیے گا آپ شراب تو نہیں پیتے۔

آزاد: شراب! توبہ صورت سے اور نام سے نفرت ہے:

کہاں تک آنکھوں میں سُرخی شرابخواری سے   سفید مو ہوئے باز آ سیاہ کاری سے

حسن آرا: پھر آپ کے پاس بجرے پر کہاں سے آئی جو آپ نے سپہر آرا کو پلائی۔

آزاد: سبحان اللہ وہ تو دوا تھی۔

کیا ذکرِ شراب یار توبہ خاور رہ ایسا نہ شرمسار توبہ خاور
دوزخ میں جلیں گے مے کے پینے والے توبہ خاور ہزار توبہ خاور

میاں آزاد یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ہنسیا کلوارن دھانی پھریا پھڑکاتی ہوئی، لب چشمہ سار نظر آئی، اور اس کو دیکھتے ہی ان کو اُن خرابیوں کی درگت یاد آئی جو بسنت کے دن سیہ مست ہو گئے تھے۔

جہاں آرا: اے باجی بھیّا کب سے سو رہا ہے۔ ذرا جگا دو۔ دو گھڑی کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔

گیتی آرا: نا کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا، بچے جب سوتے ہوں تو ان کو جگانا نہ چاہیے۔ اب آج سے یاد رکھنا۔ کم سنی میں جب بچّے سوتے ہیں تو ان کی باڑھ ہوتی ہے۔ ان کو جگانا ان کی نشوونما کو روکنا ہے۔ اپنے آپ جگ ہی جائیں گے۔ یہی تو بڑی خرابی ہے کہ بچوں کی غور و پرداخت کا کسی کو خیال نہیں۔ بچّے تو کونپل ہیں کونپل۔ چاہے جس طرف جھکا دو، لیکن بڑھ کر پھر مشکل ہے۔ تندرستی ان کی صحت اُن کے چال چلن کا ابھی سے خیال چاہیے۔ جس میں بڑھ کر توانا و تندرست چاق و چوبند ہوں۔ یہاں کی عورتیں بچّوں کو راہِ خدا پر چھوڑ دیتی ہیں، اسی سے تو اکثر بچّے بیمار رہا کرتے ہیں۔

حسن آرا: اس وقت ہوا بڑے زور سے چل رہی ہے۔ اُف! جگر تک ٹھٹھرا جاتا ہے۔ اے ہے۔ باجی۔ یہ کیا باتیں ہیں تمھاری اور سنو! ہم بڑے بڑے تو کانپ رہے ہیں۔ رزائی اوڑھنے کا جاڑا ہے۔ یہ دولائی چھوڑنے کو جی جو چاہتا ہو۔ اور بھیّا کو باریک شربتی کی آصف خانی خالی خولی پہنا دی ہے۔ اسی سے تو سردی کا مرض ہو جاتا ہے۔ اے دل بہار فلالین کا کرتا نیچے پہنا دو۔ اور کانوں میں ریشمی رومال باندھو۔ یہ گلاب کے پھول ہیں۔ کمھلا نہ جائیں گے۔ اِس اتنی ہوا کی انھیں برداشت کہاں۔ یہ روپیہ کون بھیّا کے ہاتھ میں دے گیا ہے۔ واہ اچھا پیار ہے۔ اور جو کھیلتے کھیلتے مُنھ میں رکھ لے جائے تو کیسی گذرے چھین لو۔

دل بہار: اے حضور چھین تو سب کچھ لوں۔ جب وہ دے بھی، وہ تو رونے لگتا ہے۔

حسن آرا: دیکھو ہم کس ترکیب سے لیتے ہیں۔ بھلا روئے تو۔ (چمکا کر) بھیّا (ہنس کر) بھیّا (جھنجھنا ہلا کر) بھیّا (تالیاں بجا کر) بھیّا (ہونٹ پر آہستہ سے انگلی رکھ کر) بھیّا (گدگدا کر)۔ بھیّا گدگدانا تھا کہ لڑکا کھل کھلا کر ہنس پڑا، اور روپیہ تڑ سے ہاتھ سے الگ۔ حسن آرا نے (روپیہ چپکے سے ہٹا کر) کہا کیوں دل بہار ہم نے روپیہ کیوں کر پھسلا کر لے لیا روایا نہ دھویا۔

دل بہار: جی ہاں۔ رونا کیسا اور ہنستا گیا بڑا شہدا ہے۔ (کھیل کر) بڑا شہدا ہے۔ بات یہ ہے کی۔ خالہ کو کیسے چپ چپاتے روپیہ حوالے کیا، اور ہم نے ہاتھ ہی لگایا تھا کہ غل مچانے لگا۔

گیتی آرا : عمر بھر تم نے لڑکے پالے۔ ہا۔ تمھیں سلیقہ نہ آیا۔ بچوں کی پرورش کچھ ہنسی کھیل تھوڑا ہی ہے۔

دل بہار : آدمی کے بچوں کا پالنا تو ایک طرف ہے، ہم کہتے ہیں کہ کتوں کے پلّوں تک کا پالنا ذری دل لگی نہیں ہے۔ ایک جنور کا پالنا مشکل ہے۔ اور ابھی میرا سن ہی کیا ہے جو میں یہ باتیں جانوں۔ بھیّا کو کل سے دست پر دست آ رہے ہیں، اور ایک ہی دن میں اس کے دشمن گھل کر کانٹا ہو گئے۔ یہاں جنگل میں اوپر آسمان نیچے سمندر نہ حکیم کوئی نہ ڈاکٹر۔

گیتی آرا : ہاں ہاں پھر دست تو آویں ہی گے۔ دانت نکلتے ہیں نہ۔ بخار اور دست تو قاعدہ ہی ہے اس کا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ہم دوا دے دیں گے۔ رات کو درخت کے تلے بچوں کو نہ سلایا کرو۔

حسن آرا : کیوں اس کا سبب؟

گیتی آرا : لوگ کہتے ہیں کہ رات کو درخت کے نیچے سونا بُرا، آدمی کو بیمار کرتا ہے۔

دل بہار : بیمار دیمار تو کوئی بھی نہیں ہو جاتا، یوں کہو کہ سائیں کے سو کھیل۔ خدا جانے آسیب ہو بھوت ہو پریت ہو کیا ہو کیا نہ ہو۔ لڑکا جھپیٹ میں آجاتا ہے۔

حُسن آرا : توبہ توبہ جھپیٹ کیسی اور بھوت پریت کیا بلا ہے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ تم ہی مورکھ عورتوں نے تو جھوٹی باتیں مشہور کر دی ہیں۔ رات کو درخت کے نیچے سونا اس سے بُرا ہے کہ شب کے وقت درخت سے ایک قسم کی ہوا نکلتی ہے، اور وہ صحت کے حق میں زہر کی خاصیت رکھتی ہے۔ سُویا اور بیمار ہوا اس کا اثر رفتہ رفتہ تندرستی پر پہنچتا ہے۔ ہاں دن کے وقت البتہ درختوں کے سایہ میں سونا اچھا ہے۔ دن کے وقت جو ہوا درختوں سے نکلتی ہے وہ صحت کے حق میں فائدہ بخش ہے۔ باقی چڑیل اور بھُوت کے ہم قائل نہیں، اور نہ یہ کوئی ان پوچ باتوں کو مانتی ہوں گی۔

حُسن آرا : ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہم یہاں مدرسۂ نسواں قائم کریں یہاں ہندوؤں کی بستی زیادہ ہے۔ میں نے ایک لکچر لکھا ہے۔ میاں آزاد اگر اصلاح دے دیں تو میں کسی دن یہاں کی شریف زادیوں کو جمع کر کے لکچر دوں، شاید کسی کے دل پر اثر کرے اور کوئی نتیجہ نکلے۔

آزاد : ہاں ہاں ذرا لکچر سنائیے تو۔ آپ کا لکچر تو قابلِ دید ہوگا۔ باقی رہا اصلاح۔ یہ آپ کا حُسنِ اخلاق ہے۔ میں ژولیدہ بیان، کج مج زبان، جاہل آدمی، اصلاح دینا میں کیا جانوں۔ ہاں اگر

آپ اپنی زبان سے خیالات فاخرہ فرمائیں تو بجاں منت۔

حُسن آرا : الامر فوق الادب۔ ہمیں عذر نہیں، مگر دست بستہ التماس ہے کہ ہنسیے گا نہیں۔

آزاد : ہنسوں بھی تو ہنس نہیں سکتا۔ من ضَحکَ ضُحِکَ۔ بسم اللہ فرمائیے۔

لکچر نسبت تعلیم النسا مصنفۂ صاحب
طبع رسا خاتونِ مہ لقا حسن آرا زاد اللہ حشمتہا

ظُرفائے بصرہ میں سے چار بزرگوار جن میں سے ہر ایک بذلہ سنجی میں طاق اور لطیفہ گوئی میں مشاق تھا۔ حضرت رابعہ بُصریؒ[1] کے پاس گئے۔ ایک نے کہا۔ اے رابعہ ذکور کامل العقل ہیں۔ اور اُناث ناقص العقل۔

رابعہ نے پوچھا وجہ۔ بُرہان؟ فرمایا کہ ان کے نقصانِ عقل کی یہی کافی دلیل ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے صاحب نے فرمایا کہ آج تک کسی عورت نے پیغمبری کا درجہ نہیں حاصل کیا۔ تیسرے بزرگوار بولے کہ عورتیں مہینے میں تین روز روزہ نماز سے باز رہتی ہیں۔ چوتھے بزرگ نے فرمایا کہ پس دلائلِ متذکرۂ بالا سے ثابت ہے کہ عورتوں پر مردوں کو فضیلت ہے۔

رابعہؒ نے کہا کہ آپ کی دلیلیں اور اعتراض ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن تنہا پیشِ قاضی روی راضی آئی، کا نقشہ ہے۔ اگر کسی عورت سے پوچھیے تو وہ بھی عورتوں کی تین فضیلتیں بیان کر سکتی ہے۔ اولاً۔ عورتوں میں کوئی ایسی نہیں سُنی گئی کہ نہ مرد ہو نہ عورت۔ ثانیاً آج تک کوئی ایسی عورت نہیں سنی گئی جس نے خدائی کا دعویٰ کیا ہو۔ یہ بے ادبی مردوں ہی سے سرزد ہوئی۔
ثالثاً۔ انبیا اور اولیا اور صلحا اور صدیقوں نے عورتوں ہی کے بطن میں پرورش پائی تھی۔ جب سب پر ظاہر ہے کہ اناث کو ذکور پر جس قدر فضیلت ہے اسے ذکور اپنے غرور کے سبب سے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

یہ برجستہ جواب سن کر ان چاروں کے حواسِ خمسہ مختل ہو گئے۔ اب میری پیاری بہنوں کو غور کرنا چاہیے کہ ذکور ہم کو کس قدر بُرا سمجھتے ہیں۔ اور کس درجہ نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ جاہل مُورکھ، اَن پڑھ، ناقص العقل، ناقص الدین، یہ خطاب ہمارے لیے تجویز ہوئے ہیں۔ لیکن ہم

[1] ایک مشہور عابدہ و زاہدہ خاتون، تصوف میں بلند مرتبہ پر فائز تھیں متوفی۔ ع ــــــ

اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھونڈی قناعت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ وہ تدبیر کریں جس سے ناقص العقل ہونے کا دھبّا مٹ جائے۔ اور وہ تدبیر یہی ہے کہ زیور علم سے متجلّی ہوں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم ناقص العقل ہیں سلّمنا، اور ناقص العقل ہونے کے سبب سے ناقص الدین بھی ہیں، لیکن یہ قصور کس کا ہے؟ ذکور کا۔ وہ ہم کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتے ہیں۔ ہمارے پڑھانے اور لکھانے کو کفر و خطا تصور کرتے ہیں، اور پھر ہمیں کو للکارتے ہیں، کہ تم کم عقل ہو۔ ذکور ہم کو بڑی ہی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے دل پر داغ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں بہائم سے کچھ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر ہماری آنکھوں پر وہ غفلت کا پردہ چھایا ہوا ہے کہ ہمیں اپنا نیک و بد کچھ نظر نہیں آتا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تعلیم نسواں کو آتش زن کالائے پارسائی، اور فروغِ بازار بے حیائی کہتے ہیں۔ اور شریف زادیوں کے تربیت یافتہ ہونے کو معائبِ شرافتِ خیر، اب نئی پود کے نوجوان البتہ اس امر کی طرف کسی قدر مخاطب ہوئے ہیں۔ لیکن زبانی داخلہ بہت۔ یہ نہیں کہ اپنی اپنی بیوی کو پڑھائیں لکھائیں۔ بس خالی باتیں سُن لیجیے۔ جو لوگ تعلیم نسواں کو اچھا سمجھتے ہیں وہ تین سوال پوچھتے ہیں۔

اولاً۔ کیا شرح محمدیؐ اور دھرم شاستر کی رو سے تعلیم نسواں کیا ممنوع ہے۔

ثانیاً۔ ہمارے اسلاف فردوس آرام گاہ کے وقت میں تعلیم النسا کا رواج تھا یا نہیں۔

ثالثاً۔ کب سے اور کیوں موقوف ہوئی۔

یہ تین سوال غور طلب ہیں اور اکثر اخباروں میں وقتاً فوقتاً ان کی بحث دیکھی۔

واضح ہو کہ امر اوّل کی نسبت سب یہی کہیں گے کہ تعلیم النسا ممنوع نہیں ہیں۔ دھرم شاستر اور شرعِ محمدیؐ دونوں کے رو سے اس کا جواز ظاہر ہے۔ اگر شرعِ محمدیؐ کی رو سے عورتوں کی تعلیم ناجائز ہوتی تو اہلِ اسلام کی وہ عورتیں جو مقدسہ سمجھی جاتی ہیں، اور جو واقع میں اس لائق تھیں کہ ان کے نقشِ قدم پر چلے، اور ان کے چال چلن کو دستور العمل بنائے، علم و فضل سے ضرور محروم رہتیں۔ ظاہر ہے کہ علم کے بغیر شرع محمدی کو مرد ہو یا عورت کوئی بخوبی سمجھ نہیں سکتا، اور جب تک بخوبی نہ سمجھے گا، ضرور ناقص العقل رہے گا۔ پس دین کی ترقی کے لیے لازم آیا۔ ذکور ہی نہیں۔ بلکہ اُناث بھی تعلیم پائیں۔ شرع کی رو سے ایسے امر مستحسن کی ممانعت یعنی چہ باقی رہا دھرم شاستر کی رو سے جواز ظاہر ہے۔ میری ہند دہنیں جانتی ہوں گی کہ منتری جی جو جاگ دلک کھیسر کی استری تھیں وہ علم و فضل میں آج تک مشہور رہیں۔ مہاراجہ دھرتراشٹ[1] کی استری گندھاری[2] جی اس قدر

[1] مہاراجہ دھرت راشٹر نابینا تھے۔ یہ کوروں کے باپ اور مہاراج پانڈو کے بھائی تھے۔
[2] گندھاری دراصل قندہاری ہے وہ قندہار کی رہنے والی تھیں اور مہاراجہ دھرت راشٹر کی بیوی تھیں۔

عالمہ پنجرہ تھیں کہ بیاسؔ[1] جی جیسے عالم اجل سے علمی بحث ہوا کرتی تھی۔ لیلاوتیؔ[2] جی کے نام سے کون فرد بشر واقف نہیں ہے۔ حساب میں اُن کو اس قدر دستگاہ حاصل تھی کہ اچھے اچھے محاسب ان کو مانتے ہیں۔ راجہ بھوجؔ[3] کے عہد میں دریا دھری جی مدارسِ نسواں کی منتظمہ مقرر تھیں۔ ایک اخبار میں میں نے پڑھا ہے کہ راجہ بھوج کی بیٹی نے راجہ پرتھی راجؔ[4] کے نام اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر بھیجا تھا۔ اگر تعلیم نسواں خلافِ احکامِ دھرم شاستر ہوتی، تو ایسے ایسے مُنی اور رشی اور مہاراجہ اس کو کب جائز رکھتے۔

اہلِ اسلام میں تعلیم نسواں کا رواج اس سبب سے کم ہوگیا کہ وہ رفتہ رفتہ کاہل ہوتے گئے۔ اور عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ عورتوں کی تعلیم کا بالکل خیال نہ رہا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ اہلِ اسلام کی شرفازادیاں نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھ سکتیں۔ اور اہل ہنود میں شاید پردے کی رسم کے سبب سے موقوف ہوگیا۔

عورتوں کا ناقص العقل ہونا ہنود میں مشہور نہیں ہے۔ تریا چرتر البتہ مشہور ہے۔ لیکن یہ اسی سبب سے کہ وہ بیچاریاں جواب نہیں دے سکتیں۔ اگر وہ بھی پڑھی لکھی ہوں، تو مردوں اور عورتوں کا اس کا مقابلہ کر کے ثابت کر دیں کہ مرد زیادہ خوش وضع اور نیک ہیں، یا عورتیں۔ عورتیں اگر ناقص العقل ہوتیں تو مدارسِ نسواں میں لڑکیاں ایسی ترقی نہ کرتیں، جیسی انھوں نے کی۔ بلکہ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ عورتیں مردوں سے ذہن و ذکاوت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ صاحب ڈائرکٹر مدارسِ بنگال و مدارس وغیرہ افسرانِ اعلیٰ کی رپورٹ سال تمام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدارس نسواں میں لڑکیوں نے بہت جلد ترقی کی، اور لڑکوں سے بڑھ گئیں۔

عورت اگر تربیت یافتہ ہوگی تو اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے عمدہ تعلیم دے گی۔ اخلاق سکھائے گی۔ اچھی اچھی باتیں بتائے گی۔ کیونکہ دس بارہ برس تک بچّے کنارِ مادری میں پرورش

---

[1] بیاس جی، ست وتی کے بیٹے تھے انھوں نے ویدوں کو مرتب کیا۔ اور ۱۸ پران لکھے۔

[2] لیلاوتی بھاسکر آچاریہ کی بیوی تھیں انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

[3] راجہ بھوج، محمود غزنوی کے ہم عصر سنسکرت کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ دھار ان کی راجدھانی تھی۔ نورانی۔

[4] راجہ پرتھی راج چوہان۔ دہلی اور اجمیر کے حکمراں تھے۔ وہ ترائین کے میدان میں شہاب الدین غوری سے شکست کھا کر قتل ہوگئے تھے۔

پلتے ہیں، اور ماں کی خوبی ان میں زیادہ اثر کرتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوئی، تو اوائل عمر میں جس قدر عمدہ تعلیم لڑکے اس سے پا سکتے ہیں اس قدر اور کسی طرز پر ممکن نہیں۔

اوائل عمر میں جب لڑکے اور لڑکیاں ساتھ کھیلتی ہیں تو ان کی ذکاوت اور ذہانت میں فرق نہیں معلوم ہوتا ہے اور اگر محسوس بھی ہوتا ہے، تو مفید بہ حق نسواں۔ لیکن پڑھ کر مرد عالم و فاضل منطقی و فلسفی ہو جاتے ہیں۔ اور لڑکیاں گڑیا گڈے کھیلتے کھیلتے محض جاہل رہتی ہیں۔ عورتوں کی ناقص العقلی اگر تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کی جائے، تو خلقی نہیں۔ افسوس ہے کہ گو ان کو تحصیل علوم اور اکتسابِ فنون کی قابلیت حاصل ہے۔ تاہم ذکور کی عدم توجہی ہم کو ان سے محروم رکھتی ہے۔ یہ کہنا کہ عورتوں کو پڑھنے لکھنے کا وقت نہیں ملتا ایک عذرِ بدتر از گناہ ہے۔ بعض عورتیں جو گھر کی اکیلی ہیں، وہ البتہ عدیم الفرصتی کا عذر پیش کر سکتی ہیں مگر یہ عذر عام نہیں ہے۔ بہت سی عورتیں ایسی ہیں جن کو بجز خفتن یا خوردن کے اور کوئی کام نہیں۔ مانا کہ نسواں علمِ برق میں بُراق نہ ہوں، جرِ اثقال میں طاق نہ ہوں، شاعری میں شہرۂ آفاق نہ ہوں۔ نثاری میں مشّاق نہ ہوں۔ لیکن اخلاق کی کتابیں تو پڑھیں۔ کفایت شعاری کے رسالے معائنہ کریں۔ مذہبی کتبِ معقول کی سیر کریں۔ حساب میں ضرب تقسیم، کسر اربعہ تک سیکھیں۔ گھر کا خرچ روزمرہ لکھ لیں۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں کو ناگری یا اردو کی کتابیں تو پڑھا سکیں۔ اب انصاف کیجیے کہ کیا اس قدر تحصیل کے لیے خضر و الیاس کی عمر چاہیے۔ ہم دعویٰ کر کے کہتے ہیں کہ چاہے کیسی ہی نئی لڑکی کیوں نہ ہو، چار پانچ برس میں یہ سب بآسانی سیکھ سکتی ہے۔

یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ اگر عورتیں پڑھی لکھی ہوں تو اپنے شوہر کو کہیں زیادہ خوش رکھیں۔ ناخواندہ عورت دوستِ جاہل ہے۔ تربیت یافتہ بی بی، مونسِ دانا۔ پڑھی لکھی عورتیں عموماً گھر کا انتظام ایسی خوبی خوش اسلوبی سے کر سکتی ہیں، جیسے اہلِ انگلستان ملک کا انتظام کرتے ہیں۔ بعض اصحاب اعتراض جڑتے ہیں، کہ تعلیم و تربیت سے عورتیں بدوضع ہو جائیں گی۔ توبہ توبہ! کیا بھونڈے خیالات ہیں۔ یہ علم و فضل پر بڑا بھاری الزام ہے۔ مگر پایۂ اعتبار سے ساقط۔ اکثر صاحبوں کا مقولہ ہے کہ جب عورتیں پڑھ لکھ جائیں گی۔ تو خفیہ عشقیہ خط و کتابت شروع کر دیں گی۔ توبہ توبہ کیا بدگمانی ہے۔ جو عورتیں ناخواندہ ہیں، کیا وہ زبانی پیغام نہیں بھیج سکتیں۔ ایک صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے کہ خط کے بھیجنے میں تو یہ خوف دامن گیر ہو سکتا ہے کہ مبادا خط پکڑا جائے، اور پھر ساری قلعی کھل جائے انکار کی گنجائش بھی باقی مطلق نہ رہے، اور اگر

زبانی پیغام ہوا تو کھلے گا کیا، اور کھلے بھی تو صاف انکار ہو سکتا ہے۔

بہر حال، اب میری دلی خواہش یہ ہے کہ ایک مدرسۂ نسواں قائم ہو، اور آپ سب مل کر مدد دیں کہ ہندو اور مسلمانوں کی شریف زادیاں اس میں پڑھنے آئیں۔ بڑی احتیاط کی جاوے گی کہ اس مدرسہ میں کوئی مرد نہ آنے پائے۔ پرندہ پر نہ مار سکے، اور عورتیں بھی وہی آسکیں گی جو شریف زادیاں ہیں ایسی ویسی عورتوں کو آنے کی اجازت نہ دی جاوے گی۔

بس اسی طرح لکھا ہے۔ ابھی صرف اسی قدر ہے۔ بعض خیالات اس میں نہیں آئے۔ وہ بھی بڑھا دوں گی۔ اب آپ فرمائیے حضرتِ آزاد کر پسند ہے یا نہیں؟ ایک بات اور سن لیجیے کہ یہ لکچر ایک جلسے میں پڑھا جائے گا۔ ذرا بغور اصلاح دیجیے، اور عجب نہیں کہ اخباروں میں بھی مشہور ہو۔

آزاد : بارک اللہ، بارک اللہ۔ یہ مضمون ہے یا فصاحت کا جیحون۔ اس وقت فرطِ طرب سے سینہ باغ باغ ہے۔ چشم بددُور کیا طبع کی رسائی ہے۔ اور کیا خداداد ذکاوت پائی ہے:

ہاں آج سخن وروں میں فائق ہے تو ۔۔۔ ذی فہم و ذکی ذہین و لائق ہے تو
ہم پایۂ چرخ ہے تری فکرِ بلند ۔۔۔ حلّالِ غوامض و دقائق ہے تو

گیتی آرا : حسن آرا کی زبان چوم لے۔ اللہ جانتا ہے کہ کیا طبیعت پائی ہے۔ آمد ہے آمد۔ آورد کا نام نہیں۔ کیا خوب ثابت کر دیا کہ تعلیم نسواں ضرور ہونی چاہیے۔ جی خوش ہو گیا۔ مدرسہ قائم ہو تو ایک گھنٹے بھر ہم بھی تعلیم دیں۔

جہاں آرا : دو گھنٹے ہم بھی پڑھائیں۔

سپہر آرا : ہم کو تو چھوکریاں پڑھاتے ہوئے شرم آئے، مگر جایا کریں ہم بھی۔

آزاد : اور ہم۔

حسن آرا : جی بجا ہے آپ کا وہاں گذر کہاں:

انسان کو علم فائدہ دیتا ہے ۔۔۔ آئینۂ عقل کو جلا دیتا ہے
دنیا میں جو عزت ہے تو عقبیٰ میں بہشت ۔۔۔ یہ دونوں جہان میں مرتبا دیتا ہے

واہ رے علم ہندوستان میں کروڑوں عورتیں ہیں۔ گنواریں بھی ہیں، دیہاتنیں بھی ہیں بیگمیں بھی ہیں۔ شریف زادیاں بھی ہیں۔ لیکن سب کے خیالات مختلف، پھر یہ تو بنی بنائی بات ہے۔ دنیا میں جس طرح صورتیں مختلف ہیں، اسی طرح سیرت بھی ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی گورا ہے کوئی کالا ہے۔ کوئی صبیح ملیح، کوئی نازک اندام کوئی گلفام، کوئی بدقطع۔ کوئی خوبرو۔ گنواروں

کو دیکھئے کہ ٹکلی ماتھے پر چپکائے، لال لال چریا پھڑکائے، کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے سبزے کے دھانی رنگ پر لوٹ پوٹ ہیں۔ پٹیاں گوند سے جمائے، اور سیندور کی لال لال مانگ نکالی، اور سمجھیں کہ بس اب ہم ہی ہم ہیں، اور ایسی پری زادیں دنیا کے پردے پر کم ہیں۔ شہر کی عورتوں کے ٹھاٹھ ہی ہیں۔ دنیا سے نرالے۔ ساری خدائی سے انوکھے۔ وہ فوق البھڑک لباس، زرق برق کہ نظر کا پاؤں پھسل پھسل جائے۔ وہ تراش خراش کہ زاہدِ صد سالہ تک ان کی بیعت لائے۔ اور انھیں کا کلمہ پڑھنے لگے۔ لیکن الف کے نام بے تک نہیں جانتیں۔ بالکل جاہل کندۂ ناتراش۔ ان پڑھ مورکھ، ہائے ہائے! یہ شریف زادیاں، اور جاہل مطلق۔ افسوس! شہر کی عورتیں عموماً بات چیت، بول چال، روزمرہ محاورے میں تو برق ہوتی ہیں، مگر پڑھنا لکھنا خیر صلاح۔ پھر خالی خولی طراری اور لفّاظی اور لسّانی سے کیا ہوتا ہے۔ فرانس میں بھی لیڈیوں کو تراش خراش، اور بناوٹ سجاوٹ کا بدرجۂ اتم شوق ہے، اور نئی نئی وضع، نئی نئی قطع ایجاد ہوتی ہے۔ نئے نئے فیشن نکلتے ہیں۔ لیڈیاں بانکی پوشاک بانکی وضع سے بن ٹھن کر سیر کو جاتی ہیں۔ لیکن یہی نہیں کہ خالی لباس پر لٹو ہوں۔ علم و فضل میں دستگاہ ہے۔ ہائے یہی تو رونا ہے کہ یہاں یا تو بالکل گنوار پن ہے، یا پھر جامہ زیبی اور طرّاری کا شوق۔ لکھنے پڑھنے سے تو کوئی واسطہ ہی نہیں۔

شریف زادی کا یہ معنی ہیں کہ بھلے مانس کے یہاں پیدا ہوئی ہو۔ خیالات چاہے گنواروں کے خیال سے بھی بدتر ہوں۔ اس سے بحث نہیں۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ اب وہ لوگ جو نیچ قوم کہلاتے ہیں۔ ان کی عورتیں پڑھنے لکھنے لگیں، اور شریف زادیاں، رئیس زادیاں، امیر زادیاں، بھلے مانسوں کی مستورات ابھی جہالت ہی کی تاریکی میں ہیں۔ اب چار دن میں سُن لیجیے گا نیچ قوم کی عورتیں شریف زادیوں کو دھمکائیں گی کہ بیگم صاحب آپ جانیں کیا۔ کریا اچھّر بھینس برابر۔ لاحول ولاقوۃ شریف زادیاں ناحق اپنے کو داغ لگاتی ہیں۔

واہ ری حُسن آرا، حُسن و جمال تو خدا نے دیا ہی تھا اُسی کے ساتھ طبیعت بھی وہ نوراتی عطا کی کہ واہ جی واہ۔ خیالات ایسے فاخرہ کہ باید و شاید۔ دل وہ نیک کہ اُہو ہو ہو۔ رائے وہ زرّین کہ سبحان اللہ۔ فکر وہ متین کہ اس کی متانتِ فکر کی قسم کھائے، اور یہ سب علم کی بدولت۔ طبیعت میں ذکاوت تو جناب باری نے کوٹ کوٹ کر بھری ہی تھی اس پر عمدہ تعلیم پائی۔ لے اڑی، گویا آئینۂ عقل پر جلا نہ ہوگی۔ چمک گیا۔ کیوں نہ ہو۔ حُسن آرا کا لکچر قابلِ دید ہے بلکہ دید ہے نہ شنید ہے۔ زبان کیسی شستہ و رفتہ، خیالات کیسے بدیع و شگرف۔ رائے کیسی فرخ

اور نوادر، ہمدردی ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل سے لگی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو فریق لجۂ جہل دیکھ کر اس کے جی جلتا ہے۔ اس نے بیڑا اٹھا لیا ہے کہ عمر بھر تعلیم نسواں کی ترغیب دیتی رہے گی۔ آفرین صد آفرین۔ اب حسن آرا کے خاندان کی اور شریف زادیوں، حسن آرا کی بہنوں کی حسنِ لیاقت دیکھیے کہ کیسی خوش سلیقہ، باتمیز، ذی جودت، تربیت یافتہ، اور ذی خلق ہیں کہ انسان اگر ایک دم کے دم بھی ان کی صحبت میں بیٹھے تو اس کا جی خوش ہو جائے، اور اخلاق و سلیقہ دیکھ کر عش عش کرنے لگے، کہ واہ ایسی شریف زادیاں تو آج تک ہندوستان میں دیکھی ہی نہ تھیں۔ دیکھیے تربیت یافتگی نے کیا رنگ اثر جمایا کہ بچوں کی پرورش، اور غور پرداخت اور علاج اور دل جلانے میں حسن آرا، اور سپہر آرا، اور جہاں آرا، اور گیتی آرا، سب کی سب طاق تھیں۔ بدتمیز عورتیں عموماً اپنے بچوں کی تندرستی کا اصلاً خیال اور مطلق پروا نہیں رکھتیں گو بچوں کی عاشق زار تو ہوتی ہیں، لیکن اپنی بدتمیزی کے سبب سے وہ فعل کر گذرتی ہیں کہ لڑکا بیمار نہ ہوتا ہو تو ہو جائے۔ حسن آرا، اور گیتی آرا، نے اس دایہ کو کیسا للکارا تھا، کہ خبردار لڑکے کو جگانا نہیں ابھی سویا ہے نیند بھر کے سونے دو۔ جب لڑکا سوتا ہو تو اس کو کبھی نہ جگائے۔

خیر حسن آرا اور سپہر آرا اور ان کی خالہ زاد بہن گیتی آرا، اور جہاں آرا، اور میاں آزاد، اور پیر مرد سب کے سب نے مل کر اس ایوانِ کیوان نشان میں بڑے لطف و سرور، اور مسرت و بہجت سے دو روز کاٹے۔ خوب خوش روزہ منایا، اور حسن آرا نے میاں آزاد کی چال ڈھال، وضع قطع بات چیت کو میزانِ خرد میں خوب تولا، خوب جانچا پرتالا، اور ان کے زرِ شرافت کو کامل عیار پایا۔ حسن آرا کی دلی آرزو تھی کہ میاں آزاد کی خو بو سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ دس دن میں، بیس دن میں، ایک مہینے میں، دو مہینے میں، جس قدر عرصے میں چاہے معلوم ہو۔ کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔

دو دن اس ایوانِ سپہر توامان میں اسی غرض سے رہی تھیں کہ میاں آزاد کے چال چلن کو بخوبی جانچیں، پرتالیں۔ جب دو دن تک خوب دیکھ بھال چکیں تو گیتی آرا نے کہا کہ حسن آرا اب چلو گھر چلیں، اور میاں آزاد سے کہو کہ کسی اور محلے میں مکان لیں، مگر آیا جایا کریں۔ بہن آزاد کی ہم کو دل و جان سے محبت ہے۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ آزاد کا اور تمہارا عقد ہو جائے۔ آزاد ہم کو اپنی بڑی سالی کہیں، اور ہم ان کو اپنا بہنوئی۔ کیا آنکھیں ہیں اہو ہو! کیا رخسارے ہیں واہ واہ واہ! کیا قد و قامت ہے، کیا شکل و صورت ہے۔ کہ سبحان اللہ! ایک طرف علم و فضل کو دیکھو۔

شاعر کیسے غرا سخنداں کیسے بے ہمتا، منشی کیسے بے بدل، نثار کیسے بے مثل، مورخ، کیسے زبردست، کیا برجستہ غزل کہی ہے۔ کتنی دلربا اور چیدہ ہے۔ مطلع مجھے تہ دل سے پسند ہے:

شیخ کعبے میں تم نے کیا دیکھا
ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا

اور لطف یہ کہ فی البدیہہ کہی۔ ادھر فرمایش ہوئی اور غزل برجستہ موزوں کر دی۔

حُسن آرا نے کہا بہن سنو ہم تو ان کے بڑے ممنون ہیں۔ انھوں نے تمھاری بہن سپہر آرا کی جان بچائی۔ میں تو ان کی لونڈی ہو جاؤں۔ خدا کی قسم! مگر بیاہ میں بے جانچے پرتالے نہ کروں گی اب تم ان سے یہ کہو کہ کسی اور محلے میں فوراً نہایت ہی عمدہ مکان کرایہ پر لیں، اور اس میں رہا کریں اور بہن ان سے کوئی ایسی بری بات کہو۔ جو شریف زادوں کی وضع کے بالکل خلاف ہے۔ دیکھو یہ مانتے ہیں یا نہیں۔ ان سے تم کہو کہ فلاں بات کر لاؤ، جو بالکل وضع کے خلاف ہو، اور ان کو ترغیب دو کہ اگر تم یہ بات کرو تو ہم حُسن آرا کو بیاہ کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ دیکھو مانتے ہیں یا نہیں۔ گیتی آرا نے کہا خوب سوچیں تم اب یہاں سے چلو تب کوئی بات ہو تم نے تو یہاں خیمہ ہی نصب کر دیے۔ حُسن آرا نے کہا پھر چلیے۔

گیتی آرا : (میاں آزاد سے) اب تو گھر چلنا چاہیے، دو دن ہو گئے۔

آزاد : ہاں اب بوریا بدھنا اٹھائیے۔ بقچہ سنبھالیے۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دل میں کہتی ہوں گی کہ دو دن غائب غلہ رہنا چہ معنی دارد۔

گیتی آرا : اس کا تو آپ خیال ہی نہ کیجیے۔ حُسن آرا کی والدۂ ماجدہ کو ان پر کامل اعتماد ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ اپنے بچھڑے کے دانت سب ہی پہچانتے ہیں۔ وہ حُسن آرا کو خوب جانتی ہیں۔ حسُن آرا بڑی نیک اور پارسا اور عفیفہ اور پاک دامن حیا پرور اور عفت کوش لڑکی ہے۔ گو مجھ سے ان سے دو ہی تین برس کی چھٹائی بڑائی ہے، لیکن میں خوب سمجھتی ہوں کہ وہ مجھ سے علم فضل، لیاقت تمیز سلیقے میں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی ماں ان پر جان دیتی ہیں۔ آپ ہرگز یہ نہ سمجھیے گا کہ یہاں دو دن رہنے سے حُسن آرا کی ماں ان کو بُرا سمجھیں، یا ان سے ناراض ہو جائیں۔ یہ ان ہونی بات ہے۔

آزاد : نہایت طبیعت خوش ہوئی بی حُسن آرا بیگم سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی۔

الغرض سب کے سب بجروں پر سوار ہو کر چلے۔ راہ میں میاں آزاد نے کئی بار گیتی آرا سے کہا کہ اگر یہ نہ مانیں گی تو میں زہر کھاؤں گا۔ میری تو جان جاتی ہے۔ میں کیا کروں، ہائے ستم

مجھے خدا نے ایسی پاکیزہ صورت کیوں دکھائی۔ میں اور میرا خدا کہ ان کی ذکاوت اور جودت، اور چال چلن، اور عفت نے مجھے اور بھی ان کا عاشق دلدادہ کر دیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔ اگر یہ صرف اتنا مجھ سے کہہ دیں کہ تو گھبرا نہیں، تو میرا جی خوش ہو جائے۔ مگر حیف صد حیف کہ یہ بالکل انکار کرتی ہیں اور ذرا امید نہیں دیتیں۔

حسن آرا : (کان میں) آزاد ہم تم پر دل و جان سے عاشق ہیں، اور عاشقِ صادق ہیں، مگر دیکھیے ذرا صبر کیجیے۔ ذرا تحمل کیجیے۔ ع۔ صبر تلخ ست ولیکن برِ شیریں دارد" آپ میرے جمال، میرے حسن میری پیاری پیاری صورت، میری سیرت کے عاشق زار ہو گئے۔ گو یہ غرور کے کلمے ہیں، لیکن میں صاف صاف کہتی ہوں کہ اگر کوئی سنے گا کہ اس طرح نکاح ہوا تو ہنسے گا۔ یہ نئی بات ہوگی اور جگت ہنسائی الگ۔

گیتی آرا : ہم سمجھ گئے۔ بس میاں آزاد اب زیادہ اصرار نہ کرو۔ حسن آرا نے صاف صاف کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا۔ اب بھی آپ نہ مانیں تو افسوس ہے۔ الغرض میاں آزاد اور حسن آرا اور گیتی آرا، اور سپہر آرا، اور پیر مرد، سب بجروں پر سوار ہوئے۔

ہوا سے مینڈھے اچھل رہے تھے۔ دریا نوجوانوں سے مزاج کی طرح بلیوں پر تھا۔ موجیں لہراتی ہوئی آتی تھیں۔ پانی ساحل کو چوم کر اٹھکھیلیاں کرتا ہوا جاتا، اور برجعت القہقری واپس آتا تھا۔ اشجار پر بہار کا عکس جوبن دے رہا تھا۔ بعض بعض شاخیں پانی کو چوم رہی تھیں۔ ان طیور ذی شعور اور مرغانِ خوش الحان، کا مزے سے بیٹھنا، اور ہوا کے جھوکوں کا اس قدرتی جھولے کو پینگ دینا، اور مرغانِ خوش نوا کا فرطِ طرب سے جھوم جھوم کر چہکنا، عجب لطفِ بہار دکھاتا تھا۔ مچھلی یہ اچکی وہ ہو رہی۔ کسی نے کہا زد ہو ہے۔ کوئی بولا بام ہے۔ وہ دریائی جانور نے سر نکالا، اور غڑاپ غوطہ کھایا۔ کچھوا یہ تیرتا جا رہا ہے۔ وہ گردن غٹ سے پیٹ کے اندر رکھی کنارے پر گھانس خوب جمی ہوئی ہے، اور ایک کونے پر غوطہ خور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ لہریں لہراتی ہوئی آتی ہیں، اور اس کے پاؤں کو چوم جاتی ہیں۔ ہوا ایسی سرد چل رہی ہے کہ جگر تک کرۂ مہریر بن گیا۔ روح ٹھٹھری جاتی ہے۔ جسم کے لحاف میں دبکی دبکائی پڑی ہے۔ نظر کے لیے چوطرف خسخانہ بنا ہوا ہے۔ شہتوت کی ہری بھری شاخ وہ تیرتی ہوئی۔ چلی آتی ہے۔ سامنے سے کسی نے دریا میں چراغ بہایا، اور اس کے دیکھتے ہی دل بہار نے غل مچایا۔ اے بیگم صاحب دوڑو دوڑو! دیکھیے کل آپ حجت کرتی تھیں کہ بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔

وہ دیکھیے برہم راکھس دریا میں سامنے سے چلا آتا ہے۔ اس پر فرمایشی قہقہہ پڑا۔ چراغ یہ آیا وہ آیا۔ وہ بجھا یہ ٹمٹمایا۔ جا بجا ناندیں پڑ رہی ہیں۔ کہیں کنڈ کہیں بھنور۔ یہ کیفیت دیکھنے سے غنچۂ دل کھلا جاتا تھا، اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ عمر بھر یہاں ہی بسر کیجیے۔ جانے کا نام تک نہ لیجیے ہر سمت قدرت بالغہ نمودار۔ ہر طرف صنعتِ کاملہ آشکار:

صانع مل جائے گر چہ صنعت دیکھے — پہنچے معنی تلک جو صورت دیکھے
دریا دریا خدا کی رحمت دیکھے — قطرہ قطرہ جو آدمی غور کرے

اور اس دریا کے بیچوں بیچ میں اس فرح بخش و دلکشا، عصمت آثار، اور ندرت انتما کوٹھی پر کچھ اور ہی عالم تھا۔ ہر طرف سے دریا دیکھ لیجیے۔ نیچے دریا بہ رہا ہے۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب چوطرفہ پانی ہی پانی اور لطف یہ کہ اوپر نظر اٹھائے تو بھی دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال، اور زمین پر تو نظر کا دامن پھولوں سے مالا مال تھا۔ جدھر دیکھو گلشنِ نگاریں، جدھر نظر اٹھاؤ فرش زمرّدیں ادھر پھہار ہے۔ ادھر بہار ہے۔ اتنے میں بادطرب انگیز خوب سنسناتی ہوئی آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا چھائی، اس وقت دریا کی کیفیت قابل دید تھی بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ سب کے دلوں سے رہی سہی کلفت دور ہو گئی۔ فکر منزلوں کا فور ہو گئی۔ دو چار دن پری رخان زہرہ تمثال، مشتری خصال، جوانی کے نشے میں چور میاں آزاد بادۂ شباب سے سرخوش و مخمور۔ ان کی شوخیاں اور امنگ، ان کی آہِ سرد اور جوانی کی ترنگ، میاں آزاد نے پیر مرد سے کہا کہ شراب خواری تو بلائے بے درماں ہے۔ ہم تو اس کے نام پر لاحول پڑھتے ہیں جس طرح ماہِ کنعاں[1] کو خسوفِ چاہ سے خلاصی بخشی۔ یونس[2] و ایوب[3] کو بچایا۔ خلیل[4] پر شررہائے جہندہ کو گلزار کر دیا۔ اسی طرح خداوندا مجھے بھی

---

[1] ماہ کنعان سے حضرت یوسف پیغمبر مراد ہیں، جن کا حسن مشہور رہے۔ ان کے بھائیوں نے انھیں کنویں میں ڈالدیا تھا۔ وہ حضرت یعقوب پیغمبر کے گیارھویں بیٹے تھے۔

[2] حضرت یونس پیغمبر تھے جن کو سمندر میں مچھلی نے نگل لیا تھا بعد میں ساحل پر اگل دیا آپ اس مصیبت سے زندہ وسلامت بچ گئے۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔

[3] حضرت ایوب پیغمبر تھے، ان کا صبر مشہور ہے اللہ نے ان کو آزمائش میں ڈالا تمام جسم سڑ گیا مگر انھوں نے تکلیف پر صبر کر لیا۔

[4] خلیل حضرت ابراہیم پیغمبر کا لقب ہے، ان کو خلیل اللہ یعنی اللہ کا دوست کہا جاتا ہے۔ ان کو نمرود نامی بادشاہ نے آگ میں ڈالا تھا مگر آگ ان کے لیے گلزار بن گئی۔

اس آبِ آتش خواص سے بچا۔ گیتی آرا نے آزاد کا غم غلط کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کیں۔ لیکن آزاد کی نظر حسن آرا کے رخ انور پر تھی، اور وہ کنکھیوں سے آزاد پر نظر غلط انداز ڈال رہی تھی۔ میاں آزاد نے حسن آرا سے پوچھا کہ کیوں صاحب ہمارے بجرے پر کیوں نہ سوار ہوئیں، بھلے مانسوں کا اس زمانہ میں اعتبار نہیں رہا؟ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ اس پر سپہر آرا بولی۔ باجی تمھارا تو اچھا سبھاؤ ہے۔ اے واہ کوئی بھلے مانس بات کرے تو جواب تک نہ دو۔ حسن آرا نے ایک عجب دلربا ادا سے کسی قدر تنک کر کہا، کہ بھلے مانسوں کو دیکھ لیا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ان کی بھل منسی انھیں کو مبارک رہے۔ آزاد بآواز بلند گانے لگے:

کبھی مذمت نہ ہوگی واعظ شرابِ گلگوں کی مے کشوں سے
زبان سے اس کو برا کہیں کیا جسے کہ منھ ہم لگا چکے ہیں

حسن آرا: جو دخت رز کو منھ لگاتے ہیں ان کو ہم نہ منھ لگائیں گے۔

اتنے میں بجرے داخل ساحل ہوئے، وہ بتانِ جادو جمال بدر و ہلال، تو ایوانِ کیوان نشان میں گئیں، اور میاں آزاد نے اپنی راہ لی۔ دور تک فنسوں کا جمگھٹا، اور مہریوں کا جھمگڑا دیکھتے رہے۔ جب فنسین نظر سے اوجھل ہوئیں، تو حضرت اپنے شفیق باتحقیق میاں ظراف کے یہاں چلے۔ آنکھیں اشک فشاں اور اشعار عشقیہ وردِ زبان:

پڑ گیا کیا زخمِ تیغِ عشق کاری ان دنوں	مرغِ بسمل کی تڑپ ہے بے قراری ان دنوں
واہ کیا جوبن پہ ہے حسنِ عروسانِ چمن	تازگی کرتی پھرتی ہے یاد بہاری ان دنوں
فرقتِ دلدار میں رخصت ہوئے ہوش و حواس	درد اک کرتا ہے دل کی غمگساری ان دنوں
جا بجا سبزہ ہوائیں سرد نہریں موج زن	کیا گلستان میں ہے لطفِ بادہ خواری ان دنوں

عاشق تو ہوئے مگر مزاج داں نہیں۔ اپنے ساقی لاابالی کا پایاں قدم لیں، جس نے ہمیں بادہ گساری میں پکا کر دیا:

چھکایا مئے سے اک عالم کو ساقی تو نے محفل میں
ادھر بھی کوئی ساغر ہم بھی ہیں امیدواروں میں

ہائے اتنا کہنا بھول گیا کہ فصلِ بہار میں مجھے جنون ہو جایا کرتا ہے۔ سڑی سودائی کی باتوں کا کیا برا مانتی ہو۔

اب سنیے کہ میاں آزاد تو اس سوچ میں تھے۔ ادھر ملاح ملے، یعنی پیر بخش کو خط گھٹوانے کا

شوق جو چرایا تو حجام کو بُلوایا۔ حجاموں کا قاعدہ ہے کہ مُنھ بناتے بناتے چہ میگوئیاں بھی کرتے جاتے ہیں۔ میاں خلیفہ ملاّحِ ملیح کا خط بناتے جاتے ہیں اور ساری خدائی کی گرما گرم خبریں سناتے جاتے ہیں۔ میاں میں لکھنؤ ایک دفعہ گیا تھا۔ تو وہاں سرا میں یہ بھی ٹکے تھے۔ اجی یہی جوان ہیں نہیں گبھرو سے جون آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس روج۔ (روز) ارے کون جوان گبھرو۔ کچھ بتاوے؟ اجی ہجور وہی گورے گورے ہیں نہیں۔ وہ جون بجرے پر بھی گئے تھے۔ ہاں ہاں وہ ہی میاں آزاد۔ جی بس بس وہی میاں آجاد۔ ہاں، پھر کچھ کہے گا۔ وہ صاحب تمھارے ایک بھٹیاری سے شادی کرنے کو تھے۔ مُل پھر نکل گئے۔ اس نے ان پر نالش جڑ دی تھی۔ کہ یہ مجھے روٹی کپڑا کچھ دیتے دیتے نہیں۔ اس بھٹیاری کو یہ اونٹ پر سوار کر کے رات کو لیے پھرتے تھے، اور کل پرسوں انھوں نے ایک چرئٖ بمار کو مارا۔ اس سے کہن کے تو چال اور لاسا اور کمپا پھینک پھانک کے چل دے۔ وہ کب مانتا۔ آپ نے اس پر دو تین چپتیں جمادیں۔ آدمی کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ اور شراب بہت پیتے ہیں۔ مُدا بڑے علم کے مالک ہیں، اور کبول (قبول) صورت بھی ہیں۔ دیدار و جوان۔ ملاح کا رنگ یہ داستان سنتے ہی فق ہوگیا۔ خبردار اور نہ کسی سے کہنا۔ ہم سے کہا تو کہا، اور کسی سے کہا تو بے ڈھب ٹھہرے گی۔ بس اب زبان سے نہ نکالنا۔ اچھا میں نے تو ہجور سے کہا اور سے گرج (غرض) ادھر میاں ظرّاف کے مکان پر حضرت آزاد پہنچے۔

آزاد : بھائی ہوت گھر میں ہو؟

لونڈی : میاں تو ابھی کہیں گئے ہیں۔ آپ کہاں سے تشریف لائے؟

آزاد : اجی وہ ہم کہیں سے آئے۔ تم کوئی قاضی ہو۔ تم بھابھی صاحب سے ہماری بندگی کہہ دو اور کہو مزاج پوچھتے ہیں۔ پہچانا یا بھول گئیں غریبوں کو۔

لونڈی : (دروازے کے پاس آن کر) بیگم صاحب سلام عرض کرتی ہیں، اور فرماتی ہیں کہ کہیے کہاں رہے اتنے دن۔

آزاد : اِدھر ہی اُدھر۔

لونڈی : وہ کہتی ہیں جی بس۔ ہم سے نہ بہت اُڑیے۔ یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں۔ یہ چار چار روز بجروں پر ہوا کھانا، اور یہاں آن کر بتے بتانا۔

آزاد : (مسکرا کر) کیا خوب، آخر آپ سے یہ کس نے کہا کچا چٹھا ہی سنا گیا یہ کن بزرگوار کی عنایت تھی۔

لونڈی : فرماتی ہیں کہ آپ کے بھائی ایک ہی جہاں بان جہاں گشت ہیں۔ شہر بھر کا حال ان سے پوچھ لیجیے۔ اب ہمیں اتنا بتا دیجیے کہ برات کس دن چڑھے گی۔ ہم نے سُنا کہ حُسن آرا آپ پر فریفتہ ہوگئیں اور کیوں نہ ہوں آپ پر بھی ماشاء اللہ عالم ہے۔ نک سُک سے درست، ہاتھ پاؤں خوبصورت مکھڑا پیارا، آنکھیں نشیلی، بن پیے ہر وقت کچے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے۔

آزاد : پھر بھائی کس کے ہیں۔ جیسے وہ خوبصورت ویسے ہم۔

لونڈی : فرماتی ہیں کہ بس دھاندلی رہنے دیجیے۔

آزاد : بھابھی صاحب یہ گھونگھٹ کا طلسم کیسا۔ آپ اور ہم سے پردہ؟ رنج ہو یا نہ ہو۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے میاں آزاد کی آنکھیں بند کر دیں آزاد چلا اٹھے کہ بھائی ظرّاف بھائی ظراف۔ دونوں گلے لپٹ گئے۔

ظرّاف : (پیٹھ ٹھوک کر) شاباش۔ ع۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند، کیوں نہ ہو واللہ مان گیا۔

آزاد : قبلہ آج نہ پوچھیے کچھ۔ چلتے چلاتے سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اس شراب سے خدا سمجھے۔ اس پر شیطان کی پھٹکار (کُل حال کہہ سُنایا)

ظرّاف : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے! اُف لاحول، توبہ توبہ! کتنے نادان ہو۔ تمھاری صورت سے نفرت ہوگئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ کوئی ایسی حرکت کرتا ہے۔ بھئی حد بھر احمق رہے تمھاری صورت سے واللہ نفرت ہوگئی۔

آزاد : اجی مجھے تو اپنی صورت سے آپ نفرت ہوگئی۔ مگر اب کچھ چارہ بتاؤ۔

ادھر آفتاب لبِ بام ہوا، اور وقتِ شام ہوا، ادھر میاں آزاد خانہ برباد، اور ظرّاف فرخ نہاد، نے کوئے جاناں کی راہ لی، اور ملّاحِ ملیح سے ملاقات کی۔

آزاد : السّلام علیکم۔

ملّاح : وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس؟

آزاد : (اور ظرّاف) الحمد للہ۔ آپ کا مزاج مبارک؟ ہمارے مزاج کی نہ پوچھیے:

نے بُلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں — میں موسمِ بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں
خنداں بشکلِ شیشہ دگریاں بشکلِ جام — اس میکدے میں آہ عبث آفریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ مرد — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ملّاح : خدا پر شاکر رہو۔ وہی بیڑا پار کرے گا۔ ہم اب بھی ساعی بالخیر ہیں۔

آزاد : (ہاتھ جوڑ کر) ذرا دور ہی سے، وہ چاند سا مکھڑا دکھا دو واسطے خدا کے۔ للہ! میں عمر بھر تمہارا غلام ہی بنا رہوں گا۔ کیا بزرگ ہے۔ واللہ۔ مقدس، متبرک، پاک نظر، قدسی صفات۔

ملّاح : اب بھاٹ تو بنیے نہیں، باقی چلیے میں تقریب کر دوں۔ پیر بخش نے آزاد کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور لے چلے۔ حسن آرا بیٹی ہم آتے ہیں، اور میاں آزاد بھی تشریف لاتے ہیں۔ آئیے آئیے تشریف لائیے! اور جو کوئی صاحب ہوں ان سے کہیے اس وقت تو معاف ہی فرمائیں۔ ایک ضروری کام ہے۔ آزاد کو تاب کہاں، تڑ سے اندر داخل۔ جاتے ہی حسن آرا کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی۔

حسن آرا : (ٹوپی اٹھا کر) ؎

گر زدست زلف مشکینت خطائی رفت رفت

ور ز ہندوی شما بر ما جفائی رفت رفت

گر دلم از طرۂ دلدار تابی برد برد

در میانِ جانِ جاناں ماجرائی رفت رفت

اب آپ کل تشریف لائیں۔

میاں آزاد خانہ برباد کلیجے پر چوٹ کھائے ہوئے، روتی صورت بنائے ہوئے، نماز مغرب کے وقت میاں ظرّاف کے ساتھ گپ اڑاتے، اور تدبیریں بتاتے، کوئے جاناں کی طرف سدھارے بھری برسات کے دن، کوئی گولی ہی بھر کے پٹے پر گئے ہوں گے۔ کہ قبلہ کی رخ سے متوالی کالی گھٹا جھومتی ہوئی آئی، اور دم کے دم میں چو طرفہ وہ تاریکی چھا گئی، کہ الاماں! دکاندار دکانیں جھٹ پٹ بند کرنے لگے۔ خوانچے والوں نے خوانچہ سنبھالا، اور لمبے ہوئے۔ کوئی بگھی پر سوار کوئی گھوڑے پر سوار شڑاپ شڑاپ کوڑے جما رہا ہے۔ کوئی فرسِ تند خو کو کڑکڑاتا ہوا جا رہا ہے۔ فٹن کھڑکھڑاتی ہوئی، یہ آئی وہ شی سے پتا ہو گئی۔ آگے والا ٹٹو کو سامنے پر سانٹا لگاتا ہے۔ کسی کا بیل دم دبائے بگٹٹ بھاگا جاتا ہے۔ کہار فنس اٹھائے، قدم جمائے اُڑے جاتے ہیں۔ دہنے جنگی بائیں چرخا۔ ہُوکھ ہُوکھ! ہُوکھ ہُوکھ۔ پیادہ پا ہر دو تیز قدم اٹھاتے ہیں۔ پائنچے چڑھاتے ہیں۔ سی نے جوتیاں بغل میں دبائے، اور سرپٹ بھاگا۔ کسی نے کمر کسی اور بابو کو ایڑ دی۔ کھٹ پٹ کھٹ پٹ۔ تاریکی اس قیامت کی کہ راہ سوجھتی ہی نہیں۔ ایک پر ایک بھد بھد کر کے گرتا ہے۔ درمیاں آزاد قہقہے لگا کر کہتے جاتے ہیں، کہ (دب، گڑ، چل چل) دھم، ارے! کیوں حضرت

پوچھنا نہ پاچھنا اور دھماک سے لڑھک جانا۔ اتنے میں تاریکی نے اور بھی زور باندھا۔ ہندو اشلوک اور مسلمان برابر آئتیں پڑھنے لگے۔ اس عرصہ میں میاں آزاد بستی کے باہر نکل گئے۔ وہاں کفِ دست میدان، سنسان بیابان، مگر وہ تاریکی کہ الاماں:

وہ شب تھی کہ ناگن بلا تھی کہ شام — نہ تھا نور کا نام کو جس میں نام
وہ پہڑ وہ جنگل وہ آفت کی رات — کہے تو کہ آئی قیامت کی رات
شرر بار تھا اژدہا یا فلک — ستاروں پہ تھا نیش عقرب کا شک
دیا بادِ صرصر نے شب کو فشار — زمین کی طرح ہل گئے کوہسار

ظرّاف: ع۔ آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ ست قدم را، اے میاں کچھ خبر ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی موقعِ سیر ہے۔ سَمک سے سَماتک تیرہ و تار ہے۔ قدم اٹھانا سخت دشوار ہے۔ مگر تمھیں تو کوئے جاناں کی یاد ہے۔ لب پر آہ و فریاد ہے۔ مگر ذری دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا، ورنہ پیچھے پچھتائیے گا۔ یا الٰہی! یا خدا! اُف ہوا نے کیا زور باندھا ہے۔ میں تو واللہ بِتّانے لگا۔ اگر صلاح ہو گھر پلٹ چلیں۔

آزاد:
باز گلبانگِ پریشان می زنم
آتشی در عندلیبان می زنم

حجلۂ من بہرِ من بستند دمن — سر بہ دیوارِ گلستان می زنم
در بن ہر خار خنجر می خورم — بر سرِ ہر نیش جولان می زنم
بسکہ لذّت دو ستم یک لخت دل — بر متاعِ صد نمک دان می زنم

اتنے میں بوندیں پڑنے لگیں۔

ظراف: وہ لیجیے قطرہ فشانی ہونے لگی۔ اب کوئی دم کے دم میں جل تھل کر دے گا۔

آزاد:
ابر ست و بہار ست و ہوا ہم مزہ دار
برخیز کہ لغزیدنِ پا ہم مزہ دار

ظرّاف: کسی بھلے مانس کے پاس جانے کا بھلا کون موقع ہے۔

آزاد: یہ عقل کی باتیں ہیں۔ اور یہاں عشق کی گھٹائیں ہیں، پھر عقل اور عشق میں بھلا کیوں کر بنے گنگا اور مدار کا کیسا ساتھ۔ یہاں تو کوسِ شاہی دشتِ جنون بجا رہے ہیں۔ اور مزے مزے سے کوئے جاناں کی طرف جا رہے ہیں۔ پیام بر کہاں جو رازِ دل کا اظہار کرے۔ خود ہی عاشق، خود ہی قاصد:

سوہیت کہ پیامِ مارساند — ایں قصّہ مگر صبا رساند
کو نکہتِ زُلفِ عنبر بنیش — سوی من مبتلا رساند
خود کیست کہ دردِ ناتوانی — در جلوہ گہِ دوا رساند

اتنے میں ایوانِ کیواں نشان نظر پڑا، اور میاں آزاد نے فرطِ طرب سے ٹوپی اچھالی، روکی، اور اُچھالی، پھر روکی، اور پھر اچھالی۔ دو قدم چلے، اور پھر اُچھالی، تب تو ظرّاف نے ٹوپی لے کر مارے غصّے کے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دی۔ اور کہا کہ بس یہی تو تم میں عیب ہے کہ اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ اوچھے کے گھر تیتر، باہر رکھوں کہ بھیتر۔ ذراسی بات ہوئی اور لگے اچھلنے۔

آزاد :
یا تنگ نہ کر ناصحِ نادان مجھے اتنا
یا لاکے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

میاں تم روکھے پھیکے آدمی۔ دماغ میں پینو ست چہرے پر بھوسا اُڑ رہا ہے۔ تم عاشقی معشوقی کی راہیں کیا جانو :

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

ایوانِ عالی شان کے قریب پہنچے، تو چوکیدار نے للکارا۔ کون ؟ دربان بولا۔ بس وہیں سے بات چیت۔ ظرّاف تو جھجکے، مگر میاں آزاد نے بڑھ کر کہا کہ۔ ہم۔ اور۔ پھر ہم۔، ہم، ہم، کون ہم کا نام بھی ہے ؟ یا ہم ہی ہم۔ اجی ہم اور کون۔ ہاں ہاں ہم ہی ہم۔ ہم نہیں تو کیا تم۔ اے صاحب ہم کا نام تو فرمائیے۔ یا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔ ہم میاں آزاد آزاد۔ آزاد کون ؟ اجی تم دل بہار کو اطلاع کر دو۔ چوکیدار نے دربان سے کہا۔ دربان نے آواز دی۔ اے بوا دل بہار ذری ادھر آؤ۔ کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ اندر سے آواز آئی پوچھو کون ہے۔ اس نے کہا آزاد نام بتاتے ہیں۔ میاں آزاد کی مطلوبہ و مرتقا حسن آرا۔ تو اس وقت خوابِ ناز میں تھیں لیکن ان کی پیاری بہن سپہر آرا دیوانِ صفدر پڑھ رہی تھیں، اور وجد کر رہی تھیں۔ جب دل بہار نے میاں آزاد کے آنے کی خبر سنائی تو سپہر آرا پھولے نہ سمائی۔ کہاں کہاں کدھر ؟ بلاؤ بلاؤ اتنے میں میاں آزاد غڑاپ مکان کے اندر داخل ہوئے۔

سپہر آرا :
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آزاد : جی بجا ہے مگر خدارا ہمیں میاں آزاد نہ کہنا۔ ہمیں دولہا بھائی کہا کیجیے۔

سپہر آرا : انشاءاللہ! خدا وہ دن بھی دکھائے تو میرا آزاد مُنھ مانگی مراد پائے۔

آزاد : آپ کی باجی کہاں ہیں؟

سپہر آرا : آج نصیب اعدا کچھ طبیعت ناساز ہے۔ دل بہار جگا دو۔ کہو میاں آزاد آئے ہیں۔

جب اس گوہر درج رعنائی، اخترِ برج خودنمائی کو خوابِ ناز سے جگایا، اور میاں آزاد کے آنے کا مژدہ طرب انگیز سنایا، تو باچھیں کھل گئیں۔ انگڑائی لیتی ہوئی بڑے ناز و ادا سے اٹھیں، اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلیں۔ اصیلوں نے دعائیں دیں، اور چٹ پٹ بلائیں لیں۔ عجب ٹھسّے سے وہ نوعروس سرمایۂ ناز، میاں آزاد کے قریب آن کر بیٹھی، تو لباسِ گراں بہا سے بہشت کی لپٹیں آنے لگیں۔

آزاد : مزاج اقدس؟

حُسن آرا : دردِ سر ہے۔

آزاد : صندلی رنگوں سے مانا دل ملا
درد سر کی کس کے ماتھے جائے گی

حُسن آرا : خیر سے آپ صندلی رنگ بھی ہیں۔

آزاد : کوئی سپہر آرا کے دل سے پُوچھے۔

سپہر آرا : کیا اس میں شک بھی ہے کچھ۔ لاکھوں میں لاجواب کروڑوں میں انتخاب۔ یہ رخسار لئے ہیں یا گلاب۔ اُف رے حُسن، اللہ ری آب و تاب۔ اس ادا کے واری۔ اس سج دھج کے صدقے۔ یہ ہٹ دھرمی باجی اچھی نہیں۔

آزاد : اے ترکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ
در دیدہ ام خلیدۂ و در دل نشستۂ

کیا سچ مچ ہماری صورت نہیں بھائی۔ ایسے نظروں سے گر گئے۔

حسن آرا : (مارے شرم کے آنکھیں نیچی کر کے بولی) اب کوئی اور بھی تذکرہ ہے یا نہیں؟

آزاد : سر پیش فگندہ بہ خجالت رنگاہی
شرمندہ ام از مردمی چشم سیاہت

آپ کی چشم بیمار، جو فروش دگندم نما و ہوش ربا ہے۔ اصل میں ظالم بلکہ اظلم لیکن ظاہر میں مظلوم نما ہے۔

حُسن آرا نے اپنے دستِ نازک سے ایک گلوری بنائی، اور اپنے ہی ہاتھ سے میاں آزاد کو کھلائی۔ اُہو ہو ہو، سپہر آرا بولی۔ لو میاں آزاد نقشہ جم گیا۔ اس پر میاں آزاد نے پاندان چھین کر ایک گلوری خود بنائی اور ہزاروں قسمیں دے دے کر اپنی مطلوبۂ مطبوعہ کو اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ سپہر آرا تے کہیں دیکھ لیا تو کہتی کیا ہے۔ اب ہمارے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی۔ کوئی لاکھ چوری سے پان کھائے لبوں کی شوخی کب چھپ سکتی ہے۔ حُسن آرا کی پیشانی پر عرق آگیا۔ مگر جب ایک دفعہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھا، اور مُسکرا کر گردن پھیر لی۔ میاں آزاد اس وقت ریشہ خطمی ہوئے جاتے تھے۔ جامے میں نہیں سماتے تھے۔ چہرہ گلنار، کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں، اور حُسن آرا عرق عرق نیچی نظروں سے تاک جھانک ہونے لگی۔

آزاد : اس وقت ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

سپہر آرا : کیوں نہیں پھر مُنھ مانگی مراد بھی تو مل گئی۔ اب مٹھائی کھلائیے۔ مُنھ میٹھا کیجیے۔ نہیں ہیں بھابی خوری پر کمر باندھوں گی۔

حُسن آرا : اللہ یہ ان دونوں میں کیا رمز و کنایہ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ شیرینی کیسی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

آزاد : ہم سمجھا دیں کیوں حضور؟

حُسن آرا : جی نہیں بس معاف کیجیے۔

آزاد : آخر ہم کب تک ترسا کریں۔ امتحان دیا پورے اترے۔ اب انعام تو ملے۔ بس اب تکلف برطرف آج میں بے قبولوائے اٹھوں تو آزاد نہیں۔ ادب آموز فرہاد نہیں۔ ایک حُسن گلو سوز اس پر طرہ نازِ جگر دوز :

آوازۂ حُسنت شدہ از نازو دو بالا   چوں نغمہ کہ لطفش شود از ساز دو بالا

حُسن آرا : ہمارا تو اس وقت بُرا حال ہے۔ نیند اُمڈی چلی آتی ہے۔ آنکھیں جھکیں پڑتی ہیں۔ اُف جمائی پر جمائی آرہی ہیں۔ بند بند ٹوٹا جاتا ہے۔ (نیم خیز ہو کر) اب ہمیں سونے جانے دیجیے۔

آزاد : (دوپٹا پاؤں سے دبا کر) بسم اللہ آرام کیجیے۔ جائیے۔ اب جائیے اے صاحب تشریف لے جائیے۔

حُسن آرا : (تنک کر) چھیڑ خانی سے آپ باز نہیں آتے۔ دامن تو دبائے ہیں، اور کہتے ہیں جائیے جائیے۔ اب جائیں تو کیوں کر جائیں۔

آزاد : دوپٹے کو پھینک جائیے۔

حسن آرا : بجایہ کسی اور کو سکھائیے (بیٹھ کر) اب صاف کہہ دوں۔

آزاد : ضرور۔ مگر آپ کے تیور اس وقت بیڈھب ہیں خدا ہی خیر کرے! کہہ ڈالیے جو کچھ کہنا ہو۔ خدا کرے میرے مطلب کی بات مُنھ سے نکلے۔

سپہر آرا : آمین۔

حُسن آرا : آپ لائق فائق۔ علم و ہنر کے شائق۔ معزز، ممدوح، زندہ دلوں کی جان در روح، نوخیز نوجوان، خوش تقریر، خوش بیان، فصیح و زبان داں، نکتہ سنج، مرنجان مرنج، عالی خاندان، معالی دودمان، فہمیدہ و سنجیدہ، حسین دمہ جبین، سب کچھ ہیں، اور میں تو آپ پر ایسی ریجھی ہوں کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ فصاحت و بلاغت میں آپ کو سلمان ساوُجی پایا، تو حُسن و جمال میں یوسف مصری :

داماں نگہ تنگ و گلِ حُسنِ تو بسیار　　　گلچیں بہارِ توز داماں گلہ دارد

مگر آپ مسافر غریب الوطن اجنبی پردیسی آدمی۔ آپ کا ٹھور نہ ٹھکانہ۔ گھر نہ بار خانہ بدوش، خانہ برباد خانماں خراب، میں کسی سے آپ کا ذکر کروں تو کہوں کیا۔ کس کے لڑکے ہیں۔ کس کے پوتے ہیں۔ کس کے نواسے ہیں۔ کس خاندان کے ہیں۔ مکان کہاں ہے۔ میں بتاؤں گی کیا؟ شہر بھر میں یہی خبر مشہور ہو جائے گی کہ حُسن آرا نے ایک پردیسی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ جس کے حسب نسب کا پتا ہی معلوم نہیں۔ مجھے تو اس کی پروا نہیں۔ میں تو خوب جانتی ہوں :

ع : 　　کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزی نیست

لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ مبادا اس نکاح سے، تعلیم یافتہ شریف زادیوں کو عوام حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اور مجھ کو لوگ بدوضع سمجھیں، جو مجھ کو مر جانے کے برابر ہوگا۔ بات وہ کرنی چاہیے کہ دھبّا نہ لگے۔ اور ہم اور تم لطف سے زندگی بسر کریں۔ اب ساری بات یہ ہے کہ اپنے مشہور کرنے کی فکر کیجیے۔ مشہور کرنے کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی کے گھر پھاند لیے، اور ڈکیتی میں نام پیدا کیجیے۔ مطلب یہ کہ نیکی کے ساتھ لوگ آپ کو یاد کریں۔

آزاد : (خوش ہو کر) چشمِ ما روشن دل ما شاد کہیے تو آگ میں پھاند پڑوں۔

حُسن آرا : ماشاء اللہ کہی بھی تو دہی دہشت کی بات۔ تم آگ میں پھاند پڑو، اور مجھے جلاؤ۔ کوئی معقول بات سوچو۔ جس میں نام ہو۔ اگر آگ میں پھاند پڑے اور بفرضِ محال بچ بھی گئے تو لوگ آپ کو سڑی سودائی ہی سمجھیں گے۔

سپہر آرا : کوئی کتاب تصنیف کیجیے۔

حسن آرا : نہیں کوئی ہمت اور بہادری کی بات ہو کہ جو سنے عش عش کرنے لگے۔ اور پھر اچھی اچھی رئیس زادیاں چاہیں کہ ان کے ساتھ میاں آزاد کا بیاہ ہو جائے۔ لیکن پھر اس وقت ہمیں آپ کا ہے کو پوچھنے لگے۔ پھر دماغ ہی نہ ملیں گے۔

آزاد : اگر میرے ایسے خیالات ہوں تو خدا مجھے غارت کرے۔

حسن آرا : تو سنیے اب روم و روس میں جنگ چھڑنے والی ہے۔ روم کی مدد آپ پر فرض ہے۔ آپ روم کی طرف سے لڑیے اور تیغ بسالت کے خوب جوہر دکھایئے۔ تمغے لٹکائے ہوئے آیئے، تو وہ نام ہو کہ ہندوستان بھر میں پھر گھر گھر آپ ہی کے چرچے ہوں، اور ہم فخر سے کہیں کہ میاں آزاد غازی ہمارے شوہر ہیں۔

آزاد : (ٹوپی اُچھال کر) منظور منظور جاؤں اور ریچ کھیت جاؤں۔ مرے تو خیر اسلام کے نام پر جان دی اور زندہ رہے۔ تو تم کو پایا۔

سپہر آرا اس تقریر کو سن کر آنسو بھر لائی اور آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہنے لگی کہ واسطے خدا کے یہ خیال دل سے دُور کر دو۔ کُجا روم کجا ہندوستان۔ وہاں تک خیال بھی منزل بمنزل دم لیتا ہوا جاتا ہے، اور میدان کارزار کے تو نام سے میرے ہوش پرّان ہوتے ہیں۔ میاں آزاد نے کہا آپ ابھی بالکل کم سن لڑکی ہیں۔

میاں آزاد وہاں سے رخصت ہوئے کہ کل ملیں گے اور پرسوں کوچ۔

سپہر آرا کا اصرار

بتا ساقیا دختِ رز کا نشان — کہ ہے رنج فرقت سے ہونٹھوں پہ جاں
فرح بخشِ خاطر ہو وہ جام دے — طبیعت ہے پُر کسل آرام دے
کہاں تک یہ گردش یہ دوران سر — سفر ہو گیا اب تو شکل سفر
یہ تفریق اور تفرقہ تا کُجا — کہیں زند ہیں اور کہیں میکدا
قیامت ہے ہر دم کی اُمید و یاس — پہنچ جائیں منزل پہ منزل شناس

ناظورۂ ملائک نظر فریب، عدوئے صبر و شکیب، خاتونِ مہ لقا، حسن آرا نے جوان گل عذار طرّار وطرحدار میاں آزاد کو ٹرکی جانے کی خبر جو سنائی، تو سپہر آرا اپنے بھولے پن کے سبب سے بہت ملول ہوئی، دھاڑیں دھاڑ آنسو بہائے، اور گول گول اشک لڑھکتے ہوئے دامن

تک آئے۔ ایک دفعہ اپنی بڑی بہن سے چمٹ گئی۔

سپہر آرا : باجی ہم کیا کریں دل بے قرار ہے چشم پُرنم اور اشکبار ہے۔ میرے تو کلیجے میں جیسے کسی نے برچھیاں چبھو دیں رات کاٹے نہیں کٹتی۔ ہائے تم کیسی بے رحم ہوئی جاتی ہو۔ آزاد کو بیکار جنگ پر بھیجتی ہو۔ اُس بیچارے نے ابھی زلفِ چلیپا بھی نہیں چھوئی، مگر خدا نہ کرے کہ عشق کی کالی ناگن اسے ڈس جائے۔ اچھی طرح رازِ دل بھی نہ کہنے پایا لیکن تم نے وہ گرما گرم فقرہ سنایا، کہ دوسرے کی عقل سرد ہو جاتی۔ ہے ہے باجی! کہاں کالے کوسوں بھیجتی ہو۔ تمھیں خاتونِ جنت کی قسم (گلے لپٹ کر) میری باجی میں صدقے، اب اس خیال خام سے درگذر رو۔ آزاد جائیں گے تو پھر ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گی۔ دن رات آنسو بہاؤ گی۔ زندگی تلخ ہو جائے گی قیامت بپا ہو گی۔ آزاد سا نو عمر، گل رخسار، شوخ و طرار، خلیق، باغ و بہار، نہ پاؤ گی نہ پاؤ گی۔ اچھا ہمیں کیا تم ہی پچھتاؤ گی۔ وہ بڑا دلیر آدمی ہے مورچے سے آزاد کا پھر آنا ایسا ہی ہے، جیسا ملک الموت کا واپس جانا۔ کیوں مفت میں کسی کی جان کی دشمن ہوئی ہو۔ ہائے اس نے ہاتھ تک نہیں لگایا، اور خدا نے اس کو یہ دن دکھایا :

کنارِ دریا پہنچ کے پانی پیا نہیں ایک بوند تس پر
چڑھی ہے موجوں کی ہم سے تیوری حباب آنکھیں بدل رہے ہیں

حسن آرا : ہائیں ہائیں بہن! اے واہ۔ یہ مفت کا رونا دھونا اچھا سوانگ ہے۔ وہ مبارک دن میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے، جبکہ آزاد تمغے لٹکائے ہوئے، روم کی لڑائی سر کر کے ہمارے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ گھوڑا ہنہناتا ہو گا، اور آزاد کھٹ سے اُتر آئیں گے اور ہم خوش خوش ملیں گے۔

اتنے میں میاں آزاد بھی دَن سے داخل ہو گئے۔ اس دن میاں آزاد پر اور ہی عالم تھا شباب وہ جوبن دکھاتا تھا کہ اہو ہو ہو! جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ آنکھیں سُرخ، جیسے خون کبوتر! گورے گورے رخسارے بعینہٖ گُلاب کی رنگت، اور لباس تو وہ بانکا پہنے تھے، کہ سر سے پاؤں تک ایک ایک عضوِ بدن قابلِ دید تھا۔ ٹوپی وہ بانکی کہ بانکپن بھی لوٹ ہو جائے۔ جوانمردی خود بلائیں لے۔ شمشیرِ خوش غلاف، اور خنجرِ خارا شگاف، اور از سر تا پا صندلی لباس۔ اس پر انگریزی عطر کی بو باس۔ سپہر آرا تو اُن کو دیکھتے ہی آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ لیکن حسن آرا نے ضبط کیا، اور بار بار کنکھیوں سے ان کے گل رخسار پر نظر ڈالنے لگی۔ اور ہنسی دل لگی کی باتوں میں رنجِ فرقت ٹالنے لگی۔ اس وقت آزاد کا چاند سا مکھڑا، حسن آرا کو ایسا بھایا کہ بے اختیار اُسی وقت

نکاح کرنے کو جی چاہا، مگر اللہ رے استقلال وضبط۔ ذرا اُف تک نہ کی۔ سپہر آرا نے کلیجے کو تھام آزاد سے روتے روتے پوچھا کہ۔ کہاں کی تیاریاں ہیں، آج کس پر چڑھائیاں ہیں۔ چھری کٹار، خنجر تلوار، لے کر کہاں چلے۔ تیور بڑے سخت پڑ رہے ہیں۔

آزاد : آج ہم موت کی تلاش میں نکلے ہیں۔ کفن باندھ کر قاتل کی جستجو ہے۔

سپہر آرا : (قدموں پر گر کر) واسطے خدا کے اس خیال سے درگذرو۔

آزاد : اب تو:

یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب
سُلطانِ عشق کی یہی فتح و شکست ہے

حُسن آرا سی بیوی پانا دل لگی نہیں ہے۔ ایسی حسین مہ جبین، معشوقہ نازنین، خوش رو، خوش خو، خوش سلیقہ، خوش تمیز، بڑے خوش قسمتوں کو ملتی ہیں:

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

اب ہم حُسن آرا سے اصرار کریں تو جواں مرد نہیں۔ اب ہمارے ان کے اسی روز شادی ہوگی جب ہم میدان کارزار سے سرخ رو ہو کر واپس آئیں گے۔ حمیت اسلام بھی اسی کی مقتضی ہے، کہ روم کے نام پر جان فدا کر دیں۔ سر کٹوائیں، اور زخم پر زخم کھائیں، مگر میدان سے رخ نہ پھیریں، قدم نہ ہٹائیں۔ ہم برٹش سبجکٹ ہیں:

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سری

سپہر آرا : جو آپ نے دہلیز تک بھی قدم رکھا، تو ہم رو رو کے ابھی ابھی اپنی جان دے دیں گے۔ ہائے یہ کیا سُنائی سنائی!

آزاد : سُنو سُنو! تم ابھی ناکردہ کار، اور کم سن ہو۔ تم ہمارے دل کے جوش و خروش کو کیا جانو۔ مگر تم گھبراؤ نہیں۔ جیتے جی بچے تو پھر آئیں گے۔ ہمارے دل سے حُسن آرا کی، اور تمھاری محبت جاتی رہے یہ محال ہے۔ بس ہمارا اتنا کہنا یاد رکھو، اور میری خاطر سے اب رونا دھونا چھوڑو۔ مجھے چلتے چلتے رنج پر رنج نہ دو۔ خوب یاد رکھو کہ حُسن آرا میرے ساتھ نکاح نہ پڑھوائیں گی۔ جب تک روم کی لڑائیاں سر کر کے میں واپس نہ آؤں گا۔ پھر سوچو تو کہ تمھارا اصرار بیجا ہے، یا نہیں، میرے دل سے لگی ہے کہ میں جاؤں اور ریچ کھیت جاؤں۔ ماروں اور مروں۔ کاٹوں اور کٹوں۔ تم روئے کیوں جاتی ہو۔ کیا لڑائی میں سب کے سب مر ہی جاتے ہیں؟ کیا میدان جنگ سے کوئی واپس نہیں؟ آتا۔ پھر تم اپنی آنکھوں کی کیوں دشمن ہوئی ہو۔

سپہر آرا : ہائے میری بہن کو یہ کیا ہوگیا۔ اس بیچارے نے تو جان بچائی، اور اس کے جلدو میں اپنی جان شیریں گنوانے کو جاتا ہے۔ اتنی دُور جا کر واپس آنا معلوم۔ پس اب میری زندگی محال ہے۔ مجھے دفنا کے جانا۔ ہے ہے اللہ جانے کن کن جنگلوں میں بے آب و دانہ ہو گے۔ کیسے کیسے پہاڑوں پر چڑھنا ہو گا۔ کہاں کہاں لڑنا بھڑنا ہو گا۔ کس کس سے مقابلہ ہو۔ اک ذرا سی گولی تو ہاتھی کا کام تمام کر دیتی ہے، انسان کی کون کہے۔ ہائے یہ صورت، یہ شکل گولیوں سے چھلنی ہو۔ ہمیں تو تمھارا حال ہی معلوم نہ ہو گا۔ دن رات بیٹھے کڑھا کریں گے اور ایک ایک دن ایک ایک برس ہو جائے گا۔ اور پھر کیا جانے آؤ نہ آؤ۔ لڑائی پر چڑھائی پر جانا کچھ ہنسی ٹھٹھا تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو تمھیں مردوں کا کام ہے۔ ہم تو یہاں ہی سے نام سُن سُن کے کانپتے ہیں۔

حُسن آرا : بہن پیاری بہن۔ اب تم ہمارا کہنا مانو کہ،

سپہر آرا : (کانوں کو ہاتھوں سے بند کر کے) نا، نہ مانوں گی نہ مانوں گی۔ لاکھ برس تک نہ مانوں گی۔ مر جاؤں۔ رہا یہ نہ مانوں گی۔

حُسن آرا : سُن تو لو!

سپہر آرا : جی بس سُن چکی۔ خون کیجیے اور کہیے سُن تو لو۔

حُسن آرا : میں فقط یہ کہتی ہوں کہ!

سپہر آرا : کہتی کس سے ہو۔ ہم ایسی سنتے کب ہیں۔

آزاد : اچھا ان کی بھی خاطر کرو بڑی بہن ہیں۔

سپہر آرا : واہ۔

حُسن آرا : میں فقط اتنا کہتی ہوں کہ تم پہلے مُنھ دھو ڈالو۔

سپہر آرا : وہ آزاد سے ہاتھ دھو کر مُنھ دھونے کی بھی طاقت رہے گی۔

حُسن آرا : یہ کیا بُری بُری باتیں زبان سے نکالتی ہو۔ ہمیں برا معلوم ہوتا ہے۔

سپہر آرا : جی اگر ایسی ہی محبت ہوتی تو توپ کے مہرے ان کو نہ بھیجتیں۔

حُسن آرا : ہائیں! ہائیں! اور توپ کے مہرے ان کو بھیجتا ہی کون ہے۔ کیا میں زبردستی تھوڑا ہی کرتی ہوں، وہ تو آپ جاتے ہیں۔ ہاں میں ان کو روکوں گی نہیں۔ وہ اسلام کے نام پر سر کٹانے جاتے ہیں۔ اور برٹش گورمنٹ کی رعایا ہیں۔ منع کروں تو کیوں کر سلطان المعظم روم، ہمارے ظہیر المذہب ہیں۔ ہم پر اُن کی مدد ایسے نازک وقت میں فرض ہے، اور ہماری ملکہ معظمہ کی

گورنمنٹ کے دوست۔

آزاد : ہاں انھوں نے مجھ سے اصرار کب کیا کہ تو ضرور جا ہی۔ میں تو خود جاتا ہوں۔ یہ منع کر کے دیکھ لیں۔ دیکھیں میں کہنا مانتا ہوں۔ کبھی نہیں، جاؤں اور پھر جاؤں۔

سپہر آرا : محبت اور عشق اس کے معنی ہیں کہ زبان سے اتنا بھی نہیں نکالتے کہ قاتل ہمارا وہ ہے۔ ہائے مقتول ہونے چلے مگر اف تک زبان پر نہ لائے سچ ہے :

عاشقان کشتگانِ معشوق اند بر نیاید ز کشتگانِ آواز

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد

بھلا خشکی خشکی جائیے گا ؟

آزاد : سمندر سمندر۔

سپہر آرا : ہے ہے (ہاتھ مل کر) اُف اُف۔ سمندر ؟ بڑی بُری سنائی۔ خدا بچائے۔ اللہ بچائے۔ علی مشکل کشا، مشکل کشائی کرے، اُف ! کلیجہ مُنھ کو آگیا آج۔

آزاد : اب رات زیادہ آئی۔ آپ آرام فرمائیں، ہم کل شب کو یہاں سے کوچ کریں گے۔

سپہر آرا : ہے ہے ! کوچ ! اُف اوہ۔ پھر دل دکھانے ہمارے پاس آتے ہی کیوں تھے ؟ (دامن زور سے دبا کر) جائیے تو دیکھوں کیوں کر جاتے ہیں آپ۔

حسن آرا : (ٹپ ٹپ آنسو بہا کر :

داغِ الفت لگا دیا کس نے نقشِ ہستی مٹا دیا کس نے
گل سے شبنم بنا دیا کس نے ہنس رہے تھے رلا دیا کس نے
زلف تیری اگر نہیں لیلےٰ مجھ کو مجنوں بنا دیا کس نے

سپہر آرا : اللہ میں کس کو سمجھاؤں۔ دل کو سمجھاؤں جو مچلا جاتا ہے، آزاد کو سمجھاؤں جو داغِ فرقت دیے جاتے ہیں، یا حُسن آرا کو سمجھاؤں کہ اس نوجوان کے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے۔

آزاد :

دل و جگر خون ہو چکے ہیں حواس تک اپنے جا چکے ہیں
وہی محبت کا حوصلہ ہے ہزار صدمے اٹھا چکے ہیں
ستم سے دل اور شاد مان ہو کبھی نہ سختی کوئی گراں ہو
کسی کا اب اور امتحان ہو ہمیں تو آپ آزما چکے ہیں

حسن آرا : ہائے کس غضب میں جان پڑی۔ اس وقت عجب حالت ہے۔ پنڈا پھیکا پڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹے جاتے ہیں، آنکھیں جل رہی ہیں آزاد۔ جو میں جھوٹ کہتی ہوں تو یہ دونوں آنکھیں پٹم ہو جائیں کہ دنیا میں اگر کسی کی چاہ ہے تو آزاد کی، لیکن دل سے لگی ہے کہ تم روسیوں کو نیچا دکھاؤ۔ روم کی کمک کو جاؤ۔ مرنا جینا مقدر کے ہاتھ ہے۔ کون رہا اور کون رہے گا :

غیرتِ حور مہ جبین نہ رہے — ہیں مکان گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسین — کھا گئے ان کو آسمان و زمین
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کلّ من علیہا فان[1]

میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم سرخرو ہو کر آؤ گے۔

آزاد : یہاں کیا راضی برضا۔ جو مرضی ہو۔ ہم تو کفن ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ مورچے سے ہٹ جائیں کیا مجال۔ زندہ رہے تو خیر ورنہ رخصت۔

سپہر آرا : (رو رو کر) ایسی باتیں تو میرے سامنے نہ کرو۔ ذرا رحم، ذرا رحم !

آزاد : اب ایک کام کیجیے۔ بات کو زیادہ طول نہ دیجیے۔ میں تو گھر جاتا ہوں، اور شب کو مل کر کوچ کروں گا۔ تم سپہر آرا کو سمجھا رکھو ورنہ راہ میں جب میں ان کے پیار کی باتیں یاد کروں گا۔ تو قدم نہ اٹھے گا۔ بے روم جائے صورت نہ دکھائیں گے۔

حسن آرا : سپہر آرا۔ اچھا اب ان کو جانے دو کل آئیں گے۔

سپہر آرا : اچھا جائیے۔

آزاد : رخصت کل ملیں گے۔

---

[1] یہ اشعار مثنوی زہرِ عشق مصنفہ مرزا شوق لکھنوی سے ماخوذ ہیں۔ آخری مصرع میں قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے۔ پوری آیت اور دال ہے۔ اس کا مطلب فرہنگ میں دیکھیے۔

سپہر آرا : نیت شب بخیر۔

حسن آرا نے کہا اُف اس وقت بڑی نیند آرہی ہے۔ اب سو رہو۔ سپہر آرا بولی، باجی سونا کہو۔ ہم کو تو ردنا کہو۔ نیند کس کی سونا حرام ہے۔ آزاد۔ آزاد، پیارے آزاد، تونے ہماری جان بچائی، مگر اس کے صلہ میں اپنی جان مفت میں گنوائی۔ خیر خدا مالک ہے۔

آج میاں آزاد بُرے پھنسے، بڑی ہی مصیبت پڑ گئی، جان عذاب ہیں۔ ساری مشیخیت خاک میں ملی۔ سخت کرکری ہوئی۔ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ افعال بد کا نتیجہ دیکھا، اعمال زبوں نے روزِ بد دکھایا۔ میاں آزاد جب سے گھر سے نکلے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ کبھی درویش شیخوخت پناہ، ولی اللہ، عارف باللہ، حق آگاہ، مشیخت دستگاہ، کبھی جرعہ نوشِ مغبچۂ بادہ فروش، رندے آشام، صبح کو شراب، شام کو جام، کبھی پہلوان یا پھکیت بن گئے۔ کسی لڑنتیے یا نبوئیے کو دیکھا اور تن گئے۔ اس کو دبوچا، اس کا مُنھ نوچا اس کو زمین پر دے پٹکا۔ اس کو گدّا دیا۔ کبھی پری رخوں کا جمال دیکھ کر مفتون ہو گئے۔ کسی لیلیٰ وش پر نظر پڑی، اور مجنوں ہو گئے، مگر ان سے بڑے بڑے کارِ نمایاں بھی سرزد ہوئے۔ مکتبوں کی انھوں نے اصلاح کی۔ مدرسوں اور کٹھ ملّاؤں کی انھوں نے خبر لی۔ پاٹ شالوں کا انھوں نے خاکہ اڑایا۔ اَن پڑھ گرگوں کو انھوں نے راستہ بتایا۔ مگر دو ایک حرکتیں فضول بھی سرزد ہو گئی تھیں۔ جن کا اب خمیازہ اٹھائیں گے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد نواب صاحب کے حکم سے میاں صف شکن علی شاہ کو سمجھانے چلے تھے اور ایک سرا میں بی اللہ رکھی بھٹیاری سے آنکھ لڑ گئی تھی۔ مگر زبانی داخلہ اللہ رکھی خود بھی ان پر ریجھی تھیں۔ اس بارے میں تو میاں آزاد بڑے ہی خوش قسمت ہیں۔ کیسی ہی گل عذار پری رخسار کیوں نہ ہو۔ ان کو نظر بھر کر دیکھا اور عاشق زار ہو گئی۔ اللہ رکھی نے ان پر نالش جڑی، اور حضرت کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ اب سنیے کہ اللہ رکھی نے اڑتی سی خبر پائی کہ میاں آزاد فلاں شہر میں ایک خاتون مہ لقا کی زلف چلیپا اور رخ زیبا پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے ہیں۔ اور وہ زہرہ تمثال بھی ان کو چاہتی ہے۔ دونوں عاشق اور دونوں معشوق ہیں۔ سوچی کہ بدلا لینے کا اچھا موقع ہے۔ میری زندگی میں تو میاں آزاد شادی نہیں کرنے پاتے، تو سہی جو میں وہیں نہ پہنچوں، اور سب معاملہ بھر بھنڈ ر نہ کر دوں۔ کیا دل لگی ہے ہمیں تے بتائیں، اور اور دن کو بیاہ لائیں۔ اللہ رکھی نے دل میں ٹھان لی کہ جاؤں اور بھر دباؤں۔ یہ سوچ کر اپنے رفیق میاں چانڈو باز کو ساتھ لے کر چلیں، اور دھم سے داخل۔ ایک سرا میں بڑے ٹھسّے سے رہنے لگیں۔ میاں چانڈو باز چوطرفہ ٹوہ لینے لگے کہ میاں آزاد کہاں ہیں۔ ایک دن

چانڈو کی پینک میں جھومتے ہوئے چلے جاتے تھے اور سامنے سے میاں آزاد اذبکی بنے ہوئے آتے تھے۔

چانڈو باز : (ہنس کر) السلام علیکم (گلے مل کر) مزاج اچھے؟ اللہ اللہ بعد مدت کے زیارت ہوئی۔ آنکھیں آپ کو ڈھونڈھتی تھیں۔ واللہ ترس ترس گئے۔ وہ جو چلتے وقت نا کے پران کو آپ نے تان کر سڑاپ سے چابک جمایا تھا۔ اس کا نشان اب تک بنا ہے، آپ کی کس کس عنایت کا ذکر کروں۔ بارے ملے خوب۔ بی اللہ رکھی تو مر گئی بیچاری۔ ہائے غضب ہو گیا۔ مرتے وقت خدا کی قسم اللہ اللہ کہا کیں، اور دم توڑنے کے پہلے تین دفعہ آزاد آزاد، آزاد، کہا اور چل بسیں رہے نام اللہ کا۔

آزاد نے جس وقت چانڈو باز کی صورت منحوس پہلے دیکھی تھی تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ روم کا جانا اور تمغے لٹکانا بھول گئے۔ سوچے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ اب عزت خاک میں ملی، اور ساری شخصیت نکل گئی۔ چانڈو باز نے ان سے جب مصافحہ و معانقہ کیا تو ان کا جی چاہا کہ فوراً پھونک کر للکاریں، لیکن چانڈو باز نے بیان کیا کہ اللہ رکھی رہگرائے عالم جاودانی ہوئیں، تو کسی قدر خوش اور کسی قدر ملول ہوئے۔ خوش اس وجہ سے کہ چلو بلا گئی۔ خس کم جہاں پاک۔ اور ملول اس سے کہ عین عنفوان شباب میں اس نے وفات پائی۔ لیکن جب میاں آزاد نے سنا کر نزاع کے وقت ان کا نام ورد زباں تھا تو بڑا ہی افسوس ہوا۔ پرانی محبت نے جوش کیا۔ اور آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ چانڈو باز دل میں سوچا کہ مار لیا، پھر دل میں آ گئے۔ جھانسا کھا گئے، وہ چکمہ دیا کہ یاد ہی تو کریں گے۔

آزاد :

صد حیف کہ گل رخان کفن پوش شدند　　وز خاطر یک دگر فراموش شدند
آن تان کہ بصد زبان سخن می گفتند　　آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

کیوں حضرت ہم سے بڑی محبت تھی۔ اُف! اس وقت بُرا حال ہے، ہائے مرتے وقت دو دو باتیں بھی نہ کرنے پائے۔

چانڈو باز : جی کیا عرض کروں۔ واللہ ہے، اس پیار اور اس حسرت سے تمھیں یاد کیا کہ بس میں کیا کہوں۔ میرا تو اس وقت عجب نقشہ تھا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی، اور سر مقدس گھٹنے پر لے کر بیٹھا رہا، اور دم واپسین تک آپ ہی کی یاد کرتی رہیں۔ کھٹ ہوا اور آزاد آئے۔ دھم ہوا آزاد

آئے۔ آپ اپنا ایک رومال بھول آئے ہیں۔ اس کو ہر روز دیکھ لیتی تھیں۔ کئی تولہ عطر اس میں ملا۔ اور مرتے وقت کہا کہ ہماری تربت پر یہ رومال رکھ دینا۔

آزاد : (رو رو کر) اُف کلیجہ مُنھ کو آتا ہے۔ کس مردود کو معلوم ہو کہ اللہ رکھی کو ہم سے اس درجہ الفت تھی۔ ہائے ہم اس کی پیار کی باتوں اور رمز و کنایہ کی گھاتوں کو ذرا نہ سمجھے۔

چانڈو باز : ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے بنا کر دے گئی ہیں کہ اگر میاں آزاد حُسنِ اتفاق سے آجائیں تو ان کو دے دینا اور کہنا کہ اب حشر میں ہم آپ کی صورت دیکھیں گے۔ بس۔

آزاد : بھائی اسی وقت دو۔ ابھی ابھی دو۔ واسطے خدا کے ابھی لاؤ! یار میں تو مرا بے موت۔ لائیو تو گلدستہ ذرا میں چوم لوں۔ سر پر رکھوں۔ آنکھوں سے لگاؤں گلے سے لگاؤں۔

چانڈو باز : (آنسو بہا کر) چلیے میں سرا میں فروکش ہوں۔ گلدستہ ساتھ ہے۔ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ ہائے کیا گلدستہ ہے۔

آزاد : سچ کہنا پیاری پیاری صورت تھی۔ اہو ہو ہو۔ وہ مکھڑا کہ سبحان اللہ۔

آزاد اور میاں چانڈو باز مل کر چلے۔ راہ میں اللہ رکھی کے حُسن و جمال، اور خط و خال، اور بھولی بھالی باتوں اور عشق کی گھاتوں کا ذکر مذکور رہا۔ چلتے چلتے دونوں سرا میں داخل ہوئے میاں آزاد جیسے ہی آگے بڑھے اور چانڈو باز کی کوٹھری میں گھسے، ویسے ہی دیکھتے کیا ہیں کہ بی اللہ رکھی بگلے کے پر کا سا سفید لباس پہنے کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہی میاں آزاد کا رنگ فق ہو گیا۔ ارے! ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں،" چُپ اب ہلتے ہیں، نہ بولتے ہیں۔ پیکر تصویر کی طرح بے حس و حرکت، پیشانی پر عرق عرق۔ آنکھیں جھپک گئیں، اور ایک دفعہ ہی بآواز بلند کہا۔ (اُف مرگیا) یہ کہہ کر میاں آزاد دھم سے گر پڑے، اور پھر کہا (اُف

اللہ رکھی : (زور سے تالیاں بجا کر) مجرا عرض کرتی ہوں۔ اے بندہ پرور ذری ادھر نظر کیجیے! یہ مہینوں کی راہ طے کر کے ہم صرف آپ ہی کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اور آپ کو ہم سے ایسی نفرت ہے کہ آنکھ تک نہیں ملاتے۔ واہ ری خوبی قسمت اب ذرا سر تو اٹھائیے۔ گردن تو ہلائیے۔ وہ چاند سا مکھڑا تو دکھائیے۔ ہائے کیا ستم ہے۔ جن پر ہم جان دیتے ہیں، وہ ہماری صورت سے بیزار ہیں بقول صفدر:

دل و جگر خون ہو چکے ہیں حواس تک اپنے جا چکے ہیں

وہی محبت کا حوصلہ ہے ہزار صدمے اٹھا چکے ہیں

کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں، ذرا ہم کو تو ان کا جوبن دکھا دو۔ ہم نے سنا بادِ بہاری کی طرح

کبھی چمن میں ناز کرتی پھرتی ہیں، کبھی طاؤس طنّاز کے مثل جھوم جھوم کر چلتی ہیں، کبھی بجروں پر سیر دریا کو جاتی ہیں، کبھی ہمجولیوں کو لے کر جشن آڑاتی ہیں، اور نام خدا بھی سولہ ہی سترہ کا سن ہے، اور اِن دنوں تو بناوٹ سجاوٹ پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں:

کبھی ہے سرمہ کبھی ہے مستی کبھی ہے ان کو تمازہ بھی حنا ہے
تو ان کے آگے سے کھینچتا ہے وہ تیرے آگے سے انجمن ہیں۔
غرض کہ آئینہ کا بھی طوطی عجب حسینوں میں بولتا ہے

کیوں بندہ پرور ہم بک رہے ہیں، یا بھوتک رہے ہیں۔ (رخساروں پر ہاتھ پھیر کر) ہمارا ہی لہو پیے، جو ادھر نہ دیکھے، ایک نظر ذرا ادھر بھی!

آزاد: جناب باری کی قسم صرف تمھیں کو دیکھنے آیا ہوں۔

چانڈو باز: کسی اور بھروسے نہ رہیے گا۔ اس وقت بھائی آزاد کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی، ان کو بھی تم سے دلی انس ہے۔ خدا کی قسم میں نے جو یہ فقرہ چُست کیا کہ اللہ رکھی نے نزع کے وقت آزاد، آزاد کہہ کر دم توڑا تو ان کے چہرے پر بھی موت کے سے آثار پائے گئے۔

اللہ رکھی: خیر اتنی تو ڈھارس ہوئی کہ مرنے کے بعد ہمارا قاتل آنسو بہائے گا، لیکن کیا!۔

آئے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

آزاد: اللہ رکھی اب ہماری عزت وآبرو تمھارے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو جلاؤ، چاہو تو نہ جلاؤ۔ اگر ہم تمھارے معشوق ہیں تو ہمیں دق نہ کرو۔ ورنہ اب ہم سنکھیا کھالیں گے اور اسی دم جان دیں گے۔ اگر ہماری موت منظور ہو تو خدا کی قسم ہم کمر کس کر مرنے پر آمادہ ہو جائیں، اور اگر ہماری زلیست چاہو تو ہمیں آزاد کر دو:

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم وبیش را

اللہ رکھی: سنو آزاد ہم بھی شریف زادی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی نہ سمجھنا۔ مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم پاجیوں کی طرح سرا میں بھٹیاری بن کر رہیں۔ میں ایک شریف کی لڑکی ہوں۔ او نادان ہم کو اس قدر بھول گیا۔ یاد ہے کہ ہمارے بوڑھے میاں نے تم سے ہمارے لیے خط لکھوایا تھا، اور تم ہمارے گھر کا پتہ ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے، اور ہماری تمھاری چار آنکھیں ہوئی تھیں، اور پھر ہم ایک دن فنس پر سوار ٹھٹے سے جاتے تھے، اور مہری فنس کا کونا دبائے چلتی ہوئی ساتھ تھی، اور

کئی دن تک آپ ہم پر لٹو رہے۔ آخر کار آپ تو فقرّو ہو گئے۔ اور ہمارے بوڑھے میاں نے انتقال کیا۔ ہم کم سن کوئی چودہ پندرہ برس کی عمر، وہ دقیانوس کے ہم عصر، ہمیں ان کی صورت سے نفرت تھی۔ پوپلا منھ، دانت چوہے کے نذر کر چکے تھے۔ کمر بہتر جگہ سے خم۔ بھوں تک سفید۔ حلوا دن رات کھائیں۔ آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ قوت سامعہ سے بے بہرہ۔ ہائے ہماری اماں نے ہمیں کس موے بوڑھے کے ساتھ بیاہا تھا۔ دن رات ہم کڑھا کرتے تھے، اور ہماری جوانی مفت میں ضائع جاتی تھی۔ آخر کار وہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہی تھے، چل بسے جس دن ان کے مرنے کی خبر آئی، ہم نے مسجد میں گھی کا چراغ جلائے، لیکن ہماری اماں نے پھر ہماری شادی نہ کی، اور ہم کو یہ سوجھی کہ گھر سے نکل بھاگیں۔ اللہ جانتا ہے جو ننگ و ناموس میں فرق آیا ہو۔ تم سے بیاہ کرنے کا بہت شوق تھا، مگر تم یہ سمجھ کر کہ بھٹیاری کو کیا بیاہیں نکاح پر راضی نہ ہوئے اب ہم نے سنا ہے کہ حسن آرا کے ساتھ تمھارا نکاح ہونے والا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ شبھ گھڑی بیاہ ہو۔ اچھی ساعت نکاح ہو۔ اب ہم اپنے آپ اجازت دیتے ہیں۔ خوشی سے بیاہ کیجیے۔ پیاری پیاری دلہن کے ساتھ نکاح کیجیے"۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد"، لیکن ہمیں نہ بھول جانا۔ لونڈی بن کر رہوں گی۔ مگر تم کو نہ چھوڑوں گی نہ چھوڑوں گی۔

آزاد : اُف اوہ۔ تم وہ ہو جس کا اس بوڑھے خرانٹ پیر فرتوت کے ساتھ بیاہ ہوا تھا۔ اُف اوہ! یہ راز تو اب کھلا۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ تم چمن میں اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھیں۔ بات بات پر مچلتی تھیں۔ وہ اچپلاہٹ کہ الاماں، وہ چلبلاہٹ کہ الحذر، وہ شوخی کہ الحفیظ، مگر ہائے افسوس تم نے یہ کیا کیا۔ اس وقت کلیجہ پاش پاش ہو گیا۔ یہ تمھیں سوجھی کیا۔ ہائے ہندوستان کی ان رسوم مذموم کا برا ہو، جنھوں نے تم کو غارت کر دیا۔ اور کہیں کا نہ رکھا۔ تمھاری ماں نے بڑی ہی بیوقوفی کی کہ تم کو جوان شوخ شنگ، رشکِ شاہدانِ فرنگ کو ایک سن رسیدہ گرگِ باراں دیدہ کے ساتھ بیاہا:

شادی از پیرانِ خم گردیدہ قامت بدنماست
جوہرِ شمشیر کم گردد چو خنداں مے شود

ہائے ستم تم اور بوڑھے کے پالے پڑو۔ واہ رے ہندوستان:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشان نکلا

آزاد : میں اب جاتا ہوں۔ کوئی چار پانچ گھڑی میں آ جاؤں گا۔ تم سے بڑی بڑی باتیں کرنی ہیں۔
اللہ رکھی : اچھا جائیے مگر جلدی آئیے گا۔

میاں آزاد چلے تو اثنائے راہ میں ایک مقام پر مجلس رقص و سرود آراستہ تھی، اور ایک زن زرین کمر رشک قمر لہرا لہرا کر گاتی تھی، وہ دھما کہ چوکڑی مچ رہی تھی کہ واہ جی واہ۔ طبلے کی تھپک، اور پائیں کی گمک نے ان کو ایسا سُرور بخشا کہ محو اور از خود رفتہ ہو گئے۔ ایک غزل ختم ہوئی، دوسری شروع ہوئی۔ دوسری گا چکی تیسری چھیڑی۔ کبھی ٹھمری، کبھی ٹپّا، کبھی خیال، کبھی کدارا، طبلیے اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ سارنگی ستم بپا کرتی ہے۔ میاں آزاد ایک ہی رنگین آدمی، جم گئے۔ اب اس وحشت کو دیکھیے کہ غیر کی محفل، اور حضرت اہتمام کرتے ہیں۔ کسی حقّے کی چلم بھرواتے ہیں۔ کسی گڑگڑی کو تازہ کرواتے ہیں۔ کبھی ٹھمری کی فرمائش۔ کبھی حقّانی غزل کی۔ دس پندرہ گنواروں نے جو گانے کی آواز سُنی تو دھنس پڑے۔ میاں آزاد نے سب کی گردن ناپی۔ الگ الگ، باہر سے سنو، مالک خانہ نے جو دیکھا کہ ایک شریف سُرخ و سفید متین آدمی انتظام میں مصروف ہیں تو ان کو پاس بلایا۔ تپاک سے بٹھایا، اور حقہ پلایا۔ اب سنیے کہ تڑکا ہو گیا۔ تب آزاد چونکے کہ ارے؟ نہ تو حسن آرا کے یہاں گئے، نہ روم جانے کا بندوبست کیا نہ اللہ رکھی سے ملے۔ اور بھور ہو گئی۔

افسانِ چینِ پریشانی۔ گیسوے غدار سرگردانی، ماشطۂ عروسِ حیرانی، دلدادۂ جمالِ جانِ جانی، خانماں خراب، خانہ برباد، میاں آزاد، لوحش اللہ نے رات بھر محفلِ رقص و سرود میں خوب جشن اُڑائے، اور عنبریں مویانِ پریزاد و مطربانِ باربد نژاد، نے اپنے اپنے کرتب خوب دکھائے۔ اربابِ نشاط کی خوش الحانی اور قوالوں کی غزلہائے حقانی نے کانوں کو سرور بخشا۔ ادھر چراغاں کی بہار اور گل بدنوں کے گل رخسار نے آنکھوں کو نور موفور۔ محفل دلہن کی طرح سجی سجائی۔ لیکن ادھر کہر دا شروع ہوا۔ اُدھر نوبتی نے صبح کی نوبت بجائی۔ تڑکا ہوتے ہی میاں آزاد کا بھور ہو گیا۔ جان سنسنانے لگی۔ وعدے کی یاد دل دکھانے لگی۔ بدن پر لرزا سا چڑھا۔ آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ دل بھر آیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تانوں پر سر ہلانا بھول گئے۔ لطفِ صحبت کرکرا ہو گیا۔ اب وہ رنگ ہے نہ ترنگ ہے ـ وہ جوش و خروش نہ وہ اُمنگ ہے۔ مت بھنگ، عقل دنگ، پائے خرد لنگ، کیسا ناچ کس کا رنگ، میاں آزاد اٹھے، اور وہاں سے مو پریشان، نادم و پشیمان، بادلِ سرد و پُر درد چلے۔ راستے میں بصد حسرت و حرماں سوچے جاتے ہیں کہ اللہ اللہ ہم ایسی صحبت بد میں اس درجہ محو، اور خود فراموش ہو گئے، کہ دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہی:

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

حُسن آرا کے دل میں طرح طرح کے خیالات جاتے ہوں گے۔ سپہر آرا کو غش پر غش آتے ہوں گے۔ پیر مرد وجیہ واللہ اعلم کیا سمجھاتے بجھاتے ہوں گے۔ رقیب روسیاہ کچھ اور ہی پٹی پڑھاتے ہوں گے۔ حُسن آرا آٹھ آٹھ آنسو روئی ہو گی۔ سپہر آرا رات بھر نہ سوئی ہو گی۔ گیتی آرا کو یہی ذکر، جہاں آرا کو یہی فکر ہو گی کہ آزاد کے دل میں یہ کیا سمائی کہ کیا روم چلے گئے اور ہمیں صورت بھی نہ دکھائی۔ اللہ رکھی الانتظار اشدّ من الموت پڑھتی ہو گی۔ بیتابانہ سرا کی چھتوں پر چڑھتی ہو گی۔

میاں خوجی[1]

میاں آزاد خانہ برباد، یہ سوچتے بصد حسرت و یاس، سراسیمہ و بدحواس جا رہے تھے کہ دفعتاً دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پر بہار کنج میں جھولے پڑے ہیں، اور بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کی چھوکریاں پٹیاں جمائے، ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، مانگ نکالے گلے میں ہار ڈالے ہوئے پینگ لگا رہی ہیں اور دھانی دھانی دوپٹوں اور لال لال چُنری کا جوبن دکھا رہی ہیں، اور سب کی سب پیاری ادا اور سُریلی آواز سے لہرا لہرا کر یوں گا رہی ہیں: (ندیا کنارے بیلا کن نے بُویا۔ ندیا کنارے۔ بیلا بھی بُویا۔ چنبیلی بھی بوئی۔ بیچ بیچ بُویا رے گلاب۔ ندیا کنارے) میاں آزاد کو اُن پیاری پیاری گوری گوری لڑکیوں کا گانا اور لہرانا ایسا بھایا کہ تھوڑی دیر اس کنج میں ایک درخت کے سایہ میں ذرا ٹھہر گئے۔ جب کبھی پینگ رک جاتا تھا، تو میاں آزاد خود پینگ لگاتے تھے، اور کبھی کبھی گنگناتے بھی جاتے تھے۔ اُن کو اُن پیاری معصوم لڑکیوں سے ایسی محبت ہو گئی تھی، جیسے کسی کو اپنی سگی چھوٹی بہن کا پیار ہوتا ہے۔ ان کے گانے اور گن گنانے پر وہ کم سن لڑکیاں کھِل کھِلا کر ہنس ہنس پڑتی تھیں۔ اتنے میں میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں، کہ ایک مجسم شامت، پستہ قامت، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، شرارت اور خباثت کی نشانی، کھڑا دُور ہی سے جھولوں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے۔ جب انھوں

---

[1] خوجی فسانۂ آزاد کا بہت دلچسپ مزاحیہ کردار ہے۔ یہاں سے اس کا اور آزاد کا ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور فسانہ کے ختم تک قائم رہتا ہے۔

نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک چپت زناٹے سے جما ہی تو دی ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلاّ اٹھا، اور گالیاں دے کر کہنے لگا، کہ نہوئی ولایتی اس وقت پاس ورنہ بھٹّا سا سر اُڑا دیتا اور جو کہیں جوان ہوتا تو اس وقت کھود کر دفن کر دیتا، اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچّا ہی کھا جاتا، اور جو کہیں نشہ کی جھانج ہوتی تو گھول کر پی ہی جاتا۔

میاں آزاد نے نشہ کا نام جو سُنا تو چونکے۔ غور کر کے دیکھا تو سن سے جان نکل گئی۔

یہ میاں خوجی تھے۔ کون خوجی؟ نواب صاحب کے مصاحب، کون نواب؟ وہی بٹیر باز؛ وہی صف شکن علی شاہ، کون صف شکن علی شاہ؟ وہی جن کی تلاش کو میاں آزاد نکلے تھے۔ چار آنکھیں ہوتے ہی انھوں نے اُن پر اور انھوں نے اُن پر نظر ڈالی۔

آزاد: ایں بھائی خوجی ہیں۔ اللہ اکبر۔ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ مزاج تو اچھا ہے۔

خوجی: جی ہاں مزاج تو اچھا ہے، لیکن کھوپڑی بھنّا رہی ہے۔ واہ استاد بات کرتے ہی گال کاٹ لیا، اور تو در کنار۔ علیک سلیک بالائے طاق۔ آتے ہی وہ زناٹے کی ٹیپ جمائی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھلا آخر ہم نے تمھارا بگاڑا کیا تھا۔ اُف۔ کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ نہوئی قرولی۔

آزاد: (دست بستہ) بھائی معاف کرنا قصور ہوا۔ معاف کرنا!

خوجی: جی ہاں جوتیاں لگائیے اور کہیے معاف کرنا، اور دل لگی یہ کہ بیس بیس دفعہ معافی مانگتے ہیں۔ اچھی مزاج پُرسی کی کہ آتے ہی تڑ سے ایک دھول جمائی۔ وہ تو کہیے مجھے جلدی سے معلوم ہو گیا ورنہ اس وقت میں آپ کو جان سے مار ڈالتا لانا میری قرولی۔

آزاد: اس میں کیا شک ہے کہیے آخر آپ آئے کہاں۔

خوجی: آپ ہی کی تلاش میں آئے تھے۔ آپ نے ملتے ہی کھوپڑی سہلا دی۔

آزاد: نواب تو اچھے ہیں۔

خوجی: اجی وہ گئے چولھے میں۔ یہاں سر بھنّا رہا ہے۔ اُف رے اب چلو تمھارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلواؤ یار، اس وقت مارے بھوک کے بے دم ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد: چلیے آئیے۔ بسم اللہ۔ مگر واسطے خدا کے سچ کہنا ہماری گرفتاری کے لیے تو نہیں آئے ہو۔ بھائی ہم ہرگز نہ جانے کے۔ اب یہاں اور ہی دھن ہے۔

آزاد اور خوجی دونوں مل کر چلے، تو کالی کالی گھٹا۔ نے وہ لطف دکھایا کہ اہو ہو ہو۔ میاں آزاد اپنے دوست خوجی کو ایک یورپین کوٹھی میں لے گئے۔ اور وہاں نے جا کر اتنی شراب پلادی کہ خوجی غین

ہو گئے۔ تب میاں آزاد نے دم دے دے کر ان سے پوچھا، کہ سچ بتاؤ کہ کہاں آئے ہو۔ وہ تو اس وقت اپنے آپے ہی میں نہ تھے، سب حال صاف صاف مُو بمُو کہہ دیا، کہ نواب نے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میاں آزاد جہاں ہوں، وہاں سے لے آؤ۔ آپ سے بہت ہی ناراض ہیں۔ تین آدمی اور میرے ساتھ ہیں۔ اب ہم آپ کو گرفتار کر لے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی میاں آزاد کے کان کھڑے ہوئے اور وہاں سے بھاگے تو سیدھے میاں ظرّاف کے گھر ہو رہے، اچھے بچے۔

الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں
ہزاروں بُت ہیں یاں ہندوستان ہیں

میاں آزاد خانہ برباد صبح کو ظرّاف کے مکان سے چلے تو بحرِ حیرت میں غوطہ زن کہ الٰہی جاؤں تو کہاں جاؤں۔ ملوں تو کس سے ملوں۔ ایک معشوق ہو تو اس پر جان دوں۔ ایک بت ہو تو اس کا سجدہ کروں۔ ایک دلبر ہو تو اس پر سے دل و جان، دین و ایمان سب قربان کر دوں۔ جب ایک انار و صد بیمار یک انگور و ہزار زنبور کا نقشہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ حُسن آرا کے پاس جاؤں یا سپہر آرا سے معافی چاہوں۔ یا اللہ رکھی کی خبر لوں، یا خوجی بیچارے کو کوٹھی سے لاؤں۔ وقت تھوڑا، فرصت کم، مہلت عنقا، مگر خواہشیں شیطان کی آنت سے بھی زیادہ طویل و عریض۔ ایک ایک خواہش سے اندارا اٹ جائے، بلکہ سمندر پٹ جائے، کبھی سوچے کہ حُسن آرا سے ملیں کبھی شوق چرایا کہ اللہ رکھی ہماری تلاش میں کالے کوسوں سے آئی ہے۔ آؤ پہلے اسی کی خبر لیں۔ پھر جی چاہا کہ سب کے پہلے چل کر خوجی کو تو کوٹھی سے لائیں۔ طرح طرح کے خیالات جو دل میں جاگزیں ہوئے۔ تو جان عذاب میں ہو گئی۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ میاں چانڈو باز جھومتے جھامتے، گھومتے گھامتے، ایک پھٹی سی ٹوپی دیے ہوئے، سامنے سے آ رہے ہیں، اور دوسری طرف ملّاح ملیح جریب ٹیکتے ہوئے پو قدمے جا رہے ہیں۔ اتفاق سے تینوں کی مڈھ بھیڑ ہوئی، تو عجب سیر ہوئی۔ چانڈو باز اس وقت پینک میں تو تھے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ جھلّا کر بآواز بلند کہا کہ عجیب طرح کے آدمی ہو میاں۔ اقرار کر آئے کہ ابھی آتا ہوں، دو گھنٹے میں آیا۔ پل مارنے کی دیر نہ ہوگی اور میں دَن سے داخل ہو جاؤں گا۔ اہو تھ، اور تب کے گئے گئے اب تک صورت نہ دکھائی۔ واہ اللہ رکھی بے چاری ڈاڑھیں مار مار کر رو رہی ہے۔ خوب ملے۔ لے چلیے ان کے آنسو تو پوچھیے۔ دامن سب تر بتر ہو گیا ہے۔ سر پٹک پٹک کر جان دے رہی ہیں۔ ملّاح نے جو یہ تقریر سنی تو اس کے

کان کھڑے ہوئے۔ حجّام کی زبانی تو یہ سن ہی چکے تھے، کہ میاں آزاد کسی سرا میں اللہ رکھی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے حسن آرا سے پوشیدہ ہی رکھا، لیکن جب دو دن تک برابر آزاد کا پتہ ہی نہ ملا۔ یہ ناچ رنگ میں مزے اُڑایا کیے۔ خوجی سے گلچھرے اڑاتے رہے۔ اللہ رکھی کا دُکھڑا سنا کیے اور سر دھنا کیے۔ تیسرے دن انھوں نے ملاح سے کہا کہ ذرا شہر جاؤ، دو چار چکر لگاؤ۔ دیکھو تو آزاد کو کیا ہوا۔ ملّاح ملیح نے دیکھا تو اور ہی رنگ اور ہی ڈھنگ۔ اللہ رکھی کا ذکر مذکور ہے آزاد کا رنگ فق ہو گیا۔ اور ملّاح کا کلیجہ شق ہو گیا۔ اب سنیے چانڈو باز خاموش ہوئے۔ تو ملّاح نے اپنی داستان چھیڑی۔ بھائی آزاد کہاں رہے۔ بھیّا ایسا کوئی کرتا ہے۔ بھلا حسن آرا کی خونابہ فشانی اور سپہر آرا کی اشک افشانی کا حال ناگفتہ بہ۔ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ ہر دم آہ وزاری، ہر دم بیقراری۔ حسن آرا تو خیر کسی قدر ضبط بھی کرتی ہیں، مگر سپہر آرا بے چاری، پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتی ہیں۔ کلیجہ تھام تھام کر اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ جاتی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو چار دفعہ تو غش آیا ہوگا، مگر واہ رے آزاد کہ یہاں کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کیا بس منھ دیکھے ہی کی محبت تھی۔ جائیے بس دیکھ لیا۔ ہم تو بھاٹ بنے تعریفوں کے پل باندھ باندھ دیے بگڑی ہوئی بات بنائی۔ چاند سی صورت دکھائی، اور آپ اب بتے بنانے لگے۔ کوئی ایسا کرتا ہے؟ ذرا دل میں سوچو تو کہ سپہر آرا تمھاری کیسی عاشق زار ہے۔ حسن آرا کو تمھارا کس قدر پیار ہے۔ گیتی آرا اور جہاں آرا دن رات تمھارا ہی ذکر کرتی ہے۔ ہر دم دروازے پر منتظر اب آئے، اور اب آئے، اور آپ اپنی اللہ رکھی پر لٹو ہیں، اور جو خدا نخواستہ کہیں وہ دونوں بہنیں سن لیں کہ یہ ذات شریف ہیں، تو کیسی ہو۔ بس اب بھل منسی اسی میں ہے کہ میرے ساتھ چلے چلیے۔ چین چپڑ نہ کیجیے، ورنہ حسن آرا سے ہاتھ دھوئیے گا، اور پھر اپنی پھوٹی قسمت کو روئیے گا۔ چانڈو باز نے جو یہ رنگ دیکھا تو بگڑے کہ واہ جی تم کون ہو۔ میاں ہوش کی دوا کرو، بھلا مجال ہے کہ اللہ رکھی کو چھوڑ کر یہ یہاں سے جائیں۔ کیا خوب، اچھی دل لگی نکالی ہے۔ چلو اپنی راہ لو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ معقول! ہم تو منزلوں خاک پھانکتے، سیکڑوں کنوئیں جھانکتے، یہاں آئے۔ آپ بیچ میں بولنے والے کون؟ آزاد نے جو کیفیت دیکھی تو سمجھے کہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ حسن آرا الگ بدظن ہو جائیں گی، اور اللہ رکھی الگ منھ پھلائیں گی، اور سپہر آرا ناک بھوں چڑھائیں گی، تو گیتی آرا گرما گرم فقرے سنائیں گی۔ ملّاح کا چہرہ اس وقت چانڈو باز کی اکھڑ تقریر سے لال انگارا ہو گیا۔ آزاد نے معاً فقرہ چست کیا، اور چانڈو باز سے کہا، کہ یار تم گھبراتے کیوں ہو۔ یہ پیر فرتوت

افیمی آدمی ہے۔ بازار سے جاکر دو آنہ کی بالائی تو لپک کے لے آؤ۔ ان کو افیم پلا کر غلین کریں، اور ہم اور آپ مزے سے سرا چلیں۔ کیوں استاد۔ ہے نہ معاملے کی بات؟ لانا ہاتھ، چانڈو باز تو پھر آپ جانیے نشہ باز آدمی۔ بالائی کا نام سنتے ہی گلقند آفتابی ہو گئے۔ واہ خوب کہی جھپ سے دو آنے لیے، لڑھکتے پڑھکتے چلے، بالائی لانے۔ ادھر میاں آزاد نے اس موقع کو غنیمت جان کر ملاح ملیح سے کہا کہ چلیے قبلہ۔ ہم اور آپ چلیں۔ راستے میں باتیں ہوتی جائیں گی دونوں ساتھ چلے۔ ساون کے دن گھٹا جھومتی ہوئی آئی اور ہر سمت تاریکی چھائی۔ کہیں موجۂ سبزہ نوخیز، کہیں بادِ عشرت انگیز، میاں آزاد مستوں کی طرح جھومتے جاتے ہیں، اور پیر مرد جریب ٹیک ٹیک کر قدم اٹھاتے ہیں۔ وہاں چلنے میں آندھی روگ، یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا عارضہ۔ ان کی چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ یہ بے چارے اضعف اور پیر، جب آزاد نے ڈبل چال چلنے کا لگا لگایا اور مرد کئی گز پیچھے رہ گئے تو انھوں نے باآواز بلند کہا:

بُلبُلو کس کو دکھاتی ہو عُروجِ پرواز

ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

آزاد: (رک کر) یہاں شوق نظارہ ہے قبلہ۔ ایک ایک قدم چلنا ایک ایک منزل طے کرنا ہے۔ آپ اب بوڑھے ہو گئے۔ آپ کو یہ لطف کجا۔ بس اب پیچھے پر نہ ٹوکیے۔ ہمیں سر کے بل جانے دیجیے۔ آپ تو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، اور بندہ شہ گام جا رہا ہے۔

ملّاح: میاں صاحبزادے ہم بھی کسی زمانے میں جوان تھے۔ ہم بھی پہاڑ سے ٹکر لڑنے کا دم رکھتے تھے، مگر یہ تو دوسری بحث ہے۔ آپ تو یہ فرمائیں کہ تھے کہاں، اور یہ اللہ رکھی کون ذات شریف ہیں۔ ہے ہے جو کہیں حسن آرا سن پائیں تو تمھاری صورت نہ دیکھیں۔ گیتی آرا پاس بٹھانے کی روادار نہ ہوں، اور وہ بوڑھی تو تم کو اپنے محل کے ایک میل اِدھر اُدھر پھٹکنے نہ دیں۔ اُف! خدا ہی خیر کرے۔ اب آپ دردرا دیے جائیں گے۔ اور خود کردہ را چہ علاج، آپ نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑا مارا مردِ خدا ذرا تو سوچو کہ دو دو دن غائب، اور یہ بھی نہیں کہ خدا نخواستہ علیل ہو گئے ہو، یا کوئی اور سانحہ ہوا ہو۔ یہ کچھ نہیں۔ اللہ رکھی کے پھیر میں رہے اتنے دن۔ اُف! غضب! (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ستم ڈھایا تم نے، ستم ڈھایا۔ اب ہمیں شک ہے بھئی۔ اب شادی وادی ہونا خیر صلاح۔ ذرا حسن آرا کے کان میں بھنک پڑے تو قیامت ہی بپا ہو جائے۔ خدا گواہ ہے۔ جو بات کرنے کی بھی روادار رہوں۔ فعل بد کا نتیجہ بد ہے۔

آزاد : ع- ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔

ملّاح : آب داب کے بھروسے نہ رہیے گا میاں صاحب! ایسی باتیں کیجیے گا تو پھر آپ کی جمعیتِ خاطر کی کشتی غرقاب ہی ہو جائے گی۔ اب آپ وہاں غیر حاضری کا سبب کیا بتائیے گا؟

آزاد : بندے کو سوچنے کا مرض نہیں۔ غور اور فکر سے نفرت ہے یہاں۔ اس وقت جو زبان پر آئے اور انشاءاللہ ایسی وکالت کروں کہ آپ بھی دنگ ہو جائیں۔ زبان سے پھلجھڑی چھوٹنے لگے۔ باقی رہا اللہ رکھی اس کا حال نہ پوچھیے۔ وہ پھر بیان کریں گے۔

اتنے میں وہ کوٹھی سامنے نظر آئی، اور دیکھتے ہی میاں آزاد کے دل کی کلی کھل کھلائی، اور غل مچایا، وہ کوٹھی آئی، وہ کوٹھی آئی، وہ آئی۔ وہ آئی۔ ملّاحِ ملیح نے کہا آپ ذرا اس شہتوت کے درخت کے سایہ میں دم لیں۔ میں دم کے دم میں آیا۔ یہ کہہ کر ملّاح ملیح کوٹھی میں گئے، اور حسن آرا سے خوش خوش کہا کہ لو میاں آزاد آگئے۔ سپہر آرا پلنگ پر سے چونک کر اٹھی۔ آئیے آئیے، بلاؤ بلاؤ جھٹ دریچے میں سے جھانکنے لگی۔ میاں آزاد اندر داخل ہوئے، تو سپہر آرا نے اٹھ کر استقبال کیا اور دیکھ کر بشاش ہو گئی، مگر حسن آرا اپنی جگہ سے نہ اٹھی نہ اٹھی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں پیکرِ تصویر کی طرح خاموش رہی۔ گویا دہن میں زبان ہی نہ تھی۔ میاں آزاد باادب بیٹھے اور یوں بولے۔

حسن آرا : بہن ان سے پوچھو کہ آپ کے آنے کا مدعا کیا ہے؟

آزاد : اصالتاً پوچھیے کیا لب نہیں ہے، یا دہن نہیں ہے، اور ہمارا مدعا کیا پوچھتی ہو:

متردد ہے دل کہوں نہ کہوں	پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سیکڑوں ارماں	کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
پاس تم کو اگر نہیں تو نہ ہو	اے بتو کیا نہیں خدا میرا
لیے جاتے ہو تم کہاں دل کو	ہے یہ مدت سے آشنا میرا

سپہر آرا : ع- جائیے بس خوب الفت آزمائی آپ کی۔

آزاد : مزاج پرسی بالائے طاق، خیر و عافیت کا حال دریافت کرنا درکنار، علیک سلیک چھپر پر، آتے ہی چشم فسوں پرداز کو تعلیم ناز دی۔ گلگوں حسن پر اور بھی کوڑا جمایا۔ آپ کیا پھر گئیں کہ اپنی قسمت ہی پھر گئی۔ حسن آرا کی آنکھوں سے اس وقت قہر برس رہا ہے۔ تیکھی چتون آفت ڈھاتی ہے۔ بجلی سی آنکھوں کے سامنے کوند جاتی ہے۔ مگر اس میں بھی عجب بناؤ ہے۔ یہ بھی اچھا بگاڑ ہے۔

سپہر آرا : باجی کی آنکھیں روتے روتے خونِ کبوتر کی سی سُرخ ہو گئیں۔ کھانا پینا حرام تھا۔

کلیجہ ہر دم دھک دھک کرتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ لوگوں نے یہاں آن کر کیا جانے کیا کیا کہا۔

آزاد : پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

لگائی بجھائی باتوں کا خیال کرنا وضعداروں کی وضع کے خلاف ہے۔

حسن آرا : (تنک کر) پوچھو کہ اب آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

آزاد : پوچھے کون اے صاحب آپ خود کیوں نہیں پوچھتیں آخر؟ اللہ رے عتاب، اُف ری تیری تیکھی چتون، اور اللہ رے تیری لگاوٹ بازانکھڑیاں، ہم سے دریافت ہوتا ہے کہ اب آپ چاہتے کیا ہیں۔ شانِ خدا۔ ہم سے اور یہ سوال :

کہوں کیا میں تجھ سے کہ کیا چاہتا ہوں جفا ہو چکی اب وفا چاہتا ہوں
بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن کوئی دوست دردآشنا چاہتا ہوں

حسن آرا : اے ان سے کہہ دو نہ کہ اس شعر خوانی کو چھپر پر رکھیں، یہاں کسی کو واہی تباہی شعر کہنے کا شوق نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ بڑے شاعر کی دم ہیں۔ اگذبہ اَحسنۃ پر عمل ہے نرے شاعر ہی ہیں بس۔

سپہر آرا : بہن تم لاکھ بنو۔ ہزار بگاڑ کی باتیں کرو، لبوں پر مسکراہٹ آہی جاتی ہے۔ دل کی لگی کہیں چھپانے سے چھپتی ہے۔ اے توبہ۔

حسن آرا : چلو بس چپ بھی رہو۔ بہت کلیجہ نہ پکاؤ اس وقت دل پر جو دکھ ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ تم تو نری الڑھ ہو۔ ہرجائیوں سے ملاقات کیا۔ ایسوں سے تپاک کیسا چلو اب ہم تم کمرہ خالی کردیں۔ جس کا جی چاہے بیٹھے۔ جس کا جی چاہے جائے۔ حیادار کے لیے ایک چلّو کافی ہے۔

یہ کہہ کر حسن آرا اٹھی اور سپہر آرا بھی ساتھ ہی ایک ناز دل ربایانہ سے کھڑی ہوئیں کہ اتنے میں میاں آزاد نے سپہر آرا کا پہنچا پکڑ لیا۔ اب دل لگی دیکھیے، کہ ادھر تو میاں آزاد اس نازک بدن کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور ادھر حسن آرا اس گل فام کو اپنی طرف گھسیٹ رہی ہیں۔ حسن آرا بگڑ رہی ہیں کہ ہماری بہن کا ہاتھ کوئی پکڑے تو ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ جب ہم نے ٹکا سا جواب دیا تو پھر کوئی یہاں آنے والا کون۔ واہ ایسے حیادار بھی نہیں دیکھے۔ آزاد نے کہا صاحب آپ اتنا خفا کیوں ہوتی ہیں۔ واسطے خدا کے ذرا بیٹھ تو جائیے۔ ایسا غصہ بھی کیا۔ مانا کہ ہم معتوب

ہیں۔ مگر ہم سے جواب تو سنیئے! خدا گواہ ہے کہ ہم بے قصور ہیں۔ حسن آرا نے کہا بس بس زبان نہ کھلوایئے، اور جو خدا ناکردہ کسی کی جان نکل جاتی تو کیسی ٹھہرتی۔ یہاں نعل در آتش، ماہی بے آب کی طرح بے قرار۔ طرح طرح کا انتشار، سیکڑوں انکار، اور آپ کا پتا ہی نہیں۔ خیر اب اس وقت ہم نہ بولیں گے۔ آپ کل آیئے، مگر آنے کے قبل اطلاع کر دیجیے گا۔ بسم اللہ اب رخصت۔ آپ اب چھ مہینے کے بعد صورت دکھایئے گا۔ خیر ہم بھی کلیجے پر پتھر رکھ لیں گے۔ آزاد بصد حسرت رخصت ہوئے۔

مزے مزے کی باتیں
اور عشق صادق کی گھاتیں

آن سرو بن بہار پرورد
گل غنچۂ عشق و لالہ درد

یعنی میاں آزاد خانہ برباد، قدم قدم پر آہ سرد بھرتے اور نفس امّارہ پر نفرین کرتے میاں ظراف کے مکان پر پہنچے تو وہاں افیونیوں کے پشت و پناہ، میاں خوجی لوحش اللہ چانڈو کے نشہ میں غین پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بلا یہاں کہاں سے آئی۔ اے لاحول بھئی اس نے تو بے طور پیچھا کیا ہے۔ مگر خیر اس وقت پڑا رہنے دو۔ پھر سمجھا جائے گا۔ میاں آزاد پلنگ پر لیٹے تو ادھر اُدھر لوٹ مار رہے ہیں، مگر سونا حرام۔ نیند نہیں آتی۔ پلک کا جھپکنا مشکل ہو گیا۔ ہائے فعلِ بد کا نتیجہ بھی بد ہے۔ کس بری گھڑی اللہ رکھی سے آنکھ لڑائی۔ کیا شامت آئی۔ اور ستم پر ستم یہ کہ میاں خوجی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ رات بھر سونے کے عوض رویا کیے۔ یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں غنچۂ صبح کھِل کھلایا۔ اور میاں آزاد کو شوق چرّایا، کہ چلو حسن آرا سے ملو۔ سچ ہے:

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند   بلا کشانِ محبت بکوی یار روند

چلے تو ذرہ ذرہ گل خیر۔ قطرہ قطرہ بادۂ مسرت سے لبریز، باد بہار گلفشاں۔ یہ بلبل زار مسرت غزل خواں۔ ساغر نوش بدمست، مغ بچے طرب پرست، اِدھر سبزے کی لہک، اُدھر قطرہ ہائے شبنم کی جھلک۔ میاں آزاد نے ایک بھٹی کے قریب دو شرابیوں کو لڑتے جھگڑتے، دیکھ کر کہا کہ خدائی خوار گدھے اسوار، تم دونوں پر شیطان کی پھٹکار، خدا کی مار، یہ وضع اور یہ جوتی پیزار، سرِ بازار تکرار، اور مار دھاڑ۔ ذرا تو دل میں شرماؤ۔ مارے خِفّت کے زمین میں گڑ جاؤ۔ ان میں سے ایک نے کہا:

رندانِ در میکدہ گستاخ ہیں زاہد زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

دوسرے نے اس کو چھوڑ کر ان کا پیچھا کیا۔ ان کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ اب سنیئے کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میاں آزاد کی ٹوپی اچھال دی۔ میاں آزاد جھلّائے اور وہ دونوں بھی طیش میں آئے اور لگا گدّا چلنے۔ آزاد نے چپت لگائی، اور دھول جمائی، ہات ترے کی۔ تڑ اور پھٹ، دھم اور کھٹ، تڑاق اور پڑاق، بازار میں ہلڑ مچا ہوا۔ تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع۔ اتنے میں غل جو ہوا تو میاں خوجی پلنگ سے چونک پڑے۔ ظریف کی لونڈی نے کہا میاں ایسی نیند نوج کسی بھلے مانس کو آئے۔ آزاد سے باہر گدّے بازی ہو رہی ہے، اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو۔ اتنا سننا تھا کہ میاں خوجی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، تو لٹھ نہ ڈنڈا۔ انھوں نے جھپ سے چانڈو کی نگالی اٹھائی۔ اور لپکے، اور لپکتے ہی غل مچایا کہ ابے او گیدی ٹھہر جا میں آن پہنچا۔ شرابیوں نے جوان پر نظر ڈالی تو واہ جی واہ کیا قطع شریف ہے۔ ننھے سے آدمی ٹینی مرغے کے برابر قد۔ اور یہ خم اور دم۔ انھوں نے آزاد سے اپنے کو چھڑا کر ان کی خبر لی۔ جھلّا کر آپ نے نگالی اٹھائی۔ ایک نے نگالی چھینی، اور لگا کھٹا کھٹ جمانے، میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر۔ دوسرے نے کسی سے پوچھا نہ پاچھا جھپٹ کر میاں خوجی کو کاٹ کھایا۔ اتنے میں میاں آزاد نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ خوجی بے چارے پٹ پٹا کر اٹھے کچومر نکل گیا۔ مگر واہ رے خوجی، پھر بھی دہی خم و دم ہیں، وہی تیکھی چتون ماشہ بھر کا تو قد شریف، مگر اکڑے ہی جاتے ہیں، اور دونوں شرابیوں کو اس طرح گھور رہے ہیں، جیسے کھا ہی جائیں گے۔ حوالی موالی حضرت کی قطع دیکھ دیکھ کر لوٹن کبوتر ہوئے جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اب خوجی ہیں کہ دنیا بھر کو گالیاں دے رہے ہیں۔ آخر کار جھاڑ پونچھ کر چل دیے۔ لونڈی نے کہا واہ میاں گئے تھے پیٹنے اور الٹے پٹ کر آئے۔ اتنی پڑیں بے بھاؤ کی کہ کھوپڑی گنجی ہو گئی۔ چاند پر ایک بال تک نظر نہیں آتا۔ خوجی بہت جھلّائے اور آگ بھبھو کا ہو کر کہنے لگے کہ چپ شہکارہ تو ہمیں کیا جانے کھوپڑی گنجی کیسی۔ یہ گنجی کھوپڑی کے کیا معنی؟ آخر یہ تو نے کہا کیا۔ ہماری کھوپڑی پر بال تھے ہی کب۔ یہاں پیدائشی ہی ایسے بال ہیں۔ اور صاف چاند تو خوش اقبالوں کی نشانی ہے۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اب ہٹو بھی۔ آئے وہاں سے بڑے اقبال مند بن کر۔ واہ کیا اقبال ہے۔ صورت سے تو پھٹکار برستی ہے۔ اقبال والے بنے ہیں۔ جوجی دانت پیس کر رہ گئے، اور بولے کہ بس چلی جا۔ نہ ہوئی جوانی۔ ورنہ کھود کر اسی جگہ دفنا دیتا۔

میاں آزاد کو اس قصے سے کیا واسطہ۔ وہاں تو اور ہی دھن تھی، اور ہی اُدھیڑ بن تھی۔ مگر

ان کی طبیعت بگڑنے لگی، اور رفتہ رفتہ ایسے علیل ہوئے کہ تپ چڑھ گئی۔ اب ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہوگیا۔ ناچار پیپل کے درخت کے سایہ میں جس کے دھانی دھانی پتوں کی نمک ریزی ستم ڈھاتی تھی، بیٹھے اور ع۔ بیٹھے تو گرے گرے تو بے ہوش "حسنِ اتفاق سے پیر مرد کا اسی دم وہاں سے گذر ہوا۔ یہ فنس پر سوار چلے جا رہے تھے، دور سے دیکھا کوئی سفید پوش، خانہ بدوش، بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ جب قریب آئے تو کہاروں کو حکم دیا کہ فنس رکھ دو۔ بسم اللہ کہہ کر انھوں نے فنس اتاری۔ پیر مرد قریب جا کر جو دیکھتے ہیں تو آزاد، ارے! معاذ اللہ! یہ بے چارہ آزاد ہے۔ اے خوب ہوا ہم اس وقت آ گئے، ورنہ ان کا تو کام ہی تمام ہو جاتا۔ کہاروں نے میاں آزاد کو اٹھایا، اور فنس پر لٹایا، اور لے چلے۔ پیر مرد پیچھے پیچھے پیادہ پا جانے لگے۔ کہاروں نے جو قدم بڑھایا تو ہوا ہو گئے۔ اور کھٹ سے ایوان سپہر تو امان میں تھے۔ اتنے میں پیر مرد بھی کانکھتے کونکھتے پہنچے، اور آزاد کی نبض دیکھی تو سرعت پائی۔ محل میں گئے۔ حسن آرا سے کہا کہ جلد پلنگ بچھواؤ میاں آزاد آئے ہیں۔

حسن آرا: ہائیں! ہائیں! بوڑھے میاں ہوش کی دوا کرو۔ تم تو اس وقت اپنے آپے سے گذر گئے ہو۔ اے واہ کہنے لگے آزاد آئے ہیں۔ پلنگ بچھواؤ۔ یہ پلنگ کی کیا بات چیت ہے۔

سپہر آرا: (گھبرا کر) اچھے تو ہیں۔

پیر مرد: بے ہوش پڑے ہیں، خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا: (ہاتھ مل کر) ہے ہے یہ کیا کہتے ہو، پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ جی سنسنانے لگا۔

سپہر آرا: (بدحواس ہو کر) کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اُف! ایسی سنانی اللہ ساتویں دشمن کو بھی نہ سنائے۔

پیر مرد: کہار فنس یہاں اُٹھا لاؤ۔

کہاروں نے فنس اٹھائی اور پلنگ کے پاس لگائی۔ کئی آدمیوں نے مل کر میاں آزاد کو پلنگ پر سلا دیا۔ کمرے میں فقط حسن آرا اور سپہر آرا، دل بہار، اور پیر مرد۔ حسن آرا نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سن سے جان نکل گئی۔ سپہر آرا کے گلِ رخسار پر آنسو ہی آنسو نظر آتے تھے۔

دل بہار: بیوی اس سے کچھ نہ ہونے کا۔ دوا دَرمَن کرو۔ دوڑ دھوپ کرو۔ حکیم جی کو بلاؤ۔ تم سب کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ (پیر مرد سے) اے جا کر حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔

حسن آرا: حکیم جی کا یہاں کیا کام۔ اور بولو آپ چاہیں جس کو بلائیں:

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج   کہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

یہ کہہ کر وہ خاتونِ مہ لقا آہستہ سے پلنگ پر جا بیٹھی، اور سپہر آرا پھولوں کی پنکھیا جھلنے لگی۔ حُسن آرا نے میاں آزاد کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ پیر مرد کسی کام کے لیے باہر چلے گئے۔ دل بہار دوسرے کمرے میں گئی۔ حُسن آرا نے فرطِ محبت سے میاں آزاد کی نورانی پیشانی پر بڑے پیار سے بوسہ لیا۔ ہنوز جو بھی پیشانی کے پاس سے نہ ہٹی تھی کہ میاں آزاد نے آنکھ کھول دی اور کہا (ایک اور) حُسن آرا کھل گئی۔ سپہر آرا ہنس پڑی۔

آزاد : مرے جنازے کو ان کے کوچے میں ناحق احباب لے کے آئے

نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں وہ رخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر

سحر ہے نزدیک شب ہے آخر سرا سے چلتے ہیں ہم مسافر

جنھیں ہے ملنا وہ سب ہیں حاضر جرس سے کہہ دو کوئی صدا کر

حُسن آرا : کیوں بندہ پرور یہ مکّاری! خدا کی پناہ! میری تو بُری گت ہو گئی۔

سپہر آرا : چلو بخیر گذشت۔

آزاد : ایک اور ایک اور بس۔ ع۔ یہی درویش کی صدا ہے آج۔

حسن آرا : سائیں اب پھر مانگیے۔ بس وقت اور ہی تھا اب۔ ع۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔

آزاد : میں نے کہا جواں سے کہ شب کو یہیں رہو

آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر

حُسن آرا : آپ آخر یہاں تشریف کیوں لائے۔ چھپایئے نہیں صاف صاف بتایئے۔

آزاد :

اب کہتی ہو کہ تم مری محفل میں آئے کیوں   آتا تھا کون کوئی کسی کو بلائے کیوں

کہتا ہوں صاف صاف کہ مرتا ہوں آپ پر   ظاہر جو بات ہو اُسے کوئی چھپائے کیوں

یہاں مارے نقاہت کے جان لبوں پر آ گئی۔ آپ مکر سمجھتی ہیں۔

حُسن آرا : یہی نقاہت ہے تو پھر ناز کون اٹھائے گا۔ جور و جفا کون سہے گا؟

آزاد : اب کل روانگی کا عزم ہے۔ کل اگر ٹک جاؤں تو شریف نہیں۔ روم در دس میں اب کھلّم کھلّا چھڑنے والی ہے۔

حُسن آرا : ہاں حمیت تو اسی کی مقتضی ہے کہ جایئے۔ اور ضرور جایئے۔

سپہر آرا : جائیے اور بخیر و عافیت واپس آئیے
حسن آرا : بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

اب ہم کو ایک بات یاد دلانی لازم آئی وہ یہ کہ میاں آزاد سچ مچ بیمار نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ بیمار بن بیٹھے تھے۔ وجہ یہ کہ ان کو خوف تھا کہ مبادا اللہ رکھی کا آنا حسن آرا پر بھی کھل جائے تو پھر قیامت ہی بپا ہو۔ لہٰذا انھوں نے یہ فکر کی کہ علیل ہو کر وہاں جائیں تاکہ حسن آرا ان کی علالت دیکھ کر ترس کھائیں سوچے کہ پیر مرد فلاں سڑک کی طرف سے روز آتے ہیں۔ لہٰذا حضرت آزاد موقع کو تاک کر ایک درخت کے نیچے لوٹ گئے کہ گویا جان ہی پر بن آئی۔

حسن آرا : اب تو مزاج حضور کا اچھا ہے۔ آخر نصیب اعدا طبیعت ناسازیوں کر ہو گئی آپ جاتے کہاں تھے ؟

آزاد : آپ ہی کی قدم بوسی کو آتا تھا۔ اثنائے راہ میں جی گھبرانے لگا، اور غش کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ درخت کے سایہ میں ذرا دم لینے بیٹھا تو بے ہوش حسن اتفاق سے یہ بے چارے ملے ورنہ خدا جانے کیا گت ہوتی۔ اللہ کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا۔

دن بھر اور رات بھر میاں آزاد نے وہیں بسر کی، اور تڑکے اٹھتے ہی تیاری سفر کی، کہ اتنے میں میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے پتہ پوچھتے ہوئے آن موجود ہوتے۔

خوجی : میاں ہوت ! ذرا آزاد کو تو بلاؤ۔

دربان : کس سے کہتے ہو۔ آئے کہاں سے۔ جاؤ گے کہاں۔ ہو کون ؟

خوجی : ایں ! یہ تو کچھ تقریر یا سا معلوم ہوتا ہے۔ ابے اطلاع کر دے کہ خواجہ صاحب آئے ہیں

دربان : ہونھ۔ خواجہ صاحب ! ہمیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہو بھلے مانسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے۔

خوجی : اور نہیں تو پھر کیسی صورت ہوا کرتی ہے۔

یہ تقریر میاں آزاد نے سنی تو خوجی کو پردے کے پاس بلا لیا۔

خوجی : اجی اک ذری آئینہ تو بھیج دینا۔ آئینہ بھیجیے گا ذری۔

آزاد : یا وحشت یہ آئینہ کیا ہو گا ؟ بندگی نہ سلام، نہ مزاج پرسی نہ کچھ بات چیت۔ آتے ہی آئینہ یاد آیا۔ بندر کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دینے لگا۔

خوجی : اجی بھیجتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جھوڑ ہوگئی۔ اس وقت مردود کہتا ہے کہ تمھاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ اب کوئی اس گیدی خر سے پوچھے تو کہ پھر کیا چمار کی سی ہے۔ یا پاجی کی سی۔ ذرا آئینہ بھیجیے میں دیکھوں تو مجھے خود شک ہوگیا۔

یہ فقرہ جو سُنا تو حُسن آرا اور سپہر آرا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور آزاد سے کہا کہ کون جانگلو ہیں۔

آزاد : بھئی اگر سچ پوچھتے ہو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمھاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے، مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔ مگر اب اس کا علاج کیا۔

خوجی : واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس۔ ڈاکٹروں نے مُردے تک کے جلا لینے کا توبند وبست کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں۔ دیکھیے ہم بتا دیں گے۔ صورت ہی بدلتی ہے پھر یہ کتنی بڑی بات ہے۔

آزاد : کہیں ایسا نہ ہو کہ اینڈا بینڈا علاج ہو، اور مُنھ ہی بگڑ جائے۔ اس سے تو پاجی ہی بنا رہنا اچھا۔

خوجی : نہ صاحب پاجی نہ بنیں گے۔ پاجی بن کے جیے تو کیا۔

آزاد : کل ہم روم جانے والے ہیں چلتے ہو ساتھ۔

خوجی : نہ چلے اس پر بھی لعنت۔ نہ لے چلے اس پر بھی (خم ٹھوک کر) ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

آزاد : مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا۔ اتنا یاد رکھیے۔

خوجی : اجی افیم ملے گی؟ کہ وہ بھی نہ ملے گی؟ بس تو پھر ہم اپنے چانڈو بنا لیں گے۔ آپ ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہمیں ضرور لے چلیے بالضرور لے چلیے۔

آزاد : حُسن آرا۔ اب رخصت کا وقت قریب آتا جاتا ہے، اور کلیجہ مُنھ کو آتا ہے کہ تم سے مفارقت ہوگی۔ لیکن جواں مردوں کو ان باتوں سے خوف کیا۔ زندگی شرط ہے خدا نے چاہا تو پھر ملیں گے، اور جشن کریں گے۔ اب ہمیں جانے دو۔

حُسن آرا : (ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے)

سپہر آرا : (بہن سے چمٹ کر) کچھ تو مُنھ سے بولو۔ ہائے یہ خاموشی کا کون موقع ہے۔ جو مارے رنج مفارقت کے خاموش ہو تو، وہ بات ہی کیوں کرو جس سے دُکھ ہو۔

حُسن آرا : (گال پر ہاتھ رکھ کر) اُف! (پھر رونے لگی)

آزاد : اُف دل بھر آیا۔ مگر قدم پیچھے نہ پڑے گا۔ جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں۔

سپہر آرا : ہائے اندر والا نہیں مانتا۔ اس کو بھی تو سمجھاتے جاؤ۔ یہ کس کا ہو کر رہے گا۔

آزاد : ذرا تھوڑی دیر تک یہ بات ہی بھول جاؤ، پھر میں ابھی خوجی سے ذرا دو دو باتیں کر لوں۔

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

میاں آزاد کے مزاج میں وحشت تو جبلّی اور خلقی تھی ہی، ان کو ایک جگہ چین کہاں۔ سیماب میں تو پھر بھی سکون ہے ان کی طبیعت کو سکون نہیں۔ اتنے دن یہاں رہے تو جی گھبرانے لگا۔ جنگل کی دھن سمائی، صحرا کی یاد آئی۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ ان کی معشوق مہ لقا حسن آرا نے فرمائش کی کہ روم جائیے اور ترکوں کو روسیوں کی یورش سے بچائیے۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسری نیب چڑھا پھر ان کو قرار کجا۔ جب انھوں نے دیکھا۔ کہ رخصت کا نام سنتے ہی سپہر آرا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی، اور حسن آرا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا، تو سوچے کہ مبادا ان کی پریشانی اور اشک افشانی، سے قدم ڈگمگا جائے۔ اور جانے کا نام زبان پر بھی نہ آئے، ادھر خرابی یہ کہ ان کی حالتِ زار دیکھ کر ان سے خود کب جایا جاتا۔ سپہر آرا کو تشفی دیتے یا حسن آرا کی تسلّی کرتے۔ آدمی تو ذکی الطبع اور برق دم تھے ہی۔ وہ تدبیر سوچی کہ جو کبھی پٹ ہی نہ پڑے۔ میاں خوجی سے انھوں نے صلاح لی کہ کیوں یار چہ اب اس وقت کیا صلاح ہے۔ آخر تم توسن رسیدہ گرگِ باراں دیدہ، خرانٹ فقرہ باز آدمی ہو تم ہی کچھ سوچو، مگر وہ رائے دو کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ جاؤ اب تمھاری ہی رائے پر عمل کریں گے۔ اس میں ہر چہ باداباد۔ خوجی افیمی آدمی ٹرکی کا نام سنتے ہی ہکّا بکّا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے کہ خدا ہی خیر کرے۔ بھئی ہم سمجھے تھے کہ دل لگی کرتے ہو، یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ، توبڑا، چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم لاکھ عالم و فاضل سہی۔ پھر لڑکے ہی تو ہو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو پیدائش آپ کی اور داعیہ یہ کہ ٹرکی جا کر روسیوں سے لڑیں گے اے تیری قدرت! میاں ہوش کی دوا کرو۔ عقل کے ناخن لو۔ سوجھی بھی تو کیا سوجھی بے تکی۔ یہ خیالِ خام پختہ مغزی کی دلیل نہیں ہے۔ قبلہ۔ ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی، تو ٹائیں سے مر جائیے گا۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ ارے میاں خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی یہ مر گیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر جی دھم سے گرا۔ دھائیں دھائیں کی آواز رعد کی طرح گونجتی ہے۔ قریب سپاہی کھڑا ہے اور ایک دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ

کا گولہ آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولہ چٹخا اور بہت ٹکڑے، اور ایک ٹکڑے نے دس دس آدمیوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اڑا دیا۔ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو کہیں تلوار چلنے لگی تو اُف! وہ اجل سامنے نظر آتی ہے۔ بے موت جان جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ تلوار چل رہی ہے اور ہزارہا آدمی گرتے جاتے ہیں۔ سو بھئی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔ خدا کے لیے اُدھر کا قصد بھی کہیں نہ کرنا، اور بندہ تو اپنے حساب جانے والے کو کچھ کہتا ہے ارے توبہ ارے توبہ، خدا بھلے مانس کو جنگ کے میدان سے بچائے۔ ہم ایک ترکیب بتائیں۔ آخر منشا تو تمھارا یہی ہے نہ کہ حسن آرا سے وصال ہو مگر بعد نکاح اچھا منظور۔ اور ان ہی کے کہنے سے آپ ٹرکی جاتے ہیں۔ کہیے ہاں، خیر تو وہ کام کیوں نہ کیجیے کہ حسن آرا آپ کو خود روکیں اور لاکھوں قسمیں دیں کہ جائیے تو ہمارا ہی مردہ دیکھیے۔ آپ وہاں جا کر بیٹھیے، اور ہم کو چق کے پاس بٹھائیے، اور جنگ کا ذکر چھیڑیے، پھر دیکھیے میں کیسی لفاظی کرتا ہوں کہ آپ کا بھی جی خوش ہو جائے۔ جنگ کی مصیبتوں کو اس پیرایہ میں بیان کروں کہ دونوں بہنیں کانپ اٹھیں اور ان کو یقین کامل ہو جائے کہ میاں آزاد گئے، اور اتنا غفیل ہوئے، اور میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ بھائی آزاد ذرا اپنی تصویر تو کھنچوا لو۔ آخر اب جدائی کی گھڑی تو سر پر کھڑی ہے۔ دو تین مہینے میں سُن لیں گے کہ میاں آزاد نے گولی کھائی۔ اور دم توڑا۔ واللہ جو کہیں یہ تقریر سُن پائیں تو حشر تک تمھیں نہ جانے دیں۔ اور جھپ سے شادی ہو جائے مزے سے چین کرو۔ اور ہمیں بھی نوکر رکھ لو۔ اور روم جانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ فرض کیجیے کسی مورچے پر گولی لگی۔ اور لوٹ گئے پھر حسن آرا سے کون ملے گا۔ توبہ توبہ!

میاں آزاد جب یہ داستان سُن چکے تو بولے کہ بس اب آپ اور کچھ نہ فرمائیے گا۔ ٹرکی جاؤں اور پھر جاؤں۔ دن دہاڑے جاؤں ڈنکے کی چوٹ جاؤں۔ لاکھوں میں جاؤں، کروڑوں میں جاؤں باقی رہا مرنا جینا یہ کسی کے اختیار کی بات تو ہے نہیں۔ مورچوں پر سے لاکھوں آدمی کورے آتے ہیں، اور ہزاروں راہ چلتے چلتے لوٹ جاتے ہیں، اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ حسن آرا ہم سے کہے کہ ٹرکی جاؤ اور ہم اغماض کر جائیں۔ کیا مجال۔ اور پھر حسن آرا پیاری حسن آرا کو ایسا جل دیں۔ اتنا بڑا جل دیں۔ اُف۔ جس کو معشوق کیا اس سے یہ فریب۔ ایں جانب تو ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ آپ میاں ظراف کے یہاں جائیے، اور ان سے کہیے کہ ہم ابھی آتے ہیں، آج ہی سفر کا عزم ہے سب سامان درست کر رکھیں۔ ہم پہنچے اور کھانا کھایا اور لمبے ہوئے۔ خوجی تو گرتے پڑتے چلے۔ مگر دو قدم جا کر پھر پلٹے۔ آزاد میاں آزاد!

بھائی ایک بات سُنتے جاؤ۔ کیا ہم کو بھی آپ کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔ اگر لے چلو تو خیر ہم بھی ہمراہ رکاب چلے ہی چلیں، لیکن واسطے خدا کے ذری صورت تو دکھادو۔ آزاد نے للکارا کہ دور ہو نامعقول۔ یہاں اس وقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ خوجی پھر اُلٹے پاؤں بھاگے مگر دو چار قدم کے بعد پھر پلٹ پڑے۔ میاں آزاد۔ میاں آزاد ارے بھئی آزاد ہوت! ذرا سُنتے جاؤ۔ میاں آزاد کی جان عذاب میں کہ اچھے دیوانے سے پالا پڑا پلٹے۔ کہو اب کیا یاد آیا۔ یار تم نے تو ناکوں دم کر دیا۔ خوجی بولے۔ استاد ایک بات بھول گئے تھے۔ کھانا پکوا رکھیں۔ ساتھ لے چلیے گا یا نہیں؟ آزاد بہت ہی جھلائے اور للکار کر کہا کہ نامعقول یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔ جو اتنی دور سے پلٹے جاؤ۔ ابکی پکارو گے تو گلا ہی گھونٹ ڈالوں گا۔ خوجی بے چارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے، اور پوقدمے جانے لگے۔ ظرّاف کے گھر پر جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ میل تھا سوا تین گھنٹے میں پہنچے، اور پہنچتے ہی غل مچانا شروع کیا کہ جلد تیاری کرو۔ میاں آزاد ابھی جانے والے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایک پانچ سیر میٹھے ٹکڑے اور سات سیر استعمالی، چار سیر بلکہ اور تین سیر والے چاول کا پلاؤ۔ اور دس سیر فیرنی، اور دس ہی سیر کھیر، اور کوئی چودہ سیر زردا۔ اور کوئی پانچ سیر مربیٰ اور میٹھے اچار کی دو اچاریاں، یہ سب سامان جلد تیار ہو رہے۔ واہ بھئی خوجی کیوں نہ ہو کہی بھی تو اپنے ہی مطلب کی۔ افیونی آدمی سب میٹھی ہی میٹھی چیزیں بتائیں گے اور طرّہ یہ ہے کہ دس سیر اور پانچ سیر سے کوئی کم نہیں۔ خیر میاں ظرّاف کی بیوی تو کھانا پکانے میں طاق تھیں۔ اور گھر کی لونڈیاں بھی بُراق تھیں۔ معاً سب انتظام کر لیا اور ہاتھوں ہاتھ سامان ہوا۔

اب ادھر کا حال سنیے کہ میاں آزاد نے دل بہار سے کہا کہ بُوا چپکے سے ذری قلم دان کاغذ تو لے آنا۔ دل بہار چپکے سے لے آئیں اور میاں آزاد نے بیٹھ کر خط لکھا۔

آزاد کا خط حُسن آرا کے نام

میری پیاری حُسن آرا، بصد حسرت و مسرّت تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ حسرت اس سبب سے ہے کہ جدائی کی گھڑی ہے، اور مسرّت یہ کہ اپنی پیاری حُسن آرا کے حکم کی تعمیل کو جاتا ہوں۔ میں اپنے دل کی کیفیت اس وقت ظاہر نہیں کر سکتا۔ بس میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ میں روم جاتا ہوں اور اس غرض سے جاتا ہوں کہ وہاں سے سُرخرو ہو کر آؤں۔ اور اس لائق ہوں کہ حُسن آرا کے ساتھ نکاح کر سکوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ایسی شگفتہ جبین، اور نازنین مہ پارہ

پری چہرہ کے لیے کوئی حسین اور مشہور و معروف نوجوان چاہیے۔ مجھے کوئی جانتا بھی نہیں کہ ہے کون، مگر علم و فضل میں، شرافت و نجابت میں، حمیت و مروت میں، بانک میں کشتی میں، تقریر میں کسی شریف زادے سے بندہ کم نہیں۔ ہاں شہرت، وہ خدا نے چاہا اب حاصل ہوگی۔ بہرکیف اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ اخباروں میں تم ہمارا حال پڑھو گی۔ زندگی اور وفات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اور جنگ دُوسر دارد۔ ایک گولی دیو کے بچے تک کو دم کے دم میں ہلاک کر ڈالتی ہے۔ اگر میں مر گیا تو خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم کسی شریف زادے کے ساتھ ضرور نکاح کر لینا۔ اگر تم سوگ نشین ہوئیں تو یاد رکھنا کہ میری روح رد ئے گی، اور اگر میں بچ نکلا تو پھر میرے سوا اور ہے کون۔ میں ٹرکی میں وہ وہ کارِ نمایاں کروں گا کہ میری بسالت کے جھنڈے گڑ جائیں گے اور ساری خدائی میں میرا نام ہوگا یہ کچھ غرور کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے دل کا سچا سچا حال لکھتا ہوں۔ اور قلم کو ترجمان دل بناتا ہوں۔ ہاں پیاری حسن آرا۔ مجھے دو باتوں کی دلی آرزو ہے۔ ایک تو تم میری جدائی کا رنج نہ کرنا، اور جب کبھی میرا خیال آئے تو اس مبارک گھڑی کو یاد کرنا۔ جب میں ٹرکی سے فائز بمرام واپس آن کر تمھارے ساتھ بحروں پر ہوا کھاؤں گا، اور بیاہ رچاؤں گا۔ اور مزے سے دندناؤں گا۔ واسطے خدا کے تم کڑھنا نہیں۔ ہائے اگر مجھے کوئی اتنی تسکین دے دے تو میں اور بھی خوش خوش جاؤں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیاری سپہر آرا میری جگر گوشہ کو بھی کڑھنے نہ دینا۔ ہے ہے وہ جب سنے گی کہ آزاد چل دیے تو رو رو کے ڈھیر کرے گی۔ اور خدا جانے اس بے چاری کی کیا کیفیت ہو جائے گی۔ اُف! مفارقت کا صدمہ سہنا دل لگی نہیں ہے۔ خدا عاشق و معشوق کو جدائی کا دن نہ دکھائے۔ حسن و عشق کا جھگڑا بڑا بیڈھب ہوتا ہے۔ پیاری سپہر آرا کو میں تمھارے سپرد کر کے جاتا ہوں۔ ان کی خوب دلجوئی کرنا اور خوب سمجھانا کہ میاں آزاد عنقریب ہی آنے والے ہیں۔ بس اب آئے داخل ہیں۔ تیسری بات ایک اور یاد آئی۔ ذرا کان لگا کر سنیے! دنیا میں طرح طرح کے آدمی ہیں۔ مگر بد باطن بہت، اور نیک کم۔ خدا کے لیے کسی کے لگانے بجھانے میں نہ جانا۔ اتنا کہنا ضرور یاد رکھنا۔ اس وقت تو میں طومار کے طومار لکھ ڈالوں لیکن ہاتھ کانپتا ہے، اور افسوس ہے کہ اس وقت گو لاکھ ضبط کیا لیکن آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی خوف ہے کہ مبادا تم سُن پاؤ یا سپہر آرا کے کان میں بھنک پڑے تو جانے نہ پاؤں۔ تمھارے دل میں طرح طرح کے خیالات آئیں گے، اور تم فرض کر لو گی کہ اب آزاد کا واپس آنا محال ہے تم راتوں

کو چونک چونک پڑے گی، کہ آزاد قتل تو نہیں ہوئے۔ تمھیں کھانے میں مزہ نہ آئے گا۔ پانی بد ذائقہ معلوم ہوگا۔ میری دلی تمنا تھی کہ رخصت کے قبل ایک دن ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاؤں اور سپہر آرا کے ہاتھ سے بوٹی اور کباب چھین چھین کر چکھ چکھ جاؤں، مگر دل کی دل ہی میں رہی۔ خیر یار زندہ و صحبت باقی۔

اب اس خط کو تم چوم لو زندہ بچا تو ملوں گا اور مر گیا تو الوداع

تمھارا پیارا آزاد۔

یہ خط لپ جھپ لکھ کر میاں آزاد نے دل بہار کو دیا اور کہا! دل بہار! تجھے اپنے بچوں ہی کی قسم یہ خط حسن آرا کو شام کے وقت دینا اور کہنا کہ میاں آزاد ٹرکی گئے۔ دل بہار نے ان کا دامن پکڑ لیا، اور سمجھایا کہ میاں یہ کیا غضب کرتے ہو۔ ہے ہے، بے رخصت ہوئے جاؤ گے تو حسن آرا کا کیا حال ہوگا۔ سپہر آرا قیامت بپا کر دے گی۔ گھر بھر میں کہرام مچے گا۔ ٹپس پڑ جائے گی۔ ہنسی خوشی سے جاؤ نہ۔ امام ضامن تو باندھنے دو۔

آزاد نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کے کہا کہ بوا دل بہار! تم کو اس سے کیا مطلب جو کہوں وہ کرو۔ شام کو یہ خط ان کو دے دینا۔ بس اب زیادہ کہو سنو نہیں۔ اس نے کہا نہ میاں مجھ سے یہ نہ ہوگا میں نہ تمھیں جانے دوں گی نہ خط لوں گی، اور نہ تمھارا دامن چھوڑوں گی۔ اور جو تم نہ مانو گے تو غل مچا دوں گی، اور تم بدنام ہو جاؤ گے، اور پیچھے پچھتاؤ گے۔ میاں آزاد نے جیب سے پانچ روپیہ نکالے اور دل بہار کو چپکے سے دے کر کہا کہ بس اب جاؤ۔ یہ تمھارے چھوٹے لڑکے کے لیے ہے۔ مگر خبردار شام کے پہلے نہ دینا۔

میاں آزاد یہاں سے چلنے کو چلے، لیکن قدم نہیں اٹھتا۔ دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ آنکھیں فوارۂ خون بنی ہوئی ہیں۔ دو قدم جاتے ہیں اور پیچھے پھر پھر کر دیکھتے ہیں۔ پھر چلے پھر ٹھہرے۔ محل وہ نظر آتا ہے اسی کے پیچھے اس وقت حسن آرا بیٹھی ہوں گی۔ ہائے اب یہ ایوانِ کیوان نشان واللہ اعلم دیکھنے میں آئے گا بھی یا نہیں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ چل کر حسن آرا سے مل ہی لیں۔ کبھی سوچتے ہیں کہ اب چلے سو چلے، واپس جانا ہمت مردانہ کے خلاف ہے۔ کبھی خیال آیا کہ پیر مرد سے تو رخصت ہو لیں۔ کبھی سوچے کہ سپہر آرا کی صورت تو ذرا ایک نظر بھر کر دیکھ لیں۔ کبھی دھم سے گر پڑے۔ کبھی کلیجے کو تھام لیا۔ کبھی اُف اُف کرنے لگے۔ کبھی ہائے ہائے، وائے وائے، کا کلمہ زبان پر جاری کبھی جان عاری کہ الٰہی کیا کروں، دل اور طرف جاتا ہے۔ میں اور طرف جاتا ہوں۔ کس کس کو

سمجھاؤں - خدا ہی اس وقت مدد دے تو بیڑا پار ہو، ورنہ اب غرقاب ہوئے، اور اب غرقاب ہوئے - آخرکار خدا خدا کرکے میاں ظرّاف کے گھر میں داخل ہو گئے - ظرّاف نے جوان کی صورت پر نظر ڈالی، تو پوچھا ایں! ارے میاں تمھارا حال کیا ہے؟ واللہ تمھاری صورت دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا ہے - اُف اوہ! جیسے کوئی برسوں کا بیمار ہو گیا! ڈنکوا آیا تھا کیا؟ بالکل چُرمرہی ہو گئے تم تو، واللہ توبہ توبہ - زردی چہرے پر چھائی ہے - آنکھیں سُرخ بیر بہوٹی بنی ہوئیں -

روم کے سفر کی تیاری

ظرّاف : کہیے اب تو رخصت ہے بھئی :

بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

کھانا تیار ہے کہیے تو نکلوایا جائے - برف بھی منگوا رکھی ہے :

آزاد : کھانا تو ہم اس وقت نہ کھائیں گے - اشتہا نہیں، مُطلق بُھوک نہیں -

ظرّاف : ایں! کیا خوب - پھر اتنا پکوایا کیوں - اجی دو نوالے تو کھالو -

آزاد : پکوایا کس نے؟ مجھے تو صبح سے کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں - یہ آپ سے کہا کس نے تھا کہ آپ کھانا پکوائیے -

ظرّاف : اور سنیے گا - کہا کس نے کی ایک ہی کہی - کہا آپ کے خوجی نے اور کس نے - بولو میاں خوجی! دس سیر فرنی اور دس ہی سیر کھیر، اور اٹھارہ سیر میٹھے ٹکڑے اور خدا جانے کیا اَلَم غَلَّم بتا گئے - گھر میں بڑے اہتمام بلیغ سے سب سامان لیس کیا اب دو چار نوالے تو آپ کو ان کی خاطر سے ضرور کھانے چاہئیں -

آزاد : لاحول ولا قوۃ - خوجی بھی بس گرسنہ چشم ہی رہے -

خوجی : لاحول کاہے کی - آخر اس لاحول کے کیا معنی - آپ نہ کھائیے - بندہ تو ڈٹ کے چکھ چکا -

آزاد : کیا یہ کھانا کھا چکے -

خوجی : جی نہیں تو کچھ آپ کی طرح بے وقوف ہوں - اور سب میٹھی میٹھی چیزیں پکوائیں - اور آج افیم بھی معمول سے زیادہ پی - خوب چُسکی لگائی اور مطبخن پر ہتھے لگائے -

آزاد : بس اب پھر بوریا بندھنا اٹھائیے - چلیے بسم اللہ کرکے لدیئے پھندیئے -

خوجی : قبلہ اب تو اس وقت یہ حال ہے کہ جیسے چوہے کو کوئی پارہ پلا دے - چلنا چلانا معلوم - اب

بندہ لوٹ مارے گا اور سواری کیا ہے۔

ظرّاف : یکہ۔

خوجی : ارے! غضب خدا کا۔ تو بندہ جا چکا، یکّہ پر تو آج تک کبھی سوار ہی نہ ہوئے ایں جانب اور پھر کھانا کھا کر، ارے توبہ! مر ہی جاؤں گا بھئی۔ ذرا سا پانی پلانا۔ یار افیمی تو بہت دیکھے مگر سچ کہنا ایسا بھی کوئی دیکھا جو پینک کا نام بھی نہ جانتا ہو۔

الغرض میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھانا کھایا، اور اسباب و سباب کس کر آمادہ سفر ہوئے۔ خوجی کو بھی ایک لات جمائی کہ اُٹھ نا معقول! بس اب سونا ودنا ہو چکا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش کہہ کر اٹھے۔ باہر جا کر دیکھتے ہیں۔ تو ایک سمندِ گھوڑی پوری، دوسرا مریل لڈو ٹٹو۔ پوچھا کہ یہ ڈگی گھوڑیا کس کے لیے آئی ہے؟ مگر یہ پیگو کا ٹانگھن کیا قدم باز اور سُبک خیز ہے۔ آزاد سمجھ گئے کہ ہمیں اُلو بنانا چاہتا ہے۔ شانِ خدا۔ اے تیری قدرت۔ میاں خوجی بھی اتنے ہوئے۔ سمند گھوڑی ڈھائی سو روپیہ کی قیمت کی، اس کو آپ ڈگی بتاتے ہیں، جس میں میری نظروں سے گر جائے، اور اس دُبلے پتلے مریل ٹٹو کو پیگو کا ٹانگھن بتاتے ہیں۔ آزاد نے مسکرا کر کہا کہ پھر پیگو کا ٹانگھن آپ ہی کو مبارک رہے۔ بندہ اس ڈگی ہی پر قناعت کرے گا۔ آزاد میاں ظرّاف کی بیوی سے رخصت ہوئے۔ آداب بجا لاتا ہوں۔ بھابھی صاحبہ۔ بھول نہ جائیے گا۔ بھائی تو ایک بھُولکڑ آدمی ہیں۔ آپ نظرِ عنایت رکھیے گا۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا عمر بھر نہ بھولوں گا۔ نہ بھولوں گا۔ انھوں نے بہت ہی افسوس کیا اور کہا کہ بھائی تمھارے سبب سے دُو گھڑی غم غلط ہوتا تھا، اور تمھارے بھائی تو جیسے ہیں ویسے ہیں۔ ظرّاف ظرّاف جو لوگوں نے کہنا شروع کیا تو سمجھے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی ہے ہی نہیں۔ مگر خیر صلاح، اچھا پھر اب منزل کھوٹی ہوتی ہے۔ امام ضامن کو سونپا۔ خدا کرے جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منھ بھی دکھاؤ۔ آزاد نے کہا بندگی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں برس بھر کے اندر ہی اندر قدم بوسی حاصل کروں گا۔ یہ کہہ کر میاں آزاد باہر گئے، اور تڑ سے گھوڑی کی پیٹھ پر تھے۔

اب سُنیے کہ میاں خوجی نے اپنے مریل ٹٹو کو جو دیکھا تو لگے دوہتڑ پیٹنے۔ یارو واسطہ خدا کا ہمیں بچا لو۔ بھئی ہم ایسے جانے سے درگذرے۔ بلّی بخشے چوہا لنڈورا ہی ہو کر جیے گا۔ زیچ پی ہزار نعمت پائی۔ آخر کار لوگوں نے للکارا کہ بے وقوف ہوا ہے۔ مرا کیوں جاتا ہے۔ اب یہ چاہتے ہیں۔ کہ سوار ہو جائیں، لیکن یار لوگ ڈراتے ہیں کہ دیکھ دیکھ! وہ پشتک اُچھالی۔ وہ دولتی جھاڑی۔ وہ کاٹنے دوڑا۔ وہ منھ کھول کر لپکا۔ وہ دبوچا۔ وہ ٹیٹوا لیا۔ اور ٹٹو کھڑا ہے کان تک نہیں

ہلاتا۔ ایک دفعہ ہی آنکھ بند کر کے حضرت نے چاہا کہ لدلیں، مگر یارانِ سرپل نے تالیاں جو بجائیں۔ تو ٹٹو بھاگا، اور میاں خوجی بھد سے زمین پر۔ اُف! دیکھا کہتے تھے نہ کہ ہم اس ٹٹو پر سوار نہ ہوں گے۔ مگر حضرت ذاتِ شریف نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو الو بنایا۔ کچومر ہی نکل گیا ہڈی پسلی بچ گئی، ورنہ چرمر ہی ہو جاتے۔ خیر، دو آدمیوں نے ان کو اٹھایا اور لاد کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ لگام ان کے ہاتھ میں دی، اور کہا چلیے ٹخ ٹخ۔ لگام ہاتھ میں انھوں نے لی ہی تھی کہ ایک بگڑے دل نے چابک جمایا، اور ٹٹو دم دبا کر بھاگا۔ اور میاں خوجی نے غل مچایا، مرامرا۔ گرا گرا۔ یا علی مشکل کشا! مشکل کشائی کیجیے، یا خدا مدد دے! الٰہی خیر کیجیو۔ ارارا دوں دھم۔ وہ میاں خوجی لڑھک گئے۔ تب تو آزاد نے گھوڑی بڑھائی اور ظرّاف سے رخصت ہو کر خوجی کی مدد کو چلے۔ ان کو جو حوالی موالی بازاری تماشائیوں نے دیکھا تو کھسکے اور خوجی ٹٹو پر لدے ہوئے آہستہ آہستہ چلے۔

خوجی : اب کیا ردم تک برابر اس ٹٹو ہی پر جانا ہوگا؟

آزاد : جی اور نہیں تو کیا۔ اور کیا آپ کے واسطے اڑن کھٹولا آئے گا۔

خوجی : بندہ رخصت ہوتا ہے۔

آزاد : بندہ گدّا دیتا ہے۔

خوجی : بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا۔

آزاد : ٹٹو! اے آپ تو اس کو پیگو کا ٹانگھن کہتے ہیں۔

خوجی : بھئی۔ للہ ہمیں آزاد کرو۔ ہم درگذرے۔

آزاد : ارے بیوقوف! لکھنؤ تک یوں ہی چلنا ہوگا۔ وہاں سے پھر ریل ہے۔ بمبئی تک ریل پر جائیں گے اور وہاں سے جہاز۔

خوجی : (غل مچا کر) کیا؟ جہاز! اُف میرے مولیٰ پانی کا سفر ہو کس سے سکے گا۔ اور وہاں افیون کہاں ملے گی۔ مرے بے موت۔ بھائی ہمیں آزاد کرو۔

آزاد : بس چلے چلو۔

میاں آزاد اور ان کے لنگوٹیے یار میاں خوجی گھوڑوں کی باگ اٹھائے چلے جاتے تھے۔ میاں خوجی کی ٹٹوی بھی گرما ئی تو آزاد کی سمند گھوڑی سے دس پانچ ہی قدم پیچھے رہنے لگی۔ چلتے چلتے شام کے وقت ایک گاؤں نظر آیا۔ میاں آزاد نے کہا کہ یہیں بستر جماؤ آج یہاں پڑاؤ ہو، کل دن سے لکھنؤ داخل ہو جائیں گے۔ رات بھر وہاں رہے۔ صبح تڑکے گجر دم پھر چلے تو کوئی تین ہی چار

کوس گئے ہوں گے کہ میاں خوجی ارہر کے کھیت میں گئے اور ٹٹو کو راہ خدا پر چھوڑ دیا، کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ ٹٹوی دیکھنے میں تو دبلی پتلی تھی، صورت حرام، مگر انتہا کی شریر یہ تو ارہر کے کھیت میں ہو رہے، وہ سیدھی چل کے بوٹ کے کھیت میں پہنچی اور لگی چرنے۔ اتنے میں کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا، اور لگا برا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی چمک کر لپکی، اور کوسنا شروع کیا کہ پلو یا مر جائے پلو یا کے کیڑے پڑیں، ابھی ابھی پیٹ پھٹے۔ ڈارھی جار کی لہاس (لاش) نکلے، اور کسان نے گالیاں دیں کہ ارے یو ٹٹو کس سار کے آئے۔ بسسر ہمرے کھیت میں پیٹھا دھس (داخل کر دیا) میاں خوجی جو باہر نکلے تو دیکھا کہ ٹٹوی بھاگی جاتی ہے، اور پیچھے پیچھے کسان کی جورو غل مچاتی ہے، اور کسان لٹھ لیے ہوئے چلا آتا ہے۔ اس نے گدسے لٹھ جمایا، اور پھر تان کر دوسرا دیا، اور پھر تیسرا جھکانے ہی کو تھا کہ میاں خوجی نے للکارا۔ او گیدی! ابے او گیدی! خبردار اس حرکت ناشائستہ سے باز آ۔ ورنہ فرقدان پر ایک بال باقی نہ رہے گا، اور ضربِ پاپوش سے بوکھلا جائے گا۔ وہ گنوار بلکہ اور گنوار کا لٹھ۔ عربی ترکی تو پڑھا نہ تھا، اس پر جھلّا کر جھپٹ پڑا، اور اتنے لٹھ رسید کیے کہ ٹٹوے کے پنہتّر بگڑ گئے۔ میاں خوجی میں ایک وصف تھا کہ بے سوچے سمجھے، بے دیکھے بھالے، لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو، یہ چمٹ ہی جائیں گے۔ غصّہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصّہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصّہ آتا تھا تو شہ زور پر۔ جو ان کو اٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ لڑھکنیاں کھائیں۔ چاہے کچومر نکل جائے۔ مگر یہ بررنا نہیں چھوڑتے۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر، جھاڑ پونچھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، مگر ممکن کیا کہ ذرا اف کریں۔ وہی تیور، وہی خم ودم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی ان کے حضور میں کی کہ ان کی ٹٹوی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا ان کو تاب کجا۔ آفتابہ پھینکا اور تڑسے دوڑ کر کسان سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی، اور انتہا کا کرارا، یہ منحنی دبلے پتلے مہین آدمی، ہوا کے جھونکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچی اور گدسے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی، اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اس نے ایک گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت۔ دو تھپڑ رسید کیے، ایک اِدھر ایک اُدھر، اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے، کہ مہرارو سے جیت پاوت ناہیں، یو مسنڈوں سے کا لڑے، لے بھلا۔ کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک، اور پیٹ پاٹ کر چل دی، آپ نے پکارنا شروع کر دیا۔ قسم بابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں

اپنے زعم میں آپ آرہا، ورنہ اتنی قرلیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ہات ترے کی۔ نابکار لعین۔ کھڑا تورہ اوگیدی دوزخی! اس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اڑایا، اور اتنا بنایا کہ میاں خوجی جھلا کر سب کو گالیاں دینے لگے۔ اوگیدی! تم سب پر میں بھاری ہوں، پرے کے پرے صاف کردوں۔ وہ تو کہیے چھری نہوئی۔ اس سے خیریت ہے۔ ایک نے پوچھا کہ کیوں میاں صاحب چھری ہوتی تو کیا بھونک کر مرجاتے، یا اپنے پیٹ میں لگاتے آخر نتیجہ کیا ہوتا۔ اس پر میاں خوجی اور بھی آگ بھبھوکا ہوگئے۔

میاں آزاد کوئی دو گولی کے ٹپے پر نکل گئے تھے۔ جب خوجی کو ساتھ نہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ایں! یہ کہاں رہ گئے بھئی، ایک مسافر سے پوچھا کہ کیوں جی پیچھے کوئی شخص ٹٹو پر سوار آتا دیکھا۔ اس نے کہا جی ہاں، ایک کسان سے لڑائی ہورہی تھی، اور اس کی جورو نے ان کو خوب مارا۔ اب وہ کھیت میں پڑے قرولی ڈھونڈھ رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قرولی ہوتی تو مار ہی ڈالتا۔

میاں آزاد نے گھوڑی پھیری اور دم کے دم میں ہوا ہوگئے، تو کھٹ سے اس کھیت میں داخل۔

آزاد : ارے میاں خوجی خیریت تو ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ یہاں کھیت میں پڑے رہنے کا سبب کیا۔ چلو اٹھو گرد جھاڑو، آخر کب تک پڑے رہوگے بھلا۔

خوجی : قرولی۔ نہ ہوئی پاس ورنہ اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے۔

آزاد : اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے۔ بالفعل تو تمھاری بوتھ دیکھ رہے ہیں۔

پھر ٹٹو تھمبو کرکے اٹھایا، اور گھوڑی پر سوار کرایا۔ چلے تو دور تک میاں آزاد کا ساتھ رہا، بعد ازاں کوئی ایک کھیت کا فاصلہ ہوگیا۔ خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا کہ کیوں شیخ جی آپ کہاں رہتے ہیں۔ حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک کوڑا چکھایا، اور کہا کہ ابے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں۔ وہ شخص غصے سے آگ بھبھوکا ہوگیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو خوجی کھٹ سے زمین پر۔ چاہا کہ ان کو گلا گھونٹ کے مار ڈالے مگر رحم آیا، اور چھوڑ دیا، کہ مفت کا خون کون اپنی گردن پرلے۔ اب ان کی سنیے کہ ٹٹوی پر سے گر کر چاروں شانے چت پڑے ہیں۔ آزاد نے جو پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹوی پوقدمی چلی آتی ہے، مگر خوجی ندارد، سمجھے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ پلٹے کہ دیکھیں اب کیا واقعہ ہوا۔ خوجی ٹٹو پر سے گر کر حسب معمول غل مچانے لگے کہ نہ ہوئی قرولی، ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ یاد ہی کرتا عمر بھر۔ آزاد گھوڑی کڑا کڑاتے ان کے کلے پر جاڈٹے، تو دیکھا کہ پھر اسی طرح زمین پر پڑے ہوئے قرولی کی جستجو میں ہیں۔

آزاد : اے پھٹکار شرم نہیں آتی۔ کمزور مار کھانے کی نشانی بدن میں سکت نہیں تو پھر کٹے کیوں مرتے ہو۔ مفت میں جوتیاں کھانا کون جواں مردی ہے۔

خوجی : واللہ آزاد جو قرولی کہیں پاس ہو تو بدن ہی چھلنی کر ڈالوں۔ دم تو لینے نہ دوں۔ مگر چلیے بخیر گذشت، ورنہ اس وقت اس گیدی کی تجہیز و تکفین کی فکر پڑتی۔

آزاد : چلو اب اٹھو۔ اٹھو گے بھی یا پرسوں تک یہاں ہی پڑے رہو گے، یار تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔ اب یار اسی کے ہو رہے کہ تم کو ڈھونڈھنے نکلیں۔

خوجی : اجی ہم نہ اٹھیں گے، تاوقتیکہ قرولی نہ لادو۔ بس اب بنا قرولی کے نہ بنے گی۔

آزاد : (دھپ لگا کر) بس اب بیہودہ نہ بکو۔ اٹھو ورنہ ایک لات بھی جماؤں گا۔

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی پھر راہ چلے۔

میاں آزاد آج کچھ تھکے بہت ہیں۔ واللہ اعلم کیا سبب ہوا۔ طبیعت ہی تو ہے۔ میاں خوجی چانڈو پینے، گپ اڑانے، خوشامد کرنے کے عادی۔ ان کو یہ تاب کہاں کہ منزلوں ٹٹو پر جائیں۔ سفر کی صعوبت کون سہے۔ دو دن جو منزلوں چلنا پڑا تو بول گئے، اور پٹے اتنا کہ بھرکس نکل گیا۔ بند بند درد کرتا ہے۔ عضو عضو، ٹوٹ رہا ہے۔ میاں آزاد اور خوجی دونوں باتیں کرتے ہوئے پو قدمے جا رہے ہیں۔

آزاد : آج طبیعت از بس علیل ہے۔ انتہا کی بے لطف۔

خوجی : یہاں جوڑ جوڑ میں درد ہے، اور تو خیر لڑائی ہوئی ہے، مگر اس کسان کی مسٹنڈی عورت نے تو واللہ کچومر ہی نکال ڈالا۔ اُف کس بجر کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ مگر قسم ہے خدائے پاک کی جو بھئی کہیں چھری یا قرولی پاس ہوتی تو غضب ہی بپا ہو جاتا ایک کو تو جیتا چھوڑتا نہیں۔

آزاد : خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ قرولی کی آپ کو ہمیشہ ہی تلاش رہی، مگر جب آئے پٹ ہی کے آئے۔ جوتیاں ہی کھائیں، لیکن بر رنا نہ چھوڑا۔ بس انتہا کی بے حیائی ہے۔ مرد خدا ذرا تو دل میں شرما، بے شرمی بھی تو کتنی، کچھ ٹھکانا ہے۔ خیر یہ دُکھڑا کوئی کہاں تک روئے۔ یہ تو بتاؤ کہ آخر اب ہم کریں کیا۔ طبیعت از بس بے لطف ہے، اور جی متلاتا ہے۔ ڈاک لگی ہے۔ اور بند بند ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں، اور قلب کی کیفیت ناگفتہ بہ رہی ہے۔

خوجی : پیش خیمہ آگیا استاد۔ بس آگیا اب حضرت بھی کوئی دم کے دم میں دن سے دھر دھمکیں گے۔

آزاد : کیا ؟ پیش خیمہ کیسا، اور حضرت کون، میں کچھ سمجھا وجھا نہیں، ذرا بتاؤ تو۔

خوجی : ابھی صاحبزادے ہیں نہ آپ۔ اجی ائے کون۔ بخار، تپ، احتراق، التہاب، اور پیش خیمہ یہی اعضا شکنی۔ آنکھوں کی سوزش، کلیجے کی دھڑکن ہے۔ اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر منزل چلنا از بس مضر ہے۔ تم ابھی صاحبزادے ہو۔ یہ کیا جانو۔ ہم خرانٹ ہو گئے ہیں۔ اب آپ گھوڑے پر سے اُتر پڑیے اور کسی گاؤں میں چل کر لیٹ رہیے، ورنہ طبیعت اور بھی بے لطف ہو جائے گی۔ اب کہنا مانیے۔ عارضہ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی ہنسی ٹھٹھا مقرر کیا ہے آپ نے کیا۔

آزاد : پھر بھئی اتر کہاں پڑوں۔ جب کوئی گاؤں نظر بھی آوے۔ یار اب طبیعت میں انتشار اور بھی بڑھتا جاتا ہے، اور ناکوں دم آگیا ہے۔ اُف! بدن بھر پھونک دیا۔

خوجی : بخار آگیا۔ ذرا گھوڑی کو روک لیجیے گا۔ (ٹٹوی پر سے اتر کر) ذرا ہاتھ لائیے۔ نبض تو دیکھوں۔ اُف اوہ! بڑی حرارت ہے۔ ماتھا جل رہا ہے، مگر پاؤں بالکل سرد ہیں۔ خدا کرے کوئی گاؤں ملے تو وہاں ہم اور آپ اُتر پڑیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس چٹیل میدان میں بخار کا آنا کیا ستم کی بات ہے۔ اب اگر اتر پڑیے تو ٹکیے کہاں، اور نہ اتریے تو گھوڑی پر سوار ہو کر منزل بمنزل جانا بھی غضب کا سامنا ہے۔ مگر خیر سنگ آمد و سخت آمد قہر درویش بر جانِ درویش جس طرح جلد ممکن ہو جھٹ پٹ چلے ہی چلیے، ورنہ بری وقت ہوگی۔ انتہا کی پریشانی ہے۔

آزاد : تیوراتے لگے (گھوڑی روک کر) میں تو اب اتر پڑتا ہوں حضرت! اُف! قلب کی عجب ہی کیفیت ہے۔ کہاں جاؤں کس سے کہوں۔

خوجی : ذرا صبر کیجیے۔ اب اس وقت بجز اس کے اور کیا چارہ ہے کہ کہیں چل کر آرام کیجیے، اور کچھ دوا درمن ہو۔ یہاں میدان میں تو کچھ خاک نہیں ہو سکتا۔

آزاد : کسی سے پوچھیے تو گاؤں کتنی دور ہے۔ خدا کرے پاس ہو، ورنہ میں یہاں ہی گر پڑوں گا اور قبر بھی یہاں ہی بنے گی۔ خیر یا قسمت یا نصیب!

خوجی : ہائیں بھئی ذرا تو استقلال لازم ہے۔ آدمی کو، اتنا کوئی گھبراتا ہے، اور آپ تو فہمیدہ سنجیدہ ہیں۔ قبر کیسی اور تربت کے کیا معنی۔ معقول! (ایک مسافر سے) کیوں میاں مسافر یہاں سے بستی کتنی دور ہے؟ کوئی گاؤں بھی راستے میں پڑتا ہے یا نہیں؟

مسافر : یہاں سے؟ یہاں سے کوئی۔ دیکھیے وہ کوئی ڈیڑھ کوس بلکن کوس بھر پر ایک گاؤں ہے۔ کمولا۔ وہ سامنے باغ سوجھتا ہے، ان درختوں کی آڑ میں سامنے سیدھ پر۔

خوجی : لو بھئی مار لیا ہے۔ کوس بھر پر بستی ہے۔ بس کچا کوس۔ اک ذرا دل کو ڈھارس دیجیے،

اور آپ گھبراتے کیوں ہیں۔

آزاد : اور سینے کہنے لگے آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ میرا تو بُرا حال ہے۔ یہ پوچھتے ہیں کہ گھبراتے کیوں ہو۔ گھبرائیں نہ تو کریں کیا۔ دل بیقرار ہے۔ ہم تو لاکھ چاہتے ہیں صبر کریں، مگر جب دل بھی مانے طبیعت کا تو کچھ عجب حال ہے۔ اُف! واللہ پھنکا جاتا ہوں اور بدن سے شعلے نکل رہے ہیں۔ یا خدا کس مصیبت میں پڑ گیا کہ جی ٹھکانے نہیں، مگر قہر درویش بر جان درویش جس طرح ہو چلنا ضرور چاہیے۔ وہاں تک پہنچ جاؤں کسی طرح سے۔ بس پھر سمجھا جائے گا۔ ذرا کمر تو سیدھی کر دُں۔

خوجی : چلو خدا کا نام لے کر۔ اب سامنے ہی ہے۔ اور جو کچھ کہتا مانو تو ذرا گھوڑی کو تیز کر دو دم کے دم میں داخل نہ ہو جاؤ تو سہی۔ اک ذرا کڑا کر دو۔ بس پھر مزے سے لیٹنا۔

آزاد نے سمند گھوڑی کو ذرا تیز کیا تو وہ اُڑ گئی۔ یہ جا وہ جا۔ میاں خوجی نے بھی کوڑے پر کوڑا جمانا شروع کیا۔ شراپ شراپ، ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ۔ ٹٹو بھی بے دم ہو کر چلی، مگر پھر لدو ٹٹوی ہی تو تھی کہاں تک جاتی۔ وہ بھی گھوڑی کوئی چار سو روپیہ کی، اور پھر جوان۔ یہ بڑھیا۔ لاکھ دوڑی لیکن وہ ہوا ہی ہو گئی۔ میاں خوجی نے جھلا کر جو ایک ایڑ دی تو ٹٹوی بگڑ کھڑی ہوئی، اور جھپٹی تو میاں خوجی سنبھل نہ سکے۔ ران کا جمنا مشکل ہو گیا، اور دھڑ سے زمین پر آ رہے تو بڑے ہی خفا۔ کہ ہات تری ٹٹوی کی دم میں رسّا۔ نہ ہوئی قرولی اس وقت پاس ورنہ اتنی بھونکتا کہ بلبلانے لگتی۔ اتنے میں ٹٹوی نے چاہا کہ سپاٹو کی ہوا کھائے، تب تو حضرت نے للکارا کہ اوگیدی! اوگیدی! سنبھل میں آن پہنچا۔ سوچے کہ اگر آج بھی سڑک پر لیٹا رہا تو آزاد واپس آنے سے رہے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اٹھتے ہی ٹٹوی کو پکڑا اور لد کر چلے۔ تو پیچھے دو چار ٹھٹھول، دل لگی باز آدمیوں نے تالیاں بجائیں، اور کہنا شروع کیا کہ لدا ہے، لدا ہے، لینا، لینا، جانے نہ پائے۔ خوجی بد دماغ ہو گئے، اور للکار کر کہنے لگے کہ اوگیدی ابھی قرولی ہاتھ میں ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیے ہوتے۔ گستاخ، نامعقول بے ادب۔ ان لوگوں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ میاں بگڑتے کیوں ہو۔ کہو تو تم اور تمھاری ٹٹوی دونوں کو اٹھا کر پہنچا دیں۔ خوجی کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ خون کبوتر کی سی سُرخ ہو گئیں۔ کہنے لگے کہ ٹٹوی! یہ ٹٹوی کیسی۔ عراقی نہیں کہتے۔ ہٹو سامنے سے نہیں ہنٹر جماتا ہوں۔ واہ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو۔ نہیں جانتے ہیں سپاہی آدمی ہوں۔ شاہی میں دو دو دلا پنیاں کمر سے لگی رہتی تھیں۔ اب لاکھ کمزور ہو گیا ہوں تو کیا، لیکن اب بھی تم سے پچاس سے اچھا ہوں۔ لوگوں نے خوب قہقہے اڑائے۔ جی ہاں، پیر و مرشد سچ ہے۔ آپ ایسے ہی جواں مرد ہیں۔

ایسے جیوٹ کے آدمی ہوتے کہاں ہیں۔ واہ پہلوان اور آپ کے تو ڈنڈ بل کہے دیتے ہیں، کہ آپ سپاہی اور پہلوان ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ لاحول کا کہنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی بگڑے۔ لاحول! یہ لاحول کیا؛ آخر یہ لاحول کے معنی کیا؟ اب میں اُتروں پھر۔ آؤں؟ یارانِ سرپل نے کہا، نا صاحب ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ کہیں مار ڈالیے گا آن کر تو، اور بھی ستم ہو جائے۔ آپ ٹھہرے پہلوان اور اس پر طرہ یہ کہ سپاہی آدمی۔

الغرض میاں خوجی گرتے پڑتے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ میاں آزاد گھوڑی پر کھڑے ہیں، اور سامنے سرا کا دروازہ ہے، لیکن چہرے سے ایک اضمحلال پایا جاتا ہے، اور انتہا کی وحشت برستی ہے۔ ٹٹوی پر سے اتر کر میاں خوجی نے پوچھا کہ،،

خوجی : آئیے سرا میں تشریف لائیے!

آزاد : بھائی تم جا کر کوٹھری وٹھری تو ٹھہراؤ۔ میں ابھی آیا، کچھ دیر تھوڑا ہی لگے گی، لیکن کوٹھڑ صاف ہو اور بھٹیاری۔ بڑھیا، جس میں کام اچھا کرے، اور ٹرائے نہیں۔ میں اب انتہا کا ضعیف ہو گیا ہوں۔ ناز اٹھانے کی طاقت کہا۔

خوجی سرا میں جا کر کوٹھریاں دیکھنے لگے۔ سرا بھر میں چکر لگائے، لیکن کوئی کوٹھری پسند نہیں آئی۔ بھٹیاریاں پکار رہی ہیں۔ کہ میاں مسافر ادھر آؤ ادھر۔ دیکھو خاصی صاف ستھری کوٹھری ہے۔ ٹٹوی باندھنے کی جگہ الگ، اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہو گئے۔ ٹٹوی پھر کر کہا کیا! پھر تو کہنا۔ ٹٹوی! ہشت۔ یہ پیگو کا ٹانگھن ہے۔ ایک بھٹیاری نے چمک کر کہا کہ اے میاں ادھر آؤ۔ پیگو کے ٹانگھن کو اِدھر باندھو۔ دوسری مسکرا کر بولی اے پیگو کا ٹانگھن ہو یا خراساں کا گدھا، ادھر آؤ تو۔ یہ جھلّانے لگے اور جب ان سب نے مل کر خوب بنایا تو چھری اور قرولی کی حضرت کو تلاش ہوئی۔ اس پر سرا بھر کی بھٹیاریاں تالیاں بجا بجا کر بنانے لگیں۔ تب تو میاں خوجی چکرائے کہ تو بہ ہی بھلی۔ اتنے دق ہوئے کہ ٹٹوی کو انھوں نے وہاں سے خیز کیا۔ اور سرا کے باہر نکل آئے۔ باہر جو آئے تو میاں آزاد نے پوچھا کہ کہو جگہ ہوئی تو آپ فرماتے کیا ہیں کہ نہ بھئی چلو آگے کے گاؤں میں رہیں گے۔ یہاں سب کے سب شریر ہیں۔

آزاد : ارے کمبخت وہ شریر ہوں یا نیک اس سے کیا واسطہ۔ یہاں جان پر بن آئی ہے۔ آپ کو دل لگی ہاتھ آئی ہے۔ واسطے خدا کے کوئی کوٹھری تجویز و، یا تم پڑو اپنی ایسی تیسی میں۔ میں خود جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میاں آزاد نے گھوڑی کو تیز کیا اور بات کرتے سرا میں داخل ہوئے۔

ادھر اُدھر گھوم گھام کر ایک کوٹھڑی تجویز کی، اور اتر پڑے میاں خوجی نے بھی ٹٹو پر سے زین پوش اتارا اور بستر جمایا۔ اب سُنیے کہ سائیس پیچھے رہ گئے تھے۔ میاں خوجی کو اپنے ہی ہاتھ سے سب کچھ کرنا پڑا۔ لید بھی اٹھائی اور گھوڑیاں بھی باندھی، اور گھانس بھی خرید لائے، اور بھٹیارا بھی کیا سرا والے سمجھے کہ یہ سائیس ہے۔

بھٹیارا : او سائیس بھیا ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو۔

خوجی : (گردن پھیر کر) کس سے کہتا ہے بے۔ ابے سائیس کون ہے ؟

بھٹیارا : پھر اور ہو کون۔

بھٹیاری : اے تو تنکتے کیوں ہو میاں۔ سائیس نہیں گراس کٹ سہی۔ چر کٹے سہی۔

آزاد : یہ کیا بیہودہ تقریر ہے۔ یہ ہمارے دوست ہیں یا سائیس۔

بھٹیاری : سچ دوست ہیں۔ صورت تو بھلے مانسوں کی سی نہیں۔

خوجی : آزاد۔ یار اک ذرا آئینہ تو نکال دینا۔ نہیں واللہ کئی آدمی کہہ چکے ہیں۔ مجھے کئی بار اپنے شریف ہونے کا خود شک ہو گیا۔ آج میں ضرور دیکھوں گا، بالضرور دیکھوں گا۔ آخر یہ وجہ کیا۔ کہ جو کہتا ہے یہی کہتا ہے۔

آزاد : چلو واہیات نہ بکو۔ اُف میرا تو بُرا حال ہے بھئی۔

بھٹیاری نے چارپائی بچھا دی، اور میاں آزاد لیٹے تو بخار کی وہ شدت کہ الاماں۔ آنکھیں جل رہی ہیں، اور بے چینی اور بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔

خوجی : اب طبیعت کیسی ہے ؟

آزاد : مر رہا ہوں۔

خوجی : الحمدللہ!

آزاد : خدا کی مار تجھ پر۔ دل لگی کا بھی کیا بھونڈا وقت ہاتھ آیا ہے۔ جی چاہتا ہے اس وقت زہر کھا لوں۔

خوجی : نوش جان، اور اس میں تھوڑی سنکھیا بھی ملا لیجیے گا۔

آزاد : مر کمبخت۔

خوجی : اب بوڑھا ہوا مردوں کس پر۔ مرنے کے دن تو لد گئے۔ اب تم ذرا سونے کا خیال کرو۔ دو چار گھڑی سو رہو تو بس طبیعت ہلکی ہو جائے، اور یہ انتشار کی کیفیت بھی نہ رہے، ہے نہ بات ؟

آزاد : جو کہو۔

بھٹیاری: میاں کیسے ہو؟

آزاد : کیا بتائیں بی کیسے ہیں۔ مر رہے ہیں۔

بھٹیاری: کس پر؟

آزاد : تم پر۔

بھٹیاری: علیؓ کی سنوار۔

آزاد : کس پر۔

بھٹیاری: (خوجی کی طرف اشارہ کرکے) ان پر۔

خوجی : افسوس نہ ہوئی قرولی اس وقت۔

آزاد : ہوتی تو کیا کرتے۔

خوجی : بھونک لیتے اپنے پیٹ ہیں۔

بھٹیاری: ایسے حیادار ہوتے تو اتنے بڑے نہ ہونے پاتے۔

آزاد : آبِ خنجر کی جن کو ضرورت ہوتی ہے، وہ چلو بھر پانی ہی میں ڈوب مرتے ہیں۔ اُف بھئی کچھ تو علاج کرو۔

بھٹیاری: ایک حکیم یہاں رہتے ہیں۔ کہو لپک کے بلالاؤں؟

آزاد : جاؤ احسان ہوگا۔ میں اس وقت مارے بخار کے پھک رہا ہوں۔ بی بھٹیاری جا کر بلالائیں۔ میاں آزاد دیکھتے ہیں تو عجب قطع کے آدمی۔ دھوتی لگائے۔ میرزائی پہنے، اور وہ بھی گاڑھے کی، بند کھلے ہوئے۔ چہرے سے وحشت برس رہی ہے۔ آدمیت چھو ہی نہیں گئی۔ معقول! اچھے حکیم ہیں ایسے طبیب دیکھے نہ سنے۔

آزاد : حکیم صاحب آداب۔

حکیم : ناہیں دبواؤ نہیں۔ بخار میں دابے نکسان (نقصان) ہے۔

آزاد : (دل میں) معقول! لیاقت ظاہر ہے۔ ہم کہتے ہیں آداب وہ کہتے دبواؤ نہیں۔ آپ کا اسم شریف؟

حکیم : ہمارا اسم سریپ۔ دانگلو۔

آزاد : (ہنس کر) بہت ہی خاصے۔ دانگلو۔ یا جانگلو۔

خوجی : ہیچ نمی داند۔ فہمیدی برادر؟ ایں گیدی ہیچ نمی داند باللہ کہ اگر قرولی بدست ما بودی سرش از تن جدا کردمی و مثل بُھٹا اڑا دیتا۔

آزاد : چلیے بس بہت فارسی کی ٹانگ نہ توڑیے، معلوم ہے آپ بڑے محقق طوسی ہیں۔

حکیم : نسخہ لکھوں۔

آزاد : آپ نسخہ دستور رہنے ہی دیں، بس یہاں سے تشریف لے جائیں۔

حکیم : بخار میں بکتے ہیں۔ چاند کے پٹے تنک تنک کتر ڈالو۔

آزاد : کیا؟

خوجی : کچھ بیدھا تو نہیں ہوا ہے۔ نہ ہوئی قرولی ورنہ توند پر رکھ دیتا۔ پٹے کترتا کیسا۔ کیا کچھ پاگل ہیں یہ۔ جانا معقول۔

حکیم : بھائی ہم سے ان کا علاج نہ ہو سکتے۔ اب یاک (ایک)، ہو تو علاج کریں۔ یہاں لو پاگل کو ہے، یو ہم کا الٹی کا پلرا بکت ہے سُسر۔

خوجی نے جھلا کر ان کو اٹھا دیا، اور یہ نسخہ لکھا۔

ہوالشافی۔ آلو بخارا۔ تمر ہندی۔ عرق گاؤزبان۔ شب در آب صاف خیسانیدہ[۱]، صبح مالیدہ[۲] صاف نمودہ[۳] بنوشند۔

اس نسخے کو میاں خوجی نے پنساری کی دکان پر بھیجا۔ اور یہ بندھ کر آگئیں، اور خوجی نے اُن کو بھگو دیا۔ آزاد نے کہا ذرا ہم بھی تو نسخہ دیکھیں۔ دیکھا تو بد دماغ ہو گئے۔

آزاد : شب در آبِ صاف خیسانیدہ صبح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند۔ معقول رات بھر میں تو اپنا کام تمام ہی ہو جائے گا، صبح تک جیے گا کون۔ اجی اس وقت پلاؤ۔ اسی دم۔ جب جانیں کہ ہاں آرام ہوا۔ کل تک زندہ رہنا محال۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ صبح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند۔

خوجی : پھر اب اس وقت بندہ کچھ نہ دینے کا۔ ہرگز نہ دوں گا۔ واللہ ہاں ایک بات ہے۔ آلو کا پانی پیجیے، پانچ دانے بھگوئے دیتا ہوں۔ جب مانگو آبِ زلال دوں۔ بس کافی ہے۔

آزاد : خیر یوں ہی سہی، مگر یار، اُف پھونک دیا، پھونک دیا۔ آخر یہ ہوا کیا کچھ سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ اور بھوک کے مارے اور بھی جان عذاب میں ہے۔

خوجی : کھانا اس وقت کہاں؟

آزاد : واہ کھانا ندارد ہو تو بندہ آپ تک کو چٹ کر جائے۔ اس بھروسے بھی نہ رہیے گا۔

خوجی : واللہ ایک دانہ بھی آپ کے پیٹ میں گیا، اور آپ برس بھر تک یوں ہی پڑے رہے۔
کھانا اس وقت سم کا اثر دے گا۔ لاحول ولاقوۃ۔ کھانا! اُف! نام نہ لو۔

آزاد : خیر آلو کا آبِ زلال تو لائیے۔

خوجی : لو جُرعہ جُرعہ پینا۔ یہ نہیں کہ پیالے کو منھ سے لگایا اور غٹ غٹ نوش جان کر گئے۔
ایسا نہ کرنا۔

آزاد : اُف ذرا تسکین ہوئی اور پیوں گا۔

خوجی : ابھی نہیں ذرا تھم کر۔ ذرا دم تو لو۔ بخار میں زیادہ پانی پینے سے طحال کے بڑھنے کا
خوف ہے۔

آزاد : قلب کی حرارت کیوں کر رفع ہو گی؟

خوجی : ہم بتائیں۔ صندل اور کیوڑے کی پتی قلب پر رکھیے، ابھی تخفیف نہ ہو تو سہی۔

آزاد : پیاس کی شدت ہے۔ ہر بُنِ مُو سے العطش کی آواز نکلتی ہے۔

خوجی : آلو منھ میں رکھیے۔

آزاد : گرمی انتہا سے زیادہ ہے۔

خوجی : پالک کے پتے چار پائی پر چو طرفہ بچھا دیجیے۔ اور ان پر آپ آرام کیجیے۔

آزاد : ماتھا دھمک رہا ہے۔

خوجی : کھیرا کاٹ کر ماتھے پر رکھیے۔ اور اغل بغل بھی ایک ایک کھیرا رکھ لیجیے۔ اور پیاس
معلوم ہو تو کھیرے کے بیج چوس کر پھینک دیجیے۔

آزاد : جی گھبراتا ہے۔

خوجی : بخار میں یہ تو قاعدہ ہی ہے کہ جی ضرور گھبرائے گا۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ مگر ذرا
استقلال بھی رکھیے۔ آپ کے مزاج میں تحمل مطلق چھو نہیں گیا۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔
اس سے تو چھوکری ہی ہوتے تو کسی بھلے مانس کا گھر ہی آباد ہوتا۔ کھیرا چوسیے، اور میں لخلخے
سنگھاتا ہوں۔ سائیس سائیس ادپر آؤ! ذری سا نمک باریک پیس کر پاؤں میں ملو، اور تلوے
سہلاؤ۔ ذرا پاؤں گرمائیں، اور دماغ کے انجرے کم ہوں تو تسکین ہو۔ جب تک پاؤں سرد
ہیں دو تین جلابوں کے بغیر آرام معلوم۔ مگر یہاں تو حکیم بھی عنقا ہے۔ افسوس خیر ہم

علاج کریں گے۔

آزاد : علاج تک مضائقہ نہیں۔ مگر مار نہ ڈالنا بھائی۔ ہاں ذرا اتنا احسان کرنا۔

خوجی : واہ ہم برسوں مرزا محمد علی مبرور کے یہاں مطب کیا کیے۔

میاں آزاد رات بھر بے چین رہے۔ طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ تپ کی وہ شدّت کہ الاماں۔ الحذر ماتھا جل رہا تھا۔ اختلاج قلب کی وہ کیفیت کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ میاں خوجی گو طبیب نہ تھے مگر اطبا کی آنکھیں ضرور دیکھی تھیں۔ انھوں نے مسکنّات اور مبردات کا خوب استعمال کرایا۔ اختلاج قلب اور بے قراری کے لیے صندل اور کیوڑے کا پھاہا قلب پر رکھا اور بار بار اس کو بدلا، خشک نہ ہونے دیا اور ماتھے پر کھیرا تراش کر اس کی قاش رکھی اور اغل بغل مسلّم کھیرے رکھ دیے، اور پالک کی پتیاں بستر پر بچھادیں۔ جب میاں آزاد کو تشنگی کا غلبہ ہوا تو اسپغول اور زرشک کی پوٹلی جو پانی میں بھیگتی تھی، ہونٹوں پر پھیری۔ اور تھوڑا تھوڑا پانی بھی وقتاً فوقتاً پلوایا۔ میاں آزاد نے جب بار بار پانی مانگا تو انھوں نے کہا کہ پانی حاضر ہے۔ مگر تلی بڑھ جائے گی۔ لہٰذا ذرا آپ بھی ضبط کیجیے۔ میاں آزاد نے کہا کہ بھائی جی مالش کرتا ہے۔ استفراغ ضرور ہوگا۔ خوجی نے برابر لگاتار آب آلو پلوایا، اور میاں آزاد نے کئی بار استفراغ کیا۔ اس سے کرب کسی قدر کم ہوا، اور میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی۔ کہ دفعتہً پڑوس کی کوٹھری سے آواز آئی کہ لا شراب لا شراب! یہ چونک پڑے۔ خوجی سے پوچھا کہ خیر تو ہے۔ انھوں نے کہا جی ہاں فضلِ الٰہی ہے۔ مگر افسوس کہ اس وقت قرولی پاس نہیں، ورنہ ان بدمعاشوں کو قتل ہی کر ڈالتا۔ مردودوں نے شراب پی پی کر اس قدر غل مچایا کہ الاماں! ابھی تمھاری آنکھ لگی تھی اور خدا خدا کرکے ذرا نیند آئی تھی کہ ان بدمعاشوں نے شراب کے نشے میں تم کو جگا دیا۔ چار پانچ نوجوان آدمی اس کوٹھری کے پڑوس میں ٹکے ہیں۔ شکل صورت سے تو بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ مگر انتہا کے پاجی اور رذیل۔ خدا ان سے بچائے۔ خوب شرابیں لنڈھائی ہیں۔ اب تھوڑی دیر میں۔ جوتی پیزاری چاہتی ہے۔ وہ جوتی اُچھلے کہ توبہ ہی بھلی۔ خیر اس سے ہمیں کیا۔ وہ چاہیں جوتی پیزار کریں، چاہے غل مچائیں مگر آپ رات بھر سونے نہ پائیں گے۔ واللہ اس وقت قرولی ہوتی تو مزہ چکھا دیتا۔ بی بھٹیاری تم ہی ذرا ان کو للکار دو اور کہو کہ ایک شریف مرض تپ میں مبتلا یہاں پڑا ہوا ہے۔ واسطے خدا کے ذرا خاموش رہو۔ بھٹیاری نے کہا میاں خدا گواہ ہے کہ اس کا مجھے خود ہی افسوس ہے۔ ابھی بیچارے کی ذرا یوں ہی سی آنکھ لگی تھی، کہ ان موئے شہدوں

نے ڈنکا مچائی۔ اُن پر علیؓ کی سنوار، مل میں سوچتی ہوں کہ میں ٹھہری عورت ذات اور وہ مردوے اور پھر اپنے آپے میں نہیں، جو مجھی پر نہ پل پڑیں تو میں کیا کروں۔ کہو تو بھٹیارے کو بھیج دوں۔ میاں آزاد نے کہا اچھا تم نہ جاؤ۔ اپنے مرد کو بھیجو۔ بھٹیارے نے جا کر کہا کہ بہت چلاؤ نہیں۔ یہاں ایک آدمی سو رہے ہیں۔ ماندے ہیں۔ آپ کے چلانے چیخنے سے ان کو نیند نہیں آتی۔ یہ اتنا کہتا تھا کہ سب کے سب بھڑ پڑے۔ ایک نے کہا دُت مردود۔ بھاگ جا یہاں سے۔ دوسرے نے بھٹیارے کی پگڑی اچھالی۔ تیسرے نے ٹیپ جمائی۔ چٹاخ کی آواز جو آئی تو میاں آزاد ہنس پڑے، اور خوجی نے کہا نہ ہوئی قرولی ورنہ جہاں کے ہیں وہیں پہنچاتا۔ اس پر بھٹیاری طیش میں آکر اٹھی، اور غل مچا کر انگلیاں مٹکا کر اتنی صلواتیں سنائیں کہ ان شرابیوں کا نشہ ہرن ہوگیا، اور اتنے ڈرے کہ کوٹھری بند کر لی۔ جب غل نہ ہوا تو میاں آزاد پھر سونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر شور و غل کی آواز آئی۔ اور آزاد کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ میاں خوجی بھی پینک میں تھے، جاگتے ہی چلا اٹھے کہ ابے او گیدی! نہ ہوئی قرولی ورنہ تم سب کو ایک ہی چوٹ میں خدا گنج بھیج دیتا۔ یہ کہہ کر حضرت لپکے، اور ان کی کوٹھری کے دروازے کو اس زور سے دھم دھمایا کہ چول نکل گئی اور وہ سب شرابی جھلا کر باہر آئے تو میاں خوجی پر لے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ انھوں نے اِدھر اُدھر قرولی اور قرابینچے کی بہت کچھ تلاش کی مگر بے سود۔ خوب ہی پٹے اور جھلا کر دو چار حضرت نے بھی رسید کر دیں، تو بہت خوش کہ ہماری چوٹ بھی خالی نہ گئی۔ خیر اس کے بعد وہ سب سو گئے۔ مگر نشہ میں بدمست و خراب، صبح کے وقت جبکہ مسافروں نے بقچہ سنبھالا تو ایک دفعہ ہی اس کوٹھری سے رونے کی سی آواز آئی، اور میاں آزاد اور خوجی چونک پڑے۔ آزاد نے کہا کیوں یار خیریت تو ہے۔ یہ رونا دھونا کیسا۔ خوجی نے کہا اجی اس فکر میں نہ پڑو یہ شرابی آدمی ایسا ہی کیا کرتے ہیں خوجی جو اس کوٹھری کی طرف گئے تو دیکھا کہ ایک شخص مردہ پڑا ہے، اور باقی سب کھڑے رو رہے ہیں۔ ایں، خدا ہی خیر کرے: یہ مرنا جینا کیسا۔ پوچھا کیوں بھائیو خیریت تو ہے۔ ایک نے روتے روتے کہا کہ میاں کچھ نہ پوچھو سارا نشہ ہرن ہوگیا۔

خوجی: کیوں کیوں خیر باشد؟ آخر ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو، یہ آفت کیا آئی۔

شرابی: بھائی ہم سب نے مل کر شراب پی تھی، اور ہم روز مرہ شراب پیا کرتے ہیں۔ کل کی برانڈی بڑی تیز تھی، جیسے سمِ قاتل، اور انتہا سے زیادہ لنڈھا گئے۔ یہ شخص بڑا عادت پینے والا تھا، اور ہم سب کا گرو گھنٹال، اس سے لاکھ کہا کہ بس اب نہ پیو۔ اس نے ایک کی نہ سنی۔

اپنی ہی سی کیے گیا، اور خرابی یہ کہ چٹنی نہ کھائی نہ کباب چھوئے نہ پانی پیا۔ شراب ہی شراب اڑایا کیا۔ دو بجے ہم سب سو گئے مگر وہ پہلے ہی سو رہا۔ سوتے وقت اتنا البتہ کہا کہ بھئی اس وقت گرمی بہت معلوم ہوتی ہے اور کلیجہ پھنکا جاتا ہے۔ صبح کو جب ہم سب اٹھے تو۔ ع۔ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے، آدمی نے حسب معمول حقہ بھرا، اور سرہانے رکھ دیا خبر کسے ہو۔ وہ تو بھتے ہی نہیں۔ جب چلم جل گئی اور تمبا کو جل بھن کر خاک ہو گیا۔ تو آدمی نے دوسری چلم بھری، وہ بھی جل گئی۔ تب اس نے جگایا کہ میاں حقہ بھرا رکھا ہے۔ اٹھیے اٹھیے جواب ندارد۔ صدائے برنخاست۔ آدمی نے شانہ پکڑ کر ہلایا، چادر اٹھایا تو۔ ارے؟ مُردے کی سی صورت ہو گئی ہے معاذاللہ ہم سے کہا تو بدحواس ہو کر ہم نے دیکھا، اور ہاتھ مل کر رہ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاٹا لگ گیا۔ کیوں۔ خیر جا ہے جو ہوا ہوا۔ اب تو مرے سو مرے ہائے داغ حسرت دے گیا۔ خود مرا اور ہم کو قتل کر گیا۔ اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے۔

خوجی : غضب ہو گیا۔ مفت میں بے چارے کی جان گئی۔ اس شراب خانہ شراب کو خدا غارت کرے۔ مگر استاد اب تم سب دھرے جاؤ گے، اور سزا پاؤ گے۔ لیکن ہم جو تدبیر بتائیں وہ کرو شاید بچ جاؤ۔

شرابی : ہم کہیں گے کہ سانپ نے کاٹا تھا۔

خوجی : کہیں ایسی حماقت بھی نہ کرنا۔

شرابی : اچھا بھاگ جائیں گے۔

خوجی : تو تو دھر ہی لیے جاؤ۔ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ دال میں کالا کالا ہے۔

شرابی : اچھا ہم کہیں گے کہ چھری مار کر مر گیا۔ اور گلے پر چھرا بھی بھونک دیں گے۔

آزاد : خوجی خیریت تو ہے؟

خوجی : دیکھیے عرض کرتا ہوں۔ بھئی اب تم لوگ ایک کام کرو۔ خوب روؤ اور سر پیٹو۔ ایک تو اس کو اپنا حقیقی بھائی بتاؤ دوسرا بہنوئی بتاؤ، تیسرا ماموں، چوتھا سالا، اور جو کوئی پوچھے کہ کیا ہوا تھا۔ تو کہنا کہ دردِ گردہ کے عارضے میں مرے اور یہ بھی کہنا کہ اس مرض میں وہ لڑکپن سے مبتلا تھا۔ شام کو میٹھا میٹھا درد بتاتے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے مر ہی گئے بے چارے۔ افسوس خوب چلا چلا کر رونا، اور آنسو ٹپ ٹپ گرتے جائیں۔ جو اشک یوں نہ آئیں تو مرچیں لگا لو۔ خاک نتھوں میں جھونک لو۔ سمجھے ایسا نہ ہو کہ گڑبڑا جاؤ۔ تو پھر جیل خانہ نصیب ہو؟

شرابی : آپ گواہی دیجیے گا کہ درد گردہ تھا؟

خوجی : (للکار کر) ہاں ہاں جی کہتے جاتے ہیں۔ پھر اور کیوں کر کہیں۔

کسی ذات شریف نے جا کر پولیس میں جڑ دی کہ سرا میں بعض لوگوں نے مل کر ایک مہاجن کو زہر دے دیا۔ اور اس کا روپیہ لے کر چلتا دھندا کیا۔ شہر میں مشہور ہوا کہ سرا میں کسی ڈاکو نے ایک بھٹیارے کو قتل کر ڈالا، اور دیہات میں یہ خبر اڑی کہ ایک کلوار نے کسی گاہک کو شراب نہ دی تو اس نے گولی ماری اور کلوار چل بسا۔

الغرض جتنی زبانیں اتنی افواہیں۔ جو کہتا ہے ایک نئی بات۔ تھانہ دار اور دس برق انداز وردیاں پہنے رپ رپ کرتے ہوئے سرا میں آن پہنچے۔ اری او مہترانی! بتا وہ مہاجن کہاں ٹکا ہوا ہے۔ ایں! میاں کون مہاجن کسی کا نام تو لیجیے۔

برق انداز : (جھلا کر) تیرا باپ اور کون۔

بھٹیاری : میرا باپ! اے واہ، ان کی تلاش ہے تو گورستان جائیے۔

برق انداز : خون کہاں ہوا؟

بھٹیاری : خون! ارے توبہ کر بندے۔ خون یہاں منزلوں دور، خون کیسا؟ خون ہوا ہوگا تمہارے تھانے پر۔

برق انداز : تو یہ مخبر جھوٹ ہی کہتا ہے؟

بھٹیاری : اللہ جانے خون بھی کوئی ایسی ویسی چیز ہے یا کلھیا میں گڑ پھوڑنا ہے۔

تھانہ دار : اس سرا میں کوئی مرا ہے رات کو؟

بھٹیاری : ہاں! توبہ تو یوں کہیے۔ وہ دیکھیے وہ بے چارے کھڑے رو رہے ہیں۔ ان کے بھائی تھے۔ کل درد ہوا رات کو مر گئے۔

تھانہ دار : لاش کہاں ہے؟

شرابی : حضور یہ رکھی ہے۔ ہائے ہم تو مر مٹے۔ ہائے بھائی! وائے بھائی! ارے داغ حسرت دے گیا۔ ہمیں چھوڑ کر چل بسا۔ اُف میرے اللہ! اب گھر میں جا کر ہم کیا منھ دکھائیں گے۔ ہائے کس منھ سے اب گھر جائیں گے۔ تھانہ دار صاحب کسی ڈاکٹر کو تو بلوائیے ذرا نبض تو دیکھ لے۔

تھانہ دار : افسوس ہوا۔ اس پردیس میں آپ پر آسمان ٹوٹ پڑا، غضب ہی ہو گیا۔

شرابی : ہائے ہائے کیا کریں۔ کس سے کہیں جان پر بن آئی۔ اُف! ارے بھائی کہاں چلا گیا۔ اُف مار ڈالا۔ قتل کر ڈالا۔

میاں آزاد اور خوجی نے جو یہ باتیں سُنیں کھل کھلا کر ہنس پڑے کہ بھئی واللہ کیا بات بنائی ہے۔
اتنے میں تھانہ دار نے لاش کو دیکھا بھالا۔ اور میاں خوجی سے پوچھا کہ آپ اس بارے میں کیا جانتے ہیں۔
خوجی: عرض کروں غریب پرور۔ پرسوں شب کو بندہ از بس اچھا اس سے کیا واسطہ۔ خلاصہ یہ کہ ہم سب۔ چلو یہ بھی نہ سہی۔
تھانہ دار: (ہنس کر) معقول۔ اے صاحب فرمائیے۔
خوجی: آپ تو بڑے جلد باز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ قبلہ! کہتا ہوں، کہتے کہتے کہوں یا ایک دفعہ ہی اگل پڑوں۔ سُنیئے جناب کہ کل شب کو میاں آزاد کی طبع مبارک نصیب اعدا کچھ بے لطف تھی۔ مسکنّات و مبردات کے استعمال سے ان کی آنکھ جھپکی، تو سُنا کہ پڑوس کی کوٹھڑی میں ایک شخص چلّا رہا ہے۔ قیاس سے سمجھا کہ کرب ضرور ہے۔ ورنہ اس قدر بے چینی نہ ہوتی۔ آدمی ہوں خداترس، اور رفیق القلب، رہا نہ گیا۔ جا کر دیکھا تو دردِ گردے کے مرض میں اس مرحوم کو مبتلا پایا، اور اس کے اعزہ کو مغموم و ملول۔ تشفّی اور تسکین کی باتیں جہاں تک یاد تھیں سب بیان کیں مگر مطلق فائدہ نہ ہوا۔ خیر تھوڑی دیر میں بصد حسرت بندہ واپس آیا، اور سو رہا۔ صبح کاذب کے وقت رونے کی آواز کان میں آئی۔ اور ان لوگوں کو کمال مضطر پایا۔ تو افسوس ہوا۔ اب ان کو سمجھاتا ہوں کہ دل کو ڈھارس دیں صبر کریں۔ کیوں کہ جناب صبر کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ خدا ان کو صبر جمیلہ کرامت فرمائے اور وہ تو اب آ چکا:

عرفی اگر بہ گریہ میسّر شدی وصال صد سال میتوان بہ تمنّا گریستن

تھانہ دار: حضرت اب خدا کو یاد کیجیے۔ وہ بے چارے تو راہی ملک بقا ہوئے، خدا ان کو بہشت نصیب کرے!

تھانہ دار نے روز نامچے میں لکھ لیا کہ سرائیں بر سرِ موقع تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ دردِ گردہ میں مر گیا۔ اس کے عزیز و اقارب، اور خاص حقیقی بھائی موجود ہیں۔ میاں خواجہ صاحب اور میاں آزاد دونوں گواہ ہیں۔ اور ان کی گواہی معتبر اور مستند ہے۔ لہٰذا زیادہ تحقیقات کی چنداں ضرورت نہیں۔

میاں خوجی ریشہ خطمی ہو گئے کہ بڑا پالا جیتا۔ یہ سب انھیں کی رائے کا نتیجہ تھا۔ ورنہ خدا جانے کس مصیبت میں گرفتار ہو جاتے۔ لاش الگ چیری جاتی، اور زہر خورانی کا مقدمہ الگ قائم ہوتا، اور مہینوں تحقیقات ہوتی، اور حوالات میں رہتے، اور پھر ذرا بھی ثبوت ہو جاتا تو آپ

سب کالے پانی ہی جاتے، بلکہ پھانسی پاتے۔ انھوں نے جو سبز باغ دکھایا تو وہ بے چارے کانپ اٹھے، اور ان کے ہاتھ جوڑے کر واہ استاد کیا جھانسا دیا۔ بایاں قدم لے آپ کا شاباش! ع۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند،، خیر تھوڑے عرصہ میں لوگوں نے تجہیز و تکفین کی فکر کی۔ اور جنازے قبرستان لے گئے۔ یہاں خوجی بھی دس پانچ قدم ساتھ گئے اور الٹے پاؤں واپس آئے۔

آزاد : اب یہ غل کہاں ہوتا ہے۔

خوجی : غل! غل کیسا؟

آزاد : ذرا کان لگا کر سنیے۔ اُف اوہ! بڑا غل مچ رہا ہے۔

خوجی : ہاں ہاں ہم نے بھی سنا۔ بی بھٹیاری! ذرا سننا تو لپک کے۔ دیکھ نہ آؤ۔

بھٹیاری : (گئی اور واپس آکر کہا) وہاں بھی اس موئی شراب ہی کا ذکر ہے۔ اس کے ہاتھوں سب بھلے مانس بک گئے ہیں۔ وہاں چار پانچ آدمیوں پر شیطان سوار ہوا تو کئی بوتلیں شراب کی خالی کر دیں۔ بڑی دیر تک ہو حق رہا۔ آپس میں کشتیاں بھی خوب ہوئیں۔ ایک نے دوسرے کو مارا۔ دوسرے نے تیسرے کو چپتیایا۔ آخر کار نوبت بانیجا رسید، کہ دو ایک کا سر پھوٹ گیا، اور ایک صاحب کے دماغ پر ایسی گرمی چڑھ گئی کہ بدحواس ہو گئے، اور بے اختیار ہو کر تڑپنے لگے۔ اب سنیے کہ وہاں سب کے سب شرابی، کوئی رُو رہا ہے، کوئی سر پھوڑتا ہے، کوئی سر کے زخم کو دھو رہا ہے، کوئی غین پڑا ہے۔ کوئی حیرت میں دیوار پکڑ کر کھڑا ہے، اور وہ بے چارہ سسک رہا ہے۔ کس نے پرسد۔ اس پر ایک شخص کا جو وہاں گذر ہوا تو اس نے رحم کر کے ایک حکیم صاحب کو بلایا۔ حکیم صاحب متشرع آدمی۔ وہاں جو گئے تو چلّا اُٹھے کہ شراب، شراب، بو ہے شراب، کیا یہ لوگ شراب پیے ہیں؟ کہا کہ جی ہاں، سب شرابی ہیں۔ اور اس وقت ایک سسک رہا ہے۔ اس کا علاج کیجیے۔ بڑی مصیبت میں ہے۔ بے چارہ مر ہی جائے گا۔ خیر حکیم صاحب نے نبض دیکھی، اور کہا کہ نبض میں انتہا کی سُرعت ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ اچھا۔ کاہو ماتھے پر ملو، اور استفراغ کراؤ۔ اس کے بعد نسخہ لکھا اور کہا جلد پلوائیے، ورنہ بُرا حال ہو جائے گا۔ اور یہ مر ہی جائیں گے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک آواز آئی یا معبود! حق حق،

آزاد : یہ کون بولا بھئی۔ کیا یہ بھی کوئی شرابی ہے؟ خدا ہی خیر کرے۔

بھٹیاری : اے نہیں۔ اب کیا شرابی ہی شرابی چوطرفہ نظر آئیں گے۔ یہ ایک رئیس کی لڑکی ہے۔ اس پر ایک پریت آتا ہے، اور وہ اس بے چاری کو ستاتا ہے۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ بیٹھتی ہے،

اور اس قدر چلاتی ہے کہ اُف، کان پڑی آواز کا سُننا مشکل ہے، اور ذرا سی لڑکی لیکن اس درجہ زور آور ہو گئی ہے کہ مردوں کے کان کاٹتی ہے۔

آزاد : اوہ جی یہ باتیں کسی گنوار سے کہیے۔ ہم نہ مانیں گے، واہمہ خلاق ہے۔ واہمے کو خدا نے وہ قوت عطا کی ہے کہ صورت اور لحن، اور جسم اور جوارح، قائم کر دے۔ باقی سب ڈھکوسلا ہے۔

بھٹیاری : اے واہ ڈھکوسلا کیسا۔ آپ سُنیئے تو ذری۔ اس لڑکی کا بھائی آگرہ میں تھا، اور وہاں سے پانچ سو روپیہ اپنے باپ کی کسی تھیلی سے چورا کر لے آیا تھا۔ یہاں جو آیا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ کیوں چور چوری کر کے آیا ہے، اور باتیں بناتا ہے۔ پانچ سو روپیہ لے کر بھاگ آیا ہے۔ خبردار چوری کر کے یہاں نہ آنا۔ اس لڑکے نے گڑگڑا کر کہا کہ ہائیں! میں نے تو تجھ سے چوری سے کہا تھا۔ خفیہ طور پر، اور تو نے الم نشرح کر دیا۔

آزاد : تو صاف تو ہے۔ اب اس میں مین میکھ کا ہے کی ہے۔ معلوم ہو گیا۔ کہ جب یہ لڑکا اپنے باپ کے پاس سے واپس آیا تو اس نے اپنی بہن سے کہہ دیا، کہ میں پانچ سو روپیہ لے کر آیا ہوں۔ اس نے پریت کی حالت میں بک دیا کہ مجھے معلوم ہو گیا۔ گویا ان کے سر پر جو پریت ہیں۔ وہ عالم الغیب تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔

بھٹیاری : اے ہے آپ تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔

آزاد : خدا واسطے کو مان لیں۔ کیا زبردستی ہے۔ مانیں کیوں کر جو بات ماننے کی ہو تو مانیں، یا یوں ہی مان لیں۔ اچھا ماننا ہے ہونھ۔ معقول۔

بھٹیاری : بھلا شعر یں اس کو کہاں سے یاد ہیں۔

آزاد : اب تم ایمان سے کہو کہ تم کو شعر یاد ہے یا نہیں؟

بھٹیاری : ہاں کیوں نہیں:

محفلِ راجہ میں پکھراج پری آتی ہے ۔۔۔ سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

آزاد : چہ خوش۔ چرا نباشد۔ تم کو تو شعر یاد ہوں، اور کسی کو نہ یاد ہوں۔

بھٹیاری : یہ بھوت پریت کی سب واہیات باتیں مشہور ہو جایا کرتی ہیں۔ جی میں بھی نہیں مانتی وانتی۔ رہا یہ تو سچ ہی سچ ہے۔ میں تو اپنی آنکھوں دیکھ آئی ہوں نہ مانوں کیسے بھلا۔

میاں آزاد کو خوجی نے ٹھنڈائی پلائی تو تھوڑی دیر میں ذرا ان کی آنکھ کھلی۔ جان میں جان آئی اور اشتہا معلوم ہوئی۔ میاں خوجی نے بھٹیاری سے کھچڑی پکوائی، اور میاں آزاد کو کھلوائی،

لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں کھچڑی نے وہ تبخیر کی کہ الاماں! العطش العطش۔ پیاس پیاس۔ پانی لاؤ۔ خوجی سمجھ گئے کہ مونگ کی بھونی کھچڑی نے بڑی تبخیر کی۔ آلو کا آب زلال دیا۔ پھر کبھی کبھی برف کا ٹکڑا مُنھ میں رکھا۔ بارے خدا خدا کر کے ذرا میاں آزاد کی آنکھ لگی، تو خوجی چلے سٹر گشت کو۔ چلتے چلتے ایک محلے میں پہنچے اور وہاں گھانس چکانے لگے۔

خوجی : اس گٹھے کا کیا لوگی؟

گھسیاری : دو آنے۔

خوجی : ہشت۔

گھسیاری : دھشت۔

خوجی : نہ ہوئی قرولی ورنہ پیٹ چاک کر ڈالتا۔

اس پر گھسیاری نے گٹھا ان پر پھینکا، اور یہ بےچارے اس گٹھے کے بوجھ سے دھم سے زمین پر آرہے اور بالکل تپ ہی گئے۔ نکلنا مشکل ہوگیا، اور لگے غُل مچانے۔ او گیدی! نہ ہوا قرا بیچہ نہیں تو بتا دیتا۔ قلعی کھل جاتی ساری۔ اچھے اچھے ڈاکو میرا لوہا مانتے ہیں۔ ایک ڈاکو نہیں، پچاسوں کو ہم نے چپٹر غٹو کیا ہے۔ لو گھسیارن اور ہم سے لڑے۔ اب اٹھاتی ہے گٹھ یا نہیں۔ آن کر قرولی بھونک دواج۔

لوگوں نے گٹھا اٹھایا، اور میاں خوجی ہزار خرابی نکلے تو گرد و برد۔ ڈاڑھی مونچھ خاک۔ لت پت بالکل۔ ہات ترے کی گھسیارن تک سے جیت نہ سکے۔

میاں آزاد کی آنکھیں ابھی تک جل رہی ہیں۔ ہونٹھ کانٹا سا بالکل خشک۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں۔ اٹھے اور تیوڑ کھا کر دھم سے گرے۔ گرے اور غش آگیا۔ کرب انتہا کا۔ ضعف اس قدر کہ معاذ اللہ غلبۂ صفرا سے ناک میں دم تھا۔ آب زلال، آلو بخارا پیتے جاتے تھے، اور پے در پے استفراغ کرتے جاتے تھے۔ ماتھا گرم۔ ہاتھ اس قدر گنگنے مگر پاؤں بالکل سرد۔ پھر میاں خوجی نے سائیسوں کو حکم دیا کہ پاؤں میں نمک ملو اور نمک مل مل کر تلوے سہلاؤ۔ کھیرا برابر سونگھاتے جاؤ۔ اور آب آلو شام تک پلاتے جاؤ۔ جب شام تک آرام نہ ہوا، بلکہ تشنگی کی شدت اور تپ کی حدت نے میاں آزاد کو اور بھی بےچین کر دیا۔ تو میاں خوجی بھی گھبرا گئے۔ سوچے کہ اب بلا مدد طبیب کارروائی محال ہے، اور مرض طول کھینچتا جاتا ہے۔ بی بھٹیاری سے پوچھا کہ خدا کے لیے سچ سچ بتاؤ کہ کوئی طبیب بھی یہاں ہے اس نے

کہا یہاں حکیم نہ طبیب، مگر ہاں ایک بوڑھے حکیم ہیں جنھوں نے دکن میں طب کی تعلیم پائی۔ اب وہ تو مطب تو نہیں کرتے، لیکن مروت میں ادھر اُدھر علاج کرتے ہیں کہیے ان کو بلا لاؤں۔ لیکن اتنا سوچ لیجیے کہ ان کی تسلیم و تکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیے گا۔ وہ بڑے چھلّے اور تیکھے آدمی ہیں۔ خوجی نے کہا ہم اس قدر خوشامد کریں گے کہ وہ بھی خوش ہو جائیں۔ بی بھٹیاری نے جا کر حکیم صاحب سے عرض کیا کہ سرا میں ایک مسلمان آئے ہیں۔ میاں مسافر ہیں۔ بے چارے پردیس کا واسطہ جان نہ پہچان کسی سے، اور تین دن سے بخار میں تڑپ رہے ہیں۔ ذرا چین نہیں آتا۔ اگر آپ چلے چلیں تو وہ بچ جائیں نہیں تو خیر نہیں ہے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

حکیم صاحب: ہم بخیر یادِ الٰہی اور کچھ نہیں کرتے، لیکن اگر کسی بندۂ خدا کی ہمارے سبب سے جان بچے تو ہمیں دریغ نہیں۔ الّا صورت یہ ہے کہ کوئی شریف زادہ بلانے آتا تو مضائقہ نہ تھا۔ تمھارے بلانے سے ہم نہ چلیں گے۔ ان کے ساتھ کوئی ہے، یا بالکل یک و تنہا بہ یک بینی دو گوش آئے ہیں؟

بھٹیاری: کوئی بھی ساتھ نہیں ہے۔ ایک موا ایفیمی ہے، اس نے اور بھی الم غلم دے دے کر مار ڈالا۔ اب وہ بالکل ہلکان ہو گئے ہیں۔ بدن میں ذری سکت نہیں۔ آپ چلے چلتے تو احسان ہوتا۔ اور وہ اچھے ہو جاتے۔ ثواب کا کام ہے۔

حکیم صاحب: (استخارہ دیکھ کر) اچھا چلو فنس نکلواؤ جی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ غرض آپ فنس میں داخل چلے اور سرا میں دن سے پہنچے۔ بسم اللہ کہہ کر کہاروں نے فنس رکھی، اور حکیم صاحب جا کر میاں آزاد کے پلنگ کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے۔

آزاد: آداب بجا لاتا ہوں۔

حکیم صاحب: بندگی۔

خوجی: انتہا کا ضعف ہے حکیم صاحب! بات کرنے کی تاب نہیں، معاذ اللہ کا مقام ہے۔

حکیم صاحب: آپ کے کون ہیں؟

خوجی: جی حضور یہ بندہ زادہ ہے۔

آزاد: (دانت پیس کر خاموش ہو رہے)۔

خوجی: کل شام کو انھوں نے کچالو مانگے تھے۔ ان کے معالج نے تھوڑے سے دے دیے۔

حکیم صاحب: کیا؟ کچالو! عیاذاً باللہ، مار ہی ڈالا تھا۔ وہ معالج کون گدھا ہے؟

سائیس : یہی علاج کر رہا ہیں۔ رات کو آلو اور چٹنی گبڑ کر کھلائے دیں۔

خوجی : (جھلا کر) او گیدی نابکار۔ میرا نام ایسے موقع پر کیوں لیا مردود۔ نہ ہوئی قرولی پاس ورنہ مزہ چکھاتا۔ وہ تو پوچھتے ہیں کہ معالج کون گدھا تھا، اور تو نے چٹ میرا نام لے دیا۔ اتنا نہ سمجھا کہ گدھا پن کس کی طرف عاید ہوگا۔

حکیم صاحب : ایسا غضب نہ کیا کیجیے ورنہ ایک روز دھوکا کھائیے گا۔ غضب خدا کا تپ صفرادی، اور کچالو۔ معاذاللہ خیر، اور فرمائیے جو جو حماقتیں آپ سے سرزد ہوئی ہیں۔

خوجی : بس حماقت عمر بھر میں یہی ہوئی کہ آپ کو بُلوایا۔

آزاد : ہائیں ہائیں۔ سائیس سائیس۔ جا کر ان کو یہاں سے کھڑے کھڑے نکال دو۔ جناب حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں گستاخی کرتا ہے۔

خوجی : کیا مجال۔ مگر حکیم صاحب آپ نے اپنی بواسیر کا علاج نہ کیا۔

حکیم صاحب : (آزاد سے) حضرت آپ اپنے والد ماجد کو سمجھا دیجیے یہ اس وقت نشے کا استعمال کر کے آئے ہیں۔

آزاد : جناب یہ مردود ایک مسخرہ ہے بے حیا، بے شرم۔ نہ اس کو چپتیائے جانے کا خوف، نہ جوتیاں کھانے کا ڈر، آپ اس کے کہنے سُننے کا تو مطلق خیال ہی نہ کیجیے۔ یہ ملعون پٹے گا آج۔

خوجی : ارے! ہائیں! باپ کے حق میں یہ کلمۂ کفر۔

حکیم صاحب : (مسکرا کر) بڑے مسخر الدولہ بہادر ہیں۔ خیر دو گھڑی کی دل لگی ہی سہی۔ لیکن آپ اب قلم دوات کاغذ منگوائیں تو میں نسخہ لکھ دوں۔ اب دفعیۂ مرض میں زیادہ تساہل نہ چاہیے۔

قلم دوات کاغذ آیا۔ اور میاں خوجی کو حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا اور کہا کہ اسی وقت اس کا استعمال کیجیے، اور دے کر رخصت ہوئے۔ چلتے وقت میاں آزاد نے شکریۂ نوازش ادا کیا، اور کہا میں غریب الوطن مسافر ہوں۔ میرے حالِ زار پر رحم فرمائیے اور یہ نذر دو روپیہ قبول کیجیے۔ حکیم صاحب نے بکمال اخلاق کہا کہ یہ نہ ہونے کا۔ میں دوستانہ آیا ہوں۔ کچھ روپیہ کی طمع نہ تھی حاشا۔ کیا مجال۔ جب آپ صحت پائیں گے تو سمجھا جائے گا۔ ابھی آپ اس کا مطلق خیال نہ کیجیے گا۔ بلکہ اس ملک بیگانہ میں اگر آپ کو کچھ ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جو ہمارے شہر میں آئے ہیں تو تکلیف نہ اٹھائیں، اور اپنے گھر جا کر یہ نہ کہیں کہ کن پاجیوں کی بستی میں گئے تھے۔ لے اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔

حکیم صاحب تو رخصت - اور میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے عطار کی دکان سے ادویہ لائے - اب سُنیئے کہ نسخے میں لکھا تھا - روغنِ گُل آپ نے پڑھا، روغنِ گلِ، عطار سے پوچھا کیوں بھئی مٹی کا تیل کہاں ملے گا - اس نے کہا مارواری کی دُکان پر - وہاں سے آپ کروسین آئیل یعنی مٹی کا تیل جو بتیوں میں، جلاتے ہیں اٹھا لائے - خیر دوا بھگوئی اور پلائی تو مٹی کے تیل کی بدبو آئی - آزاد نے کہا یہ بدبو کیسی ہے - اُف دماغ پراگندہ ہوگیا - تو میاں خوجی نے خوب ہی للکارا واہ بڑے نازک مزاج ہیں - آپ - آپ کو سب میں بدبو ہی آتی ہے - اب کوئی عطر پلائے آپ کو یا زعفران کا کھیت چرائے تو آپ خوش ہوں - لاحول ولا قوۃ، میاں آزاد کو جو اٹھوں نے ڈپٹا تو وہ خاموش ہو رہے، کہ بھئی ہم بیمار ہیں، اور یہ بیمار دار ہے - جو کہا دہی کریں گے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد طبیعت بے چین ہوئی، اور تپ کی وہ شدت کہ الاماں الحذر - میاں خوجی حکیم صاحب کے پاس دوڑے گئے -

حکیم صاحب : (ہنس کر) کہیئے آپ کا صاحبزادہ کیسا ہے ؟

خوجی : جی قبلہ نہایت ہی کرب ہے - اور کیوں نہ ہو پھر آپ جانئے کہ مٹی کا تیل کہاں تک کرب نہ کرے - وہ نفیس مزاج آدمی ٹھہرا -

حکیم صاحب : یہ مٹی کا تیل کیسا - میں کچھ سمجھا نہیں -

خوجی : جی ہاں آپ کاہے کو سمجھنے لگے - آپ تو بچے ہیں - روغنِ گل لکھ آئے اور اب آپ الٹا مجھی کو ڈانٹتے ہیں - خیر صاحب حکیم ہیں آپ -

حکیم صاحب : لاحول ولا قوۃ - کیا غضب کیا - انتہا کے احمق ہو کیسے جانگلوؤں سے سابقہ پڑا ہے - توبہ ہی بھلی - اور سنیئے ہم نے لکھا روغن گل - آپ مٹی کا تیل دے آئے - معلوم ہوتا ہے - کہ یہ کوئی امیرزادہ ہے - اور آپ کوئی اٹھائی گیرے، اُچکے ہیں - آپ نے تاکا ہے - رات کو کپا لو کھلا دیے - آج مٹی کا تیل پلا دیا - اسی طرح کسی دن زہر دے دیجئے گا - واللہ اس وقت اگر میرے مکان پر آپ نہ آئے ہوتے تو کھڑے کھڑے نکلوا دیتا -

خوجی : ع - او خویشتن گم ست کرا رہبری کند ،، آپ کے حواس تو ٹھکانے ہیں ہی نہیں - آپ سوچیے تو کہ آپ فرماتے کیا ہیں - اگر میرے مکان پر نہ آئے ہوتے تو کھڑے کھڑے نکلوا دیتا معقول، اس کے معنی کیا ہوئے - آپ کے مکان پر نہ آیا ہوتا تو آپ نکلوا کہاں سے دیتے - فصد کھلوائیے فصد، پہلے اپنا علاج کیجیے - پھر معالج بنیے (پاؤں پر ٹوپی رکھ کر) معاف کیجیے گا - ع - کرمہائے تو مارا کرد گستاخ -

حکیم صاحب : بھئی عجب رنگ کا آدمی ہے۔ بہر د پیا۔ تو اب یہ نسخہ لو اور پلو اد وجا کر۔

میاں خوجی نے نسخہ لیا اور عطار کی دکان سے ادویہ لے کر آتے اور آزاد کو دوا پلائی مگر تسکین نہ ہوئی، تو شام کو آزاد ڈاکٹر کی تلاش کرنے لگے۔

خوجی : ڈاکٹروں کی دوا حار ہوتی ہے۔ تپ کا علاج ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ تشریح کے البتہ بادشاہ ہیں۔ سو خدا کے فضل سے آپ کو پھوڑا تو ہے نہیں، مگر آپ کی بیماری نے میرے کلیجے میں ناسور کر دیا۔

آزاد : یہ جہلا کا قول ہے کہ صرف تشریح ہی تشریح ڈاکٹر جانتے ہیں، اور تپ کا علاج نہیں کر سکتے۔ ابھی جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو لاؤ۔

بھٹیاری : ڈاکٹر تو یہاں ہے، مگر اس کے آنے سے حانسل (حاصل)۔

آزاد : اجی حانسل وانسل ہم نہیں جانتے ڈاکٹر کو بلاؤ تو اچھا ورنہ میں ابھی ابھی دم توڑوں گا۔

خوجی بے چارے پتہ پوچھتے ہوئے اسپتال چلے، مگر بعض لوگوں نے بہکا دیا تو حضرت نے تھانہ کی سڑک دھرلی۔ آدھ کوس زمین نگل گئے تو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسپتال پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ بہکانے والوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے آخر کار خدا خدا کر کے اسپتال پہنچے۔

خوجی : (ڈاکٹر سے) کیوں میاں ڈاکٹر کہاں ہیں اس وقت؟

ڈاکٹر : آپ اپنا مطلب کہیے۔

خوجی : اجی تو تم سے کیا واسطہ۔ عجب قطع کے آدمی ہو۔ دخل در معقولات دینا کیا معنی۔ تم بس اتنا بتا دو ڈاکٹر کہاں ہیں۔

ڈاکٹر : لاحول ولا قوۃ۔

خوجی : لاحول ولا قوۃ۔

ڈاکٹر : کوئی ہے نشتر لاؤ ہم ان کی خبریں گے۔

خوجی : کوئی ہے لٹھ لاؤ۔ ہم ان کی خبر لیں گے۔

کمپونڈر : اجی کیا بک بک لگائی ہے۔ یہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں میاں۔

خوجی : آداب عرض کرتا ہوں۔ ذرا سرا تک تشریف لے چلیے۔ لڑکا نصیب اعدا سخت علیل ہے۔ تکلیف تو ہو گی۔ مگر احسان اور اجر بھی ہو گا۔

ڈاکٹر : اچھا۔ محمد و۔ محمد و۔ مندیل لاؤ ہری۔ اور سفید چغہ ڈاکٹر صاحب چغہ وغیرہ بھڑکا کر چلے۔

سرا میں پہنچے۔ اور سرا میں پہنچتے ہی میاں آزاد کو دیکھا اور کہا کہ۔

ڈاکٹر : جبان دکھاؤ جبان۔

آزاد : (آزاد طنز کی راہ سے) بہت خوب لیجیے جُبان۔

ڈاکٹر : آنکھیں دکھاؤ۔

آزاد : الٰہی خیر ابھی آنکھیں دکھاؤں تو گھبرا کر بھاگو۔

ڈاکٹر : دل آنکھ دکھاؤ بات پیچھے کرو۔

خیر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا، اور دو روپیہ فیس کے لیے اور چمپت ہوئے۔ میاں آزاد نے چار گھنٹے ڈاکٹر صاحب کی دوا کی۔ مگر تشنگی کا غلبہ ہوتا گیا۔ ہر بن موسے العطش العطش کی آواز آنے لگی۔ اس دوا نے وہ حدت کی کہ الاماں۔ پانی، پانی، او خوجی پانی لا۔ ارے کمبخت کیا دشتِ کربلا ہے۔ ہائے ایک ایک قطرے کے لیے ترساتا ہے۔ خوجی بے چارے بھی گھبرا گئے کہ خدا ہی خیر کرے اس درجہ غلبۂ تشنگی ہے کہ الاماں۔ تھوڑا تھوڑا پانی دینا شروع کیا مگر میاں آزاد نے چپکے سے بھٹیاری کے ذریعہ سے ڈھائی سیر برف منگوائی اور رات بھر استعمال میں لائے، اس وقت تو تسلی ہوئی، مگر پھر اس کثرتِ برف سے جان عذاب میں ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں سرد، پیچش نے ناکوں دم کر دیا، اور پیٹ میں ورم ہونے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے میاں خوجی ایک بیدراج کو بلا لائے۔

بید : مہاراج! باداس دکھت ناہیں ہے۔

آزاد : میں تو پھنکا جاتا ہوں تم کہتے ہو جار نہیں آتا۔ کوئی دوا ایسی بتاؤ کہ سوزش کم ہو۔ احتراق اور التہاب اور سوزش نے جان عذاب میں کر دی۔

خوجی : بید جی کوئی جڑ بوٹی لاؤ۔ ہے یا نہیں ہے۔

بید : ہے سب کچھ۔ ہے کیا نہیں۔ پر نیو کھاونے والے اور کدر (قدر) کرنے والا چاہیے۔

الغرض بیدراج نے ایک گولی دی اور شہد کے ساتھ چٹا دی تھوڑی ہی دیر میں اجابت کی ضرورت ہوئی، اور آتے ہی پلنگ پر چاروں شانے چت گر گئے۔ میاں آزاد۔ میاں آزاد بھائی آزاد، ارے میاں آزاد ہوت! صدائے بر نخاست۔ میاں خوجی بہت ہی گھبرائے اور گھبرا کر چلے پھر بید کو بلانے، تو راہ میں ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر ملے۔ یہ انھیں کو گھیر گھار کر لائے۔ اُنھوں نے دو قطرے دوا کے ایک چھوٹی سی شیشی سے پانی میں ڈال دیے۔ اس کے پینے کے ایک آدھ گھنٹے کے بعد طبیعت بے چین ہونے لگی۔ تو اب جا کر حکیم صاحب کو بلا لائے۔ انھوں نے وہ نسخہ بدلا اور ایک اس کی جگہ

پر لکھا۔ اسی طرح بدلتے چلے گئے۔

میاں آزاد نے چھ سات روز کے عرصہ میں اتنے طبیب اور بید اور ڈاکٹر بدلے کہ اپنی مٹی ہی پلید کر دی۔ اس قدر طاقت بھی باقی نہ رہی کہ کھٹیا سے بلا مدد غیر کے اٹھ سکیں۔ دو چار آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا، تو بیٹھنا محال۔ بیٹھے تو تھوڑی ہی دیر میں تیور آنے لگے۔ تکیے کا سہارا ہو یا کوئی آدمی پیچھے بیٹھا رہا تو بھی بیٹھنا محال تھا۔ خوجی کی جان عذاب میں اور دونوں سائیسوں کا تو کھر کس ہی نکل گیا۔ بھٹیاری بڑی بھلی مانس تھی۔ اس نے بڑا ساتھ دیا۔ رات رات بھر میاں آزاد کے سرہانے بیٹھی رہی اور جس وقت جو کام اس کے لائق تجویز کیا گیا فوراً بجا لائی۔ ذرا عذر نہ کیا۔ میاں آزاد راتوں کو تڑپتے تھے، اور دن بھر روتے جاتے تھے کہ یہاں موت ہم کو کشاں کشاں کھینچ لائی۔ اور کیا شامت آئی کہ ہم یہاں آئے۔

خوجی: یہاں آنے سے کیا ہوا۔ کیا سرائے آپ کو ماندا کر دیا یا چھپر کھٹ بیماری کا گھر ہے۔ آخر کچھ معلوم تو ہو۔ اس بیماری کا سبب کچھ اور ہی ہے۔ کہیے بتا دوں؟ اس کے دو خاص سبب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اور آپ دونوں تین دن تک خوب بھیگے۔ لیکن فرق ہم میں اور آپ میں اس قدر تھا کہ ہم خالی چارپائی پر گرم کپڑے پہن کر سو رہتے تھے، اور آپ بھیگے ہوئے بستر پر ننگے پڑے رہتے تھے۔ ذرا سی لنگی باندھ لی، اور اوس میں سو رہے، یا بچھونا بالکل تر ہے، اور آپ اسی پر چار چار پہر تک لوٹا کیے۔ پھر آپ بیمار نہ ہوں تو کیا ہم ہوں۔ روز کہتا تھا کہ بھئی اُس میں سونا بُرا۔ گیلے بچھونے پر لیٹنا مضر صحت ہے، مگر آپ سنتے کس کی ہیں۔ اب بھگت رہے ہو، اور تمھارے ساتھ ہم بھی گرفتار بلا ہیں۔ تم کو کرب ہے یہاں سونا حرام۔ نیند برائے نام، راحت نہ آرام۔ سائیسوں کا ناک میں دم آگیا۔ ذرا چین نہیں۔ دن رات میں دو گھڑی سوئے بھی تو آپ نے للکارا کہ سالار بخش پاؤں دباؤ۔ نداری پنکھا ہلاؤ۔ میاں خوجی ادھر آؤ۔ بی بھٹیاری کو ابھی ابھی بلاؤ۔ یا خدا انتہا کی سب کو تکلیف ہے، اور یہ صرف آپ کے اوس میں سونے سے، بس اور کوئی وجہ نہیں، مگر آپ کے مزاج میں تو ضد اس قدر ہے کہ الاماں! ہاری جیتی کچھ مانتے ہی نہیں، اور وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ اپنے کو تو آپ جالینوس سمجھتے ہیں، اور باقی سب کو گوکھا گدھا۔ دنیا میں بس ایک آپ ہی بقراط ہیں۔ اب واسطے خدا کے ایک تو پانی اس قدر نہ پیجیے۔ دوسرے جو کہیں وہ مان لیجیے تیسرے ڈاکٹر ہو یا حکیم یا بید ایک کے سر ہو رہیے۔ یہ نہیں کہ صبح کو حکیم صاحب کی دوا، کھائی۔ ڈیڑھ سیر کا پیالہ بھر کر دوا پی، اور شام کو بید راج کی گولی استعمال میں لائے۔ آدھی

رات کو ڈاکٹر کی رائے کے مطابق سرپ لیمن پی لیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ اتنے بڑے لائق اور تعلیم یافتہ آدمی اور اس درجہ احمق۔ خدا کی مار۔ یار تحمّل اور ضبط تمھارے مزاج میں چھو نہیں گیا۔

بھٹیاری : اے تو تم بھی عجیب آدمی ہو۔ بھلا کوئی بیمار کو اور پھر ایسے بیمار کو للکارتا ہے۔ وہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب اُن باتوں کا بکھانتا کیا۔ جب اللہ کرے گا صحت پائیں گے تو خوب بیٹھ کر کہہ لینا۔ اس وقت ان کو تسلّی دو ان کی تشفی کرو۔ یہ نہیں کہ بُرا بھلا کہنے لگے، اور اُوس کی جو کہتے ہو تو میاں یہ تو عادت پر ہے۔ جیسی عادت ہو۔ ہم تو دس برس سے اوس ہی میں سوتے ہیں۔ کوئی آٹھ نو برس کے سن سے اُوس ہی میں سونے کے عادی ہیں ہم آج تک کوئی زکام بھی کبھی ہوا ہو تو قسم لو۔

خوجی : میاں آزاد۔ کچھ سمجھے بھی، یہ باتوں ہی باتوں میں کہہ گیا گئیں۔ انھوں نے کہا دس برس سے اوس میں سونے کے عادی ہیں۔ اور آٹھ برس کی عمر سے اوس ہی میں سویا کیے۔ آٹھ اور دس کے ہوئے کہو چالیس، اٹھارہ ہوئے۔ اب سمجھے۔ مطلب یہ کہ ابھی اٹھارھواں ہی سال ہے۔

آزاد : اُف اوہ! بھئی یہاں اس وقت روح پر صدمہ ہے۔ تمھیں دل لگی سوجھی ہے۔ یار انتہا کا کرب ہے۔ کسی نئے طبیب کو لاؤ۔ کہنا مانو۔ یا حُسن آرا کے پاس خط بھیجو کہ ہم کو یہاں آکر دیکھ جائیں۔ اب یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے اب زیست کی امید منقطع ہو گئی۔ اب مَرے بس۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ اس وقت سرا میں لیٹے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، کل پرسوں تک خواب میں ہوں گے۔ کون خواب؟ خواب دائمی، قبر ہوگی اور آزاد :

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا　　جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس　　ہم ہوں گے اور قبر کا کونا ہوگا

اللہ بس باقی ہوس۔ کُلّ مَنْ عَلَیْھَا فَان :

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید　　ز جامِ دہر می کُلّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

خوجی : افسوس ہے کہ آپ ہذیان بھی بکنے لگے۔ میں کہتا ہوں کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔

بھٹیاری : اے چپ بھی رہو۔ یہ کیا واہی تباہی بک بک لگائی ہے۔ آخر کچھ عقل بھی ہے مردوے سرسام کیا۔ خاصے بھلے چنگے ہیں۔ نہ سرسام ہے نہ درسام۔ ہاں میاں ذری بال کتروا ڈالو تھوڑے تھوڑے پٹے کٹ جائیں، تو گرمی چھنٹے۔

آزاد : یہ نہ ہونے کا۔ میں اپنے بالوں کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔

خوجی : چھیلا بہت دیکھے۔ مگر میاں آزاد کے سے رنگیلے کم۔ مر رہے ہیں، لیکن پٹے نہ کتروائیں گے۔
بھٹیاری : مر رہے ہو تم۔ کچھ سودائی سا معلوم ہوتا ہے، اور سنو ایک تو وہ بے چارے آپ حیران ہیں۔ دوسرے یہ ان کو اور دق کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے مر رہے ہو۔ کبھی للکارتا ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے۔ اے واہ اچھّے دوست ہو۔ گوں کے یار، تجھ پر علیؓ کی سنوار۔
آزاد : کئی بار تنقیہ جو ہوا تو اور بھی پریشان ہو گیا۔
خوجی : یہ تو قاعدہ ہی ہے۔
آزاد : اب ذرا طاقت باقی نہیں رہی۔
سائیس : حکیم تو لٹکائے رہتے ہیں۔
خوجی : او گیدی چُپ۔ تو کون بیچ میں بولنے والا، تو گھانس چھیلنی جانے یا حکمت جانے۔ آپ بھی بولے، اے تیری قدرت۔
آزاد : سچ تو کہتا ہے۔ اطّبائے یونانی کا مریض مہینوں میں کہیں چنگا ہوتا ہے۔ بحران اور توبہ اور تنقیہ اور مونگ کی کھچڑی دے دے کر مریض کو ادھ موا کر ڈالتے ہیں۔ معاذ اللہ! اور قدح کا قدح پیتے ہوئے اس کی روح پر صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر دو مہینے میں بھی کھٹیا چھوڑی تو سمجھیے کہ بڑا خوش نصیب تھا۔ عیاذاً باللہ۔ خدا نہ کرے کہ بھلے مانس اُن کے پالے پڑے، توبہ ہی بھلی۔
خوجی : جی ہاں جب ڈاکٹر نہ تھے تب تو سب مر ہی جاتے تھے نہ۔ ہونھ! سوائے دہی فضول بات کے اور کچھ نہیں۔
آزاد : جی بجا ہے۔ یہ کہتا کون ہے کہ اگر ڈاکٹر نہ ہوں تو کوئی مریض صحت ہی نہ پائے۔ مگر کیا گنوار ہمیشہ ماندگی میں مر ہی جاتے ہیں۔ وہ بخار میں برابر بھٹے کھاتے ہیں۔ لرزہ میں جھنری کی روٹی اڑاتے ہیں تو ہر عارضے میں مر ہی جایا کریں۔
خوجی : آپ کے حواس تو ٹھکانے ہی نہیں کہ بات کیجیے۔ آپ بحث کیا کرتے ہیں۔
آزاد : اجی چُپ بھی رہو۔ تم تو مغز کھا گئے۔ تشفی تسلی دینا درکنار، لگے اول جلول بکنے۔ اب ہمیں سونے دو، مگر اب ایک ہی کے سر ہو رہیں گے۔ دس دس طبیب نہ بدلیں گے۔ کان پکڑے، بس جو حماقت ہوئی وہ ہوئی، اب توبہ کی۔ پھر پایا اور سب اس کی عقل سے ہوا۔ میں تو ٹھہرا مریض اور علیل۔ میں کیا اور میری رائے کیا۔ علیل کی رائے علیل۔ تم کو روکنا لازم تھا۔ تم نے کچھ خیال ہی نہ کیا۔

بھٹیاری : ہاں یہ سچ ہے مگر میاں تمھارے مزاج میں بھی ضد بہت ہے۔ تم کسی کی مانتے ہی نہیں۔ جو دھن سمائی وہ سمائی، اب بھی یہ عادت چھوڑو۔ نہیں مہینوں پڑے رہو گے۔

خوجی : تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ اپنے کرایہ سے مطلب ہے، یا کچھ اور۔

بھٹیاری : واہ اللہ کرے یہ اچھے ہو جائیں۔ کرایہ بہت مل رہے گا جی۔

اتنے میں میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی، سائیس نے پنکھا جھلنا شروع کیا۔ میاں خوجی بھی ذرا اونگھنے لگے تھے، کہ ایک شخص نے ان کو جگایا اور کہا کہ میں مسافر ہوں، آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا تخلیے میں آیئے۔ میاں خوجی پہلے تو ڈرے کہ بھئی خدا ہی خیر کرے، یہ کون شخص ہے، مگر جب بغور دیکھا تو ان کی خاصی جوڑ تھی۔ وہ بھی پستہ قامت دبلے پتلے آدمی۔ یہ بھی۔ اور لطف یہ کہ وہ بھی چانڈو باز یہ بھی، میاں خوجی نے اٹھ کر کہا۔

خوجی: کہیے کہیے۔ فرمایئے۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔

مسافر: ہونھ۔ پہچاننا کیسا۔ آپ نے ہمیں دیکھا کب تھا۔ جو پہچانتے۔

خوجی : اچھا تو آپ پلے کیوں پڑتے ہیں، دور ہی سے کہیے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ آپ کو ہم سے کام کیا ہے۔ ہم اس وقت خود ہی مصیبت میں ہیں۔

مسافر : میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی : کیوں؟ آپ اپنا مطلب کہیے۔ یہاں تو آزاد وازاد کوئی بھی نہیں ہیں۔ آپ اپنا خاص مطلب کہیے، کیا کوئی آپ کا کچھ قرض چاہتا ہے۔

مسافر : جی ہاں ایسا ہی تو بندہ دھنا سیٹھ ہے نہ، کہ سب کو قرض دیتا پھرے۔ اجی آزاد ہمارے بہنوئی ہیں۔ ہماری بہن نے بھیجا ہے، کہ دیکھو کہاں ہیں۔ سو ہم کو یہاں پتا لگا۔

خوجی : بہنوئی؟ ان کی شادی تو ہوئی نہیں، بہنوئی کیوں کر بن گئے۔

مسافر: معقول، آپ بھی کتنے دشمنِ عقل ہیں۔ بھلا کوئی بے وجہ کسی کو بھی اپنا بہنوئی بنائے گا۔ اتنا نہیں سمجھتے۔ لاحول ولا قوۃ۔

خوجی : (ہنس کر) بھلا میاں آزاد کی بیوی کہاں ہیں؟ ہم کو تو دکھا دیجیے، ہم سے کیا پردہ ہے۔

مسافر : کہاں ہیں؟ ہیں کہاں، اجی اسی سرا کے اس کونے میں، وہ سامنے والے گوشہ محل میں، چلو دکھا دیں۔ تم سے کیا چوری ہے۔ تم تو گھر کے ہو۔ چلو پھر چلو نہ۔

خوجی : اچھا ٹھہریے چلتا ہوں۔

یہ کہہ کر میاں خوجی کوٹھری کے اندر گئے۔ بالوں میں تیل ڈالا۔ سفید کپڑے پہنے۔ لال پھندنے دار ٹوپی دی۔ میاں آزاد کا ایک خاکی فراک کوٹ ڈانٹا، اور جب خوب بن ٹھن چکے، تو آئینہ لے کر صورت دیکھنے لگے۔ بس غضب ہی ہو گیا۔ آئینہ دیکھتے ہی ان کی وہ کیفیت ہوئی جو طاؤس کی ہوتی ہے۔ کہ اپنے نقش ونگار دیکھتے ہی پھڑک گیا، مگر ہائے زشت پر نظر پڑی اور دل گڑھے میں۔ ڈاڑھی کے بال اونچے نیچے پائے، مونچھیں گری پڑی۔ آپ نے قینچی لے کر بال برابر کرنا شروع کیے، تیز قینچی ایک دفعہ ہی ایک طرف کی مونچھ بالکل اڑ گئی۔ جلِ جلالہٗ، چلیے چار ابرو کا صفایا تھا۔ خود کردہ را چہ علاج خیر، قہر درویش برجان درویش کہہ کر چلے۔ مسافر اور خوجی ساتھ ساتھ گوش محل کی طرف روانہ ہوئے۔

مسافر نے تو خوجی کو پہلے ہی دیکھا تھا، مگر اور ہی قطع میں، اور اب بھی دیکھا تو اور ہی وضع میں۔ سمجھا کہ آدمی نرے چونچ ہیں، اور ایک طرف مونچھ جو صاف کتری نظر آئی تو اس کو بے اختیار ہنسی آئی۔ مگر آدمی تھا چست وچالاک، ضبط کیے رہا، اور گوش محل کے اندر میاں خوجی کو لے گیا، تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک عورت نہایت ہی زرق برق لباس میں ملبوس، عطر میں بسی ہوئی، چارپائی پر سو رہی ہے۔ زُلف چلیپا بل کھاتی، اور کالی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی، گردن کے ارد گرد پڑی ہوئی ہے، اور دوپٹا جو کھسک گیا ہے تو گردن خوارۂ نور نظر آتی ہے۔ صورت تو انھوں نے دیکھی نہیں۔ کیونکہ وہ کروٹ سے سو رہی تھی۔ مگر گوری گوری گردن دیکھ لی تو لوٹ ہو گئے۔ مسافر تاڑ گیا، مگر خاموش، بلکہ اس نے ان کو موقع دیا کہ بغور دیکھیں، اور خود کسی کام کے لیے چلا گیا۔ اتنے میں اُس گل بدن نے کروٹ جو بدلی تو میاں خوجی کو للکارا۔

گل بدن: تم کون یہاں کیا کام؟

خوجی: (کانپ کر) آپ کے بھائی پکڑ لائے۔

گل بدن: قصور؟

خوجی: ناکردہ گناہ۔

گل بدن: بے وجہ بھی کوئی کسی کو گرفتار کرتا ہے۔

خوجی: میری خطا نہیں معاف کیجیے۔

گل بدن: اچھا ذرا پنکھا تو جھلو، مگر آنکھ بند کر کے، خبردار مجھے نہ دیکھنا، میں پردہ نشین ہوں۔

خوجی: (پنکھا لے کر جھلنے لگے) اور اس گل بدن نے عمداً آنکھ بند کر لی۔ اتنے میں اس گل بدن نے تڑسے آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ میاں خوجی پنکھا تو قلی کی طرح جھل رہے ہیں، مگر دیدے پھاڑ پھاڑ

کر نظارہ بازی میں بھی مصروف ہیں۔ اس کا آنکھیں کھولنا تھا کہ میاں خوجی نے مارے ڈر کے آنکھیں خوب زور سے بند کر لیں۔ اور۔ ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ،، جان سن سے نکل گئی۔

گل بدن : کیوں جی یہ گھورنا کیا معنی؟ اب بتائیے کیا سزا دوں۔

خوجی : اتفاق سے آنکھ کھل گئی۔

گل بدن : واہ اچھا اتفاق ہے۔ اور جو اتفاق سے ہمارا ابھی ہاتھ اٹھ جائے تو پھر؟

خوجی : جو مرضی۔

گل بدن : میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی : (ڈرتے ہوئے) بی اُنھوں نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ جو کوئی میرا حال پُوچھے تو صاف صاف پتہ نہ دینا۔ کہ یہاں سرا میں ہے۔

گل بدن : بھلا کہاں جانے کا قصد ہے؟

خوجی : اُنھوں نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ہمارے عزم کا حال دریافت کرے تو اس سے یہ نہ کہنا کہ روم جانے والے ہیں۔

مسافر : ہم بھی آن پہنچے۔ ان سے کچھ باتیں ہوئیں۔

خوجی : میں کس لائق ہوں۔

مسافر : واہ یہ نہ کہیے آپ بڑے نالائق ہیں۔

گل بدن : یہ کہتے ہیں کہ میاں آزاد روم جانے والے ہیں۔ اور یہاں سرا میں فروکش ہیں۔

مسافر : ہوں گے۔ اس وقت اِنھیں کھانا وانا تو کھلاؤ۔

گل بدن : یہ آپ کی ایک مُوچھ کیا دیمک چاٹ گئی؟

خوجی : بیٹھوں تو بتاؤں۔

مسافر : بیٹھیے نہ۔ بسم اللہ تشریف رکھیے۔

میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو خوجی ندارد۔ ایک ایک سے پُوچھتے ہیں کہ خوجی کدھر گئے بھئی۔ آسمان کھا گیا یا زمین چٹ کر گئی۔ آخر یہ چل کہاں دیے۔ سوچے کہ آدمی ہیں افیونی۔ افیم کی چاٹ میں دل اُچاٹ ہوا ہو گا۔ پہنچے کسی دکان پر گھڑی بھر ہو گئی۔ دو گھڑی گذری، گھنٹوں ہو گئے مگر خوجی نہ آئے نہ آئے تب تو اُن کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ سمجھے کہ بھلے آدمی ہیں، اور کمزور، اور کمزور مار کھانے کی نشانی اور اس پر لطف یہ کہ کوتاہ گردن، تنگ پیشانی۔ ایک کڑوا کریلا دوسرے نیم

چڑھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے ٹرائے ہوں گے اس نے گردن ناپی ہے۔ اب جب تک ہم نہ جائیں گے۔ وہ سڑک ہی پر لوٹ لگائیں گے۔ اس میں چاہے دو دن ہو جائیں وہ سڑک کو نہ چھوڑیں گے، دھن کے پکے ہیں۔ ہم جانے سے رہے، یہاں اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں۔ کھٹیا پر لدے لدے کہاں شہر بھر میں ہنڈیں۔ دونوں سائیسوں کو بھیجا کہ جاکر ذرا دیکھو تو میاں خوجی کو ہوا کیا۔ آخر چمپت کہاں ہو گئے ایک نے ہنس کر کہا کہ ننھے سے آدمی ہیں کہیں بھیڑیا دیڑیا اٹھالے گیا ہوگا۔ دوسرا بولا آج ہوا۔ زناٹے کی چلتی ہے معلوم ہوتا ہے کسی طرف اڑ گئے۔ اب ہوا میں پتا تے پھرتے ہوں گے۔ یوں جانے کو کہیے جائیں مگر ان کی کھوج خبر نہ ملے گی۔ اچھا ہم ہوئے آتے ہیں، شاید آپ سمجھیں کہ یہ دونوں کام چور، نوالہ حاضر ہیں۔

اتنے میں انھوں نے بھٹیاری سے پوچھا کہ کیوں بی بھٹیاری، تمھیں کچھ معلوم ہے، بھلا خوجی کہاں چلے گئے؟ اس نے کہا میاں میں اب کیا بتاؤں، کہ کہاں غائب غلہ ہو گئے۔ مل اتنا جانتی ہوں کہ انھیں کا سا کوئی مردوا آیا تھا۔ دبلا پتلا گلا ہوا آدمی۔ چہرے کی رنگت بالکل زرد، ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور پستہ قد بھی تھا۔ اس نے ان سے کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ تم کو بار بار پوچھتا تھا۔ مگر باتوں سے ایسا پایا جاتا تھا کہ جیسے خوجی اور اس سے کبھی پہلے کی ملاقات نہ تھی۔ مگر تمھارا نام کئی بار لیا، اور پوچھا کہ کہاں ہیں۔ پھر کچھ کان میں پھسپھسایا تو میاں خوجی کوٹھری میں گئے، اور وہاں خوب بنے ٹھنے، لال ٹوپی دی، اور تمھاری جریب ہاتھ میں لی۔ بال سنوارے پٹیاں جمائے۔ اور بڑے ٹھسے سے اکڑتے اور گنڈے جھاڑتے ہوئے، اس کے ساتھ ہو لیے، مگر (ہنستے ہوئے) اُف مارے ہنسی کے بات اس وقت نہیں کی جاتی تھی۔ کوٹھری کے باہر جب آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک طرف کی مونچھ بالکل صاف۔ داہنی طرف تو تھی۔ مونچھ کیا تروا ہے کا ترواہا تھا۔ مگر بائیں طرف بالکل صفاچٹ۔ مجھے اتنی ہنسی آئی کہ لوٹنے لگے۔ جی میں تو آئی کہ تم کو جگا دوں۔ مگر اجنبی آدمی کا ساتھ تھا تو کہنا مناسب نہ سمجھی۔

آزاد: (متحیر ہو کر) کون تھا بھئی۔ دبلا پتلا آدمی زرد رو، مجھے جانتا ہے، مگر خوجی کو نہیں پہچانتا۔ کون شخص تھا۔ اہاہا، تاڑ گیا ہو نہ ہو۔

یار نہیں، وہ یہاں کہاں، پھر آخر یہ کون آدمی تھا (دل میں سوچے) کہ اُف او! ارے کہیں نواب نے تو کوئی آدمی نہیں دوڑا دیا۔ غضب کا سامنا ہے۔ اب دھر لیے گئے۔ بھاگ نک کی سکت نہیں۔ کروں تو کیا کروں، کچھ کرتے دھرتے بن ہی نہیں پڑتی۔ یا شاید پیاری حسن آرا نے

آدمی بھیجا ہو کہ آزاد کی خبر لاؤ۔ اُہو ہو ہو۔ میں سمجھا کہ سپہر آرا نے بہن کو طعنے دے دے کر مجبور کیا ہوگا کہ ہم کو واپس بلوائیں۔ بس یہی بات ہے مگر۔ ع "دل کو مرے آفرین یہ جوڑتا" میں اور ٹرکی جانے سے باز رہوں، کیا مجال۔ جاؤں اور پھر جاؤں، اور بیچ کھیت جاؤں۔ جاؤں اور ڈنکے کی چوٹ جاؤں، واپس جانے میں ہماری کرکری ہوگی۔ اب بلا فتح کیے ہوئے، میاں آزاد اپنے معشوق پری پیکر کو صورت دکھائیں تو شریف نہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ دیکھیں کون آدمی آیا ہے، جو آیا ہے کہیں جلد صورت دکھائے۔

میاں آزاد یہ خیالی پلاؤ پکا رہے تھے، مگر یہ خبر ہی نہ تھی کہ نواب کا آدمی نہ حُسن آرا کا قاصد ہے۔ وہ کوئی اور ہی ذات شریف ہیں۔ بڑی دیر تک میاں آزاد نے بے چینی میں وقت کاٹا۔ طرح طرح کے خیال ان کے دل میں آتے تھے، مگر ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں پاتے تھے۔ کہ آخر کون بزرگوار تشریف لائے تھے۔ کس سے کہنے آئے تھے۔ خوجی کو کیوں پکڑے گئے۔ اور اب تک خوجی غائب کہاں رہے۔ کھٹ ہوا اور انھوں نے پکارا خوجی۔ دھم ہوا، اور پوچھا آئے۔ ذرا کسی کی آہٹ پائی، اور چونک اٹھے۔ میاں خوجی! مگر صدائے برنخاست۔ خوجی کہیں اور ہی ہیں۔ وہ ایک مہ وش کے سرہانے کھڑے ہوئے پنکھا جھل رہے ہیں۔ اتنے میں شام ہو گئی، اور خوجی کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ تب تو میاں آزاد بس بے قرار ہوئے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ بھٹیاری سے کہا کہ چاہے جو ہو خوجی کو لاؤ۔ کسی سے پوچھو پاچھو۔ آخر گئے کہاں۔ ذرا جلد آنا۔ اس نے کہا میاں اب جاتی ہوں، حد بھر کوشش کروں گی۔ پھر اب آئیں نہ آئیں، یہ اُن کو اختیار ہے۔ جانا میرا کام ہے۔ آنا نہ آنا اُن کے ہاتھ۔ ملنا نہ ملنا اتفاق کی بات ہے۔

خیر وہ تو چلیں میاں خوجی کی تلاش میں۔ اور ادھر خوجی صاحب اور وہ حسین مہ جبین، اور وہ مسافر دستر خوان پر ہتھے لگانے لگے۔ خوجی کئی دن کے بھوکے تو تھے ہی، انھوں نے خوب ہتھے لگائے۔ کھاتے جائیں، اور تعریفیں کرتے جائیں کہ اہو ہو سو! واہ واہ واہ! کیا لذیذ کھانا پکا ہے۔ تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ ایک لقمہ کھایا اور کئی منٹ تک تعریف کی۔ یہ تو تعریف ہی کرتے رہے، اُدھر میاں مسافر نے دستر خوان صاف کر دیا۔ ارے کر کے رہ گئے۔ دل میں پچھتاتے کہ یہ ہم سے کیا حماقت ہوئی۔ پہلے پہلے خوب پیٹ بھر کے کھا لیتے، پھر دن بھر، رات بھر، چاہے تعریف ہی کیا کرتے۔ اُس مہ پارہ نے پوچھا کہ کچھ اور لاؤں؟ شرمائیے گا نہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ میاں خوجی کہنے ہی کو تھے کہ جی ہاں منگوائیے، کہ اتنے میں مسافر نے جو خوب چھک کر کھا تا چکھ چکے تھے کہا کہ نہیں جی اب کیا ہیضہ کراؤ گی خوب کھانا کھایا۔ اب ہضم نہ ہوگا۔ خوجی یہ گرما گرم فقرہ سنتے ہی جل بھن کر خاک ہو گئے۔ مگر کہیں تو کیا کہیں۔ بولے کہ اچھا الامر فوق الادب لائیے۔ اس پر مسافر نے جو انتہا کا شریر تھا رکا بیاں۔

اٹھائیں اور دسترخوان ہٹا دیا، اور خوجی بے چارے مُنھ ہی تاک کر رہ گئے۔ ارے جی میں تو آیا کہ مسافر پر برس پڑیں، مگر خیر گذری کہ قرولی پاس نہ تھی ورنہ اس گیدی سے سمجھ لیتے۔ شکر ہے کہ قرولی کبھی پاس ہی نہ ہوتی، تھی ورنہ خدا جانے کتنے آدمیوں کو شہید کر چکے ہوتے۔

خیر کھانا دانا کھا کر بیٹھے تو مسافر نے کہا: ارے لاحول ولا۔ پاندان میں تو دو ہی گلوریاں ہیں۔ ایک اس گلبدن کو دی، دوسری اپنے منھ میں رکھ لی۔ خوجی پھر مُنھ دیکھ کر رہ گئے۔ تب تو آپ بہت ہی جھلائے۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر خیر سے قرولی نہ پائی۔ ورنہ گیدی کا خون ہی پی لیتے۔ اس کے بعد مسافر نے ایک اور حرکت کی۔ ان سے کہا کہ، میاں ہوت، میاں ہوت، ارے بھائی تم سے کہتے ہیں تم سے اِدھر اُدھر۔ خوجی تو جلے بھُنے بیٹھے ہی تھے انھوں نے گھور کر دیکھا اور کہا کہ کس سے کہتے ہو جی۔ اور کس سے۔ اور سنیے کا کس سے کی ایک ہی کہی۔ کہنے لگے کس سے کہتا ہے۔ تجھ سے کہتے ہیں، تجھ سے، اور کس سے کہتے ہیں۔ ذرا پلنگ سے اُتر کر بیٹھو۔ کیا مزے سے برابر جا کر ڈٹ گئے۔ اُتر نیچے۔ اُترا کر میں پہنچوں۔ اور دیکھیے گا۔ آپ پلنگ پر چڑھ کر بیٹھے ہیں۔ معقول، یہ دعویٰ، اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتا۔

خوجی : چُپ گیدی، نہ ہوئی قرولی۔ ہائے نہ ہوئی قرولی۔

گل بدن : قرولا پیچھے ڈھونڈھیے گا پہلے ذرا یہاں سے کھسک کر نیچے بیٹھیے۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ یہاں آن کر ہمارے پاس بیٹھو۔ ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔

خوجی : (پلنگ سے نیچے اُتر کر) بہت اچھا اب بیٹھوں تو توپ کے مہرے اڑا دینا۔

مسافر : آخر میں کہتا ہوں کہ تم بیٹھے بیٹھے کیا بناؤ گے۔ اٹھ جھاڑو دے۔

خوجی : اس گیدی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ مگر شکر ہے کہ یہاں کوئی قرولی نہیں، ورنہ کھیت کے کھیت صاف کر دیتا۔ میدان کے میدان چوپٹ ہو جاتے۔

گل بدن : کیا گھاس چھیلتے، گھسیارے ہو، چر کٹے ہو، آخر کھیت کے کھیت کاہے کے صاف کر دیتے؟

مسافر : لے چلو اُٹھو! یہ لو جھاڑو ہے۔ ابھی جھاڑو دے ڈالو۔

خوجی : جھاڑو تم دو۔ ہم کو بھی کوئی، بھڑ بھونجا مقرر کیا ہے، یا کوئی پاجی سمجھے ہو۔ ہم ایک عالی خاندان آدمی، گھر کے رئیس ہیں۔ رئیسوں سے اس طرح باتیں کرتا ہے گیدی۔

گل بدن : حضور کی ریاست کہاں ہے؟ ذری ہم بھی تو سنیں۔ آخر کچھ معلوم تو ہو۔

مسافر : ہمیں تو نانبائی سا معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید نائی ہو دسترخوان پر جو بیٹھے تو لذیذ لذیذ کھانا سب

چٹ کر گئے۔ کھا جائے۔ سن دس بارہ، اور کام کرنے میں ننھا بے چارہ۔ چلیے اٹھیے جھاڑو دیجیے۔ دل لگی نہیں ہے۔ کچھ بڑے رئیس زادے بن کر بیٹھے ہیں۔ رئیسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے بھلا۔

خوجی : (جھلّا کر) خدا جانے میری صورت میں کیا عیب ہے۔ جس سے ملتا ہوں سب یہی بے تکی اڑاتے ہیں کہ بھلے مانس کی ایسی صورت ہی نہیں ہوتی یہ تو پاجیوں کی سی صورت ہے۔ آئینہ میں دیکھتا ہوں تو مجھے خود شک سا ہوتا ہے، اور اب تو جس کا جی چاہے جو کچھ کہے۔ ایک طرف کی مونچھ ہی اڑ گئی ہے۔ بھلے مانس کہاں سے رہے بھلا۔ کچھ نہیں اب ہم پہلے منھ بنوائیں گے پھر کسی سے بات کریں گے (یہ کہہ کر میاں خوجی نے کہا بندہ رخصت)۔

مسافر : (دامن پکڑ کر) واہ کیا دل لگی ہے۔ رخصت کی ایک ہی کہی۔ بیٹھیے چلم بھر کے جائیے گا اور یا ثابت کر دیجیے کہ آپ شریف زادے ہیں، اور یا پکڑ لڑ لیجیے۔

میاں خوجی تو ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ ایسے جھلّائے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ ہی تو گئے۔ اب دونوں میں خوب لپاڈگی ہونے لگی۔ اور دل لگی یہ کہ دونوں کا قد کوئی چھ چھ بالشت کا۔ دونوں مُشتِ استخوان، دونوں چانڈو باز، یہ آہستہ سے ان کو چپت لگاتے ہیں۔ وہ ہلکے سے ان پر دھپ جماتے ہیں۔ اِنھوں نے ان کے کان پکڑے۔ اُنھوں نے ان کی کان پکڑی۔ انھوں نے ان کو کاٹ کھایا انھوں نے ان کو چکٹ دی، اور پھر یہ کہ دونوں رو رہے ہیں۔ مگر میاں خوجی قرولی کی دھن باندھے ہوئے ہیں، کہ نہ ہوئی قرولی ہائے نہ ہوئی قرولی۔ مسافر نے ان کے پٹے پکڑے اور انھوں نے ان کے کان گرمائے۔ وہ جیتے نہ یہ جیتے۔ سکت دونوں کے بدن میں نہیں۔ ہانپ گئے۔ میاں خوجی تو قرولی ورولی سب بھول گئے، اور تیورا کر گرے تو چاروں شانے چت، اور اس گل بدن نے اوپر سے دو تین دھولیں بھی چکھا ہی دیں۔ ادھر ان کا تو یہ حال ہوا، ادھر مسافر کی یہ کیفیت ہوئی کہ چکر کھایا، اور دھم سے زمین پر۔

اتنے میں دونوں کو گل بدن نے اٹھایا، اور کہا اب مل جاؤ۔ بس لڑائی ہو چکی۔ اب کیا کٹ ہی مرو گے۔ چلو بیٹھو بس اب نہ بولنا۔

خوجی : بولنا وولنا میں نہیں جانتا۔ قرولی نہ ہوئی ورنہ بھونک ہی دیتا۔ ہات ترے کی۔

مسافر : وہ تو میں ہانپ گیا نہیں تو دکھا دیتا آپ کو دل لگی بچہ جی۔ مجھے بھی آپ کوئی ایسا ویسا سمجھے ہیں کیا۔ سیکڑوں ہی پیچ یاد ہیں۔

گل بدن : اب اگر دونوں میں سے ایک بھی بولا تو ہم دُرست کر دیں گے۔ اس کے معنی

کیا جب منع کیا تو پھر جھگڑا کیسا۔ اب زبان نہ کھلے۔ خبردار! چلو اب چلیں میاں آزاد کے پاس۔ ان کی بھی تو خبر لیں۔ خوجی اٹھے اور مسافر نے بھی کپڑے پہنے اور چلے۔

شام تو ہو ہی گئی تھی۔ میاں خوجی ایک طرف، اور مسافر دوسری طرف ہاتھ پکڑے ہوئے، آزاد کے پاس اس گل بدن کو لے گئے۔ وہ پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ بھٹیاری ان کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ میں تو چو طرفہ تلاش کر آئی کسی کا پتہ نہ ملا۔ اتنے میں سب دن سے جا کھڑے ہوئے اور اس نے ان کو دیکھا۔ انھوں نے اس کو اس گل بدن نے شانہ پکڑ کر ہلایا، تو میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی، اور آنکھ کا کھلنا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بی اللہ رکھی سرِبالیں بیٹھی ہیں اور میاں چانڈو باز سامنے کھڑے پاؤں دبا رہے ہیں۔

میاں آزاد خانہ برباد نے آنکھ جو کھولی تو دیکھتے کیا ہیں کہ بی اللہ رکھی عجب نازِ معشوقانہ اور اندازِ دلربایانہ سے کھڑی سرِبالیں مسکرا رہی ہیں۔ دیکھتے ہی ان کی جان نکل گئی۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کانپ اٹھے، مگر اس ترکِ سفاک کو مسکراتے اور کھلکھلاتے دیکھ کر ذرا ڈھارس ہوئی، ورنہ ہوش و حواس پیترا ہو گئے تھے۔ اب ان کے دل میں خدائی بھر کے خیالات جاگزیں ہوئے۔ الٰہی یہ یہاں کیوں آئیں۔ پتہ کس نے بتایا۔ اب ان کا اصل منشا کیا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ علالت نے ذرا پیچھا چھوڑا تو اس وہم نے آن کر آ دبوچا:

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

خوجی: پیرو مرشد اٹھیے! دیکھیے تو سرِبالیں کون کھڑا ہے۔ ذرا آنکھ تو کھولیے۔ واللہ جی خوش ہو جائے پھڑک جاؤ تو سہی۔ ہائے کیا نورانی صورت ہے (بی اللہ رکھی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ) یہ سب آپ ہی کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ مگر آپ اس وقت جھپی کیوں جاتی ہیں۔ ع۔ رہے گی دولہا سے روز صحبت ڈلہن کرے گی حجاب کب تک۔

آزاد: (اللہ رکھی سے) بیٹھیے تشریف رکھیے۔

خوجی: اجی ابھی ہم سے اور آپ کے سالے سے بڑی ٹھائیں ٹھائیں ہو گئی۔ وہ تو کہیے قرولی نہ تھی، ورنہ سالار جنگ کے پیتر بگاڑ دیے ہوتے۔ بس گوں کا یار ہے۔ شکر کرو کہ آج تم بچ گئے۔

آزاد: چپ نامعقول، سالا کس کا اور سسر ایسا؟ منھ کھولا چانڈو کے نشے میں، لگا بے تکی ہانکنے۔ بڑا قرولی باز بنا ہے۔ چلو باہر ٹھہرو۔ بی بھٹیاری تم بھی مہربانی کر کے ذرا باہر ہی بیٹھو۔ سائیس چل پردہ ڈال دے۔

جب تنہائی ہوئی تو میاں آزاد نے پوچھا کہ کہیے کس تقریب سے تشریف لائی ہیں آپ۔ ہم تو وہ آزاد ہی نہیں رہے۔ وہ دل ہی نہیں۔ وہ حوصلہ ہی نہیں۔ وہ دن ہی نہیں، وہ دلولہ ہی نہیں۔ وہ جوش نہ وہ خروش۔ اب تو روم ہی جانے کی دھن ہے۔ بس یہی اُدھیڑ بن ہے۔

اللہ رکھی: خدا خدا کر کے ہم یہاں تک تو پہنچے۔ راہ میں سوچتے جاتے تھے کہ:

لایا تو نصیب ہمیں کوے یار تک　　دیکھیں گذر ہو یا نہ ہو اس گل عذار تک

پیارے آزاد تم چلے روم کو، ہمیں کس کے سپرد کیے جاتے ہو۔ زمین ہی کو سونپ دو (رو رو کر) اُف آزاد! اب ہم کس کے ہو کر رہیں۔ سر پیشکش ہے جان نذر ہے۔ ہم تو مُرغِ بسمل کی طرح تڑپیں گے۔ ہائے تمہارے عشق نے بے طور رسوا کیا۔ آزاد تم خوب جانتے ہو کہ میں بھٹیاری نہیں۔ شریف زادی ہوں۔ مگر اماں کو خدا بخشے، جو میرے حق میں کانٹے بو گئی ہیں۔ ہائے ایک بوڑھے کھوسٹ کے مجھے حوالے کیا، اور جیتے جی مجھے مار ڈالا۔ جوانی بھر حسرت کی آگ میں جلا کی، اور جلا کروں گی۔

آزاد: اب ہماری عزت اور آبرو تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ اگر روم سے جیتے واپس آئے تو تم کو نہ بھولیں گے نہ بھولیں گے۔ مگر ہم کیا کریں قول ہار چکے ہیں۔ جان جائے مگر بات نہ جائے۔ اللہ پر شاکر رہو، خدا بیڑا پار کر دے گا۔ سچے عشق کے یہی معنی ہیں۔ ؎

عشق کامل ہے تو اتنا چاہیے　　ناگوارا سب گوارا چاہیے

حسن آرا کا کچھ حال معلوم ہو تو بتاؤ۔ سپہر آرا کی خبر سناؤ۔ ہے ہے ان پر کیسی گذرتی ہوگی۔

اللہ رکھی تو ایک بتِ پندار لفاظ و جادو طراز تھی حسن آرا کی، داستان مصیبت کو اس مسرت سے ادا کیا کہ آزاد رو دیے، اور کان دھر کر کل روایت بغور سنا کیے۔ اللہ رکھی نے کہا کہ:

ادھر تم نے گھوڑی کی باگ اٹھائی ادھر ماما شام کے وقت تمہارا نامہ حسن آرا کے پاس لائی۔

حسن آرا: بوا یہ کیا لائی ہو۔ دیکھوں۔ ہائے آج اتنی دیر سے آزاد کا پتہ نہیں۔ ذری کھوج خبر تو لاؤ۔ کہاں روٹھ کر چل دیے ماما۔ میاں آزاد تو سویرے روم کو سدھارے یہ چِٹھی دے گئے ہیں۔ جانے کیا لکھا ہے۔

اتنا سننا تھا کہ حسن آرا کے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ ایک عجب حسرت کی نگاہ سے اس کاغذ کے پرزے کو دیکھا، مگر چھوتے ہوئے روح پر صدمہ ہوتا تھا، کہ مبادا کوئی سنانی سنوں تو جان ہی تن سے نکل جائے۔ حیران و پریشان ششدر و مضطر۔ دل کو ڈھارس دی کہ شاید میرے کانوں نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ ماما نے یہ نہ کہا ہو۔ پھر پوچھا کہ بوا کیا کہتی ہو۔ منتظر کھڑی تھی کہ ماما اب اس

بات کو نہ دہرائے مگر کہاں ممکن تھا۔ ماما نے کہا ہاں ہاں وہ تو کب کے گئے۔ اب تک تو دس کوس زمین نکل گئے ہوں گے۔ اب ان کا پتا کہاں۔ مجھے تمھاری جان کی کروروں قسمیں دے دی تھیں کہ جب تک میں نظر سے اوجھل نہ ہو جاؤں تب تک خبردار، خبردار پیاری حسن آرا کو خط نہ دکھانا، نہیں تو تو جانے گی۔ حسن آرا دھک سے رہ گئی۔ سپہر آرا آگ بھبوکا ہو گئی۔ آنکھیں مارے غضب کے خونِ کبوتر کی سی سرخ۔ چہرہ تمتمانے لگا۔ بدن کانپنے لگا، اور لیا اس نے آڑے ہاتھوں۔ ماما مارے خوف کے لرز گئی۔ روپیہ مُٹھی سے گر پڑا۔ کھٹاکے کی آواز جو آئی تو حسنِ آرا تاڑ گئی کہ اس خام پارہ شہ کارہ نے اپنا مطلب نکالا چاہا کہ جہاں کی تھی وہیں پہنچائے، مگر سوچی کہ جو راز فاش ہو گا تو دل پاش پاش ہو گا۔ خاندان بدنام ہو گا۔ عشق طشت از بام ہو گا۔ لاکھ ضبط کیا ضبط نہ ہو سکا، جھڑک کر ماما سے کہا کہ چل دور ہو مردار۔ ہمیں جُل دیتی ہے۔ نمک حرام اب میاں آزاد کی پیاری پیاری صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ان کا اکڑنا اور بر رنا ان کی خوش بیانی اور نکتہ رانی، ان کی فصاحت و بلاغت، ان کی شیریں زبانی، ان کا طرزِ غزل، خوانی۔ ان کی لگاوٹ کی باتیں، عشق کی گھاتیں، سب کی تصویر سامنے کھنچ گئی۔ سودا نے زور باندھا تو جوئے اشک آنکھوں سے جاری، اور ایک غشی طاری ہوئی۔

حسن آرا: ہے ہے میرا قلب تو الٹا جاتا ہے۔ جی گھبراتا ہے۔ دیدۂ گریاں اور سینۂ بریاں کو کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ کس سے رازِ دل کہوں۔ اے میرے اللہ! یہ بیٹھے بٹھائے ہوا کیا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وحشت کی شورش ہے۔ جنون کی یورش ہے۔ سخت مشکل آن پڑی۔ ہائے ایسے جوان طرحدار سے آنکھ ہی کیوں لڑی۔ گردشِ فلک کی کشمکش سے اب پناہ ہے۔ اب دل سوزان کو بس یہی چاہ ہے کہ وہ بھبوکا سا مکھڑا نظر آئے۔ آنکھیں شعلہ افشاں ہیں۔ دونوں دیدۂ تر گریاں ہیں۔ الٰہی اب ڈھونڈھوں تو کہاں۔ تلاش کروں تو کدھر۔ پوچھوں تو کس سے:

کس جگہ ڈھونڈھیے اے غیرتِ خورشید تجھے — تو تو رہتا ہے سدا صبح کہیں شام کہیں

پیاری بہن ذرا ہمیں سنبھالو۔ اُف جو یہی حال ہے تو دم بھر میں:

قرار می برد از خلق آہ و زاری ما — بایں قرار اگر ماندہ بے قراری ما
شویم گرد و بہ دنبالِ توسنش رفتیم — مگر برای چہ روز ست خاکساری ما

ہے ہے میں بھی کتنی نادان ہوں۔ اس شہسوار کے دنبالِ توسن تک پہنچنا کیا آسان سمجھی ہوں:

دامن صبا نہ چھو سکے اس شہسوار کا　　　پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا

مگر واہ رے آزاد۔ ہے بات کا دھنی۔ جواں مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

سپہر آرا: ہے ہے باجی اس نابکار ماما نے تو غضب ہی ڈھایا۔ حشر توڑا مردار نے۔ ہائے ہائے میاں آزاد پیاری بہن کے پیارے آزاد کو چلتے وقت آنکھ بھر کے نہ دیکھنے پائی۔ حسرت ہی رہی، اور مصیبت کی مصیبت سہی۔ اب صبر کرو، اللہ نے چاہا تو تھوڑے ہی دنوں میں آتے ہوں گے، گر میرا ابھی قلب الٹا جاتا ہے۔

حسن آرا:

شب جدائی آں رشک ماہ در پیش ست　　　مرا ببیں کہ چہ روزِ سیاہ در پیش ست

تو فارغی ز غم اے پند گو برو کہ مرا　　　دو صد معاملہ با اشک و آہ در پیش ست

سپہر آرا: بہن اپنے کیے کا علاج ہی کیا ہے۔ خود کردہ را چہ علاج۔

حسن آرا: ہائے یہی تو رونا دھونا ہے۔ یہی تو افسوس ہے:

ز تیغ عشق بود خون ما بگردن ما　　　بروزِ حشر بود دستِ ما و دامنِ ما

بیامی خود تیر از دست خویشتن زدہ ام　　　فتادہ آتشے از آہِ ما بخرمنِ ما

کیا ناموری کمبخت روم ہی جانے پر موقوف تھی۔ ہے ہے! بندوق اور توپ کا سامنا، گولیوں کی بوچھار، ہر سمت ڈھال تلوار، میاں آزاد یکہ وتنہا، ساتھی نہ غمخوار، دوست نہ یار، جنگ کے میدان سے ایسا ہی کوئی قسمتوں کا دھنی ہو تو آئے، ورنہ ایک چنے کے برابر گولی دم کے دم میں کام تمام کر دے، اور تب تک یہاں جیے ہی گا کون۔ ع۔ تا سالِ دگر می کہ خورد زندہ کہ ماند" دم میں روح ہوا ہوا چاہتی ہے۔ دل ہے کہ اڑا جاتا ہے۔ جان پر بن آئی۔

سپہر آرا اپنی بڑی بہن سے زیادہ بے قرار، مگر بہن کا حال زار دیکھ کر آنسو پیتی اور دلا سا دیتی۔ بہن اب صبر کا وقت ہے۔ چلو اس وقت ذرا باغ کی سیر کر آئیں۔ ادھر ادھر کہیں دو گھڑی دل بہلائیں۔ رونا تو ابھی مہینوں ہے۔ کس منحوس گھڑی تمہارے منھ سے روم جانے کا لفظ نکل گیا۔ اب صدمۂ مفارقت اٹھاتی ہو، اور پچھتاتی ہو، مگر وقت از دست رفتہ، و تیر از کمان جستہ، کا نقشہ ہے، اب دل کو تسکین دیجیے صبر کیجیے۔

حسن آرا: کیسا باغ اور راغ۔ بہن تم کو گل و بلبل کی سوجھتی ہے اپنا تو حال دگرگوں ہے:

مارا ہوائے گلشن و ماغی نماندہ است　　　اے بوی گل برو کہ دماغی نماندہ است

کیسی سیر اور کہاں کا باغ۔ میں ہوں اور دلِ داغ داغ، اور خون نابۂ دل درایاغ۔

سپہر آرا نے جو بہن کا یہ حال دیکھا تو ضبط نہ کر سکی۔ بے اختیار رو دی، اور میاں آزاد کی سچی محبت نے ایسا جوش کیا کہ کلیجہ مُنھ کو آیا، اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اُف اُف! میاں آزاد تم سے یہ امید نہ تھی کہ صورت بھی نہ دکھاؤ گے، اور چلے جاؤ گے۔ میں تو تمھاری یاد میں جان ہی کھو دوں گی۔ اور زندگی سے ہاتھ دھوؤں گی:-

گیرم بہ یار نامہ نویسم بر ندہ کیست　　　جز رنگ آفتاب بکویش روندہ کیست

ہے ہے یہ تڑاقے کی گرمی یہ لُو کے تھپیڑے، یہ گرد و غبار، اور میاں آزاد پشت سمند رپر سوار، اور میدان کارزار، ہم یہاں چین سے بیٹھیں، اور وہ ہماری خاطر یہ مصیبتیں سہیں۔ اے۔ تف:

اے سینہ بنال نالہ کارِ من و تست　　　اے نالہ نبال روزگارِ من و تست

اے دل بر خیز تا ز دنیا بر دیم　　　دہریست کہ زندگیش عارِ من تست

حسن آرا نے جو بہن کا یہ رنگ دیکھا بے اختیار گلے سے لپٹ گئی اور سینہ سے لگایا، مگر کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ بلیوں اچھلتا ہے۔ آنسو آنکھوں سے اُمڈے آتے ہیں۔ دل سرد، مُنھ زرد، رنگ فق، کلیجہ شق، بدن کانپ رہا ہے۔ تیور پر تیور آتے ہیں، پھر جو خیال آیا تو کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔ اے میرے اللہ رحم کر! گناہوں کو بخش، صبر عطا کر، ہائے صبر نہیں آتا۔ کدھر جاؤں، کس سے کہوں، دل کو کیوں کر سمجھاؤں:

ندارم تابِ ضبطِ راز ومیترسم زرسوائی　　　مگر جویم ز بہر ہم زبانی بے زبانی را

ایسا ضعف طاری ہوا کہ بے اختیار آنکھ جھپک گئی۔ سپہر آرا چپکے سے کھسکی، اور پنکھا جھلنے لگی، مگر میاں آزاد کی دھن۔

اتنے میں حسن آرا بے خبر سوئی۔ خواب کا قاعدہ ہے کہ جس امر کا دھیان کر کے انسان سوئے اس کا خیال ایسا بندھ جاتا ہے، کہ انسان وہی خواب میں بھی دیکھتا ہے۔ حسن آرا عین حالتِ اضطرارِ خاطر میں سوئی تھی، تو دیکھتی کیا ہے کہ ریگ دشتِ بلا خیز و وحشت انگیز میں میاں آزاد ایک شجر رفیع و بلند کے سایے میں زین پوش بچھائے بیٹھے ہیں، اور ان کا سمندِ آہو شکار و صبا رفتار آزادی سے گھانس چر رہا ہے، کہ اتنے میں ایک خونخوار اور جرّار روسی آیا، اور ان کو دیکھ کر خوب ہی کھل کھلایا، اور غلاف سے تلوار نکال کر جھپٹا۔ میاں آزاد کا پاؤں زخمی تھا۔ یہ طیش میں آ کر اٹھے تو، مگر اٹھتے ہی تیورا کھا کے گرے۔ گرے تو وہ روسی فرط طرب سے اچھلنے لگا۔ اتنے

ہیں میاں آزاد تلوار ٹیک کر بیٹھ گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ غنیم کلے پر آن ہی پہنچا، تو خدا کا نام لے کر یہ اٹھے اور دوڑے گھوڑے کی طرف کہ سوار ہو جائیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ روسیوں کی ایک جماعت کثیرہ جوق جوق چلی آتی ہے۔ تب تو یہ اپنے فرسِ تند خو کی طرف اور بھی دوڑ کر چلے۔ تاکہ اس کو بچائیں۔ روسیوں نے دائیں بائیں کرکے بندوقیں سر کیں۔ ایک گولی میاں آزاد کے کان کے پاس سے سن سے نکل گئی، دوسری گولی سینے کے قریب سے چلی گئی۔ تیسری گولی ٹوپی کو چھوتی ہوئی وہ پہنچی۔ چوتھی گولی گھوڑے کی دم کے قریب سے گئی، مگر نلوہ بچ نکلا۔ اس پر میاں آزاد بہت گھبرائے اور ایسا جھلائے کہ ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر لپکے اور دو تین روسیوں کو فی النار کیا۔ اتنے میں ایک گولی دن سے ان کے ہاتھ میں لگی، اور میاں آزاد اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہو رہے ہے، اور ایک دفعہ ہی گھوڑا کڑکڑا دیا، تو ٹاپوں کی آواز سے حسن آرا کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بہن سرھانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے، اور آنکھوں سے اشک جاری ہیں۔

حسن آرا: (اشک بہا کر) سپہر آرا ہم نے پیارے آزاد کو خواب میں دیکھا۔ اُف۔ ہائے گولیوں کی بوچھار، چو طرفہ غنیم خون خوار، اور عدوئے سیہ کار، چوکھی لڑ رہے تھے۔ اتنے میں ایک گولی نصیب اعدا ان کے جسم پر پڑی، اور گھوڑے کا رخ انھوں نے پھیر دیا۔ ہائے ستم! وائے ستم! (ہاتھ مل کر) بہن اب میاں آزاد سے ہاتھ دھو بیٹھو اب وہ نہ آنے کے۔ بس ہم تو مایوس ہو گئے۔ ہائے مجھے یہ سوجھی کیا، کس مزے سے ان کے ساتھ زندگی بسر کرتی، مگر حسرت ہی رہ گئی۔ داغ مفارقت ہی دے گئے، اور اب ہم کو بھی دو دن کا مہمان سمجھو۔ ہے ہے! تم اکیلی ہی رہ جاؤ گی۔ جو ہم چل بسے، اور میاں آزاد جیتے بہو رے، تو بہن تمھیں شہید کربلا کا واسطہ، ہماری تربت انھیں ضرور دکھانا۔ روح خوش ہو جائے گی۔

سپہر آرا چیخ کر رو ئی تو ان کی بوڑھی دادی دوڑتی ہوئی آئی۔ ہائیں ہائیں بٹیا خیر تو ہے۔

میاں آزاد نے جو یہ داستان سنی تو بے اختیار رو دیے۔ حواس پیترا، رنگ فق۔ ضعف تو تھا ہی اس غم نے اضعف کر دیا۔ اب کروٹ لینے کی تاب و طاقت نہیں۔ ہائے ہماری بدولت ان دونوں رشکِ قمر، پری پیکر، نوجوان خاتون پر کیا مصیبت پڑی۔ صد رنج و الم اور یہ سب ہمارے سبب سے۔ افسوس پیاری حسن آرا نے یہ آزاد کی ملاقات کا پھل پایا، کہ اپنے دل کو مرکز دائرۂ الم بنایا ہائے افسوس! وائے افسوس!

اللہ رکھی: اب اس غم کیے سے کیا ہو گا۔ تدبیر وہ کرنی چاہیے، جس سے کچھ مطلب نکلے۔ اب سب سے بہتر یہی ہے کہ تم سیدھے ردم جاؤ، اور وہاں سے سُرخرو آؤ۔

آزاد: دو دن سے ذرا طبیعت اچھی ہے۔ کل تو نہیں پرسوں ضرور بالضرور روانہ ہوں گا۔ اب

زیادہ توقف نہ کروں گا، نہ کروں گا۔

خوجی : بی اللہ رکھی ابھی پوچھ رہی تھیں کہ مجھ کو کس کے سپرد کر کے جاؤ گے۔ اس کا آپ نے کچھ جواب دیا۔ پھر کچھ سوچیے آپ کوئی معتبر آدمی تجویز کیجیے، اور جو کوئی نہ ملے تو پھر خیر ہمیں یہ مصیبت سہیں پس ہمارے ہی سپرد کر دیجیے۔ آپ جائیے، اور ہم اور یہ یہاں رہیں گے۔

آزاد : معاف فرمائیے! بس آپ باگ ڈور اٹھائیے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔

اللہ رکھی بڑی دیر تک میاں آزاد کو سمجھایا کیں، کہ رونے دھونے سے مطلب نہ نکلے گا۔ غم و الم بالکل فضول امر ہے۔ سنو! میں کوئی بھٹیاری نہیں ہوں۔ میں ایک شریف زادی ہوں، اور گو میں نے یہ حرکت ناشائستہ کی کہ گھر بار چھوڑ کر سرا میں جا بسی۔ لیکن میرا خدا اور میں، آج تک اگر کسی نامحرم سے گفتگو بھی ہوئی ہو، مگر شامت اعمال سے یہ دن دیکھنا بدا تھا۔ خیر ہم تو اپنی بھگت لیں گے۔ اب تم کو جو کہیں وہ کرو۔ سنو! ہمارا تو کچھ خیال نہ کرو ہم سمجھ لیں گے۔ لیکن حسن آرا تمھارے بغیر مر ہی جائیں گی۔ اور سپہر آرا کا تو دم نکل جائے گا وہ دونوں تمھاری عاشق زار ہیں۔ ان کو تم سے سچا عشق ہے۔ تمھاری جوشِ جوانی اور خوش بیانی نے ان کو دالہ و شیدا کر دیا۔ اب تم پر فرض ہے کہ روم جاؤ، اور ضرور جاؤ۔ ممکن ہے کہ تم روم کا عزم نہ کرو، اور واپس جا کر حسن آرا سے ملو۔ اب کی وہ تم کو کہیں جانے نہ دیں گی بس تمھاری ہی ہو رہیں گی۔ چٹ تیری منگنی اور پٹ تیرا بیاہ ہو جائے گا۔ لیکن اس نکاح میں وہ لطف کہاں۔ اب تو سو کام چھوڑ کر جاؤ۔ خدا نے چاہا تو سرخرو ہی آؤ گے۔ اس میں تمھارا نام ہوگا، اور ملکوں ملکوں سب تم کو اچھا کہیں گے۔ میں جا کر وہاں ہی رہوں گی اور حسن آرا کی تشفی کروں گی، اور سپہر آرا کو تسلی دوں گی۔ ذرا جو کسی پر کھلنے پائے کہ ہم سے تم سے کیا تعلق ہے۔ میرا وہاں رہنا ضروری ہے۔ مگر میرے ساتھ کمبخت چنڈو باز بڑا بُرا ہے، لیکن کیا کروں اس کو ٹالوں کیوں کر اور ٹالوں تو پاس کون رہے۔ اتنا خیال رہے کہ جہاں جہاں ڈاک جاتی ہو، وہاں سے خط تو برابر بھیجتے جانا۔ ایسا نہ ہو کہ بھول جائیے ورنہ وہ کڑھ کڑھ کر مر ہی جائیں گی۔ اور میرا تو جو حال ہے، اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ میں اپنی سرگذشت کس سے کہوں:

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

آزاد : اللہ رکھی خدائے پاک کی قسم ہم تم کو اپنا اس قدر سچا دوست نہیں جانتے تھے۔ اللہ رے تم کو میرا اس قدر خیال، اور میری اتنی محبت ہے یہ آج معلوم ہوا۔ تمھاری صلاح سر آنکھوں

پر، جو کہو وہ منظور، اور جو کہا وہ منظور کرنے کے لائق ہے۔ تم اپنے سے مجھے اطلاع دینا تو خط بھیجا کروں گا۔

اللہ رکھی نے دو تین گھنٹے تک باتیں کیں، اور فہمایش کر کے روانہ ہوئیں، تو دونوں کے دونوں خوب گلے مل مل کر زار زار روئے، اور چلتے وقت آزاد نے اللہ رکھی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور رخصت ہوئے۔

دوسرے دن میاں آزاد روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں ایک پُر فضا مقام پر گھوڑے سے اتر کر، املی کے درخت کے سایہ میں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے لگے، اور خوجی سو رہے۔ میاں آزاد نے جو سبزہ زار، اور چشمہ سار، اور مرغزار پُر بہار، دیکھا تو جی خوش ہو گیا، اور روح فرحناک۔ کئی دن سے علالت نے ان کو بالکل توڑ دیا تھا، وہ جوش و خروش اب کجا۔ بدن میں سکت ہی نہیں۔ مگر پہلے سے طبیعت صحیح تھی۔ یہاں پر فضا اور ندرت انتما مقام دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے اور چہرے کی رنگت ہی بدل گئی۔ گویا کبھی ماندے ہی نہیں ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر تو میاں آزاد لمبی تان کر سوئے:

زینت النسا اور اختر النسا

سامنے سے ایک کشیدہ قامت پیر مرد سفید پوش آئے۔ اپنی راہ راہ جا رہے تھے، مگر جب میاں آزاد کو دیکھا تو ذرا ٹھہرے، اور بہ غور و تعمق ان پر نظر ڈالی۔ انھوں نے بھی ان کو غور سے دیکھا، مگر دونوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ جب وہ پیر مرد کچھ عرصے تک کھڑا رہا، تو خوجی تو ایک بے تکے آدمی، للکار کر پوچھنے لگے کہ کیا ہے کیا۔ آخر آپ کون ہیں کون؟ کیا ٹوپی لے بھاگیئے گا، یا گھوڑوں کی کاٹھی کی فکر ہے۔ آخر کچھ معلوم تو ہو؟ پیر مرد گو بوڑھے آدمی تھے مگر بڑے کرارے اور تیکھے چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اتنے میں میاں آزاد نے خوجی کے ایک چپت لگائی، اور ڈانٹ کر کہا کہ نامعقول شرفا سے اس قسم کی گفتگو کرتا ہے۔ خوجی کی ٹوپی تڑ سے زمین پر۔ انھوں نے فوراً پیر مرد کے قدموں پر ٹوپی رکھی۔ اور کہا معاف فرمائیے میں اس وقت چانڈو زیادہ پی گیا ہوں۔ پیر مرد نے بکمال اخلاق ٹوپی ان کے سر پر رکھی، اور کہا خیر، کچھ پروا نہیں آپ بیٹھیے اور مجھے اب آپ سے ملال نہیں ہے۔ میاں آزاد نے کہا کہ اگر مضائقہ نہ ہو تو ازراہِ عنایت تشریف لائیے، اور حقہ پیجیے۔ پیر مرد تشریف لائے، تو میاں آزاد نے سرو قد تعظیم کی، اور کہا۔ حقہ پیجیے۔ بسم اللہ!

پیر مرد : تسلیم آپ کو میں نے کہیں دیکھا ضرور ہے، مگر یاد نہیں آتا کہاں دیکھا ہے۔

آزاد : (متحیر ہو کر) مجھے! شاید۔

پیر مرد : کچھ خیال سا ہے۔

آزاد : بجا۔

پیر مرد : چلیے ذرا غریب خانہ پر چلیے۔

آزاد : حضرت بندہ مسافر آدمی۔ اس وقت یہاں درخت کے سایہ میں ذرا دم لیا، مگر بستی اچھی ہے۔ جی چاہتا ہے آج یہاں ٹک جاؤں، اور میں علیل بھی تھا، ابھی پرسوں ہی تو بخار نے مفارقت کی، اگر آج ۲، ۲ کوس جاؤں تو شاید تکان ہو۔

پیر مرد : میاں صاحبزادے تم نے بڑی جرأت کی کہ علالت کی حالت میں سفر کیا۔ اب اگر مناسب سمجھو تو یہاں غریب خانہ پر، یا سرا میں دو دن تک ٹک جاؤ۔ ایسی مبادرت بڑی غلطی ہے۔ اب ایسا ہرگز نہ کرنا۔ خبردار، بھائی دیکھو بوڑھوں کی بات یاد رکھنا۔

آزاد : چلیے دولت خانۂ اقدس پر چلوں۔ یہاں بیشک تکلیف ہوگی، اگر دو چار گھنٹے اچھا رہا تو خیر روانہ ہو جاؤں گا۔ ورنہ آج شب کو یہیں بسیرا لوں گا۔

میاں آزاد اور وہ پیر مرد دونوں چلے جب پیر مرد کے مکان پر پہنچے تو باہر دروازے پر دو چار کرسیاں، دو تین مونڈھے، دو ایک پلنگ بچھے تھے، اور ایک چمن میں خدمت گار کھڑا تھا۔ میاں آزاد ایک کرسی پر بیٹھ کر پیر مرد سے باتیں کرنے لگے۔

آزاد : سبحان اللہ حضرت کیا پُرفضا مقام ہے۔ بہشت بریں ہے، چمن کیا ہے۔

پیر مرد : جی یہ کلبۂ احزان ہے۔ ہوا اگر اچھی نہ معلوم ہوتی ہو تو چلیے کمرے میں بیٹھیں بلکہ دو گھڑی لیٹ رہیے تو بہتر ہے۔

آزاد : جی نہیں ابھی نہ لیٹوں گا۔

حُسن اتفاق سے پیر مرد کی بھتیجی یہ سب باتیں دروازے کے پاس سے سُن رہی تھی۔ ایک چھوٹی لڑکی نے گھر میں جا کر کہا تھا کہ ابا کے ساتھ کوئی آئے ہیں۔ گورے گورے آدمی۔ بھورے بھورے بال، جیسے انگریز سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر پیر مرد کی نوجوان بھتیجی، دروازے کی آڑ سے دیکھنے لگی، کہ دیکھوں تو کون آیا ہے۔ باتیں سنیں تو کچھ شک سا ہوا کہ ہم نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ غور سے دیکھنے لگی، اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ الٰہی یہ کون ہیں۔ میں نے تو ان کو دیکھا ہے اور

آواز بھی پہچانی ہوں۔

پیر مرد نے جو اپنی بھتیجی کو برافگندہ نقاب، دروازے پر ایک اجنبی اور غیر مرد کے روبرو کھڑے دیکھا تو ٹال ٹول کر اٹھے، اور جاکر دروازے کے پاس سے کہا کہ ہائیں۔ ہائیں! یہاں کہاں کھڑی ہو۔ اُس گلفام نے کہا کیا کوئی دیکھتا ہے۔

پیر مرد : (آزاد سے) آپ کا اسم مبارک؟

آزاد : آزاد۔

گلفام : (یعنی وہی لڑکی جو دروازے کے پاس سے جھانک رہی تھی) چچا کون ہے؟

پیر مرد : چپ رہو ایک شریف زادے ہیں، تم کو کیا کام۔

گلفام : چچا آخر کون ہیں کون۔

پیر مرد : ایک مسافر ہیں بے چارے۔ آزاد نام ہے۔

میاں آزاد خانہ برباد جو اس پیر مرد، فرخ نہاد، سے باتیں کرنے لگے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک پریزاد کم سِن، عورت دروازے کے پاس سے جھانک رہی ہے۔ اس پر نظر ڈالنا وضع اہل آبرو کے خلاف سمجھ کر یہ کنکھیوں سے گھورنے لگے۔ اس پری پیکر کو حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون جوانِ رعنا، بلند بالا ہے۔ جس کی آواز میں بخوبی پہچانتی ہوں۔ لب و لہجہ، بات چیت، طرز گفتگو، طریقِ کلام، سے کان آشنا ہیں، مگر اس وقت کچھ بھولی ہوئی ہوں۔ یاد نہیں آتا کہ یہ کون ہیں۔ کہاں دیکھا تھا۔ کب ملاقات ہوئی تھی۔ دروازے کی دراز سے جوان کی صورت دیکھی تو اور بھی یقین ہوا کہ یہ پیارا پیارا مکھڑا ہم نے ضرور دیکھا ہے۔ جب پیر مرد نے پوچھا کہ اسم مبارک، اور انھوں نے باآواز بلند آزاد نام بتایا۔ تو اس جمیلہ کے کان کھڑے ہوئے کہ ایں۔ آزاد، آزاد۔ ہو ہو ہو۔ آزاد اُن کو تو ہم خوب جانتے ہیں۔ پہلے تو کچھ سوچا کی۔ جب یہ خیال آیا کہ یہ فلاں شخص ہیں، تو مارے محبت کے دروازے کا ایک پٹ کھول کر مسکرائی، اور کہا کہ (کہیے بندہ پرور ہم کو پہچانا؟) پیر مرد حیران و ششدر کہ باللعجب یہ کیا بوالعجبی ہے، یہ اسے سوجھی کیا کہ مرد بیگانہ، خویش نہ یگانہ، جان نہ پہچان، اور اس پر طرہ یہ کہ کم سِن جوان، اور اس سے بے دھڑک گفتگو کی۔ شیشۂ ناموس کو سنگ بے حیائی سے توڑا شرم و آزرم سے منھ موڑا۔ پیر مرد سناٹے میں کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ شرفا زادیوں کو تو اغیار سے ہم کلام ہونے تک میں عار ہے۔ یہ اس کو سوجھی کیا کہ دروازے سے جھانکتے جھانکتے بےخود ہو گئی۔ سمجھے کہ لڑکی ہے نوعمر۔ اور اس جوان رعنا کا حسن و جمال غیرتِ بدر، رشک ہلال، عاشق و شیدا، مفتون و مجنون،

ہو گئی۔ مسافر سے دل ملایا، اور ایک نیا گل کھلایا۔ بس اب اس کو کھو بیٹھے اور ننگ و ناموس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس لڑکی کی چچی کو جو خبر ہوئی تو سنتے ہی دنگ ہو گئی۔ ہے ہے اس لڑکی کا کیسا دیدہ ولیل ہے۔ نامحرم سے بوڑھے چچا کے سامنے اس بے تکلفی سے گفتگو کرنا، اور اُف۔ آج آبرو خاک میں مل گئی۔ اس وقت آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ شیطان کم بخت اپنی مراد پا گیا۔ ارے لوگو یہ تو ایسی نہ تھی۔ میرے اللہ یہ اس کو سوجھی کیا۔ کہیں دیوانی تو نہیں ہو گئی۔

ماما بولی کہ صاحب ہے کیا۔ ہونا کیا۔ جو ہے ہم خوب جانتے ہیں ماشاءاللہ دشمنوں کی آنکھ میں خاک جوان لڑکی۔ میں تو کہتی تھی کہ ایک دن۔ چلو خیر اب پرانا دکھڑا کون روئے، یہ آئے کون ہیں بانکے سے آدمی ہیں۔ گبھرو جوان۔ میں باہر جا کر دیکھوں یہ ماجرا کیا ہے۔ کہیں میاں سے اور ان سے جوتی پیزار نہ ہو جائے۔ ارے کریم اد کریم! جا لپک کے جنگی خان کو تو بلا لا۔ کہنا جلدی جلدی قدم اٹھاؤ، وہاں خون خچرا ہوا چاہتا ہے۔ اُف اوہ۔ یہ بیٹھے بٹھائے ان کو سوجھی کیا بیوی۔

ضعیفہ: ہونہہ۔ میرے تو اس وقت ہوش بر جا نہیں۔ یہ مجھ سے پوچھتی ہو کہ سوجھی کیا۔ ظہور کے ابا سے کہو کہ سورۂ حمد دم کریں۔ پالا پر دسا۔ ہڈیاں توڑیں، اتنا بڑا کیا، آج الھڑوں سے سب حق ادا کر دیے ہائے برسوں کی آس آج ٹوٹی۔ قسمت پھوٹی، اسی دن کے لیے پالا تھا! کہ ہمارے سامنے نامحرم کو گلے لگاؤ۔ نام و ناموس کو خاک میں ملاؤ۔ ایسی بھی آبرو ریزی کسی کی کم ہوئی ہوگی۔ قسمتوں کا لکھا ہمارے آگے آیا۔ اپنے کرتوتوں کا پھل پایا۔ (ہاتھ مل کر) ہے ہے لوگو یہ ہوا کیا۔ اس سے تو مرہی گئی ہوتی یہ تو ایسی دیدہ دلیر بھی نہیں۔ اس پر کسی کا سایہ تو نہیں ہے۔ اُف اب میں کہاں جاؤں۔ آس پڑوس میں منھ کیا دکھاؤں۔ خیر سے پندرہ سولہ برس کا سن ہے، کوئی انجان نہیں۔ لکھی پڑھی ہیں کچھ نادان نہیں۔ کیا جانے میں کیا بک رہی ہوں۔ کہتی کچھ ہوں منھ سے کچھ نکلتا ہے۔

ماما: بیوی بات ساری اتنی ہے کہ اس سن میں کنوارا پن بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور بیاہ نہ کرو۔ ارے کریم بھائی ذری دوڑ کے جنگی خان کو ابھی ابھی بلا لا۔ اپنے ساتھ ہی لانا۔

بی مغلانی اور شاہ جی کی کہانی

مغلانی: میرا تو کل ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ، سویرے کچھ سنانی ضرور سنیں گے۔ کل شام کو یہ لڑکی مہتابی پر گئی، اور اس وقت ذرا سر در دھو دھا کر تیل بالوں میں ڈالا تھا۔ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنے تھی۔ بال بھی سنوارے تھے۔ ایک عالم تھا اس پر بال بکھرے ہوئے اور مہک رہے تھے۔ اس پر آپ نے

عطر فتنہ بھی ملا، دوپٹا بھی نہ اوڑھا، اور مہتابی پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی، بچہل قدمی کرنے لگیں۔ میں بھی مہتابی پر گئی تو ان کو اس قطع میں دیکھ کر میں نے للکارا کہ ایں! کچھ خیر ہے۔ چھوٹی لڑکی کا مہتابی پر اس وقت کیا کام ہے بھلا۔ چلو نیچے چلو، مگر تم جانو جوانی تو دیوانی ہوتی ہے، وہ لگی مجھے انگلیوں پر نچانے اور بنانے کہ تم تو بوڑھی ہوگئیں نہ تم کیا جانو کہ ہم کس دُھن میں ہیں۔ اس کے بعد ازاں پیپل کے درخت کے نیچے پرنالے کے پاس ایک بے ادبی کی، تب تو میرے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ میں نے ہاتھ مل کر کہا کہ بیٹا تم نے بڑا بُرا کیا۔ اُس پیڑ پر ایک شاہ جی رہتے ہیں ان کو تم نے ستایا۔ اب اللہ ہی مالک ہے۔ میرا دل تو تھرتھرانے لگا مگر اس کو ذرا ڈر نہیں۔ ہنس کر پیپل کے پیڑ کی طرف دیکھا، اور ایک شوخی کے ساتھ کہا کہ اجی شاہ جی ہوت! کیا کر رہے ہو؟ پیپل کے پیڑ پر کیوں بسیرا لیا۔ آم کے درخت پر جاؤ تو فصل بھر خوب چھک کر کھاؤ۔ شاہ جی او شاہ جی! سنتے ہو کہ بہرے ہو۔ تمھیں قسم ہے جو نہ بولو یہ کہہ ہی رہی تھی کہ درخت کے پتے اس طرح ہلنے لگے جیسے کسی کو جوڑی آئے۔ مجھے تو ہول آنے لگا۔ اور اس کا بدن بھی تھرتھرانے لگا۔ پھر تو ایک ایسی بات ہوئی کہ میری جان ہی نکل گئی، اور ایک ایک پتا گھونگرو کی طرح چھم چھمانے لگا۔ اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اللہ کی سوں میں تو کانپ اٹھی، اور چوطرفہ اندھیرا چھا گیا۔ یہ بیٹھی اور اٹھی، اور گرگر پڑی۔ میں نے کانپتے کانپتے دعا مانگی کہ خداوندا اس انجان معصوم کو بچا! یہاں اس کا باپ ہے نہ چچا۔ شاہ جی معاف کرو۔ کدورت سے دل کو صاف کرو، جب دیکھا کہ حالت غیر ہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھیوں سے گنے کھانا کیا کھیل سمجھی تھی۔ تو تھمبو کر کے میں اس کو نیچے لائی۔ تو اس کے کان پر جوں بھی نہ بھری دوہر تان کر سو رہی۔ میری تو جان ہلکان ہوگئی تھی، اور مجھے کھٹکا۔ چپ چاپ پڑے پڑے ان کو دیکھا کی کہ مبادا بے چین ہو جائیں، تو بیوی اللہ کی سوں، دیکھتی کیا ہوں کہ ایک سنِ سفید بوڑھا آدمی، ہرے ہرے کپڑے پہنے ہوئے جیسے لہبر طوطے کے پر ان کے سرہانے آن کر کھڑا ہوا۔ اور چہرے پر سے دوہر کھسکا کر کان میں کچھ کہا کاٹو تو لہو بدن میں ایک بوند نہ پاؤ۔ سنّاٹا مارے پڑی رہی۔ مگر ہوائیاں اڑی ہوئیں وہ بوڑھا ایک دفعہ ہی غائب ہوگیا، تو یہ اٹھی میں نے پوچھا خیر سلا (خیر صلاح) تو ہے۔ بولی ہاں مگر قلب الٹا جاتا ہے۔ جیسے کوئی کلیجہ مسوس رہا ہے۔ اور آج سینے پر ہاتھ رکھ کر سوئی۔ تو عجب خواب دیکھا۔ اُف اوہ۔ کہتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ میں تو بیوی دل کی بودی ہوں ہی۔ میں نے مارے ڈر کے پوچھا بھی نہیں کہ کیا دیکھا کیا نہیں دیکھا۔ مگر اس نے خود ہی آپ ہی آپ کہا کہ جیسے کوئی آدمی میری پلنگڑی کو اٹھا کر پیپل کے پیڑ پر لے گیا، اور اس کے بعد مجھ سے کہا کہ تم نے ہمیں بے طور ستایا، مگر کیے کا ثمرہ پایا۔ اب تم ہماری ہو۔ آٹھویں دن ہم تمھارے سر پر آیا کریں گے۔ اچھا خبردار۔ جمعرات

جمعرات خوب صاف ستھرے کپڑے پہن کر پاک جگہ پر بیٹھنا۔ اور پاک رہنا۔ اور عطر پھلیل خوب لگانا اور لوبان کی خوشبو اس قدر ہو کہ درخت کی پھنگی تک جو بلند ہو جائے۔ یہ کہتا تھا کہ اس نے میری پلنگڑی اوپر سے پھینکی تو مارے صدمے کے میری آنکھ کھل گئی۔

مغلانی نے اس چرب زبانی سے یہ جھوٹی کہانی بیان کی کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سب عورتیں تو تھی ہیں، سب کی سب کانپ اٹھیں، اب پیپل کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ہاتھ ملنے لگی کہ لڑکی ہاتھ سے گئی، کوئی آنسو بہانے لگی کہ آبر وریزی ہوئی۔ ایک نے کہا شاہ جی دہائی ہے۔ دوسری بولی میرے مشکل کشا یہی وقتِ مشکل کشائی ہے۔

اب ادھر کا ذکر سنیئے کہ جس وقت اس نوجوان نے آزاد کا نام سنا تو بآواز بلند پوچھا کہ، چچا کون ہے؟ اس حسرت سے یہ کلمہ زبان پر آیا کہ میاں آزاد کو سنتے ہی اس کا عشق ہو گیا۔ مگر یہ سمجھے نہیں کہ یہ کس بتِ عربدہ جو، آئینہ زانو، کی آواز ہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ چچا کون ہے کون؟ اور غور کر کے میاں آزاد کو دیکھا، تو آنکھیں چار ہوتے ہی جھپٹ کر لپٹ گئی۔ میرے پیارے آزاد آج برسوں کے بعد تمھیں دیکھا۔ اُف ہمارا دل عجب بھر آیا۔ ہائے میں تو سمجھی تھی کہ دشمنوں کی جان گئی۔ مگر سچ کہتا کیا جلد پہچان گئی۔ کہ میرا پیارا آزاد ہے۔ میں تو تمھاری بانکی وضع ہی سے تاڑ گئی تھی کہ ہوں نہ ہوں یہ وہی ہیں۔ باتیں سنیں تو ڈھارس ہوئی کہ انھیں کی سی آواز ہے۔ پھر مجھے تاب کجا کہ دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوں۔ بیتاب ہو کر نکل ہی آئی۔ آج تو میں نے منھ مانگی مراد پائی۔ میرے یہاں کچھ مہینے پہلے ہی عید ہو گئی۔ آج اس شہر کی ایک مسجد تو بے گھی کے چراغ جلائے چھوڑوں گی نہیں۔ دیوالی کی لطف دکھاؤں تو سہی۔

میاں آزاد چکر میں آئے کہ یہ ناظورۂ دل فریب کون ہے جو اس اختلاط سے پیش آتی ہے۔ اور ہمیں دیکھ کر کھلی جاتی ہے۔ اور پیارے کے بغیر ہمارا نام ہی زبان پر نہیں لاتی ہے۔ اب اگر صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم نے تمھیں پہچانا نہیں، تو شرم آتی ہے کہ اس کا یہ اضطرار، اور پیار، اور ان کا یہ انکار۔ یہ بہت سوچے کہ یہ کون ہے مگر پتہ نہ ملا نہ ملا۔ آخر کار ان کو کہنا ہی پڑا کہ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا۔ اس مہ وش نے یہ کلمہ سن کر ایک نعرہ بلند کیا، اور مسکرا کر کہا کہ:

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تری قدرت   ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

اللہ اللہ آپ اور اتنی جلد ہمیں بھول جائیں، اور ہمیں دیکھ کر حیرت میں آئیں، اور پوچھیں کہ تم ہو، کون؟ اللہ ری غفلت ہم وہ ہیں جو لڑکپن میں ساتھ کھیلا کیے ہیں۔ اب سمجھے آپ یا اب بھی نہیں

سمجھے۔ اب بھی نہ سمجھو تو آزاد خدا تم سے سمجھے:

میکدے سے اٹھا ہے ابرِ بہار میری دل کی لگی بجھا دے گا

آزاد: اہا ہا ہا ہا۔ اب سمجھا۔ اُف اوہ۔ اللہ اللہ برسوں بعد جمال با کمال کا نظارہ ہوا۔ اس وقت فرطِ طرب سے عرش بریں پر دماغ ہے۔ میں بھی سوچوں کہ یا خدا یہ کون ہے کہ ایسی بے جھجک ہو کر ملی۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ بختِ خفتہ آج جاگا، مگر پہچانتے ہم تو کیوں کر پہچانتے۔ تب میں اور اب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اب تو عالم شباب ہے۔ کچھ اور ہی آب و تاب ہے:

حسینانِ جہاں مرتے ہیں کیا کیا اس کے جوبن پر
حیا پر حور قربان ہے پری صدقے ہے چتون پر

مہ وش: اہو ہو ہو۔ کیا غزل ہے۔ کیا روزمرہ ہے۔ کیا بول چال ہے کیا کلام دلکش ہے۔ اور آپ کا طرزِ غزل خوانی اور اس پر یہ خوش الحانی، کچھ ٹھکانا ہے۔ کتنے برسوں بعد کلام فصاحت التیام تمھاری زبان سے سُنا۔ یہاں اس طرح کا چرچا ہی نہیں۔ اب باتیں تو پھر کریں گے ہی پہلے اب کوئی اور غزل سُنائیے، مگر مرصّع ہو۔ ایک ایک مصرع سانچے کا ڈھلا ہوا۔

آزاد ہائے: یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کٹتی
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

مہ وش: چلو اب تو اللہ نے سب سامان بہم پہنچایا۔ تم نے ہم کو ہم نے تم کو پایا۔ خدائے پاک نے پاکباز عاشق و معشوق کو ملایا۔ اسی طرح۔ ع۔ بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا۔

آزاد سوچے کہ برسوں بعد اب تو زیارت نصیب ہوئی، اگر ابھی کہہ دوں گا کہ ردم کی تیاریاں ہیں حسن آرا کے حسن گلو سوز اور سپہر آرا کے نورِ عالم افروز بر جان جاتی ہے۔ تو قیامت ہی ہو جائے گی اور یہ حسین مہ جبین اپنی بوٹیاں نوچ نوچ کھائے گی۔ بات کو چبا گئے۔ اور کہا اچھا ایک غزل اور سُنا دیں تو پھر مزے مزے سے باتیں کریں۔ ؎

تب لُطف زندگی ہے جب ابر ہو چمن ہو پیش نظر ہو ساقی پہلو میں گل بدن ہو

مہ وش: بارک اللہ کیا مطلع ہے۔ شان تو یہی کہتی ہے کہ کسی غزلِ مسلسل کا مطلع ہے جیسے آتش کی وہ غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

آزاد :

تب لطفِ زندگی ہے جب ابر ہو چمن ہو — پیشِ نظر ہو ساقی پہلو میں گل بدن ہو
لبریز بادہ شیشے دورِ شراب گل گوں — معشوق نوجوان ہو جامِ مئے کہن ہو
مجمع مصاحبوں کا یارانِ بے تکلف — جس سے کہ ربطِ باطن مانندِ روح و تن ہو
مذکورِ حسنِ لیلیٰ تصویرِ نازِ شیریں — گہہ داستانِ مجنوں گہہ ذکرِ کوہکن ہو
بزمِ طرب مہیا جلسہ پری رخوں کا — آغوش میں وہ دلبر جو جانِ انجمن ہو
گہہ رخ ہو اس کے رخ پر گہہ لب ہوں اس کے لب پر — آبِ بقا نصیبِ کام و لب و دہن ہو
طوقِ کمر کسی دم یہ دستِ شوق اپنا — طوقِ گلو کسی دم وہ زلفِ پرشکن ہو
ہنگامِ وصلِ جاناں ایسا ہو ربطِ باہم — وہ روح میں بدن ہوں میں روح وہ بدن ہو

صفدر یہ عیش مجھ کو ہر روز ہو میسّر
کیوں کر ادائے شکرِ الطافِ ذوالمنن ہو

خیر اب یہ ذکر تو یہاں چھوڑا۔ اب یہ بتانا لازم آیا کہ یہ گل رخسار کون تھی، اور میاں آزاد سے ان کی کہاں کی شناسائی تھی۔

واضح ہو کہ میاں آزاد خانہ برباد ایک روز آگرہ سے لکھنؤ آنے کو تھے۔ ریل کے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے کہ دفعتاً جوق جوق آدمی جمع ہو گئے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیوں بھئی آج یہ جمِ غفیر اور مجمع کثیر کیسا ہے؟ سنا ہے کہ گنگا جی کا نہان ہے، اور جہاں جہاں ہندوؤں کا استھان ہے، وہاں جاتے ہیں، اور تجار بھی جوق جوق آ رہے ہیں۔ آج کئی ریلیں چھوٹیں گی، اور بڑی چپقلش رہے گی۔ ریل پر ریل آتی تھی، اور ایک پر ایک پلا پڑتا تھا۔ کوئی ڈھکیلتا تھا، کوئی لڑتا تھا۔ اتنے میں ریل آئی اور گھنٹی بجی اور اس بھبھڑ میں لوگ سوار ہوئے کہ الاماں! ایک ایک درجے میں پندرہ پندرہ بیس بیس بھرے ہوئے۔ میاں آزاد سوچے کہ اس بھیڑ میں جانا فضول ہے۔ ریلیں تو آج کئی چھوٹیں گی کسی پر سوار ہو جائیں گے۔ گھبراہٹ کیا ہے۔ ریل دن سے چھوٹ گئی۔ اب سنیے کہ ایک ہندی عیسائی اپنی دو لڑکیوں کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ ان دونوں کو ٹکٹ دیے، اور کہا کہ زنانی گاڑی میں جا بیٹھو۔ وہ بے چاری ناواقف زنانی مردانی گاڑی کیا جانیں۔ جب ریلا ہوا تو وہ بھاگ کر عورتوں کے کمرے میں دوڑ گئیں، اور ادھر ان کا باپ ریل پر سوار ہو گیا، اور کھٹ سے روانہ باشد۔ یہ بے چاری کم سن ناکردہ کار، ہاتھ مل کر رہ گئیں، اور گھبرانے لگیں۔

کہ یا اللہ اب ہم کیا کریں۔ پرایا شہر یہاں اپنا نہ بیگانہ، خویش نہ یگانہ، بڑی مصیبت پڑی میاں آزاد نے جو اُن کی پریشانی اور حیرانی دیکھی، تو یہ بھی گھبرائے اور ان کے قریب جا کر بیٹھے کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کو آرام کے ساتھ، جہاں کہیے گا وہیں پہنچا دیں گے۔ اب ذرا استقلال چاہیے۔ اضطرار سے مطلب برآری معلوم۔ اور ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ کرتے دھرتے ایک نہ بن پڑے گی۔ وہ دونوں شریف زادیاں کبھی گھر سے باہر تو نکلی نہ تھیں، ان کے دلاسا دینے اور تشفی کرنے کو غنیمت سمجھیں۔ ایک نے دزدیدہ نگاہ ڈالی تو دیکھا آدمی شریف، اور جوان حسین، اور خوش وضع ہے۔ ذرا ڈھارس ہوئی۔ وہ دونوں بہنیں تھیں۔ بڑی بہن نے خاصدان سے دو گلوریاں نکالیں، اور میاں آزاد کو دیں۔ انھوں نے دستِ حنائی دیکھا تو خوں رونے لگے۔ اب شوق چرّایا کہ صورت بھی دیکھیں، مگر آدمی جلد باز تو تھے ہی نہیں۔ سنبھلے اور سوچے کہ جلدی کیا ہے۔ اُن سے ان کے باپ کا پتا پوچھ کر تار پر خبر بھیج دی۔ ہر لفظ۔ ایک روپیہ دیا، اور رسید لی۔ وہ چھ لفظ یہ تھے

We are safe will apart soon
1 2 3 4 5 6

یعنی ہم بے خطر ہیں۔ جلد روانہ ہوں گے۔

خیر کوئی تین پہر کے بعد میاں آزاد اُن کو ریل پر لے کر بیٹھے، اور ریل چلی۔ اب وہ دونوں ان سے بالکل بے تکلف ہو گئیں۔ بڑی بہن برافگندہ نقاب، چھوٹی بہن بے حجاب۔ دونوں چندے آفتاب چندے مہتاب۔ دیکھتے ہی لوٹ ہو گئے۔ ایک کا وہ حُسن گلوسوز کہ:

حُسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند — چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
جلوۂ حُسن رشکِ شعلۂ طور — چشمِ بد دُور آنکھیں موتی چور
رُخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال — رگِ گل سے وہ ہونٹھ پان سے لال
رگِ گل سے کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

مگر دونوں حیا پرور، دونوں پاک نظر۔

آزاد: حُسنِ اتفاق سے آپ دونوں کی آج زیارت ہوئی ورنہ ہم کہاں آپ کہاں:

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو — جُدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

بڑی بہن: جی ہاں، مگر خدا نہ کرے کہ کسی شریف زادی کو ایسا دن دیکھنا نصیب ہو۔

چھوٹی بہن: آپ کی باتیں تو سنیے کہ۔ ع۔ غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو۔ ریل پر اکیلا پا کر پریٹ سے

پانوٴ نکالے ہیں۔

بڑی بہن : ہائیں ہائیں کچھ خیر تو ہے؟

آزاد : کہنے دیجیے آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ ابھی الھڑپن کے دن ہیں۔

الغرض میاں آزاد نے اثنائے راہ میں ان دونوں بُتانِ ستم ایجاد، و نازنینانِ پری نژاد سے وہ تپاک بڑھایا، کہ بالکل شیر و شکر ہو گئے۔ چھٹکی کسی قدر شوخ اور تیکھی تھی۔ اس کی انھوں نے بڑی ہی خاطر کی۔ نوبت بانجا رسید کہ بے تکلفی کی باتیں اور ہنسی مذاق تک ہونے لگا، اور میاں آزاد نے گلوریوں پر گلوریاں چکھیں، اور نقشہ جما لیا۔ اثنائے راہ میں ایک مقام پر انھوں نے ان کا پتا پوچھا اور لکھ لیا اور دریافت کیا، کہ ہم آپ کے مکان پر آئیں جائیں تو کچھ مضائقہ تو نہیں ہے۔ چھوٹی بہن نے کہا کہ وجہ! آپ آنے جانے والے کون؟ واسطہ، ہاں ابّا سے پوچھیے، وہ کہیں تو آپ آئیے۔ مگر بڑی بہن نے بات کاٹی۔ اور کہا کہ خانۂ بے تکلف ہے۔ جب چاہیے تب آئیے۔ ہم عیسائی ہیں، مگر ایسے بے تکلف نہیں۔ جب لکھنؤ پہنچے تو ریل کے اسٹیشن سے وہ اپنے گھر گئیں۔ اور میاں آزاد ان سے رخصت ہوئے دوسرے دن میاں آزاد ٹھیک وقت پر پہنچے۔ دروازے پر آواز دی، کوئی ہے؟ جواب تو درکنار ایک گلڈاک کتا آنکھیں نیلی پیلی کر کے دروازے پر آن موجود ہوا۔ میاں آزاد کے ہوش اڑ گئے۔ کہ ذرا چھیڑے تو بس کہیں کے نہ رہے۔ پھر آواز دی، مگر دور سے وہ مہوش تاڑ گئی کہ میاں آزاد ہوں گے۔ غرض کہ یہ ہر روز جانے لگے، اور رفتہ رفتہ ربط ضبط بڑھانے لگے! حتیٰ کہ وہ دونوں ایک ساتھ چمن میں ہوا کھانے لگیں۔ اور سرِ شام سے صحبت ہوتی تھی، اور میاں آزاد اشعارِ آبدار اور غزلہائے فصاحت بار، پڑھ کر اُن کو وجد میں لاتے تھے۔ اور دادِ سخن پاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ دونوں ان کی عاشقِ زار ہو گئیں۔ اب اگر کبھی میاں آزاد کو آنے میں دیر ہوئی تو قرار نہیں۔ چاندنی رات ہے، اور میاں آزاد کے ہاتھ میں ہاتھ ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہیں۔ درد دُکھ سب میاں آزاد سے کہتی تھیں اور ہر دم اُنھیں کے پاس رہتی تھیں، مگر ایک دن جب کہ میاں آزاد اور وہ دونوں خوبرویانِ پری زاد عین لطف میں گل گشت چمن اور تماشائے نسرین و نسترن کرتے تھے، تو کسی نے ان کو خط دیا، اور کہا گھوڑا اسواری کے لیے لایا ہوں، جلد چلیے! میاں آزاد نے خط پڑھا تو رو دیے اور بصد حسرت و ارمان اپنی معشوق، زہرہ تمثال، اور اُس رعنا صنمِ جادو جمال سے کہا کہ افسوس صد افسوس اب جدائی کی گھڑی آ ہی گئی۔ اس خط کو پڑھ لو اور مجھے جانے دو۔ زندگی ہے تو پھر ملیں گے، ورنہ رخصت یہ کہہ کر ان کی پیشانی پر انھوں نے بوسہ دیا اور پشتِ توسن پر ہو رہے، اور گھوڑے کو کڑکڑا دیا۔

جب تک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آیا کی تب تک وہ دونوں بہنیں سنتی رہیں، اور جب آواز نہ آئی تو غم والم نے دامن پکڑا، اور زندگی تلخ ہوگئی۔ خط پڑھا تو معلوم ہوا کہ میاں آزاد کے پدرِ بزرگوار راہی ملک بقا ہوئے اور ان کو ان کے اعزہ نے جلد بلوایا تھا۔

میاں آزاد تب کے گئے گئے اب ان سے ملے۔ ان کی زبان پر اس زمانے میں یہ شعر بہت تھا:

میکدے سے اٹھا ہے ابرِ بہار میرے دل کی لگی بجھا دے گا

جب میاں آزاد نے ان کو نہ پہچانا تو اس نے یہی شعر پڑھ دیا، اور میاں آزاد سمجھ گئے کہ وہ کون ہیں۔ ایک مرتبہ میاں آزاد نے بڑی بہن کی جان بھی بچائی تھی۔ جس سے اور بھی عاشق و مفتون تھی۔ اب بعد مدت مدید و عرصۂ بعید یہ پھر ملے۔ پرانی صحبتوں کا لطف آنکھوں میں پھر گیا اور وہ سب باتیں یاد آگئیں۔

پیر مرد نے جب دیکھا کہ آفتاب لب بام ہے، اور وقتِ شام ہے۔ سنہرے بادلوں کے عکس سے در و دیوار گلنار رہے ہے۔ چمن کی بہار پر گلزار فرخار نثار رہے ہے۔ دھانی گھٹا کا ایک سمت جمگھٹا ہے۔ جس میں کبھی بجلیاں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی حسینوں کی برق وشی کی تقلید کرتی ہیں اور کبھی چمک اور تڑپ سے نگاہِ نازِ نیم باز بزبانِ طناز بر آوازے کستی ہیں۔ یکایک میاں آزاد کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ اب میرا وقتِ وظائف و نماز ہے، تم چھت پر جاؤ۔ اس بہار کا لطف اٹھاؤ۔

میاں آزاد پیر مرد کے لحاظ و پاس سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ پیر مرد کے حکم کے بموجب تھوڑی ہی میں میاں آزاد چھت پر دوسرے زینے سے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف بالائے بام چوکیوں پر فرش مکلف بچھا ہے۔ دوسری سمت کوچ پر آسمانی اطلس منڈھا ہے۔ آرام کرسیاں ایک سمت رکھی ہیں۔ پیر مرد نے کہا اے آزادِ دالانژاد تم کو تو خود معلوم ہے، میں کیا تم سے چھپاؤں، اختر النسا ماشاء اللہ کیسی حسین مہ جبین ہیں۔ لیاقت خداداد، ذہین، ذکی ہیں، ہر فن میں مشاق، ہر ہنر میں طاق۔

زینت النسا نے کہا تم جانتے ہو کہ باوجودیکہ وہ مجھ سے سن میں کم ہے۔ مگر اس کو زمانہ سازی اور دنیا کے حالات سے محض ناواقفیت تھی۔ اماں کی لاڈلی تھی۔ ایک روز پیارے مرزا کی ممانی مہمانی میں آئیں اس وقت اختری انتظام مطبخ میں مصروف تھی، اس کی چستی اور تیزی دیکھ کر وہ دنگ ہوگئیں، اور اسی روز مرزا گوہر کے لڑکے پیارے مرزا کی نسبت بات چیت کی۔ اماں تو جنم کی بھولی ہیں ان کو چپ سی لگ گئی اور ایک بات بھی زبان تک نہ آئی۔ پیارے مرزا کی ممانی نے شادی ٹھہرائی۔ الغرض اختری کی تو شادی ہوگئی۔ مگر میں نے شادی نہ کی۔ خاتونِ مہ لقا زینت النسا نے

جو عرصۂ بعید، اور مدت مدید کے بعد میاں آزاد کو پایا تو اس کا دل جو مثلِ غنچے کے گرد انقباض میں تھا، گل کی طرح کھل گیا۔ کبھی فرطِ طرب سے چٹ چٹ بلائیں لیتی تھی، کبھی سیکڑوں قسمیں دیتی تھی۔ اگر اب یہاں سے جائے تو ہماری بھی کھائے۔ آخر ش کیا ہمارا اتنا سا بھی پیار نہیں کہ ایک ذری سی بات مان جاؤ۔ ادھر ادھر واہی تباہی مٹر گشت سے باز آؤ۔ ہم تمھارے تم ہمارے کہلاؤ۔ پچھلی صحبتیں یاد ہیں یا بھول گئے؟ وہ روشنوں میں گھومنا وہ فرطِ مستی سے کیاریوں میں طاؤسِ طناز کی طرح جھومنا، وہ قیل و قال، وہ بول چال، وہ شام کو چھپ کر آنا، اور دبے پاؤں جانا وہ نامہ و پیغام، وہ صحبتِ صبح و شام، وہ میٹھی میٹھی باتیں، وہ انوکھی گھاتیں، بھلا کہیں بھول سکتے ہو۔ مگر پیارے آزاد ایسی زندگی سے ہم باز آئے۔ رورو کے جیے تو کیا جیے۔ چچا نے ہمیں تباہ کر دیا۔ ناکوں دم آیا۔ ہم دونوں بہنوں کی وہ گت بنائی، کہ جان ہی پر بن آئی۔ دروازے پر ذرا کھڑے ہوئے اور چچا نے ایک ڈنٹ بتائی۔ چچی نے سنا تو الگ جھلا کر کوٹھے پر گئے اور دانت پیسنے لگیں۔ اتنی برائیں آتی جاتی ہیں، قسم لو کہ جو دروازوں کی راہ سے بھی جھانکنے پاتے ہوں، یا برسوں کسی اپنے پرائے کے یہاں جاتے ہوں۔ یہ درد اور یہ سر۔ عیسائی اور بھی تو ہیں، مگر ان کو روز بروز پردے کا اور بھی خیال ہوتا جاتا ہے۔ خیر۔ ع۔ گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے اللہ کی ہے "

جب تک ابا جیتے تھے تب تک انھوں نے پڑھایا لکھایا، کھلایا پلایا، میلے ٹھیلے لے گئے۔ مگر ہے ہے کتنی جلد داغ حسرت دے گئے! دیکھیے جانے کیا ہوگیا۔ ہاتھ مل کے رہ گئے۔ اب ان کے پالے پڑے ہیں۔ جب دیکھو سونٹا لیے کلے پر کھڑے ہیں۔ اٹھتے جوتی، بیٹھتے لات، ہیہات ہیہات چھٹ پنے میں ہم پر یہ بجلی گری، کہ اماں الگ سدھاریں، ابا الگ چل بسے۔ خدا بخشے! یہاں تو آنکھ کھولتے ہی رنج کی صورت دیکھی، اب چین کہاں آرام کہاں:

آشیانہ نہ چمن میں نہ قفس یاد آیا
آنکھ کھلنے ہی نہ پائی تھی کہ صیاد آیا

اختر النسا تمھارے دیکھنے کے لیے بہت تڑپتی تھی۔ اس بے چاری کو انھوں نے جان بوجھ کر کھاری کنوئیں ہی میں ڈھکیل دیا۔ ایک کم رو بدخو کے پالے پڑی ہے۔ دن رات رویا کرتی ہے۔ مورد کے آنکھیں لہو کی بوٹیاں بن گئیں۔ کلیجہ پیپ ہوگیا۔ مگر کرے کیا۔ دم بخود، قہر درویش، بر جان درویش۔ ہائے یہ سب ہماری بھونڈی رسموں کا فتور ہے۔ ٹپکی پڑ جائے ایسی موئی رسم پر۔ اس کے دل سے لگی تھی کہ کسی حسین جوان کے ساتھ نکاح ہو۔ پڑھے لکھے فہمیدہ، سنجیدہ مرد کے ساتھ بیاہ ہو۔ وہ سب رہا چھپر پر۔ ایسے کے ساتھ بیاہ دیا جس کا ٹھور نہ ٹھکانہ۔ کوئی نام تک تو۔

جانتا نہ تھا کہ کون ہے کون نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کوئی روپیہ والا، یا بہادر شاہ کے خاندان کا ہوتا۔ غریب آدمی کی لڑکی کچھ غریبوں ہی کے یہاں خوب رہتی ہے۔ امیروں میں میزان نہیں پٹتی۔ ع۔ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست ،، عالی خاندان کا غرور، معالی دودمان کا فخر، شرافت کا ناز، نجابت کا گھمنڈ، سب دقیانوس کے وقت کے خیالات ہیں۔ بڑی شرافت تو یہ ہے کہ سمجھ دار ہو۔ وضعدار ہو۔ نیک ہو۔ چال چلن اچھا ہو۔ یہ نہیں کہ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ اچھے بُرے کو خاک نہیں پہچانتے! مگر لہو مل کے شہیدوں میں داخل ہوگئے۔ ع۔ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں ،، اے تف۔ ہمارے نزدیک جس کے فعل بُرے ہوں، اس سے بڑھ کر پاجی کوئی نہیں۔ اخترالنسا کے میاں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو جو ہونا تھا سو ہوا۔ سچ کہیے گا کیسی نازک اندام گلفام، اور بھولی لڑکی ہے۔ وہ ایسے بدبخت، بدوضع کے پالے پڑے، تو جی چلے یا نہ چلے۔ چور وہ، چانڈو باز وہ، شرابی وہ، جواری وہ، بگڑے باز وہ ہیچ عیب شرعی، خاصہ چھٹا ہوا آدمی، پاک بیباک، شہدا، پھیری مُنھ پر لوئی، اور کیا کرے گا کوئی۔ بے حیائی کا جامہ پہن لیا۔ تم خوب جانتے ہو آزاد کہ سالی کو اپنے بہنوئی کا کتنا پیار ہوتا ہے، اور سالی کتنی محبت کرتی ہے، مگر قسم لو جو اس کا نام لینے کو بھی جی چاہتا ہو، اور یہاں آنے کا بھی کوئی روادار ہو۔ بیوی کا زیور سب بیچ کر چٹ کر گیا۔ کچھ داؤں پر رکھ آیا۔ کچھ کے اونے پونے کیے۔ مکان دکان سب اسی جوے کے پھیر میں گھوم گیا۔ اب ٹکے ٹکے کو محتاج ہیں۔ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن یہاں آن کر آفتابہ، خاصدان، کپڑے لتے، نہ اٹھا لے جائے۔ دن رات شہدوں لقوں بدمعاشوں لچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ کوری دھنیے جولاہے، آپ کے لنگوٹیے یار ہیں۔ چچا کو اس کا حال سب معلوم تھا ان کے کرتوتوں سے سب کو اطلاع تھی، مگر لڑکی کو بھاڑ میں جھونک ہی دیا۔ اب دیکھو آتی ہے۔ دیکھنا کیسی گھُل کے کانٹا ہوگئی۔ ہڈی ہڈی گن لو۔ مضمون گوشت کیا، مشتِ استخوان ہے۔ ابھی نئی نئی جوانی، مگر یہ حال ہے کہ اللہ ساتویں دشمن کو نہ نصیب کرے۔ میں نے آدمی بھیج دیا ہے۔ بس اب آتی ہی ہوگی۔ اتنے میں دروازے پر کہاروں نے آواز دی کہ اجی صاحب سواری آئی ہے زینت النسا نے کہا لو وہ آگئی۔ میں تو کہتی ہی تھی کہ جس وقت تمھارا نام سنے گی، فوراً چلی آئے گی۔ پھر کسی کی ایک تو سننے کی نہیں۔ بُوا بُوا۔ اے بُوا! بہن آئی ہے۔ ذری پردہ کرا کے اتروالو۔ میاں آزاد نے جھانکا تو لال لال پردہ، اور بڑی ڈولی۔ چوطرفہ پردہ ہوگیا، اور اخترالنسا۔ اتریں۔ گھر میں آکر چچی کو سلام کیا۔ چچی جان بندگی۔ چچا جان کہاں ہیں؟ اور گھر میں سب خیریت۔ چچی نے پاس بٹھایا۔ پان دیا، اور کہا

جاؤ کوٹھے پر ہیں۔ وہ جو ریل پر تم کو ملے تھے، وہ بھی بھولتے بھٹکتے یہاں آن پہنچے۔ زینت النسا نے آواز دی کہ اختری بہن چچی جان سے مل کر یہاں آؤ۔ میاں آزاد آئے ہیں۔

اختر النسا تھوڑی دیر اُس ضعیفہ کے پاس بڑے ادب سے بیٹھی۔ بعد ازاں رخصت ہو کر اور اجازت لے کر اوپر گئی۔ میاں آزاد نے اس کو اور اُس پریزاد نے ان کو دیکھا، تو دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑے، مگر مارے خوشی کے اختر النسا کی آنکھیں آنسو بھر لائیں، اور گول گول موٹے موٹے آنسو ٹپ ٹپ کر کے رخساروں پر لڑھکتے ہوئے، دامن میں گرنے لگے۔ میاں آزاد کی عجب کیفیت تھی اتنے میں آزاد نے دیکھا کہ یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، تو اس کے دستِ نازک کو چوم لیا، اور دلاسا دیا کہ پیاری اختر اتنی مدت کے بعد ملے۔ کھل کھل کے باتیں کرنا چاہیے، یا ڈاڑھیں مار مار کر رونا۔ واہ اچھی اُلٹی گنگا بہائی۔ واللہ جواب روؤگی تو اٹھ کر چلا ہی جاؤں گا۔ ہم تمھارا سب حال سُن چکے۔ بہن کیا کریں اب کچھ بس نہیں چلتا، مگر اللہ پر شاکر و صابر رہو۔ ع۔ کس کی رہی اور رہے گی کس کی،، دیکھو تمھارا ابھی خدا مالک ہے کسی حالت میں انسان کو گھبرانا نہ چاہیے۔ صابرین اور شاکرین کا بڑا درجہ ہے۔ اس پر اختر النسا نے اور بھی آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا، اور زینت النسا کی بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میاں آزاد نے جوان دونوں حسین مہ جبین لڑکیوں کو اس درجہ ملول و مغموم پایا تو ان کو سخت افسوس ہوا، اور ان کی حالتِ زار پر رحم آیا، اور یوں سمجھایا۔

آزاد : (قریب جا کر) پیاری بہن اختر النسا! دیکھو ہم تمھارے پیارے بھائی ہیں۔ وہ دن یاد ہیں، جب تم کو ہم چڑھایا کرتے تھے، اور تم انگور کی ٹٹی میں روٹھ کر چھپ چھپ رہتی تھیں اور ہم ڈھونڈ ڈھانڈ کر تم کو منا لاتے تھے، اور پھر چڑھاتے تھے، اور زینت النسا پر تم جھلاتی تھیں۔ اور وہ تم کو بناتی تھیں۔ یہ برسوں کی بات ہے۔ سچ ہے:

وقتِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ہم کو جو تمھاری دونوں کی محبت ہے، اس کا حال ہمارا خدا ہی خوب جانتا ہے، یا ہمارا دل۔ خود تم اپنے دل میں غور کرو کہ جب برسوں کے بعد ہم یہاں آئیں، اور تم کو رنجیدہ اور مغموم پائیں، تو کلیجہ پاش پاش ہو یا نہ ہو؟ قاعدہ ہے کہ مدت کے بعد جو کوئی مہمان کسی کے یہاں آتا ہے تو اس کی خاطر کی جاتی ہے، مگر تم نے ڈولی سے اترتے ہی وہ صورت بنائی کہ میرا قلب الٹنے لگا۔ اے کاش! یہ دن خدا نہ دکھلا کہ میں تم کو اس مصیبت میں گرفتار دیکھتا۔ اُف! دل قابو میں نہیں رہا۔ مگر بہن ذرا اپنے دل کو مضبوط

رکھو ورنہ تمھارے ساتھ تمھارے عزیزوں کا بھی بُرا حال ہوگا۔ اُف اوہ! تمھاری صورت ہی بدل گئی۔ چہرے کی وہ سُرخی اب زردی سے مُبدل ہے مشتِ استخوان ہو، بس یوں نازک تو تم لڑکپن ہی سے ہو، مگر رنج نے تم کو کہیں کا نہ رکھا۔ افسوس!

واضح ہو کہ زینت النسا اور میاں آزاد میں چھٹپنے ہی سے ایک قسم کی محبت تھی مگر پاک اختر النسا اس زمانے میں بالکل ہی کم سن تھیں۔ وہ میاں آزاد کو بھائی آزاد کہا کرتی تھیں، اور آزاد کو اس کی ویسی ہی محبت تھی، جیسے کسی کو اپنی خاص چھوٹی بہن کی ہوتی ہے۔ جب میاں آزاد نے اختر النسا کے شوہر کی بدوضعی، اور اس کے غم و الم کا حال سُنا ان کے کلیجے پر گویا ٹھیس سی لگی، اور دل بھر آیا، مگر بڑی دیر تک سمجھایا، اور دلاسا دیا کیے۔ اس کے بعد اختر النسا نے آہ سردِ دل پر درد سے کھینچ کر کہا کہ بھائی اس وقت تم کو کیا دیکھا، جیسے جان میں جان آگئی۔ تم تو میرے لیے مسیحا ہو گئے۔ اب پہلے تو یہ مژدہ سُناؤ کہ تم یہاں سے جاؤ گے تو نہیں مگر ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ جو تم چلے گئے تو سُن لینا! کہ اختر النسا اور زینت النسا دونوں کا جنازہ نکلا۔ بس پھر ہم جان ہی دے دیں گے۔ برسوں بعد ایک غمخوار کو پایا ہے۔ اب اس کو چھوڑ کر بھلا کہاں جائیں۔ اچھا اس کا جواب پھر دیجیے گا، پہلے اپنا حال تو بیان کیجیے، کہ آپ کہاں سے آتے ہیں، کہاں کو جاتے ہیں؟ یہاں کون لایا؟ کس نے پتا بتایا میاں آزاد نے کہا تمھارے چاروں سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہاں جذبِ شوق لایا، اور محبت نے پتا بتایا۔ باقی رہا ہمارا حال وہ ناگفتہ، کہاں سے آتے ہیں، اور کہاں جاتے ہیں یہ پھر بتا دیں گے۔

جب دن قریب اختتام و آفتاب لبِ بام ہوا تو میاں آزاد خانہ برباد، وحشی مادرزاد، کو سفر کی دھن سمائی اور حضرت نے بریا بدھنا اٹھانے کی ٹھرائی، مگر سُوچے کہ اگر کوچ کا لفظ زبان پر لاؤں گا تو ان دونوں نازک بدن غنچہ دہن، بہنوں کو خدانا کردہ مُردہ ہی پاؤں گا۔ اور ابھی اچھی طرح بدن میں سکت بھی نہیں آنے پائی کہ ہماری یہ شامت آئی کہ سرا کو چھوڑا آرام و آسائش سے منھ موڑا، عقوبتِ سفر سے ناتا جوڑا۔ اب مناسب یہی ہے کہ آج شب کو یہیں بستر جمائیں اور خوب دل کھول کر خوش گپی اڑائیں۔ اُدھر خاتون شب نے بڑے ٹھسے سے نکھار کیا، ادھر گھر کی سلیقہ شعار لونڈیوں نے لذیذ و لطیف خاصہ تیار کیا۔ میاں آزاد نے بعد مدت زینت النسا اور اختر النسا کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھایا، اور لطف مزید اٹھایا:

فصلِ گل آئی ہوا عشرت ساماں باغ میں — نغمہ زن ہیں بلبلیں طاؤس رقصاں باغ میں
ہر روش پر سرو مینا جام گل غنچے سبو — میکشی کا غیب سے کیا کیا ہے ساماں باغ میں

جھوم کر پڑھتے ہیں گلبن طفلِ مکتب کی طرح   دفترِ گل ہے کہ سعدی کی گلستاں باغ میں
باغباں ہے خواب میں جلدی جگا دے اے نسیم   پھول چن کر بھر لیا گل چیں نے داماں باغ میں

بزم میں پڑھ کر غزل خاموش صفدر ہو گیا
یا چہک کر چپ ہوا مرغِ خوش الحاں باغ میں

زینت النسا : ہائے پُرانی صحبتوں کا لطف آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آیئے کھانا کھا کر چمن میں چلیں، اور چہل قدمی کریں۔ اب باغ کیا خاصہ راغ ہے۔ بلبلوں اور خوش الحان طائروں کے عوض مسکنِ بوم و زاغ ہے۔ مگر چلیے ذرا دل بہلائیں۔ گھوم گھام کر پھر چلے آئیں مگر وہاں جا کر دل بھر آئے گا۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرے گا۔ قسم لیجیے جو مہینوں چمن کا نام بھی لیتی ہوں۔ وہاں جا کر کریں کیا سُنا نہیں :

بے گل عذار جا کے گلستاں میں کیا کیا   ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو نیا کیا

گلوں کو دیکھ کر گل بدن یاد آئے، مگر خیر سے پھول تو نام کو نہ پائے۔ پھول وہاں کہاں جنگل ہے۔ یا چمنستانِ وحشت مسکن۔ چو طرفہ آشیانہ زاغ و زغن :

نظر آتا ہے گل آزردہ دشمن باغباں مجھ کو
بنانا تھا نہ ایسے بوستاں میں آشیاں مجھ کو

اختر النسا : ہاں باجی، ہم کہتے ہی کو تھے چلیے کھانے سے فراغت پائیں تو میاں آزاد کے ساتھ برسوں بعد سیر کر آئیں۔

جب کھانے سے فراغت پائی اور تینوں نے مل کر گلوری پر گلوری کھائی! تو زینت النسا نے فرطِ طرب سے اختر النسا اور میاں آزاد کو ہمراہ لے کر باغ پر فضا و ندرت انتما میں قدم رنجہ فرمایا :

وحشت فزا ہوا ہے کچھ ایسی بہار کی   پھولا جو پھول اس نے قبا تار تار کی

ان دونوں بہنوں کے والدین عیسائی ہو گئے تھے، مگر نام نہیں بدلا تھا! نہ وضع تبدیل کی تھی۔

آزاد : اہو ہو ہو! یہ پرانا درخت ہے۔ اسی کے سایہ میں ہم رات بھر بیٹھتے تھے۔ لطف یہ کہ اندھیری رات میں کیفیت اور چاندنی میں بہار، اہاہاہا! یہ وہ روش ہے جس پر ہمارا پاؤں پھسلا تھا اور ہم گرے تو اختر النسا خوب کھل کھلا کر ہنسی۔ یاد ہے اختر النسا کیوں نہیں جب ہم جھلائے تھے تو تم ہنستی ہوئی بھاگیں، مگر بے دھڑک چمک چمک کر جو چلیں تو تمھارا بھی پاؤں پھسلا، اور دھم سے تم بھی گریں۔ تمھارے یہاں ایک بوڑھی عورت تھی زیبن کی ماں۔

اختر النسا : تھی کیا معنی۔ کیا اب نہیں ہے۔ اے وہ ہم سے ہٹی کٹی ہے۔ خاصی کٹھوتا سی بنی ہوئی ہے۔

آزاد : کون؟ زینب کی ماں، کیا وہ بوڑھی ابھی تک زندہ ہے۔ اُف کیا عاقبت کے بوریے بٹورے گی۔ اس کا تو ایک ایک بال سفید سن سا ہو گیا تھا۔

خیر وہ اختر النسا کو اٹھانے گئی مگر اس کا پاؤں بھی رپٹا، اور دھم سے گری۔ غرض کہ تین چار آدمی دھم دھم کر کے گرے۔

چلتے چلتے باغ کی کوٹھی میں جو گئے، تو وہاں اپنا لکھا دیوار پر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا کہ میاں آزاد خانہ برباد نے آج اس باغ کو معائنہ کیا۔ یہ پڑھ کر میاں آزاد بڑے مسرور ہوئے۔ دل ہی دل میں کھلے جاتے ہیں۔

اتنے میں پیر مرد یعنی اُن دونوں بہنوں کے چچا جان بھی خراماں خراماں تشریف لائے۔

پیر مرد : کہیے اب اس وقت طبیعت تو نصیب اعدا ناساز نہیں ہے۔ خبردار بھائی اب بیماری میں سفر کا نام نہ لینا۔ ایسا کوئی کرتا ہے بھلا۔ توبہ توبہ! جوانی بھی کیا دیوانی ہوتی ہے۔ ہائے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ہم نے کل آپ کو جو دیکھا تو کچھ خیال سا آیا کہ اس نوجوان کو ہم نے دیکھا ضرور ہے۔ جب یہاں آئے تو زینت النساء کی زبانی معلوم ہوا۔ کہاں رہے اتنے دن۔ بس اب تو کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ یہاں ہی رہیے۔ زینت النساء آپ کو روز یاد کیا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے آپ ہی کا نام وردِ زبان۔ بارے خدا خدا کر کے آپ کی شکل خدا نے دکھائی۔ مُنھ مانگی مراد ان دونوں بہنوں نے پائی۔ اب آپ یہاں ہی رہیے۔ زینت النساء کو جو تم سے محبت ہے وہ ان کا اور تمھارا دونوں کا دل جانتا ہوگا۔ اگر تم چلے گئے تو پھر سمجھ لینا کہ اصلیں مغلانیاں، ہجولیا، لونڈیاں باندیاں، طعنے دے دے کر ان کی زندگی وبال کر دیں گی۔ اور ان کو ایک دم بھی زندگی محال ہو جائے گی۔ ہم لوگ گو عیسائی ہیں مگر عیسائی اور مسلمان میں شادی جائز ہے۔ یہ تم کو نہ جانے دیں گی، اور نہ تم ان کو چھوڑ کر جاؤ گے۔ اسی باغ میں ہم کمرہ یا بنگلہ بنوا دیں گے۔ مزے سے زندگی بسر کیجیے۔

میاں آزاد یہ گفتگو سن کر عرق عرق ہو گئے۔ ہاں کہیں تو نہیں بنتی نہیں کہیں تو شامت آئے چُپ، لب، بند، سنّاٹے میں تھے کہ کہیں تو کیا کہیں۔ روم جانے کی دُھن تو سمائی تھی۔ حُسن آرا اور سپہر آرا ہر دم اُن کے گویا پیشِ نظر رہتی تھیں، اور دل سے لگی تھی کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، ہم روم ضرور بالضرور جائیں گے۔ ع۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب اندا ختیم "۔ الشعی منی

وَالاتمام من اللہ۔ پیر مرد سے انھوں نے مسکرا کر کہا کہ قبلہ و کعبہ ابھی تو میں یہاں ہوں ہی آپ کے جو کچھ فرمایا اس کا مشکور رہوں لیکن بعد غور و فکر جواب عرض کروں گا۔

پیر مرد گھر کی طرف جانے لگے، پوچھا کہ کیوں بھئی وہ تمھارے ساتھ پستہ قامت کون آدمی تھا، کچھ اس کی بھی خبر ہے۔ یا یہاں آکر اس سے بالکل غافل ہی ہو گئے۔ واہ اچھا ساتھ دیا۔ تب تو میاں آزاد چکر میں آئے کہ لاحول ولا قوۃ۔ خوجی وہاں ہی پڑے رہے اور ہمیں خیال بھی نہیں رہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ گالیاں ہی دیتا ہوگا۔ پیر مرد نے اپنے ایک آدمی کو روانہ کیا، اور پتہ دیا کہ فلاں مقام پر جا کر ان کو اپنے ساتھ لے آؤ، اور اس باغ میں ٹھہراؤ۔

میاں خوجی کا حال زار سنیئے کہ چار گھڑی دن رہے تک تو میاں آزاد کے خیال میں غلطاں پیچاں رہے۔ اب آئیں اب آئیں مگر اُن کا پتہ ہی نہیں۔ ندارد۔ اتنے میں ان کی گھوڑیا ایک کسان کے کھیت میں چرنے لگی۔ کسان نے للکارا کہ ارے کس کی ٹٹوی ہے رے۔ اب آپ سُن رہے ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس نے خوب گالیاں دیں، آپ بیٹھے سُنا کیے۔ ٹٹوی پر دو چار ڈنڈے بھی پڑ گئے، مگر حضرت خاموش۔ جب اس نے ٹٹوی کو پکڑا اور کانجی ہوس لے چلا، تب تو آپ چونکے، اور لپٹ کر اس سے گلنجپ کرنے لگے، وہ جھلایا کہ ایک تو کھیت کا کھیت ہمارا ستیاناس کر دیا۔ اس سرے سے اُس سرے تک چروا دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ غراتے اور آنکھیں دکھاتے ہیں۔ ایک دھکا جو دیا تو آپ نے بنیس لڑھکنیاں کھائیں اور سنبھل کر اٹھے تو ماشاء اللہ وہی خم وہی دم۔ دبی بلوں پر طبیعت غل مچا کر کہا کوئی ہے۔ لانا تو قرولی۔ وہاں تھا کون۔ کانا ٹٹو اور بدھو نفر، سو وہ کانا ٹٹو بھی کانجی ہاؤس جاتا ہے۔ جب خوجی نے دیکھا کہ وہ کسان ہاری جیتی ایک نہیں مانتا، اپنی ہی سی کہے جاتا ہے تو آپ کو یہ سوجھی کہ دھم سے ٹٹوی کی پشت پر۔ کسان نے کہا اچھا جہاں گدھے بندھتے ہیں وہاں ہی تم کو بھی ہم باندھیں گے۔ کانجی ہاؤس کے ایک کونے میں تم بھی باندھے جاؤ گے، اور اپنے کو مفت میں الو بناؤ گے۔ خیر آپ مزے سے اس کی پیٹھ پر لدے ہوئے چلیے، اور بار بار قرولی مانگتے جاتے ہیں۔ آگے آگے کسان، پیچھے پیچھے ٹٹوی، اور ٹٹوی کی پیٹھ پر خوجی۔ کہاں چلے میاں، چلے کہاں کانجی ہاؤس چلے اور کہاں جائیں گے۔ کسان بولا گدھے ہیں یہ کھیت کھائے جاتے تھے، اب دھرے گئے۔ پیر مرد کا آدمی جو گیا تو خوجی کا کہیں پتا ہی نہیں۔ وہ کانجی ہوس پہنچے آدمی نے اِدھر اُدھر ڈھونڈھا، اور جا کر کہہ دیا کہ وہاں خوجی نہ ٹٹو۔ اسباب اور گھوڑی اور سائیس حاضر ہے۔ میاں آزاد خانہ برباد، اور وہ دونوں اصنام پری زاد، اس گلزار خوش سواد میں چہاں چہاں اور خراماں خراماں تماشائے ریحان ضیمران کرتے تھے۔ کبھی میاں آزاد نے اپنی پیاری

زینت النسا کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور ٹہلنے لگے۔ کبھی اختر النسا کو ساتھ لیا اور روشوں پر سیر کرنے لگے۔ کبھی بیچ میں آزاد۔ اغل بغل پری زاد سرو قامت رشک شمشاد اس وقت ان تینوں بچھڑے ہوؤں کا عجب حال تھا، کبھی فرط طرب سے اشک جاری، کبھی مارے خوشی کے گریہ وزاری، کبھی کھل کھلا، کھل کھلا، ہر ایک نے دوسرے کے چٹکی لی۔ اس نے قہقہہ اڑایا۔ اس نے ذقن بھری۔ چو طرفہ باغ میں اچکنے لگے۔

اختر النسا بعد مدت آج اس قدر ہنسی تھی، ورنہ اس کے شوہر نے اس کے دل کو مرکزِ دائرہ ادبار، اور نقطۂ پرکارِ انتشار بنا دیا تھا۔ میاں آزاد کا ساتھ جو گلزار پُر بہار میں مطلق العنانی، اور آزادی سے ملا تو غنچۂ دل نسیمِ بہجت کے اہتزاز سے کھِل گیا۔ گویہ خزانۂ قارون مل گیا۔ نعمت غیر مترقب ہاتھ آئی۔ منھ مانگی مراد پائی۔ سمجھی کہ بخت خفتہ بیدار ہوا۔ بیڑا پار ہوا۔ گھڑی گھڑی خدا کا شکر بجالاتی تھی، اور بار بار کھلی جاتی تھی۔ چہرہ گلنار تھا، مگر دیدہ اشکبار تھا۔ سکندر نے ظلمات میں وہ نہیں پایا، جو زینت النسا نے شربتِ دیدار آزاد میں پایا۔ اختر النسا تو مریضِ عارضۂ غم والم تھی ان کو کیا دیکھا کہ گویا مسیح[1] آسمانِ چہارم سے اتر آیا۔ بڑی دیر تک باغِ پر فضا و گلزار دلکشا میں جھوم جھوم کر چہل قدمی کی زینت النسا محوِ دیدار۔ اختری باغ و بہار، مگر آزاد ظاہر میں خوش، باطن میں دل فگار۔ وہ دونوں بہنیں سمجھی تھیں کہ میاں اب یہاں سے نہ جائیں گے۔ نہ جائیں گے، اسی کلبۂ احزاں کو منور فرما دیں گے۔

اختری سمجھی کہ اب زینت النسا کے ساتھ ان کا نکاح ہوگا۔ زینت النسا کھلی جاتی تھی کہ اب ہمارا بیاہ ہوگا۔ مگر آزاد کو حسن آرا کی دھن تھی۔ یہی ادھیڑ بن تھی۔ وہ یہاں تھے، مگر دل کہیں اور تھا۔ سوچتے تھے کہ خداوند جس گھڑی ہم ان دونوں سے رخصت ہوں گے۔ وہ بھی کیسی قیامت کی گھڑی ہوگی۔ کہرام مچ جائے گا۔ حشر سامنے آنکھوں کے نظر آئے گا۔ شورِ محشر بپا ہوگا۔ ستم کا سامنا ہوگا۔ اختر النسا کی جان خدانا کردہ ہونٹوں پر آتے گی۔ زینت النسا اپنے دل میں شرمائے گی، کہ یا الٰہی یہ کیا ہوا۔ آزاد نے دو گھڑی کو آن کر مفت کا رنج دیا۔ ع۔ نیا غم دے گئے دم بھر کو آ کے، یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اختر النسا نے کہا کہ اب چلیے مہتابی پر چل کر بیٹھیں گے تو لیٹے لیٹے خوب باتیں ہوں گی۔

میاں آزاد سوچے کہ بھئی ہم بھی واللہ کتنے خوش نصیب آدمی ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، جس سے ملتے ہیں، جو دیکھتا ہے، جس سے ملاقات ہوتی ہے، سب سے یہی پیغام سُنا کہ نکاح پڑھوا لو، جو کہیں ہم بیاہ کرنے پر مستعد ہوں تو ایک ایک شہر سے ایک ایک درجن بھر بیویاں لائیں۔ کھانچی کی کھانچی جورووں

---

[1] مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہیں چوتھے آسمان پر موجود ہیں ان کی پھونک سے مریض شفا پاتے تھے تفصیل فرہنگ میں دیکھیے۔

ہی سے بھر جائے۔ معقول اچھی منڈی مقرر کی ہے۔ ایک دو نہیں کھا نچی بھر کے۔ حسن آرا، سپہر آرا، اللہ رکھی، زینت النسا، اختر النسا، جس کو چاہوں بیاہ لوں، مگر حسن آرا کے سوا اور سب حرام ہیں۔ لیکن پیر مرد بھی واللہ کیا بے تکلف بزرگ ہیں۔ کیسے مزے مزے ہم سے کہا کہ اس چمنستانِ بے خزاں میں وہ طلسمات کا سماں ہو، کہ چکا چوند کا عالم ہو، نظر نہ ٹھہرے۔ زینت النسا تمھاری عاشق زار ہے۔ اور اس کا عشق صادق ہے۔ بھلا ممکن ہے کہ تم اور اس کو چھوڑ کر جاؤ۔ خود بھی صدمہ مفارقت اٹھاؤ۔ اور اس کو بھی تڑپاؤ۔ واللہ ایسے بے تکلف بوڑھے بھی نہ دیکھے ہوں گے، مگر وہ بھی سمجھے کہ سیم تن کے لیے شوہر بھی گل بدن چاہیے، اور آزاد ہی کا سا غنچہ دہن چاہیے۔ مگر جس وقت ہم نے اختر النسا کا حال زار دیکھا تو کلیجہ منھ کو آیا۔ ہندوستان کی رسومِ مذموم سے خدا سمجھے۔ یہ شادی ہے یا رنج والم کی خانہ آبادی ہے۔ یہ شادی ہے یا خانہ بربادی۔ میاں کوہ ہماچل کی سیر کر رہے ہیں، بیوی مدراس کے بندر میں اچک رہی ہیں، اور یار لوگوں نے شادی ٹھہرائی ہے۔ شوہر سندربن میں۔ جورو جھالرا پاٹن میں۔ اور جھپ سے جنم پتری ملا کے، اور کنڈلی دکھا کے، بھونری کی تیاری تو کر ہی دی۔ ع۔ خانہ ملاح در چیں ست وکشتی در فرنگ :۔ یہاں تو والدین کی یہی نیت رہتی ہے کہ لڑکی کو کسی طرح بھاڑ میں جھونک ہی دیں، یا اندھے کنوئیں میں ڈھکیلیں۔ اختر النسا کے چچا نے سمجھ بوجھ کر شادی کی ہوتی تو یہ روز بد کیوں دیکھتی۔ اس کی کیوں حالت اس درجہ زار ہوتی۔ رنج والم سے کیوں دوچار ہوتی۔ زینت النسا رکیوں صید انتشار ہوتی۔ ان باتوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو جی جلتا ہے، اور بے اختیار کلیجہ منھ کو آتا ہے، مگر اپنا بس ہی نہیں چلتا ہے۔ کریں کیا، کہیں کس سے؟ یہ سوچے کہ کل صبح کے وقت یہاں سے بستر اٹھائیں، اور سیدھے روم ہی جائیں۔ بس راستے میں کہیں بسیرا نہ کریں۔ اس میں جئیں یا مریں۔ لیکن زینت النسا سے کیا کہیں، اختر النسا سے کیوں کر رخصت لیں۔ وہ تو رو رو کے اپنا حال خدا نخواستہ تباہ کریں گی۔ ناکوں دم آجائے گا۔ مگر بختِ خفتہ نے یاوری کی، اور خدا نے اُن کی سن لی، جب مہتابی پر جا کر فرشِ مکلف پر بیٹھے اور چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلیں، تو زینت النسا نے کہا کہ میاں آزاد کہو ان پہیلیوں میں سے بھی کوئی یاد ہے؟ اختر النسا بولی ہاں ہاں میرے آزاد، تمھیں اللہ سوں کوئی پہیلی بجھواؤ۔ بہت دن ہوئے کوئی چیستاں سننے میں نہیں آئی۔

آزاد: اچھا بوجھیے۔

اشتر کلنگ بے دم نی جو خورد نہ گندم

آبی خورد ز دریا فیضی دہد بہ مردم

اختر النسا: حقہ ہے۔

زینت النسا: واہ کہیں ہو نہیں۔ ایسی بڑی بوجھنے والی آئیں۔ ہم بتائیں، دیکھو۔ بادل، کیوں؟

آزاد: ہاں! ابر ہے۔ اچھا اور بوجھیے۔

آن چیست، دہن ہزار دارد   در ہر دہنی دو مار دارد
شاہیست نشستہ بر سر تخت   آن را ہمہ در شمار دارد

اختر النسا: ہزار دہن، یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

زینت النسا: گنتی کیسی؟

آزاد: کچھ نہ بتائیں گے، جو پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔

اختر النسا: اہاہا۔ میں سمجھ گئی۔ اللہ کی سوں سمجھ گئی۔ بیشک تسبیح ہے (کود کر) کیوں کیسی بوجھی، تسبیح ہے، ضرور تسبیح ہے۔

آزاد: ہاں اچھا یہ تو کوئی بوجھیے بھلا۔ تن گورد مکھ سانور دریں سمندر تیر۔ ارے! تو یہ نہیں کہیں گے۔ اور سُنیئے!

راجا کے گھر آئی رانی   اوگھٹ گھاٹ وہ پیوے پانی
مارے لاج کے ڈوبی جائے   ناحق چوٹ پڑوسی کھائے

زینت النسا: وہ رانی کیسی جو اوگھٹ گھاٹ پانی پیوے، اور پڑوسی کے چوٹ کھانے سے کیا علاقہ؟ ہماری سمجھ وجھ میں نہ آنے کی، بتادو بس اب بوجھ چکے۔

اختر النسا: واہ دیکھو بوجھتے ہیں، گھڑیال ہے۔

آزاد: واللہ خوب بوجھی۔ اچھا اب کی بوجھیے!

ایک نار سبھا میں جب آئے   ساری سبھا بھوچک رہ جائے
چاتر چاتر دا کے یار   مُورکھ دیکھیں سونھ پسار

زینت النسا: (تھوڑی دیر غور کر کے) اس کو کوئی بوجھ دے تو مٹھائی کھلاؤں۔

آزاد: اس وقت یہاں موجود ہے۔ بس اتنا اشارہ بہت ہوتا ہے، سمجھ جائیے۔

اختر النسا: ہم ہار گئے۔ اب آپ بتادیں۔

آزاد: بتا ہی دوں پھر، یہ چیستان کی پہیلی ہے۔

زینت النسا : ارے، اُف کتنی موٹی بات پوچھی، اور ہم نہ بتا سکے۔ توبہ توبہ۔

اختر النسا : اچھا بس ایک اور کہہ دیجیے، پھر نہ کہیے گا۔ بس ایک ہندی کی پہیلی ہو، یا خیر جانے دیجیے۔ آپ کو کہانیاں بہت سی یاد ہیں۔ کوئی کہانی ہی کہیے، مگر اچھی کہانی ہو۔ لڑکوں کے پھسلانے کی نہ ہو۔

زینت النسا : ہاں کہانی سنے کو بہت دن ہوئے۔

ایک کہانی

آزاد : ایک ملک میں جس کا ہر کوچہ دبرزن خوش سواد، اور چپہ چپہ آباد تھا۔ دو بہنیں رہتی تھیں۔ دونوں خواندہ و تربیت یافتہ۔ دونوں گلفام و نازک اندام۔ دونوں پری رو اور یاسمن بُو۔ دونوں حسین و زہرہ جبین۔ دونوں حیا پرور اور پاک نظر۔ دونوں عفّت مآب، و عصمت انتساب۔ زہّاد ان کے شیدا۔ دیندار ان پر فدا وہ عشوہ گری، وہ شانِ دلبری، کہ واہ جی واہ۔ ایک عالم ان کے عارض پر ہزار جان سے مفتون۔ وہ لیلیٰ اور خلقِ خدا مجنوں۔ انداز معشوقانہ، چال مستانہ، شوخ وچالاک، مثلِ بُلبُل مست و بیباک، باغ پر فضا میں بہار روح افزا، اور بیچوں بیچ میں ایک قصر دلکشا۔ کہیں تختہ گلاب، کہیں لالہ شاداب، کہیں موریلوں کی سریلی جھنکار، کہیں پپیہوں کی پکار، چوطرفہ سبزہ زار پر بہار، اور قصرِ فرح بخش کے نیچے رود بار اس میں رنگین بجرے چھوٹتے تھے، اور صافی مزاج جوان، نظّارہ بازی کے مزے لوٹتے تھے۔ حُسنِ اتفاق سے اک جوانِ طنّاز کی ان بتان نازک انداز سے آنکھ لڑ گئی۔ اُس کی اِن پر، اور اِس کی اُن پر نظر پڑ گئی عشق نے طرفین سے زور کیا، اور صدمہ بیجا نے بالکل بھور کیا۔ ان کا دل پر اضطراب، انھیں صدمۂ مفارقت کی تاب نہ جدائی کی تاب وہ اُدھر سر دُھنیں، یہ اِدھر تنکے چنیں۔ نہ ان کو چین نہ ان کو آرام۔ عیش و عشرت کو دُور ہی سے سلام۔ آخر کار جذبۂ دل نے دونوں کو ملا ہی دیا۔ وصالِ نصیب ہوا۔ کچھ دن بجروں پر خوب سیر دریا کی، اور ایک دوسرے کی محبت آزمائی، مگر شادی حرف فرطِ حیا سے لب تک نہ آیا۔ دونوں میں سے ایک نے بھی کچھ عرصہ تک اپنا مافی الضمیر نہ بتایا، مگر آنکھیں ہی ترجمانِ دل تھیں۔ کہنا سُننا کیا تھا۔ عشق بھی بھلا چھپانے سے چُھپ سکتا ہے، کیا مجال۔ عاشق کا گریبان، اور چاک نہ ہو محال، بلکہ محض محال۔ اُس جوان کو عشق خام نہ تھا ان کو عشق برائے نام نہ تھا۔ عشق صادق تھا، مگر بخت نہ مُساعد، نا موافق تھا۔ آخر کار ایک روزِ سعید بہتر از عید، اُس جوانِ طنّاز نے اپنی ناظورۂ ملائک نظر فریب، عدوے صبر و شکیب کو باغِ روح افزا میں تنہا مصروفِ سیر

چمن پاکر جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا کہ اب تو مصاحبت کو عرصہ ہوا۔ ایک التماس عجز اساس ہے۔ اگر سُن لو اور قبول کر دو تو شاہدِ آرزو سے ہم آغوش ہو جاؤں، اور گلِ مراد سے بھری جھولی لے جاؤں۔ اس نے مطلب کی بات چبائی، اور کسی قدر تنک کر یوں زبان پر لائی، کہ بس ذرا دُور ہی سے بات چیت رہے۔ اب تو آپ نے پیٹ سے پاؤں نکالے۔ ماشاءاللہ آپ بھی چر کنے لگے۔ اے تیری قدرت! ذرا آئینہ میں مُنھ تو دیکھیے۔ یہ شکل، یہ صورت، یہ وحشیوں سی قطع، یہ جنگلیوں کی سی وضع، اور یہ شوق، یہ ذوق، آج سے آپ ہمیں صورت نہ دکھائیے گا، اور دکھائیے گا تو باغ میں نہ آئیے گا۔ جوانِ طنّاز تو مزاج دانِ معشوقانِ شیریں انداز تھے ہی، تاڑ گئے۔ اور تھوڑی دیر سکوت کر کے مُنھ بنایا اور یہ شعر پڑھتے ہوئے چلے ؎

محفل سے تیری ادبتِ ناآشنا چلے
آئے تھے درد و رنج اٹھانے اُٹھا چلے

جب اس سیم تن نے دیکھا کہ اس کا عاشقِ زار اُٹھ کر چلا تو بگڑی ہوئی بات یوں بنائی کہ اے ہے یہ کج ادائی۔ عاشق تو ہوئے مگر خیر سے مزاج میں معشوق پن ہے۔ تو ہم پر چھدار کھ کر نہ جائیے گا۔ جوان نے آہِ سرد بھر کر کہا کہ :

محفل سے تیری ادبتِ ناآشنا چلے آئے تھے درد و رنج اٹھانے اُٹھا چلے

اپنے دل میں سمجھ گئے کہ مطلب نکل آیا، اور آہستہ سے یہ شعر پڑھا :

بہت نزدیک ہے ہم عاشقوں سے کوچۂ جانان
تھکے ماندے مسافر آگئے ہیں پاس منزل کے

وہ حسین و خوش ادا مسکرائی، اور یہ شعر پھر زبان پر لائی :

ہوا بے ہوش مجنوں دیکھتے ہی جلوۂ لیلےٰ
پڑے غفلت کے پردے اٹھ گئے پردے جو محمل کے

الغرض کئی مہینے تک یہی بات چیت رہی آخر کار جوان طنّاز سے اُس بت سراپا انداز، سرمستِ خوبی، محو ناز، نے کہا کہ ہم تم راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ لیکن ایک شرط سے نکاح کریں گے، اور وہ پوری ہو تو ہم پھر ضرور بیاہ کریں گے۔ وہ یہ کہ تم ردم جاؤ اور وہاں سے سُرخ رو ہو کر آؤ۔ روسیوں کے ظلم سے اہلِ اسلام کو بچاؤ، اور تمغۂ مجیدی لٹکاؤ۔ جوانِ طنّاز نے یہ شرط منظور کر لی۔

اختر النسا : سچا عشق تھا۔ عشقِ خام نہ تھا۔

آزاد : مگر وہاں سے چلے، تو راہ میں نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ کسی اور کے ساتھ شادی کرلی، اور اس کو جل دیا۔

اختر النّسا : توبہ توبہ! بڑا بُرا کیا۔ بڑی حماقت کی، بڑی غلطی کی۔ گویا عشق نہ تھا بس زبانی ہی داخلہ تھا۔ یا وہ گرما گرمی، یا یہ سرد مہری۔ یا بہ آن شوراشوری یا یہ ایں بے نمکی۔

زینت النّسا : رنج ہوا جو اس قدر عاشق زار تھا تو آنکھ نہ ڈالتا، روم جاتا، اور پھر جاتا۔ مگر کوئی مزوّر، مکّار عیّار، فقرہ باز تھا، عاشق نہ تھا۔ عاشق ہوتا تو روم جاتا۔ ایک نہ مانتا۔

واہ رے آزاد۔ سفر کرتے کرتے ایک ہی کائیں ہو گئے۔ بجاکس چلکے سے اُن دونوں کی زبان سے قبولوا لیا کہ روم جانا ضرور ہے۔ وہ بے چاری کیا جانتی تھیں کہ جوان طنّاز اس پیرایہ میں اپنا ہی حال کہہ رہے ہیں، اور ہم کو جھانسا دے رہے ہیں۔ انھوں نے سادگی سے کہہ دیا کہ روم ضرور جانا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میاں آزاد نے دست بستہ کہا کہ، پیاری زینت النسا جو کہو وہ کروں۔ یہ میں نے اپنی ہی داستان در پردہ سنائی، اور اپنی ہی حالتِ زار بتائی۔ اب جو حکم دو وہ منظور، جو صلاح بتاؤ وہ قبول۔ ایک کافر پر دل آیا ہے، اور اسی نے وعدہ فرمایا ہے کہ روم جاؤ اور وہاں سے نیک نام ہو کر آؤ تو شہنائی ہمارے دروازہ پر بجے، اور برات سجے۔ یہاں تم کو دیکھا تو اب قدم نہیں اٹھتا، مگر اپنی بات کا پاس ہے۔ اب صلاح معقول دو۔ اور قسم لو جو تمھاری صلاح کے خلاف عمل میں لاؤں تو سور ہی بن جاؤں اس قدر سُنا تھا کہ اختر النسا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور زینت النسا کا رنگ فق ہو گیا۔ سکتے کا عالم تھا۔ ایک نے زور سے کہا ہائے! دوسری تڑ سے فرش پر گر پڑی، اور کراہنے لگی۔

اختر النّسا : ہائے تو پھر آئے یہاں کیا کرنے۔ فرقت کے دھڑکے نے مار ڈالا۔ اب دن کو آہ وزاری اور شب کو اختر شماری رہے گی۔

زینت النّسا : خدا کرے ہم خواب دیکھ رہے ہوں۔ آزاد تم ہمارے دشمن نکلے۔ آرزو کی کمر توڑ چلے۔ ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں :

شکوہ نہیں ہے آپ جواب پوچھتے نہیں　　وہ شکل مٹ گئی وہ شباہت نہیں رہی

آزاد : شکل وہی، شباہت وہی، عشوہ وہی، وجاہت وہی، جوبن وہی، ملاحت وہی، شباب وہی، آب وتاب وہی، ہم وہی، مگر۔

زینت النّسا : مگر کوچہ گردی کی دُھن سمائی ہے۔ شیطان نے انگلی دکھائی ہے۔ کسی پری رو پر طبیعت آئی ہے:

لیے پھرتا ہے مجھ کو جا بجا دل   مرا بے چین میرا چلبلا دل

اختر النسا : باجی اب ان کو یہی صلاح دو کہ ردم جائیں، مگر قول وقرار کر لو کہ جب واپس آئیں تو ہم سے بھی ملیں۔ ہمیں۔ بھول نہ جائیں۔

آزاد : کیا مجال۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی کہ نہ ہوئی قرولی ورنہ خون کے شرّاٹے بہنے لگتے۔ کئی آدمیوں کا خون ہو گیا ہوتا۔ وہ تو کہیے خیر گذری، نورنہ ستم ہی ہو جاتا۔ میاں آزاد نے پکارا بھائی خوجی ہیں؛ میاں خوجی نے کہا واہ، واہ، کیا ساتھ دیا۔ ہم کو چھوڑ کر بھاگے اور بھاگے تو خبر بھی نہ لی۔ یہاں کسان سے ڈنڈا اچل گیا۔ کانجی ہوس میں ایک برقنداز سے لاٹھی پونگا ہو گیا، اور یہاں تک آتے آتے نہ جانے کتنے آدمیوں سے گلخپ ہوئی۔ آپ کو کیا؟

آزاد : اجی چلو۔ صحیح سلامت تو آئے، اب تنگ تو بڑا اتارو، اور گھانس وانس کھاؤ، اور یہاں تک آئے کیوں کر آپ؟

خوجی : اجی وہی بوڑھے بزرگ راہ میں ملے۔ وہ یہاں تک لے آئے، ورنہ کانجی ہوس میں واقعی گھانس ہی کھانے کی نوبت آتی۔ خوجی نے باہر بستر جمایا، اور کھانا کھایا۔ اور حقہ گڑگڑانے لگے۔

میاں آزاد خانہ برباد، نور کے تڑکے زینت النسا اور اختر النسا سے رخصت ہوئے۔ زینت النسا مغموم و گریاں، اختری مصروف آہ وفغاں، روتے روتے، ہچکیاں بندھ گئیں۔ میاں آزاد بھی رقیق القلب آدمی زار زار رونے لگے۔ آخر کار دونوں کو سمجھایا کہ اس رونے دھونے سے بجز اس کے کہ خود بھی ہلکان ہو اور ہم کو بھی حیران کرو، اور دل کو کڑھاؤ کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ سکوت اختیار کرو۔ اور مشیّت ایزدی سے انسان کو مجبور سمجھ کر خاموش ہو رہو۔ لو میں اپنی تصویر دیے جاتا ہوں۔ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھنا۔ خدائے پاک کی قسم میں خطوط برابر بھیجتا رہوں گا، اور جب واپس آؤں گا تو پہلے تم سے ملوں گا، پھر کسی اور سے۔ یہ کہہ کر پانچ اشرفیاں زینت النسا، اور پانچ اختر النسا کو دیں۔ اور زینت النسا کے چچا اور چچی کو بُلا کر یوں سمجھایا۔

قبلہ وکعبہ آپ بزرگ ہیں۔ اب کلہ بکلہ آپ سے کون لڑے۔ مگر چاہے آپ برا مانیں، چاہے بھلا۔ اتنا تو ہم ضرور کہیں گے۔ نیچ کھسٹ کہیں گے۔ ڈنکے کی چوٹ کہیں گے کہ آپ نے اختر النسا بے چاری کو زندہ درگور کر دیا۔ جیتے جی مار ڈالا۔ دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ آخر سوچو تو کہ یہ تم کو سوجھی کیا، اتنے بڑے بوڑھے ہوئے، اتنا نہ سوچے کہ اس خدائی خوار، گدھے سوار کو جو لڑکی دوں گا تو اس کی ساری

عمر مفت میں برباد ہوگی، یا نہ ہوگی، آدمی اپنی لڑکی کو بیاہے تو ذرا تو سوچے کہ داماد کیسا ہے۔ سلیقہ شعار ہے، یا بدتمیز۔ شہدا ہے یا ہر دل عزیز۔ یہ نہیں کہ شہدوں لقّوں اوباشوں، بدمعاشوں کے حوالے کر دیا۔ اس بے چاری کو ساری عمر آپ نے آتشِ غم میں جلایا اور اس کے حسن و جوانی کو خاک میں ملایا۔ سُنا ان کے میاں پاک بیباک، چھٹے ہوئے شہدے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ نے کیا ستم ڈھایا۔ خیر جو ہوا وہ تو ہوا ہی۔ اب فرمائیے کہ اب بھی کوئی تدبیر ہے۔ یا اختر النسا سے ہاتھ ہی دھو بیٹھیں، اور اپنی قسمتوں کو رو بیٹھیں۔ وہ کچھ لکھا پڑھا بھی ہے، یا بالکل کورا۔ الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو ایک اجنبی آدمی ہوں، میں بلاتا تو وہ بھڑک جاتے، اور کہنا بھی نہ مانتے، مگر آپ بلائیے اور کسی روز سمجھائیے کہ آخرکار کچھ انجام بھی سوچتے ہو، یا تمام عمر شہدوں ہی کی صحبت میں صرف کروگے، اور پند و نصائح کیجیے۔ شاید راہ راست پر آئے، اور اپنے دل میں اپنے افعال ناشائستہ پر شرمائے، اور پھر آئندہ ایسی حرکاتِ لغو سے باز آئے۔ گفتہ گفتہ اثرے دارد۔ اور اگر وہ سیدھے ڈھرے پر نہ آیا اور آپ کا کہنا اس نے نہ مانا تو خیر مجبوری ہے۔ یا قسمت، یا نصیب، یا بخت!

پیرمرد نے یہ نصیحت سُن کر ایک آہ سرد کھینچی، اور کہا کہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا ہم کو اختری کا پیار نہیں؟ کیا ہم اس بے چاری معصوم کو گرفتار رنج و محن دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مگر کریں کیا اب تو جو ہوا سو ہوا، اور اس بدبخت لڑکے کو سمجھائے کون۔ سُنا نہیں:

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
پر کوئی اتنا تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

بس وہ سمجھ چکے۔ پڑھا لکھا بھی واجبی ہی واجبی ہے۔ ہم تو ہاتھ مل کر رہ گئے۔ اب آپ پوچھیے گا کہ آخر لڑکی دی ہے کیوں، ایسے جاہل شہدے کو۔ اس کا جواب بجز الفعال کے اور کیا ہے۔ سکوت اور پشیمانی ہی اس کا جواب ہے۔ افسوس کیے سے اب کیا ہوتا ہے۔

میاں آزاد نے کہا کہ واہ رے انگریزو۔ واللہ ان کے یہاں کتنی عمدہ رسم ہے کہ جب تک نوکر چاکر نہ ہو تب تک شادی نہیں کرتے۔ وہ تو شادی کر بھی لیں چاہیں، مگر ان کو لڑکی کون دے۔ اور اگر کوئی بیوقوف لڑکی دینے پر آمادہ بھی ہو جائے تو لڑکی بھلا کب منظور کرے۔ خلاصہ یہ کہ جب تک ان کو بخوبی معلوم نہیں ہو لیتا کہ ہم اپنے بال بچوں کی اچھی طرح سے پرورش کر سکیں گے، تب تک ممکن نہیں کہ بیاہ ہو۔ اس سبب سے وہ مزے مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہندوستانی مصیبت کے شکنجے میں اپنے آپ کو جکڑ دیتے ہیں۔ عاقبت اندیشی کی دم میں موٹا سا رسا۔ اور آخر بینی کی ایسی

تیسی - چاہے فاقے کرتے ہوں مگر بیاہ ضرور کریں گے۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ جورو و بال، اور لڑکے جنجال۔ اپنے ساتھ اس کی مٹی بھی پلید کرتے ہیں، اور عمر بھر رنج و غم سہتے ہیں۔ شادی کے معنی خوشی ہیں۔ مگر ہندوستان کی شادی کبھی کبھی غم کے معنی پر استعمال میں آتی ہے۔ شادی کا متقابل لفظ یہاں خانہ بربادی ہے، اور انگلستان میں شادی، اور خانہ بربادی الفاظ متناقض سمجھے جاتے ہیں۔ شادی اور خانہ آبادی الفاظ متقابل۔ ع۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا" افسوس ہے کہ اختر النسا سی نیک نہاد، پریزاد، والانژاد، اور ایسے مدعیِ خرد دشمنِ تہذیب عدوے عقل کے پالے پڑے الاماں۔ الاماں۔ الحذر۔ الحذر۔ اب اس غلطی سے آپ کو آیندہ کے لیے نصیحت حاصل کرنا چاہیے کہ زینت النسا کی ذرا سمجھ بوجھ کر شادی کیجیے گا۔ ایسا نہ ہو کر اس بے چاری کو بھی کسی لقچے کے حوالے کیجیے۔ اگر زینت النسا کسی اچھے گھر بیاہی جائے اور اس کا شوہر بھی فہیدہ و سنجیدہ آدمی ہو تو، اختر النسا کے بھی کسی قدر آنسو پچھیں، کہ خیر میں تو دین و دنیا دونوں سے ایک کی بھی نہ رہی، بہن تو خوش و خرم ہے۔ یہی سہی۔ چار دن جو کبھی بہن کے یہاں رہنے جائے گی، تو وہاں تو دو گھڑی جی خوش ہو گا۔ بڑی ڈھارس ہوگی۔ ہم تو ہندوستان کی رسومِ مذموم دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے۔ ہندیوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں کہیں انگریزی خوان نے عقل کی بات کہی اور انھوں نے کافر اور خاطی کہنا شروع کیا۔ جہاں کسی رسمِ بد کا ذکر زبان پر آیا، اور جھلا اٹھے۔ روز دیکھتے ہیں کہ ان رسموں کا انجام کیسا بد ہے۔ ان سے کس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور پھر نہیں مانتے۔ رسم کو مذہب پر بدرجہا ترجیح ہے، اور رسوم کا حال معلوم۔ ہندوستان کی حالت پر ہمیں افسوس آتا ہے:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا وہ پریشان نکلا

اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔ مگر آپ کو اپنے ایمان اور میری جان اور قرآن کی قسم ہے کہ زینت النسا کی شادی دیکھ بھال کر کیجیے گا۔ اختری کی طرح اندھے کنوئیں میں نہ ڈھکیل دیجیے گا۔ یمن روم سے واپس آکر سیدھا یہاں ہی آؤں گا، اور یہاں سے پھر جہاں جانا ہو گا جاؤں گا۔ یار زندہ صحبت باقی۔

یہ کہہ کر میاں آزاد اُن دونوں نوعروسانِ پری زاد رشکِ شمشاد سے رخصت ہونے لگے۔ تو انھوں نے چلا چلا کر اس قدر رونا شروع کیا کہ خوجی تک کا بھی دل بھر آیا۔ کہرام مچ گیا۔ ٹپس پڑ گئی۔ لونڈیاں اور اصیلیں، مغلانیاں، آتو ماما، نوکر چاکر، اپنے پرائے، خویش و بیگانہ، اور پیر مرد فرزانہ، سب کی آنکھوں سے اشک جاری، اور ہر ایک پر ایک غشی سی طاری، جسے دیکھو نالاں و گریاں، جدھر دیکھو آہ و فغاں، الاماں۔ الاماں!

آزاد : پیاری اختری اور پیاری زینت النسا! خدا گواہ ہے کہ اس وقت اگر مجھے موت آجائے اور تمھارے دروازے پر دم توڑوں تو میں سمجھوں کہ جی اٹھا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میری مفارقت تمھاری زندگی کے ساتھ وہ کرے گی، جو شمشیر گردن اور خنجر تن کے ساتھ کرتا ہے۔ مجھے کسی ایسی ویسی جگہ جانا ہوتا خیر کچھ مضائقہ نہ تھا! لیکن ایک ایسی مہم عظیم بر جانا ہے کہ کوئی سچا اور پکا مسلمان مجھے باز نہیں رکھ سکتا۔ روسیوں نے ترکوں پر یورش کی ہے، اور حمیت اسلام اب اسی کی مقتضی ہے کہ ہم وہاں جائیں، اور ترکوں کا ہاتھ بٹائیں۔ اگر مر گئے تو شہید ہوئے۔ زندہ رہے تو سرخرو اور نیک نام ہوئے۔ دلی مراد پائی، اور فائز المرام ہوئے۔ لیکن جس وقت ہمیں تمھارا زار زار رونا یاد آئے گا، قدم نہ اٹھے گا۔ پس اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بدل اجازت دو، اور ہنسی خوشی رخصت کرو۔

زینت النسا : (کلیجہ تھام کر) فی امان......

فی امان اللہ کہنے کو تھی۔ مگر مارے رنج کے پورا فی امان اللہ زبان سے نہ نکلا، صرف فی امان کہہ کر زبان بند ہو گئی، اور کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلا نہ نکلا۔

اختر النسا : (آنسو پونچھ کر) اب منزل کھوٹی ہوتی ہے۔ بسم اللہ کیجیے۔ خدا حافظ!

میاں آزاد نے رکاب پر پاؤں رکھا، اور پشت توسن پر ہو رہے۔ خوجی بھی اپنی ٹٹوی پر لدنے ہی کو تھے کہ رکاب سے پاؤں پھسلا، زین پوش، کاٹھی واٹھی الم علم، جو کچھ تھا مع میاں خوجی کے تڑسے زمین پر آرہا۔ اور خوجی لڑھکے تو زین پوش اور زین اوپر، اور وہ نیچے۔ گو وہاں سب کے سب رنج وغم میں کھڑے میاں آزاد کو حسرت کی نظر سے بصد یاس دیکھ رہے تھے، اور دعا مانگتے تھے کہ خداوندا یہ نوجوان سرخرو آئے، لیکن ادھر خوجی جو لڑھکے تو ہنسی آہی گئی۔ سب ہنسنے لگے۔ اب لطیفہ سنیے کہ خوجی قطب بن گئے۔ جہاں گرے وہیں پڑے رہے۔ اٹھتے ہی نہیں۔ آزاد نے کہا کہ حضرت اب اٹھیے۔ وہ چپ چاپ پڑے آنکھیں کھول کھول کر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں پیر مرد نے ان کو اٹھایا، اور گرد و درد جھاڑ جھوڑ کر زین کو کسا، اور گود میں اٹھا کر ٹٹوی کی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ خوجی نے ایک دفعہ ہی غل مچایا کہ ہائے نہ ہوئی قرولی، ورنہ ٹٹوی کی گردن اس وقت تن سے جدا کر دیتا۔ زینت النسا نے کہا کہ لو آزاد تم نے منھ مانگی مراد پائی۔ ہنسی خوشی جاتے ہو۔ جس طرح پیٹھ دکھائی اسی طرح اللہ کرے منھ بھی دکھاؤ۔ اختر النسا نے کہا آمین! اور میاں آزاد نے گھوڑے کی باگ اٹھائی تو دم کے دم میں نظر سے اوجھل۔ خوجی بھی ٹٹوی کو ایڑ لگاتے چلے جاتے ہیں۔

آزاد : یار تم بوڑھے ہو گئے مگر تمیز نہ آئی۔ مفت میں اپنے آپ کو ہنسواتے ہو، اور ہمیں ذلیل

کراتے ہو۔ بھلا یہ اس وقت آپ کی کیا لغو حرکت تھی۔

خوجی : تسلیم پیر مرشد! واہ، واہ، واہ، اچھی لغو حرکت ہے۔ ایک شخص تو پہاڑ سے گر پڑا۔ چوٹ کی چوٹ آئی۔ اُلّو کا اُلّو بنا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ کیا لغو حرکت تھی۔ ماشاءاللہ خیر اب کی تو جو ہوا وہ ہوا۔ اب جو کروں گا تو آپ سے اجازت حاصل کرلوں گا۔

آزاد : لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی میں یہ تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ آپ گرے کیوں، اور گرے تو پوچھا کیوں نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ پھر اتنی دیر تک اٹھے کیوں نہیں؟ یہ لغو حرکت تھی، اور یہ آپ نے کیا فرمایا کہ پہاڑ پر سے گرے۔ یہ ٹٹوی آپ کے نزدیک کوئی کوہ رفیع ہے۔ ذرا سا جانور، بٹیر کے برابر قد۔ اس کو آپ پہاڑ سمجھتے ہیں۔ معقول۔

خوجی : بس اسی سے کہتے ہیں کہ آپ نرے صاحبزادے ہی ہیں جی۔ میں نے دیکھا کہ جو ہے وہ موٹے موٹے آنسو بہا رہا ہے۔ رو رہا ہے چلا رہا ہے۔ شور و غوغا مچا رہا ہے۔ آسمان سر پر اٹھا رہا ہے۔ سوچا کہ اگر ان کو نہ ہنسایا تو خوجی نام نہیں۔ زین کسا تو ڈھیلا۔ اور رکاب پر اس زور سے پاؤں رکھا کہ زین اوپر اور بندۂ درگاہ نیچے۔ چلیے پھر کیا تھا، چو طرفہ قہقہہ پڑنے لگا۔ زینت النسا بھی مسکرائیں، اختر النسا بھی کھل کھلائیں۔ آپ اتنی ٹرک ہی نہ سمجھے۔ ع۔ پڑ رہیں پتھر سمجھ پر ایسی تم سمجھے تو کیا سمجھے،،

آزاد : آپ نے دیکھا کہ ان دونوں حسین و نازنین، پری پیکروں کو ہم سے کس درجہ محبّت ہے۔

خوجی : دیکھا نہیں تو کیا کچھ اندھا ہوں۔ یا آپ کی طرح مجھے بھی دن کو اونٹ نہیں سوجھتا۔ بلا تشبیہ کنھیا ہو۔ جہاں جاتے ہو قدر و منزلت ہوتی ہے۔ چلین لکھتا ہے اُستاد۔ مگر یہ آپ واعظ کیا دیا کرتے ہیں، جہاں بیٹھے لگے پند و نصیحت کرنے۔ اس سے فائدہ۔ آپ کوئی قاضی ہیں، یا پادری ہیں، یا سادھو ہیں۔ آخر آپ ہیں کون، کوئی جانے بڑے واعظ۔

پُرانے فشن کے بزرگوار

میاں آزاد اور خوجی باتیں کرتے ہوئے چلے، کہ ایک سایہ دار درخت دیکھ کر ذرا دم لینے کو ٹھہر گئے۔ وہاں اتفاق سے ایک پُرانے فشن کے بزرگوار بھی دری بچھائے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ میاں آزاد سے اور ان سے صاحب سلامت ہوئی، تو انھوں نے بھی ان کے قریب بستر جمایا۔ اب باہم باتیں ہونے لگیں۔

بزرگوار : کہاں کے عزم ہیں برادر ؟
آزاد : روم۔
بزرگوار : جزاک اللہ، خدا کرے سرخرو آؤ، اور غنیم روسیہ کو نیچا دکھاؤ۔ ع۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ ازہد فی الدنیا یحبک اللہ وازہد فیما عند الناس۔ یحبک الناس۔
آزاد : اب تو جاتے ہیں روم کو آزاد پھر ملیں گے اگر خدا لایا
بزرگوار : حمیت اسلام اسی کی مقتضی ہے۔ افلاطون کا مقولہ ہے۔ احفظ الناس یحفظک۔ حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کہ مظہر انوار تجلیات جلالی و جمالی و مجلی آثار عظمت الٰہی و اینہت ناتناہی ہیں، ایسا ہی فرما گئے ہیں۔ خدا جمیع اہل اسلام کو جو پیرو خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام ہیں۔ ایسے ہی توفیق نیک عطا کرے۔ آمین : ومن اللہ الاعانۃ والتوفیق۔ تمہارے چمن دل میں گلہائے توفیق نیک مہک رہے ہیں۔ خدا عمر دراز کرے، اور در سعادت تم پر باز رہے۔ آمین آمین ثم آمین: فلک الافلاک تک تمہاری ہمت بلند اور طبع ارجمند کا غلغلہ پہنچے گا۔
آزاد : فلک الافلاک کے کیا معنی ؟
بزرگوار : نہ کرسی آسمان ہیں کہ نہیں ہیں ؟
آزاد : آسمان تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ بس وہم ہے۔ حد بصر اور انتہائے کائنات الجو کا نام آسمان ہے۔ باقی ڈھکوسلا۔ آسمان جسے آپ کہتے ہیں وہ صرف کائنات الجو کی حد ہے۔ باقی خیر صلاح۔
بزرگوار : معاذاللہ! آسمان کا مخرج آس اور مان ہے۔ آس مخفف آسیا مان بمعنی مانند، یعنی مانند آسیا۔ اس کی گردش بھی چکی کی گردش کی طرح ہے، نہ بوضع گردش دولاب وعرش اور اطلس، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں سطح مقعر فلک نہم کو اطلس اور سطح محدب کو عرش کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ آسمان کوئی چیز ہی نہیں، پھر آپ سے کون بحث کرے۔
آزاد : چہ خوش، چرا نباشد۔ یک نہ شد دو شد۔ ایک آسمان دوسرے اس کی گردش۔ سبحان اللہ! گردش زمین کو ہے قبلہ! گردش فلکی شعرا کا وہم وخیال ہے۔ اور بس جیسے عنقا ویسے گردش فلک۔
بزرگوار : ہرگز نہیں، استغفراللہ زمین ساکن اور کرۂ خاک ہے۔ اور آفتاب دائرہ۔
آزاد : یونان کا حکیم محقق اور فیلسوف مدقق فیثا غورث زمین کے سکون کا قائل نہ تھا۔ ان کے بعد جرمنی کے ایک فاضل اکمل اور عالم اجل نے نظام فیثا غورث کا سکہ بٹھا دیا۔ اب نظام بطلیموس کے چراغ پر زردی چھا گئی اور نظام فیثا غورث کوس لمن الملک بجانے لگا۔ آفتاب البتہ ساکن،

اور مرکز ہے، اور اس کے گرداگرد زہرہ، اور مشتری، اور مریخ، اور زحل، اور عطارد زمین اور فونون ہرشل وغیرہ دورہ کرتے ہیں۔ بھلا یہ بات بھی قرین قیاس سمجھی جائے گی کہ آفتاب جو زمین سے تیرہ لاکھ حصے بڑا ہے، وہ اس قدر جلد زمین کے گرداگرد دورہ ختم کر دے۔ ع۔ این خیال است و محال ست و جنون،،

بزرگوار : اجی یہ علم لائے کس کے گھر سے۔ کسی علم کے موجد ہیں کیا۔ سب اخذ کیا ہوا ہے۔ حکمائے یونان کے مہر لیاقت سے نورِ اقتباس کیا ہمارا علم خاص ہے۔

آزاد : انھیں لچر پوچ، پادر ہوا، خیالات نے تو ہندوستان کو ستیاناس کر دیا۔ یونان کو آپ اپنا کس دعوی سے کہتے ہیں۔ یونانی بھی تو یورپین ہیں۔ اگر آپ کی ایشیا میں یونان ہوتا تو خیر۔ آپ کو ہنکارنے کا کسی قدر موقع بھی ملتا۔ اب آپ کیا سمجھ کر یونان کو اپنا قرار دیتے ہیں۔ یونان یورپ میں ہے۔ شاید آپ اس کو بھی اپنے ہندوستان ہی میں سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ علاوہ کشف و کمالات مورخ ہم بے بدل ہستند۔

بزرگوار : یونانی یورپین کیوں کر ہو سکتے ہیں، بھلا آپ جھک مارتے ہیں۔

آزاد : بجا ارشاد ہوا قبلہ و کعبہ۔ کیا معقول دلیل آپ نے پیش کی ہے کہ جی پھڑک گیا۔ لطف یہ کہ فیثا غورث بھی یونانی تھا، اور حرکت زمین کا قائل۔ لیکن آپ لوگ دقیانوس کے ہم عصر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، قائم رکھتے ہیں۔ زمین ساکن ہے، اور دعویٰ یہ کہ یونانی ایسا ہی لکھ گئے حالانکہ یونان کے اکثر حکما گردش زمین کے قائل تھے مگر آپ ایک نہ مانیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔

بزرگوار : شیخ الرئیس کا کلام دیکھیے۔

آزاد : اجی آپ ان کے کلام کو لیموں لگا کر چاٹیے۔ یہاں ان کے قائل ہی نہیں۔ نیوٹن اور ہرسس اور پروفیسر لاکیر اور گیو کی تصانیفِ لطیف کو دیکھیے تو آنکھیں جائیں۔ قبلہ جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ شیخ بے چارے کس میں تھے۔ ان کو مانتا کون ہے۔ معدودے چند، دقیانوسی خیالات کے آدمی۔ اور جن بزرگوں کے ہم پیرو ہیں، ان کے کلام کی امریکہ اور یورپ کے کل علما و حکما پیروی کرتے ہیں۔ شیخ تھے کس میں؟ آپ شیخ الرئیس کو لیے پھرتے ہیں۔

بزرگوار : شیخ! بو علی ابن سینا!

آزاد : جی ہاں! شیخ، شیخ بو علی سینا۔ سنیے قبلہ و کعبہ! آپ نے انگریزی پڑھی نہیں کہ آپ اپنے اور ان کے علوم کا باہم مقابلہ کر سکیں۔ پس آپ کی رائے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے جن لوگوں

نے عربی انگریزی دونوں کو بغور پڑھا ہے، اور علوم پر حاوی ہیں، وہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ کہ جو تحقیقِ انیق علمائے یورپ نے حال میں کی، اس کے مقابل میں تحقیق عتیق ہیچ ہے۔

بزرگوار: یہ آپ نے کیا فرمایا کہ علوم پر حاوی؟ حاوی تو علم پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب علم پر آپ حاوی ہوئے تو علم محوی ہو گیا۔ اور محوی صغیر ہوتا ہے۔ علم دریائے ناپیدا کنار ہے۔ جس کی تھاہ ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ بھی عجب چیز ہیں۔ نعوذ باللہ، من الشیطانِ الرجیم، ولاحول ولا قوۃ الاّ باللہ العلی العظیم۔

آزاد: چہ خوش شیطان کی ایک ہی کہی۔ کیا شیطان کے بھی قائل ہیں آپ؟ اجی قبلہ شیطان کچھ مجسم تھوڑا ہی ہے۔ نفس امارہ ہی شیطان ہے۔

بزرگوار: لاحول ولا۔ لاحول ولا۔ آپ تو دہریے معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد: میں مومنِ پاک، سچا اور پکا مسلمان ہوں۔ آپ مجھے مرتد اور ملحد بناتے ہیں۔ پس بموجب حکم جناب باری آپ داخل معصیت ہو گئے۔

بزرگوار: استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ وّاتوبُ الیہِ۔ بھلا کیوں صاحبزادے، بہشت اور دوزخ کو بھی جانتے ہو، یا ان کو بھی ڈھکوسلا ہی جانتے ہو؟

آزاد: قبلہ بہشت اور دوزخ کو دور سے سلام۔ اس وہم میں آپ ہی پڑیں۔ بندہ واجبی ہی واجبی مانتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ ڈرپوک آدمیوں کے ڈرانے کے لیے یہ بات خوب ہے۔ اور منہیات اور معصیات سے بھی انسان بچتا ہے۔ شرع والوں نے باتیں تو واللہ خوب نکالی ہیں۔ سب کی سب حکمت پر مبنی۔

بزرگوار: بھلا قوس کی نسبت علمائے فرنگ نے کیا تحقیقات کی ہے۔ میبذی[1] میں تو لکھا ہے کہ جب ابر کے عقب میں کوئی منتظم شے مثل کوہ یا ابر کثیف ہو تو آفتاب کا نور کو منور کرے گا۔ پس یعینہ آئینے کا حال ہے کہ اگر آئینے کی پشت پر کوئی اور شے نہ ہو تو صورت بخوبی مرئی نہ ہوگی۔ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اگر جسم شفیف کے عقب میں کوئی جسم کثیف ہو تو اس سے شعاعِ بصر منعکس نہ ہوگی۔ بلکہ خارج ہو جائے گی۔ اسی طرح جب اجزائے رسیہ کے عقب میں کوئی جسم کثیف نہ واقع ہو تو ہماری بصر اس سے خارج ہو جائے گی۔

---

[1] عربی میں علم فلسفہ و ہیئت کی مشہور کتاب کا نام ہے جو عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

آزاد : الغلط از سرتاپا غلط۔ اگر آفتاب جانب افق قریبِ مغرب ہو، اجی لاحول ولا۔ قریب افق جانب مغرب، ہو تو قوس قزح مشرق کی سمت ظاہر ہو۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر کرۂ شمس جانب مشرق قریب افق ہو تو ابر مغرب کی طرف ہو۔ خلاصہ یہ کہ اگر ابر آفتاب کے محاذات میں ہو اس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ احمر کیسری۔ اصفر کیو دی نیلگوں۔ اخضر بنفشی۔ قوس۔ قزح۔ شب کے وقت بھی دیکھی ہے؟

بزرگوار : اجی تو آپ کو مری ہوئی ہوگی۔ یہاں ضُعفِ بَصارتُ قریب بدرجہ فقدانِ بصارت پہنچ گیا ہے، مگر آپ کے علوم اور ہمارے علوم سے کبھی اتفاق نہ ہوگا۔

آزاد : عرض کروں قبلہ! یہ اُمور علمِ مناظرہ ومرایا سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ گستاخی معاف! اس میں بالکل کورے ہیں۔

میاں خوجی بھی آزاد پر بہت جھلاّئے کہ تم بالکل دہریوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ہم تمھارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ایسے مرتد کے ساتھ رہنا بھی داخل معصیت ہوتا ہے۔ آزاد نے کہا آپ بس چپکے بیٹھے رہیے، افیون گھول گھول کر آپ پئیں۔ چانڈو آپ اڑائیں، روزے آپ چٹ کر جائیں۔ نماز سے اصلاً واسطہ نہیں۔ عبادت پرستش خاک نہیں جانتے، اور اوپر سے غرّاتے ہو، اور ہمیں کو اُلٹا زندیق بتاتے ہو۔ خوجی بولے کہ بھئی ایسے مقدس بزرگوں کے سامنے اس قسم کے کلمات زبان پر لانا سوءِ ادب اور خلاف واب آداب ہے۔ ان سے تو جب گفتگو کرے وہی پُرانے خیالات کی۔ زمین کی گردش غلطِ آفتاب مرکز نہیں ہے۔ آسمان گردش کرتا رہتا ہے۔ شیطان کا وجود ضرور ہے، یہ نہیں کہ شیطان کے بھی قائل نہیں، اور آسمان کو بھی حد بصر کہنے لگے، اور آفتاب کو ساکن اور مرکز بتا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے۔ اثنائے راہ میں گھوڑوں کو خیز کیا تو دن سے داخل لکھنؤ میں۔

لکھنؤ

لکھنؤ میں میاں آزاد خانہ برباد، اور حضرت خوجی افیونیوں کے مسلّم الثبوت استاد نے دو دن پڑاو ڈالا اور شہر کے دو مختلف مقاموں پر ایک ایک شب بسیرا لیا۔ پہلی شب آغا میرؔ کی سرا

لہ آغا میر اودھ کے بادشاہ ازی الدین حیدر کا وزیر اعظم تھا۔ اس کی بنوائی ہوئی سرائے مشہور تھی۔ جو موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی ...ائے ریلوے اسٹیشن کے قریب وا... ی اسی جگہ اس کے محلات تھے۔ یہ علاقہ ڈیوڑی آغا میر کہلاتا ہے۔ (بحوالہ گزشتہ)

میں بسر کی۔ چوک سیر کو گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دورویہ بازار آراستہ۔ دوکانیں قرینے سے سجی سجائی۔ اشیا سلیقے سے چنی چنائی۔ حلوائی کی دوکان شہد و شکر کی کان۔ تھالوں میں مٹھائی اور اس پر ورق نقرہ۔ گاہک پر گاہک آرہے ہیں۔ افیمی پر افیمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ گوٹے والوں کی دکانوں پر بھیڑ بھڑکا ہے۔ کوئی لالہ سے مول تول کرتا ہے۔ کوئی منیب جی سے چکاتا ہے۔ صرّافے میں کھنا کھن اور چھنا چھن، کی آوازیں آتی ہیں۔ دور تک دکانوں کی قطار ہے۔ ہر دکان میں اشرفیوں کا انبار ہے۔ اور جو ہے وہ کامل عیار ہے زبان حال وقال سے پکار رہے ہیں کہ شرف الانسان بالمال للبا لکمال۔ دلالوں کی چاندی ہے۔ دو ایک گاہک مل گئے تو پورہ ہیں۔ بازار بھر میں کھڑے چکر لگا رہے ہیں۔ اس سرے سے اس سرے تک تاکتے جا رہے ہیں۔ جوہری کے دکانچہ جواہر نگار میں جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ لالہ پنا مل کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ جواہر رنگارنگ اور گوہر شاہوار، دلآلی آبدار، دیکھ کر میاں آزاد کی آنکھیں، کھل گئیں۔ لعل گرانمایہ کے نور وضیا سے چکا چوند کا عالم ہے۔ کہیں یاقوت رمانی، کہیں زمرد سبز ریحانی بزاز سراپا ناز کی دکان پر وہ متاع دلفریب ہے کہ واہ جی واہ۔ انگریزی، ہندوستانی، شربتی، جامدانی، جس قسم کا کپڑا اچھا ہو لے لو۔ چھینٹ، ڈوریہ، اطلس، قاقم۔ سنجاب۔ بانات ہر قسم کا کپڑا موجود مگر بابا مول دس روپیہ گز۔ کہیں تو تین روپیہ گز بیچیں شانے سے شانہ جھلتا تھا۔ بادِ صبا کو بھی دقت سے بار ملتا تھا۔ کمروں کی طرف جو نظر کی تو بشاش ہو گئے۔ مگر میاں آزاد، اپنے دل میں سوچے کہ بھئی یہ تو خلاف تہذیب ہے۔ اس بازار سے آپ کو جلد نکال دینا چاہیے۔ ان کے لیے تو ایک بازار خاص ہونا لازم ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے شرمائے اور مارے خوف و لحاظ کے وہاں جانے سے باز آئیں۔ مسجدوں کو دیکھا تو چھتیں چھٹی پڑتی ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ۔ جمع ہیں۔ نمازی تلاوت قرآن میں مصروف۔ خیر اس طرف کے لطف تو انھوں نے خوب اٹھائے۔ اب دوسری شب کو امین آباد کی سرا میں آئے۔ اللہ اللہ کیا شہر عذار ہے۔ کوسوں تک آباد کروروں مکان، پدموں آدمی سنکھوں باشندے

۱؎ لکھنؤ کا قدیم بازار جس میں صرافہ کے علاوہ ہر قسم کے سامان کی دوکانیں تھیں، اور بالاخانوں پر بازار حسن تھا۔ جس کی وجہ سے یہ بہت بارونق بازار تھا۔ شمال کی سمت گول دروازہ ہے اور جنوب میں اکبری دروازہ۔ چوک دونوں کے درمیان واقع ہے۔

۲؎ امجد علی شاہ کے زمانے میں ان کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد، آباد کیا۔ جس کی آبادی اور رونق آج کل روز افزوں ترقی پر ہے۔ (گذشتہ لکھنؤ از عبدالعلیم شرر) امین آباد میں ایک وسیع سرائے بھی تھی جو ختم ہو چکی۔

اللہ اللہ! اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہی میں اور بھی زیادہ آبادی تھی۔ اب تو گول دروازے کے سامنے صاف شفاف میدان ہے۔ اور ادھر ادھر اکثر محلے ویران، اجڑے ہوئے مکانات گرے پڑے، مگر ہاں صدر کی طرف خوب گلزار ہے۔ صدر بازار اور امین آباد میں وہ رونق ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا یہ مکانات بھی عمدہ اور پختہ بنے ہیں۔ عمارات عالیشان۔ بنگلے صاف شفاف، اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اِس سرے سے اس سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ سکندر باغ[1] سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ بادشاہی باغ[2] سراپا بہار ہے، جس طرف نکل جائیے باغ کثرت سے پائیں گے۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی نے یہاں خوب لطف اٹھایا۔ ہمارے رنگیلے جوان میاں آزاد اور ان کے سیلانی یار جانی میاں خوجی خانہ برباد نے لکھنؤ میں خوب مٹر گشت کی۔ خصوصاً لکھنؤ کی عالیشان کوٹھیاں، اور خوشنما و دلکشا بنگلے، اور شاہی ایوان سپہر تواماں اور گلزار رشک فرخار، اور مہوشان طرحدار، اور جوانانِ طنّاز، باغ و بہار، اور امرا کی بارہ دریاں، ایسی بھائیں کہ عش عش کرنے لگے۔ محمد وطیلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا، تو خوش الحانی میں صادق علی خان کو باربد نژاد پایا۔ بابا جی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ فرنگی محل ہے یا خطۂ یونان۔ یا علما فضلا کی کان۔ جو عالم ہے کُملا کی جان وروح۔ معزز و ممدوح مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ کی مصنفات مسلمات کی عرب تک دھوم ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور کربلائے معلیٰ اور مشہد مقدس تک کے بلغا آپ کے کلامِ فصاحت فرجام کی داد دیتے ہیں۔ ایک ایک فقرے پر احسنت و مرحبا کہتے ہیں۔ جو بلیغ ہے۔ امراء القیس ثانی ہے۔ رشکِ جالینوس یونانی ہے۔ اطبّا میں ایک سے ایک برق حکیم مرزا محمد جعفر کی طبابت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ہوالشافی نسخے میں لکھنے بھی نہ پائے کہ مریض نے صحتِ کامل پائی اور شفائے عاجل حکیم سید محمد خان صاحب کے مجربات علوی خان دہلوی کے مجربات سے کم نہیں۔ معقولات میں استادِ مسلم الثبوت خوش مذاق، زندہ دار، سعادتمند، اور معقول پسند آدمی ہیں۔ حکیم مرزا محمد حسین صاحب اور حکیم محمد ابراہیم صاحب کے گھرانے نے وہ دستگاہ کامل بہم پہنچائی کہ اودھ بھر میں شہرت پائی۔ دور دور تک نام ہوا جو مریض ان سے رجوع لایا فائز بمرام۔

---

[1] دریا گومتی کے کنارے نہایت وسیع باغ جواب بوگا منگل گارڈن ہے اور حکومت ہند کے زیر انتظام ہے۔

[2] بادشاہ باغ اس جگہ تھا جہاں اب لکھنؤ یونیورسٹی اور کالون کالج وغیرہ ہیں۔ یہ واجد علی شاہ نے اپنی بیگم سکندر جہاں کے لیے بنوایا تھا۔

ہوا۔ شعرا بھی باکمال ہیں، تدبیر الدولہ مفتی ظفر علی خان آسیر لکھنوی اصنافِ سخن پر قادر، علمِ عروض کے ماہر بڑے شاعر غزل سخندان۔ بے ہمتا ملک الشعرا ہیں اگلے شاعروں میں اب یہی تو باقی رہ گئے۔ خدا خضر والیاس کی عمر عطا کرے! گو بوڑھے ہو گئے مگر طبیعت جوان ہے۔ ایک ایک شعر سے سچا لطف شاعری ٹپکتا ہے، جو سُنتا ہے احسنت و مرحبا کہتا ہے، اور دادِ سخن دیتا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ ناسخ میر ورد مغفور کا نام انھوں نے خوب روشن کیا۔ مثنوی فصاحت محتوی وہ تصنیف کی کہ قلم توڑ دیے۔ کیا صاف روزمرہ، کیا طرزِ بیاں ہے۔ کیا بول چال کیا زبان ہے۔ محمد جان شاد بھی بول چال اور روزمرہ کے استاد ہیں۔

آلغرض جس گلی کوچے کو دیکھتے ہیں، کانِ علم جانِ علم، روح و روانِ علم ہے۔ چوک میں جو سیر کرنے گئے تو بے اختیار بول اٹھے:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

ایک دن پہلوانوں کی کشتی اور پچیتوں کی دھینگا مشتی اور بکیتوں کی کثرت اور پھنکیتوں کے کرتب اور بنوٹیوں کے کمال دیکھیے، تو گردن ہلائی کہ ہاں ابھی بانکوں سے لکھنؤ خالی نہیں ہے۔ گتکہ پٹکا، اور یہ ہو رہے۔ گتکہ پٹکا، اور وہ اچک گئے۔ تراش خراش کا بھی لکھنؤ پر خاتمہ ہے۔ یہاں کی مشاطگانِ چابک دست کی قسم کھانی چاہیے۔ وہ گُریا د ہیں کہ واہ جی واہ۔ ہندوستان کا فرانس لکھنؤ ہے۔ وہاں مہینے میں ایک فیشن بدلتا ہے، تو یہاں ہفتے میں پانچ۔ میاں آزاد اور خوجی لطفِ تماشا دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ اثنائے راہ میں ایک صاحب نئی وضع اور انوکھی قطع کے نظر سے گذرے۔ حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کس فیشن کے آدمی ہیں۔ بالکل نئی گڑھت ہے۔ اب ان حضرت کی قطع ملاحظہ فرمائیے۔ از سرتاپا زرد از زرد، ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ، زعفرانی کپڑے لیٹ کا تین کمر توئی والا، انگرکھا کیسری۔ دو پلی ٹنکے دار ٹوپی۔ بسنتی کاندھوں پر بہت بڑا چھپکے کا رومال، عشاق زار کے چہرے کی رنگت۔ اور ان سب میں لچکا ٹکا ہوا۔ ماشاء اللہ سنِ شریف چہل و شش۔ نازم باین ریش و فش۔

آزاد : کیوں بھئی خوجی، بھلا بھانپو تو یہ کس ولایت کے ہیں؟

خوجی : خراسانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یا کابل کے ہوں۔

آزاد : کابلیوں کی یہ قطع کہاں۔

خوجی : واہ خوب سمجھے۔ ارے میاں کیا کابل میں۔ نہیں ہوتے؟

آزاد : (قہقہہ لگاکر) ذرا حضرت کی چال تو دیکھیے گا۔ کیسے کندے جھاڑتے ہوئے، پو قدمے چلے جاتے ہیں۔ کبھی پاپوش زریں ٹاٹ بافی اوگی پر نظر ہے۔ کبھی رومال پھڑکاتے ہیں۔ کبھی انگرکھا چمکاتے ہیں۔ کبھی لچکے کی جھلک دکھاتے ہیں۔ چمکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس ڈاڑھی موچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ لمبی ڈاڑھی، خرگوش کی جھاڑی، اور یہ لچکے کی گوٹ۔ لاحول ولا قوۃ۔

خوجی : آپ کو واللہ ذرا چھیڑ یے تو دل لگی ہی سہی۔

آزاد : یا حضرت آداب عرض ہے! واللہ آپ کے لباسِ فاخرہ پر تو وہ عالم ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی ہے۔ پائے نظر پھسلا جاتا ہے۔

زرد پوش : (شرما کر) جی ایک وجہ خاص ہے۔

آزاد : وجہ خاص کیا؟ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ہے۔ یار سچ کہنا استاد کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے ہو؟

زرد پوش : (اپنے خدمت گار سے) رمضانی ذرا بتا تو دینا۔ ہمیں اپنے مُنھ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمضانی : حضور میاں کا نکاح ہونے والا ہے۔ مانجھے کے کپڑے پہنے ہیں۔ رسم ہے حضور!

آزاد : لاحول ولا قوۃ۔ رسم کی ایک ہی کہی۔ کہاں کی رسم، کہنے لگے رسم ہے۔ واہ اچھی رسم ہے۔ یہ بدعت ہے یا رسم ہے۔ ڈاڑھی مُوچھ والے آدمی، اور لچکا بنت پٹھا لگا کر کپڑے پہنے ہیں۔ معاذ اللہ یہ بھائی دُلہن کے لیے ہیں، یا آپ سے مچھا کڑ بیگ کے لیے۔ واسطے خدا کے ان کپڑوں کو اتارو۔ مردوں کی پوشاک پہنو۔ لاحول ولا قوۃ۔

زرد پوش : یہ تو سب ہی پہنتے ہیں۔

خوجی : ذری ہم سے تو چار آنکھیں کیجیے۔ ہاں صاحب کون سب پہنتے ہیں؟ آخر آپ نے کن سب کو دیکھا ہے؟ ہم کو سکھاتے ہو۔ تمھارے ہی سے دو چار زنان منتری پہنتے ہوں گے، ورنہ با وضع اور سنجیدہ اور متشرع لوگ تو ایسی وضع کے قریب جانا داخل گناہ سمجھتے ہیں۔

آزاد : ارے یار تم کو شرمانا چاہیے، یا بڑانا چاہیے۔ استغفر اللہ آپ اکڑتے جاتے ہیں۔ شاباش، بے حیا کی بلا دور۔

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھ گئے۔ اور حضرت زرد پوش اور ان کا خدمت گار صاحبِ تن و توش، ایک گلی میں کترا گئے۔ تو راہ میں خدمت گار نے یوں سمجھانا شروع کیا۔

خدمت گار : میاں سچ تو کہتے تھے۔ ذری دل میں سوچیے تو۔ جس گلی کوچے میں آپ نکل جاتے

ہیں، لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ انگلیاں آپ پر اٹھاتے ہیں، اور قہقہہ لگاتے ہیں۔

زرد پوش: ہنسنے دو جی۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ من ضحک ضحک۔

خدمت گار: آپ تو عربی بھی پڑھے ہیں، میں جاہل آدمی ہوں۔ مل بُری بات بُری ہی بات ہے۔ ہم غریب آدمی تو ایسے کپڑے پہنتے ہی نہیں۔ اور آپ لوگ رئیس اور پڑھے لکھے مل۔

زرد پوش: مُل وُل میں نہیں جانتا۔ تم غریب غربا ایسے کپڑے لاؤ کہاں سے، جو پہنو۔ اچھا چل کر میاں سے پوچھیں گے۔ دیکھیں بھلا کیا کہتے ہیں وہ تو ثقہ اور مُسن ہیں، جو کہیں وہ منظور۔

خدمت گار: اچھا ہزار بات کی ایک بات تو آپ نے یہ کہہ دی لیجیے گھر بھی آگیا، اور بڑے صاحب بھی ٹہل ہی رہے ہیں۔

زرد پوش: ابا جان آج ہم کو ایک بدمعاش نے رُلا رُلا دیا۔

پیر فرتوت: کون بدمعاش؟ تم نے کچھ چھیڑا ہو گا ایک ہاتھ سے تو تالی بجتی ہی نہیں۔ اہاہا! ہیں سمجھا اس تمھاری انوکھی قطع پر تو کہیں تمہیں ہنسے بھئی ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ ہم خود تم سے کہتے کو تھے کہ بیٹا اس وضع کو نہ اختیار کرو، مگر ہم تمھاری اماں سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ بڑی تنک مزاج ہیں۔ ہم کو تو ذرا ذرا سی بات پر بے ہی ڈالتی ہیں۔ سو بھئی اگر تمھارا جی چاہے تو ان کپڑوں کو اتار ڈالو، اگر نہ اتارو تو باہر نہ جاؤ، ورنہ مفت میں اپنے کو ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

میاں آزاد اور میاں خوجی راہ میں باہم قہقہہ اڑاتے اور رسوم مذموم ہند پر نفرین کرتے اور لاحول پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ تو ایک وضع دار اور طرح دار جوان سے انھوں نے پوچھا، کیوں حضرت جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو زرد کپڑے آپ نے بھی پہنے تھے؟ اس نے کہا لاحول ولا قوۃ یہ زنان منتریوں کو مبارک رہیں۔ یہاں دو انگل ہر دم میان سے باہر رہتی ہے۔ آپ نے کسی زنان منتری کو دیکھا ہو گا۔ کہیں کسی اور سے یہ سوال نہ کر بیٹھیے گا۔ اور مشفق رسموں کی تہ کہیے بعض آدمیوں کے یہاں یہ رسم ہے کہ دُلہن کا جوتا دولہا کی کھوپڑی پر تڑ سے لگاتے ہیں۔ جو دولہا ثقہ ہوا تو خیر جوتی چھوا دی، اور جو وہ بھی ٹھٹھول، ہنسوڑ بگڑے دل، ہوئے تو پھر وہ اور ان کا سر، اور گرگابی، مگر بانکے آدمی تو سر کاٹ کر پھینک دیں۔

اتنے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ڈکرٹی سامنے سے آ رہی ہے۔ بڑی بیش بہا فٹن، دو کمیت، دو ر کابی گھوڑیاں جُتی ہوئی ہیں۔ دونوں برق۔ ہوا پیچھے رہے، وہ آگے جائیں۔ شیر گردوں کو طرارہ بھر کے ٹاپیں مار آئیں۔ کوچ مین سبز مندیل کھوپڑی پر جمائے ہوئے، کوچ بکس پر بیٹھا ہوا ہائٹ ہائٹ

کرر ہا ہے، اور تین نوجوان رئیس بڑے ٹھتے، اور کروفر سے بیٹھے ہیں۔ تینوں عینک باز تینوں طناز اور خوش انداز۔ شانِ ریاست جبین مبین سے عیاں۔ طنطنۂ امارت چہرۂ نورانی سے نمایاں۔ اتنے میں ایک اور بکٹٹ بگھی کھڑکھڑاتی ہوئی سامنے سے آئی۔ دو جوان رئیس بصد شان وآن بان متمکن ہیں، مگر دونوں عینک باز سونے کی تیلیاں اور نازک تال، اس کے بعد تین چار گھوڑوں پر سوار جوان اور گلفام نظر سے گذرے۔ کوئی جماتا ہے۔ کوئی قدم دکھاتا ہے۔ کوئی کڑکڑاتا ہے۔ کوئی چمکاتا ہے۔ ان میں بھی دو عینک باز، تب تو میاں آزاد نے کہا کہ کیوں بھیا خوجی یہاں یہ عینک کا فیشن نیا دیکھنے میں آیا جسے دیکھو عینک باز۔ یہ دانا بینا آدمی، اور اندھے بننے کا شوق چرّائے۔ بینا سے نابینا بن جائے۔ لاحول ولا۔ خوجی بولے کہ اجی ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اس کو بھی جوان عاشق تن ایک سجاوٹ اور بناوٹ سمجھتے ہیں، اور چار دن میں دیکھ لیجیے گا کہ رنگین طبع، آزاد مزاج، عورتیں بھی عینک چڑھانے لگیں گی۔ یہ تو فیشن ہے بھئی۔ یہ بھی وضع داری ہے۔

ایک رئیس کا دربار

میاں آزاد گھومتے گھامتے اور خوجی افیون کی پینک میں جھومتے جھامتے ایک نواب کے دولت خانہ پر پہنچے۔ کوٹھی سجی سجائی متعدد کمرے سب آراستہ و پیراستہ سجے ہوئے دُلہن بنے ہوئے۔ ایک بڑے عالی شان کمرے میں فرش مکلف بچھا ہوا۔ دوسرے میں کرسیاں نیز آرام چوکیاں مسہریاں، کوچ قرینے سے آراستہ۔ وہ سامان کہ نظر کو چکاچوندھ ہو جس نے دیکھا دنگ ہو گیا۔ خوجی اپنے نواب کے تزک و احتشام کو بھول گئے۔ جا کر بادب دونوں کے دونوں بیٹھے۔ خوجی تو نواب زادوں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے ہی، دیکھتے ہی کوٹھی کی اس درجہ تعریف کی کہ پُل باندھ دیے۔

خوجی : حضور! خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ کیا سجی سجائی کوٹھی ہے۔ دُلہن ہے دُلہن۔ قسم ہے حسینؓ کی جو آج تک ایسی عمارات، اور اس سج دھج کی تعمیر نظر سے گذری بھی ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے، مگر واللہ ہے، جو کبھی یہ ٹھاٹھ کہیں دیکھے ہوں۔ خدا چشم زخم سے بچائے۔ واللہ بادشاہوں کے مثل رہتے ہیں۔ اتنے رفیق، اتنے مُصاحب، یہ شان یہ ریاست ہے کس میں۔ اے توبہ۔ یہ بات کہاں پائیے، اور پھر اس عمارت پر خلق کس درجہ ہے کہ اخلاق محمدیؐ کا پورا برتاؤ ہے۔ خدا ایسے رئیس کو سلامت و باکرامت رکھے۔ حق تعالیٰ ہمیشہ بامراد رکھے۔ ان کی بدولت ہزاروں غریبوں، شریفوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اس کی ذات تو مجمع محاسن و کمالات

ہے۔ بہت دن بعد ایسے عالی ہمت امیر دیکھنے میں آئے اس وقت جی خوش ہوگیا۔

مصاحب : ابھی ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے۔ یہاں دن عید رات شب برات ہے۔ پرستان کی دم میں نمدا۔ بہشت بھی اس کے آگے مات ہے۔ ہر دم طبلے پر تھاپ ہے۔ پری پیکروں کے جمگھٹے ہر وقت زمزمے چہچہے، اور قہقہے۔ کل کوٹھیاں اور بارہ دریاں اور عمارات عالیشان آپ نے ابھی دیکھیں کہاں۔ اور مصاحب لوگ تو اب آتے چلے ہیں۔ شام تک سب آجائیں گے۔ ایک میلہ کا میلہ روز جمتا ہے۔

نواب : کیوں صاحب یہ فرامشن بھی جادوگر ہیں شاید، آخر جادو نہیں تو اور ہے کیا؟

رفیق : بجا ارشاد ہوا پیر و مرشد۔ بس جادو ہی ہے۔ جادو برحق۔ کرنے والا کافر۔ یہ سب ساحر ہیں۔

مصاحب : خداوند ایک فرامشن سے مجھ سے ملاقات ہوئی، تو میں آپ جانیئے ایک ہی کائیاں۔ حضور میں نے ان سے خوب یارانہ پیدا کیا۔ بڑی گہری دوستی ہوئی۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ کیوں یار سچ کہنا یہ فرامشن کیا شئے ہے۔ آخر اس کا راز تو بتاؤ۔ بھئی ہم تو جانتے ہیں جادو ہے۔ وہ بہت ہی جھلائے، اور کہا آپ کی ایسی تیسی۔ جادو کیسا۔ جادو کے تو یہاں آج تک قائل ہی نہ ہوئے یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ باقی فری مشن تو وہ مذہب ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مذہب ہی نہیں۔ ہم نے کہا یار بے جانے تو خیر ہم کیوں کر تم سے اتفاق کرلیں، تو انھوں نے کہا تو پھر فری مشن ہی کیوں نہیں ہو جاتے کہ کسی سے پوچھنے کی حاجت ہی نہ رہے۔ میرے بھی دل پر آگئی۔ ایک دن اُن کے ساتھ فری مشن ہوئے، وہاں حضور کروڑوں لاشیں تھیں۔ اور سب کے سب مجھ سے گلے ملیں، اور ہنسیں۔ میں بہت ہی ڈرا مگر اُن لوگوں نے دلاسا دیا، کہ کچھ پاگل ہے ان سے خوف کیا کرتا ہے۔ لیکن خبردار کسی سے کہنا نہیں، ورنہ یہ لاشیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ بتایا اور ہڑپ کیا۔ اتنے میں خداوند آگ برسنے لگی، اور میں جل بھُن کر خاک ہوگیا، اس کے بعد ایک شخص نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو بندۂ درگاہ ہٹے کٹے، ٹیاں سے موجود۔ تب تو بندہ کفن پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ اور بھاگنے لگا۔ مگر سب کے سب چمٹ گئے اور گھسیٹ لے گئے۔ لیکن حضور سچ تو یوں ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو رو دیتا۔ میں مستقل رہا۔ لیکن یہ کہتا تھا کہ میں فرامشن نہ ہوں گا۔ نہ ہوں گا۔ تب تو ایک لمیم شحیم آدمی نے مجھے اک حوض میں ڈھکیل دیا، اور وہاں میں دو دن دو رات رہا۔ بالکل مردہ وا فسردہ۔ آخرش نکالا گیا اور سب کی صلاح ہوئی کہ یہ کھوٹا آدمی ہے۔ اس کو یہاں سے نکال دو ہم نکالے گئے۔

خداوند گردن ناپی گئی۔ خدا خدا کر کے بچے ورنہ جان ہی پر بن آئی تھی، اور عزت ہی گنوائی تھی۔ بارے خیر گذشت۔

میاں آزاد نے جو یہ جھوٹی داستان سُنی تو آگ بھبھوکا ہو گئے۔ سوچے کہ اللہ اکبر ان نوابوں کے مصاحب بھی کیا بے پر کی اُڑاتے ہیں۔ کیسے زٹل قافیے ملاتے ہیں، اور رئیسوں کو کیسے جلد دم میں لاتے ہیں۔ وہ بھی کس سادگی سے۔ ہر امر کو آمنّا و صدّقنا، تسلیم فرماتے ہیں۔ الاماں! اس گپ کو تو دیکھیے۔ دو دن دو رات آپ حوض ہی میں مردہ، افسردہ پڑے رہے۔ سبحان اللہ! کیا خوب تحقیقات فری مشن کی کی ہے۔ سکھنے لگے کروڑوں لاشیں تھیں اور سب کی سب بول رہی تھیں اس کذب پر شیطان کی پھٹکار۔ لاحول ولا قوۃ۔ واللہ! ان رئیسوں کو دم میں لانا کوئی بات ہی نہیں۔ یار لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اور بس۔

رفیق : حضور اس سحر کو بھی خدا نے کیا زور بخشا ہے۔ سُنا کہ کامروپ میں عورتیں جہاں مرد سے ملتفت ہوئیں، اور بس ماش پڑھ کر پھونکے، اور بکرا بنا دیا۔ بیل بنا دیا۔ گدھا بنا دیا۔ دن بھر بکرے بنے میں میں کیا کیے۔ بیل بنے سانی کھانے یا گدھے بنے رہے۔ رات کو مرد کے مرد۔ تو خداوند، یہ جادو برحق ہے۔ ہاں جادوگر کافر ہے، ضرور کر کے۔

خوشامدی : پیر مرشد یہ مُوٹھ کیا شے ہے۔ کل شب کو حضور تو یہاں پڑے آرام فرماتے تھے۔ میں دو بجے کے وقت قرآن شریف پڑھ کر ٹہلنے لگا، تو حضور کے سرہانے پر اوپر آسمان پر روشنی سی ہوئی۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے۔

رفیق : اور ہوش اُڑ جانے کی تو بات ہی ہے۔

خوشامدی : جی اس میں کیا شک ہے۔ بس خداوند میں رات بھر جاگتا رہا، اور حضور کے پلنگ کے ارد گرد چوکی پہرا دیا کیا۔ ایک ہانڈی سی تھی اور اس میں کوئی شے ایسی جلتی تھی، جیسے گیس کی روشنی۔

نواب : (کانپتے ہوئے) کھیں قرآن کی قسم؟

خوشامدی : پیر مرشد۔ حضور کے طفیل میں میرے بال بچے پرورش پلتے ہیں بھلا، آپ سے اور جھوٹ بولوں۔ نمک کی قسم سچ عرض کرتا ہوں۔ رونگٹا رونگٹا بدن کا کھڑا ہو گیا۔ گھنٹوں سنبھارا۔ اگر میرا باپ بھی سوتا ہوتا تو پہرا نہ دیتا، مگر حضور کا نمک جوش کرتا تھا۔

رفیق : حضور ان باتوں کو جانے دیجیے۔ اب یہ فرمائیے کہ سمندِ سیاہ زانو جوڑی بکاؤ ہے۔ حضور

خریدیں تو دکھاؤں۔ کیا جوڑی ہے۔ کہ اُہو ہو ہو۔ ڈیڑھ ہزار سے کم نہ دے گا۔ حضور ہی کی سواری کے قابل ہے۔

مصاحب : اے تو آپ نے خرید کیوں نہ لی؟ اتنی تعریف کرتے ہو۔ اور پھر ہاتھ سے دیدی پیرو مرشد ان کو اجازت دیجیے کہ بس خرید ہی لائیں۔ شاہی میں ان کے یہاں بھی کئی گھوڑے تھے۔ سوار بھی خوب ہوتے ہیں، اور ماشاءاللہ چابک سواری اور شہ سواری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔

نواب : کوئی ہے؟

مصاحب : ارے کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟ کئی آدمی چلا اٹھے۔

خدمت گار: حاضر۔ خداوند! پیر مرشد! حضور! (دس پندرہ آوازیں)

نواب : دو ہزار روپیہ روشن علی کو ابھی دو۔ اور دو سائیس ان کے ساتھ بھجواؤ۔ اور ایک سپاہی ابھی جائے ابھی۔

نواب کے حکم کی دیر تھی کہ اُن لالہ نے مہاجن کے گھر کی راہ لی۔ روشن علی ساتھ۔ دو سائیس اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے۔ مہاجن کے گھر پر۔

لالہ : لالہ جواہر مل۔ سرکار نے بھیجا ہے اس وقت ایک دو ہزار کی ضرورت ہے۔ جلد لائیے میرا بھائی دیر نہ لگانا۔ ورنہ میں نکال دیا جاؤں گا۔

جواہر مل : تو جلدی کاہے کی ہے۔ ذرا دم لو۔ حقّہ وقّہ پیو۔ آخر یہ روپیہ کیا ہوگا کیا؟

لالہ : ایک جوڑی لے جاوے گی، روشن علی کی معرفت۔

روشن علی : (لالہ کے کان میں) استاد دیکھو ہم کو بدنام نہ کرد۔ یار بھئی چار سو کی جوڑی ہے۔ باقی رہے سولہ سو۔ اس میں سے آٹھ سو اور حوالی موالی کو جائیں گے۔ کسی کو سو کسی کو پچاس باقی رہے آٹھ سو۔ چھ سو ہمارے۔ دو سو تمھارے۔ بھئی معاملے کی بات ہے۔

لالہ : تم تو لو چھ سو اور ہم لیں دو سو اچھا معاملہ ہے۔ میاں بھائی ہو نہ۔ ارے یار تین سو ہم کو دے۔ پانچ سو تو اڑا۔ یہ البتہ معاملے کی بات ہے۔

روشن علی : اجی میاں بھائی کی نہ کہیے۔ میاں بھائی تو نواب صاحب بھی ہیں آخر۔ مگر اللہ میاں کی گائے اور یار تم لوگ تو وہ بس کی گانٹھ ہو۔ تمھارے کاٹے کا تو منتر ہی نہیں۔ لاکھوں روپیہ کھا جاؤ مگر گزی کی لنگوٹی لگائے ہوئے پھٹی ٹوپی سر پر نہائے ہوئے۔ لالہ بھائی ہو۔ اور میاں بھائی ہو۔ اور میاں بھائی کھانے کو ہم بھی کھائیں گے۔ مگر شربتی کے انگرکھے ڈانٹے ہوئے، خود نواب

بنے ہوئے گلوریوں پر گلوریاں چکھ رہے ہیں۔ قورمہ اور روٹی اور پلاؤ روز دسترخوان پر دیکھے گا۔ تم اُبالی کھچڑی ہی کھاؤ گے۔ اچھا بھئی تین سو تمھارے پانچ سو ہمارے۔

الغرض جواہر مل نے دو ہزار چہرہ شاہی تڑ سے گن دیے اور لالہ نے روشن علی کو تین سو کم دو ہزار یعنی سترہ سو روپیہ دیے۔ میاں روشن علی نے سوا چار سو کی جوڑی خرید ی، اور اسی وقت لے جا کر نواب نامدار کو دکھائی، اور کہا کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔

مصاحب : اُہو ہو ہو۔ گھوڑی کیا پرستان کی پری ہے۔ ایسی ہم رنگ جوڑی دیکھی نہ سُنی۔

رفیق : کیا ذری سی تھوتھنی ہے۔ کیا چوڑی پیشانی ہے۔

خوشامدی : واللہ کنوتیاں تو دیکھیے۔ ہائے پیار کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

زمانہ ساز : حضور ایسے جانور قسمتوں سے ملتے ہیں۔ واللہ جنابِ باری کی قسم شہر بھر میں اس ساتھ کی دوسری جوڑی نہیں نکلے گی۔

خود مطلب : اس میں کیا شک ہے۔ مگر بھئی بڑے سستے داموں میں آئی۔ واللہ دو دو ہزار کی ایک ایک گھوڑی ہے۔ کیا خوبصورت ہاتھ پاؤں ہیں۔ واللہ اور لطف یہ کہ کوئی عیب نہیں۔

نواب : بھئی اس کو حفاظت سے بندھواؤ۔ کل شام کو فٹن میں جوتنا۔ دیکھیں کیسی جاتی ہے۔

زمانہ ساز : اے خداوند! سبحان اللہ آندھی کے موافق جائے۔ بگولا بن جائے کیا دل لگی ہے کچھ:

قدم باز ایسی گویا زیرِ پا مواج دریا ہے ۔۔۔ سُبک خیز اس قدر رہنے نہ پائے پیٹ کا پانی

نواب صاحب نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ قلم دوات کاغذ لاؤ۔ اب دلگی دیکھیے کہ کہیں پتا ہی نہیں۔ خدمت گار چوطرفہ ڈھونڈھتا ہے۔ قلم نہ دوات نہ کاغذ۔ بٹیروں کی کابک۔ پتنگ۔ ڈور کے گولے اُچکّے۔ چانڈو کی نگالیاں، کثرت سے موجود، مگر قلم ندارد۔ کاغذ کا نام نہیں۔ دوات کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ آخر کار لالہ بےچارے کا قلمدان چھین لائے تو نواب صاحب نے ایک پرچہ ایک مصاحب کے نام لکھا، اور لکھ کر اس کو دیا کہ چپکے سے پڑھ لو۔ اتفاق سے جلدی میں اُس مصاحب کو دینا تو بھول گئے۔ میاں آزاد کو پرچہ دے دیا۔

اب ناظرین باتمکین کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہم کو وہ سطور جو خاص نواب نامدار کے قلم سے نکلی تھیں۔ بجنسہ لکھنے کی اجازت دیں، اور ہماری تحریر کو خلافِ تہذیب نہ سمجھیں، تو ہم پر بڑا احسان ہو گا۔

میاں آزاد نے وہ پرچہ پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ زیہ گھونٹرین میں جانبے ہیں کیس کی خریدا

ہیں۔ یہ آبادی جان کے واسطے یس ہیں۔ اور فٹن بھی ایک دوں گو دیں گے۔ لے کن ہم کسونیا شخنت سے یہ راظ نہ کھول نا،،

میاں آزاد نے لاحول کہہ کر وہ پرچہ نواب صاحب کو دے دیا اور خوجی کو لے کر چل کھڑے ہوئے۔ راز کے بدلے (راظ) اور لیکن کو (لے کن) اور شخص کو (شخنت) اور لی ہیں کو (یس ہیں) اور اُن کو (دوں گو) اور کسو نیا (کھول نا) اور گھوڑیاں کو (گھو نڑین) لکھا ہے: یہ تو نواب صاحب کی لیاقت کا حال ہے، اور آبادی جان کا اس درجہ خیال ہے کہ فٹن اور ڈکرٹی دے دی۔

ہوٹل

میاں آزاد خانہ برباد، یہاں بستر جمانے، یا کسی مکان کا قبالہ لکھوانے تو آئے تھے نہیں۔ راہ راہ آئے۔ دو تین دن رہے، چلے گئے۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچے، تو وہ چہل پہل وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ برہمن دیوتا ڈول لیے، کھٹ کھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ جل ٹھنڈے! کٹورا الگ کھنک رہا ہے۔ میاں بھشتا مشک یا مشکیزہ لیے ہوئے، چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ایک سمت ساقی دو سیرا خمیرا بھر کر گڑگڑا رہا ہے۔ وہ مشک بو کہ دماغ طبلۂ عطار ہو جائے۔ چبوترے کے سامنے کمہار برتن چن کر بیٹھا بیچ رہا ہے۔ مٹی کے کھلونوں پر وہ جوبن کہ باہر والے بصد شوق خرید لے جاتے ہیں۔ خریدار وں پر خریدار ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پیسا پھینکا اور حقہ لیا۔ ادھر میاں بھشتا نے تازہ کر دیا۔ اور ساقی نے چلم تیار کی۔ دھواں دھار اڑانے لگے۔ کھٹک نے آواز لگائی۔ گلابی میوہ شہتوت، امرس ہے آم کے رسوں کا، قلمی آم کے رسوں کا۔ فقیر محمد خان کے باغ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا، چار باغ کا بمبئی رنگترے، سنگترے، کوے، اناس، نارنگیاں، شریفہ۔ امرود، سیب، جو چاہیے خرید لیجیے۔ ایک طرف حلوائی کی دکان مٹھائی کے خوان، برفی کے تھال، ورق نقرہ لگے ہوئے، پستے کی ہوائیاں، لوہے کے چراغ لٹکے ہوئے ہیں۔ دکان جھک جھک کر رہی ہے۔ اتنے میں آواز آئی بسکٹ لو بسکٹ! کباب کلچے۔ اِدھر اُدھر گھومے تو ٹوکری والا سامنے آن موجود ہوا۔ دوپلی ٹوپیاں، شربتی، جامدانی، چکن،

ے فقیر محمد خان گویا۔ اودھ کے مشہور مالدار۔ قصبہ ملیح آباد ضلع لکھنؤ میں ان کے باغاتِ انبہ بہت مشہور تھے۔ مختلف قسم کے قلمی آم ان کی کوشش سے وجود میں آئے۔ ملیح آبادی سفیدہ پہلا قلمی آم ہے جو انھوں نے تیار کیا تھا۔ صاحب سیف و قلم، جعفر ملیح آبادی سوانح گویا صفحہ ۹۴)

مری کے کام کی، کڑھی مندیل، گول ٹوپی، نئے نئے فیشن۔ نرالی اور انوکھی وضع کی ٹوپیاں، جھڑا جھڑ دکھا رہا ہے۔ گاہک پر گاہک بصد شوق دام چکار ہا ہے۔ دس پانچ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ دُور دُور تک مسافر بستر جمائے، کوئی زین پوش، کوئی دری بچھائے بیٹھا ریل کی راہ تک رہا ہے۔ کوئی گنوار اکڑوں بیٹھا اناپ شناپ بک رہا ہے۔ میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ اللہ اللہ ریل کا اسٹیشن کیا خاصہ میلہ ہے۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ یہ بھیڑ یہ دھوم، یہ رونق، بھئی واہ رے لکھنؤ۔ واللہ ایسا اسٹیشن بھی نہیں دیکھا۔ میاں آزاد ٹہلتے ہوئے اسٹیشن کے اندر گئے۔ ہوٹل دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اہو ہو ہو کیا صاف و شفاف ہے۔ ہر شے قرینے سے چنی ہوئی۔ درودیوار سے صفائی برس رہی ہے۔ ہر سمت نور کا عالم ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک میز اور اس کے گرداگرد کرسیاں، گلاس چنے ہوئے۔ لمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں۔ میاں آزاد بھی کرسی پر جاکر ڈٹ گئے۔ کھانا لاؤ! مگر شراب کا لگاؤ نہ ہو اور لحم خوک قریب نہ آنے پائے۔ ایک چپراسی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوگیا۔ حضور شراب تو نہ ہوگی، مگر اور کیا آپ نے حکم دیا۔ میاں آزاد نے کہا لحم خوک (آہستہ سے) یعنی سور کا گوشت نہ ہو (چپراسی) نا حضور! کیا مجال۔ یہ کہہ کر چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا، پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا۔ میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا، اور سوڈا واٹر اور لیمونیڈ پیا۔ باہر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے، پراٹھے اور کباب کلیجے چکھ رہے ہیں۔

آزاد : واہ استاد۔ تم تو خوب مزے سے کباب اُڑا رہے ہو۔

خوجی : پھر کوئی شراب اُڑائے، کوئی کباب کھائے۔

آزاد : ایں! شراب؟ لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں شراب کس نے مُنھ سے لگائی۔ یہ کس کی شامت آئی۔ یہاں دخترِ رز سے واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ بنت العنب کے عاشقِ دلدادہ کوئی اور ہی ہوں گے۔ ع۔ کردم ز شراب ناب توبہ"۔

خوجی : اور آگے تو کہیے۔ ع۔ کردم ز شراب ناب توبہ :: اور آگے۔ ع۔ وز کردۂ ناصواب توبہ۔

آزاد : قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو۔ شراب پی ہو تو سور ہی کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی : (مسکرا کر) تسلیم۔ ایک نہ شد دو شد۔ آپ نے سور کا گوشت بھلا کب چھوڑا ہوگا۔ واللہ مانتا ہوں۔ کہنے لگے شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو۔ معقول! یہ تو آپ تب کہیں جب اس کو

حرام یا مکروہ بھی سمجھیں۔ آپ دونوں کو حلال اور ان کے استعمال کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ یار آج تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

آزاد : ارے بھئی آخر کیا کیا، کچھ کہو گے بھی یا ملاحی ہی سُنائے جاؤ گے۔ سُبحان اللہ۔ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو یا سور کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو۔

خوجی : ہاں یہ آپ نے خوب کہی کہ سور کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہو گی۔ مگر یار مزہ تو خوب چکّھا ہو گا، اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگاتے، گلے لگائی ہو گی گلے۔ آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں۔ مجھے آج تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین ایمان کیا ہے تمھارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے۔ ہم کو اس بھکیڑے سے کیا واسطہ۔

آزاد : نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔

خوجی : مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ چھُری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد : تو بھائی چھُری کانٹا سے کوئی شراب پیتا ہے ؟

خوجی : ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی۔ کہ شراب کیوں کر پیتے ہیں۔ یہ کسی اپنے ایسے مے گسار بادہ خوار، سے تحقیقات کیجیے۔ افسوس! واللہ بس تم گئے گذرے۔ ہائے ستم، خیر مضیٰ ما مضیٰ۔

آزاد : آپ ایک کام کیجیے۔ ہوٹل میں جا کر،

خوجی : اے لاحول، اے لاحول، خدا ایسی جگہ کسی سچّے اور پکّے مسلمان کو نہ لے جائے۔ توبہ توبہ! (اپنے کان پکڑ کر) خداوندا بچائیو! گنہگار بندہ ہوں۔ ارے توبہ! ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولاقوۃ بس آپ ہی کو مبارک رہے قبلہ بندہ درگذرا۔

میاں آزاد ٹہلنے لگے، اور خوجی نے کباب اور کلچوں پر خوب ہیتھے لگائے۔ جب صفاچٹ کر چکے تو حلوائی کی دکان سے برفی لائے، اور افیون کے نشے میں لوٹنگارنے لگے، تو اتنے میں ایک صاحب باریش دراز یک مُشت و پنجاہ انگشت نے میاں آزاد کو مخاطب کر کے کہا کہ کیوں حضرت آپ کا اسم مبارک؟ یہ بولے میاں آزاد۔ وہ مُسکرائے اور کہا کہ ہاں واللہ۔ آپ کے قدو قامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے۔ آزادی اور آزادہ رَوی صورت سے برستی ہے ملّت کیا ہے۔

آزاد : نے کہا :

از مذہبم مپُرس نہ مومن نہ کافرم   مَن رسمِ ایں دیارِ رندانم مُسافرم

حضرت بندہ مسلمان ہے، اور مسلّم ایمان ہے۔ پابند شرع۔ آپ کا اسم شریف جناب مولوی صاحب؟

مولوی صاحب : اسمِ شریف تو چھپر پر رکھیے اس وقت مجھے افسوس کرنے دیجیے۔
آزاد : بسم اللہ آپ افسوس کر لیجیے، بلکہ رو دیجیے۔ مگر سنیے تو سہی محرم الحرام کے دن قریب ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر رو لیجیے گا۔ ایسی بیتابی کیا ہے؟
مولوی صاحب : آپ مسلمان اور پابندِ شرع، اپنے آپ کو بتاتے ہیں، اور ہوٹل میں جا کر شراب خانہ خراب، استعمال میں لاتے ہیں۔ عیاذاً باللہ۔ مردِ خدا آخر انجام کی بھی فکر ہے۔ یا سگِ دنیا ہی بنے رہو گے۔
آزاد : قبلہ بس اب کیا کہوں۔ بجز سکوت کے اور کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے پاتا۔ لاحول ولا قوۃ۔
مولوی صاحب : بے ادبی معاف! لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں۔ آپ سے حرکت شیطانی ہی ایسی سرزد ہوئی۔ مگر بحمد اللہ کہ آپ کا نفسِ لوّامہ آپ کو ملامت تو کرتا ہے۔
آزاد : مولانا خدا کی قسم۔ میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا، مگر وہ اغذیہ جو شرع کی رو سے حرام نہیں۔ پس بنظرِ انصاف سے دیکھیے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ آخر روم میں بھی تو صغیر و کبیر اور بڑے بڑے علماء، متبحر عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر یہاں ہندوستان کے مسلمان اس کو داخل گناہ کیوں سمجھنے لگے۔ میں نے کیا کفر کیا کہ مردود مطرود اور زندیق اور ملحد اور مرتد بنایا جاتا ہوں۔
مولوی صاحب : مجھ سے سنیے! میں عرض کروں نہ، ہوٹل میں جانا اہلِ اسلام کے لیے مستحسن نہیں۔ جو کھانا آپ نے ہوٹل میں چکھا ہے، اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر چکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ گو یہ بھی معیوب تھا، مگر اس درجہ نہیں۔ پھر آپ لاکھ قسمیں کھائیے، قرآن اٹھائیے، یقین کس ملعون کو آئے گا۔ کہ آپ نے شراب نہیں پی، یا سور کا گوشت نہیں کھایا۔ کاجل کی کوٹھری میں جو جائے گا وہ منھ کالا کر کے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ روم کی نہ کہیے۔ شاہ ایران مزے سے شرابِ ناب اور بیش بہا برانڈی نہیں اڑاتے؟ پھر اس سے بادہ خواری کا جواز نہیں ثابت ہوتا۔ رومی لاکھ عیسائیوں کے ساتھ لقمے لگائے، اور بے تکلفی سے کھائیں، ہم کو تو ایسا نہ چاہیے۔ ہمارے رسوم کے خلاف ہے۔ آپ کو روم میں رہنا ہے یا ہندوستان میں؟ روم کی بات روم کے ساتھ۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیالات کا تذکرہ ہے یا روم اور رومیوں کی عادات کا۔ آخر یا ہر بھی تو کباب کلیجے شیرمال، پراٹھے، باقرخانی، روغنی روٹی، بسکٹ، سب ہی کچھ بکتا ہے، پھر وہاں کھانے میں کون بہتری تھی مفت میں اپنے آپ کو نکو بنایا، اور ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔
آزاد : حضرت وہاں اول تو کھانا عمدہ اور لذیذ۔ دوسرے مقام صاف و شفاف جس لطف

سے ہم نے وہاں کھانا کھایا وہ یہاں کجا۔ قلی کھڑا پنکھا جھل رہا ہے۔ صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے۔ پلیٹیں صاف، میز شفاف، چار چار چپراسی خدمت کے لیے کھڑے ہیں۔ یہاں یہ باتیں کجا۔ لاحول ولا قوۃ۔

مولوی صاحب : کھانا عمدہ تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ باقی رہا پنکھا ایک پیسہ دے دیجیے۔ گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجیے اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام۔ سوائے ازیں یہاں بھی کوئی غلیظ شے نہیں ہے۔ یوں وحشت کی بات ہی اور ہے۔ خیر حضرت آپ جانیں آپ کا کام جانے :

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را (حافظ)

مانو یا نہ مانو! اس سے یہاں غرض نہیں ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے۔ ہم نے کہہ دیا۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے کہ ڈنکے کی چوٹ ہوٹل میں جائیں۔ اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں۔ یوں تو ہمیں اختیار ہے کہ چاہے ہوٹل میں جائیں یا جو کھائیں مگر خاموشی کے ساتھ۔ یہ نہیں کہ اسٹیشن بھر میں گھومتے پھریں کہ۔ ع۔ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

ریل کا سفر

میاں آزاد اور خوجی بڑی دیر تک اسٹیشن پر ٹہلا کیے۔ ایک کانسٹبل سے پوچھا کہ کیوں جی آج ریل کو دیر کیوں ہوئی؟ اب تک تو روانہ ہو جایا کرتی تھی۔ آج ابھی تک آئی بھی نہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ کیا وقت بدل گیا؟ کانسٹبل نے کہا کہ آج تار آیا ہے کہ ایک جگہ ریل لڑ گئی۔ ایک مسافر گاڑی اُدھر سے آتی تھی اور ایک مال گاڑی اِدھر سے جاتی تھی۔ گارڈ شراب کے نشے میں ایسا چور ہوا کہ کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اس کو تار دیا گیا تھا کہ خبردار، فلاں اسٹیشن سے آگے تیزی کے ساتھ نہ بڑھانا، اور فلاں پٹری سے نہ لے جانا۔ گارڈ تو اس وقت نشے میں غین تھا ہی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ریل کو تیز کر ہی دیا۔ اور اسی پٹری پر چلائی جس پر جانے کی ممانعت کر دی تھی۔ ریل تو لے چلے، جب پل کے پاس پہنچے تو مسافر گھڑگھڑاہٹ کے سبب سے جاگ اٹھے اور جیسا قاعدہ ہے۔ ان میں سے اکثر دریا کی کیفیت دیکھنے لگے۔ ویسے ہی اُدھر سے مال گاڑی نمودار ہوئی۔ اب ڈرائیور لاکھ لاکھ روکتا ہے۔ مگر ممکن کہاں۔ ریل کا دفعتاً رک لینا کچھ ہنسی ٹھٹھا تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عین پل پر دونوں ریلیں ٹکرائیں۔ کئی منٹ تک دونوں انجن لڑتے رہے، اور چونکہ دفعتاً لڑ گئے۔ اس تصادم سے سخت نقصان جان و مال ہوا۔ دو آدمی ریل پر سے دریا میں غڑاپ سے غڑقاب۔ پانچ آدمی

نہایت ہی زخمی ہوئے اور پندرہ بیس آدمی باہم ایسا ٹکرائے کہ ان کے سر اور دھڑ، ہاتھ پاؤں، آپس میں خوب لڑے۔ کسی کا کان کھٹ سے الگ۔ کسی کی ناک ندارد۔ کسی کا چہرہ بگڑ گیا۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔ کسی کا سر پھوٹا۔ ستم بپا ہو گیا۔ بس قیامت ہی ہو گئی۔ تو اس سے ریل وہاں رک رہی ہے۔ اب کوئی چار گھنٹے کی دیر ہوئی انجن گیا ہے۔ بس دم کے دم میں آئی وہ دیکھیے گھنٹی بجی۔ ٹھن ٹھن۔ اب تیار ہو رہیے اور چلیے۔

خیر میاں آزاد اور خوجی سوار ہوئے، اور ریل تھوڑی دیر میں چلی۔ ان کے کمرے میں کئی آدمی بیٹھے تھے۔ انھوں نے سب سے پوچھنا شروع کیا کہ کیوں بھئی قطب کا منار[1] دہلی میں کسی نے دیکھا اب سب خاموش ہیں۔

ایک : حضرت ہم تو عمر بھر آگرے میں رہے، دلّی جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے یہاں نیل کا بیوپار ہوتا ہے۔

دوسرے : ہم گنوار آدمی، قطب منار منار کو کیا جائیں دیہاتی بھائی گئے تو دہلی ہم تیں چار بار اور وہاں دو دو چار چار دن رہے بھی، مگر منار دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔ اور کون جاتا مفت کی جھنجھٹ۔

تیسرے : دلّی ہم گئے تھے ۱۲۴۵ھ میں۔ اس کو کوئی اکیاون برس کا زمانہ ہوا۔ جب ہم لڑکے سے تھے۔ اٹھارہواں انیسواں سال تھا۔ وہاں چھ سات مہینے رہے۔

چوتھے : قطب کا منار ہم نے دور سے دیکھا ہے۔ پاس سے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

پانچواں : ہمارا امکان دادرے میں ہے۔ مُل دلّی جانے کا اتفاق نہ ہوا، نہ ہوا۔

میاں آزاد اپنے دل میں ہنسنے لگے کہ لاحول ولا قوۃ۔ واہ رے ہندوستان! اتنے آدمیوں میں سے کسی نے قطب کا منار دیکھا ہی نہیں اور لطف یہ کہ ایک حضرت دادرے کے رہنے والے ہیں، جو دہلی کے پڑوس ہے۔ لیکن منار آج تک نہیں دیکھا، بلکہ دہلی ہی نہیں گئے۔ اور دو ایک صاحب جو گئے وہ قطب کے منار کو دیکھنے نہ گئے۔ ایک بزرگوار نے دور سے منار دیکھا، مگر پاس نہ پھٹکے۔

---

[1] موجودہ نئی دہلی کے نواح میں قدیم قصبہ مہرولی کے قریب "قطب منار" کی تعمیر قطب الدین ایبک بادشاہ کی مرہونِ منت ہے۔ یہ عظیم الشان اور بلند پانچ منزلہ دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں اوپر جانے کے لیے ۳۷۸ زینے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے سیاح بھی اس کو دیکھنے کے لیے بہت ذوق و شوق سے آتے ہیں۔

ایک ذاتِ شریف امیر آدمی ہیں، مگر تمام عمر آگرے میں رہے۔ اتنی توفیق نہ ہوئی کہ چلو بھئی دہلی تو ہو آئیں لاحول ولا قوۃ :

با بد بنشین و باش بیگانۂ او | در دام افتی اگر خوری دانۂ او

میاں آزاد خانہ برباد اور افیونیوں کے استاد، میاں خوجی بدنہاد، دوسرے دن پھر نواب نامدار، والاتبار کے عالی شان اور سپہر توانان ایوان میں جا ڈٹے۔ دونوں وقت ملتے یارانِ سرپل گپ کے یابو کو خوش بیانی کے میدان میں سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ ایڑ پر ایڑ لگا رہے تھے۔ اتنے میں مؤذن نے اللہ اکبر کا نعرہ مسجد سے بلند کیا۔ اب سنیے کہ یہاں جتنے ذات شریف بیٹھے ہیں، سب جھنڈے تلے کے شہدے چھٹے ہوئے گرگے۔ ایک بولا روزہ افطار کرنے کا وقت آگیا۔ دوسرے نے کہا جی ہاں آگیا۔ چنیا بیگم کہاں ہیں۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

نواب : قسم قرآن کی ہمیں آج تک معلوم ہی نہ ہوا۔ کہ روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے۔ مفت میں اپنے کو ہلاک کرنا کون سا ثواب ہے بھئی۔ واللہ جو آج تک ہماری سمجھ میں بھی آیا ہو۔ ہم تو حافظ شیراز کے چیلے ہیں۔ انھیں کی بیعت لائے۔ وہ بھی روزہ و نماز کے پابند نہ تھے۔

آزاد : آفرین کیا خوب بات کہی ہے۔ صاد ہے پیر و مرشد :

دوش از مسجد سوی خانہ آمد پیر ما | چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما
یا مریدان روبسوی کعبہ چوں آریم چوں | روبسوی خانۂ خمار دارو پیر ما

مصاحب : چوں آئم خون۔ واہ واہ کیا کلام تھا۔

رفیق : دوست از مہجد۔ ان لفظوں کو تو دیکھیے۔

خوشامدی : اچھی شعر ہیں۔ سعدی بڑے شاعر تھے، اور علما تھے۔

میر صاحب: اور سنا علم موسیقی میں بھی دخل تھا۔ بھاگ کی دھن پر سر دھنتے تھے۔

راوی : اوجھا جی۔ واہ ری صحبت۔ ایک سے ایک زبان داں، اور طلیق اللسان بذلہ سنج و لطیفہ گو ہے اور چشم بد دور، شعر و سخن میں کتنا عمدہ مذاق ہے۔ خدا چشمِ زخم حوادث سے بچائے تعریف بھی کی تو بھونڈی۔ سچ ہے :

صائب[1] دو چیز می شکند قدرِ شعر را | تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

---

[1] محمد علی بن مرزا عبدالرحیم صائب تبریزی فارسی کا بلند پایہ شاعر تھا ۱۶۸۰ء میں وفات پائی۔

مصرع ہے کہ۔ ع۔ بامریدان رو بسوی کعبۂ چوں آریم چوں" اس کو فرماتے ہیں کہ چوں آئیم خوں اور فرمایا کہ کیا کلام تھا۔ تھا کی ایک ہی کہی۔ اب شاید مفقود ہوگیا ہے۔ دوسرے صاحب نے بلفحوائے من چہ قسم برادرِ فلانِ من بسیار فش ست،، فرمایا کہ دوست از مہجد اے سبحان اللہ دوش کو دوست، اور مسجد کو مہجد اور طرہ یہ کہ دوست از مہجد۔ انھیں الفاظ کی تعریف ہو رہی ہے تیسرے صاحب بولے اچھی شعریں ہیں۔ شعر کو ان حضرات نے مؤنث کر دیا، اور ی۔ن۔ سے اس کی جمع بنائی۔ اس پر ستم یہ کہ ان اشعار کو سن کر سعدیؒ شیرازی کی توصیف کر رہے ہیں۔ گویا سعدی کا کلام ہے۔ جس پاگل کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ حافظ کا کلام ہے، یا سعدؔی کا، وہ مدح کرنے کا کیا دم بھرے، پھر کس مزے سے اکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ سعدی بڑے علما تھے ماشاء اللہ، سعدی تو خیر علما تھے ہی آپ بھی چشم بددور بڑے بلغا بڑے کملا بڑے شعرا اور بڑے فضلا ہیں۔ لاحول ولا۔ لاحول ولا۔ یہ تو تھا ہی۔ ایک صاحب شیخ جی کی قوالی کے بھی مداح ہیں۔ انھیں نے کسی تذکرہ ہی میں دیکھا ہوگا کہ شیخ علیہ الرحمۃ بھاگ کی دھن پر سر دھنتے ہیں (چلو سو رہو آدھی رات بھئی)

مصاحب : خداوند۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخرش اس فاقے سے فائدہ ہی کیا ہوتا ہے؟

نواب : (مسکرا کر) کیا خوب۔ اے یہ تو کسی روزہ دار سے پوچھو، مجھ سے اس کی تحقیقات فضول ہے۔ یہاں جب سے پیدا ہوئے، قسم لیجیے جو کبھی ایک دن بھی فاقہ کیا ہو۔ ارے میاں اول تو روزہ رکھنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ پھر بھوک میں نماز اور عبادت اور پرستش کی کس کو سوجھتی ہے۔ توبہ توبہ کیجیے! دوسرے یہ کہ جب دن بھر کڑاکے کا فاقہ کیا ہو تو رات کو شل ہو کر سو رہے، اور یار لوگ تو سحر گہی الگ اڑاتے ہیں۔ شام کو الگ دو تین سیر ستیا ناس کرتے ہیں۔ مگر ہاں دو چار مولوی بڑا ریاض کرتے ہیں۔ کھاتے بھی کم ہیں، اور سوتے بھی نہیں، اور دن رات عبادت ہی کیا کرتے ہیں۔ مگر ایسے ہیں کہ مجھ سے کہیے تو انگلیوں پر گن لوں۔

رفیق : بجا ارشاد ہوا پیر و مرشد! اور یہ دیکھیے آپ ہی کے نمک کی قسم ہے کہ دن رات کھانے ہی کی فکر رہتی ہے۔ چار بجے اور لونڈی پر پڑنے لگیں، بے بھاؤ کی۔ اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات، لہسن لا۔ پیاز بگھار، کباب پکیں۔ میٹھے ٹکڑے پکیں، الٰہی توبہ! ع۔ چوں گوش روزہ دار براللہ اکبر است۔

ہندو مصاحب : جی ہاں ہمارے یہاں بھی برت رکھتے ہیں لوگ مگر ہم نے تو ہر برت کے دن گوشت چکھا۔

رفیق : شاباش ہے لالہ شاباش، واللہ کیا پکا مذہب ہے تمھارا۔

نواب : تربیت یافتہ ہیں نہ بھئی۔ کچھ گنوار جاہل تو ہیں نہیں۔
یموں نچوڑ : واہ حضور کیا خوب بات پیدا کی ہے۔
راوی : اس تعریف کے قربان، پیدا حضور نے کیا، اپنی ایسی تیسی کی کہنے لگے کیا خوب بات پیدا کی۔
خوجی : قسم حسینؓ کی۔ کیا خیالات ہیں حضور کے۔ واہ۔ وہ بات پیدا کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔
مصاحبین : (قہقہہ لگا کر) واہ حضرت واہ کیا تعریف کی ہے۔ کہنے لگے توبہ ہی بھلی۔ واہ ری تری توبہ ہی بھلی۔ یہ توبہ ہی بھلی کی ایک ہی کہی۔ حضرت کس جنگل میں حضور تولد ہوئے تھے۔ آپ نے تو وہ بات کہی کہ توبہ ہی بھلی۔ یار خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کر بولا کرو۔
رفقا : اے حضرت بولیں کیا بس اب بولنے کے دن گئے برسات ہو چکی نا۔
خوجی : (دوزانو ہو کر) میاں ایک ایک آؤ، یا کہو چو مکھی لڑیں۔ ہم اس میں بھی بند نہیں۔ میاں سنو! یہاں عمر بھر رئیسوں، امیروں نوابوں ہی کی صحبت میں رہے۔ تم لوگ ابھی کچھ دن سیکھو۔ ابھی بچے ہو، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ ابھی خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں گے۔ آپ اور ہم پر منھ آئیں۔ شان خدا :

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

واللہ ایک بار ہمارے نواب کے یہاں ایک ذات شریف تشریف لائے۔ بڑے طرحدار اور زبان آور، میاں آزاد ان کا نام تھا۔ آتے ہی فقرہ بازی کرنے لگے۔ بس قبلہ میں نے جو آڑے ہاتھوں لیا تو جھیپ کر نوک دم بھاگے۔ واللہ ہے وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ ان کی نانی ہی تو مر گئی۔ آزاد آزاد بڑے آزاد بنے تھے۔ ایسے جھیپے کہ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ نواب کے یہاں جو آیا اس نے منھ کی کھائی۔ دم دبا کر بھاگا۔ میرے مقابلے میں کوئی ٹھہرے تو بھلا۔ بس آپ ایک کو بلایئے۔ دو دو چوبچیں ہوں بھئی پالی سے نوک دم نہ بھاگے تو مونچھیں منڈا ڈالوں۔
مصاحب : (آگے بڑھ کر) آیئے بس آیئے، دو دو نہیں چار چار چو بچیں سہی۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ زبان ہے کہ کترنی کو مات کرے۔ زبان آگے جاتی ہے۔ لفظ پیچھے رہے جاتے ہیں۔
خوجی : زبان کیا چرخا ہے رانڈ کا۔ واہ ری زبان، فرمائشی زبان ہے۔ مگر خدا جھوٹ نہ

بلائے تو۔ رے اور زے اور ے اور ٹے زبان سے نہ نکلتا ہوگا۔ روٹی کو تو حضور روتی کہتے ہوں گے۔

مصاحب : جب خدا جھوٹ نہ بلوائے، آپ اور جھوٹ نہ بولیں۔ واہ وضع کے خلاف ہے۔ ماشاء اللہ آپ کو وضع کا کس درجہ خیال ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں عمر بھر میں ایک دفعہ دھوکے سے سچ زبان سے نکل گیا تھا جس کا آج تک افسوس ہے

خوجی : اور وہ واقعہ میں بتاؤں جب آپ ایک دفعہ سچ بولے تھے۔ ایک شخص نے ان کے باپ کا نام پوچھا۔ انھوں نے جلدی میں صاف صاف بتا دیا۔ اس کا آج تک رنج ہے۔

اس پر سب کے سب ہنس پڑے، اور خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ مصاحب ایک چھٹے ہوئے گرگے۔ وہ کب جھینپنے لگے۔ جب محفل سے نکالے گئے تب تو جھینپے نہیں، اب بھلا کیا شرمائیں گے شرم چہ کنی ست کہ پیش مرداں آید۔ شاباش جھینپیں تو نواب کی محفل سے نکالے جائیں۔ اسی دم گردن ناپی جائے اور چلتے پھرتے نظر آئیں۔

خوجی : کیوں حضرت کچھ فرمائیے تو، آپ تو خاموش ہی ہو رہے۔

مصاحب : اجی تم گوکھوں سے کیا بحث کریں۔

خوجی : گالیاد تجیے گالیاں۔ پانی پی پی کر کوسیے۔ پنجے جھاڑ کے لڑنے لگیے۔ لاحول ولا قوۃ۔

التماس : راوی اپنے ناظرین اُولِی الْاَبْصار خصوصاً متین اور مہذّب بزرگواروں کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ذیل کے حصّے کو بد تہذیبی پر نہ محمول فرمائیں۔ ہم اپنے ملک کے رسوم بد اور عاداتِ خلاف تہذیب کو عمدہ طور سے لکھ ہی نہیں سکتے۔ تا وقتیکہ ہم کل مذموم کا خاکہ نہ اڑائیں پس ہم مجبور ہیں۔

اب سنیے کہ یہ گفت گو تو ہو ہی رہی تھی کہ ایک ڈکڑی گھڑ گھڑاتی ہوئی آئی۔ اس پر سے ایک نیک بخت بصد شانِ دل ربائی اتریں۔ (نیک بخت کاہے کو بد بخت کہیے) خراب سب کی نظر اسی طرف ہے۔ چھما چھم کی آواز نے شورِ محشر بپا کیا۔ اور نواب تو ریشہ خطمی ہو گئے۔ وہ پتلی کمر کو لچکاتی ہوئی تشریف لائیں۔ نواب نامدار نے سب شرفا سے برتر مقام پر ان کو جگہ دی۔ اس نے نواب کا مسند گھسیٹا، اور بڑے ٹھسّے سے متمکن ہوئی۔ اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

نواب : مزاج شریف؟

وہ : آپ کی بلا سے۔

نواب : خطا۔ قصور۔ گناہ؟
مصاحب : حضور خدا کی قسم! اس وقت آپ ہی کا ذکرِ خیر تھا۔
وہ : چل جھوٹے! علی کی سنوار تیرے اوپر اور تیرے نواب پر۔
مصاحب : کلام اللہ کی قسم!
وہ : اب ہم ایک چپت جمائیں گے۔ دیکھو نواب اپنے ان گرگوں کو منع کرو۔ میرے مُنھ نہ لگا کریں۔ جھوٹ کی روٹیاں کھاتے ہیں یہ نمک حرام۔
رفیق : اور یہ تو جھونٹوں کا سردار ہے۔
وہ : بجا اور تم؟ اے تم سب کے سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہو۔
اتنے میں ایک مہری پانچ چھ برس کے ایک لڑکے کو گود میں لائی۔
نواب : یہ بھیّا کس کا ہے۔
وہ : ہماری بہن کا۔ اللہ رکھے۔ لڑکا کیا پہاڑی مینا ہے۔ بھیّا نواب کو گالیاں تو دینا۔ تم تو شرماتے ہو۔ بس یہی تو ہم کو اچھّا نہیں معلوم ہوتا۔ (چوم کر) شاباش بھیّا گالیاں دو۔ نواب کو ان کو مٹھائی دوگے پھر؟
نواب : ہاں ہاں، ابھی ابھی۔
وہ : لے گالیاں دے دو تو نواب مٹھائی دیں، (چوم کر) بھیّا دو گالی۔
لڑکا : پہلے مٹھائی لاؤ۔ پھِل ہم دالی دینگے (پھر ہم گالی دیں گے)
مصاحب : ماشاء اللہ چشم بد دور! کیا میٹھی بول چال ہے۔
اب چو طرفہ سے مصاحب بلاتے ہیں۔ آؤ ہمارے پاس آؤ، ہم دیں۔ اور لڑکے کے کان میں انھوں نے کچھ سکھا دیا تو اس نے نواب کو بے نقط سُنائیں اور وہ گالیاں دیں کہ توبہ ہی بھلی۔ نواب صاحب خوب کھِل کھلا کر ہنسے۔ محفل بھر لڑکے کی تعریف کرنے لگی۔ اللہ رکھے کیا مینا کی طرح بول رہا ہے۔ چشم بد دور! خداوند اب ان کو مٹھائی منگوا دیجیے۔
نواب : اچھا بھئی انھوں نے کہنا کیا ہمارا۔ کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟
خدمت گار : حاضر (کوئی اٹھارہ آدمی ایک دم سے بول اٹھے۔)
نواب : بھئی ان کو پانچ روپیہ کی مٹھائی تو لا دو۔
وہ : اے ہٹو بھی۔ آپ اپنے چہرہ شاہی رہنے دیں۔ کیا کوئی فقیر ہے۔ خدا نخاستہ (نخواستہ)

نواب : اچھا ایک اشرفی کی مٹھائی لادو۔

وہ : بھیّا سلام کر لو۔

راوی : ضرور۔ اب تو سلام کا موقع ہی ہے۔ ایک بار گالی دی تو ایک اشرفی پائی۔ اب دو چار بار اور گالیاں دو تو لوٹ لے جاؤ۔ واہ رے نواب۔ کس لطف سے آپ اس لڑکے سے فرماتے ہیں، کہ ہاں کہو کہو۔ کہو تو مٹھائی منگوا دیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اے لعنت خدا۔ توبہ توبہ کتنا بھونڈا مذاق ہے۔ معاذ اللہ!

نواب : کوئی چیز تو کہو اس وقت پیلو کی کوئی چیز کہو۔ تمھیں واللہ!

وہ : لے ہٹو بھی۔ لاؤ رسنو۔ خدا کی قسم دیتے ہیں۔ آج شبین ہیں۔ آپ کو گانے کی سوجھتی ہے۔

نواب : اجی سب شبین ہی ہیں۔ کہو بھئی۔ ذری جی بہلے گا۔ اتنے میں دو چار لیموں جو سامنے پڑے تھے بی صاحب نے اٹھا لیے۔ ایک لیمو داہنے ہاتھ میں لیا۔ اور دوسرا لیموں اسی ہاتھ سے اچھالا، اور رُوکا پھینکا اور رُوکا۔ پندرہ منٹ تک اسی طرح اچھالا اور روکا کیں۔ محفل بھر میں شورِ تحسین مچا ہوا ہے کہ واہ کیا سُلّے ہاتھ ہیں۔ واللہ اس کمال کو تو دیکھیے۔ وہ بولیں بھلا نواب تم تو اچھالو۔ جب جانیں کہ نیبو گرنے نہ پائیں۔ نواب بے چارے نے بھی ایک لیموں ہاتھ میں لیا۔ اور دوسرا اُچھالا تو تڑ سے ناک پر گرا۔ پھر اُچھالا تو کھوپڑی پر کھٹ سے۔ پھر اُچھالا تو ٹانگ پر پھٹ سے۔ تب تو جھلا کر نواب نے لیموں پھینک دیے۔

وہ : ماشاء اللہ سے کتنے برق دم ہیں آپ۔

نواب : ہم کیا کچھ۔

وہ : بس جاؤ بھی جی۔

نواب : اور یہ انگلی میں کپڑا کیسا بندھا ہے۔

وہ : پوچھو۔ دیکھیں کتنی عقل ہے؟

نواب : شانِ خدا۔ اے اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ چھالیاں کترتی ہوگی۔

وہ : ہاں وہ خون کے شراٹے بہے کہ توبہ! میں نے پانی ڈالا اور کپڑا باندھ دیا۔ اب کبھی چھالیاں نہ کتریں گے۔ واللہ قسم کھاتے ہیں۔

مصاحب : حضور آج اس شہر میں ان سی دوسری نہیں ہے۔ ہنس مکھ، خلیق خندہ پیشانی۔

نواب : بھلا کبھی نواب کے بھی ہاں جاتی ہو۔ سچ سچ کہنا ؟
وہ : علی کی سنوار ان پر نواب۔ تو بھلا خیر کر کے اللہ میاں کے گھر سے پھر آئے ہیں۔ اس منحوس سے کوئی اتنا تو پوچھیے کہ آپ کہاں کے ایسے بڑے مولوی بن بیٹھے۔
نواب : جی بجا ہے۔ جو آپ کو نہ بلائے وہ منحوس ہوا۔
وہ : بلائے! بلائے یا سری ٹیک کرے۔ جس کو غرض ہو گی آپ ہی دوڑا آئے گا۔
اتنے میں میاں آزاد اور خوجی وہاں سے چمپت ہوئے۔
آزاد : خوجی بھئی آج تو طبیعت کچھ بے لطف ہے۔ عضا شکنی ہو چکی اب جان سکتی ہے۔
خوجی : آپ سے تو کہتے کہتے مر مٹے کہ ابھی بے احتیاطی نہ کیجیے تبرید پیتے جائیے۔ مگر آپ نے نہ مانا نہ مانا۔ اگر آپ تبرید کا استعمال کرتے جاتے تو آخر جرج ہی کیا تھا، مگر تم سنتے کس کی ہو۔
آزاد : یار آنکھیں جلتی ہیں۔
خوجی : بخار کی آمد ہے۔ بس اب سو رہیے۔ لاحول ولا قوۃ، مجھے خوف ہے کہ مبادا بیماری بڑھ جاوے، اور طول کھینچے، تو پھر غضب ہی ہو جاوے۔ لاحول۔ خاصے اچھے ہو گئے۔ مگر ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نوبت پہنچائی۔ پھر خود کردہ را چہ علاج۔
آزاد : کسی حکیم کو بلائیے!
خوجی : ابھی حکیم کیا کرے گا۔ اب دوا تو کہیں کل پیجیے گا نہ پھر حکیم کو کیوں بلواتے ہو۔ ابھی سے۔ مگر اب کی ایسا نہ کرنا کہ صبح کو حکیم شام کو بید۔ دوپہر کو ڈاکٹر۔ آپ کی بھی جتنی باتیں ہیں سب حماقت کی اور جلد بازی کا آپ پر خاتمہ ہے بس۔
آزاد : کل نواب کے یہاں بڑی دل لگی رہی اور آپ کچھ سمجھے بھی یہ ڈکری وہی تھی جو روشن علی خرید کر لائے تھے۔ معلوم ہوتا ہے فٹن بھی تڑسے خرید ہی لیا۔
خوجی : اُونھ یہ کون بڑی بات ہے۔ اجی اسی میں تو ایسے نواب زادوں کا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ ان کی صحبت میں جب بیٹھے خوب گپ اڑائے، اور جھوٹ اس قدر بولے کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملائے۔ بات بات پر خوشامد کرے۔ مگر مشکل اتنی ہے کہ مصاحبوں سے ہر دم عہدہ برآ کیوں کر ہو چغل خور بھرے ہوئے۔ بات ہوئی اور چغلی کھائی۔ رئیس کے مزاج کو برہم کر دیا۔ جمنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور جو جم گئے تو دونوں وقت پلاؤ اور

باقرخانی اور شیرمال اور پراٹھے اور کباب اور قورما، اور دوپیازہ اور سربائے لذیذ، چلیھے اور دندنائیے۔ اور جو رئیس کے مزاج میں زیادہ دخیل ہوئے تو پھر تو پوبارہ ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹیے اور سونے کی اینٹیں بنوا کر صندوقچے میں رکھ چھوڑیے لیکن حضرت واللہ ہے کہ ایسے مال کو رہتے نہ دیکھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کدھر آیا کدھر گیا۔ بس ادھر آیا ادھر صفایا۔ ع۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔

آزاد : ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ خوب یاد آیا کہ کل آپ نے نواب کے یہاں تو ہم کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ میں اس وقت خاموش۔ تم نے آزاد کا نام لے کر وہ وہ سنائیں کہ میں جھلا جھلا کر رہ گیا۔ لے اب اس وقت پھوں آپ کو۔

خوجی : واہ اٹھنے کی تو طاقت ہی نہیں۔ آپ کو اور خم دم یہ کہ پیٹھوں گا۔ بھائی نوابوں کی صحبت میں ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں سمجھے۔ اپنی خوب تعریف کرے۔

آزاد : لاحول ولاقوۃ۔ ایسی صحبت پر تین حرف۔ کیا بھونڈی باتیں ہوتی تھیں۔ اس لونڈے نے کیسی لقط سنائی ہیں کہ توبہ توبہ! یہ نواب بھی پاگل چونگاہی رہے۔

خوجی : اور نہیں تو کیا نرے چوچ

آزاد : خدا کرے یہ رئیس زادے پڑھ لکھ کر مہذب اور متین فہیدہ اور سنجیدہ ہو جائیں۔

خوجی : ارے خدا نہ کرے بھائی! یہ تو جاہل ہی ہیں تو اچھا۔ واللہ جو کہیں پڑھ لکھ جائیں تو پھر اتنے بھلے مانسوں کی پرورش کون کرے۔

آزاد : جی بجا ہے۔ جھوٹ بولنے والے، خوشامد کرنے والے بے ایمان، دغاباز، جعلساز تو مزے اڑائیں اور علما و فضلا و کملا جوتیاں چٹخائیں۔ بس اب ہم کو نیند آتی ہے۔ ذرا سونے دو۔

دوسرے دن گلِ آزادی کے رنگ و بو۔ بذلہ سنج، لطیفہ گو، میاں آزاد فرخ نہاد اور ان کے شفیق بالتحقیق، میاں خوجی خانہ برباد، پھر نواب قمر رکاب کی محفل عشرت منزل میں شریک ہوئے۔ میاں آزاد کو تو دل سے لگی تھی کہ ٹرکی جائیں، اور اس کے دشمنوں کو نیچا دکھائیں۔ مجیدی تمغے لٹکائیں، اور سُرخ رو ہو کر واپس آئیں، اور بتِ ملائک نظر فریب عدوے صبر و شکیب، خاتونِ مہ لقا، پیاری حسن آرا کو بیاہیں۔ لیکن طبیعت کا اضمحلال اور حُرِ موسمی کے اشتعال نے ٹنگڑی لی۔ سوچے کر خیر۔ ادھر چنگے ہوئے اُدھر روانہ باشد۔ کھٹ سے داخل منزل مقصود۔ اور تڑسے شبدیزِ سبک خیز کی پیٹھ پر سوار۔ اور دن سے

داغ دیا۔ یہ مارا وہ مارا، یہ پیادہ لیا۔ ادھر چڑھ دوڑے، ادھر دھر دھمکے۔ بس میدان کارزار ہو۔ اور میاں آزاد کی تلوار، تیغ خوش غلاف چمکے، تو پرے کے پرے صاف ہو جائیں۔ خوجی اپنی اور ہی دھن میں تھے۔ وہ افیون اور پوست ہی کی اُدھیڑ بن میں تھے۔ دن رات یہی فکر! ہر دم یہی ذکر کہ بارِ خدایا وہاں افیم ملے گی یا نہیں۔ چین تو وہاں سے قریب ہے۔ پھر کیا چینی افیم دستیاب نہ ہوگی۔

راوی : ماشاء اللہ اس واقفیت کے صدقے۔ اس جغرافیہ دانی کے قربان۔ میاں خوجی علاوہ کشف و کمالات مورخ بھی بے بدل ہیں۔ خدا عین الکمال کے اثر سے مصئون رکھے۔ آمین یہ کیا دور کی سُوجھی ہے۔ کہنے لگے چین تو ترکی کے پڑوس ہی ہے۔ کیا ہمسایہ کی افیون نہ ملے گی۔ منھ دھو رکھیے مل چکی۔ کجا چین، کجا روم، قریب ہونے کی ایک ہی کہی۔ ان کو بس افیون سے سروکار ہے۔ مذہب کا جوش نہ خروش۔ بس ایک افیونی، اور دوسرے چانڈو نوش (یعنی دھواں تک پی جائیں) بلکہ انسی تک نہ چھوڑیں۔

خیر دونوں کے دونوں نواب نامدار کی کوٹھی پُر بہار میں پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد ادب کے ساتھ بیٹھے۔ خوجی نے تو بیٹھتے ہی مقراضِ زبان سے جامۂ سکوت کو کترنا شروع کیا۔

خوجی : حق تعالیٰ ایسے رئیس با توقیر کو سلامت اور با کرامت رکھے!

مصاحبین : (با آوازِ بلند) آمین ثم آمین!

خوجی : کیوں پیر و مرشد۔ آج کچھ چہل پہل نہیں ہے؟

مصاحب : چہل پہل ہی کی آپ کو سُوجھتی ہے۔ چہل پہل کیا خاک ہو۔ ایک سانحہ جگر دوز ہو گیا۔

خوجی : الٰہی خیر۔ الٰہی خیر۔ بھئی بڑی بُری سُنائی۔ خداوند انجام بخیر کرنا۔ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی (آہستہ سے) کچھ حال تو کہیے خیریت تو ہے۔

آزاد : خدا خیر کرے۔ حضرت کچھ فرمائیے؟

نواب : کیا عرض کروں۔ بس کچھ پوچھیے نہ۔ جب دن بُرے ہوتے ہیں تو ہر چہار طرف سے بُری ہی بُری باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ابھی اٹھوارے کا عرصہ ہوا کہ گھر میں وضعِ حمل ہو گیا۔ ایک مصیبت اور۔

آزاد : پھر یہ آپ کیا فرماتے کیا ہیں پیر و مرشد وضعِ حمل ہونا بھی کیا خدانخواستہ کچھ

بُری بات ہے۔ اجی وضعِ حمل کے معنی لڑکا پیدا ہونا۔ مشکوئے معلیٰ میں اگر فرزند دلبند تولّد ہوا تو زہے نصیب۔ جشن کیجیے۔ یہ افسوس آپ کیسا ظاہر کر رہے ہیں معقول، کہنے لگے وضعِ حمل ایک مصیبت، اچھی مصیبت ہے۔

مصاحب : ہمارے حضور کا منشا اسقاطِ حمل سے تھا۔ آپ سمجھے نہیں۔

راوی : کیا خوب واہ نواب صاحب۔ کیوں نہ ہو۔ اسقاطِ حمل اور وضعِ حمل ہی میں آج تک حضور کو فرق نہ معلوم ہوا۔ لاحول ولا قوۃ کیا خاصی مصیبت بتاتی ہے۔ کہ گھر میں وضعِ حمل ہو گیا۔ واللہ پھڑکا دیا۔ بھئی اب تو ہنسی ضبط نہیں ہوتی اور طرہ اس پر یہ کہ مصاحب نے اس پر اور بھی جلا دے دی۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے حضور کا منشا کچھ ہو۔ اور اُلٹے میاں آزاد ہی کو للکارتے ہیں کہ (آپ سمجھے نہیں) بجا ارشاد ہوا۔ پیر و مرشد! وہ ایسے ہی ناسمجھ ہیں۔ دانا اور جالینوس تو بس ایک آپ کے نواب دوسرے ان کے مصاحبین منحوس۔

رفیق : (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) اجی وضع حمل بھی کہتے ہیں شیخ لکھ گیا ہے۔

راوی : ایک نہ شد دو شد۔ نواب صاحب نے تو اسقاطِ حمل کو وضعِ حمل بتایا۔ مصاحبُ الدولہ بہادر نے آزاد کو ناسمجھ بتایا۔ اور رفیق بولے کہ اجی وضع حمل بھی کہتے ہیں۔ اس مردک سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ تلفظ تک تو درست ہی نہیں تیرا۔ وضع کو تو وضع کہتا ہے۔ شیخ الرئیس بے چارے کو کیوں بدنام اور مطعون کرتا ہے۔ مگر واہ ری چالاکی کس پھرتی سے زبان چلتی ہے۔ زبان کیا بیگو کا یابو ہے۔ کیسی جلدی جھٹ پٹ شیخ کا حوالہ بھی دے دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس خوشامد کی دم میں رسّا۔

آزاد : ہاں پیر و مرشد فرمائیے، تو خدا ناکردہ کیا رنج نصیب اعدا ہوا کہ عیش و عشرت کی محفل میں وہ چہل پہل ہی نہیں۔ وہ رونق ہی نہیں۔ وہ جوبن ہی نہیں۔ چھما چھم کی آواز کان میں نہیں آتی۔ وہ قہقہے کیا ہوئے۔ وہ چہچے کیا ہوئے۔ مصاحب بلبلوں کی طرح چہکتے تھے۔ دیوار و در مہکتے تھے۔ ہم تو دو گھڑی آپ کی صحبت میں دل بہلانے آتے تھے، مگر دیکھا تو محفل بزم خاموشی، جیسے چپ تعزیہ نکلنے والا ہے۔ ہر سمت سناٹا پڑا ہوا ہے۔

نواب : (آہ سرد کھینچ کر خاموش ہو رہے۔)

مصاحب : (افسردگی کی صورت بنائے ہوئے گردن جھکائے ہوئے)۔

رفیق : (سر پکڑ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے افسوس کر رہے ہیں کہرام مچا ہوا ہے۔ کبھی

غل غپاڑا کبھی لب بند)۔
اتنے میں ایک صاحب بول اٹھے کہ حضرت کیا عرض کریں بس کچھ پوچھیے نہ۔ آج تو بڑا سانحہ ہوش ربا ہوگیا۔ ایک مینڈھا مر گیا۔ کیسا تیار تھا کہ میں کیا کہوں۔ گینڈا بنا ہوا۔

مصاحب : واہ کیا بھونڈی تعریف کی ہے۔ کہنے لگے گینڈا بنا ہوا۔ اے یوں نہیں کہتے کہ گینڈے کو ٹکرا دیتا تو قین کر کے نوک دم بھاگتا پٹا توڑ۔ ایک دفعہ میں اپنے ساتھ عیش باغ لے گیا۔ وہاں دو چار آدمی مینڈھے لیے کھڑے تھے۔ ہفتے کا دن، ساون کا مہینا۔ میلہ جما ہوا۔ ساقنون کی دکانوں پر دھواں دھار چلمیں اڑ رہی ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے۔ اتنے میں ایک راجہ صاحب پالھٹے پر سوار بڑے کر وفر سے آ رہے تھے اور بندۂ درگاہ مینڈھے کو عین سڑک پر لیے ہوئے ڈٹے کھڑے ہیں۔ اتنے میں خاص بردار نے للکارا کہ ہٹا بکری کو سامنے سے بھائی اتنا کہنا تھا کہ میرا چہرہ مارے غصّہ کے تمتمانے لگا۔ آگ ہی تو ہوگیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کہا بھئی پھر تو کہنا۔ خاص بردار ایک بتی باندھے ہوئے دو پایوں پر چڑھائے ہوئے وہ کس کی سنتا ہے۔ آنکھیں نیلی پیلی کر کے کہتا گیا ہے۔ ہٹا بکری کو سامنے سے سواری آتی ہے۔ تب تو قبلہ رگِ ہاشمی جوش زن ہوئی۔ اور میں نے مینڈھے کو للکارا، تو ایک دفعہ ہی بلا کی طرح جھپٹ کر ہاتھی کی مستک پر ایک ٹکر لگائی۔ کھٹاک۔ وہ آواز آئی کہ جیسے کوئی تناور درخت اراراکر زمین پر آ رہا۔ بندر تو آپ جانیے عیش باغ میں ڈال ڈال لگے چیخنے۔ بندریائیں بچوں کو چھاتی سے لگائے دبک رہیں۔ بندرا اور بڑے بڑے جغادری بندروں کے آنکھیں بند کرلیں۔ تو وجہ کیا ان کو مینڈھے پر بھیڑیے کا دھوکا ہوا۔

خوجی : قطع کلام ہوتا ہے آپ کے مینڈھے کو بھیڑیا سمجھے، مگر واللہ آپ کو بے دُم کا لنگور سمجھے ہوں گے۔ جب ہی آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھ رہے تن بہ تقدیر۔

محفل بھر یہ لطیفہ سن کر لوٹنے لگی۔ اور مصاحب الدّولہ نے بھی تعریف کی کہ بھئی خوب کہی۔ پھر داستان یوں شروع کی۔ بس حضرت سلامت۔ ایک ٹکر لگا کر پیچھے ہٹا اور ہٹتے ہی ڈپٹا، اور بدن کو تول کر ایک دفعہ ہی طرارہ جو بھرتا ہے تو پھر مستک پر ایک اور ایک دو ٹکریں لگائیں۔ پھر پھرا تو اُچک کر فیلبان کے ماتھے پر ایک ٹکر لگائی۔ مگر آہستہ سے۔ اس تمیز کو دیکھیے گا۔ سمجھا کہ ان میں ہاتھی کا سا زور کہاں۔ یہ انسان ضعیف البنیان، لہٰذا آہستہ سے ٹکر لگائی کہ کورے نہ بچیں۔ مگر راجہ کا ادب کیا۔ اب میں لاکھ لاکھ زور کرتا ہوں وہ سنتا کس کی

ہے۔ غصہ آیا سو آیا۔ جیسے بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ چھڑا کے پھر پکا اور ایک دو تین چار بس خدا جانے کتنی ٹکریں لگائیں کہ پاٹھا بولا گیا۔ جنگھاڑ کر نوک دم بھاگا۔ یہ جا وہ جا۔ آدمی پر آدمی گرتا ہے۔ آپ جانیے پاٹھے کا بگڑنا کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں۔ تو قبلہ وہ مینڈھا آج صبح کو چل بسا۔

مصاحبین : اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

مصاحبین نے راجعون کے عین کو قرأت کے ساتھ ادا کیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک کو بھی "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون" کے معنی نہیں معلوم۔ لیکن پڑھیں گے اس طرح گویا بڑے عربی داں ہیں۔

آزاد : کہاں افسوس ہوا۔

خوجی : افسوس سِن شریف کیا تھا؟

نواب : اے ابھی بچہ تھا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، مگر داغِ حسرت دے گیا۔

مصاحب : حضور وہ آپ کا دشمن تھا دوست نہ تھا۔

نواب : ارے بھائی کس کا دوست کیسا دشمن، اس بے چارے کا کیا قصور۔ ع۔ "از دستِ اجل بسے جگرہا خون شد"

خوجی : حق ہے :

کس نہ آمد ازان جہاں کہ تا پرسم ازو — کا حوالِ مسافران عالم چوں شد

نواب : وہ تو اچھا گیا، مگر ہم سب کو جیتے جی مار ڈالا۔

آزاد : عرض کروں پیر و مرشد! یہ عالم کون و فساد ہے۔ اس دُنیائے دون سے جو گیا اچھا گیا۔ مگر نوجوان کی وفات کا سخت رنج اور اس کے انتقال کا بڑا ہی ملال ہوتا ہے۔ ع۔ "ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مُرد"

مصاحب : اور پھر جوان بھی کیسے کہ ہونہار ہاتھ مل کے رہ گئے یار۔ کیا کریں کچھ بس چلتا ہے۔

آزاد : عارضہ کیا تھا؟

رفیق : اجی عارضہ کیا بتائیں۔ بس قسمت ہی پھوٹ گئی۔

مصاحب : مگر کیا وفات پائی ہے۔ رمضان المبارک شبین۔

چُپ چاپ کھڑے ہیں، یہ نہ کہا کہ ہمارے رفیق ہیں۔ مرنے کٹنے والے آدمی۔ جہاں ہمارا پسینا گرے وہاں یہ خون گرائیں، اور لہو کی ندیاں بہائیں۔

راوی : واہ سب زبانی داخلہ۔ لہو کی ندیاں بہانے والے جیوٹ کے آدمی آقا کے خیر خواہ ابھی آپ نے دیکھے ہی نہیں۔ اس نمک حرامی پر خدا کی مار کہ منھ پر تو تعریف کریں اور پیٹھ پیچھے نواب اور بیگم دونوں کو صلواتیں سنائیں۔ کسی کو گربۂ مسکین بنائیں کسی کو زن مرید بتائیں لاحول ولاقوۃ۔ اس بے تکے پن کو ملاحظہ فرمائیے کہ پردے کے پاس زنانی ڈیوڑھی میں جاکر نواب صاحب کے لطیفے کی تعریف کرتے ہیں، اور بآواز بلند داد دیتے ہیں کہ واہ حضور بلّی کے لیے نغرّانا خوب برجستہ فرمایا، اس جگت بازی کے صدقے۔ پھر فرمائیے۔ بیگم صاحب بُرا مانیں یا نہ مانیں۔ وہ نواب کی طرح دشمنِ عقل تو ہیں نہیں، کچھ ان کو تو ان مصاحبوں کے نام سے نفرت ہے۔ جب یہ زنانی ڈیوڑھی پر جاکر لطیفوں کی تعریف کریں تو ان کو بُرا معلوم ہو یا نہ ہو۔

آزاد : بھئی غصہ کو تھوک دو۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ ان کی بیوی ہیں وہ چاہے گھڑکیاں سنیں چاہے جھڑکیاں سُنیں۔ آپ بیچ میں بولنے والے کون۔ اور پھر جس کا کھاتے ہو اسی کو بے نقط سناتے ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔ اس لیاقت کے قربان، اور بااینہمہ یہ دعویٰ کہ ہم نمک حلال اور کٹ مرنے والے لوگ ہیں۔

اتنے میں نواب صاحب اندر سے تشریف لائے، اور مصاحبوں نے استادہ ہو کر سروقد تعظیم کی۔ امیروں کے دربار میں آپ جانیے ایک کا ایک دشمن سیکڑوں چغل خور ہر دم یہی فکر رہتی ہے کہ ایک دوسرے کی چغلی کھائیں، اور سب کو اس دربار سے نکلوائیں خود بدولت جم جائیں۔ داروغگی پائیں۔ اور چوطرفہ ہم ہی ہم نظر آئیں۔ مصاحب الدولہ جو پردے کے پاس سے گالیاں دیتے ہوئے آئے، تو دو مصاحبوں (حافظ جی اور میاں ندرت) نے باہم صلاح کی کہ آج نواب برآمد ہوں تو اس کی چغلی کھائیں، اور اس کو کھڑے کھڑے نکلوائیں۔ دونوں نے دل میں ٹھان لی کہ خوب حاشیے چڑھائیں گے، اور نواب کو بھر دیں گے۔ نواب کو جو آتے دیکھا تو چلا کر کہنے لگے۔

حافظ جی : سنا بھئی خدا یار خان (یہ ان مصاحب کا نام تھا جو زنانی ڈیوڑھی سے نکالے گئے تھے) سنا بھئی خدا یار خان بس اب جو کوئی کلمہ کہا تو ہم سے نہ بنے گی۔ جن کا کھائے

اسی کا گائے۔ نہ کہ جس کا کھائے اس کو بے نقط سنائے۔ نواب صاحب کو چاہے آپ بیٹھے بیٹھے زن مرید بنائیں چاہے گربہ مسکین کہیں، مگر خبردار جو آج سے بیگم صاحب کی شان میں کوئی نا ملائم کلمہ کہا تو خون ہی پی لوں گا۔

نواب : (چونکنا ہو کر) کیا؟

حافظ جی : کچھ نہیں حضور خیریت ہے۔

نواب : نہیں کیا معنی۔ کچھ تو ضرور ہے۔

میاں ندرت : تو چھپاتے کیوں ہو سرکار سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ حضور بات یہ ہے کہ میاں خدایار خان کو جب دیکھو حضور ہی کی ہجو کیا کرتے ہیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا کہ یہ بُری بات ہے۔ میاں کہہ کر بھائی کہہ کر بیٹا باوا کہہ کر ہاتھ جوڑ کر ہر طرح سمجھایا، مگر یہ تو لاتوں کے آدمی ہیں باتوں سے کب مانتے ہیں۔ ہم بھی چپکے ہو رہتے تھے کہ بھئی چغلی کون کھائے، مگر آج زنانی ڈیوڑھی سے حضور بس کیا کہوں۔ اب اور نہ کہوائیے۔

نواب : ان کو ہم نے موقوف کر دیا۔

معشوق رنگین ادا مس ورجینا کا حُسن و جمال اور نواب فرخ نہاد و میاں آزاد کا شوق وصال

بیا ساقی کہ شوق صحبت یار دلم را ہم چوں من برداشت از کار
بدہ جامی کہ چوں چشم کشاید نگاہم بر جمالِ دوست آید
بدہ جامی کہ کردم ہمچنا با شکارِ چشم آہوی بہ صحرا

اُدھر نوبتی نے دہل صبح بجایا، اور عاملِ روز نے تختِ زرین پر لبعد کرّ و فر جلوس فرمایا۔ ادھر نواب نامدار، فلک اقتدار کے رفقائے سلیقہ شعار نے بزمِ طرب کو دُلہن کی طرح آراستہ کیا۔ خود بدولت نے ایک مسندِ زرنگار انتخابِ روزگار، پر تشریفِ شریف ارزانی فرمائی۔ مصاحبوں اور رفیقوں نے اغل بغل دائیں بائیں، فرشِ مکلّف پر جگہ پائی۔ اتنے میں میاں آزاد اور ان کے رفیقِ خانہ برباد، میاں خوجی بھی تشریف لائے۔ دیکھتے ہی رفقا بول اٹھے کہ آئے آئے۔

نواب : یہ آئے آئے کیا معنی۔ معقول! کیا ہولی مقرر کی ہے۔ یہ رنگ ہمیں پسند نہیں۔

مصاحب : قربان جاؤں حضور! میاں خوجی لنگوٹی ہی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ مگر لاکھ پاپڑ بیلتے ہیں۔ یاروں کی پھبتی کا جواب نہیں دے سکتے۔ ہم تو ضلع جگت کے بادشاہ ہیں نہ۔

خوجی : اجی آپ ہولی کے بادشاہ سہی۔

نواب : بھئی خوب کہی واللہ خوب کہی۔

رفقا : ہاں پیر و مرشد۔ واللہ کیا برجستہ سوجھی ہے۔ میاں فری خوجی کے ڈنڑ تو مل دینا۔ واہ استاد۔ آج اس جگت بازی کے فن میں پکے ہو واللہ۔

مصاحب : پکے کاہے کو بلکہ پچکے۔

نواب : یہ کیا بے تکی اڑائی۔ یہ کیا بھونڈی ہانک لگائی۔ پکّے تو پکّے۔ یہ پچکے کیا معنی۔

مصاحب : اے پیر و مرشد ہولی کے لیے پچکے۔

نواب : لاحول ولا قوۃ بے تکی بھونڈی۔

مصاحبین : بجا ہے خداوند! بالکل بے تکی۔ محض بھونڈی بات۔ انھیں بات کرنی عمر بھر نہ آئے گی۔ بے پر کی اُڑانا خوب جانتے ہیں۔ دوگز اڑے اور تڑسے زمین پر۔ آدمی کیا گٹی ہے۔

راوی : بھئی آن بان میں ہاں ملانے والوں کا پایاں قدم ہے۔ نواب نے ذرا کسی کی تعریف کی اور یہ لے دوڑے، آسمان پر چڑھا دیا، اور ذرا کسی کی ہجو کی اور انھوں نے تحت الثریٰ کو پہنچا دیا۔ واللہ کیا چڑھاؤ اتار ہے۔ آدمی کیا ستار ہے۔ ذرا کان اینٹھیے پھر دل لگی دیکھیے۔ رفقا میں باہم زٹل قافیہ اڑہی رہا تھا کہ میاں مٹر گشت وارد ہوئے۔ آتے ہی زمین دوز ہو کر ایک فراشی سلام کیا، اور یوں گویا ہوئے۔

مٹر گشت : خداوند آج خوب سیر سپاٹا کیا۔ رہ نورد، اور جہانبان جہاں گشت، تو پھر آپ جانیے۔ بندہ ہے ہی فلک سیر۔ آج اتنا گھوما کہ ٹانگوں کے یابو کی گامچیاں درد کرنے لگیں۔ کوئی علاج بتائیے؟

مصاحب : گھانس کھائیے۔ یا کسی سالوتری کے پاس جائیے یا علاج المویشی[1] ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] علاج المویشی۔ ایک کتاب کا نام ہے۔ جس میں مویشیوں کی بیماریوں کے علاج کے طریقے اور دوائیں لکھی ہیں۔ نولکشور پریس سے شائع ہوئی تھی۔

نواب : خوب یابو کے لیے گھاس، اور سالوتری اور مویشی العلاج کی اچھی کہی۔

راوی : انھوں نے تو خیر اچھی کہی، یا جھک مارا، مگر حضور نے البتہ خوب کہی۔ علاج المویشی تو یاد نہ رہا۔ کہنے لگے مویشی العلاج۔ واہ ری لیاقت۔ واہ بانو کیا داد دی ہے۔ ایں! بانو کیا معنی؟ نواب ہیں یا بانو۔ اجی انھوں نے علاج المویشی کو الٹ کر اور مویشی العلاج کہا۔ ہم نے نواب کو الٹ کر بانو کہا تو کیا گناہ کیا۔ سچ کہیے گا۔ کیا الٹ پھیر ہے۔

نواب : کوئی تازہ تازہ، نو بنو خبر سنائیے۔ باسی نہ ہو۔ گرما گرم ہو۔

مٹر گشت : وہ روایت سناؤں کہ محفل بھر کو لٹاؤں۔ (کھل کھلا کر) سنیے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — ہست عصای رہ طبع سلیم
راوی افسانۂ رنگین بیان — طوطی پر ریختہ یعنی زبان
نقل کند کز پے سامان کار — قافلہ آمدہ باغ و بہار
نقد فرومایہ بازارِ شان — جنس صباحت ہمگی بارِ شان
شاد شگفتہ ہمہ بایک دگر — خندۂ ہر یک چو گل از روے زر
از رخ شان نور سعادت عیاں — بر سر شان بالِ ہما سائباں

حضور کسی ولایتِ مینو سواد سے چند نوجوانانِ پری زاد شگفتہ و شاد آئی ہیں۔ خیموں میں وہ بصد ناز و انداز متمکن اور ارد گرد اور سیکڑوں تماشائی ہیں۔ سنا کہ تھیٹر میں ناچتی ہیں، اور ایک ایک قدم اور ایک ایک ٹھوکر میں دلِ عشاق پائمال کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک محبوبِ چاردہ سالہ، جو زن سے نکل گئی تو بس میری جان تن سے سن سے نکل گئی۔

نواب : اور فرو کش کہاں ہیں۔

مٹر گشت : اُہو ہو ہو۔ بس یہ نہ پوچھیے:

سایہ فگن خیمہ از ہر کنار — ہر طرف دشت۔ جواہر بہار

نواب : بھلا تماشا کب سے شروع ہوگا؟ اس وقت تو بس یہ نقشہ ہے کہ:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

مٹر گشت : بس آج شام کو نو بجے سے۔ حضور قابل دید ہے۔ بلکہ دید ہے نہ شنید ہے۔

مصاحب : سب کو دکھائیے گا۔ اکیلے اکیلے مزے لوٹنا اچھا نہیں۔ ع۔ بہار دیتی نہیں سیر بوستان تنہا"

خدایار خان : حضور فدوی داد خواہ ہے! کل خداوند نعمت نے برطرفی کا حکم سنایا۔ آج میری جورو نے مجکو طلاق دے دی۔ روٹی کا نہ کپڑے کا، سنیت نیست کا بھرا۔

آزاد : پیر و مرشد ان پر نظر رحم فرمائیے۔ نوکری کی نوکری گئی، اور بیوی کی بیوی۔

نواب : حافظ جی ادھر آؤ۔ میاں ندرت کو بلاؤ۔ کل حال ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔

میاں ندرت : حضور! کہا کر نواب تو نرے پکھیا کے تاؤ ہی ہیں۔ زن مرید۔ اور بیگم صاحب کو اس نابکار نے وہ وہ باتیں کہیں، کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ عجب نامعقول آدمی ہے۔ مردود آپ کو یقین نہ آئے تو ان سے پوچھ لیجیے۔

نواب : (میاں آزاد سے) کیوں حضرت سچ کہتا ہے آپ نے کیا سنا؟

آزاد : بندہ پرور اب جانے دیجیے۔ قصور ہوا۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔

حافظ جی : یہ بے چارے تو ابھی سمجھا ہی رہے تھے کہ او گیدی خر اپنے آقائے نامدار کو ایسا کہتا ہے، اور بیگم صاحب کو ایسی ایسی صلواتیں سناتا ہے۔ کہ اتنے میں حضور بر آمد ہوئے۔

نواب : حسین علی۔ (خدمت گار) آج سے اگر خدایار کو یہاں آنے دیا تو تو جانے گا۔ کھڑے کھڑے نکال دو پہرے کے جوانوں سے کہدو کہ خدایار خان موقوف۔ پھاٹک میں قدم رکھنے کا حکم نہیں۔

خدایار خان : خداوند مجھ سے بھی سنیئے! آج حافظ جی اور میاں ندرت نے دھوکے میں تاڑی پلا دی۔ اور یہی منصوبہ تھا کہ نشے میں چور ہو تو اس کو کسی لم میں نکلوا دیں۔ سو حضور ان کی مراد بر آئی۔ آپ روشن علی سے پوچھ لیں چاہیں، اور میں اس در کو چھوڑ کر جاؤں گا کہاں حق تعالیٰ آپ کے بال بچوں کو سلامت رکھے۔ یہ سر اور یہ در رو نکٹا رونگٹا دعاگوئے دولت ہے، اور حضور تو پوتڑوں کے امیر ہیں، مگر چغل خوروں نے کان بھر دیے۔

خدا کے غضب سے ذرا دل میں کانپ چغل خور کے منھ کو ڈستے ہیں سانپ

نواب : ہاں یہ بات یوں ہے۔ الغیبُ عندالله۔ اچھا حسین علی پہرے پر نہ کہو۔ خبردار خدایار آج سے ایسی بے ادبی نہ کرتا۔ تم بحال ہوئے۔ مصاحبوں نے غل مچایا، اور آسمان سر پر اٹھایا کہ واہ حضور کیا ترحم ہے۔ ایسے رئیس پیدا کاہے کو ہوتے ہیں۔ مگر خدایار خان کو تو ان کی بیوی نے بچا لیا۔ نہ وہ طلاق دیتی نہ یہ نوکر ہوتے۔ واللہ جورو بھی قسمتوں سے ملتی ہے۔ خیر اس دن تو یہ گپ شپ رہی۔ دوسرے روز شام ہی سے تھیٹر میں جانے کی تیاریاں

ہونے لگیں۔

تھیٹر کی پری

التماس : اب ہم اپنے ناظرین متین سے پھر معافی مانگتے ہیں۔ کہ ہمیں ایک فرقہ ناپاک کا ذکر یہاں لانا پڑا۔ افسوس ہے کہ بعض رخسارِ دُوں پردر کے گروہ میں اربابِ نشاط کی گرم بازاری ہے۔ اور ان کی عقل و حلیہ عاقبت اندیشی سے عاری ہے۔

نواب : بھئی آبادی جان کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔

مصاحبین : ضرور ضرور حضور! بے ان کے مزا کرکرا ہو جائے گا۔ اتنے ہی فٹن گھڑگھڑاتی ہوئی آئی اور وہ عجب ناز و انداز سے چھم چھم کرتی ہوئی آکر مسند پر متمکن ہوئیں۔

نواب : یادش بخیر۔ واللہ ابھی آپ ہی کا ذکر تھا۔

آبادی جان : تم سے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ ہم سے جھوٹ نہ بولا کرو۔ ہمیں بھی کوئی دہاتن مقرر کیا ہے۔

نواب : خدا کی قسم کھاتے ہیں۔ چلو تم کو تماشا دکھا لائیں، مگر مردانے کپڑے پہن کر چلیے ورنہ ہماری بے عزتی ہوگی۔ عمامہ منگواؤں۔ سب سامان آپ کی عنایت سے موجود ہے۔

آبادی جان : (تنک کر) جو ہمارے چلنے میں بے آبروئی ہے۔ تو سلام (اٹھ کھڑی ہوئیں)

نواب : (دوپٹے کو دبا کر) ہمارا ہی خون پیے جو ایک قدم بھی آگے بڑھائے۔ ہمیں کو روئے جو روٹھ کر اٹھ جائے۔ حافظ جی کو بلاؤ۔ مردانے کپڑے لاؤ۔

راوی : کیا خوب۔ حافظ جی کے تعلق اچھا کام ہوا۔ لاحول ولا قوۃ۔

الغرض صندلی عمامہ زیبِ سر اور چست انگرکھا زیب بر ہوا۔ گھٹا پھنسا ہوا۔ ٹاٹ بانی بوٹ، پھندنا جھلکتا ہوا۔ نواب صاحب اور بی آبادی جان فٹن پر سوار، اور رفقا و مصاحبین کوئی بگھی کوئی ٹم ٹم کوئی پالکی گاڑی پر لدے ہوئے تماشا گھر میں داخل ہوئے۔ مگر جلدی اور وحشت میں پازیب اتارنا بھول گئی۔ وہاں پہنچے تو نواب صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ اور رفقا پیچھے پیچھے ساتھ۔ نواب قمر رکاب نے درجہ اول کے دو ٹکٹ لیے، اور سرکس میں دل سے داخل۔ اب سنیے کہ پازیب نے وہ شور مچایا کہ خفتگانِ تہ خاک کو جگایا۔ چھم چھم چھم چھم۔ اب جو ہے اسی طرف دیکھتا ہے۔ ہر فردِ بشر کی نظر نواب اور ان کے خوش رو اور قوس ابرو دوستِ طرحدار ہی

کی جانب ہے۔ تاڑنے والے تاڑ گئے۔ بھانپنے والے بھانپ گئے۔ نواب صاحب اکڑتے ہوئے۔ ایک کرسی پر جا ڈٹے، اور ان کے عنبریں مو، عربدہ جو ساتھی نے بھی ان کے قریب کی کرسی کو رونق بخشی۔ تو دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا خیمہ نصیب ہے اور اگرچہ:

بود شبی چوں دل گمراہ سیاہ — تیرہ دروں چوں مژہ شمع نگاہ
گشتہ زبس ظلمت شب روی ماہ — ہمچو رُخ کاغذِ مشقی سیاہ

تاہم ہر سمت جھاڑ اور کنول اور لیمپ کا وہ نور کہ۔ ع۔ دیکھیے تو غش کرے ارنی گوی اوج طُور:

جملہ قنادیل دے و شمعدان — چوں دل عاشق شدہ وقفِ کنعاں

الٰہی یہ مسکن نور ہے یہ کوہِ طُور ہے۔ چکاچوندھ کا عالم تھا۔ بیچوں بیچ میں ایک میدان اور ارد گرد کوئی دو ہزار کرسیاں۔ خیمہ بھر جگ جگ کر رہا تھا۔ اتنے میں دس بارہ گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے جوانانِ طنّاز میدان میں آتے اور:

پل مارنے کی ہوئی جو دیری — سبحان اللہ شان تیری

ایک نو عروس، سرمایۂ ناز، سرمست خوبی، سراپا انداز، چہاردہ سالہ، آفت کی پرکالہ:

نگاہش ساقی رندانِ بد نام — ز آب تیغ کردہ بادہ در جام
بچشمِ مست دیدارش رگِ خواب — بیادِ شوخی او برق بیتاب
دہن رمزی حدیثِ لن ترانی — زبان حرفی ز اسرارِ نہانی
شہیدِ جلوۂ او طاقت و ہوش — خرامِ مستی او عید آغوش

ایک گلگوں صبا رفتار پر سوار، اس شان برنائی، وکج ادائی، سے آئی کہ محفل بھر پر آفت ڈھائی:

نگویم توسن سُرعت نژادی — نسیم دل کشی باد بہاری
نوشتہ بر زمین نقش سم او — جوابِ شوخ چشمی ہای آہو
چو شوقِ عاشقان در گرم تازی — چو ناز دلبراں مشتاق بازی
ندیدہ عقل سُرعت آزمایش — چو مضمونی ز خاطر جستہ جانش

اُدھر پشت ادہم پر وہ آتش پارہ اِدھر ساری محفل محو نظارہ۔ مجسّم حُسن از سرتا فرق اور زبان حال و قال سے صدائے انا البرق۔ نظر جادو طراز۔ نگاہ غلط انداز۔ گردن شمع کافور، بلکہ فوارۂ نور۔ زنخدان نمک دانِ بلور۔ ابرو تیغ اصفہان، شمشیر بران:

بصورت نوبتی کمتر آفرید خدا — ترا کشیدہ دو دست از قلم کشید خدا
چو کرد نقش تو بر صفحۂ وجود رقم — صد آفریں ز زبان قلم شنید خدا

گھوڑے پر سے عجب پھرتی اور چستی کے ساتھ اچکی اور پھر پشت اشہب پر طنطنۂ واہ واہ غلغلۂ جزاک اللہ، ہر سو بلند تھا، اور لطفِ تماشا اس وقت دوچند تھا، اور طرہ یہ کہ کھیت خوش خرام و تیز گام عین راہوار ی میں چلا جاتا تھا۔ اور ایک آدمی کوڑے سے اس کو دھمکاتا تھا۔ ایک دفعہ :

چوں آں بت اسپِ خود را کردہ مہمیز — رواں شد اشکِ عاشق ہم جلوہ ریز

(ہرٹ) کہہ کر تڑ سے زمین پر شبدیز بادرفتار ہوا ہو گیا۔ مگر یہ پرکالۂ آتش جھپٹ کر پھر پیٹھ پر سوار۔ اس پر فرطِ طرب سے لیڈیوں اور جنٹلمینوں نے اتنی تالیاں بجائیں کہ خیمہ بھر گونج اٹھا :

بر پشتِ سمند ایں چہ بلا شوخ نگاریست — کز گرد رہ او بر رخ مہر غباریست

بس ایک چشم زدن میں سمند آہو شکار و صبا رفتار کو چمکا کر خیمے سے باہر۔ یہ جا وہ جا۔ اتنے میں ایک یورپین نے محفل کو مخاطب کر کے کہا کہ مس درجینا کل پھر تماشا دکھائیں گی۔ اور اب کی بڑے ٹھسے سے آئیں گی۔

بیا ساقی بیا اے ناز پرورد — کہ یارم وعدۂ زود آمدن کرد
بدہ جامی کہ باشد غارت ہوش — غم ہجراں کن از خاطر فراموش

اس کے بعد انواع و اقسام کے تماشا ہوئے اور ۱۱ بجے برخاست۔ اب سنیئے کہ نواب قمر رکاب، اس گلزار صباحت و بادۂ حدیقۂ وجاہت پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور ادھر میاں لٹو ہوئے، گیھوں پر گھر چلے۔ پہنچے تو گویا بے ہوش۔ دین و دنیا فراموش۔ نواب تو ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے اور میاں آزاد نے آہِ سرد دلِ پر درد سے کھینچ کر کہا کہ :

ہنوزش نو بہارِ حسن در جوش — ہنوزش نرگسِ ظالم قدح نوش
ہنوزش غمزہ در جادو طرازی — ہنوزش عشق گرم بے نیازی
ہنوزش تیر مژگان ستم زاد — جگر ہا ہمچو ماہی نشتر آباد
ہنوزش آمد نہار فتن ہوش — زجورش شکوہ ہا بر لب فراموش

ندرت : حضور ابھی مسا کر کے کوئی تیرہ چودہ برس کا سن اور اٹھرپنے کے دن اور

کس پھرتی سے اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہو رہتی تھی۔ کہ واہ جی واہ۔ اور پھر کبھی وہ ران پٹری جماتی تھی کہ سبحان اللہ میاں روشن علی بہت شہسواری کی لیا کرتے تھے۔ قسم خدا کی جو اُن کے باپ بھی قبر سے اٹھ آئیں تو یہ کرتب دیکھ کر ہوش پران ہو جائیں۔

خوجی : اور پھر اس شکل و شباہت، اور حسن و وجاہت کو۔ تو دیکھیے پری کا ٹکڑا ہائے کیا مکھڑا ہے۔

نواب : کیا چاند سا مکھڑا ہے۔

آبادی جان : واہ اچھا دکھڑا ہے۔

نواب : مکھڑا کیا بن گہا چاند ہے۔ بلکہ چودھویں کا چاند بھی ماند ہے۔

آبادی جان : ہم جاتے ہیں۔

نواب : بسم اللہ جائیے۔ یہاں اور ہی دھن ہے۔

مصاحب : نہیں حضور ایسا نہ فرمائیے۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ ہم حضور کو منائے لیتے ہیں۔ اس دستارِ پر بہار کو دیکھیے کس جوبن پر ہے :

بر گوشۂ دستارِ تو اے لالۂ سیراب   لختِ جگر کیست کہ بر سر زدہ یار

میاں آزاد : دستار کی تعریف ہم سے سُنیے :

میزند ناخن بدل ایں طرۂ خمدار تو   مصرعۂ پیچیدہ باشد شوخ من دستار تو

رفیق : اجی ہم اس سے بڑھ کر سنائیں :

بدل پیچیدہ رنگین معنیٔ سربستہ مقبولی   مگر بست آں صنم امروز دستار گلابی

خوجی : اس کا بھی چچا جان سنیے :

خوش بگرد سر تو می گردد   جگرم خون زرنگ دستارست

نواب : اچھا اب ہمارا آرام کرنے کا وقت ہے۔ آپ سب صاحب بھی آرام کریں۔ فی امان اللہ۔ نیتِ شب بخیر۔ کل ملیں گے۔

مصاحبین و رفقا : آداب کورنش (دفعتہً)

واہ رے نوابی ٹھاٹھ۔ عاشق ہوئے تو بس مرنے ہی لگے۔ دین کی فکر رہی نہ دنیا کی۔ واثق دمجنوں گرد برد۔ فرہاد کے عشق کی گرم بازاری سرد۔ یہ بھی ایک فخر ہے کہ ہم عاشق زار ہیں۔ فلاں پری زاد پر دل آیا ہے۔ شہر بھر میں دھوم ہو جائے کہ نواب صاحب کو عشق چرایا ہے :

تاکہ مشہور ہوں ہزاروں میں ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

اب مُنھ پھلائے غم و الم کی صورت بنائے بیٹھے آہ سرد کھینچ رہے ہیں۔ تو آ۔ ہیں آ۔ کسی نے سمجھایا۔ کسی نے اونچ نیچ دکھایا، مگر حضرت مجنوں کی قطع بنائے ہوئے، تو بڑے ہی افسوس میں ہیں۔ اب زندگی وبال ہے۔ جان جنجال ہے۔ کھانے پینے کا لطف نہیں، بلکہ محو ہو گئے۔ دین و دنیا سر و پا کی خبر نہیں۔ جی بجا ہے ایسے ہی بے خبر ہو گئے۔ جب جانیں کہ نمک کے عوض پھٹکری کھا جائے، اور ذائقہ نہ معلوم ہو۔ یا عطر کے بدلے کیچڑ مل لیجیے۔ یا ساری ثروت کسی کو لٹا دیجیے۔ اور لنگوٹا باندھ کر جنگل کی راہ لیجیے۔ تو اب نامدار پہلے تو اس بتِ پندار پر کہ ہزار جان سے عاشق زار ہو گئے۔ کبھی زلفِ چلیپا کا خیال، کبھی ابروئے کج کا ذکر۔ مگر ایک دفعہ ہی مصاحبوں نے وہ ہوا باندھی کہ عشق دشق سب غائب غلہ ہو گیا۔ بھئی یہ مصاحب جو چاہیں سو کریں۔ بس ان سے خدا پناہ میں رکھے۔ خدا نہ کرے کہ کسی شریف زادے، رئیس زادے کو ان سے پالا پڑے مصاحبوں اور رفیقوں نے جو نواب صاحب کی یہ کیفیت دیکھی تو سمجھے کہ لٹو ہو گئے، اور ساتھ ہی اس کے آپ جانیے ایک ہی کائیاں سوچے کہ اگر ہم شہ دیتے ہیں تو یہ ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ ان معاملات میں ہماری دال گلنے کی نہیں۔ اور الٹے احمق بنیں گے۔ لہٰذا وہ چال چلیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ اس سرکس والی پری پیکر رشک قمر کی اس درجہ ہجو کی کہ نواب کی نظروں سے گر گئی۔ ایک نے کہا بھئی جادو کا کھیل تھا۔ دوسرے بولے جی ہاں۔ دن کے وقت جو دیکھا تو وہ رنگ نہ وہ روغن۔ چمک دمک نہ وہ جوبن۔ رات کی پری۔ دن کو وہ جمال نہ وہ دلبری۔ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ چلیے نواب کا عشق رسیاں توڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ جب نواب نامدار نے خود اپنی زبان سے کہا کہ جانے بھی دو۔ واقعی اس قابل نہیں کہ کوئی دل ملائے، اور خون جگر کھائے۔ تو مصاحبوں کی جان میں جان آئی۔ مُنھ مانگی مراد پائی۔ نواب صاحب کے ہاں سے رخصت ہوئے، تو راہ میں باہم یوں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔

ایک مصاحب : بھئی واللہ ہمارے نواب بھی کتنے بھولے بھالے رئیس ہیں۔

دوسرا مصاحب : ہونھ بھولے بھالے! اجی نرے پھیا کے تاؤ ہیں۔ خدایار خان نے ٹھیک تو کہا تھا۔

خدایار خان : اور نہیں تو کیا کچھ جھوٹ بولے تھے۔ یار ہمیں لگی لپٹی نہیں آتی چاہے جان جاتی رہے، مگر خوشامد نہ کریں گے۔ جب ہی تو ہم کو لوگ مُنھ پھٹ کہتے ہیں۔ نوکری

رہے یا جائے۔ بندۂ درگاہ کلمۂ حق ہی بولیں گے۔ اس میں ہر چہ بادا باد۔

راوی : درست صحیح آپ ایسے ہی ہیں۔ یہاں جو چاہے کہ لیجیے۔ نواب کے سامنے سٹی پٹی سب بھول جاتی ہے۔ نوکری گئی تو رنگ فق ہو گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سفارشیں اٹھوانی پڑیں۔ خوشامد کرتے کرتے زبان گھس گئی۔ مگر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم کلمۂ حق ہی بولیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔

میاں ندرت : بھئی یہ آزاد نے بڑا آڑنگا مارا ہے۔ اس کو نہ پچھاڑا تو ہم سب نظروں سے گر جائیں گے۔

حافظ : اجی ہم ترکیب بتائیں، جو پٹ پڑے تو نام نہ رکھوں۔ نواب ڈرپوک آدمی تو ہیں ہی۔ کوئی اتنا جا کر کہہ دے کہ میاں آزاد اشتہاری مجرم ہیں۔ بس پھر دیکھیے۔ کیا تا تھیّا بجّی ہے۔ خود بدولت تو مارے خوف کے تو گھر میں گھس رہیں۔ اور زنانے میں وہ ٹیس پڑے کہ کہرام ہی مچ جائے اور قسم والدۂ مرحوم کی۔ میاں آزاد اور وہ ان کا ساتھی اجی وہ افیونچی کھڑے کھڑے نکلوا دیے جائیں۔

تیسرا مصاحب : واہ استاد کیا تڑ سے سوچ لیتے ہو۔ واللہ ایک ہی ذات شریف ہو۔

حافظ : پھر ان جھانسوں کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا میاں۔

ندرت : جی اور نہیں تو کیا۔ اور پھر ایسی سرکار میں جہاں اندھیر مچا رہتا ہے۔ ع کس نمی برسد کہ بھیا کون ہو۔

رفیق : ہاں خوب یاد آیا واللہ پرسوں تیغ بہادر دکن سے آئے ہیں۔ انھوں نے تو وہ ہوا باندھ رکھی ہے کہ اللہ اکبر۔ بات بات پر پینترے بدلتے ہیں۔ سُنا نبوٹ وہاں سے خوب سیکھ سا کھ کر آئے ہیں۔ وہ ہمارے دوست، اور سچے دوست ہیں۔ اگر سب کے سب مل کر چاہیں، تو ان کا اِسم ہو جائے۔ آپ میں سے کوئی چھیڑ دے ذرا۔ بس پھر میں لے اڑوں گا۔ مگر تعریف کا پل باندھ دیجیے۔ نواب کو جھانسے میں لانا کوئی بڑی بات تو ہے نہیں۔ ڈھلمل یقین آدمی۔ تھالی کے بیگن، جس نے جو کہا فوراً تسلیم کر لیا۔

حافظ : ایک کام کیجیے۔ آج جس وقت چل کر بیٹھیں تو ہم پہلے چھیڑیں کہ اس دربار میں خدا کے فضل سے ہر فن کا با کمال آدمی موجود ہے۔ اور ریاست کے معنی ہی یہ ہیں کہ با کمال آدمیوں کی پرورش کی جائے۔ مگر ایسے رئیس ہیں کہاں۔ جسے دیکھو اپنے حلوے مانڈے

سے کام ہے۔ شریفوں کی پرورش حضور ہی کا حصہ ہے۔ اس پر کوئی شخص بول اٹھے کہ خداوند ایک بنوٹیے کی بس یہاں کمی ہے۔ باقی تو سب موجود ہے۔ پھر کوئی کہے کہ آج کل دکن سے ایک صاحب آئے ہیں۔ بس بنوٹ کے فن میں تو بے نظیر ہیں۔ ثانی نہیں رکھتے۔ پھکیت اور بکیت اور پٹیت سب ان کے سامنے گرد ہیں۔ اس فن میں وہ بھی فرد ہیں۔ ان کی دو چار آدمی تائید کریں، کہ ہاں پیرو مرشد وہ وہ پیچ یاد ہیں کہ تلوار چھین لیں۔ کٹار چھین لیں۔ چھریرے سے آدمی دبلے پتلے ہاتھ پاؤں مگر مقابلہ پر آئے اور برق ہو گئے۔ ہم یہ کہیں گے کہ واللہ اچھے اچھے لوگ یہاں جمع ہیں۔ ارے میاں ایسے شخص کو اور ہمارے حضور کے سامنے اب تک پیش نہیں کیا، اور جو کوئی رئیس قدر دانی کر کے انھیں نوکر رکھ لے تو پھر کیسی ہو یا لاہی جیت جائیے۔ بس اس پر دیکھ لینا نواب خود اصرار کریں گے کہ ابھی ابھی لاؤ۔ جاؤ۔ ابھی جاؤ، چلیے مطلب حاصل۔ مگر ان سے کہہ دیجیے گا ذرا خوب بانکے بن کر آئیں۔ اور اکڑا کڑ بیٹھیں۔ مگر گفتگو ملائمت سے کریں۔ جس میں ہم لوگ کہیں کہ دیکھیے خداوند کمال کو بھی خدا نے کیا درجہ بخشا ہے۔ کس نرمی سے گفتگو کرتے ہیں گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ اور جن لوگوں کو کچھ آتا جاتا نہیں وہ اکڑ فوں بن کر چلتے ہیں۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے تو وجہ کیا۔ خامی گلے کا ہار ہو جاتی ہے۔

رفیق : بس اب زیادہ ہم کو نہ سنائیے۔ ہم سمجھ لیں گے۔ کہیں تیغ بہادر کے آدھ سیر آٹے کی فکر ہو جائے۔

مصاحب : مگر کیوں میاں یہ تیغ بہادر ہندو ہیں، یا مسلمان۔ تیغ بہادر تو اہل ہنود کا نام بھی ہوا کرتا ہے نہ۔ جیسے لالہ امام بخش ولد لالہ حسین بخش۔ کسی ہندو کے گھر میں عین محرم کے دنوں میں لڑکا تولد ہوا، امام بخش نام رکھ دیا۔ ہندو بھی بعض بعض کتنے بے تکے ہوتے ہیں، کہ توبہ ہی بھلی۔ اور ڈھلمل یقین اتنے بڑے کہ اپنے دیبی دیوتاؤں کے علاوہ ہمارے پیر پیغمبر کو بھی مانتے ہیں۔ پوچھیے کہ تم جو تعزیہ کو سجدہ کرتے ہو اور درگاہوں میں جا جا کر شربت پلاتے ہو، اور اپنے لڑکوں کو حضرت امام حسین کا غلام بناتے ہو، اور امام باڑے تعمیر کراتے ہو، تو مشرف بہ اسلام ہی کیوں نہیں ہو جاتے۔

رفیق : بھئی یہ اعتراض بے جا ہے۔ آخر تم لوگوں میں بھی تو ایسے گوکھے ہیں، جو چیچک میں مالن کو بلاتے ہیں۔ چوراہے پر گدھے کو چنے کھلاتے ہیں۔ جنم پتری بنواتے ہیں۔ نجوم کے

قائل ہیں۔ پھر یہ بدعت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور ہندوؤں میں جو بعض بعض جگہ مجلسین ہوتی ہیں تعزیے رکھے جاتے ہیں۔ اس کی نہ کہیے قبلہ، یہ ضعیف الاعتقادی عالمگیر ہے۔ رفیق اور مصاحب دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ اب ادھر نواب صاحب کا حال سنیے کہ انھوں نے ایک خدمت گار کو بلایا اور کہا کہ جعفر اس وقت ہمارا ایک کام نہیں کرتے جعفر نے دست بستہ عرض کیا کہ جو حکم ہو۔ فرمایا کہ جہاں ہم گئے تھے وہاں جاؤ اس نے پوچھا کہاں؟ حضور کسی جگہ کا نام تو لیں۔ بولے دہیں میاں جہاں تماشا ہوتا ہے۔ وہاں جاؤ اور جو کہیں وہ کرو۔ جعفر نے جمائی لیتے ہوئے کہا کہ خداوند، وہاں تو اس وقت سناٹا پڑا ہے۔ آدم زاد کی تو شکل بھی نظر نہیں آتی۔ کتے البتہ لوٹ رہے ہیں۔ تڑکے جہاں فرمائیے وہاں جاؤں نواب صاحب اچھا کہہ کر سو رہے۔

میاں آزاد کی حسرت و حیرانی اور عشقِ ورجینا میں ناکامی و پشیمانی

خیر مقدم اے جنونِ نیک فال — اے توام شیر نستانِ خیال
اے خرابی خانہ زار کشورت — دست و صحرا فرہائی وقرت
جستم از فیضت زآدم آب وخاک — فارغم کردی زخود روحی فداک

حضرت تجلی نے خود ہی کہا ہے، کہ عشق معراجِ کمالِ آدم ہے اور اس میں تاثیر اسم اعظم ہے۔ واہ۔ اجی یوں کہو کہ عشق بھوت ہے۔ پریت ہے۔ عشق چڑیل ہے۔ کوہکن کے سر پر اس نے تیشہ ملا۔ مجنوں کو اس نے بن میں پھرایا۔ وامق کو اس نے دیوانہ بنایا۔ زلیخا کو اس نے کنواں جھکایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ خیر مقدم اور اس پر طرہ یہ کہ جنون نیک فال اور روحی فداک۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ خرابی خانہ زار کشورت۔ نواب تو سٹ پٹا گئے، مگر میاں آزاد پختہ مغز جنون تھے۔ اور اس یوسف لقا شیریں ادا، محبوبِ مطلوب پر دل و جان سے مفتون تھے انھوں نے تڑکے، گجر دم طرارہ بھرا تو سیدھے اس مہ پارہ سراپا انداز شوخ و طناز کے خیمہ زرنگار میں داخل ہوئے اس وقت سہانا سماں وہ آفت دوراں توبہ شکن۔ کفر گزیناں۔ پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے ایسی مست ہو گئی تھی، جیسے بسنت کی رت میں بھونرا۔ کلیوں کی شوخی کے ساتھ چٹکنا اور پھولوں کا مہکنا۔ قوتِ باصرہ اور قوتِ شامہ کے ساتھ وہ کرتا تھا۔ جو سنگار دلہن کے ساتھ۔ اور اٹھتی جوانی جوبن کے ساتھ۔ اس عروسِ رعنا

شمائل زیبا خصائل کو میاں آزاد نے تنہا گلگشتِ چمن اور تماشائے نسرین و نسترن میں مصروف پایا۔ تو شوق چرا کہ آگے بڑھ کر مخاطب ہوں۔ سوچے کہ مبادا بد دماغ ہو جاتے۔ معشوق مزاج ہے۔ لیکن اس کی اٹکھیلیوں کی چال، اور بکھرے بالوں نے ان کے سمند شوق پر تازیانہ کا کام کیا۔ اور یہ شعر پڑھتے ہوئے خراماں خراماں آگے قدم بڑھایا:

یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب ۔۔۔ سلطان عشق کی یہی فتح و شکست ہے

اس شوخ ستم ایجاد، آفت جانِ آزاد، خانہ برباد نے ایک نظر غلط انداز سے بصد شوخی و ناز جوان کی طرف دیکھا تو تیر نظر کلیجے کے پار ہو گیا۔ دل اور بھی مضطر و بے قرار ہو گیا:

بیک نظارۂ شوخِ ستمگار ۔۔۔ چو عضو رفتہ از جا ماند بے کار
جگر در سوختن دل در تپشہا ۔۔۔ رگ جان دست فرسودہ کششہا
چو زلف او سری افگندہ در پیش ۔۔۔ بپا پوسش تو گوئی رفتہ از خویش
سر و سودا بہم در کار بازی ۔۔۔ دل و جگرے شہید جاں گدازی
ادا فہم آن نگارِ فتنہ تمثال ۔۔۔ چو خواند از صفحۂ رخسارش ایں حال

تو تاڑ گئی کہ ہمارے چاہنے والے ہیں۔ مجنوں ہیں۔ متوالے ہیں۔ جن لوگوں کے دل پر چوٹ لگی ہے، وہ خوب ہی جانتے ہیں، کہ جب معشوقوں کو معلوم ہوا کہ فلاں ہمارا عاشق زار ہے، اور خدا کے فضل سے خوش رو جوان، اور طرحدار ہے۔ تو چشم فسوں پرور دانہ کو اور بھی تعلیم ناز دیتے ہیں، اور ایک ایک قدم پر دلِ عشاقِ خستہ جان کو پائمال کرتے ہیں۔ اس پریزاد نے میاں آزاد کے بشرے سے ان کا سودا اور جنون بھانپ لیا، تو اس طرح چمکتی ہوئی چلنے لگی کہ ان کی جان پر آفت ڈھائی۔ کبھی کسی جوش میں انا البرق کہتی ہوئی، اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ کبھی ناز و انداز سے سبزۂ نو دمیدہ پر قدم دھرنے لگی۔ کبھی زلف عنبریں کو رخ انور سے ہٹایا تو سحاب سے بن گہا چاند نظر آیا۔ کبھی سر کے جھٹکنے سے زلفِ مشکیں کو رخ زیبا سے چھپایا، تو معلوم ہوا کہ چاند گہن میں آیا۔ وہ پیاری کلائی، وہ دست حنائی کہ واہ جی واہ چہرہ غیرتِ مہر و ماہ۔

میاں آزاد کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگے۔ مگر رعب حسن میں ایسے آئے کہ زبانِ قال بند ہو گئی۔ زبانِ حال کو ترجمانِ دل بنایا، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سارا مدعا کہہ سنایا۔ لیکن حرف مطلب لب تک نہ آیا:

نہ جوشِ گریہ کردانگیز طوفان   شد از چشمش رواں خونِ غزالاں

جب اس رشکِ قمر فرخندہ اختر نے یہ کیفیت دیکھی تو انگریزی میں طوطی زبان کو یوں زمزمہ ریز بیان کیا۔

مس ورجینا: ایسے مردوے بھی کسی نے کم دیکھے ہوں گے۔ یہ رونا دھونا تو چھوکریوں کا فعل ہے داڑھی مونچھ والوں کو روتے ہم نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ ان کو دیکھیے کیا موٹے موٹے آنسو بہا رہے ہیں۔

آزاد: (کچھ کہنے کو تھے مگر انتہا کے جوش نے زبان بند کر دی)۔

مس ورجینا: دو باتوں سے خالی نہیں یا تو تم پاگل ہو۔ اور ابھی پاگل خانہ سے رسیاں توڑ اکر آئے ہو یا میری ہم شکل تمھاری کوئی بہن گھر سے نکل گئی ہوگی۔ یا شاید خدانہ کردہ چل بسی اور مجھے دیکھ کر وہ یاد آئی ہو۔

آزاد: پاگل تو میں ضرور ہوں۔ مگر تمھاری ہی چھب اور تمھاری ہی ادا کا دیوانہ ہوں۔ اور تمھارے ہی شمعِ رخسار کا پروانہ ہوں۔

میاں آزاد انگریزی بولنے میں مشاق تھے۔ اور محاوراتِ رنگین و فقراتِ دلنشین ، میں طاق تھے۔ مگر اس شوخ پرمست کے سامنے سٹی پٹی بھول گئے ، اور ایسے رعب میں آئے کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

نگاریں دختر بر واز سرش ہوش   چہ دختر ہا قیامت دوش بردوش
نہاں در گیسو او لیلۃ القدر   عیاں از جبہہ او مطلعُ الفجر
کمانِ ابروان آفت جاں   رگ ابر سیاہ تیر باراں
حنائی پنجہ اش خورشیدِ دلہا   ہلال ناخنش عیدِ تماشا
خراب بازوش تاب و توانہا   سپر افگندۂ زورش کمانہا

ادھر گرم جوشی، اُدھر خود فراموشی۔ ادھر دین کی فکر نہ دنیا کا ہوش ادھر نگاہ مست میں شراب کا جوش۔ ادھر مرغ دل بے قرار۔ اُدھر دام زلف مشکبار۔ قریب تھا کہ میاں آزاد ہاتھ میں ہاتھ دیں اور بے تکلفی سے عرض مدعا کریں کہ دفعتاً اس نے تیکھی چتون، اور قہر آلودہ نظر سے ان کی طرف دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے:

پھری چشم بتِ بے پیر دیکھو   ہماری گردش تقدیر دیکھو

منہیں ہے گرد دامن سرخ سنجاب ۔ ہمارا خون ہے دامن گیر دیکھو
انھیں ہے طوق منّت کا گرانبار ۔ ہمارے پاؤں کی زنجیر دیکھو
زبانِ شمع کے لیتا ہے بوسے ۔ کھلی ہے قسمت گل گیر دیکھو
پھری چشم بت بے پیر دیکھو

ان اشعار کو میاں آزاد نے فرطِ مستی میں جھوم جھوم کر گایا۔ اس بت پندار کو لبھایا۔ دھن اس کو ایسی بھائی کہ بے اختیار کھِل کھِلائی۔ وہ رنگین نگار عاشق زار کی خود عاشق زار ہو گئی۔ اور بے محابا ہمکنار ہوئی۔

آزاد : شنیدم نام تو از خویش رفتم ۔ برائے خود بلا اندیش رفتم

میاں آزاد نے جو اس قدر کہا تو :

نمک افشاندہ چوں شورِ تکلّم ۔ ترحم جلوہ گر شد در تبسّم

کوئی تین گھنٹے تک چمنستانِ پر فضا اور چشمۂ ندرت انتما میں دونوں عاشق زار و معشوقِ طرحدار میں حُسن و عشق کی گفتگو رہی۔ اس کے بعد اس نو بہارِ گلشنِ خوبی، وچراغِ دودۂ محبوبی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ میاں کدھر تمھارا خیال ہے۔ اور ایک تم پر کیا فرض ہے برسوں سے ساری خدائی میں چکر لگائے اور ربع سکون کو تماشے دکھائے۔ دیار و امصار سے میرے پاس اچھے اچھے تاجداران کج کلاہ اور امرائے ثریّا جاہ کے خط آئے۔ جہاں جانے کا اتفاق ہوا، ایک عالم کو صید عشق پایا۔ جس نے صورت دیکھی اس کو اپنا دیوانہ بنایا روس کے تین جنرل ہم پر عاشق ہوئے۔ یونان میں ایک رئیس باتوقیر لٹو ہو گئے۔ ہسپانیہ کے وزیر زادہ نے بہت زور مارے۔ انگلستان کے بانکوں نے نالہ پر درد بلند کیے۔ جرمن کے امیر کبیر، ملکوں ملکوں سایہ کی طرح میرے ساتھ گھوما کیے۔ روم کے کئی معزز پاشا جان و مال سے حاضر تھے۔ آسٹریا کے کئی کونٹ زہر کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ دنیا میں جعل سازی اور دغا بازی کی بڑی گرم بازاری ہے، اور چشمہ تذویر ہر ملک میں عجب روانی کے ساتھ جاری ہے۔ اس سب سے ہم نے کسی سے دل نہ ملایا کسی کو منھ نہ لگایا۔ ہمارے چاہنے والے کو لازم ہے کہ پہلے آئینے میں اپنا منھ تو دیکھے۔ لے اب سُنو مگر قسم کھاؤ کہ کسی سے کہو گے تو نہیں۔

آزاد : کیا مجال میں اور کسی کے راز کو افشاں کروں، مگر آپ کی تقریر جادو تخمیر سے

معلوم ہوگیا کہ کسی جوان طنّاز پر دل آیا ہے۔ (آہ سرد کھینچ کر) خیر ہمارا بھی خدا حافظ و ناصر ہے۔
پریزاد: میں عورت نہیں ہوں، مرد ہوں۔ جو تم سوچیں۔ میں نے کئی سال سے عورت کا بھیس بدلا ہوں۔ اور دنیا بھر میں سب مجھے دوشیزہ ہی سمجھتے ہیں۔ مس ورجینا میں نے اپنا نام رکھا ہے۔ اخباروں میں برابر میری تعریف چھپ رہی ہے۔ جو لکھتا ہے یہی لکھتا ہے کہ کیا پیاری لڑکی ہے۔ غضب کی شوخ۔ رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سبحان اللہ کیا شان دلبری ہے۔ عورت کیا پرستان کی پری ہے۔ دل ہی دل میں ہنستا ہوں کہ ان لوگوں کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ جو عشقیہ خطوط اور اشعارِ لطافت بار میرے پاس آتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ کہ میں خود مس روز کے ساتھ بیاہ کرنے والا ہوں۔ یہ لوگ مجھی کو مس بنائے دیتے ہیں۔

ادھر میاں آزاد ہوش فراموش، ادھر وہ بت پندار آفت ہوش۔ یہ ششدر و حیراں، وہ مست و غزل خواں، اِدھر عشق بازی اُدھر بے نیازی۔ یہ خونابہ نوش۔ وہاں بہارِ جمال در جوش۔ یہاں تاب دوری نہیں۔ وہاں خیال حضوری نہیں۔ جب اس فرضی شکر و خت شیریں حرکات نے میاں آزاد کو صیدِ مصائب و آفات، اور اس قدر دلدادۂ واز خود رفتہ پایا، تو بآواز بلند ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور اس تیرِ جگر دوز سے میاں آزاد کے مرغِ دل کو اور بھی تڑپایا:

از آنسو نالہ در آتش عنانی	وزیں سو عشوہ گرم مہربانی
از آنسو گریہ طوفانِ تلاطم	وزیں سو آب در چشم ترحم
از آنسو التماس چارہ سازی	وزیں سو وعدہ عاشق نوازی
از آنسو بر جگر آہِ جگر پاش	وزیں سو ہر زبان برلب کہ خوش باش

اس آزاد فریب، طاؤس زیب، نے مسکرا کر کہا اب آخر اس جنون کا علاج کیا ہے۔ بتا دیا۔ سمجھا دیا۔ کہ میں نے کئی سال سے عورت کے بھیس میں امرا کو جھانسے دیے، اور ایک ایک نازو ادا کے ہزاروں روپیہ لیے۔ یہ رازِ سربستہ آج تمھاری بے قراری اور موج خیز گریہ وزاری، دیکھ کر زبان پر لایا۔ اور تم کو صاف صاف بتایا اور سمجھایا کہ میں کیا ہوں۔ اب تم ناحق تنکے چنتے ہو۔ اور بے کار میری چاہ میں سر دھنتے ہو۔ تمھیں یقین ہی نہیں آتا تو میں اس بدگمانی کا علاج کیا کروں۔

آزاد : اچھا مردانے کپڑے پہن کر ہمارے سامنے آؤ تو ہم اپنی حماقت پر پشیمان ہوں" اور خیال خام سے درگذریں۔ عشق کو پردانہ برطرفی دیں۔ ورنہ چال ڈھال، تراش خراش، بناوٹ سجاوٹ، سے کون کہہ سکتا ہے کہ تم دختِ شکرلب، زنِ سیم غبغب نہیں۔ یہ لگاوٹ بازانکھڑیاں، مرد کہاں سے لائے گا۔ یہ قہرآلود چتون کیوں کر پائے گا۔ یہ زلفِ پرشکن اور نرگسِ غمزہ زن عورتوں ہی کا حصّہ ہے۔ مرد اس سے ضرور بے بہرہ ہے۔

آخرکار جب اس مرد عروس نما نے میاں آزاد کو اس قدر مفتون اور لیلائے زلف کا مجنوں، اور ان کی چشم ترکو پرخوں پایا۔ تو مردانہ کپڑے پہن کر آیا۔ کلاہ کج سرپر اور جاکٹ کوٹ زیب بر کرتب تو میاں آزاد کو کچھ یوں ہی یقین ہوا کہ واقع میں ہم الّو بنے اس نوجوان کو دُلہن سمجھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مگر بھیس بدلے تو ایسا، اور کمال ہو تو اتنا۔ ع خود غلط بود انچہ ما پنداشیتم۔ توبہ توبہ :

اللہ اللہ زکہ ایں قاعدہ آموختہ کیست استاد تو انیہا زکہ آموختہ

پوچھا کہ اب اپنا نام بتاؤ۔ اور وہ عشقیہ خطوط دکھاؤ، جو تمہارے عاشقوں نے تمہارے پاس بھیجے ہیں ۔ تو البتہ یقین کامل ہو۔ اس نے ہنس کر کہا کہ میرا نام اُومر کنگزلی ہے۔ اور خطوط تو دفتر کے دفتر ہیں جس نے کہا یہی کہا کہ ہماری بیوی بنو ہم سے بیاہ کرو، مجھے بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ مگر چپ اس کے بعد طومار کے طومار عشقیہ خطوط ومراسلات کے دکھائے۔ جن میں سے بعض دلچسپ تحریریں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

ا۔ پیاری ورجینیا۔ میں نے اپنے جنازہ اٹھانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ آج ورجینیا نے پاؤں میں مہندی لگائی ہے۔ آج جنازہ نہ اٹھائیں۔ کل تابوت اٹھے گا۔ تمہاری زلف کی کالی ناگن مجھے ڈس گئی۔ یہ وہ ناگن ہے جس کا کاٹا سر سے کھیلے، نہ منھ سے بولے لہر تک نہ آئے۔ تمہارے تیر نگاہ نے مجھے گھائل کردیا، اور اس زخم پر تمہارے تبسّم نے وہ نمک پاشی کی کہ مزے سے میں نے جان دی۔ تمہاری برق ادا نے میرے خرمن زندگانی کو جھلسا دیا۔ لیکن گو تمہاری ادا کا کشتہ ہوں، اور کباب حسن برشتہ ہوں مگر۔ ع۔ رفتم اندر ترخاک اُنس بتانم باقیست "اگر گور غریباں پر بھی آؤ تو جلا لو۔ تم قم نہ کہنا۔ میں خود ہی اُٹھ بیٹھوں گا۔ یا اگر ہماری تربت ہی سے دل خوش ہو تو ٹھوکر ضرور لگانا۔ میں نے جنازہ اٹھانے والوں سے بصد حسرت کہہ دیا ہے :

جنازہ میرا گلی میں ان کی جو پہنچے ٹھہرا کے اتنا کہنا
اٹھانے والے ہوئے ہیں ماندے سو تھک کے کاندھا بدل رہے ہیں

یوں تو خدا کی خدائی میں گلوں کا قحط نہیں۔ بلبلوں کا کال نہیں۔ ایک سے ایک معشوق رشک قمر۔ ترک زرّیں کمر موجود ہے، مگر یہ چھب یہ ادا یہ ناز، یہ انداز، یہ حُسنِ گلوسوز یہ نگاہ جگر دوز، یہ خم وچم کہاں:

خوبصورت یوں تو بہتیرے ہیں لیکن پارسا
نازش نازک بدن نازک کمر کوئی نہیں

اب دل سے لگی ہے کہ تم ہمارے ہم تمھارے ہوں۔ بس اب اور کچھ نہ لکھوں گا۔

راقم نیم جاں۔

اس صحیفۂ رشیقہ کو پڑھ کر میاں آزاد اور وہ پریزاد، دونوں خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے اس کے بعد دوسرا خط پڑھا:

۲۔ نیرنگِ حُسن وعشق کی اللہ ری بہار
بے کار کوئی فعل نہیں کارساز کا

سروِ جوئبار خوبی، وُنو بادۂ باغ محبوبی۔ گلِ صباحت کی رنگ و بو، حسین و خوش رو، شیریں حرکات ورنگین ادا مس ورجینا:

حسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رُویت ہمہ سال لالہ گوں باد

عشق کو بھی جنابِ باری نے کیا رتبہ دیا ہے۔ واہ۔ واہ۔ ہم اور کسی پر عاشق ہوں۔ مگر حُسنِ گلوسوز نے خرمنِ صبر کو جلا دیا:

سودائے عشق میں نہ رہی شان خواجگی
محمود بندہ ہو گیا حُسنِ ایاز کا

اب تو ہم نے عشق کے دریائے بیکرانِ ژرف میں غوطہ لگایا: ع۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم:

ساحل سمجھتے ہیں تہِ دریائے عشق کو
طوفان ناخدا ہے ہمارے جہاز کا

کل شب کو جو تمھارے شعبدے دیکھے تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا:

ہوتا ہے شعبدوں سے ترے آسمان سفید
اُڑتا ہے رنگ چہرۂ نیرنگ ساز کا

آخر اب اس درد دل کی دوا بھی ہے یا مرضِ عشق لاعلاج ہے۔ ہم ایک گدائے بینوا ہیں تم مسکین نواز ہو۔ حال زار عشاقِ خستہ جان پر نظر رحم کیجیے۔ خلوت میں ہمیں عار نہیں۔ گو یہاں تو خلوت میں بھی بار نہیں۔ کل تم اتنے رنگ بدل کر آئیں کہ۔ ع۔ سبحان اللہ شان تیری:

ہم بھی کشتہ تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے — او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

اس خط کا جواب ملے تو جامے میں نہ سماؤں۔ آنکھوں کے بھل، سر کے بھل، دوڑ آؤں میرا کلبۂ احزاں وہ مقام ہے جس کی صبح کا شام کو رشک، جس کی شام میری تیرہ بختی کی آنچھ کا ایک اشک۔ میری بزم وہ بزم ہے کہ:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

تیری شوخی اور بیباکی اور ترک چشم کی سفاکی کا حال کوئی میرے دل سے پوچھے:

تیری زلفوں کا زمانہ مبتلا ہو جائے گا — دیکھ لینا بال بال اس کا بلا ہو جائے گا

تو وہ خورشید قیامت ہے کہ تیرے سامنے — گورا گورا چاند کا منھ سانولا ہو جائے گا

اس خط کو پڑھ کر اودم کنگز لی نے کہا کہ یہ آپ کے ہندوستان سے خطوط آئے ہیں۔ اب یورپ کے خطوط عشقیہ ملاحظہ فرمائیے!

۳۔ پیاری مس ورجینیا۔ خدا وہ دن دکھائے کہ لوگ تم کو مس ورجینیا کے عوض مسز کراو لکھیں۔ اور ہم کو یہ فخر حاصل ہو کہ ہم تم کو اپنی چاہیتی بیوی کہیں۔ سنو پیاری ورجینیا! تم حسن و جمال میں لاجواب۔ ہم فنون سپہ گری میں انتخاب۔ ہم فوج کے کپتان ہیں۔ والد مرحوم کی تربت کو خدا عنبریں کرے۔ جنگِ کریمیا میں انھوں نے وکٹوریا کراس پایا تھا، اور میرا ابھی کئی لڑائیوں میں نام ہوا۔ میرا ستائیسواں سال ہے۔ تنخواہ کے علاوہ گاؤں سے بیس پونڈ ماہواری کا منافع ہوتا ہے۔ اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد اپر لنڈن بنک میں جمع ہے۔ اپنی تصویر بھی آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجتا ہوں۔ ع۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف "، میری تم پر جان جاتی ہے۔ فرقت میں اندھیرا سا آنکھوں میں چھا جاتا ہے، اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونا آتا ہے۔ اگر کوئی وقتِ خاص ملاقات کے لیے مقرر کرد تو بسر و چشم آؤں مگر تخلیہ ہو تاکہ اظہارِ دل بخوبی کر سکوں۔ یوں تو یہ تحریر ہی ترجمان دل ہے۔

۴۔ ڈیر مس ورجینیا۔ کل اسٹیج پر تم نے وہ وہ تماشے دکھائے کہ جان بدن سے نکل گئی۔ تمھارا شوخی سے پشتِ شبدیز پر جمنا اور پھرتی سے اچکنا، اور گل گوں خوش گام کو کڑکڑانا۔ اور چمکانا، اور رجمانا جس وقت یاد آتا ہے۔ دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ چشم گریاں۔ سینہ بریاں لب پر آہ و فغاں، الاماں الاماں! شوخی تو تمھاری ایک ایک رگ و پے میں بھری ہے، جس نے دیکھا بول اٹھا کہ پرستان کی پری ہے۔ جو بے پروں یہ بلند پروازی کرتی ہے۔ تم نے

ایک عالم کو اپنا والہ و شیدا بنایا۔ کلوپٹرا کا نام صفحہ روزگار سے مٹایا۔ ایسی جادو جمال اور شہسواری اور شعبدہ بازی میں باکمال، عورت تو آج تک دیکھی نہ سنی۔ مگر ہم کو شمع رخسار آتشیں سے لو لگا کر جلنے کے سوا اور کیا حاصل ہوگا۔ خاک نہیں ہیں۔ ایک دولت مند سوداگر کا لڑکا ہوں۔ میرے باپ کے ایک لاکھ چالیس ہزار پونڈ (یعنی چودہ لاکھ روپیہ) کی جائداد ہے اور بندہ ہی ایک اولاد ہے۔ اب کوٹھی کا کام کاج سب میرے متعلق ہے۔ میں نے بائیس برس کے سن تک کالج میں علوم والسنہ کی تعلیم پائی، اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اب میرا پچیسواں سال ہے۔ تصویر ہمدست حامل بھیجتا ہوں کہ اس کو اپنے البم میں رکھو۔ اسی طرح کئی خطوط آزاد نے پڑھے، اور لکھنے والوں کی ناکامی پر افسوس کیا۔

اس کے بعد اومر کنگزلی نے کئی تصویریں دکھائیں۔ میاں آزاد نے کہا اللہ اللہ کیسے کیسے جوانان وجیہ و صبیح نے شادی کا پیغام بھیجا تھا مگر افسوس کہ سب نامراد ناکام رہے۔ کوئی فائز المرام نہ ہوا۔ اور کیوں کر ہوتا وہ تو دھوکے کی ٹٹی تھی۔

اومر کنگزلی : ایک دفعہ اطالیہ میں گیا وہاں جو تماشا ہوا تو اہل اٹلی بھی فریفتہ ہوگئے ایک ایک انداز و ناز پر ہزار جان سے شیفتہ ہوگئے۔ اکثر امرا اور رؤسا نے دولت خانوں میں بلوایا اور اپنی دختران نیک اختر، اور بیوی اور عیال و اطفال سے ملاقات کرائی۔ کئی دن تک ہم نے ان پریوں کے ساتھ خوب ہوا کھائی ان کو یہ کیا معلوم تھا کہ مس درجینا اصل میں اومر کنگزلی ہے وہ ان کو مس ہی سمجھا کیے۔

اور ایک لطیفہ سنیے! ایک نوجوان امیرزادی نے میری پیشانی پر بوسہ لے کر کہا کہ ہمارے میاں تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اور ہم نے ان کو اجازت دے دی کہ منظور۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی کہ واہ اچھی بیوی ہیں۔ سوتیا ڈاہ کا نام تک نہیں جانتیں۔ ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت آئی کہ شاہ اطالیہ ڈاکٹر ایمانول نے مجھے طلب کیا، اور ایک روح افزا اور دلکشا باغ لطافت انتما میں میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چہل قدمی کیا کیے۔ اکثر باتیں اس قسم کی زبان پر لائے کہ میں بڑی دقت سے ہنسی ضبط کرتا تھا۔ پہلے دن تو مارے رعب کے کوئی کلمہ صاف صاف نہ کہا! مگر دوسرے روز ادھر چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا ادھر شاہ اطالیہ نے ہمیں طلب کیا۔ میں خوب بن ٹھن کر گیا تو بادشاہ دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور باغ فراغ کے ایک گوشہ میں کہ از بس سرسبزہ پر بہار بھائے گئے۔ روشوں میں ٹہلنا شروع کیا۔

اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے کہا کہ پیاری ورجینا - اس کے بعد کچھ اور کہنے کو تھے کہ میں نے تیکھی چتون سے دیکھا اور ہاتھ جھٹک کر کہا کہ ورجینا کے پہلے آپ نے کون لفظ فرمایا۔ شاہ نے آہ سرد کھینچ کر ڈرتے ڈرتے کہا کہ معاف کیجیے گا غلطی سے پیاری کا لفظ نکل گیا۔ میں نے تنک کر کہا کہ بس اب نہ فرمائیے گا۔ اگر ہوس است ہمیں قدر بس ست۔ آپ کا دھوکا بھی اچھا دھوکا ہے۔ تب تو اور بادشاہ سلامت کچھ دیر خاموش رہے، اور پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے چپکے سے ہاتھ دے دیا۔ اور ٹہلنے لگا۔ اس سے ان کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ اور جی میں جی آیا۔ آہستہ سے میرے ہاتھ کو دبایا۔ میں خاموش ہو رہا۔ میرے سکوت سے انھیں جرأت ہوئی۔ تو چٹکی لی۔ اس پر میں نے کہا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ ایسا نہ چاہیے، ورنہ آپ کی بدنامی ہوگی اور میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ یہ سُن کر وہ اور بھی مضطر و بے قرار ہوئے اور کہا کہ ورجینا! پیاری ورجینا! میں تو تم پر عاشق ہوں۔ اب تم اطالیہ ہی کو اپنا وطن بناؤ۔ اسی دلکش و پر فضا باغ میں بستر جماؤ۔ میرے ساتھ شادی کر لو۔ اس میں بدنام ہوں چاہے نیک نام ہوں:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان　　　　ما نمی خواہیم ننگ و نام را

میں نے دانتوں تلے انگلی دبا کر کہا۔ ہائیں! کدھر آپ کا خیال ہے شادی کیسی۔ یہ کیا کلمہ آپ زبان پر لائے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک میری مرضی کے موافق کوئی طرح دار اور حسین جوان نہ ملے گا میں بیاہ نہ کروں گی نہ کروں گی۔ اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ اور ایسی میری قسمت کہاں کہ بادشاہوں کے گھر پڑوں، اور شہزادی بیگم بنوں۔ آپ کا خیال تھوڑی دیر کا ہے۔ شاہوں کے مزاج میں تلون ہوتا ہے۔ آج کچھ کل کچھ۔ پرسوں کچھ۔ پھر جس صورت کو میں ڈھونڈھتی ہوں وہ نظر ہی نہیں آتی، اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ یا تو شادی ہی نہ کروں گی یا اگر کسی کے ساتھ بیاہ ہوگا تو وہی جو مرضی اور پسند کے موافق ہو۔ اس میں بادشاہ ہو یا وزیر۔ رئیس ہو یا امیر کسے باشد۔

بادشاہ: ہم پسند نہیں! لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شے بادشاہ پسند ہے۔ مگر اللہ رے ناز اُف ری بے نیازیاں کہ تم بادشاہ کو پسند نہیں کرتیں:

اللہ رے نازِ حُسن کی یہ بے نیازیاں　　　　بندہ نواز آپ کسی کے خدا نہیں

غرورِ حُسن اجازت مگر ندادائے گل　　　　کہ پرسشی بکنی عندلیبِ شیدا را

انھوں نے لاکھ لاکھ جتن کیے مگر میں نے ایک بات بھی نہ مانی۔ اور مانتا کیوں کر وہ تو مس ورجینیا کو بیاہنا چاہتے تھے۔ میں کچھ مس ورجینیا تو ہوں نہیں۔ میں تو خوب واقف تھا کہ ہم اومر کنگزلی ہیں۔ لہٰذا ان کا اصرار اور میرا انکار عجیب لطف دکھاتا تھا۔ بڑی ہی دل لگی ہوئی۔ بس یہ کیفیت تھی :

وہ میری سنتے نہیں بجا ہے میں ان کی سنتا نہیں مزا ہے

ادھر بھی ہاں ہاں کا غل مچا ہے جو شور اُدھر ہے نہیں نہیں کا

الغرض آخر کار میں نے جھلا کر کہا کہ تم بادشاہ ہو۔ حکمراں ہو۔ ثریا جاہ ہو۔ زبردستی چاہو قید کر لو۔ مگر میری مرضی کے خلاف ہے۔ اور بھلا یہ کون سا انصاف ہے کہ زبردستی کسی کو بیاہو اگر ایسا ہوا تو جان دے دوں گی۔ اس پر وہ بہت ہی متوحش ہوئے اور کہنے لگے کہ توبہ توبہ کہیں جان دینے اور خودکشی کرنے پر نہ آمادہ ہو جانا۔ میں اظلم بادشاہوں میں نہیں ہوں تھوڑی دیر کے بعد میں روانہ ہوئی تو رخصت کے وقت خاصے کا ایک کمیت گھوڑا دیا۔ جو کوئی تین ہزار روپیہ کا ہو گا۔ وہی جس پر کل میں سوار تھا، اور دس ہزار روپیہ نقد اور کوئی آٹھ ہزار کا اسباب گرانمایہ دیا۔ اور بصد حسرت و حرماں رخصت کیا۔ ابھی کیا ہے دیکھیے گا اس وقت کیسی دل لگی ہو گی۔ جب ہم مس روز کو بیاہیں گے اور دنیا بھر کے اخبار اس خبر سے مطلع ہو کر حیرت میں آئیں گے۔ اب کی امریکا جاتے ہی ہم ان کو عقد نکاح میں لائیں گے۔

آزاد : اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ آج شب کو ٹھیٹھر میں آؤں گا۔

اومر کنگزلی : آنے کو آیئے اور ضرور آیئے، مگر اب وہ لطف آپ کو نہ آئے گا۔ لیکن پھر بھی وہ سج دھج دیکھ کر ضرور دنگ ہو جائیے گا۔ وہ تو موقع ہی اور ہوتا ہے۔

میاں آزاد وہاں سے چلے تو دل میں سخت پشیماں کہ لاحول ولا قوۃ کیسے احمق بنے۔ مگر ہم ہی حمق میں فرد نہیں۔ ہمارے ساتھی اور بھی بہت سے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے رؤسا، نامدار و شاہان فلک اقتدار، چکمے میں آ کر فریفتہ و شیفتہ ہو گئے۔ یہ حُسن بھی کیا بلائے بے درماں ہے۔ حق تو یوں ہے کہ آفت جان ہے۔ نواب سے جو کہیں یہ لطیفہ کہوں تو معاذاللہ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جائیں، اور مصاحب سنیں تو ہم کو اور نواب کو دونوں کو خوب بنائیں۔ تالیاں بجائیں کہ اچھے عاشق ہوئے تھے۔ مگر ممکن کیا کہ یہ راز زبان تک آئے۔ کیا مجال۔ یہ باتیں دل میں سوچتے ہوئے سرا میں پہنچے۔ پھاٹک ہی کے پاس سے آواز آئی کہ لانا تو میری قرولی۔ ہائے نہ ہوا قرابینچہ ورنہ دکھا دیتا تماشا۔ اتنے میں میاں آزاد نے للکارا کہ کیا ہے بھئی کیا ہے۔ ہم آن

پہنچے ۔ گھبراتا نہیں ۔ دیکھا تو خوجی ایک کتے کو دُتکار رہے ہیں ۔ معقول ۔ اب میاں خوجی کتوں پر بھی قرولی چلانے لگے ۔ شاباش اچھی کیا ۔ افیون سلامت رہے کل کو ہوا سے پنجے جھاڑ کر لڑیں گے ۔

عید سعید

عید ست و موسمِ گل ساقی بیار بادہ ہنگام می کہ دید ست بے می قدح نہادہ

آج تو نرالا سماں ہے ۔ در و دیوار نور افشاں ہے غریب امیر سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں ۔ صغیر و کبیر خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں ۔ جسے دیکھو سرمست ۔ جن پر تطر ڈالو عشرت پرست ۔ کہیں بلبلِ رنگین گفتار کے چہچہے کہیں تدروِ خوش رفتار کے قہقہے ۔ اللہ اللہ یہ عیدِ سعید کی تیاریاں ہیں ۔ اہاہا ۔ جب ہی یہ چہل پہل ہے ۔ نواب قمر رکاب کی بزم طرب کا حال نہ پوچھیے روزے تو حضرت پہلے ہی چٹ کر گئے تھے ۔ لیکن عید کے روزِ سعید بزم جمشیدی آراستہ ہوئی ۔ نور کے تڑکے سے مصاحبوں رفیقوں نے آنا شروع کیا، اور مُبارک مُبارک کی صدا ایسی بلند کی کہ کرّوبیوں نے عرشِ بریں کو تھام لیا ۔ ورنہ آسمان اور زمین کے قلابے مل جاتے، اور دونوں کے کنگرے ہل جاتے ۔

مصاحب : خدا عید مبارک کرے ۔ میرے نواب جم جم جئیں ۔

رفیق : برس دن کا دن مبارک کرے ۔

روشن علی : ع ۔ نجانہ آمدنت عید عشرت افروز ست ۔ مبارک است کہ امروز روزِ نوروز ست "

ندرت : حضور مجرا عرض ہے :

گردوں بہ مراد و ۔ بخت فیروزت باد خورشید فلک بندۂ دلسوزت باد

ہر روزِ تو خوب ترز ہر روز ت یاد در ہفتہ سہ عید و چار نوروزت باد

حافظ جی : پیر و مرشد (نذر دکھا کر) ع ۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف " خدا حضور کو عید مبارک کرے :

لب نمی آید بہم از خندۂ ایں شادیم آفتاب از آسماں گوید مبارک بادیم

نواب : (نذر قبول کر کے) آپ کو بھی مبارک ہو مگر سنا کہ آج تو عید میں اختلاف

ہے۔ بھئی آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں اچھا۔

مصاحب : حضور فرنگی محل کے علمائے اہلِ تسنّن نے تو آج ہی پنجشنبہ کو عید کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن جناب قبلہ و کعبہ نے فرمایا ہے کہ ہماری عید کل ہے۔ چلیے دو دھڑ کا معاملہ ہو گیا۔

نواب : بھلا چاند کل کسی نے دیکھا بھی ہے ہمارے یہاں تو کسی نے دیکھا ہی نہیں۔

مصاحب : پیر و مرشد پکے پل پر چار بہشتیوں نے دیکھا، اور راجا کی بازار میں حافظ امان علی صاحب نے دیکھا، اور فرنگی محل میں مولوی عبدالحی صاحب قبلہ کے اعزّہ میں سے ایک صاحب نے دیکھا، اور میری بہو نے دیکھا۔

نواب : آپ کی بہو کا سن شریف کیا ہے۔ ہیں کوئی چودہ پندرہ برس کی۔

مصاحب : (شرما کر) حضور (مسکرا کر) گردن جھکائی۔

نواب : حضرت آپ اپنی بہو کی عمر تو مخفی رکھتے ہیں، اور پھر ان کی شہادت ہی کیا۔ باقی رہے حافظ جی۔ بھئی مثل مشہور ہے کہ حافظ بے چاروں کی آنکھیں کثرتِ توغل و مطالعہ سے چوندھیا جاتی ہیں ان کو دن کو تو اونٹ سوجھتا ہی نہیں۔ بھلا سرِ شام دونوں وقت ملتے ناخن کے برابر چاند کیا سوجھے گا۔

آزاد : حضرت میں نے اور میاں خوجی نے کل شام کو اپنی آنکھوں دیکھا اور سماعی شہادت تو سرا بھر دے گی۔

نواب : تو تین گواہیاں معتبر ہوئیں۔ آپ اور خواجہ صاحب اور حافظ جی صاحب ہماری عید تو ہر طرح آج ہے۔

اتنے میں فٹن پر سے وہی بنت الشیطان کمر لچکاتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی اتریں۔

(آبادی جان)

نواب : آئیے آئیے کہیے آپ کی عید کس دن ہے۔

آبادی جان : کیا کوئی بھاری جوڑا بنوا رکھی ہے۔ چھٹے سے مُنھ شرم نہیں آتی۔

نواب :

عید قرباں ہے یہی دن تو ہے قربانی کا　　آج تلوار کے مانند گلے مل قاتل

اور ہم کو کیا یہاں تیسوں روزے چٹ کیے بیٹھے ہیں۔ دود قند قورمہ اور پلاؤ اڑتا تھا۔ یہ تو

ان کو فکر ہوگی جو دین کا ٹوکرا سر پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ یہاں تو یہ شعر ورد زبان ہے:

تھی رمضان میں مری حالت تباہ   خوب ہوا شہر بدر ہوگیا۔

آبادی جان : انھیں چھنوں تو دوزخ میں جاؤ گے۔

نواب : خیر تو ایک تسکین تو ہوئی۔ آپ سے تو وہاں بغل گیر ضرور ہوں گے۔

رفقا : (غل مچا کر) اعجاز۔ اعجاز۔ پیر و مرشد۔ سبحان اللہ کیا برجستہ کہی ہے۔ واللہ خوب سوجھی۔ ذری دیکھیے تو سہی۔ طرفتانی کا رنگ فق ہوگیا کیا گرما گرم لطیفہ کہا ہے۔

یہ قہقہے اڑہی رہے تھے کہ چمپا لونڈی اندر سے گھبرائی ہوئی آئی۔ لُٹ گئے لُٹ گئے۔ (سر پیٹ کر) اے حضور چوری ہوگئی۔ سب موس لے گیا۔ ہائے کہیں کا نہ رکھا موئے چورنے۔

نواب : کیا کیا چوری ہوگئی۔ ارے کب؟

چمپا : رات کو اور کب۔ اس وقت جو بیگم صاحب کوٹھڑی میں جاتی ہیں تو روشنی دیکھتے ہی اندھیرا سا آنکھوں تلے چھا گیا، ہاتھ مل کر غل مچایا کہ ارے دوڑو۔ وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بلو کا اور کپڑے لتے سب تتر بتر پڑے ہیں۔ ستیاناس ہو نگوڑے کا جو برس برس کے دن۔

مصاحبین : پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ افسوس۔ اے خداوند کل تو ایک بجے تک یہاں دربار گرم رہا۔ کوئی بارہ بجے ہارمونیم بند ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پہلے سے گھس بیٹھا تھا۔ اور رات کو جاگ بھی ہوئی۔

نواب : (ذری ہماری تلوار تولانا) بھئی احتیاط شرط ہے۔ ع۔ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" (تلوار لے کر گھر میں داخل ہوئے) دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم صاحب ایک نازک پلنگڑی پر سر پکڑے بیٹھی ہیں، اور بوا زعفران سمجھا رہی ہیں کہ بیوی نواب کی سلامتی رہے۔ ایک سے ایک بڑھیا جوڑا بن جائے گا۔ آپ گھبراتی کاہے کو ہیں۔ نواب نے جا کر کوٹھڑی کو دیکھا بلو کے کو خوب غور سے معائنہ کیا، مگر تلوار ہاتھ میں ہے اور پینترے بدلتے ہوئے گھر بھر کا جائزہ لے رہے ہیں۔

نواب : (بیگم سے) ہمارا لہو پیئے جو روئے۔ آخر یہ روتا کاہے کا مال گیا گیا۔

بوا زعفران : اے ہاں سچ تو فرماتے ہیں۔ جان کی سلامتی چاہیئے مال بھی کوئی بڑی چیز ہے۔

بیگم : آج کے دن خوش روزہ مناتے۔ ڈومنیاں آتیں، مبارک باد گاتیں۔ دن بھر دھما چوکڑی مچتی۔ رات کو رت جگا کرتے۔ سو آج ایک نیا شگوفہ کھلا۔ مگر گہنے کی صندوقچی چھوڑ گیا۔

اتنا ہم پر احسان کیا۔ کوئی دو ہزار کا البتہ خورد بُرد کیا۔ اب اس وقت کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ موئے چور کی ہیبت سے جیسے مُردنی چھاگئی۔

نواب : ہمارے سر کی قسم۔ لے اٹھو بس اب منھ دھو ڈالو۔ عید مناؤ، وہ جوڑا پھر کاؤ۔ ہمارا ہی جنازہ دیکھے جو چوری کا سوگ کرے۔ دو ہزار بھی کوئی بڑی کائنات ہے۔

الغرض بڑی جد و کد کے بعد بیگم صاحب بصد ناز و ادائے دلربایانہ اٹھیں، اور بوا زعفران نے قسمیں دے دے کر منھ دھلایا۔ نواب صاحب نے کہا تھیں واللہ ہنس تو دو وہ ہنسی آئی لب پر، آئی، ناک پر آئی، ع۔ وہ لب پر آئی ہنسی دیکھو مسکراتی ہو، بیگم صاحب بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑیں، اور گھر بھر میں قہقہے پڑنے لگے۔ جو ہے وہ لوٹن کبوتر بنا جاتا ہے۔

خیر بیوی کو ہنسا کر نواب نے باہر قدم رنجہ فرمایا تو مصاحب، رفیق، حوالی، موالی، خدمت گار، اہلکار، دروازے کے پاس ڈٹے ہوئے۔ جاتے ہی غل مچا یا کہ خداوند خیریت تو ہے۔ کچھ تو بتلایئے یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر کدھر سے چور آیا۔ کوئی کہتا ہے کہ حضور بے گھر کے بھیدی کے چوری نہیں ہوتی۔ ہم کو اس جشن پر شک ہے۔ جشن اندر سے گالیاں دے رہی ہے کہ اللہ کرے جھوٹے پر بجلی گرے۔ آسمان پھٹ پڑے، یہ جھوٹ موٹ کسی کا نام لے۔ کسی نے کہا خداوند چوکیدار کی سازش ہے۔ ضرور ہے آخر یہ کل رات بھر کیا کیا۔ چوکیدار ہے کہ لاکھوں قسمیں کھاتا ہے۔ کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ غرض کہ گھر بھر میں عجب ہر لو تنگ ہے۔

اتنے میں ایک مسخر الدولہ نے بڑھ کر یوں مخاطب کیا۔

مسخر الدولہ : حضور قسم ہے کلام اللہ کی ہمیں معلوم ہے کہ یہ کس ملعون ناہنجار کا کام ہے۔

نواب : پھر بتاؤ بتاؤ کچھ معلوم تو ہو؟

مسخر الدولہ : قسم حسین کی ہم تاڑ گئے۔ واللہ معاً بھانپ گیا۔ قربان جاؤں خداوند! ہو نہ ہو اسی مردک کا فعل ہے۔ بھلا بے بھلا ہم پہچان گئے۔ اجی آسمان پر تو ہم تھگلی لگائیں۔ چڑیا کا دودھ تک بہم پہنچائیں۔ عنقا کا انڈا تک لائیں۔ ہم سے اڑ کر کوئی جائے گا کہاں۔

مصاحب : لاحول ولا قوۃ۔ معلوم ہے تو پھر بتاتے کیوں نہیں۔

مسخر الدولہ : اجی بتانے سے آخر فائدہ کیا۔ مگر معلوم ہم کو بیشک ہے ہمیں اصلاً شبہ نہیں۔ بس اسی مردود کی ساری کارستانی ہے۔ لے بھئی جو غلط ہو تو ہاتھ ہارتے ہیں۔

نواب : عجیب طرح کا نامعقول آدمی ہے۔ کبھی ہاتھ ہاتھ بدتا ہے۔ کبھی ناک ناک بدتا ہے۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں واللہ۔ آخر یہ اس قدر اصرار تم کیوں کرتے ہو۔ جس پر تم کو شک گذرتا ہے۔ اس کا نام بتا کیوں نہیں دیتے۔ یہ بھونڈے نخرے یہاں کس کو بھاتے ہیں۔

مصاحب : اجی ان بوڑھے چونچلوں کو چھپر پر رکھو۔ ع۔ "ناز بر آں کن کہ خریدار تست" بتاؤ تمھیں خدا کی قسم کس پر تم کو شک ہے۔ آخر کس کوتا کا ہے۔ بھئی ہم کو بچا دینا استاد۔

مسخر الدولہ : (نواب صاحب کے کان میں آہستہ سے) خداوند یہ کسی چور کا کام ہے قسم کلام اللہ کی۔

نواب : (قہقہہ لگا کر) ہشت نامعقول۔ خدا کی مار تجھ پر۔ اس وقت بھی مسخرے پن سے باز نہیں آتا۔

مصاحب : کیا کہا حضور کس کا نام لیا؟

نواب : (پھر زور سے قہقہہ لگا کر) آپ چپکے سے فرماتے ہیں کہ خداوند یہ کسی چور کا کام ہے۔ اور کلام اللہ کی قسم بھی کھائی۔

محفل بھر کی یہ کیفیت تھی کہ جسے دیکھو لوٹ رہا ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اتنے میں ریل کا ایک چپراسی تار لے کر آیا۔

چپراسی : ہجور تار آیا ہے۔

نواب : تار! اُف خدایا شر آفات سے بچائیو۔ خداوندا روزِ بد نہ دکھائیو۔ سن سے جان نکل گئی۔ اس وقت بھئی ان کو اچھی طرح بٹھاؤ۔ اور کسی انگریزی خوان کو بلاؤ۔ اور تار پڑھواؤ۔ خدا جانے کہاں سے گور آیا ہے۔ اس وقت دل قابو میں نہیں۔

مصاحب : کیوں میاں جوان یہ تار تو بڑے صاحب کے دفتر سے آیا ہے نہ۔

چپراسی : ناہیں ریل گھر سے آوا ہے۔

رفیق : واہ رے انگریزو۔ اللہ جانتا ہے یہ بھی بلا تشبیہ خدائی کرتے ہیں۔ اور بینئے جلدی کے لیے اب تار کی خبر بھی ریل پر آنے لگی۔ واہ رے استاد عقل کام نہیں کرتی۔

دوسرے مصاحب : واللہ اعلم یہ تار بولتا ہے کیوں کر۔ آخر تار تو بےجان ہے بھئی۔

راوی : اچھے اچھے جمع ہیں۔ جو ہے جالینوس، بطلیموس، ارسطو، بقراط، اور سقراط ہی ہونے کا دم بھرتا ہے۔ مگر لیاقت یہ کہ چپراسی سے جو سوال کیا بھونڈا۔ ایک صاحب نے

پوچھا کہ کیا یہ تار بڑے صاحب کے دفتر سے آیا ہے۔ اس گاؤدی سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ بڑے صاحب کے دفتر کو تار سے کیا واسطہ۔ خیر جب چپراسی نے کہا کہ نہیں خداوند ریل گھر سے آیا ہے، تو فرمایا کہ جلدی کے لیے تار کی خبر ریل پر آنے لگی۔ واہ ری عقل۔ لاحول ولا قوۃ۔ اتنا نہیں جانتے کہ ریل تو کانپور سے لکھنؤ تک تین گھنٹے میں پہنچتی ہے اور تار کی یہ سرعت ہے کہ ادھر کھٹ ہوا اور خبر کلکتہ میں داخل۔ پھر اس قدر نہیں سمجھتے کہ جو تار کی خبر ریل پر جاتی تو تار برقی سے پھر کیا فائدہ تھا۔ خدمت گار کسی انگریزی خواں کو لے آیا۔ مگر واجبی ہی واجبی لیاقت۔

لفافہ کھولا تو بہت غور سے پڑھنے لگے۔

نواب : کیا لکھا ہے بھئی۔

انگریزی خواں : لکھنؤ (دس منٹ تک تامل کیا)

مسخرالدولہ : میاں کیا کو دوں دے کے پڑھے ہو کیا؟ کچھ اور بھی لکھا ہے۔ یا لکھنؤ ہی لکھا ہے۔ اور بس۔

انگریزی خواں : لکھنؤ۔ مرزا پر۔

مسخرالدولہ : واہ رے تیری پُر۔ بھیّا مرزا پور کہو مطلب یہ کہ لکھنؤ کو خبر بھیجی ہے اور مرزا پور سے آئی۔

انگریزی خواں : لکھا ہے کہ کل چاند دیکھنا اور ایڈ ہونا۔

مسخرالدولہ : بے بس آپ پڑھ چکے اور ہم سمجھ چکے (خدمت گار سے) کس گاؤدی کو پکڑ لائے میاں۔

انگریزی خوان : (شرما کر) ایڈ ہونا تو صاف لکھا ہے۔

مصاحب : ہجے کیجیے ہجے۔ انگریزی زبان کی آپ بن ناحق ٹانگ توڑتے ہیں۔ بس رہنے دیجیے۔

رفیق : اہاہا۔ نہ کہیے گا واللہ ہم تاڑ گئے۔ یہ جو ایڈ ایڈ بک رہے ہیں یہ عید ہے۔ پوچھا ہوگا کہ چاند کل دیکھا یا نہیں۔ آج عید ہے یا کل یہ تو وہی مشکل ہوئی۔ واللہ کہ ہاتھ میں چکی کا پاٹ ہے۔

نواب : ہاں خوب سمجھے واللہ۔ کسی نے مرزا پور سے پوچھا ہوگا کہ آج عید ہے، یہاں یا کل ہوئی۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ بھیجا کس نے ہے۔ آخر کسی کا نام تو بتائیے۔

انگریزی خواں : ناسر ہوسین۔ (نثار حسین)

مسنحر الدولہ : ماشاءاللہ کیا نام بتایا ہے۔ ناسر ہوسین۔ ترکی نام ہے یا فرانسیسی، معقول۔

رفیق : ہم بتائیں۔ ناسر ہوسین نہیں۔ نثار حسین ہوگا۔ کیوں نہ کہیے گا۔

نواب : شاباش، خوب سُوجھی۔ مرزاپور میں ہمارے ایک دوست ہیں نثار حسین۔ بڑے متشرع آدمی۔ یہ انھوں ہی نے تار بھیجا ہوگا۔ پھر اب اس کا جواب کسی سے لکھوائیے اور بھجوائیے، مگر جلد جائیے۔ تاکہ ان کے پاس آج ہی پہنچے۔ وہ بڑے بیقرار ہوں گے۔ ایک روپیہ دو روپیہ جو صرف ہو داروغہ سے دلوادو، اور میاں ندرت کو ابھی تار گھر بھیجو اور کہو وہاں صاحب سے یا کوئی بابو ہو تو اس سے کہیے کہ ذرا جلد بھیج دیں، اور کان میں چپکے سے، اگر کچھ مانگے تو دے دینا۔ مگر اتنا کہہ دینا کہ خبر ضرور پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہ راہ میں کہیں رک رہے تو غضب ہی ہو جائے۔

میاں ندرت۔ لکھنؤ کے آدمی اور وہ بھی پُرانے فیشن کے نخاس کے باہر عمر بھر قدم رکھا ہی نہیں۔ وہ کیا جانیں کہ تار گھر کس بلا کا نام ہے۔ خیر قہر درویش بر جان درویش کہہ کر چلے تو راہ میں ایک ایک سے پوچھتے جاتے ہیں کہ کیوں بھئی تار گھر کہاں ہے۔

نان بائی : اجی ہم سے روٹی کباب کلچے کا بھاؤ پوچھیے۔ تار وار کسی بابو سے دریافت کیجیے۔

پٹوا : اب لے بجور ہم تو بس چرکھا کاتنا خوب جانتے ہیں، اور کچھ ہم کیا جانیں۔

نائی : تار گھر! ہم کو تو کھت بنانا اور مونڈنا آتا ہے کہیے تو آپ کا بھی بنا دیں!

آخر کار ایک چپراسی نے کہا کہ کل کی برف کے سامنے ہے۔ بھائی ہم کل کی برف ورف تو جانتے نہیں۔ یہ بتاؤ کہ ادھر نخاس[1] ادھر یا ٹہ نالہ اور پھر اس طرف سعادت گنج سے۔ کس رُخ کو جائیں

---

[1] لکھنؤ کے مشہور بازار اور محلّے زیادہ تر نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے عہد میں آباد ہوئے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد کے مشہور محلّوں میں فتح گنج۔ یحییٰ گنج۔ نخاس۔ کشمیری محلّہ۔ حسن گنج۔ ٹکیت گنج شامل ہونا۔ سعادت علی خان کے عہد کے محلوں میں سعادت گنج۔ رکاب گنج۔ موؤں گنج۔ گولا گنج مقبول گنج۔ رستوگی محلہ بہت مشہور رہیں۔ حضرت گنج امجد علی شاہ نے آباد کیا تھا جو لکھنؤ کا بہت بارونق بازار رہے۔ انھیں کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد بہت شاندار محلہ بسایا تھا۔ (بحوالہ گذشتہ لکھنؤ از شرر لکھنوی)

بُرے پھنسے۔ یار اور تار گھر میں خدا جانے کیا واردات ہو، ذری انگریزی قانون والوں سے ہم ناواقف بھی ہیں۔ دیکھیے آج کیا افتاد پڑتی ہے۔ خیر خدا مالک ہے۔ چلے تو دُھنیا مہری کے پل پر ہو رہے۔ سیدھا راستہ چھوڑا، اور نا کے کی راہ لی۔ لا حول ولا قوۃ۔ وہاں ایک آدمی سے پوچھا کہ یہاں سے تار گھر کتنی دُور ہوگا۔ اس نے کہا تین کوس۔ ایں! ارے میاں ہوش میں ہو۔ ہاں ہم تو ہوش میں ہیں۔ تم اپنی کہو۔ تم بھی ہوش میں ہو یا مدہوش ہو۔ آتے کہاں سے ہو۔ خیر حسین گنج پوچھتے چلے جاؤ۔ وہیں تار گھر بھی ہے۔ بھئی کیا آدمی ہو۔ حسین گنج کا نام تو ہم نے سنا ہے۔ مگر سوائے چوک، رستم نگر، کاشمیری محلہ، درگاہ، رانی کٹرہ، یحییٰ گنج۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے اور تو کوئی محلہ جانتے ہی نہیں، یا اور دو چار جانتے ہوں، مگر حسین گنج تو آج تک دیکھا ہی نہیں۔ بارے چلتے چلتے کوئی دو گھنٹے میں عیش باغ پہنچے۔ تو جان میں جان آئی کہ جیتے بچے۔ یہاں سے پتا پوچھتے پوچھتے چلے۔ حسین گنج۔ حسین گنج میں ایک بابو سٹرک پر کھڑے تھے، ان سے پوچھا کہ کیوں بابو جی تار گھر کہاں ہے۔ انھوں نے کہا سامنے چلے جاؤ۔ پھر پلٹے بابو جی ایک روپیہ لایا ہوں اور لکھوانا یہ ہے کہ آج عید سنیوں کی ہے۔ کل شیعوں کی ہوگی۔ بھلا وہاں بیٹھا رہوں جب خبر پہنچ جائے تب واپس آؤں۔ بابو نے کہا ایسا کچھ جبر ور نہیں۔ خیر تار گھر کی کوٹھی پر داخل ہوئے تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے کہ دیکھیے جان کیوں کر بچتی ہے۔ خدا جانے کیا افتاد پڑے۔ ہاتھی چھوٹے، گھوڑا چھوٹے، تھوڑی دیر پھاٹک پر کھڑے رہے اور وہاں سے مارے ڈر کے بیرنگ واپس۔ راہ میں دونوں روپے انھوں نے بھنائے اور بیوی کے لیے تیج میل مٹھائی چنگیل میں لے چلے، اور راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ نواب سے یوں چکمہ چلیں گے، یوں پھانسا دیں گے، چین کر واستاد، خدا بدھ کا نقشہ ہے۔ اب میاں ندرت کے پوبارہ ہے۔ دو چہرہ شاہی جو نئی گرہٹ کے چمکتے دمکتے پائے تو خوب گلچھرّے اڑائے۔ مزے سے مٹھائیاں چکھیں۔ حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ گھر میں جو خوش خوش گھسے تو ہاتھ میں چنگیل اور اس میں مٹھائی تیج میل۔ بیوی دیکھتے ہی

؎ دھنیا مہری۔ بادشاہ نصیر الدین کے عہد میں ایک مشہور کہارن تھی۔ جس کا دربار میں بہت رسوخ تھا دو سو کہارنیوں کی امیر تھی۔ افضل النساء خانم خطاب ملا تھا۔ کئی عمارتیں اور پل اس کے نام سے مشہور ہیں۔ (تاریخ اودھ جلد دوم مرتبہ نجم الغنی)

کھل گئیں کہ آج البتہ چکھوتیاں ہوں گی، جھپٹ کر چنگیل ان کے ہاتھ سے چھینی، اور دیکھا تو منھ میں پانی بھر آیا۔ برفی پر چاندی کا ورق لگا ہوا۔ امرتیاں تازہ بتازہ۔ لڈو گرما گرم۔ پیڑے وہ جو متھرا کے پیڑوں کے دانت کھٹے کر دیں۔ دو تین لڈو اور برفی ایک، تو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گئیں۔ واہ مٹھائی کیا ہے کہ لب بند ہوتے ہیں۔ پیڑا اٹھانے ہی کو تھیں کہ میاں ندرت نے جھلا کر پہنچا پکڑ لیا۔

ندرت : لب بند ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں مگر تمہارا منھ چلا ہی جاتا ہے۔ ایک لڈو کھایا میں کچھ نہ بولا۔ دوسرا نگلا میں چپ چاپ دیکھا کیا۔ تیسرے لڈو پر ہاتھ بڑھایا اور مزے مزے سے کھایا۔ برفی کھائی اور اب چلے پیڑے پر ہاتھ ڈالنے۔ تب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اب کھانے پینے کی چیزیں ٹوکے کون۔ اتنی بڑی لومڑ ہو گئیں مگر ہلڑ ہی بنی رہیں۔ ندیدوں ڈال کے ٹوٹوں، مربھکوں کی طرح مٹھائی پر گر پڑنا کیا معنی۔ دو پیالیاں لاؤ افیم گھولو پیو جب خوب نشے گٹھیں تب مٹھائیاں چکھو۔ آؤ آج ہم تم دونوں پئیں۔ خدا کی قسم یہ افیم بھی نعمت کی ماں کا کلیجہ ہے۔

بیوی : (بہت تنک کر) بس نیامت (نعمت) کی ماں کا کلیجہ تم ہی کھاؤ۔ کھاؤ چاہے بھاڑ میں جاؤ۔ واہ آج اتنے بڑے تہوار کے دن مٹھائی کیا لائے کہ دماغ ہی نہیں ملتا۔ موتی کی سی آب اتار لی۔ ایک پیڑے خاطر پہنچا دھر کے مروڑ ڈالا۔ اللہ کرے ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ تم ایم کھاؤ چاہے سنکھیا کھاؤ۔ ہم اپنے سوتے ہیں۔

راوی : واہ میاں ندرت کیوں نہ ہو۔ خود تو میاں افیمچی بنے ہی اب اپنی بیوی کو بھی پلاؤ۔ لطف تو یہی ہے کہ دونوں میاں بیوی افیم کی پینک میں اونگھا اونگھ کر مٹھائی ٹونگیں ایک کا سر اس پاٹی پر ہو دوسرے کا اس پاٹی پر ہو۔ جب تک کھٹاکے کی آواز نہ آئے تب تک سر نہ اٹھائے۔ رات بھر سربسجود۔ یادِ معبود، بھئی ان افیونیوں سے خدا بچائے بھلے مانس کو تو ان کے پڑوس نہ رہنا چاہیے۔ انتہا یہ کہ ہے کہ بندر تک کو افیمی کر دیا۔ لکھنؤ میں کسی ذات شریف نے بندر پالا اور اس کو افیم پلانا شروع کی۔ اس اپج کے قربان، یہ کیا دور کی سوجھی ہے۔ اور کیوں نہ سوجھے لکھنؤ کا تو چوہا چوہا افیونی ہے۔ خیر چند روز کے بعد حضرت نے بندر کو چھوڑ دیا۔ اب میاں اینٹھا سنگھ کے حواس بے ترا ہوئے۔ سٹی پٹی بھولی ہوئی۔ وقت پر افیم نہ ملی تو جمائیاں پر جمائیاں آنے لگیں۔ دُم الگ لپٹی جاتی ہے، اور اینٹھا سنگھ الگ لوٹ رہے

ہیں۔ بُرا حال ہے زندگی دبال ہے۔ کوٹھے پر سے بازار میں آئے۔ اب یاران سرپل سب کیفیت دیکھ رہے ہیں۔ بے ڈگڈگی کے بندر کا ناچ کسی نے کاہے کو دیکھا تھا۔ دو چار آدمیوں نے پیالی میں افیم گھولی اور بندر کو دی، تو باچھیں کھِل گئیں۔ اور بڑے شوق سے پیالہ لے کر غٹ غٹ کر کے پی گیا، تو آنکھوں میں روشنی آئی۔ غرض کہ بندر بے چارہ افیم پینے کے وقت باؤلا کتا سا بن جاتا تھا۔ اب میاں ندرت کو اس سے بڑھ کر سوجھی۔ انھوں نے اپنی زوجۂ مقدسہ کو بھی افیم کی چاٹ دینی چاہی جس میں دونوں ہر دم غین رہیں۔ اس سُوجھ بوجھ کے صدقے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مرزا رفیع دانش نے اور بھی ستم ڈھایا کہ اس بلائے درماں کی تعریف میں یوں فرمایا:

تریاکی اگر سینہ کئی صد چاکش — از دل نرود خیانت دامساکش
چوں غنچہ تریاک سرافگندہ بہ پیش — سر بر نکند تا نہ رسد تریاکش

اتنے میں باہر سے آواز آئی (میاں ندرت صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ صدائے برنخاست۔ پھر پکارا۔ میاں ندرت صاحب ہیں۔ جواب خموشی۔ تب تو اس نے زور زور سے زنجیر کھڑکھڑانا شروع کی۔ بیوی متحیر کہ آخر میاں سون کھینچے ہوئے کیوں بیٹھے ہیں۔

بیوی : سنتے ہو یا کانوں میں ٹھیٹھیاں ہیں۔ ایک آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّ رہا ہے۔ دروازے کو چول سے نکالے ڈالتا ہے۔ اور تم بھٹ مارے بیٹھے ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ کہیں چوری کر کے تو نہیں آئے ہو۔ آخر ش یہ ماجرا کیا ہے۔

ماما : ہاں بیوی کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

ندرت : ذری آہستہ آہستہ باتیں کرو۔

بیوی : اے ہے سچ کہیے گا ذری۔ ہم تو خوب غل مچائیں گے۔ اور قہقہے لگائیں گے۔ ماما ہم پردے میں ہوئے جاتے ہیں، جا کر ان کو بلاؤ۔ کہو گھر میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اور ہم سے کہتے ہیں۔ رساں رساں بولو۔

ندرت : نہیں نہیں یہ دل لگی بازی اچھی نہیں تم کہہ دو کہ نواب صاحب کے یہاں گئے ہیں۔

ماما : اے ہے کون آدمی ہے کہ دروازے کو توڑے ڈالتا ہے۔

آواز : اجی ماما جی میاں گھر میں ہیں یا نہیں؟

ماما : (باہر جا کر) بس اتنے ہی کے لیے۔ توبہ۔ توبہ۔ میں تو سمجھی کہیں سے دوڑ آئی ہے۔

میاں تو سویرے مُنھ اندھیرے نواب کے ہیاں (یہاں) گئے ہیں۔ ابھی آئے نہیں۔ جو ملیں تو بھیج دیجیے گا۔

آواز : ایں: نواب صاحب کے یہاں سے تو ہم بھی ابھی ابھی آرہے ہیں۔ وہاں ڈھنڈ طس مچی ہوئی ہے۔ یہ چل کہاں دیے۔ تار گھر تک سرکار نے بھیجا تھا۔ سو اب تک راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ اچھا بھابھی صاحب سے کہو کہ آج عید کے دن آپ کے دروازے پر آئے ہیں۔ کچھ سویاں دویّاں کھلائیں۔ ہم تو بے تکلف آدمی تقاضا کرکے دعوت لیتے ہیں۔

ماما نے اندر سے نے جاکر باہر برآمدے میں ایک مونڈھا بچھا دیا۔ اب یہاں میاں بیوی میں تکرار ہونے لگی۔

میاں : اجی ٹال بھی دو۔ ایسے ویسے مفت خورے بہت آیا کرتے ہیں۔ ماما جی تم بھی پاگل ہی رہیں۔ مونڈھا بچھانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

بیوی : اے واہ ہم تو کریں گے اور ضرور خاطر کریں گے یہ اچھا کہ نواب کے یہاں جاکے ہم کو گنوارن، بدسلیقہ عورت بنائیں۔ اس میں تمھاری ناک نہ کٹے گی۔

میاں : ہماری ناک کی تم کہو ہی نہیں۔ ایسی ناک بھی نہ دیکھی ہوگی۔ روز کٹتی ہے۔ مگر صبح کو پھر (جتنی کی تتنی) یہ ناک کیا منھدی کی شاخ ہے کہ قلم کی اور بڑھی۔ شمع ہے شمع۔ کاٹ ڈالو تو اور بھی روشن ہو۔

بیوی نے ایک تشتری میں پانچ چھ ڈلیاں مٹھائی کی قرینہ سے لگاکر، ریشمی ہرا رومال اس پر ڈھک دیا، اور ماما سے کہا کہ جاؤ دے آؤ۔ میاں ندرت کی روح پر صدمہ ہوا کہ چار پانچ ڈلی تو بیوی باتیں کرتے کرتے چکھ گئیں، اور پانچ چھ اب نکل گئیں۔ غضب ہی ہوگیا۔ ماما مٹھائی لے کر چلی تو ڈیوڑھی میں دو لڈو چپکے سے نکال کر ایک طاق میں رکھ دیے۔ اتفاق سے ایک چھوکرا دیکھ رہا تھا اس نے تاک لگائی اور جب ماما جی باہر گئیں، دونوں لڈو مزے سے کھا گیا چلیے چور کے گھر میں مور بیٹھا۔ مصاحب نے رومال ہٹایا تو کہا کہ واہ بھابھی صاحب تو بڑے بھائی صاحب سے بڑھ کر جزرس نکلیں۔ یہ ہاتھی کے مُنھ میں زیرا۔ خیر پانی تو لاؤ۔ ماما ایک شیشے کے گلاس میں صراحی کا ٹھنڈا پانی لے گئیں، اور حضرت نے مٹھائی کھائی اور پانی پیا۔ پیٹ بھرا تو پان کی فرمایش کی۔ بیوی نے اپنے ہاتھ سے دو گلوریاں بنائیں۔ مصاحب الدولہ نے چکھیں تو حقہ مانگا۔ ندرت نے کہا دیکھا نہ۔ ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔ مٹھائی لاؤ، پان کھلاؤ۔ پانی پلاؤ۔ حقہ بھر

لاؤ۔ گویا باوا کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ ان موذیوں کی تو قبر تک سے میں واقف ہوں۔ اسی سے کہا تھا کہ منھ نہ لگاؤ، اور ایک ان پر کیا موقوف ہے۔ نواب کے ہاں جتنے ہیں سب گرگے سب مفت خورے۔ پرایا مال تکنے والے۔ ماماجی جا کر کہہ دو کہ حقّہ یہاں کوئی نہیں پیتا۔ چلیے اب بہت اختلاط بھی نہیں اچھا ہوتا۔ ماما حقّہ بھر کے دے ہی آئی۔ جب سوختہ کر چکے تو حضرت نے باہر سے آواز دی کہ ماماجی چارپائی یہاں موجود ہے۔ ذرا دری یا غالیچہ دے جائے گا۔ اب ٹھیک دوپہر کو کون اتنی دُور جائے۔ ذرا کمر سیدھی کر لیں۔ تب تو میاں ندرت خوب ہی جھلائے۔ اور سنیے اب لیٹنے کی سوجھی۔ آخر اس مردک کا منصوبہ کیا ہے۔ کملی کھڑی کرنے کا قصد تو نہیں کیا ہے۔ کہیں صریح جانتا ہے کہ مالک گھر میں نہیں ہے۔ پھر یہ دروازے پر چارپائی بچھا کر سونا کیا معنی۔ اور مجھ سے اس سے کہاں کا ایسا یارانہ ہے۔ کہ آتے ہی بھابھی صاحب سے فرمائشیں ہونے لگیں۔ بھابھی صاحب! پوچھیے مجھ سے آپ سے بھائی چارہ کب ہوا تھا۔

اتنے میں ماما ڈیوڑھی میں گئیں کہ لڈو چپکے چپکے کھائے۔ طاق پر ڈھونڈ مار لڈوؤں کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ چھوکرے نے پوچھا کہ ماماجی وہاں کیا ڈھونڈھ رہی ہو۔ وہ تو چوہا کھا گیا۔ سنتے ہی ماما آگ بھبھوکا ہو گئی تو چھوکرا کہتا کیا ہے۔ ماماجی سچ کہنا کیسی خلال ہوئی۔ اور چوہا بھی کیسا تاک ہی میں بیٹھا تھا۔ چوہے نے تمہارے اچھے کان کترے۔

مصاحب: ماماجی ذری پلنگ دے جائیے تو دراز ہوں۔

ماما: پلنگ ولنگ یہاں نہیں ہے۔

مصاحب: ماماجی ہم جانتے ہیں بڑے بھائی اس وقت کہیں عید ملنے گئے ہیں۔ بس سمجھ جائیے۔

ندرت نے کہا خوش ہوئیں۔ اب خوش ہوئیں۔ کچھ سمجھیں بھی۔ اب یہ اس فکر میں ہیں کہ تم کو ہم کو لڑوا دیں۔ تمہارے ہاتھ میں جوتی ہو، ہمارے ہاتھ میں بیزار۔ اور تڑاتڑ پڑتی ہوں۔ اور مٹھائی بھیجو۔ گلوریاں چکھاؤ۔ چکھاؤ گلوریاں۔ بڑے بنا بنا کر بھیجو۔ شرم تو نہ آئی ہوگی۔

جب مصاحب الدولہ بہادر جھینپ ہوئے تو میاں ندرت بھی جھومتے جھامتے چنگیل کی طرف بڑھے، اور افیم کی پینک میں خوب چھک کر مٹھائی چکھی۔ اور چلے نواب کے گھر چلے تو پو قدمے۔ قدم قدم پر فقرے سوچتے جاتے ہیں۔ بارے داخل ہوئے، تو لوگوں نے

آسمان سر پر اٹھایا۔ آئیے آئیے۔ آئیے قبلہ۔

نواب : شکر ہے کہ زندہ تو بچے۔ یہ آپ آج تک تھے کہاں آخر؟

مصاحب : حضور تارگھر تو یہ سامنے ہے۔

رفیق : اجی دو قدم پر نکلے اور داخل۔

حافظ : ہاں اور نہیں تو کیا۔ بات کرتے تو آدمی پہنچتا ہے۔

روشن علی : کون! مجھ سے کہیے تو اتنی دیر میں ایک اٹھارہ پھیرے کروں۔

ندرت : ہاں بھئی گھر بیٹھے جو چاہو بنکار لو۔ کوئی جائے تو قدر عافیت معلوم ہو۔ چلتے چلتے اندھی روگ آجاتا ہے۔ بکری مرگئی کھانے والے کو ذائقہ ہی نہ آیا۔ آپ لوگ تھان کے ٹرے ہیں۔ کہنے لگے دو قدم پر ہے۔ جی بلکہ اور آدھی قدم پر۔ یہاں سے گئے سعادت گنج۔ وہاں سے دھنیا مہری کے پل۔ وہاں سے عیش باغ۔ وہاں سے گنیش گنج۔ وہاں سے امین آباد، اور زنبور خانے ہوتے ہوئے۔ تار گھر پہنچے۔ دم ٹوٹ گیا۔ شل ہو گئے۔ مرمٹے۔ نہ کھانا دانہ۔ آپ لوگ یہاں بیٹھے بیٹھے جو چاہیے فرمائیے۔ ذری دو قدم جائیے تو معلوم ہو آٹے دال کا بھاؤ۔ کہنے اور کرنے میں فرق ہے قبلہ۔

نواب : تو اب اس کھائیں کھائیں سے کیا واسطہ یہ کہیے کہ خبر پہنچی یا نہیں۔

ندرت : قربان جاؤں خداوند نے بھلا میں اس کا کیا جواب دوں۔ علم غیب تو پڑھا ہوں نہیں۔ کچھ خبر دے آیا۔ بابو نے میرے سامنے کھٹ کھٹ کیا۔ صاحب نے روپیہ لیا۔ چپراسیوں کو انعام دیا۔ روپیہ اپنی جیب سے دینے پڑے۔ وہ تو کہیے وہاں میرے نوابی کے جان پہچان میرزا کلن بیگ نہ ہوتے تو بیرنگ واپس آنا پڑتا۔

نواب : خیر تشفی ہوئی۔ اب فرمائیے کہ اتنی دیر کہاں ہوئی۔

ندرت : خداوندا جلدی کے مارے بگھی کرایہ کر کے گیا تھا۔ لوٹتیوں کو اس نے وہ پلٹا کھایا کہ میں تو سمجھا کہ بس چل ہی گیا۔ مگر خدا مسبّب الاسباب ہے گرا تو لیکن بچ گیا۔ کوئی دو گھنٹے تک کوچبان بم ہی درست کیا کیا۔ اس سے دیر ہوئی حضور! ورنہ حاضر ہوتا اب گھر جاتا ہوں۔

نواب : ہائیں! ارے بھئی کھانا تو کھاتے جاؤ۔ اچھا چار روپیہ تو وہ ہوئے اور بگھی کے کرایہ کے بھی کوئی تین روپیہ ہوئے ہوں گے۔ سات روپیہ داروغہ سے لے لو۔

ندرت : نہیں خداوند جھوٹ نہ بولوں گا۔ چاہے فاقہ کروں، مگر کہوں گا سچ ہی۔ یہی تو

غلام میں جو ہر ہے۔ دو روپیے اور پانچ پیسے دیے۔ دیکھیے خدا کو منھ دکھانا ہے۔
نواب : داروغہ ان کو دس روپیہ دے دو۔ سچ بولنے کا کچھ انعام بھی تو دوں۔
راوی : ماشاءاللہ کیا سچ بولے ہیں۔

حُسن آرا کی بے قراری اور خیالِ میاں آزاد میں گریہ وزاری

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ — بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ
کجا روم بکہ گویم بگو چہ چارہ کنم — کہ تیر عشق مرا اندرون جان زدۂ

ایک روز سرِ شام ایک دل آرام گلفام، حور وش، نازک اندام، عشاق کی جان پر آفت ڈھانے والی، دنیا سے نرالی، باغِ پُر فضا و دلکشا کی پیاری پیاری روشوں میں عجب نازِ معشوقانہ اور اندازِ دلربایانہ، سے اٹھکھیلیاں کرتی اور چمک چمک کر قدم دھرتی ہوئی مصروف گل گشت تھی۔ بھلا پوچھیے تو یہ نگار جادو جمال، دمشتری خصال کون ہے۔ یہ خاتونِ مہ لقا پیاری حُسن آرا ہیں، جس کا میاں آزاد خانہ برباد پر دل آیا تھا۔ اور جس نے اُس جوانِ صالح کے نشترِ نگاہ کا چرکا کھایا تھا۔ یہ پری بصد شان دلبری، گلوں کو حجاب رشک میں چھپاتی اور بلبلوں کو غیرت سے شرماتی ہوئی۔ جہاں جہاں جاتی تھی۔ اور پتلی کمر کروروں بل کھاتی تھی :

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی — شورِ بلبل نے کیا بادِ بہاری آئی

نسیم عنبر بیز، عنادل طرب ریز، کہیں جوش بہار، کہیں خندہ سرشار، خدائے جہاں آفریں کی چمن طرازی۔ باغبانِ گلشنِ ایجاد کی خیایاں پردازی۔ شاخ گل بہار آفریں۔ تختہ تختہ سراپا رنگین، ہر شجر خضارت ہار، ہر روش روکش فرخار، دورویہ سبزے کی لہک، بیچ میں لال انگاراسی سڑک، جیسے چرخ نیلوفری پر دھنک کی دمک، اور پیاری حُسن آرا ابر کی چال جھوم جھوم کر چلتی ہے، اور دایہ بہار بادِ عطر بار کا پنکھا جھلتی ہے :

از رشکِ خرامیدن تو سرو چو طاؤس — در ہر قدمی تازہ کند ماتم مارا

شاہدان چمن کے خرمن صبر و قرار میں آگ لگاتی ہوئی اور پائینچے ناز و ادا سے اٹھاتی ہوئی، کبھی جھپٹ کر اس روش میں کبھی پھرتی کے ساتھ اس روش میں خرام کرتی تھی۔ دلربائی کا اہتمام کرتی تھی۔ اٹھتی جوانی، بحرِ حسن کی طغیانی، جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ جمالِ حُسن یوسُف سے ٹکر لڑتا تھا۔ اس وقت حُسن آرا فرطِ طرب سے آپ ہی مسکراتی تھی اور چلبلے پن کے مارے

کھِل کھلاتی جاتی تھی۔ کہ دفعتاً سارا لطف کرکرا ہوگیا۔ سامان تازہ مہیا ہوگیا۔ عین مستی میں بصد شوخی ہر طرف گھوم رہی تھی۔ اور جوانی کے نشے میں جھوم رہی تھی کہ دور سے کسی شخص نے خوش آوازی سے گانا شروع کیا۔ کہ (جب سے گیو موری سدھ ہی نہ لینی۔ کیسے کٹھن کٹھور) یہ سنتے ہی طوفان غم تنورِ سینہ میں جوش زن ہوا۔ ایک ایک رونگٹا نخچیر تیر محن ہوا۔ حسرت وصال آزاد میں تنکے چننے لگی۔ رنج فراق میں سر دھننے لگی۔ ہائے آزاد! وائے آزاد! کی صدا بلند کی سفیدۂ صبح مسرت پر ظلمتِ شب حسرت کی تاریکی چھائی، گریباں و دامن کی شامت آئی:

گریاں شد و تلخ بگریست   بے گریۂ تلخ در جہاں کیست

کبھی چیخی اور چلائی۔ کبھی یہ سخن زبان پر لائی کہ یا خدا میرے معشوق کی صورت دکھا دے یا خضر خجستہ پے پتا ہی بتا دے۔ عالم تصور میں میاں آزاد کی تصویر مجسم نظر آئی۔ نظر آتے ہی کھل کھلائی مگر طرفۃ العین میں تصویر غائب پائی۔ تو خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور چلائی۔ کبھی پھولوں کی پنکھڑی کو سونگھ کر کہا کہ اس میں اُس گل عِذار کی بو ہے۔ کبھی سنبل کی طرف نظر ڈال کر کہا کہ ایسا ہی وہ عنبریں مو ہے۔ کبھی عندلیبِ شیدا سے مخاطب ہو کر کہنا:

بنال بلبلِ اگر با منت سرِ یاریست   کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

کبھی بادِ عنبر بیز کو اپنا مخاطب کر کے عجب حسرت سے چلا اٹھنا کہ:

نسیم صبح کہ مستانہ وار می گذری   ندانمت ز کدامی دیار می گذری

اے باد اگر بہ گلشن احباب بگذری   زنہار عرضہ دہ بر جانان پیام ما

کبھی قمری کو شاخِ شمشاد پر دیکھ کر رو کے کہنا:

فرق ست میاں آنکہ یارش در بر   با آنکہ دو چشمِ انتظارش بر در

کبھی پھولوں کو شاخِ گلبن میں دیکھ کر اشارہ کرنا:

ہوا میں ٹوٹتے ہیں خاک پر گل آج بسمل سے   گلستاں قتل کا میدان ہے تیغ نازِ قاتل سے

مطرب بار بد نژاد نے ایک ٹھمری کیا سنائی کہ بے چاری حسن آرا کے دل پر بجلی گرائی:

مطرب بگوشم زد نواز گریہ محزون کردمش   ساقی بدستم داد می پیمانہ پُر خون کردمش

میاں آزاد خود تو خانہ برباد تھے ہی مگر جہاں بیٹھے، جس سے دل ملایا اس کو مجنوں اور مفتون اور اپنا سا آزاد خانہ برباد بنا دیا:

شد ہر کہ آشنا بہم پنہاں نہاں شد ہمچو من   با ہر کہ بنشستم وی چوں خویش مجنوں کردمش

پیر مرد، دیجیہ یعنی وہی ملاح، مع حسنِ اتفاق سے باغ کی طرف جو گذرا تو دیکھا کہ حسن آرا دیوانہ وار ادھر اُدھر پھر رہی ہے۔ سمجھا کہ رنگ رو باختہ حضرتِ عشق کی ساختہ پرداختہ ہے۔ تاڑ گیا کہ آزاد یاد آئے۔ زلف کھلی اور آشفتہ، بال بکھرے ہوئے عین بیخودی کے عالم میں ہے۔

پیر مرد : (قریب جا کر) حسن آرا پیاری حسن آرا۔

حسن آرا : (پیچھے پھر کر) کیا کہا۔ پیاری! کس کی پیاری! ہائے کس کی پیاری؟ آزاد کی پیاری۔ اپنے پیارے آزاد کی پیاری۔ اپنی آنکھوں کے تارے آزاد کی پیاری۔ آج سے ہمیں پیاری نہ کہنا سنا بڈھے۔ خبردار جو پیاری کہا تو تو جانے گا۔

پیر مرد : (کانپتے ہوئے) حسن آرا۔ تمھاری تقریر سے ہمیں خوف معلوم ہوتا ہے کہ اب تم بہکنے لگیں۔ میں تو تم کو اپنی بیٹیوں کے برابر سمجھتا ہوں، کیا اولاد والدین کو پیاری نہیں ہوتی۔

حسن آرا :

ہجر تو از پیکرم رنگ بہاری ریختہ — ابر و برق و باد باراتی عجب انگیختہ
گر بہ گلشن بگذرم با ایں دل رنگین خویش — عندلیب از شک ہجولاں لالہ گردستہ ریش

اب تو بندی سالک جلوۂ عشق ہے۔ اور ساغر چشم لبریز بادۂ عشق ہے:

میکشد شعلہ سرے از دلِ صد پارۂ ما — جوشِ آتش بود امروز یہ فوارۂ ما
ہر کسی روزِ ازل تختۂ تعلیم گرفت — عشق مشاطگی آموخت زنظارۂ ما

(چونک کر) اُف۔ اس وقت تو میں جیسے نشے میں تھی۔

پیر مرد : تم اس وقت مریض ہو، میں طبیب ہوں۔ مریض کو طبیب کا کہنا ماننا چاہیے۔

حسن آرا :

از سر بالینِ من برخیز اے نادانِ طبیب — درد مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

پیر مرد : اس آہ وزاری سے خدا برا مانتا ہے۔ یہ سوءِ ادب ہے۔

حسن آرا :

ہائے دہوے عاشقاں در پیش رب — سوزشِ عشق است نے ترکِ ادب

پیر مرد : اس وقت سبزہ زار کو دیکھو۔ باغ و بہار کو دیکھو۔ دو گھڑی جی خوش کرو۔ دل بہلاؤ، کہا مانو۔ غم کے پاس نہ جاؤ۔ عشق کا نام زبان پر نہ لاؤ۔

حُسن آرا :

بے گل عذار جا کے گلستاں میں کیا کیا ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو نیا کیا

زر فتنِ تو طراوت نما ند در گلشن نہ آن گلست و نہ آن لالہ و نہ آن نرگس

پیر مرد : ذرا دل کو تسکین دو۔ ذرا غم کو دور کرو۔

حُسن آرا : صندلِ دردِ سرِ فراق تو لاؤ۔ تریاق مار گزیدہ اشتیاق تو دکھاؤ۔

اتنے میں پیر مرد کو سوجھ گئی کہ میاں آزاد کی تصویر لاکر حُسن آرا کو دکھا دوں۔ تو شاید تسلی بخش دل بے قرار، اور جمعیت خاطر پُر انتشار ہو، دوڑ گئے اور جھپٹ کر لے آئے۔

پیر مرد : (تصویر دے کر) لو ہم نے میاں آزاد کو یہاں ہی بلا دیا، نہ کہو گی۔ ہیں وہی یا کوئی اور۔

حسن آرا : (تصویر کو بار بار بوسے دے کر) واہ :

قانع بہ تجلی نہ شود شائقِ دیدار پروانہ بہ مہتاب تسلی نتوان کرد

اس تصویر میں، گویائی کہاں۔ وہ شوخی تو مصور نے کھینچی ہی نہیں۔ اس چشمک زنی کا عکس تو اتارا ہی نہیں۔ وہ رخسارِ آتشیں کے رنگ کا متغیر ہونا تو دکھایا ہی نہیں۔ وہ بات بات پر بانک پن۔ اس میں کہاں نظر آتا ہے۔ وہ خوش الحانی، وہ طرز غزل خوانی تو دکھائی ہی نہیں دیتا منہ سے پھول دم تقریر تو جھڑتے ہی نہیں۔ آنکھوں کے لال لال ڈورے تو سوجھتے ہی نہیں (تصویر کی طرف مخاطب ہو کر) میاں بت بنے بیٹھے ہو۔ کچھ بولو تو۔ غ۔ رخ میری طرف نظر کہیں اور" یہ طور بے طور۔ گویا منھ میں زبان ہی نہیں۔ یا وہاں ہی نہیں :

کس سوچ میں ہو نسیم بولو آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

پھر بوسہ لے کر :

دلِ دیوانہ دارم ندانم چیست تدبیرش سرِ زلفِ تو میخواہد مبارکباد زنجیرش

اگر ہماری تصویر کوئی اِس وقت کھینچے تو عجب وحشت کی صورت ہے۔ کیوں ؟ :

وحشت عیاں ہے خاک سے مجھ خاکسار کی بھڑکے ہرن بھی سونگھ کے مٹی مزار کی

اتنے میں حسن آرا کی چھوٹی بہن سپہر آرا دوڑی آئی۔

سپہر آرا : بہن بہن۔ اس وقت وہ خوش خبری سنائیں کہ تم بھی یاد کرو۔

حُسن آرا : ہم تو اسی دن خوش ہوں گے جب میاں آزاد گلگوں مرصع تنگ پر سوار پھاٹک پر آن کھڑے ہوں گے۔ گھوڑا ہنہناتا ہو گا۔ اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اور ہم کو ساتھ

ساتھ لیے روشوں میں ٹہل رہے ہوں گے۔

سپہر آرا : اللہ میرا جانتا ہے کہ اچھل پڑو۔ یہ لو میاں آزاد کا خط آیا ہے۔ احسان تو نہ مانو گی۔

حُسن آرا : چل جھوٹی۔ ایسا ہیں کوئی دیوانہ بنایا ہے۔

سپہر آرا : خاتون جنت کی قسم۔ یہ لو پڑھ لو نہ۔ مہر تو دیکھو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔

حُسن آرا : یہ نامہ آزاد آیا۔ یا مسیح دم فریاد آیا۔ (خط چھین کر) بوسہ لیا اور سپہر آرا کو دے دیا۔ کہ پڑھ کر سناؤ۔ مگر پھر لے لیا اور کئی بار چوما۔

سپہر آرا : پڑھوں۔ سنیے :

آزاد کا خط حُسن آرا کے نام

مانامہ بہ برگِ گل نوشتیم باشد کہ صبا باو رساند

جانِ آزاد۔ آہنگِ گرمِ شوق نے خطاب والقاب سب بھلا دیا۔ طولِ مقال شوق و انزجارِ مبالغہ سے درگذر کر نفسِ مطلب کہے دیتا ہوں کہ میرے آہنگِ شوق کی آبرو اب خدا کے ہاتھ ہے۔ میر شمشیر خارا شگاف اور تیغ خوش غلاف سے جو ہو سکے گا۔ وہ میری بسالت و شجاعت کے گواہ ہوں گے۔ غنیم کا فتح کر لینا تو ہمت مردانہ کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں فتح الباب دل ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ جب میں نے تمھارے دل پر فتح پائی تو روسی کیا بے چارے ہیں۔ تین چار دن میں بمبئی سے مثل نظر رواں ہوں گا۔ اور میرا جہاز بہت جلد قسطنطنیہ کے قریب لنگر انداز ہو گا۔ شکست و فتح کا حال خدا جانے اس وقت بحرِ اظہار بساطت ہر رگ و پے میں موج زن ہے۔ جوش و خروش کی انتہا نہیں۔ مجھے خوب معلوم ہے گو تم راتوں کو مجھے یاد کر کے چونک چونک پڑتی ہو گی۔ میری تصویر ہر دم تمھارے روبرو رہتی ہو گی۔ لطف صحبت آنکھوں میں پھر جاتا ہو گا۔ اور بعض اوقات تم دیوانوں کی طرح سر پٹکتی ہو گی۔ مگر میرے استقلال کو دیکھو کہ محبوب مطلوب کے حکم کی تعمیل کے لیے میں نے کیا کیا گوارا کیا۔ ایک اشارے کی دیر تھی کہ ٹرکی کا جانا فوراً منظور کر لیا۔ سر بازوں اور سچے عاشقوں کا یہی کام ہے۔ ورنہ عشق خام ہے۔ اور عاشق برائے نام پیاری سپہر آرا بھلا تم کو کیا سمجھاتی ہوں گی۔ وہ تم کو بات بات پر طعنے دیں گی کہ ایسا ہی

عشق تھا تو شہر بدر کیوں کیا۔ مگر تم مستقل رہو۔ اور وضعِ اہل آبرو اسی کی مقتضی ہے کہ اس کو تشفی دو۔ تم دونوں پیاری بہنوں کو میری وجہ سے بڑا صدمہ پہنچا۔ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو تم کیوں مضطر و پریشان، ششدر و حیران ہوتیں۔ اب تو جو ہونا وہ ہوا۔ کچھ دن کلیجے پر پتھر رکھو۔ میں روم داخل ہوتے ہی خط پر خط بھیجوں گا۔ ہماری ایک صلاح مانو۔ ان دنوں اودھ اخبار[1] ضرور پڑھا کرو۔ اس میں جنگ کا پورا پورا ذکر اشاعت پاتا ہے۔ راہ میں بخار نے ناک میں دم کر دیا۔ اب خدا کے فضل سے صحیح و سالم ہوں۔ میاں خوجی راہ میں خوب تماشے دکھاتے ہیں ایسا مسخرہ بھی کم دیکھا ہوگا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ جیتے ہیں تو پھر ملیں گے۔ ورنہ جس دن لیلیٰ مجنوں فرہاد و شیریں کا نکاح ہوگا اسی دن ہم تم دلہا دلہن بنیں گے۔ خدا حافظ بمبئی سے اپنی روانگی کا تار بھیجوں گا۔

(آزاد خستہ جان)

اس خط کو جس وقت سپہر آرا پڑھ چکی حسن آرا نے فوراً دوڑ کر لے لیا اور جوش مستی میں خط کے اس قدر بوسے لیے کہ تر ہو گیا۔ اس کے بعد اس فقرے کو یاد کرکے (کہ جس روز لیلیٰ اور مجنوں شیریں اور فرہاد کا بیاہ ہوگا اس روز ہم تم بھی دولہا دلہن بنیں گے) دونوں بہنیں ایک دوسرے کو چھاتی سے لگا کر خوب زار زار روئیں۔

حسن آرا : امید منقطع نہیں کر دی۔ دولہا دلہن بننے کا وعدہ کیا ہے۔ ایسا پاک باز عاشق دیکھا نہ سنا۔ اس استقلال کو تو دیکھو کہ خط میں ذرا ہراس کا لفظ تک نہ آنے پایا۔ ابتدا ابتدا میں کیسی جواں مردی ثابت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تلوار مُگلی پڑتی ہے۔ جیسے مورچے ہی پر کھڑے ہوئے سچ مچ لبلبی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ ہائے یہ فقرہ تو ستم کا ہے کہ سربازوں اور سچے عاشقوں کا یہی کام ہے۔ سپہر آرا کا بھی دل میں خیال ہے۔

سپہر آرا : بڑا جیوٹ جوان ہے۔

حسن آرا : اور بات کا دھنی۔

سپہر آرا : (خط کھول کر) اس فقرے سے کیسی جواں مردی ٹپکتی ہے (بحر اظہار بسالت رگ و پے میں جوش زن ہے۔)

---

[1] اودھ اخبار منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ سے نکالا تھا۔ یہ اخبار نوّے سال تک جاری رہا ۱۹۴۹ء میں بند ہو گیا۔

مانا مہ برگِ گل نوشتیم باشد کہ صبا بادرساند

ہائے اِس (باشد) نے غضب کیا۔

نواب کے دربار میں رفقا کی چہ میگوئیاں

نواب فلک بارگاہ وثریا جاہ کی محفلِ عشرت منزل میں چہل پہل، وہی دھما چوکڑی، وہی رنگ رلیاں، وہی فقرے بازی، وہی زمانہ سازی، وہی رفقا کے ڈٹاؤ، اور مصاحبوں کے جٹاؤ، وہی خوشامد کی گرمی بازار۔ وہی حضور و پیر مرشد خداوند کی چوطرفہ سے بوچھار۔ ایک شب کو نواب صاحب بیٹھے غپ اڑا رہے تھے کہ پدرم سلطان بود۔ اور مصاحب مارے خوشامد کے غل مچا رہے تھے کہ حضور ایسے اور حضور کے باپ ایسے تیسے۔ اور حضور کا دادا جان ڈبل پیسے نواب صاحب نے مشیخت میں آن کر از آدم تا ایں دم شجرہ ملا دیا شجرہ کیا ملایا کہ زمین و آسمان کے قُلّابے ملا دیے۔ کبھی تو بابُر[1] کو جدامجد بنایا۔ کبھی تیمور[2] سے سلسلہ ملایا۔ کبھی التمش[3] کے پوتے بن بیٹھے۔ کبھی نور جہاں[4] کو اماں کی خالہ کی پھوپھی کی اماں کی بھاوج بتایا۔ کبھی بولے کہ اورنگ زیب[5] ہمارے چچازاد بھائی تھے۔ کبھی فرمایا کہ محمود غزنوی سے ننہال کا رشتہ ہے۔ الغرض جو جو نام زبان پر آئے کسی کو حضرت نے اپنا باپ بتایا اور کسی کو باپ کا باپ بتایا۔ اور نور جہاں تو حضرتِ مشیخت پناہ و شیخوخیت دستگاہ کی خالہ کی پھوپھی اماں کی بھاوج ہی تھیں۔ سُن لیا چاہیں کہ فلاں عورت حسین و مہ جبین تھی بس پھر دم کے دم میں شجرے میں داخل۔ کوئی پھوپھی اماں کوئی چچی جان عجب نہیں کہ پدمنی بھی ان کی دادی ہو۔ معاذاللہ مرد خدا ایک بات پر قایم رہو۔ یا تو نیشا پوری

---

1. بابر متوفی ۱۵۳۰ء ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی۔
2. تیمور متوفی ۱۴۰۴ء ترکی نسل سے تھا بہت بڑی سلطنت کا بانی، ایشیائے کوچک ایران افغانستان سب اس کے زیر حکومت تھے۔ سمرقند اس کا دارالسلطنت تھا۔ ہندوستان پر بھی حملے کیے۔
3. التمش متوفی
4. نور جہاں متوفی ۱۶۴۵ء بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نہایت مدبر خاتون تھی۔
5. اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کا مشہور حکمراں متوفی

پوری خاندان سے سلسلہ ملاؤ۔ یا خاندان مغلیہ سے، یہ نہیں کہ کبھی غوری، کبھی خلجی، کبھی افغانی، کبھی بدخشانی۔ مصاحبوں نے جو دیکھا کہ نواب صاحب تو دور تک سلسلہ قائم کر دیا، تو ایک صاحب گرما گرم بولے کہ چنگیز[1] خان ہمارے دادا کے نواسوں میں تھے۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ نواب کی بزم طرب پر کشت زعفران کا دھوکا ہوتا تھا واہ حضرت واہ۔ دم غنیمت ہے۔ شجرہ بھی ملایا تو ہلاکو سے جس کو ہندو مسلمان سب بُرا کہتے ہیں۔ جس کے دین و ایمان کا اب تک پتا ہی نہ ملا اور اس بے تکی پن کو دیکھیے کہ ہلاکو کو اپنے دادا کا نواسہ یعنی اپنا ہم عصر بتایا۔ سبحان اللہ

میاں آزاد نے عمر خیام کی رُباعی پڑھی۔ ے

ان شاہ کہ خویش را ہلاکو می گفت — در کبر و منی سخن بہ ابرو می گفت

دیدیم کہ بر کنگرہ اس فاختۂ — امروز نشستہ بود و کو می گفت

نواب: لڑپڑو، لڑپڑو میاں۔ دیکھو تمہارے دادا کے نواسے کو اس قدر سخت الفاظ سے میاں آزاد نے یاد کیا۔ لاحول ولا قوۃ بھئی جو کوئی میرے عزیز کو ایسا کہتا تو واللہ بکڑ ہی ہو جاتی۔

مصاحب: حضور اب میں تو پھٹے حالوں ہوں۔ یہ کوئی کاہے کو باور کرے گا۔ کہ ہلاکو اس کا عزیز تھا۔ جس سے کہوں گا وہ بنائے گا، کہ آپ بھی اتنا ہوئے۔ اب آخر کس کس سے لڑتا پھروں۔

آزاد: (نواب سے) آپ نے تو اچھا تیز کیا تھا مگر ہمارے ڈنڈبل دیکھ کر حضرت منکے تک نہیں، اور ہم سے بھڑنا کچھ دلگی تو ہے نہیں۔ یہ غصہ تو کمزوروں ہی پر آتا ہے۔

مصاحب: اور آپ کہاں کے بڑے شہہ زور کی دُم بنے ہیں۔

آزاد: (مسکرا کر) بھڑکے دیکھ لو۔ پیس کے دھر دوں۔

مصاحب: اجی جاؤ بھی ہڈیاں چلچلاتی ہیں کیا۔ تمہارے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پر رحم آگیا۔ ورنہ وہ گدّا دیتا کہ چھٹی کا دودھ آپ کو یاد آجاتا لاکھ مرے ہوئے ہیں تو کیا ہوا تم سے دس پر بھاری ہیں۔ ہونہہ۔ کیا موم کی ناک سمجھ لیے ہیں۔ منگواؤں جوڑ بھر۔

ندرت: اجی آپ بڑے پہلوان۔ شیدی لندھور سہی۔ بس اب خوش ہوئے۔ ماشہ بھر کا

---

[1] سرشار نے چنگیز اور ہلاکو کو ایک شخص سمجھا ہے۔ یہ اُن کو غلط فہمی ہوئی چنگیز مشہور تاتاری فاتح تھا۔ ہلاکو اس کا بیٹا تھا۔

تو آپ کا قد ہے اور بڑا ر ہے ہیں۔ جوڑ منگاؤں، کبھی گھلے یا پھری کی صورت بھی دیکھی ہے۔ یا جوڑ ہی منگوائیے گا۔ حضور ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ والد مرحوم کے اکھاڑے میں پیا لہ ہوا، دلّی کے شہزادے بھی تشریف لائے تھے۔ والد مرحوم اپنے شاگردوں کو سکھا رہے تھے اتنے میں ایک شہزادے نے کہہ دیا کہ حضرت پیالہ ہو۔

مصاحب : لاحول ولا قوۃ۔ ارے میاں دِن دہاڑے شراب پیتے تھے۔

ندرت : شراب کیسی آپ بھی بس نرے چونگا ہی رہے پیالے سے یہ مطلب کہ دنٗں دنٗں بنیٗں شاگرد چوٹیں لگائیں، اور استاد بچائیں۔ قبلہ دلگی نہیں ہے۔ بڑے با کمال آدمیوں کا کام ہے۔

بس حضرت اتنا کہنا تھا کہ والد مرحوم نے تیس شاگردوں کو بلایا کون شاگرد! بڑھی ہوئی جوڑیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اب استادی کے کمال کو ملاحظہ فرمائیے کہ تیسٗ گتکے برابر پڑتے ہیں۔ اور تیسوں کی چوٹوں کو والد مرحوم رد کتے ہیں، اور تیسوں پر چوٹ لگاتے ہیں۔ لطف یہ کہ ان کی چوٹیں جسم بھر کو تاک کر آتی ہے اور سب مختلف۔ کوئی تو چاکی کا ہاتھ آتا ہے۔ کوئی سرتا کتا ہے۔ کوئی ہشکٹی کوئی طمانچہ، کوئی کمر، کوئی پالٹ، اور والد مرحوم کی یہ کیفیت کہ ذرا آڑے ہو گئے۔ ذرا ادھر شانہ ہٹا دیا۔ ذرا اُدھر گھوم گئے۔ چوٹیں سب خالی چلی جاتی ہیں اور جہاں وہ جھپٹے پرے کے پرے صاف تھے۔ گتکہ چمکا تو چکا چوند کا عالم تھا۔ آنکھ جھپکی جاتی تھی، اور والد مرحوم اس طرح پھرتے ہیں، جیسے بھوکا شیر کچھار سے نکلے۔ ڈکارتے ہوئے ایک نمک حرام شاگرد نے چاہا کہ پشت پر سے ہاتھ لگائے تا کہ اس کا نام ہو جائے، اور والد مرحوم بھی نصیبِ اعدا کام تمام ہو جائے۔

آزاد : معقول! والد مرحوم بھی اور نصیب اعدا بھی۔ سبحان اللہ۔

ندرت : حضرت (میری محبت پدری) اسی کی مقتضی تھی۔ خیر جناب بس اس کا کترا کر پیچھے جانا تھا کہ والد مرحوم نے وہ تاک کر تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ بھنڈارا تک کھل گیا۔ سبحان اللہ کا چھینٹا لوگوں نے برسا دیا۔

اتنے میں ایک شخص چمکتا، دمکتا، لال لال کاغذ لایا۔ وہ جھلک کہ آنکھ جھپک جائے۔ اِدھر اُدھر بیل اور گل بوٹے بنے ہوئے لاکر نواب صاحب کو دیا۔ اور نواب نام دار نے پڑھنا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پلا ساقیا ایک وحدت کا جام
کہ حمدِ خدا سے زبان کو ہے کام

شراب طہورا کا ہو دور دور
سرور آج ہے دل کا ہے اور طور

وہ شیشہ وہ ساغر وہ پیمانہ ہو
کہ پیتے ہی اِک جوشِ مستانہ ہو

وہ بادہ ہو رشکِ مے سلسبیل
کہ موجد میں جس کے جناب خلیل

نیا نشہ ہو اور نئی ہو امنگ
جو بہکوں بھی ساقی تو ہو طرفہ رنگ

پڑھوں نعمتِ احمد وہ بادہ ملے
کہ سنت ادا ہو بڑھیں ولولے

وہ احمد جو مختون پیدا ہوئے
نبی وہ کہ دل جس پہ شیدا ہوئے

پڑھوں مدحتِ ساقی کوثر آج
کہ سوئے نجف پھر رہا ہے سراج

زبان پر نہ کیوں کر ہو مدح و ثنا
رواجِ مسلمانی ان سے ہوا

مبارک مبارک کی آئی بہار
شگفتہ ہوئے گل ہزاروں ہزار

گلستان میں بلبل کے ہیں چہچہے
کہ محفل میں احباب کے قہقہے

خوشی کا ہے صد شکر دل پر دفور ہے وقت ——— کیا؟

آزاد : دیکھوں۔ ہے وقت (جشن) اگر پڑھیے تو مصرع موزوں ہو کوئی لفظ اتفاق سے رہ گیا ہے۔

حافظ : اور جو شاید شاعر ہی نے غلطی کی ہو۔

آزاد : واہ کلام سے ظاہر ہوتا کہ شاعر ایسی بھونڈی غلطی کرنے والا نہیں۔ ہم جانتے ہیں یہ لفظ (زہے) ہے (ز) کا لکھنا کاتب بھول گیا ہے۔

نواب : ہاں بیشک۔ زہے ہی ہے ورنہ سکتا ہوتا ہے۔ خیر۔

خوشی کا ہے صد شکر دل پر دفور
زہے وقت جشن و نشاط و سرور

جو خورشید مرزا تھے عالی مقام
کہ اظہر من الشمس جن کا ہے نام

حافظ : الغلط۔ اظہر من الشمس صحیح ہے۔ خالی اظہر بروزن اطہر غلط ہے۔

آزاد : اجی سننے دیجیے۔ خواہ مخواہ نکتہ چینی کا کرنا تہذیب کے خلاف ہے:

نواب : جہانگیر مرزا ہیں ان کے پسر
بڑھا نور خورشید سے یہ قمر

مصاحبین : سبحان اللہ یہ شعر جسے کا ہے۔ ع۔ بڑھا نورِ خورشید سے یہ قمر، بہت ہی خوب۔

نواب : انھیں کے ہے ختنہ کی تقریب سعد — یہ جشن و طرب دوپہر کے ہے بعد
جو شوال کی ساتویں ہے سعید — اسی روز یہ عید ہے بعد عید

حافظ : معقول! عید بعد ٹر۔ مگر یہاں خوب نیا ہا ہے۔ شاعر کی تعریف کریں گے ہم۔

آزاد : شکر ہے کہ آپ نے تعریف تو کی۔

نواب : ستمبر کی بس ہو گی پچیسویں — کہ ہے پنجشنبہ کا دن شک نہیں

حافظ : حضرت یہ (بس) کا لفظ رکن ہے۔ اور مصرعۂ ثانی میں (شک نہیں) بھئی برائے وزن بیت ہے۔ خالق باری یاد آگئی۔ ع۔ ستمبر کی ہو وے گی پچیسویں :: یوں ہو تو کیسا۔

آزاد : اس سے بھی بد تر۔ ہو وے گی، اب متروک ہے۔ پرانا سکّہ ٹکسال باہر۔ اب ہوگی بولتے ہیں۔

نواب : محلہ جو ہے گولہ گنج اک یہاں — میاں محترم کا وہاں ہے مکاں
اسی جا ہے منظور بزم طرب — وہیں دن کو تشریف لائیں گے سب
یہ امید ہے آپ بھی آئیے — کرم ہو قدم رنجہ فرمائیے
جہاں میں بڑھے قدر عزّ و وقار — اگر آئیے آپ ہو افتخار

بھئی ضرور چلیں گے۔ ہم سے پرانے مراسم ہیں۔

آزاد : واہ رے لکھنؤ۔ ان چونچلوں کو تو دیکھیے۔ سرخا سرخ ارغوانی کاغذ، جھلکتا، اور چمکتا ہوا، اور روشنائی بھی زرنگار۔ رقعہ تہنیت کیا مرقع ارژنگ ہے۔ کانِ جواہر کے ہم سنگ ہے۔

دوسرے روز نواب کے یہاں جلسہ جما تھا۔ پورب کی طرف سے رونے کی آواز آئی۔ سب کے کان کھڑے ہوئے، کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ رقیق القلب آدمیوں کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ نواب صاحب نے خدمت گاروں کو بلایا، اور حکم دیا کہ فوراً جا کر دیکھو کہ کیا ماجرا ہے۔ اور کون روتا ہے۔

حاضرین : حضور کوئی بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ پٹّس پڑ گئی کہرام مچا ہوا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

نواب : میاں یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ رنج اور غم، اور ملال اور الم، کے سوائے۔ اس میں ہے کیا خاک :

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو — جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

خدمت گار : حضور وہ جوان سے نہیں تھے ؛ گورے گورے۔ وہ مرزا صاحب۔ وہ مرگئے۔
نواب : ایں ! مرگئے ! ہائے افسوس۔ وہ، وہ، وہ، بڑا سخت سانحہ ہوش رُبا ہے۔
روشن علی : (ہاتھ مل کر) خداوند کوئی دو مہینے تو شادی کو ہوئے تھے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی دو مہینے کی دلہن کو سہاگ کے عوض سوگ نصیب ہو۔ ابھی کل کی بات ہے کہ فنس میں سوار ادھر اُدھر چھُو چھُو کہار، بڑے ٹھسّے سے بیاہ کر لائے تھے۔ کل بے چاری دلہن تھی۔ آج بیوہ ہوگئی کل سُرخ لباس پہنے دُلہن بنی تھی۔ آج چشمِ تر سے خون کی ندیاں جاری ہیں۔ کل وہ بیچارہ بنا بنا تھا۔ آج یہ کوہِ الم ٹوٹا۔ کل خلعت زرّیں زیب بر تھا۔ آج کفن پوش ہے۔ کل نبات چنوائی جاتی تھی۔ آج خونابہ نوش ہے۔ کل پشت توسن پر سوار تھے۔ آج چار کے کاندھے پر جاویں گے۔ کل الاعزّا واقربا ہشّاش بشّاش تھے۔ آج اغیار تک کا کلیجہ پاش پاش ہو جائے گا۔ دنیا کے بھی کیا کارخانے ہیں۔ کہیں شادی کہیں غم۔ کل شادی تھی تو آج خانہ بربادی :

زیں جملہ زرفتگانِ ایں راہ دراز   باز آمدہ کو کہ خبر گوید باز
زنہار دریں سراچہ ازروی نیاز   چیزے نگذاری کہ و گرنائی باز

آزاد : اے خواجہ یقین بداں کہ خواہی مردن۔ کردیم خبر۔
جز یک کفن دگر نخواہی بردن، از نعمت وزر
فردا کہ روی ازیں جہاں فانی، اے مردکِ خسر
زن مال ترا بعیش خواہد خوردن باشوے دگر

دیکھیے خداوندا اس چند روزے زندگی کے لیے، حضرت انسان کیا کیا فکریں کرتے ہیں۔ کہ معاذاللہ۔ مکان بنواتے ہیں، تو معمار پر تاکید اکید رہتی ہے کہ ہزار ہی برس کی خبر لائے۔ کپڑے سلواتے ہیں تو میاں خلیفہ کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ کہ ایسا نہ ہو سیون گل جائے، مگر یہ معلوم ہی نہیں کہ مکان چاہے ہزار چھوڑ دس ہزار برس کی خبر لائے۔ لیکن زندگی نقش بر آب ہے۔ زندگانی مثلِ حباب ہے۔ ایک دم کے دم میں خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ کچھ بھروسا ہی نہیں :

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید   ز جامِ دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

اللہ بس باقی ہوس۔ دُنیا خواب وخیال ہے۔ زندگی بھی عجب جنجال ہے۔
آزاد : ارے بھائی۔ اگر انسان یہ فکریں نہ کرے۔ مکان نہ بنوائے۔ کپڑے نہ سلوائے تو

انتظام کائنات میں فرق نہ آجائے۔

یہ گفتگو بعد حسرت و حرماں ہو ہی رہی تھی کہ ایک شیخ صاحب تشریف لائے۔

آداب عرض کرتا ہوں، پیر و مرشد!

بندگی عرض ہے۔ آج ہمارے پڑوس میں بڑا سانحہ ہوگیا۔

(آہ سرد بھر کر) جی ہاں سانحہ کیا قیامت ہی بپا ہوگئی۔ ابھی وہیں سے آتا ہوں ہائے افسوس! دلہن بیوہ ہوگئی۔ ڈیڑھ مہینہ بھی پورا شادی کو نہ ہوا تھا، کہ اس عروسِ چاردہ ساله پر یہ حشر ٹوٹا۔ ایک مہینہ اور سات روز نکاح کو ہوئے۔ نکاح کے گیارھویں دن بیمار ہوئے، طاقت رفتہ رفتہ گھٹتی گئی، نقاہت بڑھتی گئی۔ مرض نے قوت پائی آج صبح ہوتے ہوتے چل بسے۔ اس بے چاری بیوہ کی حالت پر افسوس آتا ہے۔ اے کاش دس بارہ برس شادی کو ہوئے ہوتے تو خیر، اس قدر رنج و غم نہ ہوتا۔ ہائے قیامت تو یہ ہے کہ دس گیارہ دن تک دلہن رہی اور بس؛

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

یہ شخص عرصۂ دراز سے دمے کے عارضے میں مبتلا تھا۔ مگر کبھی جم کر علاج نہ کیا۔ حکیموں نے کہہ دیا تھا کہ تمہارا عارضہ مہلک ہے۔ ڈاکٹروں نے تاکید کردی تھی کہ علاج نہ کروگے تو مر ہی جاؤگے۔ احباب اور اعزّہ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئے! مگر جواں مرگ نے نہ مانا نہ مانا۔ اور سنیے ان کے خسر کو کل حال معلوم تھا۔ ایک دن وہ مرحوم اور اس کے خسر دونوں حکیم صاحب کے ہاں بیٹھے تھے، تو حکیم جی نے کہا کہ بھئی تم اپنی صحت کی فکر نہیں کرتے، یہ عارضہ نہایت سخت اور مہلک ہے۔ جانبر ہونا محال ہے۔ جم کے علاج ہو تو دو چار برس کے عرصہ میں جاتا رہے۔ لیکن ان کو تو اجل کی مہمانی منظور ہی تھی۔ کہا نہ مانا، اور میں نے جو ایک روز سمجھایا کہ میاں کیا غضب کر رہے ہو، تو فرمایا کہ ہم کو حکیم صاحب پر عقیدہ نہیں ہے۔ پوچھا سبب؟ تو بولے کہ ایک روز ہم حکیم صاحب کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے ایک شریف زادہ اپنی ہمشیرہ کو ڈولی پر سوار کرا کے لایا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی تو فرمایا کہ اللہ اکبر اس قدر ورم آگیا ہے۔ اس شریف زادے نے آہستہ سے کہا کہ قبلہ ورم نہیں ہے۔ یہ حاملہ ہے۔ پھر جس کو اس قدر بھی طب میں واقفیت نہیں۔ وہ علاج کیا خاک کرے گا۔ لاکھ لاکھ سمجھایا کہ بھئی اور اطبا بھی تو یہی کہتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی بھی تو یہی رائے ہے۔ مگر وہی جو میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ ان کو اجل کی مہمانی کرنا فرض تھا۔

نواب: افسوس صد افسوس! جوان، خوش رو، خوش خو، خوش گلو، گو دبلا پتلا آدمی تھا، مگر ہم نے آج تک سنا ہی نہیں کہ دمے کے عارضے میں مبتلا ہیں۔

داروغہ : اچھا منظور۔ مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تم لو باون ہمارے۔ سچ کہنا کوئی چالیس کی مٹھائی اس مہینے اور اُس مہینے میں ملا کر آئی ہوگی یا کم۔

حلوائی : اجی، ہجور اب اس بھید سے آپ کو کیا واسطہ۔ آپ کو آم کھانے سے گرج (غرض) ہے یا پیڑ گننے سے، اور سچ سچ یہ ہے کہ کوئی سب ملا کر کے اڑتیس روپیہ کی آئی ہوگی۔ مل وجن (وزن) میں البتہ کتر بیونت کر دیتا ہوں۔ سیر بھر لڈو مانگ بھیجے، ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

داروغہ : اوہ اس کی نہ کہیے۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ یہ دماغ کسے کہ تولنے بیٹھے میاں لکھ لٹ۔ بیوی اُن سے بڑھ کر، ڈنڈی ترازو کون لے بیٹھے۔ چین کرو، دس کے پچاس لو، اور سیر کی تین پاؤ بھیجو مزے ہیں۔ اچھا یہ سو روپیہ گن لو، اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو۔

حلوائی : یہ مول تول ہے۔ سو اور پانچ ہم لیں، اور باکی (باقی)، ہجور کو مبارک (مبارک) رہیں۔ مالے (معاملے) کی بات ہے۔

الغرض داروغہ جی نے حلوائی کو راضی کر لیا۔ اس داروغگی کے صدقے! اڑتیس روپیہ کے ایک سو باون دلوائے، اور بیالیس سے زیادہ ہی زیادہ خود ہضم کیے۔ اے پھٹکار! کور نمک ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ جن رؤسا کے یہاں ایسے ایسے داروغہ اور اہلکار ہوں ان کا خدا ہی حافظ ہے مگر نواب صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ان کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کیا دیا اور کیا لیا۔ اور یار لوگوں نے حلوائی سے بالائی رقم اڑا ہی لی۔ پھر وہ تو شیر مادر ہے۔

اب سُنیے کہ میاں خوجی نے وہ ساری گفتگو سن لی جو داروغہ جی اور حلوائی میں ہوئی۔ جب داروغہ صاحب نے شیودین حلوائی کو ہنسی خوشی رخصت کیا، تو خوجی نے بڑھ کر یوں کہا :

خوجی : اے حضرت آداب عرض ہے۔ کہیے اس میں کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہے یا باون کے باون خود ہی ہضم کر جاؤ گے، اور ڈکار تک نہ لو گے۔ اب ہمارا آپ کا ساجھا نہ ہوگا تو بُری ٹھہرے گی۔

داروغہ : کیں؟ کس سے کہتے ہیں آپ۔ یہ ساجھا کیسا؟ آخر ہم بھی تو سنیں۔ بھنگ تو نہیں پی گئے ہو۔ کہیں۔ یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ ذرا سمجھ بوجھ کر بات زبان سے نکالا کیجیے۔ یہاں بیہودا بکنے والوں کی زبان دست پناہ سے نکال لی جاتی ہے۔ تم ٹکڑگدوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔

خوجی : (کمر کس کر) اوگیدی! قسم خدا کی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے تجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو۔ میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں۔ ذری کسی اور بھروسے نہ بھولیے گا۔ کیا خوب اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے اور پچاس خود اڑائے اور اوپر سے

غُرّاتا ہے مردک۔ بہت داروغگی کے بھر دسے نہ بھولیے گا۔ میں ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچّا چٹھا جڑتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم تمام عمر رئیسوں ہی کی صحبت میں رہے ہیں۔ گھانس نہیں چھیلا کیے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بیس روپیہ ادھر رکھ دیجیے اور بیسوں چہرہ شاہی ہوں۔ بس اسی میں خیر ہے، ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ اب سوچتے کیا ہو۔ ذرا چیں چپڑ کرو تو ابھی ابھی قلعی کھول دوں، یہ اکڑنا وکڑنا سب بھول جائیے، اور یوں تو بیس پر معاملہ ہوتا ہے۔ بولو اب کیا رائے ہے؟ بیس روپیہ سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے؟ پہلے تو بڑے گرم ہوئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کھا ہی جاؤ گے۔ مگر اب موم ہو گئے۔ لے بس اب لائیے لائیے۔ بیس چہرہ شاہی سامنے بسا دیجیے، ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔ ابھی تو کوئی کانوں کان نہ سُنے گا۔ پیچھے البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

داروغہ : واہ ری پھوٹی قسمت۔ آج صبح صبح یوہنی تو اچھی ہوئی تھی اچھے کا مُنھ دیکھ کر اٹھے تھے، مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی۔ خدا جانے یہ ذات شریف کہاں سے سن رہے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ واہ رے ہم، اور واہ ری قسمت۔ کہیے اب باون میں سے آپ کو بس ایک رقم کی رقم نکال دیں، تو ہمارے پاس کیا خاک رہے۔ اور ہاں خوب یاد آیا باون کس مردود کو ملے۔ کُل سینتالیس ہی تو ہمارے ہتّے چڑھے۔ دس تم بھی لو بھئی، (ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر) مان جاؤ استاد۔ ہمیں ضرورت تھی اس سے کہا ورنہ کیا بات تھی۔ اور پھر ہم تم زندہ رہے تو سیکڑوں لوٹیں گے۔ میاں یہ ہاتھ دونوں لوٹنے اور رقم ہی چیرنے کے لیے ہیں یا کچھ اور

خوجی : دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی پندرہ دو۔

الغرض داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپیہ میاں خوجی کی نذر کیے، اور دونوں آدمی جا کر شریک محفل ہوئے تو وہاں نواب کے فرشتہ خان کو بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا وارے نیارے ہوئے۔ وہاں شعر خوانی ہو رہی ہے۔

ندرت : ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نواب : خوب۔ بہت ہی خوب۔ میاں آزاد آپ بھی کچھ فرمائیے۔

آزاد : شکل دکھلا دو بُتِ گلفام کیا ہو کیا نہ ہو
میں چراغ صبح ہوں تا شام کیا ہو کیا نہ ہو

خوجی : گر آبلہ افتاد بپائے طلبت - زنہار مایست
شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پر و بال عنقا گردد

حافظ : عنقا غلط - عنقا بہ فتح عین صحیح ہے۔

نواب : جھک مارتے ہو تم۔ نامعقول جب دیکھو نکتہ چینی ہی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ عنقا کہا تو کیا اور عنقا کہا تو کیا معلوم ہے آپ بڑے فصیح کی دم ہیں۔ خبردار جو آج سے عیب جوئی کی۔

مصاحب : کیا منصب ہیں حضور ان سے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ میاں یہ عیب ہے مانتے ہی نہیں۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو حضرت سے عنقا کے ہجّے بھی نہ کیے جائیں لیکن مشیخت جتانے کو موجود۔

آزاد : ہاں واقعی یہ سخت عیب ہے۔ کل بھی حضرت ان اشعار پر منھ آئے تھے۔

اتنے میں ایک بزاز آیا، اور چوبدار نے آن کر کہا کہ خداوند چھاؤنی کا بزاز آیا ہے، جو ولایتی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا مگر اس وقت موقع نہ تھا۔ میں نے عرض نہ کیا۔

نواب : داروغہ سے کہو مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچہ جڑتے ہو (داروغہ سے) جاؤ بھئی ان کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی دو۔ جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے؟ آیا ہو تو دکھاؤ مگر با با مول کی سند نہیں۔

بزاز : اب کوئی دو ج تک سب کپڑا آجائے گا۔ اور حضور ایسی بات کہتے ہیں بھلا اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی بھی مول تول کی بات کی ہے آج تک۔ اور یوں تو آپ امیر ہیں۔ جو چاہیں کہیں مالک ہیں ہمارے۔

داروغہ : چلو بھئی حساب ہو جائے اٹھو۔

داروغہ اور بزاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کھپریل میں دونوں کے دونوں جا کر بیٹھے۔ تو میاں خوجی بھی رینگتے ہوئے چلے اور دن سے موجود۔ داروغہ نے جو ان کو دیکھا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مُردنی سی چہرے پر چھاگئی۔ چپ، ہوائیاں اڑی ہوئیں، سمجھے کہ یہ خوجا ایک ہی کائیاں ہے۔ دُنیا بھر کا نیاریا ہے۔ اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو مردود نے ہتے ہی پر ٹوک دیا۔ اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پھر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو تو سہی۔ ٹھہر تو جا تو چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔ مگر پھر سوچے کہ۔ ع۔ گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دوں۔ آؤ اس وقت چنیں وچناں کریں پھر سمجھا جائے گا۔

خوجی : داروغہ صاحب سلام۔

داروغہ : آؤ بھائی جان ادھر مونڈھے پر بیٹھو۔ اچھی طرح بھئی حقہ لاؤں آپ کے لیے۔

بزاز صدر بازار کا رہنے والا ایک ہی استاد۔ تاڑ گیا کہ اس کے بیٹھنے سے میرا اور داروغہ کا مطلب خبط ہو جائے گا کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ پہلے تو کچھ دیر داروغہ سے اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوا کی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا کہ میاں صاحب آپ کو یہاں کچھ کام ہے۔

خوجی : تم اپنی کہو لالہ جی ہم سے کیا واسطہ۔

بزاز : تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ چلو۔ اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے۔

خوجی : او گیدی! زبان سنبھال۔ نہیں اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ خون خرابہ ہو جائے گا۔

بزاز : اٹھوں پھر میں۔

خوجی : اٹھ کے تماشا بھی دیکھ لے۔

بزاز : بیدھا ہے کیا۔

خوجی : واللہ جو بے تے کیا تو اتنی قرولیاں۔

قرولیاں کہہ کر خوجی کچھ اور کہتے ہی کو تھے کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منھ دبا دیا، اور ایک چپت جمائی۔ چلیے دونوں گتھ گئے۔ اب داروغہ جی کی سُنیے کہ بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوجی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، اور کمر دبائے ہوئے ہیں، اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھونک رہا ہے، اور داروغہ صاحب گلے پھاڑ پھاڑ کر غل مچائے جاتے ہیں کہ میاں کیوں لڑے مرتے ہو بھئی دھول دھپے کی سند نہیں۔ زبانی ہی داخلہ رہے۔ خوجی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلہ بنے اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ میاں خوجی اور داروغہ صاحب اور بزاز تینوں گتھے پڑے ہیں، تو ایک مصاحب بولے کہ بھئی واللہ اچھی تگڈم ہے۔

اتنے میں بزاز دوڑا ہوا آیا اور نواب صاحب سے فریاد کی کہ ہجور (حضور) ہم آپ کے ہاں تو سستا مال دیتے ہیں، مگر یہ کھوجی (خوجی) حساب کتاب کے بکھت (وقت) نہ ٹلے۔ لاکھ لاکھ کہا کیے کہ بھئی ہم اپنے مال کا بھاؤ تمھارے سامنے نہ بتائیں گے۔ مل انھوں نے ہاری نہ مانی نہ جیتی، اور الٹے پنجے جھاڑ کے چپت کی ٹھہرائی۔ کمجور (کمزور) مار کھانے کی نشانی میں نے وہ گدا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہوں گے۔ داروغہ بھی روتے پیٹتے آئے کہ دہائی ہے، چارپائی کی پٹی توڑ ڈالی۔ خاصدان توڑ ڈالا، اور سیکڑوں ہی صلواتیں سنائیں۔

میاں خوجی ایسے دھپیائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس کچھ نہ پوچھیے نہیں۔ داروغہ نے تو حضرت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بزاز نے تان تان کر لپڑ لگانے شروع کیے۔ خوجی نے دونوں کو گیدی اور مردک خر بنایا، اور بہت کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ لانا میری قرولی، مگر ایک نے بھی سنوائی نہ کی۔ نواب صاحب کو جو خدام باادب نے خبر کی تو بزاز دوڑا آیا اور معاً یہ فقرہ چیست کیا کہ حضور میں تو حساب کرتے آیا تھا مگر جس قیمت پر اس سرکار میں کپڑا فروخت کرتا ہوں اس قیمت پر کسی اور کے ہاتھ تھوڑا ہی بیچتا ہوں خوجی وہاں داروغہ جی کے پاس ڈٹے بیٹھے تھے۔ میں سوچا کہ سب قسم کے کپڑوں کی قیمت سے واقف ہو جائیں گے اور صورت سے آدمی کھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے ڈرنا چاہیے میں نے کہا کہ خوجی صاحب آپ ذرا اس وقت باغ میں ٹہلیے تو ہم حساب کر لیں، پس اس پر آنکھیں نیلی پیلی کر کے لام کاف بکنے لگے۔ نواب کے دل میں یہ بات گھپ گئی۔

خوجی اور داروغہ اور بزاز تینوں کو بلوایا اور اظہار لینے شروع کیے۔

نواب : داروغہ صاحب۔ یہ کیا جھگڑا تھا، بھئی تم تو بیٹھے بیٹھے خوب بینڈ ھے لڑا دیتے ہو۔

داروغہ : حضور یہ خوجی صاحب تو بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر قرولی بھونکتے ہیں اور گیدی تو تکیہ کلام ہے۔ حضرت تا کہ باشد، یہ بے گیدی بنائے نہ چھوڑیں گے۔ اس وقت لالہ بلدیو ہی سے بھڑ پڑے۔ اب میں لاکھ ہاں ہاں کرتا ہوں، سمجھاتا ہوں، وہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی، وہ تو یہ کہیے میں نے بیچ بچاؤ کر دیا، ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بزاز : بڑے بھلے آدمی ہیں۔ وہ تو دروگا (داروغہ) بچیرؤ (بیچارے) نہ آ جائیں تو کپڑے وپڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوجی : نواب روتے کاہے کو ہو۔ جو ہوا سو ہوا۔ آئی گئی بات ہو گئی، اب یہ دکھڑا لے کے کیا بیٹھے ہو۔

نواب : لپاڈگی تو نہیں ہوئی؟

خوجی : نہیں حضور شریفوں میں کہیں ہاتھا پائی ہوتی ہے بھلا۔ ہم نے ان کو للکارا، انھوں نے ہم کو ڈانٹا، مگر کندے تول تول کے دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کچھ دل لگی ہے، اور پھر شریف کہیں پٹ کے آتے ہیں۔

راوی : واہ میاں خوجی! کیوں نہ ہو۔ اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا، مگر نواب کے سامنے جا کر کیا شیخی جتاتے ہیں کہ شریفوں میں کہیں لپاڈگی کی نوبت آتی ہے۔ یہ نہ کہا کہ

دونوں کے دونوں چمٹ گئے اور مارتے مارتے کچومر نکال دیا۔

خیر ادھر تو میاں خوجی نواب کی محفل میں جا کر بیٹھے اور ادھر لالہ بلدیو اور دارو غہ صاحب گئے کہ حساب کریں۔

داروغہ : ہاں بھئی لالہ بتاؤ؟

لالہ : اجی بتائیں کیا جو چاہو دلوا دو۔

داروغہ : پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا آتا کیا ہے؟ سو دو سو، دس بیس پچاس جو ہو کہہ دو۔

لالہ : داروگا جی آج کل کپڑا ابڑا مہنگا ہے۔

داروغہ : لالہ تم نرے گاؤدی ہی رہے۔ اجی ہم کو گراں اور ارزاں سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنے حق سے مطلب ہے تم تو اس طرح کہتے ہو کہ جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ : پھر اب کی سات سو ترپن روپیہ نکالیے۔

داروغہ : سات سو ترپن! بس، ارے میاں! اب کی اتنے دنوں میں بس سات ساڑھے سات ہی سو کی نوبت آئی۔

لالہ : جی ہاں۔ اجی آپ سے تو کچھ پردہ ہی نہیں۔ دو سو اور چھپن روپیہ کا کپڑا آیا ہے، اندر باہر سب ملا کے، مگر پرسوں تو نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کی تو تمھاری کوئی پانچ سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسے موکے (موقع) پر چوکنا گدھا پن ہے، وہ تو پانچ چھ سو بتاتے تھے۔ میرے منھ سے نکل گیا کہ حساب کیے سے معلوم ہو، مل کوئی سات آٹھ سو کا آیا ہوگا۔ تو اب سات سو ترپن ہی رکھیے، اس میں ہمارا اور آپ کا سمجھوتا ہو جائے گا۔

داروغہ : اجی سمجھوتا کیسا۔ ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں، اور ہمارے تمھارے تو باپ دادا کے وقت کے مراسم ہیں، تم تو مثل اپنے عزیزوں کے ہو۔ لے بولو کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے۔ بتاؤ؟

لالہ : بس دو سو چھبیس تو ہم کو ایک دیجیے، اور تین سو اور دیجیے اس کے بعد جو بڑھے وہ آپ کا۔

داروغہ : ٹھہرو میں حساب تو لگا لوں۔ دو اور تین پانچ ہوئے، تو پانسو چھبیس تو تم لو اور وہاں بچا کیا، سات سو ترپن میں سے پانسو چھبیس گئے تو کتنے بچے؟

لالہ : دو سو ستائیس۔

داروغہ : (قہقہہ لگا کر) اچھا بھئی منظور۔ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

لالہ : پھر دلوائیے تو چلیں۔

داروغہ : ابھی لو، گھبراتے کیوں ہو؟

داروغہ نے پانچ سو چھبیس روپیہ بزاز کے حوالے کیے اور دو سو ستائیس تلوہ اڑائے۔ بزاز جانے لگا تھا کہ داروغہ نے پھر پکارا۔

داروغہ : بھئی سنتے ہو! سات سو ترپن روپیہ چھ آنے لکھ لو تاکہ معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے۔

لالہ : (مسکرا کر) بڑے کائیاں ہو دروگا جی۔ اجی دو سو ستائیس روپیہ چھ آنہ کل آپ کا۔

آواز : بلکہ آپ کے باپ کا۔

جیسے ہی داروغہ اور لالہ میں باہم گفتگو ہو چکی، ویسے ہی ایک موکھے میں سے آواز آئی۔ لالہ نے کہا کہ کل آپ کا۔ اور آواز آئی کہ بلکہ آپ کے باپ کا۔ تب تو دونوں چوکتا ہوئے کہ بھئی یہ کون بولا ادھر ادھر دیکھتے ہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ سخت حیرت ہے کہ یا الٰہی یہ کون بولا۔ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں، کہ اتنے پھر آواز آئی (کہو کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہے) تب تو دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اڑ گئے کہ یہ اسرار کیا ہے۔

اب سُنیے کہ جب خوجی نواب نامدار کی بزم عشرت بار میں بیٹھے، تو داروغہ اور بزاز دونوں کو ڈھارس ہوئی کہ اب یہ بلا ٹلی، اور پھر وہ سوچے کہ پٹ پٹا کر اب کس مُنھ سے میاں خوجی یہاں آئیں گے۔ لیکن خوجی ایک ہی بے حیا۔ راستے بھر یہی خیال تھا کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر دارے نیارے کر رہے ہوں گے، تو چپکے سے کسی بہانے اٹھے اور اٹھ کر کھپریل کے پچھواڑے ایک موکھے کی راہ سے سب سنا کیے، جب کل کارروائی ختم ہو گئی تو فرمایا کہ (بلکہ آپ کے باپ کا) خیر، داروغہ اور لالہ نے ان کو ڈھونڈھ نکالا، اور للو پتو کرنے لگے۔

بزاز : ہمارا کسور (قصور) پھر ماف (معاف) کیجیے۔

داروغہ : اجی یہ ایسے آدمی نہیں۔ یہ بے چارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہو گئے۔

خوجی : یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمائیے۔

داروغہ : جو ارشاد ہو۔

خوجی : لاؤ پھر کچھ ادھر بھی۔

داروغہ : جو کہو؟

خوجی : سود لوائیے، پورے ایک سو لیے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر خوب ہماری مرمت کی ہے، اور ہمارے پاس اتفاق سے قرولی نہ تھی۔

داروغہ : یہ تیس روپیہ تو ایک لیجیے، اور یہ دس کا نوٹ۔ بس اور جو امسیٹھ کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھوئیے۔

خوجی : اجی از خرس موئے بس ست۔ لائیے! چالیس کیا کم ہیں۔

بزاز : کھاسی رکم کی رکم ہے (خاصی رقم کی رقم ہے)۔

خوجی : تمھاری بھی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔

داروغہ : (اپنے دل میں) اچھے ملے ہم سمجھے تھے کہ بس ہم ہی ہم ہیں، مگر یہ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔ جب دیکھو ساجھے کو مستعد اچھا پٹیا مارا! مگر اب ان کے دن بھی پورے ہو گئے۔

خیر میاں خوجی اور داروغہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ دیے جا کر محفل عشرت منزل میں بیٹھے گویا دونوں لنگوٹیے یار تھے۔ دانت کاٹی روٹی باہم تھی، مگر داروغہ کا بس چلتا تو خوجی کو کالے پانی ہی بھیج دیتے یا زندہ چنوا دیتے۔ وہاں جو گئے تو نواب صاحب کے فرشتہ خان کو بھی خبر نہیں کہ ہوا کیا، اور کیسے کیسے وارے نیارے یار لوگوں نے کیے، وہاں لطیفے ہو رہے ہیں۔

ندرت : حضور آج ایک شخص نے ہم سے پوچھا کہ اگر دریا میں نہائیں تو رخ کس طرف رکھیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی اگر دانش مند ہو تو اپنے کپڑوں کی طرف رخ رکھو، ورنہ چور نلوہ اٹھا لے جائے گا اور آپ غوطے ہی کھاتے رہ جائیں گے۔

حافظ : پرانا لطیفہ ہے۔

آزاد : ایک حکیم نے کہا ہے کہ جب تک میں مجرد تھا تو بیوی والے گونگے ہو گئے تھے۔ ورنہ مجھے متاہل ہونے کے جھگڑوں اور لڑکے بالوں کے جھنجھٹے سے اطلاع تو دیتے، اور اب جو میں نے خود شادی کر لی، تو مجرد بہرے ہیں۔ میں لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں کہ شادی نہ کرو، وہ میری نصیحت پر عمل ہی نہیں کرتے۔

حافظ : خوب واللہ خوب نصیحت کی، سچ ہے مجرد ہی رہنا اچھا ہے۔ جورو بھونچال لڑکے جنجال۔

نواب : واہ، جس میں آوارگی مزاج میں آ جائے۔ بیوی ہو، لڑکے بالے ہوں۔ لطف ہو۔ مونس و غمخوار ہو۔ راز دار ہو:

شوقہا افزاید از پہلوی تو

اتنے میں گندھی آیا اور آداب بجالایا۔

نواب : داروغہ جی!

داروغہ : خداوند!

نواب : بھئی ان کا بھی فیصلہ کرو۔

داروغہ : چلیے آپ کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی آئیں۔

داروغہ اور گندھی دونوں چلے اور کھپریل میں داخل۔

داروغہ : کتنا عطر آیا؟

گندھی : دیکھیے آپ کے یہاں تو لکھا ہوگا۔

داروغہ : ہاں لکھا تو ہے خدا جانے وہ کاغذ کہاں پڑا ہے۔ تم اپنی یاد سے جو جی میں آئے بتا دو۔

گندھی : ابھی کل ہی تین تولہ حنا، دو تولہ موتیا، پانچ تولہ عطر عروس، اور ڈیرھ تولہ کیوڑا دے گیا ہوں۔ کوئی پینتیس روپیہ کا ہوا۔

داروغہ : اچھا پینتیس ہوئے اور پچھلا حساب۔

گندھی : اسّی ادھر کے بھی ہیں، اور بیگم صاحب نے اب کی عطر کی بھرمار ہی کر دی، عطر، عطر مہری کھڑی ہے کہ عطر لاؤ۔ عطر لاؤ، قرابے کے قرابے خالی کر دیے۔

داروغہ : اچھا بھئی پھر اس میں کسی کے باپ کا کیا اجارہ ہے۔ شوقین ہیں۔ مخیر ہیں۔ رئیس زادی ہیں۔ امیر ہیں۔ نفیس مزاج ہیں۔ باسلیقہ ہیں۔ عطر انھیں کے لیے ہے یا ہمارے آپ کے لیے۔ اچھا تو اسّی اور پینتیس کتنے ہوئے ایک سو پندرہ ہوئے نا؟

گندھی : بس ڈیرھ سو دلوایئے۔

داروغہ : اچھا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ لو سو یہ ہیں اور تیس کے تین نوٹ دس دس کے۔

گندھی : اچھا لیجیے یہ عطر کی شیشی آپ کے لیے لایا ہوں۔

داروغہ : کس چیز کا ہے۔

گندھی : سونگھیے تو معلوم ہو، خدا جانتا ہے دس دس روپیہ تولہ خریدا ہے لوگوں نے اور جھڑا جھڑ رامپور اور حیدرآباد اور ٹونک اور مرشدآباد اور خیرپور سے فرمائشیں آ رہی ہیں۔

میاں گندھی تو اُدھر روانہ باشد۔ ادھر داروغہ جی خوش خوش نواب صاحب کے پاس

جانے لگے تو آواز آئی کہ (استاد اس شیشی میں یاروں کا بھی حصّہ ہے) پیچھے پھر کے دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی سوا بالشت کا قد شریف جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

داروغہ: یار تم نے تو بے طور پیچھا کیا۔

خوجی: اب کی تو تم کو بیس ہی روپیہ ملے، اس میں کچھ نہ لیں گے وہ رقم ہی کیا ہے۔ مگر اس دس روپیہ والے عطر میں سے آدھی شیشی ملے۔

داروغہ: خیر دیں گے اور ضرور دیں گے۔ آپ سے تو کوئی ہی دبی ہے۔

داروغہ جی اور خوجی نواب صاحب کی محفل میں پھر شریک ہوئے تو دیکھا وہاں شعر خوانی ہو رہی ہے۔

آزاد: شب زگرمی ہائے اشک دشت پیما سوختم
چوں چراغِ ناخدا بر روئے دریا سوختم

ندرت: اشک کی نسبت یہ شعر بھی سننے کے قابل ہے:

اشکم بروں می افگند راز دروں پردہ را — آرے شکلہ تنہا بود از خانہ بیروں رفتہ را

نواب: ارے کیا خوب۔

حافظ: لغو لچر خرافات۔ اشک کے حال کا شعر ہم سے سنیئے:

نشستم تا کمر در خوں ز اشکِ لالہ گونِ خود — تو چوں دشمن شدی من ہم کمر بستم بخونِ خود
داد شہرت اشک من آخر بسودائی مرا — کہ در سوا جا بجا ایں طفل ہر جائی مرا
ایں اشکِ جگر گوں چہ اثر داشتہ باشد — پیدا است کہ طفلی چہ جگر داشتہ باشد

ندرت: یہ اشک کو شعرا نے طِفل کیوں باندھا ہے بھئی؟

اے طفلِ طفلِ اشک مرا بر زمیں مزن — پرورده ام بخونِ جگر ایں یتیم را

نواب: بعد ازیں نامہ مگر بر پر ماہی بندم
کہ رہِ شوقِ تو غرقاب شد از گریۂ ما

حاضرین: اے سبحان اللہ! واہ کیا فکر ہے۔ ذہن کی رسائی اسی کے معنی ہیں۔ سبحان اللہ!

راوی: نواب صاحب کی زبان مبارک سے شعر سنیں اور رفقا خاموش ہو رہیں۔ کیا مجال۔ ممکن ہی نہیں۔ سبحان اللہ کا دونگڑا برس گیا۔ بارک اللہ کی گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ خیر صاحب نواب نامدار اتنے ہوئے تو کہ شعر و سخن کی طرف مخاطب ہونے لگے۔

اتنے میں لالہ جواہر مل آئے۔ آئیے جناب آئیے!

نواب : آج تو عرصۂ دراز کے بعد زیارت ہوئی۔ کہاں رہتے ہو؟ بھئی ہوا تو نہیں لگی کہیں؟ نہیں بھئی ہے تو کچھ ایسا ہی یار، کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔

مہاجن : جی نہیں ہوا تو رئیسوں کو لگتی ہے، یا بعض بگڑے ہوئے امیروں کو۔ ہم پرانی چال کے لوگ ہیں۔ میں ان دنوں پراگ میں گیا تھا۔

حافظ : اے سبحان اللہ! پراگ کے لیے کیا خوب موزوں لفظ ہے۔ لالہ جواہر مل صاحب بڑے جگت باز آدمی ہیں۔

خوجی : افیم کی پینک سے چونک کر۔ ۔

زیرِ مژگاں اشکِ گرم جوشِ دریا میزند　　　آبِ زیرِ کاہِ باشد آتش خس پوش ما

نواب : ایں! معقول! آپ کے نزدیک ابھی تک اشک کی تعریف کے شعر ہی یہاں پڑھے جا رہے ہیں۔

آزاد : بہت جلد چونکے۔

مصاحب : (قہقہہ لگا کر) خداوند! میں تو مارے ہنسی کے لوٹ رہا ہوں۔ اُف فوہ!

رفیق : کیا جلدی خبر ہوئے ہیں، تو جہ کیا۔ پینک میں تھے۔ حضرت کی آنکھ کھلی تو سمجھے ابھی تک اشک کی تعریف میں تمام لوگ شعر خوانی کر رہے ہیں۔ خود بدولت نے بھی ایک ہانک لگائی واہ رے افیم، خدا جانتا ہے پینک میں جو مزہ ہے وہ کسی بات میں نہیں۔

مہاجن : حساب کرنے آئے تھے۔

نواب : تو گھبرائے کیوں جاتے ہو، کچھ ہمارا ہی فاضل ہوگا بھئی! تمہارا ہماری طرف ایک کچّا نہ نکلے گا۔

مہاجن : نہیں گھبرانے کی بات چیت کیا ہے بھلا، جو حکم ہو منظور، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں،

داروغہ : ارے بھئی کچھ چوروں سے بیوار تھوڑا ہی ہے۔

مہاجن : نہیں لاحول بلاکوت (قوۃ)

راوی : یہ لاحول ولاقوۃ کی خرابی ہے چھاٹیں گے فارسی ہی۔

سرا میں خوجی پر بے بھاؤ کی پڑیں اور بوا زعفران پنجے جھاڑ کے لڑیں

ایک دن پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کی ناک میں دم کر دیا۔ بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی لیا۔ اب وہ ادھر سے کروٹ لیتے ہیں تو انھوں نے اُدھر سے جسم چھلنی کر دیا۔ اور اس طرف پھرے تو اُس طرف خون کے فوارے بہنے لگے۔ حضرت بہت ہی جھلّائے۔ افیمی آدمی چار پہر آنکھوں میں رات کٹی۔ پچھلے سے ذرا آنکھ لگنے کو تھی ہی کہ کھٹملوں کا خدا بھلا کرے، انھوں نے انگرکھا لہو لہان کر دیا۔ ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرات نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا۔ اور انھوں نے پینک سے چونکتے ہی غل مچایا کہ دلانا میرا قرابینچہ! یہ ہانک جو انھوں نے لگائی تو آس پاس والوں کی نیند حرام ہو گئی۔ معاً چور کا گماں ہوا۔ لینا لینا جانے نہ پائے۔ چور۔ چور۔ چور، ارے میاں کہاں؟ کدھر کس رخ، لینا پکڑ لیا ہے۔ دیکھو گانسے رہنا۔ کھدیرو، خوب کھدیرو۔ بھئی مسافرو ہشیار۔ اپنے اپنے مال کی حفاظت کرو۔ اب سرا بھر میں ہلڑ مچا ہوا ہے، ٹرپونگ کا عالم۔ کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے، کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کے اپنی گٹھری کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے دبکا پڑا ہے، منکتا تک نہیں۔ میاں خوجی نے جو لینا لینا، جانے نہ پائے، چور، چور کی آواز سُنی تو خود بھی غل مچانا شروع کیا کہ ہائیں! ہائیں! خبردار جانے نہ پائے۔ لانا میری قرولی۔ او چور! او گیدی! ٹھہرا رہنا کہ میں بھی قرولی لے کر آن۔ پہنچا۔ یہ خبر ہی نہیں میاں کو کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ٹھہرا رہنا میں بھی قرولی لے کر آن پہنچا۔ دیکھیے دیکھیے آپ اپنی ڈاڑھی کی طرف دیکھیے! غصّے کو تھوک دیجیے قد تو حضور کا ماشاءاللہ پون انچ کا، اور خم ودم یہ کہ قرولی لے کر آن پہنچے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو قرولی کی حضرت نے کبھی عمر بھر صورت بھی نہ دیکھی ہوگی، مگر بات بات پر قرولی اور قرابینچے کی فکر رہتی ہے۔ کوئی اس مسخرے سے اتنا تو پوچھے کہ اب قرابینچے کا فشن کہاں۔ شیر بچہ باندھے آپ نے کس کو دیکھا ہے۔ قرولی کس کی کمر میں نظر آئی، مگر ان کو تو بک دینے سے مطلب ہے۔ خیر۔

میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کھٹ سے اٹھ ہی کھڑے ہوئے اور لپک پڑے۔ اب آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں کہ لینا، لینا، لینا، ایں! معقول! لینے کے عوض کہیں دینے نہ پڑ جائیں۔ لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا، اور فرمایا: کہ تو ہی چور ہے۔ بھلا بے بھلا پکڑ لیا حریف کو، بھٹیاری نے کہا میاں کچھ خیر ہے؟ ہوش کی باتیں کرو۔ اتنے میں آپ نے

دوڑنا شروع کیا۔ پینک ہیں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اڑا اڑا دھوں۔ میاں خوجی اپنے شامت اعمال سے گرے بھی تو کہاں، جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہو گئے۔ کمہار نے للکارا کہ چور چور! یہ اٹھنے کو تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا، اور پکارنا شروع کیا کہ ارے دوڑو چور پکڑ لیوں۔ مسافر اور بھٹیارے اور بھٹیاریاں اور حوالی موالی سب کے سب دوڑ پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے۔ کوئی بید گھماتا ہے، کوئی لکڑی ہلاتا ہے، مگر افسوس ہے کہ میاں خوجی کے پاس قرولی نہ قرابنچہ اندھیری رات، گھٹا ٹوپ اندھیرا، چوطرفہ چھایا ہوا۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی بگڑے دل آدمیوں کو شکار ہاتھ آیا۔ خوب بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زناٹے کے ہاتھ لگائے۔ اب خوجی کی سٹی پٹی بھولی۔ نہ قرابنچہ یاد رہا نہ قرولی جب خوب پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا کہ بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ تو خوجی ہیں، جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوتے ہیں۔ چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرہ صدی کے بالشتیے میاں خوجی ہی ہیں۔ کمہار کو لوگوں نے للکارا کہ چھوڑ دے بے یہ چور نہیں ہیں۔ چھوڑ دے ہنڈول کے دام ہم دے دیں گے۔

الغرض بعد خرابی بصوہ، میاں خوجی کی جان بچائی، مگر کب؟ جب کچومر نکل گیا۔ انجر پنجر الگ ہو گئے۔ جب یاران سرپل نے چپت گاہ کو خوب سہلا دیا۔ تو میاں خوجی چلے۔ میاں آزاد سے بھی کسی نے آن کر کہہ دیا تھا کہ تمھارے ساتھی خوجی چوری کی علت میں پھنسے ہیں۔ کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی۔ سو اس نے پکڑ لیا۔ دوسرے نے آن کر کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک کمہار کی ہنڈیاں چراتے گئے مل جاگ ہو گئی۔ بھئی واہ جتنے منھ اتنی ہی زبانیں، اور اتنی ہی باتیں، اسی دم کی بات اور مختلف روایتیں مشہور ہو گئیں۔

میاں آزاد کو بڑا ہی برا معلوم ہوا کہ ہمارا ساتھی، اور چوری کی علت میں ماخوذ ہو، مگر یہ بات کچھ ان کو جچی نہیں۔ سوچے کہ خوجی ایسے آدمی میں نہیں۔ وہ چوری چکاری کیا جانیں۔ وہ تو بس فقرہ بازی ہی خوب جانتے ہیں، اور بھلا چوری چکاری بھی کرتے تو ہنڈیوں کی۔ خیر، انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ چلیں اور خوجی کو نلوہ بچالائیں۔ ورنہ آزاد نہیں۔ چارپائی سے اترے اور ہانڈی ہاتھ میں لی کہ جو بولے گا اس کو فرا چکھاؤں گا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی صاحب جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں، اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ ہات ترے گیدی کی بڑا آزاد بنا ہے۔

ایسے آزاد بہت دیکھے ہیں۔ مردود چارپائی پر پڑا خرخر کیا کیا، اور ہماری خبر ہی نہیں۔ اب بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی تک چلے آئے۔ مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔ اتنا بھی نہ سوچھا کہ آزاد کھڑے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے یوں کہا۔

آزاد : خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا، اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے۔؟

خوجی : ہاتھ پاؤں! ہونھ۔ یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندۂ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے، پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے، پورے پچاس۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

راوی : درست۔ اس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گننے بیٹھتے۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ پڑیں کتنی؟ آدمی بھی مکھی کے جوڑ ہوتے کہ غول میں چھپاک سے گن لیے مارے چپتوں کے بولا تو گئے تھے۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ جھاڑ پونچھ کر پھر موجود۔

خوجی : واللہ میں اس وقت پھلجھڑی بنا تھا۔

راوی : اے صلّی علیٰ۔ واللہ آپ آدمی کیا دمڑی کے پٹے باز ہیں۔ زبان البتہ پھلجھڑی کو بھی مات کرتی ہے۔

خوجی : بس یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اس شانے کو، اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے، اور میں جو پھرا تو کسی کو اَنٹی دی، دھم سے زمین پر گرا۔ کسی کو کولے پر لاد کر مارا کھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر۔ دو چار میرے رعب میں آکر تھرتھرا کے گر ہی تو پڑے دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔ یہ ڈھیلکی کھائی وہ ہو رہا۔ اِدھر نکلا اُدھر اُبھرا۔ گھس پیٹھ میں تو پھر آپ جانیے ایں جانب برق دم ہیں ہی۔ جو سامنے آیا اسے نیچا دکھایا۔ جو منہ چڑھا منہ کی کھائی۔

راوی : اور ایک صاحب آپ کے رعب میں آکر کمہار کے ہنڈوں پر بھی تو گر پڑے تھے۔ واہ رے بٹوٹیے تیری بھی آج دھوم ہے۔

خوجی : خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ دار آدمی دکھا تو دیجیے۔

راوی : حضرت خدائی بھر کا حال۔ تو خدا ہی کو خوب معلوم ہے، مگر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا بے غیرت جوتی خورا، سرا بھر میں تو اس سرے سے اُس سرے تک کوئی ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس ڈینگ پر پھٹکار۔ اے لعنت خدا۔

خیر میاں آزاد اور خوجی دونوں اس وقت سو رہے، اور دوسرے روز شام کو نواب صاحب

کے ہاں پہنچے۔

آزاد : پیر و مرشد! رخصت ہونے آیا ہوں۔ زندگی ہے تو پھر ملوں گا ورنہ یہ آخری الوداع ہے۔

نواب : کیا کوچ کی تیاریاں کر ہی دیں۔ بھئی جب واپس آؤ گے تو ملاقات ضرور کرنا، بھول نہ جانا۔

آزاد : بھلا یہ آپ کے فرمانے کی بات ہے۔

خوجی : غلام بھی رخصت ہوتا ہے۔

نواب : آپ تو واللہ بڑے ہنسوڑے آدمی ہیں کہیے اب بشرطِ خیریت کبھی ملیے گا بھی۔

خوجی : خدا لائے گا تو ضرور آؤں گا حضور!

داروغہ : میاں خدا کرے سب کے پہلے انھیں پر گولی پڑے۔ بلکہ گولہ اور وہ بھی بم کا گولہ اب خدا اس منحوس کی صورت نہ دکھائے اور نہ اس مروک کو یہاں لائے۔

الغرض آزاد اور خوجی نواب صاحب سے رخصت ہوئے۔

نواب : فی امان اللہ خدا۔ بخیریت پہنچائے اور واپس لائے۔

خوجی : داروغہ جی خدا حافظ!

داروغہ نے کہا میاں آزاد کو امام ضامن اور خوجی کو شیطان کو سونپا۔ آزاد اور خوجی رخصت ہوئے، تو پھاٹک سے باہر نکل کر میاں خوجی نے کہا بھئی، ذرا ٹھہرے رہنا میں ابھی ابھی آیا۔ آپ کو جو وحشت نے گھیرا تو پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر۔

خوجی : (دربان سے) یار ہے ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے۔

دربان تھا گنوار کا لٹھ گوکھا آدمی اس نے ان کو تپائی دی کہ آپ بیٹھیے۔ یہ بیٹھے تو پینک میں سر یہ چلا وہ چلا۔ اب کوئی دم کے دم میں زمین دوز ہوا ہی چاہتا ہے کہ اتنے میں دربان نے آواز دی کہ بوا زعفران! بوا زعفران! اجی بوا زعفران۔ اے بوا زعفران۔ بوا زعفران بولیں۔ اے ہے تو کچھ کہو گے بھی یا بوا زعفران ہی پکارتے جاؤ گے دماغ کے کیڑے تک چاٹ گئے۔

دربان : اجی آپ کے لڑکے وہ۔ توبہ۔ تمھارے میاں آتے ہیں۔

دربان بے وقوف نے پہلے (لڑکے) کہہ کر میاں کا لفظ جو کہا تو گھر بھر کی عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں، اور بیگم صاحب ہنستے ہنستے بولیں کہ اچھے گنوار کو ڈیوڑھی پر بٹھایا ہے۔ اس نے پھر غل مچایا کہ اجی بوا جی آئیے دیکھیے تو ان کا حال کیا ہے۔ ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔

ابھی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ بوا زعفران سے اور ان کے میاں سے لاگ ڈانٹ تھی وہ جو گھبرائی ہوئی اندر سے آئی تو ان کو دیکھا کہ تپائی پر بیٹھے پینک میں جھوم رہے ہیں۔

اب یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ بوا زعفران کے میاں کی بھی بعینہٖ یہی قطع مبارک تھی۔ خوجی سے بالکل مشابہ۔ ذرا فرق نہیں۔ وہی سوا بالشت کا قد، وہی دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں اور طرّہ یہ کہ افیون بھی پیتے تھے۔ اور زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی کہ تم افیم کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں دم بھر نہیں بنتی تھی۔ آخر کار ایک روز اس کے میاں نے کہا کہ اچھا آج سے اگر ہم کو پینک میں دیکھو تو گن کر پانچ سو جوتے لگاؤ، اور جو بھول جاؤ تو پھر سرے سے گنو۔ زعفران نے جو باہر آکر دیکھا تو حضرت موجیں لے رہے ہیں۔ جل بھن کے خاک ہی تو ہوگئی۔ اور جاتے ہی میاں خوجی کے پٹے پکڑ کر ایک ایک دو تین چار پانچ دھپیں تڑ تڑ تڑ لگا ہی تو دیں۔ خوجی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ مار کے آگے بھوت ناچے۔ چونک کر فرماتے ہیں کیا۔

خوجی : لانا تو ولایتی قرولی۔ ارے ان سرائے والوں نے تو ہماری کھوپڑی پلپلی کر دی۔

راوی : یہ خوش ابھی اپنے نزدیک آپ سرا ہی میں رونق افروز ہیں۔ واہ ری افیم۔ یہ جو نہ کرے وہ تھوڑا ہے۔ بوا زعفران نے ایک دفعہ ہی کچ کچا کر چکت دی، تو حضرت کی روح پر صدمہ ہوا، اور ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ مگر وہ حبش دیوتی نواب کے یہاں رقمیں کھا کھا کر ہتنی بنی پھرتی تھی۔ یہ بے چارے سوا بالشت کے آدمی، اس نے ان کو چُرمُر کر ڈالا۔ مگر یہ قرولی ہی مانگا کیے۔

اتنے میں غُل غباڑے اور دھڑ پکڑ کی آواز جو بلند ہوئی تو اصیلیں، مغلانیاں، ماما چھو چھو لونڈیاں سب باہر نکل آئیں۔ اور بیگم صاحب اور عصمت النسا بیگم اور گیتی آرا بیگم سب کے سب پردے کے پاس دوڑیں کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔

بیگم صاحب : بوا زعفران۔ آخر شِ یہ ہے کیا۔ روئی کی طرح اس بے چارے کو توم کے دھر دیا۔ واہ۔

عصمت النسا بیگم : اوئی نوج ایسی جورو کسی کی ہو، ہاتھ ہی ٹوٹیں مردار کے، ادھ مرا ہی کر ڈالا۔ شیخ سدّو تو نہیں سر پر سوار ہے۔ وہ موا تو آپ ہی زندگی سے بیزار رہے۔ اس نے اور اوپر سے دو چار لاتیں لگا دیں۔

مغلانی : حضور زعفران کا قصور نہیں، یہ اس مردوے کا قصور ہے جو جُرد ا کے ہاتھ بک

گیا ہے۔ (خوجی کا کان پکڑ کر کہا پھٹے سے مُنھ جُروا کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتے ہو، اور ذرا چوں نہیں کرتے)۔

خوجی : جُروا! ہائے افسوس۔ اجی یہ جورو کس مروک کی ہیں۔ خدا خدا کرو۔ بھلا میں اس ہڑونگی دیو کی بچی، کالی کلوٹی ڈائن، کے ساتھ بیاہ کرتا۔ اس کو اس وقت سوجھی کیا کہ مار کے بھرکس نکال دیا۔ اور دانت کٹکٹا کر بوٹیاں تک نوچ ڈالیں۔ یہ ہے کون بلا۔ میرے تو حواس برجا نہیں۔

بواز عفران جو یہ باتیں سُنیں تو وہ آواز ہی نہیں، وہ لب و لہجہ ہی نہیں۔ غور کر کے دیکھتی ہے تو میاں دیاں کوئی نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں،، چہرہ زرد ہو گیا، اور دانتوں کے تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہی۔

مغلانی : اے ہاں یہ ہے کون۔ چمپا کے ابا نہیں ہیں۔

عباسی : (ہنس کر) اے واہ بواز عفران۔ اب تو راہ چلتوں کو بھی میاں بنانے لگیں۔ ذری پہچانو تو یہ ہیں کون؟

فرخندہ : اوئی یہ تو بے چارے نواب صاحب کے یہاں دن رات پنے رہتے تھے۔ یہ یہاں کیسے آئے؟ اے زعفران آخرش تم کو سوجھی کیا۔ ذری مشال (مشعل) جلا کر دیکھو تو چمپا کے ابا یہی ہیں۔

بیگم صاحب نے بھی خوب ہی لے دے کی اور اصیلوں مغلانیوں نے تھڑی تھڑی کہہ کر بواز عفران کو رلا ہی چھوڑا۔ اور بھی چور بن گئی کہ ناحق ایک بے چارے کی آبرو کی آبرو لی اور کھوپڑی کی کھوپڑی گنجی کر ڈالی۔ اتنے میں نواب صاحب سے کسی نے جا کر ساری داستان کہہ دی اور محفل بھر میں حاضرین جلسہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ کہ بھئی واللہ یہ نئی روایت ہے۔ اس پر میاں ندرت بولے کہ بھئی ان کو یہاں تک تو لاؤ دیکھیں تو ہیں کون بزرگ مغد منگار پہنچے، اور میاں خوجی کو لے آئے۔

حاضرین : ایں! ارے میاں یہ تو خوجی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

ہنسی کے سمند پر ایک اور تازیانہ ہوا، اور کُل حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ اب ادھر نواب صاحب اور ان کے مصاحب تو قہقہہ لگاتے ہیں، اُدھر گھر سے قہ قہ کی صدائیں بلند ہیں۔ اور خوجی اپنے دل میں خفیف کہ یکے نقصان مایہ، و دیگر شماتت ہمسایہ۔ ایک تو خوب پٹے دوسرے اب۔ ع۔ لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ نواب نے زعفران کو اندر سے بلوایا۔ مگر

خدمت گار نے کہا کہ حضور وہ تو نہیں آتیں پردے کے پاس کھڑی رو رہی ہیں۔

خوجی : اس مکر کو دیکھیے گا حضور۔ رونا ہم کو چاہیے۔ الٹا وہ رو رہی ہیں۔

ندرت : بھئی تم کو میاں بنایا۔ رونے سے بھی گئی گذری۔

نواب : زعفران کی سزا ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ خوجی کو دے دی جائیں۔

خوجی : بس غلام کے حال پر رحم کیجیے۔ معاف فرمائیں مجھے! بندہ درگذرا۔ غضب خدا کا اس دیو کی بچی کے ساتھ اور میں شادی کروں خدا بچائے! خدا ہر آفت سے محفوظ رکھے، میاں کے دھوکے میں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے اور جو کہیں سچ مچ میاں ہی ہوتے تو معاذاللہ چٹنی ہی کر ڈالتی۔ کیا کہیے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ نوابی ہوتی تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوتیں، کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتی۔ یہاں کوئی ایسے ویسے نہیں۔ گھانس نہیں۔ کھودا کیے ہیں۔ چکلہ داریاں، کمیدانیاں رسالداریاں، کیا کیے ہیں۔

راوی : اے صل علی، بیشک حضور نے کمیدانی بھی کی اور چکلہ دار بھی تھے۔ وگلے والی پلٹن کے رسالدار آپ ہی تھے۔ مگر بوا زعفران نے رسالداری وسالداری سب خاک میں ملا دی ایک نہ چلی۔

نواب : اور وہ آپ کے ساتھی میاں آزاد کہاں ہیں۔

خوجی : پھاٹک کے اس طرف پل پر بیٹھے تھے۔

ندرت : میاں دیکھو پھاٹک سے نکل کر پل پر میاں آزاد بیٹھے ہیں۔ ان کو ذرا لپک کر بلا لانا۔

میاں آزاد آئے تو روشن علی نے ان کو ساری داستان سنائی اور آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

آزاد : کہیے قرولی اس وقت نہ یاد آئی۔

دربان : جی ہاں قرولی تو یاد آئی تھی، اور بڑا غل غپاڑا مچایا تھا، اور سرا کا نام لیتے تھے کہ، سرا والوں نے تو کھوپڑی پلپلی کر دی۔ جب آنکھ کھلی اور بوا زعفران کو دیکھا تو نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے اس دھوکے میں کہ اس کے میاں ہیں۔ بڑی بری گت بنائی۔ پھر محل بھر میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا، اور مصاحب مارے ہنسی کے لوٹنے لگے۔

آزاد : آخر یہ وہاں کیا کرنے گئے تھے۔

داروغہ : (کھپریل سے دوڑتے ہوئے آئے) کیا ہوا بھئی کیا ہوا۔ خیر باشد کس پر پڑیں تڑاتڑ۔

نواب : آپ کے دوست میاں خوجی پر۔

داروغہ اور میاں خوجی میں تو لاگ ڈانٹ تھی ہی انھوں نے جو یہ خبر سنی تو بہت ہی خوش ہوئے۔ اور باآواز بلند کہہ اٹھے کہ یہ خوجا اسی لائق ہے میں بھی بہت خوش ہوا۔

روشن علی : اجی سینے تو لوٹنے لگیے۔ حضرت ڈیوڑھی پر پہنچے تو تپائی پر اونگھ گئے۔ دربان سمجھا کہ بوازعفران کے میاں ہیں۔ اس نے آواز دی کہ بوازعفران تمھارے میاں آئے ہیں۔ اس نے باہر آکر دیکھا تو پلنگ ہیں، اور اس کو افیم سے تھی نفرت۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ پٹے پکڑ کر خوب تڑا تڑ لگائیں، آپ اس سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ میں تیرا میاں نہیں ہوں۔

داروغہ : (بہت خوش ہوکر) سزا۔ اس گیدی خرکی، سزا (کان میں جھک کر) کیوں بچہ چھپائے گئے نہ۔ اور عطر مانگو۔

الغرض بڑی دیر تک اندر باہر دونوں جگہ قہقہے پر قہقہے پڑے اور آخر کار میاں آزاد اور خوجی از سر نو نواب اور حاضرین جلسہ سے رخصت ہوئے اور چلے۔ اثنائے راہ میں میاں آزاد مارے ہنسی کے بیتاب ہو ہو گئے۔ اور ایک بار خواجہ صاحب فرماتے کیا ہیں کہ میں نے بھی وہ وہ چٹکیاں لی ہیں کہ زعفران بھی یاد ہی کرتی ہوں گی۔

راوی : ذرا ادھر تو چار آنکھیں کیجیے۔ اے پھٹکار ستی پٹی تو بھولی ہوئی تھی، مگر اکڑنا نہ چھوڑا۔ واہ رے حیادار۔

آزاد : میاں ڈوب مر جا کر۔ ایک چلو پانی کافی ہے۔ لاحول ولا قوۃ ایک عورت سے ہاتھا پائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی : جی وہ عورت سو مرد کے برابر ہے۔ چمٹ پڑے تو آپ کے حواس بھی فقرو ہو جائیں۔

جہاز پر سوار ہونے کے شرائط سخت منجانب خواجہ صاحب سیر بخت

میاں آزاد اور خوجی سرا پہنچ کر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گوشت اور روٹی اور باقرخانی اور کباب کی فکریں ہونے لگیں اور لدھیانہ کے اسٹیشن پر چلے۔

خوجی : یا خدا بچائیو!

آزاد : ایں؟ خیر باشد کیا شیطان نے انگلی دکھائی، یا بوازعفران یاد آئی۔

خوجی : اجی حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ چلتے کہاں ہیں۔ اُف میدانِ جنگ میں گولیوں، اور چھرّوں کے منھ میں خدا ہی خیر کرے۔ یار ایک چنے کے برابر گولی میں تو کام تمام ہو جائے گا۔

بھائی کہا مانو۔ حسن آرا سے درگذرو، اور زینت النسا کے ساتھ نکاح پڑھوالو۔

آزاد : بہت خوب ہے بس اب زیادہ بک بک نہ کیجیے۔

خوجی : حضرت سنیے! چلنے کو تو ہم چلتے ہیں، مگر اتنی شرطیں قبول کیجیے تو بسم اللہ ورنہ۔ ع۔ بندہ رخصت می شود اللہ نگہبانِ شماست۔ کہیے تو کہہ چلوں۔ ایک ایک شرط ماننی ہوگی، ورنہ آپ اپنی راہ لیں، میں اپنا راستہ لوں۔

شرط اول : قرولی ہم کو ضرور دے دیجیے، اور ایک قرابنچہ بھی ہمارے پاس رہے۔ چلے ہیں تو مورچے پر آپ اور ایک پھول کی چھڑی تک پاس نہیں۔

دوم : برس بھر کے صرف کے لیے افیم این جانب کو دیجیے میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی۔ اور بے موت انتا غفیل ہو جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کی عادی ہی نہیں، مگر بندۂ درگاہ بے افیم پیے ایک قدم نہ چلیں گے۔ وہاں پردیس میں افیم ملے نہ ملے کہاں ڈھونڈھتے پھریں گے۔

سوم : اتنا بتا دیجیے کہ وہاں بوازعفران کی سی ڈنڈ پیل، پنجہ کش دیونیاں تو نظر نہ آئیں گی۔ ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے خدا حافظ! اُف فوہ! واللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں۔ اور کیا تان تان کے مکّے بازی کی ہے کہ پلیتھین ہی نکال ڈالا روح پر صدمہ ہے واللہ روح پر۔

چہارم : سرا میں ہم اب تمام عمر نہ اتریں گے۔ اور جو جہاز پر کمہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ اجی اتفاق ہے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم۔ کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کمہار انجر پنجر ہی الگ کر دے گا۔ لہٰذا کمہاروں کی صحبت آج سے القط۔

پنجم : جس رئیس کے صحبت میں بزاز آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے۔ نہ جائیں گے۔ اس لیں لالہ نین سکھ ہوں، یا لالہ بلدیو۔ اجی بزاز تو ٹھہرے زمین کے گز سب کہیں گھوما چاہیں۔ مگر ہم بہت دیکھ بھال کر جائیں گے۔

ششم : جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کانجی ہوس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانجی ہوس پہنچائے۔ ذرا یہ دریافت کر لیجیے گا۔

ہفتم : ٹٹو پر ہم سوار نہ ہوں گے اس میں چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

ہشتم : میٹھے پلاؤ روز پکیں۔

نہم : ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجیے۔ یہ خوجی کیا معنی؟

دہم : مورچے پر ہم نہ جائیں گے۔ بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے تعلق رہے اور لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے۔
یازدہم : حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعائے خیر۔
دوازدہم : گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔
سیزدہم : جو ہم خدا نخواستہ داخل خلد بریں ہوں تو لاش کو ہندوستان میں پہنچوانا، اور جہاں والد بزرگوار کی لاش دفن ہے، وہاں ہی دفنانا۔ لیکن ہم کو خود ہی معلوم نہیں کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے۔ اور تھے کون۔ آپ ذرا پتا لگا لیجیے گا، اور تربت پہلو بہ پہلو بنوائیے گا۔ اگر ان کی تربت نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو بس اسی کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ یہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے۔
چہاردہم : پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے۔ اتنی شرطیں بسر و چشم قبول ہوں تو چشم ما روشن، دل ماشاد خانہ احسان آباد، ورنہ خوجی نہ میاں آزاد،

آزاد : گیارھویں شرط بسر و چشم منظور۔
۲۔ بارھویں شرط بڑی کڑی ہے۔ مرنے کے دو گھڑی پیش تر کہہ دیں گے۔ کہ اب چل چلاؤ لگ رہا ہے، مگر گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل بتا دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔
۳۔ اور بھائی سنو۔ خواجہ صاحب تو ہم سے نہ کہا جائے گا۔ ہم تو خوجی ہی خوجی کہا کریں گے۔
۴۔ ہاں یہ شرط کیے لیتے ہیں کہ نہ تو وہاں بوازعفران ہوں گی نہ بزاز، نہ کانجی ہوس۔ آپ مزے سے جہاں چاہیے گھانس چرلیے۔ کوئی چوں تک تو کرے گا نہیں۔ اور کمہار کا تو جہاز پر عکس نہ پڑنے پائے۔
۵۔ ایک قرولی ایک قرابین ایک پتھر کلا ایک دھڑتی دھمک، توپ آپ کو خریدیں گے آپ مزے سے توپ کو کاندھے پر لادے یا ہاتھ میں لیے جہاں چاہیے جائیے۔
۶۔ افیم بمبئی میں آپ کی پیٹھ پر لاد دیں گے۔ گھبرائیے نہیں۔ کہیے اب تو چلیے گا؟ یا اب بھی مچلیے گا۔

خوجی : بسم اللہ کمر کسیے۔
میاں آزاد : لائے اس بت کو التجا کر کے

اب راستے میں راگ نہ لائیے گا۔

خوجی : ایک بات اور باقی رہ گئی۔

آزاد : بس لگے ہاتھوں وہ بھی کہہ ہی ڈالیے۔

خوجی : میں اپنی دادی جان سے تو پوچھ لوں۔

آزاد : معاذاللہ! کیا وہ ابھی زندہ ہیں؟ جیتی جاگتی عاقبت کے بوریے سمیٹنے آئی ہیں کیا؟ خدا جھوٹ نہ بلائے تو آپ کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ اور وہ نیک بخت اس حساب سے کم سے کم کیا ڈیڑھ سو برس کی بھی نہ ہوں گی۔

خوجی : میاں اپنا کام کرد میں دل لگی کرتا تھا۔ ان کی تو ہڈیوں تک کا پتا نہ ہو گا۔

ایک کنجوس رئیس کی ملاقات اور اس کے بخل کے حالات

الغرض میاں آزاد اور خوجی صاحب نے اسباب کسا اور اسٹیشن پر داخل ہوئے۔ میاں خوجی کو روپے دیے کہ ٹکٹ لاؤ۔ حضرت جاڈٹے اور جس وقت گھنٹی ہوئی ٹھن ٹھن۔ اور کانسٹبل نے کہا کہ کانپور کے مسافرو چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے۔ خوجی بھی لپکے اور وہ ریلا آیا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے ہیں۔ بیسواڑے کے دس بارہ کشیدہ قامت، جوانوں میں حضرت خوجی جو پھنسے۔ تو کچلنے لگے۔ وہ ڈنڈپیل لحیم و شحیم کرارے جوان۔ یہ بےچارے نیم جان، قد ماشاءاللہ پون انچ کا۔ بہت ہی گھبرائے اور یار لوگ جو بھڑ بھڑا کے دھنس پڑے تو ان کے ہاتھ پاؤں گویا شکنجے میں کس گئے۔ جب کچلنے لگے تو غل مچایا کہ لانا قرولی۔ دو ایک کو تو یہاں ہی شہید کر دوں۔ اتنا سننا تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ اور میاں خوجی دراتے ہوئے ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس پہنچے۔

خوجی : بابو صاحب ٹکٹ دیجیے۔

بابو : گول مت کرو۔ (غل مت کرو)

خوجی : اجی غل تو سنتے ہو۔ مگر اس غولِ بیابانی پر نظر بھی ہے؟

بابو : چپ۔!

خوجی : چپ! یہ چپ کیسی ٹکٹ دیتے ہو، یا میں اسٹیشن ماسٹر سے رپٹ بولوں پھر۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ریلا آیا۔ وہ ریل پیل کہ میاں خوجی کے چھکے ہی بگڑ گئے۔ رپٹ وپٹ سب بھولے اور کوئی بیس قدم پیچھے ہو گئے۔ خیر بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے ٹکٹ ملے اور جا کر ریل پر بیٹھے۔ ریل چلی تو میاں خوجی کو آزاد نے جگایا کہ اٹھیے جناب خواجہ صاحب کانپور آ گیا۔

خوجی : واللہ! بھئی واہ ری ریل۔ ایک ہی مرتبہ کی پلک میں کانپور پہنچ گئے

خوب جواب دیا

ریل سے اترے تو میاں آزاد کو ان کے ایک دوست مل گئے۔

آزاد : میرزا صاحب آداب عرض ہے۔

میرزا : بندگی۔ اخاہ۔ آپ ہیں، کہیے مزاج شریف؟

آزاد : الحمدللہ۔ اب فرمائیے فروکش کہاں ہو جیے گا۔

میرزا صاحب نے کہا کہ ہمارے ایک حبیب لبیب کا فلاں مقام پر مکان ہے۔ آپ ایک گھنٹے میں وہاں آئیے تو ملاقات بھی ہو، اور مزے سے آرام بھی کیجیے وہ مشہور رئیس ہیں۔

ایک گھنٹے میں میاں آزاد اور خوجی ان رئیس کے یہاں گئے۔

آزاد : (خدمت گار سے) ہیں تشریف رکھتے ہیں؟

خدمت گار : جی ہاں! جائیے، وہ سامنے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔

آزاد : (کمرے میں گھس کر) آداب بجا لاتا ہوں۔

رئیس : آپ کہاں سے آئے؟

آزاد : السّلام علیک۔ آئیے مصافحہ تو کریں۔

رئیس : بندگی آپ کہاں سے آئے ہیں۔

آزاد : حضرت اس کمرے بھر میں ایک تو کرسی اس پر آپ ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کچھ بیٹھنے کو منگوائیے تو عرض کر دوں۔

رئیس : (جھلا کر) کچھ بیٹھنے کو لاؤ ان کے لیے۔

خدمت گار نے دوسرے خدمت گار سے کہا کہ کرسی اٹھا لاؤ۔

رئیس : (خفا ہو کر) کرسی نہیں میک ڈنبر لاؤ۔ بدتمیز۔ وہ مونڈھا جو سامنے پڑا ہے

اٹھادے۔

آزاد : (مونڈھے پر بیٹھ کر) کیوں قبلہ یہ میک ڈنبر کیسا ہوتا ہے۔

رئیس : آپ کوئی قاضی ہیں۔

آزاد : جی ہاں۔

رئیس : اور اوپر سے کہتے ہو جی ہاں۔

آزاد : مگر سخت تعجب ہے کہ آپ اور اپنے لنگوٹیے یاروں کو بھول جائیں۔ ع۔ گر بدولت برسی مست نگردی مردی۔

رئیس : (سرخ ہو کر) لنگوٹیے یار کیسے۔

آزاد : ابے لٹورے! ہم کو بھول گیا؟ یاد ہے جب گومتی کے سامنے میدان میں بانے کی کنکیاں ہم سے آپ سے لڑتی تھیں، اور میدان بدا گیا تھا، ادھر سے ہم نے ماہی جال کی گول دو بنی کنکیا چپکائی اِدھر سے آپ نے جھنڈی دار کل پٹی بڑھائی۔ ہم نے آپ کے کتنے مارے اور غوطہ دے کر جو ایک گھسّا دیا ہوں تو وہ کاٹا۔ تب کے بھاگے آج ملے ہو۔ مگر واللہ ہو حیادار کہ اب تک چار آنکھیں نہیں کرتے۔

خوجی : مگر حضور یہ بھی سات تار پر ہمیشہ گنڈے والا بھیڑیا ہی اڑایا کیے۔ کیوں نہ ہو پھر میاں ولایتی کے شاگرد ہیں۔ مگر عقل ذرا موٹی ہے۔

اب وہ چکر میں آئے کہ یہ دونوں کون ہیں۔ بھئی کہاں سے آئے ہیں۔ ایک تو کہتا ہے کہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرا میاں ولایتی کا شاگرد بتاتا ہے۔ یہ دونوں کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد : کہو مچھئی۔ اب تو پہچانا۔ کیوں چڈا گل خیرد۔

رئیس : یہ تو میری لمبی سفید داڑھی۔ اور تم کہتے ہو کہ جھنڈی دار پتنگ لڑایا تھا۔ کہتے ہیں کہ سات تار پر گنڈے والا اڑایا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ہو کون؟

آزاد : واہ استاد اس تجاہلِ عارفانہ کے صدقے۔ اجی ہم وہ ہیں جس کے ساتھ تم میاں عبداللہ کی دکان پر چانڈو کے چھینٹے پیا کرتے تھے۔ بھئی ہم نے تو چانڈو بازی چھوڑ دی۔ مگر یار تم بُرا کرتے ہو کہ اس پیرانہ سالی میں بھی چانڈو ہی پیے جاتے ہو۔ جب ہی بن بلاؤ کا سا چہرہ ہو گیا۔

اتنا کہنا تھا کہ رئیس آگ ہو گئے للکارنے ہی کو تھے کہ آزاد نے ایک اور فقرہ چست کیا۔

آزاد : حضرت تکلیف نہ ہو تو یہ دو پیسے کسی کو دیجیے کہ پیسے کی گلوری اور پیسہ کا حقہ لے آئے۔

رئیس : بس چلیے یہاں سے ٹہلیے۔ آپ نے کسی کو ککڑ والا یا تنبولی مقرر کیا ہے؟ چلیے چلیے!

آزاد : اور یہ چونی لیجیے اپنی دکان سے گرما گرم کباب اور شیر مال منگوا دیجیے۔

تب تو رئیس سمجھے کہ یہ بھی کوئی ہیں۔ ایسے ویسے، ایسے ویسے کا یہ خم ودم کجا۔ پوچھا کہ آخر آپ ہیں کون بزرگ! اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

آزاد : بس ہاں اب آپ نے آدمیت سیکھی۔ اب شرفا کی طرح پر بات چیت شروع کی بندہ آپ کے سر اپنے یار میرزا عبد الستار کے پاس آیا ہے۔ مگر مرد خدا ذرا تو اخلاق سیکھو، آخر آدمیت بھی کوئی شے ہے یا ہر دم مرکب، وحشت ہی پر سوار رہتے ہو۔ بھلے مانسوں سے بھلا کہیں بھلے مانس یوں ملا کیے ہیں۔ جس طرح آپ ہم سے ملے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

رئیس : واللہ ہم کو اتنی عمر میں ایک آپ ہی گرو ملے۔

آزاد : پھر حضرت ہر فرعونے راموسائے۔

راوی : اخلاق بھی کیا چیز ہے۔ صاحب خلق ہر دل عزیز ہے اخلاق تمغائے انسانیت ہے اخلاق جوہر اہلیت ہے جس انسان میں خلق نہیں وہ گل ہے۔ جس میں بو نہیں۔ اور مل ہے۔ جس میں کیفیت سرور یک مو نہیں۔ کج خلق آدمی کو ہمیشہ خبیث ہی پایا۔ جو ملاقات کو گیا وہ بُرا ہی کہتا آیا۔ خوش اخلاقی کو نعمت عظمیٰ، اور عطیہ کبریٰ ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم کسی سے غرور یا تکبر کے ساتھ پیش آئے تو اس کی گرہ سے کچھ نہ جائے گا۔ مگر ایک تو ہماری عادت خراب ہو جائے گی دوسرے رفتہ رفتہ ضعیف الاعتقاد آدمی، پھر سویرے سویرے نام نہ لیں گے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ کھانا نہ ملے۔ لاحول ولا قوۃ۔

میاں آزاد تو کچھ مانگنے گئے ہی نہ تھے۔ ان کو کسی کی پرواہی کیا تھی۔ کسی کے نوکر نہ چاکر نوکری کے خواہاں نہ زر کے طالب:

ہر کس کہ بدہر نیم نانی دارد	(کچھ آدھی روٹی پر منحصر نہیں ہے
وز بہر نشست آشیانی دارد	(صرف جھونپڑے ہی سے مراد نہیں)
نی خادم کس بود نہ مخدومِ کسی	(کیا پوچھنا ہے)
گو شاد بزی کہ خوش جہانی دارد	(چین ہی چین لکھتا ہے)

میاں آزاد نے ان رئیس کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور اس درجہ خفیف کیا کہ وہ بے چارے گردن نیچی کیے ان کے آوازے چپ چاپ سنا کیے۔ اور ان کے پٹھو میاں خوجی بھی ہاں میں ہاں ملایا کیے۔ میاں آزاد کی آنکھیں راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں مگر ان کے دوست میرزا صاحب نہ آئے۔

آزاد سوچے کہ میرزا تو ہم سے بھی بڑھ کر آزادہ رو ہیں۔ خدا جانے کہاں رہ گئے۔ اب چلنا چاہیے۔ خوجی سے کہا کہ اڈے پر سے گاڑی تو لاؤ۔

خوجی : گاڑی! لاحول ولا قوۃ۔ اجی اس شیطانی چرخے پر جائیے گا۔ اپنے میزبانِ سعادت اقبال نشان کی پالکی گاڑی نہ لے لیجیے۔ بس اسٹیشن میں ہم کو اتار دے۔ بات کرتے تو گاڑی دن سے پہنچ جائے گی۔

رئیس : گھوڑا لنگ کرتا ہے اور بابو آج شل ہو گیا ہے۔ کرایہ کی گاڑی منگوائے دیتا ہوں۔

خیرات سے کیا معنی

الغرض میاں آزاد اور خوجی ایک کرایہ کی بگھی پر اسٹیشن کو چلے۔ مگر رئیس موصوف کی زبان سے اتنا بھی نہ نکلا کہ حضرت کھانا تو کھا لیجیے۔ واہ ری انسانیت۔ یہ بھی نہ کہا کہ اسٹیشن پر پھر جائیے گا پہلے دسترخوان پر تو آئیے۔ جب چلنے لگے تو میاں خوجی نے کہا کہ پیر و مرشد آپ نے تو للکار کر اتنا کھانا کھلوا دیا کہ اب چلنا اور قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ جیسے چوہے کو پارہ پلا دیا۔ مگر ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگی کہ بکتے کیا ہیں۔ ایسی مروت کی دم میں موٹا سا رسا۔ شرم چہ کتی ست کہ پیش مرداں آید۔ خیر اسٹیشن پر داخل ہوئے تو سنا کہ ابھی ٹکٹ بٹنے میں کوئی دو گھنٹے کی کسر ہے۔ اب خوجی اور میاں آزاد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوجی : توبہ ہی بھلی۔ اچھے رئیس کے یہاں گئے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ تو کہیے آپ سا بے تکلف دل لگی باز نہ ہو تو وہ رئیس واللہ گردن میں ہاتھ ڈلاتا۔ بیٹھنے اور بات کرنے تک کا روادار نہ تھا۔ مگر اللہ میرا جانتا ہے کہ آپ نے بھی وہ سنائیں کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ ایسی کھری کھری کہیں کہ بس گردن ہی تو نیچی کر لی۔ اور وہ چانڈو پینے کی تو بس ایسی ہوئی کہ واللہ مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ جب آپ نے کہا کہ بانے کی تکلوں کا میدان بدا تھا، تو بہت ہی نیلے پیلے ہوئے مگر کرتے کیا۔

آزاد : ارے میاں ہم بھلا چوکنے والے ہیں۔ نہیں بُرا یہ مانا کہ بندگی کا جواب ہی نہیں۔ جاتے ہی پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو جی! میں نے کہا حضرت پہلے کرسی مونڈھا کچھ منگوائیے پھر نکیرین کی طرح سوال کیجیے۔ جب تم نے میرے کلام کی تائید کی کہ سات تار پر گنڈے والا خوب اڑاتے ہیں، تو بڑے چکرائے۔ مگر نانبائی والے فقرے پر البتہ سرد ہوئے۔ میں نے کہا اپنی ہی دکان سے شیرمال اور کباب منگوائیے۔ پوچھیے میں کوئی مذکوری ہوں نہ چپراسی ہوں۔ سائیس ہوں۔ آخر یہ سمجھا کیا تھا۔ مگر اپنے دل میں گالیاں ہی دیتا ہوگا۔

اتنے میں ایک شخص نے میاں آزاد کے قریب آکر کہا کہ حضور غریب الوطن ہوں، سادات ہوں، تین دن سے اگر ایک دانہ بھی کھایا ہو تو سور کا گوشت۔ بال بچے سب بھوکوں مر رہے ہیں۔ اگر ہو سکے تو ایک آدھ سیر آٹے کی فکر کر دیجیے۔ ثواب ہوگا۔ ع۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست، ع۔ شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را۔

آزاد : ع۔ شاہان کم التفات بحال گدا کنند، ماشاء اللہ یہ تن و توش یہ ہاتھ پاؤں۔ یہ ڈنڈ پیل، اور بھیک مانگتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے۔ لولے اپاہج، لنگڑے اندھے، ہوتے تو خیر۔ تمھاری اعانت ہم پر فرض تھی، مگر تم کاہل اور بدوضع معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ بھیک نہ مانگتے۔

خوجی : حضرت آپ پر بھی سایہ پڑ گیا۔ ایک پیسے میں اس کا کام نکل سکتا ہے۔ آپ نے اتنی باتیں کیں، مگر چار دمڑی کا ایک پیسا نہ دیا نہ دیا۔ یہ کون حمیت ہے بھلا۔ ع۔ چیزے بدہ درویش را چیزے مگو درویش را۔ ے پکار کر دے دو کہ لے سائیں یہ لیے جاؤ۔

آزاد : آپ تو ہیں پاگل۔ مجھے کتے نے نہیں کاٹا ہے۔ یہ گرگے بھلا رحم کے قابل ہیں۔

خوجی : آخر ان کا قصور۔

آزاد : بدوضعی کاہلی، چانڈو بازی، چوری ڈکیتی، یہ کسی میں بند تھوڑا ہی ہیں۔

فقیر : نہیں حضور اللہ ہی جانتا ہے جو کبھی چوری کی ہو۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ غریب الوطن ہیں۔

ایک لالہ صاحب نے کہا غریب الوطن کاہے سے ہو گئے۔ تین پشت سے تو یہاں کمپو میں تم رہتے ہو۔ مگر جہاں پردیسی کو دیکھا، اور غریب الوطن بن گئے (آزاد سے) اجی یہ ایک شیخ کا لڑکا ہے۔ تین دفعہ قید ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ تو اس علت میں حضرت ماخوذ ہوئے تھے، کہ مہاجن کے گھر پھاندے۔ اس کے لڑکے کے ہاتھ سے کڑا نکالا ہی تھا کہ جاگ ہو گئی۔

ایک اہیرن جو وہاں رہتی تھی اس نے ان کو پکڑ لیا۔ ڈیڑھ برس کی سزا پائی۔ پھر ایک جولاہے کے چھپر میں آگ لگا دی۔ پکڑے گئے اور دو برس کو صاحب مجسٹریٹ نے بھیج دیا۔ پھر چھوٹے تو ایک مولوی صاحب کے ہاتھ دو چار کتابیں بیچیں۔ وہ چوری کی تھیں۔ غرض کہ ان کو عمر بھر چوری چکاری ہی کرتے گذری۔

آزاد: (خوجی سے) آداب عرض ہے۔ کیوں ہم کیا کہتے تھے۔ اجی ان لوگوں کی تو قبر تک سے ہم واقف ہیں۔

خوجی: (فقیر سے) اور تم تو سید بنے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بس سامنے سے دور ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد غل غپاڑے کی آواز کان میں آئی، اور ایک عورت چلائی کہ دوڑو چور ہے۔ خوجی اور میاں آزاد جو لپکے کہ دیکھیں معاملہ کیا ہے، تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہی حضرت پکڑے گئے ہیں۔ ایں خیر تو ہے۔ دو چار آدمیوں نے کہا کہ یہ شکل صورت دیکھیے اور یہ افعال دیکھیے، اس عورت بے چاری کی گٹھری لے کر بھاگنے ہی کو تھے کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ اور اس نے غل مچایا۔ وہ تو کہیے کہ دیکھ لیا ورنہ آنکھ چوکتی تو حریف لے ہی اڑا تھا۔

آزاد: کیوں جناب خواجہ صاحب ذرا ادھر تو چار آنکھیں کیجیے۔ کیوں ہم کیا کہتے ہیں آخر وہی بات نکلی نا۔ بھئی حق یوں ہے کہ ہندوستان میں خیرات کا طریقہ حد بھر برا ہے۔ آنکھ بند کی اور روپیہ لٹانا شروع کیا۔ مستحق اور غیر مستحق میں تو کچھ فرق ہونا چاہیے یہ نہیں کہ جس نے سوال کیا اس کو دے نکلے سمجھے کہ ہم بڑے مخیر ہیں۔ واہ کیا مخیر ہیں دے ایسے کو جو ہماری مدد کا صریح محتاج ہو۔ نہ ایسے بدمعاش، عیاش اوباش کو جو پیسا یا ٹکا پاتے ہی چانڈو خانے پہنچے۔ یا ساقن کی دکان پر دم لگائے، یا قمار خانے میں داؤں پر رکھ دے۔ ایسے حضرات ذات شریف کو دنیا گویا بدوضعی اور بدمعاشی کا معین ہونا ہے۔ یہ جتنے فقیر نظر آتے ہیں۔ ان میں فی صدی نوے ایسے ہی پائیے گا۔ بھیک کو بھی ان حضرات نے ایک پیشہ مقرر کر لیا ہے۔ اندھا مانگے دیکھو ہم کھٹ سے دے دیتے ہیں یا نہیں، مگر ایسوں کو تو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ایک حبہ نہ دوں گا۔

شراب خانہ خراب

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شخص نے میاں آزاد سے کہا کہ حضرت ذری یہ خط تو

پڑھ دیجیے۔ آزاد نے خط لیا اور کھولا، اور پڑھ کر سنانا شروع کیا۔

خط

سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا　　　محبت می و معشوق ترک کر آتش

سرورِ بادۂ فتوت سلامت۔ بوتل بوتل بندگیات، اور کباب کباب کورنشات، کے بعد شرابِ مطلب کو یوں لنڈھاتا ہوں۔

خوجی : بہت ہی خاصے یہ تو کوئی پیرِ مغاں کے بھی چچا ہیں۔ بھئی اور بندگیات کی بھی ایک ہی کہی۔

آزاد : سنتے جائیے۔ لنڈھاتا ہوں۔ خیر آجکل کوہِ شملہ[1] پر بہار بھی ہے لالہ زار بھی۔ گلزار ندرت بار بھی ہے۔ مگر نہیں ہے تو ہمارا یار نہیں ہے۔ اور تو سب سامان موجود ہے، مگر میر صاحب مفقود بادہ گساروں کے یہاں آجکل رتی خوب چمکی ہوئی ہے۔ شراب نے وہ ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، کہ کوئی کوچہ و برزن نہیں، جہاں اس دخترِ رز کے عشاقِ زار و مست، و سرشار، اپنی ترنگ میں جھومتے نظر نہ آتے ہوں۔ خیر کوچوں اور گلیوں تک تو خیریت تھی، اب بڑے بڑے، خاص خاص بازاروں تک میں ان حضراتِ بدمست نے گھومنا شروع کیا ہے۔ وہ ہجوم رہتا ہے کہ بعض اوقات راہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اہلِ پولیس کہاں تک انتظام کریں، اب ساری خدائی کو تو حوالات میں بھیجنے سے رہے۔ افسوس کہ حضرت ناعاقبت اندیش ذرا نہیں سوچتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اور ان کا بھی کیا قصور۔ اس شراب خانہ خراب کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جب ایک دفعہ مُنھ لگی پھر گلے کا ہار ہو گئی۔ ع۔ چھٹتی نہیں ہے مُنھ سے یہ کافر لگی ہوئی آپ بھی اب بوڑھے ہوئے اب تک قرابے کے قرابے لنڈھائے، بوتلوں پر بوتلیں پی گئے۔ کوٹھیاں خالی کر دیں۔ اب کچھ عاقبت کا بھی خیال ہے۔ میاں غفلت تابہ کے، اور بے ہوشی تا کجا۔ آپ کا وہ نامۂ عنایت میرے پاس آیا۔ جس میں آپ نے لکھا ہے کہ :

گویند مرا کہ دوزخی باشد مست　　　قولی ست خلاف دل در دنتواں لبست
گر عاشق مست دوزخی خواہد بود　　　فردا بینی بہشت ہم چوں کفِ دست

---

[1] شملہ ہندوستان کا نہایت پر فضا اور خوبصورت پہاڑی شہر، انگریزی دورِ حکومت میں یہ مرکزی حکومت کی موسم سرما کی راجدھانی تھا اب یہ صوبہ ہماچل پردیش کی راجدھانی ہے۔

یار تم مطلب و طلب تو خاک بھی نہیں سمجھتے، مگر ان رباعیوں نے تمھاری مٹی رہی سہی اور بھی پلید کر دی۔ آپ کا وہ نمیقۂ انیقہ بھی میں نے غور سے پڑھا۔ جس میں آپ نے حضرت عمر و خیام کی یہ رباعی لکھی ہے:

گویند مرا کہ می پرستم ہستم　　گویند مرا عارف مستم ہستم
در ظاہر من نگاہ بسیار مکن　　کان در باطن چنانکہ ہستم ہستم

یہ سچ۔ مگر اب ظاہر ہے تو آپ کا باطن اور بھی خراب ہے۔ بھائی سنو یہ کہہ دینا کہ ہم تو صاف باطن ہیں۔ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں، دوزخ ایک شرعی دھڑکا ہے۔ بہشت باغ ہے۔ یہ تو نہایت ہی آسان باتیں ہیں۔ مگر صاف باطن ہونا منہیّات و معصیّات سے احتراز کرنا سالک مسلکِ خیر ہونا دل لگی نہیں ہے۔ دو چار واقعاتِ شملہ ذیل میں آپ اور آپ کے ساتھیوں کی عبرت کے لیے لکھتا ہوں غور سے سنیے!

کل شام کا ذکر ہے کہ ایک صاحب رندِ میخوار کلوار کی دکان سے خوب شرابیں پی کر، یہ غزل پڑھتے ہوئے جھوم جھوم کر سڑک پر جاتے تھے:

ہاں کھلے ساقی درِ میخانہ آج　　خیر ہو بھر دے مرا پیمانہ آج
ناز کرتا جھومتا مستانہ وار　　ابر آتا ہے سوئے میخانہ آج
بوسۂ لب حسن کے صدقے میں دے　　ادبت ترسا ہیں ترسانہ آج
عشق چشمِ مست کا دیکھو اثر　　پاؤں پڑتا ہے مرا مستانہ آج
میرے سینے کی الٰہی خیر ہو　　ہے بہت مضطر دلِ دیوانہ آج
محتسب کا ڈر نہیں بسمل تمھیں　　سوئے مسجد جاتے ہو رندانہ آج

یہ پڑھتے ہوئے دوسرے کلوار کی دکان پر داخل ہوئے اور وہاں غل مچایا۔ آسمان کو سر پر اٹھایا۔ اتنے میں تین چار دھوبی شراب کے نشہ میں چور، اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت رند سے چت پٹ کی ٹھہری۔ پھر اتنا پٹے کہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔

اب سنیے کہ موے پر سو دُرے۔ ایک تو یہ بے عزّتی ہوئی دوسرے طرّہ اس پر یہ ہوا، کہ کانسٹبل نے چالان کر دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ غیرت دار کے لیے ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔

پرسوں شام کی وارداتِ سنیے! آٹھ بجے کے وقت بندہ سیر گشت کو نکلا۔ بازار میں دیکھا کہ اژدہام عام ہے، اور ایک شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہے کہ۔ بیٹا بیٹا۔ قریب جا کر دیکھا تو

ایک شرابی ایک حلوائی کو پیٹ رہا ہے۔ ان کا بھی چالان ہوا۔ حضرت ایک شریف زادے ہیں، مگر صحبت بد کا بُرا ہو کہ کہیں کا نہ رکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ ایک شخص نے شراب کی ترنگ میں ایک بے چارے معصوم لڑکے کو بے وجہ بے سبب کاٹ کھایا۔ اور وہ بے چارہ بلبلانے لگا۔ آخر کار دو تین خدا ترس آدمیوں نے اس کو اس ظالم بدمست کے پنجے سے چھڑایا۔ مگر اس نے ایک ایک کو ہزار ہزار صلواتیں سنائیں۔ شرفا نے بھاگ کر اپنی راہ لی، کہ مفت میں کہیں لینے کے دینے نہ پڑیں۔ ان کو بھی اہل پولیس نے گرفتار کر لیا، تو کہتے کیا ہیں۔ سُن بے چپڑی میں نشے میں ہوں۔ اس وقت طبیعت پر قابو نہیں چلتا۔ جو ہم کو مجسٹریٹی لے جائے گا تو ہمارے یار تجھ کو حلال ہی کر ڈالیں گے۔

ایک اور واقعہ بھی قابل گزارش ہے۔ رات کا وقت۔ ایک بجے کا عمل، چوطرفہ تاریکی چھائی ہوئی۔ یکایک شور وغل کی آواز آئی۔ چونک پڑا۔ خیر تو ہے بھئی۔ یہ غل کیسا برآمدے پر جاکر دیکھتا ہوں تو تین چار بھلے مانس، اور بڑے مشہور مہذب آدمی باہم جوتی پیزار کر رہے ہیں۔ پولیس والے نے ڈانٹا کہ بھلا دارو پی پی کر سڑک پر دنگا کرتے ہو۔ پکڑ لے چلوں گا چوکی پر، ایک بابو صاحب جو اسی غول بیابانی میں تھے بول اُٹھے کہ شالا ہمارا کلکتہ نہ ہوا نہیں تو ہم تم کو جھاڑو سے مارتا۔ دوسرے بابو صاحب نے فرمایا کہ اگر ہمارے کلکتہ میں ہوتا تو تم کو ہم ہگلی میں ڈبو دیتا۔ غرض کہ شراب خانہ خراب کی پوری پوری ہجو کروں تو دفتر کے دفتر لکھ ڈالوں۔

ایک حضرت بادہ گسار شب کے وقت کوئی دو بجے حلوائی کی دکان کے ٹٹر توڑے ڈالتے تھے، کہ ہم کو سیودہ، وہ بھی ماخوذ ہوئے۔ اب فرمائیے شراب چھوڑیے گا یا نہیں؟

(آپ کا دوست راز داں)

آزاد : واہ مولانا۔ یہ ریشِ مبارک اور یہ بادہ گساری۔ ان سفید بالوں کی تو شرم رکھو:

ہوس از سرت یکِ سرِ مو نہ رفت — سیاہی ز مو رفت واز رو نہ رفت

میر صاحب :

دوزخ میں جلیں گے مے کے پینے والے — توبہ خا در ہزار توبہ خا در

بھائی جان یہ خط ہمارے پڑوسی کے نام آیا ہے۔ ہم سے بھلا کیا واسطہ۔ بدخط لکھا تھا اس سے ہم نے کہا کہ کسی اور سے پڑھوائیں۔

خوجی : اے لعنت خدا اور اوپر سے جھوٹ بولتے ہو۔

خیر ریل پر سوار ہوئے اور چلے تو میاں آزاد اور خوجی کے کمرے میں ایک گنوار اور ایک وضعدار بھی بیٹھے تھے۔ گنوار کو دیکھ کر میاں خوجی نے کہا کہ طوطی را با زاغی در قفس کردند۔ اتنے میں گنوار نے پاؤں پڑھایا اور بنچ پر دراز ہو گئے۔ پھر دوسرا پاؤں بڑھایا تو کھٹ سے میاں خوجی کے سر پر پڑا۔

خوجی : (پینک سے چونک کر) اوگیدی۔ بدتمیز۔ نکالوں قرولی پھر (آزاد سے) ارے! قرولی لے دینا تو آپ بھول ہی گئے۔

گنوار : ہم چمار ناہیں ہیں ہجور۔ ہم سے گالی گپتا نہ بکو جیسے تم ہو کرایہ دیو، ہم ہو دیا۔ پھر تم ہم کا ڈپٹت کاہے کا ہو۔

خوجی : بہت کوں دوں کے بھروسے نہ رہنا۔ میں کانوں میں سر کر دوں گا۔ اب کی ریل سے اتر کہتے ہی قرولی لے لیتا ہوں۔

وضعدار : (گنوار سے) ابے چپ نہیں رہتا۔ بے کار ٹیں ٹیں لگائی ہے۔

آزاد : حضرت ان گواروں سے ساتھ سے خدا بچائے۔ دیکھیے ایک آپ ہیں کہ کس تہذیب کے ساتھ بہ لطف و مروت ملتے ہیں۔ اور ایک وہ حضرت ہیں کہ پھاڑے کھاتے ہیں۔ اکڑے ہی جاتے ہیں۔

خیر تھوڑی دیر کے بعد میاں آزاد نے ایک شعر پڑھا:

عاشق شب وصال میں گھبرائے جاتے ہیں
پچھلے سے جان مرغ سحر کھائے جاتے ہیں

سبحان اللہ کیا نور کا مطلع ہے۔

خوجی : ایک مطلع اس پر ہمیں بھی یاد آیا ہے۔

نام خدا وہ ناز سے اترائے جاتے ہیں
جوتی کا بوجھ پڑنے سے بل کھائے جاتے ہیں

دوسرے کمرے سے آواز آئی:

دل کو ہم اپنے کہہ کے یہ سمجھائے جاتے ہیں
کر صبر تھوڑی دیر کہ وہ آئے جاتے ہیں

تیسرے کمرے سے ایک صاحب بول اٹھے :

کوئی تو ان کے وصل سے ہوگا شگفتہ دل
پھولوں کے ہار چوک سے منگوائے جاتے ہیں

چوتھے کمرے سے کسی نے لہرا لہرا کر گانا شروع کیا :

آنکھیں نہیں ملاتے ہیں شرمائے جاتے ہیں — کیا جانیے کہ وصل میں کیا بات ہو گئی
کھوتے ہوئے سے آپ جو کچھ پائے جاتے ہیں — دل میرا لے کے کہیں بھول آئے ہیں حضور
لو اب تمھارے سر کی قسم کھائے جاتے ہیں — کالے ڈسیں جو زلف تمھاری کبھی چھوئیں

آزاد : خدا کی قسم جو اپنے ہم چشم با وضع شریف، خوش فکر آدمیوں کا ریل پر ساتھ ہو تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ جو گنوار لٹھ مار، واڑیوں کا ساتھ ہوا تو معاذاللہ ناک میں دم آجاتا ہے۔ جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔ اول تو قطع ماشاءاللہ قابل دید ہے۔ اور گفتگو تو سننے ہی کے لائق ہے۔ واللہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھ کر پتھر لڑھکا رہے ہیں۔ ہم تو جب ریل پر جاتے ہیں بس یہی دعا مانگتے ہیں کہ یا خدا اہلِ شہر با وضع، خوش قطع، فہمیدہ و سنجیدہ، خوش فکر و بذلہ سنج آدمیوں کا ساتھ ہو۔

وضعدار : حضرت پان ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد : تسلیم مجرا:

زبرگِ پان چسپاں ممنوعِ احسان مو بمو گشتم
بہ باطن قوتِ دل شد لبظاہر سرخرو گشتم

خوجی : (وضعدار سے) مگر یہ کہاں کی انسانیت ہے قبلہ وکعبہ کے ایک کی تو تواضع کی اور دوسرے کو صفایا بتایا۔ ایک گلوری ادھر بھی بڑھائیے۔

وضعدار : معاف کیجیے گا لیجیے! بسم اللہ۔

خوجی : آداب۔ حضرت تھوڑی دیر میں ایک گلوری اور دیجیے گا۔

ادھر ان حضرات میں تو گفتگو ہو ہی رہی تھی اُدھر گنوار بڑے غصّے میں بیٹھے ہیں کہ ان سب کی کاؤں کاؤں سے اپنی نیند حرام ہو گئی۔ ایک اس درجے میں شعر پڑھتا ہے۔ دوسرا اس درجے میں اپنی مٹی بے طور پلید ہوتی۔

بنے ہوئے سدھ کی درگت

ادھر مشاطۂ روز نے معشوقۂ صبح کے پیارے پیارے مکھڑے کو غازۂ شفق سے منور کیا اور مہر جہاں تاب کے نورِ عالم افروز نے ذروں کو ہم سرِ قمر کیا۔ اُدھر ہمارے شفیق بالتحقیق۔ جناب خواجہ صاحب مسخروں کے مسلّم الثبوت استاد گردون دودی یعنی ریل گاڑی سے اسٹیشن کے چبوترے پر آئے۔ آزاد اسٹیشن کے بیل بوٹوں کی طراوت دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔ اور میاں خوجی سے یوں مخاطب ہوئے۔

آزاد : جس طرح مقناطیس پتھر کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح سبزہ زار پر بہار کو بھی حضرت کدیور جہاں آفرین نے وہ خاصیت بخشی ہے کہ نظر اس کی عاشق زار ہے۔ سبزہ نظر آیا اور روح وجد کرنے لگی۔

خوجی : اور جس طرح زہاد سبحہ شمار کو ہر دم حور اور شراب طہور اور سلسبیل و کوثر اور شجرِ طوبیٰ کے ثمر کی فکر رہتی ہے۔ اسی طرح ایں جانب کو ہر وقت چنیا بیگم کے وصال کا اشتیاق رہتا ہے۔ چانڈو کے لمپ کی لو سے صبح و شام لو لگی رہتی ہے۔ سچ کہیے گا چنیا بیگم سے زیادہ سبز رنگ بھی کوئی معشوق نظر سے گذرا آپ کو گھانس پھوس ہی کی پڑی ہے۔ یہاں ڈبیا کو جو خالی دیکھا جمائیاں آنا شروع ہوئیں۔

آزاد : آپ تو ہیں مسخرے۔ اور میری روح اس وقت واللہ وجد کر رہی ہے۔ اس گل کاری کو تو دیکھیے باد بہاری بھی عجب نازِ معشوقانہ سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی، بیل بوٹوں کی بلائیں لیتی ہیں۔ واللہ اسٹیشن بھر کو تختۂ زمرد ین بنا دیا۔ پھولوں کو دیکھیے خوش رنگ و خوشنما۔ بیلوں کو دیکھیے خضارت انتا جس طرف نظر پڑتی ہے۔ بہارِ روح افزا ہی نظر آتی ہے۔ اس سے مکین کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے، اور مکان کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ مگر ہندوستانیوں کو نہ تو مکان کی صفائی کا خاک خیال ہے۔ اور نہ علمِ نباتات کی طرف ان کی طبیعت مائل ہے۔ ایک مرتبہ ایک بڑے وسیع و فراخ دلکش اور دلکشا باغ میں ہم نے دیکھا کہ صدہا گل بدن اور غنچہ دہن لیڈیاں انواع و اقسام کے گلہائے خوش رنگ قرینے کے ساتھ سامنے رکھے ہوئے بیٹھی ہیں۔ اور سیکڑوں جنٹلمین باغ بھر میں گھوم رہے ہیں۔ اور پیارے پیارے پھولوں کو دیکھ کر جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ وہ وہ گل دستے۔ وہ وہ خوشنما اور دلربا پھول کہ انسان ایک نظر دیکھے تو باغ باغ

باغ ہو جائے۔ پھر ایک مرتبہ ایک دوست کے ہمراہ ہم ایک ایوان سپہر توامان میں گئے۔ جہاں میزوں اور بنچوں پر ڈالیوں اور ناندوں میں ہزار ہا پھول اور گلبن دیکھنے ہیں آئے۔ کئی صاحبوں نے انعام پائے یہ پھولوں کی نمائش گاہ کا ذکر ہے۔ ہندوستانیوں کو اس قدر دماغ کہاں کہ وہ ان دل خوش کرنے والی باتوں کی طرف توجہ کریں۔ اور انگریزوں میں کوئی بنگلہ کوئی کوٹھی، ایسی پایئے ہی گا نہیں جہاں باغ اور گل اور سبزہ نہ ہو۔

خوجی : ان کو کھانے کو تو ملتا ہی نہیں۔ آپ کوٹھی اور باغ اور گل وبلبل لیے پھرتے ہیں۔ ارے بھائی یہ سب بے فکری کی باتیں ہیں۔ جب روپیہ پاس ہوتا ہے تو اس وقت سب سوجھتی ہے یہاں تو:

شب چو عقد نماز بر بندم — چہ خورد بامداد فرزندم

کا نقشہ ہے۔

آزاد : واہ اجی شوق ہی نہیں۔ حوصلے پست۔ دل بجھے ہوئے۔ کاہلی کے ہاتھ بکے ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس لاکھوں روپیہ ہے، وہ کب ان امور کی طرف مخاطب ہوتے ہیں۔

اتنے میں اسٹیشن کے باہر پہنچے تو دیکھا کہ غل مچ رہا ہے۔ الٰہی خیر۔ یہ جھگڑا کیسا ہے۔

آزاد : جناب خواجہ صاحب ذرا دیکھیے تو یہ غل کیسا مچ رہا ہے۔

خوجی : اجی حضرت اب کہیں ٹکنے کا سہارا کیجیے۔ غل غپاڑا تو مچا ہی کرتا ہے۔

آزاد : نا بھئی ذرا دریافت تو کرو۔ یار حد بھر کا ہل ہو۔

آزاد اور خوجی دونوں گئے، اور بھیڑ کاٹ کر اس غول کے اندر داخل ہو گئے۔ دیکھا کہ ایک شخص گیروے کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ اور ارد گرد میلا جما ہے۔ حضرت کی قطع فقیروں کی سی ڈاڑھی یکمشت دو انگشت۔ بال کمر تک۔ مونچھیں مونڈی ہوئیں۔ ادھیڑ ہیں، کوئی پچاس کے پیٹے میں۔ مگر چہرہ سرخ جیسے لال انگارا، اور آنکھیں آگ بھبوکا۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی ماجرا کیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا تو سب کے سب خاموش۔ مگر جسے دیکھتے ہیں اسے متحیر پاتے ہیں۔

آزاد : (ایک مسلمان سے) کیوں بھائی صاحب یہ بھیڑ کیسی ہے؟

مسلمان : اجی حضرت زمانے کی نیرنگی ہے۔

دوسرا : ہات ترے کی۔

تیسرا : ولم زموعہ یگر فہ۔ وخ ۲۲ . اد ۲،

کجاست دیر مغاں و شراب ناب کجا

چوتھا: اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی نیاز
غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

ہندو: نارائن! نارائن! بُری ہوئی۔

خوجی: کیا بُری ہوئی۔ کچھ ہم بھی تو سنیں۔

تماشائی: یہ سننے کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر سنے بھی تو کان بند کرلیں۔ عبرت! عبرت! عبرت!

آزاد: (ایک کانسٹبل سے) کیو بھئی جوان! یہ کوئی فقیر ہیں۔

کانسٹبل: اجی حضور یہ فقیر نہیں چنڈال ہیں۔ اب آج ان کی مرمت ہو جائے گی۔

خوجی: لاحول ولا قوۃ۔ ایسے نامعقول آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ اصل بات کوئی بتاتا ہی نہیں۔ توبہ توبہ! سب کر رہے ہیں۔ جان عذاب میں ہے۔ پوچھیں کس سے (آگے بڑھ کر) ہم خود فقیر ہی سے پوچھتے ہیں۔ کیوں باباجی یہ کیا ہوا۔ کچھ ہم بھی تو سنیں۔

ایک آدمی: یہ باباجی ہیں آپ کے۔

دوسرا: بھئی خوب پہچانا قریب جاکر ذری دیکھیے۔

تیسرا: (قہقہہ لگاکر) کیا کھو گئے تھے۔ بہت دن بعد بچھڑے ہوئے ملے گلے تو مل لیجیے۔

خوجی: (للکار کر) چپ گیدی لاؤں قرولی۔

کانسٹبل: کیا قرولی! اچھے آئے۔ یہ قرولی کیوں آتی ہے۔ کیوں صاحب!

خوجی: اجی پوچھتے پوچھتے تھک گئے۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔

کانسٹیبل: بس اتنے ہی کے لیے۔ مجھ سے سنیے۔ یہ فقیر کوئی چار مہینے ہوئے کہ یہاں آیا۔ اور ایک شخص کو اس نے سبز باغ دکھاکر اپنا چیلا بنایا۔ وہ ان کے اس درجہ معتقد ہوئے کہ معاذاللہ۔ ان کو بلاتشبیہ خدا ہی سمجھنے لگے (اپنے کان اینٹھ کر) نقل کفر کفر نباشد اور حضرت خوب تپنے لگے۔ اب کوئی تو کہتا ہے کہ باباجی نے دس سیر مٹھائی دریا میں ڈال دی، اور دوسرے دن جاکر کہا کہ سرجوجی ہماری امانت ہم کو واپس دو۔ بس ایک دفعہ ہی دریا لہریں مارتا ہوا باباجی کے قریب آیا، اور دس سیر گرماگرم تازہ بتازہ مٹھائی ان کے دامن میں کسی نے آپ ہی آپ باندھ دی۔ کوئی اس درجہ ان کے کمال کا معتقد ہوگیا کہ قسمیں کھا کھا کر کہنے

لگا کہ کئی مردے انھوں نے زندہ کر دیے۔ بلکہ دو چار تربیت یافتہ لوگوں نے جو اختلاف رائے کیا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس حماقت کو دیکھیے۔ ایک صاحب نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ ایک دن موسلا دھار مینھ برس رہا تھا اور ان پر بوند نے اثر نہ کیا۔ اور غیب سے ایک چھتری کوئی فرشتہ ان کو لگائے رہا۔ مینھ نے دم کے دم میں جل تھل کر دیا۔ مگر بابا جی کے جسم پر ایک بوند تک نہ گری۔

آزاد : اچھی پھبتی کہی۔ چکنا گھڑا ہی بنا دیا۔

کانسٹیبل : کچھ پوچھیے نہیں۔ سنتے سنتے کلیجہ پک گیا۔ اب یار لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ قید خانے سے نکل جائیں گے۔ مگر تین دن سے حوالات میں ہیں اور اب سٹی پٹی بھولی ہوئی ہے۔

آزاد : تو یہ کہیے اچھا رنگ جما لیا تھا۔ بڑے رنگ باز آدمی ہیں حضرت۔

کانسٹیبل : جی پرلے سرے کا ۔ ان کے تو کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ میں جو ادھر سے آؤں جاؤں تو روز دیکھوں کہ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ مگر عورتیں زیادہ اور مرد کم۔ اور حضرت بیٹھے لہرا لہرا کر گا رہے ہیں۔ مجذوب بنے ہوئے بڑبڑا رہے ہیں۔ جو آتا ہے وہ سجدہ کرتا ہے۔ ماتھا ٹیکتا ہے۔ بابا جی دو وقتہ موہن بھوگ اڑانے لگے۔ صبح کو دودھ کھایا اور ڈنڈ پیلے۔ شام کو انواع و اقسام کی نعمتیں چکھیں، اور دندنانے لگے۔ خلقت آپ جانیے بھیڑیا دھسان آپ کی دیکھا دیکھی میں گیا۔ میری دیکھا دیکھی آپ گئے، اور بابا جی کے ہاں روز دربار لگنے لگا۔ رفتہ رفتہ پنج کوسی آدمیوں نے آنا شروع کیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بابا جی نے اپنی کوٹھری میں ٹاٹ بچھایا۔ اور ٹاٹ کے نیچے اِدھر اُدھر دس پانچ روپے رکھ دیے اور چپکے سے باہر نکل آئے۔ جب کوئی اسی نوے آدمی جمع ہو گئے اور بابا جی کا دربار خوب آراستہ ہوا، تو ایک شخص نے کہا کہ بابا جی ہم کو کچھ دکھائیے ہم آپ کے تب ہی معتقد ہوں گے۔ جب آپ ہم کو کچھ دکھائیں گے۔ بابا جی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور شیر کی طرح ڈکارے۔ جس سے ضعیف الاعتقاد آدمیوں کے حواس اڑ گئے۔ کہ اب بابا جی کا بحر غیظ و غضب جوش زن ہوا۔ خدا ہی خیر کرے۔ دو چار ڈرپوک آدمیوں نے تو مارے خوف کے آنکھیں ہی بند کر لیں، اور بابا جی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ایک شخص نے کہا بابا یہ انجان ہے اس پر رحم کیجیے۔ دوسرا بولا کہ نادان ہے جانے دیجیے۔ تیسرے نے اس سے کہا کہ پاؤں پڑ اور ہاتھ جوڑ۔ تو بابا جی کیا کہتے ہیں۔

فقیر : نہیں اس سے پوچھو کہ یہ کیا دیکھے گا۔
لوگ : کیا دیکھے گا بول۔
شخص : میں تو روپیہ کا بھوکا ہوں۔ اور بس۔ دھن۔ دولت زر ثروت چاہتا ہوں۔ جو بابا جی میں قدرت ہو تو مجھے اس وقت اور کچھ نہیں تو دو ہی چار روپیے دے دیں۔
فقیر : بچّا فقیروں کو دولت سے کیا کام۔ مگر اچھا دیکھو منگواتا ہوں۔ چل، چل، چل، چل۔ ہن برسے ہن برسے۔ برسو، برسو، بر۔ کھن کھن کھن کھن۔ وہ برسے یہ برسے اچھا بچّا جا فقیروں کی کٹی میں دیکھ۔ ٹاٹ کا کونا اٹھا، پرمشیر نے تیرے لیے کچھ بھیجا ہی ہوگا۔ جا مگر سُر دیکھ کر جو اس طرف کا سُر چلتا ہو تو جانا۔ نہیں تو زک اٹھائے گا۔
شخص : بابا جی دائیں طرف کا سُر چلتا ہے۔ جاؤں۔
فقیر : سیدھا چلا جا، مگر پیچھے پھر کے دیکھے تو تو جانے گا۔ اور جو وہاں کوئی ڈراونی صورت دکھائی دے تو ڈر مت جائیو، نہیں تو مر جائے گا۔

ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گیا تھا کہ فقیر نے اس کوٹھری کے ایک کونے میں پردہ ڈال دیا تھا اور اس پردے میں ایک آدمی کا منھ کالا کر کے اس کو بٹھا دیا تھا منھ کالا کوئلا سا اور ہونٹھ لال انگارا :

دانت اس کے تھے گورکن قضا کے　　　وہ نتھنے رہِ عدم کے نا کے

اب ان میاں کے سٹی پٹی بھولی کہ خدا جانے کیسی بھیانک صورت نظر آئے گی۔ ایسا نہ ہو کے کہیں ڈر جائیں اور جان ہی جاتی رہے تو لینے کے دینے پڑیں۔ بابا جی ایک ایک سے کہتے ہیں کہ جس کو روپے لینا ہوں جائے مگر کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ جائے تب تو ایک نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔

نوجوان : لیجیے میں جاتا ہوں۔
فقیر : بچّا جاتا تو ہے مگر ذرا سنبھلے ہوئے۔ دیکھ ہم نے جتا دیا ہے بچّا۔
نوجوان : اجی کیسا بچّا ہم تمھارے بھی بابا ہیں۔ آپ بھولے کس بھروسے ہیں۔ مجھے بھی کوئی وہ مقرر کیا ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں آپ وہ مہیب شکل دکھائیے۔
فقیر : تیری جوانی پر ترس آتا ہے۔ مت جا۔ کہا مان، کہا مان، کہا مان۔
نوجوان : (ڈراتا ہوا کوٹھری میں گھس گیا)۔

ٹاٹ کو اٹھایا اور جتنے روپیے رکھے تھے سب حضرت نے جیب میں رکھ لیے چلنے ہی کو تھے پردے میں سے وہ مردِ دیو نما تڑسے نکل پڑا۔ اور ان کی طرف دانت کھول کر جھپٹا۔ اور جب کوئی گز بھر کا فاصلہ رہا تو مُنھ کھول کر چاہا کہ ان کو کاٹ کھائے، یہ پھکیت آدمی۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جیسے ہی اس نے مُنھ کھولا بس ویسے ہی انھوں نے لکڑی حلق میں ڈال دی، اور پہلے تو اتنی چوٹیں لگائیں۔ اتنی چوٹیں لگائیں کہ بوکھلا دیا۔ اور پھر جمپٹ کر اتنا گدیایا اتنا گدیایا کہ یاد ہی کرتا ہوگا۔ اب انھوں نے چاہا کہ اس کو باہر لے جائیں تاکہ خلق خدا پر اس مردود کی قلعی کھُل جائے مگر وہ مردِ دیو نما بھی آدمی شہ زور تھا۔ ہاتھ چھوڑا کر دوسری طرف سے بھاگ کھڑا ہوا۔ انھوں نے روپیے ہضم کیے اور اکڑتے ہوئے باہر نکلے تو حوالی موالی سب دنگ۔ کہ یہ تو خوش خوش آتے ہیں، اور ہم سمجھے تھے کہ اب ان کی لاش دیکھیں گے۔ اور یہ جیتے نہ پھریں گے۔ مگر وہ اور بھی اکڑ رہے ہیں۔

نوجوان : (فقیر سے) کہیے حضرت وہ شکل کیا ہوگئی۔

فقیر : تمھاری جوانی پر ہم نے رحم کیا۔

جوان : رحم وہم تو نہیں پہلے جا کر پوچھیے تو کتنی ہلدی لگائی۔ اگر عقلاء وہاں بیٹھے ہوتے تو بخوبی سمجھ جاتے کہ بابا جی فقرہ باز ہیں۔ بس زبانی ہی داخلہ تھا۔ باقی خیر صلاح۔ مگر وہاں جتنے بیٹھے تھے سب مدعیان خرد ضعیف الاعتقاد۔ بابا جی کے کشف و کمال کے معتقد وہ سمجھے کہ بیشک بابا جی نے اس جوان پر رحم کیا، ورنہ زندہ نہ بچتا۔ اور بعض سمجھے کہ یہ نوجوان بھی صاحب کشف و کمالات ہے۔

بھئی واللہ ضعیف الاعتقادی کے صدقے۔ سچ ہے پیر ما خس ست اعتقاد ما بس ست۔

خیر صاحب اب بابا جی نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک روز کسی مہاجن کے ہاں گئے۔ وہاں محلے بھر کے مرد اور عورتیں ان کے درشنوں کو جمع۔ اور پھولوں کی برکھا بھی ان پر ہوئی۔ رات کو جب سب چلے گئے تو انھوں نے مہاجن کے لڑکے سے کہا کہ ہم تم سے بہت پرسند ہیں۔ اب ہم تم کو کچھ دے جائیں گے۔ بابا جی کا اتنا کہنا تھا کہ وہ لڑکا ان کے قدموں پر گر پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک کوری ہانڈی لاؤ۔ اور چولھا گرم کرو۔ مگر لکڑی نہ ہو کنڈے ہوں۔ لڑکے نے سب سامان چٹکیوں میں لیس کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ پیتل یا لوہے کا ایک پتر لاؤ۔ جو طول میں دو انگل سے زیادہ نہ ہو وہ فوراً ایک لوہے کا پتر لایا۔ بابا جی نے فرمایا کہ

اس کو ہانڈی میں ڈال دو، اور پاؤ بھر پانی میرے پاس لے آؤ۔ پانی کو لے کر آپ نے کچھ پڑھا اور ہانڈی میں اس کے سامنے پانی ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پڑیا دی اور کہا کہ سفید سفید دوا اس میں ڈال دو۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک بابا جی بیٹھے رہے، آدھ گھنٹے کے بعد مہاجن کا لڑکا مکان کے اندر گیا، اس موقع کو غنیمت جان کر بابا جی نے لوہے کا پتر نکال لیا۔ اور سونا اپنے پاس سے ہانڈی میں ڈال دیا۔ اور روانہ باشد۔ مہاجن کا لڑکا جو باہر آیا تو بابا جی ندارد چو طرفہ ڈھونڈھ مارا مگر بے سود۔ ہانڈی کو جا کر دیکھا تو لوہے کا پتر غائب۔ سونے کا تھکا موجود۔ محلے بھر میں خبر ہو گئی۔ پھر تو بابا جی کی سب کو جستجو ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ نوبت با ینجا رسید کہ ایک مالدار کی بیوی نے اپنا زیور دے دیا۔ کہ اس کے سونے کو ایسا کھرا کر دو کہ پچاس کے درسے بکنے کے لائق ہو جائے۔ بابا جی نے جو کوئی پانچ چھ ہزار کی رقم پائی تو فقرّو۔ اہلِ پولیس نے بڑی سرگرمی کی مگر نہ ملے نہ ملے۔ ایک برس کے بعد پرسوں پکڑے گئے۔ اب ہتکڑی پڑی۔ خدا نے چاہا تو چودہ برس کے لیے بھیجے جائیں گے۔ حضرت زمانہ بڑا نازک ہے۔

ایک عروس نازنین کا دلہن بنتے ہی بیوہ ہونا اور خلق خدا کا فرطِ الم سے آٹھ آٹھ آنسو رونا

اس شہر مینو سواد غیرت بہشت شدّاد، میں میاں آزاد :

ماکوس بادشاہی دستِ جنون زدیم
تختِ رواں آبلہ در زیر پا می ماست

کہتے ہوئے آزادانہ و بیباکانہ گھومنے لگے۔ ان کے شفیق بالتحقیق اور ہمدرد و رفیق، میاں خوجی چیرۂ زعفرانی بر سر، اور لباس پہلوانی در بر فرضی قرولی در کمر، اس قطع کے ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ دونوں بے فکرے وہ دین دنیا سے آزاد۔ یہ آزادوں کے بھی استاد۔ ع۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو، جدھر سینگ سمایا ادھر بستر جمایا۔ جہاں جی چاہا وہاں پڑاؤ ڈالا۔ ع۔ نے غمِ دُزد نے غم کالا، فکر کے پیٹ میں بھالا۔ فکر چہ کسی ست کہ پیش مرداں آید۔ جورو نہ جاتا۔ اللہ میاں سے ناتا۔ خیر دونوں یار وفادار بے فکروں آوارہ گرداروں کے سرداروں نے شہر بھر کی خاک چھانی۔ گھومتے گھومتے ایک میدانِ

فراخ میں پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک اونچے ٹیکرے پر ایک درویش شیخوخیت دستگاہ اور ارد گرد دس پانچ آدمی بیٹھے ہیں۔ اور شاہ صاحب اونچے سروں میں بلحن داؤدی گا رہے ہیں کہ :

نورِ نبوی در نظر ماست ہویدا — روشن تطرانیم و غمی رانشناسیم
بردانشِ ما انجم و افلاک بخندند — گر صاحب لولاک لما رانشناسیم
فردای قیامت بہ پناہی نہ گریزیم — گر آن مہ و خورشید لقارا نشناسیم
فیضی نشود خاتمۂ ما بہ ہدایت — گر ختمِ امامانِ ہدا را نشناسیم

ادھر درویش حق آگاہ عمدہ عرفائے اہل اللہ نے اس غزل نعتیہ کو ختم کیا۔ ادھر حاضرین نے باآواز بلند کہا کہ صلی اللہ علیہ و آلہ واصحابہ اجمعین۔ اتنے میں ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا کہ شاہ جی ایک سوال ہے۔ جلد اس کا جواب لطف فرمائیے۔ مجھ سے ایک شخص سے لاگ ڈانٹ ہے۔ وہ میرا دشمنِ خونخوار، میں اس کا عدو اور درپے آزار۔ وہ میرے خون کا پیاسا میں اس کی جان کا خواہاں۔ اس وقت مجھے ایسا موقع ہاتھ آیا ہے کہ اگر میں اپنے دل کا بخار نکالوں تو وہ تمام عمر مصیبت اور تباہی اور رنج و غم، اور ماتم و الم ہی میں بسر کرے اور کرتے دھرتے ایک نہ بن پڑے۔ وجہ یہ کہ اس نے نشے کی حالت میں ایک روز سرِ بازار، مجمع میں کروروں گالیاں دیں، اور میرے ٹپے پکڑ کر دے پٹکا۔ اور پھر کئی بار رپٹنیاں دیں، اور خلق خدا کے سامنے مجھے ذلیل و خوار کیا۔ دوسرے دن جب نشہ ہرن ہوا تو قدموں پر گر پڑا اور خواہاں عفو تقصیر ہوا۔

درویش : ع۔ در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست؟ انّ اللہ مع الصابرین :

داروبزرگی بجہاں ہر کسی این — من در خطا بزرگم وا دور عطا بزرگ

خوجی : واہ اچھی صلاح دی۔ کوئی پانچ لگائے اور آپ کہیے کہ۔ ع در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست،، اچھی لذت ہے ہم تو قرولی بھونک دیں واللہ۔

آزاد : (خوجی سے) کیا بکتا ہے نامعقول (درویش سے) آپ کی حکیمانہ اور بزرگانہ صلاح قابل صاد ہے (اس شخص سے) اسی رائے صائب پر عمل کیجیے!

شخص : چین بجبیں ہو کر کھڑے کھڑے انتقام لوں گا ابھی ابھی سمجھوں گا۔

وہ تو یہ کہہ کر چل دیے۔ مگر میاں آزاد کے دل پر درویش طیب النفس کی صلاح نے

بڑا اثر کیا۔ علماء کمال کے مزاج دان تو تھے ہی، سمجھے کہ یہ کوئی بڑے نامی گرامی بزرگ ہیں۔

آزاد : حضرت جی چاہتا ہے۔ عمر بھر آپ کی خدمت کیا کروں۔

درویش : آپ کی نوازش۔ آپ کا حسنِ اخلاق۔ میں تو اس لائق ہوں نہیں۔ مشتِ خاک مضغۂ گوشت۔ اذلِ خلائق۔ اضعف العباد :

در ریاضِ آفرینش لالہ سان روئیدہ ام
پای در گل، داغ بر دل شعلہ در دامانِ ما

جب اور حوالی موالی اٹھ گئے، تو میاں آزاد اور خوجی اور وہ درویش خدا ترس اکیلے رہ گئے۔

خوجی : کیوں شاہ صاحب! آپ تو تمام شب یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہوں گے۔

درویش : (آہ سرد کھینچ کر) نہ۔ پانچ وقت نماز پڑھ لیتا ہوں اور دوسرے تیسرے تلاوت قرآن شریف۔

خوجی : آپ خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔

درویش : میں خدا ہی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں خدا رسیدہ کے معنی ہی نہیں سمجھا آج تک۔

خوجی : حضور کی دعا میں بڑی برکت ہے :

روے مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند
سببش بندگی حضرتِ درویشان ست

درویش : بھائی میں کیا میری دعا کیا۔ یاد رکھو۔ ع۔ "بے رضائے تو یکے برگ نہ جنبد ز درخت" یہ دعا تو صرف تشفی قلب اور تسکینِ دل کے لیے ہے باقی خیر صلاح۔

خوجی : پیر و مرشد یہ سچ فرمایا آپ نے۔ جو روزِ ازل سے قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ دعا کیا کر سکتی ہے۔

درویش : میں قسمت کے لکھے کو بھی نہیں سمجھتا کہ اس کے معنی کیا۔ ملّا توفیق کشمیری خوب کہہ گئے ہیں۔ ؎

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم — کنند باز کہ آں روز باز خواہ نیست
بکن مقابلہ آنرا بسر نوشت ازل — اگر زیاد و کمی باشد آں گناہ نیست

آزاد : آپ کے خیالات نفیسہ کو بعینہ اپنے خیالات کے مطابق پایا۔ اس وقت میرا

دل فرطِ طرب سے جامۂ جسم میں نہیں سماتا۔ معاف فرمائیے گا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ جیسے اور آدمی درویش باکمال بن بیٹھے ہیں، اور عوام کو دھوکا دے کر گمراہ کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے بھی اس ٹیکرے کو رونق بخشی ہے۔ مگر بحمد اللہ کہ میری رائے غلط نکلی۔ آپ بڑے راست باز اور صاحبِ طبع رسا اور معدنِ صدق و صفا ہیں۔ ورنہ لوگ تو فقیر کے پردے میں دام تزویر بچھاتے ہیں، اور ضعیف الاعتقادوں کو لوٹ کھاتے ہیں۔

درویش : (آہ سرد بھر کر) حضرت کچھ نہ پوچھیے، نہ میں نے فقیروں کے بھیس میں سیّاحی اختیار کی ہے۔ لیکن جس ملک میں جس صوبے، جس شہر، جس قصبے، جس گاؤں میں پہنچا وہاں عامۂ خلائق نے آن کر گھیر لیا۔ اب کوئی تو کہتا ہے کہ میرا لڑکا ماندا ہے پھونک ڈال دو۔ میں کس کس سے کہوں کہ یہ جھاڑ پھونک سب باتیں ہیں۔ ع۔ بے رضائے تو یکی برگ بجنبد ز درخت،، ایک تو یوں ہی عصیان کے بحرِ قہّار میں ڈوبا ہوا ہوں، دوسرے شیطان کا مرید بن کر عوام کو گمراہ کروں، جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے ان کو بہکاؤں، اور ان کا مال حرام طور پر اڑاؤں، یہ مجھ سے حشر تک نہ ہوگا۔ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ جھاڑ پھونک سب ڈھکوسلا ہے:

سر تا سر دفترم سیاہ است　　　دیباچۂ نامہ ام سیاہ است

کوئی لڑکا مانگتی ہے (مسکرا کر) اور میں بوڑھا آدمی کس کس کو سمجھاؤں کہ ارے غافلو اولاد خدا کی دین ہے۔ کہیں فقیروں کی دعا سے لڑکے پیدا ہوا کیے ہیں۔ ع۔ بے رضائے تو یکی برگ بجنبد ز درخت،، کوئی کہتا ہے کہ آپ کی دعا سے میری شادی ہو جائے تو آپ کی خدمت کروں۔ اب فرمائیے ان کے لیے بی بی کہاں ڈھونڈھتا پھروں۔ ع۔ بے رضائے تو یکی برگ بجنبد ز درخت،، کوئی آن کر کہتا ہے کہ میں کسی عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہو جاؤں، تو آپ کو جاگیر دوں۔ غرض کیا کہ حضرت میں جاگیر سے باز آیا۔ آپ اپنی جاگیر رہنے دیں۔ میں حاکم نہ حاکم رس۔ پھر نوکری میرے امکان میں کہاں بھلا۔ ع۔ بے رضائے تو یکی برگ بجنبد ز درخت، الغرض میرا تو بیٹھنا لوگوں نے دوبھر کر دیا۔ ناک میں دم آگیا۔ جو آتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ کچھ دعا کیجیے۔ اور یہاں دعا جانتے ہی نہیں۔ کہ کہتے کسے ہیں۔ دعا سے ہو کیا سکتا ہے۔ ع۔ بے رضائے تو یکی برگ بجنبد ز درخت،، افسوس کہ ہم نے کچھ نہ کیا آئے تھے معصوم اور جائیں گے عاصی پُر معاصی:

بگریہ زادم و با گریہ از جہاں رفتم　　　دریں خرابہ چناں کل عدم چنان رفتم

چنانکہ شیر کند خواب طفل با شیریں　　　　فزدہ غفلت من ہاز سفید مو یہا

خوجی: دونوں اچھے ملے۔ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔

درویش: ع۔بے رضائے تو یکی برگ نجنبد ز درخت،، اور ہم اس کو بھی دیوانہ پن سمجھتے ہیں۔کہ املی کی پتیاں کھانے لگے، اور ایک ہاتھ کو اٹھایا تو عمر بھر اس سے کام ہی نہیں لیتے۔ بولنا چھوڑ دیا۔اب اشاروں سے باتیں کرتے ہیں۔یہ سب بناوٹ ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر ست　　　　از ہزاران کعبہ یک دل بہتر ست

بولنا چھوڑ دیا مگر دل ہی دل میں گالیاں دے رہے ہیں۔ایک ہاتھ سے کام نہیں لیتے مگر دوسرے ہاتھ سے حرام چوری مکاری کا مال صرف کرنے کو مستعد۔ایسے ریا کاروں سے مرد زیرک کو احتراز لازم ہے۔اپنا تو یہ مقولہ ہے:

گر گو ہر طاعتت نہ سفتم ہرگز　　　　در خاک ورت بدل نرفتم ہرگز

نومیدنیم ز بارگاہ کرامست　　　　زیراکہ دو را یکے نہ گفتم ہرگز

میاں آزاد اس تقریر سے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے کھلے جاتے تھے۔خیر تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہوئے۔اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں ایک سانحۂ ناشنیدنی و عبرت خیز اور واقعہ نادیدنی و حیرت انگیز نے ان کو افسردہ اور پژمردہ کر دیا۔اس داستان عبرت عنوان و حسرت توامان کے لکھتے سے کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔صریر قلم صدائے الاماں سناتا ہے۔اُف! ہائے افسوس وائے افسوس! ہمارے ناظرین با تمکین کے شیشۂ دل پر اس سنگ سانحۂ جان کاہ سے ٹھیس لگے گی اور رقیق القلب آدمی آٹھ آٹھ آنسو روئیں گے۔

اب سنیے کہ ایک زمیندار باوقار، متقی و پرہیزگار کے فرزند دلبند و جگر پیوند کا کسی دوسرے گاؤں میں نکاح ہوا اور دولہا دلہن کا انھیں کی مرضی سے بیاہ ہوا۔دلہن اس نوجوان کے گل رخسار پر ہزار جان سے مثل بلبل عاشق تھی اور وہ اس پیاری لڑکی کے حسن گلو سوز کا شیفتہ و شیدا۔دونوں نے منھ مانگی مراد پائی تھی۔بعد مدت دلی آرزو برآئی تھی۔وہ خوش و خرم کہ جس پری پیکر رشک قمر سے آنکھ لڑی، وہی ہتے چڑھی۔یہ ہشاش بشاش کہ جوان طناز پایا، جس کے لیے منت مانی تھی اسی کے ساتھ نکاح پڑھوایا۔ناظرین فسانہ خود غور کر سکتے ہیں، کہ جب کبھی کسی جوانان صالح کو حسب دلخواہ گل عذار و طرحدار نیک

ذات، و پاکیزہ صفات، خوش سیرت، خوبصورت، پارسا و مہ لقا، اور کم سن بیوی ملے تو اس کو کیا کچھ فرحت اور مسرت حاصل ہوگی۔ بس کچھ نہ پوچھیے۔ کوئی پیاری کنواری لڑکیوں اور شریف زادیوں کے دل سے پوچھے کہ ان کو اس بات کی کیسی ٹوہ رہتی ہے کہ جس لڑکے کے ساتھ ان کا بیاہ ہونے والا ہے، وہ بد وضع یا بد قطع تو نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ وہ عالی خاندان بھی ہے۔ معالی دودمان بھی۔ خوش رو بھی ہے۔ خوشخو بھی ہے۔ صحبت اور تعلیم بھی اچھی پائی ہے۔ علما و فضلا تک بھی رسائی ہے۔ تو پھر مارے خوشی کے باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اس دلہن کی آنکھ جب سے زمیندار کے لڑکے پر پڑی تھی اور جب سے اس کی آنکھ جادو نگاہ روکش مہر و ماہ سے لڑی تھی دونوں راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعا مانگتے تھے کہ بارِ خدایا ہمارا نکاح ہو، خداوند ہم دونوں کا آپس میں بیاہ ہو! دل ہی دل میں وہ پیاری لڑکی کہتی تھی کہ الٰہی وہ دن جلد دکھا کے میرے دروازے پر میرا دولہا آئے، اور وہی پیارا جوان مجھے ہنسی خوشی بیاہ لے جائے اب یہ بیان لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ کہ زمیندار کا لڑکا جس وقت دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے چلا اور دُلہن کو زنانے کمرے میں بٹھا کر ریل کے ایک درجے میں قدم رکھنے ہی کو تھا کہ ایک شقی القلب نے تیغ خون آشام نیام سے نکالی واحسرتا!

اس وقت فرطِ الم سے ہمارا دل اس قدر بھر آیا کہ قلم رک گیا۔ طوفانِ اشک مثل سیل عظیم امڈا چلا آتا ہے۔ حضرت یہ چوٹ کھایا ہوا دل ہے:

اشکم بردن می انگند راز درون پردہ را
آری شکایت ہا بود از خانہ بیرون رفتہ را

حضرت ناظرین! اب کلیجے کو تھام لیجیے اور ضبطِ گریہ کیجیے۔ اور سنیے! کہ اس جوان طنّاز صالح و پاکباز نے جیسے ہی ریل کے ایک گاڑی میں بایاں قدم بڑھایا تھا، ویسے ہی اس شقی نے شمشیر و پیکر سن سے نکالی۔ تلا ہوا ہاتھ اس جوان پر لگا یا کہ سر کو تا رُخِ انور کاٹ کر جگر کو کاٹتا ہوا کمر تک آیا۔ افسوس کہ وہ مقتول پیچھے پھر کے اپنے قاتل کو دیکھنے بھی نہ پایا تھا، کہ مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا اور اسٹیشن پر اس بے گناہ بے بس و بے کس کی لاش پھڑکنے لگی:

زدست و بازوں گشتہ تو شد معلوم   کہ بعد کشتہ شدن ہم تلاشہا باقی ست

ادھر اس کی لاش خون میں آغشتہ پھڑک رہی تھی اور ادھر اجل سر بالیں کھڑی ہنس رہی تھی، کہ میاں صاحبزادے اب کس کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارتے ہو۔ اُف! اُف! اس بے چاری دلہن کو ابھی معلوم ہی نہیں کہ اس پر کیا بجلی گری وہ، ہنس ہنس کر اپنی دایہ کی چھوکری سے کہہ رہی ہے کہ کیوں دل بہار ہمارے میاں کو دیکھ کر تمھیں حسد تو نہیں ہوتا۔ یہ خبر ہی نہیں کہ میاں نے جان آفریں کو جان سپرد کر دی اور داغِ مفارقتِ ابدی دے گئے۔ اتنے میں اسٹیشن پر کہرام مچ گیا۔ صدہا آدمی دوڑ پڑے اور غل غپاڑے کی آواز بلند ہوئی۔

دلہن : دل بہار۔ دیکھو یہ غل کیسا ہے۔ ذری جھانک کر دیکھا تو۔

آوازِ غیب : ندی کنارے دھواں اُٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے۔
جہ کے کارن میں جوگن بھئی وہی نہ جلتا ہوئے

دل بہار : (جھانک کر) ہے ہے کسی نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ چبوترا سارا لہولہان ہے۔

دلہن : ارے! توبہ توبہ! کیا جانے کون تھا بے چارہ۔

دل بہار : (پھر جھانک کر) ہیں! ہیں! خیر تو ہے لاش کے سرہانے کھڑے تمھارے دیور رو رہے ہیں۔

ایک دفعہ لاش کے پاس سے آواز آئی کہ ہائے! میرے ارے میرے بھائی تو کدھر گیا۔

دلہن : (کلیجہ دھک دھک کرنے لگا) ہائیں! بھائی بھائی کر کے کون روتا ہے۔ اُف ارے میں لٹ گئی۔ (ریل سے اتر کر چھاتی پیٹتی ہوئی چلی) حضرات ناظرین:

جائے نشاطِ نیست خطرگاہِ روزگار   پست و بلند آں سرِ دارست و پائیدار

یہ اسٹیشن پر کون مصیبت زدی جاتی ہے۔ ہائے یہ وہ شکر لب ہے جو ناز و نعم سے پالی گئی تھی۔ جو کبھی اپنے مکان کی ڈیوڑھی تک نہیں گئی تھی۔ وہ اب ہزاروں آدمیوں کے غول میں روتی چلاتی ہوئی جاتی ہے۔ نعش مقتول کے قریب پہنچی تو ہائے کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ کرّوبیوں نے عرشِ بریں کو تھام لیا۔ شیروں کے کلیجے دہل گئے۔ رستم قبر میں کانپ اٹھا۔ اسفندیار کی روح تھر تھرانے لگی۔ ثورِ فلک اور گاوِ زمیں کا کلیجہ لرزنے لگا۔ فرطِ حیا اور جوشِ جنون، اور طغیانیِ بحرِ الم سے نظر بھر کر نعشِ بیکفن کو نہ دیکھ سکی:

من ازحیا نتوانم کہ بر رخت نگرم — تراخیال کہ مستغنی از وصال توام

دلہن : زبان حال سے :

ای بی تو حرام زندگانی — جز بی تو کدام زندگانی
بی روی خوشش تو زندہ بودم — مرگی ست بنام زندگانی

نعش بے کفن : زبان حال سے :

گر اضطراب ندارم زآرمیدن نیست — شہید عشق ترا فرصت تپیدن نیست،

دلہن : زبان حال سے :

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روی گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نعش بے کفن : زبان حال سے :

شہید حسرت آغوشت اے نازک بدن گشتم — بجای موی سرور ماتم بند قبا بکشای

دلہن : ہائے لٹ گئی لوگو! یہ کیا. بجلی گرائی (متحیر ہو کر) ارے لوگو یہ ہوا کیا۔

دل بہار : ہے ہے دلہن لٹ گئی۔

دلہن : (چھاتی خوب زور سے پیٹ کر) ہے ہے کس کی دلہن۔ دلہن کون تھی۔ ہائے میں تو بیوہ ہوں۔

اتنے میں اسٹیشن کی دو چار عورتیں، اسٹیشن ماسٹر کی بیوی، گارڈ کی لڑکی۔ ڈرائیور کی بھتیجی۔ کنجی کھولنے والی مسرائن نے قریب آن کر اور رو رو کر سمجھایا :

دلہن : خواہم کہ بر آں سینہ نہم سینۂ خود را
تا دل بتو گوید غم دیرینۂ خود را

یہ شعر زبان سے پڑھ کر پھر نعرہ (ہائے) بلند کیا اور دھم سے نعش پر گر پڑی، اور اپنے پیارے شوہر کا ساتھ دیا۔

حضرات ناظرین۔ یہ اسی دنیا کے لیے حضرت انسان بغض اور عداوت اور تعصب کے پتلے بنے ہوئے ہیں :

افسوس کہ عمر رفت و ہشاری نیست — دردا کہ خیال خویشتن داری نیست

فغاں کہ قافلۂ عمر رفت نیم قدم
طریق راست نہ پیمود نفس کاہل ما

میاں بیوی عاشق و معشوق کی لاشیں دیکھ کر بڑے بڑے سنگ دل آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ اسٹیشن ماتم کدہ بن گیا تھا۔ چو طرفہ کہرام مچا ہوا تھا۔ دونوں کی نعشِ بے کفن کے گرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ زن و مرد سب حسرت اور عبرت اور حیرت کی نظر سے لاشوں کو دیکھتے تھے۔ استعجاب تھا کہ یا للعجب یہ کیا بوالعجبی ہے۔ جسے دیکھو انگشت حیرت در دہاں جس پر نظر ڈالو مصروفِ آہ و فغاں کلیجہ منھ کو آتا تھا۔ سینہ شق ہوا جاتا تھا۔ میاں کی لاش پر بیوی کی لاش کو مرغ بسمل کی طرح تڑپتے دیکھ کر روح پر صدمہ تھا۔ چند منٹ میں لاش تڑپ کر سرد ہو گئی۔ ہے ہے! کیا سانحۂ روح فرسا ہے۔ ہے ہے! کیسا واقعۂ جاں گزا ہے۔ دلہن کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی۔ چھپکا زیب سر۔ عروسی لباس زیب بر، زلف چلیپا تا کمر، سر سے پاؤں تک زیور ہی زیور۔ مگر دم کے دم میں خون در جگر۔ وہ جوش، وہ خروش۔ وہ ولولے۔ وہ شوق، وہ خواہش، وہ امنگ، سب خاک میں مل گئی۔ دل کی دل ہی میں رہی۔ شب عروسی کی شکل ہی نہ دیکھی کہ روز ہجراں نصیب ہوا۔ اسٹیشن تک ابھی ابھی فنس پر چڑھ کر بصد کر و فر آئی تھی۔ اب تابوت میں جائے گی۔ جہیز ابھی میکے سے سسرال جانے بھی نہ پایا تھا کہ قبر کی فکر ہونے لگی۔ ابھی لباس سے عطر فتنہ کی مہک آ رہی تھی کہ کافور کی تدبیریں ہونے لگیں۔ صبح کو دروازے پر روشن چوکی اور شہنائی بج رہی تھی۔ اب صدائے ماتم بلند ہے۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ اہل شہر گھروں اور چھتوں اور دکانوں سے برات دیکھ رہے تھے۔ اب جنازہ دیکھیں گے۔ اس دلہن کا دیور معصوم لڑکا، بارہ تیرہ برس کا سن، اس واقعے کو دیکھ کر دنگ ہو گیا اور مثل پیکر تصویر خاموش کھڑا رہا۔ آتش غم اشکوں کو بھی جھلسا دیا۔ چہرے سے انتہا کی حیرت ٹپکتی تھی۔ کہ یہ کیا ہوا۔ آخر کار بیخود ہو کر گر پڑا۔ لوگ سمجھے کہ اس بے چارے کم سن نے بھی عاقبت کی راہ لی۔ مگر گلاب چھڑکا، کیوڑا ڈال کر سوندھی سوندھی مٹی ناک کے پاس لے گئے لخلخہ سونگھایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن صورت ایسی مہیب کہ دیکھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ دل بہار دونوں لاشوں کے پاس بیٹھی تھی۔ مگر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ دل بہار دلہن کے ساتھ کھیلی تھی۔ اور ہم سن ہونے کے سبب سے وہ اس کنیزک زادی کو بہت چاہتی تھی۔ تمام عالم اس کی نظروں میں تیرہ و تار تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا۔ دولہا کا خدمت گار باورچی سپاہی اس قاتل شقی کو زور زور سے جوتے اور تھپڑ لگا رہے تھے۔ اور اپنے آقا زادے کو یاد کر کے ڈھاروں ڈھار روتے جاتے تھے۔ خیر اسٹیشن ماسٹر نے دو پلنگ منگوائے اور ان کی لاشوں کو عزت کے ساتھ

اٹھواکر اسٹیشن کے ایک صاف ستھرے کمرے میں رکھا اور اس مقتول کے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے جاکر اپنے کمرے میں بٹھا کر دلاسا دینے لگا۔ دل بہار ان دونوں کے سرہانے بیٹھی رو رہی اور پنکھا جھل رہی تھی۔ کہ مکھی نہ بیٹھنے پائے۔ خدمت گار کمرے کے باہر غمزدہ اور افسردہ پژمردہ اور نیم جان کھڑے رو رہے تھے۔

جس وقت یہ سانحہ ہوا تو گارڈ اور ڈرائیور اور خلاصی اور مسافر سب ریل پر سے اتر آئے۔ مسافروں نے کہہ دیا کہ اس وقت ہمارا دل بھر آیا ہے۔ ہم نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔ بلا سے ٹکٹ کے دام گئے اس قاتل خونخوار کو دیکھ کر سب کی آنکھوں میں خون ٹپکتا تھا، اور یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو بس اسی دم پیس ڈالیں۔ اتنے میں لال کرتی کا ایک گورا جو سانحہ ہوش ربا سے مارے رقت اور رنج کے بڑی دیر سے چلا چلا کر رو رہا تھا۔ ضبط غصہ نہ کر سکا۔ جوش میں آکر جھپٹا اور اس شقی کے پٹے پکڑ کر خوب پیٹا اور کئی بار کاٹ کاٹ کھایا۔ اور دانتوں سے بوٹیاں نوچ نوچ لیں۔ جو لوگ اور اہل کار اور مسافر اور ریل کے ملازم اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بھی دیدہ و دانستہ آنکھ چرائی اور ایسے ناہنجار کو پٹتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوئے۔

اتنے میں اس عروس کے گھر خبر ہوئی۔ تو کہرام مچ گیا۔ شادی کا گھر عزا خانہ ہوگیا۔ ہائے افسوس وائے افسوس کہیں ڈھول بجتی تھی کہیں ڈومنیاں رات بھر کی تھکی ماندی سو رہی تھیں اصیلیں خوش خوش پھرتی تھیں۔ دل بہار کی ماں اترائی جاتی تھی کہ اس کی لڑکی دلہن کے ساتھ گئی ہے۔ وہاں قدر و عزت سے رہے گی کہ دفعتہً یہ بجلی گری۔ اب وہاں کا حال ناظرین فسانہ خود قیاس کر سکتے ہیں کہ لڑکی کو رخصت کیے ہوئے پہر بھی نہ ہوا تھا، اور وقت رخصت جو آنسو فرطِ طرب سے والدین اور اعزا و اقربا کی آنکھوں سے نکل پڑے تھے وہ اچھی طرح خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ دولہا اور دلہن دونوں شہید ہو گئے۔ ریل کے اسٹیشن پر بے کسی کی حالت میں ان کی جانِ شیریں بصد تلخ کامی گئی۔ لڑکی کی ماں تو اس سانحہ جاں گزا کا حال عبرت مآل سنتے ہی بس بت بن گئی۔ رونا دھونا تڑپنا چلانا غل مچانا سر پیٹنا سب بھول گئے۔ حیران و ششدر رشتوں کے سہارے بیٹھی آنکھیں پھیر پھیر کے دیکھ رہی ہے۔ مگر صورت وہ مہیب کہ الاماں! گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب سر پیٹ رہے ہیں)۔ ڈومنیاں سوتے سوتے جاگ اٹھیں۔ ہے ہے خیر تو ہے سنتے ہی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ہائے صبح کو مبارک باد گاتی تھیں۔ اب آنسو بہاتی ہیں۔ جو جہاں تھا وہ وہاں ہی رہ گیا۔ لونڈیوں نے آسمان سر پر

اٹھایا۔ باہر سے خدمت گاروں اور نوکروں نے صدائے ماتم بلند کی۔ اس کے بوڑھے باپ کو جو خبر ہوئی تو وہ پیر مرد، خستہ جاں، خستہ دروں ہائے ہائے کہہ کر۔ ع۔ اٹھا تو گرا گرا تو بیہوش، ہوش آیا تو آنکھوں نے جواب دیا۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں :

ہر داغِ جگر شرر فشانش — زر خندہ چو شمع بر فغانش
فوارۂ خون ز دیدہ جوشید — زاں ساں کہ سحر شعاعِ خورشید
شد نالۂ زار شورش انگیز — مژگان گر دیدار غواں بیز
می خست دروں بناخنِ یاس — می شفت جگر بنوکِ الماس
جوشید بہ سینۂ تلخ آبش — موجی شدہ نبضِ اضطرابش
می گفت سخن باہ و زاری — می سوخت ز داغِ دلفگاری

کبھی دیوانوں کی طرح گریباں کو چاک کر ڈالا۔ کبھی خاک پر لوٹنے لگا۔ اب سمجھائے کون؛ سب صید یاس و حرماں۔ مصروف آہ و فغاں تھے۔ کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جسے دیکھو مارے غم کے بدحواس اور سراسیمہ ہوا جاتا تھا :

می گفت کہ ایں چہ فتنہ بر پاست — ایں گردِ خرابی از کجا خاست
یارب چہ کنم چہ چارہ سازم — چوں شمع بسوز جانِ گدازم
زیں نالۂ آتشیں ترانہ — شوری ست کرانہ تا کرانہ

اس دوختِ گلفام کی بوڑھی ماں، ایک ایک سے پوچھتی پھرتی تھی کہ ارے آخر تم روتے کیوں ہو۔ ہائے یہ ہوا کیا؟ دیکھو مجھے رونا نہیں آتا۔ میری پیاری لڑکی گئی گذری۔ ایک آنسو بھی میری آنکھوں میں نہ آیا۔ ان کے اعزہ میں سے تیس چالیس آدمی بصد حسرت و یاس، ماتم کرتے خاک اڑاتے اسٹیشن پر گئے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ہر در و دیوار سے صدائے ماتم بلند ہے۔ غریب و امیر، برنا و پیر، سب رو رہے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے روتے روتے ان سے کہا کہ اس کمرے میں جائیے اور وہ سب کے سب :

آمد بر آں دو خستہ خاطر — نورِ عشق بجوبہ دید ظاہر
حیرت زدہ روبرو نشستند — برلب در گفتگو بہ بستند
صد گونہ بہ خلق گفتگو بود — ہر سمت نوای ہای و ہو بود

دونوں کی لاش کو ان کے گھر لے گئے۔ راہ میں ہزاروں آدمیوں کا انبوہ کثیر اور جمِ غفیر،

ساتھ، سب گریہ و نالاں۔ قدم قدم پر آہ و فغاں۔ جن لوگوں نے ان دولہا دُلہن کی صورت خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی، جانتے بھی نہ تھے کہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں، وہ تک زار زار روتے تھے۔ اور چو طرفہ سے آدمی ٹوٹے پڑتے تھے ایک ایک پر دنش دنش اور بنیش بنیش گرے پڑتے تھے۔ لوگ اس طرح پر ماتم کرتے تھے کہ گویا ان کا کوئی خاص عزیز اور قریب کا رشتہ دار مرگیا ہے۔ دکانداروں نے جنازے کو دیکھا اور دکان بڑھا کر ساتھ ہوئے۔ عورتیں بازاروں اور جھروکوں اور کھڑکیوں اور چھتوں پر سے چھاتی پیٹتی تھیں۔ کہ ہے ہے! یہ کیا ہوا۔ خدا ایسی گھڑی ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ سواریوں پر سے رئیس زادے اتر اتر پڑے، اور جنازے کے ساتھ ماتم کرتے ہوئے چلے۔ اب ادھر کا حال سنیئے کہ اسٹیشن پر سناٹا اور اہل پولیس اس شقی القلب کو لیے ہوئے کچہری جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی بھیڑ ہے اور فرطِ جوش سے لوگ گھس بیٹھ کر اس کو مار رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کچہری تک جاتے جاتے ادھ مرا کر دیا۔ برق انداز بھی دانت کٹ کٹا کٹ کٹا کر رہ جاتے تھے۔ اشاروں سے لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ خوب گدّے لگاؤ۔ اور کچومر نکالو۔ یہ اسی لائق ہے۔ اتنی شہ جو پائی اور دنادن پڑنے لگیں۔ مگر اس سے کیا فائدہ، جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اتنے میں صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو انسپکٹر آئے اور انھوں نے بھیڑ کو قاتل کے قریب سے ہٹایا۔ جس وقت دونوں لاشیں گھر پر پہنچیں۔ اس وقت کے کہرام کا کچھ حال نہ پوچھیے۔ ناگفتہ بہ۔ اگر ہم کل حالات ہو بہو بیان کریں تو ناظرین بے اختیار رو پڑیں۔ ہائے افسوس! وائے افسوس! رباعی:

دی روز چناں وصال دل افروزی — امروز چنیں فراق عالم سوزی
افسوس کہ بر دفتر عمرش ایام — ایں را روزی نویسد آنرا روزی

اللہ بس باقی ہوس۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس وقت لاشیں دروازے پر پہنچیں، سارا شہر اس جگہ موجود تھا۔ مگر شانِ خدا۔ ایک پیر مردِ مقدس بھی وہاں وارد ہوئے۔ اس سانحۂ غمناک کو سن کر کمال افسوس کیا اور ایسے الفاظ زبان پر لائے کہ اس دختِ زہرہ جبین کے بوڑھے باپ کا دل دنیا ہی سے پھر گیا۔ اور غم والم رنج و ماتم بدرجہا کم ہو گیا۔ پیر مرد نے نہایت متانت سے عجیب لب و لہجہ میں کہا کہ:

پیر مرد: یارانِ رفتگان کو کیا رویئے مسرت

کیا تم روانہ سوئے ملکِ عدم نہ ہوگے

بھائی سنو! تم ہمارے ہم عصر ہو۔ اب ہم تم دونوں لبِ گور ہیں۔ اور دو چار برس بے حیائی سے جیے تو جیے۔ ورنہ اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ کسی کو ہم کیا روئیں۔ جس طرح تم آج اپنی پیاری بیٹی کو رو رہے ہو۔ اسی طرح کروڑوں آدمیوں نے اپنی اولاد کی وفات کا غم کیا ہوگا۔ مگر نتیجہ۔ یہ روتے کس زندگی کو ہو۔ جو ہوا وہ ہوا۔ بس اب صبرِ جمیل خدا تم کو عطا کرے۔ میرا لڑکا اور ایک ہی لڑکا، کیسا خوبصورت کہ گلاب کے پھول کی اس کے مقابل میں قدر نہ تھی۔ اور علم و فضل میں اس درجہ کمال حاصل تھا کہ سترہ برس کے سن میں دو عربی کی کتابوں کا مصنف ہوا۔ مگر اجل نے اس کو نہ چھوڑا۔ شادی کے دوسرے ہی مہینے دردِ قولنج میں تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ اب نوجوان بہو معصوم بے چاری گھر میں بیٹھی ہے تم خدا کا شکر کرو کہ تمھارے داماد کے مرتے ہی لڑکی سچا عشق اور پاکبازی ظاہر کرکے چل بسی اور خلد بریں میں داخل ہوئی، ورنہ اگر بعد وفاتِ شوہر زندہ بھی رہتی تو اس کو دیکھ دیکھ کر تمھارے دل کا کیا حال ہوتا۔ جس دن میرا لڑکا مرا، میں درزی سے اس کے لیے کفن سلوارہا تھا، باہر سے ایک میرے دوست اسی دن وہاں آئے اور دروازے پر جمِ غفیر دیکھ کر پوچھا کہ خیر تو ہے۔ یہ کیا سلوا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میرا لڑکا جس کی عمر سترہ برس کی تھی آج صبح کورہ گرائے عالمِ بقا ہوا۔ اب میں اس کے لیے کفن سلوارہا ہوں یہ اس کی آخری خدمت میرے تعلق ہے۔ پھر وہ کہاں میں کہاں۔ لوگوں کا دل بھر آیا اور جو اہلِ دل تھے انھوں نے میری پیٹھ ٹھوکی کہ واہ رے استقلال اور اللہ رے صبر۔ سبحان اللہ!

بھائی رنج و شادی خانہ بربادی خانہ آبادی، اس جہاں میں توام ہے۔ مرنا اور جینا لازم و ملزوم ہے۔ کوئی عنفوانِ شباب میں مرا کوئی پیرانہ سالی میں مگر:

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید   زِ جام دہر مے کلّ من علیہا فان

اس سے کسی کو مفر ہی نہیں۔ پھر اس کا افسوس ہی کیا۔ جو مرا وہ اچھا گیا۔ اب تم کہا مانو کہ رنج و غم کو دل سے بھلادو۔ وہ خدا کی امانت تھی۔ خدا کے سپرد کردی گئی۔ پھر اس میں آپ کا کیا اجارہ ہے۔ انسان کو ہر حال میں شاکر رہنا چاہیے۔ مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ عورتوں کو رونے دیجیے، وہ یہ باتیں کیا جانیں۔ آپ تو جانتے ہیں:

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ تو فرمائیے کہ موت سے کون بچ جائے گا۔ کیا آپ نہ مریں گے پھر رونا دھونا کیا ہے۔ ضبط کرنا فرائض انسانی میں سے ہے۔

اس تقریر پُر تاثیر نے اس پیر فرتوت، غم دیدہ و ستم زدہ کے دل پر بڑا اثر کیا اور اس نے کہا کہ حضرت آپ میرے لیے اس وقت خضر ہو گئے۔ بلکہ عجب نہیں کہ آپ خضر ہی ہوں۔ اور میری یہ مصیبت دیکھ کر انسان کی شکل میں آئے ہوں کہ مجھے سمجھایئے اور میرے غم کو دور کیجیے:

اے خدا قربانِ احسانت شوم　　　　این چہ احسان ست قربانت شوم

ہے ہے! گھر سے رونے کی آواز آئی تو کلیجہ شق ہو گیا۔ اب ضبط کرنا محال ہے۔ مگر آپ کی صلاحِ نیک کا قدم قدم پر خیال ہے۔ ممکن کیا کہ اشک آنکھوں سے جاری ہوں۔

اُدھر قاتل کی تحقیقات کی گئی۔ تو معلوم ہوا کہ وہ وہی شخص تھا جو اُس درویش کے پاس بیٹھا تھا۔ اور جس نے درویش سے پوچھا تھا کہ ایک آدمی سے اور مجھ سے لاگ ڈانٹ ہے کہیے تو اس کو مار ڈالوں۔ دیوانہ پن کی حالت میں گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا باپ اس کو زنجیر پہنا کر رکھتا تھا، مگر بے سود۔ ایک روز زنجیر تڑا کر وہ راہی ہوا اور گاؤں سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت کچھ تلاش کی گئی مگر پتا نہ ملا نہ ملا۔

جب تحقیقات ہوئی تو اس نے اجلاس پر بیان کیا کہ۔

مجرم : ہو ہو ہو ہو، قہ قہ، ضیق النفس۔ ع۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم ،، ادب ادب سے کام کرو۔

عدالت : یہ سودائی نہیں ہے بنتا ہے۔

ڈاکٹر : (امتحان لے کر) نہیں۔ خلل دماغ تو تھا۔ مگر قتل، اس نے ثباتِ عقل میں کیا۔

الغرض سشن سے پھانسی کا حکم ہوا۔

صبح کے وقت جیلخانہ میں پھانسی آئی اور کانسٹبلوں کے کئی گارد اور کئی افسر خاکی وردی پھڑکاتے سنگینیں چمکاتے ہوئے رپ رپ کرتے آن موجود ہوئے۔ قاتل بھی آیا۔ پھانسی کو دیکھ کر بدن کا خون خشک ہو گیا۔ اور چہرے پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک دفعہ ہی اس نے بڑی حسرت اور مایوسی کے ساتھ کہا کہ بھائی ہندو رام رام، اور بھائی مسلمانو سلام۔

یہ فقرہ سن کر کل حاضرین کا جو کوئی دس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ دل بھر آیا۔ مجرم نے

پھر پھانسی کی طرف نظر کی اور کانپ اٹھا۔ کانپتے تھراتے ہوئے یہ اشعار پڑھنے لگا:

کوئی دم کیجیے کس طور سے آرام کہیں　　چین دیتی ہی نہیں گردش ایام کہیں

صیدِ لاغر ہوں مری جلد خبر لے صیاد　　دم نکل جائے تڑپ کر نہ تہِ دام کہیں

خوجی: کیوں میاں شعر تو اس نے کچھ بے تکے سے پڑھے بھلا اس وقت اس کا کیا ذکر تھا۔

آزاد: چپ بھی رہو بس تم کو تک بندی ہی کی سوجھتی ہے اور اس بے چارے کی جان پر بن آئی ہے:

انھیں کچھ رحم بھی آتا ہے یارب وقت خونریزی　　چھری جب حلق عاجز پر رواں جلاد کرتے ہیں

الغرض پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور لاش پھڑکنے لگی۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ دفعتہً ایک شخص گھوڑا کڑکڑاتا اور سرپٹ دوڑاتا ہوا سامنے سے آرہا ہے اور دم کے دم میں داخل جیل خانہ ہو کر اس نے کہا کہ رکو ابھی پھانسی نہ دینا اور وہاں لاش پھڑپھڑا رہی تھی۔ حضرت دل کا بھی عجب حال ہے۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ، ابھی دو ہی دن ہوتے کہ شہر بھر اس قاتل کے خون کا پیاسا تھا۔ کسی نے دانتوں سے بوٹیاں نوچیں کسی نے کاٹ کھایا۔ کسی نے اس زور سے چٹکی لی کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ سب دست بدعا تھے کہ اس شقی القلب کو ایسی سخت سزا ملے کہ اس کی بوٹیاں اڑائی جائیں۔ تکے اس کے بدن کے چیل کوّے کھائیں۔ زندہ دفن کیا جائے اور آج لاش کا پھڑکنا دیکھ کر اکثروں کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ بہتوں نے افسوس کیا۔ تو وجہ کیا۔ اس وقت اس کو بے بس حالت میں دیکھ کر اس کا قصور، اس کا گناہ اس کا جرم کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ جس وقت پھانسی پر چڑھایا گیا اور لاش پھڑکنے لگی، تو ایک شخص رہوار باد رفتار کو سرپٹ دوڑاتا، اور کڑکڑاتا اور چمکاتا ہوا آیا۔ جیسے ہی جیل خانہ میں داخل ہوا ویسے ہی پکارا کہ روک لو روک لو، مگر اسی دم لاش کا پھڑکنا موقوف ہوا اور لاش سرد ہو کر گھومنے لگی۔ اس واقعۂ دردانگیز کو دیکھ کر وہ سوار دھم سے گھوڑے پر سے گر پڑا۔ اور گرتے ہی کہا کہ یہ تیسرا تھا۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ سمجھ گئے کہ اس کے اعزّہ میں سے کوئی ہو گا۔ قریب جا کر سنتری نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے دیوانہ وار تلطر کر کے کہا، کہ یہ تیسرا تھا۔ اتنے میں داروغہ جیل نے پوچھا کہ تم کون ہو بھئی، اور یہاں اس وقت کیوں آئے ہو۔ اس نے پھر آہستہ سے کہا کہ یہ

تیسرا اٹھا۔ اب ایک ایک آدمی اس سے پوچھتا ہے کہ میاں تم کون ہو۔ اور یہ روک لو روک لو کی آواز کیوں دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ یہی کہتا ہے کہ یہ تیسرا اٹھا۔ یہ معمّا کسی پر نہ کھلا۔ سمجھ میں نہ آیا چوطرفہ لوگ حیرت زدہ کھڑے تھے۔ لاکھ لاکھ تدبیروں سے اس سے پوچھا مگر وہ یہی کہا کیا کہ تیسرا اٹھا۔ اب اس کے ارد گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ میاں آزاد نے جو اس کی صورت پر بغور نظر ڈالی تو دیکھا کہ جوئے اشک اس کی آنکھوں سے رواں ہے، مگر چلانے اور آہ سرد بھرنے کی طاقت جسم میں نہیں۔ بآواز بلند میاں آزاد نے کہا کہ ارے یارو اس خستہ درول سے کیا پوچھتے ہو کہ تو کون ہے۔ ہمارا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ یہ اس شخص کا باپ ہے۔ اس کے اشک اس کے دردِ دل کی خبر دیتے ہیں۔ یہ آنسو نہیں ترجمانِ دل ہیں۔ اس کے جسم کے ہزار ہزار قطرۂ خون ایک ایک اشک بن کر نکل رہے ہیں۔

آزاد : آپ کی حالت پر افسوس آتا ہے حیف صد حیف!

سوار : (آہستہ سے) بھائی یہ تیسرا اٹھا۔

آزاد : صبر۔ صبر۔ صبر۔ اور کیا کر سکتے ہو۔

سوار : (اور بھی آہستہ سے) ہائے یہ تیسرا اٹھا۔

حکام جو اس مقام پر کھڑے تھے اور جو اس پھانسی کی نگرانی کے منتظم تھے، اگرچہ ان کو پھانسی پر چڑھنے کے وقت اس نے ہزاروں بے نقط سنائی تھیں اور صدہا گالیاں دی تھیں۔ لیکن وہ حکام والا مقام بھی اس بوڑھے سوار کی یہ حالت دیکھ کر کفِ افسوس ملنے لگے، اور باہم کہنے لگے کہ اس پیر مرد کی حالت زار نے ہمیں افسوس ناک کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی نبض دیکھی تو کہا انتہا کا ضعف ہے۔ اس کا بچنا محال ہے۔ دو ہی چار دن کا مہمان ہے۔ اس کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اِس دھچکے کی یہ برداشت نہیں کر سکتا اور اس کا مر جانا بھی اب بہتر ہے۔ بہت جی کے کیا کرے گا۔ جیا بھی تو زندہ درگور پھر ایسا جینا ہی کیا۔ لَاحَولَ وَلَاقوۃ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بوڑھا اٹھ کر بیٹھا اور اس نے پھانسی کو نظر حسرت سے دیکھ کر کہا کہ یہ تیسرا اٹھا۔ میاں آزاد نے ایسے ہمدردی کے کلمے کہے کہ وہ ان کی طرف مخاطب ہو کر اور ان کو اپنا دلی دوست سمجھ کر یوں کہنے لگا:

بوڑھے کی داستانِ عبرت عنوان

میں قوم کا بنگش پٹھان ہوں۔ تین اوپر ستر برس کا سن ہوا۔ اس میں تین حادثے ایسے گذرے کہ میں بالکل مرہی مٹا۔ تین لڑکے تینوں نے پھانسی پائی۔ ایک نے علی مسجد کے قریب ایک کارواں پر چھاپا مارا۔ اس طرف لوگ بہت تھے اور ادھر کم، یہ فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اور کارواں والوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ حاکم و محکوم ایک کا اصلا خیال نہ کیا، اپنے آپ ایک پھانسی بنا کر اس کو لٹکا دیا۔ جس وقت اس کی لاش کو پھانسی پر سے اتارا، میں بھی شامتِ اعمال سے وہاں جا پہنچا۔ لڑکے کی نعش کو دیکھ کر غش کی نوبت آئی۔ مگر چپ۔ اگر ذرا ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس کا باپ ہے تو پھر مجھے بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ اس وقت کی کیفیت آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ اتنے میں ان سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ اس کا باپ ہے۔ یہ سنتے ہی دس پندرہ آدمی چمٹ گئے اور آگ جلا کر مجھ سے کہا کہ اپنے لڑکے کی لاش کو اس میں جلا۔ اُف! ہائے ستم، وائے ستم! میں بے خود ہو کر گر پڑا تو چھری کئی مقام پر چھبوئی۔ مجبور کیا کہ اپنے نورِ بصر لختِ جگر کی لاش کو اپنے ہاتھ سے جلاؤں۔ اُف! لیکن بھائی جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ عزیز کوئی شے ساری خدائی میں نہ ہوگی۔ میں نے اس لڑکے کو جو میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ انھیں ہاتھوں سے جس نے اس کو پالا تھا۔ جلایا اور جب شعلے بلند ہوئے تو میری نظروں میں دنیا تیرہ و تار معلوم ہونے لگی۔ اب دوسرے لڑکے کا حال سنیے کہ وہ راولپنڈی میں راہ راہ چلا جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک شخص نے جو گھوڑے پر سوار تھا اس کو چابک سے ہٹایا۔ اس نے جھلا کر تلوار میان سے کھینچی اور اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ حاکم نے پھانسی کا حکم دیا۔ عین وقت پر جس وقت پھانسی سے اس کی لاش اتاری جاتی تھی میں بھی وہاں پہنچا۔ بس آگے نہ پوچھیے کیا ہوا۔ ع۔ دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل،، اور آج کا سانحہ تو آپ نے خود ہی دیکھا ہائے۔ یہ تیسرا تھا۔ ہائے یہ تیسرا تھا۔ بس کمر ٹوٹ گئی اور صاف صاف یوں ہے کہ اس لڑکی کے باپ نے اقرار کیا تھا کہ میرے بیٹے سے ساتھ جس کو ابھی پھانسی دی گئی نکاح پڑھوائے گا لڑکا اس خوبصورت پری پیکر پر ہزار جان سے عاشق تھا۔ جب دیکھا کہ وہ دوسرے کی بیوی بنی تو اس وقت رقیب سمجھ کر مار ڈالا۔ ہائے افسوس!

آزاد : دل بھر آیا۔ مگر یہاں تو لوگ کہتے تھے کہ دیوانہ تھا۔
بڈھا : وہ کچھ بھی نہ تھا اور سب کچھ تھا۔
آزاد : دنیا کے بھی عجب کارخانے ہیں۔ بس ہم سمجھ گئے کہ وہ نوجوان بے گناہ بے سبب قتل ہوا۔ ہائے افسوس! انسان کے ایک فعل ناملائم سے کتنے بندگان خدا کے خرمنِ خاطر پر برقِ انتشار گرتی ہے۔ ایک تو وہ نوجوان بے چارہ قتل ہوا دوسرے اس کی بیوی نے جان شیریں گنوائی۔ تیسرے اس دُلہن کے ماں باپ پر آفت ڈھائی۔ چوتھے اس بے چارے بوڑھے کی جان پر بن آئی۔ خلاصہ یہ کہ تیس چالیس آدمیوں پر گویا بجلی گری۔ اور ان کا عیش و آرام مبدل بہ رنج و غم ہوا۔ واہ اسی دنیا پر حضرات ایسے لٹو ہیں۔ دم کے دم میں بڑے بڑے خوش و خرم آدمی صید الم ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا پر اترانا غلطی ہے۔ اِدھر انسان ہنسا، اور اُدھر زمانے کی نیرنگی نے اسے خون رُلایا:

چوں حاصلِ آدمی دریں جا دو در — جز درد دل و دادنِ جاں نیست دگر
خرم دل آنکہ یک نفس زندہ بنود — واسودہ کسی کہ او نزاداز مادر

اس دنیائے دوں کے سوانح حسرت خیز و واقعات حیرت انگیز پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

مخلصِ بے باش حق گزاری اینست — نیکی می ورز خیر جاری اینست
جز حق مپرست و بر کسی بد مپسند — تفسیر کلام رستگاری اینست

اس دلہن اور اس دولہا کی حالت اس رباعی کے مطابق ہے:

دیروز پی گلاب می گردیدم — فر خندہ گلی بر سر آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردۂ ترا می سوزند — گفتا کہ دریں باغ دمی خندیدم

آہاہا! اس رباعی کے چوتھے مصرع کو جو جانِ رباعی ہے۔ سن کر اہل دل پھڑک جائیں گے۔ سبحان اللہ! ع۔ گفتا کہ دریں باغ دمی خندیدم،، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلائے گئے۔ خاک میں ملائے گئے۔ ایک دم کے دم وہ دُلہن ہنسی تھی۔ بس ایسا روئی ایسا روئی کہ خدا دشمن کو بھی نہ رلائے۔

خیر میاں آزاد اور خوجی بڑی حسرت کے ساتھ وہاں سے چلے۔ راہ بھر اس واقعۂ ناشنیدنی کی باتیں کرتے جاتے تھے۔

آزاد : بھائی میں تو اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ جب میں نے دیکھا کہ دلہن کے دست حنائی میاں کے خون میں آغشتہ و آلودہ ہیں۔

خوجی : دل بہار کا رونا دیکھ کر بس دل بھر آیا اور اس بے چارے بچے کا بلکنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا۔ چلیے اب کسی دکان پر چل کر افیم تو خریدیں ذرا غم تو غلط کریں۔

آزاد : اجی بھاڑ میں گئی آپ کی افیم۔ آپ کو افیم ہی کی پڑی ہے۔ یہاں مارے غم کے کھانا پینا بھول گئے۔

خوجی : کیا آپ کی بڑھیا کے مرنے کی خبر آئی ہے۔

آزاد : (خفا ہو کر) چپ نامعقول۔ یہ بھلا دل لگی کا کون موقع ہے۔

خوجی : اجی چلو بڑھیا تو تھی ہی۔ ڈھلک گئی۔ ڈھلک گئی۔

آزاد : بڑے متفنی ہو۔

خوجی : بھائی رنج دو گھڑی حد تین گھڑی کا، جو سب کے سب آپ ہی کی طرح سوگ لیں تو انتظام کائنات میں فرق نہ آ جائے۔ میاں مرنا جینا لگا ہی رہتا ہے۔ کوئی عاقبت کے بوریے تو سمیٹے گا نہیں۔

مکتب خانے کی شکایت اور ایک ناخلف کی حکایت

اتنے میں میاں آزاد خانہ برباد اور خوجی توبہ توبہ! جناب خواجہ صاحب چلتے چلتے ایک مکتب خانے کے قریب پہنچے۔ دیکھا کہ دس بارہ لڑکے ایک چھپر میں بیٹھے ہوئے الف زیر آبے زیر با پڑھ رہے ہیں اور ہلتے جاتے ہیں:

نداریم غیر از تو فریادرس   توئی عاصیاں را خطا بخش ایں

نہیں رکھتا ہوں میں غیر از تیرے فریاد کا پہنچنے والا۔ تو ہے تو عاصیوں پُر معاصیوں کا خطا بخشنے والا اور بس۔ اتنے میں مولوی صاحب نے قمچی جمائی۔ مردک سو دفعہ کہہ دیا۔ کہ بس کے معنی فقط۔ سنتا ہی نہیں۔ وہی مرغی کی ایک ہی ٹانگ کہے جاتا ہے۔

خوجی : اخاہ۔ آپ اس بکر کٹی میں ہیں۔ واللہ کیا چومغز آدمی ہے۔ (طالب علموں سے) کیوں بھئی لڑکو ان کو کس عجائب خانے سے چرا لائے ہو۔ میاں سچ کہنا لکھا دوں رپٹ تھانے پر کہ مولوی صاحب کو لندن کے عجائب خانے سے چرا لائے۔ ابھی سے چوری

کرنا سیکھے۔ بڑھ کر تو خوب ہتھے ساف کرو گے۔

اس تقریر سے میاں آزاد کو بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔ گو وہ بڑے رنج و غم میں تھے۔ لیکن ہنس ہی دیے اور خوجی سے کہا کہ بڑے مسخرے ہو واللہ روتوں کو ہنساتے ہو۔ عجائب خانہ سے چرا لانے کی ایک ہی کہی۔

ایک طالب علم : حضرت کچھ نہ پوچھیے۔ ہمارے مولوی صاحب کو زبان کا چسکا بہت ہے۔ روز ایک نئی فرمائش رہتی ہے اور مچھلی کے گوشت پر تو جان ہی دیتے ہیں بس کانٹا تک نہ چھوڑیں۔ مچھلی کی مچھلی بھکس جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ ایک روز مولوی صاحب اور ہم لب دریا بیٹھے مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ دریا کی سیر جو بھائی اور طبیعت لہرائی تو حضرت نے تڑ سے ایک غزل تصنیف فرمائی۔ ذرا سنیے گا! دیکھیے کس دھوم دھام کی غزل ہے :

بہ پیشم در سحرگاہاں گر آری لحم بکرارا	بوی نیکوش بخشم سمر قند و بخارا را
کباب آہوی فربہ اگر داری غنیمت داں	کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشت مصلا را
جمال برۂ بریاں و حسن دنبۂ فربہ	چناں بردند دست از دل کہ ترکان خوان نعما را
چہ آرائی بمشک و زعفران رخسارِ فالودہ	برنگ دلوی خال و خط چہ حاجت روئی زیبا را
بگو ہر ساز وصفِ خوشۂ انگور شقالی	کہ بر نظم تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

اتنے میں دریا سے ایک دیو کا بچہ نگر مچھ منھ کھولے ہوئے نکلا اور جھپٹا اور غڑاپ مولوی صاحب پر چکت دیا۔ اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ وہ تو کہیے ہم سب دوڑ پڑے اور خوب گاؤ زوریاں ہوئیں۔ اُدھر نگر مچھ ادھر ہم اور مولوی صاحب اُدھر میں نہ ادھر میں۔ یہ بلا کدھر ہیں۔ لاکھ لاکھ جتن کیے مگر نہنگ مولوی صاحب کا آدھا ہاتھ نوش جان ہی کر گیا اور حضرت نیم ٹر ملا رہ گئے۔ اب ان حضرت کو ڈاکٹر خانے لے چلے تو وہاں آپ کہتے کیا ہیں کہ جناب ڈاکٹر صاحب کچھ ایسا بندوبست کیجیے کہ رگ سے رگ اور پٹھے سے پٹھا مل جائے۔ بڑے کھاؤ پیر ہیں۔ صبح کو چار پانچ باقر خانیاں اور پکا تین سیر گوشت، اور شام کو ڈھائی سیر کھن تلے کا دودھ اور دن بھر کیا جانے الم غلم کیا بھکسا کرتے ہیں۔ زمانے میں صدہا واقعات عجیب گذرے مرد نکھٹو ہو گئے۔ گھوڑے ٹٹو ہو گئے۔ اونٹ خچر ہو گئے۔ ہاتھی مچھر ہو گئے۔ مگر ہمارے مولانا نیم ٹر ہی بنے رہے۔

آزاد : گر ہمیں مکتب ست و ایں ملا کارِ طفلان تمام خواہد شد

خوجی : واہ رے مکتب خانے۔ لاحول ولا۔

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے دروازے پر کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ :

زنانِ بارداری مرد ہشیار اگر وقتِ ولادت مار زایند
ازاں بہتر بنزدیکِ خردمند کہ فرزندانِ ناہموار زایند

آزاد : سُنا بھائی خوجی؟

خوجی : اجی ہاں سب سنا۔ یہاں اس وقت افیم کی پڑی ہے، اور آپ کو اور ہی سوجھتی ہے۔

آزاد : کیوں شیخ صاحب یہ رباعی آپ یوں ہی پڑھ رہے ہیں، یا خدانخواستہ کوئی وجہ خاص ہے۔

شیخ صاحب : حضرت عمر بھر میں خدا نے بس ایک لڑکا دیا۔ وہ ایسا ناہنجار پیدا ہوا کہ بس کچھ پوچھیے نہ۔ میں یہاں سے چودہ کوس پر نوکر ہوں۔ صاحبزادے کو جو پانچ روپیہ کی ضرورت ہوئی تو آپ نے یہ فقرہ چست کیا کہ گھر میں روتے ہوئے گھسے اور کہا کہ ہائے ابا چل بسے۔ چلیے رونا پیٹنا مچ گیا۔ اس کی ماں کا بُرا حال ہوا کہ بیوہ ہوگئی۔ اس فقرے سے آپ نے دس روپیہ اینٹھے کہ جاتا ہوں ابا کی لاش لے آؤں۔ جب میرے پاس پہنچے تو دیکھتے ہی پیٹنے لگے۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ بولے کہ اماں چل بسیں۔ آج تیجا ہے۔ ہوش اڑ گئے کہ ننھے ننھے بچوں کو اب کون سنبھالے گا۔ میں تو اس وقت سوار ہوا اور ان سے کہا کہ اسباب لے کر آؤ۔ آپ نے اسباب کے بھی کوڑے کیے اور خوب گلچھرے اڑائے۔ میں جو گھر میں داخل ہوا تو شب کا وقت۔ پکارتا ہوں کہ کنڈی کھولو کوئی سنتا ہی نہیں۔ اور سنتے ہیں تو کنڈی نہیں کھولتے۔ کہ یہ تو مر گیا تھا اب قبر سے کیوں کر بھاگ آیا۔ کوئی کہتا ہے کہ خبیث ہے کوئی بھوت پریت سمجھتا ہے۔ آخر کار آدمی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو گھر میں سب ہکّا بکّا۔ اور سب نے مل کر رونا شروع کر دیا۔ میں اپنی بوڑھی بیوی کو یاد کر کے بے اختیار رو دیا تو وہ کہتی کیا ہے۔

بیوی : اے تم تو مر گئے تھے۔ یہ آئے کہاں سے کیا نام بدوّل ہو گیں۔

میں نے کہا تم مر گئی تھیں یا میں۔ اب مجھ سے ان سے دھڑ پکڑ ہو رہی ہے وہ مجھے پریت

سمجھتی ہے اور میں اسے چڑیل سمجھتا ہوں۔ خیر آخر کار راز کھلا کہ صاحبزادے کی ہم دونوں کے حال پر عنایت تھی۔ اب سنیے کہ مردک نے ہمارے سب یاروں دوستوں سے کہہ دیا کہ ابّا کو تو کتّے نے کاٹا ہے۔ ذری سمجھ بوجھ کر جائیے گا۔ کچھ دوست تو مارے خوف کے نہ آئے اور جو آئے بھی ان کا حال سنیے کہ دروازے پر آواز دی میں باہر گیا چھپٹا کہ بغل گیر ہوں وہ پینترا بدل کر کھڑے ہو گئے، کہ خبردار ادھر نہ آنا۔ میں بڑھتا ہوں وہ ڈنڈا سنبھالتے ہیں۔ آخر کار معلوم ہوا کہ یہ بھی صاحبزادے کی نوازش ہمارے حال پر تھی۔ خدایا تو اولاد ہی نہ دے اور یا دے تو سعید و رشید۔ اس نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔

میاں آزاد اور خوجی اس داستان کو سن کر آگے بڑھے۔

آزاد : کیوں یار سچ کہتا کیا کیا باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔

خوجی : جی ہاں۔ مگر اس وقت افیم کے نہ ملنے سے بُرا حال ہے۔ کہیں سے افیم ملے تو جان میں جان آئے ورنہ اب یہاں بھی چل چلاؤ ہے۔

آزاد : لت بھی کیا بُری چیز ہے۔

یہاں سے جو آگے بڑھے تو ایک حضرت ذات شریف سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔

ذات شریف : آپ دونوں صاحب کیا کہیں باہر سے آتے ہیں۔

خوجی : اجی یہاں کہیں چانڈو یا افیم کی دکان بھی ہے۔

ذات شریف : بہت ہی خاصے۔ کیا لکھنؤ میں مکان ہے حضور کا۔ علیک سلیک سب بالائے طاق۔ آتے ہی افیون اور چانڈو کی فکر ہوئی۔ بھلا کتنے روز سے آپ اس شہر میں فروکش ہیں۔

خوجی : جی یہی کوئی دو مہینے سے۔

ذات شریف : اخاہ! دو مہینے سے! اور اب تک چانڈو والے کی دکان ہی نہ معلوم ہوئی۔ ساری عمر گلستان پڑھی مگر اتنا بھی نہ سمجھے کہ زلیخا زن بود یا مرد۔

آزاد : واہ اُستاد گلستانِ سعدی اور یوسف زلیخا جامی کا پیوند تو خوب لگایا۔

ذات شریف : واہ واہ۔ جاے استاد خالی نیست۔

آزاد : بہت ہی خاصے۔ خالی نیست کی ایک ہی کہی۔

ذات شریف : جو میں فرماؤں وہ سنیے گا۔

آزاد : بسم اللہ آپ عرض کیجیے ۔ آپ کا اسم مبارک ۔

ذات شریف : رئیس تو میں اسی شہر کا ہوں مگر میرا اسم مبارک لوگ رونق بیگ پکارتے ہیں ۔

آزاد : سبحان اللہ ۔ اسم مبارک پکارتے ہیں ، اور آپ اپنے منہ آپ رئیس ہیں ۔ واہ میاں مٹھو اور اسم مبارک اپنے نام کو کہنا آپ ہی کا کام ہے ۔ چلیے بس اب سلام ہے ۔

ذات شریف : حضرت آپ ہی لوگوں کی صحبت میں تو بندہ بھی بیٹھا ہے ۔ کہیں ایسے ویسے گھس گھدوں میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا ، جی ہاں ۔ ذری اتنا سمجھے رہیے گا ۔ بندہ درحقیقت میں زبان دان ہے ۔

آزاد : اجی آپ درحقیقت میں زباندان ہیں ۔ بلکہ فی الحقیقت کے بیچ میں آپ زبان دان ہیں ۔

خوجی : آپ واللہ نری نخالص باتیں کرتے ہیں ۔

عدالت منصفی میں بیوی دلا پانے کا مقدمہ

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا

یک من علم را دہ من عقل باید درنہ :

نہ محقق بود نہ دانشمند چار پائی بر دکتا بے چند

پڑھے آدمی چاہے کم ، لیکن جو کچھ پڑھے اس پر غوض ضرور کرے ۔ یوں تو میاں مٹھو بھی حق اللہ پاک ذات اللہ نبی جی بھیجو کی رٹ لگاتے ہیں ۔ تو گھنٹوں زبان ہی بند نہیں ہوتی لیکن اس سے آدمیت تھوڑا ہی آسکتی ہے ۔ علم و فضل کا شوق تو اکسیر کی خاصیت رکھتا ہے ۔ مگر چچا سعدی واللہ خوب کہہ گئے ہیں کہ :

زمینِ شور سنبل برنیارو درد تخمِ عمل ضائع مگرداں
نکوئی با بداں کردن چناں ست کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

تو دجہ کیا :

پرتو نیکاں نگیرد ہر کہ بنیادش بد ست تربیت نااہل راچوں گردگان برگنبد ست

اور جو عالم با عمل نہیں وہ چراغ ہے۔ جس میں نام کو نور نہیں مُل ہے جس میں ذرا بھی سرور نہیں۔ معشوق ہے جس میں آن نہیں۔ قالب ہے جس میں جان نہیں۔ پھر علم سے فائدہ کیا۔ ملحد، مرتد، زندیق، دہریے بھی تو اکثر بڑے علما و فضلا گذر گئے ہیں۔ ہر عالم با عمل نہیں ہے:

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے　　　ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

خیر آمدم بر سر مطلب۔ میاں آزاد دنیائے دوں کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے اور خوجی مُنھ پھلائے ہوئے افیم کی جان کو روتے ہوئے جاتے تھے۔ چلتے چلتے عدالت کے قریب پہنچے تو وہ چہل پہل کہ میلا لگا ہوا ہے۔ خونچے والے پکار رہے ہیں۔ گلاب ریوڑیاں۔ دہی بڑے مصالحے کے۔ مٹر ٹٹر ایک طرف۔ ساقی چلمیں بھر بھر کر مشکبو دھواں دھار پلا رہا ہے۔ سامنے لکڑ والا مدار لیے حقے جمائے ایک ایک کے دو دو کر رہا ہے۔ وکلا بڑی بڑی مندیلیں دیے، فوق البھڑک جوڑے پھڑکائے، ادھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ کوئی ڈکڑی پر سے اُترا اور دن سے کمرے میں داخل۔ کسی نے بگھی روکی اور غڑاپ گواہ گھر میں موجود۔ اہل مقدمہ مُور و ملخ سے زیادہ کوئی نیم کے درخت کے سایہ میں ہری ہری دوب پر سو رہا ہے۔ کوئی سبزہ بیگانہ کو اپنا مسکن بنائے بیٹھا چبینا چبا رہا ہے۔ گواہ سر بجیب تفکر یوں جھوٹ بولیں گے۔ یوں بات بنائیں گے۔ وکیل ہم سے کڑے کڑے سوال کرے گا تو ہم کہہ دیں گے۔ کہ ہمیں یاد نہیں۔ ہم نہیں جانتے۔

میاں آزاد اور خوجی بھی ٹہلنے لگے تو خوجی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دکان پر افیون جھڑا جھڑ بک رہی ہے۔ باچھیں کھل گئیں۔ مرادیں مل گئیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جاتے ہی ایک گنڈا ڈبل دکان پر پھینکا لاؤ افیم جلد لاؤ۔ یار واسطے خدا کے دیر نہ لگاؤ۔ کل سے پریشان ہوں لیتے ہی گھولی اور گھولتے ہی غٹ غٹ۔

خوجی : اب آنکھیں کھلیں۔

آزاد : یوں نہیں کہتے کہ اب آنکھیں بند ہوئیں۔

خوجی : کیوں استاد جو ہم حاکم ہو جائیں، اور کرسی پر بیٹھے ہوئے اجلاس کرتے ہوں تو بات بات پر ڈگریاں دیں، اور بات بات پر ڈسمس کریں۔ اور بھئی افیمی اگر کسی کو قتل بھی کر آئے تو مردود ہی ہو اپنے حساب جو سزا دے۔

آزاد : تو پھر نکا ہے بھی جلد جائیے۔ گردن بھی آپ کی ناپی جائے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے دوست کو ساتھ لیے ہوئے ٹہلتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ (اجی ہمیں اپنی جورو پر اختیار ہے یا نہیں) ان کا دوست کہتا ہے کہ ہاں ہاں، بیشک آخر آپ کو نہیں تو کیا مجھ کو آپ کی بیوی پر اختیار ہے تمھاری جورو۔ پھر اختیار کس کو ہوگا۔

خوجی : (آزاد سے) حضرت ان کا نام بھی جانگلوؤں کی فہرست میں داخل کیجیے۔ نمبر اول کے گھامڑوں میں حضرت کو بھی شامل کیجیے۔ سنا بھی آپ نے۔ یہ فکر ہوئی کہ اپنی بیوی پر اختیار ہے یا نہیں۔ واہ ری عقل ذرا ان سے دو دو باتیں تو کیجیے گا۔ آپ کو واللہ۔

معلوم ہوا کہ وہ صاحب کلرک ہیں اور دوسرے حضرت وکیل۔ کلرک کی بیوی اپنے میکے میں ہیں۔ حضرت پہنچے کہ جورو کو ساتھ لے آئیں۔ ان کے خسر الدولہ نے کہا کہ بھئی ہم ہندو دھرم ہیں، آج اور کل ساعت اچھی نہیں ہے دو دن تامل کرو۔ پرسوں لے جانا۔ حضرت انگریزی خواں اور وہ بھی نیم ٹر۔ بس بگڑ کھڑے ہوئے کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، ہم ابھی ابھی لے جاویں گے۔ اور ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیب چڑھا یہ کلرک صاحب تو ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے ہی۔ وکیل ملے تو ان سے بڑھ کر آزاد۔ اجی کیسی باتیں کرتے ہو۔ داغ نہیں دیتے نالش، آج ہی نالش کرو۔ واہ اچھی دل لگی نکالی ہے۔ بیوی تمھاری اور دعویدار کوئی اور ہو۔ مالِ عرب پیشِ عرب تمھیں شرم نہیں آتی کہ جورو پر اتنا ہی بس نہیں چلتا۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایک چلو پانی تم ایسوں کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے جو غیرت دلانا شروع کی تو وہ گھامڑ آدمی اور بھی تیز ہوئے اجی کیسی ساعت۔ ساعت کی ایسی تیسی انگریزی پڑھ کر ساعت کو مانیں تو خدا کی مار ہم پر۔

آزاد : ہاں ہاں اور نہیں تو کیا۔ ساعت چہ معنی دارد۔ حضرت یہ سب ضعیف الاعتقاد آدمیوں کی باتیں ہیں۔ تربیت یافتہ لوگ ساعت واعت کو ذرا تو مانتے نہیں۔ مگر یار ایک بات تو ہم بھی کہیں گے۔ چاہے تم نہ مانو۔ تمھارے خسر تو اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ تمھاری بوڑھی ساس کی تو روح پر صدمہ ہوگا۔ جو تم بے ساعت ان کی پیاری لڑکی کو لے جاؤ گے پھر دو دن تامل ہی نہ کرو۔ بس اب آپ کی جہالت ہے کہ مانتے ہی نہیں۔ فرض کیجیے آپ

زبردستی اپنی بیوی کو لے گئے تو نتیجہ؟ بیوی کو الگ رنج ہو گا۔ اور آپ کی سسرال والوں کو الگ۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب لڑکی اپنے والدین کو ملول دیکھے گی تو خود بھی مغموم ہو جائے گی۔ پھر رنج دے کر بیوی کو آپ لائے بھی تو کیا اور دو ہی دن کا تو واسطہ ہے یا کچھ اور ناحق ٹھائیں ٹھائیں کرتے ہو۔ دو دن خاموش ہو رہو۔ تیسرے روز کھٹ سے اپنی بیوی کو لے جانا۔

کلرک : میں نہ مانوں گا۔ آج ہی لے جاؤں گا۔ ابھی ابھی اسی دم تو سہی۔ ذرا دیر نہ ہونے پائے۔

وکیل : آپ تو خود دیر لگاتے ہیں۔ ایک دو پٹی لکھ کر دن سے داغ دو کہ لالہ سب قدر و عافیت بھول جائیں۔

خوجی : اجی کیوں گمراہ کرتے ہو کسی بھلے مانس کو۔ آپ تو واللہ خوب مینڈھے لڑاتے ہیں۔

آزاد : آخر دو دن میں بھلا کیا ہوئے گا۔

کلرک : (وکیل سے) آپ لکھیے عرضی۔

وکیل : لیجیے۔ ابھی لیجیے۔

بعدالت صاحب منصف۔

جاگیشر سنگھ، قوم جاٹ، ساکن چمار پور، پیشہ نوکری۔ مدعی

بنام

نانک رام قوم جاٹ ساکن فتح پور۔ پیشہ مہاجنی۔ مدعا علیہ

دعوی واسطے دلا پانے زوجہ کے۔

میں مدعی عرض رسا ہوں۔

۱۔ کہ بتاریخ ۲۰ر فروری ۱۸۷۳ء میری شادی مسماۃ سُکھ دیا صبیۂ نانک رام کے ساتھ ہوئی۔

۲۔ ۳۱ر ستمبر ۱۸۷۴ء کو مسماۃ مذکورہ یعنی وہی سُکھ دیا زوجہ میری اور صبیۂ نانک رام کی مہاجن اپنے باپ کے گھر گئی۔

۳۔ باوجودیکہ میں خود اسے بدا کرنے آیا تاہم اس زوجہ میری کے باپ نے اس کو رخصت نہ کیا اور کہا کہ ساعت اچھی نہیں۔ دو دن تامل کرو لہٰذا عدالت سے چارہ جو ہوں کہ

حق بحق دار رسد۔ عند الپکار کمترین فدوی حقیقت حال عرض کروں گا امیدوار مغفرت ہے کہ ڈگری بحق مجھ شوہر زوجہ کے عدالت سے صادر ہو۔

یہ دھوم دھام کی عرضی وکیل صاحب نے لکھی اور بہت اکڑتے ہوئے میاں آزاد کو سنائی تو آزاد ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

خوجی : دعویٰ واسطے دلا پانے زوجہ کے۔ پوچھیے آپ کی بیوی کو ضبط کس نے کیا ہے۔ اور یہ دل لگی دیکھیے گا کہ ماشاءاللہ کس فصاحت سے عرضی لکھی ہے۔ اے پھٹکار (زوجہ میری کے باپ نے) واہ اس اردو کے صدقے اور پھر فرماتے ہیں کہ صبیتہ نانک رام کی مہاجن کیا ترکیب ہے۔ سبحان اللہ اس زبان دانی کے قربان۔

آزاد : اور عند الپکار تو دیکھیے۔ عربی اور ہندی لفظ کا اچھا پیوند لگایا۔ پھر کمترین فدوی اس سے بڑھ چڑھ کر۔ غرض کہ جیسے وکیل ویسے موکل۔ دونوں طرفہ معجون۔ ع۔ خوب گذرے گی الخ۔

خوجی : حضرت بڑی خرابی یہ ہے کہ زبان داں ہے تو انگریزی خواں نہیں اور انگریزی خواں ہے تو زبان داں نہیں۔ یہ دونوں انگریزی میں طاق ہیں۔ خصوصاً یہ وکیل صاحب تو شہرۂ آفاق ہیں۔ مگر بس لمبی داڑھی ہی دیکھ لیجیے اور فارسی خاک نہیں جانتے واللہ سمجھے کیا ہنسی آئی ہے، جب حضرت نے لکھا کہ امیدوار مغفرت ہے۔ معقول۔ امیدوار مغفرت ہو تو بھئی کسی پیر یا دری یا گروجی کے پاس جاؤ۔ عدالت بھی کیا کچھ ذریعۂ مغفرت ہے اور فرماتے ہیں کہ ڈگری بحق مجھ شوہر زوجہ کے بہت خاصے۔ شوہر زوجہ کی ایک ہی کہی۔ کوئی اس نادان سے اتنا تو پوچھے کہ زوجہ کے سوا کسی اور کے بھی شوہر ہوا کرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

خیر یہ عرضی لکھ کر وکیل اور موکل دونوں عدالت منصفی میں پہنچے۔ منصف صاحب کو دیکھا کہ موچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ دونوں نے جا کر اکڑتے ہوئے سلام کیا۔

منصف صاحب : (عرضی پڑھ کر) افسوس آپ تربیت یافتہ ہو کر اور ایسی حماقت کے مرتکب ہوئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ لعنت بکار شیطان۔ بھلا غور تو کیجیے کہ دو دن کے لیے آپ نے بے سمجھے بوجھے عرضی دے دی۔ شریف کے لیے گڑ جانے کا مقام ہے۔ آپ کو شرم نہیں آتی آپ کے خسر یہاں ایک مشہور اور نام برآوردہ آدمی ہیں۔ ان کو آپ نے مفت

میں ذلیل کیا اور خود بھی ذلیل ہوئے۔ یہ صلاح کس دانشمند نے آپ کو دی۔

خوجی : یہاں دانشمند کے معنی بے وقوف۔ جن صاحب نے صلاح دی وہ ایک کلاہ تتری سر پر جمائے وہ سامنے کھڑے غٹر غٹر سن رہے ہیں۔

منصف : میں نے جو کچھ کہا وہ جج کے طور پر کہا ہے۔ ورنہ عدالت تو انصاف کرے گی۔

وکیل : آپ ان باتوں کے معتقد ہیں۔

منصف : کن باتوں کے۔

وکیل : یہی یہی۔

منصف : بہت ہی خوب۔ کوئی ہے۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ اے صاحب کیا یہی۔

وکیل : ساعتِ بد اور ساعتِ نیک۔

منصف : ارے بھئی یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ ساعت کی پابندی تمھارے موکل پر فرض ہے۔ مانا کہ یہ پرانے کرم خوردہ خیالات ہیں۔ مگر دو دن کے لیے نالش کرنا سسرے سے لڑنا، جورو دلا پانے کی عرضی داغنا جہالت ہے یا کچھ اور۔ شریف کے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ہاں اگر ان کے خسر اپنی لڑکی کو بالکل جانے ہی نہ دیتے۔ ان کو خانہ داماد بنانا چاہتے تو آپ پر فرض تھا کہ عدالت کے ذریعے سے دار خواہ ہوتے مگر دو دن کے لیے اس قدر ذلت اٹھانا آپ ہی کا کام تھا۔

وکیل : ہم تو آج ہی لے جائیں گے۔

منصف : (جھڑک کر) منصرم صاحب۔ عرضی واپس کیجیے۔ ۳۰ فروری تاریخ غلط ہے۔ فروری تیس دن کا آج تک مہینا ہی نہیں ہوا۔

منصرم : اور ۳۱۔ ستمبر بھی لکھا ہے۔ ستمبر ۳۰۔ دن کا مہینہ یہ لیجیے اپنی عرضی بدل کر دیجیے۔ کل عید کی چھٹی ہے۔ پرسوں تشریف لائیے۔

وکیل : آپ لوگ ناحق دام کا جتبہ کرتے ہیں۔

منصف : کیا فرمایا آپ نے۔ کیا ذرا پھر کہیے۔ آداب عدالت سے بھی آپ واقف ہیں۔

وکیل : میں تو جج کے طور پر کہتا ہوں۔

منصرم : حضرت یہ اکھڑپن ہر مقام پر نہیں چلتا۔ آپ ایسے لائق وفائق آدمی سنجیدہ اور تربیت یافتہ اور یہ گفتگو۔ افسوس۔ آخر کس صحبت میں بیٹھے ہیں آپ۔

وکیل : چلیے کسی صحبت میں ہم بیٹھے ہیں اس سے آپ کو کیا مطلب۔
موکل : میری اچھی مٹی پلید کی آپ نے۔ کل چھٹی ہے پرسوں اتوار۔ اور نرسوں تو خسر الدولہ بہادر خود ساتھ کر دینے کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر مجھے فائدہ کیا ہوا۔ واہ اچھی صلاح دی آپ نے اور یہ ۳۰ فروری کیوں لکھ گئے اور ۳۱۔ ستمبر کے کیا معنی ہوئے۔ واہ بندہ نواز۔
آزاد : (خوجی سے) دیکھیے خواجہ صاحب واللہ ایسے ہی حضرات انگریزی خواں کو بدنام کرتے ہیں۔ یہ جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ انگریزی خواں وحشی ہوتے ہیں، اس کے یہی معنی ہیں۔ پوچھیے آپ نے عرضی بھی لکھی اور اپنے آپ کو بھی مطعون کیا۔ اور سسرال بھر کو اپنے سے خلاف کر دیا اور انجام کیا ٹائیں ٹائیں فش۔ اور بیوی الگ طعنے دے گی کہ تم بات بات پر نالش جڑ دو گے۔ تم سے ذری بات کرتے خوف معلوم ہوتا ہے۔
خوجی : اجی یہ ان کا قصور نہیں۔ یہ ان حضرت کی عنایت ہے۔
آزاد : ان کا اس میں کیا قصور۔ ارے بھئی ایک شخص نالش کرنے پر ادھار ہی کھائے ہوئے ہے، آخر کوئی نہ کوئی وکیل ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ اور کوئی کیوں ہو ہم ہی مستعد ہیں۔
راوی : اب خرابی تو یہ ہے کہ پرانے فشن کے لوگوں کے کچھ اور ہی خیالات ہیں۔ اور نئے فشن کے لوگ کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔ پھر فرمائیے دونوں میں باہم بنے کیوں کر اب :

اگر در ہر دو جانب جاہلانند دگر زنجیر باشد بگسلانند

اور جو ایک طرف گرم، دوسری طرف نرم ہوں تو بات بن جائے۔ تو جوانانِ انگریزی خوان پر فرض ہے کہ بوڑھوں سے ہر امر اور ہر بات میں الجھ نہ پڑا کریں۔ آپ لاکھ جتن کیجیے وہ اپنی ہی سی کیے جائیں گے تو وجہ کیا اسی اسی برس کے جو خیال جمے ہیں وہ کہیں دم کے دم میں مٹ سکتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نئی پود کے آدمی پرانی دقیانوسی باتوں کو آمنّا وصدّقنا کہہ کر خواہ مخواہ تسلیم ہی کر لیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ وہ دلیل اور برہان کے بغیر کچھ بھی نہ مانیں گے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ بعض حضرات ان امور میں عقل کو بالکل معطل کر دیتے ہیں۔ عقل سے بالکل کام ہی نہیں۔ بس جو ہم کہیں وہ مانو چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اس کی پابندی وہ کر چکے۔ ع۔ ایں خیال ست و محال ست و جنون،، اس زوجہ والے مقدمہ میں بیشک کلرک اور اس کے لائق وکیل کی رائے صائب تھی۔ ساعت کیسی مگر غلطی اس قدر ہو گئی کہ جوانی کے جوش میں آکر دو دن کے لیے نالش کر بیٹھے۔

موکل صاحب یعنی وہی کلرک پھر میاں آزاد سے مخاطب ہوئے۔

کلرک : آخر آپ سخت سست کلمے کیوں زبان سے نکالتے ہیں۔ ہم جانیں ہماری جورو جانے آپ کہاں کے میر فیصلی بنتے ہیں۔

آزاد : مانو تو فہوالمراد۔ نہ مانو اپنی رادھا کو یاد کرو۔ اگر اشرف المخلوقات ہو تو بہائم وہ ہوش و دود دام نہ بن جاؤ۔

کلرک : اشرف المخلوقات آپ ہوں گے۔ یا آپ کے باپ ہوں گے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کون کہے گا بھلا؟

آزاد : سبحان اللہ۔ پھر اشرف المخلوقات کون ہے؟

کلرک : گدھا ہے، اور کون ہے۔ یہ کھلی ہوئی اور بنی بنائی بات ہے۔

خوجی : (ہنس کر) واہ استاد۔ تم ہی تو ایک گرو ملے ہو اکھیں۔

آزاد : یہ کس گرو نے پٹی پڑھائی ہے۔ کس کی بیعت کی ہے آپ نے؟

کلرک : ہمارے استاد شیطان۔ دیکھ لیجیے! خدا نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ سجدہ کر اس نے نہ مانا۔ مستقل مزاج آدمی بات کا دھنی تھا۔

آزاد : کیا شیطان بھی آدمی ہے؟

کلرک : آدمی کا آدمی، اور فرشتہ کا فرشتہ۔

آزاد : تو قبلہ معاف فرمائیے۔ بس میں ہارا آپ جیتے۔ آپ سے بھلا بحث کون کرے۔ گدھے کو آپ اشرف المخلوقات بتاتے ہیں۔ حضرت شیطان رجیم آپ کے ہادی ہیں۔ آپ سے خدا بچائے۔

کلرک : قبلہ سنیے :

اپنی جگہ تو سب کو ہے دعوائے مردمی ۔۔۔ میدان کارزار میں ٹھہرے تو مرد ہے

آپ فقرے پر فقرے چست کرتے تھے اور بندہ سوں کھینچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مگر اب بولیے تو دیکھیے وہ جواب دنداں شکن دوں کہ آپ کے دانت ہی کھٹے ہو جائیں۔

ایک بخیل اور ایک فضول خرچ کی حالت کا مقابلہ

میاں آزاد خانہ برباد کو چین کہاں کہ ایک جگہ دو دن بھی ٹک جائیں۔ چلنے میں آندھی

رہوگے۔ وہ اچلا چال کہ توبہ ہی بھلی، جو کہیں دس پانچ دن جم کر رہنا ہوا تو گویا شہر کاٹے کھاتا ہے۔ چین ہی نہیں آتا۔ خوجی ان سے بڑھ کر بیقرار ان کے بھی دل لگی کھنگر ساتھ اچھا ہوا۔ اپنے اپنے رنگ میں دونوں مست۔

میاں آزاد کی طبیعت کچھ ایسی گھبرائی کہ تڑ کی جانے کی دھن سمائی اور انھوں نے قسم کھائی کہ بس اب سیدھے بمبئی چلیں گے ذرا توقف نہ کریں گے۔ سوچے کہ اللہ اکبر اتنے دن ہو گئے اور ایں جانب دربدر گھوم رہے ہیں۔ کہیں نواب صاحب کے دربار دُربار میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ کہیں ریلوے اسٹیشن پر مصروف ماتم ہیں۔ کہیں کسی درویش سے کلہ بکلہ مشغولِ جنگ بحث کر رہے ہیں۔ کہیں کسی فقیر کی کٹی میں برہا اڑا رہے ہیں۔ یا ٹیکرے پر بیٹھے رنگے سیاروں کو صلواتیں سنا رہے ہیں۔ خوجی اور ہی دھن میں۔ جس شہر میں پہنچے، پہلے یہی فکر ہوئی کہ افیم کی دکان کہاں ہے۔ افیم کتنے سیر ہے اور کس مزے سے حضرت چنیا بیگم کا نام زبان پر لاتے تھے اور پیتے ہی گل قند آفتابی ہو جاتے تھے۔ گھولی اور ریشہ خطمی ہوئے۔ ڈبیا کھولی اور باچھیں کھل گئیں۔ میاں آزاد کبھی کبھی ان کے دق کرنے کے لیے ڈبیا کو چھپا رکھتے تھے۔ اے ہے بس قیامت کا سامنا تھا۔ آنکھوں سے اشک جاری اور انتہا کی بے قراری اور گریہ وزاری۔ واہ یہ کہاں کی دل لگی نکالی ہے۔ اچھی دل لگی ہے۔ اس سے کسی دن مار ہی نہ ڈالو کہ بس پھر عمر بھر کو چھٹی ہی ہو جائے۔ روز روز کا جھنجھٹ کیوں رہے۔ آزاد کہتے کہ بھئی تم تو اڑتی چڑیا پکڑتے ہو، معقول! ابھی کیا ہے۔ ابھی تو ہوا سے لڑ و گے۔ بھلا میں افیم کو لے کر کیا کرتا۔ یہاں اس کی صورت سے نفرت ہے۔ دیکھیے جیب و یب میں دیکھیے اتنا سننا تھا کہ۔ ع۔ سمندِ غیظ پہ اک اور تازیانہ ہوا، جیب ویب میں اہو کھ۔ ہم کو بھی کوئی لونڈا مقرر کیا ہے۔ اتنی بڑی ڈبیا اور جیب میں۔ رکھوں کیا سوئی ہے یا رائی کا دانہ ہے۔ اور اوپر سے آنکھیں دکھاتے ہو۔ واہ وا۔ اچھی دل لگی ہے۔ لائیے لے بس لائیے دل لگی ہو چکی۔

جب کبھی میاں آزاد کا جی گھبراتا تھا تو خواجہ صاحب کو چھیڑ دیتے تھے۔ بس ایک دفعہ کوک دیجیے پھر دل لگی دیکھیے۔ اور چھیڑ کر چپکے ہو رہیے۔ پھر گھنٹوں نئے نئے سُر سنا کیجیے۔

آزاد : بھئی خوجی!

خوجی : خوجی کہیں اور رہتے ہوں گے۔

آزاد : ارے بھئی خوجی بندگی عرض ہے۔
خوجی : کہدوں گا۔
آزاد : آپ تو نقال ہو گئے میں دیکھتا ہوں۔
خوجی : صحبت۔
آزاد : ہم پر آپ کی صحبت نے رنگ نہ جمایا۔ ہمیں افیم پینے کا شوق نہ چرّایا؟
خوجی : قسمت۔
آزاد : اب کہو اس وقت کیا مانگتے ہو؟
خوجی : قناعت۔
آزاد : یہ تو یار اس قبر کی برکت ہے جس پر آپ بیٹھے تھے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کسی ولی اللہ درویش حق آگاہ کی تربت ہے۔ بیٹھے اور پارس ہوئے۔ لو اب پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں اور دھر ہے؟
خوجی : پوست کے کھیت میں۔
آزاد : خوب۔ اور روح؟
خوجی : افیمیوں کی ٹکڑی میں منڈلا رہی ہو گی۔
آزاد : جو نسبت کتّے کو ہڈی اور چیل کو بوٹی اور بلّی کو چھیچھڑوں سے ہے وہی نسبت آپ کو افیم سے ہے۔
خوجی : اب کہیے چلنے دلنے کی بھی فکر ہے۔ یا بلّی کے خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔
آزاد : اب چلیے بس۔
خوجی : مگر دو ایک مقام اِدھر اُدھر راہ میں دو ایک مقام اور بس دو ہی ایک مقام۔
آزاد : یا الٰہی ایک لفظ کہتے ہو اور اٹھارہ بار مقام کی دھن۔
خوجی : مطلب یہ کہ بمبئی تک بس دو ہی ایک جگہ مقام ہو۔ باقی کوچ۔
آزاد : بس اب کوچ بولا تو بولا۔ مقام چہ معنی دارد۔
خوجی : بسم اللہ کمر کسیے۔
آزاد : بسم اللہ چلیے آئیے۔

میاں آزاد اور خوجی بات کی بات میں ریل کے اسٹیشن پر ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک ٹہلا کیے تو سنا کہ ابھی ریل چھٹنے میں دو گھنٹے ہیں۔ اُف بڑا وقت باقی ہے۔ ناحق جلدی کی۔ مگر خیر۔

آزاد : ارے میاں ابھی دو گھنٹے ہیں۔

خوجی : پھر گولی دن سے نشانے پر پڑے۔ چاہے اس پار ہو جائے مگر ایک انگل کیا معنی ایک چاول بھر بھی فرق پڑے تو کیا۔ بھائی ریل پر جب آئے دو گھنٹے پہلے۔ اب آپ تو مال کی حفاظت کیجیے بندہ ذری لپک کر افیم تو لے لے۔ بس گیا اور آیا۔ چٹکی بجاتے جاؤں اور یوں آؤں (چٹکی بجا کر)۔

آزاد : اب تو آپ چٹکیوں پر اڑانے لگے۔

میاں خوجی تو ادھر افیم لانے لپکے، اور آزاد اسٹیشن پر ایک ایک کا جائزہ لینے لگے۔

آزاد : (ایک ہندو مسافر سے) رام رام بھائی رام رام۔

ہندو : (مسکرا کر) سلام صاحب سلام۔ ستھنا پہنے ہو، اور رام رام کہتے ہو۔

آزاد : ارے بھائی۔ خدا اور رام ایک ہی تو ہے۔ یہ تو فقط عقل اور سمجھ کا پھیر ہے۔

ہندو : ہاں صاحب ہے تو ایسا ہی۔

آزاد : کہاں جاؤ گے ٹھاکر؟

ہندو : گاؤں یہاں سے پانچ کوس ہے۔ ہم تو پہر بھر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ رات کا اٹھے، نہادا، پوجن کیا، ستو باندھا، ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں آئے گئے۔

آزاد : کتنے گاؤں ہیں تمھارے۔

ہندو : اے، ہجور اب یو سمجھو کہ کوئی دوئی، تو ہمکا کھرچ کے نچ رہت ہیں۔

آزاد : اور یہ گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی میرزائی تمھاری قسمتوں میں ہے۔

اتنے میں آزاد ٹہلتے ہوئے اور طرف چلے تو آواز آئی کہ (ارے میاں یہ کیا بھسا کو بھر گئے ہو ہم سے یہ دو سیرا خمیرا لواور اچھا موٹا تو ابھر کر لاؤ) ! میاں آزاد پیچھے پھر کر جو دیکھے ہیں تو اللہ اکبر یہ تو کوئی بڑے رئیس ہیں بھئی۔ اور یہ تو ہم تب ہی سمجھ گئے تھے جب دو سیرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ ایک سُرخ زین پوش بڑے تکلف سے بچھا ہوا ہے۔ اور ایک صاحب کرّ و فر کے ساتھ متمکن ہیں۔ جامدانی کا کرتا ادھی کا انگرکھا، تین روپیے کی سفید ٹوپی سر پر کج، کھے ہوئے۔ کوئی دو ڈھائی سو کی گھڑی جیب میں اور اس کی طلائی

زنجیر زیبِ گلو چست گھٹنا ڈانٹے ہوئے، جیسے بگلے کا پر۔ قریب چار پانچ سفید پوش اور بیٹھے ہیں۔ ایک ایرانی سے فارسی میں گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ زبان داں فراٹے اڑا رہا ہے۔ یہ لوگ بس بلے بلے کہہ دیتے ہیں اور جو کوئی لولا لنگڑا فقرہ بولے بھی تو بے تکا۔ ایک منشی صاحب نے یہ مخمس سنایا:

واعظا چوں بطرمی چند در آئی بخروش | کہ بیا در چمن خلد و می ساغر نوش
گیرم آں خود ہمہ نوش ست ولیکن من دوش | کردہ ام توبہ بدستِ صنم بادہ فروش
کہ دگر می نخورم بی رخِ بزم آرائی

ایرانی : بارک اللہ ایں مآلِ شماست۔
منشی صاحب : بلے بلے۔ اشعار ست۔ ایں اشعار ست۔
ایرانی : ہر چہ غیر اوست پوچ ست۔
منشی صاحب : بلے بلے۔
راوی : اب فارسی کی ٹانگ نہ توڑیے۔ معلوم ہے کہ آپ بلے بلے جانتے ہیں۔ اور ایرانی کو سکھاتے ہیں کہ اشعار ست۔ ایں اشعار ست۔ بہت ہی خاصے۔ فارسی بولنا فرض ہی کیا ہے۔ نہیں بول سکتے تو خاموش ہی نہ ہو رہو۔ اردو ہی میں گفتگو کرو ورنہ یہ بلے بلے کب تک کیے جاؤ گے۔ اور ایرانی ایک استاد، وہ بھی تاڑ گئے کہ یہاں سب گوکھے ہی گوکھے بیٹھے ہیں بس بلے بلے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔
منشی صاحب : جناب شنیدن کنند کہ؟
راوی : اُف واللہ پھڑکا دیا۔ بھئی اس (شنیدن کنند) نے پھڑکا دیا لوٹن کبوتر بنا دیا۔ شنیدن کنند یعنی سنیے۔
ایرانی : (مسکرا کر) جناب گفتن کنند بندہ شنیدن می کند۔
آزاد : (ہنس کر) و بندہ نیز خندیدن می کند۔
ایرانی : (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) کیستی تو کیستی؟
آزاد : بابا غلامِ فضائے خاکِ پاکِ ایران زمین۔ درویشِ عزلت نشیں ننگِ انام آزاد برائے نام۔
ایرانی : (خوش ہو کر) بیا و نزد ما بنشیں، (میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر) حالا

گفتن کن۔ بندہ شنیدن می کند۔

منشی صاحب : پدرِ ما۔ وہ پدرِ من۔ لاحول ولا قوۃ۔

راوی : اچھے خلف الرشید پیدا ہوئے کہ باپ ہی کے نام پر لاحول پڑھنے لگے۔ ہونہار ہو۔ شاباش۔ ع۔ عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست۔

منشی صاحب : پدرم۔ (آگے آیت)۔

ایرانی : (قہقہہ لگا کر) ے

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوئی نفروشم

منشی صاحب : (بہت خوش ہو کر) او کہ حافظ جی دریں اشعار گفتند آدم بود دیدرم۔

ایرانی : (مسکراتے ہوئے او آدم بود و پدرِ شما خرک مسکین۔

منشی صاحب : (سمجھے خاک نہیں مگر بول اٹھے) بلے بلے۔

آزاد : واہ رے تیرے بلے۔ وہ ان کے پدرِ بزرگوار کو خرکِ مسکین بنا رہا ہے، اور آپ بلے ہی بلے کرتے جاتے ہیں اور یہ حافظ جی کی کتنی کہی ہے واللہ حافظ شیراز کو حافظ جی آج تک کسی نے نہ کہا تھا۔ اور چلے ہیں اہل زبان سے فارسی بولنے :

بت کریں آرزو خدائی کی شان ہے تیری کبریائی کی

منشی صاحب : پدرم زبان خود را تراشید و در گوشۂ مقام نشستہ بود۔

ایرانی : (بہت ہی ہنس کر) زبان خود بریدہ بکنجی نشست مگر دیوانہ بود۔

آزاد : پاگل خانے بھیج دیجیے۔ کوئی ان منشی صاحب سے پوچھیے کہ اس لغو بیانی کی ضرورت ہی کیا تھی بھلا۔

منشی صاحب : پدرم امروز آگرہ عرف اکبر آباد ست و چچا صاحب آمدند۔

ایرانی : (آہستہ سے)۔ ع۔ مارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت۔

آزاد : کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔

منشی صاحب : جناب میدانند کہ بوثیرہ چہ معنی دارد ؟

آزاد : (متحیر ہو کر) چہ می پرسی بوثیرہ۔

منشی صاحب : (زمین پر کوئلے سے لکھ کر) باین طور (بوثیرہ)۔

ایرانی : بوشیرہ لقب حضرت علی ست۔
منشی صاحب : بلے بلے بلے۔ خطاب ست وقاآنی در ایران شما شعر خوب خوب و عمدہ عمدہ میگوید۔
ایرانی : قاآنی مرد۔
منشی صاحب : سعدی ہم مُرد یا نہ ؟
ایرانی : نام سعدی شیرازی بفصاحت زندہ است۔
منشی صاحب : دریںجا مردمان قتی را انگور میگویند۔ قتی چہ معنیٰ دارد ؟
ایرانی : قتی در ترکی صندوقچہ را گویند۔
منشی صاحب : بلے بلے۔ وکرم را سیخ نمودن چہ معنی دارد ؟
ایرانی : کمر سیخ کردن کنایہ از اندک توقّف کردن :

از نخستین نکہت مست و خرامم کردی کمرے سیخ دم کہ کجا بم کردی

منشی صاحب : ساس را ساس میدانی۔ ساس مادرِ زوجہ را میگویند۔ خوش دامن برائے ایں صحیح ست یا غلط ؟
ایرانی : خوشدامن۔ تراشیدۂ فارسی دانایاں ہندوستان ست۔ و بہ ایران ما مادرِ زن و مادرِ شوہر گویند۔

خیر ایرانی تو رخصت ہوئے اب میاں آزاد نے پوچھا کہ حضرت اسمِ مبارک ؟
رئیس : خاکسار کو محمد منور علی کہتے ہیں۔
آزاد : دولت خانہ۔
رئیس : غریب خانہ ایک قصبہ میں ہے یہاں سے کوئی پانچ کوس پر میرے دیہات ہیں۔ کچھ زمینداری ہے۔ سیر ہے۔
میر صاحب : آپ بڑے رئیس ہیں سو روپیہ ماہواری ملوہ بچ رہتا ہے۔ چار بھائی ہیں۔ دو چچا زاد بھائی ہیں۔ وہ تیس تیس روپیہ پاتے ہیں پچاسوں نوکر چاکر آدمی سواری۔
آزاد : یہاں تو بطریق سیر و تفریح آپ آئے ہوں گے۔
میر صاحب : نہیں کچھ روپیہ قرض لینا تھا۔ سو مہاجن دو روپیہ سیکڑا سود مانگتا ہے۔

میاں آزاد نے منشی صاحب کو اشارہ سے بلا لیا اور الگ لے جا کر یوں ہم کلام ہوئے۔

آزاد: حضرت روپیہ قرض لیجیے تو ہمارے ہی ذریعے سے۔ دس ہزار بیس ہزار، پچاس ہزار، لاکھ دو لاکھ، جتنا کہیے مگر جاگیر قرق کرا لیں گے اور چار روپیہ فی صدی لیں گے۔

منشی صاحب: واہ نیکی اور پوچھ کر۔ اگر آپ ایک چودہ ہزار بھی دلوا دیں تو بڑا احسان ہو۔ اور سود چاہے پانچ روپیہ سیکڑا لیجیے تو کیا پروا ہے۔ سود دینے میں تو ہم آندھی ہیں۔

آزاد: بس مل چکا، یہ سود کی کیا بات چیت ہے بھلا۔ سود کیا معنی۔ ہم کہیں سود لیا کرتے ہیں۔ منافع نہیں کہتے۔ سود۔ بڑے وہاں سے سود دیتے والے بن کے آئے۔ خبردار اب سود کا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ تم جانو گے۔

منشی صاحب: اچھا حضور منافع سہی۔

آزاد: سہی یہ سہی کیا معنی؟ اور یہ تو بتاؤ کہ سو روپیہ بے غل وغش پاتے ہیں، تو پھر چودہ ہزار قرض کیوں لیتے ہیں؟ اللہ اللہ ایک دو نہیں چودہ ہزار ایک دم سے لاحول ولاقوۃ۔

منشی صاحب: پیر و مرشد۔ آپ سے تو کوئی پردہ نہیں ہے۔ سو پاتے ہیں، اور پانچ سو مہینے میں اڑاتے ہیں۔ عمدہ کھانا کھاتے ہیں۔ باریک اور قیمتی کپڑے پہنتے ہیں پھر ذی مروّت اتنے بڑے کہ سائل کبھی محروم ہی نہیں جاتا۔ جس نے سوال کیا خوش خوش گیا۔ اور ریاست کی بو دماغ میں ہے۔ کوٹھیاں بنوائیں، بنگلے بنوائے، بگھیاں اُدھے گھوڑے یابو خریدے پھر یہ سب آئے کہاں سے۔ بنک سے لیا۔ مہاجنوں سے لیا۔ اِس سے لیا اُس سے لیا۔ اب چودہ ہزار کے پیٹے میں آ گئے۔ اب کوئی ٹکا نہیں دیتا جس سے مانگتے ہیں وہ ہوا بتاتا ہے۔ کوئی پتیا ناتک نہیں۔ رہی سہی ساکھ دو تین ڈگریوں سے اور بھی خاک میں مل گئی چلیے۔ ع۔ نے غم دزد نے غم کالا،، اب دیکھیے نہ۔ یہ تو حالت ہوگئی ہے اور دوسرا دھواں دھار اُڑ رہا ہے اور چار پانچ حضرات ساتھ ہیں۔ صبح و شام دو وقت چالیس پچاس آدمی دسترخوان پر کھاتے ہیں اور ایسا ویسا کھانا نہیں کہ دال ماش اور چپاتیاں نگل لیں۔ مرغن، اشرفی لقمہ پھر یہ آئے کس کے گھر سے بھلا۔ سو ہی کی تو اوقات ہے۔ سو روپیہ کی کیا بساط۔ آپ کہیں سے دلوا دیں تو بیڑا پار ہے ورنہ کشتی اب ڈوبی اور اب ڈوبی اور غرقاب خاک تھاہ نہ ملے گی۔

آزاد نے اس تقریر کو سن کر کمال افسوس کیا۔ سوچے کہ کفایت شعاری کو بھی خدا نے

کیا ہی شرف دیا ہے۔ اس فضول خرچی سے خدا ہی سمجھے۔ اس سے انسان دین دنیا دونوں میں سے ایک کا بھی نہیں رہتا۔ جہاں اس کی طرف انسان مائل ہوا بس پھر اس سے بچنا محال ہے:

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست   نرود جز بوقتِ مرگ از دست

راوی: اب ان ٹھاکر صاحب اور اِن صاحب کا مقابلہ تو کیجیے۔ وہ بھی زمیندار یہ بھی زمیندار۔ وہ گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی میرزائی پر قناعت کرتے ہیں۔ یہ شربتی اور جامدانی پھڑکاتے ہیں۔ وہ ڈھائی تلے کا لکڑ توڑ چرودھا گنواری جوتا پہنتے ہیں۔ یہ پانچ روپیہ کی چمکتی دمکتی اوگی۔ وہ بھنوری یا پالک اور چنے کی روٹی کھاتے ہیں۔ یہ دو وقتہ شیرمال اور باقرخانی اور مرغ پلاؤ پر سیتھے لگاتے ہیں۔ وہ ٹکے گز کی چال چلتے ہیں۔ یہ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہمارے نزدیک دونوں پر پھٹکار۔ وہ کنجوس۔ یہ فضول خرچ ذلیل وخوار وہ روپیہ کو دفن کیے ہوئے ہیں، یہ روپیہ لُٹاتے پھرتے ہیں۔ ہائے! خَیرُالاُمُورِ اَوسَطُہَا کے مفہوم پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ دونوں مصیبت میں ہیں۔ وہ کھا نہیں سکتے، تو یہ بچا نہیں سکتے۔ افسوس صد افسوس دونوں کے افعال ایک دوسرے کے خلاف اور دونوں مرکز اعتدال سے قدم باہر نکالے ہوئے۔ ٹھاکر سے کوئی اتنا کہے کہ ٹھاکر صاحب۔ اب ساٹھ کے پیٹے میں ہو دس پانچ برس اور جیے تو جیے۔ یہ اس قدر سختی جبراً اپنے نفس پر کیوں گوارا کرتے ہو۔ کہ چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے۔ جان باقی رہے مگر ٹکا نہ نکلے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اب بوڑھے ہوئے کھاؤ اور کھلاؤ۔ اور ان حضرت کو کوئی اس قدر تو سمجھائے کہ میاں چوٹی تک قرض سے ڈوبی ہوئی ہے۔ آخر کچھ فکر بھی ہے، یا آنکھ بند کیے روپیہ ہی لٹائے جاؤ گے۔ خواب غفلت تا کے۔ اب زمینداری گھوما ہی چاہتی ہے۔ پھر وہ مصیبت پڑے گی کہ عمر بھر نہ بھولیے گا۔

لیکن اربابِ خرد اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ٹھاکر لاکھ منحوس، کنجوس ممسک بدبخت سہی مگر ان سے بدرجہا اچھا ہے۔

پری پیکرانِ ملک مہاراشٹر کی حیا پردری اور ذکور کی پاک نظری

مہر سپہرِ رہ نوردی دسپہر مہر کوچہ گردی، میاں آزاد، خانہ برباد، اور ان کے زندہ

دل وصافی مذاق رفیق بالتحقیق میاں خوجی نے بادل شاد ملک مہاراشٹر یعنی دکھن کی بھی سیر وسیاحت لگے ہاتھوں کر لی۔ یہ مقام مینو سواد میاں آزاد، خانہ برباد کو ایسا بھایا کہ بے اختیار زبانِ حال اور لسانِ مقال سے یہ شعر خوجی کو سُنایا:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست
اگر فردوس بر روی زمیں ست　　ہمیں ست و ہمیں ست و ہمیں ست

یوں تو اس مقام دلپذیر کی ہر ایک شے بے نظیر پائی۔ لیکن یہ وضع ان کو سب سے زیادہ بھائی کہ پردے سے مستورات کو اصلا کام نہیں۔ چادر و برقع کا کہیں نام نہیں۔ شریف زادیاں بے حجاب۔ والا دودماں لیڈیاں برافگندہ نقاب، مگر آنکھوں میں حیا و آزرم تہاں۔ چتون سے نیکی اور شرم عیاں۔ تمام شہر حُسن و جمال کی کان ہے ملاحت صباحت کی جان ہے۔ یہاں کی کچھ اور ہی آن بان ہے:

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانی دارد　　بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنی دارد

ساریاں زیب تن ہیں۔ مصروفِ سیر چمن ہیں۔ میاں آزاد نے ٹھان لی کہ ٹرکی سے واپس آئے اور بس یہاں ہی بستر جمایا۔ تمام ہندوستان میں بس یہی ملک نمونۂ باغ نعیم نظر آیا۔

خوجی: کیوں میاں یہاں تو کچھ عجب رسم ہے بھئی یہ بڑی بڑی شریف زادیاں منھ کھولے پھرتی ہیں۔ اس مطلق العنانی کے صدقے۔ واللہ کیا آزادی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ شرم وحیا سب بھون کھائی۔

آزاد: اور سنیے آپ لاحول پڑھتے ہیں۔ کیوں صاحب یہ لاحول پڑھنا کیا معنی پردہ کیسا۔ پردہ ڈھکوسلے کا نام ہے۔ عرب میں، عجم میں، افغانستان میں، مصر میں، مراکو میں، ترکستان میں، کہیں بھی پردہ ہے؟ یہاں پردہ آنکھ کا ہے۔ ان کے دل میں حیا اس طرح مکنون ہے۔ جیسے اسرار قلب میں مکنون رہے۔ اے نادان کہیں برقع سے پاکبازی آتی ہے۔ کہیں چادر حیا سکھاتی ہے۔ جہاں گھونگھٹ کاڑھا اور نظر پڑنے لگی۔ تمار بازوں کی آنکھ لڑنے لگی۔ اور بعض اوقات:

بس قامتِ خوش کہ زیر چادر باشد　　گر باز کنے مادرِ مادر باشد

لیکن گھونگھٹ سے آخر فائدہ ہی کیا ہے؟ گھونگھٹ پر انسان کی نظر پڑی اور کہنا شروع کیا کہ:

نیم موسیٰ نقاب از چہرہ بردار   نمی آید خوشم ایں لن ترانی
کلیم یاد تو از عشق ہر دو سوختہ ایم
ترا تجلّی و مارا نقاب مے سوزد

خوجی : تو آپ بالکل آزاد آدمی ہیں، مگر اپنا یہ مقولہ ہے:

قدم برون تہد ماہِ من ز منزلِ خویش   بود چو صورتِ آئینہ زیبِ محفل خویش
یار سرگرم حیا من ادب آموز نگاہ   چشم تا کار کند شرم و حجاب ست اینجا

یوں تو ہر ملکی و ہر رسمی مشہور ہے، مگر ہمارے ملک میں تو کہاریاں اور مالنیں تک پردہ کرتی ہیں۔ نہ کہ شریف زادیاں۔ معاذ اللہ ایک قدم تو بے پردہ کے جاتی نہیں۔ کیا مجال۔ شرم آشنا، رگ رگ میں حیا:

چوں بینید آن بتِ شرم آشنا آئینہ را   صورت بیگانہ وا انداز حیا آئینہ را

آزاد : ارے میاں نقاب کو شرم، اور حجاب کو آزرم سے کیا سروکار۔ حیا آنکھ کی اس سے بڑھ کر حجاب ہی نہیں۔ اس پاک نظری سے بہتر نقاب ہی نہیں۔ حیا دل میں جیسے بو برگِ گل میں، یا سرور بادہ وُمل میں۔ اور ہمارے ملک ہمارے خاص وطن مالوف و مانوس میں تو پردے کا نام نہیں۔ جیسے عرب میں ٹرکی میں روم و شام میں، سب جگہ یہ رسم کافور ہے۔ ویسے ہی ہمارے ہاں بھی۔ مگر ہندوستان کا تو بابا آدم ہی نرالا ہے۔

خوجی : آپ کا ملک کون خراساں ہے۔ آخر اس آپ کے خاص ملک کا نام تو سنوں؟

آزاد : کشمیر جنت نظیر (خدا آباد رکھے) کون کشمیر۔ وہ کشمیر جس کی شان میں عرفی شیرازی کہہ گئے ہیں:

ہر[1] سوختہ جانی کہ بہ کشمیر در آید   گر مرغ کباب ست با بال و پر آید
از بسکہ کند جذب رطوبت خطرش نیست   گر کاسۂ چینی ز ہوا بر حجر آید

وہاں ہندو مسلمان سب کی مستورات مخدّرات، صرف برقع پوش نکلتی ہیں یا ذرا ہاتھ سے چہرے کو چھپا لیا۔ یہ مرض نہیں ہے کہ عورت گھر کے باہر قدم ہی نہ رکھے۔ یہ تو ہندوستان ہی میں عارضہ پھیلا ہے۔ ہم تو جب ٹرکی سے واپس آئیں گے، بس یہاں ہی بستر جمائیں گے۔

---

[1] یہ مطلع اول ہے اس بہترین قصیدے کا جو عرفی شیرازی نے کشمیر کی تعریف میں لکھا تھا۔ تورانی۔

اور حسن آرا کو ساتھ لے کر مطلق العنانی اور آزادی کے ساتھ ہوا کھائیں گے۔ صبح و شام اس گل فام نازک اندام کو بغل میں بٹھائے بگھی پر ہوا کھا رہے ہیں۔ سیر چمن اور تماشائے نسرین و نسترن کے مزے اڑا رہے ہیں۔

خوجی : یار بات تو خاصی ہے، مگر مجھ منحوس کی تو بیوی اس لائق ہی نہیں کہ ہوا کھلانے لے جاؤں، اور اپنے آپ کو مفت میں ہنسواؤں۔ الّو بنواؤں اور اپنے اوپر آوازے کسواؤں۔ اول تو اب بوڑھی ہوئیں۔ مجھ سے کوئی دو اور ایک اور تین چار برس بڑی ہی ہوں گی۔

آزاد : (ہنس کر) یار تم بھی واللہ بس نمبر اول کے بے وقوف ہی رہے۔ بھلا صحبت یافتہ آدمی کی زبان سے کبھی یہ پوچ فقرہ نکلے گا کہ بیوی مجھ سے چار برس بڑی ہے۔ عمر بھر نوابوں کی صحبت میں رہے، مگر بات کرنے کی تمیز نہ آئی نہ آئی۔ باقی رہا ہوا کھلانے کی نسبت۔ آپ کی زوجۂ محترمہ سیاہ فام ہیں اور ان کے کالے منھ سے آپ جھینپتے ہیں۔ ہوا کھلانے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ آخر ہرج کی کیا بات ہے۔

خوجی : جی جب جش جاؤں گا تو وہاں ہوا کھلاؤں گا۔ بھائی اتنا نہیں سمجھتے کہ آخر کیا مجھے کتّے نے کاٹا ہے، جو بیٹھے بٹھائے جورو کو گلی کوچوں میں ہنڈواؤں واہ اچھی صلاح ہے۔ آپ نئی روشنی کے لوگ ہیں آپ کی حسن آرا کے آپ سے زیادہ نفیس خیالات ہیں، اور پھر خدا کے فضل سے دونوں میاں بیوی جوان۔ دونوں خوشخو۔ دونوں قوس ابرو۔ دونوں زیور علم و فضل سے آراستہ۔ دونوں نوخیز و نوخاستہ۔ جو دیکھے پھڑک جائے کہ کیا چاند سورج کی جوڑی۔ رعبِ حسن سے کوئی نظر نہ اٹھا سکے۔ ایسی شکل و سیرت ہو تو مضائقہ نہیں۔ ہم اب کیا ولولہ دکھائیں۔ وہ جوش ہی نہیں۔ وہ امنگ کجا۔ وہ ترنگ کجا:

وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

آزاد : حسن و جمال تو واقعی سحر کا اثر رکھتا ہے۔ جہاں کسی بت جادو جمال یا مشتری خصال کو دیکھا اور بس انسانی روح وجد کرنے لگی۔ رگِ دل پر تیر نظر نشتر کا کام کرتا ہے۔ لیکن نیکی اور پارسائی بھی دلربائی کے ساتھ ضرور ہے۔ کمالاتِ ذاتیہ اور پارسائی سے شریف زادیوں کو مزین اور خیالاتِ بلند و طبعِ ارجمند سے مشیّن ہونا چاہیے۔ اگر عورت صرف حسین ہی حسین ہوئی تو کیا۔ مگر ہندوستان میں عورت کو پردے ہی

میں رہنا چاہیے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ملیح و وجیہ شوخ و شنگ خاتون مہ پارہ ایک نقرہ خنگ پر بانکی ادا سے بیٹھی ہوئی عین بازار میں گھوڑا دوڑاتی جاتی ہے۔ پتلی کمر جس پر رگِ جان کا دھوکا ہوتا تھا۔ سیکڑوں بل کھاتی ہے۔ ایک ایک قدم پر لچکتی جاتی ہے۔ میاں آزاد نے آیۂ فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھ کر خوجی سے کہا کہ سچ کہنا یار کتنا اچھا انداز ہے۔ سبحان اللہ۔ پس اس طرح پیاری حسن آرا بھی پشتِ سمند پر سوار ہوں گی۔ اس وقت اس بتِ پندار کی آن بان بھی ملاحظہ فرمائیے گا اور ہی عالم ہوگا۔ واللہ وہ جوبن ناز پری کا ہمدم ہوگا۔

خوجی : بھئی سچ ہے ع۔ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی،، واللہ سفر کے مزے اب عمر بھر نہ بھولیں گے۔

آزاد : ہم کہتے ہیں بوا زعفران کو بیاہ لو اور کوئی ٹٹو لے دو۔ بس اسی طرح وہ بھی بازاروں میں ہوا کھائیں۔ لوگ پوچھیں یہ کون ہے تو ہم کہیں میاں خوجی کی زوجۂ مقدسہ ہیں۔

خوجی : بس رہنے دیجیے ہماری بیوی ہوا کھائیں اور ہمارا اور اپنے باپ کا نام بد کریں۔ اور یہ زعفران کون ہے۔ ارے توبہ تو یہ یاد آگئی حضرت معاف فرمائیے۔ وہی زعفران نہ جس نے اپنے شوہر کے دھوکے میں ہماری کھوپڑی گنجی کردی تھی۔ مارے چپتوں کے بوکھلا دیا تھا (اپنے کان پکڑ کر) خداوندا بچائیو! اور شرِ آفات سے محفوظ رکھیو! پیچ پی ہزار نعمت کھائی۔ چھوڑ دے بلّی چوہا لنڈورا ہی ہو کر جیے گا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تین کم سن لڑکیاں عجب ناز و ادا سے قدم رکھتی ہوئی ہاتھ میں ہاتھ ملائے باتیں کرتی چلی جاتی تھیں۔ دو شریف زادے سامنے سے آتے تھے۔ جب وہ تینوں گل بدن غنچہ دہن، دوشیزہ جمیلہ حسینہ اور یہ دونوں نوجوان ایک مقام پر ایک دوسرے کے قریب پہنچے (جیسا بعض اوقات ہر فرد بشر کو اتفاق ہوا ہوگا) جس طرف یہ جائیں اسی طرف وہ جائیں، یہ بھی اور وہ بھی گھبرا گئے۔ وہ دائیں بڑھتی ہیں تو یہ بھی دائیں بڑھتے ہیں اور وہ بائیں کے رخ جاتی ہیں تو یہ بھی۔ ایک منٹ تک یہی نقشہ رہا تو ان کنواری پیاری لڑکیوں کا جو بارہ بارہ برس کی تھیں، چہرہ سرخ ہوگیا۔ ان کے بشرے سے شرم آلود غصہ دیکھ کر یہ دونوں جوان صالح سخت خفیف ہوئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر، اور گردن نیچی کر کے آنکھیں جھپکا کر کہا کہ بہن معاف کرنا ہم نے دیدہ و دانستہ ایسا نہیں

کیا۔ ایسا راہ میں اکثر اتفاق ہو جاتا ہے۔ معاف فرمائیے گا۔ تم تینوں میری چھوٹی بہن ہو۔ اس فقرے سے ان تینوں کا ملال دور ہو گیا اور باشارۂ چشم انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے معاف کیا۔ میاں آزاد اور خوجی دونوں نے بغور دیکھا۔

آزاد : کیوں سچ کہتا چہرے سے کیسی سچی شرم و حیا برستی ہے۔ کیا رعب ہے۔ کیا داب ہے اور ان جوانانِ صالح کو دیکھا کہ اپنے ملک کی معزز خاتونوں کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر اعتدال سے زیادہ آزادی بھی فضول ہے۔ خوب یاد رکھو جن ملکوں میں پردہ نہیں وہاں آزادی کے ساتھ نیکی بھی زیادہ ہے۔ میاں پردہ دل کا ہے۔ عورت اگر بد ہو تو لاکھ پردوں میں سے نکل جائے گی۔ ہاں زیادہ مطلق العنانی بھی عورتوں کے لیے نازیبا ہے۔ یہاں سے بمبئی چلے۔

میاں آزاد کا بمبئی میں داخل ہونا اور خوجی کا ایک گرانڈیل عورت کے عشق میں عقل کھونا

اور بمبئی کیا کہوں بن آئے ہو لنگور سے   داڑھی منڈ وائیں باز آئی خدا کے نور سے

چرخ چنبری لاکھ چرخ کھائے۔ گردونِ گردان ہزار گردش میں آئے۔ زمانہ کروڑ جتن کرے کہ وحشی ملدرزاد، افیونیوں کے مسلّم الثبوت استاد، میاں خوجی سا دوسرا پیدا تو کرے کیا مجال۔ ادھر کی دنیا چاہے اُدھر ہو جائے مگر خوجی اپنے آپ ہی نظیر بنے رہیں گے۔ غصہ تو ان کی گھٹی میں تھا۔ بات ہوئی اور تنک گئے۔ ذرا کسی سے جھوڑ ہوئی اور چیتون پر میل آگیا۔ قرولی تو بات بات پر نکلتی تھی۔ کنجڑن سے تکرار ہوئی، اور چپنیڈوں پر فرضی قرولی حضرت تیز کرنے لگے۔ بڑ قصاب سے کئی بار چھچھڑوں پر چھری چلی۔ ایسی قرولی بھی کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ جس پر غصہ آیا فوراً فرمایا ادگیدی نہ ہوئی نوابی ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ لاش پھڑکنے لگتی۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی مہاراشٹر کے ملک سے بمبئی میں آئے۔ جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر پناہ کے پاس دونوں میں دو دو چونچیں ہو گئیں۔

آزاد : چلو کسی اچھی سی سرا میں چل کر بسیرا لیں۔

خوجی : کہنے والے اور چلنے والے دونوں کی ایسی تیسی۔ کیوں کچھ بھی وعدہ پورا کرتے ہو۔ وہ قرولی تو خریدتے ہی رہے، اور افیم کے لیے کبھی پورے سولہ گنڈے نہ دیے۔ اب یہ

وعدہ خلافی کرتے ہو۔ اسی سے تو ہم نے پہلے ہی قول لیا تھا کہ چاہے آسمان کی جگہ زمین اور زمین کے مقام پر آسمان آجائے، مگر ایں جانب سرا میں قدم نہ رکھیں گے۔ سانپ کا کاٹا رسّی سے ڈرتا ہے۔ اس دن کمہار والے نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ بس ہمارا ہی سر جانتا ہے۔

آزاد : اجی اب دنیا بھر کی سراؤں میں کمہار ہی کمہار تو ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہو کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔

خوجی : اچھا۔ تو اس شرط پہ چلتے ہیں کہ رات کو کسی پیڑ پر بسیرا لینا۔

خوجی کی درگت

آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے تو سرا میں کھٹ سے داخل۔ ایک کوٹھری میں جاکر میاں خوجی تو مزے سے چھپر کھٹ پر دراز ہوئے۔ چاروں شانے چت میاں آزاد خانہ برباد بھی دوسری کھٹیا پر لیٹے ہو کر خرّاٹے لینے لگے۔ خوجی افیمی آدمی نیند کہاں۔ بس کوئی دم آنکھ جھپکنے ہی نہیں پاتی۔ آزاد نے تکیہ پر سر رکھا تو نیند ہاتھ باندھے آن موجود ہوئی۔ خوجی نے جوان کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ ہی آپ کہنے لگے کہ ارے میاں آزاد گذر گئے۔ بے چارے خوب آدمی تھے افسوس ابھی باتیں کرتے تھے ابھی ندارد۔ ع۔ افسوس کہ از میانہ برخاست،،

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشیدہ قامت، بلند بالا شیطان کی خالہ سامنے سے چمکتی دمکتی ہوئی آتی ہے۔ مگر قد کوئی سات فٹ کا نصف انچ کم نہ جو بھر زیادہ۔ آستینوں کی پھنسی ہوئی کُرتی، اور وہ چستی اور پھرتی، کہ الاماں! چادر سبز پہنے سبزانِ چمن کو شرماتی ناز سے قدم بڑھاتی ہوئی میاں خوجی کی طرف آنکلی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک تیکھی چتون سے ان کو دیکھ لیا اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلی چلی تو حضرت نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھما چھم کرتی ہوئی کوٹھری میں درّاتی چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس بیتر اہوئے سوچے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل گئی تو وہ لے ہی ڈالیں گے۔ کہ اللہ اللہ اب آپ کو بڑے بڑے شوق چرّائے اور جو کہیں خود ریجھ گئے تو پھر ہم کو چوپر ہی کر ڈالیں گے اور ہم بس لیموں اور نون ہی چاٹ کر رہ جائیں گے۔ اشارے سے کہا کہ ذری آہستہ آہستہ بولو اس نے کہا کیا؟ مُنھ سے کہو۔ کچھ سر سے کھیلو مُنھ سے بولو۔

خو.جی : (منہ پر انگلی رکھ کر) چپ چپ۔

عورت : اے واہ۔ اچھے ملے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ ہے۔

خوجی : (اشارے سے) میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

عورت : ان کا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمہارے۔

خوجی : (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے چپ بھی رہو۔

عورت : چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر کے بیٹھیں۔

خوجی اور وہ عورت جس پر میاں صاحب کا دل آیا تھا چلے اور ایک کوٹھری میں۔ یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوجی : آپ کا نام۔

عورت : کیسر۔

خوجی : (کانپ کر) سچ کہنا کہیں زعفران کی ہمشیرہ جان تو نہیں ہو۔

عورت : اللہ جانتا ہے کتنے وجیہ جوان ہو، اور خدا پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خو.جی : (اکڑ کر) ابھی کیا جوانی میں دیکھنا ہم کو۔

راوی : کیا خوب ابھی جوانی شاید پھر آنے والی ہے۔ کچھ اوپر پچاس کا سن ہوتے آیا سن شریف پنجاہ و شش نازم باین پش فش۔ واہ رے بزاخفش۔ اس عورت نے آپ کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا کہ ماشاء اللہ کیا ہاتھ پاؤں ہیں۔ لیکن آپ سمجھے کہ سچ مچ ریجھ ہی گئی تو اور بھی بھپرنے لگے اور مشیخت میں آن کر فرماتے کیا ہیں کہ ابھی کیا ابھی تو دودھ ہی پیتے ہیں۔ بڑھ کر جوانی میں دیکھنا کہ کچھ اور ہی عالم ہوگا۔ اب جنازے پر جوانی کو یاد کیجیے گا۔ ارے ناداں کہیں آب رفتہ پھر جو میں آیا ہے۔

عورت : ڈیل ڈول کتنا پیارا پایا ہے اور نکھ سکھ سے کتنے درست ہیں آپ۔ ماشاء اللہ جی خوش ہوگیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خو.جی : (دونوں بازوؤں کو پھڑکا کر) اور جو میں ورزش کروں تو شیدی لندھور کو لڑاؤں۔

عورت : ذرا کان تو پھٹپھٹا ڈالو۔ شاباش ہے۔

خوجی : ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانوگے۔

عورت : جو بُرا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلادوں گی۔ چلو چھٹی ہوئی۔

خوجی : (ہاتھ جوڑکر) جان بخشی کرو تو کہوں۔

عورت : کیا بھٹیارے یا بھٹیاری یا کسی اور کی جان لوگے۔ آخر صاحب یہ جان بخشی کیسی۔ اچھا جو تمھیں کہنا ہو وہ کہو۔ مگر داڑھی صفاچٹ ہو۔

خوجی : خون معاف ہو۔

عورت : چپت لگاکر۔ ابے بھکوئے خون کیسا؟

راوی : ہات ترے گیدی کی لے اور لے گا۔ پڑی نا ایک زناٹے کی۔ واللہ یہ تو زعفران کی ہمشیرہ جان کی ہمشیرہ جان ہی نکلیں۔ چپت بازی ہونے لگی۔ خوجی سر کی خیر مناؤ جب نہیں تو اب سہی۔

خوجی : یہ دھول دھپا شریفوں میں بھلا کہاں جائز ہے۔

عورت : شریف تجھ موئے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے۔ ٹوپی پھینک کر ایک اور چپت جمائی۔ چٹاخ۔

راوی : ہاں اب کی البتہ چٹاخ کی آواز گونجی۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ خوجی کے سر کی سلامتی نہیں۔ جب نہیں تو اب سہی۔ ع۔ چور جاتے رہے کہ اندھیاری،،۔

عورت : آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے۔ پھوڑدوں دونوں دیدے؛

راوی : واہ واللہ اچھی آنکھ پھوڑ سے آنکھ لڑائی۔ خدا چشم زخم حوادث سے بچائے۔ جسم بھر میں اس نے دیدہ دانستہ عین آنکھ ہی پر نشتر لگانا چاہا۔ عورت کیں آنکھ پھوڑ ٹنڈا ہے۔

خوجی : اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے۔ اب بے بتاؤ کچھ مانگیں تو دوگی۔

عورت : ہاں کیوں نہیں (کان پکڑ کر ایک لپڑ ادھر اور دوسرا اُدھر) کیا مُعمے بولتے ہیں آپ چیستانیں بجھواتے ہیں۔

خوجی : (گھبراکر) ہم مانگتے ہیں کہ قول دو۔

عورت : دیا۔

خوجی : پھر مکرنے کی نہیں سَنَد دَنَد۔

عورت : نہ۔

خوجی : میں کہتا ہوں پھر۔

عورت : بسم اللہ۔

خوجی : کہنا یہ ہے کہ۔ مگر کہتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

عورت : اب میں تم کو ٹھیک نہ بتاؤں کہیں۔

خوجی : شادی کر لو میرے ساتھ۔

راوی : اہو ہو ہو۔ ارے واہ رے خوجی۔ اچھا شوق چرّایا۔ یہ جب ہی جوتیاں کھاتے جاتے تھے اور منکتے تک نہ تھے۔ کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔ مگر جناب خواجہ صاحب شادی کا شوق تو چرّایا۔ اب ذرا اس کشتی گیر کے نیچے بھی تو دیکھتے جائیے۔ وہ دیکھیے دیو کی بچی سامنے ڈٹی کھڑی ہے گولا دنگ ذرا اس کے نیچے اور ڈنڈ پیل تو اچھی طرح ملاحظہ فرمائیے آپ کو وہ پھینکے تو گیند کی طرح لڑھکتے جائیے اور پھر قد تو ناپیے۔ آپ کوئی پونے پانچ انگل اور وہ پورے سات فٹ ہے۔ اتنی بڑی لمبی عورت تو آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی۔ خوجی چار بالشت۔ وہ ہشت مشت۔ خوجی دبلے پتلے لاغر، وہ لحیم و شحیم، فربہ و جسیم۔ وہ ڈنڈ پیل کشتی گیر۔ یہ آج مرے کل دوسرا دن مگر خوجی کی آنکھوں پر شیطان نے پٹی باندھ کر پٹی پڑھادی کہ بس ساری خدائی میں حور ہے تو یہ ہے اور دوراز قصور ہے۔ تو یہ ہے۔ میاں خوجی کا اور اس کا مقابلہ۔ جیسے پدّے اور شہباز۔ یا ٹینی مرغ اور طاؤس طنّاز۔ اور لطف یہ کہ ابھی چپتیائے گئے ہیں۔ لیکن ایسے رہے کہ بیاہ ہی بیاہ پکارنے لگے۔

خوجی : تمہارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عورت : اے ابھی تم بچے ہو۔ دودھ کے دانت تک تو ٹوٹے نہیں بیاہ کیا کروگے بھلا۔

خوجی : واہ وا۔ میرے دو بچے کھیلتے ہیں۔ ابھی تک ان کے نزدیک لونڈے ہی ہیں ہم۔

عورت : پھر اس کی نہ کہیے۔ میرا ابھی تو ایک بچہ کھیلتا ہے۔

خوجی : لاحول تو بس معاف کیجیے۔

عورت : آگئے نہ جھانسے میں۔ اتنا نہ سمجھے کہ ابھی میں آپ بچہ ہوں لڑکوری کیوں کر ہو سکتی تھی بھلا۔

خوجی : سن شریف۔

عورت : بارہ اور پانچ کے ہوئے۔

راوی : کیا بھولی بنتی ہیں۔ جی بارہ اور پانچ باون ہوئے۔

خوجی : بارہ اور پانچ سترہ۔

عورت : پھر اس عمر میں کہیں لڑکا بھی ہوا ہے۔

خوجی : (دست بستہ) کہنا مانو نکاح پڑھوا لو۔

عورت : کچھ کمائی دمائی تو نکال اور داڑھی منڈوا۔

خوجی : (دس روپیہ دے کر) لو یہ حاضر ہے۔

عورت : دیکھوں۔ اونھ ہاتھی کے منھ میں جیرا۔ اچھا خیر۔

خوجی : لو یہ پانچ اور لو۔ اس کے کپڑے بنوانا۔ مگر میری دھجیاں نہ اڑانا۔ میں زمین کا گز بن جاؤں گا اور تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔

عورت : (کان پکڑ کر) ایک شرط سے شادی کروں گی۔

خوجی : منظور۔

راوی : ایں! اچھی منظوری ہے۔ ابھی شرط سنی ہی نہیں اور منظور کر لی۔

عورت : صبح تڑکے سویرے منھ اندھیرے اٹھ کر مجھے جھک کے سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی۔

خوجی : اجی بلکہ اور دس۔

راوی : شاباش۔ حاتم ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ اور بیس۔ کھوپڑی کچھ کرایہ کی کھوڑی ہی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ شادی ابھی منزلوں دور ہے۔ پہلی ہی منزل ہے اور اس قدر سختی کے ساتھ قول لیا جاتا ہے اور کھوپڑی سب کے پہلے ہی تاکی گئی۔

خوجی : (اچھل کر) چاند سی بیوی پائی۔

راوی : چاند گنجی ہوگی۔

عورت : اچھا اسی بات پر ایک پنجہ اور داہنے ہاتھ سے نکالو۔

خوجی : لو یہ پانچ اور لو۔ تمھارے دم کے لیے سب کچھ موجود ہے۔

راوی : بجا ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔ نواب کے داروغہ سے رقم کی رقم دھمکا کر

پٹیل لائے ہو نہ۔

عورت نے جھپ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھا لیا اور بغل میں دبا کر لے چلی، تو خوجی بہت ہی چکرائے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے ہزار زور کیے مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑیمار جانوروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے لے چلے۔ اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں، اور وہ کشیدہ قامت عورت چھم چھم کرتی ہوئی اور پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی ہوئی یہ گئی وہ گئی۔ ایک مقام پر خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اس نے پھر چپٹر غٹو کیا۔

خوجی : اب چھوڑتی ہے یا نہیں۔ مگر داڑھی میں بچا ہی لوں گا۔

عورت : ایں! ہوش کی دوا کر مردوے۔ میں اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام لوں گی نہیں۔ ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا کیا جانیں بس ایک کے سر ہو رہیں۔ بھاگے کہاں جاتے ہو میاں۔

خوجی : میاں ابھی سے کیوں کر ہو گئے۔

عورت : بس اب زیادہ ٹرائو گے تو میں اسی وقت سے چپت بازی شروع کر دوں گی (گودی سے اتار کر) بھلا تم بھاگ تو جاؤ۔

خوجی : یارو کیا اندھیر ہے۔ میں کچھ قیدی ہوں۔

عورت : (چپت دے کر) اور نہیں کون ہے تو آخر تو ہے کون۔ اب کیا میں کہیں جانے بھی دوں گی۔

خوجی پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائیں اب یہ جھلائے اور غل مچایا کہ کوئی ہے۔ لانا قرولی۔ تماشائی بازاری اردگرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگائے، کھڑے ہنس رہے ہیں۔

ایک : کیا ہے میاں کیا ہے کیا۔ یہ دھڑ پکڑ کیسی؟

عورت : آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ ہمارے میاں ہیں ہم چاہیں پچتیائیں چاہے دھپیائیں پھر کسی کو کیا۔

خوجی : واہ تو میاں بس دھپیانے ہی بھر کے ہیں۔

دوسرا : ان کو بغل میں داب کر کہاں لے چلیں۔

عورت : جدھر سینگ سمائے۔

خوجی : ہائے نہ ہوئی قر۔

کانسٹبل : کیا! قرولی۔ پہلے لیسنس تو دکھاؤ۔ پھر قرولی نکالو۔ ہونھ مہرارو گردن دابے گودماں اٹھائے لیے جات ہے۔ وہ کرولی (قرولی) نکالت ہیں۔

تیسرا : ارے واہ رے بے غیرت جورو نے دبایا اور دبوچا اور تو دم بخود کھڑا ہے۔

چوتھا : تو حضرت کرے کیا۔ وہ ٹھہری ہٹی کٹی ڈنڈ پیل۔ یہ بے چارے دبلے پتلے مریل آدمی، پھر اس دیونی سے عہدہ برا کیوں کر ہو سکیں۔

خوجی : بھائیو میری جان بچاؤ۔

لوگ : بیاہ کیوں کیا تھا۔

عورت : میاں بیوی کے جھگڑے میں آپ لوگ نہ پڑیں۔

خوجی : میاں کون مردود ہے؟

عورت : تو مردود اور کون۔

خوجی : خدا کی مار جو اس کے ساتھ نکاح بھی ہوا ہو۔

عورت : بھلا پھر میں یوں ہی ان کو بغل میں دبوچ کر لے آتی۔

لوگ : جیسے بلی اپنے بچوں کو منھ میں دبا کر گھر لے جاتی ہے۔

کانسٹبل : یا جیسے دائی بچوں کو گود میں لے کر تماشا دکھلاتی ہے۔

خوجی : یارو ذرا میاں آزاد کو سرا سے بلانا۔

عورت : ہاں یہ کہیے اب آپ کی کچھ اور نیت ہے۔

پھر گود میں اٹھا کر لے چلی۔ مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی۔ مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی تماشائی اور بازاری اور حوالی موالی، ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے، اور خوجی ایسے جھلائے کہ بوٹیاں نوچے ڈالتے تھے۔ مگر قرولی میان ہی میں ہے۔

لوگ : اجی بس جاؤ بھی۔ عورت ذات سے جیت نہیں پاتے بس عزت ڈبو دی بالکل۔ لاحول ولا۔

خوجی : اجی اس عورت پر علی کی سنوار۔ یہ تو مردوں کے کان کاٹتی ہے۔

عورت : (جھلا کر) ہاں! کوسنے بھی لگے اب۔ اچھا۔

اچھا کر کے جو اس نے دبایا تو میاں خوجی نے توبہ غل مچایا۔

خوجی : ارے یار دکیا شہر شملہ ہے۔ ایک عورت ڈائن ایک بھلے مانس کو مارے ڈالتی ہے اور کوئی بیچ بچاؤ تک نہیں کرتا۔ یار و خدا کے لیے بچاؤ للہ بچاؤ۔ لیکن واہ رے میں داڑھی بچا ہی لی۔

اتنے میں میاں آزاد جو بیدار ہوئے تو خوجی غائب غلّہ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتا ہی نہیں۔ خوجی خوجی خواجہ صاحب اجی جناب خواجہ صاحب۔ ایں! جواب ہی نہیں دیتے۔ ارے میاں کہاں ہو۔ وہ ہوں تو بولیں۔ وہ تو بازار میں اضحوکہ روزگار بن گئے ہیں۔ بھٹیاری نے کہا کہ (میاں خوجی بزاز کی طرف گئے تھے) میاں آزاد بازار گئے کہ دیکھیں کیا اُفتاد پڑی۔ دیکھا تو دنگ ہو گئے۔ للکار کر کہا کہ چھوڑ دے۔

اس نے خوجی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے میاں خوجی سے کہا کہ حضور میرا انعام ہوا۔ میں بھر دیا ہوں۔ خوجی ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، پچیس تیس روپیے گئے اور اُلّو کے اُلّو بنے۔

ہمارے اولی مولی خبطا ہولا، کوچہ گرد، خانہ برباد میاں آزاد اور احمق مادر زاد میاں خواجہ صاحب گرتے پڑتے لپ جھپ قدم دھرتے چوٹ کھاتے ہوئے ہرن کی طرح طرارے بھرتے بازار سے بھاگے تو شہر بھر کے لونڈے لاڑھیے ساتھ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔ حضرت خوجی اپنے حساب تو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہیں مگر پاچہ ماشاءاللہ بعدستان چین کی طرح پاؤں دھرتے ہیں۔ کمر دوہری ہوئی جاتی ہے اور خلق خدا قدم قدم پر پھبتیاں سناتی ہیں۔

ایک بولا کھو چڈا اگل خیر و چاند سی بیوی نے چاندگنجی کر دی نا۔ کیوں ہات تیرے کی۔ دوسرا قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ اچھی بیوی پائی کہ گرہ ہی سے کچھ کھو بیٹھے۔ تیسرے بگڑے دل نے پوچھا کہ کہو استاد کھوپڑی کی اب کیا کیفیت ہے؟ چوتھا بولا میاں صندلی رنگ معشوق سے دل کیا ملایا کہ دردِ سر خریدار۔

خوجی بے چارے کو راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ جدھر نکل جاتے ہیں آوازوں کے چھرّے چلتے ہیں۔ پھبتیوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ بیوی سے میٹھی میٹھی باتیں بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ تلخ کامی نصیب ہوئی۔ دل ہی دل میں سب کو صلواتیں سناتے اور چپکے

چپکے کوستے اور بڑبڑاتے جاتے تھے۔ اس داستان گل گل میں آئے حواس اور بھی غائب ہوگئے۔ اچھی غنچہ دہن گل بدن کے بیاہنے کا شوق چرایا کہ یار لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ چو طرفہ چل پوں مچی ہوئی ہے۔ دو چار آدمیوں نے بہروپیے کی تعریف کی۔ تو خوجی جل بھن کے خاک ہوگئے۔ وہ تو کہیے کہ خیر سے قرولی میان ہی میں تھی ورنہ خون کی ندیاں بہنے لگتیں اب کسی سے بولتے ہیں نہ چالتے ہیں۔ دُم دبائے ڈگ بڑھائے، آنکھیں جھپکائے، گردن نیوڑھائے، ٹپّا توڑ بھاگ رہے ہیں اور قطع شریف دیکھ دیکھ کر لوگوں کو اور بھی ہنسی آتی تھی اور ان کی ہنسی ان کو خون رلاتی تھی۔ ع وائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے"

نیا شہر غریب الوطن آدمی۔ گلی کوچوں سے ناواقف بات کرنے کی قسم کھائی۔ بوے اور شامت آئی۔ سرا کا راستہ یاد نہیں۔ گھومتے گھامتے شہر بھر کے صدقے ہوتے۔ بارے خدا خدا کر کے سرا میں بلا کی طرح نازل ہوئے۔ تو یہاں بھی تالیاں بجنے لگیں۔ یہ پسینوں میں عرق عرق جوئے ندامت میں از پا تا فرق غرق۔ نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں ایک چھپر کھٹ پر دراز ہوئے۔ کئی بھٹیاریوں نے حضرت کو آن کر گھیر لیا۔ ایک سبز پوش نے مسکرا کر کہا کہ گاج پڑے ایسی عورت پر جو بے نکاح پڑھوائے میاں کو گود میں اٹھائے، اور بازار بھر میں ہنڈوائے۔ خوجی اس تقریر پر لوٹ پوٹ ہوگئے اور بھانپ گئے کہ یہ ہے کہیں ہماری ہی طرف کی، ورنہ یہ لفاظی اور لسانی کجا۔ اتنے میں میاں آزاد بھی آئے اور خوجی کی چارپائی پر بیٹھے۔

آزاد : (سبز پوش سے) کیوں بی خیر تو ہے۔ آج بال بکھرے بکھرے کیسے ہیں کیا خوجی کے پٹنے کا ماتم کرتی ہو۔

سبز پوش : (مسکرا کر) بناوٹ سجاوٹ تو میری گھٹی میں پڑی ہے۔ روز چوٹی کنگھی کی فکر رہتی تھی، مگر جب ہم نے دیکھا کہ خوجی ہم پر نظر ہی نہیں ڈالتے تو پھر ہم سوچے کہ کس کا نکھار اور کہاں کا سنگار، انھیں کا آج سوگ کیا ہے۔ جب سے آئے مُنھ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ اچھی مرمت کر دی گئی۔ نہیں تو سرا بھر کو سر پر اٹھاتے تھے۔ بار بار اتنا غل مچاتے تھے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ ٹل وہ قرولی جہاں کی تہاں ہی رہی۔ توبہ توبہ!

آزاد : ٹپنے کا تو انھیں خوف نہیں کئی جگہ دھپیائے گئے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔

کہ بوا زعفران نے ان کی کھوپڑی پلپلی کر دی تھی، مگر ان کا قاعدہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ آج کیا جانے کیا سبب ہے کہ انتہا کے ملول معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر آزاد چلے گئے۔

بیچارے بے بس میاں خوجی نیب کے پیڑ کے سایے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہے تھے۔ فقرے باز ہنسوڑ بنا رہے تھے۔ سرا کی بھٹیاریوں نے ایسا انگلیوں پر نچایا کہ خدا کی پناہ۔ مگر انھوں نے جو سوں کھینچی تو تھکے تک نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان رعنا بلند بالا جوڑی تینچے کی کمر سے لگائے سر دہی لٹکائے اودی پگڑی سر پر جمائے بانکی ترچھی وضع بنائے اوچی بنا ہوا اور خوب تنا ہوا، جوانی کے جوش میں اکڑتا آتا ہے۔ بھٹیاریاں غور سے تاکنے لگیں۔ چھپ چھپ کے جھانکنے لگیں۔ سمجھیں کہ مسافر ہے۔ چو طرفہ سے غل مچایا۔ آسمان سر پر اٹھایا کہ میاں ادھر آؤ، یہاں بستر جماؤ۔ میاں مسافر دیکھو صاف ستھرا مکان ہے۔ میاں سپاہی بکریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں ہے ذرا تو تکلیف ہوگی نہیں۔

سپاہی بولا کہ ہمیں بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے۔ کوئی ہمارے ساتھ چلا چلے تو سودا سلف خرید کر ہم آجائیں۔ جوان آدمی اور بلا کا حسین پھر آپ جانیے حسن وہ شے ہے کہ چٹکیوں میں رنگ جما لے۔ سب کی سب بے جھجک اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوئیں۔ ایک بولی چلیے ہم چلتے ہیں۔ دوسری نے کہا لونڈی حاضر ہے۔ تیسری چمک کر بڑھی کہ میں جاؤں۔ سپاہی نے کہا کہ پرائی عورت کو بیچ بازار میں ساتھ لے جانا رسوائی ہے۔ کوئی پڑھا لکھا مرد چلے تو ہم پانچ روپیہ دیں۔ ابھی چہرہ شاہی خاصے کھرے چمکتے دمکتے گنوائے۔ میاں خوجی کے کان میں پانچ چہرہ شاہی کی جو بھنک پڑی تو کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور کہا کہ کہیے تو میں چلوں۔ مگر پانچوں نقد گنوا دیجیے، بندہ الیسٹھ سے منزلوں بھاگتا ہے۔ پیچھے جوتی بیزار نہ ہو۔ سپاہی نے جھپ سے کھن کھن کر کے پانچوں گن دیے۔ روپے تو خوجی نے ٹینٹ میں رکھے اور مال و اسباب بھٹیاری کو سونپ کر سپاہی کے ساتھ چلے۔ اب بازار میں جس طرف سے حضرت نکل جاتے ہیں غول کے غول جمع۔ ٹھٹ کے ٹھٹ اور حوالی موالی انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ یہ وہی جانگلو ہے جس کو بہروپیا عورت کا بھیس بدل کر گود میں اٹھا لایا تھا اور راہ میں خوب گدیایا تھا۔ غٹ کے غٹ پلے پڑتے ہیں۔ تماشائی ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ جسے دیکھو قہقہہ اڑاتا ہے۔ لوٹن کبوتر ہوا جاتا ہے۔ بھئی واللہ اچھا

فقرہ کیا۔ خدا کی قسم خوب پھانسا دیا۔ اچھی جوڑ و پائی۔ خوب ہی گت بنائی۔ کھوپڑی ہی جانتی ہوگی۔ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ واللہ کتنے بھولے بھالے ہیں۔ سیدھے جیسے نکوا؟ جب چاروں طرف سے یاران سرپل چھاؤں آئے تو خوجی بہت ہی جھلائے اور غل مچایا ایک ایک کو ڈانٹنے لگے کہ بس اب زبان سے کوئی کلمہ نکلا تو برس ہی پڑوں گا۔ ایک ایک سے اسی میدان میں لڑوں گا۔ (سپاہی سے) حضرت ذرا قرابینچ تو دیجیے گا اور یہ میرا گنّا تو لیجیے گا۔ یہ کہہ کر خوجی نے کمر کسی اور کنارا اے کر پیترا بدلا اور ٹھاٹھ سے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اے کیوں نہ ہو میرے شیر۔ اس بات کے صدقے۔ قردلی، قرابینچہ سروہی تینچہ نہیں نہ سہی۔ افیون کی خیر رہے کتارا کیا کم ہے۔ ہتھیار ہو یا نہ ہو کیا غم ہے۔ اتنے میں ایک شخص نے جھپٹ کر کیلی جو کی تو کتارے کے دو ٹکڑے۔ ایک تو وہ لے بھاگا۔ دوسرا میاں خوجی نے لپک کر اٹھایا۔ اور سیکڑوں گالیاں دینا شروع کیں۔ سپاہی نے اردگرد کے بگڑے دل بے فکروں کو للکارا اور خوجی کو تتو تھمبو کر کے سمجھایا۔ چلتے چلتے ایک افیونی کی دکان پر پہنچے اب تو میاں خوجی کی جان میں جان آئی۔ چنیا بیگم پائی۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ جمائیوں پر جمائیاں آتی ہیں۔

سپاہی : کہو بھئی جوان۔ ہے شوق۔ پلواؤں۔

خوجی : اے میں تیری زبان کے قربان۔ اور اس دکان کے صدقے۔ اس افیون کے واری۔ چنیا بیگم میری پیاری۔

سپاہی : شوقین آدمی ہو۔

خوجی : اجی میں تو اس پر عاشق ہوں۔

سپاہی نے میاں خوجی کو خوب افیم پلوائی۔ اور اس ڈال کے ٹوٹے نے جو چسکی لگائی۔ تو غٹ غٹ کر کے پیتا ہی گیا جب خوب سرور گھٹے اور نشے جمے تو سپاہی نے ان کو ساتھ لیا اور لے چلا۔ اثنائے راہ میں خوجی سے یوں میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں۔

خوجی : افیم پلائی ہے تو مٹھائی بھی کھلواؤ۔ احسان کرے تو پورا۔

سپاہی : ابھی ابھی لو چار گنڈے کی پنج میل مٹھائی حلوائی کی دکان سے لاؤ۔

خوجی : (خوجی خوش ہو کر)

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

حلوائی کی دکان سے میاں خوجی نے لڑ لڑ کے خوب مٹھائی لی اور چنگیل لے کر جھومتے ہوئے چلے۔ اب مارے بھوک کے راستے میں ہی چپکے چپکے ڈلیاں نکال کر چکھنی شروع کر دیں۔ سپاہی کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا مگر دیدہ و دانستہ آنکھ چورا لیتا تھا۔ خوجی نے تھوڑی ہی دیر میں آدھی چنگیل خالی کر دی۔

سپاہی : ۔ مٹھائی سے بوجھ معلوم ہوتا ہو تو مجھے دیدے۔

خوجی : جی نہیں حضرت۔ میں تو ایک بہنگی اٹھانے کا دم رکھتا ہوں آپ پاؤ بھر مٹھائی کو بوجھ سمجھتے ہیں۔

سپاہی : کیا کسی کہار کی نسل سے ہیں آپ ؟

خوجی : (سنا نہیں مگر جواب ترسے دیا) جی ہاں جی ہاں جی ہاں کہہ کر ایک ڈلی اور منھ میں رکھ لی۔ اتنے میں سپاہی نے مزدور کے ایک لونڈے کو بھی ساتھ لیا اور چلتے چلتے ایک بزاز کی دکان پر پہنچے۔ خوجی اور وہ دونوں بیٹھے۔

بزاز : حکم کیا خریداری ہوگی۔

سپاہی : (خوجی کی طرف اشارہ کر کے) ان کے انگرکھے کے برابر جامدانی دیجیے۔ خوجی نے انگرکھے کا نام اور جامدانی کا لفظ سنا تو جامے میں پھولے نہ سمائے۔

بزاز : اچھا۔ حضور۔ اپنے انگرما پھک (موافق) لیں تو کچھ ہمیں بھی مل رہے اور (خوجی کی طرف دیکھ کر) ان کا تو انگرکھا اور پائجامہ اور چپکن سب گج بھر میں تیار ہے۔

سپاہی : تم کو اس سے کیا مطلب۔ بڑے جھجھالیے ہو۔

خوجی : (پونڈا ٹیک کر) نکالو جامدانی نکالو۔ بہت باتیں نہ بناؤ۔

بزاز : لیجیے کیا جامدانی ہے۔ اول نمبر۔ بہت بڑھیا۔ مول تول دس روپیہ گز۔ نہیں سات روپیہ گز کو آئے گی۔

سپاہی : بھئی ہم پانچ روپیہ کو لیں گے۔

بزاز : اب تکرار کون کرے آپ چھ کے دام دیں۔

سپاہی : اچھا دو گز اتار دو۔

بزاز : لیجیے اور یہ الپا کا ہے۔ سات آنے دیا۔

سپاہی : اچھا دس گز یہ بھی اتار دو۔

سپاہی نے بزاز سے سب ملا کر کوئی پچیس روپیہ کا کپڑا لیا۔

میاں خوجی کی یہ کیفیت کہ پینک میں غین۔ سر کی خبر نہ پاؤں کی۔ ایک دفعہ ہی پینک میں آئے تو سر قدم بوسی کو چلا۔ مزدور کا لونڈا یہ حال دیکھ کر ہنس پڑا تو حضرت جاگ اٹھے۔ مگر پھر آنکھیں جھک گئیں۔ سر کھمبے کی طرف چلا۔ اور کھٹاک سے بولا۔ تو کھوپڑی سہلاتے ہوئے پھر آنکھ بند۔ اپنے آپے میں تو تھے ہی نہیں۔ وہ تو افیم کے بس میں تھے میاں سپاہی جب خوب لے دے چکے تو گٹھا باندھ کر لونڈے کو دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

بزاز : کہاں ؟

سپاہی : گھر۔

بزاز : گھر ؟

سپاہی : ہاں۔

بزاز : اور دام ؟

سپاہی : آکر دیں گے۔

بزاز : واہ۔

سپاہی : ارے بھئی کچھ چوروں سے بیوہار ہے۔

بزاز : جمانا (زمانہ) ناجک (نازک) ہے۔

سپاہی : (خوجی کی طرف دیکھ کر) ہمارا سالا بیٹھا ہے۔ ہم ابھی آئے۔

وہ تو لے دے کر اور خوجی کو سالا بنا کر چلد یے۔ اب خوجی جو پینک سے چونکے تو سپاہی نہ مزدور کا لونڈا۔ فقط خوجی اور ان کا پونڈا۔ چلے تو بزاز نے گردن ناپی۔ کہاں چلے آپ۔ کہاں چلے کہاں ؟ ہم کیا کسی کے غلام ہیں۔ گلام نہیں اور ہو کون۔ تمھارے بہنوئی تم کو بٹھا کر کپڑا لے گئے ہیں۔ تب تو خوجی چکرائے۔ ابے کیسے بہنوئی اس نے کہا بس بے تے نہ کرنا میاں۔ سالے ہو ان کے کہ نہیں۔ اتنے میں ایک شخص نے کہا کہ یہ خط وہ یہاں پھینک گئے ہیں۔ خوجی جو اس رقعے کو پڑھتے ہیں تو یہ لکھا تھا۔

رقعہ

ہات ترے کی کیوں کھا گیا نہ جھانسا۔ دیکھ اب کی پھر پھانسا۔ تب کی بیوی بن کے جیت یا دیا

اب کی میاں بن کے غپّا دیا۔ بڑے مزے سے حضرت مٹھائی ٹونگتے آتے تھے گویا ہم اندھے تھے۔

خوجی ارے! کر کے رہ گئے۔ واہ رے بہروپیے۔

میاں خوجی چکر ہیں کہ اچھا گھن چکر بنایا۔ سالا کا سالا بنا گیا۔ اور غپّا جو دیا وہ گھاتے ہیں۔ خیر اور تو جو ہوا وہ ہوا۔ اب یہاں سے چھٹکارا ذری ٹیڑھی کھیر ہے۔ بزاز دس، ہم ٹرّوں ٹوں پھٹیل۔ پھر یہاں کسی سے جان نہ پہچان اور قرولی پاس نہیں بُرے پھنسے زمانے بھر کے نیارے اور ہمیں کو جھانسا دیا۔ ایک دفعہ ہی آپ نے آنکھیں نیلی پیلی کی اور مارے غصّے کے مُنھ لال چقندر ہو گیا۔ حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کتارا تان کر پینترا بدل کے کھڑے ہو گئے۔ بزاز کو کتارا دکھا کر کہا کہ دوں ایک۔ بزاز نے جوان کے قدوقامت، اور ہاتھ پاؤں اور ڈیل ڈول پر نظر ڈالی تو ہنس دیا، اور کتارے کے جواب میں اس نے گزا اٹھایا۔ آئیے آپ کا گنّا ہمارا گج۔ خوجی بہت ہی بگڑے۔ اب قسمیں کھاتے ہیں کہ بھائی ہیں تو اچھی طرح اس کی صورت سے بھی واقف نہیں، مجھے کیوں پھانستے ہو۔

بزاز بولا جب تک آپ کے بہنوئی نہ آئیں گے میں دکان سے ہٹنے تو دوں گا نہیں۔

اتنے میں ایک شخص نے آن کر بزاز کو سات روپیے دیے، اور کہا بیچے کپڑا پھیر دیا۔ ہے۔ اور کہا ہے کہ ہمارے سالے کو چھوڑ دو۔ بزاز نے روپیے گن لیے اور خوجی کو آزاد کیا۔ بارے خدا خدا کر کے اس جھنجھٹ سے جان تو بچی سالے بنے بنے۔

میاں آزاد کا ایک بتِ تند خُو پر دل آنا اور اس نگار قوس ابرو کے پری خانے میں جانا

ادھر تو یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں، اُدھر میاں آزاد غائب۔ ان سے ایک شخص نے کہا یا حضرت آج میلہ دیکھنے نہ چلیے گا۔ وہ دھوم دھڑکے کا میلہ ہوتا ہے کہ اہو ہو ہو، ایک ایک مہ پارہ جادو نگاہ، رد کش مُہر، غیرت ماہ:

ناز سے پائنچے اٹھائے ہوئے — شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
نشۂ بادۂ شباب سے چور — چال مستانہ حسن پر مغرور
انگھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز — مستِ صہبائے غمزہ و انداز
سیکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی — جان طاؤس و کبک لیتی ہوئی

ناز معشوقانہ اور اندازِ دلربانہ سے چو طرفہ پھرتی ہیں۔ ان برق وشوق کے حسن گلو سوز سے عشاق زار کے دل پر بجلیاں گرتی ہیں۔ چلیے اور میاں خوجی کو ساتھ لیجیے۔ یہ بھی عاشق تن رنگیلے چھیل چھبیلے جوں ہی آزاد نے کہا بولے چلیے ہم تیار ہیں۔ مگر خوجی اس وقت ادھی اُدھیڑ بن میں ہیں۔ میاں آزاد خوب نکھرے اور سج دھج کر اکڑتے ہوئے چلے۔ واللہ ایسا بے فکرا بھی نہیں دیکھا۔ میلا ٹھیلا تو کوئی ان سے بچنے ہی نہیں پاتا تھا۔ کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر گئے ہوں گے کہ ایک جھروکے سے آواز آئی کہ:

خدا جانے یہ آرایش کرے گی قتل کس کس کو طلب ہوتا ہے شانہ آئنہ کو یاد کرتے ہیں

میاں آزاد نے جو اوپر نظر کی تو۔ ع۔ سبحان اللہ شان تیری،، اب قدم نہیں اٹھتا۔ دفعتہً دروازہ خوجی کی آنکھ کی طرح بند ہوگیا۔ وہ معاملہ ان کے دل کی گرفتاری کے واسطے کمند ہوگیا۔ آزاد متحیر کہ الٰہی یہ چھلاوا تھا سحر تھا، ٹونا تھا، آخر تھا کیا۔ پل مارنے کی دیر ہوئی اور وہ چاند سا مکھڑا گہن میں آگیا۔ ایک دفعہ سہ منزلہ کی ایک کھڑکی سے وہ چہرۂ نورانی پھر نظر آیا۔ آزاد بول اٹھے کہ وہ اُس ماہ تابان نے جلوہ دکھایا، مگر پھر غائب۔ ہائے ستم۔ آزاد جوشِ شوق اور بڑے ذوق سے بولے کہ:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی بازارِ خویش و آتش ماتیز می کنی
پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو دل خانہ خراب کی باتیں

آزاد کے ساتھی نے جو یہ رنگ دیکھا تو آہستہ سے کہا کہ حضرت بس کہہ دیا اس پھیر میں نہ پڑ لیے گا۔ کانٹے میں اُلجھنا ہو تو بسم اللہ۔ ورنہ آگے قدم بڑھائیے اِلاّ اللہ۔

آزاد: حضرت آج تو بعد مدت چاند سی صورت نظر آئی ہے۔ بس اب تو کوٹھے پر جانے کی دھن سمائی ہے۔ وہ معشوق ہیں عاشق۔ وہ عذرا ہیں وامق وہ شیریں ہیں فرہاد۔ وہ پریزاد میں قیدِ عقل سے آزاد۔

اتنے میں دیکھا کہ پھر وہ معشوقِ سیم غبغب، بتِ شکر لب۔ غیرت لعبتان چیں گلفام ونازنین بے حجاب و برافگندہ نقاب، جھروکے پر بصد ناز و انداز کھڑی ہوئی ہے؛ میاں آزاد کی آنکھ اس آہو چشم کی فسون پرداز اور لگاوٹ باز انکھڑیوں سے لڑی ہوئی۔ اس نے ایک عجب ادائے دلربایانہ سے اپنی بانکی مہری سے جونکھر کر اس کے سامنے کھڑی تھی کہا کہ فنس تیار کراؤ ہم میلے جائیں گے۔ میاں آزاد نے باآواز بلند کہا کہ۔ ع۔ ستم ست اگر ہو...

حضرت ایک برجستہ شعر حسب حال پڑھنے کو تھے، مگر رعب حسن سے (ستم ست اگر ہو) کہہ کر رہ گئے۔ ان کا دوست ایک ہی کائیاں۔ سمجھ گیا کہ اس ترکِ زرّیں کمر رشک قمر کا رعب جم گیا تو بگڑی ہوئی بات بنائی اور یوں ہانک لگائی۔ لکنت کا بُرا ہو جس نے میرے یار کی زبان بند کر دی۔ تو وہ نوعروس سرمایۂ ناز بصد انداز کیا کہتی ہے:

زلکنت نیست گر حرفش بلب دیر آشنا گردد　　سخن گرو زباں صد بار گرد تا جدا گردد

طوطی سخن ہے اور شکرستان دہن ہے۔ بھلا طوطی شکر فشاں کہیں شکرستان سے باہر بھی آتی ہے۔ خیر اب تو بندی سیر چمن کو جاتی ہے۔ اور میری شوخی ان حضرت کے گھورنے پر مسکراتی ہے۔ یہ نکتے اور لطیفے جو سنے تو میاں آزاد کے۔ ع۔ سمندِ عشق پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ دل نخچیر تیر الوائے جانانہ ہوا۔ حضرت ہزار دل سے مثلِ عندلیب اس گل بدن کے عاشق زار ہوئے اور یوں گرم گفتار ہوئے:

ستم ست گر ہوست کشد پے سیر سرو سمن درآ　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

دم کے دم میں وہ صورت پھر غائب ہو گئی۔ اب میاں آزاد کی بے قراری اور گریہ وزاری کا بحرِ مواج لہریں مارنے لگا۔ اس سمند کار کا اُور چھور ہی نہیں۔ کھڑکیاں اور دریچے سب بند ہو گئے۔ اب آزاد چکرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے مگر سوچے کہ:

نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو　　نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں

اس صنم جادو جمال زہرہ تمثال کا در تھا، اور میاں آزاد کا سر تھا۔ کبھی دروازہ دھم دھمایا۔ کبھی غل مچایا۔ کبھی کنکر پھینکے، کبھی پتھر پھینکے:

کرتے ہیں آواز زنجیری دیتے ہیں دستک شو سو بار　　پتھر پھینکے ہیں گھر میں زنجیر در کھڑکاتے ہیں

اتنے میں اوپر سے ایک وصلی گری۔ میاں آزاد وحی آسمان سمجھ کر جھپٹے۔ اٹھا کر پڑھتے ہیں تو جلی قلم سے لکھا تھا کہ ع۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ ست،، آزاد نے اس تحریر کو چوم لیا۔ اور بوسہ لے کر یوں کہنا شروع کیا:

آزاد: ان حرفوں کے صدقے۔ ع۔ فدائے جنبشِ دستِ حنائی،، سواد نامہ نے آنکھوں کو نور بخشا۔ سیہ مستی مداد نے دل کو سرور بخشا۔ جذب دل کے طفیل ہم انشاءاللہ ان پیارے پیارے ہاتھوں کو بھی چوم لیں گے:

نمودی سرفراز از نامہ چوں خاکساری را　　رساندی از نسیم لطف بر گردوں غباری را

بکاغذ ریخت کلکت از رقم کحلِ سلیمانی ازاں وادی ضیا چشم قید انتظاری را
زرِ شح خامہ کردی خاطرِ احباب را خرم طراوت بخش صد گلشن نمودی نوکِ خاری را
بمہرِ خود مزین ساختی از لطف مکتوبم قرین مہر کردی ذرۂ بے اعتباری را

یہ وصلی درپردہ وصال کی خبر دیتی ہے۔ خوشنویسی ہاتھوں کی بلائیں لیتی ہے:

من دانم و دل داند زیں نامہ چہا دیدم صد بار ز بیتابی وا کردم و پیچیدم

اب حیرت ہے کہ الٰہی میں جواب بھیجوں تو کیوں کر بھیجوں۔ خاک ہو کر صبا کے ہمراہ جاؤں، مگر ہمارا اغبار تو ضعف کے سبب سے وہاں تک جا ہی نہ سکے گا:

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی طپیدنِ دل مرغانِ رشتہ برپارا

اور کلوخ اندازی اس لیے تو کی ہی ہے کہ سر کے سودا کا سنگ سے علاج ہو۔ ذرا تو تسکین مزاج ہو۔ سزا دیجیے تو سزا ہے۔ اور انتقام لیجیے تو روا ہے۔ لیکن۔ ع۔ عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو:

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے قتل ہو جو منظور ابرو کے اشارے سے کرو چور
زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو اپنے دل تنگ میں جگہ دو

یہ عشق فتنہ پرداز، شمع فروز پردۂ راز ہے۔ آج دل دیوانہ ایک پری سے ہمدم و ہمساز ہے۔ اتنے میں ایک اور وصلی اوپر سے گری۔ اور میاں آزاد نے جھپٹ کر اٹھائی۔ پڑھا تو یہ مصرعہ لکھا تھا۔ ع۔ دل لگی کرتی ہے پریاں مرے دیوانے سے،، آزاد پڑھتے ہی اچھل پڑے۔ مرے دیوانے!، لو صاحب اب ہم ان کے ہو گئے۔ اب اپنے دیوانے کی فکر کیجیے۔ (کھڑکی کی طرف نظر کر کے) حضور آپ اپنے دیوانے کا خیال رکھیے۔ اپنا کہہ کر اغیار سے نہ ہنسوانا۔ اللہ اللہ اپنے دیوانے سے اس درجہ بے خبر۔ زلف کی زنجیر ہو، تیر کا نخچیر ہو، میرا علاج سہل لٹکا ہے۔ عنابِ لب اور شربتِ دیدار۔ گل رو، اور قند لب گلقند ہو گیا۔ مگر آنکھیں کھول کھول بند دریچوں پر نظر ڈالتا ہوں:

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تری قدرت ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

اتنے میں ایک مہری اندر سے آئی۔ اور میاں آزاد کو دیکھ کر مسکرائی۔ اشارے سے کہا کہ آئیے۔ ہاتھ سے بتایا کہ جلدی جلدی قدم بڑھائیے۔ یہاں آزاد با دلِ شاد، خنداں و فرحاں،

مہتابی پر پہنچے۔ تو دماغ رشک ختن ہو گیا۔ سینہ چمن چمن ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک عربدہ جو، صنم عنبریں مو، رشک ناہید، غیرتِ خورشید، دولھن بنی ہوئی ایک نازک کرسی پر بصد شان بر نائی، وخود نمائی، عجب ٹھسے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ میاں آزاد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ نقش مراد کرسی نشین ہوا۔ تیر دعا بہدفِ اجابت قریں ہوا:

نگاہ کن ورق سادہ راچہ پرکارست — نگار خانۂ صبح ست ایں نہ رخسارست
کریم چوں گہر افشاں شود گدا چہ کند — مپرس حالِ دل آں دم کہ در سخن آئی

وہ بتِ پندار ایک دلربا شوخی کے ساتھ مسکرائی تو میاں آزاد کی زبان پر یہ بیت آئی:

بتسمے کن و بگذر ہمیں ادا کافی ست — چو خون بہا طلبندار تو کشتگان در حشر

مہری نے جو سامنے کھڑی تھی آزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آہستہ آہستہ گفتگو کیجیے بیوی نازک مزاج ہیں۔ طبع نازک پر یہ آواز گراں گذرے گی۔ آزاد نے آہستہ سے کہا کہ:

گل ہم برنگ دبوی تو نازک مزاج نیست — میر بخند از تصورِ نظارہ خاطرت

نازک بدن: (یعنی وہی دلھن) فرمائیے کیا مطلب ہے۔ دور دور کی ملاقات یا وصال۔

آزاد: ملاقات نہ وصال۔ فقط نظارۂ جمال ع۔ اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری

اب سنیے کہ اس دلآرام گلفام کی شکل وصورت بعینہ خاتون مرلقا حسن آرا کی سی تھی۔ وہی شباہت، وہی حسن وجمال، وہی گلاب سا چہرہ، وہی خال، سر مو فرق نہیں۔ میاں آزاد کو اپنی پیاری حسن آرا یاد آئی اور یہ مصرع زبان سے نکلا۔ ع۔ اے گل بتو خرسند تو بوے کسی داری،،

نازک بدن: معلوم ہوتا ہے آپ چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ کسی کے جعدِ مشکیں میں دل پھنسا ہے۔ ناگنی زلف نے ڈسا ہے:

رخ میری طرف نظر کہیں اور — کھلتے ہیں کچھ اشتیاق کے طور

آزاد: برسوں حسن وعشق کے پھیر میں رہے۔ ہمیں اپنی عاشقی پر ناز تھا اور ہم بنکارتے پھرتے تھے کہ:

عجب نہیں یہ جنون کی بزرگواری سے — مرڑوڑوں کان کو مجنوں کے مثلِ طفلِ شریر

لیکن اب تو ایک حسین مہ جبین سے دل ملایا ہے۔ بس اسی کے بیاہنے کا شوق چرّایا ہے۔

نازک بدن: پھر ہم سے واسطہ۔ حرمت میں داغ لگانے سے رہے۔ شادی ہو۔

بسم اللہ ورنہ تشریف لے جائیے۔

آزاد : (نیم خیز ہوکر) خدا حافظ۔

نازک بدن : (دامن پاؤں کے تلے دبا کر) اللہ ری تنک مزاجی اُف ری عالی دماغی، ہم غیب کا حال بھی بتا سکتے ہیں۔ کہیے آپ کا کچا چٹھا کہہ چلوں۔ مگر ہٹ دھرمی کی سند نہیں۔

آزاد : (بیٹھ کر) بسم اللہ۔

نازک بدن : میاں آزاد آپ کا نام ہے۔ اور حُسن آرا.....

آزاد : (متحیر ہوکر) ایں! یہ کیا اسرار ہے۔

نازک بدن : کیوں کیا پتے کی کہی ہے۔

آزاد : (دم بخود حیرت زدہ)

نازک بدن : (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) حُسن آرا میری چھوٹی چچا زاد بہن ہے۔ ڈیڑھ برس سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ مگر دوسرے تیسرے خط ضرور آتا ہے۔ لیجئے حُسن آرا کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد خط لے کر چومنے لگے (سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ خط کو پڑھا، تو یہ لکھا تھا۔

میری پیاری بہن۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ تمھاری بہن تمھارے وصال کے شراب کے نشے میں جھومتی ہو۔ تم ان کو اور وہ تم کو مارے خوشی کے چومتی ہو۔ ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھائیں ہنسیاں دل لگیاں ہوتی جائیں، اب دردِ دل سنو۔ یہاں ایک جوان ماہر و قوس ابرو پریزاد میاں آزاد آئے تھے۔ جوانِ صالح و پاکباز ہیں۔ فصحائے نامی سے دمساز ہیں۔ اصرار کیا کہ نکاح ہو۔ ساعتِ سعد کو بیاہ ہو۔ میری شامت از بان سے نکل گیا کہ روم جائیے۔ مسلمانوں کو کفار کے حملے سے بچائیے۔ نام کر کے آئیے، اور تمغے لٹکائیے تو کیا مضائقہ۔ وہ تو ایک ٹن کا آدمی ہے۔ معاً منظور کر لیا، اور چل کھڑا ہوا۔ اب فراق مارے ڈالتا ہے۔ دل قابو میں نہیں۔ تم خوب جانتی ہو۔ کہ میں ابھی ناکردہ کار ہوں۔ ع۔ عشق کے صدمے اٹھانے کو جگر بھی چاہیے" یہاں جگر پاش پاش ہوگیا، اور ابھی بسم اللہ ہی ہو۔

الا یا ایّہا السّاقی ادر کاساً و ناولہا کہ عشق آسان نمود اول ولے افتادہ مشکلہا

وہ بمبئی کے راہ سے روم جائیں گے۔ تم سراغ میں پتا لگانا ان کو بلوانا اور میرا خط پڑھ کر سنانا۔ اتنا ضرور کہنا کہ کیا مروت اسی کی مقتضی ہے کہ مجھ شہیدِ خنجر او کشتۂ تیغِ وفا کو تڑپاؤ:

نمیدانم ترا در دل چہ افتاد　　　　کہ دادی صحبتِ دیرینہ بر باد

تصویر شناخت کے لیے بھیجتی ہوں۔ میرا حال میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ سپہر آرا روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت پھٹ پڑی تھی تو بھیجا کیوں۔ شہر بدر کیوں کیا۔ مگر دل گواہی دیتا ہے کہ آزاد پیارے آزاد سرخرو آئیں گے۔ آزاد خدا کی قسم تمھاری تصویر ہر دم رو برو رہتی ہے۔ مگر:

یکے زبان و ہزاران شکایت ست مرا　　　　تو شادزی کہ غم بے نہایت ست مرا

(حُسن آرا)

آزاد: ورنامۂ اغیار مرا یاد نمودست　　　　حیف ست کہ چوں من بنود نامہ سیاہی

مگر واہ رے اشتیاق، اور اُف رے دردِ فراق، ہم بمبئی میں داخل نہ ہونے پائے اور نامۂ شوق آگیا سچ ہے:

اللہ ری ہوائے لبِ بامِ قصرِ یار　　　　اڑ کر کبوتر آگے گیا ہے نسیم سے

عشقِ بلبل میں اثر ہے تو قفس میں آکش　　　　بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستاں آئی

یہاں آزاد نے: مانگا کاغذ دوات وخامہ :. لکھا جھٹ پٹ جواب نامہ۔ لفافہ بند کیا اور فوراً ڈاک خانے بھیجا۔

نازک بدن: حُسن آرا تڑپ رہی ہے آپ کی تحریر سحر تخمیر سے ذرا تسلی ہوگی۔ سپہر آرا حیران ہے کہ اس کے جنون کا علاج کیا کرے۔ مگر:

بیماری عشق لادوا ہے　　　　اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجیے　　　　سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجیے

کچھ روگ جو درپے خلش ہو　　　　درماں کے لیے دوادوش ہو

آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ　　　　ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ

یاد آئیں جو ابر دانِ خمدار　　　　رہتے نہ کہیں گلے پہ تلوار

وہ سبزۂ خط جو یاد آئے　　　　جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے

کر یاد کہیں چہ ذقن کو　　　　کودے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو

دیوانے کی مُطلق العنانی　　　　ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

مرگ ناگہانی کا کلمہ سن کر میاں آزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اشکوں کا تار بندھ گیا۔ ہائے یہ اشک نہ تھے بلکہ ترجمانِ دل۔ جگر خون ہو کر آنکھوں کی راہ نکلا۔ وائے ستم!

نازک بدن : اب آپ ہمارے یہاں ٹھہریں، اکثر علما اور باحمیت اہل اسلام آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ ایک دن جلسۂ عام منعقد ہوگا۔ آپ کی خدمت میں باحمیت مسلمان اسپیچ دیں گے۔ جہاز کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مگر اب تک آپ نے یہ نہ پوچھا کہ ہم نے آپ کو پہچانا کیوں کر؟ ہم نے سرا میں آدمی بھیجا تھا۔ اور اس نے آپ کو بغور دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے مجھ سے آن کر کہا کہ وہی صاحب آرہے ہیں۔ میں آپ کو آزماتی تھی کہ دیکھوں کتنے ہیں۔ بیاہ کا ذکر میں نے اسی سبب سے چھیڑا تھا اگر آپ عشق ہی ظاہر کرتے جاتے تو میں حسن آرا کو لکھ بھیجتی کہ:

نشاید ہوس باختن باگلے　　کہ ہر مدادش　　بود بلبلے

لیکن آپ نے میری صورت دیکھتے ہی کہا کہ ع۔ اے گل تبو خرسندم تو بوے کسی داری۔

آزاد : پھر میں یہاں ہی اٹھ آؤں؟

نازک بدن : ضرور۔

آزاد : شاید آپ کے اعزّہ میں سے کوئی بدظن ہو جائیں۔

نازک بدن : آپ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی کوئی نیک شریف زادی اس طرح بیدھڑک کسی غیر اور نامحرم کو اپنے ہاں نہ بلوائے گی۔ جس طرح میں آپ کو بلا لیا۔ کیا مجھے ناموس و ننگ کا خیال نہیں۔ کیا میں نہیں جانتی کہ میرے یہاں غیر مرد کو اس بے تکلفی کے ساتھ میرے قریب بیٹھے دیکھیں گے تو آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے گا۔ مگر وہ تو خود اس وقت تمہاری تلاش میں نکلے ہیں۔ حسن آرا نے تو خطوں کی بھرمار کر دی اور ان کو قسمیں دے دے کر لکھا ہے کہ آزاد کو ضرور ڈھونڈھ نکالو۔ آتے ہی ہوں گے۔ دیر سے گئے ہوئے ہیں۔ اب آپ تو جائیں نہیں میرے آدمی کو بھیج دیجیے وہ اسباب لے آئے۔

آزاد : اچھا ذرا دوات کاغذ تو منگوائیے۔ میں اپنے ساتھی کے نام رقعہ لکھ بھیجوں۔

ایک عورت نے قلم دوات کاغذ سامنے رکھ دیا اور میاں آزاد نے یہ رقعہ لکھا۔

خواجہ صاحب بہادر، اسباب وسباب لے کر اس آدمی کے ساتھ چلے آیئے سرا

یں رہنا تم کو ہم کو دونوں کو شاق گذرتا ہے۔ یہاں حُسنِ اتفاق سے حسن آرا کی بہن مل گئیں۔ یار ہیں قسمت کے دھنی۔ ہم تم دونوں۔ بس اب آؤ اور یہاں ہی بستر جماؤ۔ اور ایک مژدہ طرب انگیز بھی سناتا ہوں، کہ افیم کی دوکان بھی یہاں سے قریب ہے۔ وہ ہنسی آئی باچھیں کھل گئیں۔ استاد۔

(آزاد خانہ برباد)

خوجی کی حماقت

خوجی نے مارے وحشت کے دل میں ٹھان لی کہ جو آئے گا خوب غور سے دیکھوں گا۔ اور للکاروں گا، بھلا اب کی چکما چل جائے، تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ دو دفعہ کیا جانے کیا اتفاق ہوا کہ وہ چکما دے گیا۔ یہاں اڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اس مردود بہروپیے کو چچا ہی بنا چھوڑتے۔ وہ غپّا دیتا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتا۔ مگر خیر۔ ع۔ پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے،، سامنے ایک گھسیارا گھانس کا گٹھا سر پر لادے پسینے میں عرق عرق آن کھڑا ہوا۔ میاں خوجی کی کوٹھڑی کے قریب ایک ٹٹو اسرا ئیں بندھا تھا۔ وہ سمجھا کہ انھیں کا یابو ہے تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

گھسیارا: ہجور گھانس تو نہیں چاہیے۔

خوجی: (غور کر کے دیکھا) چل اپنا کام کر۔ ہیں گھانس وانس کچھ نہیں چاہیے۔ گھانس کوئی اور کھاتے ہوں گے۔ ہم اپنے غم میں آپ کاہیدہ ہیں۔

گھسیارا دور تھا اس نے اچھی طرح سنا نہیں کہ میاں خوجی نے کیا جواب دیا تو پھر پوچھا کہ صاحب کچھ گھانس لوگے۔ خوجی (سمجھے کہ بہروپیا ہے) چل بے چل ہم پہچان گئے۔ ہم سے بہت چلبلے بازی نہ کرنا بچہ اب کی کوئی حرکت سرزد ہوئی تو پلیتھن ہی نکال ڈالوں گا۔ اب جاتا ہے یا آنکھیں دکھاتا ہے۔ تیرے بہروپیے کی دم میں رسّا۔ ع۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے،، شامت اعمال سے گھسیارا بہرا تھا، وہ سمجھا بلاتے ہیں۔ ان کی طرف آنے لگا۔ بس تب تو میاں خوجی غصّہ ضبط نہ کر سکے اور چلّا اٹھے کہ او گیدی بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر تن سے جدا ہوگا۔ یہ کہہ کر حضرت لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ اس کو چپت لگائیں اس نے جو زور کیا کہ چھڑا کر بھاگ نکلے تو میاں خوجی منھ کے بل دھم سے زمین پر آرہے، اور گٹھا جو گرا تو حضرت خواجہ صاحب تپ ہی گئے۔ گٹھے کے بوجھ سے ایک لڑھکنی کھائی بھٹیاریوں نے دوڑ کر گٹھے

کو پاؤں سے دبانا شروع کیا، اور خوجی نے اس کے اندر سے غنغنانا شروع کیا۔ ابے او گیدی اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ مروک نے ناکوں دم کر دیا۔ خیر بعد خرابی بصرہ آپ گھانس کے نیچے سے برآمد ہوئے تو گرد میں لت پت۔ بھٹیاریوں نے بڑی ہمدردی سے گرد جھاڑی یہ کہیے کہ گرد جھاڑنے کے حیلے خوب مرمت کر دی۔ ایک نے ادھر سے گدا جمایا۔ دوسری نے اُدھر سے چپتیایا۔ اچھی گرد جھاڑی۔ خوجی بہت ہی جھلائے مُنھ پھلائے بیٹھے تھے۔ میاں آزاد نے جس آدمی کو سرا بھیجا تھا۔ وہ رقعہ لیے ہوئے آیا۔ اور لوگوں سے پوچھ کر ان سے کہا کہ چلیے آپ کو آزاد نے بلایا ہے۔

خوجی : کس سے کہتے ہو؟ ارے اب کی نامہ بر بن کر آیا۔ تب کی گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا، پھر سپاہی بنے چل بھاگ مردود۔

نامہ بر : رقعہ تو پڑھ لیجیے۔

خوجی : میں جلتی بلتی لکڑی سے داغ دوں گا۔ نامعقول! مجھے کوئی لونڈا مقرر کیا ہے کیا۔ ایسے ایسے بہروپیے یہاں جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

نامہ بر چل دیا۔

میاں آزاد خانہ برباد نے تو اپنے افیم چی دوست میاں خوجی کے پاس آدمی کو بھیجا تھا کہ ان کو مع بوریا بندھنے، اور تنگ توبڑے کے لے آئے۔ مگر وہ بیرنگ واپس گیا۔ خوجی نے اس کو ایسا للکارا اور وہ ڈانٹ بتائی کہ اس کے حواس بیترا ہوئے، اور بگٹٹ بھاگا تو گھر پر آن کر دم لیا۔ ہانپتے ہانپتے ڈیوڑھی سے اس نے پکارا کہ بوا زیبن!

زیبن : اسباب وسباب لے آئے ہو نا؟

آدمی : کہاں کا اسباب۔ وہ تو کاٹنے دوڑے۔ یہ دیکھو قرآن کی قسم جو ذری اور بولوں نا تو وہ چکت دے کہ کان ہی اڑا لے جائے اور میں کنکٹا ہی رہ جاؤں۔ وہ تو کچھ الول جلول سا بکنے لگے۔ کچھ سنک سی ہے۔

زیبن : چل مسخرے۔ بہت کھلّی بازی نہیں اچھی ہوتی۔ بتاؤ بتاؤ بھلا یہ دل لگی کا کون موقع ہے۔

آدمی : زیبن کی کٹیلی آنکھوں کی قسم وہ نہیں آئے۔ دور ہی سے وہ ڈانٹ بتائی کہ میں دُم دبا کر بھاگا۔ پیچھے پھر کے دیکھتا تو وہ لے ہی پڑتے۔ قسم خدا کی وہ تو کوئی سودائی سا معلوم

ہوتا ہے۔ سرا بھر میں سب کے سب اس کو بناتے اور انگلیوں پر نچا رہے تھے۔

نازک بدن : رجب اسباب لے آیا ؟

رجب : بیگم صاحب کچھ پوچھیے نا۔

آزاد : کیوں کیوں ؟

رجب : حضور وہ تو کچھ جھنجلائے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں لاکھ لاکھ کہا کیا، انھوں نے ایک تو سنی نہیں۔ بس دور ہی دور سے گیدڑ بھبکیاں بتایا کیے۔ کچھ عجب آدمی ہیں۔

آزاد : خط کا جواب لائے۔

رجب : غریب پرور کہتا جاتا ہوں کہ قریب بھٹکنے تو دیا نہیں۔ جواب کس سے لاتا ؟ وہ تو کچھ جھلائے ہوئے سے بیٹھے تھے، اور ارد گرد لوگ ان کو بنا رہے تھے۔ ٹھگنے سے آدمی دُبلے دُبلے سے افیم بہت پیتے ہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نازک بدن کا شوہر آگیا۔ زبین نے صحن میں سے پکارا کہ بیگم صاحب بیجیے میرزا صاحب آگئے۔

بیگم : (وہی نازک بدن) کہو میاں آزاد سے تو کہیں مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔

میرزا صاحب : شہر بھر گھوم آیا۔ سیکڑوں چکر لگائے مگر نہ ملے نہ ملے۔ سرا میں گیا تو وہاں خبر ملی کہ آئے ہیں۔ ایک شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے پوچھا تو بڑی دل لگی ہوئی۔ جیسے ہی ہیں گیا قریب گیا اور وہ کلبلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کون آپ کون ؟ میں نے کہا یہاں میاں آزاد نامی کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ بولے کہ پھر آپ سے واسطہ۔ میں نے کہا صاحب آپ تو کاٹے کھاتے ہیں۔ آخر میں نے کیا آپ کو گالی دی تھی۔ تو بغور دیکھ کر کہتے کیا ہیں (ارے اس بہروپیے نے تو ہماری ناک میں دم کر دیا۔ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ تو پھر آیا۔ آج بھلے مانس کی صورت بنا کر آئے ہیں، کل گھسیارے بنے تھے۔ پرسوں کیا جانے کیا بنے تھے۔ غرض کہ ایسی ایسی دل جلول اور واہی تباہی تقریر انھوں نے کی کہ تو بہ ہی بھلی۔ میں کچھ جو سمجھا ہوں کہ یہ بک کیا رہا ہے آخر کار ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک شری سودائی آدمی ہیں۔ ان کے منھ نہ لگیے۔ ان کو ایک بہروپیا کئی بار ستا چکا ہے۔ ایک دفعہ عورت بن کر آیا تو حضرت کو شادی کرنے کا شوق چرایا۔ اس نے گود میں اٹھایا اور جیب سے لے بھاگا۔ ساری بازار میں ہنڈیا۔ دوسری مرتبہ سپاہی بن کر آیا اور ان کو بھانسے دے کر بزاز کی دکان پر بٹھلایا، اور کئی روپیہ کا مال لے کر

چلتا ہوا، اور بزاز سے کہہ گیا کہ یہ ہمارے سالے ہیں۔ ان کو بہلائے جاتے ہیں۔ اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ جوان کی کوٹھری کی طرف سے نکل جاتا ہے اس کو ڈپٹتے ہیں کہ تو بہروپیا ہے بھلا بے بھلا ہم نے پہچان لیا۔ اس وقت اگر ان کا باپ بھی آئے تو اس کو بہروپیا سمجھیں۔ اسم مبارک حضرت کا خوجی ہے۔ ایسی قطع بھی کسی کی کم ہوگی۔ اول تو بالشتیے۔ دوسرے افیمی۔

بیگم : ذرا اوپر تو آؤ۔ دیکھو ہم نے میاں آزاد کو یہیں بلوالیا۔ نہ کہو گے۔

میرزا صاحب کھٹ کھٹ کرتے ہوئے کوٹھے پر آئے۔

آزاد : (کھڑے ہو کر) آیئے بغل۔۔۔۔

میرزا صاحب : (بغل گیر ہو کر) بسم اللہ حضرت! آنکھیں ترستی تھیں۔ آپ کی زیارت کو یارے الحمدللہ کہ سعادتِ زیارت نصیب ہوئی:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

میں تو سرا بھی گیا تھا۔ مگر وہ آپ کے رفیق ڈانٹنے لگے سمجھے کہ یہ بھی بہروپیا ہے۔

آزاد : وہ ایک سودائی آدمی ہیں لیکن یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ اس بہروپیے نے پھر غچا دیا۔

میرزا صاحب : اب آپ آرام سے بیٹھیں۔ اچھی طرح تشریف رکھیے۔

بیگم : (اپنے شوہر میرزا صاحب سے) میاں آزاد کو بڑا کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو تم آن کر ہم پر خفا ہو۔ اور نامحرم کو یہاں دیکھ کر ہم سے بددماغ ہو جاؤ (مسکرا کر) یہ کبھی مرہٹوں کے ملک میں نہیں رہے۔

میرزا صاحب : (آزاد سے) حضرت ہم عرصہ دراز تک دکھن میں رہے ہیں۔ پردے کا چنداں خیال نہیں، اور پھر آپ سے۔ حسن آرا نے آپ کی سفارش کی ہے۔

آزاد : آپ کی نوازش۔

میرزا صاحب : خدا گواہ ہے اس وقت آپ کی ملاقات سے طبیعت اس درجہ محظوظ و مسرور ہوئی کہ۔ ع۔ "دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من"، اب آپ آج تو آرام فرمائیے کل اکثر علما و فضلا آپ سے ملاقات کریں گے ازبس مشتاق زیارت ہیں۔

آزاد : ضرور ملوں گا۔

میرزا صاحب : جہاز کا بندوبست بھی خاکسار بعنوان مناسب کر دے گا۔

آزاد : ہاں ضرور۔ اب میں بے قرار ہوں کہ اڑ چلوں۔

میرزا صاحب : انشاء اللہ۔ ایک جلسۂ عام یہاں منعقد ہونے والا ہے۔ جس میں علمائے بمبئی آپ کو ایڈریس اور اہل اسلام شریک جلسہ ہو کر دعائے خیر دیں گے۔ خدا آپ کو اس ارادے میں کامیاب کرے۔ آمین ثم آمین۔

ادھر میاں خوجی اپنے دل میں سوچے کہ عزت بھئی ڈوب ہی گئی، مشیخت میں بٹا لگا۔ بڑی ہی کرکری ہوئی۔ کوئی ایسا چکما بہروپیے سے کرنا چاہیے کہ وہ بھی عمر بھر یاد کرے۔ کئی گھنٹے تک اسی میں غلطاں پیچاں رہے۔ حتیٰ کہ افیم کھانا تک بھول گئے۔ کہ اتنے میں میرزا صاحب کا آدمی آیا اور میاں آزاد کا خط دکھایا پہلے تو خوجی جھجکے کہ یہ بہروپیا ہے، مگر بغور دیکھا تو لفافے پر میاں آزاد کے دستخط پائے۔ لیا اور پڑھا۔

خواجہ صاحب میں نے سنا کہ اس بہروپیے نے جس کے ساتھ آپ نکاح کرنا چاہتے تھے۔ آپ کو خوب ہی جھانسے دیے اور آپ پھر اس کے چکمے میں آ گئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ اب اس آدمی کے ہمراہ تشریف لائیے۔ ورنہ پھر وہ آپ کو دھوکا دے گا اور آپ کو کرتے دھرتے کچھ بن نہ پڑے گا۔ بھائی کہا مانو۔ آؤ اور جلد آؤ! اور ضرور آؤ مگر خرابی تو یہ ہے کہ تم نے آدمی کو دور سے دیکھا اور للکارنا شروع کیا کہ بھلا بے بہروپیے ہم پہچان گئے۔ خدا خیر کرے میں جانتا ہوں کہ اب مجھی کو آنا پڑے گا۔ خیر۔ ہر چہ بادا باد۔ (آزاد)

خوجی نے یہ خط پڑھ کر کل اسباب خدمت گار کے سپرد کر دیا اور کہاں سے کہہ دینا کہ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ مگر ہم کو پتا تو بتا دو؟ خدمت گار نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔

میاں خوجی کا جھانسا دینا

خوجی ایک شخص سے بہروپیے کے مکان کا پتہ پوچھ چکے تھے۔ پوچھتے پوچھتے بہروپیے کے مکان پر داخل ہوئے۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا اور بہروپیے کی بیوی کو ضرورت تھی کہ اپنے جان پہچان کے پاس تیس روپیہ بھیجے۔ وہ پارسل بنا کر اور سی کر رکھ چکی تھی۔ لونڈی کو سکھا دیا تھا کہ جو کوئی پڑھا لکھا ادھر سے نکلے تو اس سے پارسل کا لفافہ لکھوا لینا۔ لونڈی کھڑی راہ دیکھ رہی تھی۔ میاں خوجی تو اس تاک میں تھے ہی کہ کسی ڈھب سے لونڈی ہم کلام ہو اور لونڈی اس فکر میں کہ کوئی منشی یا مولوی ملیں تو مزے سے لفافہ لکھواؤں۔

خوجی سے اور اس سے یوں گفتگو ہوئی

خوجی : (لونڈی سے) کیوں جی ذری پانی نہیں پلاتی ہو۔

لونڈی یہ سنتے ہی پھول گئی لومنھ مانگی مراد پائی۔ جو دل میں آرزو تھی وہ بر آئی۔ خوش ہو کر بولی کہ میاں بیٹھو پانی پیو۔ گلوری کھاؤ۔ حقہ گڑگڑاؤ۔ میں ابھی لائی۔ دوڑتی دوڑتی گھر میں گئی اور ہنس کر بیوی سے کہا کہ لو اب کیا چاہتی ہو میں پانی لیے جاتی ہوں آپ جھپ سے ایک گلوری بنا رکھیے، ایک منشی جی کو بڑی دور سے پھانس پھونس کر دم دھاگا دے کے گانس لائی ہوں دو آنے پر راضی ہوئے ہیں۔ واہ ری لونڈی۔ ایسی طرار لونڈی بھی کم دیکھی ہوگی۔ کہنے لگی پھانس پھونس کے دم دھاگا دے کر گانس لائی ہوں اور بڑی دور سے، اور طرّہ یہ کہ دو گنڈے کی رقم بھی اینٹھی۔ لونڈی اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ جس آفتابے میں پان بھیگ رہے تھے وہی جلدی سے اٹھا لے گئی۔ پانی کھاری اور کڑوا جیسے نیب۔ پائیچے ایک ہاتھ سے اٹھائے دوسرے ہاتھ میں کٹورا لیے ہوئے باہر پہنچی۔

لونڈی : لیجیے میاں پیجیے۔

خوجی : (ہنس کر) لاؤ۔ تم بڑی نیک بخت ہو بوا۔

لونڈی : اے واہ لوگ تو پوشاکے بھاتے ہیں میں نے اتنا سا پانی پلایا تو کیا احسان کیا۔

خوجی نے کٹورے سے پانی پیا تو غل مچایا کہ ارے غضب کیا زہر ملا لائی ہو۔ مار ہی ڈالا۔ لاحول ولا قوۃ۔ (اپنے دل میں) سچ ہے واللہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بہروپیے کی لونڈی نے تو ان کے بھی کان کاٹے۔ خیر لونڈی جھٹ پٹ اندر گئی اور صراحی سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لائی۔ میاں خوجی پیا تو جان میں جان آئی۔ اتنے میں گلوری تو بیوی نے بنا ہی رکھی تھی، لا کر میاں خوجی کو دی۔ چباتے ہی اگل دی، منھ ہی کاٹ ڈالا۔ چونا ہی چونا لگا لائی ہو۔ ارے توبہ۔ (دل میں) یہ اس بہروپیے کی بیوی تو لونڈی کی بھی خالہ ہے۔ بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔ دونوں بس کی گانٹھ۔

اتنے میں لونڈی اندر سے پارسل لائی اور کہا کہ میاں اتنا ہم پر احسان کرو کہ اس پارسل کا لفافہ لکھ دو۔

خوجی : لفافہ! اچھا۔ کہاں جائے گا کس کے نام ہے۔ کون بھیجتا ہے؟ کچھ معلوم بھی تو ہو یا انگریس واہی تباہی جہاں چاہوں بھیج دوں۔

لونڈی : میں بیوی سے سب حال پوچھ لوں تو بتاؤں۔ آپ بیٹھے رہیے گا۔ پارسل مجھے دے دیجیے۔ ابھی ابھی آئی۔ (پردے کے پاس سے) میاں جانا نہیں میں صدقے۔ ایک گلوری اور کھلاؤں گی۔

خوجی : اچھا اچھا جاؤ (دل میں سوچ کر) کہ اُف فوہ کیا کائیاں لونڈی ہے۔ پارسل جھپاک سے لے ہی بھاگی۔ نہیں تو اس وقت پارسل ہی اڑا دیتا!

لونڈی اندر سے جاکر پارسل لے آئی اور بیوی یعنی بہروپیے کی جورو نے پردے کے پاس سے پتا بتایا۔ میاں خوجی نے پتے اور نشان کی دم میں رسّا باندھا۔ اپنا نام اس پر جلی قلم سے لکھ دیا۔

یغر اسمہٗ بعدہٗ بمبئی محلہ بھنڈی بازار۔ بر دولت خانہ میرزا اسد بیگ صاحب درجہٗ خاص میاں آزاد سیّاحِ مادرزاد نزد جناب قبلہ و کعبہ میاں خواجہ بدیع صاحب مدظلہٗ مشرف باد۔

یہ لفظ لکھ کر حضرت نے لونڈی کو دیا اور اپنی راہ لی۔ لونڈی نے فوراً ڈاکخانہ میں پارسل دی اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔ واہ ری لونڈی۔

میاں خوجی کو پتا تو معلوم ہی تھا۔ پہنچے تو وہاں بڑی دل لگی ہوئی۔

دوسرے دن کوئی پہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ لال لال پگیا سر پر جمائے چونگا دبائے میرزا صاحب کے مکان پر آیا۔

ہرکارہ : (میرزا سے) آپ کے یہاں کوئی کھوجی ٹکے ہیں۔

میرزا : کون! کھوجی۔ ابے یہاں کھوجی کا کیا کام۔

خوجی : ہاں ہاں جی ہمارے نام پارسل آیا ہوگا۔ اٹھ کر پارسل لیا، دستخط کیے اور ہرکارہ روانہ باشد،۔

اب آزاد متحیر ہیں کہ یہ اس مردک کے پاس کہاں سے پارسل آیا ہوگا۔ پڑھا تو سخت متحیر ہوئے کہ قبلہ و کعبہ لکھا ہے اور پتا ٹھیک ٹھیک۔ اُدھر بہروپیا جو گھر میں گھسا تو۔ بیوی نے کہا لو تم لفافہ نہیں لکھتے تھے ہم نے لکھوالیا اور جھپ سے پارسل بھجوا دی۔

لونڈی : ایک ٹھگنے ٹھگنے دبلے پتلے آدمی تھے، افیم کی پینک میں اونگھتے جاتے تھے۔ انھوں نے لکھ دیا۔

بھروپیا : (ہاتھ مل کر) ارے! افسوس اُف مار ڈالا۔ دے گیا چکما ہونہ ہو وہی سرا دالا خوجی ہو، بس غضب ہی ہو گیا۔

بیوی : خیر تو ہے؟

بھروپیا : کچھ نہ پوچھو۔

بیوی : یہ افسوس کیسا۔ جلد حال بتاؤ کلیجہ الٹا جاتا ہے۔

بھروپیا : تم سے کیا بتاؤں۔

بیوی : کیا ایسی بات ہے کہ مجھ سے کہنے کی نہیں، کیا کوئی جل دے گیا یا کسی عزیز کی سنانی سن کر آئے ہو۔

بھروپیا : بس چپ رہو۔ اللہ نہ کرے۔

بیوی : آخر ش یہ ماجرا کیا ہے۔ کسی سے لڑ کے آئے ہو یہ بڑبڑاتے کیا ہو۔ تم نے نہ لکھا ہم نے دو گلوری دے کر اور سے لکھوالیا۔

بھروپیا : غضب کیا۔

بیوی : کچھ کہو گے بھی۔ یا یہی کہے جاؤ گے کہ غضب ہوا غضب کیا آخر معلوم تو ہو کہ کیا غضب ہوا، اور کس نے غضب کیا؟

آچھیں!

ناطقہ زبان کے ساتھ، لَے تان کے ساتھ، مضراب ستار کے ساتھ، ڈاب تلوار کے ساتھ، خون بدن کے ساتھ، بہار چمن کے ساتھ، نسیم سحر غنچۂ گل کے ساتھ، بادِ باران نشہ مل کے ساتھ، ناز و ادا معشوقِ طناز کے ساتھ، آبِ زلال کشنگانِ حجاز کے ساتھ، وہ نہیں کرتا جو میاں آزاد خانہ برباد والا نژاد و فرخ نہاد نے اسلام کے ساتھ کیا۔ مذہب کو اس پر ناز ہو تو بجا ہے۔ محبت کو اس سے اعزاز ہو تو روا ہے۔ خاتون مہ لقا شیریں ادا زی مروت، با صفا حسن آرا کی سی ناظورہ غنچہ دہن جانانہ سیم بدن جس پر رہے وہ ٹرکی جانے کا خیال دل میں لائے اس کو حمیتِ اسلام کا شوق چرائے بھلا کوئی بات بھی ہے مگر واہ رے آزاد کے آبروئے ہمت مردانہ نے حسن اور عشق دونوں کے خیال کو دور کر دیا۔ نکاح اور بیاہ کی فکر کو کافور کر دیا۔ ع۔ این کار از تو آید و مردان چنین کنند۔ اے شاباش۔

حماک اللہ عن شرّ النّوائب　　　جزاک اللہ فی الدارین خیرا

غور کیجیے کہ کتنے مقاموں پر گل عذار، طرح دار، باغ و بہار، خاتونیں ان پر ریجھی تھیں مگر واہ رے آزاد۔ ذرا لغزش نہ ہوئی۔ آفرین۔ زبین النسا کے حُسن و جمال کو دیکھیے اس مستانہ چال ڈھال کو دیکھیے، اس خط و خال کو دیکھیے اور سب پر طرّہ اس سن و سال کو دیکھیے، نوعمر و سن نوخیز و نوخاستہ، رشکِ ماہرویاں آراستہ۔ آزاد کے گلِ رخسار پر ہزار جان سے عاشق۔ یہ عذرا تو وہ وامق مگر پیاری حسن آرا سے قول ہارے تھے اس کی پتلیوں کے مارے تھے۔ اللہ رکھی کیا کچھ کم تھی۔ اس کی شوخی اور جوانی بھی ستم تھی۔ اس نے لاکھ ان کو اُبھارا اور سیکڑوں تدبیروں سے تباہ کرنا چاہا، مگر یہ کورے کے کورے ہی آئے۔ رنگیلے چھیل چھبیلے رسیا، ٹھٹول عاشق تن تو ضرور تھے، مگر پاکباز و پاک نظر، قدسی صفات و حیا پرور۔ بمبئی میں اہل اسلام نے ان کی بڑی ہی خاطر کی اور ایک دن مقرر ہوا کہ سب مل کر میاں آزاد کے آنے اور روم جانے کا جلسہ منعقد کریں گے۔ میاں آزاد اپنے دوست میرزا صاحب کے ساتھ جہاز کی فکر میں گئے۔ ادھر خوجی نے افیم کی چسکی لگائی اور پلنگ پر دراز۔ مگر چشم نیم باز، زبین لونڈی جو باہر آئی۔ تو حضرت کو پینک میں دیکھ کر خوب ہی کھِل کھِلائی اور اندر جا کر بیوی سے یوں کہا!

زبین : اے بیگم صاحب ذری پردے کے پاس آئیے تو لوٹ لوٹ جائیے یہ موا خوجی سودائی بڑی افیم کھاتا ہے۔ ہے ہے مجھ سے تو مارے ہنسی کے رہا نہ گیا۔ ذری آیئے تو سہی۔

بیگم کم سن تو تھیں ہی۔ پردے کے پاس سے جو جھانکا تو ان کو ایک دل لگی سوجھی چھپ سے ایک بتّی بنائی اور زبین سے کہا کہ لے چپکے سے ان کی ناک میں بتی کر۔ زبین ایک ہی شریر بس کی گانٹھ، وہ جا کے بتی میں تیتا مرچ لگا لائی اور خوجی کی کھٹیا کے نیچے گھس کر سرھانے کی طرف گئی اور ہاتھ بڑھا کر میاں خوجی کی ناک میں آدھی بتی داخل ہی تو کر دی اور جھپ سے کھینچ کی اف واللہ اس وقت مارے ہنسی کے لکھا نہیں جاتا۔ خوجی جو کلبلا کر اٹھے تو آچھیں چھیں چھیں۔ ااا آچھیں چھیں۔ اوگید آچھیں۔ اوگیدی کہنے کو تھے کہ چھینک آگئی تو اوگید ہی کہہ کر رہ گئے) اونا۔ آچھیں (اونا معقول کہنے کو تھے مگر اونا کہا تھا کہ چھینک نے زبان بند کر دی، اور معقول کا لفظ اس نا معقول کی زبان تک نہ آنے پایا)۔ ہاچھیں اتفاق سے پڑوس میں ایک پرانے فشن کے بزرگوار توگری کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس جانے والے تھے۔ وہ جیسے دہلیز کے قریب آئے ویسے ہی خوجی نے چھینکا۔ اندر چلے گئے۔ بیوی نے ایک گلوری

دی۔ چباتے ہوئے چلے ہی تھے کہ پھر چھینک پڑی۔ لاحول ولا۔ پھر اندر گئے۔ اب کی چکنی ڈلی کھائی۔ روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ادھر آآآ آچھیں کی آواز آئی اور اُدھر بیوی نے لونڈی دوڑائی کہ اندر چلیے بیوی بلاتی ہیں۔ اندر جا کر انھوں نے جوتے کا پاؤں بدلا اچھا ٹوٹکا ہے۔ اے حضرت ٹوپی سے ادل بدل کر لیجیے تو اور بھی موزوں ہو۔ پانی بھی پیا اور رخصت ہوئے۔ جیسے ہی باہر آن کر رکاب پر پاؤں رکھنے کو تھے کہ خوجی نے ناک کی دو نالی بندوق سے ایک اور فیر داغ دی۔ تب وہ بہت ہی جھلّائے۔ ہات ترے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں۔ مردود کی۔ اور پاؤں تو کان بھی صاف کتر لوں۔ مردک نے مرچوں کی ناس لی ہے۔ ناک کیا تک چھکنی کی جھاڑی ہے۔ ہات تری ناک پر چکت دوں منحوس نے جانا دوبھر کر دیا۔ رکاب پر قدم رکھا، اور چھیں۔ دہلیز تک آئے اور چھیں، خدا سمجھے بیوی اندر سے بولیں کہ ناک ہی کٹے موئے کی۔ جو برائی بد شگونی کے لیے ایسی دل لگی بازی کرے ذری زیبن کو بلا کر پوچھو تو کہ یہ کس نکٹے مونڈی کاٹے کو بسایا ہے۔ اللہ کرے گدھے کی سواری نصیب ہو۔

ادھر یہ میاں بیوی پانی پی پی کر بے چارے کو کوس رہے تھے اُدھر خوجی کا چھینکتے چھینکتے سچ مچ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ اور بیگم صاحب گھر کے اندر لوٹ رہی تھیں۔ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ مگر واہ ری زیبن۔ وہ سوں کھینچی کہ سبحان اللہ، چارپائی کے نیچے دبکی پڑی رہی، تو سانس تک نہ لی۔ مگر مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ سمجھی کہ ہنسی اور قلعی کھلی۔ دم بخود ہم سے تو حضرت نہ رہا جاتا۔ یہاں تو چاہے کوئی مار بھی ڈالتا مگر ہنسی حشر تک نہ ضبط ہو سکتی، ہم تو مع خوجی اور مع چارپائی اٹھ کھڑے ہوتے۔ خوجی ابھی تک چھینک ہی رہے ہیں۔ جب چھینکنے نے ذرا فرصت دی تو انھوں نے غل مچایا۔ اد گیدی۔ بھلا بے بہروپیے، نکالی نہ کسر تو نے۔ اچھا بچہ چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔

راوی : بہت ہی خاصے۔ حضرت کے نزدیک بہروپیے نے ناک میں مرچیں جھونک دی تھیں اور یہ خبر ہی نہیں کہ بی زیبن گریۂ مسکین بنی ہوئی چارپائی کے نیچے ہنس رہی ہیں۔ خوجی بچارے اٹھے اور آفتابہ لے کر منھ دھویا اور ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب تڑیڑے دیے۔ کھوپڑی پر خوب پانی ڈالا، تب ذرا کسی قدر تسلی ہوئی اور بیٹھ کر بہروپیے کو کوسنا شروع کیا۔ خدا کرے سانپ کاٹے مردود کو۔ مکان پھٹ پڑے۔ دھنی اڑا اڑا کر کے گرے۔ سونا تک ملعون نے حرام کر دیا۔ خدا جانے اس کو میرے ساتھ کیا ضد پڑ گئی ہے۔ یہاں آ کے رہا یہ گھر بھی ڈھونڈھ

نکالا۔ ٹھہر مردود کل تیرے چھپر پر چنگاری ہی نہ رکھ دی ہو تو خواجہ بدیع نہیں۔ ہونے دے تڑکا۔ دن دہاڑے آگ لگاؤں گا۔ اس تقریر کو سن کر زبین کا بُرا حال تھا۔ لوٹتی تھی مگر واہ ری زبین، اس وقت زبین کی قطع فوٹو گراف کھینچنے کے لائق تھی۔ دبکی دبکائی سکڑی سکڑائی چارپائی کے نیچے زمین دوز۔ سانس تک لینا محال تھا۔

اتنے میں میاں خوجی نے دروازے سب بند کر دیے۔ جب دروازے بند ہوئے تو زبین چکرائیں۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ قریب تھا کہ چیخ کر نکل بھاگے۔ مگر دیکھا کہ میاں خوجی چارپائی پر دراز ہوئے اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ زبین کی جان میں جان آئی اور چپکے سے کھسکتی ہوئی نکلی اور بھاگی۔ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ خوب کھل کھلا کر ہنسی۔ ادھر بیگم صاحب قہقہے لگاتی تھیں اُدھر بی زبین لوٹی جاتی تھیں۔

بیگم : جاؤ۔ اب کی پھر چپکے چپکے ناک میں بتی کرنا۔

زبین : نا بیوی اب میں نہ جانے کی۔ بڑی سودائی آدمی۔ اس کے منھ کون لگے۔

بیگم : ہاں نہ جاؤ گی۔ اچھا نہ جاؤ۔

زبین : لو بیوی یہ زبردستی کی بات ہی اور ہے وہ کیا مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

اتنے میں زبین کا دیور دس برس کا چھوکرا، مگر آفت کا پرکالہ، انتہا کا شریر، شیطان کا چچا اور کانا۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیب چڑھا۔ رگ رگ میں شرارت، اتنا سا لونڈا مگر بلا کا بدذات، اس نے کہا میں جاتا ہوں اور دیکھے جایئے بیگم صاحب کیسا انگلیوں پر اس ایلچی کو نچاتا ہوں۔ مل انام (انعام) لوں گا۔ بیگم صاحب بولیں کہ اچھا ہمیں ہنسا دے تو انعام دیں گے۔ لونڈے نے جا کر دیکھا تو دیکھا حضرت کی خبر آگئی ہے۔ دوڑا دوڑا آیا اور کہا وہ تو اس وقت خدا جانے کہاں ہیں بے چارے خوب آدمی تھے۔ کتا گھر میں بندھا تھا۔ جھٹ اس کو زنجیر سے کھول زنجیر میں رسی باندھی اور باہر نے جا کر چارپائی کے پائے میں کتے کو باندھا اور میاں خوجی کی ٹانگ میں بھی رسّی باندھ دی اور چمپت۔ کتے نے جو بھونکنا شروع کیا تو خوجی چونک اٹھے۔ مگر ہاتھ ابھی ناک ہی پر ہے۔ دیکھتے ہیں تو ٹانگ میں رسی اور رسّی میں کتا اب ادھر خوجی چلاتے ہیں۔ اُدھر شیرا چل یوں مچاتے ہیں۔ لونڈا گھر سے دوڑا آیا۔ خیر تو ہے خیر تو ہے۔ کیا ہوا ارے! اور سنو کوئی کتے کو ان کی ٹانگ میں باندھ گیا ہے۔ اب زور نہ کیجیے ورنہ کتا

مفت میں ٹانگ دے گا۔

خوجی : ہونہہ۔ پوچھتے ہیں کون باندھ گیا ہے۔ کون گیا، یہ اسی بہروپیے مردک کا کام ہے اور کسی کو کیا پڑی تھی۔

زیبن : اے کیا ہوا میاں کیوں غل غپاڑا مچایا ہے۔

لونڈا : اجی میاں کی ٹانگ میں کوئی بہروپیا کتّا باندھ گیا ہے۔

زیبن : دیکھوں۔ اوئی۔ کیا کیا لوگ ہیں۔ لو ٹانگ میں کتّا باندھ دیا۔

خوجی : ٹانگ میں کتّا باندھ گیا، یوں نہیں کہتیں کہ دم میں نمدا باندھ گیا۔

زیبن : (ہنس کر) ہاں میاں بھول گئی تھی۔ سچ مچ دم میں موا نمدا ہی باندھ گیا۔ مگر یہ آیا کدھر سے۔ کواڑے تو سب بند کے بند پڑے ہیں۔

خوجی : یہی تو مجھے بھی حیرت ہے۔ مگر اب کی میں نے بھی ناک پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ بہروپیا بھی میرا لوہا مان گیا ہوگا۔ اب یہ تو سوچو کہ آیا کس طرف سے۔ اچھی دل لگی نکالی۔ بھلا کتے اور بلی کی دل لگی کون سی نکالی ہے۔ اب کی میں چھچھوندر ہی مردک کی ٹانگ سے باندھ آؤں گا۔ ٹھہر تو جاؤ چچا جان۔

زیبن : میاں کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس جگہ ایک خبیث رہتا ہے۔

خوجی : خبیث! اجی نہیں یہ اس بہروپیے ہی کا کام ہے۔

لونڈا : یہ یوں مانیں گے۔ جب تک خبیث ان کی کھٹیا کو نہ الٹ دے گا۔ تب تک مانیں گے تھوڑا ہی۔

خوجی : یہ بات تھی تو اب تک ہم سے کیوں نہ کہا بھلا۔ جان لوگی کسی کی۔ دو دن کے لیے مہمان تمہارے ہاں آیا اور خبیث کو پیچھے لگا دیا۔ اب رات کو جو یہاں سوئے اس پر تین حرف۔

زیبن : میں بھی کہوں کہ یہ بند دروازہ اور کتا باندھ جاتا۔ کیا اچنبھے کی بات ہے۔ مگر اب معلوم ہوا نہ۔ میں تو پہلے ہی کہہ گئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا تھا، مُدا بولی نہیں۔

خوجی : واہ کیا دانائی اپنی بیان کر رہی ہو۔ آزاد آئے تو ان کو آڑے ہاتھوں لوں۔ وہ خبیث پریت چڑیل بھوت جن ایک کے قائل نہیں سو ہمیں تو معلوم ہو کہ کبھی بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہے۔ کبھی کتا بھونک رہا ہے۔ ایک پائینتی دوسرا سرہانے۔

خوجی تو یہاں خبیث کے پھیر میں تھے اور اُدھر میاں آزاد علما و فضلا سے مصافحہ و معانقہ کرتے پھرتے تھے۔ جدھر نکل گئے انگلیاں اٹھنے لگیں۔ مسلمان ان کی زیارت کو جوق جوق اُمڈے چلے آتے تھے۔ جو ملتا تھا وہ تعریف کے پُل باندھ دیتا تھا۔ واہ آزاد سبحان اللہ۔ ع۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند،، آزاد دل ہی دل میں حُسن آرا کا شکریہ ادا کرتے تھے کہ نہ اس بت پندار سے آنکھ لڑتی نہ تمام ہندوستان میں ہمارا نام مشہور ہوتا۔ حُسن آرا کو سیکڑوں دعائیں دیتے تھے۔ جہاز کا بھی میرزا صاحب نے خوب بندوبست کر دیا۔

میاں آزاد اور ان کے حبیب فرخ نہاد میرزا صاحب والاتزاد، راہ راہ چلے جاتے تھے، ایک باغ کے قریب جو پہنچے تو دیکھا کہ سرنگ گھوڑے پر ایک گل بدن سیم لباس فاخرہ سے ملبوس ران پڑی جمائے، ناز دلربایانہ اور اندازِ معشوقانہ سے چلی آتی ہے۔ اس غیرتِ قمر کے قریب ایک مشکی پر اس کا شوہر جوانِ رعنا سوار ہے۔ دونوں کم سن بیوی کا بیس۲۰ میاں کا کوئی پچیس برس کا سن۔ دونوں حسین و نازنین دونوں مہ وش مہ جبین اٹھکیلیاں کرتے آتے اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے کِھل کھلاتی ہیں۔ میاں آزاد تو انگریزی میں برق تھے آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے جانے لگے۔ ان دونوں کو اُس وقت یہ خیال بجا کہ۔ ع۔ دیوار ہم گوش دارد فہمیدہ لب بجنباں،، وہ امنگ اور ترنگ کا وقت تھا دو میاں بیوی، دوسرا دن شب عروسی کا جوش دو لوہے کی انتہا نہیں، ہوائیں کھاتے گھوڑے چمکاتے گپیں اڑاتے، رمنے کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اب ذرا پیار کی باتیں اور میاں بیوی کی عشق کی گھاتیں، اور لن ترانیاں اور بدگمانیاں ملاحظہ فرمائیے۔

میاں : کل ایک بڑی حسینہ جمیلہ لیڈی نظر سے گذری۔ آنکھیں وہ شرمگیں کہ چشم بد دور رخ وہ زیبا کہ نورٌ علیٰ نور۔ اسٹیشن میں ویسی پری زاد دوسری نہیں۔

بیوی : (تیکھی چتون سے نظر ڈال کر) کیا کہا۔ ذری پھر تو فرمائیے گا۔

میاں : میں نے کہا کہ۔ کر۔ کر۔

بیوی : بس ہم سمجھ گئے ہیں اڈمبرا میں اتنی بڑی ہوئی ہوں آپ مجھ سے بہت اڑیے نہ، ہاں صاحب کیا فرمایا۔ اسٹیشن بھر میں بس پری ہے تو وہ ہے۔ مگر وہ اپنے وقت کی کلیوپیٹرا ہوگی۔

میاں : (شرما کر) میرا یہ مطلب تھا کہ اس اسٹیشن میں وہ پری زاد ہے جو اپنی آپ

ہی نظیر ہے۔ مگر ایک اس سے بھی بڑھ کر پری رو ہے۔

بیوی : (غصے میں) وہ کون؟

میاں : وہ جو میرے ساتھ گھوڑے پر اس وقت ہوا کھاتی ہیں۔

بیوی : (خوش ہو کر) بجا میں تو خوبصورتی کا دعوی کرتی ہی نہیں۔

میاں : باکمال کہیں دعوی کیا کرتے ہیں۔ تم نہ کرو ہم تو دعوی کرتے ہیں کہ بمبئی بھر میں ہماری چاہتی بیوی سے زیادہ کسی کا حسن پر آشوب نہیں۔ ابرو خنجر آبدار ایک اشارے میں کلیجے کے پار، اور اس آن بان پر جان تک قربان۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب اسٹیشن بھر میں کوئی نہ ہوگا۔

بیوی : (باچھیں کھل گئیں، تم کیا کچھ کم ہو۔

میاں : اب ہم کوئی چار پانچ روز میں روانہ ہوں گے۔

بیوی : ہاں ہمیں راہ میں مصر کے منار ضرور دکھلانا۔ بھلا جرمنی میں کتنے دن ہوگئے۔

میاں : جرمنی میں کیا ہے۔ فرانس میں البتہ قیام ہوگا۔

بیوی : (مسکرا کر) کہاں! فرانس میں نہ (آنکھ کا اشارہ کر کے) ہاں وہاں کیوں نہ زیادہ قیام ہوگا۔ ہم اپنے پرانے اسکول بھی کم کوے چلیں گے۔ مس لزی سے ملنا۔ دیکھو کیسی نیک بی بی اور کیسی تربیت یافتہ ہیں۔

اتنے میں ایک ہوٹل ملا۔ اور دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سے اتر کر وہاں گئے۔ آزاد اپنے دل میں سوچے کہ واللہ کس مزے سے ان کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ چین ہی چین لکھتا ہے۔ اور کیا نوک جھونک ہوتی جاتی ہے۔

مولانا محمد آزاد

عروس چاردہ سالہ، آفت کی پرکالہ، خاتون مہ لقا حسن آرا کے طفیل میں سالک مسلک سداد میاں آزاد مادام، شموس حمتیکم الی یوم التناد کی حمیت مثل خورشید روشنی بخشی ہر مرزو یوم ہوگئی چار دانگ ہند میں عموماً اور متشرع اہل اسلام میں خصوصاً دھوم ہوگئی۔ جس گلی کوچے نکل جاتے تھے، لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے۔ حضرت جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ میرزا اسد بیگ صاحب کے ہمراہ بمبئی میں اکثر علما و قفات کی خدمت میں بار پایا۔ اور ان سب

نے عزت بخشی رتبہ بڑھایا۔ گھر گئے تو دیکھا کہ خوجی ننگ دھڑنگ افیم کی ترنگ میں ایک لنگی باندھے ہوئے دروازے کے باہر اکڑوں بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور آہستہ آہستہ شکر پارے ٹونگ رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دونوں ہنس پڑے۔

میرزا صاحب: ان آپ کے ساتھی کی بھی واللہ نرالی سج دھج ہے۔

آزاد: (خوجی کے کان میں زور سے) کیا پہنچ گئے۔

خوجی نے ہانک لگائی بہروپیا! بہروپیا! اب بہروپیا بہروپیا کہتے ہوئے اس زور سے آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا کہ گویا اپنے حساب چور کو گرفتار کیا تھا۔ آنکھیں تو حضرت کی بند ہیں۔ مگر بہروپیا بہروپیا غل مچائے جاتے ہیں اور یہ دونوں کھل کھلاتے ہیں۔ واللہ کیا فرمائشی جانگلو ہے۔ دید نہ شنید۔ میاں آزاد تو خوجی کے رگ وریشے سے واقف تھے، اور اپنے بچھڑے کے دانت سب ہی پہچانتے ہیں۔ انھوں نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ ہاتھ چھوٹ گیا اور خوجی پھٹ سے مُنھ کے بھل زمین پر آرہے۔ آزاد تڑ سے دس قدم پر۔ ادھر خوجی نے لڑھکنی کھائی اور ادھر آنکھ کھول دی تو آزاد نے خوب غل مچایا کہ بھاگا بھاگا۔ وہ بھاگا وہ بہروپیا بھاگا جاتا ہے۔ خوجی بھی لینا لینا جانے نہ پائے کہتے ہوئے فرضی بہروپیے کے پیچھے لپکے۔ ماشاءاللہ ذرا دُبلا سے تو آپ کے پاؤں اور چلتے ہیں بہروپیے کو گرفتار کرنے۔ واپس آئے تو ہانپتے جاتے ہیں اور کوستے جاتے ہیں۔ نکل گیا نکل گیا۔

میرزا صاحب: جناب خواجہ صاحب کون نکل گیا۔

خوجی: اجی حضرت کالا چور نکل گیا۔ بس ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے تو گردن ناپی تھی۔ مگر بدر رو بیچ میں آگئی۔ اس سے بس نہ چل سکا۔ اور میں ہانپ بھی گیا تھا ورنہ پکڑ ہی لیتا۔

راوی: بجا ارشاد ہوا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ آپ بہروپیے کے کلّے ہی تک پہنچ گئے تھے۔

آزاد اور میرزا صاحب جو اندر گئے تو دیکھا کہ گھر کا گھر ہنس رہا ہے اور بیگم صاحب کی زبان سے مارے ہنسی کے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔

آزاد: (دل میں) واہ ری کم سنی۔ اس الھڑپن کے صدقے۔ ہائے کیا شوخی ہے۔ بوٹی بوٹی اس وقت پھڑک رہی ہے اور ہنسی کو تو دیکھیے۔ رنگ رخسار کا متغیر ہونا اور بھی ستم ڈھاتا ہے، اور پھر اپنی بے دھڑک ہنسی کے خیال پر چشم شرگیں کچھ اور ہی سجھاتی ہے کُندرڈ وندان کی جھلک اور لب لعل شکر خا کی دمک زبان حال سے کچھ اور ہی سناتی

ہے۔ یہ نازک کلائی اور یہ دست حنائی، خون رلاتا ہے۔ دل بے قرار ہوا جاتا ہے۔ مگر جرأت نہیں پڑتی کہ بیدھڑک آنکھ لڑاؤں، اور اس بتِ پندار کا جوبن لوٹوں۔ وہ ناظورۂ دلفریب سمجھ گئی کہ میاں آزاد رسیجھے۔ اب ناظرین حق ہیں، خصوصاً حضرات رنگین مزاج، خود ہی دل میں غور فرمائیں کہ جب ایک کم سن پری پیکر رشک شمس و قمر کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں جوان خوش رو و عنبریں مو کی ہم پر نظر پڑتی ہے تو چاہے کیسی ہی پاکبازی و پاک نظر کیوں نہ ہو پھر اس وقت کچھ اور ہی عالم ہوگا۔ وہ چھپ چھپ کر کنکھیوں سے دیکھنا اور اگر اس جوان نے بھی دیکھا تو لجا کر گوری گوری گردن پھیر لینا۔ کبھی شوق خود نمائی سے چمک جانا، کبھی پیاری پیاری اداسے چھب دکھانا۔ ستم ہے، غضب ہے، قیامت ہے۔ سحر ہے جادو ہے۔ کرامت ہے، بیگم صاحب کا بھی یہی حال ہے، اور پھر ان کو یہ بھی خیال تھا کہ تھوڑے ہی زمانے میں حسن آرا ان کی بیوی بنے گی۔ سپہر آرا ان کو دولہا بھائی کہیں گی۔ میاں آزاد سے ان کو دلی محبت ہو گئی اور کیوں نہ ہوتی۔ پیاری بہن کے پیارے تھے کہ نہیں۔

اتنے میں خدمت گار نے باہر سے آواز دی۔

خدمت گار: زبین۔ زبین۔ او زبین!

زبین: ہاں ہاں! اوئی کچھ کہو گے بھی یا زبین ہی زبین کہے جاؤ گے۔

خدمت گار: دو چار صاحب ملاقات کے لیے آئے ہیں۔

میرزا صاحب باہر گئے اور ادھر اس پیاری دلہن نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے گلوری بنائی اور میاں آزاد کو اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ اہو ہو۔ واہ رے آزاد، واللہ بڑے خوش نصیب ہو۔ تمام عمر پریوں ہی میں بسر کی۔ حضرت سچ تو یوں ہے کہ حسد ہوتا ہے مگر خیر۔ میرزا صاحب جو باہر گئے تو کیا دیکھا کہ تین چار زعماء تشریف لائے ہیں۔ مولانا محمد طاہر صاحب منطقی۔ مفتی محمد عبدالحمید صاحب۔ قاضی عبدالقدوس صاحب۔ حکیم مولانا محمد عبدالرؤف صاحب۔

قاضی صاحب: السلام علیکم (مصافحہ کر کے)

میرزا صاحب: وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

مفتی صاحب: مزاج معلی۔

میرزا صاحب: الحمدللہ۔ آپ کا مزاج مقدس۔

(سب مل کر) وَلَہُ الشکر۔

قاضی صاحب : فرعِ سماع ہوا کہ حضرت مولانا محمد آزاد صاحب قاصدِ عازمِ سلطنت رفیعہ و دولتِ جلیلہ روم عمرہا اللہ الیٰ یوم النشور ہیں۔ دفقۃ المرضاتہ اور محض بقصد ادخار مثوبات آخرت یہ قاصد ہیں۔

میرزا صاحب نے میاں آزاد کو اندر سے بلوایا اور آزاد کے آتے ہی سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چاروں سے مصافحہ ہوا۔

قاضی صاحب : مدت مدید سے یہ عاصی مشتاقِ حصول لقا تھا۔ للہ الحمد کہ آج یہ سعادتِ عُظمیٰ نصیب ہوئی اور فائز بمرام ہوا۔

مفتی صاحب : قس علیٰ ہذا۔

حکیم صاحب : علیٰ ہذا القیاس۔

مولانا صاحب : اَلاَمرُ کذالک۔

آزاد : السّعی منی والاتمام من اللہ۔ میں اس وقت آپ بزرگانِ ملکوتی صفات کی زیارت سے از بس محظوظ و مسرور ہوا۔

قاضی صاحب : باری تعالیٰ جل شانہ و عم نوالہ نے غزائے دینی میں ثوابِ جمیل اور اجر جزیل مقرر فرمایا ہے اور اس امر حسن پر تاکید شدید اور تخصیص اکید کی ہے اور آئینۂ تفضیلت اس کی بآیات متکاثرہ و احادیث متواترہ ثابت ہے اور حضرت باری جل شانہ نے مجاہدین کے درجے کو قاعدین کے درجے پر تفضیل دی ہے اور بیّن ہے کہ افضل الاعمال احمزہا اور یہ امر بھی ابدیہیات سے ہے کہ غازیانِ راہِ خدا اگر سیل سیوف نہ کرتے تو دورِ قیامت تک بنائے شرع متین اور اساس دین مبین قائم و ثابت نہ ہوتی اور اگر مجاہدین فی سبیل اللہ بذل مہج نہ فرماتے تو سوادِ کفر و ظلمت ضلالت مبدل بنور ہدایت نہ ہوتی اور شہدار رضوان اللہ علیہم کو امواتِ توہم کرنا نہ چاہیے۔ بلکہ عند اللہ وہ احیا ہیں کہ بالوانِ نعم جنانِ ملتذذ و مرزوق ہوتے ہیں۔ اور ازانجا کہ ان ایام میں فیۂ روسیہ نے قصدِ غصب ممالک مقبوضہ حضرت قدر قدرت خاقان بن خاقان سلطان روم عمر اللہ ملکہ کیا ہے۔ ہر عبد مسلم پر بعد تحقیق شرائط قرین ہے کہ دفع شر ان کے سعی مشکور و کوشش موفور کرے اور خلیفۂ وقت کی من ای طریق کان ہد و نصرت کرے، اور تخیّل کہ بنی اصفر سے جن کا

خروج علائم قرب وقوع واقعہ یعنی حدوثِ قیامت ہے۔ یہی مراد ہوں۔

آزاد : بجا ارشاد ہوا۔ تو پھر قبلہ وکعبہ آپ کے اِس ارشاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کی چڑھائی سے قیامت ہوا چاہتی ہے اور صورِ اسرافیل کی آواز کان میں اب آئی اور اب آئی تو جب قیامت ہی آنے والی ہے تو پھر لڑنے سے مفت جان دینے کے سوا اور کیا فائدہ۔

قاضی : قبلہ میں نے یہ نہیں کہا کہ ان کا خروج علل ظہور قیامت سے ہے۔ بلکہ علائم قیامت سے ہے، اور علائم وعلل میں یوں بعید ہے کما لایخفیٰ علی الفطن اللبیب وَلَو فرضنا ذالک کبریٰ تمہارے قول کا ممنوع ہے۔ پس یہ قیاس منتج صحیح نہ ہوگا۔ وَھُوَ المقصود۔

آزاد : بجا ارشاد ہوا۔ قبلہ میں سمجھ گیا۔

خوجی : (دبی زبان سے) جھوٹے پر تین حرف۔ ہم تو خاک بھی نہ سمجھے۔ اتنا سمجھے کہ پشتو میں بھیک مانگ رہا ہے کوئی۔ اس مغلق سے خدا کی پناہ۔ پنسیری پنسیری بھر کے لغت ڈھلکا دیے۔ سیلِ سیوف اور کما لایخفیٰ علی الفطن اللبیب اور خدا جانے کیا کیا الم غلم۔

آزاد : قبلہ دعا کیجیے میرے حق میں۔

مفتی صاحب نے کہا یا رالٰہا! مولانا محمد آزاد صاحب کو فیافی وجبال اور حرب وجدال اور غزا وقتال میں بہ تفضّل وعنایت اپنے مصوروں محفوظ رکھنا۔ اور غب حصول فتح وفیروزی ہم لوگوں سے ملاقی فرمانا! (سب نے مل کر کہا آمین)۔

خوجی : آمین آمین ہم سمجھے وجھے نہیں، مگر بول اٹھے آمین۔ غب غب۔ آمین فیافی اور چواچی آمین ثم آمین (قاضی صاحب کے قریب جا کر) حضرت قاضی القضات غپ غپات۔ فیھا الموات غب غب۔

قاضی صاحب : (مسکرا کر) اسم مبارک ؟

خوجی : جناب مفتی خواجہ بدیع صاحب علیہ الرحمۃ والغفران اور حضور کا نام نامی ؟۔

قاضی صاحب : محمد عبد القدّوس۔

خوجی : کیا ؟ اُستوخدوس ؟ (اسطوخودوس) یہ نئی گڑھت کا نام ہے۔

؎ اسرافیل ایک فرشتہ کا نام ہے۔ جو قیامت کے دن صور (ایک قسم کا سائرن) پھونکے گا اور سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہوجائے گا۔ کائنات کی ہر شے بے جان درد ہوجائے گی (حسب اعتقاد اہل اسلام)

آزاد : نہایت گستاخ آدمی ہو تم۔ بس چونچ سنبھالو ورنہ اس وقت میں حلال کر ڈالوں گا۔

اب ایک لطیفہ سنیئے کہ میاں خوجی نے جس قدر تقریر کی سب پینک کی حالت میں۔ ہوش میں تو تھے مگر آنکھیں کچھ کچھ بند، جب آزاد نے ڈانٹ بتائی تو آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو سب کے پہلے قاضی صاحب ہی پر نظر پڑی۔ طویل القامت مُسن۔ شملہ بمقدار علم سر پر، قمیص در بر، بردیمانی بر دوش، سفید پوش، صاحب تن و توش، نعلین بغدادی پاؤں میں۔ ماتھے پر گھٹے۔ ریش مبارک یک مشت دو انگشت۔ خوجی پینک سے جو چونکے تو ان کو دیکھتے ہی آگ ہو گئے۔ اور یوں بکنے لگے۔

خوجی : اور دیکھیے گا ذری۔ آج مولانا بن کر آئے ہیں۔ بھئی گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے۔ واللہ گرگٹ کے سے۔ اس دن گھسیارے بنے تھے۔ آج مولوی صاحب بنے ہیں۔ کبھی سپاہی کا روپ بدلتا ہے، اس نے تو ناکوں دم کر دیا۔

قاضی اور مفتی اور مولانا اور حکیم رخصت ہوئے۔ ادھر میاں آزاد نے ان کو خوب ہی للکارا نامعقول بے دیکھے بھالے، بے سمجھے بوجھے، جو چاہتا ہے بک دیتا ہے۔ کچھ پڑھے ہوتے تو علما کی قدر بھی کرتے۔ اجہل مطلق ہو۔ تم بھلا کسی کی قدر کیا جانو۔ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔

خوجی : جی ہاں بس اب ایک آپ ہی تو بڑے لقمان ہیں۔ بڑے وہ بنے ہیں۔ ہم کو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی گدھا ہے۔ اور یہاں عربی چاٹے بیٹھے ہیں۔ افعل افعلا ما فعلوا۔ ما فعلت۔ ما فعلتا۔ ما فعلن۔ ما فعلت۔ ما فعلتما۔ ما فعلتم۔ ما فعلت ما فعلتما۔ ما فعلتم۔ ما نعلتِ۔ اور سنیے غلم۔ غلما۔ غلمو۔ غلمت۔ غلمتا۔

میرزا صاحب : یہ کون صیغہ ہے بھئی؟

خوجی : جی یہ صیغہ الم غلم ہے۔ اچھا بتایئے استقراء کے کیا معنی؟ (کل کل دآگے آیت)

آزاد : استقراء یہ کہ مثلاً چند افراد پر قیاس کر کے کل کو ویسا ہی سمجھے، بس اسی کا نام استقراء ہے۔ مثلاً کل حیوان تحریک فکہ الاسفل عند المضغ۔ یعنی جس قدر حیوانِ مطلق ہیں وہ سب جبڑوں کو کھاتے وقت ہلاتے ہیں۔ مگر تمساح؟ اس سے مستثنٰی ہے۔ بس دلیل ضعیف ہو گئی۔

میرزا صاحب اور میاں آزاد باہر کرسیاں بچھا کر بیٹھے تو خوجی نے شعر خوانی شروع کی۔

خوجی :
دل گواہ است کہ در پردہ دل آرائی ہست
ہستی قطرہ دلیل ست کہ دریائی ہست

میرزا صاحب : سبحان اللہ۔ کیا خوب کلام دلکش ہے۔ خوجی خوش ہو گیا۔ واللہ بھڑک گیا۔ بارک اللہ واہ خواجہ بدیع صاحب۔

آزاد :
صبح کہ ترک مستِ من شیشہ کشادمی دہد
عقل نجاک میزند صبر بباد می دہد

خوجی :
ہم مژہ اش ستیزہ را دشنہ بدست میدہد
ہم نگہش زمانہ را عربدہ یاد میدہد

آزاد :
آہ کہ بردماغ و دل میزندم نسیم خواں
جرعۂ ساغرے کہ آں ترک نژاد می دہد

خوجی :
جرعۂ کاروانِ ما نیست بہ ناقہ، جرس
شوقِ تو راہ می بردورِ و توزاد می دہد

آزاد :
فیضیؔ نامراد من از غم دہر غم مخور
زانکہ مراد اہل دل شاہ مراد می دہد

میرزا صاحب : حضرت پھر اب تو چار پانچ روز یہاں ہی بستر جمائیے۔ جہاز کو جانے کو بس ایک اٹھوارا سمجھیے، مگر واسطے خدا کے خطوط ضرور بھیجا کیجیے گا۔ دیکھیے ایسا نہ ہو کہ یہاں ہم کو اور وہاں حسن آرا کو تڑپائیے۔ الانتظار اشد الموت حسن آرا کا خط بھی صبح و شام آتا ہی ہو گا۔ ہائے یہ لگی بُری ہوتی ہے۔

پیراک

جناب فضیلت انتساب مصباح مجالس سداد، مولانا محمد آزاد صاحب میرزا کے ساتھ لبِ تالاب کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اور پری رخان مہ وش کے حسنِ گلوسوز سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ تالاب کا پانی وہ صاف سیڑھیاں وہ سڈول اور شفاف کہ بے اختیار نہانے کو جی چاہے۔ طبیعت لہرائے کہ دھم سے غوطہ لگائیے۔ درختوں کے سایہ میں کھڑے ہوئے میاں آزاد پیراکوں کے کرتب دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص لنگوٹا باندھ کر پل پر سے کودا دھم، دوسرا درخت سے دھماک، تیسرا چبوترے سے آیا تڑ۔ کہیں جل بانک ہو رہی ہے۔ کہیں داؤ پیچ۔ کوئی ملّاحی چیرتا ہے۔ کوئی کھڑی لگا رہا ہے۔ کوئی شیر کی پیرائی پیرتا ہے۔

کوئی مردے کی جن کو استادی کا دعویٰ ہے وہ اُبھر اُبھر کر کمر اور لنگوٹ دکھاتے ہیں۔ سمجھنے والے تعریف کے پل باندھتے جاتے ہیں۔ اے سبحان اللہ واہ میرصاحب خدا گواہ کیا خوب ملکہ حاصل ہے۔ حضرت خواجہ صاحب واللہ اب شہر میں آئے ہوا گئے۔ خان صاحب واللہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ یوں تو پیراک ایک سے ایک بڑھ کر ہے مگر آپ کے تم و دم ہی اور ہیں۔ واللہ پرانے استادوں کے یادگار بس ایک تم ہو، وہ پھولے نہیں سماتے ہیں۔ کھلے جاتے ہیں۔ نوسکھیے اپنے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، اور جو پیرنا دیرنا خاک نہیں جانتے۔ وہ پہلی دوسری ہی سیڑھی پر بیٹھ کر نہائے اور لمبے ہوئے۔ ڈرپوک آدمی دور سے سیر تو دیکھ رہے ہیں۔ مگر پانی کے قریب جاتے ہوئے زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔ بدن تھرتھراتا ہے۔ بھئی احتیاط شرط ہے۔ پانی اور آگ سے زور نہیں چلتا۔ جس چیز کو انسان نہ جانے اس میں دخل در معقولات مقتضائے عقل و حکمت نہیں۔

میاں آزاد اور میرزا صاحب دونوں اس وقت کی کیفیت پر لوٹ تھے۔ غنچۂ دل نسیم مسرت کے اہتزاز سے کھلا جاتا تھا۔ تالاب بھر میں سروں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ جب کچھ عرصے تک یہ لطف اٹھا چکے تو آزاد نے میرزا صاحب سے یوں کہا۔

آزاد : کہیے آپ کو بھی پیرنے کا ذوق ہے یا نہیں۔

میرزا صاحب : جی ہیں کچھ دو ہی چار ہاتھ لگانے جانتا ہوں۔ لیکن آپ کا جی چاہتا ہو تو بسم اللہ۔

آزاد : جل بانک ہوگی ہم سے آپ سے۔

میرزا صاحب : بھلا مجھے کیا سلیقہ ہے۔

آزاد : یہاں سب سے بڑھ کر کون استاد ہے اس فن کا؟

میرزا صاحب : وہ۔ وہ جو نیلا لنگوٹ باندھے پورب کے زینوں کی طرف کھڑا ہے۔

آزاد : وہ جن کا چھریرا بدن ہے؟

میرزا صاحب : جی ہاں۔ پھر اگر شوق چرّایا ہو تو بسم اللہ۔ لنگی منگواؤں۔

اتنے میں یہ واقعہ ناشنیدنی و سانحہ نادیدنی ہوا کہ ایک لڑکا بلا کا حسین، غضب کا مہ جبیں، از سرتاپا نور، غیرت حور۔ تالاب میں نہا رہا تھا۔ کمر کمر تک پانی میں کھڑا غوطے لگا رہا ہے۔ سوچا کہ اچھی طرح غوطے لگانا محال ہے آؤ ذرا ایک زینہ اور اتریں۔ اس شوق سے جیسے

ہی اس نے ایک پاؤں زینے سے بڑھایا اور بس دوسرا پاؤں بھی ساتھ اٹھ گیا اور اٹھتے ہی چلا اور غڑاپ پانی میں ایک غوطہ کھایا۔ پھر ابھرا وہ تو ڈوب رہا ہے اور ادگرد حوالی موالی پیراک تماشائی ابھی تک یہی سمجھتے ہیں کہ وہ دل لگی کرتا ہے۔ آخر کار جب تیسری مرتبہ اس نے غوطہ کھایا تو لوگوں نے غل مچایا کہ ڈوبا۔ ارے دوڑو ڈوبا۔ ہائے ڈوبا! ہائے ڈوبا! اس کا چھوٹا بھائی بھی ایک زینے پر قریب کھڑا تھا وہ بے اختیار ہو کر چلانے لگا اور سارا زمانہ غل مچانے لگا کہ غوطہ خوروں کو بلاؤ۔ ملاحوں کو پکڑ واؤ، مگر مدد کوئی نہیں جاتا۔ جان بھی کیا پیاری ہوتی ہے۔ بڑے بڑے استاد تالاب پر موجود ہیں۔ مگر کندے تول تول کے رہ جاتے ہیں۔ قریب نہیں آتے ہیں۔ آخر کار میاں آزاد جھپ سے پل پر آئے اور دھم سے کود پڑے۔ ابھرتے ہی غڑاپ غوطہ لگایا۔ اور غوطہ لگاتے ہی اس لڑکے کا شانہ ہاتھ آیا۔ انھوں نے اس کو نکالا اور کنارے پر لائے تو دیکھا کہ جان باقی ہے۔ مگر کوئی دم کا مہمان ہے۔ پڑا سسک رہا ہے۔ لیکن آزاد کی تعریفیں ہونے لگیں۔ غلغلۂ بارک اللہ۔ ہر سمت سے بلند ہوا۔ ہر فرد بشر خرسند ہوا۔ میاں آزاد کی دھوم ہو گئی۔ اب کوئی ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے۔ کوئی چومے لیتا ہے۔ کوئی کروروں دعائیں دیتا ہے۔ لوگوں نے مل کر اس کو الٹا لٹکایا۔ جب پانی بالکل نکل گیا تو اس لڑکے کو ذرا ذرا ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر ہیبت چھائی۔ بوٹی بوٹی تھرتھرائی، چہرہ زرد، ہاتھ پاؤں سرد۔ بھیانک اور ڈراؤنی صورت تھی۔ دیکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ بارے رع: سیدہ بود بلائے دلے بخیر گذشت، جب اس لڑکے کو ہوش آیا تو اس نے بصد حسرت و حرماں بیان کیا کہ۔

لڑکا: میں نے چاہا کہ غوطہ لگاؤں۔ کیوں کہ جہاں میں پہلے کھڑا تھا وہاں پانی کمر کمر تک تھا۔ اچھی طرح سے غوطہ لگانا مشکل تھا۔ جب میں نے قدم بڑھایا تو مجھے خود معلوم ہو گیا کہ پانی یہاں زیادہ ہے لیکن میرا دوسرا پاؤں تو دبخود اٹھ گیا۔ اور میں نے لاکھ چاہا کہ بچوں مگر بچنا سخت دشوار تھا، بلکہ محال محض۔ جب دونوں پاؤں اکھڑ گئے تو بس غوطے کھانے لگا۔ اور ڈوبا۔ اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی اس کے بیان کرنے سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں (بیان کرتے ہوئے چہرہ زرد ہو گیا) پس جب پہلی مرتبہ غوطہ کھایا تو پانی منھ میں جانے لگا۔ میں نے ہاتھ سے منھ کو بند کیا تو ناک کی راہ پانی آنے لگا۔ جب ناک کو بچایا تو پھر منھ میں پانی آنے لگا۔ اتنے میں لاش ابھرنے لگی۔ مگر

پھر غوطہ کھایا تو تہ آب میں زرد زرد کوئی شے نظر آئی۔ لیکن ہوش اور حواس اب بالکل غائب ہو گئے۔ تیسرے غوطے کا حال اچھی طرح نہیں یاد۔ اتنا جانتا ہوں کہ میرے دل پر اس قدر دھچکا کبھی نہیں ہوا تھا۔ جس قدر اب کی ہوا۔ اُف اُف اُف! (کانپتے ہوئے) اس وقت تالاب کی صورت مجھے کاٹے کھاتی ہے۔ اور بے موت میری جان جاتی ہے۔ افسوس صد افسوس غضب ہی ہو گیا تھا، مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ صاحب میرے پاس آئیں جنھوں نے میری جان بچائی۔ ان کا مجھ پر تا دم مرگ احسان رہے گا۔

لوگوں نے میاں آزاد کو آواز دی اور کہا چلیے آپ کو وہ لڑکا بلاتا ہے، جس کو ابھی ابھی آپ نے تالاب سے نکالا ہے۔ میاں آزاد گئے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔ روتے روتے وہ آزاد کے گلے لپٹا اور کہا کہ میں اس عنایت کا کیا معاوضہ کروں، اس احسان کا بار کیوں کر میرے سر سے اترے گا۔ آپ نے مجھے رہینِ منّت بیکراں و مرہونِ عنایت بے پایاں کر دیا:

چہ نامی کہ مولائے نام توام ۔۔۔ دِرم ناخریدہ غلام توام

آزاد : (پیشانی چوم کر) احسان! احسان کیسا؟

لڑکا : اب میں آپ کے ہمراہ چلوں گا اور ضرور چلوں گا۔

آزاد : بھائی میں سیاح جہاں گرد رہ نورد، بھلا میرے ساتھ تم کہاں جاؤ گے۔

لڑکا : اگر ساتھ چھوڑوں تو جو جی چاہے وہ کہیے گا۔ نام بدل ڈالوں۔

میرزا : اچھا اب اس وقت تو یہ ہمارے مکان پر جاتے ہیں۔ وہاں ہی آن کر ملنا۔

لڑکا : پتا؟

میرزا : بھنڈی بازار۔

لڑکا : نام؟

میرزا : میرزا اسد بیگ۔

لڑکا : اچھا پھر آپ جائیے میں حاضر ہوں گا (آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر):

چہ نامے کہ مولائے نام توام ۔۔۔ درم ناخریدہ غلام توام

میاں آزاد اور میرزا صاحب وہاں سے چلے۔

پارسی کا مکان

آج تو کچھ رنگ جما ساقیا   بادۂ گلرنگ پلا ساقیا
دیر ہوئی دور چلے ساقیا   اور چلے اور چلے ساقیا
قاضی و زہاد کی پگڑی گرے   ہاتھ میں رندوں کے ہوں دونوں سرے
خیر پیالہ نہ پلا ساقیا   آنکھ تو یاروں سے ملا ساقیا

مئے کدۂ وحشت کے بادہ خوار، نشۂ شراب جنون کے سرشار، عشق کے چشم و چراغ۔ سرخوش و تردماغ، وامق و فرہاد کے استاد، مولانا محمد آزاد، خانہ برباد۔ میرزا صاحب کے مکان عشرت بنیان میں داخل ہوئے اور میاں خوجی کی ٹکڑی میں تڑ سے شامل ہوئے رہ نوردی اور کوچہ گردی، شوربشتی اور دھینگا مشتی، حسن آرا کے حسن و جمال اور سپہر آرا کی مستانہ چال، زینت النّسا کی بھولی بھولی باتیں، اور اختر النّسا کے عشق کی گھاتیں اللہ رکھی کی شوخی اور بے قراری، اور اس بے چاری دلہن کی گریہ وزاری، یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بصد حسرت و یاس یہ اشعار زبان پر لائے:

آج مرا پیرِ مغاں کیا ہوا   کل جو بندھا تھا وہ سماں کیا ہوا
ساقی و مُطرب نظر آتے نہیں   جا کے چھپے ہیں کدھر آتے نہیں
قلقل مینا ہے نہ چنگ در باب   ناک میں آتی نہیں بوئے کباب
کیا ہی برستی ہے یہاں بیکسی   مئے کدہ اور ایک جہانِ بیکسی
کوئی نہیں میکدہ سنسان ہے   گھر کو چلو ہُو کا یہ میدان ہے
آج یہاں ہوتی ہے کچھ عقل گم   بزم نہ ساقی نہ صراحی نہ خم
ایک اداسی سی فقط چھائی ہے   خیر ہے کچھ فصل خزاں آئی ہے

تنور سینہ میں فراق کا داغ، اور خونابۂ دل دریا یاغ، چہرے پر وحشت کے آثار۔ بشرے سے جنون آشکار۔ سینہ بریاں۔ چشم خونچکان۔ ہائے! کل پیاری حسن آرا نے اپنے نازک دستِ حنائی سے خوشبو دار پان کھلایا، اور آج اس کی یاد نے خون رلایا۔ وہ سپہر آرا کا چاند سا مکھڑا، اور یہ فراق کا دکھڑا، زینت النسا کا ہم پر مرنا، اور عشق کی باتیں کرنا۔ اختری کا رونا، اور ٹھنڈی سانسیں بھر کر سونا، اللہ رکھی کا اصرار اور ہمارا انکار، لطف صحبت

دیرینہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا:

دلبری برواز دلم صبر و قرار کز رخش بر قع بود صبح بہار
چشم جادو یش گہ تسخیر جاں در نگہ سازد و تبسّم راعیاں

راوی : دلبرے ! دلبرے چہ معنی دارد۔ یوں کہو کہ پریوں کے غول کا غول تم پر فریفتہ تھا۔ ڈنگل کا ڈنگل والہ و شیفتہ تھا۔ حسن آرا جادو نگاہ، سپہر آرا غیرت مہر و ماہ، زینت النسا نگار تند خو، اختر النسا آتشیں رو، سب کا دل تمھارے حسن برشتہ کا کباب تھا۔ تمھارا گلِ رخسار چندے آفتاب چندے مہتاب تھا۔

آزاد : دردِ دل کی چمک ستم ڈھاتی ہے۔ وہ نورانی صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے:

کیا حال ہو گیا ہے دل بیقرار کا آزاد ہو کسی کو الٰہی نہ پیار کا

اب سنیے کہ جس طفلِ غنچہ دہن، سیمیں بدن کو میاں آزاد نے تالاب سے نکالا تھا۔ وہ ایک پارسی کا نورِ چشم قرۃ العین تھا۔ راحتِ دل مادر اور باپ کا چین تھا۔ اس کو اس کے والدین نے ناز و نعم سے پالا تھا۔ جب اس کے باپ نے کہ جاہ و دولت سے مالا مال، سبز بخت، مرفہ حال تھا۔ اور اس کا ظلمت کدہ مراد صرف اسی شمعِ سعادت سے منور تھا۔ نہال زندگی اسی ثمر نورس سے بار ور تھا۔ اس نے جو اس در جیحونِ عظمت و سروری اور مہر سپہر حشمت و برتری کے تہ خاک ہونے کا حال تردو مآل سنا تو بے اختیار سر دھننے لگا اور دیوانہ وار تنکے چننے لگا۔ بحر محبت پدری جوش زن ہوا۔ دل صید رنج و محن ہوا:

گریاں شد و تلخ تلخ بگریست بے گریۂ تلخ در جہاں کیست
چنداں زغمش بمہر نالید کز نالۂ او سپہر نالید

اتنے میں ایک شخص نے آن کر کہا کہ گھی کے چراغ جلائیے، اور غربا کو خیرات سے مالا مال فرمائیے۔ صاحبزادے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر ایک شریف زادے نے دھم سے غوطہ لگایا اور ڈوبنے سے بچایا۔ اب رنگ رلیاں مناؤ۔ خوشی کے شادیانے بجاؤ۔ بین کے عوض چین کر د۔ یہ مژدۂ عشرت انگیز اور نوید بہجت خیز سنتے ہی پارسی کے دل کی کلی کھلی گئی۔ مُنھ مانگی مراد مل گئی۔ اس نے اسی وقت فٹن تیار کرائی اور تالاب کی ہوا کھائی۔ لڑکا باپ سے چمٹ گیا۔ باپ بیٹے سے لپٹ گیا۔ اب پارسی کو فکر ہوئی کہ میاں آزاد کو کہیں سے پائیں۔ گدا ہو تو امیر کبیر بنائیں۔ تلاش کرتے کرتے انھوں نے ڈھونڈھ ہی نکالا۔ لوگوں نے پتہ بتایا

کہ میرزا اسد بیگ صاحب کے دولت خانہ، فیض کاشانہ پر۔ مولانا محمد آزاد صاحب فروکش ہیں۔ پارسی کے دل سے لگی تھی کہ کسی طرح اس احسان عظیم سے سبکدوش ہوں۔ فوراً خدام باادب کو پتے پر بھیجا۔

میاں آزاد یہاں بیٹھے ہوئے آہ سرد بھرتے، اور لڑکھڑا کر قدم دھرتے تھے۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو آدمیوں نے ان کو جھک کر سلام کیا اور کہا کہ رستم جی جمشید جی۔ سی ایس آئی، نے آپ کو بلایا ہے، اور فرمایا ہے کہ اگر فرصت نہ ہو تو میں خود حاضر ہوں۔

میاں آزاد حیران و ششدر کہ۔ ع۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

آزاد : یہ کون بزرگوار ہیں؟

آدمی : حضور جن کے لڑکے کو آپ نے ڈوبتے سے بچایا۔

آزاد اندر گئے تو باچھیں کھل گئیں۔

بیگم : اخّاہ۔ اس وقت تو مزاج زعفران زار ہے۔ کیا پڑا پایا؟

آزاد : جس لڑکے کو ہم نے بچایا تھا اس کے باپ نے بلایا ہے۔

بیگم صاحب سے یہ کہہ کر میاں آزاد باہر آئے اور آدمیوں سے خوش ہو کر کہا کہ ہم کل شب کو آئیں گے۔ اس وقت تھکے ماندے ہیں۔ ہرگز نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔

دوسرے دن ادھر آفتاب لب بام ہوا اور دن قریب اختتام ہوا۔ ادھر میاں آزاد نے صاف ستھرے کپڑے ڈانٹے اور ڈکرٹی پر سوار ہو کر چلے۔ میاں خوجی کوچ بکس پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ادھر یہ گاڑی بھی کھڑکھڑاتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اُدھر سامنے سے ایک بگھی بڑی تیزی کے ساتھ آتی تھی۔ دونوں لڑ گئیں۔ اس زور سے ٹکرائیں کہ میاں خوجی نے کوچ بکس پر سے زمین پر پٹخنی کھائی۔ اب گرے تو اٹھنا معلوم۔ جس قطع سے گرے تھے اسی قطع سے پڑے رہے۔ ادھر بازاری تماشائی کا ارد گرد ہجوم۔ غل غپاڑے کی دھوم۔ مگر حضرت لڑھکے سو لڑھکے گویا اپنے نزدیک فرش گل پر سوتے تھے۔ اتنے میں میاں آزاد اتر آئے، اور خواجہ بدیع صاحب کو زبردستی اٹھا لائے تو آپ نے ہنکارنا شروع کیا۔

خوجی : یہاں اتنے بڑے غدار شہر میں کوئی بگھی وگھی چلانا تو جانتا نہیں۔ ہم پہلے ہی سمجھے کہ اب ٹکرائی۔ ماتھا ٹھنکا کہ اب ٹھوکر کھائی۔ اور اب کھائی، مگر قربان اپنے استاد کے واللہ اس پھرتی سے کودا ہوں کہ واہ جی واہ۔ میاں آزاد ہوتے تو اس وقت دم

بارہ سیر ہلدی تھوپنی پڑتی، مگرِ واہ رے میں۔

راوی : کیا زبان ہے۔ پینک میں تو حضرت غین تھے وہ تو کہیے کہ۔ ع۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت،، ورنہ گھوڑا ٹاپ رکھ دیتا تو کچومر ہی ہو جاتے اور جو کہیں پہیے کے نیچے آتے تو حواس بے پوچھے ہی غائب غلّہ ہو جاتے۔ مگر بیٹھے ہنکارتے ہیں، اور غل مچا مچا کے پکارتے ہیں کہ قربان جاؤں اپنے استاد کے دھم سے کود ہی تو پڑا۔

میاں آزاد اس رئیس باوقار، اور تاجر ذی الاقتدار کے دولت خانہ، فیض کاشانہ پہنچے تو عش عش کرنے لگے۔ اور پھونک پھونک کر قدم دھرنے لگے۔ مکان مشک جناں۔ کوٹھی سپر تواماں رئیس فرخ نہاد والانزاد نے۔ ع۔ کی تا درِ خانہ پیشوائی،،

میاں آزاد نے دیکھا کہ رئیس آن بان کے آدمی ہیں:

رئیس ذی ہمم فخرِ زمانہ — بہ شکلِ مہر عالم میں یگانہ

مسیحا کی طرح عالی مکان ہے — زمین فیض قدم سے آسماں ہے

یہ عالم جوشِ طوفانِ کرم کا — سدا زر داس کے آگے سُنھ درم کا

میاں آزاد سے مصافحہ و معانقہ اور حضارِ دربار ڈربار سے علیک سلیک صاحب سلامت ہوئی۔ چوطرفہ سے آزاد کی تعریفیں ہونے لگیں۔ مگر آزاد سر جھکائے ہوئے خاموش۔

رئیس : (ٹوٹی پھوٹی اردو میں) آپ نے اپنے لڑکے کو ڈوبنے سے بچایا۔

راوی : مطلب یہ کہ آپ نے میرے لڑکے کو ڈوبنے سے بچایا۔ مگر میرے کے عوض اپنا کہہ گئے اس پر خوجی ہنس پڑے اور بے تکے تو تھے ہی کہتے کیا ہیں۔

خوجی : واہ ری قسمت کیا مفت میں لڑکا پایا۔ لو بھئی اب تو چین کرو۔

آزاد : (رئیس سے) بھلا اس وقت مجھ سے دیکھا جاتا کہ ایک بے چارے بے گناہ لڑکے کی جان جائے اور میں بیٹھا دیکھا کروں۔

خوجی : حق ہے واللہ حق ہے۔ ہم ایسے شیروں کے تم ایسے ہی شیر ہوتے ہیں۔ اور یہ دیکھو واللہ ہے جو میں ہوتا تو غڑاپ سے میں بھی تو کود ہی تو پڑتا، مگر یار اب دعا مانگنا پڑی کہ یہ موٹی توند والا بھی کسی دن غوطہ کھائے۔ اس کا بھی پاؤں پھسل جائے تو پھر یاروں کے گھرے ہیں۔ لو بارہ ہماری پانچوں گھی میں اور بواز عفران کا سر کڑھائی میں۔ اور داروغہ کا دھڑ ادھر ادھر۔ یہ ڈوبیں خدا کرے بچائیں ہم ہی۔

راوی : بجا۔ ضرور۔ پانی کا نام لیتے ہوئے تو آپ کا بدن کانپ جاتا ہے عضو عضو تھرّاتا ہے اور خم ودم یہ کہ ڈوبتے کو نکالیں، اور کس کو پھنسے کو، واللہ آپ کے ڈنڈ مل دے۔

آزاد : آپ کی زیارت سے بڑی خوشی ہوئی۔

رئیس : اپنے کو بھی بڑا کھوسی (خوشی) کا بات چیت۔

خوجی : (آہستہ سے) کیا؟ کھوسی کا بات چیت ہیں تو عجب جھایا سا معلوم ہوتا ہے۔

رئیس : کال آپ آویں تو ہمارا لیڈی لوگ آپ کو گانا سنائیں۔

خوجی : اچھی بے وقت کی شہنائی بجائی۔ اجی کچھ افیم گھولو چسکی لگاؤ مٹھائی منگواؤ رئیس کی دُم بنے ہو۔

آزاد : کل میں ضرور حاضر ہوں گا۔

رئیس : آپ تو اپنا کا باپ ہے۔

خوجی : بلکہ دادا۔ خوب پہچانا واہ پٹھے۔

آزاد : (خوجی سے) خاموش ادب کن کہ مقام ادب ست۔

خوجی : کچھ سُنا تم کو تمھارے باپ کا باپ بنایا۔

آزاد : (رئیس سے) کل کس وقت حاضر ہوں۔

رئیس : شام کو کال بہت لیڈی لوگ جمع ہوگا اور آپ کو کھوس (خوش) کرے گا۔

خوجی : لیڈی لوگ! ہائے واللہ لیڈی لوگ کی ایک ہی کہی۔

الغرض آزاد اور خوجی رخصت ہوئے تو رئیس کے ایک بھائی نے آزاد سے چپکے سے کہا کہ آپ کی نذر کے لیے ہزار روپیہ تجویز ہوا گیا ہے۔ کل بڑی دھوم سے کل پارسی جنٹلمین، اور لیڈیوں کی دعوت ہوگی اور آپ کو سب خوش کریں گے۔

خوجی بُرے پھنسے

نور کے تڑکے میاں آزاد فرخ نہاد اور جناب وحشت مآب خواجہ بدیع صاحب خانہ برباد اور حضرت میرزا اسد بیگ صاحب بادلِ شاد ایک فراخ و وسیع باغیچۂ دلکش و پر بہار رو کشِ گلزار فرخار میں گپیں اڑاتے تھے۔ اور نسیم مشکبار کے جھونکے دماغ کو طبلۂ عطار بناتے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کم سن جھرُوکے پر سے لہرا لہرا کر گاتی ہے :

مے گلرنگ سے جھلکی جو سرخی پان کی اس میں گلوئے یار پر عالم ہوا شیشے کی گردن کا

آزاد اس کی خوش الحانی اور بہار جوانی دیکھ کر از بس محظوظ ہوئے اور گردن ہلا کر فرمانے لگے۔ کہ بھئی سچ کہنا کیا شعر ہے۔ شعر تو ایک طرف اس نغمۂ جانفزا نے واللہ تڑپا ہی دیا۔

سردمی طرب من زندگی بخش دلم باشد تدارد فرق ہر گز بارگ جانم نوگ سازش

خوجی: پھر آپ کو کیا۔ آپ یہ باتیں کیا جانیں بھلا۔ آپ تو انھیں کی گفتگو کے لائق ہیں جن " بلغ العلا بکمالہ، کشف الدجا بجمالہ، حسنت جمیع خصالہ، صلوا علیہ وآلہ۔ بس بلغ العلا سے گفتگو کرنے کے قابل حضور ہیں۔ لفاظی اور جادو طرازی آپ کیا جانیں بھلا۔ لاحول ولا:

چہ خوش گفت ست سعدی درزلیخا الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

محمد عبد القدوس یا مولانا اسطوخودوس آئیں تو آپ باتیں بنائیں واللہ اس دن تو آپ نے پشتو میں خوب بھیک مانگی تھی۔ واللہ مجھے حیرت ہے کہ مولانا صاحب گھر میں کس طرح گفتگو کرتے ہوں گے۔ یا شاید وہ بھی فارسی کی شرح تجرید پڑھی ہوں۔ واللہ بڑی دل لگی ہوتی ہوگی۔ ادھر سے یہ پنسیری لغت لڑھکاتے ہوں گے، ادھر سے وہ تین تین من کے پتھر ڈھلکاتی ہوں گی۔ میاں کہتے ہوں گے کہ تقبیلِ زوجہ ثواب وصواب ہے۔ وہ فرماتی ہوں گی کہ ثواب غب زوالِ آفتاب ہے۔ مگر عذاب قبلِ طلوعِ ماہتاب ہے۔ لونڈیاں باندیاں منھ تاکتی ہوں گی کہ دونوں کی ضد لینی چاہیے چلیے ایک دفعہ مولانا با لعلم والفضل اولانا حضرت قاضی محمد عبد القدوس انار اللہ برہانہ سے تو ملیں۔

میرزا: اس دن تو آپ نے ان کو بہروپیا بنایا تھا۔ پینک سے چونکتے ہی کہنے لگے کہ بھلا بے بھلا میں نے بخوبی پہچان لیا۔ آج مولانا بن کر آئے ہیں کل گھسیارا بنا تھا۔ ہات تیرے بہروپیے کی۔

آزاد: واللہ اس وقت ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ بیٹھنا اجیرن ہوگیا۔ قاضی القضات نورانی طلعت، مقدس آدمی آپ ان کو ڈپٹ رہے ہیں کہ گھسیارا ہے۔ واللہ اپنے دل میں بڑا برا مانا ہوگا۔

میرزا صاحب: نہ صاحب میں نے جھک کر کان میں کہہ دیا تھا کہ خلل دماغ ہے۔ اجی ایک دن بڑی دل لگی ہوئی۔ مولانا محمد عبد الطاہر صاحب محدث کسی میرے سے کم علم آدمی سے گفتگو کرتے تھے۔ اور کبھی موقع پر کسی کا ذکر آیا۔ آپ فحش الفاظ زبان سے نکالا نہ چاہئیں۔

کبھی فرمایا بنت الابلیس۔ وہ خاک سمجھا۔ پھر فرمایا اُمّ الصّبیان وہ منھ تاکتے لگا۔ پھر فرمایا نسواں سواد الوجہ فی الدنیا، وسو۔ فی القلب فی العقبیٰ۔ اس نے کہا ذرا ٹھہرے رہیے گا، لپک کر مولوی کو بلا لاؤں۔ آخر کار ایک شخص نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ مولانا صاحب کا یہ منشا ہے تو جھلّا کر کیا کہتا ہے کہ لاحول ولا قوۃ۔ ذرا سی بات کے لیے پہروں جھنجھٹ میں رکھا۔

آزاد : جی ہاں ایک دفعہ کسی شخص نے ایک مولانا صاحب سے آکر کہا کہ قبلہ میرے گھوڑوں کے لیے اپنے اصطبل سے گھانس دلوا دیجیے۔ فرمایا کہ (ہمارے متین میں اس قدر تمین بھی نہیں ہے کہ عصا فیر اپنے مناقیر میں اخذ کر کے اپنا مقفص بنا دیں۔ وہ آدمی تھا گنوار۔ بلکہ گنوار کا لٹھ۔ سمجھا کہ مولانا اس وقت وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا کہ گھانس دلوا دیجیے۔ تو آپ نے چیں بجبیں ہو کر فرمایا کہ تکرارِ کلام داب اُولوالالباب سے نہیں ہے۔ دست بستہ عرض کیا کہ قبلہ میں کچھ سمجھا ہی نہیں تو حضرت کیا فرماتے ہیں کہ تم سمجھو یا نہ سمجھو یہ عاصی اسی کیف سے متکیّف ہے۔ ایک ٹھٹھول نے اس سے کہہ دیا کہ ابے بھاگ جا، یہ اس وقت تاڑی پیے بیٹھے ہیں۔ کئی آدمیوں کو مار چکے ہیں، وہ بگٹٹ بھاگا اور دل میں سوچا کہ اچھے سے گھانس مانگی یہ تو خود گھانس کھا گئے ہیں۔

اتنے میں ایک شخص نے آکر میاں آزاد کو جھک کر سلام کیا اور رقعہ دیا۔ میاں آزاد نے کھولا اور پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا:

منہل فضائل منبع فواضل ذی الطبع الوقّاد مولانا محمد آزاد صاحب۔ دام برکاتکم۔ بعد مالیق لشانکم منّی التماس می رود کہ آج غبّ مساقبل عشا ایک مجلس اللفاد وکملائے بلدۂ بمبئی منعقد ہوگی اور حسبِ دستور اہلِ فرنگ کہ اصحاب فرہنگ ہیں۔ ایک (اسپاچ) آپ کی خدمت میں روبروئے جملہ حضار والا تبار دیا جائے گا۔ رَجا آپ وقت متعینہ پر تشریف ارزانی فرما کر کلبۂ احزان کو منور فرمائیں۔ کہ ہر آئینہ مراسم اتحاد و یکجہتی میں جادارد۔ اکثر فضلائے اجل و علمائے اکمل مشتاقِ زیارت بہجت افزا ہیں۔ ان کو محروم نہ فرمایئے۔ زیادہ الطناب کہ دور از داب آداب ست۔

محرّرۂ عاصی قاضی محمد عبدالقدّوس عفا اللہ عنہ

لفافہ۔ یا جامع المتفرقین۔ صراغب نامہ۔ درکمورہ بمبئی بھنڈی بازار۔ بنظرِ فیض اثر حضرت مولانا محمد آزاد صاحب سلّمہٗ اللہ تعالیٰ درآید۔ اسم برخاتمہ میاں آزاد نے یہ خط پڑھ کر

میرزا صاحب کو سنایا اور کہا چلیے گا۔ انھوں نے کہا ضرور بالضرور۔ ہزار کام چھوڑ کر نہ چلنا کیا معنی۔ میاں آزاد نے جواب نامۂ مولانا صاحب۔ لکھا:

نہ کردم جان نثارِ قاصد و شرمندہ ام زومی — کہ در اول سخن بیہوش کرد از شوق پیغام او

حضرت مولانا صاحب کی خدمت میں تسلیم۔ قبلہ میں تو مردِ آزاد وحشت کا عاشق و دلدادہ، کوچہ گردوں اور رہ نوردوں کا استاد۔ خانہ بدوش برباد ہوں۔ مگر ہمدردوں کا ادب آموز، حبیب وطن اور دلسوز ہوں علماء کملا کی جماعت میں میری زبان نہ کھلے گی۔ لیکن الامر فوق الادب بندہ بسر و چشم حاضر جلسہ ہمایوں ہوگا۔ اللہ اللہ میری خاکساری نے میرا درجہ اس قدر بلند کر دیا کہ علماء اجل میری ملاقات کو زیارت کملائے ملکوتی صفات سمجھنے لگے۔ سچ ہے:

ہر کہ شد خاک نشین برگ و بری پیدا کرد — دانہ با خاک چو پیوست سری پیدا کرد

حباب کو دیکھیے! سرکشی کی اور لہروں نے تھپیڑوں سے فنا کر دیا۔ غبار پر نظر ڈالیے اس کی خاکساری نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچایا حق ہے:

زراہ خاکساری کر کسی برخاک بنشیند — چو خورشید جہاں افروز بر افلاک بنشیند

اضعف العباد محمد آزاد

جب چار بجے تو میرزا صاحب نے کہا کہ حضرت لیس ہو رہیے۔ آزاد نے کہا کہ قبلہ غضب مساقبل عشا بلایا ہے۔ خیر۔ ادھر خورشید گیتی افروز نے پردۂ مشکین میں اپنی نورانی صورت چھپائی، اور لیلی شب لاکھوں پری چہم سہیلیوں کو جلو میں لے کر آئی۔ ادھر مولانا محمد آزاد فرخ نہاد نے ترکی ٹوپی سر پر جمائی، اور کوٹ پتلون ڈاٹ کر لیس ہوئے۔ میرزا صاحب بھی کپڑے وپڑے پہن کر ڈٹ گئے۔ مگر خوجی ابھی سنگار ہی کر رہے ہیں۔ آئینہ سامنے رکھا ہے۔ ٹوپی دی اور چھینک پڑی۔ الغرض چلے تو کس قطع سے کہ گلابی پگڑی سر پر اور ایک ڈھیلی چکن پرانی فشن کی در بر، عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں لیے۔ چست گھٹنا پہنے اور ایک بڑا موٹا ڈنڈا لیے۔

راہ میں کہیں میاں خوجی کو استنجے کی ضرورت ہوئی اور ایک گلی میں جا کر بیٹھے۔ اتفاقِ وقت اور شامتِ اعمال ادھر سے ایک کانسٹبل بھی چلا آتا تھا۔ جاگو۔ جاگو۔ رات کے سونے والو جاگو۔ اندھیری ہے۔ خوجی کو جو اس نے دیکھا تو پہلے جھجکا پھر للکارا۔

کانسٹبل: کو ہے رے۔ ارے تیں کون ہنس؟ (یعنی کون ہے۔ ارے تو ہے کون؟)

خوجی: ہوں۔ ہوں۔ ہونھ۔

کانسٹبل : ارے یہ تو منھ ہی سے ناہیں بولت ہے (یہ تو منھ ہی سے نہیں بولتا)
خوجی : واللہ استنجے کے پیے بول کا لفظ اچھا ذو معنی ہے (کھڑے ہوکر) ابے ہم شاشیدن کا صیغہ گردان رہے ہیں اور تو ڈپٹتا ہے۔
کانسٹبل بیسواڑے کا گنوار۔ گردانے کا لفظ جو اس نے سنا تو سمجھا کہ یہ کہتا ہے کہ گردنی دوں گا چھتری آدمی۔ بس آگ ہی تو ہوگیا۔ جیسے جلتے بلتے توے پر پانی چھڑک دیا۔ بڑھ کر ان کا ٹیٹوا لیا، اور ایک پٹخنی بتائی۔ پھر کس کر ایک لات جو جماتا ہے تو خواجہ بدیع صاحب نے لڑھکنی کھائی۔ اور ایک دفعہ ہی غل مچایا کہ ہات ترے گیدی کی۔ لانا تو قرابینچہ۔ ٹھہر میں نکالتا ہوں قرولی۔ مردک نے وہ جھٹکا دیا کہ پیٹ کا پانی تک ہل گیا۔ اس نے اوپر سے ایک ردل جمایا دن سے۔ کرولی لاوت ہیں سرو۔ نکال کرولی۔ نکال (ایک اور لات جمائی)
خوجی : اوگیدی۔ میں پہچان گیا۔ او بہروپیے۔ ذرا مجھے کمر تو کس لینے دے۔ آج سپاہی بن کر آیا۔ اس دن مولوی صاحب بنے تھے۔
کانسٹبل۔ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل چوکی پر۔ راہ میں اپنا یاران کوٹ اور کمبل اور بکری کے لیے گھانس اور بلی کے لیے چھیچھڑے سب ان پر لادے جناب خواجہ بدیع صاحب کی روح پر صدمہ۔ مگر خیر سے سمجھے ابھی تک بہروپیا ہی ہیں۔ چوکی پر لے جا کر اس نے کہا:
کانسٹبل : حولدار صاحب۔ بجور یو سار چور تین دن سے محلے میں ہلا مچائے ہے۔ نھتنن پران کر دہس۔ آج سنار کے سو ہارے گٹی مارے بیٹھا گلی تاکت رہے کہ کہوں گلی پر پہنچوں جائے۔ یعنی حضور یہ سالہ چور تین دن سے محلے میں شور مچاتے ہیں ناک میں دم کر دیا ہے۔ آج سنار کے دروازہ پر گتی مار کے بٹھا گلی تاک رہا تھا تو میں بھی جا پہنچا۔
حولدار : (خوجی سے) ابے تو کون ہے۔
خوجی : (پینک میں)
کانسٹبل : (چپت جماکر) بولت ناہیں ہے (بولتا نہیں ہے) سسرا۔ ایک اور زناٹے کا ہاتھ دیا۔
خوجی : (چونک کر) ہات ترے بہروپیے کی۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔
حوالدار : کہو کہاں سیند دینے کی فکر تھی۔ کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہے یا الگ ہی الگ یہ تنہا خوری اچھی نہیں۔

خوجی : (چونک کر) ایں! ایں گلِ دیگر شگفت۔ آزاد۔ آزاد!

کانسٹبل : جادوا ونا ہیں۔ حوالدار صاحب کی بات کا جواب دے۔ (رول لگاکر) تین دن سے نہتھس پران کرو ہیں۔ پار سال یو سالا (یہ سالا) کلوار کے گھر پیٹھا را ہیے اب کی سنار کا تاکس۔ یعنی پچھلے سال یہ سالا ذسار کلوار کے گھر گھسا تھا۔ اب کی سنار کو تاکا۔

حولدار : ہاں آجکل اس کے ہاں مال بھی بننے کو آیا ہے۔

خوجی : یار اک ذری حقہ تو بھروانا۔ لاؤ توڈانٹ کے ایک توا۔

کانسٹبل : (کان پکڑ کے) مسکھری (تمسخر) کرت ہے۔

خوجی : (اچھل کر) لاناقرولی۔ آنتیں نکل پڑیں گیدی کی۔ یہ کہہ کر خوجی جو جھپٹے کہ بھاگ جاؤں تو ٹانگیں تو ماشاء اللہ پون پون انچ کی تھیں ہی۔ کانسٹبل نے گردن ناپی خوجی ذرا اور جھپٹے کہ اتنے میں ایک حوض کے اندر دونوں کے دونوں غڑاپ۔ خوجی افیمی آدمی۔ سردی کا وقت نشے خوب گٹھے ہوئے سر در جے ہوئے۔ پانی کے نام سے روح لرز جاتی تھی۔ حوض میں جو لڑھکے تو بس ستم ہی ہوگیا۔ لیکن۔ ع۔ خود تو ڈوبیں گے مگر یار کو لے ڈوبیں گے،، کانسٹبل بہت ہی جھلایا کر بے طور لڑھکے۔ اردی وردی سب لت پت۔

خوجی کی موزونی طبع

ادھر خواجہ بدیع صاحب نے حوض میں لڑھکنی کھائی اُدھر کفن پھاڑ کر یوں ہانک لگائی۔

دکھا ساقی مے گل رنگ کے ناز | سنا پھر قلقلِ مینا کی آواز
بہ شکل خون دل ٹپکا دہن میں | کہ ابلیں مستیاں میرے سخن میں
خدا کے واسطے لے جاگ ساقی | کہ خاطر کو ہوئی پھر لاگ ساقی
طبیعت صورتِ مے جوش میں ہے | تمنا عزم نوشا نوش میں ہے
ہجوم آرزو کہتا ہے لا جام | جھکا شیشہ کہ آیا اور ہنگام
ابھی بھر دے کہ خاطر ہے بہت تنگ | دکھاؤں اور ساقی اک نیا رنگ
وفور جوش میں مضمون رقم ہو | فسانہ اِس طرح زیبِ قلم ہو
پلا ساقیا مالوے کی افیم | کہ کر آؤں گل گشتِ باغِ نعیم
پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا | جھلک آبِ اسود کی جھٹ پٹ دکھا

نرالا ہے محفل کا کچھ آج رنگ
نہ کیوں زندگی سے طبیعت ہو تنگ

نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ
نہ چانڈو نہ افیون نہ گانجا نہ بھنگ

کرم کر فقیروں پہ مائی ڈھیر
میں قربان جاؤں ذرا کم ہیر

ادائیں تری یاد کرتا ہوں میں
دم نزع ہے سانس بھرتا ہوں میں

جلالے دم واپسیں اے کریم
سرہانے پہ کہہ قم باذنِ الافیم

خراب سیہ مست و ترو امنم
بدہ ۔ اُد بیم ۔ اُو بیم ۔ او بیم

یہاں خوفِ دوزخ ہے نے خوف مُل
بتادے مجھے او بیم کا ٹھل

نہ تاخیر کر ساقی مشک رنگ
پلا جامِ افیون ابھی بید رنگ

دم پینک و غلش بے رنج و غم
پڑھوں یہ کلام فصیح عجم

کرشما ترحم بحال سقیم
کہ ہستم اسیر کمند افیم

نگہدار ما را ز راہ خطا
خطا در گذار و افیم نما

نداریم غیر از تو فریاد رس
بدہ جام افیون و باقی ہوس

زباں تا بود در دہاں جا گزیں
سرائیم توصیفِ افیونِ چین

توفئی کا فریدی زیک شاخ پوست
ہزاران چو من مرد افیون دوست

سن اے ساقی لا اُبالی ذری
نکل جائے گی سن سے اب جان مری

جو آوے مرے منھ میں افیون تاب
تو کم ہو ذرا جوششِ اضطراب

نکل جاؤں پینک میں اک آدھ میل
غضب ہے یہ حوض اور ستم ہے سبیل

پھروں خوب بازار میں بے دھڑک
وہ ٹھنڈی ہوائیں وہ ٹھنڈی سڑک

چکاؤں کہیں جا کے قند و شکر
کسی جا پہ کھا جاؤں حلوائے تر

کہے مجھ سے کنجڑن خدا کی قسم
کتارا نہ دینے کے ڈبل سے کم

کسی جا پہ چھلکے کہیں پیالیاں
کسی جا پہ پونڈا کہیں پھاندیاں

کنوں بشنوا اے ساقی تو بیا
نہیں آدمیت ہے تجھ میں ذرا

آدمی را آدمیت لازم ست
عود را گر بو نہ باشد آں بلا شک ہیزم ست

تواضع مروت محبت وفا
نہیں چھو گئی تجھ میں گیدی ذرا

یہ سچ مچ ہے قول فصیح عجم

ا ۔ غت بود ۔ ط

تواضع کند ہر کہ ہست آدمی — نہ زیبد بمر دم بجز مردمی
سخاوت مس غیب راکیمیاست — سخاوت ہمہ درد ہارا دواست
سخیاں زافیوں بر می خورند — بخیلاں نبات و شکر می خورند
خدا کی قسم شکر کر شکر کر — قر دلی سے خالی ہے میری کمر
قرابنیچہ پاس ہوتا اگر — تو کچ کر کے میں بھونک دیتا بتر
خدا کے لیے لا مری جانِ جان — افیم سیہ رو کشِ زعفران
کدھر ہے تو آزادِ فرخ نہاد — پدر بر پدر پاک و عالی نژاد
گرا کر مجھے حوض میں چل دیا — وہ گیدی وہ مردود بھر دیا
جو پینک میں ہوتا نہ میں بے خبر — تو بھٹے کی صورت اڑا دیتا سر
اسی میں ہے بس خیر اے بدسگال — مجھے حوض سے آن کر لے نکال

بدیعا بس اب روک اپنی زبان
دمِ صبح ہوتا ہے پینک کا دھیان

راوی ۱ے ساقی نامہ کا رنگ ہی نرالا ہے۔ ابتدا ہی سے مالوے کی افیم کا بول بالا ہے۔

۲ے (کرکر) عین فصاحت ہے۔ انگریزی میں اس ضعف کا نام ٹلٹریشن ہے۔ خوجی کا شاعری میں بھی چشم بد دور، نرالا فشن ہے۔

۳ے بھنگ بھری نہ ہوئی نہ سہی۔ مت بھنگ تو ہے۔

۴ے پشتو میں بھیک مانگنے لگے۔

۵ے اس قم باذن الافیم نے پھڑکا دیا۔ واہ استاد۔

۶ے ادیم کی تکرار عین کمالِ شاعری ہے۔ اللھم زِد فزِد۔

۷ے ادچھاجی۔ یہ نیا ہوٹل ایجاد کیا۔

۸ے شاباش اچھا حاشیہ چڑھایا۔

۹ے نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کو بھی لگے ہاتھوں اصلاح دے ہی دی۔

۱۰ے اوفوہ۔ بڑا دھاوا کیا بھئی۔ آدھ میل! کچھ ٹھکانا ہے۔ ہاں رینگتے رینگتے پہنچ ہی جاؤ گے۔

۱۱ے اس شہر میں بیانی کے صدقے۔ حلوائے تر کے لیے کھاجا بھی کس موقع پر لائے عذوبتِ بیان ظاہر ہے۔

۱۲ لانا ہاتھ۔ تصویر کھینچ دی۔ ایسے موقع پر میرا شیر چوکتا ہی نہیں۔

۱۳ بمبئی کے پونڈے دور دور تک مشہور ہیں۔

۱۴ ایں! ابھی تک تو ساقی کی خوشامدیں ہوتی تھیں۔ اب تو لگے گالیاں دینے۔

۱۵ کیا خوب۔ بحر بھی ایک ہی ہے۔ واللہ مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن گئے۔

۱۶ یہ بات وہ بات۔ لا میرے ہاتھ۔ قند اور نبات۔ بس دوسری بات نہیں۔

۱۷ یاد آئی یاد آئی۔ میاں خوجی کو قرولی یاد آئی۔

۱۸ اس بے تکے پن پر قربان۔ قرابنیچہ پاس ہوتا تو بتر بھونک دیتا اور جو اس کے پاس پھاوڑا ہوتا تو وہ کدال نہ جھونک دیتا۔

۱۹ بھلا اس شعر کا مطلب تو کوئی صاحب سمجھائیں۔ کیا مجال۔ زعفران بواز عفران حبشن سے عبارت ہے جس نے میاں کے دھوکے میں خوجی کا سر سہلایا تھا، اور خوب دل کھول کر چیتیایا تھا۔ چونکہ وہ حبشن کالی کوئیلا تھی لہٰذا فرماتے ہیں کہ ایسی افیم دے جو اس سے بھی کالی ہو۔

۲۰ ہاں اب اپنی اصلیت پر آئے۔ کرے کوئی دھرا شعلیجی والا ہی جائے گا۔ ابھی تک حضرت یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ بہر دپیے ہی کے ہتھکنڈے ہیں۔

۲۱ جی منھ دھو رکھیے۔ اور اسی حوض کے پانی سے۔

۲۲ دم صبح: اچھا اندھیر مچایا۔ صبح کیسی۔ اجی خواجہ صاحب ابھی تو رات بھی نہیں بھیگی ہے۔

الغرض بعد خرابی بصرہ حوض سے نکلے۔ نیا شہر پردیس کا واسطہ راہ پوچھتے پوچھتے مکان پر پہنچے اور پڑ رہے۔ دوسرے روز ادھر مہر گیتی افروز نے جلباب خفا میں رخ انور چھپایا اور عروس عدن نے اپنے حسن گلو سوز کا جھمکڑا دکھایا ادھر میاں آزاد اور میرزا صاحب والا نژاد اس پارسی کے یہاں گئے۔

بزم طرب

ترے صدقے یہ می کیسی تھی ساقی اثر تک بھی نہیں آنکھوں میں باقی
نگاہ مہربانی اور ساقی کہ پھر اپنا وہی ہے طور ساقی
شراب پاک دے تا جی ٹھہر جائے طبیعت کیف پیہم سے ابھر جائے

طبیعت چاہتی ہے جوش مستی　　تمنا ہے کہ ہو بادہ پرستی
فسانے کا بیان آئے زباں پر　　سخن دے لذتِ قندِ مکرر

دونوں اس رئیس کے دولت خانۂ فیض کاشانہ پر پہنچے۔ دیکھا کہ ہر سمت چکا چوند کا عالم ہے۔ اور محفلِ عیش منزل رشکِ گلزار ارم ہے۔ اندر کا اکھاڑا ہے۔ پریوں کا دنگل ہے۔ ہر طرف وہ چہل پہل وہ دھوم۔ وہ حوروں کا ہجوم۔ وہ پری پیکروں کے جمگھٹے، وہ معشوقوں کے جھمکڑے، کوئی سیمن بر، کوئی رشکِ قمر، کوئی ماہ سیما، کوئی رنگین ادا، کوئی غیرت ماہ، کوئی جادو نگاہ، کوئی اٹکھیلیاں کرتی آتی ہیں، کوئی نازو ادا سے قدم دھرتی جاتی ہے، کوئی ابر کی طرح جھومتی ہے، کوئی فرطِ جوش مستی سے اپنی ہجولی کو چومتی ہے، وہ دھانی پوشاکیں، وہ آبی ساریاں، وہ گلابی لباس، وہ بنارسی دھوتیاں، سرخ لباس سے گل لالہ کھلا ہوا۔ یاقوتِ احمر دیکھے تو ہیرا کھائے۔ سبز سبز قیمتی کپڑوں کے جوبن سے پکھراج شرمائے۔ جو ہے ایک نئی ترنگ میں، اور نئے ہی رنگ میں:

ہے لطف حسینوں کی دو رنگی کا امانت
دو چار گلابی ہوں تو دو چار بسنتی

اتنے میں رئیسِ جم جاہ نے اپنی دُختِ شکرلب، سیم غبغب، غیرتِ لعبتانِ چینی، گیسوئے عذار نازنینی، طاؤس زیب، ملائک نظر فریب، یغماگر کاروانِ ہوش۔ غمزہ زن عشوہ فروش موجدِ رسمِ دلربائی، طرازِ آستینِ خود نمائی۔ تدرو رفتارِ باغ و بہار:

سرتا قدمش کرشمہ و ناز　　ہم سرکش عشق و ہم سر انداز
افگندہ بدوش زلف چوں شست　　او بے خبر و نظارہ گر مست
معجونِ لبش بدر فشانی　　پروردہ بہ آبِ زندگانی

کی میاں آزاد سے ملاقات کرائی۔ وہ چاند سا مکھڑا دیکھتے ہی مہ پارہ و مہ جبیں، برہم زن خانمان پر ہمارے رنگیلے جوان کی طبیعت آئی، جل جلالہٗ

کمانِ عشق ہر جا افگند تیر　　سپر داری نباشد کار تدبیر

اور وہ آفت ہوش بصد جوش و خروش ان سے باتیں کرنے لگیں۔ واہ رے آزاد۔ واللہ بلاتشبیہ اپنے وقت کے راجا اندر تھے۔ منظورِ نظر حسینانِ زریں کمر، ادھر شوق جادۂ عشق اُدھر پیمانۂ دل لبریز بادۂ عشق۔ ادھر وردیدہ نگاہ نظارہ بازی، ادھر چشم بیمار

کو تعلیم فسوں پردازی، ادھر خیال سجادہ نشینی فرہاد و مجنوں، ادھر جوشش قلزم جنون، ادھر آہ جگر دوز ادھر شوق خرد سوز، ادھر نقد عقل نثار جمال نگار، ادھر تیر نگاہ غلط انداز جگر کے پار، اس بت پندار، شوخ و طرحدار کی طبع نازک تردد آشیانہ تھی، انیلے پن نے اور بھی ستم ڈھایا مگر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ اتفاق سے وہاں گوالیار کے چند قوال باربد نژاد، بھی گئے تھے۔ رئیس ذی حشم نے ان کو بلوایا اور محفل عیش منزل کو رشک جشن جمشید بنایا:

جب تک کہ نہ دل کی بے کلی جائے　　اودائرے والے گت چلی جائے

قوال نے لحن داؤدی میں وہ غزل چھیڑی کہ محفل بھر مست ہوگئی:

کس ندارد چو تو گلبانگ اسیری بلبل　　زندہ گشتم ز سرود تو بخیری بلبل
نغمہ اَت آب حیات ست جوانی آرد　　خضر خود سو چو رسد موسم پیری بلبل
سرخ شد گوشِ گل از زمزمۂ رنگینت　　نشدی سبز باین تازہ صفیری بلبل
باغبان در چمن از بہر فریب آمدہ است　　گرد ہر گل بتو زنہار نگیری بلبل
بے زبانانِ چمن زمزمہ در دل دراز　　منگر جانب ایشاں بحقیری بلبل

بسر گل کہ بخوان در چمن بزم سخن
غزل چند ز طغرا بہ نظیری بلبل

بسنت کی رت میں بھونرا کلیوں کا رس چوس چوس کر اتنا مست نہ ہوتا ہوگا جتنی وہ دلبر حور وش مست ہوگئی۔ اس غزل کی نے اور قوال کی معجز بیانی، اور خوش الحانی، اور سامعین کی واہ واہ، اور حاضرین کی سبحان اللہ، نے محفل عشرت منزل میں وہ رنگ اثر جمایا کہ چھوٹے بڑے سب کو ایک قسم کا حال آیا۔ کسی کی آنکھوں سے جوئے اشک جاری۔ کسی کا دل صید بیقراری لٹا دیا، تڑپا دیا۔ پھڑکا دیا۔ ہر فرد بشر مصروف آہ و فغاں تھا اور یہی شعر ورد زباں تھا:

بیا ساقی امشب بہ میخانہ ہیں　　چراغاں و مینا و پیمانہ ہیں
سپہر یست ایں کاخ فرخندہ پے　　براد جش مرتب ز خمہای مے
بود بادہ خورشید ایں آسماں　　قدحہای نورانیش اختراں
چہ بادہ صفا بخشِ صحن چمن　　طراوت فروزاں ایاغ سمن
مغنی بیا سیر میخانہ کن　　شراب سرودی بہ پیمانہ کن
شد از فیض میخانہ صحرا و شہر　　مقام نشاط طرب ہائے دہر

بُتِ پندار : آپ کا مکان کس سرزمین میں ہے :

آزاد : در تیرہ زمین ہند دلگیر شدم
دز غصۂ این خاک سیہ پیر شدم
شاید بکفم گل جوانی آید   در فصل بہار سوئے کشمیر شدم

بُتِ پندار : (خوش ہو کر)

چہ کشمیر انتخابِ ہفت کشور   قسم خوردہ بخاکش آبِ کوثر
فضائے نشۂ مستی ہوائش   زمینِ کا سما نہا خاک پایش
بنائے کعبۂ دلہا ز خاکش   عروجِ نشۂ معنی ز تاکش
غبارش آب در رنگِ چہرہ گل   گیا ہش دلربائے زلف سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ   رخ خوباں بہ پیشش خط کشیدہ
نجاکش سایۂ پر ہائے بلبل   جوابِ یک چمن خندیدن گل
زلالش بادہ سازِ مستی عشق   نسیمش روح بخش ہستی عشق
تباتش چوں زروے مہر جوشند   شکر گویند گوہرے فروشند
بنور جلوۂ خورشید طالع   یہ تیغ غمزۂ برہانِ قاطع

وہی کشمیر نہ ؟

آزاد : وہی۔

بُتِ پندار : آپ کی شادی ہو گئی ہے ؟

آزاد : نہ مگر ایک سمن برسے وعدہ ہو گیا ہے۔

بُتِ پندار : وعدہ مصمم ہوا ہے نہ۔

آزاد : (آہ سرد بھر کر) ہاں۔

بُتِ پندار : میں بھی کشمیری الاصل ہوں نظیر بیگم میرا نام ہے :

بہار دیدہ نگاہِ دیار کشمیر ست   دو چشم چار بیک چشمہ سار کشمیر ست

جس وقت میاں آزاد نے بیان کیا کہ ایک سمن برسے وعدہ نکاح ہو گیا۔ بس اسی دم سے اس بتِ پندار نے اختلاط کی باتیں کم کر دیں۔ مگر میاں آزاد کے دل پر ان سب بتانِ سیم اندام، اور اصنام گلفام کی پاکبازی، اور حیا پروری کا نقش جم گیا۔ الغرض اُدھر :

محفل میں گدگداتی تھی شوخی نگاہ کی
شیشوں سے آرہی تھی صدا قاہ قاہ کی

اس رئیس جم جاہ کیوان بارگاہ نے میاں آزاد کو روپیہ دینا مناسب نہ جانا مگر دل میں یہ ٹھانی کہ اس دخت سمن پر حور پیکر کے ساتھ آزاد کا بیاہ ہو جائے تو عید ہے۔ لیکن جب سنا کہ اس کا دل اسیر کمند طرۂ زلف حسن آرا ہے تو آہ سرد بھر کر دم بخود ہو گیا جب وہاں سے رخصت ہوئے تو اس زہرہ تمثال مشتری خصال، نے بصد حسرت کہا کہ پھر کبھی ملیے گا۔ اور یہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ دروازے تک رخصت کرنے نہ گئی:

درو داعش گو نہ رفتم احتیاج عذر نیست
دوست می داند کہ استقبالِ ہجراں مشکل است

آزاد : کیوں کچھ دیکھا؟

میرزا : دیکھا تو سب کچھ مگر سنا کم۔ چپکے چپکے باتیں ہوں تو بھلا کوئی کیا خاک سنے۔ یہ کان کچھ گدھ کی آنکھیں تو ہیں نہیں۔

آزاد : پیار محبت کی باتیں ہوتی تھیں مگر تہذیب کے ساتھ۔ قدم قدم پر ناموس و ننگ کا خیال تھا، جب سنا کہ شادی نہیں ہوئی۔ مگر ایک پری پیکر پر دل آیا ہے۔ بس اسی وقت سے اس گرماگرمی کو سرد مہری سے بدل دیا۔ گو لطف وہی رہا مگر جھجک کے ساتھ۔ اللہ ری پاکبازی سبحان اللہ۔ دیکھو کس درجہ اس کو عصمت اور عفت کا خیال ہے:

زن نیک و خوش سیرت و پارسا
کند مرد درویش را بادشا

میرزا : اس میں کیا شک ہے۔ اگر ہم اس طرف رہتے ہوتے تو ہرگز آپ کو اندر نہ آنے دیتے، لیکن یہاں اس کا اصلا خیال نہیں اور بھئی ہے بھی ایک بھونڈی بات، پردہ دل کا۔ دگرہا ہیچ۔ ع۔ ”نگاہ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں“، خیر۔ گھر پہنچے تو خوجی نے اپنی سرگذشت سنائی مگر نمک مرچ لگا کر داستان کو چٹپٹا کر دیا۔

خوجی : حضرت اب کی میاں بہروپیے کانسٹبل بن کر آئے تھے۔ جاگو جاگو یہاں پچھلے پہر تو البتہ ذرا آنکھ لگ جاتی ہے، باقی رات بھر نیند ہی نہیں آتی ہے۔ خیر ہم سے اس سے چت پٹ کی ٹھہری۔ مگر داؤں پیچ ہوتے ہوتے میں نے ایک پھنکی بتائی تو حوض میں غڑاپ لگا غوطے کھانے، مگر میں اپنے زعم میں خود بھی آرہا، تو دو سو شعر موزوں کیے۔ ایک سے ایک بڑھ کر:

پلا ساقیا مالوے کی افیم کہ ہے شوقِ گل گشتِ باغِ نعیم

میرزا : (قہقہہ لگا کر) خدا کی قسم۔ اس ساقی کا رنگ ہی نرالا ہے۔

آزاد اور میرزا صاحب اشعارِ آبدار حضرت بدیع سن کر اچھل اچھل پڑے اور جب خواجہ صاحب نے فرمایا کہ :

آدمی را آدمیت لازم ست عود را گر بو نباشد آن بلاشک ہیزم ست

تو بڑی ہنسی آئی کہ۔ ع۔ ایک مصرعے کی بڑھ گئی ہے دم :

خوجی : کہئے پھر آپ علما کے جلسے میں بھی نازل ہوئے تھے یا اپنا سا منھ لے کر چلے آئے۔

آزاد : جی ہاں گئے کیوں نہیں تھے۔ قاضی محمد عبد القدوس صاحب کی اسپیچ لیجیے ملاحظہ فرمائیے۔

خوجی : اسپیچ کیوں۔ اسپاچ کہیے، یہی تو قاضی صاحب نے لکھا تھا۔

میرزا : تو حضرت وہ کوئی انگریزی داں تو ہیں نہیں۔ ع۔ بی خواں ہیں۔ انگریزی الفاظ کی صحت سے ان کو کیا واسطہ۔

آزاد : لیجیے اسپیچ یا اسپاچ ملاحظہ فرمائیے۔ میں پڑھتا ہوں ذری غور سے سنیے گا۔ (جیب سے نکال کر)

اسپاچ مولانا قاضی محمد عبد القدّوس صاحب مدّ ظلہ العالی

الحمد للّٰہ الّذی سوائُ الطریق وجعل لنا التّوفیق خیر رفیق والصلواۃ علیٰ خیر الانبیاء الّذی اُہرق و مالا لجاہدین والاعداء، واقام نبیہ الشریعہ السہلۃ۔ امّا بعد بر سالکانِ مسالک حمیّت دار ضاے باری و مشیّد ان امکانِ اسلام و دینداری مختفی و محتجب نہ رہے کہ ابتدائے ابداعِ عالم اور بدو فطرتِ دنیا سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ جب کسی فیّاض با خدا نے نشرِ امورِ خیر اور قلعِ امورِ بد کا قصد کیا۔ ایک شریر ناخدا ترس اس کی طرف سے مقابل ایسا ظاہر ہوا کہ جس کی ہمہ تن یہی کوشش رہی کہ اس شخصِ متبرک کی سعی جمیل کو رایگاں اور ضائع اور اپنے خیالات واہیہ اور امورِ شر کو مشتہر اور شایع کیجیے۔ جس قدر وہ بندۂ مقبول روز و شب اس بات کا داعی رہا کہ خلائقِ خدا کو وادی ضلالت سے نکال کر شاہراہِ ہدایت میں لاؤں۔ اس قدر یہ شخص مطر رو اس امر کا ساعی رہا کہ بندگانِ الٰہی کو ورطۂ جہالت و گمراہی سے باہر نہ نکلنے دوں۔

چنانچہ حضرت آدم کے مقابل میں شیطانِ لعین اور جناب ہابیل کے مقابل میں قابیل، اور جناب ابراہیمؑ کے مقابل میں نمرود مردود اور حضرت موسیٰ کے مقابل میں فرعون ملعون، اور جناب رسالت مآب کے مقابل میں ابو جہل متمرد قریش تھے مگر یہ امر قابل غور اور لائق امعان ہے کہ ہر چند بدوں اور شریروں نے نیکوں اور پاکوں کی محنت کو رایگاں کرنا چاہا۔ الاّ نیکوں نے ہدایت میں اصلا کوتاہی نہ کی اور راہ راست سے باز نہ آئے۔ کما لایخفیٰ علی الفطن اللبیب۔ روز و شب انواع و اقسام کے صدمات و رنج و الم اپنے نفوس پاک پر برداشت کیے۔ لیکن جس طرح ممکن ہوتا تھا اپنے دلی مقصود یعنی اشاعت امور خیر کو بہ احسن طریق انجام دیتے رہے۔ اس امر کے انجام دینے میں مصائب ان پر پیش آئے مگر ان کے اقدام برکت التیام کو متزلزل نہ کر سکے۔ اس مرحلۂ عظیم کے طے کرنے میں جو کارزار ان کو درپیش ہوا بہ نہایت استقلال و غائتِ صبر بلا ملال کے طے کر دیا اور اپنے کام کے اتمام کرنے میں خواہ اپنا ہلاک نفس ہو یا اہراق دم اعدا ہوا اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دیکھو مشیّدان ارکان شریعتِ اسلام کو کہ کس طرح انھوں نے اپنے اوپر مشقتیں جھیلیں اور اپنے کام کو انجام دیا۔ اہل و عیال کو چھوڑا وطن سے مُنھ موڑا، غربت و مسافرت کو آرام و راحت پر ترجیح دی۔ حجاز و جبال نیستان و ریگستاں میں گھومے۔ ممالک غیر میں مثل اجنبی گئے۔ سر نذر کر دیا۔ یہ سب مشقتیں راہِ خدا میں ان کو گوارا تھیں۔ جب یہ حال تھا تو خداوند عالم نے بھی مدد کی۔ یہاں تک کہ یہ اسلام جو اوائل میں مضمحل تھا، روم میں، شام میں، عجم میں، تاتار میں، افغانستان میں، ہندوستان میں، الغرض تمام عالم میں مشہور ہوا۔ اس کے شمس شہرت کی ضو نے ربع مسکوں کو منور کر دیا۔ بالفعل فئۂ روسیہ شنّت شملہم کے تنور سینہ میں نائرہ حسد و بغض اس قدر ملتہب و مشتعل ہے کہ آمادہ و مہیا اس امر پر ہوئے کہ اس دین مبین کی تخریب کیجیے۔ حتیٰ کہ بانواع حیل و دغا خلیفۂ وقت پر انھوں نے خروج کیا۔ لہٰذا ہر عبد مسلم کو سزاوار و انسب و احسن ہے کہ سُیوف خوش غلاف، و خارا شگاف کو نیام ظفر التیام سے نکال کر تنبیہ اعدائے دین میں سعی مشکور اور کوشش موفور کرے۔ یہی موقع اذخار مثوباتِ اخرویۂ انام اور اعانتِ اسلام کا ہے۔ ورنہ۔ ع۔ عروج بر فلکِ سروری بد شوار یست،، کلام ہدایت فرجام، جناب ختمی مآب علیہ السلام کا بھی یہی ماحصل ہے۔ اول تو ہر عبدِ مسلم پر فرض ہے کہ حضرت ملا جلال الدین محقق حقائق کمال و منطقۃ البروج بلند خیال کے کلام ہدایت التیام پر نظر ڈالے۔ رجعنا من الجہاد

الاصغرالی الجہاد الاکبر۔ یعنی باز گشتیم از غزائے کوچک، بغزائے بزرگ۔ گفتند کہ غزائے بزرگ کدام ست۔ فرمود کہ جہاد بانفس خود کہ اعدای عدوک نفسک التی بین جنبیک۔ واگر بافراط غضب روا رت کیفیت نیز منضم شود بحیوانات عجم تشبیہ نمودہ یا بہائم وجمادات چوں ظروف وآلات وامتعہ ہمین طریقہ پیش گیرد وتقرب بابہائم وقتل امثال کبوتر وگربہ تشفی جوید اگر قطِ قلم ملائم طبع او نیاید، باقتل بر حسب استعجال او نکشاید، آنرا بشکند ودیوانہ صفت بدشتام نافرجام برآید۔ غایت رذالت باشد۔ چنانچہ از بعضے ملوک سابق کہ بہ تہوّر منسوب بودہ منقول ست کہ چوں کشتی اُو از سفر دریا دیر تر رسیدی، بر دریا خشم گرفتی، دور یارا بریختن آب وانباشتن بو بہا تہدید نمودی و حکیم ابوعلی[1] مسکویہ از بعضے سفہا نقل کردہ کہ بسبب آنکہ چوں شب درماہتاب خفتی، رنجور گشتی بر ماہتاب خشم گرفتی و بر و شتام او اقدام نمودی، واو را ہجوم ہائے او ماہ را مشہور ست۔ والحق بدین شیوہ بگلاب تشبیہ چیست۔

اے سامعین بلند مکان وحاضرین والاشان یہ وقت اعانت اسلام ہے۔ تاکہ حضرت خاقانی، خلیفۃ الرحمانی قدر قدرت، سلطان المعظم عمراللہ ملکہ الی یوم النشور کے اعدائے روسیہ سے غزاے بزرگ میں شریک ہوکر اپنے نفس پاک کی سچائی کا ثبوت کامل دیں اور عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں۔ بس بمو یقضوائے حدیث الدال علی الخیر کفاعلہٖ، حضرت مولانا محمد آزاد صاحب نے عزم بالجزم کیا ہے کہ روم جائیں اور تشیّد بنائے دولت علیہ کے لیے اہل روم کا ہاتھ بٹائیں۔ جناب باری ہر مسلمان مسلّم ایمان کو توفیقِ خیر عطا کرے۔ آمین!

سامعین : (باآواز بلند) آمین! آمین! آمین!

خوجی : افسوس ہے کہ ہم وہاں نہ تھے۔

میرزا : خوب ہوا کہ آپ نہ تھے، ورنہ آپ اس آمین کی آواز پر چونک پڑتے، اور اوگیدی کی ہانک لگاتے۔ کبھی قرولی چمکاتے، کبھی قرابینچہ نکالتے، کسی کو بہرو پیا بناتے، کسی کو آنکھیں دکھاتے، آپ کہیں لے جانے کے قابل تھوڑا ہی ہیں۔

آزاد : اسپاچ توسن لیجیے! آپ تو بات کاٹے دیتے ہیں۔

---

[1] حکیم ابوعلی الخازن احمد بن محمد معروف بہ ابن مسکویہ۔ مشہور طبیب عالم اور مورخ تھا۔ ایران کے دیلمی خاندان کے بادشاہ عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۴۲۱ھ میں وفات پائی۔

خوجی : ابھی اسپاچ ختم ہی نہیں ہوا۔ اسپاچ یا اسپاچ کا جد امجد، یا اسپیچوں کی خالہ اچھا صاحب فرمائیے۔

بقیہ اسپیچ مولانا محمد عبدالقدوس صاحب

اور ازانجا کہ ہماری سرکار ابد قرار کہ عبارت ہے سرکار انگلشیہ سے۔ سلطنت رفیعہ عثمانیہ کی دوست ہے اور اہل اسلام کی بہی خواہ اور جنگ قرمیہ میں بھی ممد و معاون رہی ہے۔ پس اور بھی موقع ہمدردی ہر آئنہ حاصل ہے۔ یہ امر باعث خوشنودی حکام و موجب رضا مندی گورنمنٹ والا مقام متصوّر ہے۔

خوجی : ذری ٹھہر جائیے گا۔ یہ قرمیہ کیا معنی۔

آزاد : جنگ کریمیہ سے مراد ہے۔ کریمیہ میں بڑی جنگ ہوئی تھی نہ؟

میرزا : کیا خوب کریمیہ کی خرابی قرمیہ۔ بلی ماروں کا محلہ دہلی ہے اس کو بعض حضرات محلہ گربہ کشاں لکھتے ہیں۔ اور آگرے میں ایک محلہ ہے گڑ کی منڈی اس کو منڈوی قندِ سیاہ کہتے ہیں۔ اور کالے سنگھ سپاہی کو ایک عربی خواں نے اسدُ الاسود لکھا تھا اور بھنڈی بازار کو ایک مولانا صاحب نے سوق البھنڈی بنایا۔ لاحول ولا قوۃ۔

آزاد : باقی ماندہ بھی لگے ہاتھوں سن لیجیے۔

خوجی : اللہ اللہ ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔ معاذ اللہ بھئی مولانا آزاد صاحب واللہ یہی لطف خاک بھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ گل نہ بلبل بادہ نہ گل۔ صراحی نہ قلقل۔ افیم کی پیالیاں ہوں پینک ہو، متوالیاں ہوں، پونڈے پر چاقو تیز ہو، نشے سے رستخیز ہو، سر د جمن ہو، نشے گھٹیں۔ چہل پہل ہو، قہقہے ہوں، چہچہے ہوں، کہنے لگے صاحب الدّالِ علی الخیر۔ اور خدا جانے کیا حضرت ہم نہ سنیں گے۔ تضیع اوقات۔

میاں آزاد اور میرزا صاحب اور خوجی گھر پہنچے۔

بیگم : اوخہ۔ اوخہ۔ آج تو دماغ ہی نہیں ملتے۔ دونوں کے دماغ عرش پر ہیں۔ پارسی کے یہاں کیا پایا۔ کیا دیکھا جو باچھیں کھلی جاتی ہیں۔

میرزا : (ہنس کر آزاد سے) کہہ دوں۔ جو کہیں حسن آرا حسن پائیں تو غضب ہی ہو جائے۔

آزاد : سبحان اللہ آپ کو چٹے پٹے لڑانا تو خوب آتا ہے۔ واللہ مانتا ہوں استاد (بیگم سے) آپ کے سر کی قسم جو اس کی کچھ بھی اصلیت ہو۔ یہ ناحق ٹھائیں ٹھائیں کرتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے۔

بیگم : (تنک کر) جی ہاں درست ہے۔ کچھ ہے نہیں تو آپ شرمائے کیوں جاتے ہیں۔ یہ دیکھیے، یہ باتیں اچھی نہیں۔

آزاد : خدا گواہ ہے کہ.....

بیگم : اے تو قسمیں کاہے کے واسطے کھاتے ہو۔

آزاد : کسی طرح آپ کو یقین بھی آئے۔

بیگم : جی بجا۔ قسموں سے کوئی اور یقین کرتے ہوں گے۔ کسی ایلی گوارن کو دم دیجیے گا۔ آخر یہ بات تھی کیا۔ پارسنیں ہوتی تو قبول صورت ہیں وہ جو سبحان علی خان کشمیری تاجر کی لڑکی کو انھوں نے اپنی لڑکی بنایا ہے۔ اسی کو دیکھا ہوگا۔ خیر مرزا صاحب نے جب دیکھا کہ بیوی تیکھی ہوئیں تو بگڑی ہوئی بات بنائی۔

خوجی کی حماقت

ذرا خواجہ بدیع صاحب کی قطع مبارک دیکھیے گا۔ واللہ اس وقت تو فوٹوگراف اتارنے کے قابل ہیں۔ نہ ہوا فوٹوگرافر۔ افسوس! صبح کا وقت ہے۔ حضرت خوجی کھاردے کی ایک لنگی باندھے ہوئے کھٹیا پیپل کے درخت کے سایہ میں بچھائے اونگھ رہے ہیں۔ مگر گڑگڑی بھی ایک ہاتھ سے تھامے ہیں۔ چاہے پئیں نہ مگر چلم پر کوئلے دہکتے ہیں۔ سر زمین دوز ہے، گویا اپنے حساب سجدہ کر رہے ہیں :

زخاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

اتفاقِ وقت چیل نے درخت پر سے بیٹ کر دی۔ چونکے اور چونکتے ہی آگ ہوگئے۔ بہت ہی اچھلے کودے، پھاندے، اور اتنا غل مچایا کہ محلہ بھر سر پر اٹھایا۔

خوجی : ہات ترے گیدی کی، مردک کے ہمیں بھی کوئی وہ سمجھ لیا ہے۔ درخت کی پھننگی پر نظر کر کے چیل کی طرف مخاطب ہوئے، اور بیٹے آج چیل بن کر آیا ہے۔ قرولی تو وہاں تک اثر نہ کرے گی۔ نہ ہوئی پھر کلا اس وقت توڑے دار بندوق ہوتی تو وہ تاک کے نشانہ لگاتا کہ یاد ہی کرتا مردود۔

آزاد : یہ کس پر گرم ہو رہے ہو خواجہ صاحب۔

خوجی : اور اوپر سے پوچھتے ہو کس پر گرم ہو رہے ہو۔ گرم کس پر ہوں گے۔ اسی بہردپیے پر

یہ وہی جو مولانا عبدالقدوس بن کر آئے تھے، وہی جو بیوی بن کر ہم کو جھپ سے نے بھاگے تھے، وہی جو سپاہی بن کر بزاز کی دکان پر بیٹھا آئے تھے۔

میرزا : پھر اب کچھ تدارک تو کیجیے۔

خوجی : تدارک کیا خاک کروں۔ میں تحت الثریٰ میں وہ فلک الافلاک پر۔ کہتا تو ہوں کہ توڑے دار بندوق منگوا دیجیے، تو پھر دیکھیے کیسا نشانہ لگاتا ہوں تاک کر۔ مگر آپ کو کیا پڑی ہے۔ جائے گی تو بدیع بیچارے کے ماتھے ہی۔

میرزا : ہم بتائیں، زینہ منگوائیں، اور آپ پیڑ پر چڑھ جائیں، آخر گیدی بھاگ کر جائے گا کہاں۔

خوجی : (اچھل کر) لانا ہاتھ۔

آزاد : خوب سوجھی۔

میرزا صاحب نے آدمی سے کہا کہ بڑا زینہ اندر سے لے آؤ، مگر جلد لانا، ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہو۔

خوجی : ہاں میاں اسی سال آنا، میرا یار دیکھو ایسا نہ ہو کہ گیدی بھاگ نکلے۔

آدمی : (دروازے کے پاس سے) زیبن! زیبن! زیبن!

زیبن : کچھ کہو گے بھی۔ یا زیبن ہی زیبن رٹتے جاؤ گے پہاڑی کی طرح سے۔

آدمی : تو کوئی پکارے تو بولنا قسم ہے، مگر تنکنا کوئی اس سے سیکھ لے۔ پردہ کرا دو میاں، ذری سیڑھی مانگتے ہیں۔

بیگم : یہ سیڑھی کیا ہو گی؟

آدمی : حضور وہی جو سڑان ہیں، خفقان، وہی میاں ان پر کہیں چیل نے بیٹ کر دی۔ بس اب جھک باندھنا شروع کی کہ بہر دپیے کا کام ہے۔ سو اب سیڑھی لگا کر پیڑ پر چڑھیں گے ذری پردہ کرا دیجیے۔

بیگم ہنسوڑ عورت، اور کم سن، خوب کھل کھلائیں، اور فوراً مہتابی پر داخل۔ واہ ری کم سنی واللہ شباب اور الھڑپن کا کچھ رنگ ہی اور ہے۔ امنگ ہی اور ہے۔ اب بیگم صاحب کھلی جاتی ہیں، اور زیبن کو للکار رہی ہیں۔ اس سے کہو جلدی سیڑھی لے جائے۔ مہتابی پر کھڑی سیر دیکھنے کی مشتاق ہیں۔ آبی دوپٹہ کھسکا جاتا ہے۔ اللہ رے چلبلے پن، جوڑا کھلا پڑتا ہے۔ ٹاٹ بانی اوگی پاؤں سے نکلی پڑتی ہے۔ پازیب کی چھما چھم نے شور محشر بپا کیا ہے۔ اللہ اللہ آج تو مہتابی پر دن دہاڑے

چاند نے مکھڑا دکھایا:

چرخ نیلی ہے بہت اپنی شفق پر نازاں   لب بام ان کے تو بھی کھلک... یا دکھلا

مارے ہنسی اور جوش اشتیاق کے گورے گورے گال تمتمانے لگے۔ اتنے میں زینہ لے کر خدمتگار جا پہنچا۔ میاں خوجی نے کمر کسی افیم کی ڈبیا پھر کھٹ پر رکھی مگر پھر سوچ کر یہ لوگ ہیں دل لگی باز۔ کہیں دل لگی دل لگی میں ڈبیا اڑا دیں تو اپنا کام ہی تمام ہو جائے۔ پھر جیب میں رکھ لی اور کانپتے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔ قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ جب آخری زینے پر پہنچ کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھے تو چیل کی طرف رخ کر کے کہا کہ گانس لیا گانس لیا، پھانس لیا، پھانس لیا، ہت ترے گیدی کی، لے میں بھی کلے پر آن پہنچا۔ اب جاتا کہاں ہے۔ لے بچہ آج ہی تو پھنسے ہو، روز جھانسے دے دے کر اڑنچھو ہو جایا کرتے تھے۔ ہونھ! کیا ہم کو نرم چارہ سمجھے تھے۔ اب سوچو تو جاؤ گے کدھر سے۔ لے اب آئیے بس اب چوٹ کے سامنے۔ میں نے پھر قرولی تیز کر رکھی ہے۔ اتنے میں پیچھے پھر کر جو دیکھتے ہیں تو زینہ غائب۔ یا جل جلالہٗ لگے سر پیٹنے۔ اِدھر چیل پھر سے اُڑ گئی۔ یہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ بیگم صاحب نے جو یہ کیفیت دیکھی تو کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ایسی خوش ہوئیں کہ زور زور تالیاں بجانے لگیں۔

خوجی : یہ میرزا کہاں گئے ذری چار آنکھیں تو کیجیے ہم سے، آخر ہم کو آسمان پر چڑھا کر غائب غلہ کہاں ہو گئے۔ تدبیر بتاتے ہی نہیں۔ بڑے وہ بن کے آئے تھے۔ وہاں سے۔ ارے یارو کوئی سانس ڈکار ہی نہیں لیتا (غل مچا کر) ارے میاں آزاد! میرزا صاحب! اے زیبن۔ ارے کوئی ہے۔ یا سب مر گئے۔ خدا سمجھے ان ملعونوں سے، اب آخر ہم کب تک یہاں ٹنگے رہیں۔ ارے یارو کچھ خوف خدا بھی ہے۔ واہ بہروپیے کے دھوکے میں اچھا ہم کو الّو بنا دیا۔ کہ چیل کو بہروپیا کر کے دکھایا۔ آخر یہ سب کے سب بہرے ہو گئے۔ ارے میاں آزاد، اجی میرزا جی کوئی بولتا ہی نہیں۔ بی زیبن!

بیگم : (مہتابی پر سے قہقہہ لگا کر) اللہ کرے پینگ آئے۔

خوجی : (چونک کر) یہ کون بولا (مہتابی کو دیکھ کر) واہ حضور آپ کو تو ایسی بد دعا دینی چاہیے

بیگم اور میاں خوجی کی چار آنکھیں ہوئیں جو، تو اس دلبر سیم تن، گل رخ، غنچہ دہن نے ایسی زغند بھری کہ تڑ سے راوٹی کے اوٹ میں ہو رہی، مگر پائینچے اٹھائے، بدن کو چرائے ہوئے کہ نامحرم کی نظر نہ پڑے۔

اب خوجی کی سنیے کہ حضرت نے شعر خوانی شروع کر دی۔

دیدم امروز پری چہرہ نگاری عجبی
گل عذاری عجبی بود و بہاری عجبی

کافرے غارت گر ایمانِ من
دلبر من جانِ من جانانِ من

آفت دین دشمنِ زہد وورع
بازغا کالشمس من مائی طلع

یک قبائے تنگ در بر زرفشاں
چکمہ در پاؤ خودش دامن کشاں

کاکل مشکینش او در پیچ و تاب
نرگسِ شہلاش مست نیم خواب

زلف را گفتہ سمن سائی کند
قتلِ عامی از خود آرائی کند

عشوہ ہارا دلبری آموختہ
چشم را جادوگری آموختہ

میاں آزاد سوچے کہ خوجی افیمی آدمی، ایسا نہ ہو پاؤں ڈگمگا جائے، یا پینک آئے تو مفت کا خون ہماری گردن پر ہو۔ بس اب دل لگی ہو چکی۔ اور وہ سمجھ گئے کہ یاروں کا فقرہ ہی فقرہ تھا۔ بھرے دے کے ہم کو پیڑ پر بھیجا۔ چیل کو بہروپیا بنا دیا، اور ہمیں اُلو۔ اِدھر ہم کو پیڑ کی دُھن سمائی اُدھر حضرات نے سیڑھی کھسکائی۔ اب جائیں تو کہاں، جہنم میں۔ میرزا صاحب نے آدمی کو حکم دیا کہ زینہ لگاؤ۔ بیگم نے جو سنا تو ہزاروں قسمیں دیں مہتابی پر سے اور انتہا کی بے قرار ہوئیں۔ پھر آپ جانیے شباب اور شوخی اس پر طرہ۔

بیگم : ہماری ہی بھتی کھائے، جو زینہ لگائے۔ ہمیں کو ہے ہے کرے، جو خوجی کو اتارے۔ اللہ کرے آندھی آئے اور ٹہنی پھٹ پڑے۔

میرزا : دیکھو چپ رہو۔ راہ چلتے سب باتیں سنتے ہیں۔ تم مہتابی پر، ہم یہاں۔ یہ غل مچانے کا کون موقع ہے بھلا۔

بیگم : اللہ کرے زلزلہ آئے، درخت جڑ سے ہل جائے!

خوجی : جی اور کیا۔ یہاں ہڈیاں چور ہو جائیں۔ گرتے ہی عدم کی راہ لیں۔ آپ کی ایک ادنیٰ سی ادا ہے۔

بیگم : اس وقت تو پیپل پر کا بھتنا معلوم ہوتا ہے۔

خوجی : میاں آزاد بس یہی باتیں تو بُری معلوم ہوتی ہیں۔

آزاد : گھبراؤ نہیں زینہ لینے گیا ہے۔

خوجی : اجی یہاں جان پر بن آئی ہے۔ آپ کو گھبرانا سوجھتا ہے۔

خیر آدمی زینہ لایا اور خوجی درخت پر سے اترے۔

تھانہ دار کی شرارت

باغچۂ دلکش میں میاں آزاد اور خوجی اور میرزا صاحب چہل قدمی کرنے لگے۔ خواجہ بدیع صاحب جھلا کر بہروپیے کو گالیاں دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی نے آن کر میرزا اسد بیگ کو سلام کیا۔

میرزا : بندگی، آج تو بعد مدت آئے سلاری۔ کہاں رہے اتنے دن تک ؟

سلاری : (ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے)۔

میرزا : کیوں کیوں خیر باشد؟

سلاری : کچھ نہ پوچھیے (روکر) عزت وزت سب خاک میں مل گئی۔

میرزا : افسوس۔ مگر کچھ بتاؤ تو۔

خوجی : افسوس کی ایک ہی کہی، حال سنا ہی نہیں، اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ اچھے اچھے بے تکے یہاں جمع ہیں۔

سلاری : کیا بتاؤں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

خوجی : بس کہہ ڈالو میاں۔ یہاں پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوتے ہیں۔

سلاری : حضور پرسوں میرا داماد، میری لڑکی کو لیے ہوئے اپنے گاؤں جاتا تھا۔ جب تھانے کے قریب پہنچا، تو تھانہ دار صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جاتے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی باگ روک لی، اور بات چیت ہونے لگی۔

تھانہ دار : تم کون ہو ؟

رحیم بخش : (اس کے داماد کا نام تھا۔) میں چھٹی رسا ہوں۔

تھانہ دار : کہاں جاتا ہے ؟

رحیم بخش : اپنے گاؤں۔

تھانہ دار : یہ تیرے ساتھ کون ہے ؟

رحیم بخش : میری عورت۔

تھانہ دار : تم نوکری کرو گے چھ روپیہ مہینا ہم تم کو دیں گے۔

رحیم بخش : حضور میں سات روپیہ پاتا ہوں۔

تھانہ دار : اچھا سات ہی روپیہ دیں گے۔

رحیم بخش : حضور میں نوکری نہ کر دوں گا۔

تھانہ دار : بدمعاش۔ تم غریب آدمی ایسی مہ پارہ کہاں سے پا گیا۔ یہ حسین عورت تمھاری بیوی نہیں ہو تا سکتی۔ سچ بولو یہ کون ہے اور تم اس کو کہاں سے بھگا لائے ہو! بدمعاش؟

رحیم بخش : بدمعاش کوئی اور ہو گا۔ یہ بیشک میری جورو ہے، اب آپ مجھ کو نہ روکیں بس۔

تھانہ دار : (چابک اٹھا کر) سوّر ہم تمھارا چالان کر دیں گے۔ تمھاری ایسی قسمت کہاں کہ یہ جمیلہ تم کو ملے۔ اگر تم ہماری نوکری کر لو تو اچھا، ورنہ ہم ابھی چالان کرتے ہیں۔

رحیم بخش : اچھا اندھیر مچایا۔

تھانہ دار : (عورت سے) تم کون ہو بولو۔

رحیم بخش : تھانہ دار صاحب۔ آپ مجھ سے باتیں کیجیے۔ میری بیوی سے نہ بولیے۔

تھانہ دار : (عورت سے) ہم سے صاف صاف کہہ دو کہ تم اس کی کون ہو؟

کانسٹبل : (عورت سے للکار کر) بتادے بتادے، صوبہ دار صاحب کیا پوچھتے ہیں۔

وہ بے چاری مارے شرم کے گڑی جاتی تھی۔ گردن جھکا کر تھر تھر کانپتی تھی۔ پسینوں میں عرق عرق گو غریب کی جورو تھی، غریب کی لڑکی تھی، مگر حیادار۔ اس وقت اس کا عجب حال تھا اور اپنے دل میں سوچتی تھی کہ اگر زمین میں گڑھا ہو جاتا، تو میں دھنس جاتی۔ کانسٹبل الگ للکار رہا ہے۔ اور تھانہ دار الگ گلے پر سوار۔

تھانہ دار : یہ دونوں بدمعاش ہیں۔

رحیم بخش : میرے ساتھ کسی سپاہی کو میرے گاؤں تک بھیج دیجیے معلوم ہو جائے کہ یہ میری بیاہتا جورو ہے یا نہیں۔

تھانہ دار : چپ بدمعاش، مجھ سے بہت باتیں نہ بنانا۔ میں بدمعاشوں کی آنکھ پہچان جاتا ہوں کہ یہ شخص بڑا مروک ہے۔ تم کہاں کے ایسے خوش قسمت ہو کہ ایسی پری چھم تمھارے ہاتھ آئی۔ یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں۔

کانسٹبل : ہاں صوبہ دار صاحب یہی بات ہے۔

تھانہ دار : (گھوڑے سے اتر کر) الگ الگ ان کا اظہار لیا جائے۔

رحیم بخش : یہ نہ ہونے کا۔ گاؤں کی کسی عورت کو بلوائیے، اور اس سے کہیے پوچھے۔

کانسٹبل : ہوں یہ نہ ہونے کا۔ ایسے بڑے تیس مار خاں بن کر آئے ہیں۔ تھانہ دار عورت کو ایک درخت کے آڑ میں لے گئے اور کانسٹبل رحیم بخش کو تھوڑی دور پر۔ مگر آمنا سامنا تھا تا کہ رحیم بخش کو کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔

تھانہ دار : (عورت سے) آپ کون ہیں بی صاحب ؟

عورت : (گردن جھکا کر) ان کی عورت۔

تھانہ دار : کن کی۔ اسی چٹھی رساں کی ؟

عورت : جی ہاں۔

تھانہ دار : تو ذرا گردن تو اٹھائیے۔ جھگڑا تو دکھائیے۔ بھلا تم اس چرکٹے کے قابل ہو۔ خدا نے چہرہ تو نور سا دیا ہے، لیکن شوہر تو لنگور سا دیا ہے۔ ایک صلاح دیں مانو گی۔

عورت : (رو کر) مجھے وہ لنگور ہی پسند ہے۔

تھانہ دار : ذرا ادھر تو ایک نظر دیکھ لو۔ کیا پری چہرہ ہے۔ خدا کی قسم۔ ایک جھلک ایک ادا، ایک ناز، نے قتل کر ڈالا۔ غارت گر دین و ایمان ہو۔ کہا مانو اس کو چھوڑو اور ہماری بنو۔

عورت : (جھنجھلا کر) خدا کرے میں مر جاؤں۔

تھانہ دار : دشمن دشمن۔ تمھارے دشمن۔ اچھا اس وقت تم کیا چاہتی ہو۔

عورت : موت۔

تھانہ دار : خدا نہ کرے آخر اس قدر خفا کیوں ہو۔ میں تو ادب کے ساتھ دور کھڑا ہوں۔

عورت : ایسے ادب پر پتھر پڑے۔ بس اب مجھے جانے دو۔

تھانہ دار : کیا مجال اب تو ہماری نظر پڑی۔ جانا کیسا، اور آنا کیسا۔

ادھر تھانہ دار صاحب تو یہ اظہار رہے تھے اُدھر کانسٹبل کچھ اور ہی پٹی میاں رحیم بخش کو پڑھا رہے تھے۔

کانسٹبل : بھئی سنو۔ صوبہ دار کے سامنے تو میں ان کی سی کہہ دیا، اور نہ کیسے کہوں، افسر ہیں کہ باتیں۔ پھر افسر بھی کیسے کہ جلاد۔ ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھانے کو مستعد۔ سنیئے ان کی نیت خراب ہے، اور یہ بڑے چھٹے ہوئے گرگے ہیں۔ تمھاری بیوی بڑی خوبصورت ہیں۔ یہ ان پر ریجھے ہوئے ہیں۔ جب ہی تو کہتے تھے کہ نوکری کر لو۔ بڑا بد معاش ہے۔ خدا اس

مردم آزار سے سمجھے۔ ایسا ملعون تو دیکھا ہی نہیں۔ اب تم کسی تدبیر سے اپنی جورو کو لے کر چل دو۔

رحیم بخش : اور کچھ نہیں بس میں سمجھ گیا کہ پھانسی ضرور پاؤں گا سولی پر چڑھایا جاؤں گا۔ اور چاہے جو ہو، لیکن اس تھانہ دار کو قتل کروں گا تب مروں گا۔ اب تو چاہے یہ مجھے جانے دے یا نہ جانے دے میں بے قتل کیے ہوئے نہ رہوں گا۔

کانسٹبل : ہاں پھر حمیت اور مردمی تو اسی میں ہے۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کے کام کرنا چاہیے۔

رحیم بخش : اب آخر بے عزتی میں باقی کیا رہ گیا۔

کانسٹبل : بیشک تمھارے تیور کہے دیتے ہیں کہ تم ہی انھیں ٹھیک بناؤ گے، اور یہ ہے اسی لائق۔

تھانہ دار : سپاہی۔ سپاہی!

کانسٹبل : حضور آیا۔ حکم؟

تھانہ دار : یہ کہتی ہیں کہ یہ شخص بھگا لایا ہے۔

عورت : جس نے کہا ہو اس پر آسمان پھٹ پڑے۔

رحیم بخش : اب آپ کی مرضی کیا ہے۔ جو ہو صاف صاف کہہ دیجیے تو میں معاملہ ہی بھگتا دوں۔

تھانہ دار : ان دونوں کو تھانے پر لے چلو۔

رحیم بخش اور اس کی عورت اور تھانہ دار اور کانسٹبل تھانے پر پہنچے۔ تو وہاں کے سپاہیوں نے آپس میں باتیں کیں کہ صوبہ دار صاحب کو کوئی شکار مل گیا ہے۔ لائیے پھانس کے کسی کو بڑا جھنڈے تلے کا شہدا ہے۔ بھئی افوہ اتنا بڑا لچا تو دیکھا نہ سنا۔ ذرا دیکھیے تو۔ باچھیں تو کھلی جاتی ہیں ریشہ خطمی ہوئے جاتے ہیں۔ چڈا اگل خیر د۔

خیر تھانہ دار صاحب ایک کرسی پر ڈٹ گئے، اور اس عورت سے کہا کہ ہمارے سر کی قسم تم اس سامنے والی کرسی پر بیٹھو۔ اب خیال کیجیے کہ گرہست عورت، کنویں تک پانی بھرنے بھی جائے تو گھونگھٹ کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔ تھانے پر اتنے آدمیوں کے سامنے بے وجہ بے سبب جانا کیسی بے آبروئی کی بات ہے اور جب کسی پاکباز کو معلوم ہو جائے کہ ایک شریف النفس کی نیت میں بدی ہے، تو اس کا کیا حال ہوگا۔ کانسٹبل جھک جھک کر دیکھ رہے تھے، اور وہ بے چاری دم بخود گردن جھکائے ہوئے بت کی طرح کھڑی ہے۔

تھانہ دار : اس بدمعاش کو ہمارے پاس لاؤ۔

رحیم : فرمائیے؟

تھانہ دار : تم دس برس کے لیے بھیجے جاؤ گے، پورے دس برس کے لیے۔

رحیم بخش : جب کوئی جرم ثابت ہو جائے۔

تھانہ دار : ہاں آپ قانون داں بھی ہیں۔ خیر تو اب ہم ضابطہ کی کارروائی کریں۔

رحیم بخش : یہ کُل کارروائی ضابطہ ہی کی تو ہے جو ہو رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر ضابطہ اب اور کیا ہوگا بھلا خیر۔ اس وقت تو آپ کے بس میں ہوں جو چاہے کیجیے، مگر میرا خدا سب دیکھ رہا ہے۔

تھانہ دار : (قریب بلا کر) تم ہمارا کہا کیوں نہیں مان لیتے۔ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ تم نوکری کر لو اور اپنی جورو کو لے کر یہاں ہی رہا کرو۔ اس میں ہرج کیا ہے۔ آخر نوکری پیشہ تو ہو ہی۔

رحیم بخش : آپ سے میں اب بھی عاجزی سے پیش آتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ آپ اس خیال خام سے درگذریے، ورنہ بات بڑھ جائے گی اور آپ کی جان پر بن آئے گی۔ بس اب ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے۔

اتنے میں کسی نے آن کر پیچھے سے رحیم بخش کی مشکیں کس لیں اور کمبل ڈال کر لے چلے اُدھر تھانہ دار صاحب نے کانسٹبل کو اشارہ کیا اور وہ اس مہ پارہ کو لے کر چلا۔ اب رات کا وقت ہے کوئی دس بج گئے ہیں۔ ایک کمرے میں تھانہ دار اس پری وش کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے ایک ٹھوکر دی اور جھپٹ کر اس تیزی سے بھاگی کہ تھانہ دار کے ہوش و حواش رفو چکر ہوئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کانسٹبل بھی منھ ہی دیکھتے رہے۔ انھوں نے عمداً چشم پوشی کی کہ بھاگ جائے تو اچھا اب غور کیجیے کہ کم سن عورت زیور پہنے ہوئے۔ پردیس کا واسطہ۔ راہ سے ناواقف۔ اندھیری رات۔ میاں گم۔ ساتھی غائب۔ تھانہ دار عاشق۔ کانسٹبل چور۔ سوچی کہ یا الٰہی جاؤں تو کدھر جاؤں، اور کروں تو کیا کروں، عجب مصیبت میں جان ہے۔ اگر بوڑھی کھوسٹ ہوتی تو خیر جہاں چاہتی چلی جاتی۔ بیدھڑک گھوما کرتی، مگر جوانی کا عالم، اور پری چھم، ستم پرستم۔ جس کی پناہ لے وہی دغا دے۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کبھی میاں کی مصیبت پر آٹھ آٹھ آنسو روتی کبھی حالت زار پر کف افسوس ملتی۔ خدا ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے۔ خیر افتاں وخیزاں ٹھوکریں کھاتی زیور کو بچور، اور چہرے کو شہ زور سے چھپاتی گلیوں گلیوں جاتی تھی۔ ایک مقام پر تلنگے نے جو پاؤں کی آہٹ پائی تو ایک ڈانٹ بتائی۔ کون؟ کون؟ کون جاتا ہے چھپا ہوا۔ اف کیا بُرا وقت ہے۔ الاماں۔ اب

فرمائیے وہ ناکردہ کار، کم سن گل عذار، اس شب تیرہ و تار میں چوکیدار کو کیا جواب دے۔ بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ ہاتھ پاؤں سرد، رنگ زرد، چوکیدار نے پھر للکارا۔ مگر صدائے برنخاست۔ تب تو اس کا ماتھا ٹھنکا کہ بھئی دال میں کالا کالا ہے، چور ہے کوئی۔ قریب آن کر پوچھا کہ کون ہو۔ اس شکر لب، سیم غبغب نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ میں ایک عورت ہوں۔ راستہ بھول گئی ادھر نکل آئی۔ اندھیری رات راہ اچھی طرح نظر نہ آئی۔ کانسٹبل نے پوچھا کہ کہاں جاؤ گی۔ ارے غضب اب فرمائیے کیا بتائے۔ کسی محلے کو کیا جانے۔ گڑگڑانے لگی۔ وہ کہتا ہے ہونھ۔ ہم سے فقرہ بازی راہ بھول گئی۔ چل تھانہ پر۔ اف ستم ستم۔ تھانے کا نام سنتے ہی روح فنا ہوئی کہ جہاں سے بچ کر نکل آئی اب پھر وہیں کا اس نے نام لیا۔ کانسٹبل نے کہا اب سوچتی کیا ہے چل یا کچھ دے۔ یہ کان میں کیا پہنے ہے؟ کرن پھول ہے۔ بس یہی نکالدو۔ اس وقت کرن پھول عزت کے مقابل میں۔ اس کو پیارا نہ تھا۔ جھپ سے کرن پھول کان سے نکالا، وہ اُسے حوالے کیا۔ الٹے پاؤں اس گلی سے بھاگی۔ تو چلتے چلتے ایک مقام پر کیا دیکھتی ہے کہ ایک مرد درخت کے پاس کھڑا کہہ رہا ہے کہ کل صبح کو چھری تیز کر دوں گا۔ قریب جو گئی تو یہ اس کے اور وہ اس کے گلے لپٹ گئے۔ وہ مرد کون تھا۔ وہ رحیم بخش تھا۔ اس کو کانسٹبلوں نے دورلے جاکر ایک مکان میں بند کر دیا تھا مگر کانسٹبل کی آنکھ ذرا چوکی اور وہ دیوار پھاند کر دھم سے زمین پر کود پڑا۔ اس درخت کے پاس میاں بیوی میں مڈبھیڑ ہوئی۔ بیوی نے اپنا سب حال سنایا، اور میاں نے اپنی بیتی بیان کی۔ صبح کو رحیم بخش نے اس تھانہ دار کو راہ میں اتنی لکڑیاں ماریں، کہ بیدم ہوگیا۔ گھوڑے پر سے اس نے کھینچ لیا، اور مارتے مارتے کچومر نکالا۔ بیوی کو ایک بوڑھی گھوسن، اور ایک جوان پہیا بنیے کے ساتھ روانہ کر ہی چکا تھا۔ خود بھی بھاگا۔ کانسٹبل جب تک آئیں آئیں وہ فغرو ہوگیا۔ گاؤں والے تو اس کے دشمن تھے ہی ایک نے بھی نہ بچایا۔ بلکہ جب دیکھا کہ وہ ادھ مرا ہوگیا تو دو چار نے لاتیں بھی جمائیں۔ موے پر سو دُرّے۔ رحیم بخش کو سمجھایا کہ بھاگ جاؤ، ورنہ دھرے جاؤ گے۔ اب وہ میرے یہاں چھپا بیٹھا ہے۔

خوجی : اجی ہم بتائیں بھئی۔ قسم ہے چینا بیگم کی کہ یہ سارے ہتھکنڈے اسی بہروپیے کے ہیں۔ یہ وہی مردک ہے، جو وہ نہ نکلے تو ناک کٹا ڈالوں۔ ناک ناک بدتے ہیں۔

آزاد : جی آپ کی ناک تو واللہ شاخ حنا ہے۔ کاٹی اور بڑھی جس قدر زیادہ کاٹ چھانٹ ہو، اسی قدر خوبصورت نظر آئی۔

خوجی : واللہ! قسم قرآن کی یہ بہروپیے ہی کی چال تھی۔ آخر اور کس کو پڑی تھی۔
سلاری : کون؟ بہروپیا؟ میں کچھ سمجھا و مجھا نہیں۔
میرزا : قبلہ یہ روایت طلب بات ہے۔
سلاری : پھر اب مجھے کیا حکم ہوتا ہے۔ کوئی معقول تدبیر بتائیے، ہم تو غریب مفلس ٹکے کے آدمی ہیں۔ مگر آبرو دار ہیں۔
آزاد : بھئی تمھارے داماد تمھارے پاس آ ہی گئے ہیں، اور صاحبزادی کے شیشۂ عصمت پر بھی فضل خدا سے سنگ بے عزتی صادر نہیں ہوا۔ اگر کوئی باز پرس کرے تو آپ اس وقت رائے لیجیے گا۔
سلاری : بہت خوب اسی سے تو میں آپ کے پاس آیا کہ صلاحِ نیک دیجیے میں قانون کیا جانوں۔
خوجی : قانون سے کیا واسطہ۔ ارے بھئی یہ تو سارے ہتکھنڈے اسی بہروپیے کے ہیں۔ اس گیدی ہی کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں۔
سلاری : بہروپیا کون ہے؟
آزاد : اجی آپ اس سودائی کی باتوں میں نہ جائیے۔

مانجھی سے سوال و جواب

خوجی نے ایک دن کہا۔ ارے یار دکیا اندھیر ہے۔ تم روم چلتے چلتے بہے بہے کہاں پھرتے ہو۔ کہیں پارسی کے ہاں پریوں کے جوبن لوٹے۔ کہیں قاضی القضات حضرت مولانا محمد عبدالقدوس صاحب سے غلمت غلمت فہو علمت۔ کیا۔ اتنے دن تک نواب ہی کے ہاں پڑے رہے اور پھر ایک ہو تو کہوں، دو ہوں تو چپ رہوں۔ تین ہوں تو گنوں۔ چار ہوں تو شمار کروں، جب ہر مقام پر ایک نئی چھیل چھبیلی پر ریجھے تو کہاں تک گنوں۔ بھئی میں تو بکتے بکتے دیوانہ ہوگیا۔ ادھر مس ورجینا پر دل آیا، اُدھر نظیر بیگم نے لبھایا۔ یاالٰہی، مگر افسوس ہے کہ تم کو اپنی بات کا ذرا پاس نہیں۔ کسی سے وعدہ کیا ہے۔ پھر پورا کرنا چاہیے یا نہیں۔ اب آخر روم کب جاؤ گے۔ عاقبت میں یا حشر کے دن۔ اجی بس اب اسپاچ بھی سنا اور دعوتیں بھی چکھیں۔ اب بقچے سنبھالو۔ اور چلو سیدھے۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ ہم ایک نہ مانیں گے چلیے اٹھیے کوچ بولیے۔

آزاد : میرزا صاحب اتنے دنوں میں خوجی نے ایک یہی بات تو پکی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجیے۔

میرزا : اجی حضرت تیاری کیجیے۔ بس اب آپ چلیے۔

خوجی : قبلہ پہلے یہ بتائیے کہ کتنے دن کا سفر ہے؟

آزاد : اس سے کیا واسطہ۔

خوجی : اور سنیے۔ اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔

آزاد : بھئی ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی : جہاز! ہائے غضب! کیا تری تری جانا ہوگا؟

آزاد : جی اور نہیں تو کیا خشکی خشکی۔ آپ ابھی تک اسی بھروسے تھے بہت جلد چونکے۔

خوجی : میری تو روح لرزنے لگی۔ بھیّا میں نہ جانے کا۔ بابا من نمی رفتم۔ وہ لا حول۔ من نخواہم رفت۔

آزاد : اجی دے برندش کا معاملہ ہو تو سہی۔ چلو وہاں ترکی عورت کے ساتھ تمھارا بیاہ کرا دیں گے۔

خوجی : خشکی خشکی چلو تو بھائی میں چلوں گا۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

میرزا : جناب خواجہ صاحب آپ کو شرم نہیں آتی۔ اتنی دور تک ساتھ آئے اور اب ساتھ چھوڑے دیتے ہو۔ ڈوب مرنے کی بات ہے۔

خوجی : کیا خوب۔ یوں بھی ڈوبوں اور مروں بھی ڈوبوں۔ تو یہ اس قدر ضد کیوں کرتے ہیں۔ خشکی ہی خشکی کیوں نہیں چلتے۔

میرزا : آپ بھی واللہ نرے چونچ ہی رہے۔ عجب آدمی ہو۔ بھئی خشکی کی راہ سے کتنے دن میں پہنچو گے بھلا۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ کجا بمبئی کجا قسطنطنیہ۔ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔ پرسوں جہاز پر سوار ہو دن سے روم داخل۔ خشکی کی ایک ہی کہی۔

خوجی : اب آپ سے حجت کون کرے۔ آپ تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ جہاز کا کون اعتبار اور جو ڈوب گیا۔ ذرا کسی سوراخ کی راہ سے پانی آیا، اور بس پہنچے جہنم میں۔ ع "چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"، ذرا ہوا تیز چلی اور پچھم کے عوض پورب پہنچے۔

آزاد : تو نہیں چلو گے نہ۔ صاف صاف بتا دو۔ ابھی سویرا ہے۔

خوجی : چلیں تو بیچ کھیت اور ڈنکے کی چوٹ، مگر پانی کا نام سُنا اور روح تحلیل ہو گئی۔ بھلا کیوں صاحب یہ تو بتائیے کہ سمندر کا پاٹ گنگا کے پاٹ سے کوئی دونا ہوتا ہوگا۔ یا کچھ کم و بیش۔

میرزا : جی بس اور کیا چلیے آپ کو سمندر دکھلائیں۔ نہ تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

خوجی : بس کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ ہم کو لے چلیے اور جھپ سے چپر غٹو کر کے جہاز پر بٹھا دیجیے۔ ایک شرط سے چلتے ہیں۔ بیگم صاحب ضمانت کریں، ہمارے سر کی قسم کھائیں کہ زبردستی نہ کریں گے کہ خواہ مخواہ جہاز پر چڑھو ہی۔

آزاد : کیا خوب۔ آپ کیا اور آپ کا سر کیا چلیے ہم بیگم صاحب سے کہوائے دیتے ہیں آپ اور آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھائیں تو سہی۔

میرزا : اچھا چلیے وہ ضمانت کریں گی۔ آئیے اٹھیے۔

میرزا صاحب اور میاں آزاد دونوں مل کر گئے اور ان سے کہا واسطے خدا کے اس بڑی افیمی خوجی سے اتنا کہہ دینا کہ تو جہاز دیکھنے جا یہ لوگ زبردستی سوار نہ کریں گے۔ بیگم صاحب نے جو ساری روایت سنی تو خوب کھل کھلائیں، اور تنک کر بولیں کہ ہم نہ کہیں گے۔ آپ لوگوں نے ذرا سی بات نہ مانی اور سیڑھی ہٹا لی۔ اچھا خیر پردے کے پاس بلا لو۔

خوجی : (پردے کے پاس سے) آداب بجا لاتا ہوں حضور!

جواب کون دے، بیگم صاحب تو مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں، اور میاں آزاد کے خیال سے اپنی بے تکلفی اور چلبلاہٹ پر کسی قدر شرماتی ہیں، مگر لجاتی بھی ہیں۔ اور کھل کھلاتی بھی ہیں۔ شرم اور ہنسی دونوں نے مل کر رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیا۔ اس وقت تغیّر رنگ نے عجب جوبن دے دیا۔ اتنے میں خوجی نے پھر ہانک لگائی کہ، آداب بجا لاتا ہوں حضور۔ غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے۔

میرزا : وہ کہتی ہیں کہ ہم ضمانت کیسے لیتے ہیں۔

خوجی : آپ رہنے دیجیے انھیں کو کہنے دیجیے۔

بیگم : خواجہ صاحب بندگی۔ آپ کیا پوچھتے ہیں۔

خوجی : اے حضور مجھ کو جہاز دکھانے لیے جاتے ہیں۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ جو حکم ہو بجا لاؤں۔

بیگم : کبھی بھولے سے نہ جانا۔ نہیں پھر کے نہ آؤ گے، اور جو کہیں وہ موا بہروپیا مل گیا تو بس بن گئی بات۔

خوجی : آپ ان کی ضمانت کرتی ہیں۔

بیگم : میں کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی۔ زرد دیجیے ضامن نہ ہوجیے۔ یہ ڈبو ہی دیں گے۔ موئی قرولی رکھی ہی رہے گی۔

خوجی : چلیے بس حد ہوگئی۔ اب ہم نہ جانے کے۔

آزاد : بھائی تم ذرا ساتھ چل کر سیر تو دیکھ آؤ۔

خوجی : واہ اچھی سیر ہے۔ کسی کی جان جائے آپ کے نزدیک سیر ہے۔ اس جانے والے پر تین حرف۔

خیر ٹٹو تھمبو کر کے میرزا صاحب اور میاں آزاد خوجی کو لے کر چلے۔ چلتے چلتے جب ساحل بحر پر پہنچے تو خوجی نے نظر بھر کر سمندر کو دیکھا۔ دیکھتے ہی دو چار قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے پھر دس پانچ قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے۔

خوجی : اف خداوندا بچائیو۔ یا خدا بچا۔ یہ ملک الموت ہے یا سمندر۔ لہریں دیکھتے ہی کسی نے کلیجے کو مسوس لیا۔

میرزا : کیا لطف ہے خدا کی قسم جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں۔ اہو ہو ہو!

خوجی : (میرزا کا ہاتھ پکڑ کر) کہیں بھولے سے پھاندنے واندنے کا قصد بھی نہ کرنا۔ حیادار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

آزاد : عجب مسخرہ ہے بھئی۔ ایک آنکھ سے روتا ہے۔ ایک آنکھ سے ہنستا ہے۔

خوجی : آپ تو کہتے تھے کہ گنگا کے برابر پاٹ ہے۔ معاذ اللہ کچھ ٹھکانا ہے۔ اور چھور ہی نہیں۔ چلتے چلتے پاؤں کے پرخچے اڑ گئے۔ وہاں کہتے تھے کہ بس تھوڑا سا ہی فاصلہ تو ہے۔ ان فقرہ بازوں سے خدا سمجھے، اور تس پر اتنی دور سواری پر آئے ورنہ کیا جانے کیا ہوتا۔

اتنے میں دو چار ملّاح سامنے سے آئے۔ خوجی نے جوان کو غور سے دیکھا تو ہنسی چھٹی۔ میرزا صاحب سے پوچھا کہ یہ کون ہے بھئی۔ ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے۔ انھوں نے کہا یہ ملّاح ہیں دن رات سمندر ہی میں رہتے ہیں۔ جب دیکھیے جہاز پر۔

خوجی : بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لے گا؟ اردو جانتا ہے کہ نہیں؟

میرزا صاحب : ہاں ہاں جانتا کیوں نہیں ہے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کو لے گیا ہے۔ اردو خوب سمجھتا ہے۔

خوجی : (ایک بوڑھے ملّاح سے) کیوں میاں مانجھی تمھارے باپ کہاں مرے تھے۔

مانجھی : ساگر (سمندر) جہاز پر۔

خوجی : ہوں اور دادا ؟۔

مانجھی : وہ بھی جہاز پر۔

خوجی : ہوں۔ اور چچا وچا ؟

مانجھی : وہ بھی سمندر میں۔

خوجی : افسوس۔ بھلا تم کہاں مرو گے ؟

مانجھی : اب یہ کون جانے کسی کو اپنے مرنے کا حال کیا معلوم۔ مگر مریں اسی سمندر میں ہم بھی۔

خوجی : پھر بھلا جہاں تمھارے کنبے کے اتنے مرے اور تم خود بھی وہیں مرنے والے ہو تو اس سے پرہیز کیوں نہیں کرتے اور کوئی پیشہ کرو۔

مانجھی : آپ کے باپ کہاں مرے تھے میاں ؟

خوجی : ہمارے شہر میں اور کہاں مرتے۔

مانجھی : اور دادا تمھارا کہاں مرا تھا۔ ؟۔

خوجی : وہ بھی شہر میں مرے تھے۔ قبرستان میں ان کی بھی لاش ہے۔

مانجھی : اور چچا وچا سب کہاں مرے ؟

خوجی : سب وہیں مرے۔ کئی قبریں اب تک موجود ہیں۔

مانجھی : (گردن ہلا کر) پھر آپ اس شہر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جہاں آپ کے باپ اور دادا اور چچا اور عزیز سب مرے۔

خوجی : واہ۔ واہ۔ شہر کے چھوڑنے سے کیا مرنے سے بچ جائیں گے۔ ہم چاہے جہاں رہیں مریں گے ضرور۔ مرنا برحق ہے۔ چاہے یہاں سے لندن جائیں چاہے روم و شام جدھر جائیں ملک الموت سے بھلا کوئی بچ سکا ہے۔ ع۔ علاجِ موت نکرد ندرد سیاہ شد تد۔

ماجھی : پھر میں اپنا پیشہ کیوں چھوڑنے لگا بھلا۔ جب موت سے بچ ہی نہیں سکتا کوئی تو میں پیشہ کیوں چھوڑ دوں۔

خوجی : آپ منطق بھی پڑھے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ اچھی دلیل پیش کی۔

ماجھی : کیا؟ میں سمجھا نہیں۔

خوجی : اجی تم خوب سمجھتے ہو۔ مگر شکل صورت سے تو ہم سمجھے تھے کہ جانگلو ہے۔ لیکن تم تو خوب اُردو بولتے ہو۔

ماجھی : میں جبل پور کا رہنے والا ہوں۔ باپ دادا نے سب نے یہی پیشہ کیا۔

آزاد : کہیے خواجہ صاحب چھینپے تو نہ ہوں گے۔ آپ سچ کہنا کیا جواب دیا۔ واہ رے ماجھی کہیے اب تو تشفی ہوئی چلیے گا جہاز پر؟

خوجی : ہاں ضرور۔ سو کام چھوڑ کر۔ نہ چلنا کیا (ماجھی سے) کیوں بھئی ہم کو پاؤں پاؤں تو نہ چلنا ہوگا کسی مقام پر۔

ماجھی : ہونھ۔ کیا دھرتی پر چلنا ہے؟

خوجی : بھلا افیم کھانے کی جہاز پر ممانعت نہیں ہے؟

ماجھی : نہیں بہت سے آدمی افیم گھول کر پیا کرتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے کھائے۔

خوجی : اے میں تیری زبان کے قربان۔ واہ میری جان۔ بس چنیا بیگم پاس ہوں تو مزے ہیں۔ بھلا کیوں میاں جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے۔ جہاں سے سمندر نظر ہی نہ آئے، اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں۔ سچ بتانا استاد۔ اجی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی۔

ماجھی : ہم آپ کو ایسی جگہ بٹھا دیں گے جہاں پانی آسمان کچھ سوجھ ہی نہ پڑے۔

خوجی : صدقے۔ قربان۔ بڑے۔ دوست ہو ہمارے، ایک بات اور بتا دو۔ گنے ملتے ہیں راہ میں یا ان کا کال ہے۔

ماجھی : گنے وہاں کہاں، کیا کچھ منڈی ہے۔ اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلیے۔

خوجی : ہائے گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی۔ کھلا حلوائی کی دکان تو ہوتی ہوگی۔ آخر یہ اتنے شوقین افیمی جو جاتے ہیں، تو کھاتے کیا ہیں۔ سنکھیا، کھاجا۔ برفی، پیڑے، لڈو، یہ سب ملتا ہے یا ندارد۔

ماجھی : اجی جو چاہو ساتھ رکھ لو۔

خوجی : اور جو منھ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آئے۔

آزاد : پاگل ہے کون۔ مسخرہ اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جانا ہے اور پوچھتا کہ پانی کہاں سے آئے گا۔ اور سب پانی پئیں گے تم پیاسے مروگے۔ دشت کربلا ہے۔ احمق۔

خوجی : تو آپ کیوں الجھ پڑے، آپ سے پوچھتا کون گیدی ہے (ملاح سے) کیوں جی بھلا ہم گنتے یہاں سے باندھ لے چلیں اور گنڈیریاں بنائیں اور جہاز پر چوسیں۔ مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں؟ آخر ہم تو صبح و شام دو چار پونڈے کھایا چاہیں۔ پھینکیں کہاں۔

آزاد : یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہم بتا دیں گے۔ آپ بدحواس نہ ہوں۔

خوجی : اس کی تو ممانعت نہیں ہے کہ کوئی پینک میں نہ ہو۔

مانجھی : (ہنس کر) نہ

خوجی : اور جو قرولی باندھے ہو تو ہرج تو نہیں ہے۔ کچھ یا مثلاً قرابنیچہ ہو۔

مانجھی : چاہے جو ہو توپ نہ ہو اور تار پیڈو نہ ہو، تلوار ہو، کٹار ہو، چاہے جو ہو مگر لائیسنس ضرور ہونا چاہیے۔

خوجی : ہونھ دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نہ۔ اچھا یہ تو سب ہوا۔ اب دو دو باتیں اور ہو جائیں۔ ایک تو یہ بات پوچھنی ہے کہ بہروپیے تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے۔

مانجھی : چاہے جو سوار ہو۔ دام دے سوار ہووے، کسی کا وہ نہیں۔ مل۔

خوجی : اجی ٹل کو ڈالو بھاڑ میں ہمارے سوال کا جواب دو۔ کمہار تو نہیں ہوتے۔

مانجھی : آج تلک کوئی کمہار گیا نہیں۔ یاد نہیں پڑتا۔

خوجی : اے میں تیری زبان کے پھر قربان، بڑی ڈھارس ہوئی۔ خیر کمہار سے تو بچے۔ باقی رہا بہروپیا، اس گیدی کو سمجھ لوں گا۔ اتنی قرولیاں بھوکوں کہ یاد ہی تو کرے۔ آخر حوض میں گرا ہی دیا۔

مانجھی : اتنی باتیں تو کسی نے بھی نہ پوچھی تھیں۔ اب کچھ اور پوچھو گے؟

خوجی : ہاں بس ایک بات۔ اور وہ بھی دو پٹی، یہ تو قید نہیں ہے کہ صبح و شام ہر شخص ضرور ہی نہائے۔ اگر یہ قید ہوئی تو جانے والے پر تین حرف۔ ہم کوئی جیل خانے میں تو ہوں گے نہیں۔

مانجھی : آپ چاہے عمر بھر نہ نہائیں۔

خوجی : اے میں تیری زبان کے قربان۔
مانجھی : افیم بہت کھاتے ہو معلوم دیتا ہے۔
خوجی : (مسکرا کر) ہاں خوب پہچان گئے۔ آپ قیافہ شناس بھی ہیں۔ خیر سے۔ یہ تم کیوں کر بوجھ گئے بھائی۔ شوق ہو تو گھولوں۔
مانجھی : دُت۔ بس الگ رہیو۔ ہم افیم کو چھوتے تک نہیں۔
خوجی : (بگڑ کر) او گیدی ٹکے کا آدمی تم، اور جھک مارتا ہے: بکالوں قرولی؟
آزاد : ہاں ہاں خواجہ صاحب دیکھیے دیکھیے، جانے دیجیے گا۔ ذری قرولی میان ہی میں رہے۔
میرزا : جناب خواجہ بدیع صاحب آپ اپنی طرف دیکھیے۔ درگذر کیجیے، بدتمیز ہے۔
خوجی : خیر آپ لوگوں کی خاطر ہے، ورنہ اُدھیڑ کے دھر دیتا، پاجی کو (اکڑ کر) مجھے بھی کوئی اور سمجھا تھا۔ یہاں سیف اللہ کے اکھاڑے میں کشتی لڑا کیے ہیں۔ دل لگی ہے کچھ۔ کہنے لگا "دت"، واہ اچھی دو دو بک ہے۔ اس وقت آپ لوگ بیچ میں نہ پڑیں تو بھرکس ہی نکال دیا ہوتا۔
میرزا : ذری غور سے دیکھیے کہیں بہروپیا تو نہیں ہے۔ ہم تو جانتے ہیں وہی گیدی ہے۔

یہاں سے گھر چلے تو راہ میں دیکھا کہ ایک درخت کے سایے میں دو گھوڑے کھڑے ہیں۔ ایک پر نوجوان یوروپین جنٹلمین دوسرے پر ایک نازک کمر پری پیکر لیڈی۔ یہ دونوں وہی ہیں جو میاں آزاد کو اس دن ملے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا، کہ جنٹلمین نے بیوی سے کہا تھا کہ کل میں نے ایک ایسی پری چہرہ دیکھی، جو اس اسٹیشن بھر میں فرد ہے، اور جس کے مقابلے میں کل حسن لیڈیوں کا گرد ہے۔ اس پر وہ تنکیں کہ کیا کہا۔ انھوں نے بات بنائی۔ بھانپ گئے کہ بیوی نے برا مانا۔ کہا کہ وہ اسٹیشن بھر میں اپنی آپ ہی نظیر ہے، مگر تم سے دوم نمبر پر ہے۔ وہی دونوں آج پھر ملے۔ میاں آزاد سے اس جنٹلمین نے انگریزی میں یوں گفتگو کی۔

جنٹلمین : اس درخت کا کیا نام ہے۔ آپ جانتے ہیں کچھ؟
آزاد : برگد۔ برگد کا درخت ہے۔

جنٹلمین : وہ نہیں، یہ یہ۔
میاں آزاد علوم و فنون شاعری نثاری وغیرہ میں تو برق تھے، مگر علم نباتات میں بالکل کورے، بغلیں جھانکنے لگے۔

آزاد : اس کا نام مجھے خود نہیں معلوم۔ ہم لوگ ذرا ان باتوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ یہاں علم نباتات میں کسی کو عبور نہیں۔

جنٹلمین : ولایت میں اس کا بڑا چرچا ہے (اردو میں) ہم اپنے ملک کی گھاس پھوس پیڑ جڑ بوٹی پہچانتا ہے۔

خوجی : ولایت کا گھسیارا معلوم ہوتا ہے۔ یا مالی ہوگا۔

جنٹلمین : (اردو میں) چڑیا کا علم جانتا ہے آپ (انتھالوجی)

آزاد : جی نہیں۔ یہ علوم یہاں سکھائے نہیں جاتے۔

جنٹلمین : چڑیا کا علم ہم خوب جانتا ہے۔

خوجی : چڑیمار ہے لندن کا۔ بس قلعی کھل گئی۔

وہ دونوں تو گھوڑوں کو کڑکڑا کر ہوا ہو گئے۔ ادھر آزاد اور میرزا صاحب کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

آزاد : اُف فوہ۔ واللہ لٹا دیا۔ بڑی خرابی سے ہنسی ضبط ہو سکی۔ چڑیمار اور گھسیارے کی ایک ہی کہی۔ انھیں باتوں سے تو ہندوستان تباہ ہے۔

میرزا : جی اور نہیں تو کیا۔ علم نباتات پڑھے تو مالی اور گھسیارا کہلائے۔ علم الطیور کا شوق کرے تو چڑیمار کی پھبتی سنے۔ لاحول ولا قوۃ۔ جہاں خوجی سے لوگ ہوں وہاں ترقی ہو چکی۔

نامۂ رنگین

سنبھل ساقی کہ وقت اب اور آیا — رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزہ رکھتا نہیں بے کیف جینا — تمنّا ہے کہ برسے ابرِ مینا
ہر اک قطرہ لہن بن بن کے ٹپکے — مرے دامن سے وے چھن چھن کے ٹپکے
چل اٹھ ساقی مے تو یہ تسکین دے — کہ لطفِ بیخودی میرا سخن دے

قدم لوں اب ودائعِ ہوش کے میں — تصدّق جاؤں اپنے جوش کے میں
ہر اک مضمون سے پٹتوں صورتِ مار — مزے لے لے کے بن جاؤں گنہگار

ادھر لیلیٰ مشکیں پر ندِ شب نے طرۂ مشکبار زلف عنبریں سے دماغِ عشاق زار کو روکش تاتار بنایا، اُدھر بتِ حور پیکر، نازنین سمن بر، ماہ سیما، شیریں ادا، پیاری حسن آرا کو شوق چرایا کہ آزاد فرخ نہاد کے نام خط بھیجے۔ اسی دم:

مانگا کاغذ و دوات و خامہ — لکھا عاشق کے نام نامہ

حسن آرا کا نامۂ رنگین بنام آزادِ حزیں

میرے پیارے آزاد! خاتون جنت کی قسم تمہارا سا شیر دل، شیر مرد، مروت اور جرأت میں فرد، دیکھا نہ سنا۔ دیکھا ہو تو تم کو نہ دیکھوں۔ سنا ہو تو پیاری سپہر آرا کی سنانی سنوں تمہاری ایک ایک ادا میرے دل میں کھپ گئی ہے۔ وہ چھپ چھپ کے کنکھیوں سے نظر ڈالنا، وہ بگڑی ہوئی بات کو سلیقہ سے ٹالنا، وہ مردانہ نکھار، وہ جوانانہ سنگھار، وہ رنگین ادائی۔ وہ خود نمائی، وہ طرزِ غزل خوانی، وہ شیریں بیانی، کیا بھول سکتی ہوں؟ واہ بھول چکی بیگماتِ مخدرات اور محلاتِ عصمت سمات، لکھنؤ کی سی چٹاخ پٹاخ باتیں تو مجھکو آتی نہیں، ورنہ خط کو گلدستہ، اور دستنبو بنا دیتی۔ اس وقت دل سے لگی ہے، کہ تم میرے روبرو زانو بزانو بیٹھے میری نازک کلائی اور میرے دستِ حنائی کو پاک محبت سے چوم رہے ہو۔ تم خوب جلتے ہو کہ گو میں شاہدِ عاشقی کی غازہ طراز ہوں، لیکن پاک نظر اور پاکباز ہوں۔ ہاں اس کی قسم نہیں کھاتی کہ کسی پر دل نہیں آیا۔ کسی کی پیاری بیوی بننے کے خیال نے نہیں گدگدایا۔ لیکن ہمارا معشوق کون ہے۔ یہ تم اپنے ہی دل میں سوچ لو جب تک تمہارے گلِ رخسار پر نظر نہیں پڑی، قسم لو جو کسی گل کی بلبل ہوں۔ جب تک تمہارا سرو قامت نہیں دیکھا تھا، خدا ہی سمجھے جو کسی شمشاد کی قمری ہوتی ہوں۔ تم سے دل ملا کر البتہ عشق کے صدمے سہے ورنہ:

نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حالِ عشق بازی — نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

ہم ہنسا کرتے تھے کہ دل کا آنا کیسا، اور جانا کیسا، مگر اب معلوم ہو گیا کہ دل قابو اور ہاتھ اختیار سے کیوں کر جاتا رہتا ہے۔ پہلے معلوم کس کو تھا کہ دل ملانے کے خمیازے پیچھے اٹھانے پڑیں گے:

الا یا ایہا الساقی ادر کاسًا وناولہا   کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
بیوے نافہ کاخر صبا زان طرہ بکشاید   زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

اب تو توبہ میری ہی زلف پریشاں کی طرح برہم ہے۔ خوشی خیر باد کہہ کر سدھاری۔ بس میں ہوں، اور غم ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم بے دھڑک ململ کا صندلی دوپٹا، یا پڑا نے دار گوٹ کی باریک دلائی اوڑھے، روشوں میں بے حجاب گھوما کرتے تھے، اب برا فگندہ نقاب دہلیز سے باہر قدم رکھتے شرم آتی ہے۔ بدن چرانا جانتی ہی نہ تھی کہ کہتے کسے ہیں۔ اب مجال کیا کہ کسی نامحرم کی ادھر اُدھر نظر پڑے، یہ سب حضور ہی کے کانٹے بوئے ہیں۔ پھر جو چین عاشقی کا گل چیں ہوگا۔ اس کا کے پاؤں میں کانٹے چبھیں گے۔ یہ تو بنی بنائی بات ہے۔ بس جس طرح امید کسی کے دل میں چھپی ہوتی ہے۔ اس طرح میں بھی مارے حیا کے چھپتی پھرتی ہوں۔ جس طرح شوخی معشوقوں کے مزاج میں پنہاں رہتی ہے، اسی طرح تمھاری حسن آرا بھی رخ کو گھونگھٹ میں چھپائے رکھتی ہے۔ جس طرح جادو نگاہوں کی لگاوٹ بازانکھڑیوں میں قہر نے جگہ پائی۔ اسی طرح ہم نے بھی اغیار سے صورت چھپائی۔ جو صورت آزاد کو دکھائی، وہ اب کسی اور کو کیا دکھائیں۔ حیا مانع ہے۔ اب تو نگاہ اشارت آشنا ہو گئی ہے نہ۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ پہلے تو الڑھ پن سے نظر پڑتی تھی۔ یہ محبت خیز اشارے جانتا کون تھا۔ مگر پاس ناموس و ننگ کو رخصت نہیں کیا ہے۔ ہاں جب تک تمھارے رخسار کے جوبن آنکھ نہ لوٹے گی، تب تک مایوسی کی کمر نہ ٹوٹے گی۔ جب تک اپنے ہاتھ سے پھر اسی طرح گلوری نہ کھلاؤں۔ جب تک تمھارے ساتھ بجروں پر سیر کو نہ جاؤں۔

راوی : اس قدر حسن آرا لکھ چکی تھی، کہ سپہر آرا تڑسے بول اٹھی۔

سپہری : باجی خدارا یہ فقرہ کاٹ دو (کانپ کر)، ہے ہے اس وقت جو وہ خیال آیا تو رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اُف (تھرتھرا کر) جان ہلکان ہو گئی تھی۔ وہ کہو خیر سے۔ بزرگوں کی دعا آڑے آئی۔ اس گاڑھے وقت میں پیارے آزاد بھائی نے جان بچائی۔ نہیں تو کیا جانے کیا کا کیا ہو گیا ہوتا۔ بس (ارے) کر کے رہ جاتے۔ بجروں کا نام سنتے میری روح فنا ہو جاتی ہے۔

حسن آرا : (مسکرا کر) اچھا خط تو لکھنے دو۔

راوی : یہ کہہ کر حسن آرا نے خط لکھنا پھر شروع کر دیا۔

تب تک دل کو چین نہیں۔ طبیعت کو قرار نہیں۔ نظر میں کچھ اور ہی رنگ پھر رہے ہیں۔

تیرے صدقے آزاد! پیارے آزاد! اتنا کہنا مان لو کہ خط کو نہ ترساؤ۔ آنکھیں اشک بھر لاتی ہیں۔ مگر تمھاری پیاری سپہر آرا سمجھاتی ہیں، کہ باجی تم اپنا راز، آپ افشاں کرتی ہو۔ تم جو دن رات ٹپ ٹپ آنسو بہاؤ گی، تو لوگ کیا کہیں گے۔ ناحق بن ناحق کسی کے طعنے سننا اس پڑوس کی عورتوں کو ان سے بدظن کرنا، محلے بھر میں ہنسوانا کون سی عقلمندی کی بات ہے، اب میں اس کو کیا سمجھاؤں کہ بہن عقل ٹھکانہ کس کی ہے۔ عقل کو تو حسن آرا رو چکی، عقل سے کب کی ہاتھ دھو چکی:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

وہ سادہ مزاج کیا جانے کہ عاشقوں کی طبیعت کہیں تسکین آشنا ہوا کرتی ہے پختہ کار ہوتی تو سمجھتی کہ یہ خیال خام ہے۔ گو میں بھی ابھی ناکردہ کار سہی، مگر وہ تو مجھ سے بھی بڑھ کر انیلی ہے۔ عشق کے صدموں کا حال کیا جانے۔ پہلو کو قرار تو تب ہے، جب دلآرام پاس ہو۔ بادۂ عشق کے سرور کا وہ جوش ہے کہ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں، دردِ فراق سے جب بے ہوش ہو جاتی ہوں تو آپ کی سپہر آرا کیوڑا چھڑکتی ہیں۔ گلاب لاتی ہیں۔ لخلخہ سونگھاتی ہیں۔ مگر جب تک اس کا دل کسی پر نہ آئے، کسی خوشرو، عنبریں مو، جوان پاکباز سے آنکھ نہ لڑے، کوئی البیلا شریف زادہ نظر نہ پڑے، تب تک میرے دردِ دل کو وہ کیا سمجھے۔ میں اس کو کیوں کر سمجھاؤں کہ پیاری بہن، یہاں ہر غش ہی رہتا ہے۔ تم گلاب اور کیوڑا اور لخلخہ کب تک سنگھاؤ گی مسکنِ قلب ادویہ کہاں تک پلاؤ گی۔ مسکنِ قلب تو شربت دیدار ہے۔ مزیلِ غشی عناب لب یار گل عذار ہے۔ میرا دامن کبھی اشک لالہ گوں سے خالی پاؤ ہی گی نہیں۔ حیرت کا ہجوم تو دیکھ دل اور جگر، اور طبیعت اور مزاج، سب میں حسرت ہی حسرت بھری ہے۔ الٰہی حسرت ہی حسرت ہے:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ　　کچھ نہیں اور تو حسرت ہی سہی

ہائے اشتیاق، ہائے دردِ فراق۔ اس نے بسمل اور نیم جاں کر دیا۔ اور اس نے جیب و دامن کو حسرت سے بھر دیا۔ اچھی طرح کھل کے رو بھی تو نہیں سکتی۔ اماں جان دیکھ پائیں تو مہنا متھ مچائیں۔ کہیں چھوکری کچھ خیر تو ہے۔ اے واہ بیٹھے بٹھائے اچھا تو تا پالا۔ کہیں ننگ و ناموس میں بٹہ نہ لگانا۔ چلو منھ دھو۔ فرمائیے پھر کیا کہوں۔ لجانے کے سوا اور کیا ہے۔ اچھی طرح بشاش تو پھر نہیں سکتی:

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی　　　دل ہی دل میں تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

اس وقت:

ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی آ رہی ہیں　　　غضب کی بدلیاں کچھ چھا رہی ہیں
ابلتی ہے طبیعت سوئے ساغر　　　ہوس پھر ڈھونڈھتی ہے بوئے ساغر
دہن ہے قطرۂ گلگوں کا مشتاق　　　بس اب تاخیر اک دم کی بھی ہے شاق

مگر یاس کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ ناامیدی دور سے بھیانک صورت دکھاتی ہے۔ ہوا سے بوئے حسرت آتی ہے۔ مصیبت، پریشانی، درد، حیرانی، غم و غصہ، و رنج و حرماں، سب مہمانی کو آئے ہیں۔ دل دکھاتے ہیں، مگر نہیں آتا تو تمھارا خط ایک نامۂ رنگین ان سب کو جھٹ دور کر دے۔ مگر جب خط آئے بھی، جب مراد دل صورت دکھائے بھی۔ ایک تو خط نہیں آتا، دوسرے ہنسی نہیں آتی۔ رنگ اور روز زرد ہے، دل سرد ہے۔ ہوش و حواس باختہ حضرت عشق کے ساختہ و پرداختہ۔ وہ جوبن، وہ چلبلاپن وہ شوخی، وہ اچپلاہٹ، وہ سجاوٹ، وہ بناوٹ، سب منزلوں دور ہیں۔

ہائے خدا بھی میری نہیں سنتا۔ دن رات سر دھنتی رہتی ہوں۔ مگر دعا بے اثر ہو گئی۔ جس وقت طائران خوش نوا، سحر ناز افزا اشجار سراپا بہار کی پر میوہ شاخوں پر چہکتے ہیں۔ اس وقت ایک تیر سا کلیجے کے پار ہوتا ہے۔ دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ جوشش قلزم بیخودی میں کیا جانے کیا حال ہوتا ہے۔ دیکھیے قطرۂ دریائے فراق، غرقۂ بحر اشتیاق کی خدا کب تک سنتا ہے۔ سپہر آرا بھی سمجھاتی ہے۔ کبھی زلف کی طرح الجھ پڑتی ہے۔ فرط محبت سے میرا دیوانہ پن دیکھ کر لڑتی ہے۔ لیکن تم نے چلتے وقت منھ بھی نہ دکھایا۔ ذرا آنکھیں بھر کر دیکھ تو لیتی! ائے ہائے کس سے کہوں، اور کیا کہوں، بس اب دیوانی سی ہو گئی۔

میری تو بدی ہونی تھی کچھ یوں　　　تم نیک تھے بے ملے گئے کیوں
تم جاؤ تو کیوں نہ آئے افسوس　　　افسوس افسوس ہائے افسوس
تقدیر پھری پھرے نہیں تم　　　امید گئی، گئے نہیں تم
اے کاش میں کچھ بھی سانس باقی　　　جی کھول کے داغ دل دکھاتی
اب مجھ میں وہ دم ابھی کہاں ہے　　　وہ دل وہ جگر وہ جی کہاں ہے
مر جاؤں اگر غضب میں تیرے　　　میں کیا کہ خبر نہ پہنچے میری

اب[۱۴] مجھ میں وہ دم ایّ کہاں ہے وہ دل وہ جگر وہ جی کہاں ہے

پیارے آزاد اب خط کے حرف مٹے جاتے ہیں۔ آنسو اُمڈے چلے آتے ہیں۔ مجھے کیا کہتے ہو۔ ہاتھ کانپنے لگا۔ ہائے میرے اللہ یہ مجھے کیا ہوا۔ بیٹھے بیٹھے تیر نظر کی گھائل ہو گئی، اور تمھاری طرف مائل ہو گئی۔ اب آؤ تو جلا لو ورنہ اب دم ٹوٹا، اور اب ٹوٹا۔ ہائے خدا جانے تم اس وقت کن جنگلوں میں پھر رہے ہو گے۔ کن پہاڑوں پر میری یاد میں سر دھن رہے ہو گے۔ کون جانے یہ خط تم کو ملے یا نہ ملے۔ قلب الٹا جاتا ہے۔ کہا مانو بس اب ٹرکی نہ جاؤ، میں باز آئی۔ اب تو میرے پیارے مجھے چاند سا مکھڑا دکھا میں انیلی کیا جانتی تھی کہ فرقت کا دھڑکا کیسا ہوتا ہے۔ ایک اور بات سنو وہ یہ ہے کہ.......

حسن آرا اس قدر لکھ چکی تھی کہ جنون نے زور شور کیا۔ قلم ہاتھ سے گر پڑا۔ دل دھک دھک کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ باقی سطور سپہر آرا نے لکھی ہیں۔

بھائی آزاد۔ پیارے بھائی آزاد۔ تمھاری حسن آرا اس قدر لکھ چکی تھیں کہ دل قابو میں نہیں۔ لکھا نہیں جاتا۔ اُف میرے اللہ حسن آرا اس قدر لکھ کر پٹ سے گر پڑیں، اور غش آگیا، ہم نے مل کر پلنگڑی پر لٹا دیا۔ آنکھیں پھیر دیں، اور پھر کا دم بھرنے لگیں۔ اماں جان کو خبر ہوئی، سر پیٹتی دوڑی آئیں روئیں چلائیں۔ اصیلوں مغلانیوں پر بہت جھلائیں۔ ہم پر جھنجھلائیں۔ اپنی بوٹیاں نوچ نوچ کھائیں، اور رو رو کر دیوانہ وار یہ شعر زبان پر لائیں:

حسرت میں لگایا داغ تو نے لٹوائی بہارِ باغ تو نے

اتنے میں حسن آرا کو ذرا ہوش آیا۔ ہوش آتے ہی فرطِ جنون سے پہلے یہی لفظ زبان پر آیا کہ، آزاد! آزادا دیدہ ہائے خوناب، کوئی میرے آزاد کو لاؤ۔ کوئی ذرا اس کا پیارا پیارا گورا گورا مکھڑا دکھاؤ۔ ارے میں مری۔ مرتے دم تو نظر بھر کر دیکھ لوں، مگر اب ذرا ذرا اچھی ہیں۔ ڈاک کا وقت جاتا ہے۔ میں نے اماں جان کی چوری سے یہ سطریں لکھیں۔ خدارا ٹرکی ورکی کا دھیان نہ کرنا۔ آؤ اور حسن آرا کو جلاؤ۔ وہ ایک ایک بن و مو سے یہی کہہ رہی ہے کہ:

جانانِ مرا بمن بیارید ایں مردہ تنم بادسپارید
گر بوسہ زند بریں لبانم تازندہ شود عجب مدارید

---

[۱۴] ہائے ری بدحواسی۔

آؤ تو خیر۔ ورنہ حسن آرا کو بھی نہ پاؤ گے، اور پھر پچھتاؤ گے۔ گھبرانہ جانا کئی بار غش آچکا ہے۔ دیکھو اس وقت مارے بد حواسی کے خط کو کتنی جگہ کاٹا اور کتنے لفظ غلط لکھ گئی۔ پاک پروردگار کے صدقے میں، کہیں تم کو یہ حسرت نامہ مل جائے، اور تم واپس آؤ تو ہم گھی کے چراغ مسجدوں میں جلائیں۔ حزین و غمگین سپہر آرا۔

یہ خط لکھ کر سپہر آرا نے آدمی کو دیا کہ جا ابھی ابھی ڈاک میں ڈال۔ ابھی جا دوڑا ہوا۔

زَن مُرید

برستا ہے شبابِ عمر ساقی
پلا تو بھی اگر ہو خُم میں باقی

ہجومِ شوق کی مستی ہے ہر دم
بہت کچھ آرزوئیں ہیں مزاحم

ارادے چاہتے ہیں مے پرستی
کہ آئے گوش تک پھر شورِ مستی

دہن امید ساغر میں رہے باز
سنے جی قلقلِ مینا کی آواز

لبِ مشتاق بھیگیں تر زباں ہو
ادا اس طرح رسم داستاں ہو

سرِ شام دلآرام، نازک اندام، یعنی میرزا صاحب کی زوجہ شوخ و گلفام نے پردے کے پاس آکر کہا کہ: (آج اس وقت کچھ چہل پہل قہقہے نہیں کیا موا خوجی دنیا سے سدھارا) میرزا صاحب نے خوجی سے کہا کہ حضرت کوئی ذکر چھیڑیے۔ دیکھیے صاحب کھڑی تقاضائے شدید کر رہی ہیں۔

خوجی : واللہ وہ پھڑکتا ہو الطیفہ سناؤں کہ لوٹ لوٹ جایئے جامے میں مارے خوشی کے پھولے نہ سمائیے۔

بیگم : اچھا پھر سنائیے۔ یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے۔ جب مُنھ سے پھوٹے بھی کچھ۔

خوجی : پھر افیم پلوائیے گا۔

بیگم : ہاں ہاں کہو تو۔ مرو بھی تو پوست ہی کے کھیت میں دفنائے جاؤ۔ کافور کی جگہ افیم ہی ہو تو سہی۔

خوجی : ایک شخص تھے خوشنویس۔ حروف ان کے قلم جادو رقم سے ایسے نکلتے تھے جیسے سانچے کے ڈھلے ہوئے۔ صاد چشمِ شاہدانِ چگل کو شرمائے۔ لام سے شمیم زلفِ مہوشانِ فرخار آئے۔ الف شانِ سرو قداں دکھائے۔ جواہر رقم خان اور ان کے بھائی جان، یاقوت قلم خان دونوں

اس کے مقابل میں گرو۔ حافظ نوراللہ اور ہادی علی تک کی گرم بازاری سرد۔ مگر بے عیب تو بس ایک خدا کی ذات ہے، یا میاں خوجی کی۔ باقی خدا کا نام اور قصہ تمام۔ ان حضرت میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ غلط نویس نہ تھے۔

آزاد : اتنا بڑا جانگلو۔ دیکھا نہ سنا۔

خوجی : خدا ان لوگوں سے بچائے۔ بھئی میرا تو ناک میں دم آگیا۔ بات پوری سنی ہی نہیں اور اعتراض جمانے کو موجود۔ خم ٹھوک کر لڑنے کو مستعد۔ بات کاٹنے پر ادھار کھائے ہوئے۔ خوجی مردود کا یہ مطلب ہے، کہ وہ غلط نویس نہ تھا، مگر یہ عیب تھا کہ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔ ایک شخص کو قرآن شریف لکھوانے کی ضرورت ہوئی۔ سوچے کہ اُن سے بڑھ کر کوئی خوشنویس نہیں۔ اگر دس پانچ روپیہ زیادہ بھی صرف ہوں تو بلا سے، مگر لکھوائیں گے۔ اُنھیں سے روپیہ کی ایسی تیسی۔

بیگم : اے واہ ری عقل۔ کوئی آپ ہی کے سے جانگلو ہوں گے گلی بہ گلی چھاپہ خانے ہیں۔ کوئی چھپا ہوا قرآن کیوں نہ مول لے لیا۔

خوجی : حضور وہ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ منطق نہیں پڑھے تھے۔

خیر صاحب خوشنویس کے پاس پہنچے، کہا کہ حضرت جو اُجرت فرمائیے دوں گا، مگر دست بستہ ایک عرض ہے۔ کہیے کہوں کہیے نہ کہوں؟ اُنھوں نے کہا ضرور فرمائیے۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ ایسا لکھوں کہ جو دیکھے پھڑک جائے۔ وہ نسخہ ہو کہ کیمیا گر بھی وجد کرنے لگے۔ ہاں حضرت یہ تو صحیح ہے، مگر ذرا اپنی طرف سے نہ بڑھا دیجیے گا، اور چاہے خدائی بھر کے کلام کو اصلاح دیجیے۔ لیکن اللہ میاں کی شان میں یہ گستاخی ناجائز ہے۔ خوشنویس نے کہا کیا مجال یہ کلام مجید ہے۔ ممکن کیا کہ اس عاصی کے قلم سے ایک لفظ بھی بدلنے پائے۔ توبہ توبہ! آپ مطمئن رہیے۔ ایسا نہ ہونے پائے گا۔ خیر حضرت وہ تو گھر گئے ادھر میاں خوشنویس لکھنے بیٹھے۔ جب ختم کر چکے تو کتاب پاک لے کر چلے۔ کوئی ایک مہینے میں قرآن لکھ ڈالا۔ لیجیے حضور قرآن موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ میری محنت پر نظر ڈالیے، اور غور کیجیے کہ کیا دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اُنھوں نے سر جھکایا اور تھوڑی دیر میں غور کر کے کہا کہ بس ایک بات صاف فرما دیجیے کہیں کچھ اپنی طرف سے تو نہیں ملا دیا ہے۔ خوشنویس نے کہا نہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کانپتے تھے۔ مگر اس میں جا بجا شیطان اور ابلیس کا نام تھا۔ میں نے

آؤ تو خیر۔ ورنہ حسن آرا کو بھی نہ پاؤ گے، اور پھر پچھتاؤ گے۔ گھبرانا کئی بار غش آچکا ہے۔ دیکھو اس وقت مارے بدحواسی کے خط کو کتنی جگہ کاٹا اور کتنے لفظ غلط لکھ گئی۔ پاک پروردگار کے صدقے میں، کہیں تم کو یہ حسرت نامہ مل جائے، اور تم واپس آؤ تو ہم گھی کے چراغ مسجدوں میں جلائیں۔ حزین و غمگین سپہر آرا۔

یہ خط لکھ کر سپہر آرا نے آدمی کو دیا کہ جا ابھی ابھی ڈاک میں ڈال۔ ابھی جا دوڑا ہوا۔

زن مرید

برستا ہے شباب عمر ساقی پلا تو بھی اگر ہو خم میں باقی
ہجوم شوق کی مستی ہے ہر دم بہت کچھ آرزوئیں ہیں مزاحم
ارادے چاہتے ہیں مے پرستی کہ آئے گوش تک پھر شور مستی
دہن امید ساغر میں رہے باز سنے جی قلقل مینا کی آواز
لب مشتاق بھیگیں تر زبان ہو ادا اس طرح رسم داستاں ہو

سیر شام دلآرام، نازک اندام، یعنی میرزا صاحب کی زوجہ شوخ و گلفام نے پردے کے پاس آکر کہا کہ: (آج اس وقت کچھ چہل پہل قہقہے نہیں کیا موا خوجی دنیا سے سدھارا) میرزا صاحب نے خوجی سے کہا کہ حضرت کوئی ذکر چھیڑیے۔ دیکھیے صاحب کھڑی تقاضائے شدید کر رہی ہیں۔

خوجی : واللہ وہ پھڑکتا ہوا لطیفہ سناؤں کہ لوٹ لوٹ جایئے جامے میں مارے خوشی کے پھولے نہ سمایئے۔

بیگم : اچھا پھر سنایئے۔ یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے۔ جب منھ سے پھوٹے بھی کچھ۔

خوجی : پھر افیم پلوایئے گا۔

بیگم : ہاں ہاں کہو تو۔ مرو بھی تو پوست ہی کے کھیت میں دفنائے جاؤ۔ کافور کی جگہ افیم ہی ہو تو سہی۔

خوجی : ایک شخص تھے خوشنویس۔ حروف ان کے قلم جادو رقم سے ایسے نکلتے تھے جیسے سانچے کے ڈھلے ہوئے۔ صاد چشم شاہدان چگل کو شرمائے۔ لام سے شمیم زلف مہوشان فرخار آئے۔ الف شان سرو قداں دکھائے۔ جواہر رقم خان اور ان کے بھائی جان، یاقوت قلم خان دونوں

اس کے مقابل میں گرو۔ حافظ نور اللہ اور ہادی علی تک کی گرم بازاری سرد۔ مگر بے عیب تو بس ایک خدا کی ذات ہے، یا میاں خوجی کی۔ باقی خدا کا نام اور قصہ تمام۔ ان حضرت میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ غلط نویس نہ تھے۔

آزاد : اتنا بڑا جانگلو۔ دیکھا نہ سنا۔

خوجی : خدا ان لوگوں سے بچائے۔ بھئی میرا تو ناک میں دم آگیا۔ بات پوری سنی ہی نہیں اور اعتراض جمانے کو موجود۔ خم ٹھوک کے لڑنے کو مستعد۔ بات کاٹنے پر ادھار کھائے ہوئے۔ خوجی مردود کا یہ مطلب ہے، کہ وہ غلط نویس نہ تھا، مگر یہ عیب تھا کہ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔ ایک شخص کو قرآن شریف لکھوانے کی ضرورت ہوئی۔ سوچے کہ اُن سے بڑھ کر کوئی خوشنویس نہیں۔ اگر دس پانچ روپیہ زیادہ بھی صرف ہوں تو بلا سے، مگر لکھوائیں گے۔ انھیں سے روپیہ کی ایسی تیسی۔

بیگم : اے واہ ری عقل۔ کوئی آپ ہی کے سے جانگلو ہوں گے گلی بہ گلی چھاپہ خانے ہیں۔ کوئی چھپا ہوا قرآن کیوں نہ مول لے لیا۔

خوجی : حضور وہ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ منطق نہیں پڑھے تھے۔

خیر صاحب خوشنویس کے پاس پہنچے، کہا کہ حضرت جو اُجرت فرمائیے دوں گا، مگر دست بستہ ایک عرض ہے۔ کہیے کہوں کہیے نہ کہوں؟ انھوں نے کہا ضرور فرمائیے۔ خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ ایسا لکھوں کہ جو دیکھے پھڑک جائے۔ وہ نسخہ ہو کہ کیمیاگر بھی وجد کرنے لگے۔ ہاں حضرت یہ تو صحیح ہے، مگر ذرا اپنی طرف سے نہ بڑھا دیجیے گا، اور چاہے خدائی بھر کے کلام کو اصلاح دیجیے۔ لیکن اللہ میاں کی شان میں یہ گستاخی ناجائز ہے۔ خوشنویس نے کہا کیا مجال یہ کلام مجید ہے۔ ممکن کیا کہ اس عاصی کے قلم سے ایک لفظ بھی بدلنے پائے۔ توبہ توبہ! آپ مطمئن رہیے۔ ایسا نہ ہونے پائے گا۔ خیر حضرت وہ تو گھر گئے ادھر میاں خوشنویس لکھنے بیٹھے۔ جب ختم کر چکے تو کتاب پاک لے کر چلے۔ کوئی ایک مہینے میں قرآن لکھ ڈالا۔ لیجیے حضور قرآن موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ میری محنت پر نظر ڈالیے، اور غور کیجیے کہ کیا دیدہ ریزی کا کام ہے۔ انھوں نے سر جھکایا اور تھوڑی دیر میں غور کر کے کہا کہ بس ایک بات صاف فرما دیجیے کہیں کچھ اپنی طرف سے تو نہیں ملا دیا ہے۔ خوشنویس نے کہا نہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کانپتے تھے مگر اس میں جا بجا شیطان اور ابلیس کا نام تھا۔ میں نے

سوچا کہ کتاب مقدس اور شیطان کا لفظ، اچھی بات نہیں۔ لہٰذا کہیں آپ کے باپ کا نام لکھ دیا، کہیں شیطان کی جگہ اپنے پدر بزرگوار کا نام لکھ دیا۔

بیگم : بس یہی لطیفہ۔ یہ تو پرانا لطیفہ ہے۔

خوجی : جی حضور اس دھاندلی کی سند نہیں۔ اب افیم پلانے کا وقت آیا تو دھاندلی کی لینے لگیں۔

اتنے میں میرزا صاحب نے خوجی کو افیم کے عوض خالی پانی پلا دیا۔ کہیں بالکل خالی پانی ہی نہ سمجھ لیجیے گا۔ اس میں ذرا سا کتھا بھی ملا تھا۔ جس میں رنگ آجائے۔ جھٹپٹا وقت۔ خوجی کو دن کو اونٹ کی گردن تو سوجھتی ہی نہ تھی، بھلا شب کے وقت افیم اور کتھے کے رنگ میں کیا تمیز کرتے۔ آپ نے غنیمت سمجھ کر پیالے کا پیالہ چڑھا لیا، مگر واہ ری افیم اور واہ رے تیرے خیال پیتے ہی حضرت غین ہو گئے۔ دین و دنیا دونوں سے بے فکر خبر ہی نہیں۔

جب چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا اور رات بھیگی تو میاں آزاد نے اپنے بستر پر آرام فرمایا اور میرزا صاحب نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے کمرے کو رشک گلزار بنا دیا، تو خوجی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔

خوجی : ایں! چو طرفہ سناٹا۔ ہو کا عالم۔ آدمی کیا جانور تک نظر نہیں آتے اور نشہ ہرن۔ بھئی کچھ عجب پھوس افیم تھی کہ گویا پی ہی نہیں۔ پہلے تو بڑا زور کیا تھا۔ میں غین ہی ہو گیا تھا۔

راوی : اور یہ خبر ہی نہیں۔ کہ افیم کے عوض دو چار تولے کتھا گھول کر پی گئے باقی رہا نشہ اس کی نہ کہیے۔ آپ تو بے پیے یوں ہی غین رہا کرتے ہیں۔

خیر اب ذرا میاں خواجہ بدیع صاحب کی وحشت ملاحظہ فرمائیے۔ چنیا بیگم نے انگلیوں پر نچایا۔ جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پانی جاری ہونے لگا۔ بدن سنسنا رہا ہے۔ کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے۔ خون خشک۔ اپنی قضا کے خود نوحہ خوان۔ نزاع کی حالت میں سسکتے رہے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی۔ ڈبیا جیب سے نکالی کہ شاید کھرچن ورچن، اوچھن پوچھن، پڑی پڑائی ہو، تو اس دم جی جائیں۔ دیکھا تو صفا چٹ۔ بس سن سے جان نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت۔ انسان کیا معنی مرغ و ماہی تک آرام میں۔ اب افیم آئے تو کہاں سے۔ سوچ کر بھئی چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے جائیں گے اور بیچ کھیت جائیں گے۔ افیم کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لائیں گے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ دن سے چل کھڑے ہوئے۔ گلی میں کانسٹبل سے مڈبھیڑ ہوئی۔

کانسٹبل : کون ؟
خوجی : ہم ہیں خواجہ بدیع ملازم سرکار۔
کانسٹبل : کہاں کام کرتے ہو۔ دفتر میں کام کرتے ہو نہ کس دفتر میں ؟
خوجی : پولیس کے دفتر میں۔ مانک جی بھائی جی کی جگہ پر۔ آج سے کام کرتے ہیں۔ یار اس وقت کہیں سے ذرا سی افیم لاؤ تو بڑا احسان ہو۔ آخر استاد پالا ہمیں سے پڑے گا۔ تمہارے ہی دفتر میں ہیں۔ سیاہ و سفید کا ہمیں کو اختیار ہے۔
کانسٹبل : ہاں ہاں ابھی اسی دم۔ اور میں تو خود افیم کھاتا ہوں۔ افیم تو لو یہ ہے، مگر اس وقت گھولو گے کس میں۔
خوجی : واہ۔ کانسٹبل ہو کر باتیں۔ گھر کی حکومت۔ سرکاری پیادے کو سب مانتے ہیں۔
کانسٹبل : اچھا چلو پلا دیں۔
خوجی : (خوش ہو کر مارے خوشامد کے) واہ صوبہ دار صاحب بڑے بڑے وقت کام آئے۔ ہم آپ جانئے افیمی آدمی۔ شام کو افیم کھانا بھول گئے۔ آدھی رات کو یاد آیا۔ ڈبیا کھولی تو سناٹا۔ نے کہیں سے پانی اور پیالی دلواؤ تو جی اٹھیں، ورنہ ایں جانب کی خیر نہیں۔ بس اب کوئی دم کا مہمان ہوں۔

الغرض کانسٹبل نے حضرت خواجہ صاحب کو خوب افیم پلوائی۔ اور خوجی نے مربھکوں کی طرح چسکی لگائی۔ گھر کو لوٹے تو راستہ بھول گئے۔ جاتے کہیں ہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے۔ ایک بھلے مانس کے دروازے پر پہنچے تو پینک میں سوجھی کہ یہی میرزا صاحب کا مکان ہے۔ واہ ری پینک۔ پھر کیا تھا وحشت کو خدا اسلامت رکھے۔ لگے زنجیر در کھڑکھڑانے، اور غل مچاتے، کھولو، دروازہ کھولو کھولو۔ بھئی اُف اب تو پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ کھڑا نہیں رہا جاتا کھولو۔ دروازہ کھول دینا!

اب سنیے! کہ میاں خواجہ بدیع صاحب باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے، اور دروازہ دھم دھماتے ہیں۔ اندر اس مکان میں ایک میاں رہتے تھے۔ انیس صدی کی پیدائش۔ خوجی کے بھی چچا۔ کوئی ایک اوپر دس برس کا سن۔ کھیل کود کے دن۔ دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں قد چشم بد دور تین کم سوا دو انچ کا۔ سوائے ہڈی اور پوست کے گوشت اور چربی کا نام بھی نہیں، اور ان کی بیوی خاصی دیو نی، ہٹی کٹی، مسٹنڈ، بڑے ڈیل ڈول کی عورت بھج بی

ہوئی، لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں، اٹھتی جوانی، مگر ایک آنکھ کانی، چال مستانہ، بول چال بیباکانہ، ایک گھونسا تان کے لگائے تو شیدی لندھور کا بھی بھرکس نکل جائے۔ کوئی دو تین کم بیس برس کی عمر، دونوں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ خوجی نے دھم دھما شروع کیا۔

میاں (چونک کر) ایں! خداوندا بچائیو یہ اس اندھیری رات میں کون آیا۔ بھئی اُف مارے ڈر کے روح کانپتی ہے۔ کیسا اندھیر اگھپ ہے۔ اپنے حساب اٹھنے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ مگر بیوی کو جگاؤں اور مردانہ کپڑے پہنا کر ساتھ لے جاؤں تو وہ بھی کانپنے لگے، کہ ہاں بڑودہ کے پہلوانوں کا گھر ہے۔ یہاں سے بچ کر جانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

خوجی : کھولو۔ میٹھی نیند سونے والو کھولو۔ یہاں جاتے دیر نہیں ہوئی، اور کواڑے جھپ سے بند کر لیے۔ کھٹیا وٹیا سب غائب کر دی۔

میاں : (سرھانے جا کر) بیگم! بیگم۔ او بیگم! کیا سو گئیں۔

وہاں سنتا کون ہے۔ جوانی کی نیند، دل لگی ہے۔ کوئی چارپائی الٹ دے تو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سر پر چکی چلے تو آنکھ نہ کھلے۔ میاں کی روح فنا۔ آنکھوں کو مارے ڈر کے ایک ہاتھ سے بند کیے ہوئے، بیوی کے سرھانے کھڑے ہیں مگر تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ ایک بار جان پر کھیل کر کچ کچا کے خوب زور سے شانہ ہلایا۔ او بیگم سنتی ہو کہ نہیں؟ جگی ہیں مگر سوں کھینچے پڑی ہیں۔

بیگم : (ہاتھ جھٹک کر) اے واہ لے کے شانہ اکھاڑ ڈالا۔ اللہ کرے یہ ہاتھ ٹوٹیں ہماری میٹھی میٹھی نیند مارے ہچکولوں کے تلخ کر دی۔ واہ اللہ جانتا ہے میں تو سمجھی ہالا ڈولا آ گیا۔ خدا خدا کر کے ذری آنکھ لگی تو ٹپکی پڑی۔ اب کی جگایا تو تم جانو گے۔ پھر اپنی داتوں تو بیٹھ کے روتے ہیں بے غیرت چل دور ہو۔

میاں : لاحول ولا قوۃ۔ کیا پھر سو گئیں۔ جیسے نیند کے ہاتھ کوئی بک جاتا ہے۔ بیگم او بیگم (ڈرتے ڈرتے) اٹھتی ہو کہ نہیں؟

بیگم : اے اوئی۔ کیا ہے کیا؟ کچھ منھ سے بولو گے بھی۔ بیگم بیگم۔ اچھی رٹ لگائی ہے۔ ڈر لگتا ہو تو منھ ڈھانپ کے سو رہو۔ ایک تو آپ نہ سوئیں دوسرے ہماری نیند بھی حرام کریں۔

خوجی : دھم دھس۔ کھڑ کھڑ کھڑ۔ کھولو! مر گیا پکارتے پکارتے۔

میاں : بھئی یہ کون ہمارا دشمن اس وقت آیا ہے۔ خدا ہی خیر کرے بیگم، او بیگم۔ خدا کرے بہری ہو جائے! ان کی نیند سے اپنی جان عذاب میں ہے۔ دیکھو توبہ کواڑ کون توڑے ڈالتا ہے۔ بندہ تو اس اندھیاری میں ہمسنے والا نہیں۔ ذری تم ہی دروازے تک جا کر دیکھ لو۔

بیگم : جی میری بیزار اٹھتی ہے۔ تمھاری تو وہی مثل ہے کہ روٹی کھائے دس بارہ، دودھ پیے مٹکا سارا، کام کرنے کو نتھا بچارا۔

پہلے تو میں عورت زاد، اور جو ڈر گئی تو پھر کیسی ہو۔ جانے کون موا آیا ہے۔ چور چکار سے بیوی کو بھرواتے ہیں۔ اے لعنت خدا، پھٹے سے مُنھ مردوے بنے ہیں۔ جُرواسے کہتے ہیں کہ باہر جا کر چور سے لڑو۔

خوجی : اجی بیگم صاحب۔ خدا کی قسم افیم لانے گیا تھا۔ دروازہ کھلوا دیجیے۔ یہ میرزا صاحب اور مولانا آزاد تو میری جان کے دشمن ہیں۔

بیگم نے جو افیم کا نام سنا تو آگ بھبوکا ہو گئیں۔ اٹھ کر میاں کو ایک لات لگائی، تو دھم سے لڑھکتی کھائی۔ اور بیوی نے اوپر سے اور کوسنا شروع کیا۔ اس افیم کو آگ لگے پینے والوں کا ستیا ناس جائے۔ ایک تو میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے کھونٹے میں باندھا، دوسرے اس کے ماں باپ نے افیم اس کی گھٹی میں ڈال دی۔ چلو بس ہو چکی زندگی تم نے جو قسم کھائی تھی کہ آج سے افیم نہ پیوں گا۔ نہ تمھاری قسم کا اعتبار، نہ زبان کا۔ قسم بھی کوئی مولی گاجر ہے کہ کر کر کرکے چبا گئے۔

میاں : (گرد جھاڑ پونچھ کر) کیوں جی اور جو میں بھی ایک لات کس کے جمانے کے لائق ہوتا، تو پھر کیسی ٹھہرتی؟

راوی : جو ہوتے نہ، اس لائق۔ ایسے ہوتے تو جورو کی جوتیاں ہی کیوں کھاتے۔ میاں دل ہی دل میں اپنے ماں باپ کو صلواتیں سنا رہے ہیں۔ واہ اچھے ماں باپ تھے۔ یہاں دھان پان آدمی۔ بیوی لا کے بٹھا دی دیونی۔ ہشت مشت یہاں مردے سے بدتر۔ ہاتھ پاؤں ہڈی ہڈی گن لیجیے۔ وہ تو بیاہ کرکے چھٹی پا گئے۔ لاتیں ہمیں کھانا پڑتی ہے۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کام ہی تمام ہو گیا۔ مگر تھا بے حیا کہ پھر (جیوں کا تیوں) موجود۔

بیگم : میرا تو قاعدہ ہے کہ پہلے تو باتوں سے سمجھاتی ہوں۔ اور کوئی نہ سمجھے تو لاتوں

سے خبر لیتی ہوں۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ تم کو کھلا پلا کر خاصا ہٹا کٹا بنا دوں۔ ہمسائی طعنے تو نہ دیں، اور تم بیوا افیم، تو جی چلے یا نہ چلے۔

میاں : تمہاری جان کی قسم کون مردود چنڈو کے قریب بھی گیا ہو۔ آج تک یا کبھی افیم کی صورت بھی دیکھی ہو۔ اور یوں خواہ مخواہ بد گمانی کا کونسا علاج ہے ذری چل کے دیکھو تو آخر ہے کون۔ کوئی ہمارا دشمن ہے کہ آن کر میاں بیوی کو لڑوا دیا۔ تم کسی کی سنتی تو ہو نہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کس کر ایک لات جما دی بس۔

میاں خواجہ بدیع صاحب اس اثنا میں اونگھ گئے۔ زنجیر پکڑے پینک میں کھڑے ہیں۔ یہ میاں بیوی چلے تو اس قطع سے کہ بیوی آگے آگے دست پناہ ہاتھ میں لیے ہوئے اور میاں پیچھے پیچھے مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے۔ راہ میں جو بیوی کا ہاتھ ذرا چھوٹ جائے تو غل مچائیں کہ ہائے مرا۔ ایسا نہ ہو کوئی پکڑے جائے۔ دروازہ کھولا تو خوجی دھڑ سے گرے سر کے بھل، اور میاں مارے خوف کے کانپ کر خوجی پر ارارا کر کے آرہے اور بیوی نے دونوں کو دبوچا۔ اچھی تگڑم ہوئی۔ مگر خواجہ صاحب اس وقت پھرتی سے نکل کر بھاگے، تو ناک کی سیدھ پر چلے۔ نشہ تو ہرن ہو ہی گیا تھا۔ سیدھے میرزا صاحب کے مکان پر داخل۔ وہاں دیکھا کہ خدمت گار پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ چپکے سے حضرت بھی اپنی کھٹیا پر دراز ہوئے، مگر مارے ہنسی کے بُرا حال۔ سوچے کہ ہم تو تھے ہی، لیکن یہ میاں صاحب ہمارے بھی چچا نکلے۔ وہ تو کل حال ان کو معلوم نہ ہوا ورنہ صبح تک نہ ضبط ہو سکتی۔ بارے بخیر گذشت۔

اخبارِ جنگ

پلا ساقی شرابِ ارغوانی — کہ مہمان ہے بہارِ زندگانی
کھٹکتا ہے مجھے یہ ہوش باقی — وہی پھر دے ترے قربان ساقی
طبیعت صورتِ مے جوش میں ہے — تمنا عزمِ نوشا نوش میں ہے
ہجوم آرزو کہتا ہے دے جام — جھکا شیشہ کہ آیا اور ہنگام
لپٹ جا اگلے سے پھر سفر ہے — نہیں معلوم کیا ہو کیا خبر ہے
خبر دارانِ الفاظ و معانی — بیان کرتے ہیں یوں اب یہ کہانی

کہ ادھر غنچہ صبح کھل کھلایا۔ ادھر میاں آزاد کو اس شکر لب، سیم غبغب بیگم کا جھمکڑا نظر آیا:

نظریں تیز یاں تیغ اجل کی — لب شیریں میں شیرینی عسل کی
غضب آنکھوں میں مثل کیف لبریز — سنان ہر مژہ دل کے لیے تیز

میاں آزاد نظر بھر کر اس جادو جمال، زہرہ تمثال کو دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ میرزا صاحب بھی انگڑائیاں لیتے ہوئے پلنگ پر سے اٹھے۔ بیگم صاحب بالکل پراگندہ نقاب بے تکلفی سے کھڑی میاں آزاد کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی تھیں۔ اپنے شوہر کی جو آہٹ پائی تو بدن کو چورا لیا۔ اور ایک طرارا بھرا تو زینہ کی اوٹ میں تھیں۔

میرزا : آداب عرض ہے۔

آزاد : کورنش، کہیے حضرت آج تو کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلیے، جو پولیٹیکل امور سے خوب واقف ہو۔ ہم سن بھی تو لیں کہ روسیوں کا قصد اب کیا ہے۔ جنگ کی ٹھہری یا نہیں ٹھہری۔ چھڑی یا ابھی کچھ دیر ہے۔ حضرت اب تو جا ہے جو ہو بندہ درگاہ جائیں اور زیچ کیمت جائیں، اب روز روز ٹالنا عقل کے خلاف ہے۔ ہم آپ کی حسن آرا سے وعدہ کر چکے ہیں۔ وہ ہر دم میری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔

بیگم : ہے تو ایسا ہی۔ قول مرداں جان دارد۔ مگر نظیر بیگم پر آپ کا دل بے طور آیا تھا۔

آزاد : (شرما کر) واہ۔

اتنے میں میرزا صاحب کو کسی نے باہر بلایا۔ یہاں میاں آزاد نے میدان خالی پایا، تو ایک گرما گرم فقرہ بیگم صاحب کو سنایا۔

آزاد : آپ نے ابھی کیا فرمایا تھا۔

بیگم : جی بھول گئے ہوں گے آپ۔ میں نے کہا تھا کہ اس نظیر بیگم پر آپ کا دل بے طور آیا تھا۔

آزاد : (دبے دانتوں) اب اس کا انصاف تو ہم نے آپ ہی پر چھوڑا۔ بس سمجھ جائیے۔

بیگم : حیا چھپنے لگی آنکھوں میں آکر — ندامت نے کیا چپ سر جھکا کر

آزاد : کچھ جواب نہ دیا حضور نے۔ میں جواب کا منتظر ہوں، مگر ٹکا سا جواب نہ دیجیے گا۔

بیگم : مجھ سے اڑیے نہیں بہت میں بھانپ گئی۔ آپ نے ایسا شافی جواب دیا کہ جی خوش ہو گیا۔

راوی : ناظرین تاڑ ہی گئے ہوں گے کہ جواب شافی کیا تھا۔ ہاں شاید بعض بزرگ منشی،

آدمی ان باتوں کو پیرانہ سالی کے سبب سے بھول گئے ہوں، تو ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔ تاکہ مطلب صاف صاف سمجھ میں آئے۔ یاد ہوگا کہ میاں آزاد میلہ دیکھنے جاتے تھے، تو ایک ایوانِ عالی شان کے رنگین و نزہت آگیں، کمرے میں ایک نگار پری چہرہ نظر پڑی، اور دونوں میں باہم آنکھ لڑی یہ تو عاشق مزاج تھے، بس جم گئے۔ وہ بھی چمن طبع نکلیں۔ جھلک دکھائی، اور نظر سے اوجھل۔ کبھی اُس دریچی سے چاند سا مکھڑا دکھایا۔ کبھی اس کھڑکی سے جھمکڑا دکھایا۔ انھوں نے غل مچایا کہ :

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی   بازارِ خویش و آتشِ ماتیز می کنی

الغرض اوپر سے وصلیاں آئیں، اور آزاد پکار اٹھے کہ لو نقشہ جم گیا۔ وصلی وصال کی خبر دیتی ہے۔ الغرض اُدھر نکھار اور سنگار، ادھر طبیعت بے قرار، آخر کار اندر سے ایک عورت آئی، اور میاں آزاد کو لے گئی۔ اس مشتری خصال کو معلوم تھا کہ میاں آزاد یہی ہیں۔ اور اس کی بہن حسن آرا کا دل اسی جوان پر آیا ہے۔ پیاری بہن کا پیار ان کا پیارا پہلے ہو چکا۔ بیگم نے ان کو خوب ٹٹولا اور لگاوٹ کی باتیں کیں کہ دیکھوں ان کو حسن آرا کا تہ دل سے پیار ہے یا فقط زبانی داخلہ۔ آزاد نے جو بغور اس کو بت پندار پر نظر ڈالی تو کہنا شروع کیا کہ۔ ع۔ اے گل بتو خرسندم تو بوی کسی داری،، وجہ یہ کہ حسن آرا کی اور ان کی شبیہ ملتی تھی۔ وہی قد و قامت وہی چال ڈھال، وہی خط و خال، میاں آزاد کی باتوں سے ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ سچے اس کے عاشق ہیں۔ جب ہی تو میاں آزاد نے کہا کہ خود ہی انصاف کیجیے۔

میرزا اسد بیگ صاحب جو باہر سے تشریف لائے تو میاں آزاد سے انھوں نے یوں بات چیت کی۔

میرزا : کہیے آج کیا قصد ہیں، کدھر کے دھاوے ہیں ؟

آزاد : اس وقت ہم کو کسی ایسے لائق آدمی کے پاس لے چلیے، جو معاملات موجودہ ٹرکی سے خوب واقف ہو۔ ہمیں وہاں کا کچھ حال معلوم ہی نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ وہاں جنگ ہوئی یا ابھی روسی کندے ہی تول تول کے رہ جاتے ہیں۔ کچھ سن تو لیں۔ پھر وہاں کے رنگ ڈھنگ تو معلوم ہوں۔ کسی انگریزی خواں کے پاس لے چلیے۔ انگریزی اخبارات کہیں سے مل جائیں تو واہ جی واہ۔ ہم خود ہی سب حالات پڑھ لیں۔ کاہے کو کسی کے پوچھنے کی حاجت رہے۔

میرزا : بہت خوب چلیے! میرے ایک دوست ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ہیں۔ بڑے طبّاع آدمی۔ انگریزی اخبارات کے کارسپانڈنٹ بھی ہیں، اور خلیق مرد آدمی۔ یار باش، زندہ یاد۔

آزاد : بس چلیے ایسے ہی لوگوں سے تو یہ بات ممکن ہے۔ ان سے ہم سے خوب میزان پٹے گی۔ بس اور کچھ چاہے نہ بتائیں، لیکن اخبارات انگریزی ذری دکھادیں۔ میں کل حالات خود پڑھ لیں گے۔

بیگم : اے تو کچھ کھاتے تو جاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

آزاد : جی نہیں اب جانے ہی کی دھن ہے۔ جانے دیجیے۔ کوئی دو گھنٹے میں آئے جاتے ہیں۔

بیگم : اچھا تو پھر بے چاء پلائے تو ہم نہ جانے دینے کے۔ چاء پیتے جاؤ۔ گرما گرم پھر چاہے جب آؤ۔

آزاد : بہت خوب آپ کا حکم بسر و چشم منظور۔ لائیے چاء، مگر اس کے تیار کرانے میں ذرا دیر لگے گی۔

زبین : اے حضور تیار ہے۔ دیر کا ہے کی۔ تیار ہے، لائی۔

یہ کہہ کر زبین دو دھیا چاء لائی، اور آزاد اور میرزا صاحب نے بڑے شوق سے پی۔

آزاد : اب تو جانے دیجیے گا؟

بیگم : واہ وا۔ آپ ہمیں کوئی بدتمیز سمجھے ہیں۔ یہ کہاں کا سلیقہ ہے، کہ چائے پلائے اور گلوری نہ کھلائے۔

میرزا : پھر لپ جھپ بنادو، دو چار گلوریاں۔

بیگم : (تنک کر) تمھاری سی پھُرتی اور تیزی کوئی کہاں سے لائے۔

آزاد : (اپنے دل ہی دل میں) ہو نھ شوخی اور تیزی کا تو کوئی تم سے سبق سیکھے۔ پتلی کی کل بھی اتنی پھرتی سے کام نہ کر سکے۔

خیر بیگم نے گلوریاں بنائیں۔ مشکبو۔ زبین ایک خاصدان میں رکھ لائی، اور میاں آزاد نے کھائیں، اور میرزا صاحب کو کھلائیں۔

آزاد : اب اور تو کچھ باقی نہیں رہا۔ سوچ لیجیے، ابھی سویرا ہے۔

بیگم : جی بس اب آپ سیر گشت کو جائیں، دوپہر کو آؤ چاہے تیسرے پہر کو۔

آزاد اور میرزا صاحب، اور میاں خواجہ بدیع مل کر ہیڈ ماسٹر کے مکان پر گئے۔ تھوڑی دور مکان تھا چلے اور کھٹ سے داخل۔

ہیڈ ماسٹر : (میرزا صاحب سے) اخاہ۔ آج یہ چھ دن کے بعد آپ کہاں بھول پڑے۔

حضور مزاج مقدس؟

میرزا : شکر ہے، آپ کا مزاج؟

ہیڈ ماسٹر : (آزاد کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی تعریف کیجیے۔

میرزا : آپ میرے بھائی، عزیز اور دوست ہیں۔ بڑے لائق فائق بزرگوار۔ ٹرکی جانے کا قصد ہے۔

ہیڈ ماسٹر : ٹرکی! یہ کہیے، اخاہ۔ مولانا محمد آزاد صاحب۔

میرزا : جی ہاں۔ آپ ہی ہیں۔

ہیڈ ماسٹر : (آزاد سے) حضرت آئیے بغل گیر تو ہوں (استادہ ہوکر) آپ تو شہرہ آفاق قابل زیارت ہیں۔

آزاد : (بغل گیر ہوکر) حضرت یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ ایسا فرماتے ہیں، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میں تو ایک گمنام فقیر آدمی ہوں۔ گدائے بینوا۔

ہیڈ ماسٹر : آپ کا دولت خانہ کہاں ہے جناب؟

آزاد : ع۔ درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست، کیا پوچھتے ہو۔ خانہ بدوشوں کا گھر کہاں۔ قبلہ خاکسار خانہ برباد و خانہ بدوش ہے۔ لڑکپن سے اصنام دشت نوردی سے ہم آغوش ہیں۔ جہاں یہ رہے وہیں گھر ہے۔ اب تو بالفعل ٹرکی جانے کی دھن ہے۔ اور بس۔

ہیڈ ماسٹر : خدا سب کو ایسی ہی توفیق خیر دے آپ نے بڑی ہمت کی ہے۔ ع۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو،

آزاد : خدا کی مدد اور عنایت مجھے درکار ہے۔

ہیڈ ماسٹر : بیشک۔

آزاد : حضرت! تازہ حالات روم و روس کے کچھ بتائیے کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

ہیڈ ماسٹر : ٹرکی کی حالت قابل افسوس ہے۔ بڑی نازک حالت ہوگئی۔ اور دیکھ لیجیے گا کہ رفتہ رفتہ اس کے اعضا و جوارح ہی اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ گو اہل ترک ان کو غنم اور بہائم سمجھتے ہیں، مگر اجتماع مخالفین ہادم بنیاد سلطنت ہے۔

خوجی : قبلہ و کعبہ میرے پیٹ میں غنم و بہائم کا لفظ سن کر چوہے چھوٹ گئے، آنتیں تک

چاٹے جاتے ہیں۔ ذرا مہربانی کرکے جھٹ پٹ بتا دیجیے گا۔ کہ وہاں توپ دغ رہی ہے یا نہیں؟ و نادن کی آواز کان میں آتی ہے یا نہیں؟

ہیڈ ماسٹر : حضرت دنادن کی آواز تو یہاں تک آچکی۔ آپ کے کان شاید کان سماعت ہوں تو ہوں۔ بندہ نہیں سن سکتا، مگر جنگ چھڑ گئی خوب ہو رہی ہے۔

خوجی : اُف میرے اللہ! روح بس تحلیل ہی تو ہو گئی۔

آزاد : خواجہ صاحب ہمت نہ ہاریئے۔ فتح ہے انشاء اللہ!

خوجی : اجی ہمت گئی کھیلنے۔ یہاں تو توپوں کی آواز کانوں میں برابر آرہی ہے اور پاؤں ڈگمگایا جاتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر : (خوجی کی طرف اشارہ کرکے) آپ کون بزرگ ہیں؟

خوجی : مجھ ہی سے نہ پوچھیے۔ جی بندے کو لوگ خواجہ بدیع صاحب علیہ الرحمہ والغفران کہتے ہیں۔

آزاد : عرف۔؟

خوجی : جی بس رہنے دیجیے۔ آپ بیچ میں ہانک نہ لگایئے۔

آزاد : (ہیڈ ماسٹر سے) اب روس سے ہوتی ہے نہ؟

ہیڈ ماسٹر : جی نہیں رعایا سے۔ مگر سازش روسیہ ضرور ہے اس میں اصلا شک نہیں۔

آزاد : تخت پر تو بالفعل حضرت مراد آفندی ہیں نہ۔

ہیڈ ماسٹر : جی ہاں۔ مگر چوں نذ بجساب اندر۔

خوجی : !چوں خط بہ کتاب اندر، چوں بو بگلاب اندر، چوں افیم بہ ڈبیا اندر، چوں نشہ بہ پوستا اندر۔

ہیڈ ماسٹر : آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔

آزاد : کیا خاص حضرت سلطان المعظم کی رعایا باغی ہے؟

ہیڈ ماسٹر : جی ہاں اکثر صوبے بگڑ گئے، اور جنگ ہو رہی ہے۔

میرزا : ہرزہ و الابزا شریر معلوم ہوتا ہے۔ شہزادہ کلیسو ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ ترکی سے لڑیں۔

میرزا : بھلا سردیسہ ہے کہاں؟

آزاد : سلطنتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے۔ سرویہ کی تو کیا اصل وحقیقت ہے کہ روم کے منہ چڑھے، مگر درپردہ روس منحوس کی سازش ہے۔ یہ سب اسی کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر : جی ہاں۔ روسی سپہ سالار ان کے کمانیر ہوئے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا مدد ہوگی خیر۔ سرویہ تو ایک طرف، ٹیلیگرام سے منکشف ہوا کہ مانٹی نیگرو نے بھی اشتہارِ جنگ دے دیا۔

آزاد : ہاں! لاحول ولاقوۃ۔ بُری ہوئی۔

خوجی : بُری ہوئی تو پھر جاتے کیوں ہو؟ کیا تباہی آئی ہے، جو چلے روم روم۔ شامت اعمال۔

ہیڈ ماسٹر : سرویہ کی فوج سرحد سے گذر گئی۔ ترکوں سے ایک جنگ بھی ہوئی۔ سنا کہ غنیم نے لشکرِ سلطانی سے زک فاش پائی۔ مگر سرویہ والے کہتے ہیں کہ سب غلط ہے۔ ہم ڈٹے ہوئے ہیں۔ زیت شہر اور دوسرے مقاموں میں ترکوں نے جو فتح پائی اس کو اہل سرویہ مخفی رکھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ہم نے ترکوں کو سرحدِ بوسینا پر زک دی۔

خوجی : واہ کہیں دی نہ ہو۔ مگر آپ نے تو ایسے ایسے شہر بتائے کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ یہ زیت کس شہر کا نام ہے، اور دھوں کون مقام ہے؟ دیکھیے تو کل ہم بھی جاتے ہیں۔ قسم خدائے پاک کی اتنی قرولیاں بھوکی ہوں کہ پرے کے پرے صاف ہو جائیں۔ دل لگی ہے قبلہ کچھ۔

آزاد : یہ روسی سپہ سالار جو سرویہ کی طرف سے لڑتے ہیں، تو سرکاری طور پر یا اپنی ہی خوشی سے۔

ہیڈ ماسٹر : ہاؤس آف لارڈس، لارڈ ڈربی صاحب نے بجواب سوال لارڈ کمبر ڈون کے یہاں کیا کہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ روسی افسر جو سرویہ کی فوج میں مقرر ہوئے، وہ گورنمنٹ روس کی اجازت سے آئے ہوں۔ آج کی تار برقی بڑی تشویش ناک ہے۔

خوجی : اللّٰھم احفظنا من کلّ البلیّات۔ میں تو یہ خبریں سُن سُن کر نیم جاں ہو رہا ہوں منوں خون خشک ہوا جاتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر : ۷۔ جولائی کے ٹیلیگرام مرسلہ لندن سے منکشف ہوا کہ ترکوں اور

مانٹی نیگرو میں بڑی گرما گرمی سے جنگ ہوئی۔ دریائے بسوا اور درنیا جہاں ملے ہیں وہاں ایک شہر ہے ولتیا۔ اسی جگہ جنگ ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ نتیجۂ جنگ ہمارے حق میں مضر ہے۔ مانٹی نیگرو والوں نے قلعۂ میڈن فتح کر لیا۔ یہ قلعہ نہایت مستحکم ہے۔

خوجی : بس تڑ کا ہو گیا۔ ہم تو اپنے حساب ہندوستان چھوڑنے والے کو کچھ کہتے ہیں۔

آزاد : ہاں صاحب اور کیا تار ہے؟ حضرت خبر تو بُری سنائی، الاماں!

ہیڈ ماسٹر : دوسری خبر یہ ہے کہ سرویہ اور ترکوں میں کچھ عرصے تک سخت جنگ ہوئی مگر فتح و شکست نہ اُن کو نہ اِن کو اور افسوس یہ ہے کہ اہل سرویہ کی فوج کی کمان روسی افسر جنرل کمانڈر انچیف کے سپرد ہے۔ اب سرویہ سے فوج صوفیہ کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ ایک خبر یہ ہے کہ ترکوں نے سرویہ کی فوج کو مقام بلینا میں زک دی اور سرویہ کی فوج کے نو سو آدمی مقتول ہوئے۔ مگر وہ کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ہم کو زک نہیں ملی۔ ہمارے صرف دو سو آدمی مارے گئے۔ اور ہماری فوج سرحدِ رشکا سے اتر گئی۔ اور ترکوں کو ہٹا کر نودی بازار میں بھگا دیا۔

خوجی : اجی اس جنگ کا انجام کیا ہونا ہے۔ بس اتنا بتا دیجیے؟

میرزا : خبر نہیں؛

آزاد : افسوس۔ کمال رنج ہوا۔ انتہا کا قلق۔

خوجی : بھائی سنتے ہو! میاں آزاد۔ یار واپس چلو۔ اجی شرط تو یہی ہے نہ کہ تمغے لٹکا کر آؤ۔ پھر یہ خبر بس تمغے لٹکانے کی کہاں ہیں۔ ہے کہ نہیں۔ آپ واپس چلیے اور تمغہ میں ایک بنوا دوں گا۔

آزاد : ابھی تک یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام جنگ کا کیا ہو گا۔ جنگ دو سَر دار د۔ طرفین سے بجوش و خروش لڑائی ہو رہی، اور سامان بھی کم نہیں۔ دیکھیں کون دب کے رہتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر : سرویہ کا تو کیا منھ ہے کہ ٹرکی کے منھ چڑھتا ہے۔ یہ سب اسی گرگ باران دیدہ کی سازش ہے۔ اغوا کا انجام بد ہے۔ خدا خیر کرے بڑی مہیب جنگ ہوگی۔ اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر سرویہ نے شکست پائی تو روس خود خم ٹھوک کے لڑنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ پھر البتہ لوہے سے لوہا لڑے گا۔ مگر دیکھیے گا ترکی بھی کیسے لڑتے ہیں۔

بلا کے جری ہیں۔

آزاد : جی اس میں کیا شک ہے۔ ان کی جرأت کے بھی آج جھنڈے گڑے ہوتے ہیں۔ وہ بڑے لڑنے بھڑنے والے ہیں۔ روسیوں سے کیا کچھ کم تھوڑا ہی ہیں۔ مگر سامان ندارد۔ ٹکا پاس نہیں۔ جنرل اور افسر کم۔ اور بدنظمی بہت۔

خوجی : یہ آپ نے کیا فرمایا کہ ٹکا پاس نہیں۔ کیا افیم کا محصول نہیں آتا۔

الغرض میاں آزاد اور میرزا صاحب۔ اور خوجی ہیڈ ماسٹر سے رخصت ہوئے اور گھر پہنچے۔

ریل کے حادثے

میاں آزاد زنان خانے میں بیٹھے گپیں اڑا رہے تھے، اور باہر میاں خوجی زمین سے باتیں بنا رہے تھے۔ اتنے میں ایک قوال بار بدنژاد یہ مصرع گاتا ہوا ادھر راہ جانے لگا۔ اور نغمۂ دلکش و ترانۂ روح افزا سے خلق اللہ کو لبھانے لگا۔ ع۔ اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں،، بیگم آپ جانیے کم سن عورت اور چمن طبع رنگین مزاج مصرع سنتے ہی میاں آزاد سے فرمایش کر بیٹھیں کہ حضرت اس پر مصرع لگائیے۔ میاں آزاد ملیح الکلام، شیریں مقال، خوش فکر نازک خیال تو تھے ہی ادھر بیگم صاحب نے فرمایش کی ادھر میاں آزاد تڑ سے بول اٹھے:

اشتیاقِ دید سے فرصت کبھی پائی نہیں — اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں
غیر دیکھیں ان کی صورت اس کی تاب آئی نہیں — اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں
محو نظارہ رہے ایسے کہ یاد آئی نہیں — اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں
اس کی فرقت ذہن میں اپنے کبھی آئی نہیں — اس لیے تصویر جانان ہم نے کھنچوائی نہیں

بیگم : کہیے آپ کی خاطر سے اس کی تعریف کر دیں، مگر سچ پوچھو تو مصرع ذرا پھیکے ہیں۔

آزاد : ہونھ! اچھا تو آپ کوئی چٹ پٹا مصرع کہیے۔

بیگم : اے ہم عورت ذات بھلا۔ شعر شاعری کیا جانیں، اور جو آپ کی یہی مرضی ہے تو بسم اللہ:

لوحِ دل ڈھونڈھا کیے پر ہاتھ ہی آئی نہیں — اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

آزاد : بارک اللہ آپ نے تو سلمان ساوجی کے بھی کان کاٹے۔

خوجی : انھوں نے تو سلمان ساوجی کے بھی کان کاٹے اور میاں حضرت بدیع کے موشِ فکر نے کمال خجند اور وطواط اور رودکی کے کان کتر لیے۔ ذری سنیے گا کیا مصرع کہا کہ حافظ حلوائی کے بھی دانت کھٹے کر دیے۔ مگر مجھ کم بخت کو قدر دان ہی نہیں ملتا:

پینکِ افیون سے ٹک فرصت کبھی پائی نہیں — اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

اس مصرع کا سننا تھا کہ میرزا صاحب اور ان کی ہنسوڑ بیگم اور میاں آزاد ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔

آزاد : خواجہ صاحب آپ کو دقیانوس سے تلمذ تھا شاید۔ کبھو اور ٹک پرانے سکّے اب ٹکسال باہر ہیں، اور (پینکِ افیون) اس ترکیب نے تو واللہ پھڑکا ہی دیا۔

اتنے میں بیگم صاحب یوں زمزمہ سنج بیان ہوئیں۔

بیگم : (آزاد سے) ایک بات کہیں۔ جو مانو تو کہیں، نہیں بات بھی جائے؟

آزاد : جو فرمائیے منظور اور یوں بدگمانی کی تو بات ہی اور ہے۔ خواہ مخواہ پہلے ہی گمان ہوا کہ بات جائے گی۔ کہہ کر دیکھ لیجیے نہ۔ سر جائے، جان جائے، مگر بات نہ جائے۔

بیگم : ہاں! تو کہی ڈالوں۔ یہاں سے کوئی دو گھنٹے کی راہ پر ایک آخوند صاحب رہتے ہیں۔ علامۂ جلیل اور فاضلِ نبیل۔ خدا ترس، وخدا شناس، صبیح نفس، خدا رسیدہ آدمی ہیں۔ تو اس وقت ریل پر ان کے پاس چلے جاؤ۔ دعائے خیر سے بیڑا پار ہو جائے گا۔ اتنے بڑے سفر میں سینکڑوں جھک جھورے جھیلنے ہوتے ہیں جھنجھٹ ہی جھنجھٹ ہے۔

آزاد : (مسکرا کر) اچھا جانے کو کہیے چلا جاؤں، مگر میرے خیالات کے خلاف ہے۔ لوگ ہنسیں گے۔

بیگم : (تنک کر) اے ہے تو کاہے کے لیے لوگ ہنسیں گے۔ خواہی نخواہی ہنسیں گے۔

میرزا : من ضَحِکَ ضُحِکَ۔ یہ اچھی ہنسی ہے۔ فقرائے باکمال سے ملنا کچھ عیب تو ہے نہیں۔ پھر ہنسی کیسی:

روے مقصود کہ شاہاں بدعامی بینند — سببش بندگی حضرت درد لیشان ست

بیگم : آپ لاکھ باتیں بنائیے۔ میں بے بھیجے نہ چھوڑنے کی۔

آزاد : خیر تو یہاں بھی عذر نہیں۔ ایسا بے عذر آدمی بھی کم دیکھا ہوگا۔
بیگم : تو پھر اسٹیشن پر جائیے، یہی تو ریل کا وقت ہے۔
آزاد نے کپڑے وپڑے ڈانٹے۔ میاں خوجی کو ساتھ لیا، اور اسٹیشن پہنچے۔ ٹکٹ خرید گاڑی میں داخل ہوئے۔ سیٹی ہوئی، اور ریل چلی۔ کوئی آدھ کوس ریل گئی ہوگی کہ ٹھہر گئی۔ اب سب کو حیرت ہوئی کہ آدھ کوس کے فاصلے پر ریل کا ٹھہرنا کیا معنی۔ اسٹیشن نہ چوکی۔
راوی : حضرت ناظرین۔ اب ایک اور روایت طلب بات ذرا غور سے سنیے، تو مطلب سمجھ میں آئے۔
روایت : شوی مارک نامی ایک باشندۂ جرمنی، ہندوستان میں رہتے تھے۔ کئی گرنٹ انھوں نے یہاں خرید لیے تھے۔ ان کی میم خوبرو اور پری چہرہ فرانسیسی لیڈی تھیں۔ صاحب کو بڑی تمنا تھی کہ۔ ان کے گھر میں لڑکا پیدا ہو۔ مگر لڑکیوں نے ان کا گھر پرکھ لیا تھا۔ ان کی آرزوئے دلی کا خون کیا تھا۔ جب دیکھو لڑکی ہی ہوتی تھی۔ صاحب بے چارہ جھنجھلا جھنجھلا کر رہ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب:

امید کے نخل نے دیا بار خورشیدِ حمل ہوا نمودار

تو صاحب ہر روز دعائیں مانگتے تھے کہ خدا کرے اب کی لڑکا ہی ہو۔ مگر ان کی دعا قبول نہ ہوئی اب کی پھر دخترِ نیک اختر ہی تشریف لائیں۔ صاحب نے جس وقت بچے کے رونے کی آواز سنی تو بدحواس ہو کر دایہ سے پوچھا، کہ جلد بتاؤ لڑکی ہوا یا لڑکا ہوا۔ دایہ نے بصد حسرت کہا کہ حضور اب کی باری پھر مس باباہی تشریف لائیں۔ یہ سنتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے۔ فرطِ رنج و غم سے بصد حسرت باغ میں ٹہلنے لگے۔ اتنے میں صاحب کے ایجنٹ شیخ تصدق صاحب صاحب بھی تشریف لائے۔ باغ میں جا کر صاحب کو جھک کر سلام کیا۔

صاحب : دل ایجنٹ!
ایجنٹ : پیر و مرشد! خداوند! جو حکم۔
صاحب : آپ نے کچھ سُنا، آج بڑا ابُرا خبر؟
ایجنٹ : ہاں حضور بہت بڑا ابرا خبر۔
صاحب : آپ نے کیا سُنا؟
ایجنٹ : (اپنے دل میں) کیا بیڈھب سوال پوچھ بیٹھے ہیں۔ سنا کس بھکوے نے کچھ میں

توفقط ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ انھوں نے کہا بُرا خبر۔ میں نے کہا کہ بہت بڑا بُرا خبر۔

صاحب : (روکر) ہمارا میم صاحب نے اب کی پھر لڑکی دیا۔

راوی : صاحب کے رونے پر ایجنٹ کو بڑی ہنسی آئی۔ مگر آدمی تھا چالاک اور زمانہ ساز سنتے ہی لگا دوہتڑ پیٹنے۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر شوی مارک نے بھی سر پیٹنا شروع کیا۔ ایجنٹ نے خانساماں، اور بیرا، اور دھوبی، اور سقہ اور ڈورپے، اور سب نوکروں چاکروں کو بلوایا، اور کہا سب آؤ اور پیٹو۔ بھئی واللہ اس وقت کی بھی دل لگی قابل دید ہے۔ دس بارہ آدمی مل کر سر پیٹ رہے ہیں۔ جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر کسی نے نمک چھڑک دیا۔ یہ ساری کیفیت دایہ نے میم صاحب سے جڑ دی۔ انھوں نے جھلا کر کہا کہ ہم صاحب کو بہت جلد پاگل خانے بھیجنے والا ہے۔

صاحب : وِل ایجنٹ ہمارا میم صاحب ہر سال لڑکی پر لڑکی چھوڑتا ہے، اور تمھارا میم بھی۔

ایجنٹ : (روکر) حضور دونوں کو ایک ہی ٹاپے میں بند کر دیجیے۔

صاحب : ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اپنا مُنھ پیٹ ڈالے۔

ایجنٹ : اور حضور میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا اور آپ کا دونوں کا مُنھ پیٹ ڈالوں۔ آپ کی اور میری دونوں کی صورت منحوس ہے۔ دونوں بدبخت، دونوں اس قابل کہ تلے اوپر گڑھیا میں ڈبو دے۔

صاحب : وِل شیخ صاحب آپ بہت ٹھیک ٹھیک بولتا ہے۔

ایجنٹ : حضور آپ کا اور اپنا دونوں کا مُنھ جھلس دینے کو جی چاہتا ہے۔

صاحب : ہاں ٹھیک ٹھیک تم بولتا ہے۔

راوی : شیخ جی کو گالیاں دینے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ گالیاں دیتے جاتے ہیں۔ مگر صاحب سب کو ٹھیک ہی ٹھیک بتاتے ہیں۔

صاحب : دل شیخ اب آپ کچھ تدبیر سوچ کہ لڑکی نہ ہونے پاوے۔

ایجنٹ : تو حضور ایک کام کیجیے حضور تو بنگلے کے اس طرف جاکر ٹہلیں اور فدوی اس باغ میں چہل قدمی کرتا ہے۔ دونوں تدبیر سوچیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

یہ سن کر صاحب نے شیخ کو گلے سے لگایا اور خوب روئے۔ رو دھوکر صاحب تو بنگلہ کے اس طرف گئے۔ اور ادھر شیخ جی نے باغ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ چکیا آڑو گول مول،

پکے نیم سرخ، نیم سبز۔ انھوں نے موقع غنیمت جان کر آڑو چکھنے شروع کیے۔ باغبان نے تو دیکھا تھا، کہ صاحب ان سے گلے مل مل کر رو رہے تھے۔ مارے خوشامد کے جھپاک سے چاقو اور پانی لے آیا۔ دھو دھو کر اور چھیل چھیل کر آڑو کھلانے شروع کیے۔ واہ بھئی شیخ جی کیوں نہ ہو صاحب کو اچھی پٹی پڑھائی، اچھا ٹہلایا۔

الغرض دوسرے سال صاحب کے مشکوے دولت میں فرزند ارجمند تولد ہوا۔ جب لڑکا چھ برس کا ہوا تو صاحب اور میم صاحب، اس کو لے کر ریل پر سوار ہوئیں۔ اپنے گرنٹ کو جاتے تھے۔ اسی ریل پر میاں آزاد اور خوجی بھی سوار تھے۔ خیر ریل جو ٹھہری تو ایک شخص نے کہا کہ کسی کا لڑکا ریل پر سے گر پڑا ہے۔ اسی سے ریل ٹھہرا دی گئی۔ صاحب اور میم صاحب نے ادھر لڑکے کے گرنے کی خبر سنی، اور ادھر اپنے پیارے لڑکے کو غائب پایا۔ تو سن سے جان نکل گئی۔ اسی دم ریل بھی دن سے روانہ ہوئی۔ فرطِ بے قراری سے میم صاحب نیچے کود پڑیں اور صاحب نے لڑکے اور میم دونوں کو مردہ سمجھ کر رونا شروع کیا۔ قریب تھا کہ خود بھی کود پڑیں کہ اتنے میں ریل ٹھہری۔

اب سنیے کہ ان کا لڑکا انتہا کا شریر تھا۔ کھیلتے کھیلتے بنچ کے نیچے جا کر سو رہا۔ والدین کو اس کی خبر نہیں۔ جب انھوں نے لڑکے کے گرنے کا حال سنا اور اپنے لڑکے کو غائب پایا۔ تو حق الیقین کا درجہ ہوا کہ وہی لڑھک گیا۔ مگر دوسری مرتبہ جو ریل ٹھہری تو میاں صاحبزادے بنچ کے نیچے سے کھٹ سے موجود صاحب نے لڑکے کو دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اور فرطِ ابتہاج سے آنسو نکل پڑے۔ ادھر میم صاحب کا حال سنیے کہ چلتی ریل پر سے کود پڑنے کا ان کے قلب پر صدمہ تو پہنچا مگر گھاس پر گری تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں چوٹ نہ آنے پائی۔ جس وقت لوگوں نے میم صاحب کو گھاس پر سے اٹھایا تو سمجھے کہ چل بسیں لیکن تھوڑی دیر میں انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنا تھا کہ صاحب نے لڑکا ان کی گود میں ڈال دیا۔ بس اب ان کی خوشی اور مسرت کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ گلے سے لپٹایا، چھاتی سے لگایا، بار بار منھ چوم لیا اور مارے خوشی کے آنسوؤں کا تار بندھ گیا، مگر صدمہ اٹھایا تھا۔ کلیجے پر زخم کھایا تھا۔ بولنے کی تاب نہ تھی۔ بات کرنا محال تھا۔ بیٹھنا تک اس وقت وبال تھا۔ لڑکا بھی دنگ۔ مگر صاحب کا چہرہ فرطِ طرب سے گل رنگ۔ بیوی کو سمجھاتے تھے۔ تشفی دلاسا دیتے جاتے تھے، کہ وہ شدنی امر تھا، اب کیا ملال ہے۔ اب تو ہمیں قہقہے چہچہوں کا خیال ہے۔

خدا نے ہم تینوں کو بلا سے بچایا۔ بچھڑے ہوئے کو ملایا۔ لو ذرا سی برانڈی پی لو اور گھر جاؤ۔ لڑکے کو کھلاؤ۔ دل بہلاؤ۔ اللہ نے بڑی خیر کی ورنہ میں تو زندگی سے بیزار ہو جاتا۔ تیر غم کلیجے سے پار ہو جاتا۔ جب میم صاحب کو ذرا تسکین ہوئی تو آہستہ سے بولیں کہ یہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یا بیداری ہے، مگر ابھی تک نہایت بے قراری ہے۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ غش پر غش آ رہے ہیں۔ قلب الٹا جاتا ہے۔ دم بھر چین نہیں آتا ہے۔ یہ کہہ کر اپنے پیارے بیٹے کو خوب زور سے چھاتی سے لگایا۔ اور رو رو کر فرمایا، کہ لڑکے تو کیا جانے کہ تیری عمّا (اماں) پر اس وقت کیا گذری۔ مرمر کے بچی پپا (ابا) کی صورت پر مردنی سی چھائی ہے۔ سرخی نے رخساروں پر آنے کی قسم کھائی ہے۔

الغرض صاحب کے نزدیک میم اور میم کے نزدیک لڑکے نے گویا دوبارہ زندگی پائی۔

پہلے اسٹیشن پر جب ریل ٹھہری تو ایک لڑکا کوئی سات آٹھ برس کا۔ بنچ پر کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ میاں آزاد نے اس بچے کے باپ سے کہا کہ بھئی اس لڑکے کو بٹھا دو۔ وہ گھامڑ گنوار سن کر خاموش ہو رہا۔ میاں خوجی نے اس لڑکے کی ماں سے کہا کہ او نیک بخت اپنے لڑکے کو سنبھال لے۔ ریل چلا چاہتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لڑھک جائے، تو پھر لینے کے دینے پڑیں مفت میں۔ اس کے کان میں جوں نہ رینگی۔ اتنے میں ریل روانہ ہوئی۔ ریل کا چلنا ہی تھا کہ لڑکا تڑ سے لڑھکا۔ ارے! ہاتھ زخمی ہوا۔ ٹانگ میں چوٹ آئی، کان دب گیا، وہ تو کہیے خیر گذری کہ گاڑی کے اندر ہی گرا، ورنہ جو باہر گرتا تو بچنا محال تھا۔ جس وقت لڑکا گرا تو اس کی ماں نے، ارے! کر کے اٹھا لیا۔ خوجی بڑے خفا، اب ارے کاہے کو کی۔ خواجہ بدیع کمبخت تو پہلے ہی سمجھاتا جاتا تھا۔ تم سن کے چپکی ہو رہیں۔ اس کو کوئی کیا کرے۔

آزاد: میں نے بھی سمجھا دیا تھا۔ مگر سنتا کون ہے چلو۔ ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

بچوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں ریل ٹھہری اور بس وہ بنچ پر کود کر کھڑے ہو گئے۔ یا کھڑکی کے پاس کھڑے، آدھا دھڑ باہر لٹکائے، بے تکلف دیکھنے لگے۔ لڑکوں کو تمیز کہاں کہ جب ریل چلے گی۔ تو دھچکے سے قدم ڈگمگانے لگیں گے اور اس کے روانہ ہوتے ہی گر پڑیں گے۔ ذرا ریل ٹھہری اور بس وہ سمجھے کہ اب جو چاہیں وہ کریں۔ لڑکے تو خیر بچے ہیں ان کے چھوٹ جائیں گے۔ مگر ان کے والدین کی حماقت پر البتہ ہنسی آتی ہے۔ جان بوجھ کر روکتے نہیں، اور بعض احمق جو خود ہی واقف نہیں وہ اپنے لڑکے کو کیا سمجھائیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب کی بار ایسے سانحے میرے

رو برو ہو چکے ہیں۔ گورنمنٹ کو لازم ہے کہ اس قسم کے حادثات سے عوام کو اطلاع دیتی رہے۔ بلکہ ریل والے اس کو بھی اپنے فرائض میں تصور کریں تو خوب بات ہو۔

راوی : ریل جس وقت ٹھہری کئی آدمی اتر اتر پڑے۔ ایک پانڈے جی مہراج بڑے پیاسے تھے۔ تھوڑی دیر تک پکارا کیے کہ مسر جی! او پانی والا۔ جب پانی والے نے سنا تو ان کے قریب آیا۔ یہ پانڈے برہمن آدمی پرانے فیشن کے لوگ۔ ریل پر پانی پینا اشدھ یعنی ناپاک سمجھتے تھے۔ کھٹ سے اتر ہی تو پڑے، اور پلیٹ فارم پر ادھک لگا کر بیٹھ گئے۔ مگر جوتا اتار کر۔ ایک حریف بھی ٹہل رہے تھے۔ بس سمجھ جائیے حضرت نے جیسے چاہا کہ پانی پئیں ویسے ہی جمعدار نے للکارا کہ اُدھر اُدھر گنوار کہیں کا بیٹھ گئے بیچ راہ میں جانگلو۔ یہ بے چارے اٹھے کہ اس طرف جا کر پانی پئیں، مگر جوتیاں ندارد۔ ارے! ارے چہ معنی دارد۔ حریف جوتیاں اڑا لے گیا۔ اِدھر دیکھا۔ اُدھر دیکھا، جوتیاں کہیں نظر نہیں آئیں۔ لگے جمعدار سے دھینگا مشتی کرنے۔ ادھر گھنٹی بجی، سیٹی ہوئی، اور ریل دن سے روانہ باشد لپکے ہی تھے کہ ریل پر جھپ سے سوار ہو جائیں، جمعدار گلے پر موجود۔ ہاتھ پکڑ لیا کہاں چلے چچا جان۔ اب بیٹھ یہاں ہونھ کیا جلد لپکے تھے۔ ریل کو بھی کوئی چھکڑ سمجھے تھے۔ کبھی بابا راج سوار ہوئے تھے۔

پانڈے جی : تو کیا ہم یہاں ہی رہ جاویں گے۔

جمعدار : رہ جاؤ گے یا رہ گئے۔ اب جا بھی سکتے ہو۔

پانڈے جی : تم بڑے تٹ کھٹ آدمی ہو جی۔ ہم چڑھ جاتے تو تمہارا کیا ہرج تھا جی؟

جمعدار : ٹکٹ دکھاؤ۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بتاؤ۔

پانڈے جی : لو جیسے ریل نکل گئی اور ہم کا چھانڑ دہن ہائے گجب اب ہم کون اپائے کری ہو!

جمعدار : او پاکر واپنا مونٹر۔ اور ٹکٹ دکھاؤ ہم کا۔

پانڈے جی : اب ٹکٹ کہہ کے گھر سے لائی ہو۔ ٹکٹوا سار تو وہیں رہ گوا۔ تماکو کا بٹوا، لحاف، تو شک، بچھانے کی دری، یاک (ایک) پونڈ بھانگ کی جھولی۔ مدا یو کہو کہ ٹکڈی ہمرے پاس ہے بھئی۔ یو بڑی کھر گجری۔ اب ہم جائی کہاں؟

جمعدار : کانجی ہاؤس۔

راوی : جمعدار نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔ انھوں نے فوراً تار دیا، کہ ایک مسافر

کا اسباب ریل پر ہے۔ اور وہ اسی اسٹیشن پر رہ گیا۔ جلدی کے سبب سے ریل نکل گئی۔ وہ نا پاہی گیا۔ پانڈے جی مہراج سمجھے کہ اب پکڑے گئے۔ مال کا مال گیا۔ ریل کی ریل نکل گئی۔ مصیبت کی مصیبت پڑی۔ الّو کے الّو بنے۔ اور سرکار سے جو کچھ جرمانہ ہو وہ مزید برآں۔ جمعدار نے جوان سے کہا کہ کانجی ہاؤس جاؤ۔ تو سمجھے کہ اس طرف سرائے کو کانجی ہوس کہتے ہوں گے۔ بندیل کھنڈ کے آدمی، لوگوں سے کانجی ہاؤس کا راستہ پوچھنے لگے۔ دل لگی باز آدمیوں نے فقرے دینے شروع کیے۔ کسی نے پچھم بتایا، کسی نے پورب، آخر کار ایک بھلے مانس نے کہہ دیا کہ کچھ بے وقوف ہوئے ہو۔ کانجی ہاؤس جا کے کیا گھانس کھاؤ گے پاگل! گدھے ہو یا بیل یا بچھیا کے تاؤ۔ نرا احمق ہے رے، اپنا کام کرو آدھ گھنٹے میں ریل آتی ہو گی۔ اسی پر سوار ہو جانا۔ اب پھر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے اور لطف یہ کہ وہ اور ان کی میم کمرے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور آپ نے پردہ اٹھایا کھٹ سے اندر۔

اسٹیشن ماسٹر: تم کون ہے؟ سور بے پوچھے چلا آیا۔ کوئی ہے!

پانڈے جی: ہجور ہماری پنہی کو وے گوا۔ کاؤ کہی۔

اسٹیشن ماسٹر: چلے جاؤ گدھا۔ ہم نہیں جانتا پانی واتی۔

اتنے میں جمعدار اور تین سپاہیوں نے پانڈے جی کی گردن میں ہاتھ دیا۔ اور باہر نکال کر سمجھایا کہ نادان، اس وقت وہ کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں، اور میم صاحب بھی وہیں ہیں۔ تو کیوں گھس گیا۔ خبردار اب ایسی حرکت نہ کرنا۔

اور لطیفہ سنیے۔ جب ریل ٹھہری تو ایک صاحب نے وہیں تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ غل مچانا شروع کیا کہ کھولو۔ کھولو۔ خیر اترے تو اب گھبراہٹ نے ٹیٹوا لیا۔ دروازے کے پاس گئے بابو نے ٹکٹ مانگا۔

مسافر: باہر آؤ تو دیتے ہیں۔

بابو: ہم تمھارے لیے باہر جاؤں گا۔ تم کون کہاں کا کنڈیل ہے۔

مسافر: اجی تو صریح دیکھ رہے ہو کہ دونوں ہاتھ رکے ہوئے ہیں۔ مگر ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔ کہہ دیا کہ باہر آؤ سنتے ہی نہیں۔

بابو: تم تو بڑا اجنّت (حجّتی) آدمی ہے گا۔ تم ٹکٹ دکھائے تو جانے پاوے گا۔ نہیں تو تمھارا پاؤں میں بیڑی پڑے گا۔

مسافر : ہم صاحب سے بول دیں گے کہ بابو ہم کو دھمکاتا ہے۔ مردِ آدمی کہتے تو جاتے ہیں کہ باہر آ تو ٹکٹ لے۔ کیا نامعتبر ہیں ہم۔

بابو : ہم کیا جانے کہ تم چور ہے، یا کو بدماش (بدمعاش) ہے تم کہاں کا سیٹھ بنا ہے۔ اب تم ہمارے کو ٹکٹ نہ دے گا۔ تو ہم نہ جانے مانگتا۔ بھائی تم شالا بڑا گول مال کرتا ہے۔

مسافر : (اسباب پھینک کر) لے لے، اب ٹکٹ لے۔ بے ٹکٹ دیے نہ جائیں گے۔

راوی : حضرت بہت بگڑے۔ مارے غصّے کے چہرہ سرخ۔ بابو بے چارہ سپاہی کے آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت نے گٹھری کھولی، پندرہ منٹ میں گٹھری میں ایک بیگ تھا۔ اس کا قفل کھولا۔ کوئی تین منٹ میں بیگ سے ایک کپڑا نکالا، ایک منٹ میں کپڑے سے ٹین کا چونگا نکالا۔ دو منٹ میں چونگا کھولا۔ ایک منٹ میں چونگے سے ایک لال کپڑا نکالا۔ ایک منٹ میں وہ خوب پٹا پٹایا تھا، اس کو کھولا۔ تین منٹ میں اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ اس سے ٹکٹ نکالا۔ کوئی ستائیس منٹ میں نکل سکا۔ خدا کی پناہ ان جانگلوؤں سے خدا بچائے۔ ستائیس منٹ کے بعد بابو کو ٹکٹ ملا۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ اب اسٹیشن پر سناٹا۔ سب ہرو۔ کسی کو کتے نے تو کاٹا نہیں تھا کہ آدھ گھنٹے تک ٹکٹ ہی نکالا کرتا۔ جب ہی حضرت بابو کو باہر بلاتے تھے، کہ مزے سے گٹھری کھولیں۔ اور ٹکٹ دیں۔ گھر ہی سے کیوں نہ بھیج دیا۔

ایک مسافر کی کیفیت سنیے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ریل چلنے کو ہے تو نارنگی والے کو بلایا۔ ایک آنہ دیا، کہ نارنگیاں دے۔ اس نے پیسے تو ہتھیا لیے۔ اور دھتا بتایا۔ ریل چل کھڑی ہوئی۔ جلدی سے وہ نارنگی پک کر گاڑی میں پھینک دیں۔

آخوند صاحب کی ملاقات

الغرض میاں آزاد کوئی ڈھائی گھنٹے میں داخل منزل مقصود ہوئے، اور جناب اخوند صاحب ی ملاقات کو چلے۔ مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک مقدّس اور مسّن بزرگ بیٹھے تلاوت قرآن ید ہیں مصروف ہیں۔ چار پانچ آدمی اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں، مگر سب خاموش اور ادب کے اتھ میاں آزاد بھی ایک گوشے میں چپکے سے جا بیٹھے۔ خواجہ بدیع صاحب جھک کر تین بار سلام کر کے وند صاحب کے قریب ہی ڈٹ گئے۔ جب تلاوت قرآن سے فراغت پائی۔ تو جناب ممدوح نے اِن کو چوم لیا، اور میاں آزاد کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا، کہ آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں،

اور کیا خاص غرض ہے؟

آزاد : بمبئی سے آتا ہوں، اور غرض خاص معرضِ بیان میں لاتا ہوں۔ میرا عزم ہے کہ روم جاؤں اور ترکوں کا ہاتھ بٹاؤں۔ وہاں آج کل روسیہ نے حضرت سلطان المعظم سے جنگ کا قصد کیا ہے۔ دولت رفیعہ روم کے اعضاء وجوارح ہی اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ ایسے سفر دور دراز میں انواع و اقسام کی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آپ کی علمیت اور دعائے خیر کی برکت مشہور کالشمس فی نصف النہار ہے۔ اگر میرے حق میں دعائے خیر کیجیے۔ تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ خانۂ احسان آباد۔

آخوند صاحب : (فکر کرنے لگے)۔

راوی : سچ ہے۔ ؎

سخندانِ پروردہ پیر کہن   بیندیشد آنگہ بگوید سخن

اخوند صاحب : آپ کی ہمدردی کا حال سن کر روح مسرور ہوئی۔ حمیت اسلام واقع میں اسی کی مقتضی تھی۔ خدا آپ کو نیک نام اور فائز المرام کرے۔ آپ کی ہمت مردانہ ہی آپ کے حق میں دعائے خیر کا فائدہ بخشے گی۔ اور آپ کی حمیت آپ کو شرِ آفات سے بچائے گی۔ باقی رہا میری دعا کی نسبت، میں تو دعا دے چکا کہ خدا آپ کو فائز مرام اور نیک نام کرے۔ اس قدر غور کر لیجیے کہ آپ تو صرف ہندوستان سے روم جاتے ہیں۔ دانایانِ فرنگ تمام عالم کی سیر و سیاحت فرماتے ہیں۔ مگر وہ کبھی دعا کے طالب نہ ہوئے اور بفضل خدا ہمیشہ سرخرو اور کامیاب ہی رہے ہیں۔ اگر دن بھر دعا مانگا کروں گا تو بھی یہ ممکن نہیں کہ آندھی آئے اور میری دعا کی وجہ سے آپ کا جہاز بچ جائے یا اور سب ڈوبیں اور آپ میری دعا کے باعث سے محفوظ رہیں شاید ایسا ہی ہو، مگر میں نے صدق دل سے اپنی رائے عرض کر دی معاف فرمائیے گا!

راوی : میاں آزاد تو سمجھے تھے کہ یہ صاحب دعائے خیر دیں گے اور ایسی ایسی باتیں کہیں گے جوان کے خیالات سے بالکل خلاف ہوں۔ لیکن قضیہ بالعکس نظر آیا۔ اخوند صاحب نے اور ہی پٹی پڑھائی۔ میاں خوجی کے نزدیک الٹی گنگا بہائی۔ آزاد مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ پھڑک گئے، اور استاد ہو کر جناب اخوند صاحب کے قدموں پر گر پڑے۔

آزاد : قبلہ میں نے سنا تھا کہ آپ بڑے باکمال ہیں۔ دولت علم و فضل سے مالا مال ہیں۔ دیکھا تو اس سے بھی دہ چند پایا۔ اور اتنی ہی دیر کی صحبت میں وہ لطف اٹھایا کہ۔ ع۔ دلِ من

داند و من دانم و داند دلِ من،، اب صاف عرض کرتا ہوں کہ میرے بھی بعینہٖ وہی خیالات ہیں، جو آپ کے ہیں۔ لیکن ایک دوست کے اصرار نے مجبور کیا کہ زیارتِ انور سے محروم نہ رہوں۔ گو آیا تو تھا اوپری کے دل سے، مگر جانتا ہوں خوش خوش۔ بحمد اللہ کہ آپ جیسے ملکوتی صفات بزرگ نیک نہاد کے شرف ملاقات سے مستفید ہوا، اور آپ کے شمسِ ہدایت کی ضیا سے عیونِ باطن نے نور پایا: ع۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی،،

جناب اخوند صاحب نے میاں آزاد کو پند سود مند اور نصائح دل پسند سے درم ناخریدہ غلام کر لیا، مگر خوجی کی نظروں میں ان کا کلام ذرا بھی نہ جچا۔

الغرض میاں آزاد خوجی کو لے کر وہاں سے روانہ ہونے کو تھے، کہ خواجہ بدیع صاحب نے ایک کاغذ جناب اخوند صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ آزاد دنگ کہ یا الٰہی یہ کاغذ اس نے کیسا پیش کیا۔ بے تکا تو ہے ہی۔ کہیں کچھ سوال تو نہیں کر بیٹھا۔ اخوند صاحب نے پڑھا۔ اور مسکرا کر وہ میاں آزاد کو وہ کاغذ دے دیا۔ انھوں نے جو اس پر نظر ڈالی تو ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس میں یہ لکھا تھا۔

استفتا : چہ میفر مایند علماء دین و مفتیانِ شرع متین دریں معنی کہ اگر کسی بر جہاز افیون چیں یا مالوا یا ہر انچہ دستیاب شود بفضل خدائے عز و جل و خوہ بر جہاز و بینک ہم شود کہ ہر آئینہ لازمۂ آنست چنانکہ سرور لازمہ شراب و مست بھنگ لازمہ بنگ نوشی و موت لازمۂ چانڈو بازی، و چرس لازمۂ حمق و کانجا لازمۂ پاجی پن ست، فلہذا اگر خورد کسی افیون، بر جہاز مضائقہ داو از روئے شرع یا غیر مضائقہ۔ انچہ باشد صاف صاف بگویند کہ در شرع شرم روانہ باشد و عند الحاجت بکار نہ آید۔ سوال از اخوند صاحب قبلہ است۔ آزاد را چہ مجال کہ بخند و بر من و بر تحریر من بدیع کہ تقطاع الطریق ست بینوا و توجر وا۔

آزاد : (مسکرا کر) سبحان اللہ۔ فارسی کی اچھی ٹانگ توڑی ہے۔ بس گلا ہی ریت ڈالا۔ مگر سوال کتنا بیڈھب ہے۔

خیر : اخوند صاحب قبلہ کی ملاقات سے میاں آزاد از بس محظوظ و مسرور ہوئے۔ شام کو ریل پر سوار ہو کر تڑ سے داخل بمبئی۔ بگھی کرایہ کی میرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔

زہین : (اندر جا کر) آگئے اور وہ سڑان بھی گرتے پڑتے آرہے ہیں۔

بیگم : آگئے دیکھا ہم کہتے ہی تھے (میرزا صاحب سے) لے اب پانچ روپیہ دہنے ہاتھ سے

دھر دیجیے۔ حاشا میں ایک تو ماننے کی نہیں۔ اجی بس دھاندلی تہ کر رکھیے، واہ وا۔ یہ کون بات ہے کہ ہر کر مکر جانا۔ پانچ روپیہ کے واسطے ایمان دو گے، تو اللہ جانتا ہے ہمیں سخت رنج ہوگا۔ لاؤ بس لاؤ! (دامن پکڑ کر) میں اٹھنے تو دوں گی نہیں۔ بدا کیوں تھا۔ بدنے میں آندھی روگ ہیں۔ مگر دیتے وقت کھلتا ہے۔ تم آئے دن ایسی ہی دھاندلی کیا کرتے ہو۔ خود جیتیں تو چھین لیں، اور جو ہاریں تو بتے بتائیں۔ جی بس میں نے قسم کھائی جو بے لیے دامن چھوڑ دوں اے واہ!۔

آزاد : کیا بات ہے۔ ہم بھی تو سنیں۔

میرزا : حضرت آپ کو ہم نے حکم بدا۔

بیگم : جی یہاں حکم وکم نہیں جانتے۔ دہتے ہاتھ سے پانچ روپیہ رکھ دیجیے۔ میر فیصلی ہم نہ مانیں گے (رونی صورت بنا کر) ہمارے روپیہ حوالے کیجیے۔ بس اب رلاؤ نہیں۔

راوی : واہ ری کم سنی۔ بس دنیا میں جو کچھ ہے شباب ہے۔ جوبن، مذاق، لطف، سب کی عزت اسی کے دم سے۔ سب کی رونق اسی کے فیض قدم سے۔ بیگم صاحب کی بھولی بھالی باتیں۔ تو دیکھیے کبھی گھڑکنا، کبھی جھڑکنا، کبھی آنکھیں دکھانا، کبھی مسکرانا، کبھی رونی صورت بنانا، کبھی چٹکیاں لینا، ایک وضع پر قرار ہی نہیں۔ اہو ہو ہو! بڈھے میں یہ باتیں کہاں الہٰی توبہ! جہاں بیٹھے نقش قدم ہو گئے۔ اٹھے تو چلنا دوبھر۔ چلے لٹھیا کے سہارے۔

آزاد : آخر آپ ہی آپ دونوں لڑ رہے ہیں کچھ ہم سے بھی تو کہیے۔

میرزا : حضرت ہم پانچ روپیہ ہارے۔ دیں گے۔ جلدی کیا ہے۔ کچھ مینھ برس رہا ہے۔

الغرض میرزا صاحب نے جھکا جھکا کر پانچ روپیہ بیگم کو دیے پہلے ایک روپیہ منگوایا بیگم نے موری میں پھینک دیا۔ پھر دو دکھائے انھوں نے جھلا کر چٹکی لے لی، مگر چپکے سے۔ جس میں میاں آزاد نہ دیکھنے پائیں۔ شوخی اور حیا مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بھلا ممکن تھا کہ میرزا شرط ہار کر بیوی کو روپیہ نہ دیتے، اور پھر بیوی بھی کیسی کہ جوان، شوخ، حسین، حیا پرور طرار گل عذار، مگر مزہ اسی میں ہے کہ دو گھڑی دل لگی دیکھیں۔ مل مل کے روپیہ دیے گھر کی سہی، تیکھی چتو دیکھی، قہر آلود نظر پر نظر ڈالی، اس سے بڑھ کر اور لطف کیا ہے، آخر کار رجب خوب جھکا چکے تو پانچوں حوالے کیے، اور کہا کہ کتنی ساوی ہو۔ بھلا میں پانچ روپیہ کے لیے تم سے آنکھ چراتا۔ انھوں نے کہا بس اب بہت باتیں نہ بنائیے۔ اس کے بعد اخوند صاحب کی باتیں ہوئیں۔

واہ رے طبیب

دوسرے دن میاں آزاد کی طبیعت کچھ علیل تھی۔ خوجی کو لے کر حکیم کے پاس گئے۔ دیکھا کہ باہر کئی ڈولیاں اور فنسیں رکھی ہوئی ہیں۔ جا کر باادب بیٹھے۔ کوئی قارورہ دکھا رہا ہے۔ کوئی اپنے عارضے کا کچا چٹھا سنا رہا ہے۔ حکیم صاحب فرش مکلّف پر متمکن ہیں اور ایک مریض سے یوں گفتگو کر رہے ہیں۔

مریض : اُف ہائے!

حکیم صاحب : (نبض پر ہاتھ رکھ کر) تمہاری نبض رملی چلتی ہے۔ زار یانج پھانکو جا کر۔

آزاد : رملی کیا معنی۔ جناب حکیم صاحب؟

حکیم صاحب : ایک قسم کی نبض ہے۔

آزاد : (اپنے دل میں) بس معلوم ہو گیا کہ حکیم صاحب نرے گھامڑ کندۂ ناتراش، ہیں۔ نملی نبض کی خرابی رملی ہے۔ اور رازیانج کی خرابی زار یانج ہے۔ کسی قلمی کتاب میں رازیانج پڑھا ہو گا۔ چلیے وہ تو بھول گئے زار یانج کہنے لگے:

گر ہمیں مکتب ست وایں ملا — کار طفلاں تمام خواہد شد

حکیم صاحب : اکثر ادویہ کے نام سے بھی وہ لوگ واقف نہیں جو طب سے بے بہرہ ہیں۔ مثلاً دم الاخوین۔ یعنی دو بھائیوں کا خون گرم دوا ہے۔ فالج میں دی جاتی ہے۔ محب الآس۔ امید کا ریج۔ چوتھے درجہ کا گرم کلہ ہے۔

آزاد : ہاں! اغلب ہے کہ مسہل قوی ہو۔ اور جن لوگوں کو قبض کی شکایت ہے ان کو مفید ہو۔

حکیم صاحب : اس میں کیا شک ہے۔

آزاد : (اپنے دل میں) مار ہی ڈالا۔ حبُ الآس سرد دوا قابض اس کو حضرت مسہل قوی بتاتے ہیں۔ بھلا تخم کاہوئے مقشر کی کیا خاصیت ہے۔ حکیم صاحب سمجھے کہ کار دے مستقر پوچھتے ہیں۔ سوچے کہ کیا جواب دوں۔ یہ تو نام ہی نہیں سنا آج تک۔ فرمایا کہ ایک جانور ہوتا ہے۔ بدخشاں واقع روم میں۔ رنگ آسمانی۔ تقویے میں اس کا خون نافع ہے۔

راوی : بہت ہی خاصے۔ واہ حکیم جی۔ جو یہ واقفیت ہے تو کاہے کو مریض جانبر ہوتا

ہوگا۔ تخم کا ہوئے مقشر انتہا کا سرد ہے۔ تپ میں دیا جاتا ہے۔ آپ لقوے میں استعمال کراتے ہیں، اور گرم بتاتے ہیں۔

آزاد : کیوں جناب یہ کونین اور پولٹیس کی کیا خاصیت ہے۔

حکیم صاحب : کونین تپ کو بھڑکاتی پولٹیس پھنسی کو پھوڑا بناتی ہے۔

میاں آزاد دنگ کہ یا الٰہی یہ حکیم ہے یا ملک الموت کا چچا جان۔ الاماں الاماں! جو کہتا ہے الٹی۔ ع۔ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل،، اس سے لکھنؤ لاکھ گیا گذرا ہے تو کیا ہوا۔ پھر غنیمت ہے۔ حکیم مرزا محمد علی صاحب سرور کی لیاقت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ چار دانگ ہند میں اس خسرو اقلیم حکمت نے سکہ بٹھایا۔ مُردوں کو قم باذنی کہہ کر جلایا۔ حکیم مرزا علی خاں صاحب مخاطب بہ حکیم الملوک کی توصیف میں زبانِ ناطقہ لال ہے۔ حکیم مرزا علی حسین صاحب مخاطب بہ مسیح الدولہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ حکیم پناہ علی خاں صاحب علاج اور تشخیص دونوں میں عدیم التشبیہ۔ حکیم یعقوب صاحب جن کی گلی کو لوگ دار الشفا کہتے ہیں۔ اور جن کے کمال کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج رہا ہے۔ اب حکیم مرزا محمد جعفر صاحب کیسے مقدس اور خداترس اور لیق بزرگوار ہیں۔ حکیم میر باقر حسین صاحب حکیم سید محمد خاں صاحب ع۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست،، حکیم میرزا مظفر حسین خاں صاحب جن کے فیضانِ تعلیم سے صدہا ہزار ہا، طلبہ فائز بمرام ہیں۔ حکیم محمد اسمٰعیل صاحب، حکیم شیخ علی محمد صاحب ان اطبار کامل فن، فخر زمن کی جس قدر زیادہ تعریف کیجیے می زیبد۔ نبض پر ہاتھ رکھا اور مریض نے کہا، بس اب میں صحیح ہوں۔ ہو الشافی نسخے میں لکھا، اور بیمار نے کہا قبلہ بس۔ اب تکلیف نہ کیجیے۔ بندہ چنگا ہوگیا۔ اور یوں کسی پنساری کا فائدہ کرانا منظور ہو تو بسم اللہ!

خوجی : بھلا افیم کی کیا خاصیت ہے۔

حکیم صاحب : اول درجے میں کھیاں مارنا، دوسرے درجے میں آنکھیں مانگنا، تیسرے درجے میں غائب حواس وہوش۔ چوتھے درجے میں کفن پوش۔ حاضرین سب پھڑک گئے، اور میاں آزاد بھی لوٹنے لگے، کہ واللہ کیا کہی ہے۔ آزاد جہاں دیدہ آدمی معاً بھانپ لیا کہ حکیم جی نام ہی کے حکیم بن بیٹھے ہیں۔ پڑھے لکھے خاک نہیں ہیں۔ لیاقت واجبی ہی۔ مگر ہاں علم مجلس میں ان کے بھی جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ ضلع جگت میں طاق، آواز کسنے میں مشتاق، سب گنوں پورے۔ انھیں کون کہے لنڈورے، آٹھوں کا ٹھ کیست ہیں۔

واہ حضور۔ آپ بھی ہماری ہی جان کے خواہاں ہوئے (دل میں)، اگر اس شہر میں ایسے ہی ایسے طبیب ہیں تو کئی قبرستان آباد ہو جائیں گے۔ چو طرفہ مقبرے ہی مقبرے نظر آئیں گے۔ خدا ایسے نیم حکیم سے بچائے۔ اللہ ان کی صورت نہ دکھائے۔ جو میرا بس چلے تو کم سے کم دو ڈبل روز کی اس کو پلواؤں۔

آزاد : حضرت اب رخصت ہوتا ہوں۔ کل انشاء اللہ تخلیہ کے وقت بشرط فرصت ضرور ملوں گا۔

حکیم صاحب : (مسکرا کر) بشرطِ فرصت کے بعد ضرور کا لفظ کیا ضرور تھا؟

آزاد : غلطی ہوئی معاف فرمائیے گا۔

حکیم صاحب : غلطی بھی غلط ہے۔ غلط میں (ی) بڑھانے کیا ضرورت ہے؟

راوی : آزاد تو سمجھ گئے تھے کہ ان حضرت نے جو کچھ سیکھا ہے صرف صحبت کی وجہ سے باقی خیر صلاح۔ نملی کو رملی کہیں، اور تخم کا ہوئے مقشر کو سیاہ رنگ کا جانور بتائیں، اور ہماری گفتگو میں غلطیاں نکالیں، اے تیری قدرت۔ ع۔ مینڈک کی راز کام پیدا شد،،

آزاد : غلطی تراشیدۂ فارسی دانانِ ہندوستان ہے۔ گو اہل عجم کے کلام میں نہ ہو مگر اردو میں جائز ہے۔ اس کو بھی جانے دیجیے، یہ غلط العام ہے۔ کیونکہ اچھے اچھے ثقات مُسن کی زبان سے سنا ہے۔ پس فصیح ہوا۔ وہو المطلوب اس کی صحت کے ثبوت میں ہم حضرت زیب النساء کے کلام کو پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی ذی لیاقت تھیں۔ اور شاعری میں بھی نازک خیال و شیریں مقال سنیے!

وائے بر شاعرانِ نادیدہ — غلطی را بخود پسندیدہ
سرو را قدِ یار می گویند — سرد چوبے ست ناتراشیدہ

اس کی صحبت میں وہ وہ دلیلیں پیش کر سکتے ہیں، جو قاطع اور مُسکت خصم ہیں۔ اب کسی کو نہ ٹوک بیٹھیے گا قبلہ!

حکیم صاحب : آپ اَجْہَل ہیں۔

خوجی : (آزاد سے) اور نہ خرید و قربینچہ۔ اس وقت پاس ہوتا تو اچھل کے ٹیٹوا ریت دیتا۔

آزاد : (حکیم صاحب سے) آپ کی خفگی سر آنکھوں پر۔ مگر:

ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج — ماگذشتیم ز لطف تو غضب را چہ علاج

حکیم صاحب : آپ کو کیا یہ خبط دامن گیر ہوا ہے کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ کیا آپ اپنے کو ہم سے زیادہ ذی لیاقت تصوّر کرتے ہیں؟

خوجی : (نیم خیز ہو کر) اجی دو پیالیاں منگوائیے تو لیاقت کا حال ابھی ابھی کھل جائے دیکھیں ہم عنین ہوتے ہیں یا آپ پیں ہوتے ہیں۔ یا دو قرولیاں لائیے۔ دو دو ہاتھ ہم سے آپ سے ہو جائیں۔ دیکھیں کون سرخ رو ہوتا ہے، اور کون گھائل ہوکے روتا ہے۔ کون موچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ کون قبر میں سوتا ہے۔ مگر شکایت تو میاں آزاد سے ہے کہ آج تک قرولی نہ منگوا دی نہ منگوا دی۔

آزاد : چلیے اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ۔ آداب بجالاتا ہوں جناب حکیم صاحب۔

حکیم صاحب : خفا ہو کر نہ جائیے گا۔ بندہ تو بے نفس آدمی ہے۔ دولت خانہ آپ کا کہاں ہے؟

آزاد : حضرت ع۔ آزاد ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست،،

خوجی : مجھ سے پوچھتے تو میں کہتا کہ (بدوش) یعنی دولت خانہ بدوش

آزاد : (استادہ ہو کر) تسلیم۔

میرزا صاحب سے آزاد نے کہا کہ حضرت وہ حکیم تو نرے چوغ ہی نکلے۔ واللہ جو الف کے نام بے بھی جانتا ہو۔

میرزا : چلیے ہم آپ کو اور ایک حکیم کے یہاں لے چلیں

دوسرے نیم حکیم

سب مل کر چلے۔ سب میں خواجہ بدیع صاحب کو بھی شامل کر لیجیے گا پہنچے۔ حکیم صاحب ایک کتاب کو بغور دیکھ رہے تھے۔ یہ جا کر بیٹھے بھی، مگر اعضل نے گردن تک نہ اٹھائی۔ تو جہ صاحب کو پینک جو آئی تو عدم کی راہ لی۔ کھوپڑی یہ ٹلی۔ وہ چلی، میرزا صاحب نے آزاد کو اشارے سے دکھایا، کہ خواجہ صاحب کی خبر آگئی۔ موت ان کا پتا پا گئی۔ آزاد نے چٹکی سے چٹکی لی۔ تو چونکتے ہی وحشت میں آکر للکارا۔

خوجی : جناب نے [illegible] بات تم نے کی۔ ہم خدا کی ... میں ہیں۔ اور یہاں مراقبے میں

تھے۔ لانا تو میری قرولی۔

حکیم صاحب : (سر اٹھا کر) کیا قرولی! (آزاد سے) کیا خلل دماغ ہے اس کو۔

آزاد : حضر۔

راوی : حضرت کا لفظ کہنے کو تھے کہ خوجی نے بات کاٹ دی۔

خوجی : مجھ سے سنیے۔ ایک بہروپیے نے ناک میں دم کر دیا ہے آپ کے ہاں نسخہ وسنخہ، لکھوانے آئے نہ تو جمال گوٹہ لکھ دیجیے گا۔

آزاد : ان کی باتوں میں نہ جائیے گا ان کو قطرب ہے۔

حکیم صاحب : وہ تو صورت دیکھتے ہی میں تاڑ گیا تھا۔

خوجی : واہ رے تاڑنے والے۔ شاباش۔ اس تشخیص کے قربان۔ قصیدہ کہوں گا۔ آپ کی تعریف میں۔

حکیم صاحب : کیا آپ شاعر بھی ہیں؟

خوجی : قبلہ بس جیسے آپ حکیم ہیں۔ ویسا ہی بندہ شاعر ہے۔

حکیم صاحب : کوئی شعر فرمائیے پھر۔ کان کے پردے تک مشتاق ہیں۔

خوجی : بہت خوب مگر داد دیجیے گا۔ چاہے آپ ہی پر پھبتی کیوں نہ ہو سنیے!

مُردوں کو زندہ کرتے تھے جو وہ تو مر گئے زندوں کے قتل کو یہ مسیح الزّماں ہوئے

مطب برخاست ہو چکا تھا، مگر شاگرد البتہ دو چار دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ وہ تک مسکرا دیے حکیم جی نے چمڑے کے تکیے پر کہنیاں ٹیکیں، اور پھر کتاب پڑھنے لگے۔ اتنے میں ایک مریض آیا۔ گو وقت مطب نہ تھا، مگر حکیم صاحب مخاطب ہوئے۔

مریض : حکیم صاحب میرے دانتوں کی جڑوں میں کئی روز سے درد ہوتا ہے۔

حکیم : اجتلابِ مواد بلغمیہ اس کا باعث ہے۔ کیا وجع مبرح ہے۔

مریض : -؟-

شاگرد : آپ استفسار فرماتے ہیں کہ کیا کرب شدید ہے؟

مریض : (گھبرا کر) ہاں۔

حکیم : اچھا نسخہ لو اور تمضمض کرو۔ مگر کل حلو و حامض سے حمیہ لازم ہے۔

خوجی بھی بیٹھے بیٹھے سن رہے تھے۔ چپکے سے آزاد کے کان میں کہا کہ مولانا عبدالقدوس

صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ لغت کی سلوں کی سلیں لڑھکاتے ہیں۔ اب مریض نہ بچے گا۔ نسخہ پیا اور چمپت۔ خدا ایسے اطباء سے بچائے۔ ان کی صورت نہ دکھائے۔ آمین! آزاد نے اشارے سے کہا کہ چپکے رہو جی۔ یہ موقع کانا پھوسی کا نہیں ہے گھر پر باتیں کریں گے۔

خوجی : جناب حکیم صاحب کچھ اس عاصی بدبدیع کو بھی عرض کرنا ہے حکم ہو تو فرماؤں۔

حکیم صاحب : (فرماؤں کے لفظ پر حکیم صاحب مسکرا دیے)

خوجی : اس حکیم کے قربان بات کرتے ہی کھیسیں کاڑھ دیں۔ ابھی مرض سنا ہی نہیں اور ریشہ خطمی ہو گئے۔ آدمی گیا گل قند آفتابی ہے یہ تو حلو کی رعایت تھی اب حامض کا حال سنیے کہ شراب غموض ہے یا مہتابی ہے۔ بانبرز شراب ہے۔

حکیم صاحب : (شاگردوں سے) قطرب اسی کو کہتے ہیں۔

شاگرد : بجا قبلہ۔

خوجی : حضور مجھے۔ اختلاف غواد خلقیہ اور دغغ ہبرغ اور کرب غدید اتتے غین ہیں۔ میں نے سنا حضور رمال بھی ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ چڑیماروں کے گرو گھنٹال بھی ہیں۔

حکیم صاحب : (آزاد سے) ان کو قطرب ہے مگر سخت۔ کل بعد غور نسخہ لکھوں گا۔

خوجی : مگر واسطے خدا کے نسخے میں میٹھی دوائیں ہوں۔ نبات سفید اور گلقند اور شکر قند اور شربت نیلوفر، اور شربت جنازی، کڑوی دوا پر علی کی سنوار ہاں افیم مالوا۔ ۱۰۔ تولہ۔ افیون چینی ۵۵۔ تولہ۔ تخم بیخ پوست ۲۹ من درخت پوست، لکھ پیڑے کا لکھ پیڑا۔ ٹینکچر آف اوپیم ۵۲۔ اونس ۲۶۔ ڈریم بس پیتے ہی عالم بالا کی سیر کرنے لگوں۔ اور آپ ہی کا دم بھرنے لگوں۔

اتنے میں حکیم صاحب نے پکارا ملاحت! شاگردوں نے غل مچایا (صباحت) آزاد دنگ کہ یہ بے تکی ہانک کیسی لگائی۔ قطرب بتاتے خوجی کو تھے، مگر خود خبطی سے معلوم ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب نے مکرر آواز دی (صباحت) شاگرد بولے (ملاحت) خوجی نے دیکھا میں ہی پھسڈی رہا جاتا ہوں، اُدھر حکیم صاحب۔ ملاحت اور تلامذہ صباحت کہتے تھے، ادھر انھوں نے للکار کر پکارا (وجاہت)۔

راوی : حضرات ناظرین یہاں ایک روایت طلب بات ہے۔ لگے ہاتھوں سن رکھیے داشتہ آید بکار۔ اگرچہ بود سر مار۔ کیوں ہے نہ یہی۔ شاید کسی وقت کام آجائے۔ حکیم صاحب نے دو لونڈیاں رکھی تھیں۔ ایک ملاحت، دوسری صباحت، دونوں طرار، دونوں باغ و بہار،

دونوں گلعذار، دونوں پرکار، جو ذرا نمکین زیادہ تھی۔ اس کو ملاحت کہتے تھے، اور جو سرخ و سفید تھی اس کا نام صباحت تھا۔ ماں باپ نے خدا جانے کیا نام رکھا تھا۔ مگر حکیم آپ جانے رسیا آدمی، وہ پھڑکتے ہوئے نام رکھے کہ واہ جی واہ۔ خوجی نے جو چیخ کر وجاہت کو آواز دی تو دونوں لونڈیاں بجلی کی طرح لپک کر آئیں، مگر دونوں کم سن یا کہ بیباک۔

حکیم صاحب : ملاحت ذرا بہو بیگم سے کہہ دو کہ چار، تیار کرا دیں۔

خوجی : صباحت ذری لاڈو خانم سے کہہ دو کہ میٹھے ٹکڑے پکا دیں۔

صباحت : (بیڈھب تیور ڈال کر) اے کون لاڈو خانم۔؟

حکیم صاحب : تم جاؤ ان کو خلل دماغ ہے۔

ملاحت : (صباحت سے) اے چلو بھی موئے سودائی کے منھ نہ لگو۔

راوی : وہ دونوں لونڈیاں شوخ وچنچل نہک مہک سے درست چالاک و بیباک، لاڈو خانم کا نام سن کر خوب ہی ہنسیں اور اغیار کو دیکھ کر علاً اور بھی کھل کھلائیں اور ایک عجب ادائے دلربا سے چمک کر پردہ اٹھایا اور پھرتی کے ساتھ قدم بڑھا کر اندر گئیں، وہاں کا حال ملاحت جانیں، یا صباحت۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ اسی وقت اندر سے بھی قہقہے کی آواز آئی۔ دونوں نے جاکر جڑ ہی تو دیا کہ موا بوناٹما کہنے لگا کہ لاڈو خانم سے میٹھے ٹکڑے پکوا لاؤ۔ پھر آواز آئی کہ میٹھے ٹکڑے نہیں انگارے، سنکھیا یعنی میٹھے ٹکڑے کیسے انگارے کہے تو خیر کیا مضائقہ۔ منھ جھلسا دیں، لیکن حکیم صاحب اور ان کے شاگرد ابھی تک قطرب ہی کے پھیر میں ہیں۔ اور خواجہ بدیع صاحب کو کامل آزادی حاصل ہے کہ جو چاہیں بک دیں۔ جس کو جی چاہے گالیاں دے بیٹھیں۔ حکیم صاحب تو خود ہی تشخیص کر چکے کہ قطرب ہے۔ بس اب انکار کون کر سکتا ہے، اور شاگردوں نے بھی اتفاق کر ہی لیا ہے۔

اتنے میں آزاد نے کہا کہ پھر کل کسی وقت اس بے چارے کو لے آؤں گا۔ آپ کی توجہ سے صحت ہو جائے تو کمال عنایت اور بندہ نوازی ہے۔

حکیم : انشاء اللہ۔

شاگرد : دو دن میں علاج کر دیں۔ حکیم جی قبلہ کا دست شفا مشہور ہے۔

حکیم : آج تھوڑے پتے کتروا ڈالیے گا۔ خصوصاً چندیا کے پاس سے۔

خوجی : میں نے سنا ہے کہ آپ نے بھی تو کچھ دن خط بنایا ہے۔ پھر آپ ہی نہ الٹے استرے

سے مونڈ ڈالیے۔

ملاحت : حضور چار تیار ہے۔

خوجی : اور میٹھے ٹکڑے۔

ملاحت : قند تو منگوا دیجیے۔

خوجی : روی تو گل ولب تو قند ست   گل قند علاج درد مند ست

حکیم : ملاحت۔ اب ہم تم کو شرارت کہا کریں گے۔ کہہ دیا کہ بھاگ جاؤ دیوانے کے منھ نہ لگو۔ اور کھڑی دل لگی بازی کر رہی ہو۔

خوجی : ڈبیا میں بند کر رکھو نہ۔ ذری دو گال ہنسنے بولنے دو میاں۔ پھر پوچھا کہ کیوں حضرت آپ کے تو بہت شاگرد ہیں۔ بھلا ہم کسی سے سوال کریں۔

حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا کہ سوال کی ضرورت ہی کیا ہے جب دماغ کا علاج ہوگا تو ان کے کمال سے آپ ہی واقف ہو جائیں گے۔

خوجی : (ایک شاگرد سے) جناب حکیم صاحب کا اسم مبارک ؟

شاگرد : حضرت مولانا قاضی حکیم میرزا سعید الدین علی بیگ خاں صاحب المخاطب بمسیحائے ثانی۔

خوجی : اے ہے۔ بس اتنا ہی سا نام۔ بندے کا نام سنیے تو ہوش اڑ جائیں سناؤں ؟

شاگرد : بسم اللہ مگر ذرا دور ہی بیٹھے رہیے گا۔ آپ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

خوجی : ان کا نام تو ہے حضرت مولانا قاضی حکیم میرزا سعید الدین علی بیگ خاں صاحب المخاطب بہ مسیحائے ثانی۔ اور بندہ درگاہ کا نام ہے۔ جناب پینک مآب دائم الخمر والسکر در منبع و مجمع نور موفور، حضرت مولانا و استادنا، حکیم مفتی قاضی القضات، شیخ میر سید خواجہ خواجگان، خواجہ محمد بدیع الدولہ بہادر، اورنگ جنگ المخاطب بہ افیونیوں کے ثانی (اُف دم چڑھ گیا)۔

میاں آزاد اٹھ کھڑے ہوئے، میرزا صاحب بھی استادہ ہوئے، اور میاں خواجہ بدیع الدولہ بہادر اورنگ جنگ بھی ساتھ چلے۔ چلنے کے وقت پردے کے پاس آن کر ملاحت و صباحت نے کہ انتہا کی شریر اور شوخ طبع تھیں چھینک دیا۔ خوجی تاڑ گئے کہ ہم کو چھیڑتی ہے بس لوٹ گئے کہ بے مٹھائی کھائے اب نہ جانے کا۔ آزاد لاکھ سمجھاتے ہیں۔ میرزا صاحب

ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہیں۔ مگر وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے ہی جاتے ہیں۔ بارے خدا خدا کرکے اٹھے، اور روانہ باشد۔

راہ میں آزاد نے کہا کہ حضرت واہ رے لکھنؤ۔ واللہ ہر فن کے باکمال اب بھی وہاں موجود ہیں۔ خدا آباد رکھے۔ وہاں کا گلی کوچہ ہم کو تو دل سے پسند ہے۔ جو ہے دلبند ہے۔ الکھم زِد فزد۔

بمبئی سے بھی کوچ ہوا

میاں آزاد اور میرزا صاحب اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے باہر سے آواز دی۔ میرزا صاحب نے زیبن سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو کون ہے۔ میاں خلیفہ ہوں تو کہنا اس وقت ہم خط نہ بنوائیں گے، تیسرے پہر کو آجائیے۔ زیبن آٹا گوندھ رہی تھی اچھا کہہ کر خاموش ہو رہی اس نے پھر باہر سے آواز دی اور ساتھ ہی خدمت گار نے بھی پکارا۔ تب تو زیبن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا۔ مگر ناک بھوں چڑھاتی، ٹرٹراتی، اور خدمت گار کو بے نقط سناتی ہوئی اٹھی۔ ٹپکی پڑ جائے ایسی نوکری پر، جو ہے میری ہی جان کا گاہک، جسے دیکھو میرا ہی دشمن۔ واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر لپک۔ اب کی چاند ہو تو میں تنخواہ لے کے اپنے گھر بیٹھ رہوں۔ کیا نگوڑی نوکری کا بھی کچھ کال ہے۔ زیبن کا قاعدہ تھا کہ کام سب کرتی تھی، مگر بڑبڑا کر ہزاروں باتیں سنا کر بات بات پر تنک جانا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مگر۔ ع۔ ناز برآں کن کہ خریدار تست، اپنے کام میں برق تھی، اس سے اس کی خاطر بھی ہوتی تھی۔ الغرض منہ پھلا کر اور آٹے کو پٹک کر زیبن باہر گئیں۔ پہلے تو جاتے ہی خدمت گار کی خوب لے دے کی۔ کیا گھر بھر میں میں ہی اکیلی ہوں جب پکارتا ہے مجھی کو پکارتا ہے۔ موے اُلّو کے منہ میں نام پڑ گیا ہے۔ خدمت گار کی جانی دشمن بات بات پر للکارا کرتی تھی خیر زیبن اور خدمت گار میں چیخ چلا کی۔ اس کے بعد خدمت گار نے کہا کہ یہ آئے ہیں، میاں سے جا کر ان کا پیغام کہہ دو۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کر کہنا۔ سب باتیں سن لو، اچھی طرح، اور میاں سے کہہ دو کہ جی چاہے تو باہر ہی آن کر سن لیجیے۔ زیبن اندر آئیں۔

میرزا صاحب: کون ہے۔ کون آیا کون ہے۔

زیبن: وہ آیا ہے، ملاح یا جانے کون۔

میرزا صاحب : کہتا کیا ہے ؟

زینن : حضور وہ کہتا ہے کہ آج جہاز روانہ ہوگا۔ ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے تیار ہو رہیے۔

بیگم نے جو جہاز کا لفظ سنا، اور معلوم ہوا کہ آج ہی جہاز روانہ ہوگا تو بس دھک سے رہ گئیں۔ چہرے کی سرخی خیر باد کہہ گئی۔ زردی نے اپنا عمل کر لیا۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ ضبط نہ کرتیں تو آنسو جاری ہو جاتے مگر بہت ہی سنبھالا اور حسرت کے ساتھ میاں آزاد کی طرف دیکھنے لگیں۔

آزاد آپ جانیے۔ جہاں یاں جہاں گشت، پرلے سرے کے تجربہ کار آدمی بیگم کے دل کی بات چٹکیوں میں تاڑ لی مگر دم بخود۔

میرزا : (آزاد سے) لیجیے حضرت۔ اب کوچ کی تیاری کیجیے۔

آزاد : بسم اللہ۔ تیار مستعد۔ یہاں کچھ بڑا لمبا چوڑا اسامان تو کرنا نہیں۔ خیمہ خرگاہ نہیں۔ ایک بیگ ایک دری، ایک آفتابہ، ایک لکڑی، چلیے اللہ اللہ، خیر صلاح۔ جس وقت کہیے جھپ سے موجود۔ میرا اسامان سب لیس ہے۔ وقت پر دن سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔

خوجی : (پردے کے پاس سے) یہاں بھی مضمون واحد ہے۔ ایک ڈبیا، ایک پیالی چانڈو پینے کی، ایک نگالی ایک کنارا، ایک دونا مٹھائی کا ایک چاقو ایک قرولی، بس اللہ اللہ خیر صلاح۔ توپ، بندوق، کٹار، تلوار، وہاں مول لے لیں گے۔ بندہ بھی کیل کانٹے سے درست ہے۔

اس تقریر پر میاں آزاد اور میرزا اسد بیگ صاحب دونوں ہنس پڑے۔ خوب ہی کھل کھلائے۔ مگر بیگم صاحب کے لب پر ہنسی نہ آئی۔ بلکہ انھوں نے ایسی صورت بنائی کہ ان کے میاں بھی سمجھ گئے، اور ہنسی کو بہت ضبط کیا۔ میرزا صاحب خوب جانتے تھے کہ ان کی بیوی پاک دامن ہیں۔ اور اس سے بھی واقف تھے کہ حسن آرا میاں آزاد پر عاشق ہیں، پھر ان سے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بدظن ہو جائے۔ سمجھ گئے کہ اتنے دن تک میاں آزاد یہاں رہے سہے اب ان کی جدائی شاق کیوں کر نہ گذرے۔ خیر اشارے سے بیوی کو سمجھایا۔ لیکن اس وقت تو قلب کا کچھ عجب ہی حال تھا، اور اس بیقراری سے سچا عشق ظاہر ہوتا تھا۔ جس کو میاں آزاد اور میرزا صاحب دونوں بھانپ گئے۔ میرزا باہر گئے

کہ اس آدمی سے گفتگو کریں اور یہاں میاں آزاد اور بیگم صاحب اکیلے رہ گئے۔ کچھ دیر تک بیگم نے مارے رنج کے سر تک نہ اٹھایا، اور آزاد بھی سمجھے کہ اگر میں تشفی کا ایک کلمہ بھی کہوں گا تو بے اختیار رو ہی دیں گی۔ لہٰذا انھوں نے لب تک نہ ہلائے۔ مگر رنگ رخسار کے متغیر ہونے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے سے ان کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم نے سر اٹھایا اور آزاد سے مخاطب ہوئیں۔

بیگم : بس زبان بند ہو گئی۔

آزاد : آپ گھبرائیے نہیں۔ میں جلد واپس آؤں گا۔

بیگم : (آہ سرد کھینچ کر) ہائے اگر اتنی تشفی کر دو تو میں جی اٹھوں۔

آزاد : استقلال کو ہاتھ سے نہ دیجیے۔ آپ کو تو حسن آرا کی وجہ سے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ مجکو دیکھیے کہ تیر عشق کی خلش سے کیسے کیسے کرب سہہ رہا ہوں۔ مگر اُف تک نہ کیا۔ حسن آرا ہی کی حالت پر نظر ڈالو۔ اس بے چاری پر میری جدائی نے کیسی بجلی گرائی۔ کیا نوبت آئی۔ لیکن مستقل مزاج ہے۔ انھیں موقعوں پر انسان کو استقلال کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ صبر صبر۔

بیگم : کہنا آسان کرنا مشکل ہے۔ اُف اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا آج ہی جاؤ گے۔ آف۔ آج ہی۔!

آزاد : الٰہی میں کیوں کر سمجھاؤں۔

بیگم : تمھارے جانے کے بعد میری کیا کیفیت ہو گی، اور اب ہم تمھیں دیکھیں گے کیوں کر۔

آزاد : انشاء اللہ۔ زندگی ہے تو ہنسی خوشی پھر ملیں گے۔

بیگم : منزلوں کا سفر، کالے کوسوں، مجھے تو جیسے مایوسی سی ہے۔ میں تو سب کچھ مان جاؤں، پر جب دل بھی مانے۔ اس اندر والے کو کون سمجھائے۔ کوئی تدبیر بن ہی نہیں پڑتی۔ اللہ میں کیا کروں!

اتنے میں میرزا صاحب نے باہر سے آکر کہا کہ صبح کو بحر روم جہاز روانہ ہو گا۔ خدا کرے بخیر و عافیت واپس آیئے، اور ہم بھی شریک تقریب سعید ہوں۔

آزاد : السعی منی والاتمام من اللہ۔

بیگم : یوں جانے کو سب ہی جاتے ہیں۔ حج کو لاکھوں مرد عورت ہو آئے، مگر اتنی دور جانا، اور لڑائی میں شریک ہونا۔ بس یہی خیال تو مارے ڈالتا ہے۔

آزاد : یہ سچ ہے مگر: کشتگانِ خنجرِ تسلیم را : ہر زماں از غیب جانے دیگر ست۔

بیگم : واپس آنے کی تو بہت کم امید ہے نہ۔ جہاں گولہ چلتا ہو، وہاں کسی کا بھی بس نہیں چل سکتا۔ اتنی سی جان۔ گولے کو بھلا روک سکتی ہے کہاں۔

آزاد : یہ لاکھوں آدمی جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں اور مورچے پر جاتے ہیں، کیا سب کے سب مر ہی جاتے ہیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا، اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ قضا کا وقت کوئی ٹال ہی نہیں سکتا۔ پھر جیسے یہاں ویسے وہاں۔ دونوں مقام یکساں ہیں۔ اب اس کا خیال نہ کیجیے اور خدا کی مرضی پر شاکر رہیے۔

بیگم (آہ سرد کھینچ کر) ہاں۔

میرزا : بھئی میرا تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سرخرو ہی ہو کر آئیں گے۔ آج تو آپ جاتے ہیں، مگر خدا وہ دن جلد دکھائے گا۔ کہ پھر اسی مکان میں ہوں گے انشاء اللہ:

ہاں مشو نومید چوں واقف نئی زاسرارِ غیب باشد اندر پردہ بازیہای پنہاں غم مخور

انسان کو خدا کے معاملات میں ذرا بھی دخل نہیں۔ انسان کرتا کچھ ہے نتیجہ کچھ اور ہی نکلتا ہے۔ سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہی ہے:

من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال کاری کہ خدا کرد فلک را چہ مجال

اور موت کا تو حال ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی زیست سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور سمجھ گئے کہ اب ان کا بچنا غیر ممکن ہے، وہ دم کے دم میں خاصے ہٹے کٹے نظر آئے، اور جو اچھے بھلے چنگے تھے، وہ بات کی بات میں چل بسے سپاہیوں نے زخم کھائے، گولے کھائے، گولیاں کھائیں، تلواروں سے بدن چھلنی ہو ہو گئے، مگر بقید حیات موجود ہیں۔ ایسا بھی اکثر ہوا کہ ایک گولی قریب سے بھی نہیں نکلی، لیکن ٹھوکر کھائی اور مر گئے۔ جنگ پر جانے سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خواہ مخواہ مر ہی جائیں گے فضول ہے۔ اور یوں آبِ حیات تو کسی نے پیا ہی نہیں، کہ وہ عاقبت کے بورے بٹورے۔ طفل مکتب تک جانتا ہے کہ ہر ذی روح کے لیے موت ہے۔ اس سے نہ کوئی بچا نہ کوئی بچے گا۔ اس وقت ان باتوں کے تذکرے سے بے خبر، اس سے کہ میاں آزاد بے چارے کا دل چھوٹا پڑ جائے، اور کوئی نتیجہ نہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ اپنے اس معزز مہمان کی روانگی کے وقت ہنسی خوشی، اس کو بہ حسن لیاقت انجام دیں۔ تاکہ ان کا ساری خدائی میں نام ہو اور حسن آرا پیاری ان کے ساتھ چین سے بسر

ریں۔ اب ہمارے رونے دھونے، یا رنج کرنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ بھلا میاں آزاد کو تم روم جانے سے باز رکھ سکتی ہو۔ ممکن نہیں۔ پھر اپنے رنج و حسرت کے اظہار سے ان کو ملول و مغموم کرنا فعلِ عبث ہے یا نہیں ؟

بیگم : میں کیا کروں، یہ سب باتیں تو میں بھی جانتی ہوں، مگر سمجھاؤں کسے۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔ ضبط کر رہی ہوں۔

آزاد : آپ میرا کہا مانیے تو خوب رو لیجیے، تاکہ بخار چھنٹ جائے۔ رونے کا ضبط اچھا نہیں۔ رونے کے ضبط کرنے میں قلب پر ایک قسم کی حرارت ہو جاتی ہے۔ خفیف سا بخار آتا ہے، اور انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر دل کو خوب مضبوط رکھو اور سمجھاؤ کہ خوف کیا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے جنگ ہوا ہی کی ہے، اور آدمی موروچوں پر جایا ہی کیے ہیں۔ ایک میں ہی اکیلا تھوڑا ہی جاتا ہوں۔ جب تک آپ دل کو ڈھارس نہ دیں گی دہلیز کے باہر قدم تو رکھنے کا نہیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مفت میں میری بدنامی ہو۔ اور میں روم جانے سے محروم رہوں۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد واپس آن کر آپ کی زیارت حاصل کروں گا۔ اب آپ یا خوب رو لیجیے یا ہنس دیجیے۔ میری تسلی اسی میں ممکن ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ میں اصرار نہ کروں گا کہ مبادا طبعِ نازک پر گراں گذرے۔ پہلے ہی دن زیبن مجھے للکار چلی ہیں۔ کہ بیوی نازک مزاج ہیں۔ زور زور گفتگو نہ کیجیے۔

بیگم : زیبن۔ زیبن۔ پانی لاؤ۔ مُنھ دُھلاؤ۔

میرزا : جی خوش ہو گیا۔ واہ اس وقت جی خوش ہو گیا۔

آزاد : ہاں علیٰ ہذا القیاس۔ بس اب مُنھ دھو کر گلوریاں بنایئے خود بھی کھایئے۔ اور میرزا صاحب کو بھی کھلایئے۔

میرزا : زیبن پانی لاؤ۔ سنتی نہیں، یہی تو تم میں عیب ہے کہ صبح کا کام شام کو اور شام کا کام صبح کو کرتی ہو۔ لاؤ پانی جھٹ پٹ۔

زیبن : توبہ۔ اب آلو چھیلوں یا پانی پلاؤں۔

الغرض زیبن حسبِ دستور دل ہی دل میں بُرا بھلا کہتی ہوئی اٹھیں اور پانی لے گئیں۔ بیگم نے مُنھ دھویا، اور گلوریاں بنا کر میرزا صاحب اور میاں آزاد کو دیں، اور آہستہ سے کہا کہ اب میں کوئی ایسا کلمہ زبان پر نہ لاؤں گی جس سے میاں آزاد کو یا ان کو رنج

ہو۔ یا جس سے میرے رنج کا اظہار ہو، باہر سے خوجی نے آواز دی۔

خوجی : مولانا محمد آزاد صاحب کہیے اب چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ خواجہ بدیع کی بھی فکر ہے۔ وہ قرولی لیتے ہی لیتے رہ گئے۔ افیون کا کیا بندوبست کیا ہے۔ یا کہیں ایسا نہ ہو کہ افیون راہ میں نہ ملے، اور ہم جیتے جی مر مٹیں۔ ذری زیبن کو بازار تک بھیج کر پونڈے کی پھاندی، اور کوئی ساٹھ ستر کتارے تو نازک نازک سے منگوا دیجیے۔ سیر ابھائی! نہیں تو میں جیتا نہ پھروں گا۔

زیبن : ہاں زیبن ہی تو گھر بھر میں فالتو ہے۔ لپک کر بازار سے بے کیوں نہیں آتے۔ کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔ یا پاؤں کی منہدی چھٹ جائے گی۔ اور افیم لینے میں عورت ذات کہاں جاؤں گی بھلا۔

بیگم : (آزاد سے) راستے میں اس طراں کے سبب سے خوب چہل پہل رہے گی۔ جی تو نہ گھبرائیے گا؟

آزاد : ہاں مگر دیکھیے کیا کیا حماقتیں کرتے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ لیے چلتا ہوں کہ شاید غم غلط ہو، مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

خوجی : اچھا پھر مورچے پر ہماری کیفیت دیکھیے گا۔ ابھی جو چاہے کہہ لیجیے۔ آپ سے سو قدم آگے ہی رہوں، تو سہی۔

میرزا : اس میں کیا شک ہے۔ جناب خواجہ صاحب اور جو غنیم کی طرف کوئی بہروپیا ہوا تو پھر کیسی ٹھہرے گی۔

خوجی : سچ کہتا ہوں اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہیں آپ۔ اگلے والی پلٹن میں رسالدار تھا۔ بندے نے اودھ میں خدا جانے کتنی گڑھیاں فتح کر لیں۔

بیگم : کیا گڑھیاں فتح کر لیں؟ اے واہ (مسکرا کر) گڑھیاں فتح کرنا خوب بات ہے۔ تم کو بھی اپنی زبان سے کہنا نہیں ہے۔

خوجی : حضور آپ تو میاں آزاد کے کہنے میں آجاتی ہیں اور مجھ کو خواہ مخواہ بناتی ہیں۔ گڑھی سے مطلب تھا۔ اس کی جمع گڑھیاں ہوئی، یا نہیں ہوئی۔ فرمائیے پھر گڑھیا کیا معنی۔ ہم بھی کسی زمانے میں رسالدار بہادر تھے۔ اب پھٹے حالوں ہیں تو کیا ہوا۔

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز　　ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

بیگم : اے رسالدار صاحب آپ کی قرولی کیا ہوئی۔ مورچہ کھا گئی ہو تو ذری صفا کر لیجیے۔ ایسا نہ ہو مورچے پر میان ہی میں رہے۔

زیبن : کیدان صاحب ہمارے لیے وہاں سے کیا (سوغات) لائیے گا؟

خوجی : اجی جیتے آئیں تو یہی بڑا تحفہ ہے۔ یہاں تو بدن کانپ رہا ہے۔ بلا کا سامنا ہے۔ اُف خدا ہی بچائے!

بیگم : (آزاد سے) خطوط بھیجا کیجیے گا یا نہیں یا ترسائیے گا؟

آزاد : ضرور بھیجوں گا۔ نہ بھیجنا کیا معنی۔

الغرض چلنے کا وقت آگیا، اور میاں آزاد نے اپنا اور خوجی کا اسباب باندھا۔ بگھی تیار ہوئی۔ سب سامان چوکس سب لیس۔ بیگم صاحب نے پھرتی کے ساتھ چار گرہ سبز اطلس، لے کر اور اُسے سیا اور اس میں ایک اشرفی رکھ دی۔ مہر شاہی ضرب مرشد آباد، امام ضامن کی اشرفی تو تیار ہو گئی۔ جس وقت میاں آزاد نے چلنے کے لیے لکڑی اٹھائی، اس وقت بیگم بے چاری بے اختیار رو دی۔ مگر دل کو تھام لیا، اور پھر مُنھ دھویا۔ چلتے وقت میاں آزاد نے کہا کہ بیگم صاحب! اب اس وقت دل کو قابو میں رکھیے۔ ورنہ راہ میں دو چار روز تک میرا بڑا برا حال ہو گا۔ اگر مجھ سے واقع میں دلی محبت ہے تو میرا کہا مان لیجیے۔ غم کو اپنے قریب آنے ہی نہ دیجیے۔ میں آج سے خط پر خط بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھیے۔ اور حسن آرا کے نام بھی خطوط کا تار باندھ دوں گا۔ بیگم صاحب نے بڑھ کر اپنے پیارے پیارے اور نازک ہاتھوں سے امام ضامن کی اشرفی باندھ دی، اور کہا کہ امام ضامن کی ضامنی جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح مُنھ بھی دکھاؤ، اور اللہ کرے مُنھ مانگی مراد پاؤ۔

آزاد : خدا حافظ!

بیگم کی پریشانی ناگفتہ بہ۔ آنکھیں لہو کی بوٹیاں۔ روتے روتے سرخ ہو گئیں۔ قلب کی عجب کیفیت تھی۔ حرکت سُست۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اور بے قراری ہر گھڑی ترقی پر تھی، مگر عورت تھی فہمیدہ یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو رہی:

دل می رود ز دستم صاحبدلان خدارا　　دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

میاں آزاد اور میرزا صاحب۔ اور خوجی جا کر بگھی پر بیٹھے بگھی روانہ ہونے کو تھی، کہ

میاں آزاد نے کہا ارے! لاحول ولا قوۃ۔ لکڑی بھول آیا۔ آپ ٹھہریں میں اندر سے ابھی ابھی آیا۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بگھی سے اُترے، اور جلدی جلدی اندر گئے۔ واہ استاد ہم سمجھ گئے۔ ع۔ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے، اندر جو حضرت پہنچے، تو دیکھا کہ بیگم کے بال پریشان ہیں، اور وہ گھبرا رہی ہیں۔ مگر زمین سمجھاتی ہیں کہ بیوی روؤ نہیں۔ اللہ چاہے تو ایک دو ہی مہینے میں آ جائیں۔ آزاد کو جو دیکھا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔

آزاد : دیکھیے بیگم صاحب اس وقت آپ کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ اب جب تک میں روم سے واپس نہ آؤں گا۔ آپ میری صورت نہ دیکھیں گی مگر خدا نے مجھ کو اور آپ کو پھر ملایا۔ بس اسی طرح خدا پر شاکر رہیے (قدموں پر گر کر)، بیگم صاحب خدا کے لیے رنج نہ کرنا ہمارا ہی خون پیے جو غم کرے۔ اب مجھے جب تک یقین نہ دلاؤ گی میں زمین سے نہ اٹھوں گا۔

بیگم : (زمین سے اٹھا کر) میں جس کی کہو قسم کھا لوں کہ اب میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ خدا تم کو واپس لائے، اور خیر و عافیت سے تم پھر بمبئی میں آن کر ہمارے یہاں رہو۔

آزاد : اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ!

بیگم : اِمام ضامن کے حوالے کیا:

بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

زمین سے کہا کہ وہی مچھلی خدمت گار کو دے کر کہہ دے کہ دروازے پر کھڑا رہے جس وقت میاں آزاد دروازے کے باہر قدم رکھیں، سامنے کر دے، اور دیکھتا رہے کہ کوئی عورت سامنے نہ آنے پائے۔

آزاد : لکڑی لے کر جھٹ پٹ باہر پہنچے، اور بگھی پر سوار ہو کر ساحل بحر کی طرف چلے تو اثنائے راہ میں میرزا صاحب سے انھوں نے کہا کہ واسطے خدا کے اپنی بیوی کو خوب سمجھاتے رہیے گا۔ آپ کا ذمہ ہے۔

خوجی نے بیڈھب، بیڈھپ، سوال ابھی سے شروع کر دیے۔

خوجی : ہمیں کوئی نہانے کو کہے گا تو ہم قرولی ہی بھونک دیں گے۔

میرزا : تو جب کوئی کہے نہ۔

خوجی : ہاں بس اتنا یاد رکھیے گا ذری۔

میرزا : کچھ زبردستی تو ہے نہیں۔ چا[illegible] کسی کا [illegible] ؟

خوجی : دیکھیے ہم پھر جتائے دیتے ہیں کہ ہم گنا چوس چوس کر سمندر کے باپ پر پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو ہم دبوچ بیٹھیں گے۔ ہاں ایسے ویسے نہیں ہم۔

آزاد : اجی اب زیادہ فکر نہ کیجیے۔ میں نے سب بندوبست کر لیا۔

خوجی : آپ کے انتظام کو بس دور ہی سے سلام ہے۔

میرزا : اجی نہیں گھبراتے کیوں ہو۔

خوجی : خدا کرے، افیم روز کی روز ملتی جائے۔

آزاد : افیم منوں ٹنوں لیجیے۔ یہ کیا بات ہے۔

خوجی : اور قرولی۔

آزاد : واہی ہو خاصے۔

خوجی : واہ کیا شرافت ہے۔ آپ کی، گالیاں ہی دینے لگے۔ واہ قبلہ،

میرزا : اجی اب خدا کا نام لو۔ یہ اول جلول باتیں نہ کرو۔

حُسن آرا کی بے قراری

از تپ و تابِ فراق تو بلب آمدہ جاں — شد ز دل تاب و تواں

بر لبم از لبِ خود شربت عناب چکاں — اے مسیحائے زماں

ہے ہے آج قلم خونیں رقم ابتدا ہی سے ماتم کر رہا ہے۔ بائیں آنکھ کا پھڑکنا اور بھی ستم ہے۔ الٰہی یہ کس کی بے قراری اور گریہ وزاری کا حال حسرت مآل زبان کلک گہر سلک سے نکل گیا کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ طبیعت قابو ہی میں نہیں۔ کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے۔ خدا ہی خیر کرے الاماں! یہ آہِ عالم سوز و جگر دوز، بے وجہ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کسی چوٹ کھائے ہوئے عاشق شیدا کے کانوں میں نائرہ درد فراق مشتعل ہے۔ یہاں آزاد اور خوجی تو جہاز پر رنگ رلیاں منا رہے ہوں گے۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا رہے ہوں گے، مگر ایک غم زدہ، ستم رسیدہ کا حال سننے کے قابل ہے۔ ایک تو عروس سرمایۂ نازنینی۔ روکش لعبتان چینی ستم کوش، یغماگر کاروان ہوش، برہم زن خانمان دیں، مہ جبین، و نازنین کو سرِ شام سے اپنے معشوق گل فام کی یاد آئی اور اس کی پیاری پیاری صورت نظروں میں ایسی سمائی کہ عقل کو رد بیٹھے۔ صبر و شکیب سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ نالا سوزان نے بجلی گرائی۔ چشم گریاں نے ساون بھادوں کی سی جھڑی لگائی اور

رورو کر یہ شعر زبان پر لائی:

آمدز جدائیت بجان دل　　که ناله کند گہی فغان دل
چوں باہمہ صدقِ عشق بازی　　گاہی نشد از تو کامران دل
بنشینم دگردِ تو بگردم　　افسانۂ عشق در نوردم

بی حسن آرا صاحب کی طبع نازک پر اگر گراں نہ گذرے، تو ہم اتنا ضرور عرض کریں گے یہ سب زبانی داخلہ ہے۔ افسانۂ عشق رہ نوردان کوئی دل لگی ہے۔ عشق نہ ہوا کھیل ہوا۔ کلیجے پر چوٹ کھائی ہے کہ باتیں اور ابھی ابتدائے عشق ہے۔ ع۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا":

الا یا ایہا السّاقی ادر کاساً وناولہا　　کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اسی بے قراری اور اختر شماری کی حالت میں حسن آرا اپنی نازک پلنگڑی پر جا کر سو رہیں۔ خدا کرے رات کو آنکھ نہ کھلے۔ کلیاں بھی چٹکیں تو ساتھ ادب کے۔ بادِ صبا بھی چلے تو دب کے۔ حسن آرا خواب ناز میں ہے:

سرھانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس وقت تو شبنم کا دوپٹہ بھی بار ہے۔ شمع کا جھلملانا بھی ناگوار ہے۔ مگر شبہائے فراق میں یہی تو ایک مونس و غمخوار ہے۔ یہی ہمصفیر یہی تسلی بخش دل بے قرار ہے:

فانوس میں نہیں ہے یہ شعلہ شرار کا　　پردے میں دل جلے ہے کسی بے قرار کا

خواب میں حسن آرا کیا دیکھتی ہے کہ ایک پیر مرد ملکوتی صفات برگزیدہ کائنات ساکنان جنان کی طرح سبز پوش، شاہد زہد سے ہم آغوش، بردیمانی در بر شال طوس کا عمامہ بر سر اس کے قریب آن کر کھڑے ہوئے، اور ایک کتابِ لاجواب دے کر فرمایا کہ اے دختِ شکر لب تیری بے قراری اور عشقِ صادق تیری پارسائی اور باوفائی نے میرے دل میں جگہ کر لی۔ اب تو بے جھجک صاف صاف بتادے کہ تیرا محبوب ہے اور تجھے کیا مرغوب ہے۔ حسن آرا نے کہا کہ:

داغ بر دل ز غم لالہ عذاری دارم　　فارغ از بیم خزاں باغ و بہاری دارم
من کجا خوابِ فراغت کہ بزیر بستر　　شب ہمہ شب زغم ہجر تو خاری دارم
ساقی از راہِ عنایت قدمے در کارم　　کہ بسر از مے دوشینہ خماری دارم
ہوس حور و قصورم ز قصورِ عقل ست　　من کہ صد درجہ بہ از حور انگاری دارم

پیر مرد : دل کو تسکین دو، اور یہ کتاب لو۔ اس میں فال دیکھو۔

حسن آرا نے کتاب لی اور پہلے پڑھا، ٹیٹل پیج، یعنی اوج پر لکھا تھا۔ دیوانِ حافظ سبحانک لا علم لنا الّا ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم :

قسم شاخ نبات ست ترا اے حافظ فال ما راست بگو تا شودم با تو یقین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کتاب کھولی تو یہ غزل نکلی :

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند وانداراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند بادہ از جامِ تجلّیِ صفاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چوں من از عشقِ رخش بیخود و حیراں گشتم خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوشدل چہ عجب مستحق بودم و اینہا بزکاتم دادند
بعد ازیں روئے من و آئینۂ حسنِ نگار کہ دراں جا خبر از جلوۂ ذاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد کہ بدان جور و جفا صبر و ثباتم دادند
ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم می ریزد[۱] اجرِ صبریست کزاں شاخ نباتم دادند
کیمیائی ست عجب بندگیِ پیر مغاں[۲] خاکِ رہ گشتم و چندیں درجاتم دادند
بحیاتِ ابد آں روز رسانید مرا خطِ آزادگی از حسن مماتم دادند
عاشق آں دم کہ بدامِ سرِ زلفِ تو فتاد گفت گر بند غم و غصہ نجاتم دادند
شکر صد شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل کہ نگارِ خوش شیریں حرکاتم دادند
ہمت حافظ و انفاس سحر خیزاں بود کز بندِ غمِ ایام نجاتم دادند

معاً آنکھ کھل گئی، تو نہ پیر مرد تھے، نہ مطالعۂ کتاب تھا۔ وہ تو بس خواب ہی خواب تھا۔ گو حسن آرا فال وال کی قائل نہ تھیں، مگر پھر بھی کسی قدر دل کو ڈھارس ہوئی۔ تڑکے انھوں نے سپہر آرا سے خواب کا حال بیان کیا۔

سپہر آرا : باجی لو فتح ہے۔ کہو تو ہم تعبیر بتا دیں۔ وہ بوڑھے میاں خواجہ خضر تھے۔ ـــــ

---

۱ یہ شعر دیوان حافظ کے متعدد نسخوں میں نہیں ملتا ہے۔

۲ یہ چار شعر دیوانِ حافظ مرتبہ فرزوہتی مطبوعہ ایران میں موجود نہیں ہیں۔

نہیں؟ آخرش تمہیں بتاؤ اور کس کو پڑی تھی کہ بے قراری کی حالت میں سر بالیں آتا۔ اور دوائے دردِ دل لاتا۔ کتاب دیتا اور اپنی راہ لیتا۔

حسن آرا : واہ رے آزاد ہمیں اس کی جواں مردی رہ رہ کے یاد آتی ہے۔ اپنی جان، اپنی جوانی، اپنی راحت، اپنی زندگی، کی فکر ہی نہ کی۔ یہاں ذرا سا دکھڑا گھنٹوں خون رلاتا ہے، مگر اس شیر مرد کی غربت پر اب افسوس آتا ہے۔ مجھ سے ملے یا نہ ملے، مگر خدا کرے زندہ بچے:

شہید عشق را نازم کہ چوں پروانہ در مشہد نہ فکرِ گور دارد خاطر نہ پروائے کفن دارد

اتنے میں ایک مغلانی نے سپہر آرا کو خط دیا۔

حسن آرا : (ہاتھ بڑھا کر) ہم پڑھیں گے۔

سپہر آرا : واہ ہم پڑھیں گے۔

حسن آرا : (پیار سے جھڑک کر) بس یہی باتیں تو ہمیں بھاتی نہیں؟

سپہر آرا : (بانکی ادا سے تنک کر) نہ بھائیں، واہ دھمکاتی کیا ہو۔

حسن آرا : (سپہر آرا کے گورے گورے گالوں میں ہاتھ پھیر کر) میری بہن، پیاری بہن، دیکھو بڑی بہن کا اتنا کہنا مان جاؤ۔ بہن ادھر مجھے خط دکھاؤ۔ لاؤ بس لاؤ خدا کے لیے۔

سپہر آرا : (بھولے پن سے) ہم تو نہ دیں گے۔

حسن آرا : تم خواہی نخواہی ضد کرتی ہو۔ بچوں کی طرح مچلی جاتی ہو۔

سپہر آرا : رہنے دیجیے۔ بس۔ واہ وا۔ ہم اپنے آزاد کا خط نہ پڑھیں۔

حسن آرا : (مسکرا کر) آپ کے کون ہیں؟

سپہر آرا : جی (لے کو خوب بڑھا کر) اور آپ کے کون ہیں؟

حسن آرا : (شرما کر) ہمارے۔ اب کیا بتاؤں؟

سپہر آرا : شرمائی نہ ہوگی۔

حسن آرا : لے اسی بات پر خط ہمارے حوالے کر دو۔

سپہر آرا : ہوں۔ کہیں حوالے نہ کیا ہو۔

لونڈی : (سپہر آرا سے) دے دیجیے۔ بڑی بہن ہیں۔ کہنا کیجیے۔

سپہر آرا : (گھڑکی دے کر) تو کون بیچ میں بولنے والی ہے۔ چل دور ہو۔ سنیے آپ بھی وہ بڑی بن کے آئی ہیں۔ بی ٹیک۔

راوی: تریاہٹ کے صدقے۔ سپہر آرا نے خط نہ دیا نہ دیا۔ اور پڑھ کر حسن آرا کو خط یوں سنایا۔

خط

اب تو جاتے ہیں ہند سے آزاد — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

حسن آرا: آمین!

سپہر آرا: کیا شعر ہے۔ اہو ہو ہو۔ خیر آگے سنیے! جان آزاد:

حسنِ تو ہمیشہ در فزون باد — رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

آج جہاز پر سوار ہوتا ہوں۔ رخصت۔ خدا حافظ۔ کہو فی امان اللہ، دو گھنٹے اور ہندوستان میں ہوں، اس کے بعد سفر، سفر، سفر، سمندر اور ہم، سفر اور ہم، ذرا دعا تو دو اور اتنا کہو کہ:

بہ سفر رفتنت مبارک باد — بہ سلامت روی و باز آئی

انشاءاللہ۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ بخت بر سرِ یاری اور طالع آمادہ، مددگاری ہے تو کیا پروا۔ پیاری حسن آرا! اس وقت میرا دل بھر آیا، مگر میرزا صاحب نے مجھ کو خوب سمجھایا تمھاری بہن پیاری بہن۔ میری جدائی سے بہت مغموم ہیں۔ جس وقت میں نے کہا کہ رخصت ہوتا ہوں، بس اس وقت کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ گھڑی گھڑی مُنھ دھوتی تھیں، اور گھڑی گھڑی روتی تھیں۔ قدم اٹھانا اس وقت مشکل ہو گیا۔ ہائے صدمۂ ہجر بھی کیا بُری چیز ہے۔ خدا دشمن کو کسی پیارے کے ہجر کا صدمہ نہ دکھائے عدو بھی جدائی کا داغ نہ پائے۔ یں خوش و خرم ہوں۔ مگر سوزِ دل اور آہِ آتشیں نے خرمنِ صبر کو پھونک دیا۔ میری پیاری حسن آرا، مجھے کسی طرح اتنی تشفی دے دو کہ تم بے قراری کی حالت میں نہیں ہو، تو اس غربت میں جی جاؤں۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہوا، مگر درد لا دوا نہیں۔ میں کچھ اس وجہ سے تو ردم جاتا نہیں ہوں، کہ بہشت میں جگہ ملے۔ بہشت کو دور ہی سے سلام۔ وہاں ایک حور ملی بھی تو کس مصرف کی۔ مرزا غالب خوب کہہ گئے ہیں کہ وہ نیکبخت اجیرن ہو جائے گی:

زنِ نو کن اے دوست در نو بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

میں تو اس لیے جاتا ہوں کہ پیاری حسن آرا کا حکم بجا لاؤں، اور اپنے پیارے بھائی مسلمانوں کا ہاتھ بٹاؤں۔ اس کوشش میں چاہے آزاد مر ہی کیوں نہ جائے، مگر ردم پر

آنچ نہ آنے پائے، اور مرنا تو برحق ہے۔ اس کا غم کیا:

زکوچ کاروانِ عمر غافل تا بکے باشی — دریں رہ آمد و رفت نفس بانگ جرس وارد

مرا در صدمۂ ہجر حسن مکن با مدعی نسبت — کہ سوزِ سینۂ پروانہ کے طبعِ مگس وارد

رخصت۔ آزادِ خستہ خاں!

ہاں پیاری سپہر آرا کو خوب سمجھانا۔ وہ بڑی رقیق القلب ہیں۔ اس وقت خوجی پانی کی صورت دیکھ کر مچل رہے ہیں۔

حسن آرا: یہ موا خوجی ابھی جیتا ہی ہے۔

سپہر آرا: اُف پانی کا نام سن کر جوڑی چڑھ آتی ہے۔

حسن آرا: غرض کہ بے چارے جہاز پر سوار ہو گئے۔ اب دیکھیں قسطنطنیہ سے کب خط آتا ہے۔

سپہر آرا: کہیے اب تو فال پر ایمان لائیں۔ دیکھا میں کیا کہتی تھی کیوں؟

حسن آرا: بجا۔

سپہر آرا: دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
دانداران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

رات کا وقت تھا کہ نہیں تھا۔ صاف صاف تو خواجہ حافظ نے کہہ دیا تھا۔ تم نہ مانو تو اس کو کوئی کیا کرے۔ اور آبِ حیات کے لفظ سے میں تاڑ گئی کہ خواجہ خضر ہی تھے۔ اب تو مانو۔ اور یوں اپنی بات کی پچ کرنا تو بات ہی اور ہے:

چہ مبارک می سحر بود و چہ فرخندہ شبی — آن شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

وہ تازہ برات کس سے مراد ہے۔ وہ یہی طرب نامۂ آزاد ہے۔ صبح کو آیا کہ نہیں؟ رات کو خواب دیکھا تھا کہ نہیں؟ پھر فرخندہ شب اس کو کہو گی یا نہ کہو گی، اور مبارک سحر اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ اس بے چارے کی کھوج خبر پائی:

اینہمہ قند و شکر کز سخنم مے ریزد — اجر صبریست کزاں شاخِ نباتم دارند

شاخ نبات پر حافظ عاشق تھے کہ نہیں؟ کہو ہاں۔ صبر کا پھل پایا یا نہیں کیا فال ہے۔ واہ حافظ شیرازی کیوں نہ ہو بالکل صاف صاف بتایا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے بادشاہزادی کا زیور چرا لیا تھا۔ انھوں نے اس سے دیوان حافظ منگوا کر فال دیکھی اور حسن اتفاق سے جس خواص نے زیور چرایا تھا وہی ہاتھ میں شمع لیے ہوئی تھی فال جو دیکھی تو یہ مصرع

نکلا - ع - چہ دلاورست دزدی کہ بکف چراغ دارد" اسی طرح ایک شخص کا لڑکا باہر گیا تھا۔ کوئی دو مہینے سے خط نہیں آیا تھا۔ اس نے فال دیکھی تو یہ شعر نکلا:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور کلبۂ احزاں شود روزی گلستان غم مخور

ذری یہاں کوئی آنا!

مغلانی : آئی بیوی۔ کہیے؟

سپہر آرا : پانچ روپیہ کی پنچ میل مٹھائی منگواؤ۔ ابھی لاؤ۔ ہم دیوانِ حافظ کو مٹھائی سے تولیں گے۔

حسن آرا : اس خبط کو دیکھیے۔

سپہر آرا : آپ کی بلا سے۔ ایک ڈلی تم بھی کھا لینا۔

حسن آرا : خوب چہ خوش۔ پانچ روپیہ کی مٹھائی اور اس میں ہم کو ایک ڈلی ملے۔ تو تُلنے کے پہلے آدھی نہ چکھ گئی ہوں تو جب ہی کہیے۔

سپہر آرا : واہ رے چکی۔ میں ایسی کچھ نہیں ہوں۔

حسن آرا : بھلا کتاب سے آیندہ کا حال کیا معلوم ہوگا۔ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے، جب کوئی فال دیکھتا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہوئے تھوڑی دیر بڑبڑائے اور کتاب کھولی۔ اپنے طور پر معنی لگانے لگے۔ واہی تباہی۔ بہن یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ہم کو بڑے صوفی نے سبق پڑھایا ہے۔

تھوڑی دیر میں سپاہی نے آواز دی کہ ماماجی مٹھائی لے جاؤ سپہر آرا دوڑی مجھے دینا۔ حسن آرا الگ پھرتی سے جھپٹی کہ ہمیں ہمیں۔ اب ماما بےچاری کس کو دے۔ ایک چنگیل دو گاہک۔ اس نے حسن آرا کو چنگیل دے دی۔

حسن آرا : اب بتائیے۔ جی چاہتا ہے کھانے کا لگا لگاؤں۔ برفی پر چاندی کے چمکتے ہوئے برق کتنی بہار دیتے ہیں۔

سپہر آرا : ماما تم ددانی (دیوانی) ہو گئی ہو کچھ۔ روپیے ہم نے دیے تھے یا انھوں نے۔ پرایا مال کیا جھپ سے اٹھا دیا۔ واہ واہ چلو میرے سامنے سے جاؤ۔ بس مٹھائی لے کے دے دی۔ ہاں ہاں کرتی جاتی ہوں۔ سنتی ہی نہیں، بیہودہ کہیں کی۔

ماما : بیوی میں ......

سپہر آرا: چلو بس رہنے دو بی بی وہی۔ اوپر سے باتیں بناتی ہیں۔ شرمائے نہ شرمانے دے۔
حسن آرا: اچھا دیوان حافظ میں پھر فال دیکھو۔ دیکھیں حافظ اب کیا حکم دیتے ہیں۔
سپہر آرا: اچھا لاؤ ہم اپنے ہاتھ سے دیکھیں گے۔

سپہر آرا نے صدق دل سے فال دیکھی۔ کتاب کھولی تو سرے پر ایک مصرع نکلا۔ ع۔

گر شراب از کفِ آن ساقئ مہوش باشد"

حسن آرا: اوپر کا مصرع پڑھو۔
سپہر آرا: ورق الٹ کر۔ ع۔ دلقِ و سجادۂ حافظ برد بادہ فروش"
حسن آرا: دلقِ سجادۂ حافظ برد بادہ فروش
گر شراب از کفِ آن ساقی مہوش باشد

کیا جانے کیا سبب ہے کہ جہاں حافظ کا شعر پڑھا اور میں بس جیسے مست ہو گئی:

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بےغش باشد — اے بسا خرقہ کہ مستوجبِ آتش باشد

اس سے تو صاف صاف کچھ مطلب نہیں نکلا۔ پھر فال دیکھو۔

سپہر آرا: فال بھی کیا کوئی لڑکوں کا کھیل ہے۔
حسن آرا: (ہنس کر) اور نہیں کیا ہے۔ اچھا اس کے ساتویں صفحہ میں دیکھو۔
سپہر آرا: (سات صفحہ گن کر):

عید ست و موسمِ گل و یاران در انتظار — ساقی بروئے شاہ ببیں ماہ و مے بیار

خیر حسن آرا نے مٹھائی دے دی، اور سپہر آرا نے اپنے ہاتھ سے تولی ایک طرف دیوان حافظ، دوسرے پلڑے میں چینکیل۔ تول کر سب کو تقسیم کی اور خوش ہو ہو کر یہ شعر پڑھنے لگی:

دلق و سجادۂ حافظ برد بادہ فروش — گر شراب از کفِ آن ساقی مہوش باشد

ماما بے وقوف کرسی کی رہنے والی، لپک کر حسن آرا کی بوڑھی دادی کو بھی اس شیرینی میں سے دس پانچ ڈلیاں دے آئی۔

بوڑھی: یہ مٹھائی کیسی؟
ماما: حضور فال دیکھی تھی۔
بوڑھی: فال کیسی؟

ماما : چٹھی آئی تھی کہیں سے اسی کے لیے دیکھی تھی۔
بوڑھی: چٹھی کیسی؟
ماما : بیوی وہی جودہ ہیں، دیکھیے کیا نام ان کا، ان کی جدائی۔
بوڑھی: جدائی کیسی۔ مردار باتیں بناتی ہے۔ لا میری جریب تو دے۔

خدا ہی خیر کرے، لکڑی بیطور مانگی۔ بوڑھی عورت، کمر جھکائے، لٹھیا ٹیکتی ہوئی چلیں۔ آئیں تو دیکھا کہ دونوں بہنیں مٹھائی چکھ رہی ہیں۔

حسن آرا : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے!۔
سپہر آرا : (ہکا بکا ہو کر) ارے!۔
بوڑھی صاحب : یہ مٹھائیاں کیسی آئی ہیں؟
سپہر آرا : اماں جان آپ کی صاحبزادی ہم سے شرط ہاریں۔ کہتی تھیں۔ ہمارے دیوانِ حافظ میں چار سو صفحے ہیں۔ میں نے کہا نہیں چار سو چالیس ہیں۔
بوڑھی : (پیٹھ پھیر کر) ہاں۔ توبہ! یہ موئی ماما تو سٹھیا گئی ہے۔ کیا جانے کیا کیا بکتی ہے۔

سپہر آرا اور حسن آرا نے بھی ماما کو چپکے چپکے خوب للکارا کہ تجھ سے ہم نے کہا کب تھا کہ اماں جان کو مٹھائی دے:

کے طالب ساغر شراب ست — از لعلِ تو ہر کہ کامیاب ست
نادیدہ بخواب دیدہ رویت — پیوستہ در آرزوی خراب ست
جان نیست دریغ از تو دل چیست — در بردنِ دل چہ اضطراب ست
مانندِ چراغ روز بے نور — پیش رُخِ یارِ آفتاب ست
جوید دم خنجرت گلویم — لب تشنہ در آرزوی آب ست
داد از تو کہ قتلِ عشقبازان — در کیش کہ داخلِ ثواب ست
از زلفِ مسلسلِ تو جانم — پیوستہ اسیرِ پیچ وتاب ست

حسن بھی عجب بلائے بیدرمان ہے۔ دیکھا اور دل ہاتھ سے جاتا رہا ہے:

من آن از حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم — کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

یوں تو خدا کی خدائی میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین ومہ جبین ہے۔ لیکن حسن آرا پر عالم ہی اور ہے۔ خدا چشم بد سے بچائے۔ ایسی لگاوٹ باز انکھڑیاں دیکھیں نہ سنیں۔ قد بوٹا سا،

پری چھم، برق دم، وہ نور کہ نظر نہ ٹھہرے، وہ رخ کہ آنکھ جھپکنے لگے:

گردمی جلوہ کنان آن بت چین برخیزد — زاہدِ گوشہ نشیں از سر دین برخیزد
بر زمینے کہ خرامی چو مسیحا نفسی — مردہ جان باید در فیصل از زمین برخیزد
آہِ گرم ونفسِ سرد بود در عشقت — آنچہ از دستِ منِ خاک نشیں برخیزد

حسن آرا کو جس نے دیکھا، پکار اٹھا کہ ہلال عید ہے۔ دید ہے۔ نہ شنید ہے، مگر یہ حسن اس بے چاری کے لیے بلا ہوگیا:

گل وگل چیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر — تو گرفتار ہوئی اپنی صلا کے باعث

حضرات ناظرین! اب ایک نیا گل کھلا چاہتا ہے۔ غضب ہوا چاہتا ہے۔ سنیے! حسن آرا اور سپہر آرا دو چار ہم جولیوں کو ساتھ لیے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے، مہتابی پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے کے چٹکی لی۔ کسی نے کسی کو گدگدایا، اور خیال نہیں کہ سہ منزلے پر کھڑی ہیں۔ خدا نہ کرے پاؤں ڈگمگائے تو غضب ہی ہو جائے۔ ہوا زناٹے سے چل رہی تھی۔ دایہ بہار پنکھا جھل رہی تھی۔ قہقہوں کی آواز فلک چنبرین تک جاتی تھی۔ ہر پری وش مارے خوشی کے کمل کھلاتی تھی۔ بوٹی بوٹی پھرکی جاتی تھی۔ پازیب کی چھماچھم شور محشر بپا کرتی تھی:

بلا بالائے من طرز خرامت — ہمی سازد خجل کبک دری را
خرام حیرت افزائے کہ آن سروِ سہی دارد — صیاد اور گلستان از وز بدن یاد میدارد

چوتھی رنگین ادا نازک آواز خوش خرام، جوان طناز:

نزاکتِ تو نسیم بہار شو خہاست — ز بارِ سایۂ گل کج شود کلاہ ترا

اتنے میں ایک پتنگ آگر گرا۔ اور سپہر آرا نے لپک کر لوٹ لیا۔ اہاہا اس پر تو کسی خوشنویس نے کچھ لکھا ہے۔ ماہی جال کا کنڈے والا پتنگ، سفید جیسے بگلے کا پر، سب کی سب دوڑ پڑیں دیکھیں، حسن آرا اور سپہر آرا کے سوا اور کوئی پڑھی لکھی تو تھی ہی نہیں۔ سپہر آرا نے پڑھ کر اشعار سنائے:

از عاشقانِ صادقت اے دلستان منم — اول کسے کہ بر تو فدا شد ز جان منم
دارم متاعِ نادر دبا خود زمدِ دیار — امروز میر قافلۂ عاشقان منم
آن کس کہ روز و شب بامید نظارہ ہا — مانند در ستادہ بران آستان منم

آن کس کہ در جہانِ محبت زمیں خود — آرد بسر بدرِ دعمت شاد مان منم
آن کس کہ جان و دل بدو صد آواز نزد — سازد ہدف بناوکِ نازِ تو آن منم
آن کس کہ پشت پا زدہ بر روضۂ ارم — آوردہ رو بکوچۂ زلفِ بیان منم
آن کس کہ در ہوائے طلبگاری بتیا — ہمچوں رضا برآمدہ گرد جہاں منم

حسن آرا کا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، پیشانی پر عرق آگیا، تاڑ گئی کہ کوئی عاشق زاد پیدا ہوئے، مجھ پر یا سپہر آرا پر شیدا ہوئے، معلوم نہیں کہ:

دم زوصفِ لعلِ جاناں میزنم — ساغری از آبِ حیوان میزنم

حسن آرا دنگ تھی کہ یا الٰہی یہ کون ذاتِ شریف ہیں، کسی نے شہ دی ہے کہ ان پر عاشق ہو۔ یا شاید اس نے کبھی باہر دیکھ لیا، مگر یہ ہے کون، بے کار اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ دماغ پھر گیا ہے۔ موئے کا کیا۔ سپہر آرا اپنے کھیل کود میں مصروف تھی۔ جب سب ہمجولیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں، تو حسن آرا نے سپہر آرا سے کہا، کہ تم کچھ سمجھیں۔ یہ پتنگ پر کیا لکھا تھا۔ تم تو کھیل میں مشغول تھیں، بس اس وقت سے یہی سوچتی ہوں کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ آزاد کے عشق کا راز سربستہ کہیں کھل تو نہیں گیا کہ اور لوگوں کو بھی عشقبازی کا شوق چرّایا۔

سپہر آرا: ہاں بہن کچھ تو میں بھی سمجھی تھی، مگر اس قدر نہیں، بُری ہوئی اب کسی سے کہو سنو نہیں۔

حسن آرا: دل میرود زدستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

سپہر آرا: اللہ کرے پردہ فاش نہ ہونے پائے۔

حسن آرا: آثار بُرے ہیں۔

راوی: بیڈھب ہوئی۔

حسن آرا: اس پتنگ کو پھاڑ پھوڑ کر پھینک دو کوئی دیکھنے نہ پائے۔

سپہر آرا: آپ نے تو سب کے سامنے پڑھوایا۔

حسن آرا: (وہ) مگر وہ۔ سمجھی کیا ہوں گی۔

سپہر آرا: شاید کچھ تاڑ گئی ہوں۔

حسن آرا : واہ تاڑ گئیں تو پھٹ سے منھ ہی پر کہہ دیتیں اور انگلیوں پر نچاتیں۔

سپہر آرا : اب کسی سے پوچھو کہ یہ پتنگ اڑاتا کون تھا آخر؟

حسن آرا : اچھا ماما سے پوچھو۔

سپہر آرا : واہ کس پگلی کا نام لیا۔ موئی خبطن۔

شطرنج

اتنے میں خدمت گار نے ماما کو آواز دی اور ماما باہر سے ایک لفافہ لے آئی۔

حسن آرا : کیا آزاد کا خط پھر آیا ہے کیا؟

سپہر آرا : اب ڈاک کا وقت کہاں۔

حسن آرا نے جو لفافہ لیا تو مارے خوشبو کے دماغ معطر ہو گیا، پھر ماتھا ٹھنکا۔ یہ خوشبو کیسی، اور لفافہ بھی ایسا عمدہ اور بیش بہا کہ واہ جی واہ۔

سپہر آرا : ماما پوچھو کس نے دیا ہے۔ ابھی کھولنا نہیں۔

حسن آرا : ہاں پوچھو تو۔

ماما : خان صاحب پوچھتی ہیں لفافہ کہاں سے آیا ہے؟

خدمت گار : اجی ایک آدمی دے گیا ہے۔ نام نہیں بتایا۔ دیا اور لمبا ہوا۔

سپہر آرا : کھولو تو یہ ماجرا کیا ہے۔ اُف خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا : خیر کیا۔ نرا شر ہی شر ہے۔

لفافہ کھولا تو ایک خط اور ایک اخبار نکلا۔ خط میں یہ لکھا تھا:

اے وادہ رخت بہ مہر پرتو ابروی تو خوشتر از مہ نو

آپ کی ذکاوت کی چار دانگ ہند میں دھوم ہے، اور شمع رخسار آتشیں پر پروانہ دار عشاقِ زار کا ہجوم ہے۔ آج پنساری کی دوکان سے دوا جو منگوائی، تو اس کاغذ میں بندھی تھی۔ کاغذ کو جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک اخبار ہے۔ مگر اخبار کا نام پھٹ گیا ہے۔ اس میں ایک نقشۂ شطرنج نظر آیا۔ سنا ہے کہ آپ شطرنج خوب کھیلتی ہیں۔ ذرا ہماری خاطر سے اس کا حل تو بتائیے۔ خط بھی ملاحظہ فرمائیے۔ شطرنج کے تلازمے میں کیا خوب لکھا ہے۔ اگر حکم ہو تو ایک روز حاضر ہوں۔ آپ کا خادم مرزا ہمایوں فر۔

سپہر آرا : کون؟ میرزا ہمایوں فر۔ کیا کوئی شہزادے ہیں۔ نام تو شہزادوں ہی کا سا ہے۔ خط سنو!

بساطِ آرائے سخن گستری وکشادہ رو تنگنائے ہنر پروری، بحفظ نقاش، ازل باشندہ بعد عرض جوہر نیازمی طرازد کہ دریں غرض ایام مضمون پر نقش و نگار نقشہ شطرنج کہ در مطبع آن طبایعِ زماں منطبع شدہ، اندریں سرائے سہ پنج یہ طبع اربابِ نکتہ سنج، حکم وصول گنج بے رنج دادہ، خیلے خوب بنظر درآمدہ۔ آرے منصوبہ بلندش عالی قطرتان یونان زمین را بہ پست ترین پایہ نشاندہ، وہوش وحواس اشراقیاں را رو باندراس نہادہ۔ بل خانہائے مربع ہشت در ہشت روبہ رو کش غرفہ ہائے بہشت و حریفش بجانب عتیق وغلبہ بازی، مصروف گشت برگشت۔ یہ روش نمونہ دست برد خزاں ست پر بہار و قائم داریش قائم مقام یاب قائم النار سمانش بلاج را صورت ممات فتحش ابواب فتح را فتح الباب حیات، واشپ بازی درترکنازی از فرش تازی چناں پیش روی وتیز روی کردہ کہ مصداق ایں شعر استاد شعری اشعار کہ خلاق سخن وشعری روشن ست کماہی بہم نمودہ:

زجستن جستن او سایہ دردست   چو زاغ آشیاں گم کردہ می گشت

از عرق ریزی پیلش حریفاں را زیادہ تراز فیل یاران در رخ گاہی از معرکہ رُخ برنتافتہ داد سرخروئی ہا دادہ وطرفہ ترانیکہ پیادہ کمترین پایہ بعد طے مراحل ومنازل چند رتبۂ صدارت وزارت بہم میکند کہ پیل بند اندیشہ بگردِ آن نمیتواند گردید۔ ع۔ دراز دستی ایں کوتہ آستینان ہیں،،، المختصر دمیکہ ازدہ یرہ بندی وصف آرائی مہرۂ بازمی پیماید دستخیز جنگ روم را با فرنگ بباد میدہد عرصۂ فکر بر مردمان دور و نزدیک و ترک وتاجیک نیک تنگ میکند و میغیکہ از راستی چپ طالعی ہا تقدیر بے پیر برمیگردد از تدبیر شاہ و وزیر نقش چست و درست برکرسی نمی نشیند برائے تصدیق ایں حال نقلِ نقشہ بطور معمّا بنا بر ضیافتِ طبع شائقین لف ست تا ناظرین در حل مشکلاتش لطفے بردارند وسمندِ فکرت را بجولان گاہِ عقدہ کشائی واسپ تیز گام تدبیر را بمیدان گاہِ طبع آزمائی جولانی دہند بوکہ از جوابش اطلاعی۔ دنشود کہ عرق ریزی راقم از بے التفاتی شایقین وکم توجہی شاعرین رایگاں گردد پس تا کہ شطرنج بہ نقش ونگار افلاک پیش نظر ناظرین کرۂ خاک است چشم کسی بر شطرنجی روزگار مزساز وصفحہ جہاں از محاذی مطاوی شطرنج خالی مواد۔ بفضلِ رب العباد وبحق النون والصاد۔

راقم نیاز۔ از مقام کانپور۔
اسپ افگن۔

نقشہ لبطور معمّا

ہمہ	خوش	و	جہاں	وفا	مے	مدہ	جہاں
بدہ	شاہ	بے	جہاں	را	را	ست	باید
است	ایں	کہ	دلا	حیات	را	بکار	پیل
باد	رخ	ولیکن	حیات	آید	رام	اگر	فنا
شاہا	و	و	مدہ	طلب	چہ	و	باید
اسپ	دست	دو	کار	کن	تو	کن	حیای
جہاں	ست	جہاں	مات	جہاں	آخر	شاہ	پیادہ
ز	گشت	آید	فنا	جہانے	پیش	نباشد	کہ

خاتون مہ لقا پیاری حسن آرا تلازمہ شطرنج کا خطِ رنگین اور ان کے فقرات نمکین، اور محاوراتِ شیریں اور تلمیحاتِ دلنشین پڑھ کر پھڑک اٹھی، اور دخت طرّار غیرت خوباں فرخار شیریں ادا، سپہر آرا، یوں چمک اٹھی۔

سپہر آرا: باجی سچ کہنا یہ تو کسی بڑے زبردست منشی عطارد رقم کا لکھا ہوا ہے۔ ہم تو

ان فقروں پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ ابتدا سے انتہا تک ایک ہی تلازمہ ہے۔

حسن آرا : نقشہ غور کرنے کے قابل ہے۔ نقشہ کیا معمّا ہے۔ چیستاں ہے حضرت اسپ افگن تو کوئی بڑے استاد معلوم ہوتے ہیں۔

سپہر آرا : باجی سچ کہتے ہیں جو ذری غور کرو تو چٹکیوں میں نقشہ نکال لو۔ یہ مواد ذرا سا نقشہ بھی کوئی بڑی چیز ہے۔ اللہ کے فضل سے ذکی ہو۔ تم تو بڑے بڑے نقشے نکال لیتی ہو۔ بھلا اس کی کیا اصل وحقیقت ہے۔ بس اب اس نقشے کو نکال ہی کے اٹھیے گا۔ دو گھڑی دل بھی بہلے گا۔

حسن آرا : بہن یہ وہ نقشے نہیں ہیں۔ اس کو پڑھو تو اچھی طرح اسپ افگن اگر اس وقت سامنے آئے تو ہم بے جھجک ان کو منھ دکھاتے۔

راوی : زہے نصیب زہے نصیب۔ اب آج سے ایں جانب بھی سو کام چھوڑ کر شطرنج کھیلا کریں گے۔ شاید ہماری قسمت کا ستارہ بھی چمک جائے۔ شاید اسی بہانے کوئی مہوش چاند سا مکھڑا دکھائے۔ اب کوئی کامل فن شاطر نوکر رکھنا پڑا۔ بغیر اس کے چین ہی نہیں سچ ہے:

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

حضرت اسپ افگن کو اپنے طالع فرخندہ پر جس قدر ناز ہو بجا ہے۔ اپنی خوش قسمتی پر جتنا اترائیں روا ہے۔ مگر ہم سے رقابت ہو گئی تو وجہ کیا۔ حسد پیدا ہوا۔ خدا کرے میاں آزاد کے کان میں بھنک نہ پڑے، ورنہ مفت میں میں گتھم گتھا ہو جائے گی۔ وہ بھی اپنے دل میں کہیں گے کہ اچھے آئے۔ ڈنکے کی چوٹ رعایت کرتے ہیں:

خوف سے لیتے نہیں نام کرسن نے نہ کوئی
دل ہی دل میں انھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

سپہر آرا : اچھا اب اور کسی وقت غور کیجیے گا۔

حسن آرا : مگر بہن اتنا تو سوچو کہ یہ خط اور نقشہ بھیجا کس نے ہے۔

سپہر آرا : باجی ہمایوں فر تو کسی شہزادے ہی کا نام ہوگا، اور میرزا بھی لکھا ہے خاندانِ نیشاپوری سے کوئی ہوں گے۔ ماما کو بلاؤ اور کہو سپاہی سے پوچھے کہ کون لایا تھا، کدھر گیا، کیا کہتا تھا۔ ذری آدمی کا پتہ مل جائے تو بس بھیجنے والے کا پتہ بھی بات کی بات میں ملا داخل ہے۔

حسن آرا : ماماجی۔

راوی : آخاہ، اس وقت تو بڑی تعظیم سے پکارا۔ (ماماجی)

حسن آرا : اجی ماماجی۔

راوی : اللہ اللہ (اجی ماماجی) ہے ہے جو کہیں سن پائیں تو عجب ادا سے فرمائیں، کہ (اُدئی یہ کون منھ چڑھا رہا ہے):

بدم گفتی و خُرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

معقول۔ بہت ہی خاصے۔ آپ ہی پھبتی کہیے، آپ ہی جواب دیجیے۔ حضرت اس وقت خامۂ جادو نگار بلوں پر ہے، اور کیوں نہ ہو شاہد سخن سے ہم آغوش ہیں کہ باتیں۔

حسن آرا : اجی ماماجی کیا سو رہیں۔

ماما : (آنکھیں ملتی ہوئی) حضور ذری آنکھ جھپک گئی تھی کہیے۔

سپہر آرا : اے یہ کیا نحوست پھیلائی ہے۔ بھلا سونے کا یہ کون وقت نکالا۔

حسن آرا : ماماجی خان صاحب سے ذری پوچھو تو کہ یہ لفافہ کون لایا تھا، مگر چپکے سے۔ اماں جان تک بات نہ پہنچے۔ سمجھیں؟ ہاں ذری اتنا خیال رہے۔

ماما : نہیں بیوی۔ کیا مجال۔ کل تو کیا جانے مجھے کیا ہو گیا کہ بھولے سے مٹھائی ان کو دے آئی۔ میں خان صاحب کے کان میں کہوں گی، جو بڑی بیگم سن لیں تو ناک کٹوا ڈالوں۔ بیوی میں امیروں ہی میں رہی ہوں، ایسی کوئی دیوانی ہوں۔ واہ۔ باہر جا کر اشارے سے خان صاحب کو بلانے لگی۔

خان صاحب : کہو کہو۔ کیا کہتی ہو۔

ماما : (چپکے سے) ذری ادھر تو آ۔

خان صاحب : وہاں کونے میں کیا کروں آن کے۔ تم اس وقت ہو کہاں کوئی وہاں ہولے ہوئے دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ ڈیوڑھی پر سے نکلوا دوگی کیا؟

ماما : (جھلا کر) اے نجے دور چھو کرے، کل کا لونڈا باتیں کیسی چکنی چکنی کرتا ہے۔ موا بدگمان کہیں کا (قریب جاکر) چھوٹی بیگم پوچھتی ہیں کہ یہ لفافہ کون لایا۔ کہاں سے لایا۔ کچھ معلوم ہے۔

خان صاحب : وہ تو بس لایا اور چمپت ہوا، مگر مجھے معلوم ہے وہ سامنے والے باغ میں ایک شہزادے آن کے ٹکے ہیں۔ انھیں کا چوبدار تھا۔

ماما : (اندر جاکر) بیوی وہ کہتا ہے کہ۔

سپہر آرا : ہاں ہاں ہم نے سن لیا۔ پردے کے پاس سے ہم سن رہے تھے۔

ماما : (آہستہ سے) کوئی شہزادے سامنے۔

سپہر آرا : ہاں ہاں۔ سُنا سُنا۔

ماما : انھیں کا چوبدار۔

سپہر آرا : سڑن کہیں کی۔ کہتی ہوں سنا سنا، اور بکتی جاتی ہے۔

حسن آرا : (ماما سے) اچھا ماماجی۔ تم جاؤ سور ہو۔ اب کچھ کام نہیں ہے۔ (سپہر آرا سے) میرزا ہمایوں فرجانے کون ہیں۔

سپہر آرا : دیکھا میں نے تو نام ہی سے پہچان گئی تھی کہ شہزادہ ہے کوئی۔

حسن آرا : مگر یہ بد تمیز۔

سپہر آرا : یہ کاہے سے۔

حسن آرا : اول تو کسی کنواری، شریف زادی۔ کے نام خط بھیجنا کیا معنی دوسرے پتنگ گرایا۔ اس پر بھی عشقیہ شعر، اور خط بھی عطر وعنبر میں بسا ہوا، اور صاف صاف عشق کا اظہار اور پیام تو دیکھیے کہ حکم ہو تو ایک روز حاضر ہوں۔

سپہر آرا : باجی یہ تو بد گمانی ہے کہ خط کو عطر سے بسایا۔ شہزادے ہیں۔ عطر کیا چیز ہے۔ ہاتھ کے عطر کی خوشبو خط میں بھی آگئی، مگر ان کے تمیز اور سلیقے کو تو دیکھو، ادب کے ساتھ لکھا ہے۔ کوئی بد تمیزی ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔ یا ہو۔

حسن آرا : بہن تم بھی کتنی سادی ہو۔ مجھے تو یہی حیرت ہے کہ ان کو خط بھیجنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ وہ تو خیر گذری کہ ہمارے ہی پاس خط آگیا، نہیں تو جو کہیں اماں جان کے پاس جاتا تو ہے ہے غضب ہی ہو جاتا۔ چار آنکھیں ہم سے تو نہ کی جاتیں۔ صاف صاف تو یوں ہے۔ اور بہن اب خط آئے تو نہ لینا خبر دار۔ خبر دار۔ وہ شہزادے ہم غریب آدمی کی لڑکیاں۔ گو اللہ کا دیا سب کچھ ہے، مگر ہمارا ان کا مقابلہ کیا، اور پھر رسوائی کا خوف، وہ آئیں گے بھی تو ٹھاٹ سے۔ ہم یوں تو ملیں گے نہیں۔ کہ یہ دوپٹے اوڑھ اوڑھ کر سامنے جائیں۔ ملیں تو بناؤ چناؤ سے، مگر آج تک بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں کہیں ایرے غیرے سے یوں ملا کی ہیں۔ توبہ! توبہ! لوگ حرف رکھیں گے۔

سپہر آرا : اب سوچیے نقشہ نہ نکالا تو بڑی ہنسی ہوگی۔

حسن آرا نے کوئی بیس منٹ تک غور کیا۔ سپہر آرا کئی مرتبہ بیچ بیچ میں بول اٹھی مگر حسن آرا

تو محوبھیں جواب تک نہ دیا۔ بیس منٹ کے بعد ہنس کر بولیں، کہ یو حل کردیا نہ کہو گی اللہ جانتا ہے بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لاؤ پھر اب جواب تو لکھ بھیجیں، مگر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں پہنچا دیتے ہی ہاتھ نہ پکڑے جانے بھی دو اب چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں۔ مفت کی بدنامی اٹھانا بھلا کون سی دانائی ہے۔

سپہر آرا : نہیں نہیں پیاری بہن۔ میں صدقے۔ ضرور لکھ بھیجو، پھر جا ہے جو ہو۔

حسن آرا : اچھا لاؤ لکھیں۔ جو ہونا ہو گا سو ہو گا۔

سپہر آرا : ہم بتائیں۔ آؤ ایک کام کریں خط وط تو لکھو نہیں، مگر اس نقشے کے حل کو پیارے روزمرے اور بول چال، میں خوشخط لکھ کر ڈاک پر بھیج دو، کیوں، بس اس میں نہ رسوائی ہے نہ کچھ کسی کا ڈر۔

حسن آرا : اہو ہو ہو۔ اچھی کہی، خوب سوجھی، آخر کار ہماری ہی بہن ہو نہ۔

راوی : کیوں نہیں چشم بد دور۔ تم فتنۂ دوران، تو وہ بلائے بیدرماں چندے آفتاب چندے مہتاب۔

حسن آرا جواب لکھنے بیٹھیں۔ کشمیر کا نازک قلم دان، واسطی قلم، سرخ رنگ چاندی کی پیاری پیاری دوات، زر افشاں کاغذ، اس پر طرح طرح کے گل بوٹے بنے ہوئے روشنائی اودی۔ خوشنویسی گردش قلم پر جان دیتی تھی۔ ذکاوت جودتِ طبع کی بلائیں لیتی تھی سپہر آرا کہتی جاتی تھی کہ ہاں بہن جیسی رنگین ادا ہو، ویسی ہی عبارت بھی رنگین ہو۔

راوی : ضرور اور شوخی بھی تو ہو۔ وہ تو گھٹی ہی میں پڑی تھی۔ اور شوخی بھی بلا انگیز، سیماب کو بھی بے قراری کا سبق دے۔

حسن آرا نے یوں جواب لکھا۔

جواب : نقل ہے کہ تاجدار جم جاہ، حضرت شاہ جہاں بادشاہ طاب ثراہ وجعل الجنتہ مثواہ ایک خسرو ذی حشم خاقانِ خدم مہر سپہرِ برتری، سپہر مہر سروری سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ مگر بد بد کے، اور بازی وہ سخت کہ الاماں بعض مورخ راوی ہیں کہ شاہ جہاں فردوس آرام گاہ، ثریا جاہ، اپنے وزیر اعظم اور دستور المعظم سے کھیلتے تھے۔ مگر شرط یہ تھی کہ جو ہارے وہ جورو حوالے کر دے۔ بڑی کڑی شرط تھی۔ وزیر کی بیوی بڑی حسین اور نازنین گل بدن اور غنچہ دہن تھی۔ بادشاہ کی جو اس پر آنکھ پڑی تو سن سے جان نکل گئی۔ بس دیکھتے ہی عاشق

عاشق زار ہو گئے۔ سوچ کہ اگر جیتے تو اس پری پیکر کو پائیں گے زہے قسمت، اور ہائے تو خیر جا تو ہے ہی۔ اور وزیر سمجھا کہ اگر بازی جیتا تو بادشاہزادی ملی، اور ہارا تو قسمت۔ کھیلتے کھیلتے بازی کی یہ صورت ہو گئی۔

	سبز پیل						سبز رخ
	پیادہ سرخ		پیادہ سرخ				
						سبز پیادہ	سبز رخ
رخ سرخ	اسپ سرخ						
پیل سرخ				سبز پیادہ	سبز پیادہ	سبز پیادہ	
رخ سرخ					شاہ سرخ		ل

سرخ بازی شاہ جہاں کی تھی۔ وزیر کی بازی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ شاہ جہاں کو ایک چال میں مات ہوتی تھی۔ اور بادشاہ کو ایک چال بھی نہیں سوجھتی تھی۔ حیران و ششدر، پریشان و مضطر کہ اب کروں تو کیا کروں۔ بازی جائے تو غم نہیں، مگر یہاں تو بیوی ہاتھ سے جاتی ہے۔ بس ایک چال میں مات ہے (رخ سبز نجانہ اش کشت) عرصہ دراز تک شاہِ ثریا جاہ، سر بزانو متفکر رہے، مگر ایک چال بھی نہ سوجھی، اور تدبیر ذرا کارگر نہ ہوئی۔ شاہ جہاں

کے چار محل تھے سمجھ بیٹھا کہ چاروں میں ایک سے ضرور جدائی ہوگی نصیب ۔ لیکن چاروں پیاری اور چہیتی ہیں، جدا کریں تو کسے ۔ ایک سے ایک بڑھ کے۔ پری جھم، برق وش ہے، اسی فکر میں غلطاں پیچاں تھا کہ کروں تو کیا کروں ۔ یہ چاروں محل، مہ لقا شیریں ادا، جدائی از بس شاق گذرے گی ۔ سوچ کر چلواں چاروں سے تو پوچھو ۔ دیکھیں شاید مفارقت اور جدائی کے خیال سے کچھ سوجھ جائے ۔ تین بیگموں نے یکے بعد دیگرے یوں جواب دیا ۔

جہاں آرا بیگم : المتخلص بہ جہاں :

تو بادشاہ جہانی جہاں زدست مدہ | کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

حیات النسا بیگم : المتخلص بہ حیات :

جہاں خوش ست ولیکن حیات می باید | اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

زینت النسا بیگم : المتخلص بہ فنا :

جہاں و حیات ایںہمہ بیو فا ست | فنا را طلب کن کہ آخر فنا ست

جہاں آرا بیگم نے خوب ہی شعر موزوں فرمایا تھا ۔ مگر حیات النسا بیگم نے اس کا جواب دنداں شکن دیا ۔ اور زینت النسا بیگم نے دونوں سے گوے سبقت لیا ان کا سب سے چڑھ بڑھ کر رہا :

جہاں و حیات ایں ہمہ بیو فا ست | فنا را طلب کن کہ آخر فنا ست

خوب کہی ۔ جب چوتھے محل کی نوبت آئی، تو انھوں نے وہ بات بتائی کہ بادشاہ پھڑک گئے ۔ چوتھی بیگم کو شاہ جہاں دلآرام کہتے تھے ۔ وہ انتہائی زیرک اور خوش فکر تھیں ۔ دلارام نے کہا کہ ذری وہ بازی ہم بھی تو دیکھ لیں ایک نظر ۔ یہ خود بھی شطرنج خوب کھیلتی تھیں ۔ جب نقشہ ان کے روبرو رکھا گیا تو پہلے کسی قدر ملول ہوگئیں، کہ بازی بیڈھب ہے ۔ مگر تھوڑی دیر تک خوب غور کیا کیں، اور غور کرکے فکرِ عمیق سے وہ بات پیدا کی، کہ واہ جی واہ، مات کا مات بچایا ۔ اور حریف کو اُلٹا مات کیا ۔ سوچ سمجھ کر فرمایا کہ :

شاہا دو رُخ بدہ و دلارام را مدہ | پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشف مات

چلیے پانچ چال میں سبز بازی کو مات ہے، اور سرخ بازی سرخ رو، نقشے کی چال رخ پر ہوگی ۔

سرخ کی چال ۔ | سبز کی چال ۔

۱۔ رخ نجانۂ رو ۸ کشت
۲۔ پیل نجانۂ پ وہ کشف رخ کی
۳۔ رخ نجانۂ رو ۸ کشت
۴۔ پیادہ نجانۂ او کشت
۵۔ اسپ نجانۂ رو کشت

۱۔ شاہ سبز نے رخ کو نجانہ وہ پیٹ لیا
۲۔ شاہ نجانۂ رو ۸ کشت بچی
۳۔ شاہ نے اس رخ کو رو ۸ خانہ میں پٹیا
۴۔ شاہ رو ۸۔ خانے میں آگیا
۵۔ (مات) کشت بچنے کو کوئی گھر بھی نہیں رہا

اصل میں یہ معمّا چونسٹھ خانوں میں مہرۂ اسپ دوڑانے کا ہے۔ جو چار شعر شاہ جہاں بادشاہ کی چاروں بیگموں نے موزوں کیے تھے، وہ چاروں اس میں درج ہیں۔ مگر ہر ایک شخص کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتے۔ حل نقشہ درج ذیل ہے۔ گھوڑا دوڑایا جائے تو چاروں شعر صاف نکل آئیں۔

ہمہ ۳۵	خوش ۱۸	و ۵۱	جہاں ۱۲	وفا ۳۷	مے ۲۲	مدہ ۵۵	جہاں ۱۴
بدہ ۵	شاہ ۱۱	بے ۳۶	جہاں ۷	را ۵۴	را ۱۲	سست ۳۸	پاید ۴۳
است ۱۹	ایں ۴۳	کہ ۹	دلا ۵۲	حیات ۲۱	برا ۴	بکار ۱۵	پیل ۵۶
باد ۱۰	رخ ۴۵	ولیکن ۲۰	حیات ۳۳	آید ۱۶	رام ۵۲	اگر ۴	فنا ۲۹
شاہا ۴۷	و ۳۴	و ۶۱	مدہ ۸	طلب ۴۱	چہ ۲۸	و ۵۷	باد ۴
اسپ ۶۱	دست	دو ۴۸	کار ۱۹	کن ۶۰	تو ۱	کن ۴۴	حیات ۱۵
جہاں ۳۱	ست ۴۶	جہا ۵	مات ۶۴	جہاں ۲۷	آخر ۲۴	شاہ ۳	پیادہ ۵۸
نہ ۶	کشت ۶۳	آید ۳۰	فنا ۴۵	جہانے ۴	بپیش ۵۹	نباشد ۴۶	کہ ۴۳

۳۔ اب اس حساب سے لکھتے جائیے تو یوں ہوگا۔

۱۔ تو بادشاہِ جہانی جہاں ز دست مدہ — کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

۲۔ جہاں خوش ست ولیکن حیات می باید — اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

۳۔ جہاں و حیات ایں ہمہ بیوفا ست — فنا را طلب کن کہ آخر فنا ست

۴۔ شاہا دو رخ بدہ و دلارام را مدہ — پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت مات

یعنی چونسٹھ خانوں میں گھوڑا دوڑایا گیا۔ اور چاروں شعر موجود۔

حسن آرا کے بکمال فصاحت و بلاغت لکھا اور خط کے آخر میں اپنا نام یہ لکھا:

عشق کا حال بیسوا جانیں — ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

پردہ نشین پاکباز

خط کو بند کیا اور لفافہ لکھا:

لیے جاتا ہے نامۂ بیکس
بال بیکا نہ ہو کبوتر کا

بملا حظہ حضور جم جاہ میرزا ہمایوں فر عالی پایگاہ، بوقت احسن در آید یوم الثلثہ مرسلۂ پردہ نشین حیا پرور، عصمت کوش و پاک نظر۔

ماما جی کو پھر بلایا، اور سمجھایا کہ کسی معتبر آدمی کو چپکے سے دو، اور سمجھا کہ کہو کہ ڈاک کا جو بمبا سامنے ہے اس میں یہ خط ڈال دے، اور اگر کوئی دیکھ لے تو ٹال دے۔ خبردار کسی غیر کے ہاتھ میں نہ جائے۔ کسی اور کی اس پر نظر نہ پڑنے پائے۔ سپہر آرا بولیں کہ باجی اس میں عطر فتنہ لگاؤ۔ جس میں وہ سمجھ جائیں کہ اب زیادہ خط کتابت میں شر ہے۔ حسن آرا نے کہا کہ واہ عطر فتنہ سے دستاویز ان کے ہاتھ آئے گی طبیعت اور بھی للچائے گی۔ عطرِ فتنہ اس بات کا گواہ ہوگا کہ در پردہ ہم مکتوب الیہ کو سناتے ہیں کہ ہم دونوں بہنیں۔ آج فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوں گی۔ خدمت گار خط کو بمبے میں ڈال آیا، اور کہا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

شہزادہ ہمایوں فر

شہر سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک مقام پر بہار، اور مرغزار غیرتِ فرخار میں ایک

ایوانِ سپہر تو امان سے گولی بھر کے پٹے پر ایک باغ فرح بخش و دلکشا ہے۔ اس گلزارِ رشک نگار میں ایک عمارتِ عالیشان و ندرت انتما ہے۔ اس عمارت میں ایک شہزادہ، بلند ارادہ، صاحبِ جاہ و مال، غرۂ ناصیہ عزت و اجلال، افشاں جبیں صورت و اقبال ٹکا ہے۔ ایک روز دن قریب اختتام تھا، اور شہزادہ مغربی الیہ زیب بام تھا۔ شفق کا رنگ عشاق خجستہ جاں کے چہرے کی طرح زرد، بادِ صبا بجھے ہوئے دل کے مانند سرد۔ شام مثل قلبِ تیرہ درونانِ بد باطن سیاہ نہ اشعۂ زر نگارِ خورشید، نہ جلوہ جمالِ ماہ۔ چوطرفہ سنسان بیابان، اور لق و دق میدان ہو، بالکل سناٹا تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں موذن نے مسجد سے تکبیر کی آواز دی۔ اور مسلمانان پرہیزگار نے خانۂ خدا کی راہ لی۔ ادھر مندروں سے ناقوس برہمن نے شور مچایا۔ غافلوں کو خواب خرگوش سے جگایا۔ اور خدا ترس ہندوؤں نے شوالے کی طرف قدم بڑھایا۔ گھوسی گوؤں کو چراتے، برہا گاتے آنے لگے۔ مویشی چراگاہ سے آہستہ آہستہ جانے لگے۔ گھوسنیں دودھ دہی مٹھا بیچ کر شہر سے آرہی تھیں، اور باہم دل لگی اور چہل کر کے، پھرتی اور تیزی کے ساتھ قدم بڑھارہی تھیں۔ پھر گاؤں میں اس کے سوا اور ہے کیا۔ چھپروں اور جھونپڑوں سے دھواں بلند تھا۔ کوئی گوارن لال لال مانگ نکالے، دھک دھکاتی ہوئی۔ ہنڈیاں چڑھارہی تھی۔ کوئی ماتھے پر ٹکلی جمائے بھی پکا رہی تھی۔ کنویں پر پانی بھرنے کے لیے دس پانچ کا غول۔ لہنگے فوق البھڑک، پھریاں انمول۔ کوئی گھونگھٹ کاڑھ کر گھڑا لیے آتی ہے۔ کسی کی کمر ہزار جگہ سے بل کھاتی ہے۔ پانی کے بوجھ سے لچکی جاتی ہے۔ ٹھٹول آدمی شرارت کی راہ سے ننھی ننھی کنکریاں پھینکتے ہیں۔ حیرت زدوں کی طرح تاک جھانک کر کے دیکھتے ہیں۔ مگر ان کی پاک دامنی کے صدقے کہ سر تک نہیں اٹھاتیں۔ حروفِ شکایت زبان پر نہیں لاتیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔ گھونگھٹ تو برائے نام ہے۔ اگر شکایت کی بھی تو عورتوں سے، ٹھٹول اور بگڑے دل آدمیوں کی ماں بہنوں سے؟ دیکھو بھوجی! تمہارے پوت ہمکا چھیڑت ہیں۔ راہ ڈگر ماں الٹی کا پلوا بکت ہیں۔ ان کا تنک سمجھا دیئے۔ چاہے کوئی گنواروں اور گنوارنوں کو نظرِ حقارت ہی سے کیوں نہ دیکھے، لیکن واللہ حیا اور پاک دامنی کا گنواروں کو شہر کی عورتوں کچھ کم خیال نہیں ہے۔

الغرض شہزادۂ ہمایوں فریب بام چہل قدمی میں مصروف تھے، مگر بے قرار، اور دل ہی دل میں سوچتے جاتے تھے کہ الٰہی خیر۔ شام بھی ہوگئی۔ مگر خط نہ جواب، کہیں ہماری تحریر گراں تو نہیں گذری، افسوس کہ میں نے جلدی کی تعیل کارِ شیطاں لعین ہے۔ لعنت بکارِ

شیطان۔ اپنے خط اور اس کی عبارت اور طرزِ تحریر کو سوچنے لگے کہ مبادا جوش میں کوئی کلمہ خلاف ادب زبان سے نکل گیا ہو تو ستم ہی ہو جائے۔ ان سیمیں بدن، اور غنچہ دہن معشوقوں کے آئینۂ دل پر گرد و غبار ملال جم جائے۔ عین حالت بے قراری میں یہ اشعار حسرت کے ساتھ ساتھ پڑھ پڑھ کر ٹہلتے جاتے تھے:

ساقیا جرعۂ بجامم کن — گردشِ چرخ رابکامم کن
نوبتِ درد و غم نبامم کن — کشورِ بے غمی بنامم کن
تا بر آرم بکام دل نفسی — از زلالِ لبت بکامم کن
زلفِ شبگوں ز چہرہ یکسو نہ — مطلعِ صبح عیشِ شامم کن
کردم آوازہ تا یکے چو رضا — از سرِ زلفِ خود بدامم کن

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص سانڈنی پر سوار دور سے نمودار ہوا۔ سمجھے کہ قاصد یار ہے۔ اور یہ خیال تسلی بخش دل بے قرار ہوا۔ خدمت گاروں کو باآواز بلند پکارا، اور حکم دیا، کہ دیکھو یہ سانڈنی سوار ہے، یا قاصد یار ہے۔ جواب خط لایا ہے، یا خالی ہاتھ آیا ہے۔ شاید کوئی پیغام خاطر خواہ سنائے، دوائے دردِ دل لائے۔ داغ سینۂ بریاں کا مرہم اس کے پاس ہو۔ آتش زنِ کالائے حرماں و یاس ہو۔ خدام باادب تعمیلِ حکم کے لیے دوڑے ہی تھے، کہ سانڈنی سوار ہوا ہوگیا، اور حسرت و مایوسی نے ان کو تڑپا دیا۔ بجز کفِ افسوس ملنے کے کیا چارہ ہے۔ معشوقوں سے زبردستی پیام اور جوابِ خط طلب کرنے کا عاشق کو کب یارا ہے۔ کبھی رو رو کر بصد یاس، یہ اشعار حسرت بار زبان پر لائے:

چند روی بر سر بیداد کیں — رسمِ نکویاں نبود این چنیں
فرش رہت دیدہ و دل کردہ ام — خیز و قدم رنجہ کن اے نازنیں
در صفِ خوباں قیامت نشان — کس نبود جز تو مقدم نشیں
آنچہ لعشقت طلبم از خدا — جانِ حزیں باشد و چشم نمیں

تھوڑی دیر میں ایک چپراسی نظر آیا۔ سمجھے کہ بس ان کی ترکانِ زرّیں کمر نے ضرور بلوایا۔ چپراسی نے دربان کو خط دیا، اور منتظر جواب ٹھہرا رہا۔ شہزادہ بلند اختر، حضرت میرزا ہمایوں فر کی باچھیں کھل گئیں، دل نے گواہی دی کہ ساری مرادیں مل گئیں۔ نگارِ تند خو برسرِ کرم ہے۔

بس اب، ہمیں کیا غم ہے۔ خط کو کھولا تو چپراسی بولا کہ حضور میں آداب بجالاتا ہوں، اور جاتا ہوں، اس میں یہ لکھا تھا۔

میرزا ہمایوں فر بہادر۔ آج شام کو ۸ بجے کے وقت بابو ابھناش چند مکرجی ایم، اے، جو بڑے لائق فائق آدمی ہیں۔ سبز کوٹھی میں متصل کچہری جج، لکچر دینے والے ہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو آپ بھی اس وقت قدم رنجہ فرمائیے، اور جلسے کی رونق بڑھائیے۔ آپ کا خادم جاں سوفرٹن کلکٹر۔

ایں اپنی ناکامی کے صدقے، جو کام ہوا پورا ہوا۔ سمجھے تھے کہ نگارِ تند خو کا جواب با صواب، اور ملاقات کا پیغام ہے۔ یہ معلوم بھی نہ تھا کہ کلکٹر صاحب کا نامۂ محبت فرجام ہے۔ خیراب وصلِ جاناں سے ہاتھ دھویا۔ خط بھیج کر اپنا وقار بھی کھویا۔ دو مرتبہ دھوکا ہوا۔ اب باور نہیں کہ خط کا جواب آئے، اور رنجتِ برگشتہ مدد فرمائے۔ قاصد صنم عربدہ جو کا پیام لائے، اور مژدۂ طرب انگیز سنائے:

غرق در خونِ دل و دیدہ ام از دوری او — چند زیں گو نہ زیم آہ ز مجبوری او
چکتم باغ کہ بے تازہ گلت در نظرم — خس و خاشاک نماید سمن و سوری او
گر ندیدی سحر و شام بہم جلوہ نما — خط مشکیں بنگر بر رخ کافوری او
دل بود قطرۂ بنا عالم آب و گل را — تا بود دست رسے کوش معبوری او
یار بگذاشتہ جنت طلبد مزدِ نماز — تیف بر حوصلۂ زاہد و مزدوری او
از عقاقیرِ مسیحی نرود درد رضا — وصلِ معشوق بود چارۂ رنجوری او

یہ شعر شہزادۂ بلند ارادہ پڑھ ہی رہے تھے کہ ڈاک کا ہرکارہ شنجرفی پگیا جمائے دھانی و گلا پھڑکائے، بہر طوطے کی صورت بنائے، آن موجود ہوا۔ آداب بجالایا، اور خط دیا محصول لیا اور روانہ ہوا۔ فرطِ ابتہاج سے خط کا کھولنا بھی دشوار تھا۔ مارے خوشی کے چہرہ گلنار تھا:

آن پیک نامور کہ رسید از دیارِ دوست — آورد حرز جان ز خط مشکبارِ دوست
خوش می زہد نشان جلال و جمال یار — خوش می کند حکایتِ عز و وقارِ دوست
جان داد مش بہ مژدہ و خجلت ہمی برم — زیں نقد کم عیار کہ کردم نثار دوست
سیر سپہر و دورِ قمر را چہ اختیار — در گردش اند ایں ہمہ بر اختیار دوست

شکر خدا کہ از مددِ بخت کارساز — بر حسبِ مدعاست ہمہ کار و بارِ دوست
گر بادِ فتنہ ہر دو جہاں را بہم زند — باد چراغ و چشم در رہِ انتظارِ دوست
کحل الجواہرے بمن آرائے نسیمِ دوست — زاں خاک نیکبخت کہ شد رہ گزارِ دوست
ما ئیم و آستانۂ عشق و سرِ نیاز — تا خواب خوش کرا برد اندر کنارِ دوست

پیک نامور حضرت جبرئیل سے عبارت ہے۔ مگر میرزا ہمایوں فر نے اپنے طور پر اس کا مطلب کیا ہے، اور پیک نامور ہرکارہ سے مراد لی۔ خطِ مشکبار، وہی حسن آرا کا نامۂ رنگین، مرہمِ زخمِ عشاق زار ہے۔ حسن آرا کی ذکاوت اور جودت صاف ظاہر ہے۔ ایک ایک حرف اس کے حسن لیاقت پر دال ہے، اور یہی یار کا جمال و جلال ہے۔ خط کا آنا نیک فال ہے، اور یہ شعر بالکل حسبِ حال ہے:

ما ئیم و آستانۂ عشق و سرِ نیاز — تا خوابِ خوش کرا برد اندر کنارِ دوست

خط کھولا تو پاس آنکھیں بند اور عقدہ وا ہو گیا۔ پڑھتے ہی شہزادہ فرخ بخت، ہزار جان سے شیدا ہو گیا:

خیر مقدم مرحبا اے طائرِ میموں قدم — شاد ماں کردی مرا نازم تراسر تا قدم
میکنم در ہجر تو انجام آغاز نیاز — زانکہ شرح آرزومندی نیاید در قلم
صحبت عشاق بدنامت کند زاہد برد — خوش نگہ کن بادہ در جام ست و مجلس متہم

عبارت پڑھی تو پھڑک گئے۔ ہائے کیا پیارا روزمرہ ہے۔ کیا بول چال ہے۔ زبان اور بیان میں بھی نگاہ کی طرح جادو کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس دستِ نازک کے صدقے جس نے یہ سطریں لکھی ہیں۔ ہے ہے لکھتے وقت کلائی لچکی جاتی ہوگی۔ بستاتی ہوگی اور پھر قلم اٹھاتی ہوگی۔ شوخی ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے۔ رنگینی ایک ایک حرف سے عیاں ہے۔ عبارت سلیس، فقرے نفیس، اس بیساختہ پن کے قربان، اور نقشہ تو ایسا حل کیا کہ قلم توڑ دیے۔ بڑا خوش نصیب وہ شوہر ہے جس کی ایسی بیوی ہو۔ انشاء اللہ۔ ع۔ بیدل ہنوز نیم بہ نیم پیہ می شود:

دلبر جانانِ من برد دلِ و جانِ من — برد دل و جانِ من دلبر جانانِ من
از لبِ جانانِ من زندہ شود جانِ من — زندہ شود جانِ من از لبِ جانانِ من
روضۂ رضوانِ من خاکِ سر کوی دوست — خاک سر کوی دوست روضۂ رضوانِ من
ایں دلِ حیرانِ من والہ و شیدای تست — والہ و شیدائے تست ایں دلِ حیرانِ من

یوسفِ کنعانِ من مصر ملاحت تراست — مصر ملاحت تراست یوسفِ کنعان من
سرد گلستانِ من قامتِ دل جوی تست — قامت دل جوی تست سرد گلستان من

آخر میں پڑھا:

عشق کا حال بسوا جانیں — ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

جی درست ہے ہم سے نہ بہت اڑیے۔ اس کے بعد پھر کئی بار وہی شعر پڑھا:

عشق کا حال بیسوا جانیں — ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

ننگ کیوں، وجہ؟ اگر عشق صادق ہے تو مضائقہ کیا ہے:

عشق تا خام ست باشد بستہ ناموس و ننگ — پختۂ مغزانِ جنون را کی حیا زنجیر پاست

الغرض خود ہی شعر پڑھتے تھے اور خود ہی جواب دیے جاتے تھے، اور وجد میں آتے تھے۔ جب آخر میں پردہ نشین کا لفظ پڑھا تو بول اٹھے کہ:

بالا ہے ترا حسن حسیناں چگل سے — سب بزم ہے مشتاق نکل پردۂ دل سے

خدا پردہ نشیی کی آبرو رکھے۔ آمین!

اتنے میں شہزادۂ جم جاہ کے ایک دوست تشریف لائے، اور یوں ہم کلام ہوئے۔

دوست: کہیے قبلہ جواب آیا یا دھتا بتا دیا۔

شہزادہ: واہ دھتا تم ایسوں کو بتاتی ہوں گی۔ لو یہ جواب ہے سچ کہنا۔ حروف میں بھی کس درجہ آب و تاب ہے۔ ہر دائرہ فروزاں تر از آفتاب ہے۔

دوست: لفافہ پڑھ کر۔ اخاہ بڑے ادب سے خط لکھا ہے۔ حضور جم جاہ شہزادہ میرزا ہمایوں فر عالی پائگاہ۔ اللہ اللہ یہ تعظیم، یہ تکریم۔

شہزادہ: قبلہ وہ ادب شناس ہیں۔ مزاج داں ہیں۔ کچھ بازاری عورتیں تھوڑا ہی ہیں۔ تحریر سے شرافت برستی ہے۔

دوست: پھر اب پوچھتے کیا ہو، گہرے ہیں۔ ہمیں نہ بھولیے گا۔

شہزادہ: اچھا بھئی یہ تو پتا لگاؤ کہ یہ تحریر اور عبارت بڑی بہن کی ہے یا چھوٹی بہن کی ہے۔

دوست: (مسکرا کر) اب یہ فکر ہوئی پیدا۔ اجی وہ دو توں کلاں ہے۔ اس دلیری کے قربان۔ واللہ آخر میں غضب ڈھایا ہے۔ اور قیامت کا شعر زبانِ قلم پر آیا ہے:

عشق کا حال بیسوا جانیں   ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں
(پردہ نشیں)

شہزادہ : جواب لکھوں گا۔
دوست : ضرور۔ ع "در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست"، اب یہ تو فرمائیے کہ منظور کیا ہے؟
شہزادہ : نکاح۔
دوست : واہ!۔
شہزادہ : کیوں۔؟۔
دوست : ہونھ۔ کہنے لگے۔ نکاح، گستاخی معاف! منھ دھو رکھیے۔ آزاد کا نام بھی سنا ہے۔ انھیں پر دل آیا ہے۔
شہزادہ : (آہ سرد بھر کر) دونوں؟ ہمیں سارا قصہ معلوم ہے، مگر دل تو صرف ایک کا آزاد پر آیا ہے نہ۔
دوست : حضرت ان سے نکاح کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ پہلے امتحان لیتی ہیں پھر آنے دیتی ہیں۔
شہزادہ : امتحان کیسا؟ آپ کی بھی کیا باتیں ہیں۔
دوست : باتوں داتوں کے بھروسے نہ رہیے گا۔ وہاں گزارا مشکل ہے، تب کہیں سارٹیفکٹ دیا جائے گا۔
شہزادہ : آخر کچھ بتاؤ تو یہ امتحان کی بچ کیسی ہے۔
دوست : اے حضرت! وہ تربیت یافتہ خاتون ہیں۔ بلا کی جودت پائی ہے۔ نور کی طبیعت پائی۔ حسین مہ جبین، سیم تن، غنچہ دہن، دونوں برق۔
شہزادہ : تو پھر امتحان میں یہاں کب بند ہیں۔ شعرا اپنے سامنے کہوالیں، لکھوالیں، جو چاہیں پوچھیں۔ بندہ بھی اچھے اچھے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے۔ مرد میدان ہیں ہم۔ ایسے ویسے نہ سمجھیے گا۔
دوست : بھئی وہ اب سات پردوں میں رہتی ہیں۔ ملنا ذری محال ہے۔
شہزادہ : اور ہم نے تو اڑتی سی خبر پائی ہے کہ بجروں پر سوار ہو کر ہوا کھاتی ہیں اور

سیر دریا کو جاتی ہیں۔ طبیعت تو تب ہی لہرائی، کہ چل کر جمالِ مبین تو دیکھ لیں، ایک دن دیکھا کہ مہتابی پر دونوں کی دونوں ٹہل رہی ہیں۔ وہ جھمکڑا کہ اہو ہو ہو، نور کا عالم، برق دم، وہ جوبن کہ انسان برسوں گھورا کرے۔ یوسفِ مصری تک دیکھے تو انھیں کا دم بھرے۔ از پا تا فرق زرق برق دریائے نزاکت میں غرق، ہر بن مو سے صدائے انا البرق آتی تھی۔ مہین دوپٹے کے بار سے کمر نازک لچکتی جاتی تھی۔ دیکھتے ہی عاشق ہو گیا۔ سن سے جان نکل گئی۔

دوست : پھر اب تو چین ہی چین لکھتا ہے۔ سمجھیے فتح ہے۔ مبارک ہو مٹھائی کھلوائیے۔

شہزادہ : اجی حضرت! اندھا تب پتیائے، جب آنکھیں پائے۔

دوست : لیکن دیکھیے آپ میرے دوست ہیں۔ اتنا یاد رہے کہ اپنے وقار اور وقعت، اور عظمت کو ہاتھ سے نہ دیجیے گا۔ یہ کوچہ ازبس نازک ہے:

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار که پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

شہزادہ : میں بد وضع آدمی تو ہوں نہیں کہ کوئی حرکت نا ملائم مجھ سے سرزد ہو، گو عشق کا دم بھرتا ہوں، مگر پھونک پھونک کے قدم دھرتا ہوں، آپ میری طرف سے مطمئن رہیں۔

دوست : یہ سچ مگر قبلہ یہ کوچہ بُرا ہے۔

شہزادہ : بھائی تم مطمئن رہو۔ اب فقط یہ صلاح دو کہ جواب بھیجوں یا نہ بھیجوں اور جواب میں لکھوں تو کیا لکھوں بس فقط اس قدر مجھ کو دریافت کرنا ہے۔

دوست : میں غور کر کے جواب دوں گا۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ وہ دونوں بہنیں شہزادوں ہی کے قابل ہیں، مگر یہ نامہ و پیام کا طریقہ ہندوستان کی رسوم کے خلاف ہے۔

شہزادہ : ہاں بیشک۔

دوست : کل بعد غور عرض کروں گا۔ تسلیم۔

عاشق النسا بیگم کا جل دے کر حسن آرا و سپہر آرا سے گلے مل آنا

شہزادہ بلند ارادہ حضرت ہمایوں فر نے محبّ مطلوب کا خطِ رنگین و مکتوبِ الفت اسلوب جو پایا تو بڑھ کے کئی بار چوما، آنکھوں سے لگایا، جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ مارے خوشی کے اترائے جاتے تھے۔ سوچے کہ دور سے دیکھا ہے۔ ایک پرستان کی پری ہے، دوسری مہر سپہرِ دلبری ہے۔ بوٹا سا قد، چہرہ حور کا، لیکن۔ ع۔ کون جانے جھوٹ ہے یا سچ ہے۔

شہرہ دور کا،، کسی طرح ملاقات کی ٹھہرے، بنے یا بگڑے، خدا کرے اس گھونگھٹ کا طلسم ٹوٹے۔ عاشق جوبن کے مزے لوٹے۔ دو بدو گفتگو ہو تو دل کی بیکلی جائے، تنِ مُردہ میں از سرِ نو روح آئے:

وہ جوبن پر جو آئیں لطف اٹھے زندگانی کا
ابھی گھونگھٹ میں چہرہ ہے عروسِ نوجوانی کا
ہلال و بدر دونوں ہیں تیری تصویر کے خاکے
وہ صورت ہے لڑکپن کی یہ نقشہ ہے جوانی کا
بہار آئی ہے، گل پھولے ہیں سبزہ لہلہاتا ہے
پلا ساقی کوئی ساغر شرابِ ارغوانی کا

الٰہی یہ فصلِ گل ہے، مگر صراحی ہے نہ مل ہے۔ یہ عالم جوانی ہے لیکن مادۂ گل گوں ہے نہ شراب ارغوانی ہے۔ نہ ایام نشاط طرب، اور ہم مشتاقِ وصلِ نیت الغیب، بحرِ عشق کا یہ جوش ہے کہ دین و دنیا فراموش ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی بھلا مانس کسی پردہ نشین پر مفتون ہو، اور لاکھوں تمناؤں کا خون ہو۔ اللہ اللہ سادگی میں اس درجہ چھبن تھا کہ ماہ دو ہفتہ سے بڑھ چڑھ کر جوبن تھا۔ اگر نکھار کریں تو سبحان ملا اعلی انجم ان کے جمال پر نثار کریں۔ اور بڑے بڑے ملائکہ نورانی پیار کریں، سچ ہے۔ ع۔ زیور ہے سادگی ترے رخسار کے لیے:

اُمنگ پر آ کے محو صفت کبھی جو وہ گل عذار ہو گا
پسیں گے منہدی یہ دل گلوں کے چمن میں خونِ بہار ہو گا
دمِ فنا بھی یہی جو دل کو تصوّرِ زلفِ یار ہو گا
ہوا سے پھر کو بکو پریشان یقین ہے میرا غبار ہو گا
یہی ہیں چالیں اگر تمہاری تو دیکھنا مٹیں گے ہم بھی
جہاں پڑے گا قدم تمہارا وہیں ہمارا مزار ہو گا
یہ رات بھر کے ہیں سارے جلسے جہاں ہوئی صبح پھر تو صفدر
نہ شیشہ ہو گا نہ جام ہو گا، نہ شمع ہو گی نہ یار ہو گا

ادھر شاہزادۂ ہمایوں فر اشعارِ حسرت بار، پڑھ کر دل کو سمجھاتے تھے، ادھر خان صاحب ڈیوڑھی پر کھڑے ہو کر پردے کے پاس سے ماماجی کو بلاتے تھے۔

خان صاحب: ماماجی! ماماجی! اجی ماماجی! ہائیں سنتی ہی نہیں، ماماجی!

ماماجی: آئی آئی، توبہ الٰہی، کیا مینھ برس رہا ہے (باہر جا کر) کہو۔

خان صاحب: یہ مہری آئی ہیں پیغام سن لو۔

مہری : میرزا ہمایوں فر بہادر کی بہن نے مجھے حسن آرا بیگم کے پاس بھیجا ہے۔

ماماجی : آؤ آؤ پھر آؤ، کیا عورتوں سے بھی پردہ ہے کچھ۔

مہری اور ماماجی دونوں اندر داخل ہوئیں۔ حسن آرا اور سپہر آرا نے دیکھا کہ سرمئی اطلس کا لہنگا، اور ہاتھ بھر کی چوڑی پڑا تے دار گوٹ، دوپٹا گلشن لیٹ کا دھانی رنگا ہوا، سنہرا لچکا ٹکا ہوا، زرنگار موباف چونڈے۔ بن پڑا ہوا، پاؤں میں چھڑے اور کڑے، بانکی مہری آداب بجالائی، اور یہ پیغام زبانی کہا۔

مہری : حسن آرا بیگم کے پاس مجھے میرزا ہمایوں فر بہادر کی بڑی بہن، عاشق النسا بیگم نے بھیجا ہے، اور کہا ہے کہ دیوار سے دیوار ملی ہے، مگر آپ کو ہم نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو ہم تھوڑی دیر میں آئیں۔

سپہر آرا اور حسن آرا نے اشاروں میں باہم باتیں کیں۔

حسن آرا : ہاں ہاں ضرور۔

سپہر آرا : کہیے بسم اللہ آئیے۔

مہری جھک کر آداب بجالائی اور چلی گئی۔

حسن آرا : بہن اب ذری بن ٹھن کے بیٹھنا چاہیے۔

سپہر آرا : اے باجی اللہ کی سوں تمھیں بناؤ چناؤ کی حاجت ہی کیا ہے۔

راوی : صاد ہے :

جلوہ را زیور نباید چوں بآئیں می رود عار وار داز حنا پائے کہ رنگیں می رود

حسن آرا اور سپہر آرا نے حسن دان منگوایا۔ گیسو سنوارے۔ بیس روپیہ سیر والا بیلے کا تیل بالوں میں ڈالا۔ زرق برق پوشاک سے جوبن دو بالا کیا۔ اس وقت تو زاہد صد سالہ کی بھی نظر پڑتی تو تیر نگاہ سے گھائل ہو جاتا۔ زہد کو ریا اور تقوی کو ڈھکوسلا سمجھ کر ان بتوں کی پرستش کا مائل ہو جاتا۔ بڑے بڑے صوفیانِ صافی طینت اور گوشہ نشینانِ خمولِ نورانی طلعت پکار اٹھتے کہ :

پنجہ زد مشقت بباہیں پارسائی پارہ شد طاعتِ صد سالہ ام تاراج ایک نظارہ شد

مشروع دکم خواب کے پاجامے۔ فوق البھڑک بنت اور گوکھرو کی چمک دمک دوپٹے گلابی رنگے ہوئے جامدانی کے۔ اور ان پر بیل بوٹے کامدانی کے، گرنٹ کی سبز گوٹ، سبز اور گلابی

کی چوٹ، بانکڑی ٹکی ہوئی لیس لگی ہوئی چھپکا زیب سر۔ زلف چلیپا تا کمر۔ جگنو کی وہ چمک کہ آفتاب بلاخیز کی نگاہ دیکھ نہ سکے۔ رخِ انور کا وہ نور موفور کہ بدر، لاکھ کاہش کرے بے نظر جھپکے ہوئے آنکھیں سینک نہ سکے۔ پازیب زیب پا چھاچھم کی آواز سے شور محشر بپا۔ وہ نور افشاں جبیں، وہ جمال مبیں کہ فرہاد بھی دیکھ پاتا تو اس کا دل اُلجھیں کہ چاہِ زنخدان کی چاہ میں ڈانواں ڈول ہو جاتا۔ مجنوں دشت نوردی چھوڑ دیتا۔ لیلیٰ کے عشق سے منھ موڑتا۔ پیارے پیارے ہاتھ اور نازک نازک کلائی اور ان میں چوڑیاں کچھ سیاہ کچھ طلائی۔ وہ پور پور چھلے اور دست حنائی۔ سبحان اللہ۔ اس شان کے صدقے! اس آن بان کے صدقے! اس دلربائی کے قربان۔ اس کج ادائی کے قربان۔ چشم فسوں پرداز نے اور بھی ستم ڈھایا۔ اچھے اچھے آہو چشموں کو نخچیر تیرِ نظر بنایا۔ الٰہی ابرو ہے۔ یا تیغ یا شمشیر اصفہاں۔ وہ گورے گورے گال اور عنبریں خال:

خالِ عارض کسے پیارا نہ ہوا　　کس کی آنکھوں کا وہ تارا نہ ہوا
ہائے وہ خالِ رخ ماہ جبیں　　میری قسمت کا ستارا نہ ہوا

سلک دنداں غیرت دُرِ عدن۔ لبِ لعل شکر خار دکش عقیق یمن۔ زلفِ عنبر فام رشکِ خطا و ختن۔ رخسارِ گل، دہن غنچہ، گیسو سنبل، سراپا، چمن، وہ ناز معشوقانہ، وہ جلوہ مستانہ کہ بس کچھ نہ پوچھیے:

انداز نرالا ہے تری جلوہ گری کا　　ہے چاند سا چہرہ تو چلن کبکِ دری کا
اٹھا ہے یہ کس کے رخِ پرنور سے پردہ　　خورشید میں عالم ہے چراغِ سحری کا
ہر جنبشِ مژگاں سے ہے مقتول زمانہ　　کیا تیز ہے خنجر تری بیدادگری کا
لائے گی نہ بو جائے محبوب کی جب تک　　دامن میں نہ چھوڑوں گا نسیم سحری کا

دونوں بہنیں سولہ سنگار کر کے فرش مکلّف پر متمکن ہوئیں۔ اصیلوں مغلانیوں نے جوڑے بدلے۔ مکان صاف۔ کمرے شفاف، جھاڑ کنول لمپ روشن۔ اللہ اللہ۔ یہ تو کچھ شبِ عروسی کے سے ٹھاٹھ ہو رہے ہیں۔ اُف ری تیاریاں۔ اللہ ری دھوم:

یہ شب بزم جاناں میں تھی دل کی صورت　　جلا صبح تک شمع محفل کی صورت
جو دیکھا مرقع حسینوں کا سفدر　　نظر آگئی اس کی محفل کی صورت

منتظر تھیں کہ عاشق النسا بیگم آئیں۔ قدم رنجہ فرمائیں۔ دیکھیں کیا پیام لاتی ہیں۔ کیا سناتی ہیں۔

سپہر آرا : اللہ کرے ان کو پتنگ وتنگ کا حال نہ معلوم ہو۔
حسن آرا : واہ (الف کو خوب بڑھا کر) واہ۔
سپہر آرا : یہ واہ کاہے کی۔ کیا کچھ فرض ہے کہ بہنوں سے بھی عشق کا حال کہہ دیوے ان کے آگے بھی عشق کا دکھڑا رو دے۔
حسن آرا : خدا خدا کرو۔ وہ ٹوہ لینے آتی ہیں۔ عاشق النسا بیگم نام تو خوب ہے۔ کیا خوب عورت مرغوب ہے؟ عاشقُ النّسا۔
سپہر آرا : اماں جان کو تو اطلاع کر دیجیے۔ ایسا نہ ہو جریب ٹیکتی ہوئی آئیں اور ان کے سامنے صلواتیں سنائیں تو کر کری ہو۔
حسن آرا : اچھا میں جاتی ہوں تم بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں (بڑی بیگم کے پاس جا کر) اماں جان بی ہمسائی آج آنے والی ہیں۔ کوئی شہزادی ہیں، دو گھڑی دل بہلے گا۔
بڑی بیگم : آئیں آئیں، قرینے سے بٹھانا۔ تمیز سے باتیں کرنا۔ باورچیوں کو بلواؤ اور خود حکم دو، اور کھانا پکواؤ۔ کوئی بھاری سا جوڑا دونوں بہنیں پہن لو۔ سمجھیں؟
حسن آرا : اماں جان کپڑے تو بدل لیے ہیں۔
بڑی بیگم : (عینک کو کپڑے سے صاف کر کے) دیکھوں یہ کیا سفید دوپٹا ہے۔
حسن آرا : نہیں اماں جان گلابی ہے۔ وہی جامدانی کا دوپٹا جس پر کامدانی کی آڑی بیل ہے۔
بڑی بیگم : بیٹا اب آنکھوں نے جواب دیا۔ رات کو گلابی اور آبی کیا سوجھے۔
راوی : یہ سچ مگر جو کاٹھی آپ نے پائی ہے، یہ دونوں میں سے ایک کی تو ہے نہیں۔
بڑی بیگم : بٹیا کوئی اور بھاری جوڑا نکالو۔
حسن آرا : (بھولے پن کے ساتھ) اماں جان ہمیں تو یہی پسند ہے۔
بڑی بیگم : (کان میں جھک کر) سنو شہزادیوں وہزادیوں کے پھیر میں نہ پڑنا (پیشانی پر بوسہ دے کر) ابھی ناکردہ کار ہو۔
راوی : واہ ری بڑی بیگم۔ زمانہ دیکھا ہے کہ باتیں۔ کس محبت سے کان میں جھک کر فرماتی ہیں کہ شہزادیوں وہزادیوں کے پھیڑ میں نہ پڑنا۔ ہائے ری بدگمانی ابھی ناکردہ کار ہیں، گھبرائیے نہیں۔ انشاء اللہ پختہ کار ہو جائیں گی:

خدا ترا بتِ ناداں دراز سن تو کرے ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

حسن آرا نے شرما کر گردن جھکا لی۔ بڑی بیگم کے فرشتے خان کو بھی خبر نہ تھی کہ یہاں پتنگ آئے، اور شطرنج کے نقشے آئے، اور عشق کا اظہار کامل طور پر ہو گیا۔

حسن آرا : ہم اماں جان کو سمجھا آئے۔ کہتی تھیں کہ اور بھاری جوڑا پہنو۔

سپہر آرا : تو بُرا نہیں مانا۔

حسن آرا : نہیں (مسکرا کر) کہنے لگیں۔ دیکھو شہزادیوں وہزادیوں کے پھیر میں نہ پڑنا۔

سپہر آرا : (قہقہہ لگا کر) ہاں!۔

اتنے ہیں عاشق النّسا بیگم کی فنس ایوانِ سپہر توامان کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ فنس زر نگار۔ چھٹکا بیش بہا پر بہار، سولہ کہار، وردیاں پہنے، مچھلیاں لٹکائے، جنگی دہنے بولتا، بائیں ٹھوکر بچائے کہتے ہوئے۔ دستیاں روشن، اور وہی بانکی مہری فنس کا کونا دبائے تیزی سے قدم بڑھائے، ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں۔ دربان نے آواز دی۔ ماما جی سواری آئی ہے۔ کہاروں نے اللہ اللہ کہہ کر فنس رکھی۔ ماما جی نے دربانوں کو ہٹایا، پردہ کرایا۔ عاشق النّسا بیگم اتریں، بسم اللہ!

عاشق النّسا بیگم : (اندر جا کر) آداب بجا لاتی ہوں۔

حسن آرا بیگم : تسلیم آئیے۔

عاشق النّسا بیگم : آؤ بہن گلے تو ملیں۔

حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم بے جھجک عاشق النّسا بیگم سے گلے ملیں۔

سپہر آرا :
آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے
یہ شان کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

حسن آرا : (عاشق النّسا بیگم کے جوڑے میں گلاب کا پھول دیکھ کر:
یہ کون آیا ہے رکھ کر پھول جعد عنبر افشاں میں
صبا اترائی پھرتی ہے جواں روز وں گلستاں ہیں

راوی :
الٰہی دے اثر ایسا مری بیتابیِ دل میں
چلے آئیں کلیجہ تھام کر وہ میری محفل میں

عاشق النّسا بیگم :
صفدر زباں سے رازِ محبت عیاں نہ ہو
دل آشنائے درد ہو لب پر فغاں نہ ہو

سپہر آرا : آپ نے آج غریبوں پر کرم کیا زہے نصیب۔
عاشق النّسا بیگم : بہن ہماری تو کئی دن سے خواہش تھی کہ آپ سے ملیں، مگر پھر ہم سوچے کہ شاید آپ کو ناگوار ہو۔ ہم تو غریب ہیں۔ امیروں سے ملتے ہوئے ذرا وہ معلوم ہوتا ہے۔
حسن آرا : بجا ہے۔ آپ خدا کے فضل سے شہزادی ہیں۔ ہم تو رعایا ہیں آپ کی۔
عاشق النّسا بیگم : آپ دونوں بہنیں ایک دن کوٹھے پر ٹہل رہی تھیں تو ہمایوں فر نے مجھ کو بلایا کہ بہن ذرا یہاں تک آؤ۔ جب گئی تو مجھ کو اشارے سے دکھایا کہ یہ دونوں لڑکیاں کنواری ہیں، مگر پڑھی لکھی ہیں۔
سپہر آرا : آپ کے بھائی صاحب کا بیاہ ہو گیا ہے۔
راوی : اے ہے کیا بیڈھب سوال کیا ہے۔ حسن آرا نے چٹکی لی کہ یہ کیا بھونڈی بات پوچھ بیٹھی۔
عاشق النّسا بیگم : (سپہر آرا سے) جی نہیں ابھی تو شادی وادی نہیں ہوئی، مگر آپ کی عنایت درکار ہے۔

سپہر آرا نے تو لجا کر سر جھکا لیا۔ مگر حسن آرا نے ایک بانکی ادا سے کہا کہ ہم لڑکیاں یہ باتیں کیا جانیں۔ بڑی دیر تک محبت اور الفت کی باتیں رہیں۔ یہاں تک کہ حسن آرا نے گلوری بنا کر دی اور عاشق النّسا بیگم نے انھیں کے ہاتھ سے کھائی۔ کتھا کیوڑے میں بسا ہوا، چاندی سونے کا ورق لگا ہوا۔ چکنی ڈلی اور الایچی، غرض کہ بڑی تکلف کی گلوریاں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اغذیۂ لطیف و لذیذ دسترخوان پر چنی گئیں، اور تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر عاشق النّسا بیگم نے فرطِ محبت ۔ ایت بے تکلفی سے حسن آرا کے زانو پر سر رکھ دیا اور لیٹ رہیں۔ سپہر آرا نے اٹھ کر کشمیر کا ایک بیش بہا دوشالہ اڑھا دیا، اور ان کے قریب جا بیٹھیں۔

عاشق النّسا بیگم : بہن اللہ جانتا ہے تم دونوں بہنیں چندے آفتاب، و چندے مہتاب ہو۔
حسن آرا : اور آپ۔
سپہر آرا : در تماشائے تو افتادہ کلاہ از سر چرخ
خبر از خویش نداری چہ قدر رعنائی
شہزادہ بہادر کو آپ کے تشریف لانے کا یہ حال معلوم ہے یا نہیں۔
حسن آرا : شہزادہ بہادر کی مرضی سے تو یہاں آئی ہی ہیں۔

عاشق النّسا بیگم : ہمایوں فر کیوں نہیں کہتی ہو، جو شہزادہ بہادر کہتی ہو۔
راوی :
نواب بہادر وہ ہمیں کہتے ہیں صفدر
پورا نہیں لیتے ہیں کبھی نام ہمارا
عاشق النّسا بیگم :
اب چین نہیں سینے میں دل کو کسی پہلو
وزدیدہ نگہ لے گئی آرام ہمارا

یہ کہہ کر عاشق النّسا بیگم اٹھ بیٹھیں، اور فرمایا کہ بہن ہم رخصت ہوں گے۔ زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔

سپہر آرا :
بے چین کر رہا ہے کیا کیا دل و جگر کو
ہر دم کسی کا کہنا جاتے ہیں ہم تو گھر کو

الغرض مکالمہ محبت انگیز و اشاراتِ الفت خیز کے بعد عاشق النّسا بیگم تشریف لے گئیں، اور جاتے وقت باصرار کہہ گئیں کہ ایک دن آپ کو ہمارے ہاں آنا پڑے گا۔ خدا حافظ اور فی امان اللہ کہہ کر مہمان میزبان، اور میزبان مہمان سے رخصت ہوئے۔ فنس پر سوار ہو کر عاشق النّسا بیگم نے ماما اور مغلانیوں، اور اصیلوں، اور دربانوں کو دو دو اشرفیاں انعام کی دیں، اور چپکے سے ماما کو ایک تصویر دے کر کہا کہ یہ دے دینا۔ کہاروں نے پھر بسم اللہ کہہ کر فنس اٹھائی، مشعلچیوں نے دستی آگے بڑھائی، اور فنس تزک و احتشام سے چلی، ماما نے اندر جا کر تصویر دی۔ حسن آرا نے دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

حسن آرا : بہن غضب ہو گیا۔ اُف۔ ہے ہے ستم ہو گیا۔
سپہر آرا : ہے ہے کیا ہوا۔ کیا، بولو تو؟
حسن آرا : تصویر دے کر (ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی)۔

سپہر آرا نے تصویر لی تو دانتوں تلے انگلی دبائی۔

سپہر آرا : ارے غضب ہو گیا۔ چل دی۔ اُف!

اس تصویر پر لکھا تھا (تصویر خاکسار عاشقِ زار میرزا ہمایوں فر)

نیم موسیٰ نقاب از چہرہ بردار — نمی آید خوشم این لن ترانی

پیاری میں عاشق النّسا بیگم نہیں ہوں، میں شہزادہ ہمایوں فر ہوں۔ اب اگر تم نے سرد مہری کی تو خدا گواہ ہے کہ زہر کھا لوں گا، جان دوں گا،

حسن آرا : (ہیرے کی کیل ناک سے نکال کر) بہن میں تو یہ کھا کر سو رہتی ہوں۔

سپہر آرا : (کیل چھین کر) اُف (رو رو کر) دل کو ذرا سنبھالو۔

حسن آرا : سنبھالوں کیا خاک۔ ہائے گل چکی (دانت کے تلے انگلی دبا کر) قیامت کا سامنا ہے۔ زانو پر سر رکھ کر سو یا۔ اُف! اُف! اُف!

سپہر آرا : مگر باجی اتنا تو سوچو بہن کہہ کہہ کر بات کرتے تھے۔ بہن بنا گئے ہیں۔

حسن آرا : یہ سب باتیں ہیں کس کی بہن اور کیسا بھائی، ہمارے مقدر میں یہی لکھا تھا:

وہ یوں مجھے دیکھ کر گیا ہے   کھال اس کی جو کھینچے سزا ہے

اللہ کرے یہ اخبار والے نہ سن پائیں کہ پھر اودھم کا اڑائیں۔

راوی : حضور یہاں پہلے ہی خبر پہنچ گئی۔ ہم نے ماماؤں اور مغلانیوں سب کو گانٹھ لیا ہے کہ روز روز کا کچا چٹھا کہہ سنائیں۔

سپہر آرا : واہ کسی کی مجال پڑی ہے پرائی بہو بیٹی کو تہمت لگانا کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے۔

راوی : کیا مجال ایک نگاہ قہر آلود کافی ہے۔

سپہر آرا نے فرطِ بے قراری میں فال دیکھی تو یہ غزل نکلی:

سحر بلبل حکایت با صبا کرد   کہ عشق گل بما دیدی چہا کرد

غلام ہمت آن نازنینم   کہ کارِ خیر بی روی ریا کرد

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم   کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد

فال تو اچھی ہے۔ خصوصاً یہ شعر قابلِ تعریف ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم   کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد

میاں آزاد کا جہاز پر سوار ہونا اور حسن آرا کا محبت نامہ پڑھ کر رونا

میاں آزاد جس وقت ساحل بحر کے قریب گئے، تو خوجی سے کہا کہیے حضرت آپ تو ڈھیلے ڈھالے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت خوجی نے جو غور سے پانی کی صورت دیکھی اور گول گول دیدے پھاڑ کر لہروں اور ان کے تھپیڑوں پر نظر ڈالی تو کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے اور کوئی پچاس قدم الٹے پاؤں بھاگے۔ وہاں پر خدا جانے کس مصلحت سے کسی نے ایک میخ گاڑی تھی۔ ٹھوکر جو کھائی تو اراراد دھوں۔ لڑھکتے ہی حضرت نے غل مچایا، کہ بھلا

بے گیدی) یہاں بھی ہماری جان کا گاہک۔ اُن ہی موجود ہوا اچھا بچہ۔ ٹھہر تو جاؤ۔ اتنا چھپایا ہوکر عمر بھر تو یاد ہی کرے مردک ہم جو پیٹھ کی طرف منھ اور منھ کے رخ دُم کیے بھاگے جاتے تھے تو گیدی نے اچھی گھات پائی۔ ایک بخنی چلتے چلتے بتاہی دی اب ادندھے پڑے بہروپیے کو للکار رہے ہیں۔ مگر اٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنے میں میرزا صاحب اور میاں آزاد بھی ٹلے پر جا پہنچے۔

آزاد : بس اٹھیے اٹھیے۔ بڑی دیر تک سویا کیے۔

خوجی : (جھاڑ پونچھ کر) پہلوان تو کبھی چت گرے ہی گا نہیں۔ جب گرے گا پٹ۔ گرا اور زمین پکڑ لی۔

آزاد : اب سفر کی تیاری ہے۔

خوجی : توبہ کر بندے، بھائی خشکی خشکی چلو تو بندہ ساتھ ہے، ورنہ سلام۔ پانی کی صورت دیکھی اور زہرہ آب ہوگیا۔ میں تو راستے ہی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر کھنگر بن جاؤں گا۔ دم سے جا کون سکے گا۔

یہ کہہ کر میاں خوجی بگٹٹ بھاگے۔ آزاد اور میرزا صاحب بھی ساتھ ہی جھپٹے۔ لینا۔ لینا۔ جانے نہ پائے، چور چور، ادھوری استر کا چور ہے۔ راہ میں ایک شخص نے میاں خوجی کا ٹٹو الیا، پہلے تو بہت ہی جھلائے اور لگے گاؤ زوریاں کرنے، مگر آزاد اور میرزا بھی آن ہی موجود ہوئے۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو، لو بھئی ہم آگئے۔

میرزا : (آزاد کے کان میں) حضرت یہ یوں نہیں جانے کے ان کو خوب افیم پلوائیے اور الو بنائیے۔ جب یہ نشے میں غین ہوں تو لاد لود کر جہاز پر بٹھا دیں گے۔

آزاد : اچھی ترکیب ہے (خوجی سے) ارے میاں خوجی۔

خوجی : خواجہ صاحب نہیں کہتے۔ خوجی کی ایسی تیسی۔ خواجہ بدیع خاصہ نام ہے۔ خوجی کیا معنی؟

آزاد : خواجہ صاحب قبلہ! آپ نے آج افیم تو پی ہی نہیں۔

خوجی : یہ کاہے سے معلوم ہوا آپ کو۔

میرزا : آپ کی آنکھوں سے جمائیوں سے۔

آزاد : کیوں صاحب آپ نے افیم پیتے دیکھا تھا انھیں۔

میرزا : جی نہیں میں تو خود ٹوکنے کو تھا۔

خوجی : ہاں حضرت کچھ نشہ تو ہم کو بھی ہلکا معلوم ہوتا ہے (جمائی آئی) بیشک افیم نہ پی ہوگی۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو اپنے ہوش کا حال ہے۔

آزاد : اس وقت جمائی بھی آئی آپ کو۔ وہ لیجیے دوسری آئی، خدا ہی خیر کرے۔

میرزا : تیسری آئی، واللہ اس وقت تو جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔

خوجی : بھائی بندہ بے پیے اب بات تو کرنے کا نہیں۔

میاں خواجہ بدیع صاحب نے پیالیاں نکالیں، افیم گھولی، اور چسکی لگائی، آزاد ہشاش بشاش کہ تہ پر تہ جمائی۔ میرزا خوش کہ ہماری تدبیر کارگر ہوئی، خوجی نے افیم جو پی تو مارے ہوس کے ذرا زیادہ پی گئے، پیتے ہی غین، آنکھیں بیر بہوٹی، آزاد نے ایک چھپر کھٹ پر لاد کر حضرت کو کشتی پر سوار کیا اور وہاں سے جہاز پر، خوجی کو سراپا ہی کی خبر نہیں، ورنہ وہ رولا بچاتے کہ الاماں، آزاد سوار ہونے ہی کو تھے کہ میرزا صاحب کا دوسرا خدمت گار نے بے تحاشے دوڑتا ہوا گھر سے آیا۔

آزاد : خیر تو ہے۔ خیر تو ہے؟

میرزا : اُف خداوندا خیر کیجیو!

خدمت گار : (ہانپتے ہوئے آزاد سے) حضور بیگم صاحب۔۔۔۔

آزاد : ہاں ہاں کیا ہوا بتا تو۔

میرزا : ارے غضب۔ ارے کمبخت بول تو کیا ہوا۔

خدمت گار : (رو رو کر) ہجور۔

میرزا : ہائے غضب! اُف۔ ستم۔ ستم۔ ستم۔ یہ پیاری بیگم دھوکا دے گئیں۔

آزاد : (خدمت گار کو چپت لگا کر) ابے کچھ کہے گا بھی مردک۔

خدمت گار : ہجور بیگم صاحب نے ہم کو یہ کھت (خط) دیا اور کہا آپ کا نام صاحب تمھارے جو ہے لیا، اور کہا کہ جیسے ان کی وہ کوئی دیکھو بہن ہیں باہر۔

آزاد : (چونک کر) ہاں ہاں کیا ہوا۔

خدمت گار : انھیں بہن نے آپ کو خط بھیجا ہے۔ سو لیجیے۔

آزاد : ابے تو پھر روتا کیوں تھا نابکار۔

خدمت گار: حضور۔ ایک آدمی نے وہاں پر دو گُدّے لگائے۔
آزاد: دُت نامعقول۔
میرزا: چل دور ہو پاجی گدھے، نالائق۔

آزاد خط لیا اور جہاز پر سوار ہوئے۔ میرزا صاحب سے کہا رخصت، ہماری طرف سے بیگم صاحب کو تسلی دیجیے گا اور ان کی تشفی کیجیے گا۔ میرزا نے کہا بہت خوب۔ آپ مطمئن رہیں فی امان اللہ۔

جہاز چلا اور جب تک نظر آیا میرزا اسد بیگ صاحب فرطِ محبت سے کھڑے دیکھا کیے آزاد نے حسن آرا کا خط کھولا اور پڑھا، اور پڑھ کر بہت روئے۔

حسن آرا کا رنج و غم اور سپہر آرا کو نامحرم سے گلے ملنے کا الم

سپہر آرا: میرزا ہمایوں فر ہمیں جل دے گئے۔
حسن آرا: کیسا کچھ۔
سپہر آرا: اُف اللہ جانتا ہے جب وہ باتیں یاد آتی ہیں، تو کانپ جاتی ہوں۔
حسن آرا: ہے ہے گلے۔
سپہر آرا: (بہن کے منھ پر ہاتھ رکھ کر) باجی خدارا اب اس کا نام نہ لو۔
حسن آرا: آتے ہی کہا تھا کہ آؤ بہن گلے تو ملیں۔ ہائے ہم عاشق النسا بیگم کے دھوکے میں رہے وہ میرزا ہمایوں فر نکلے۔
سپہر آرا: اب خاموش ہی رہیے کلیجہ پاش پاش ہوگیا ہے۔
حسن آرا: خبردار اب نامہ و پیغام سے واسطہ نہ رکھنا۔ ع۔ الغفط ہے قلم کی دوست داری،، آدمیوں کو تاکید کر دو کہ کسی کا خط بے سمجھے بوجھے لیں ہی نہیں، ورنہ موقوف کر دیے جائیں گے۔
سپہر آرا: ذری سوچ لو۔ آدمی اپنے دل میں کیا سمجھیں گے کہ ابھی تو اس گرما گرمی سے ملیں، اور ابھی یہ نادری حکم۔
حسن آرا: ہاں سچ تو ہے ابھی تک تو ہم ہی تم جانتے ہیں۔
سپہر آرا: اور خدا نہ کرے کہ وہ کسی سے ذکر کریں۔

حسن آرا : اس سے اطمینان رکھو۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ وہ لقے تو ہیں نہیں کہ۔

سپہر آرا : واہ لقے نہیں تو اور ہیں کون۔ لقوں کے سر پر کیا دو سینگ ہوتے ہیں۔

حسن آرا : اب آج سے مہتابی پر نہ چڑھنا۔

سپہر آرا : واہ بہن بیچ کھیت چڑھیں، دن دہاڑے چڑھیں اتنا تو سمجھو کہ یہاں کا آدمی میرزا ہمایوں فر کے مکان میں سے کیوں کر آئے گا بھلا۔ یہ سب مُٹے بتاتے تھے وہ اور پھر نظر آئے بھی تو ہمارا خدا ہی جانتا ہے کہ ہم کو کسی شریر کے گھورنے سے ذرا سروکار نہیں۔ اپنا دل صاف رہنا چاہیے ہے کہ نہیں؟

حسن آرا : ہے تو یوں ہی مگر بہن عاشق النسا بیگم سے گلے مل چکی ہو۔ ہائے غضب تو یہ ہے اب چار آنکھیں ان سے کیوں کر ہو سکیں گی۔

سپہر آرا : اے خدا نہ کرے کہ ایسوں سے چار آنکھیں ہوں۔

حسن آرا : دل اس وقت سے قابو میں نہیں رہا۔

سپہر آرا : آؤ فال دیکھیں۔

حسن آرا : دیکھو دو گھڑی غم ہی غلط ہوگا۔

سپہر آرا نے دیوان حافظ منگوایا اور صدق دل سے فال دیکھی تو یہ غزل نکلی:

صبا بہ تہنیتِ پیرِ مے فروش آمد — کہ موسم طرب و عیشِ نامی و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشای — درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنورِ لالہ چناں بر فروخت بادِ بہار — کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بجوش آمد
بگوشِ ہوش زمن بشنو و بعشرت کوش — کہ ایں سخن سحر از ہاتفم بگوش آمد
ز فکر تفرقہ باز آئی تا شوی مجموع — بحکم آنکہ چو شد اہرمن سروش آمد
چہ جائے صحبت نامحرم ست مجلس انس — سر پیالہ بپوشاں کہ خرقہ پوش آمد
بگومیت سخن خوش بباد بادہ بنوش — کہ زاہد از بر مارفت و بادہ نوش آمد
زخانقاہ بہ میخانہ می رود حافظ — مگر ز مستی زہد و ریا بہ ہوش آمد

---

[1] دیوان حافظ مرتبہ قزوینی مطبوعہ تہران میں ساتواں شعر نہیں ہے۔ اور مطبوعہ نولکشور میں مرتبہ قزوینی کا یہ شعر غائب ہے: " ز مرغ صبح ندانم کہ سوسن آزاد۔ چہ گوش کرد کہ بادہ زبان خموش آمد

سپہر آرا جھوم جھوم کر اشعار پڑھتی جاتی تھی اور روح وجد میں آتی تھی۔ اتنے میں حسن آرا نے کہا کہ اس شعر کو پھر تو پڑھنا کچھ مطلب بھی غور کرتی ہو یا پڑھتی ہی چلی جاتی ہو۔

سپہر آرا نے شعر پھر پڑھا:

ز فکر تفرقہ باز آئی تا شوی مجموع　　بحکم آنکہ چو شد اہرمن سروش آمد

حسن آرا: (مسکرا کر) تا شوی مجموع سمجھیں۔ اس سے تو صاف صاف مطلب یہی ہے کہ تمہارا ان کے ساتھ نکاح ہو جائے گا۔

سپہر آرا: (تنک کر) چلیے بس اب چھیڑ خانی رہنے دیجیے۔

حسن آرا: اے واہ دل میں تو خوش ہوئی ہو گی چاہے زبان سے نہ کہو۔

سپہر آرا: اس کے کہنے میں کون سی برائی تھی بھلا۔

حسن آرا: آخر برا کیا ہے۔ شہزادے ہیں کہ نہیں ہیں؟ اور صورت تو تم دیکھ ہی چکی ہو، چاند کا ٹکڑا ہے۔

سپہر آرا: (ہنس کر) خواہی نخواہی چھیڑتی جاتی ہو۔

سپہر آرا نے غزل پڑھنا شروع کی تو ایک مصرع کو چبا گئی۔

حسن آرا: کیا کیا کیا۔ یہ چبا چبا کے پڑھنا کیا معنی۔ مصرع پھر تو فرمائیے۔

سپہر آرا: چہ جائے صحبتِ نامحرم ست مجلسِ انس۔

حسن آرا: لو اب آج کے دوسرے ہی مہینے شہنائی دروازے پر بجتی ہو گی۔

سپہر آرا: ہم اٹھ کے چلے جائیں گے ہاں۔ یہ ہنسی ہم کو گوارا نہیں۔

حسن آرا: اچھا اس فال سے تم نے کیا مطلب نکالا۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور معنی پیدا کرو تو دو سیر مٹھائی ہارتے ہیں۔ بتائیے؟

سپہر آرا: خدا کے لیے مٹھائی وٹھائی کا نام تو نہ لیجیے گا ذری۔ کہیں۔ اب کی بھی بیگی ماما اماں جان کو رسوخیت جتانے کے لیے جا کے دے آئے۔ تو یہ راز بھی کھل جائے۔ ہے ہے غضب ہو وہ تو بڑی خفا ہو جائیں کہ یہ کیا ہوا۔

حسن آرا: اللہ نہ کرے۔ واہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ اس میں ہمارا کیا قصور عاشق النسا بیگم کے دھوکے میں کوئی جل دے جائے تو ہمارا کیا قصور بھلا۔ میں کہتی ہوں اس کا کلیجہ بھی نہ لرزا کہ وہ کنواری شریف زادیوں میں عاشق النسا بیگم بن کر آیا اور۔

سپہر آرا : بس بس۔ ع۔ دیوار گوش دارد۔ فہمیدہ لب بجنباں،، یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ سوچیے تو ذری۔ اف کیسا غضب ہو گیا۔

حسن آرا : اب میں خدا کی قسم دل لگی سے نہیں کہتی کہ آخر اس بے چارے میں کیا برائی ہے۔

سپہر آرا : اے خدا خدا کرو۔

حسن آرا : حسین۔ شہزادہ مالدار، وضعدار، خوش تقریر۔ خوش پوش، خوبرو، عنبر مو، کم سن طناز۔

سپہر آرا : بس! اور دس پانچ باتیں کہیے نہ۔

سپہر آرا کے دل پر ان باتوں کا بہت بڑا اثر ہوا۔ انسان کی طبیعت بھی کیا جلد پلٹا کھاتی ہے۔ اور کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ ابھی تو میرزا ہمایوں فر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اب بڑی بہن سمجھاتی ہیں کہ آخر اگر نکاح ہو تو قباحت ہی کیا ہے۔ حسین ہے۔ وضعدار ہے۔ خوش تقریر، تربیت یافتہ، شہزادہ مالدار ہے، اور سپہر آرا بیگم دل ہی دل میں کھلی جاتی ہیں، کہ ہاں ہے تو سچ۔ اس کے حسن میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا کسی طرح کا۔ معقول۔ اب بی سپہر آرا کو شوق چرایا کہ نکاح ہو۔ لیکن ابھی حسن آرا تک سے چھپاتی ہیں۔ زبان پر حرفِ عشق نہیں لاتیں۔ مگر دل میں سوچتی جاتی ہیں کہ ہے تو خوب بات۔ ہم بھی رئیس زادیاں ہیں۔ آخر ایسی ویسی تو ہیں نہیں کچھ، اور ان کے شہزادے ہونے میں تو شک ہی نہیں۔

مہری کا پیغام

آج ناظورۂ ملائک نظر فریب، حسن آرا بیگم، اپنی ہمشیرہ، سیزدہ سالہ آفت کی پرکالہ، پیاری سپہر آرا کو بزرگانہ نصیحتیں کر رہی ہیں، اور وہ بھی اپنی ذی جودت وذی لیاقت بہن کے تقدس کا دم بھر رہی ہیں۔ یہ باتیں اس لائق ہیں کہ ان کو حرزِ جاں کرے اور ان کے فقرے فقرے کو دستور العمل سمجھے۔ ان سے شرافت و نجابت پاک دامنی اور حیا پروری کا سبق سیکھے:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اب مکالمۂ موعظمت انگیز ونصیحت آمیز سنیے۔

حسن آرا : سپہر آرا ہماری پاک دامنی، ہم ہی خوب جانتے ہیں اور ہمارا خدا۔

سپہر آرا : اور یا پیارے آزاد۔

راوی : اور یا ہم جور و زر روز کا کچا چٹھا پاتے ہیں، اور اس فسانے میں طرزِ نوی سے درج کرتے ہیں۔

ناظرین : اور یا ہم لوگ جو حسن آرا کے دل کی بات تک جانتے ہیں۔ اور سپہر آرا کے تقدس کو دل سے مانتے ہیں۔

حسن آرا : دنیا میں رہنا سہنا کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں، مگر ہمارا ہی دل خوب جانتا ہے کہ ہمارا دامن لوث بدی سے کس درجہ پاک ہے۔ چاہے سارا زمانہ یہی کیوں نہ سمجھے کہ ایک بہن شوخ دوسری بیباک ہے۔ جمیت ذرا ڈانواں ڈول ہو کیا مجال۔ ارادہ فسخ ہو جائے یہ ممکن نہیں۔ اللہ کے بندہ نوازی کے قربان جاؤں۔ نور کے عوض نورِ حیا آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ نظر بھی پڑتی ہے تو صدق صفا کے ساتھ پاؤں بھی پڑتا ہے تو ادب و حیا کے ساتھ۔ بہن اللہ گواہ ہے کہ اس ملک کی شریف زادیوں میں بس یہی عیب ہے کہ بجز کھانے پینے، لڑکے کھلانے اور سینے کے کچھ جانتی ہی نہیں۔ حرف تک تو پہچانتی ہی نہیں۔ مرد تو خیر پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن عورتیں تو بس گورے چمڑے اور زرق برق لباس ہی کو بڑی شرافت سمجھتی ہیں۔ سو بہن گر گورے چمڑے ہی پر شرافت ہے تو یہ گھوسن جو روز دودھ دے جاتی ہے اس سے زیادہ شریف اس شہر میں تو شاید ہی کوئی اور ہو۔ باقی رہی پوشاک بھلا کہیں کمخواب و سنجاف، اور بیش بہا مو ہاف سے بھل منسی آیا کی ہے۔ بعض عورتیں دن بھر بنی ٹھنی رہتی ہیں۔ جب دیکھو حسن دان کے سامنے بیٹھی نکھر رہی ہیں۔ مشاطہ سے فرمائشیں ہو رہی ہیں۔ کہ عطر سے بسا دے جس طرف سے فنس نکل جائے لوگوں کا دماغ طبلۂ عطار کو شرمائے۔ سمجھیں کہ جونپور اور قنوج سے گلاب اور کیوڑے کے دریا باہر آئے۔ فنس کو دور سے دیکھتے ہی، لوگوں کی انگلیاں اٹھیں کہ وہ آئی وہ آئی۔ شہر میں مشہور ہو کہ فلاں بیگم نام خدا بڑی شوقین ہیں۔ غضب کی مہ جبیں ہیں۔ فنس کا جھٹکا بھی مہک رہا ہو۔ تو حسن جھلک رہا ہو۔ مہری کو حکم ہو کرلے تو بھی عطر مل لے۔ وہ (میں قربان)، کہہ کر آدھی شیشی ہاتھ پر لڑھکائے، اور گیسو کے عوض چہرے پر لگائے، تاکہ شعاعِ آفتاب جو رخ پر پڑے تو چہرہ چمک جائے، اور عطر تڑخ تڑخ نور برسائے، ماشاء اللہ دوپٹا ایسا باریک ہو کہ کوئی زیور چھپا نہ رہے۔ دوپٹے میں سے جوبن چھن چھن کر نکلے۔ بہن اگر ذرا غور کرو تو معلوم،

ہو جائے کہ جو بنے ٹھنے ہی میں شرافت ہے، تو موئی بیسواؤں سے (بہت آہستہ سے) بڑھ کر کوئی شریف زادی نہیں۔ بناؤ چناؤ سب کچھ کرو، مگر قرینے کے ساتھ۔ کچھ تو بوئے شائستگی آئے۔ اور ٹھیٹھ ہندنیاں تو بہن ان سے بھی گئی گذری ہیں۔ ہاں نیک اندر بد، بار اندر نیک، کیا سب کی سب بے شعور تھوڑا ہی ہیں، مگر تربیت یافتہ دو، تو غیر تربیت یافتہ چار سو۔ ہم نے ہندوستان بھرے انوکھی وضع رکھی، اور اب تک تو خدا کے فضل سے نبھی چلی آتی ہے۔ آیندہ کا حال کون جانے۔

سپہر آرا: اللہ چاہے تو عمر بھر اسی وضع کے ساتھ بسر ہو۔

حسن آرا: انشاء اللہ۔

سپہر آرا: سنو باجی۔ اگر یہ بات مشہور ہوئیں تو لوگ ہم کو کیا جانے کیا سمجھیں۔ لیکن سمجھا کریں، ہم اپنے صدق و صفا کو نہ چھوڑنے کے، رفتہ رفتہ خود ہی کھل جائے گا۔ کہ دونوں بہنیں کیسی پاکباز ہیں۔ ہندوستان کی عورتیں سنیں تو دانتوں کے تلے انگلیاں رکھیں، لیکن تمھیں بتاؤ کہ ہم نے آج تک کیا کیا۔ ہنود کے ہاں مشہور ہے کہ سیتا جی سے رام چندر جی ذری بدگمان ہوگئے کوئی نگوڑا دھوبی اپنی بیہودہ جورو سے کہہ رہا تھا کہ مجکو بھی کیا رام چندر سمجھی ہے۔ بس انھوں نے آن کر گھر میں کوئی ایسی بات کہی کہ سیتا جی نے جو پاکباز تھیں دعا مانگی کہ زمین شق ہو جائے اور اگر میں عصمت مآب ہوں تو زمین کے اندر دھنس جاؤں۔ ان کی پاکی اور تقدس میں کوئی شک تو تھا ہی نہیں، زمیں دعا مانگتے ہی شق ہوگئی اور وہ دھنس گئیں۔ بس پھر تو سارا زمانہ کہنے لگا کہ بڑی حیا پرور اور پاک نظر تھیں۔ اپنے ہی ہاں نہ دیکھ لو کہ حضرت مریم کے والدین نے بدرگاہِ حق جل و علا نذر مانی تھی کہ اگر ہم کو لڑکا یا لڑکی عطا فرمائے تو ہم اس کو بیت المقدس کی جاروب کشی کے لیے مامور کر دیں گے۔ چنانچہ بفضل ایزدی حضرت مریم ان کے یہاں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدین نے حسب وعدہ ان کو ایک گوشۂ بیت المقدس میں بٹھا دیا۔ اور کبھی کبھی ان کے دیکھنے کو آیا کرتے تھے۔ خدا کی شان کہ حضرت مریم حاملہ ہوئیں، اور وضعِ حمل بعد انقضائے مدت فرمایا، اعزا اور والدین جو دیکھنے کو آئے تو یہ قدرت خدا دیکھی۔ متحیر ہوئے اور حضرت مریم کی طرف سے بدگمان ہو کر پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا، خاندان کا نام ڈبو دیا۔ اپنے کو رسوائے خلق کیا۔ تب حضرت مریم نے فرمایا کہ اسی لڑکے سے پوچھو۔ لوگ حیرت زدہ اس لڑکے کی طرف مخاطب ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ گویا ہوئے اور اپنی عفیفہ و

مقدس ماں کی عفت کی سند اپنی گویائی سے پیش کی۔ حکم خدا سے گویا ہوئے تھے کہ باتیں کیں، عیسیٰ روح اللہ آپ کا لقب ہے۔ جب ذرا سے لڑکے اور فرزندِ نوزائیدہ کو لوگوں نے گویا پایا تو شک دور اور اہتمام بیجا کا فور ہوا اور حضرت مریم کی عصمت و عفت اور ان کے تقدس کا نقش سب کے لوحۂ دل پر منقوش ہوگیا۔ باجی اللہ جانتا ہے جو ہم کو ذرا بھی خیال ہو۔ ہمیں کوئی لاکھ برا کہے تو کیا اپنا دل صاف ہونا چاہیے۔

اتفاقاً مہری کھڑی پردے کے پاس سے سن رہی تھی۔ کون مہری وہی جو مصنوعی عاشق النسا بیگم کے ساتھ آئی تھی۔ وہی جو زبانی پیغام لائی تھی۔ وہی جو میرزا ہمایوں فر کی ہمدم و ہمساز تھی، وہی جو محرم راز تھی۔ پردے کے پاس سے ساری رام کہانی سن کر چمکتی ہوئی اندر گئی۔ اُف ستم ہوگیا۔ غضب بپا ہوا۔ حسن آرا نے جو اس پر نظر ڈالی تو وہ جھک کر تسلیم بجا لائی۔ تسلیم کا لفظ سنتے ہی سپہر آرا نے گردن پھیر کر دیکھا تو دنگ ہوگئی۔ رنگ فق آنکھوں سے غیظ و غضب ٹپکتا تھا۔

حسن آرا : کون ہو؟

مہری : حضور میں ہوں۔

حسن آرا : کہاں سے آئی ہو؟

مہری : آپ مجھے اتنی جلد بھول گئیں۔ بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

حسن آرا : بیگم صاحب کون؟

مہری : جی عاشق النسا بیگم۔

حسن آرا : کہو کیا پیغام بھیجا ہے۔

مہری : (مسکرا کر) حضور کو ذرا وہاں تک تکلیف دی ہے۔

مہری کا اس وقت مسکرانا، دونوں بہنوں کو نہایت شاق سا گذرا، جیسے تیر سا چھاتی میں لگا۔ مگر چپ۔ بولیں، للکاریں، تو رازِ سربستہ افشا ہو جائے۔ ہائے کیا بیڈھب موقع ہے۔ توبہ توبہ۔ مہری تو محرم راز تھی نہ۔ کیا مزے سے مسکرائی۔ اب اگر کوئی اور موقع ہوتا تو حسن آرا اس کو سمجھاتی، اور سپہر آرا بگڑ جاتی، کہ خام پارہ ہمارے منھ پر چڑھتی ہے۔ مگر دونوں دور اندیش اور دانا تھیں۔ دم بخود ہوئیں۔

مہری : حضور بیگم صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر کچھ حرج نہ ہو تو آج ہمارے ہی ہاں آئیے۔

سپہر آرا : کہہ دینا، ہمیں فرصت نہیں ہے، معاف کیجیے۔

مہری : بہت اچھا۔ مگر فرمایا ہے کہ آپ کو فرصت نہ ہو تو میں خود ہی چلی آؤں۔

سپہر آرا : جی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ بس اب دور ہی سے سلام ہے، اور اب آج سے تم نہ آنا یہاں سنا کہ نہیں۔

مہری : (ادب کے ساتھ) بہت اچھا لونڈی حکم بجا لائے گی مگر حضور سوچ لیجیے کہ لونڈی کا قصور نہیں۔ بیگم صاحب کی جیسی نوکر ویسی حضور کی۔

سپہر آرا : چلو بس بہت باتیں نہ بناؤ۔ بیگم صاحب ہمیں دیوانہ بناتی ہیں۔ ہڈیاں چلچلاتی ہیں۔ بس کہہ دینا خیر اسی میں ہے کہ اب نامہ پیغام نہ آئے۔ شہزادے ہیں اس سے چھوڑ دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو خون ہو جاتا۔ اتنے بڑے شہزادے۔ بادشاہ کی اولاد اور غریب کنواری شریف زادیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بس چلے تو وہ سزا دوں کہ عمر بھر یاد کریں۔ واہ اچھا جال پھیلایا ہے۔ ان کے کان کھول دینا کہ ہم کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ ذری بہت چل نہ نکلیے۔

حسن آرا : (بہن سے) اب خاموش بھی رہو۔ کوئی سن لے گا۔ بس اب کچھ کہو نہ سنو۔ (مہری سے) چلو سامنے سے ہٹو۔

مہری : (قدموں پر گر کر) حضور میری جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

حسن آرا : اب تم جاؤ ہم نے کئی دفعہ کہہ دیا۔ نہیں پیچھے پچھتاؤ گی۔

مہری روانہ ہوئی۔ ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، جب احاطے کے باہر نکل گئی تب کہیں جان میں جان آئی۔ قسم کھائی کہ اب نہ جائے گی۔ ادھر سپہر آرا کا چہرہ مارے غصے کے لال بھبھوکا ہو گیا۔ پاک دامنی کے خیال نے مجبور کیا کہ مہری کو للکارے، پہلے تو بی مہری صاحب بات بات پر مسکراتی تھیں۔ فقرے فقرے پر کھلی جاتی تھیں۔ مگر جب سپہر آرا نے ڈانٹ بتائی تو دنگ ہو گئی۔ سپہر آرا کے چہرے کا اس وقت غصے نے اور بھی جوبن دوبالا کر دیا تھا۔ سرخی اور سفیدی کا متغیر ہو جانا، اور گورے گورے رخسارِ رنگین کا تمتمانا غضب ڈھاتا تھا۔ معشوقوں اور سیم بدنوں، کے غصے میں بھی وہ آن ہے کہ سبحان اللہ۔ انکھڑیاں قہر آلود تھیں۔ مگر اس قہر کے صدقے کہ عالم ہی اور تھا۔ چتون وہ تیکھی کہ اچھے اچھے بانکے دیکھیں تو آنکھیں ٹھکائیں۔ حسن آرا بیگم سمجھاتی جاتی تھیں کہ بہن اب اور باتوں کا خیال کرو۔ کبھی بہن سے گلے

پٹنا، کبھی ہاتھ میں ہاتھ دینا، کبھی فرطِ محبت سے بوسے لینا، دو معشوقوں کی یکجائی، اور اپنے اپنے طور پر دلربائی۔ ایک کا بل کھانا، اور جھلا جھلا کے رہ جانا، دوسری کا سمجھانا، اور اونچ نیچ دکھانا، اس سے عجب کیفیت نظر آتی تھی۔ اور شان کبریائی جلوہ دکھائی تھی، دیر تک دونوں سکوت میں رہیں:

چشمِ جادو نکہت گرچہ خموش آمدہ است
از اشارات واد انکتہ فروس آمدہ است

سپہر آرا: اچھی عاشقی ہے، بس معلوم ہوا کوئی بوالہوس ہے:

نہ رسد عاشقی بہ بوالہوساں — عاشقی دیگر و ہوس دگر ست

اگر عشق صادق ہے تو حیا و شرم کے ساتھ ظاہر کرنا چاہیے، یا اس بے تکے پن سے۔

راوی: اب تو بے بولے نہیں رہا جاتا۔ سپہر آرا بیگم فرماتی ہیں کہ حیا و شرم کے ساتھ اظہارِ عشق ہونا چاہیے۔ یہ سچ۔ لیکن:

گرچہ در پردہ عاشقی ہنر ست — چکنم آہ و نالہ پردہ در ست
چوں نسوزد بہ عشقِ گل بلبل — آتشی متصل بہ مشتِ پر ست

میرزا ہمایوں فر کے رود بارِ عشق کی روانی اور بحرِ جنون کی طغیانی

ادھر تو عتاب تھا۔ اب ادھر شہزادہ ہمایوں فر کا حال سنیے، کہ مہری کو بھیج کر لبِ بام وقتِ شام ٹہلنے لگے۔ مگر سوچتے جاتے تھے کہ کہیں وہ دونوں پری پیکر بہنیں خفا نہ ہو گئی ہوں تو بڑی بے ڈھب ٹھہرے۔ بات کی بات جائے اور شاید جان کے بھی لالے پڑ جائیں۔ اور ان کی قہر آلود آنکھیں غضب ڈھائیں۔ دل پر بجلی گرائیں۔ دیکھیں مہری کیا پیغام لاتی ہے۔ کیسی خبر سناتی ہے۔ خدا کرے کہ مہری کو ساتھ لے کر مہتابی پر چلی آئیں، اور ہم کو جھمکڑا دکھائیں اور ہم یہ اشعار لکھ کر پتنگ ڈھائیں:

دمیکہ جلوہ نمائی باین قد و قامت — ہزار حشر بپا گردد از در و بامست
نشد گہی کہ شود چشم مست تو ہشیار — کہ بود ساقی دلیں مے کہ ریخت درخامست
باعتقاد دل و جانم از سر وش بہ است — بمن کسی کہ رساند نوید پیغامست
مگر خدا لئے بتائی کہ روز و شب نگرم

چو کعبہ سجدہ گہہ عاشقان در وباست

اگر وقت چار آنکھیں ہوں، اور تیرِ نظر کلیجے پر لگے تو خلش وہ مزہ دے کہ از سرِ نو جان آ جائے۔ اور روح تک ذائقۂ خلش پائے:

از کرشمہ جانانم تیر زد شمر گانم   چوں نہ مرحبا خوانم وقت مرحبا است

اتنے میں مہری آئی۔ شہزادہ ہمایوں فر تاڑ گئے، کہ ٹکا سا جواب دیا۔ بُری خبر لائی۔ چیں بجبیں ہے۔ خداوندا خیر کیجیو۔ مہری قریب آن کر مُنھ پھلا کے کھڑی ہو گئی، مگر خاموش۔

ہمایوں فر: پھر اب کہو نہ صاف صاف۔

مہری: حضور کیا عرض کروں۔

ہمایوں فر: وہ تو ہم تمھاری چال ہی سے سمجھ گئے تھے کہ بیڈھب ہوئی کہ چلو بس۔

مہری: حضور اب لونڈی وہاں نہ جانے کی۔

ہمایوں فر: جانا آنا سمجھا جائے گا، پہلے مطلب کی بات تو بتاؤ کہ ہوا کیا۔

مہری: میں نے جا کر پردے کے پاس سے سنا کہ آپ ہی کی باتیں چپکے چپکے کر رہی ہیں۔ ایک بولیں کہ ادھر جی کچھ ہوگا بھی۔ جُل تو دے گئے، مگر ہمارا دل تو صاف ہے۔ دوسری بہن بولی کہ اب خبردار خط وط نہ لینا۔ پھر کیا جانیں کیا باتیں کیا کیں۔ میں جو گئی تو بڑی بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں۔ اور چھوٹی بہن تو بس برس ہی پڑیں۔ اُف بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ میں کھڑی کانپ رہی تھی کہ مصیبت میں پڑی۔ چھٹکی بہت تیز ہو کے بولیں کہ اب نہ آنا، اور آؤ گی تو تم جانو گی۔ اور ان سے بھی کان کھول کے کہہ دینا کہ بہت چل نہ نکلیں۔ اتنے بڑے شہزادے ہو کے اور شریفوں کی بہو بیٹیاں سے یہ باتیں۔ ہم کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ شہزادے ہیں، اس سے چھوڑ دیا۔ بہت ہی بگڑیں۔ حضور میں چور کی طرح چپکے چپکے سنتی رہی۔ لیکن وہ جھلایا ہی کیں۔ میں نے قدموں پر سر رکھ دیا اور......

ہمایوں فر: خوب کیا۔ مگر تم پردے کے پاس تھوڑی دیر اور کیوں نہ باتیں سنا کیں۔

مہری: حضور وہ موئی ماما پولی حیراں غڑاپ سے نکل آئی، اور لونڈی نے جھپ سے پاؤں کھجلانا شروع کیا۔ پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ نہیں کنکڑی پاؤں میں چُبھ گئی۔

راوی: سب جھوٹ۔

ہمایوں فر: افسوس۔ تو بہت ہی بگڑیں۔

مہری : قربان جاؤں حضور بس کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ اپنے آپے ہی میں نہیں تھیں۔

ہمایوں فر : ہم نے بڑی غلطی کی۔ ان دونوں شریف زادیوں کی یہ حیا پروری بس دل میں کھپ گئی۔ آفریں ہم سے یہ ایک حرکت بڑی ہی لغو سرزد ہوئی۔ اول تو ہمیں جانا نہ تھا، اور گئے تو پہچانا نہ تھا۔ مگر ان دونوں کو بھی عصمت کا کس درجہ خیال ہے۔ واہ واہ۔ اے سبحان اللہ اللہ اللہ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی سے رہیں، اور بایں ہمہ، عفت کو اتنا عزیز رکھیں۔ آفریں آفریں! خدا ہی خوب جانتا ہے کہ ہم نے بدی کا کبھی خیال ہی نہیں کیا۔ ہاں اگر ان کو منظور ہوتا تو نکاح ہو جاتا، پھر اس میں عیب کیا ہے۔ نکاح کچھ گناہ ہے۔

مہری : حضور ذری سوچیں تو۔ جان بخشی ہو تو عرض کروں؟

ہمایوں فر : بخشی۔ کہو۔

مہری : آج تک اس طرح کسی نے بیاہ کیا ہے بھلا۔ اور حضور نے جاکر یہ بن ناحق کو کہا کہ آؤ بہن گلے ملیں۔

ہمایوں فر : ہاں کہتی تو سچ ہو۔ یہ بڑی غلطی ہوئی۔

مہری : اب جانے وانے کا قصد نہ کیجیے گا۔

ہے یہ وہ درد کہ جس درد کا چارہ ہی نہیں
واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گذارہ ہی نہیں

شہزادہ بلند ارادہ، افشاں جبیں تاجداری۔ گیسوئے نمدار شہریاری، یوسف جمال، رشک قمر میرزا ہمایوں فر۔ ضاعف قدرہ کا پردہ نشین، نازنین پر دل کیا آیا کہ دنیا کے عیش و عشرت لطف و مسرت سے ہاتھ اٹھایا۔ ترانۂ عشق نوک زبان تھا۔ غم کدۂ دل کلبۂ احزاں تھا۔ آنکھیں خوں چکاں گویا بحر قلزم نے فوارہ چھوڑا۔ راحت منزلوں دور آرام نے منھ موڑا۔ وہ پردہ نشیں ناکردہ کار، یہ جگر پر چوٹ کھائے ہوئے عاشق زار، ان کو ننگ و ناموس کا خیال۔ ان کو شادی کی دھن اور شوقِ وصال۔ آنکھ بھی پڑی تو پردہ نشیں پر۔ دل بھی آیا تو پاک نظر مہ جبیں پر:

دل تو کہاں وہ مہوشِ نامہرباں کہاں　　ناداں ہے زمیں کہاں آسماں کہاں

بتِ پندار کا روٹھنا، اچھے صاحب کو للکارنا، شہزادے کو بے نقط سنانا، اور مہری کا

باتیں بنانا، جب ان امور کا خیال آتا تھا، تو شہزادے کا رنگ فق ہوا جاتا تھا۔ ایک پری پیکر پری زاد، دوسری کافر، ستم ایجاد، ایک چھیل چھبیلی، دوسری کامنی، مگر واہ ری پاکبازی اللہ ری پاکدامنی، غمزۂ خوباں نے دل توڑا۔ دیوانہ پن سے ناتا جوڑا۔ کبھی یادِ گلِ رخسار نے نئے نئے گل کھلائے۔ کبھی وہ خم و چم، وہ ناز و انداز یاد آئے۔ عہدِ جنون کی بہار۔ دل پہلو میں بے قرار۔ ہجر کا خسار، چشم در راہِ انتظار، مزاج نسیمِ نوبہار کی طرح آوارہ، نظروں کے سامنے غمزۂ خاطر شکن محبوب مہ پارہ:

قسمت الٹ گئی کہ دل تلخ کام کو
مشتاقِ بوسۂ لبِ شیریں دہن کیا

رفیق: کوٹھے پر آیئے۔

ہمایوں فر: اچھا۔

اتنے میں ہمایوں فر عین حالت بے قراری میں لب بام آئے تو عروسِ مراد نے جلوہ دکھایا۔ شور و شیون کا اثر ہوا۔ نظارۂ جمال مہر پیکر ہوا۔ ادھر مہتابی پر دل برِ طناز۔ اُدھر لبِ بام ہمایوں فر شہیدِ خرامِ ناز۔ حسن آرا بیگم بڑے ٹھسے سے مہتابی پر چڑھی ہیں، مگر ادھر پشت کیے اور نقاب زریں رخِ انور پر ڈالے کھڑی ہیں:

مشتاق بے قراری ہیں دیدار کے ترے
گھونگھٹ تو اپنے مکھڑے سے ظالم ذرا اٹھا

یہ لیجیے! وہ سپہر آرا بھی بناؤ چناؤ کر کے مہتابی پر تشریف لائیں۔ اور آتے ہی شہزادے سے بے خبری میں آنکھیں لڑائیں۔ آنکھیں لڑتے ہی شوخی کے ساتھ اچک کر وہ ہو رہیں۔ اور دم کے دم میں حسن آرا بھی نظر سے اوجھل تھیں۔ حضرت ہمایوں فر محبت آمیز اشارے کر ہی رہے تھے، اور لبِ زخم جگر چنگاریاں بھر ہی رہے تھے کہ حسن آرا جھک کر کوٹھے پر اور سپہر آرا اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی زینے پر۔ ارے! ہائے اس دیدار بت پندار نے اس سوختہ جان کے دل پر اور بھی بجلی گرائی۔ اس بے رحمی کے صدقے کہ دکھاتے ہی صورت چھپائی۔ نظر بھر کر دیکھنے بھی نہ پایا۔ الٰہی یہ سحر ہے یا چھلاوا۔ جب اُن بتانِ شعلہ رو کو نظر سے غائب پایا تو بدن سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اور سینے میں شعلے بھڑک اٹھے ہے ہے ایسی ہی حیا پھٹ پڑی تھی تو کوٹھے پر کیوں آئیں۔ اور آئیں تو متوالی انکھڑیاں کیوں لڑائیں:

ہم سے لڑا کے آنکھ چراتے ہو کیا نگاہ
پیارے نہ آئے فرق ترے بانکپن میں آج

طرۂ تابدار، اور گیسوئے عنبر بار، کی یاد سے چھاتی پر سانپ لہرانے لگے غش پر غش آنے لگے۔

ترے لعلِ لب کے خیال میں غم زندگی جو مٹائے دل
تو مذاقِ لطف سے غش یہ ہو کہ مزے جہاں کے اٹھائے دل
مجھے تلخ ہستی زہر ہے غم زیست جان پہ قہر ہے
مجھے آبِ خضر بھی زہر ہے کہ بلائے جان ہے فنائے دل

اب ادھر کی کیفیت سنیئے! حسن آرا کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ حضرت میرزا ہمایوں فر اس وقت لب بام مصروفِ خرام ہیں۔ اور تا ظورہ مہ پارہ کی دید سے فائز بمرام ہیں جب سپہر آرا مہتابی پر آئی، اور شہزادے بخت بیدار کی رسائی سے ان سے بے خبری میں آنکھ لڑائی تو چپکے سے کہا کہ بہن یہیں بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ وہ تاک جھانک سے باز نہیں آتے ہیں۔ اب اچھے صاحب کو ٹکا سا جواب دیا تو دور ہی سے کھڑے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ حسن آرا نے طرارہ بھرا تو تڑ سے کوٹھے پر اور سپہر آرا جو بھرتی سے چھٹی تو کھٹ سے نیچے۔ واہ رے شباب، واہ ری کم سنی، واہ واہ رے الڑھ پن، وہاں دونوں بہنوں میں باتیں ہونے لگیں۔

حسن آرا: ٹپکی پڑے۔ اے واہ۔ اچھا گھر پرکھ لیا ہے۔

سپہر آرا: میرا بس چلے تو اس کا گھر اجڑوا دوں۔

حسن آرا: اے ہے گھر آباد کیجیے، یا اجڑوا دیجیے۔ ستم کرتی ہو۔ کعبۂ دل کو ڈھاتی ہو۔

سپہر آرا: باجی۔ اللہ خیر کرے! یہ تو موا پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑا ہے۔ جب دیکھو کوٹھے پر کھڑا ہے۔

حسن آرا: اے تو تم کاہے کو اپنی زبان خراب کرتی ہو۔

سپہر آرا: میرے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے جیسے۔

حسن آرا: پھر آدمی ہی تو ہیں وہ بھی۔ دل ہی تو ہے۔ آدمی کا آدمی ہی پر دل آتا ہے۔ یا بیل بکری پر۔

سپہر آرا: باجی آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر، کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔

حسن آرا: اس مہری نگوڑی کو تو دیکھو کیسی ہرڈنکا بکتی ہے۔ چٹاخ پٹاخ ہماری ماما پولی حیران۔ عقل کے پیچھے دست پناہ لیے گھومتی ہے۔

سپہر آرا: اُف بجلی ہے بجلی۔ وہ تو سوار کو گھوڑے پر سے اتارے۔ ہم سے یارانہ پیدا کرنا چاہتی تھی۔ خام پارہ۔

حسن آرا: اب جانے وہ کیا کیا نہ کر گذریں۔ کہیں رات کو نہ پھاندیں، ہم لڑکیاں بھلا دھینگا

مشتی کیا جائیں۔
سپہر آرا: توبہ توبہ۔ اللہ جانتا ہے جو ادھر کا رخ بھی اب کرے۔ کیا شہر شملہ ہے۔ ایک بال تو موئے کی کھوپڑی پر نظر آئے نہیں۔
حسن آرا: تو ایسے کلمے کیوں زبان سے نکالتی ہو۔ بہن لاکھ گیا گذرا ہے پھر شاہزادہ ہے۔
سپہر آرا: کیا کروں نگوڑے دل سے کچھ بس نہیں چلتا۔ جینے سے بیزار ہو گئی۔
حسن آرا: (بہن کو چھاتی سے لگا کر) یہ کیوں۔ یہ کیوں؟ (بوسے لے کر) دل کو تسکین دو پیاری۔ ہماری آبرو اللہ کے ہاتھ ہے۔ دنیا کے یہی کارخانے ہیں اپنا دل صاف ہونا چاہیے سو ہے۔
سپہر آرا: جوں جوں غور کرتی ہوں کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے۔ کیا جھپ سے بہن بنا گیا۔ عاشق النسا بیگم کے بھیس میں صورت دکھا گیا۔ باجی تم چاہے نہ مانو۔ یہ موا بہروپیا ہے۔ کوئی کیا روپ بھرا تھا۔ ہائیں؟
حسن آرا: اور ہیں بھی نازک آدمی۔
سپہر آرا: اے علی کی ستوار، ایسی نزاکت پر۔ ایڑی چوٹی پر قربان کردوں تمھارا دہ کھڑا ہے۔ بہن سچ کہتی ہوں، گلاب کے پھول کی رنگت پھیکی پڑ جائے۔ وہ کون ایسے بڑے سوگھڑ ہیں۔
اتنے میں ایک مغلانی آئی۔
مغلانی: لیجیے بڑی بیگم صاحب نے یہ مٹھائی دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آج شب کو عیدگاہ تو نہ چلیے گا۔
حسن آرا: (تشتری لے کر) یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے۔
مغلانی: اے حضور۔ وہ جو اس دن آئی نئی تھیں (آئی نہیں تھیں) بیگم صاحب۔ انھوں نے بڑی بیگم صاحب کے لیے دو خوان بھیجے ہیں لوزیات کے سو بڑی بیگم صاحب نے یہ تشتری آپ کے لیے دی ہے۔
پیاری: (مغلانی کی لڑکی) ذلا سی (ذرا سی) مٹھائی اس میں سے ہمیں دیجیے۔
راوی: توتلے پن سے (ر) کی جگہ (ل) بولتی ہے۔
سپہر آرا: اے واہ۔ پیر نہ شہید، نکٹوں کا چھا پا۔ ان کو دیکھیے یہ بڑی وہ بن کے آئی ہے۔ اچھا اتنا بتا دے کہ کب بیاہ کرے گی؟

پیاری : پھل (پھر) مٹھائی لوں گی۔

سپہر آرا : ہاں ہاں بتا تو سہی۔ جان کیوں نکلی جاتی ہے۔

پیاری : پہلے مٹھائی دیجیے تو بتاؤں۔

سپہر آرا : تو مل چکی۔ گڑھیا میں منھ دھو آ۔

پیاری : میں! بیوی۔ میں ایک (خسم) کلوں گی (کروں گی) پہلے اور پھل (پھر) چھوڑ کے دوسلا (دوسرا) اور پھل (پھر) تیسلا (تیسرا) پھل چوتھا ان سب کو لاتیں مال مال (مار مار) کے نکال دوں گی۔ اب دیجیے، لے اب دیجیے۔

سپہر آرا : (تشتری اونچی کر کے) جاؤ اب نہ دیں گے۔

پیاری : (منھ بنا کر) اوں۔ دیجیے، مٹھائی دیجیے۔ امّاں دیکھو۔

مغلانی : تو مجھ سے کیا کہتی ہے۔ کچھ میں نے ٹھیکا لیا ہے۔ اے ہاں۔

حسن آرا : دے دو۔ دے دو۔ رو رہی ہے۔

سپہر آرا : اچھا لے مگر پانی نہ پینے دوں گی۔

پیاری : ہاں نہ پیوں گی۔ لاؤ تو۔ جھکا جھکا کے ذلا (ذرا) سی مٹھائی دی۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ ذرا سی لڑکی اور کیسی باتیں بناتی ہیں۔ کچھ ٹھکانا ہے، جب مٹھائی کھا چکی تو آبخورہ اٹھانے لگی کہ پانی پیے۔ سپہر آرا نے روک لیا۔

سپہر آرا : اقرار کیا تھا؟

پیاری : اچھا اب میں جاتی ہوں۔

سپہر آرا : (ہاتھ پکڑ کر) جاؤ۔ جاتی ہوں۔ ایسی بڑی جانے والی ہیں۔ جاؤ اب جاؤ۔ مٹھائی کھا تا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ کیا مزے سے بولیں کہ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ مٹھائی کے دام دیے جاؤ پہلے۔

حسن آرا : پی لینے دو۔

مغلانی : بڑی بیگم صاحب آتی ہیں۔

حسن آرا : کہاں کہاں۔ اے کہاں آتی ہیں۔

مغلانی : وہ کیا آئیں۔

سپہر آرا : دیکھوں۔

بڑی بیگم : (زینے کے پاس سے) بٹیا ذری ادھر جھانکنا۔

سپہر آرا : (دوپٹا سنبھال کر) حاضر ہوئی! ارشاد۔

حسن آرا : کہیے اماں جان۔ حاضر ہیں۔ اس وقت ہوا میں آپ کیوں نکلیں۔

بڑی بیگم : میں اوپر ہی آتی ہوں۔

حسن آرا اور سپہر آرا تیزی کے ساتھ نیچے ہی دوڑ گئیں۔

حسن آرا : اماں جان اوپر جا کے کیا کیجیے گا۔

سپہر آرا : چڑھنے اترنے میں اور تکلیف ہی ہوگی۔ ہم تو آپ یہاں موجود ہیں۔

بڑی بیگم : آج پڑوس سے دو خوان آئے ہیں مٹھائی کے وہی تمھاری گوئیاں (ہنس کر) جو اس دن آئی تھیں۔ انھیں کے ہاں سے ہم نے دو روپیہ دلوا دیے، وہ جو عورت ساتھ تھی اس نے کہا کہ بیگم صاحب نے حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم کو کل بلوایا ہے۔ سو کل کسی وقت سواری پر چلی جانا اور حسینی خانم اور نصیبن، اور فرخندہ کو ساتھ لیتی جانا۔ دو چار گھڑی دل بہلانا پھر چلی آنا۔

راوی : ارے غضب اب بُری ہوئی۔ بڑی بیگم کو کچھ معلوم تو تھا ہی نہیں، اب ان سے کہے کون بھلا۔ جریب ہاتھ میں ہے۔ چھوٹتے ہی جمائیں۔ سپہر آرا اور حسن آرا اب ہاں کہیں تو کیوں کر اور نہیں کہیں تو بڑی بیگم وجہ پوچھیں۔ ہندی کی چندی نکالیں۔ اُف ستم ستم۔

حسن آرا : کل کی کل کے ہاتھ ہے اماں جان۔

سپہر آرا : سمجھا جائے گا۔ نیتِ شب حرام۔

راوی : یہ رکھائی۔

حسن آرا : (سپہر آرا کے کان میں) ہے ہے اللہ بچائے ہم دونوں کی آبرو۔

سپہر آرا : ذری میرے قلب پر ہاتھ رکھنا!

حسن آرا : (ہاتھ رکھ کر) اُف۔ ذری میرے دل پر ہاتھ رکھنا۔

سپہر آرا : ارے۔

بڑی بیگم : کیا چوری چھپے باتیں کر رہی ہو۔ میں تو اسی مارے تمھارے ادھر آتی نہیں کہ اپنے لڑکیاں لڑکیاں کیا جانیں کیا باتیں کرتی ہیں۔ میں بوڑھی ان میں کیا بیٹھوں۔ تمھارا جی چاہے تو روح افزا کو بھی بلوا لو، اس کو بھی کل ساتھ لیتی جانا۔

راوی : جی بس انھیں کی کسر ہے، اور تو سب مصالحہ موجود ہے۔

بڑی بیگم تو چلیں چلو خیر ہوئی۔ لونڈیاں باندیاں ساتھ، ادھر حسن آرا اور سپہر آرا باتیں کرنے لگیں۔

حسن آرا : اب بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

سپہر آرا : پھر علاج ؟

حسن آرا : پھر (ہیرے کی کیل) ناک سے نکال کر یہ۔

سپہر آرا : (چھین کر) یہ کیا حرکت ہے بھلا۔ سوچیے سوچیے، کوئی تدبیر نکل ہی آئے گی۔

حسن آرا : کیا خاک نکلے گی۔

سپہر آرا : ایک کام کریں۔ اب بے خوشامد کے کام نہ نکلے گا۔

حسن آرا : ہاں پھر اب تو ہوئی سو ہوئی۔ مگر بہن بڑی بری ہوئی۔

سپہر آرا : یہاں بناوٹ سجاوٹ سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ لگاوٹ کا نام ہی نہیں جانتے سرمہ کاجل، مسی افشاں سے واسطہ ہی نہیں رکھا۔ مگر پھر بھی بلا سے نہ بچے۔

راوی : گل و گل چیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

سنیے بی سپہر آرا صاحب ! مانا کہ کاجل، کنگھی، چوٹی، افشاں، حسن داں، سے واسطہ نہ رکھا، مگر اس ادا اور بانکپن، اور اس جوبن کو کہاں چھپاؤ گی۔ اتنا تو سوچو ذرا۔ یہ مکھڑا تو زاہد کو کافر بنائے جو بے حجاب دیکھے اس کی جان جائے :

تری آنکھ اے بتِ نازنیں مے بیخودی سے بھری رہی
کوئی ہوشیار نہ چھوڑے اسی تاک میں یہ پری رہی

رگ رگ میں شوخی بھری ہے۔ عورت کیا پرستان کی پری ہے۔ بلکہ پریوں سے بھی زیادہ شان دلبری ہے :

پری نے حور نے انسان نے، کب یہ شکل پائی ہے
خدا نے ہاتھ سے اپنے تری صورت بنائی ہے

سپہر آرا : اب ان کے نام ایک خط لکھیے اور صاف صاف مطلب سمجھا دیجیے، اور ذرا ملائمت سے لکھیے گا کہ ان کو بھی رقت آنے لگے۔ نہیں تو آخر ش کل کیا کرو گی۔ موذی کے پنجے میں پھنس کر چھٹکارا کلام لچھے اچھے لکھے یاد ہیں۔ جب ادھر دال نہ گلی تو اماں جان تم چاہے نہ مانو۔ یہ موا

بھروپیہ مسا لگایا اور وہ بھی کتنی بھولی ہیں۔
حسن آرا : بس بالکل عقل سے بے بہرہ۔
راوی : بڑی بیگم بے چاری پر یہ ناحق کا عتاب ہے۔ اب نے انھیں کیا معلوم کہ یہاں ایک اور گل کھلا۔

ماں کرے نندلال

اتنے میں دروازے پر ایک نیا گل کھلا، اور دس بارہ آدمیوں نے مل کر عین در محل پر بآواز بلند ولحن داؤدی گانا شروع کیا:

ماں کرے نندلال۔ سہاگن بچا مان کرے نندلال
دودھ پوت اور ان دھن لچھمی گود کھلائے نندلال
مان کرے نندلال سہاگن بچا

دس پانچ آدمی لہرا لہرا کر گاتے ہیں، دو چار تال دیتے جاتے ہیں، دو ایک مجیرا بجاتے ہیں۔ ایک حضرت ڈھولکی پھپھپاتے ہیں اور شادیانے کی دھن میں گاتے ہیں کہ:

سہاگن بچا مان کرے نندلال
ہمیشہ دلبرے سبحان مبارک باشد

اب گھر بھر میں کھلبلی مچی ہوئی ہے کہ یہ ماجرا کیا ہے لڑکا کس کے ہوا۔ بڑی بیگم بیوہ، اور پھر مسن، حسن آرا کنواری، سپہر آرا دوشیزہ، یہ کیا اندھیر ہے بھئی۔
ماما : ارے تم کون لوگ ہو۔
چند لوگ : اے حضور۔ خدا سلامت رکھے بھانڈ ہیں۔
ایک آدمی : قربان جاؤں میں تو شیر خورہ ہوں۔

ایک صاحب ہنہنا کر بولے۔ میرے بچھڑے کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ ماں کے پیٹ ہی سے ہنہناتا اور کلیلیں کرتا نکلا تھا، دوسرے صاحب نے اچک کر فرمایا، ہیں، ہیں، ہیں۔ دو ماگے ہیں۔ دو باگے ہیں۔ اور ادھر تالیاں بج رہی ہیں، اور گاتے جاتے ہیں۔ ماں کرے نندلال۔ گود کھلائے نندلال۔

خدا ہی خیر کرے! حسن آرا اور سپہر آرا کی عزت اور عفت خدا ہی کے ہاتھ ہے آخر

11 اِس گھر میں اور کوئی نوجوان عورت بھی نہیں ہے۔ پھر یہ لڑکا کس کے ہاں ہوا؟

کہیے حضرات ناظرین! آخر کچھ سمجھے بھی ہر فرد بشر دنگ ہے کہ بھئی یہ تو کچھ اور ہی رنگ ہے۔ بھانڈوں کا آنا، اور شاہانے کی دھن میں (ماں کرے تندلال) گانا کسی کا گھوڑا بن کے ہنہنانا، کسی کا طبلہ مجیرا بجانا، مقام استعجاب ہے۔ بھئی آخر بچا اس گھر میں کون ہوئی۔ لڑکا کون جنی۔ ٹھہریئے ذرا غور تو کریں، ایک بڑی بیگم، ان کا ایک سو ایک برس کا سن، منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بیس برس کا عرصہ ہوا، کہ شوہر نے گلزار جناں کی راہ لی۔ دوسری حسن آرا بیگم ہے ہے یہ تو کنواری ہے یہاں (بچا) بننا کیسا۔ تیسری سپہر آرا، وہ بھی بشرح صدر، پھر رہا۔ ہمہ عالم گواہ عصمت اوست،، اب تو ان کے گھر بھر میں کوئی باقی ہی نہیں رہا۔ ہاں لونڈیاں باندیاں۔ ہیں سو ماماجی ساٹھ سے متجاوز، سٹھیا گئیں۔ دو مغلانیاں وہ بھی مسن۔ ایک مغلانی کی چھوکری۔ (پیاری) وہ آٹھ نو برس کی اور ابھی تک بھانڈوہی گا رہے ہیں کہ:

ماں کرے نندلال۔ سہاگن بچا ماں کرے نندلال
دودھ پوت اور ان دھن لچھمی گود کھلائے نندلال
سہاگن بچا مان کرے نندلال

بڑی بیگم غل مچا رہی ہیں۔ ماما اصیلیں جھلا رہی ہیں، مگر حسن آرا اور سپہر آرا کھل کھلا رہی ہیں۔ الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ ماما اصیل مغلانی، مہری، لونڈی، پٹھانی، پیش خدمت، سب کا رنگ فق، اور بڑی بیگم کا کلیجہ شق۔

بڑی بیگم: ارے لوگو یہ ہے کیا (چھاتی پیٹ کر) ارے دن دہاڑے کیا اندھیر ہوا۔

مغلانی: حضور بھانڈ آئے ہیں۔ جانے ان سے کس نے کیا کہہ دیا ہے۔

بڑی بیگم: اچھا حسن آرا اور سپہر آرا کو اسی دم میرے سامنے لاؤ تو تسکین ہو۔

راوی: اللہ ری بد گمانی۔

مغلانی: چلیے حضور بڑی بیگم صاحب نے یاد کیا ہے۔ جلدی قدم اٹھائیے۔

حسن آرا: اے یہ ہے کیا۔ گود کھلائے تندلال کیا معنی؟

مغلانی: اب لونڈی کیا ارض (عرض) کرے یہ تو تب کہتے ہیں جب لڑکا پیدا ہوتا ہے۔

سپہر آرا: (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے! ہاں سچ تو ہے۔ گود کھلائے تندلال۔ گود کسے کھلائے۔ لڑکے کو۔

حسن آرا : آخرش کوئی ان نگوڑے بھانڈوں سے پوچھے تو آئے کس کے ہاں ہیں۔

پیاری : (دوڑتی ہوئی آئی) چلیے اٹھیے بیگم صاحب ابھی بلاتی ہیں۔

حسن آرا : (سپہر آرا کے کان میں) اس طلبی کے معنی سمجھیں کچھ؟

سپہر آرا : خوب سمجھی ان کا ماتھا ٹھنکا ہوگا کہ کچھ دال میں کالا نہ ہو۔

اتنے میں دربان نے للکارا۔

دربان : چپ رہو، چپ رہو، ذری خاموش تو رہو۔

بھانڈ : واہ رے دربان ذری آگے نہ بڑھنا۔ ورنہ تمھیں ککراول[1] جانا پڑے گا۔

دوسرا بھانڈ : واہ شیرا کیوں نہ ہو۔ کیا دمرہلا کے بھونکے ہو۔ ایک آدھ کی ٹانگ لے اُچک کے۔

دربان : اور سنو ہمیں پر پھبتیاں ہونے لگیں۔

مغلانی : ارے آخر تم لوگوں سے کس نے کیا کہا۔ یہ چیا کیسی؟ کچھ گھانس تو نہیں کھا گئے ہو۔

بھانڈ : آیئے آیئے۔ بڑی بی تو بڑی بی، چھوٹی بی سبحان اللہ۔

مغلانی : ارے یہ کیا غضب ہے۔

بھانڈ : غضب پڑے بُرے کی جان پر، اور آنکھ ادھر ہم سے لڑے۔

مغلانی : اے دور موئے۔

بھانڈ : رفتم تماشائے کنارِ جوی

دیدم بلب آب زرے بندی

گفتم صنما بہائے مویت چہ بود

فریاد برآورد کہ ڈور در موی

ادھر حسن آرا اودی گرنٹ کا پاجامہ اور ململ کا دوپٹہ پہنے چمکتی ہوئی بڑی بیگم کے پاس گئی اور جاتے ہی گلے ملی۔ دم کے دم میں سپہر آرا بھی خاصی شوخی سے قدم رکھتی آگے بڑھی۔

سپہر آرا : اماں جان کاہے کے لیے یاد کیا ہے، فرمائیے۔

بڑی بیگم : (پیشانی پر بوسہ دے کر) بیٹھو۔ بابا بیٹھو۔

حسن آرا : اے پیاری کی اماں۔ آخر باہر جاکر ان موئے بھانڈوں کا منھ تو جھلسو۔ گھانس کھا گئے ہیں نگوڑے کیا۔

سپہر آرا : ہاں ہاں جاؤ ذری۔ خان صاحب سے کہو کہ نکال باہر کریں احاطے سے۔

---

[1] ککراول لکھنؤ کے قریب ایک نالہ ہے، مشہور ہے کہ اگر کسی کو کتا کاٹ لے تو اس نالہ میں غسل کرنے سے اس کا زہر بے اثر ہو جاتا ہے۔

ادھر بھانڈ (ہمیشاں دلبرے سبحان مبارک باشند) گا رہے ہیں۔ ادھر گھر میں چھوٹے بڑے چھنگی بوٹے سب جھلا رہے ہیں۔

آخر کار سپاہی نے بھانڈوں کو سمجھایا۔

سپاہی : میاں قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہاں لڑکا وڑکا نہیں ہوا۔ تم مانتے ہی نہیں ہو گئے تو کوئی اس کو کیا کرے۔

بھانڈ : واہ جوان کیوں نہ ہو۔ کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی لمبے گیسو والا ہے۔

سپاہی : (آہستہ سے) بھلا لڑکا ہو گا کس کے۔ دو لڑکیاں وہ کنواری ہیں گے۔ ایک بڑی بیگم وہ بوڑھی کھپٹ، اور تو کوئی عورت ہی نہیں۔ تم یہ یک کیا رٹ رہے ہو۔

مغلانی : ناحق بن ناحق کو موے ہماری بیگم صاحب کو رلواتے ہیں۔

بھانڈ : (آپس میں) یہ اچھی دل لگی ہے بھئی۔ پھر اس مردک نے کہا کیوں تھا جی ؟

مغلانی : یہ کانٹے کس کے بوئے ہوئے ہیں۔

بھانڈ : ارے صاحب بس کچھ نہ پوچھیے۔ بڑا چکما ہو گیا۔

دربان : لے اب مجیرا وجیرا اٹھاؤ نہیں تو یہاں ٹھیک کیے جاؤ گے۔

بھانڈ : اہو ہو ہو۔ واللہ کیا خیر خواہ آدمی ہیں، اور خیر سے کرارے بھی کتنے ہیں کہ واہ۔

دوسرا بھانڈ : ہاں کرارے کیوں نہ ہوں یہ شیدی فولاد کے پوتے ہیں کہ باتیں۔

الغرض بھانڈ وہاں سے چل دیے۔ بڑی بیگم صاحب نے منت مانی تھی کہ یہ بلا خیر و عافیت سے ٹل جائے تو گھی کے چراغ جلائیں۔ بارے بخیر گذشت۔ اب گھی کے چراغ مسجدوں میں جلائے گی۔ اور نذر و نیاز دلائیں گی کہ شیشۂ ناموس، سنگِ بے آبروئی سے محفوظ رہا۔

حسن آرا اور سپہر آرا یوں باتیں کرنے لگیں۔

سپہر آرا : یہ سب انھیں ذات شریف کی عنایت ہے بس۔۔۔۔

حسن آرا : کن کی ؟ نہیں۔ توبہ، توبہ،

سپہر آرا : آپ چاہے نہ مانیں۔ ہم تو یہی کہیں گے۔ پھر اور ایسا کون ہے ؟

حسن آرا : بہن وہ شہزادہ ہے۔ صحبت یافتہ ہے۔ یہ اس کی حرکت نہیں۔ وہ تو اور پردہ پوشی کریں گے، یا ملعون، بھلا کوئی بات بھی ہے۔

سپہر آرا : اچھا پھر یہ بھانڈ کیوں آئے۔ جب تک کسی نے بہکا کر بھیجا نہیں، بھلا وہ کیوں

لنے لگے تھے۔
حسن آرا : ہاں کہتی تو سچ ہو۔ مگر اللہ جانتا ہے، چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہمایوں فر سے ایسی حرکت نہ ہونے کی، نہ ہونے کی۔
سپہر آرا : بھلا خط تو لکھو۔
حسن آرا : اچھا اونچ نیچ دیکھ لو۔ میری عقل تو اس وقت ٹھکانے نہیں۔
سپہر آرا : گود کھلائے نند لال۔ جب میں یاد کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کوئی نگوڑوں سے پوچھے کہ گود کون کھلائے۔
حسن آرا : قلم دوات کاغذ لاؤ۔ تو یہیں خط لکھیں چپکے چپکے۔
سپہر آرا : پیاری، پیاری، او پیاری! بہری کہیں کی سنتی ہی نہیں۔ ذری قلمدان تو لے آنا۔
پیاری : اچھا مٹھائی دیجیے گا۔
سپہر آرا : مر مٹھائی کھا کھا کر۔ کام کرنے سے جی چراتی ہے، مگر مٹھائی مٹھائی کرتی جاتی ہے۔ پیاری چھوکری قلمدان لے گئی۔ حسن آرا بتانے لگی اور سپہر آرا نے لکھنا شروع کیا۔

حسن آرا کا نامہ شکایت

جو ستائے مجھ کو کوئی ذرا وہ عذاب میں رہے مبتلا
نہیں سہل کچھ مجھے چھیڑنا اثرِ سرشک یتیم ہوں
مرے رنج کی نہ کچھ ابتدا نہ مری خوشی کی ہے انتہا
جو جلوں تو نارِ جحیم ہوں، جو ہنسوں تو باغِ نعیم ہوں
نہیں اس جہاں پہ نظر مجھے کہ مآل سے ہے خبر مجھے
نہ ہوائے لعل و گہر مجھے نہ میں طالب زر و سیم ہوں

ارے ظالم! کچھ خوف خدا بھی ہے؟ میاں آخر حشر میں کیا منھ دکھاؤ گے۔ یہ گورک دھندا پھیلا رکھا ہے۔ اپنے آپے میں ہو کہ گذر گئے۔ کیوں جی شریفوں کی یہی حرکتیں ہوتی ہیں کہ عاشق النساء بیگم بن کر بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں میں۔ کوٹھے پر تاک جھانک لگائے شرم نہیں آتی بہن بنا گئے ہو۔ اور اب اپنے گھر بلاتے ہو۔ منھ دھو رکھیے۔ تمھاری شہزادگی کا خیال آتا ہے، ورنہ خاتون جنت کی قسم جہاں کے ہو وہیں پہنچاتی۔ اب

ذری بہت چل نہ نکلیے۔ پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں۔ میرے دل پر تمھارے طرف سے غبار ہے۔ وہ حشر تک نہ جائے گا۔ حشر کے دن خدا کے سامنے بخار نکالوں گی۔ بہت منھ نہ چڑھیے ذرا جھیپو۔ کچھ تو شرماؤ۔ میاں یہ مردوں کے ہتھکنڈے نہیں ہیں۔ شریف زادیوں کو دق کرنا کون سی بھل مانسی ہے۔ اے لعنت خدا، اگر آپ کی آدمی بھیجا تو خدا سمجھے تم سے۔ اور ہم تو ہیرے کی کیل ناک سے نکال کر لیے بیٹھے ہیں۔ ذرا اونچ نیچ ہوئی اور کھا کر سو رہے۔ خون تمھاری گردن پر۔ جتا دیا ہے، اور تمھارے نامۂ اعمال میں تو نکیرین نے لکھ ہی لیا ہے:

حیا سے منھ نہ موڑیں گے سنائے جس کا جی چاہے
وفاداری میں ہم کو آزمائے جس کا جی چاہے
کبھی مانند گوہر آبرو صفدر نہ جائے گی
بظاہر خاک میں مجھ کو ملائے جس کا جی چاہے

اس وقت بدن میں آگ لگی ہے۔ شعلے نکل رہے ہیں۔ خیر اسی میں ہے کہ اب اس حرکت سے باز آؤ، ورنہ تم جانوگے۔ مجھے لفاظی اور لسانی تو آتی ہی نہیں، مگر سچ کہتی ہوں اب اگر ایسی بات ہوئی تو کنوئیں میں پھاند پڑوں گی۔ تم ایسے بے حیاؤں کو خط لکھنا ناگوار ہے، مگر کروں کیا مجبور ہوں۔ خیر ہماری عفت کا خدا حافظ و ناصر۔ اب تمھارے ظلم سہنے کی تاب نہیں ہے خبردار جتا دیا۔ مانو اچھا نہ مانو تو خیر ایسے رسوا ہوکے خدائی بھر میں لوگ تم سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اپنے دل میں تم سمجھے کیا ہو میاں! یاد رکھو جو یہی ہتھکنڈے رہے تو ایک دن اپنی ہی محل سرا کی طرف دیکھ لینا کہ آگے پیچھے ہم دونوں کا تابوت نکلا ہے۔ تم اپنے دل میں سمجھے کیا ہو۔ مگر یاد رکھو ہمارا خدا ہماری پاک دامنی کا گواہ ہے۔ پس تم ناحق سر دھنتے ہو۔ اگر نکاح کا شوق چرّایا ہے تو اماں جان کی خدمت میں عرض کرو۔ پیغام بھیجو۔ ہم لڑکیاں کیا جائیں، ان باتوں میں بھلا ہم کو دخل کیا ہے۔ بہت اندھیر نہ جاؤ۔ ان فضول باتوں سے باز آؤ، ورنہ تم جانوگے، اور تو ہمارا کیا بس ہے۔ زیادہ باتیں بتانا عبث ہے، مگر اپنی جان پر تو دسترس ہے۔ یاد رکھیے اگر ایسی ہی چھیڑ چھاڑ رہی تو ہماری جان مفت میں جائے گی۔ ہاں تم پر البتہ آنچ نہ آنے پائے گی۔ اگر آپ کا گلا آبِ دمِ خنجر کا مشتاق ہے تو کسی سفّاک بتِ بے پیر سے دل ملائیے۔ کوئے قاتل میں جائیے، ہم گھر گرہست شریف زادیاں، ان باتوں سے ہمیں کیا واسطہ، دل لینا جانیں نہ دل دینا۔ دل آنا اور دل جانا ان سب کو ہم ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ اب ادھر کا رخ نہ کیجیے گا۔ مہری کو جھپ سے نہ بھیج دیجیے گا۔

راقمہ

کانٹوں میں نہ ہو اگر الجھنا تھوڑا سا لکھا بہت سمجھنا

یہ خط ایک معتبر آدمی کو دے کر روانہ کیا۔

مرزا ہمایوں فرخانۂ باغ میں گلگشت کر رہے تھے، آدمی نے تسلیمات عرض کر کے خط دیا، اور چمپت ہوا۔ خط پڑھنے کے قبل فرطِ طرب سے یہ غزل جھوم جھوم کر پڑھی:

وہ بت جلوہ آرا ہوا چاہتا ہے خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

راوی: جی بجا ہے۔ ذری خط تو پڑھ لیجیے:

وہ اٹھکھیلی کی چال چلنے لگے ہیں کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

راوی: اب ان کا مہتابی پر چڑھنا بھی موقوف کر دایئے گا۔

بہت تیز ہے آج کل تیرِ مژگاں کوئی دل نشانہ ہوا چاہتا ہے

وہ رخسار پر ملنے والے ہیں غازہ یہ قرآن مُطلّا ہوا چاہتا ہے

مِرے قتل کرنے کو آتا ہے قاتل تمام آج قصّہ ہوا چاہتا ہے

خط کو کھولا اور پڑھنے لگے۔ اب اس وقت کی کیفیت نہ پوچھیے۔ کبھی خط کو چوم لیا کبھی آنکھوں سے لگایا۔ کبھی خدا کا سجدۂ شکر بجالائے۔ کسی فقرے نے رلا دیا۔ کسی نے ہنسا دیا۔ مگر جب کل خط پڑھ چکے تو خوشی بھی ہوئی رنج بھی۔ رنج اس وجہ سے کہ تابوت اور جان دینے کی بُری سنائی دل ہی دل میں کہنے لگے کہ ہائے اس بت پندار وطرّار کو کیا معلوم کہ یہ کیسا ناز پروردہ ہے۔ گو دیوانہ ہو گیا، مگر اب بھی نازک طبیعت ہوں۔ کلیجہ تھام کر ایک نعرہ بلند کیا، یہ مکتوب الفت اسلوب بھی اسی امر پر دال ہے، کہ لگاوٹ اور وصال کا محبوب کو مطلوب کو ضرور خیال ہے۔

بناوٹ کے ہیں طور سارے تمھارے بگڑ جائے گی اب ہمارے تمھارے

حسینو! ہوا ہم کو افشاں سے روشن کہ چمکے ہوئے ہیں ستارے تمھارے

نہ ہے عشق ایسا نہ ہے حسن ایسا جہاں میں ہیں شہرے ہمارے تمھارے

غفلت کے پردے ایسے پڑے کہ عقل ہی سے ہم لڑ پڑے۔ دل صیدِ رنج والم ہے۔ منزلِ عشرت اب مجلس ماتم ہے:

داغِ الفت لگا دیا کس نے نقشِ ہستی مٹا دیا کس نے

گل سے شبنم بنا دیا کس نے ہنس رہا تھا رلا دیا کس نے
ایک عالم ہے آج کیوں بے ہوش رخ سے پردہ اٹھا دیا کس نے
زلف تیری اگر نہیں لیلیٰ مجھ کو مجنوں بنا دیا کس نے
دل جو چھالے کی طرح پھوٹ گیا کس نے چھیڑ اُدکھا دیا کس نے

حسن آرا کو تو وہ تھی کہ یہ کن ذات شریف نے دل کا بخار نکالا ہے۔ سپہر آرا سوچتی تھیں کہ کوئی جھنجھلا لیا ہے۔ ادھر محلہ والوں نے دانتوں کے تلے انگلیاں دبائیں، اور طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ گھر گھر یہی ذکر، چھوٹے بڑے سب کو یہی فکر، کہ لڑکا کس کے گھر پیدا ہوا۔ حسن آرا اور سپہر آرا پر کون شیدا ہوا۔ بھلے مانس کہتے تھے کہ ان کنواری شریف زادیوں کی عفت خدا بچائے۔ ان کی پاک دامنی پر آنچ نہ آنے پائے شہدے اپنے ڈھائی چانول گلاتے تھے۔ ایک دوسرے کو بچاتے تھے۔ افسوس صد افسوس۔ عورتوں کے یہ خبر سُن سن کر ہوش اڑتے تھے کہ نوج ایسی لڑکی کسی بھلے مانس کی ہو، ہے ہے حرمت میں داغ لگایا۔ نیا گل کھلایا مگر ٹائیں ٹائیں فش۔ وہاں کچھ بھی نہیں۔

جیحونِ فصاحت، دُرِّ خوش آب یعنی بابو ابھناش چندر صاحب کا لکچر لاجواب

شہزادۂ بلند اختر، حضرت میرزا ہمایوں فر حسبِ معمول وقتِ شام، لبِ بام، نظارۂ قدرت کاملۂ ایزدی فرماتے تھے، اور نو عروسانِ چمن کا جوبن دیکھ دیکھ کر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ طیورِ ذی شعور کا اشجارِ پُر بہار کی شاخوں پر جھولنا، اور کلیوں کا چٹ چٹ کر کے پھولنا، عجیب لطف بہار دکھاتا تھا۔ میرزا ہمایوں فر کا غنچۂ دل اس وقت بادِ طرب سے کھلا جاتا تھا۔ زمین پر گُل خنداں، آسمان پر طلوعِ ماہِ تاباں، اِدھر بھی سماں، ادھر بھی سماں۔ اتنے میں میرزا ہمایوں فر بہادر کی نظر جو سامنے والی مہتابی پر پڑی، تو آنکھ ایسی لڑی کہ عقل سے ہاتھ دھویا۔ مزرعِ دل میں تخمِ غم بویا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گیند اُچھالے جاتے ہیں۔ تڑ تڑ گرتے ہیں، اور پھر مہتابی کی خبر لاتے ہیں۔ اہو ہو ہو۔ کوئی معشوق کوٹھے پر گیند کھیل رہا ہے۔ جب ہی بے چارہ شہزادہ مصیبت جھیل رہا ہے۔ کوٹھے کی دیواریں بلند، رفعت میں منارِ مصر[1] سے بھی دہ چند۔

---

[1] زمانہ قدیم میں مصر کے بادشاہوں کی لاشیں جن تہ خانوں میں مسالے لگا کر محفوظ کر دی جاتی تھیں ان (باقی آگے)

ہوشِ دل سے یہ شعر کئی بار زبان پر آیا۔ اور یہ آواز بلند لہراتے ہوئے گایا:

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

ہائے بلبل کے دل سے اس وقت پوچھیے کہ گل کے اچھالنے سے اس پر کیا گذرتی ہوگی۔ مہتابی پر اگر وہ ماہرو اس وقت آئیں تو میرزا ہمایوں فر خوب موقع پائیں، اور دردِ دل اشاروں سے صاف صاف سمجھائیں۔ مگر ممکن کہاں۔ اب تو مہتابی کے دروازے میں موٹا سا قفل دیا ہوا ہے۔ دروازہ میاں خوجی کی آنکھوں کی طرح بند پڑا ہوا ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چپراسی دن سے پھاٹک میں موجود اور غڑاپ کوٹھے پر۔

چپراسی: (ادب کے ساتھ سلام کرکے) حضور صاحب نے یہ چھٹی دی ہے۔

ہمایوں فر: (چھٹی کھول کر) میرزا ہمایوں فر بہادر، آج آٹھ بجے پھر لکچر ہوگا۔ بابو بھناش چند مکرجی ایک بہت عمدہ لکچر دینے والے ہیں۔ چونکہ آپ میرے معزز دوست ہیں، اور چونکہ آپ انگریزی میں اچھی لیاقت رکھتے ہیں، لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ ازراہِ عنایت آج بشرط فرصت ضرور تشریف لائیں۔ لکچر سننے کے قابل ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ویکر گھوڑے کی ایک عمدہ جوڑی دو ہزار دو سو روپیہ کو خریدی ہے۔ کسی روز مجھے دکھائیے گا۔ اگر یہ وہی جوڑی ہے جو کرنل میکفرسن خریدنے والے تھے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ دو سو روپیہ آپ نے زیادہ دیے، مگر جوڑی عمدہ ہے۔ اور گھوڑیاں جاندار اور ابھی پنچ ہیں۔ آپ کا دوست۔

(جیمس اسفرین)

چپراسی: غریب پرور! میں جاؤں اب ہے حکم؟

ہمایوں فر: ہاں جاؤ۔

میرزا ہمایوں فر نے ساڑھے سات بجے کے وقت حکم دیا کہ فٹن تیار کرو، اور وہی گھوڑیاں جوتو جو کل خریدی تھیں۔ فٹن فوراً تیار ہوئی، اور وہی گھوڑیاں جوتی گئیں۔ چوبدار نے آداب بجا لاکر عرض کیا کہ (حضور فٹن تیار ہے) سات بار سلام کیا، اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرزا ہمایوں فر نے کپڑے پہنے، اور فٹن پر سوار ہوئے، تو خدام نے بآوازِ بلند مل کر کہا بسم اللہ فٹن چلی۔

کے اوپر پتھروں کے مضبوط عظیم الشان مینار تعمیر کیے جاتے تھے۔ ان کو اہرام یا مینارِ مصر کہتے ہیں۔ یہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

دو سائیس فٹن کے پیچھے کھڑے ہیں۔ کپڑے صاف ستھرے پہنے ہوئے۔ کوچبین چکنی دکتی مندیل سر پر رکھے ہے، اور چوبدار بھی اس کے قریب بیٹھا ہے۔ گھوڑیاں مرمر منک بیٹھے اور کھٹ سے بارہ دری میں داخل۔ دو بابو صاحب آئے اور جھک کر آداب بجالائے۔ جس وقت میرزا ہمایوں فر بہادر لکچر کے کمرے میں گئے، تو سب حاضرین جلسہ نے سرو قد تعظیم کی۔ اس وقت اگر سپہر آرا بیگم ان کو دیکھ پاتیں تو (موئے) کا لفظ ان کی شان میں حشر تک زبان پر نہ لاتیں اور بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناتیں۔ صاحب کلکٹر بہادر نے ہاتھ ملایا۔ تپاک کے ساتھ بٹھایا لکچرار صاحب تشریف لائے۔ تخت کا ایک چوکا بچھا تھا، اور اس پر سفید چاندنی، اور اس پر ایک کرسی رکھی تھی، اور ایک میز پر شیشے کا گلاس اور اس میں ٹھنڈا پانی۔ اغل بغل دو کرسیاں اور تھیں۔ لمپ بکثرت روشن تھے۔ کمرا بھر جھک جھک کر رہا ہے۔ کوئی سات آٹھ سو ہندوستانی، اور حکام جنٹلمین، اور لیڈیاں، اور طلبا اس وقت لکچر سننے کے لیے موجود تھے۔ صاحب لکچرار نے کچھ دیر حاضرین جلسہ کو دیکھا، اور ذرا سا پانی پی کر یوں فرمایا۔

لیڈیو اور جنٹلمینو۔ آج میں نے آپ صاحبوں کو اس غرض سے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف دی ہے کہ آپ سب صاحب میرا لکچر سنیں۔ میں ایک قلیل البضاعت اور ناقص الصناعت آدمی ہوں۔ لیکن جو کچھ میں عرض کروں گا، وہ اس لائق ہے کہ آپ اس پر غور و توجہ فرمائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ان نعمتوں کا جو جناب باری عز اسمہ نے عطا کی ہیں، اور ان بیشمار مہربانیوں کا جو خدائے تعالیٰ نے ہم پر کی ہیں۔ کماحقہ شکریہ ادا نہیں کرتا۔ گو خدا کی نعمتوں کا شکریہ کماحقہ ادا کرنا محالات سے ہے۔ تاہم ہر بنی نوع انسان پر عین فرض اور فرض عین ہے اور سچ پوچھو تو یہی ذریعہ حصول سعادت دارین ہے کہ جو نعمتیں ہم کو خدا نے عطا کی ہیں ان کے شکریہ میں رطب اللسان ہوں۔ یہ باتیں تو در کنار، اکثر آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ ان افعال ناشایستہ، اور حرکات ناشایستہ کے مرتکب ہوئے ہیں، جو ننگ شرافت ہیں، اور جن کے نام سے شرافت کو عار ہے۔ وہ باتیں کیا ہیں۔ اس کو ہر شخص اپنے دل میں خود سوچ سکتا ہے۔ اکثر آدمیوں کا یہ غلط اور بے سرو پا خیال ہے، کہ اگر وہ خدا سے دعا مانگیں گے تو ان سے گناہ چاہے کیسے ہی کبیرہ کیوں نہ ہوں یک قلم معاف کر دیں گے اور نیک آدمیوں کے

ساتھ ان کا حشر ہو گا۔ توبہ توبہ! اسی غلطی سے ان کو جرأت ہوتی ہے کہ وہ گناہ کرتے جائیں مگر وہ اپنے مذہب کے خاص اصول کو نہیں سمجھے، اور اپنے طرز پر اس کے معنی پیدا کر کے دل خوش کر لیتے ہیں۔ بعض آدمی:

شنیدم کہ در روز امید و بیم بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم (سعدی)

کہہ کر بدی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کا جس درجہ زیادہ افسوس کریں کم ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اگر خدا سے انسان دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو:

جو چاہے سو مانگ آتش درگاہ الٰہی سے محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سائل کو

یہ سچ۔ مگر۔ ع۔ ہر سخن جائے وہر نکتہ مکانے دارد۔

اب سنیے کہ بعض آدمی اس طرح کی دعا مانگتے ہیں جس کے سننے سے انسان کو ہنسی آتی ہے۔ چند مثالیں میں دیتا ہوں، سامعین خود ہی سمجھ جائیں گے۔

۱۔ ایک لڑکا جس کا سن کوئی چودہ برس کا تھا ایک مرتبہ مندر میں کھڑا یہ دعا مانگ رہا تھا "ہے پرمیشر اگر تجھ میں ست ہے تو کچھ ایسا کر کے میرے مولوی صاحب کل صبح کو مر جائیں"، ہم نے جب یہ دعا سنی تو بڑی ہنسی آئی۔ لڑکے سے تھوڑی دیر میں پوچھا کہ کیوں میاں صاحبزادے تم مولوی صاحب کے مرنے کی دعا کیوں مانگ رہے تھے۔ پہلے تو بہت ہی جھلائے کہ آپ کون؟ آپ سے واسطہ۔ میں نے دیکھا کہ یہ یوں بتانے کے نہیں۔ میں نے کہا پھر میں جا کر تمھارے مولوی صاحب سے کہہ دوں۔ تب تو ہاتھ جوڑنے لگا اور کہا بات یہ ہے کہ سکندر نامہ کا سبق مجھ کو اچھی طرح سے یاد نہیں رہتا۔ مولوی صاحب روز قمچیاں مارتے ہیں۔ یہ نادان اپنے دل میں سمجھتا تھا کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا۔ لاحول ولا قوۃ۔

۲۔ ایک نوجوان آدمی جس کا کوئی پچیس چھبیس برس کا سن ہو گا۔ مسجد میں کوئی گیارہ بجے رات کے وقت دعا مانگ رہا تھا کہ یا خدا میری شادی کسی ایسی پری پیکر رشکِ قمر کے ساتھ ہو جس کی ایک ایک رگ میں خون کے عوض بس شوخی ہی شوخی ہو۔ یا خدا اگر ایسی پریزاد کے ساتھ بیاہ ہو تو میں تیرا بڑا مشکور ہوں گا۔

۳۔ ایک عورت دعا مانگ رہی تھی کہ یا خدا فلاں عورت ابھی ابھی پھانسی پائے، اور اس بے چاری کا قصور صرف اس قدر تھا کہ اس کے لڑکے نے اس عورت کے لڑکے کو گالی دی تھی۔

۴- ایک تربیت یافتہ آدمی دست بہ دعا تھے کہ فلاں جہاز جس پر فلاں شخص سوار ہے غرقاب ہو جائے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اُس جہاز پر ایک سوداگر تھے۔ ان کے یہ حضرت مقروض تھے۔ کوئی ستر روپیہ ان کے ذمے تھے، لہٰذا دعا مانگی کہ وہ جہاز ڈوب جائے جس پر وہ شخص سوار ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔

ستر روپیہ کی طمع میں ایک جہاز کے جہاز کو غرق کر دینا، اور صدہا بندگان خدا کی جان جانے کے خواہاں ہونا عجب دعا ہے۔ مرد آدمی اگر روپیہ ہی بچانے کی خواہش تھی تو یہی دعا کیوں نہ مانگی کہ یا خدا مجھے روپیہ دے۔ یا یہی دعا مانگتے کہ وہ قرض خواہ ڈوب جائے تمام جہاز کو کیوں ڈبوتے دیتے ہو۔ آخر اس پر جو سیکڑوں آدمی بیٹھے ہیں، انھوں نے تمہارا کیا بگاڑا۔ افسوس! بہت بڑی شکایت یہ ہے کہ عورتوں کی ہم لوگ کما حقہ عزت نہیں کرتے، جو پاسِ ناموس و ننگ، اور خیال عفت و عصمت عوراتِ ہندوستان کو ہے، وہ مردوں کو نہیں۔ اگر کوئی شخص اس جلسے میں ایسا ہو جس نے کبھی نظرِ بد سے عورت کو نہ دیکھا ہو تو وہ کھڑا ہو جائے، کیوں کہ میں اس کی عزت کروں گا اور خدا سے دعا مانگوں گا کہ سب بندے ایسے ہی نیک ہو جائیں۔ کیا اس اتنے بڑے جلسے میں جہاں اس وقت ہزار آدمیوں کے قریب ہوں گے ایک بھی ایسا نہیں جو جرأت کے ساتھ اور ایمانداری کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور کہے کہ وہ ہر عورت کو باستثناء زوجہ مثل اپنی بہن کے سمجھتا ہے۔ میں چند مثالیں ایسی دیتا ہوں جس سے عورتوں کی نیکی اور پاک دامنی صاف ظاہر ہو جائے گی۔

۱- ایک مرتبہ کسی گاؤں میں کنویں کے پاس میں کھڑا تھا۔ ایک کم سن برہمنی جو حسن و جمال میں اپنی آپ ہی نظیر تھی کنویں پر کلسا لے کر آئی بے نقاب گھونگھٹ بھی نہ تھا۔ جھٹپٹا وقت وہ وقت جب کہ ہمارے بنگالے میں دلہن کو دکھاتے ہیں اور جس وقت شفق کے رنگ سے دلہنوں کے چہرہ زیبا کی رنگت عجب نور دکھاتی ہے وہ کم سن برہمنی کپڑے بھی گاؤں کی اور عورتوں سے فوق البھڑک زیب تن کیے ہوئے تھی اور زیور سے بھی آراستہ تھی ایک مزدور مسافر جو شکل و صورت سے شریف زادہ معلوم ہوتا تھا اس کے پیچھے چلا اور اس نیک بخت سے اس مزدور نے کہا (بھوجی تنک پانی پلائے جاؤ) وہ نیک بخت کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر میں کلسا کنویں پر رکھ کر اپنے گھر گئی اور وہاں سے ایک بڑا سا کلھڑ لائی

اور اس کلھڑ میں پانی انڈیل کر اس مزدور کے پاس لے گئی اور دیا۔ حضرت نے پانی پیا مگر پیتے پیتے اس کی صورت پر کنکھیوں سے نظر ڈالتے گئے اور بڑی دیر میں پانی پی چکے۔ وہ بے چاری تاڑ گئی کہ یہ بد آدمی ہے۔ اس وقت چہرے سے جو ملال اور رنج اور غم و غصہ ظاہر ہوتا تھا اس کا بیان کرنا محال ہے۔ ہم کو اس نیک بخت بہن سے ایک قسم کی محبت ہو گئی اور ہم نے دعا مانگی کہ خداوندا! ہر ایک عورت کو ایسی ہی حمیت اور توفیق نیک عطا کر اور ذکو کو نورِ عقل دے، تاکہ وہ نیک بخت عورتوں کو اپنی بہن سمجھیں۔ انسان کو ہر روز ایسی ایسی کاہشیں رہتی ہیں کہ وہ اپنے حالات پر کامل غور نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ کامل غور کرے تو وہ کاہشیں بھی کسی قدر رفع ہو جائیں، اور سچی خوشی صورت دکھائے سب سے زیادہ خدشہ انسان کے نفس کو اغوائے شیطان سے یہ رہتا ہے کہ وہ اچھی اچھی صورتیں دیکھ کر از خود رفتہ اور دیوانہ بن جاتا ہے، اور اسی دیوانگی اور از خود رفتگی کی حالت میں نفس مطمئنہ خیر باد کہہ کر سدھارتا ہے۔ اور نفس لوامہ کہنا دل نہیں مانتا ہے۔ نفس امّارہ غالب آجاتا ہے۔ انسان کو مرکز دائرہ گناہ کبیرہ بناتا ہے۔ حسن کو بھی عجب تاثیر بخشی گئی ہے۔ جادو ہے تو یہ ہے، اور سحر ہے تو یہ ہے، اور ٹونا ہے تو یہ ہے، اور چھلاوا ہے تو یہ ہے، حسین پر نظر پڑی اور نیت ڈانواں ڈول ہو گئی، طبیعت نے معصیت میں راہ پائی نفوسِ قدسیہ نے ہوا بتائی، دل میں فسق و فجور کی دھن سمائی۔ حسن عجب بلائے بیدرماں ہے۔ اس نے ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان اور مسلمانوں کو کرسٹان، اور کرسٹان کو کافر، اور زاہدوں کو بے ایمان بنایا۔ مسلمان رام ہوے، ہندو بدنام ہوئے۔ تاجداروں نے تخت و تاج سے ہاتھ دھویا۔ فرماں روایانِ سمو المکان نے حکمرانی اور خسروی کو کھویا، مگر ذرا سوچیے تو معلوم ہو جائے کہ یہ حسن خدا کا عطیۂ عظمیٰ اور موہبتِ کبریٰ ہے۔ حسن اس لائق ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کے دل پر جنابِ باری عز اسمہٗ کی قدرت کاملہ اور صنعتِ بالغہ کا نقش منقوش اور اس کی عظمت اور خدائی کا عکس مرتسم ہو۔ لیکن نفس امّارہ سے خدا سمجھے کہ اس کو ذریعۂ ادبار بنا دیا۔ یوں تو خوشنما پھول دیکھ کر انسان گھنٹوں عش عش کرتا ہے۔ پیارے پیارے گل بوٹوں پہروں وجد میں لاتے ہیں۔ خوبصورت اور خوش اندام گھوڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ فرح بخش عمارات لبھاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اینٹیں تک قرینے سے ایک مقام پر چنی ہوں تو آنکھیں ایک قسم کا نور پاتی ہیں، لیکن حسین عورت بس قیامت ہے، مگر کس کے لیے، انھیں کے لیے جو نفس امّارہ کے

ہاتھ بک گئے ہیں۔ ورنہ خدا ترس اور خدا شناس آدمی ایسی باتوں سے منزلوں دور ہیں اور ہر شے پر نیکی اور پاکی کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ ممکن کیا کہ ذرا لغزش ہو جائے یا طبیعت میں بدی کا خیال آئے کیا مجال۔

ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت ایک شخص لب دریا چلا جاتا تھا ہوا اس وقت اس زنّاٹے کی چل رہی تھی کہ کلیجہ تک ٹھٹھرا جاتا تھا۔ روح لرزتی تھی۔ پاؤں دقت سے اٹھتے تھے۔ دانت مارے سردی کے بج رہے تھے۔ اور وہ آدمی صرف ایک سفید کوٹ پتلون پہنے ہوئے برہنہ لب آب ٹیمز نکوہ تنہا جا رہا تھا۔ اول تو یوں ہی انگلستان میں سردی کی شدت ہے اس پر طرّہ یہ ہوا کہ عین موسم زمستاں اور ہوا کی تندی اور تیزی انتہا کا ستم ڈھاتی تھی، یہ چرکے پر چرکا لگا۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر مصیبت تازہ یہ ہوئی کہ دریا کا کنارہ اور کمبل نہ لوئی نہ کوٹ نہ شال، یا الٰہی اس وقت بیان کرنے سے روح کانپ رہی۔ اور سامعین با تمکین بھی اس شخص کی حالت پر افسوس کرتے ہوں گے۔ قہر درویش برجان درویش، بے چارہ اسی کیفیت افسوس ناک سے چلا جاتا تھا۔ لیکن سمجھ گیا تھا کہ اب زندہ نہ بچوں گا۔ چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ بدن کے رونگٹے رونگٹے کھڑے تھے۔ چلتے چلتے جب بستی میں پہنچا تو ایک مکان کے شیشوں سے روشنی نمودار ہوئی۔ لمپ کمرے میں روشن تھا۔ اس مصیبت زدہ، ستم رسیدہ نے پکارا کہ میں اب مرتا ہوں، اگر کوئی رحم دل مجھ کو بچائے تو بجاں منت، ورنہ دروازے پر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، اور ٹھٹھر ٹھٹھر کر جان دوں گا، اور دم توڑوں گا اور زندگی سے اسی دم منھ موڑوں گا۔ اس وقت اس مصیبت زدہ کو اتنی طاقت نہ تھی، کہ آواز بلند سے بولے۔ مگر اس نالۂ روح فرسا نے رنگِ اثر دکھایا، اور ایک کھڑکی کھلی کھڑکی کھلنے کی آواز نے۔ اس کے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن یوسف نے حضرت یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔ یا جو صحت مریضِ جان بلب کے ساتھ کرتی ہے۔ نظر اٹھا کر اس نے اوپر دیکھا آواز آئی کہ اے مرد تو کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ کہاں سے آتا ہے، اور کہاں جاتا ہے۔ دردِ دل کیا ہے۔ ع۔ درماں ہے کہ دردِ لا دوا ہے،، اس وقت اس کی جان میں جان آئی اور اس نے جی کڑا کر کے، کسی قدر بلند آواز سے کہا کہ دم نزع ہے۔ بس اب مرتا ہوں۔ پھر اوپر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اور یہ تھوڑی دیر دروازے پر کھڑا رہ کر آگے بڑھا۔ اس مکان میں ایک عورت رہتی تھی اس نے یہ سمجھ کر کہ اس وقت مجھے نیچے جانا پڑے گا۔

کھڑکی بند کردی، اور سوچی کہ مرجائے گا تو میری گرہ سے کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ سورہی۔ یہ بے چارہ مصیبت کا مارا دو قدم آگے بڑھا تو گر پڑا اور ایک دفعہ ہی نعرۂ افسوس ناک اس نے بلند کیا اور زمین پر لوٹ گیا۔ ہائے کی جگر دوز آواز سن کر ایک دروازہ کسی نے کھولا، اور اس کے قریب آن کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی شرابی ہے۔ بہت پی گیا، اور یہاں آکر پھٹ سے گر پڑا پھر معلوم ہوا کہ مرگیا۔ مگر بغور دیکھا تو سانس چل رہی تھی۔ آہستہ سے کان کے قریب جاکر دریافت کیا کہ کیا حال ہے۔ اس بے چارے نے آنکھیں ذرا کھول دیں، اور پھر بند کرلیں۔ دروازہ جس نے کھولا وہ ایک لیڈی تھی۔ کوئی انیس برس کا سن۔ اسی روز اس نیک بی بی کی شادی ہوئی تھی، اور وہ شب شب عروسی تھی۔ دھم کی صدا اور ہائے کی جگر دوز ندا سن کر وہ بیقرار ہو گئی۔ اور رگِ حمیت ایسی جوش زن ہوئی کہ اوپر سے اتر آئی۔ اور مرد کو اٹھوا کرلے گئی اور ایک کمرے میں اس کو نہایت بیش بہا پلنگ پر لٹایا، اور گرم کپڑے اڑھا دیے، مگر اس کے شوہر کو اس کی حالتِ درد انگیز پر رحم نہ آیا اور اپنی بیوی کو سمجھایا کہ بعد مدت دلی آرزو بر آئی ہے، اور تم کو اس کے علاج کی دھن سمائی ہے۔ بارہ بج گئے ہیں۔ خدمت گار کمرے کو دلہن کی طرح سج گئے ہیں۔ ہزاروں تمناؤں کا خون ہو گا، مگر اس نیک بیوی نے اپنے شوہر کی طرف ایسی تیکھی چتون سے دیکھا کہ اس کا شوہر کمرے میں چلا گیا۔ جب اس مرد مصیبت زدہ کے ہاتھ پاؤں گرمائے تو ہوش آیا۔ اس نیک بیوی نے پوچھا کہ تم کون ہو، اور یہ کیا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میری بیوی کے آج اس وقت لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن پیدا ہونے وقت سے بیوی کی طبیعت ازبس ناساز ہے۔ میں مارے بدحواسی کے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو بلانے جاتا تھا۔ اور اسی طرح گرمی کے کپڑے پہنے ہوئے لب دریا آتا تھا۔ سردی نے مجھے ایسا دبوچا کہ کچھ بس نہ رہا۔ تم نے مجھ پر اس وقت بڑا احسان کیا، کہ جان بچائی۔ اس کے بعد اس نیک بیوی نے ایک گلاس برانڈی کا پلایا، تب حضرت ذرا اور بھی گرمائے۔

اب سنیے کہ اس بد بخت، بد نصیب، بد وضع، مردود نے کیا لغو حرکت کی جب خوب گرمائے تو اس نیک بی بی پر نظر بد ڈالی۔ وہ سرہانے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اول تو وہ ایسی مہ پارہ، پری چہرہ تھی کہ شاید شہر میں ویسی خوب رو، قوس ابرو دو ہی چار ہوں گی۔ دوسرے شباب پھٹا پڑتا تھا۔ تیسرے شب عروسی، وہ جوبن کہ انسان پرستش کرنے لگے، وہ نور کہ واہ جی واہ۔ از سرتا پا زرق برق، عالم نور از پاتا فرق۔ اگر ایک نظر غلط انداز سے

دیکھے تو ہزاروں کا خون ہو جائے۔ زلفِ چلیپا کالی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ غازہ اور گلگونہ نے اس قدرتی جمالِ رخسارِ زیبا کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ عطرِ عنبر کی مہک نے دماغ کو طبلۂ عطار بنا دیا تھا۔ حضرت نے اس ترکِ زریں کمر روکشِ شمس و قمر کو سر بالیں پایا، تو یوں فرمایا کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ایک کونے میں دبک رہیے۔ ع۔ شوقہا افزاید از پہلوے تو" اے لعنتِ خدا۔ علی کی سنوار شیطان کی پھٹکار۔ خدا کی مار۔ ہات تیرے احسان فراموش مردک کی ایسی تیسی۔ خدا سمجھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ وقت بھول گیا جب کہ ہاتھ پاؤں کا ہلانا تک مشکل تھا۔ بات تک لب پر نہیں آسکتی تھی۔ چلنا دوبھر تھا۔ سردی سے روح پر صدمہ تھا۔ کلیجہ لرزا جاتا تھا۔ ع۔ وہ آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا"، اس نیک بی بی نے اس درجہ احسان کیا کہ اس کی حقیقی ماں اور سگی بہن تک اس درجہ احسان نہ کرتی۔ وہ نیک بی بی اس وقت سرھانے سے ہٹ گئی، اور حضرت نے اٹھ کر کہا کہ اب میں رخصت ہوتا ہوں؟ گھر کی ایک خادمہ نے کہا کہ ہاں جائیے، مگر وہ بانات اوڑھتے جائیے، حضرت نے بانات کو بغل میں دبایا، اور چلتے وقت خادمہ سے پوچھا کہ اس مکان پر نمبر کیا ہے، اور روانہ باشد۔ حضرت سامعین مقامِ غور ہے کہ نفس امارہ کیسی بری چیز ہے، اور نفسِ مطمئنہ کس درجہ ہر دل عزیز ہے۔ نفس مطمئنہ نے اس مرد کی جان بچائی، اور نفس امارہ نے اس بدبخت کو یہ پٹی پڑھائی۔ شب عروسی اور سردی کے دن، اور اس درجہ رحم کرنا، اسی نیک بی بی کا کام تھا۔ اور احسان کا یہ بدلا دینا اس بدبخت مرد ہی کا حصہ تھا۔ مجھے شک کی جگہ کلی یقین ہے، اور یہی ایمان و دین ہے کہ حضراتِ سامعین بلند مکان اور حاضرین وحی نشان اس وقت اس بدباطن، بدوضع، بدکردار، بدمعاش، بدبخت آدمی سے ناراض ہوں گے۔ اگر وہ بالفرض محال سامنے آئے تو بے اختیار یہی جی چاہے کہ چورنگ کیجیے۔ ایسی سزا دیجیے کہ عمر بھر یاد ہی تو کرے لیکن اس سے ہم کو یہ نتیجہ مستخرج کرنا چاہیے کہ جب ہم اوروں کی ایسی غلطیوں اور حماقتوں اور برائیوں کو سُن سُن کر اس قدر ملول و مغموم ہوتے ہیں اور غیظ و غضب کا بحرِ ناپیدا کنار جوش زن ہو جاتا ہے، پھر اگر ہمارے افعال بھی ایسے ہوئے تو اور لوگ ہم کو کیا کہیں گے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جس وقت کسی نوجوان نوخیز نوعمر کے انتقال پر ملال کی وحشت اثر خبر سنتا ہے، تو کمال افسوس کرتا ہے۔ اور کوئی پندرہ بیس منٹ تک دنیا کی بے ثباتی کا خیال کرکے سوچتا ہے، کہ آج سے عناد اور فساد اور لڑائی جھگڑا، تعصب اور بددیانتی بے ایمانی

سب کو طلاق دیں گے۔ سلامت روی کی چال چلیں گے۔ لیکن دو گھڑی کے بعد پھر وہی جوتی پیزار، وہی گلخپ، وہی تکرار، وہی بُرے بُرے خیال، کسی سے رنج کسی سے ذراسی بات پر ملال، اور کسی کو میں کیا کہوں خود اپنا ہی حال معرضِ بیان میں لاتا ہوں، اور اپنی بیتی سناتا ہوں۔

ایک دن میں کلکتہ جارہا تھا۔ جب چورنگی اسٹریٹ میں پہنچا تو دیکھا کہ ٹکٹی پر ایک لاش آرہی ہے۔ صدہا آدمی ساتھ ساتھ ماتم کرتے جاتے ہیں۔ روتے ہیں، اور اس مرحوم کا نام لے کر چلاتے ہیں۔ رام رام ست ہے۔ ست بولو مکت ہے۔ ہر کا نام ست ہے ست بولو مکت ہے۔ دو تین پنڈتوں نے لہرا لہرا کر کہ شن تو یو میں پرا دھا شوا سوا شمبھو۔ شری مہادیو۔ شمبھو۔ اس آواز اور رام رام کی ست کی صدا نے مجھے افسردہ، پژمردہ کردیا۔ ایک ہیبت سی میرے چہرے پر چھاگئی۔ جب میں نے سنا کہ ایک پیرمرد کا لڑکا جس کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی اور جس کی شادی کو ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے۔ جس کی بیوی ابھی پوری بارہ برس کی بھی نہیں جس کی قوم میں بیوہ کا نکاح ناجائز ہے، اور جو اپنے والدین کا ایک ہی لڑکا تھا، جس کی ماں پچپن برس کی ہے، اور ساٹھ برس کا باپ، جو انٹرنس کے امتحان میں اول آیا تھا، جس نے فرسٹ آرٹس کے امتحان میں تمغہ پایا تھا۔ اس ٹکٹی پر مرگھٹ جارہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس کا جسم آگ کے شعلے میں جل رہا ہوگا۔ اس کی ہڈیاں مچھلی اور نہنگ کی غذا ہوں گی۔ باپ نیم جاں اور زندہ درگور ہو جائے گا۔ ماں کی قوتِ باصرہ جواب دے گی۔ سسر اجیتے جی مر مٹے گا۔ ساس اپنی پیاری بیٹی کو بیوہ دیکھ کر سر پھوڑے گی اور اس کے تمام خاندان کا عیش رنج و غم سے مبدل ہوگا، تو دل بھر آیا۔ اور میں کئی قدم تک جنازے کے ساتھ گیا۔ اس وقت دل کا عجب حال تھا، لیکن کوئی پچاس قدم ساتھ گیا ہوں گا کہ ایک ایرانی سامنے سے چلا آتا تھا۔ اس کی لکڑی جس کو وہ گھمار ہا تھا ہاتھ سے چھوٹ کر میرے سر پر پڑی، اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑ سے گالی دے بیٹھا۔ افسوس!

حضرات سامعین دیکھیے کہاں وہ رنج و غم تھا۔ کہاں یہ فعلِ ناشایستہ مجھ سے سرزد ہوا۔ عین حالتِ خیال بے ثباتی دنیائے دوں میں، میں نے وہ حرکت کی جو ایک بچے سے بھی نہ ہوتی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ مجھ سے اور اُس ایرانی سے دشمنی نہیں۔ وہ مجھ کو جانتا تھا نہ میں اس کو، مگر با ایں ہمہ میں ایسے فعلِ ناشایستہ کے قریب ہوا اور یہ بھی میں خوب جانتا تھا کہ

اس نے عمداً اور قصداً اور ارادہ، دیدہ و دانستہ، ایسا نہیں کیا۔ اتفاق سے لکڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سر پر پڑی۔ علاوہ بریں کچھ ایسی چوٹ بھی نہیں لگی تھی کہ مر ہی جاتا۔ افسوس ہے کہ ایک ہی منٹ میں، میں وہ سب باتیں بھول گیا، اور بلاوجہ ایک شریف کو گالی دے بیٹھا۔ وہ ایرانی خوب سمجھا کہ میں نے اس کو گالی دی مگر خاموش رہا:

دل بدست آور کہ حج اکبر ست　　　　از ہزاران کعبہ یک دل بہتر ست

وہ انسان کیا جو کسی کو دکھ پہنچائے۔ وہ آدمی کیا جو بنی نوع انسان کو اپنا بھائی نہ سمجھے۔ آدمی سب ہیں، اور پھر بھی آدمی شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ ع۔ نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار ست و نیست،، یہ دنیا آدمی کی کھان ہے مگر آدمی عنقا۔ کھرا آدمی کبریتِ احمر کا حکم رکھتا ہے۔ کھوٹے خس و خاشاک سے زیادہ ہیں۔

میں اپنے معزز سامعین سے اور کچھ نہیں چاہتا، اگر چاہتا ہوں تو صرف اس قدر کہ جو کچھ میں نے مزخرف لکچر میں کہا ہے اس پر غور کریں۔ بہت ضروری بات جس سے ہم کو بچنا لازم ہے۔ یہ ہے کہ حسین کو دیکھ کر ایسے پھسل نہ جائیں کہ دین و دنیا دونوں سے جائیں۔ ع۔ نہ خدا ہی ملے نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہیں نہ اُدھر کے رہیں،، خصوصاً حسین اور کم سن عورت خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مردمی اور مردمی اس میں نہیں ہیں کہ بدوضعی کو جوہر سمجھے، مگر مردمی اس میں ہے کہ نفسِ امّارہ کو مغلوب کرے۔ بہت سے شہزادے، رئیس زادے، امیرزادے، آج کل بس اسی چکر میں پڑے ہیں کہ بدوضعی کو اعلیٰ درجے تک برتیں۔ جدھر نکل جائیں لوگ انگلیاں اٹھائیں کہ وہ جاتے ہیں:

تا کہ مشہور ہوں ہزاروں میں　　　　ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

ہائے افسوس اگر وہ اس قدر سمجھیں کہ اُن کے دل کی تو دلی خواہش اس امر کے حاصل کرنے کی ہے، جو ننگِ شرافت اور خلافِ وضع اہلِ آبرو ہی۔ تو غالباً اپنے اس خیال فاسد پر کفِ افسوس ملیں۔ مگر ان کی عقل کی آنکھوں پر شیطان نے پٹی باندھ کر، ایسی پٹی پڑھا دی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں اس معزز طبقے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو منہیات نشیات سے اجتنابِ کامل اور پرہیز کلّی کرتے ہیں، اور جو بہت پھونک کر قدم دھرتے ہیں۔ جن کے دل میں کبھی بدی نہیں آتی۔ جن کے مزاج میں گنہگاری بار نہیں پاتی۔ ایسے شریف زادوں کے نقشِ قدم پر چلنا ضرور ہے۔ جن کے دل سے بدوضعی اور اوباشی منزلوں

دور ہے۔ لیکن کچھ ایسی ہوا بندھی ہے کہ حیا پروری کا چراغ ہی گل ہوگیا۔ پاس نام و ننگ کا قلع ہوگیا۔ اب اکثر رئیسوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کو فخریہ بیان کرتے ہیں۔ جب کبھی ان سے کہا کہ حضرت اس کوچے کی راہیں تو کچھ آپ ہی کو خوب معلوم ہیں، تو کھل جاتے ہیں۔ اور اکڑ کر فرماتے ہیں کہ میاں تمام عمر کیا کیا کیے۔ آخر اب بھی کوئی ہم سے گوے سبقت لے جائے تو حیرت ہو یا نہ ہو۔ مصاحب بولے اے حضور آپ نقاد ہیں خوشامد کرنے والے تڑسے کہہ اٹھے کہ خداوند آپ اس فن کے مبصر ہیں یہ موئچوڑ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ پیر و مرشد خدا گواہ ہے کہ بس آپ ہی آپ ہیں، اور اصل میں اگر دیکھیے تو آپ کیا اور آپ کے باپ کیا۔ تمام عمر بجز اس کے کچھ کیا ہی نہیں کہ طبلے پر تھاپ ہوا، اور کلچھڑے اڑ رہے ہوں۔ لاحول ولا کسی کارِ خیر میں شریک نہ ہوئے۔ نیکی کا کام کیا ہی نہیں آج تک، ہزار پائے تو دس ہزار اڑائے۔ ٹکا پاس نہیں۔ ان حضرات کی حالت بیشک قابلِ افسوس ہے جو بجز ان باتوں کے اور کسی امر کو اچھا سمجھتے ہی نہیں۔ اب میری دلی خواہش ہے کہ آپ سب صاحبوں سے جن احباب کا جی چاہے ان امور کی نسبت اپنی رائے، اور اپنے خیالات ظاہر کریں۔

لکچر ختم ہوگیا، اور حاضرین جلسہ نے اس زور سے تالیاں بجائیں کہ تمام عمارت گونجنے لگی۔ اس کے بعد صاحبِ لکچرر اپنی کرسی پر بیٹھے، مگر کسی شخص کو اس قدر جرأت نہ ہوئی کہ استادہ ہو کر کچھ کہے۔ انھوں نے پھر کہا کہ اگر کسی صاحب کا جی چاہے تو کچھ فرمائیے۔ میں بڑی مسرت سے سنوں گا اور خوش ہوں گا۔ ایک صاحب استادہ ہوئے اور ادھر ادھر دیکھ کر یوں فرمایا۔

میں نے اس لکچر کو جس کا ایک ایک حرف قابلِ داد اور ایک ایک لفظ لائقِ صاد ہے۔ دل کے کانوں سے سنا اور اس کے ایک ایک فقرے سے مجھے اتفاق ہے۔ حسن کی نسبت جو کچھ عالم و فاضل لکچرر نے فرمایا، سب صحیح بلکہ اصح ہے۔ حسن واقع میں خدا کی دین ہے حسین آدمی کو جناب باری عزاسمہ، کا تہ دل سے مشکور و ممنون ہونا چاہیے کہ وہ جوہر عطا کیے، اور وہ صورت زیبا دی کہ اور بنی نوع انسان گھنٹوں حیرت کے ساتھ گھورا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے حسین مرد ہوں یا عورت، یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی نہیں تو دو کوڑی کا۔ اُس حسین سے جس کے دل میں بدی ہے، وہ کریہ منظر اچھا جو مسلکِ خیر و نیکی کا سالک ہو۔ دیکھو نیم کیسی کڑوی چیز ہے، لیکن صدہا عوارض کا

اس سے علاج ہوتا ہے۔ روز شراب کیسی شیریں ہے۔ لیکن ایک قطرہ اگر برہمن یا چھتری یا مسلمان پی لے تو اس کے ہم قوم اس کو ذات سے خارج کر دیں۔ بہت سے پھول دنیا میں ایسے ہیں، جو دیکھنے میں نہایت خوشنما ہیں، لیکن بو باس نہیں۔ کسی مرض کی دوا نہیں۔ بر عکس اس کے بہت سے پھول ایسے بھی ہیں جو دیکھنے میں خوشنما نہیں۔ مگر امراض کے لیے ان کا استعمال اکسیر کی خاصیت رکھتا ہے، اور جو کوئی پھول رنگین اور خوشنما بھی ہو، اور ساتھ ہی اس کے اطبا کے نسخوں میں بھی اس نے جگہ پائی ہو، اور بو باس سے بھی دماغ کو رشک تاتار بنا دیا ہو، تو صلّ وجلّ پھر کیا پوچھنا ہے۔ الغرض حسین آدمی کو خدا کا ممنون ہو کر صورت زیبا کے ساتھ سیرت بھی ملائکہ نورانی کی سی بہم پہنچانا چاہیے ورنہ ہیچ۔

جلسہ برخاست ہوا۔ اور دو چار صاحبوں نے حضرت میرزا ہمایوں فر بہادر اور صاحب لکچرر سے ملاقات کرائی۔ تھوڑی دیر تپاک کے ساتھ باتیں ہوئیں اور رخصت۔ میرزا ہمایوں فر فٹن پر سوار ہوئے اور کوچبین نے گھوڑیوں کو کڑکڑایا تو ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔ ایک مقام پر گھوڑیاں ذرا بھڑکیں، اور کچی سڑک پر فٹن کو گرانے گئیں۔ قریب تھا کہ میرزا ہمایوں فر کوچبین کو گالیاں دیں کہ ویسے ہی ان کو لکچرر کی باتیں یاد آئیں اور خاموش ہو رہے۔

اس لکچر نے میرزا ہمایوں فر کے دل پر اثر کیا۔ لکچر کے مطالب ان کے فی الذہن تھے راہ بھر وہی باتیں سوچتے آتے تھے، اور کہتے جاتے تھے، کہ کُل باتیں ہمارے حسب حال ہیں، مگر پھر دل کو سمجھاتے تھے کہ ہم نے تو کوئی فعل ایسا نہیں کیا جس سے ہماری وضعداری یا شہزادگی، یا امارت، یا شرافت میں بٹا لگے۔ اسی وقت ان کو یاد آیا کہ عاشق النّسا بن کر حسن آرا اور سپہر آرا کو گلے لگایا۔ اور ان شریف زادیوں کو بلانے کا پیغام بھیجا۔ جل دے کر اب اپنے بس میں لانے کی فکر کی، پس مارے خفت کے ان کی پیشانی پر پسینا آگیا۔ اس درجہ رنج ہوا کہ بیان سے باہر سوچے کہ ہم نے بہت ہی بُرا کیا۔ اب نامہ و پیغام کو دور ہی سے سلام ہے:

ہر کہ از تقصیر خود شد منفعل آبِ رحمت از جبیں خویش یافت

اغلب ہے کہ اب راہ راست پر آئیں۔ اب لب بام بُری نیت سے نہ جائیں۔ اب اِدھر اُدھر آنکھیں نہ لڑائیں، اور آہ جگر دوز لب پر نہ لائیں۔ نامہ و پیغام بھیجنے کا خیال دل سے بھلائیں۔

خواب

اے خوش ان صبح کہ عاشق زشکر خواب وصال دست در گردن معشوق حمائل برخاست

کنج باغ ہو، بلکہ راغ ہو، ادھر لمپ اور جھاڑ اور کنول کا نور ہو، ادھر صنم غیرت حور ہو۔ عشرت یار، در و دیوار ہو، گلزار سراپا بہار ہو، اور عاشق زار ہو، اور معشوق رو کش فرخار ہو، ایک سمت بادۂ گلگوں کیمیائے فتوح روح کی گلابیاں، دوسری جانب جام مروّق اور گزک کی پیالیاں۔ غم ہو نہ فکر ہو۔ محبت و گرمجوشی کا ذکر ہو۔ معشوق بھی ہو تو آگ بھبھوکا رقیب روسیہ کو لگے لوکا۔ پرندتک پر نہ مارنے پائے۔ ہوا تک بار نہ پائے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ معشوق فرطِ طرب سے یہ شعر زبان پر لائے:

آن شب قدرے کہ گویند اہل خلوت امشب ست یارب ایں تاثیر دولت از کدامی کوکب ست

اور عاشق پاکباز کی روح حافظ شیراز کی اس بیت میں آیا:"

تشنہ چاہ زنخداں توام کز ہر طرف صد ہزارش گردن جاں زیر طوق غبغب ست
آنکہ ناوک بر دلم از زیر چشمی می زند قوت جان عاشقش در خندہ زیر لب ست

یہ سب ہو، اور عاشق کو معشوق کی تلاش ہو، تو سینہ پاش پاش ہو، گلزار خار نظر آئے باغ کو دحشت زار کی صورت دکھائے اور عاشقِ زار کی زبان پر یہ کلام آئے:

چمن بھی ہے بہار روح افزا بھی ہے ساقی بھی الٰہی وہ بھی آجائیں جنھیں ہم یاد کرتے ہیں

اب سنیے کہ مجسم اندام، سراپا انداز، پیاری حسن آرا بیگم اور ان کے پیارے جوان طنّاز میاں آزاد، دام بالا عزاز، ایک فرح بخش کوٹھی پر متمکن ہیں۔ چھت گیری گلابی، جھالر آبی قالینوں اور سفید چاندنیوں کا وہ مکلّف فرش کہ صفائی اس کی قسم کھائے اور چاندنی اس پر سے صدقے ہو جائے۔ صدر میں ایک مسند بچھا ہے۔ سُرخ جیسے بیر بہوٹی۔ ادھر اُدھر کار چوبی کام، اور بیچ میں سورج مکھی کا ایک پھول بنا ہے۔ تکیہ جواہر نگار، تو رہار، جھاڑ اور کنول روشن۔ یہ کمرہ ہے یا دلہن۔ تشتریوں میں بیلے کے ہار۔ بو باس ہیں رشک ختن غیرتِ تاتار۔ گلہائے معنبر کے انبار۔ عطر و عنبر اور مشک اذفر کی خوشبو آتی ہے، اور یہ بوے روح افزا سونگھ کر قوتِ شامّہ اتراتی ہے۔ آزاد دائیں اور حسن آرا بیگم بائیں، اغل بغل مسند لگائے بیٹھے ہیں حسن آرا کی زلف پریشاں، مگر چہرہ خنداں۔ آزاد دست و غز لخواں۔ حسن آرا کی آنکھوں سے

مسرت اور بہجت برستی ہے۔ جدائی اور مفارقت کمرے کے باہر کھڑی ترستی ہے۔ حسن آرا نے میاں آزاد فرخ نژاد سے پوچھا کہ اب کیا چاہتے ہو۔ بتاؤ جو حکم دیں بجالاؤ۔ بعد مدت کے دل کی آرزو برآئی، اور خدا نے وصال کی گھڑی دکھائی۔ آزاد نے دست بستہ عرض کیا:

دل سراپردۂ محبت اُوست — دیدۂ آئینہ دارِ طلعتِ اُوست
منکہ سر ور نیادرم بدو کون — گردنم زیر بارِ منتِ اُوست
دورِ مجنوں گذشت و نوبت ماست — ہر کراپنج روز نوبتِ اُوست
من کہ ہاشم دراں حرم کہ صبا — پردہ دارِ حریمِ حرمتِ اُوست
گر من آلودہ دامنم چہ عجب — ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اُوست
ہر گل تو کہ شد چمن آرائی — اثر رنگ و بوی صحبت اُوست

اتنے میں اس زناٹے کی ہوا چلی کہ جہاز تہ و بالا ہونے لگا، آخر خوجی نے غل مچانا شروع کیا، اور گوڑیوں کا دن۔ اکھاڑے میں پہلوان جمع۔ پٹھوں کو کشتی سکھا رہے ہیں۔ دو تال ٹھونک کے ایک موٹا تازہ ہٹا کٹا پٹھا کھڑا ہوا۔ جوڑ چھٹی۔ علی کے نام کے گیارہ ڈنڈ طاق کے قریب پہلے اور پینترے بدل بدل کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اف ذری دیکھیے گا وہ لال لنگوٹ والا کیسے کڑوے تیور ڈال رہا ہے۔ سقے والے کی شامت آئی۔ بس دیکھتے جائیے، وہ پٹخنی کھائی۔ ارے رے رے رے۔ خوب سنبھلا واہ پٹھے۔ وہ دستی کی اور پیٹھ پر آیا۔ اب لال لنگوٹ والا ذرا اگڑ بڑا گیا۔ ہفتے گھٹے ہی چاہتے ہیں۔ وہ انٹی دی واہ رے سقے والے، مشک گنج کے اکھاڑے کا ہے کہ باتیں۔ چھٹ گئے۔ اہاہا! کیا جھپٹ ہے، اے سبحان اللہ وہ گتھ گئے مگر اب کی سقے والے کی گردن بُری پھنسی ہے، لیکن وہ بھی ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔ ہمتے تو دے گا نہیں حریف کو شاباش ہے۔ وہ گردن چھڑا لی۔ مانتا ہوں واللہ۔ گردن چھڑاتے ہی حلقوم کس لیا۔ ایں! پھر دونوں کے دونوں الگ تھلگ۔ بھئی ملی ہوئی کشتی لڑتے ہیں۔ یہ کچھ بات نہیں۔ دروازے پر فقیر چکارلیے ہوئے، موجود۔ لہرا لہرا کر گا رہا ہے کہ جمنا کا جانا چھوڑا، گنگا کا نہانا چھوڑا، مٹی کا لگانا چھوڑا، اور اما بولی ارے بندر والے ذرا ادھر آنا۔ ناچ کھلاڑی دھنک دھنا۔ ڈگڈگی بج رہی ہے۔ اینٹھا سنگھ بزاز خفش پر سوار، بندر والے کے ارد گرد ایڑ لگاتے جا رہے ہیں۔ ٹوپی سر پر رکھتے ہی، کسی نے چھینک دیا، اور ٹوپی تڑ سے پھینکی۔ وہ گری۔ پھر ٹوپی رکھی، پھر چھینک پٹ سے پڑی اور لال لال

ٹوپی (پھندے کی کسرتھی راوی) گھوڑے پر جا گری۔

مینھ چھما چھم برس رہا ہے۔ آزاد نے حسن آرا بیگم سے کہا کہ خیر تو ہے بھیگی جاتی ہو۔ اور ذری پلنگری نہیں اٹھاتی ہو۔ یہاں کمرے میں اٹھالاؤ۔ میں صدقے آزاد جو اٹھے تو بجرا وہ پہنچا۔ دھوپ سے کھوپڑی چٹخی جاتی تھی۔ ماما چھتری لگاتی تھی۔ اور ہمایوں فر جو لب بام آئے تو کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے۔ تامدان پر اچھے صاحب سوار اور حسن آرا اکیلی اٹھائے ہوئے جاتی ہے اور کمر بل کھاتی ہے۔ یہ دیکھتے ہی میرزا ہمایوں فر کے بدن سے شعلے نکلنے لگے، اور جھلا کر اور طیش کھا کر دھم سے کود ے، تو سپہر آرا بولیں کہ باجی آج کیسی طبیعت ہے۔ بولتی ہو نہ چالتی ہو۔ بات کو ناحق بن ناحق ٹالتی ہو۔ آخر ش کسی نے کچھ کہا ہو، سنا ہو، تو بتاؤ؟ حسن آرا مفت میں ہلکان ہونا کیا معنی۔ پھول چلنے کے لیے ہیں۔ شمشاد بر رہا ہے۔ سرو تنے ہیں:

از تاب آتش مے برگرد عارضش خوی — چوں قطرہ ہائے شبنم بر برگ گل چکیدہ
یاقوتِ جانفزایش از آبِ لطف زادہ — شمشادِ خوش خرامش از ناز پروریدہ

(حافظ)

آں لعلِ دلکشش ہیں داں خندۂ دل آشوب — مشتری ہمچوں زہرہ شد رقاص
بتا ساقی کفارہ کیا ہے رسم مے پرستی میں — بال بیکا نہ ہو کبوتر کا۔

ڈاکٹر نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہ۔ بڑی بیگم صاحب اچھی ہو جائیں گی۔ ان کے پیٹ میں چونے کا ہنڈا چلا گیا۔ تشخیص میں آیا ہے کہ پانی کے ساتھ چونے کا ہنڈا پی گئی ہیں۔ میں کل کوئلے کی دھنک کو پانی کو خشک کر کے بیچ دھارا بہاؤں گا۔ سمجھیں کہ یہ مردار شے ہے۔ میرزا ہمایوں فر اور میاں آزاد فرخ نہاد اور حسن آرا بیگم اور ایک پنساری۔ بوڑھا پنساری جس کے ہاں سے مانک چندی ڈلی آتی تھی، وہ سب مل کر ایک دستر خوان پر کھانے لگے۔ بس تھوڑی دیر میں گولیوں کی آواز آئی، اور آزاد نے کمر کسی، ہمایوں فر نے پتھر کلہ لیا، اور حسن آرا آپ لے کر دوڑی، مگر فنس پر سوار اور ہاتھ میں توپ۔ میدانِ جنگ میں جو گئی ایک لاش بولی:

از کجا می آئی اے سرمست خوبی محوِ ناز — عطر آگیں نا پدامن عنبر افشاں تا کمر

حسن آرا نے کہا:

پیام دوست شنیدن سعادت ست سلامت — فدائے خاک درِ دوست باد جانِ گرامی

ہوا جو چلی تو حسن آرا کی زلف پریشان ہونے لگی اور میاں آزاد نے اس وقت

برجستہ کہا:

اے باد نسیم یار واری ۔۔۔ زان نفحۂ مشکبار داری
زنہار مکن دراز دستی ۔۔۔ با طرۂ او چہ کار داری
اے گل تو کجا در دے خویش ۔۔۔ او مشک تر و تو خار داری
نرگس تو کجا و چشم مستش ۔۔۔ او سرخوش و تو خمار داری
اے سرو تو با قد بلندش ۔۔۔ در باغ چہ اعتبار داری
اے عقل تو با وجودِ عشقش ۔۔۔ در دست چہ اختیار داری

بڑی بیگم: آج میٹھے ٹکڑے پکے ہیں۔ کھاؤ گی بھبوں؟

حسن آرا: اماں جان اس وقت تو جی نہیں چاہتا، دو پیازہ ہو کٹھا تو بھجوائیے۔

سپہر آرا: ہاں مگر دھنیا ضرور پڑا ہو۔ یہ موئی ماما دھنیا ڈالنے کی دشمن ہے۔ باورچی سے پکوائیے اس کی تو جیسے روز بروز عقل دیمک چاٹے جاتی ہے۔

بڑی بیگم: کاہے کی گوٹ۔ کچھ بتاؤ گی بھی۔ پیسے کی دو والی۔

سپہر آرا: ایک آنے کی نارنگی یہاں بھیج دیجیے تو احسان ہو۔ مگر لال لال ہوں ذری۔

ہمایوں فر: اے ہے۔ پان تو آپ کی ماما ایسا لگا لائی کہ چونا ہی چونا ہے۔

آزاد: پھینک دیجیے۔

ہمایوں فر: اجی اب تو چبا چکے۔ مگر منھ کے پرخچے پرخچے۔ اڑ گئے۔

آزاد: کہیے بی حسن آرا صاحب۔ مزاج تو اچھے رہے؟ آپ کی بہن سے ملاقات نہ ہوئی کہیے اچھی تو ہیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں، ذرا ایک دفعہ تو نظارہ بازی ہو جائے۔

حسن آرا: اے واہ ماشاء اللہ بڑے فصیح بنے ہیں۔ بلبل کو مذکر کہتے ہیں۔

ماما: پھر بھُس کیا ملا دیا، دونوں طرح جائز ہے۔ دونوں کی مثالیں موجود ہیں مذکر بھی مؤنث بھی سنیے:

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروج پرواز ۔۔۔ ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

اس میں مؤنث ہے۔ ہے کہ نہیں ہے بولیے۔ اب مذکر کی مثال سنو:

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا ۔۔۔ روح القدوس ہے نام مرے ہمصفیر کا

ہمایوں فر: ہاں مگر حبشی اور تکونے میں فرق ہے۔ تکونا سنبوسہ حبشی حلوا سوہن۔ کیوں۔

ہاں ہاں میاں ہاں۔ اس میں مین میکھ کیا ہے۔

دائرے والے نے گت چھیڑی اور ارباب نشاط نے یہ غزل گائی:

زلف کرتی ہے پریشان ترے سودائی کا
آنکھیاں دیتی ہے چشمک ترے رسوائی کو

رشک ہے پان ومستی پر کہ یہ کس دھوکے میں
چوم لیتے ہیں وہیں کی ترے زیبائی کو

تیرہ بختی کا لگایا ہے جبیں پر ٹیکا
آج تشہیر کیا ہے ترے سودائی کو

جلوہ یار نے آنکھوں کے پری خانہ میں
عالم نور کیا شعلۂ بینائی کو

جب ترے درد کش عشق کو سونپا نہ خاک
گنبد گور کیا گنبد بینائی کو

ڈورگری اور سپہر آرا نے لوٹ لی۔ مگر بڑی بیگم نے کنکوا نہ چھوڑا تب تو حسن آرا پان والے پر جھلائی۔ موا روز ٹھگ لے جاتا ہے زمانے بھر میں بکے آنے ڈھولی یہ دیں آٹھ آنے ڈھولی۔ مٹھی کالا ہو موے کاٹتے میں گھر کی مہری نے کتاب اٹھائی اور پڑھا۔

قصیدہ مع تاریخ جلوس نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر وزیر اعظم شاہ اودھ بہ صنعت پنج ہزار و نہ صد و شش مادہ تاریخ طریق استخراج مادہ انیست کہ ہر مصرع تاریخ و منقوط شعر تاریخ و غیر منقوط ہم تاریخ و منقوط یک مصرع و غیر منقوط و دیگر ہم تاریخ و غیر منقوط اول مصرع و منقوط دوم ہم تاریخ و بہمین طریق مصرع اولی۔

آزاد نے حسن آرا کو گلوری دی۔ اور حسن آرا نے ہمایوں فر کو گلوری دی اور ہمایوں فر نے بڑی بیگم کو گلوری دی اور بڑی بیگم نے اپنے شوہر کو گلوری دی اور بڑی بیگم کے شوہر نے سپہر آرا کو گلوری دی اور حسن آرا نے اچھے صاحب کو گلوری دی اور اچھے صاحب نے آزاد کو گلوری دی اور سب نے مل جل کر کھانا کھایا۔ جب رات ہوئی تو آزاد نے کہا کہ تم کو میاں آزاد نے یاد کیا ہے اور کہا ہے کہ (اب کب تک ترسائے رکھیو جی) کہا کہ برسوں سے ہم نے نہیں دیکھا۔ پیاری حسن آرا اب تو ذرا جھمکڑا دکھا دو۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اس کے بعد حسن آرا نے اٹھ کر کہا کہ صاحب آپ تو شہزادے ہیں اور ہماری اور خو بو ہے۔ ایک لڑکا کوئی آٹھ نو برس کا ہوگا ایک جنگل کے کالے بھورے ریچھ پر سوار صحن میں آیا اور بندر نے اس لڑکے کو چھاتی سے لگایا اور سپہر آرا بولی کہ باجی ڈلی ذری کاٹ دینا ہم سے اس وقت نہیں کٹتی تکلیف تو ہوگی مگر خیر۔ بہن ہو بڑی اور کیا کہوں۔

حسن آرا: چاندنی چوک تو دلّی میں ہے اور حضرت گنج لکھنؤ میں۔

ہمایوں فر: واہ دلّی چاندنی چوک میں اور لکھنؤ حضرت گنج میں اور دلی میں حضرت گنج۔

راوی: اے سبحان اللہ۔

آزاد: یہ بھی غلط۔ چاندنی چوک میں لکھنؤ۔ اور لکھنؤ میں دلی اور دلی میں حضرت گنج۔

سپہر آرا: جی کہیں ہو نہ۔ حضرت گنج میں دلی اور دلی میں لکھنؤ اور لکھنؤ میں چاندنی چوک اور پھر چاندنی چوک میں حضرت گنج اور بس اسی طرح۔

ماما: حضور میاں آزاد آئے ہیں۔

حسن آرا: آزاد آئے۔ آزاد آئے۔ آزاد آئے۔

سپہر آرا: کہاں۔ کہاں۔ ہاں ہاں سچ کہا وہی تو ہیں اونٹ پر سوار ہیں معلوم ہوتا ہے کہ۔

راوی: خوب سوجھی۔ دن کو اونٹ خوب سوجھا ہے واللہ۔

حسن آرا باغ میں ٹہل ٹہل کر دیوان حافظ شیرازی پڑھتی تھی۔ اور جھومتی جاتی تھی اور بار بار گردن ہلاتی تھی اور کھلی جاتی تھی۔ اور سپہر آرا اسی اونٹ پر ہوا کھاتی ہے:

خوشتر زعیش وصحبتِ باغ و بہار چیست ساقی کجاست گو سبب انتظار چیست

آزاد اور حسن آرا پری زاد، ہاتھ میں ہاتھ دیے باغ میں بصد تحمل ٹہل رہے ہیں، اور سپہر آرا اونٹ کو میرزا ہمایوں فر کی مہتابی پر چمکاتی ہے، اور اچھے صاحب کی مہری اترائی جاتی ہیں کہ میرے پائجامے میں کیس ٹکی ہے۔

حسن آرا: مہری کتنی بے تکی ہو تم۔

مہری: اے واہ۔

حسن آرا: ہم باغ میں ٹہل رہے ہیں، اور تم یہاں آتی ہو۔ جو میاں آزاد کا خط اس وقت آجائے تو ہم پانچ روپیہ انعام کے دیں۔

آزاد: ہاں ہم بھی دیں۔

مہری: آپ کیا دیں۔

آزاد: جو آزاد کا خط آئے۔ تو ہم دس روپیہ دیں۔ پورے دس۔

مہری: اللہ کرے آئے۔ خدا کرے آئے۔ دس اور پانچ کتنے ہوئے۔ دس اور پانچ پندرہ۔

ہمایوں فر اور آزاد مل کر امریوں میں جھولا جھولے اور جھولے پر جو نا ندے تھے۔

ان میں پھول پھوے۔ اور کروندے کے سایہ میں جاکر حسن آرا ناچنے لگی، اور سپہر آرا گاتی تھی (کروندے کی چھیاں چھیاں) اس کے بعد روح افزا اور سپہر آرا نے بجروں پر اچکنا شروع کیا۔

حسن آرا : آزاد آزاد! پیارے آزاد! اس وقت ہمارا دل ایسا بشاش ہے کہ، عمر بھر کبھی نہ تھا۔ ہائے ایک ہی بجرے پر ہم اور تم سیر رہے ہیں۔

آزاد : واہ جھوٹ سب جھوٹ۔

حسن آرا : حسین کی قسم سچ کہتے ہیں۔

آزاد : بھلا بڑی بیگم کے سر پر ہاتھ رکھو۔

حسن آرا : (بڑی بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ کر) لو بس۔

آزاد : ہاں اب تشفی ہوئی۔

سپہر آرا : اور جو اماں جان اس وقت ہوتیں تو پھر کیسی ٹھہرتی۔

بڑی بیگم : جب ہوتیں نہ۔

سپہر آرا : شاید آجائیں۔

آزاد : جی ہاں یہاں آچکیں۔

جب ڈگڈگی بجی تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے بھئی۔ معلوم ہوا کہ پڑوس کا مکان جس میں شیخ نورالحسن رہتے تھے اُس کی قرقی ہوئی مال اور اسباب سب بکتا جاتا ہے، اور نیلام ہو رہا ہے۔

دو کرسیاں : سرکاری بولی ایک روپیہ آٹھ آنے، بارہ آنے۔ ایک روپیہ، دو روپیہ۔ ڈھائی روپیہ، پونے تین، پونے تین، پونے تین، ایک پونے تین۔ دو پونے تین۔ تین۔ لیجیے دام نقد لائیے! لو۔

دو پائجامے : سبز اطلس کے، سرکاری بولی سو روپیہ، دس روپیہ، دس دس بارہ روپیہ، بیس روپیہ، بیس روپیہ، پچیس روپیہ، پچیس روپیہ، ایک پچیس روپیہ، دو پچیس روپیہ تین۔

شربتی کا دوپٹا : کامدانی کا کام کیا ہوا۔ پانچ روپیہ، چھ روپیہ، سات روپیہ، پندرہ روپیہ، (واہ رے شوقین۔ سات سے پندرہ ہو گئے۔ ایک دم سے) تیس روپیہ، بتیس روپیہ، ایک بتیس روپیہ، دو بتیس روپیہ تین۔

حسن آرا میاں آزاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے جھروکے سے دیکھ رہی تھیں، اتنے

میں حسن آرا مہتابی پر سے گر پڑی۔ لیکن ابھی زمین تک نہ آنے پائی کہ مضمون غت ربود ہو گیا۔

ایک چور نے شاہ جی سے نسخہ لیا اور نک چھکنی نے ناک میں دم کر دیا

حضرات ناظرین۔ کچھ سمجھے بھی ہرگز نہیں۔ ہم کو دعویٰ ہے کہ ہزار میں شاید دو بزرگوار سمجھے ہوں تو سمجھے ہوں۔ ناظرین با تمکین کے دل میں طرح طرح کے خیالات جاتے ہیں کسی کی رائے ہو گی کہ اڈیٹر صاحب بھنگ کے ترنگ میں تھے۔ کوئی صاحب فرمائیں گے کہ برہمن ہیں تو کیا ہوا معلوم ہوتا ہے برانڈی پیے تھے (خدا نہ کرے توبہ) کوئی بزرگوار غلط ذکاوت سے کہیں گے کہ خللِ دماغ ہو گیا۔ ایک ساعت کا قطرب تھا، کوئی کہے گا کہ لکھتے لکھتے عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ اول جلول واہی تباہی بکنے لگے۔ افسوس کل تک بے چارے بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے۔ آج تنکے چننے لگے۔ ہمارے جس قدر ناظرین ہیں، سب اپنے اپنے خیالات کے مطابق رائے زنی کریں گے، اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ خطوں پر خط ٹوٹ پڑیں گے اور اکثر اصحاب شکایت کریں گے کہ یا حضرت خیر تو ہے قصہ کھلوائیے۔ کسی حکیم حاذق سے رجوع لائیے۔ یہ آپ نے کیا بکا ہے، از سرتا پا خرافات۔ جو کچھ بھی سمجھ میں آتا ہو۔ معقول، قبلہ سمجھا کیا دل لگی ہے۔

اور سنیے! حضرت کاتب لکھتے لکھتے چونک پڑے۔ ایں۔ یہ پنڈت صاحب کو سوجھی کیا ہے بھئی۔ یہ مضمون ہے یا غت ربود کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، نہ رہا گیا چھپکے کا رومال اوڑھے، میرزا فش بنے ہوئے تشریف لائے۔ آداب حضرت، آج کی ظرافت کو ذرا مکرر ملاحظہ فرما لیجیے۔ کیوں وجہ؟ آج تو کچھ مطلب ہی خبط ہے گستاخی معاف۔ اور سنیے گا۔ حضرت آپ اپنا کام کیجیے۔ اس جھنجھٹ میں نہ پڑیے۔ بہت خوب۔ تھوڑی دیر میں ایک مصحح صاحب برآمد ہوئے۔ تسلیم آج کی ظرافت ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے گا۔ عرض کیا کہ حضرت یہاں سلسلہ وضع کے پابند ہیں۔ مکرر دیکھنے کی قسم کھائی ہے۔ دوسرے دن ہمارے شفیق با لتحقیق ڈاکٹر رجب خان صاحب ڈاکٹر درجۂ اول پاگل خانہ اودھ کا نمیقۂ انیقہ آیا۔ اجی صاحب آپ تو ہم کو پاگل بناتے تھے مگر اب فرمائیے کون پاگل ہے۔ ہم یا حضور۔ کیوں یہ کل میاں آزاد کی داستان میں کیا بے پر کی اڑائی ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ اگر یہی حال ہے تو حضرت آپ بھی ہماری ہی جان کھائیں گے۔ ہم تو خیر بھلا پاگلوں میں رہتے ہیں۔ آپ تو ایک مخزنِ علم اور معدنِ علم مطبع میں رہتے ہیں یہ آپ کو نصیب اعدا کیا ہوا لگی۔ اسی طرح اور دو چار آدمیوں نے بھی فرمایا کہ حضرت ہم کو گنجائش شکوہ سنجی

ہے

خیر اب ہم کس سے کہیں کہ یار و ہم نیچر کے مصور ہیں۔ ہائے اگر تا دل میں نیچر نہیں تو کچھ بھی نہیں خاک لطف ہی نہیں۔ مزا ہی کرکرا ہو جائے۔ سنیئے! اور دل کے کانوں سے سنیئے کہ یہ حسن آرا بیگم نے خواب دیکھا تھا۔ ہاتھ لائیے ذرا، کیوں نہ کہیے گا واسطے خدا کے ذرا تو اس سوجھ بوجھ کی داد دیجیے۔ کہیں داد تو درکنار میاں مٹھو نہ بنایئے گا۔ حضرت یہ خواب تھا بھلا پوچھیے تو یہ خواب کون دیکھ رہا تھا۔ حسن آرا بیگم پھر آپ جانیے خواب تو تھا ہی۔ کبھی لندن میں بیٹھے دندناتے ہیں۔ کبھی ولسن کے ہوٹل میں مٹن چاپ اڑاتے ہیں۔ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر ہو رہے، کبھی درخت کے پھنگی پر اور ایک بندر نے جو گیدڑ بھبکی بتائی تو لٹک گئے، اور گرتے گرتے ہی آنکھ کھل گئی۔ تو خواب بندر کی طرح اچک کر کھجور کے پیڑ پر تھا۔ یہی خواب میں ہوتا ہے، کچھ اور مسلسل خواب تو شاذ و نادر ہی کوئی دیکھتا ہوگا۔ ورنہ عموماً یہی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ مُردوں سے باتیں ہو رہی ہیں، اور وہ کہہ رہے ہیں کہ کیوں بھئی اگر ہم زندہ ہوتے تو کیسی ٹھہرتی۔ یا کسی ایسے دوست سے ملاقات ہوئی، جو منزلوں کی راہ پر ہے، اور وہ کہہ رہا ہے کہ خدا کرے ہم سے تم سے کسی دن ملاقات ہو۔ معقول سامنے تو بیٹھے ہیں، مگر ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی گویا۔ اس خواب پریشاں میں حسن آرا نے خدا جانے کیا کیا دیکھا۔ مگر سلسلہ درست نہیں۔ خیال تو کیجیے کہ کتنے مقامات پر بے جوڑ ہے۔ اول تو میاں آزاد اپنی پیاری حسن آرا کے پاس پہنچے کہاں سے۔ وہ جہاز پر سوار ہو کر روانہ باشدہ ہوئے۔

غرض کہ یہ مضمون بھی ساری خدائی کے مضمونوں سے نرالا ہے۔ ابتدا ہی سے انتہا کا بے تکا پن خاتونِ مہ لقا حسن آرا، اور میاں آزاد فرخ نہاد، ایک ہی کمرے میں متمکن ہیں۔ ایں یا وحشت!!! حسن آرا بیگم کہاں، آزاد بے چارے کہاں، وہ جہاز پر۔ یہ وہاں سے منزلوں دور۔ اور حضرت فرماتے ہیں کہ ایک ہی فرح بخش کوٹھی میں دونوں بیٹھے ہیں۔ چھت گیری گلابی، جھالر آتی۔

الغرض مہتابی پر سے حسن آرا بے چاری نصیب اعدا گری اور گرنے کا دھچکا اٹھا کر فوراً آنکھ کھل گئی۔ خواب کا قاعدہ ہے کہ ادھر صدمہ پہنچنے کا حال دیکھا، ادھر معاً آنکھ کھل گئی۔ جب ہی تو ہم نے کہا ہے کہ (لیکن ابھی تک زمین) نہیں آنے پائی تھیں کہ مضمون غت ربود ہو گیا)، سمجھنے والے اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ مضمون کے آخر میں جو غت ربود لکھا یہ بے وجہ نہ تھا۔

الغرض حسن آرا کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ آدھی رات کے قریب ہے۔ کمرے کا لیمپ گل، چوطرفہ اندھیرا چھایا ہوا۔

اب ایک اور بات سننے کے قابل ہے۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ جس دن اسٹیشن پر اس دلہن کے شوہر کو ایک سفاک نے قتل کیا تھا اس دن میاں آزاد اور خوجی کو ایک فقیر ملے تھے۔ ٹیکرے پر میاں خوجی نے ان سے کہا کہ آپ باکمال اور رسیدہ ہیں، انھوں نے کہا کہ حضرت میں آج تک رسیدہ کے معنی بھی نہیں سمجھا۔

پھر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ پیر و مرشد حضور کی دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ انھوں نے کہا بھائی میں آج تک دعا کا قائل ہی نہیں ہوا۔ دعا صرف تسلّی قلب کے لیے ہے۔ ورنہ دعا سے کیا ہو سکتا ہے۔ میاں آزاد نے جو اُن کو اپنے فشن کا پایا۔ تو جی خوش ہو گیا، خیر۔ وہی فقیر بقول:

درویش رواں رہے تو بہتر آب دریا بہے تو بہتر

اس شہر مینو سواد میں پہنچے، جہاں حسن آرا رہتی تھیں۔ لوگوں نے وہاں ان کو گھیرنا شروع کیا۔ ایک ذات شریف ایسے بھی نازل ہوئے، جنھوں نے شاہ جی کا ناک میں دم کر دیا۔ یہ حضرت بڑے نامی گرامی چور تھے۔ شاہ جی سے کوئی پچاس بار درخواست کی کہ حضور واسطے خدا کے کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس کسی کے ہاں چوری کرنے جاؤں۔ اس کو نظر نہ آؤں۔ شاہ جی نے سمجھایا کہ میاں ہمارے پاس ایسا نسخہ ہی نہیں۔ ہم تم کو کیا دیں۔ اس نے ایک نہ مانی۔ خیر۔ شاہ صاحب نے جب دیکھا کہ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ تو کہا اچھا۔ جس روز کسی کے گھر پھاندو ہم سے شام کو مل لینا۔ ہم ایک بوٹی دیں گے۔ چور انتہا کا خوش کہ مار لیا، بس اب کیا پوچھنا ہے۔ حسن آرا کا مکان تاکا، اور مالدار سمجھ کر دل میں ٹھان لی کہ آج شب کو انھیں کے ہاں چلنا چاہیے۔ رقم کثیر ملے گی۔ پو بارہ ہیں۔ شام کو شاہ جی کے پاس گئے، اور کہا کہ حضرت آج ایک گھر پھاندنے کی نیت ہے۔ لائیے پھر کچھ بوٹی دوٹی دلوائیے۔ شاہ جی نے ایک ڈبیا دی، اور کہا کہ اس میں بوٹی ہے، مگر خبردار جب تک مال کے کوٹھے میں نہ پہنچ لو ہرگز قصد نہ کرنا کہ اس کو کھولو جس وقت وہاں داخل ہو جاؤ۔ ڈبیا کو کھول کر بوٹی کو نکالو، اور خوب زور سے سونگھ لو۔ مگر چاہے تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ چار پانچ مرتبہ خوب زور سے سونگھنا، سمجھے؟ ہاں اس کے خلاف نہ کرنا۔ چور نے ڈبیا جیب میں رکھی اور کوئی گیارہ بجے کے وقت کمند ڈال کر کھٹ سے کوٹھے پر ہو رہا۔ خیر ایک گھنٹے تک تو کوٹھے پر جا کر دبکا رہا۔ اس کے بعد جب سب سو گئے تو حضرت دبے پاؤں اترے۔ چپ چاپ، اور اتفاق سے اسی کمرے میں گئے جہاں حسن آرا اور سپہر آرا سو رہی تھیں۔ جا کر سب کے پہلے تو لیمپ کو گل کر دیا۔ بعد ازاں کوٹھری کا قفل توڑا۔ وہ دونوں

غافل سوئی تھیں۔ پھر آپ جانیے اٹھتی جوانی کی نیند۔ قفل توڑ کر حضرت دن سے کوٹھری میں داخل ہوگئے۔ بسم اللہ وہاں ڈبیا نکالی، اور اس میں سے بوٹی لی، اور لے کر خوب زور سے سونگھی۔

حضرات ناظرین! ذرا ہنسی کو ضبط کیجیے گا کچھ سمجھے بھی، وہ بوٹی کیا تھی؟ نکچھکنی ارے! اُف۔ غضب کیا واللہ۔ ہا چھیں آچھیں، چھیں چھیں ادھر حسن آرا خواب پریشاں سے بیدار ہوئیں اور لمپ گل اور کوٹھری سے چھینک کی آوازیں آرہی ہیں۔ حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ چور گھبرا کر کوٹھری سے نکلا۔ تب تو حسن آرا بے چاری کانپنے لگی۔ کہ خدا ہی بچائے، چور کو اس وقت اپنی ہی ناک کی پڑی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو ناک کاٹ کر پھینک دیتا۔ اتنے میں حسن آرا پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئیں، اور غل مچانے لگیں کہ چور چور چور، کانپتی جاتی تھیں اور غل مچاتی تھیں سپہر آرا بھی ہائیں ہائیں خیر تو ہے کہتی ہوئی اٹھ بیٹھیں، اور گھر بھر میں جاگ ہوگئی۔ لینا لینا۔ چور۔ چور۔ چور۔ آپ جانیے ایک ہی اُستاد لپک کر وہ ہو رہا۔ دروازہ کھولا اور تڑک کر پھاٹک کے باہر چوکیدار اور خان صاحب اور دربان سب پیچھے پیچھے جاتے ہیں، مگر اس کے سایہ کو بھی نہیں پاتے، لیکن دس قدم بڑھا اور آچھیں۔ وہ جاتا ہے وہ جاتا ہے۔ چور بے تحاشا بگٹٹ بھاگا جاتا تھا۔ مگر چھینک آئی اور لوگوں نے غل مچایا کہ وہ ہے، وہ ہے، پھر نظر سے غائب۔ تھوڑی دور تک جھپٹ کر نکل گیا اور پھر چھینکا۔ وہ گیا۔ وہ گیا۔ لینا۔ لینا۔ لینا۔ آخر کار ایک مقام پر اس چھینک نے دھر دابا دیا۔ پکڑے گئے حضرت۔ لوگ گرفتار کر کے تھانے پر لیے جاتے تھے کہ اتنے میں کانسٹیبل ملا اور چوکی پر لے چلا۔

چور اپنے دل میں سوچتا جاتا تھا کہ بھئی واہ اچھے شاہ صاحب ہیں۔ ماشاء اللہ کیا بوٹی دی ہے۔ ناک نے اس وقت ناک میں دم کر دیا۔

کہانی زبانی بی مغلانی

شام ے باورچیوں نے بڑے اہتمام بلیغ سے طعام لذیذ پکایا، اور نو بجے کے وقت حسن آرا اور سپہر آرا اور بڑی بیگم صاحب نے بڑے شوق سے نوش جان فرمایا۔ جب کھانے سے فراغت پائی۔ تو حسن آرا اپنے کمرے میں آئی، اور سپہر آرا نے مغلانی کو بلایا۔

سپہر آرا : اچھی دل بہار ایک کہانی نہیں کہتیں اس وقت۔

مغلانی : میں صدقے ایک نہیں دس۔

حسن آرا : مگر شیطان کی آنت نہ ہو کہ سویرے تک تمام ہی ہونے نہ پائے۔
مغلانی : اے نہیں یہ کیا بات۔ یوں تمام ہو یوں (چٹکی بجاکر)
پیاری : (چھوکری) بھوت اول (اور) دیو نہ کہنا کہ میں کانپ جاؤں اچھا۔
سپہر آرا : تم ایسی کہو جس میں بھوت ہی بھوت ہوں۔
پیاری : نہ بیوی کہنے دیجیے، جیسے دیکھو ہمالا (ہمارا) ہی دشمن ہے۔
سپہر آرا : (ہنس کر) تیرا دشمن تیرا پیٹ ہے۔

کہانی زبانی بی مغلانی

سوتا سنسار، جاگتا پاک پروردگار۔

ماما : واہ سوتا سنسار۔ ابھی بجے کئے ہیں، جو سب کو سلائے دیتی ہو۔ اے بہت بجے ہوں دس بجے ہوں۔ اور۔ ۔۔۔۔۔۔۔

مغلانی : تم کہانی کو کاٹ نہ دیا کرو، یہ عیب ہے۔ بوڑھی ہوئے رہیں اور عمر بھر امیروں رئیسوں ہی کے یہاں نوکری کی، مگر مجاز (مزاج) ٹھکانے نہیں۔ بے کے بات کاٹ دی۔

سپہر آرا : بوڑھی ہونے آئی کیا معنی۔ کیا بوڑھی ہونے میں کچھ شک بھی ہے؟

مغلانی : جی یہ ابھی تک اپنے تئیں دس ہی برس کی سمجھتی ہیں۔

ماما : اے ہاں سوتا سنسار۔ کون سوتا کون ہے، یہاں ابھی سارا دھندا پڑا ہے۔ ان کے حساب سب سو گئے۔

کہانی زبانی بی مغلانی

سوتا سنسار، جاگتا پاک پروردگار۔ ہمارا بھی خدا تمہارا بھی خدا کانوں کی دیکھی۔۔۔

پیاری : (ہنس کر) کانوں کی دیکھی۔ کانوں سے دیکھتا ہے کوئی؟

مغلانی : او عذاب ہم نہ کہیں گے بس۔

حسن آرا : نہیں نہیں۔ کہو کہو بچے کے ٹوکنے کا کوئی بُرا مانتا ہے۔

کہانی زبانی بی مغلانی

سوتا سنسار، جاگتا پاک پروردگار، ہمارا بھی خدا تمھارا بھی خدا۔ کانوں کی سنی کہتے ہیں۔ آنکھوں کی دیکھی کہتے نہیں۔

ایک جنگل میدان میں بہت سے جانور پاڑھے، اور صاحب تمھارا بھلا کرے ہاتھی اور چیتے اور شیر اور بندر، اور صاحب تمھارا بھلا کرے لنگور اور بارہ سنگے۔ اور اونٹ اور لوکھری اور جانے کون کون رہتے تھے۔ غرض کہ صاحب تمھارا بھلا کرے۔ بہت سے رہتے تھے۔ ان میں ایک اونٹ بھی تھا اور ایک لوکھری بھی تھی۔ تو اس جنگل میں ایک ندی تھی۔ دو ہاتھی ڈباؤ پانی اور ندی کے اس طرف کو کسی کا باغ تھا، بڑا سا باغ، جیسا مرزا ہمایوں فر کا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا۔ تو اونٹ روز روز اس باغ میں ندی تیر کرکے جاتا تھا، اور پیٹ بھر کے میوے کھا کھا کر کے واپس آتا تھا۔ لوکھری نے جو دیکھا کہ صاحب تمھارے اونٹ موٹا ہوا جاتا ہے تو ٹوہ لگائی کہ دیکھوں کیا کھاتا ہے۔ ایک دن آڑ میں بیٹھی رہی۔ اونٹ ندی میں پیٹھا اور باغ میں جاکر اس نے خوب پھل پھلیری کھائے۔ لوکھری بڑی چالاک اور دغاباز ہوتی ہے۔ جیسے پیاری۔ (پیاری کے سر پر دھپ لگاکر) جیسے یہ موئی لونڈیا دغاباز ہے۔ اس نے اونٹ سے دوستی پیدا کرلی۔ ایک روز اونٹ سے کہا کہ بھائی انٹونا ہم سے دوستی نہیں کرتے اونٹ لمبا تو بیوقوف ہوتا ہی ہے دم میں صاحب تمھارا بھلا کرے آگیا۔ اور دوسرے دن سویرے منھ اندھیرے لوکھری کے ساتھ گھومنے لگا۔ لوکھری اپنے مطلب کا یار اس نے پوچھا کہ تم کس باغ میں جاتے ہو، وہاں ہم کو بھی لے چلو۔ جو جی چاہے تو پھر دوستی کس کام آئے گی۔ کیا عاقبت میں بخشاؤ گے۔ ہم کو بھی دکھلاؤ۔ اونٹ راضی ہوگیا، بولا اچھا جو حکم ہو۔ چلتے چلتے، چلتے چلتے، جب صاحب تمھارا بھلا کرے ندی پاس پہنچے تو اونٹ کی چڈھی پر، لوکھری چڑھ گئی، اور اونٹ تیر کرکے اس پار نکل گیا۔ لوکھری بڑی خوش ہوئی اور اس نے صاحب تمھارا بھلا کرے، خوب پھل ول کھائے۔ جب کھا چکی خوب پیٹ بھر کے تو اس نے ندی پر آکے پانی پیا خوب سا، اور اونٹ سے کہا کہ میرے گلے میں چل ہوئی ہے کہ اس وقت آواز لگاؤں۔ اونٹ کے ہوش اڑ گئے کہ خدا ہی خیر کرے، کہا کہ میں اتنا بڑا جانور جتنی دیر میں تیرے سے دو جانور کھائیں، اتنی دیر میں، ہمارا ایک کونا پیٹ کا بھی نہ بھرے، میں تو ابھی بھوکا

ہی ہوں۔ خبردار، خبردار، بولیو دولیو نہیں۔ سنا کہ نہیں؟ بولی اور میں صاحب تمہارا بھلا کرے پٹا۔ لوکھری نے کہا اب پھر چاہے جو کچھ ہو میں بولتی ہوں۔ اونٹ نے پھر ہاتھ جوڑے کہ ایسا غضب نہ کیجیو۔ دیکھو اونچ نیچ دیکھ کر کام کرنا، نہیں میں پٹوں گا خوب سا۔ لوکھری نے ایک نہ مانی، اور اونٹ سے تھوڑے فاصلے پر جا کر آواز لگائی۔ کیُوں کیُوں کیُوں۔ آواز کے ساتھ سنتے ہی باغبان دوڑ پڑے لیہو۔ لیہو۔ جانے نہ پائے، جانے نہ پائے۔ لوکھری تو ذرا سی ادھر اُدھر جھاڑی میں چھپ رہی، مگر اونٹ اتنا بڑا جانور جائے تو کہاں جائے۔ دھر لیے گئے۔ اب وہ لاکھ چھپتا ہے مگر اونٹوں کی چوری نہوڑے نہوڑے۔ کہاں تک قد کو چھوٹا کرے جھاڑی کی آڑ میں ادا چھپ کے بھاگا اور پھر سیدھا ہوا تو باغبانوں نے غل مچایا کہ وہ نکلا۔ وہ نکلا۔ دوڑ پڑے وہ پھر چھپے مگر انھوں نے گردن دیکھ پائی۔ وہ جات ہے۔ وہ بھاگا جات ہے۔ ناک میں دم آگیا۔ اب بھاگ کے جائے تو کہاں جائے، اور لوکھری مزے سے جھاڑی میں دبکی دبکائی بیٹھی رہی۔ اس کو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کہاں ہے، کہاں نہیں ہے۔ آخر کار دس پانچ آدمیوں نے اونٹ کو گھیر لیا۔ انھوں نے لاکھ شتر غمزے کیے، مگر ڈنڈے پڑنے لگے۔ تب تو یہ خوب سا بلبلائے، مگر ان لوگوں نے مارتے مارتے بولا دیا۔ جب خوب بھر کس نکل گیا تو یہ بھاگے۔ لوگوں نے پھر گھیرا اور پھر لٹھ پڑے نے شرو (شروع) ہوئے بس صاحب تمہارا بھلا کرے یہ خوب سا پٹا، اور پٹ پٹا کے مار کھا کے، رسیاں توڑ اکر بھاگا۔ تھوڑی دیر میں چاہا کہ ندی پار کر کے جنگل میں جائے اتنے میں

پیاری : دیو دیو کی بات نہ ہو۔

سپہر آرا : اب آگے دیو کا تو ذکر ہے ہی۔

پیاری : ہوں نہیں مانتیں۔

مغلانی : نہیں نہیں بٹیا دیو کا ذکر ہے نہ بھوت کا۔ سنتی جاؤ چپ چاپ بس اونٹ جو ندی میں جانے لگا تو لوکھری بھی پھدک کے موجود۔

لوکھری : کیا ہمیں یہیں پر چھوڑ کر چل دوگے۔

اونٹ : نہیں چھوڑیں گے کیا۔ آؤ۔

اونٹ بیٹھ گیا اور لوکھری اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی، اور اونٹ ندی میں چلا۔

سپہر آرا : ارے سچ کہتے ہیں لمبا آدمی بے وقوف ہوتا ہے۔

حسن آرا : کیا اونٹ بھی آدمی۔

مغلانی : بس بیوی جیسے ہی بیچ دھارا میں پہنچا ویسے ہی صاحب تمھارے اونٹ نے کہا کہ دوست اب تو ہمارے بدن میں چُل ہوئی۔ ذری ہلنے کو جی چاہتا ہے۔ لوکھری بولی: ہائیں ہائیں ایسا غضب بھی نہ کر بیٹھنا کہیں میں گر پڑوں گی۔

اونٹ : اب تو بے ہلے رہا ہی نہیں جاتا۔

لوکھری : اور میں۔

اونٹ : اس وقت تمھارے منھ میں چل ہوئی تھی، اب اِس وقت مجھے ہلنے کی چُل ہوئی۔

سپہر آرا : (ہنس کر) ہاں دیکھا بات نکلی نہ ایک۔ ہم سمجھے ہی تھے۔

مغلانی : لوکھری بہت روئی پیٹی چلائی۔ بہت غل غپاڑا مچایا۔ بہت اُچلی کودی پھاندی۔ مگر اونٹ نے ایک نہ مانی جلا ہوا تو تھا ہی۔ اس زور سے بدن کو ہلایا کہ لوکھری تڑسے پانی میں آرہی۔ بہت سنبھلی مگر کچھ کارگر نہ ہوئی بات جیسا کیا ویسا پایا۔ جو جیسا کرے گا وہ ویسا پائے گا۔ نیکی کا ثمرہ نیک ہے، جو بدی دیوے گا وہ بدی پاوے گا۔ بھئی ہے کہ نہیں۔ بس صاحب تمھارا بھلا کرے اونٹ نے پیچھے پھر کے بھی نہیں دیکھا، اور لوکھری بہنے جو لگی تو بہتے بہتے، بہتے بہتے، جا کے کہیں پہنچی۔ جہاں دھوبی کپڑے دھورہے تھے۔ انھوں نے جو دیکھا کہ لوکھری بہی چلی آتی ہے، تو پوچھا کہ لوکھری لوکھری کیا ہوا۔ لوکھری نے کہا کیا بتاؤں کچھ کہا نہیں جاتا۔ پھر دھوبیوں نے پوچھا لوکھری کیوں ڈوبی۔ لوکھری نے کہا کہ ایک میں ہی نہیں ڈوبی ساری دنیا سارا زمانہ ڈوبا ہوا آتا ہے۔ مجھے نکالو تو بتاؤں۔ نہیں تو تم لوگ بھی ڈوب جاؤگے۔

دھوبیوں نے مارے ڈر کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ آؤ پنچایت کرو کہ اس کو نکالیں یا نہ نکالیں۔ لوکھری نے کہا کہ ارے تمھارا ناس ہو جائے جب تک پنچایت کروگے تب تک تو میں کوس بھر دور رہوں گی۔ اس پر دو دھوبی کپڑے وپڑے اتار کر کے صاحب تمھارا بھلا کرے چلے۔ اور لوکھری کو لے آئے۔ پوچھا اب بتاؤ۔ وہ بولی کہ اب ذرا سی سستالوں تو بولوں۔ بھیگ گئی تھی بہت۔ کچھ دیر تک دھوپ میں کھڑی رہی۔ جب گرمائی اور ذری ٹھکاوٹ مٹی، تو چوکڑی بھر کے پاؤ کوس پر ہورہی، اور بولی کہ میں ڈوبی تھی تو میرے حساب جگ ڈوبا تھا۔ جس طرح اس کا بھلا کیا، خدا سب کا بھلا کرے۔ (کہانی ختم ہوئی) اتنے قہقہے پڑے کہ محلے بھر میں آواز پہنچی۔ سوتوں کو جگایا۔ اتنے میں گھڑیالی نے منگری اُٹھائی، اور ٹھائیں ٹھائیں بارہ کا گجر بجایا۔

حسن آرا : ارے!۔

سپہر آرا : ارے کاہے کی۔

حسن آرا : آدھی رات گئی۔

سپہر آرا : اور کیا۔

مغلانی : پھر دس کے عمل میں تو آپ کھانا ہی کھا رہی تھیں۔

حسن آرا : اے تو کیا دو گھنٹے میں کہانی ہوئی۔

سپہر آرا : اور نہیں تو کیا۔

مغلانی : بہت بکی آج۔

حسن آرا : کوئی مسا کر کے گھنٹا بھر کہی ہوگی۔

مغلانی : اب سو رہیے۔

حسن آرا : اور نہیں تو کیا رت جگا ہے کچھ۔

سپہر آرا : اے لو یہ پیاری یہیں کہانی سنتے سنتے سو گئی۔

حسن آرا : اب جگاؤ نہیں گدگدا تو فرش ہے۔ ذری کچھ اڑھا دو اوپر سے۔

الغرض مغلانی گئی۔ حسن آرا اور سپہر آرا ایک ہی پلنگ پر سوئیں اور باتیں ہونے لگیں۔

سپہر آرا : باجی اس وقت عاشق النسا بیگم یاد آتی ہیں۔

راوی : جی۔ آداب۔

حسن آرا : بس اب ان کا ذکر نہ کرو۔ اب سونے کا خیال کرو۔

سپہر آرا : (حسن آرا کو گدگدا کر) اب سوئیے۔

حسن آرا : (مارے گدگدی کے تڑپ کر) اف فوہ کچھ خیر تو ہے۔

سپہر آرا : اب آج سے قسم کھائی۔ دن کو نہ سوئیں گے۔ ہرگز نہ سوئیں گے۔

حسن آرا : سوؤ یا نہ سوؤ، مگر واسطے خدا کے اور تو کسی کی نیند نہ حرام کرو۔ بس اب آپ اپنے پلنگ پر جا کر سو رہیے۔

سپہر آرا کو اس وقت نیند نہ آئی، مگر حسن آرا نے جو تکیے پر سر رکھا تو خواب ناز میں تھی۔ سپہر آرا کے دل میں طرح طرح کے خیالات جاتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی ایک غزل گانے لگا:

منم غریبِ دیار و توئی غریب نواز | دمے بحالِ غریب دیار خود پرواز
بہر کمند کہ خواہی، بگیر و بازم بند | بشرط آنکہ ز کارم نظر نگیری باز
بر آستین خیال تو مید ہم بوسہ | بر آستان وصال تو نیست دست نیاز
نہ ایں زماں من شوریدہ دل نہادم روی | بر آستان تو کاندر ازل نہادم باز
حدیث در دمن اے مدعی نہ امروز ست | کہ حافظ از زِ ازل رِند بود و شاہد باز

اس غزل کو اُس شخص نے کوئی آٹھ دس بار گایا۔ پھیری دیتا جاتا تھا اور غزل گاتا جاتا تھا جس طرح رمضان شریف میں اکثر آدمی شب کو پھرتے ہیں۔ طرزِ غزلخوانی سے ایک قسم کی حسرت ٹپکتی تھی۔ اور جس وقت یہ شعر اس کی زبان سے نکلتا تھا:

بر آستین خیال تو مید ہم بوسہ | بر آستانِ وصال تو نیست دستِ نیاز

تو آواز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کھایا ہوا ہے۔ جس وقت آٹھویں مرتبہ اس نے پانچواں شعر پڑھا، تو مصرع اولی سنتے ہی (ولا منال ز شامی کہ صبح در پے می اوست) سپہر آرا کے منھ سے بے اختیار آمین کا لفظ نکل گیا اس وقت اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی عاشق زار ہے۔ فوراً بیتاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جھروکے سے دیکھنے لگی۔ بھلا اس وقت ایک بجے کیا معلوم ہوتا۔ پھر چپکے سے آن کر لیٹ رہی۔

اس کے بعد اُس نے دو شعر اور پڑھے:—

اے خونبہائے نافۂ چیں خاک راہ تو | خورشید سایہ پرورِ طرفِ کلاہِ تو
نرگس کرشمہ می برد از حد بروں خرام | اے جان فدائے شیوۂ چشم سیاہ تو

(حافظ)

سپہر آرا کو یقین واثق ہو گیا کہ میرزا ہمایوں فر کی طرح کوئی عاشق اور پیدا ہوئے۔ پھر آواز آئی:

یاران ہم نشین ہمہ از من جدا شدند | مائیم و آستانۂ دولت پناہ تو

تب تو سپہر آرا کو شک کی جگہ یقین واثق ہو گیا کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ خیر تھوڑی دیر میں وہ آدمی چلا گیا اور چلتے چلتے یہ شعر پڑھا:

لے یہ غزل، دیوان حافظ کے مستند نسخوں میں نہیں ہے۔ نورانی

جنگ جو کج کلہاں صلح و صفا نیز کنند　　　غنچہ سازند دل و کار صبا نیز کنند

ادھر سپہر آرا کو بھی نیند آئی۔

دو پری پیکر مہمانوں کا آنا اور حسن آرا اور سپہر آرا کو خواب ناز سے جگایا

چار بجے کے وقت دربان نے آواز دی۔

دربان : ماما جی دروازہ کھولو۔ ماما جی پیاری کی اماں (دھم دھم دھم دھم) دروازہ کھولدو۔

ماما : دل بہار دیکھو کون پکارتا ہے؟

دل بہار : اے واہ پھر کھول کیوں نہیں دیتیں۔

ماما : میری اٹھتی ہے جوتی۔ میں دن بھر کی تھکی ماندی ہوں۔

دل بہار : اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے۔

دربان : اجی لڑ لینا پیچھے پہلے کواڑے کھول جاؤ۔

مغلانی : ارے کوئی دروازہ کھول دو اٹھ کے۔

دل بہار : ہونھ کیا حکومتیں جتا رہی ہیں۔

ماما : ہاں جا تو بیوی یہی ہیں۔ گھر کی مالکن۔ آپ نہیں اٹھتیں۔

دربان : اجی کھولو تو سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا : (چونک کر) کہاں سے کیا؟

دربان : جی حضور سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا : ماما۔ مغلانی۔ دل بہار پیاری کی اماں۔ ارے کیا سب کی سب مر گئیں۔ اب آپ جائیں دروازہ کھولتے ہم۔

اتنے میں حسن آرا کی آواز سن کر ماما، اصیل، مغلانی، دل بہار، پٹھانی، سب کی سب ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئیں، اور دروازہ کھولنے لپکیں، اور سپہر آرا بھی جاگ اٹھی۔

سپہر آرا : کون ہے باجی؟

حسن آرا : کیا جانے دستی روشن ہے۔ اور دو تین خاص بردار ساتھ ہیں، اور دو فنس ہیں جانے کون آیا ہے۔

سپہر آرا : فنس پر پردہ پڑا ہے، یا مردانی سواریاں ہیں۔

حسن آرا : نہیں بہن مردانی نہیں ہیں۔

حسن آرا اور سپہر آرا نے باسی ہی پانی سے منھ دھویا، اور ماما نے پردہ کرا کے سواریاں اُتروائیں۔

سپہر آرا : اخاہ روح افزا بہن ہیں، اور بہار النسا بیگم بھی آئی ہیں۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسا بیگم باہم خوب گلے ملیں۔

بہار النسا : بہن اچھی تو رہیں۔

سپہر آرا : دعا کرتے ہیں۔

حسن آرا : دو برس کے بعد آپ دونوں کو دیکھا۔

روح افزا : ہاں اور کیا۔

بہار النسا : اماں جان کہاں ہیں۔

سپہر آرا : آج طبیعت کچھ سست ہے۔

روح افزا : ہاں تو اب سویرے ملیں گے۔ آؤ حسن آرا اور ہم ایک پلنگ پر اور بہار النسا بہن اور سپہر آرا ایک پر سو رہیں۔ اس وقت آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔

حسن آرا بیگم صاحب حسب معمول سویرے منھ اندھیرے اٹھیں۔ سپہر آرا کو جگایا۔ دونوں بہنوں نے منھ ہاتھ دھویا۔ اور وضو کر کے امام باڑے میں نماز صبح ادا کی۔ اس کے بعد حسن آرا بہ لحن داؤدی مناجات نظامی گنجوی پڑھنے لگیں۔ اور ادھر سپہر آرا بیگم نے وظیفہ شروع کر دیا۔

سہانا سماں، در و دیوار نور افشاں، سپیدۂ طلعت نشاں، صبح نمودار، باد صبا طرب انگیز و فرحت بار، اشجار پر بہار، نسیم غالیہ بار سے جھونکے کھاتے ہیں۔ شاخوں پر مرغانِ خوش الحان چہچہاتے ہیں، اور طیورِ ذی شعور ترانۂ حق گاتے ہیں۔ کلیوں کا چٹکنا پھولوں کا مہکنا بلبلوں کا چہکنا قدرت حق دکھاتا تھا، اور غنچۂ دل کھلا جاتا تھا۔ حقانی آدمی یادِ معبود حقیقی میں مصروف و مشغول تھے۔ اشعارِ حمدِ باری وردِ زباں۔ گوشہ نشینانِ خمول تھے۔ گلہائے معنبر کی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی۔ حسن آرا مست ہوئی جاتی تھی۔

جب حسن آرا نے مناجات، اور سپہر آرا نے وظیفے سے فراغت پائی، تو چھوٹی بہن بڑی بہن کے پاس آئی۔ حسن آرا نے بوسہ لیا، اور سپہر آرا نے جواب بوسہ دیا، دونوں بہنیں بڑی بیگم کے پاس آئیں اور بعد ادب آداب بجا لائیں۔

اماں جان بندگی۔

بڑی بیگم : اللہ زندگی دے۔ اچھے گھر جاؤ۔
حسن آرا : اماں جان تسلیمات عرض کرتی ہوں۔
بڑی بیگم : جیتی رہو۔
ماما : دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔
بڑی بیگم : خدا ان کو تندرستی دے۔ میرے تو دل کی چین کلیجے کی ٹھنڈک آنکھوں کی سکھ ہیں۔
ماما : بیگم صاحب ان دونوں کا سبھاؤ اچھا ہے۔ واہ کیا مجاز پایا ہے ہنس مکھ اور آنکھوں میں سیل۔
سپہر آرا : چلیے بس اب تعریفیں رہنے دیجیے، زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔
حسن آرا : اماں جان ہاں دیکھیے خوب یاد آیا۔ رات بہار النسا بہن اور روح افزا بیگم آئی ہیں۔
بڑی بیگم : ہاں شکر ہے، دیکھا! میری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی کل، میں بھی کہوں کہ اللہ کیا خوشخبری سنوں گی۔ کہاں ہیں کہاں، بلاؤ بٹیا، یہ کیا ابھی تک یہاں آنے کی نوبت ہی نہ آئی۔
سپہر آرا : ابھی سو رہی ہیں رات کو کہتی تھیں کہ آنکھیں جھپکی پڑتی ہیں۔ سفر میں نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔
بڑی بیگم : اے تو جگا دو بٹیا۔
حسن آرا : اماں جان ذرا اور سونے دیجیے۔
بڑی بیگم : بہار النسا اچھی تو ہیں۔
سپہر آرا : جی ہاں فضل الٰہی ہے۔
بڑی بیگم : روح افزا سنا تھا کچھ ماندی تھی۔ دبلی ہوگئی ہوگی۔
سپہر آرا : ہاں اماں جان ان کی اس موئے ڈنگو کی بیماری نے بالکل اری پری اڑا دی۔

اتنے میں حسن آرا اور سپہر آرا اپنے کمرے میں گئیں، تو دیکھا کہ دونوں غافل سو رہی ہیں۔ روح افزا کی زلفِ چلیپا کالی ناگن کی طرح بل کھا کے تکیے پر سے پلنگ کے نیچے لہرا رہی ہے۔ اور گوری گوری گردن پر سانپ کے من کا دھوکا ہوتا ہے۔ بہار النسا کا ڈوپٹا کہیں ہے دولائی کہیں ہے۔ دستِ حنائی سینے پر رکھے ہوئے آہستہ آہستہ خراٹے لے رہی ہیں۔ زلف نے پریشاں ہو کر عجیب رنگ دکھایا تھا۔ گورے گورے مکھڑے پر کالے کالے گیسو عجب جوبن دیتے تھے۔ سچ ہے :

چھٹنا مزدور رخ پہ ہے زلف سیاہ کا ۔۔۔ روشن بغیر شام نہ ہو چہرہ ماہ کا

اتنے میں روح افزا نے عجب ناز سے کروٹ بدلی، اور انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔

سپہر آرا : بندگی۔

روح افزا : (آنکھیں ملتی ہوئی)، بندگی بہن۔

سپہر آرا : خوب میٹھی نیند سوئیں۔

روح افزا : اب تک نیند کا خمار باقی ہے۔

سپہر آرا : اماں جان بلاتی ہیں۔

روح افزا : نماز پڑھ لیں تو چلیں۔

حسن آرا : (بہار النسا کا ہاتھ ہلا کر) اے بہن اب اٹھو۔

بہار النسا : (چشم نیم باز) اللہ اتنا دن چڑھ آیا۔ سارے میں دھوپ پھیل گئی۔

حسن آرا : اٹھیے چلیے اماں جان بلا رہی ہیں۔

بہار النسا : (اٹھ کر) نماز پڑھ لیں تو چلیں۔

سپہر آرا : وہ تو جان کھائے جاتی ہیں کہ ہمیں منھ دکھا لیں پھر چلی جائیں۔

بہار النسا : اچھا روح افزا کو جگاؤ۔

سپہر آرا : (ہنس کر) اے وہ کیا بیٹھی ہیں سامنے۔

بہار النسا اور روح افزا نے منھ دھویا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوئیں۔

روح افزا : (سپہر آرا سے) قبلہ کا رخ کس طرف ہے؟

حسن آرا : اُدھر۔

دونوں نے نماز صبح پڑھی اور تھوڑی دیر وظیفہ پڑھ کر، سپہر آرا اور حسن آرا کے ساتھ چلیں۔ بڑی بیگم کے پاس۔ جاتے ہی، روح افزا پھرتی سے بڑی بیگم سے چمٹ گئی (اماں جان بندگی عرض) بہار النسا بھی بڑی بیگم سے گلے ملیں، اور ادب کے ساتھ فرش پر بیٹھیں۔

بڑی بیگم : (روح افزا سے) اب تو اس بیماری نے پیچھا چھوڑا کیا کہتے ہیں، تو یہ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں آتا۔

سپہر آرا : (مسکرا کر) ڈنگو بخار۔ آپ تو روز روز بھول جاتی ہیں۔

بڑی بیگم : ہاں وہی ڈنگو۔

سپہر آرا : (قہقہہ لگا کر) ڈنکو نہیں ڈنگو۔

روح افزا : اب ایک مہینے سے پیچھا چھوڑا ہے کہیں۔ میری تو جان پر بن آئی تھی۔

بڑی بیگم : چہرہ کیسا زرد پڑ گیا ہے۔ اے ہے تو تہی سا منہ نکل آیا۔

بہار النسا : اب تو آپ انھیں اچھی دیکھتی ہیں۔ یہ تو گھل کے کانٹا ہو گئی تھیں۔

بڑی بیگم : حکیم محمد حسین نے علاج کیا تھا نہ وہاں۔

روح افزا : جی نہیں۔ وہ تو خود بے چارے اسی ڈنگو نگوڑے میں مبتلا تھے۔ دولہا بھائی ایک ڈاکٹر کو لائے تھے۔

بڑی بیگم : اے ہے بھولے سے علاج نہ کرنا ڈانگڈر وانگڈر کا۔ ان کی دوا لگے تو تیر نہیں تکا۔

روح افزا : نگوڑے ڈاکٹر کو لائے تھے۔ میں تو اس کی بولی ہی نہ سمجھوں۔ کہے زبان دکھاؤ۔ اب جب منہ دکھائیں تب تو زبان بھی دکھائیں۔ دولہا بھائی نے کہا دکھا دو زبان ہرج کیا ہے۔ ہم نے کہا یہ تو حشر تک نہ ہونے کا۔ پھر نبض دیکھی تو ہاتھ کو پردے سے نکال لیا۔ اور کہا چوڑیاں نکال ڈالو۔ میں نے طلائی چوڑیاں اتار ڈالیں، مگر شیشے کی ایک چوڑی پہنے رہی۔ اب نبض دیکھی تو اور راگ نکالا۔ کہے باتیں کرو ہم سے تب تو میں نے دولہا بھائی کو بلایا۔ اور کہا واہ صاحب آپ تو اچھے ڈاکٹر کو لائے ہیں۔ پہلے کہا منہ دکھاؤ ہم تو ایڑی بھی نہ دکھائیں۔ پھر ہاتھ باہر کھینچ لیا پھر حکم ہوا کہ چوڑیاں اتار دو۔ اب کہتا ہے کہ ہم سے باتیں کرو۔ یہاں نگوڑی گٹ پٹ کسے آتی ہے۔ بس میں درگذری ایسے علاج سے آپ انھیں نکالیے۔ اے بس گھڑی جیب سے نکالی اور کہا کہ گنتی گنو۔ سنیے؟ جیسے اپنے حساب لڑکیوں کے مدرسے میں امتحان لے رہے تھے۔ دولہا بھائی تو آپ جانتی ہی ہیں بالکل انگریزی ہی بن بیٹھے ہیں، وہ مجھ سے کہیں کہ خدا کے لیے بہن میری عزت رکھ لو تم گنتی زور زور گن دو۔ میں نے کہا ایک دو پانچ بیس گیارہ اٹھ اللہ جانتا ہے جو کچھ بھی سمجھا ہو۔ دوائیاں وہ دیں جو کڑوی جیسے گلو۔ نگوڑی سے بھی کڑوی اور جب آئے ایک اشرفی لے جائے۔ جو دولہا بھائی وہاں نہ ہوتے تو ہم اب تک خدا گنج پہنچے ہوتے۔

بڑی بیگم : چلو یہ باتیں نہ منھ سے نکالو۔ اللہ کو بری معلوم ہوتی ہیں۔

حسن آرا : (بہار النسا بیگم سے) کیوں بہن۔ کیا دولہا بھائی کے مزاج میں انگریزیت بہت ہے۔

بہار النسا : (مسکرا کر گردن نیوڑا لی)۔

راوی : روح افزا اپنے بہنوئی، بہار النسا بیگم کے شوہر کو دولہا بھائی کہتی تھیں۔ جب ہی

تو بہار النسا نے شرما کر مسکرا دیا۔ روح افزا اور بہار النسا دونوں بہنیں، اور بڑی بیگم کی نواسیاں تھیں۔

بڑی بیگم : بہار النسا۔ یہ تم مہینوں خط کیوں نہیں بھیجتی ہو، یہاں سے خطوں پر خط جاتے ہیں۔ مگر جواب ہی نہیں آتا۔

بہار النسا : اماں جان! خطوں کا تو میں تار باندھ دوں مگر جب کوئی لکھنے والا بھی ہو۔

روح افزا : یہ تو گرستی کے دھندے میں ایسی پڑ گئیں کہ پڑھا لکھا۔ سیکھا سکھایا، سب چوپٹ کر دیا۔

حسن آرا : اور دولہا بھائی نے تو خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔

سپہر آرا : ہاں ان کو جیسے چڑھ سی معلوم ہوتی ہے۔

روح افزا : دن بھر بیٹھے شعر کہا کرتے ہیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ ذری سا لفافہ لکھنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔

بڑی بیگم : (بہار النسا سے) کہو تمھاری ساس تو اچھی ہیں۔

بہار النسا : ہاں نہ مجھے موت آتی ہے نہ انھیں۔

بڑی بیگم : بڑی کلّہ دراز عورت ہے۔

روح افزا : اٹھتے جوتا، بیٹھتے لات، یہ بات وہ بات لا میرے ہاتھ۔ کل پرسوں تک دولہا بھائی یہاں آئیں گے تو میں ان کو خوب جھاڑوں گی۔

حسن آرا : وہ بے چارے کیا کریں۔ ماں سے کچھ بس چلتا ہے۔

بڑی بیگم : دیکھو سچی بات یہ ہے کہ تمھاری بہن بھی ذرا تیز مزاج ہیں۔ ہاں۔ صاحبزادی بھی ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔

سپہر آرا : جو ایک گرم ہو، اور ایک نرم ہو، تو بات بنے، اور جو دونوں تیز ہوئیں تو کیسے بنے۔

بہار النسا : اب تم اپنی ساس سے نہ لڑنا۔ تم نرم ہی رہنا۔ میرے تو ناک میں دم آگیا۔ اللہ نہ کرے ایسی ساس کسی کو ملے۔

بڑی بیگم : خورشید مرزا یہاں آئیں تو میں اب کی سمجھا دوں۔

بہار النسا : واہ اماں جان مجھ سے آن سے حشر تک نہ بنے گی۔ جو کوئی لونڈی باندی مجھ سے اچھی طرح باتیں کرے تو جل مرتی ہیں، میں جان بوجھ کر اور جلاتی ہوں۔

بڑی بیگم : (پیٹھ ٹھونک کر) شاباش برخوردار۔
حسن آرا : مل جُل کے رہو بہن۔
بہار النسا : اب جب تم سسرال جاؤ گی اور ایسی ہی ساس پاؤ گی اور پھر مل جُل کے رہو گی. تو سات بار سلام کروں گی۔
راوی : واہ کر چکیں سلام۔ وہاں بس ہی نہیں۔ میاں آزاد ان پر عاشق یہ میاں آزاد پر۔
حسن آرا : آخر یہ جھگڑا ہی کا ہے کا۔
بہار النسا : کہہ دوں گی۔
روح افزا : جھگڑا سارا یہ ہے کہ دولہا بھائی ان کی خاطر بہت کرتے ہیں۔ بس ان کی ساس جلی مرتی ہیں کہ جورو کی خاطر کیوں کی اس نے۔
سپہر آرا : کیا ماں کی خاطر نہیں کرتے ہیں۔
روح افزا : ماں کے سامنے مارے ڈر کے ان سے اچھی طرح باتیں تو کی نہیں جاتیں۔ تم خاطر کرنا لیے پھرتی ہو۔
بہار النسا : میں تو اللہ جانتا ہے ہزاروں دفعہ طرح دے جاتی ہوں، مگر جب نہیں رہا جاتا تو میں بھی بکنے لگتی ہوں۔ مجھے تو انھوں نے بے حیا کر دیا۔ بس اب وہ ایک کہتی ہیں، تو میں دس سناتی ہوں۔
بڑی بیگم : (پھر پیٹھ ٹھونک کر) شاباش۔
حسن آرا : میری طرف سے بھی پیٹھ ٹھونک دیجیے گا۔
بہار النسا : اچھا حسن آرا جو کسی تیکھی اور تیز ساس سے پالا پڑا تو دکھا دوں گی۔
حسن آرا : واہ۔
سپہر آرا : ہم تو اس طرح رہیں کہ ساس اپنی لڑکیوں سے زیادہ پیار کرے۔
بہار النسا : جب آدمی ہو نہ۔
سپہر آرا : بہن ہم تو چٹکیوں میں آدمی بنا لیں۔
بہار النسا : ابھی ناتجربہ کار ہو نہ۔ ہم کو تو ایسا دق کر رکھا ہے کہ اللہ کرے مر جائے وہ یا ہم۔
بڑی بیگم : پھر وہی باتیں کرنے لگیں۔
روح افزا : اے ہاں یہ کیا گھڑی گھڑی بدشگونی نکالتی ہو منھ سے۔ وہ مریں چاہے چولھے میں پڑیں۔ تم اپنے تئیں تو نہ کوسو۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسا، بڑی بیگم کے پاس سے اٹھ کر کمرے میں گئیں، اور چاروں وہاں جاکر نکھرنے لگیں۔ بس اب تو قیامت کا سامنا ہے۔ چاروں نوخیز اور چاروں تیز، چاروں شوخ، اور متین، چاروں عفیفہ اور حسین، دو اِدھر نکھار کر رہی ہیں، دو اُدھر سنگار کر رہی ہیں:

خدا جانے یہ آرایش کرے گی قتل کس کس کو　　طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

سبحان اللہ کیا شعر ہے ہزار بار لکھیں، مگر پھر بھی جی چاہے کہ لکھتے ہی جائیں۔ حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا تو بن ٹھن کے موجود ہو گئیں، مگر بہار النسا بیگم کے ابھی گیسو ہی سنورتے ہیں۔ آئینہ رو برو ہے۔ صورت پسند نہیں آتی۔ مانگ ٹیڑھی ہو گئی۔ موباف کا جوبن ہی نہیں ظاہر ہوتا۔ چھپکا بے موقع ہے۔ یا الٰہی۔

روح افزا: انھیں جب دیکھو ناک چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں۔

بہار النسا: تم آئے دن یہی طعنے دیا کرتی ہو۔

حسن آرا: اب آخر بہن کب تک سنگار ہوگا۔

روح افزا: ایسی تو صورت بھی نہیں اللہ نے بنائی ہے۔

راوی: جی بجا ہے۔

بہار النسا: چلیے آپ تو بڑی قبول صورت ہیں نہ۔ ہمارے تلوے کو بھی نہیں پہنچتیں۔

راوی: اُف رے غرور، اللہ رے دعویٰ حسن۔ چاروں طناز۔ چاروں کے چار انداز۔ ایک آئینہ سیمائی۔ دوسری خود رائی۔ تیسری شوخ چشم، چوتھی افشاں جبیں حیا و شرم۔ حسن آرا کا آبی، سپہر آرا کا گلابی، روح افزا کا آسمانی، اور بہار النسا کا زعفرانی ڈوپٹا، نیرنگی قدرتِ حق کا تماشا دکھاتا تھا:

جو لطف حسینوں کی دورنگی کا امانت　　دو چار گلابی ہوں تو دو چار بسنتی

گو بہار النسا سب سے زیادہ بنی ٹھنی تھی، مگر حسن آرا کی خوبصورتی اس سادگی میں بھی چوگنی تھی۔

بہار النسا نے کوئی دو گھنٹے میں چوٹی کنگھی سے فراغت پائی مگر اس وقت واقع میں بھلی معلوم ہوتی تھیں اور، ع۔ دیکھ آئینے میں کہتی تھیں کہ اللہ ری میں، روح افزا گوڈنگو کی بدولت دبلی ہو گئیں تھیں، اور چہرے میں وہ سرخی اور رعنائی بھی نہ تھی۔ مگر پھر کم سن تھیں۔

حسین تھیں۔ سپہر آرا کی شوخی اور کج ادائی، سب سے فوق لے گئی۔ مگر حسن آرا کے بھولے پن اور اسی کے ساتھ بانکی ادا نے اس کے جوبن کو دوبالا کر دیا تھا۔ چاروں نکھر کر اس وسیع و فراخ، پر بہار و ہوادار کمرے میں فرشِ مکلّف پر جھروکے پاس بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔ سپہر آرا ڈلی کترتی تھیں۔ حسن آرا نزاکت کے ساتھ گلوریاں بناتی تھیں۔ روح افزا ایک ترکی جنرل کی تصویر کو جو دیوار میں لگی ہوئی تھی غور سے دیکھتی تھی۔ مگر بہار النسا بیگم کی نظر آئینہ ہی پر تھی۔ ہائے ستم۔

سپہر آرا : اے توبہ تو اب آئینہ دیکھ چکیں۔ یا گھنٹوں صورت ہی دیکھا کیجیے گا۔

حسن آرا : یہ شوق خود آرائی۔

بہار النسا : تم کہتی جاؤ۔ ہم جواب ہی نہ دیں گے۔

سپہر آرا : پھر دیکھا۔

روح افزا : کون اللہ جانتا ہے انھیں مرض ہے۔ یہ بھی تو ایک عارضہ ہے۔

بہار النسا : واہ خواہی نخواہی عارضہ ہے۔

سپہر آرا : ہئی۔

بہار النسا : تم سب بہنیں ایک ہو گئیں اس وقت۔ بکتی جاؤ، اپنی ہی زبان تھکاؤ گی۔

حسن آرا : روح افزا بہن تم اُٹھ کر آئینہ پر کپڑا گرا دو۔

روح افزا : دلّی والیاں کہتی ہیں (گیر دو)

حسن آرا : ہاں بتاؤ تو یہ بات کیا ہے۔ ساس سے بنتی کیوں نہیں تم سے۔

بہار النسا : تم نے بھی کس کا نام لیا۔

سپہر آرا : اللہ۔ اتنی بیزار ہو گئیں۔

بہار النسا : ایسی ساس کو تو بس چپکے سے زہر دیدے۔ کچھ کم ستر کی ہونے آئی۔ ابھی تک خاصی ٹانٹی کٹھو تا سی بنی ہے۔ میرا تو ہاتھ پکڑے تو چھڑانا مشکل ہو جائے۔ موئی دیونی ہے۔

روح افزا : کچھ کی کچھ ہی ہے۔

حسن آرا : (ہنس کر) یہ بھی عیب ہے۔ کوس کوس کے کھا جاؤ نہ۔

بہار النسا : تمھیں کہاں کی ایسی محبت پھٹ پڑی ہے ان کی۔

حسن آرا : بہن مل جل کے رہنا اچھا۔

بہار النسا : ایک دن کا ذکر سنو۔ کسی کے ہاں سے مہری آئی، کچھ میوہ لائی تھی۔ وہ اس وقت

جھوٹے موٹے قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ مہری نے آکر مجھ کو سلام کیا، اور میوے کی تشتری سامنے رکھ دی۔ بس دن بھر مُنھ پھلائے رہیں۔

حسن آرا : ہے تو بڑی بد عورت۔

روح افزا : مگر دیکھنے میں میٹھی۔

سپہر آرا : باتیں بھی چکنی چُپڑی کرتی ہیں۔

بہار النسا : او سنو، ابھی سنو تو، سنتی جاؤ۔ ایک روز ان کو کسی نے دو چکوترے دیے۔ انھوں نے اپنی ماں کو دے دیے۔ انھوں نے کہا لو میں نہ کھاؤں گی۔ خیر آئی گئی بات ہوگئی۔ انھوں نے ایک چکوترا مجھ کو بھیجا، اور ایک میری نند کو۔ وہ ان سے بڑھ کر بس کی گانٹھ۔ بس جل مری اور جاکے ماں سے جڑ دیا کہ بھائی نے ہم کو آدھا سڑا ہوا چکوترا دیا، اور بھابھی کو بڑا سا چکوترا بھیجا۔ اس جھوٹ کو تو دیکھو۔ انھوں نے صبح سے شام تک چرخا کاتنا شروع کیا۔ یا میرے اللہ لگانے بجھانے میں تو وہ برق ہے۔

حسن آرا : میں ایک بات پوچھوں؟

بہار النسا : پوچھو۔

حسن آرا : سچ سچ کہنا۔

بہار النسا : اے ہے تم تو نکاح کی سی شرطیں کرتی ہو، پوچھتی و وچھتی کچھ بھی نہیں ہو۔

حسن آرا : دولہا بھائی تو پیار کرتے ہیں۔

بہار النسا : یہی تو خیر ہے۔

حسن آرا : دل سے۔

بہار النسا : دل اور جان سے۔

حسن آرا : بھلا ماں سے بنتی ہے۔

بہار النسا : وہ خود جانتے ہیں کہ چڑ چڑی، بد مزاج، لڑاکا عورت ہے۔

حسن آرا : بہن وہ تو بری ہیں ہی۔ مگر تم بھی تیزی کے سبب سے ان کو اور بھی جلاتی ہو۔ جو مل کے چلو تو وہ تمھارا پانی بھرنے لگیں۔

بہار النسا : اچھا تم ہی بتاؤ کیا مل کے چلوں۔

حسن آرا : سنو روح افزا بہن سب کو سب ملی کر انصاف کرو۔ ہم ان کو یہ صلاح دیتے

ہیں کہ اب کی جب جائیں تو ان کو ادب کے ساتھ جیسا بہو بیٹیوں کا دستور ہے، جھک کے سلام کریں۔

روح افزا : کن کو۔ کن کو؟

حسن آرا : ساس کو اپنی اور کس کو۔ دیواروں کو۔

روح افزا : واہ۔

حسن آرا : واہ کاہے کی۔

سپہر آرا : اے سنتی جاتی ہو کہ یہ آن کی جان کی دشمن، وہ نصیبِ اعدا ان کے خون کی پیاسی بات چیت تک تو ہوتی نہیں اور جو ہوئی بھی، تو وہی طعنہ بازیاں۔

حسن آرا : واہ، اب تک جو ہوا سو ہوا، اب یہ سلام ضرور کریں۔ مگر جھک کے۔

بہار النسا : مر جاؤں مگر سلام نہ کروں مردار کو۔

حسن آرا : بس یہی تو بری بات ہے۔

بہار النسا : رہنے دیجیے بس۔ واہ وہ تو ہم کو دیکھ کے جل مریں، ہمارے ماں باپ کو پانی پی پی کے کوسیں۔ ہماری بہنوں کو برا بھلا کہیں، اور ہم ان کو جھک کے سلام کریں۔ ایک دن ماما کو خوب للکارا کہ ہمارا پاندان اوپر اس کو کیوں دے آئی۔ میرے منھ سے بس اتنی سی بات نکل گئی کہ یہ میری ساس کاہے کو ہیں یہ تو میری سوت ہیں۔ بس اس پر دو دن تک کوساکیں۔ لڑکے کو بلا کے اتنا سخت وسست کہا کہ تو یہ ہی بھلی۔ میں تو بس دھک سے رہ گئی۔

راوی : واہ بی بہار النسا بیگم صاحب۔ کیا خوب بات حضور نے فرمائی ہے۔ آپ کی ساس واقع میں بڑی کلّہ دراز ہیں۔ ایک دن چپکے سے گلا گھونٹ ڈالیے روز روز کا جھگڑا مٹے۔ یہ جھنجھٹ تو جائے کہیں۔ کس مزے سے فرماتی ہیں کہ بس میرے منھ سے اتنی سی بات نکل گئی کہ یہ میری ساس کاہے کو ہیں۔ یہ تو خاصی سوت ہیں۔ ارے توبہ۔ توبہ۔ خدائی بھر میں کوئی عورت بھی اپنی بہو کا ایسا سخت اور جگر خراش فقرہ سن کر چپ ہو رہے گی۔ اور تس پر اپنے نزدیک بیگم صاحب نے کچھ بھی نہیں کہا۔ فرماتی ہیں کہ (بس اتنی سی بات میرے منھ سے نکلی)، سبحان اللہ ان کے نزدیک یہ اتنی ہی سی بات تھی۔ ساس کو سوت بنایا، اور اس کو (اتنی ہی سی) بات فرماتی ہیں۔ جب لڑکوری ہوں گی۔ اور ساس بنیں گی اور بہو ان کو سوت بنائے گی، تب دیکھیے گا کیسا کودلی اچھلتی ہیں۔

حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا نے جو یہ سنا تو دنگ ہو گئیں۔

حسن آرا : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر خاموش)۔

سپہر آرا : (چہرے سے حیرت برستی تھی)۔

روح افزا : (اُداس مارے غصّے کے چہرہ لال ہوگیا۔)۔

اس کیفیت کے بعد ان سب کو ہنسی آئی اور تینوں کھِل کھلا کر ہنسنے لگیں، تو کوئی آدھ گھنٹے تک ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔

حسن آرا : اُف بڑی بُری بات کہی۔

روح افزا : بُری سی بُری۔

سپہر آرا : اب بن چکی بس۔

بہار النسا : تم سب کو ہماری ساس نے کچھ رخصت۔ وہ تو یہ رشوت ضرور دی ہے۔ جب کہتی ہوا تھیں کی سی۔

روح افزا : تمھاری سی کیا کہیں بھلا۔

سپہر آرا : ہماری بہن اور ایسی منھ پھٹ۔ ساس کو سوت بنائیں۔

حسن آرا : اور پھر شرمائیں نہ شرمانے دیں۔

بہار النسا : اب بتایئے تو۔ ہاں پہلے جھک کے سلام کروں، خوب زمیں دوز ہو کے، اور پھر۔

حسن آرا : اے ہے میرے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ تم سے یہ کہا کیوں کر گیا۔

بہار النسا : بتاؤ۔ بتاؤ۔ ہماری قسم سچ بتاؤ۔

حسن آرا : تم ہنسو گی اور ہمیں ہوگا رنج۔

بہار النسا : نہیں ہنسیں گے نہیں بولو۔

حسن آرا : جا کے سلام کرو۔

بہار النسا : اور جو وہ جواب نہ دیں تو اپنا سا مُنھ لے کے رہ جاؤں۔

سپہر آرا : واہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جواب دیں اور پھر دیں۔

روح افزا : اور وہ نہ بھی دیں تو پھر بڑی ہیں۔

حسن آرا : نہ جواب دیں تو قدموں پر گر پڑو۔

بہار النسا : میری بیزار گرتی ہیں قدموں پر۔

حسن آرا : چلیے اب کوئی اور ذکر چھیڑیے۔

روح افزا : وہ بھی کچھ ان سے کم نہیں ہیں۔ وہ تنگ مزاج، یہ تیز مزاج۔

بہار النسا : وہ جیسا میرے ساتھ کرتی ہیں ویسا اُن کے آنکھوں گھٹنوں کے آگے آئے۔

حسن آرا : خرچ تو اُجلا ہے۔ مگر کنجوس ہیں۔

بہار النسا : تین سو وثیقے کے ہیں اور ڈھائی سو گاؤں سے آتے ہیں وہ تو خود لیتی ہیں، اور نقد کوئی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہی زیادہ ہوگا۔ اور جواہرات، مکان، باغ دکانیں، یہ الگ اور چچا کے حصّہ میں سے دو سو تمھارے بہنوئی مہینے کے پاتے ہیں اور وکالت میں کوئی چھ سات سو روپیہ مہینا ملتا ہے۔

روح افزا : مگر خرچنے میں آندھی ہیں۔

بہار النسا : بگھیاں فٹن گھوڑے سب ہی کچھ ہے۔ آدمی نوکر چاکر بہت ہیں۔

حسن آرا : تم کو کیا دیتے ہیں۔

بہار النسا : اس مردار کھپٹ بڑھیا سے چُرا کر میرے اوپر کے خرچ کے لیے سو روپیہ مقرر ہے۔ اس میں کپڑے، کھانے، عطر پان، ڈلی سے واسطہ نہیں۔ وہ سب انھیں کے خرچ میں ہوتا ہے۔

سپہر آرا : روح افزا بہن۔ تمھارے میاں کی بھی تو اب ترقی ہوئی ہے۔

روح افزا : ہاں۔

حسن آرا : اب کیا تنخواہ پاتے ہیں۔

روح افزا : اب اول درجے کے منصف ہوئے۔ چار سو کے۔

حسن آرا : کچھ زمین بھی تو ہے پاس۔

روح افزا : کوئی نو سو کی سالانہ آمدنی ہے۔

حسن آرا : اور ان کے بڑے بھائی کہاں نوکر ہیں۔

روح افزا : وہ نیل کی سوداگری کرتے ہیں۔ ان کی بڑی آمدنی ہے۔ کوئی سترہ اٹھارہ سو ماہواری، خرچ کے بعد بچ رہتے ہیں۔

حسن آرا : تمھاری ساس خوب ہیں۔

سپہر آرا : لڑیں نہ جھگڑیں بیچاری۔

روح افزا : مگر اُن کی صاحبزادی تو بس۔ کچھ نہ پوچھو اس نے میری ناک میں دم کر دیا جب آتی ہے روز ماں کو بھرا کرتی ہے۔

سپہر آرا : جو بہار النسا بہن وہاں ہوتیں تو ان ساس سے بھی نہ بنتی۔

بہار النسا : ہاں۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں آپ۔ ہونھ۔

میرزا ہمایوں فر اور اصنام رشکِ قمر

اتنے میں بہار النسا نے کہا کہ اس وقت کالی کالی گھٹا چھائی ہے۔ جی چاہتا ہے، مہتابی پر سے دریا کی موج زنی دیکھیں۔ روح افزا بھی جھپ سے راضی ہو گئی۔ سپہر آرا بھی خوش خوش اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ہاں ہاں چلیے چلیے، مگر حسن آرا کو یاد آ گیا کہ میرزا ہمایوں فر ضرور خبر پائیں گے اور ضرور کوٹھے پر آئیں گے۔ اور ضرور ستائیں گے۔ لیکن مجبور تھی چار دل پھرتی کے ساتھ زینے پر چڑھنے لگیں، ہائے اس وقت کی شوخی بس غضب تھی۔ سپہر آرا کہتی ہیں کہ سب کے پہلے میں ہی مہتابی پر پہنچوں۔ بہار النسا کی نزاکت، اور تیزی اور ہی جوبن دکھاتی ہے۔ روح افزا ہنس ہنس کر سپہر آرا کے شانے سے شانہ لڑاتی ہے۔ مگر حسن آرا پھر آپ جانیے نستعلیق۔ ناز و انداز سے خراماں خراماں، زینوں پر قدم رکھتی ہیں۔ چاروں غارت گر دین و ایمان، مہتابی پر داخل ہوئیں۔ اللہ اللہ آج سویرے سویرے چار چار نظر آئے مکھڑوں کی وہ چمک دمک کہ پائے نگاہ تک پھسل جائے۔ ہرن کی طرح وہ آہو چشم چوکڑیاں بھرنے لگیں۔ ہوا اس زور سے چلتی تھی کہ دوپٹہ کھسکا جاتا تھا۔ گورا گورا بدن صاف نظر آتا تھا۔ کسی ہمراز نے میرزا ہمایوں فر سے جا کر کہہ دیا کہ پیر و مرشد! اس وقت تو سامنے والا کوٹھا پرستان ہے۔ اندر کا اکھاڑا ہوا رہا ہے۔ ایک غنچہ کھلا ہوا ہے۔ سامنے ان کو تاب کہاں۔ تڑ سے کوٹھے پر آئے تو:

> ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

سپہر آرا جھپٹ کے کمرے ہیں ہو رہی۔ روح افزا تڑ سے وہیں بیٹھ گئی۔ حسن آرا نے ذقن بھری تو را دی میں، مگر بہار النسا بیگم نے بیڈھب آنکھیں لڑائیں۔ میرزا ہمایوں فر نے بہت جھک کر دور ہی سے آداب عرض کیا۔

بہار النسا : آنکھیں ہی پھوٹیں جو ادھر دیکھے۔

ہمایوں فر : ہاتھ کے اشارے سے (اپنا گلا اپنے آپ کاٹ ڈالوں گا)

بہار النسا : بسم اللہ۔

اتنے میں ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں، اور چاروں پری پیکر بانکپن کے ساتھ نیچے چل دیں۔ میرزا ہمایوں فر منھ تاکتے رہ گئے۔

حسن آرا : (بہار النسا سے) آپ تو خوب ڈٹ کے کھڑی ہو گئیں۔

بہار النسا : کیوں کیا کوئی گھول کے پی جائے گا۔

روح افزا : یہ شہزادے ہیں ہمایوں فر۔

سپہر آرا : تم کیوں کر جانتی ہو بہن۔

روح افزا : اے واہ اور سنیئے گا۔ جانو ہم یہاں کبھی آئے ہی نہیں۔ یہ بہت دن تک کلکتہ میں رہے۔ لڑکپن میں ہم کھیلا کیے ہیں ان کے ساتھ۔

بہار النسا : اے بہن چپتیں لگایا کیے ہیں ان کو۔ لڑکپن میں بڑے خیصورت (خوبصورت) تھے۔

روح افزا : اور کیا اب نہیں ہیں۔

بہار النسا : دور سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہے ہے ان کی ماں اور دادی سے جھوٹم جھوٹا ہوا کرتا تھا۔ ساس بہوؤں میں پل بھر تو بنتی نہیں تھی۔ جب دیکھو کھٹ پٹ۔

روح افزا : تم تو خوش ہوتی ہوگی۔

سپہر آرا : آئیے شطرنج کھیلیں۔

بہار النسا : یہاں آنتیں قُل ہُو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ تم شطرنج کے منصوبے میں ہو۔ اتنے میں بڑی بیگم نے پانچ سیب، ایک انار، کچھ انگور اور چلغوزے بھیجے۔

ماما : لیجیے یہ میوہ بڑی بیگم صاحب نے دیا ہے۔

سپہر آرا : دیکھوں۔ یہ چلغوزے تو لیتی جاؤ۔

پیاری : ہم کو دیجیے۔

سپہر آرا : ان کو دیجیے۔ پیر نہ شہید۔ نکٹوں کو چھایا۔ سب کے پہلے ان کو دیجیے آپ کون ہیں۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں۔

حسن آرا : (چلغوزے اٹھا کر) اچھا پہلے پہلے سلام کر کے۔

پیاری : سلام۔ اب لائیے۔

چاروں بہنوں نے میوہ مزے مزے چکھا چہل ہوتی جاتی تھی، ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین چھین کے کھاتی تھی قہقہے پڑتے تھے۔ شانے سے شانے لڑتے تھے۔ جوانی کی امنگ شباب کی ترنگ۔

اب سُنیے کہ میرزا ہمایوں فر ٹکٹکی باندھے کھڑے تاک رہے ہیں :

نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

جب بڑی دیر تک مہتابی کو سونا پایا تو بے چارہ یہ شعر زبان پر لایا :

گل بد آموز نے کیا تم کو سکھایا ہے کہ ہائے آج وہ آنکھ، وہ چشمک وہ اشارہ ہی نہیں

شہزادہ بلند اختر، میرزا ہمایوں فر نے جب ان غیرتِ بعتانِ چینی سرِ لوح بیاض نازنینی، کو نظر سے اوجھل پایا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا۔ دم گھبرایا۔ بہار النسا کا آنکھیں لڑانا یاد آیا۔ حسن آرا کی تیزی اور شوخی کے خیال نے تڑپایا۔ جگر میں خارِ غم ہجر کی خلش، سینہ میں نائرہ رنج جدائی کی طپش۔ دل میں دھڑکا، جی میں کھٹکا۔ گل سا چہرۂ خنداں مرجھا گیا۔ غنچۂ دل کمھلا گیا :

دل سے شعلے اٹھتے ہیں جس وقت آجاتا ہے یاد وہ بھبوکا سا بدن نوخیز گدرایا ہوا

حیرت تھی کہ اس شوخ بیباک نے آنکھ کیوں ملائی۔ اور ملائی تو پھر اس قدر کیوں شرمائی، پھر سوچے کہ شاید دھوکا ہوا ہو۔ کسی اور سے دل ملایا ہو۔ ہے ہے کسی اور طرف چشمک زنی تھی، مگر یہاں تیر نگاہ ایسا کاری پڑا کہ کیفیت جان کنی تھی :

ہم سے لڑی نگاہ تو چشمک ادھر اُدھر پیدا یہ چشم شوخ نے کیا بانکپن کیا

الٰہی یہ کس خوش نصیب سے اشارے بازی کرتی تھی۔ کس خوبرد کے عشق کا دم بھرتی تھی۔

زلفوں سے کافری کا پریشاں کیا دماغ آنکھیں دکھا کے نشۂ آہو ہرن کیا

بی حسن آرا بیگم کی لفاظی اور جادو طرازی

اب ادھر کا ذکر سنیے۔ آج وہاں اور چرچے ہیں۔

بھئی بیوی خدا دے تو حسن آرا کی سی۔ یوں تو ہندوستان میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین وحیا پرور نازنین و پاک نظر ہے۔ لیکن حسن آرا کی ادا ہی اور ہے :

شاہد آں نیست کہ موے ومیانی دارد بندۂ طلعتِ آنیم کہ آنے دارد

یہ دہنِ شیریں۔ یہ حسنِ شرمگیں۔ یہ لبِ لعلِ شکر خا۔ یہ ناز و ادا۔ یہ معشوق پن یہ پھبن۔ دید کی آنکھ نے دیکھا ہو تو دکھائیے، اور شنید کے کانوں نے سُنا ہو تو بتائیے۔ فرد ہے۔ لاجواب ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں انتخاب ہے :

وہ غمزہ اُس چشمِ سُرمگیں کا کہ خون ہو دل غزالِ چین کا
وہ جلوہ افشاں جبینِ کا کہ ماند ہو چاند چودھویں کا
نزاکت اُس سیمبر کی پنہاں رہے جو منظورِ چشمِ حیراں
سفیدی چشمِ منتظر یاں بنی ہے گلبرگ یاسمیں کا
اگر وہ ملبوس میں زری کے دکھائے اندازِ دلبری کے
تو اڑ چلے بھیس میں پری کے کرشمہ اس شوخ نازنین کا

اور اس حسن خداداد پر وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا اور بھی ستم تھا۔ خیالاتِ فاخرہ ایسے کہ ان کی رزانت کی قسم کھائے۔ فکرِ عمیق ایسی کہ اس کی متانت کے صدقہ ہو جائے:

چوں مرغانِ چمن رنگین ادائے نازک آوازی
سراپا عشوۂ عالم فریبے شوخ طنازی
بلیغے خوش کلامی دور اندیشی خوش اندامی
فصیحی نکتہ پردازی زسرتا پا ہمہ نازی
چو گل بند قبا بازی چو شبنم پاک دامانی

ایک دن حسن آرا کو وہ بات سوجھی جو آج تک کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ سوچی کہ آؤ آب کی ایک لکچر دوں اور ہاتھوں ہاتھ قدر دانوں سے دادِ سخن لوں۔

حسن آرا : آؤ ایک لکچر دیں۔

بہار النسا : کیا۔ کیا دیں۔

سپہر آرا : انگریزی زبان کی ٹانگ توڑی ہے۔

روح افزا : لکچر کیا شے ہے۔

حسن آرا : دولہا بھائی جلسۂ تہذیب میں جاکے آئے دن کیا پڑھا کرتے ہیں۔

روح افزا : ہاں ان سے (بہار النسا کی طرف اشارہ کرکے) ان سے پوچھو۔

بہار النسا : اوئی ہم کیا تمھارے دولہا بھائی کے ساتھ ساتھ گھوما کرتے ہیں۔ جانے کہاں جاتے ہیں۔ کیا پڑھ پڑھ کے سناتے ہیں۔ اتنا ہم کو معلوم ہے کہ شعر بہت کہتے ہیں۔ ایک دن ہم سے کہنے لگے کہ چلو تم کو رمنے کی سیر کرا لائیں۔ فٹن پر بیٹھ لو۔ ٹپ گرا دیں گے۔ رات کا وقت ہے۔ تم دوشالے سے خوب منھ اور جسم کو ترا لینا۔ چلو ہوا کھلا لائیں۔ میں نے

کانوں پر ہاتھ دھرے کہ نہ صاحب! بندی ایسی سیر سے درگذری۔ دمنے میں وہاں صاحب لوگ ہوں گے اور نہ جانے کون کون ہو ہم نہ جانے کے۔

حسن آرا : واہ وجہ۔ نہ جانے کی وجہ؟

سپہر آرا : اب کی آئیں تو ان کے ساتھ ہم ضرور جائیں۔

بہار النسا : چلو بیٹھو۔ چھوٹی تو عمر لڑکیاں بہنوئیوں کے ساتھ یوں نہیں جایا کرتی ہیں۔

سپہر آرا : (تنک کر) کیا فرمایا۔ ذری پھر تو کہیے گا؟

روح افزا : کہتی ہیں تو عمر سالیاں جوان بہنوئیوں کے ساتھ یوں نہیں جایا کرتی ہیں۔

سپہر آرا : جی ہاں میں نے سُنا سُنا۔ بہری نہیں ہوں۔ اچھی صورت اللہ نے نہیں دی مگر کان بڑے بڑے بنائے ہیں۔

راوی : ایں! کیوں صاحب یہ ناشکری:

تجھ کو اے بت جو سرا انجمن آرائی ہو کافرستاں ہر اک چشم تماشائی ہو

جس نے ایک نظر بھر کر بھی دیکھ لیا اس کو بس یہی شوق ہوتا ہے کہ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا ہی کرے:

برق تجلی کہ زتابش گداخت طور از پرتو جمال تو بر کوہ جستہ است

روح افزا : ایک کام کرو۔ دس پانچ لڑکیاں اور بھی تو ہوں کہ ہم ہی ہم ٹڑوں ٹوں۔

حسن آرا : اچھا ٹھہریے بلواتے ہیں۔

سپہر آرا : شیخ جی کے ہاں ماما کو بھیج دو، اور تقی خان کے گھر پر دل بہار کو بھیجو، اور کہو کہ دونوں صاحبزادیوں کو اسی وقت بلایا ہے۔ ہماری بہنیں باہر سے آئی ہیں، اور ماما سے کہہ دو کہ پلٹتے ہوئے مبارک علی خاں بھائی کے ہاں جا کے لاڈو خانم کو ساتھ ہی لے آئے۔ پالکی ان کے ہاں ہے ہی۔ اور ہم نظیر کو بلوائے لیتے ہیں۔

حسن آرا : اے نظیر کو نہ بلواؤ۔ ان کے ساتھ جانی بیگم بھی آئیں گی۔ وہ بات بات میں شاخ نکالتی ہیں۔ انھیں خبط ہے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی حسین ہی نہیں ہے۔ شکل چڑیلوں کی، ناز پریوں کا۔ دن رات ناگ چوٹی میں گرفتار رہتی ہیں۔

سپہر آرا : پھر اچھا تو ہے۔ بہار النسا بہن سے بھڑوا دینا۔

روح افزا : پھر اب جھٹ پٹ بلواؤ۔

ماماجی اور دربان، اور خان صاحب، اور دل بہار، ان چاروں کو حکم ہوا کہ جاؤ، وہ ادب کے ساتھ حکم بجالائے۔ تھوڑی دیر میں ڈولیوں پر ڈولیاں، اور فنسوں پر فنسیں، اور بگھیوں پر بگھیاں آنے لگیں۔ حسن آرا اور سپہر آرا کا وسیع عالیشان، فراخ و فلک تو امان، کمرا ہمیشہ سجا سجایا رہتا تھا۔ آج انھوں نے اس قدر تکلف کیا کہ بیش بہا غالیچے اِدھر اُدھر بچھا دیے۔ کمرے کی رونق دو بالا ہوئی۔ دربان بار بار آواز دیتا تھا، کہ سواریاں آئی ہیں۔ اصیلیں مغلانیاں باہر سے جا جا کر سواریوں پر سے اُتروا تی تھیں، اور وہ ناز و انداز کے ساتھ چمک چمک کر اندر آتی تھیں۔ سلام بندگی کے بعد بغل گیر ہوتی جاتی تھیں۔ جب سب آچکیں تو دربان نے پھر آواز دی کہ ماماجی پردہ کرا لیجیے۔ زنانی سواریاں آئی ہیں۔ سب کے بعد پالکی گاڑی پر سے دو نوجوان اتریں۔ ایک کا کوئی بیس برس کا سن دوسرے کے الھڑپنے کے دن۔ ایک شوخ طرار دوسری بھولی اور ناکردہ کار۔ اندر گئیں۔ سپہر آرا اور حسن آرا اور بہار النسا اور روح افزا سے گلے ملیں۔ اور سب کی سب بیٹھیں۔ شوخ و طرار کا نام جانی بیگم تھا بھولی اور ناکردہ کار کا نام نظیر بیگم تھا۔ جانی بیگم چٹاخ پٹاخ، بوٹی بوٹی سیماب کی طرح بے قرار، باغ و بہار نظیر بیگم کو کوئی تیرھواں سال تھا۔ چہرے مہرے نک سک سے ایسی درست کہ لاکھوں میں ایک۔ خوش وضع، خوش قطع۔ پارسا اور نیک، مگر نگاہ اشارت آشنا نہیں۔ انکھڑیوں میں لگاوٹ بازی کا پتا نہیں:

اپنے جوبن سے نہیں یار خبردار ہنوز ناز و انداز سے واقف نہیں زنہار ہنوز
کس طرح اس سے وفا شرطِ وفاداری ہو جو سمجھتا ہی نہیں آپ کو دلدار ہنوز
ابھی انداز سخن میں نہیں انداز فریب بے تکلف ہیں جو گویا لب گفتار ہنوز
چال میں ڈھنگ وہی ناز سے اٹھکھیلی کا فتنہ پرواز نہیں شوخی رفتار ہنوز
ہے لڑکپن کا ہر اک ناز و ادا میں انداز دلبری سے نہیں زنہار خبردار ہنوز

حسن آرا نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

میری پیاری بہنو! میری پیاری ہمجولیو! میں کچھ ایسی لقمان کی دوسری تو ہوں نہیں کہ کھڑی ہو کر تڑ تڑ، اور فر فر کہتی چلی جاؤں۔ میری تو زبان لڑکھڑانے لگے گی۔ مگر میں کہوں گی ضرور ایک بات ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم سب چٹکیوں پر اڑاؤ اور مفت میں نکو بناؤ۔

جانی بیگم: اے ہے تو کاہے کے واسطے نکو بنائیں۔ خدا واسطے کو، اور نکو تو وہ بنائے جو

اپنی ناک جڑ سے کاٹ کے پھینک دے۔

حسن آرا : اچھا تو پھر ہم جو کہیں وہ سنیئے۔

جانی بیگم : اچھا تو ذری حقہ تو بھرواؤ۔ کیا رمضان شریف ہے۔ پان نہ گلوری، نہ حقہ نہ گڑگڑی۔

سپہر آرا : ماماجی۔

ماماجی : حکم۔

سپہر آرا : (اٹھ کر کان میں) وہ چاندی کی گڑگڑی تو بھروالانا۔

ماماجی : (تھوڑی دیر میں) لیجیے دوسیرا بھروایا ہے۔

سپہر آرا : (جانی بیگم کی طرف اشارہ کرکے) انھیں دو۔

جانی بیگم : تسلیم۔ (حسن آرا سے) ہاں ہاں کہو۔ چپ پیر کا روزہ رکھا ہے کیا؟

حسن آرا : ہم نے کچھ لکھا ہے اور آپ سب کو ہم ضرور سنائیں گے۔ اس پر تین چار ہم صفیر ہو کر بولیں کہ کہیے کہیے۔ خدا کی قسم آپ باتیں کیا کرتی ہیں جیسے بلبل چہک رہا ہے۔

جانی بیگم : ہزار داستان ہو، ہزار داستان۔ پہاڑی مینا کی حقیقت کیا ہے۔

حسن آرا نے لکچر پڑھنا شروع کیا، اور سب کی سب چپ چاپ سننے لگیں۔

تقریرِ دل پذیر و سحر تخمیر

آب گوہرِ ہنر پروری، چشمک زنِ سحر سامری۔ ریختہ خامۂ فصاحت۔ ختامہ شاعرہ خوش فکر و نازک خیال۔ ملیح الکلام شیریں مقال۔ خورشید مشرقستانِ نکتہ رانی۔ بدرِ منیرِ فلک خوش بیانی۔ افشاں جبیں حسن و صفا، گیسوئے عذار شرم و حیا، خالِ زیبائے رخِ عصمت، مہر سپہر عفت، رابعہ منزلت، بلقیس مرتبت، شیریں حرکات در نگین ادا، حسن آرا بیگم صاحب المتخلص بہ حسیںؔ۔

وہو ہذا

میری پیاری بہنو! ساس بہوؤں کے جھگڑے، نند بھاوجوں کے بکھیڑے، میاں بیوی کی جوتی پیزار، بات بات پر گلخپ، بات بات پر تکرار، ہر دم عناد، آئے دن فساد، آپس کی شورہ پشتی، سمدھنوں سمدھنوں کی دھینگا مشتی سے خدا کی پناہ۔ معاذاللہ! معاذاللہ ان بری

باتوں سے خدا بچائے۔ بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کے مزاج میں ایسی بات دخل نہ پائے۔ اس پھوٹ کی تمھارے ہندوستان ہی میں اس قدر گرم بازاری ہے کہ ساس کی زبان پر کوسنا جاری ہے، اور بہو مصروفِ گریہ وزاری ہے، اور میاں کی عقل عاری ہے۔ نند بھاوج سے برسرِ پیکار۔ بھاوج نند کی صورت سے بیزار، بہو ہچکیاں لے لے کر روتی ہے۔ ساس زہر کھا کر سوتی ہے۔ اور جو ساس اور بھی میدانِ غضب کی یکہ تاز ہوئی، اور بہو زبان دراز ہوئی تو مار پیٹ کو کہیں لینے نہیں جانا ہے۔ اپنا کیا آگے آتا ہے۔ میاں اگر بیوی کی سی کہیں تو ان کی گھڑکیاں سہیں۔ اگر اماں کا جنبہ کریں تو بیوی کی باتیں سنیں، ماں اُدھر بیوی اِدھر کان بھرتی ہے۔ وہ اِن کے اور یہ اُن کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے۔

مگر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ کوئی بجا کے دکھا دے۔ ساس حلیم ہو تو بہو کو منا لے، اور بہو سلیقہ والی ہو تو ساس کو آدمی بنا لے۔ ورنہ:

اگر در ہر دو جانب جاہلانند　　　　وگر زنجیر باشد بگسلانند

ایک شریف زادی نے اپنی ماما سے کہا کہ ہماری ساس تو ہماری سوت ہیں۔ ماما (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ہے ہے آسمان نہیں پھٹ پڑتا، ایسے زمانے پر۔ حشر نہیں بپا ہوتا ایسی باتیں بنانے پر۔ ہمیں دعویٰ ہے کہ اگر وہ شریف زادی ہماری رائے پر چلیں اور جو ہم کہیں وہ کریں، تو ان کی ساس راہ راست پر آجائیں، اور انھیں اپنے سر پر بٹھائیں۔ وہ سیدھی جا کر ساس کے قدموں پر گر پڑیں۔ اور آج سے ہرگز اُن سے نہ لڑیں کیا ان کی ساس کا سر پھر گیا ہے یا باؤلے کتے نے کاٹا ہے۔ ساس کی اگر بہو خدمت کرے۔ ساس کی محبت کا اس کی لڑکیوں کی طرح دم بھرے، تو خدائی بھر کی ساسوں میں کوئی ایسی نہ ملے، جو چھیڑ کر بہو سے لڑے۔ یا بے وجہ بات بات پر بھڑ پڑے۔ اور جو ساس بہویں دونوں تیز اور تیکھی اور بلا کے بے درماں ہوئیں، تو بس ستم ہے۔ غضب ہے۔ قیامت ہے۔ آفت ہے۔

اب سوچو تو ذرا دل میں کہ اس تکرار اور جوتی پیزار کا انجام کیا ہے، اور اس کا نتیجہ کیسا بُرا ہے۔ گھر میں پھوٹ۔ ایک دوسرے کی دشمن جانی۔ صورت سے بیزار۔ لونڈیوں باندیوں میں ذلیل و خوار۔ ساری دنیا میں رسوا، اور روسیاہ۔ گھر تباہ۔ ایک چپ سو [illegible] ہزار [illegible] ٹالتی ہے۔ رنج اور فساد کو دم میں جہنم میں ڈالتی ہے۔ مگر جب کوئی خاموش رہے کبھی جب [illegible] اتنی سی مصیبت سہے بھی، اور جو یہ خیال ہو کہ ساس ایک کہے تو دس سنائیں [illegible]

باتیں کہے تو بیس مرتبہ اس کو آنو بنائیں تو بس میل ہوچکا۔ ساس نہ ہوئی بھونی مونگ ہوئی۔ آخر اس کا بھی کوئی درجہ ہے یا نہیں۔ یا بس سسرال میں جاتے ہی مالکن بن بیٹھے۔ ساس کو طاق پر رکھ دے، اور میاں پر حکومتیں چلانے لگے۔

انگریزوں کی ولایت میں یہ اچھا قاعدہ ہے کہ اِدھر شادی ہوئی، اُدھر باپ الگ، بیٹا الگ۔ محبت الفت پیار سب وہی رہتا ہے، مگر الگ تھلگ، اور پھر مل جُل کے۔ خدا جانے وہاں بھی ساس بہوؤں میں لڑائی جھگڑا ہوا کرتا ہے، یا نہیں۔ مگر اتنا تو نہ ہوتا ہوگا۔ یہاں تو گھر گھر ساس بہو میں چخ چلتی ہے کھُلم کھُلا۔ اور جو چخ نہ چلی تو دلوں میں کدورت رہتی ہے۔ انگریزوں کی ولایت میں اچھا قاعدہ ہے، مگر یہاں اگر کوئی لڑکا اپنی جورو کو لے کر الگ رہے، اور باپ ماں سے جدا ہوئے تو لوگ اس کو نام رکھیں، اور ہنسیں، کہ واہ اچھے سپوت پیدا ہوئے۔ جرواپاتے ہی باپ کی دُم میں رسا باندھا۔ ماں کو طاقچے پر بٹھادیا۔ ہے ہے گھر گھر رسوا ہو جائے۔ تو یہاں بہو کو ذرا بہت سوچ سمجھ کے چلنا چاہیے۔

تم میں سے بعض ابھی کنواری ہو، مگر ایک نہ ایک دن سسرال جاتا ہے، اور کسی ساس کی بہو بننا ہے۔ بعض کی شادی ہو بھی گئی ہے۔ جن کو بہو بننا ہے وہ میری ان باتوں کو خوب یاد رکھیں، اور جو ساس والی بہو ہیں وہ میری باتوں کے موافق چلیں، تو پھر دیکھیں کتنا فائدہ ہوتا ہے۔

اب میں تم سے اتنا چاہتی ہوں کہ سچ سچ اپنی اپنی ساس کا حال بیان کردو۔ یہاں کوئی غیر تو ہے نہیں۔

اس پر سب کی سب جن کی شادی ہوگئی تھی، بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہکنے لگیں۔

ایک : اللہ کرے ہماری ساس کو آج رات ہی کو ہیضہ ہو۔

دوسری : اللہ کرے اب تک ہماری ساس کو ہیضہ ہو گیا ہو۔

تیسری : اللہ کرے ایسی جگہ ہماری کمبخت ساس مرے جہاں ایک قطرہ پانی نہ ملے۔

بہار النسا : یا خدا میری ساس مردار کے پاؤں میں باؤلا کتا کاٹے! اور وہ بھونک بھونک کے مرے۔

چوتھی : ہم تو اپنی ساس کو پہلے ہی چٹ کر گئے بہن۔ تھی بڑی چڑ چڑی۔

پانچویں : ساس تو ساس ہماری نند نے ناک میں دم کر دیا۔

جانی بیگم : میری ساس تو میرے آگے چوں نہیں کر سکتی۔ بولی اور میں نے گلا گھونٹ ڈالا۔ اُف اللہ! پھڑکا دیا۔

چُہل

واہ حسن آرا بیگم۔ کیوں نہ ہو۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا کہنا ہے۔ وہ لکچر دیا ہے کہ قلم توڑ دیے۔ ہائے! ایسی شریف زادیاں پیدا کہاں ہوتی ہیں۔ میاں آزاد! خدا کی قسم ہو بڑے خوش قسمت۔ ایسی بیوی پائی، کہ دیدنہ شنید۔ مکھڑا رو کش ہلال عید۔ سیرت تو ایسی خدا نے عطا کی ہے، کہ سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اے کاش ایسی بیویاں نیک اس ملک میں اور ہوں تو واہ، واہ۔

اس لکچر نے سب لڑکیوں پر اثر کیا۔ خصوصاً نظیر بیگم پر تو ایسا اثر ہوا کہ سبحان اللہ۔ یہ سیزدہ سالہ، ہونہار، نوعمر، انتہا کی سادہ مزاج تھی۔ گل بدن کا پائجامہ، مگر سفید بگلے کے پر کا سا، دوپٹا اور اس میں سے جعد کے موباف گلگوں، وزریں کا جھلک، غضب ڈھاتی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ناگن لہرا رہی ہے۔ چلتے وقت نظیر بیگم نے حسن آرا کے کان میں کہا کہ ہم پھر آپ سے ملیں گے۔ بہن ہمیں کچھ سکھاؤ۔ کل سے ہم آیا کریں گے۔ کچھ پڑھایا کرو گی؟

حسن آرا : (پیار کر کے) ہاں بہن! آیا کرو۔ ضرور آیا کرو۔

نظیر بیگم : ضرور آیا کروں گی۔ ہمیں بھی پڑھایا کرو۔

حسن آرا : ضرور۔

جانی بیگم : اے واہ، کیا پڑھائیں گی بھلا۔ ہمارے پاس آؤ تو ہم روز پڑھا دیا کریں۔

راوی : بس آپ معاف ہی کیجیے۔

نظیر بیگم : آپ کے تو پڑوس ہی رہتے ہیں ہم۔ مگر بہن تم ہڑ دنگا سکھاتی ہو، اور تمہیں کچھ آتا نہ جاتا ہے۔

سپہر آرا : (مسکرا کر) کہتی تو سچ ہو۔

جانی بیگم : جی ہاں بجا ہے۔ تم تو اتفاق کر ہی لوگی۔

حسن آرا : کھیل کود بھی ہو۔ ہنسی مذاق بھی ہو۔ مگر دو گھڑی اچھی باتوں کی طرف بھی مائل ہوا کرو۔

جانی بیگم : واہ اچھی باتیں نگوڑی کون سی ہیں۔ ہم بھی تو سنیں۔

حسن آرا : جو ہم نے آج کہیں۔
جانی بیگم : واہ۔
نظیر بیگم : ان کا ایسی باتوں میں جی ہی نہیں لگتا۔ یہ ایسی ویسی باتوں کی طرف رہتی نہیں۔ دن بھر کوٹھوں پر گھوڑوں کی طرح دوڑا کرتی ہیں۔ اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر۔ یا میرے اللہ!
جانی بیگم : (نظیر بیگم کا ہاتھ پکڑ کر) مروڑ ڈالوں ہاتھ۔
نظیر بیگم : دیکھا دیکھا، بس، کبھی ہاتھ مروڑا، کبھی ڈھکیل دیا۔
جانی بیگم : (نظیر بیگم کا گال کاٹ کر) اب خوش ہوئیں؟
سپہر آرا : اے واہ، لے کے گال کاٹ لیا۔
جانی بیگم : پھر عورت ہیں یا مرد ہیں کوئی۔ ہونھ، واہ واہ۔
نظیر بیگم : اب آپ اپنی محبت رہنے دیں۔
جانی بیگم : (چٹکی لے کر) کیا کہا؟

جب رخصت ہوئیں تو سپہر آرا نے آواز دی۔ چلیے اماں جان بلاتی ہیں۔ روح افزا، اور بہار النسا، اور حسن آرا، مل کر گئیں۔ بڑی بیگم صاحب کے ساتھ، ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھایا۔ کھانے وقت یوں گفتگو ہوتی۔

بہار النسا : اب حسن آرا کی شادی کہیں تجویز ی؟
بڑی بیگم : ہاں: فکر میں تو ہوں۔
بہار النسا : فکر نہیں امی جان! اب دن دن چڑھتا ہے،
روح افزا : اللہ کے فضل سے اب یہ سیانی ہوئی ہیں۔
بہار النسا : پھر اب کب تجویز ہے گا؟
بڑی بیگم : جلد۔
بہار النسا : جلد کیا، کوئی دو چار برس میں۔
روح افزا : اللہ اللہ کرو۔
بہار النسا : (از راہِ مذاق) بے چاری سپہر آرا بھی منتظر ہیں کہ ہم ان کا بھی ذکر خیر چھیڑیں۔
سپہر آرا : دیکھیے یہ چھیڑ خوانی اچھی نہیں۔ ہاں۔
بڑی بیگم : (مسکرا کر) تم جانو یہ جانیں۔

بہارالنساء : ابھی کل ہی شام کو تو، تم نے کہا، کہ اماں جان سے ہمارے بیاہ کی سفارش کرو، اور آج مکرتی ہو۔ بھلا کھاؤ تو قسم تم نے نہیں کہا؟

سپہر آرا : واہ، ذرا ذرا سی بات پر کوئی قسم کھایا کرتا ہے۔

روح افزا : پانی پڑتا ہے کچھ؟

سپہر آرا : جی ہاں آپ بھی یوں ہیں۔

روح افزا : اچھا قسم کھا جاؤ۔

سپہر آرا : کاہے کی قسم کھائیں؟

بڑی بیگم : اے تو چڑھتی کیوں ہو بٹیا۔

سپہر آرا : اماں! جھوٹ موٹ لگاتی ہیں۔ چڑھیں نہیں۔ واہ۔

روح افزا : کیا جھوٹ موٹ۔

سپہر آرا : اور نہیں تو کیا۔

روح افزا : اچھا ہمارے سر کی قسم کھا جاؤ۔

سپہر آرا : اللہ کرے میں مرجاؤں۔

بہارالنساء : ہائیں۔

روح افزا : چلو بس اب رودیں۔ اب کچھ نہ کہو۔

بہارالنساء : اماں جان ایک رئیس ہیں۔ ان کا لڑکا کوئی انیس برس کا ہوگا۔ خدا جانتا ہے۔ بڑا حسین ہے، اور پڑھا لکھا ہے۔ سکندرنامہ آج کل پڑھتا ہے۔ اس کی ماں بھی نیک ہے۔ بیچاری نے ہم سے کہا تھا کہ تم اپنی بہنوں کے بارے میں، بیگم صاحب سے کہو۔ اچھا گھر ہے۔

روح افزا : وزیرزادے ہیں وہ؟

بڑی بیگم : ہاں کھانے پینے سے خوش ہیں۔

روح افزا : خوش، آٹھ تو گھوڑے ہیں، ان کے ہاں۔

ماما : میں سمجھی۔ میں ان کے یہاں کوئی ڈیڑھ برس نوکری کر آئی ہوں۔

بڑی بیگم : پھر چھوڑی کیوں؟

ماما : چھوڑ دی، اب کیا بتاؤں۔

بہارالنساء : اماں جان! وہ حسن آرا کے لائق ہے لڑکا۔ سچ کہتے ہیں۔

بڑی بیگم : ان کا کچھ اور حال بتاؤ اچھی طرح۔ کئے لڑکے ہیں ان کے؟

روح افزا : دو۔

بہار النسا : اور دونوں لئیق، خوبصورت، ہوشیار، نیک چلن،

روح افزا : ایک لڑکا بہن! وہ چھوٹا سا جو ہمارے مکان کی طرف سے مشکی ٹٹو پر روز نکلا کرتا ہے۔ بڑا پیارا ہے۔ دولہا بھائی سے اور اس کے بڑے بھائی سے بڑی ملاقات ہے۔

بہار النسا : ہمارے ہاں تو دوسرے تیسرے دن وہ آتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں۔ بس حسن آرا ہی کے لائق ہیں۔

روح افزا : ضرور منظور کیجیے۔

بڑی بیگم : اچھا، اچھا، سوچ لوں۔

راوی : حسن آرا کے اس وقت ہوش اڑ گئے۔ رنگ فق کلیجہ شق۔ جان عذاب میں تھی، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہائے غضب:

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا — دردا، کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

(حافظ)

سپہر آرا بھی چتونوں سے تاڑ گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

بہار النسا اور روح افزا تو بڑی بیگم کو پکا کر رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ منظور کریں، تو ستم ہی ہو جائے۔ قیامت نازل ہو۔ کوہِ افتم ٹوٹ پڑے۔ بجلی خرمنِ عیش پر گرے۔ ہے ہے، آزاد جہاز پر گئے ہیں۔ وہ مصیبتیں سہتے ہیں، اور یہاں یہ جشن منائیں، اور بیاہ رچائیں کیا مجال۔

غم کا ترانہ، اور میاں آزاد کا فسانہ
افسانۂ راز اور ذکرِ خیر عاشق ناشاد

مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ، اور شادی کی چھیڑ چھاڑ سے، حسن آرا بیگم کو خاصہ تناول کرنے کی اچھی طرح نوبت نہ آئی۔ جب صحتِ طعام سے فراغت پائی، تو مغلانی کو حکم دیا کہ کمرے میں لمپ جلا۔ مسہری بچھا۔ اس وقت سر میں دھمک ہے درد دل کی چمک ہے۔ اس نے چٹ چٹ بلائیں لے کر، اور دعائیں دے کر کہا: سر میں درد ہو یا دل سرد ہو، تو اس کے لیے صندل لگائیے اس کے لیے حکیم بلائیے۔ پھر ماتھے اور نبض پر ہاتھ رکھ کر بولی: نہ بیوی قربان جاؤں۔ اللہ کے فضل

سے آرام ہے۔ دردِ سر کا خیال خام ہے۔ دو گھڑ بیٹھیے۔ گلوری کھائیے۔ ابھی تو چراغ میں بتی پڑی ہے۔ بہنوں سے باتیں کیجیے۔ ہمیں ایک خط لکھ دیجیے۔ حسن آرا تیکھی ہو کر بولی: بس بہت باتیں نہ بناؤ۔ جو حکم دیں بجالاؤ۔ ہمیں اس وقت کچی گھڑی بھر بیٹھنے کی بھی گوں نہیں۔ خوف ہے۔ ہمارا درد بڑھ نہ جائے کہیں۔ معاً لمپ جلوایا۔ پلنگ بچھوایا۔ حسن آرا چپکے سے پلنگ پر سو رہی، اور منھ ڈھانپ کر خوب روئی:

بیتابیوں نے دل کی قیامت ہے آج کی
برہم مزاج غمزۂ خاطر شکن کیا

صیدِ رنج و محن۔ خون موج زن:

ہوئے بے خود غمِ تنہائی سے　　　کہیے کس سے کہیں کیا یاد آیا

اب سنیے! روح افزا اور بہار النسا تے بھی! عشق آزاد و حسن آرا کی اڑتی سی خبر پائی تھی ایک مہری نے ساری داستان، مو بمو، کہہ سنائی تھی، لہٰذا، جب خاصہ چنا گیا تو دونوں نے بڑی بیگم کے سامنے چھیڑا۔ دونوں چتونوں سے تاڑ گئی، کہ کچھ دال میں کالا کالا، ضرور ہے۔ جب ہی تو شادی بیاہ کے نام سے طبیعت نفور ہے۔ لہٰذا جان بوجھ کر شادی کی خبر سنائی اور حسن آرا کی سٹی پٹی بھلائی:

رازِ دل محبوب کیا چاہیے معلوم　　　کچھ بد خبر عاشق بیمار اڑا کر

روح افزا اور بہار النسا اور سپہر آرا جو ادا و انداز سے کمرے میں آئیں، تو حسن آرا کو خواب ناز میں دیکھ کر جھلائیں۔

روح افزا : (چادر ہٹا کر) کیا ابھی سر شام ہی سو رہی؟

بہار النسا : مکر کرتی ہوں گی، سوئیں گی ابھی کیا۔

سپہر آرا : نہیں بہن! یہ تکیہ پر سر رکھتے ہی سو جاتی ہیں۔

بہار النسا : جی ہاں! سنا ہوا ہے۔ ایک تم کو تکیہ پر سر رکھتے ہی نیند آجاتی ہے، دوسرے ان کو۔ پلک جھپکاتے کی دیر ہوئی اور سو گئیں۔ بس، واہ!

روح افزا : (گدگدا کر) اٹھو بہن! ہماری ہی بھتی کھائے جو نہ اٹھے۔ ہماری بہن نہیں۔ اٹھ بیٹھو شاباش۔

بہار النسا : اے ہے، ماش کے آٹے کی طرح اینٹھی جاتی ہو۔ بل پر بل کھاتی ہو۔

سپہر آرا : سونے دیجیے۔ انکھڑیاں مارے نیند کے متوالی ہو رہی ہیں۔ جب ہی تو سو رہی ہیں۔

بہار النسا : رسیلی متوالیوں نے جادو ڈالا۔ ہمارے یہاں پڑوس میں روز تعلیم ہوتی ہے۔ صبح کے وقت بڑی بہار معلوم ہوتی ہے۔ مگر ہمارے میاں کو اس کی بڑی چڑھ ہے! کہ عورتیں ناچ دیکھیں یا گانا سنیں۔ ہم کئی بار نواب صادق علی بیگ کے یہاں سن آئے اور ناچ بھی دیکھا۔ یہ مردوں کی بھی کیا رواج ہے۔ گھر کی جورو سے بات نہ کریں۔ باہر شیر۔ اللہ جانتا ہے، ہم تو ان سب موئی یدقطع، بیواؤں کو ایڑی چوٹی پر قربان کر دیں۔ ایک نے مسّی کی دھڑی جمالی تھی۔ جیسے بطخ نے کیچڑ کھائی تھی۔

روح افزا : (حسن آرا کو چوم کر) اٹھو بہن!

حسن آرا : (آنکھیں کھول کر) اس وقت سر میں درد ہے۔

بہار النسا :

صندلی رنگوں سے جاتا دل ملا درد سر کی کس کے ماتھے جائے گی

حسن آرا : یہاں اپنی چہار دیواری سے آج تک، قدم ہی باہر نہیں رکھا۔ جب سے ہوش سنبھالا دہلیز کے باہر قدم رکھا ہو تو قسم لیجیے۔ ہمیں شوق شادی ہے نہ خیال خانہ آبادی ہے۔ آپ نے تو آج اچھی سنائی۔ دل ملانے کی ایک ہی فرمائی۔

بہار النسا : درست۔

روح افزا : جی، آہو چشموں سے آنکھ لڑائی ہے۔ یہ جو آج معمول کے خلاف نیند آئی ہے، تو اس کا باعث رنج تنہائی ہے۔ اچھا اب سچ سچ کہہ دو، لگی لپٹی کی سند نہیں۔ کس سے دل ملا ہے۔ کس کا عشق چرّایا ہے، کوئی حسین جوان بھایا ہے، یا خدا نہ کردہ کوئی ایسے ویسے پر دل آیا ہے؟:

یہ مضحکہ جہاں میں جو ہو عشق بے محل دل دیجیے تو یار طرح دار دیکھ کر

سپہر آرا : اور کیا۔ ع۔ معشوق کیجیے تو پریزاد کیجیے۔

حسن آرا : کسی سے ملنے کا اب حوصلہ نہیں اے جاں۔

بہت اٹھائے مزے، ان سے آشنا ہو کر

حسن و عشق کے جھگڑے میں نہ پڑے گی، اگر پڑے گی۔ بھی تو کسی طرح دار سے آنکھ لڑے گی۔ اور اس لائق ہے کون۔ توبہ!

بیتاب ہو کے روحِ زلیخا نے آہ کی　　　　سلطان حسن و عشق کا بازار دیکھ کر

روح افزا : بس باتیں نہ بنایئے ۔ ہم سے نہ چھپایئے ۔ ہم سب سن چکے ۔ بھلا کسی پر دل نہیں آیا تو آنکھوں سے آنسو کیوں کر نکلے ۔ ذری آئینہ میں صورت تو دیکھیے ۔ رنگ فق ہو گیا ہے یا نہیں ؟ ہوائیاں اُڑی ہوئی ہیں ۔ شادی کا حرف زبان پر آیا ، اور تمھارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ۔

سپہر آرا : اے بہن ! یہ دھان پان آدمی ، ذری سر میں درد ہو الیسٹ رہیں ۔

بہار النسا : لڑکی باتیں بناتی ہے ۔ ہم کو چٹکیوں پر اڑاتی ہیں ۔

حسن آرا : اب آپ جو چاہیں کہیں ۔ یہاں معشوقِ مرغوب ہے ۔ نہ کوئی محبوب مطلوب ۔

سپہر آرا : الٰہی خیر ہو ! ان دونوں بہنوں سے جانے کس نے کہہ دیا ہے جھوٹے موٹے ۔

روح افزا : گریباں میں منھ ڈالو ۔ کہہ چلوں سب

حسن آرا : بسم اللہ فرمایئے ۔ سو کام چھوڑ کے ۔ آپ کو خدا کی قسم ۔

روح افزا : اچھا اس وقت دل کیوں بھر آیا ۔

حسن آرا : دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بہار النسا : (تالیاں بجا کر) کھل گئی نہ بات ۔

روح افزا : جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے ۔

حسن آرا : واہ ۔ ہونھ ۔

سپہر آرا : تو جادوگرنی کہیں اور رہتی ہوں گی ۔

بہار النسا : (ہنس کر) کیا دونوں بہنیں پہاڑی مینا کی طرح چہک رہی ہیں ۔

سپہر آرا : (مسکرا کر) تم دونوں بہنیں نہیں ہزار داستان کی طرح چہک رہی ہو ۔

روح افزا : ہم تو اس وقت کلیلوں پر ہیں ۔

راوی : یہ شوخی ، اللہ اللہ ، یہ شوخی ، حضور ! اس وقت کلیلوں پر ہیں ۔ چشم بد دور :

کمندِ جلوہ ناز تو جذبہ دارد　　　　کز آسمان بہ زمین آوردسیما را

بہار النسا : اچھا بھلا ، بڑی سچی ہو تو ایک بات کرو ۔ بس امتحان ہو جائے گا ۔ ہم ایک ہاتھ میں کوئی چیز لیں ، اور دوسرا ہاتھ خالی رکھیں ۔ مٹھی باندھ کے آئیں اور تم ایک ہاتھ پر

ہاتھ مارو۔ جو خالی ہاتھ پر پڑے تو تم جھوٹی اور میں سچی، اور جو دوسرے ہاتھ پر پڑے، تو ہم جھوٹے تم سچی۔

حسن آرا : اے واہ، چھوکریوں کا کھیل۔

روح افزا : اہا ہا۔ اور آپ ہیں کیا؟

بہار النسا : یہ چھوکری نہیں، یہ بڑی بوڑھی ہیں۔

سپہر آرا : اچھا آپ آئیے۔ کوئی چیز ہاتھ میں لائیے۔ مگر جو خالی ہاتھ پر پڑے تو تم جیتیں، جو دوسرے ہاتھ پر پڑے تو ہم جیت گئے۔ یہی نہ،

روح افزا : اللہ ری بدگمانی۔

اتنے میں بہار النسا، دوسرے کمرے میں گئیں۔ ایک چھوٹی سی شیشے کی گولی دائیں ہاتھ میں رکھیں۔ بایاں ہاتھ خالی۔ دونوں مٹھیاں زور سے بند کریں اور باہر نکل آئیں۔

بہار النسا : آئیے۔

روح افزا : اللہ کرے ہاتھ خالی پر پڑے۔

سپہر آرا : واہ، اللہ نہ کرے!

بہار النسا : اچھا اب ہاتھ پر ہاتھ تو مارو۔

حسن آرا : یہ واہیات باتیں ہیں۔

روح افزا : تو کانپتی کیوں جاتی ہو۔

سپہر آرا : اچھا دونوں مٹھیاں سامنے لاؤ۔ باجی بولو کس ہاتھ میں ہے۔

حسن آرا : ادھر والے میں (دائیں).

سپہر آرا : نہیں باجی، دھوکا کھاتی ہو۔ اللہ جانتا ہے، دھوکا کھاتی ہو۔ ہم تو بائیں ہاتھ پر ہاتھ ماریں گے (تڑ)۔

بہار النسا : (بائیں ہاتھ کو کھول کر) سلام

سپہر آرا : ارے! وہ ہاتھ تو دکھاؤ؟

بہار النسا : (ہاتھ کھول کر) لو ہے شیشے کی گولی کہ نہیں؟

سپہر آرا : ہے، نیچ کھیت میں۔

حسن آرا : دیکھا کہا تھا کہ اس ہاتھ میں ہے۔ اس ہاتھ میں ہے۔ کہا نہ مانا۔

سپہر آرا : جی ہاں، آپ علم غیب ہی تو پڑھی ہیں۔
روح افزا: کہیے اب تو سچ ہے؟
سپہر آرا : (شرما کر) کہیں ہو نہ سچ۔
حسن آرا : ان ڈھکوسلوں سے ہوتا کیا ہے۔
بہار النسا: اچھی بہن! ہماری بہن! اسے اب اتنا بتا دو کہ میاں آزاد کون ہیں۔
حسن آرا : رنگ فق۔
سپہر آرا : آنکھ نیچی۔
روح افزا: لجاتی کیوں ہو بھلا؟
سپہر آرا : کیا جاتے کیا واہی تباہی باتیں کرتے ہیں۔
بہار النسا : واہی تباہی؟ ذری ادھر تو دیکھو!
روح افزا: واہی تباہی، چہ خوش۔
حسن آرا : یہ میاں آزاد کون ہیں؟
روح افزا: ہماری پیاری بہن کے پیارے۔
سپہر آرا : بجا ہے۔
بہار النسا: وہ بجروں کی روانی۔
روح افزا: وہ دنیا کی طغیانی۔
بہار النسا : وہ روٹھنا وہ منانا۔
روح افزا: وہ روم روانہ ہونا۔
بہار النسا: وہ گرم جوشی:
روح افزا: وہ عشرت کوشی۔
بہار النسا : وہ راز و نیاز کی باتیں۔
روح افزا: وہ عشق کی گھاتیں۔
بہار النسا : وہ چپکے سے گلوریاں کھانا۔
روح افزا: وہ محل میں گل چھرے اڑانا۔
بہار النسا : وہ مزے مزے کی حکایتیں۔

روح افزا : اور وہ مزے مزے کی شکایتیں۔
بہار النسا : وہ امتحان لینا۔
روح افزا : وہ قول دینا۔
بہار النسا : اور وہ نکاح کا ذکر۔
روح افزا : اور وہ شادی کی فکر۔
بہار النسا : وہ صبح کا سہانا سماں، وہ بہار۔
روح افزا : وہ ترنم، وہ پھوہار۔
بہار النسا : وہ ڈوبنا' وہ نکالنا۔ وہ ڈوبتوں کو بچانا۔
روح افزا : اور وہ کسی کا قدموں پر گرنا۔
بہار النسا : کیا کہتی ہوں میں' ادھر تو دیکھو!
روح افزا : میری طرف اک نظر تو دیکھو!
بہار النسا : سنا کہ میاں آزاد پہلوان ہیں۔
روح افزا : اور سنا کہ حسین جوان ہیں۔
بہار النسا : طرح دار ہیں طرار ہیں۔
روح افزا : اور باغ و بہار ہیں۔
بہار النسا : شوزش گرد گل نارستہ شمشاد۔
خوبی سرد او، چوں سرو آزاد
روح افزا : وہ رخ کہ نہ پڑے آنکھ جس پہ
وہ نور کہ صدقے ماہِ انور
بہار النسا : پھر ہرج کیا ہے۔ شریف ہیں عالی خاندان ہیں۔
روح افزا : ہاں ہاں، بھلے مانس ہیں، معالی در دمان ہیں۔
بہار النسا : اب چھپانے سے کیا ہوتا ہے۔ بھلا۔ صاف صاف بیان کر دو۔
روح افزا : سن تو چکے ہی ہیں ہم۔ اب مخفی رکھنا لمغنی چہ؟
حسن آرا : (تنک کر) بتائیں کیا۔ جب کچھ اصلیت بھی ہو۔
سپہر آرا : ان دونوں بہنوں نے خواب دیکھا تھا کل معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا : ہاں سچ کہا۔ خواب دیکھا ہوگا۔

روح افزا : ہاں ہم تو آزاد کو خواب میں بھی نہیں دیکھا، مگر جہاں آرا کہتی تھیں کہ وہ حسن وجمال میں کروڑوں میں ایک ہیں۔ خوش فکر، تیز طبیعت، شریف اور نیک ہیں۔

حسن آرا : جہاں آرا بہن کیا کہتی تھیں؟

روح افزا : اللہ گواہ ہے بڑی تعریف کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ایسا خوبرو آدمی، آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا۔

بہار النسا : مگر ایک عیب بھی بتاتی تھیں۔

سپہر آرا : عیب۔ وہ کیا؟

بہار النسا : سنا شراب بہت پیتے ہیں۔

حسن آرا : ارے توبہ! کہیں مردار کا نام بھی نہ لینا۔

یہ دختِ زر حرام زادی مردار   مینا بازار کی ہے رہنے والی

بہار النسا : ہونھ۔ ہم سے اڑتی ہو۔ شان خدا۔ بھلا شراب نہیں پی تھی تو بہکے کیوں؟ مہری کی طرف کیوں جھکا ہے۔

حسن آرا : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) چپ چپ۔

روح افزا : آخر یہ سوجھی کیا۔ اللہ ہم کیوں کر میاں آزاد کو دیکھیں۔ اب کی جو خط بھیجو گی، تو لکھ دینا کہ تمہاری سالی بہت مشتاق ہیں جلد آؤ۔

سپہر آرا : بڑے ہنسوڑ، خوش مزاج آدمی ہیں، اور برق جیسے بجلی اف۔ ایسا چالاک اور ہوشیار اور طرح دار جوان آج تک دیکھا ہی نہیں۔

روح افزا : ڈیل ڈول کیسا ہے؟

سپہر آرا : چھریرا بدن۔ کشیدہ قامت۔ نک سک سے درست چہرے مہرے سے ٹھیک۔ دیکھو تو گھنٹوں گھورا کرو۔

بہار النسا : جب دیکھیں بھی۔

حسن آرا : انشاء اللہ۔

بہار النسا : ہمایوں فر تمہارے پڑوس میں رہتے ہیں۔ سپہر آرا کا ان کے ساتھ نکاح

ہو جائے تو ہم سمجھیں، کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔
سپہر آرا : میرے تو تلوؤں کو بھی نہ پہنچیں۔
حسن آرا : چہ خوش۔ چاند کو گہن لگانا چاہتی ہو۔ طوطی کو کوّے سے جوڑ لگانا۔ واہ اچھی بہن ہو۔
بہار النسا : ایں ؟ وہ نورِ شہزادگی چہرے سے برستا ہے کہ واہ، واہ اماں جان سے آج ہی تو کہوں گی میں۔
حسن آرا : تو اچھا جو تمھیں ایسے ہی پسند ہیں، تو اماں جان سے ذکر کرو۔
بہار النسا : کریں گے۔
سپہر آرا : اور ایجاب قبول، کوئی چیز ہی نہیں۔
روح افزا : انکار کردگی تو تم سے بد قسمت ہم کسی کو نہ سمجھیں گے۔
سپہر آرا : دیکھا جائے گا۔
روح افزا : الخموشی نیم رضا۔

ایک اور مہمان کا آنا اور فرطِ مسرت سے چاروں بہنوں کا کھل کھلانا

سویرے منھ اندھیرے، چاروں عفیفہ و پاکباز، خوب رویانِ طنّاز، وضو کرکے، امام باڑے میں جا نماز بچھا کر، نماز پڑھ رہی تھیں۔ پہلے تو حسن آرا اور بہار النسا میں بحث ہوئی۔
بہار النسا : الگ الگ مصلّیٰ بچھاؤ۔
حسن آرا : یہ کیوں! ایک جگہ نماز پڑھنا کیا کچھ گناہ ہے؟
بہار النسا : اے اتنا نہیں جانتیں کہ جماعت سے عورتیں نماز نہیں پڑھ سکتیں۔
حسن آرا : تو بہن امام عورتوں میں نہیں جائز ہے یا ایک ساتھ پڑھنا؟
بہار النسا : اچھا چلو۔

چاروں نے نماز ادا کی۔ سپہر آرا وظیفہ اور روح افزا مناجات پڑھ رہی تھیں۔ حسن آرا نے عندلیبِ شاخسار جادو طرازی، حضرت لسان الغیب حافظ شیرازی، جَعَلَ اللّٰہُ مَقَامَہٗ فِی الجِنَان، کا دیوانِ معرفت توامان، اٹھا لیا، اور بہار النسا بیگم

نے حسن دان منگوا کر نکھرنا شروع کیا۔ اپنے مذاق کے موافق سب کی سب مصروف ہوئیں۔

حسن آرا : بس صبح تو نکھار، شام تو نکھار۔ یا میرے اللہ احسن دان، سنگار دان، آئینہ، کنگھی، چوٹی، تیل پھلیل، مسی، عطر، اس کے سوا اور کسی شئے سے واسطہ ہی نہیں،

بہار النسا : اب آخر ش کنگھی دے۔ بالوں میں تیل ڈالے۔ یا کوئی تمھارے لیے۔ بول حیران جھنڈ منڈ بنی رہے۔

حسن آرا : روح افزا بہن سچ کہتی ہیں کہ، تمھیں عارضہ ہے اس کا۔

بہار النسا : چلو پھر کسی کو کیا۔ روح افزا اوروں پر بہت حرف رکھتا جانتی ہیں؛ مگر اپنے داؤں بھول جاتی ہیں۔

حسن آرا بہن: اے تو بہن سنو تو!

بہار النسا : بس اب باتیں نہ کرو۔ مانگ ٹیڑھی ہو گئی۔ تمھاری باتوں میں خیال بٹ گیا۔

حسن آرا : (ہنس کر) ہے ہے۔ غضب ہو گیا۔ یہاں تو دولہا بھائی بھی نہیں ہیں۔ آخر یہ نکھار دکھاؤ گی کسے۔

بہار النسا : ہم اُٹھ کے یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم چھیڑتی جاتی ہو۔ ایک تو موا چھپکا سیدھا نہیں رہتا۔

حسن آرا : (قہقہہ لگا کر) اے ہے۔ اب تک مانگ کا خیال تھا، اب چھپکے کا خیال ہے۔

بہار النسا : اچھا ایک دن ہم تمھاری مشاطہ بنیں۔ اللہ گواہ ہے وہ جوبن آجائے کہ جس کا حق ہے۔

حسن آرا : پھر اب صاف صاف کہلواتی ہوں بہن! اس سر کی قسم یاد رکھو، تم لاکھ بنو ٹھنو، ہمارا جوبن تو خدا داد ہے۔ ہمیں بناؤ چناؤ کی حاجت ہی کیا ہے بھلا۔

راوی : حق ہے:

حاجت بناؤ کی تجھے اے نازنیں نہیں
زیور ہے سادگی ترے رخسار کے لیے

بہار النسا : اپنے منھ میاں مٹھو بن لو۔

حسن آرا : ہاں یہ دعوا۔

بہار النسا : کیوں، کیا کچھ جھوٹ ہے؟
حسن آرا : اور نہیں سچ بھی ہے۔
بہار النسا : اچھا یہ پڑھ لیں تو پوچھیں۔ جو یہ دونوں کہیں وہ ٹھیک ہے۔
حسن آرا : منظور، مگر کچھ بد لیجیے۔
بہار النسا : یہاں بد کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔
روح افزا : کیا محبت ہو رہی ہے؟
سپہر آرا : کیا سوئی تھیں ابھی تک۔
بہار النسا : بی حسن آرا کچھ فرماتی ہیں۔
سپہر آرا : ہم سے دانے لیجیے تو ہم بتائیں۔
حسن آرا : (سپہر آرا سے) بہار النسا، اپنے کو پرستان کی پری، جنت کی حور، سمجھتی ہیں، اور ہم ان کے نزدیک کچھ ہیں ہی نہیں۔ بس اب تم، اور بہن روح افزا، دونوں انصاف سے کہہ دو۔
سپہر آرا : جس طرح، بہار النسا بہن نکھرتی ہیں، سنورتی ہیں، اس طرح اگر تم بھی نکھرو، تو چاند کا ٹکڑا بن جاؤ۔ تمھارے چہرے پر سرخی اور سفیدی، اور رعنائی کے علاوہ نمکینی بھی بہت ہے، مگر وہ گوری چٹی ہیں۔ بس نمک نہیں۔ مگر ہاں حسین ضرور ہیں۔ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔
روح افزا : دونوں حسین ہیں، مگر حسن آرا بڑھ چڑھ کر۔ یہ تو ہم نہ کہیں گے کہ بہار النسا، بہن میں نمکینی نہیں ہے، مگر ہاں حسن آرا سے کم ہی کم۔
بہار النسا : چلو خیر۔
حسن آرا : اب آپ چاہے بُرا مانیے۔

اتنے میں ایک فٹن کھڑ کھڑاتی ہوئی آئی۔ مُشکی جوڑی جُتی ہوئی۔ کوچ مین، سرخ وردی پہنے ہوئے، چوبداروں کی سی پگڑی جمائے بیٹھا ہے۔ پیچھے دو سائیس کالی وردیاں ڈاٹے کھڑے ہیں۔ فٹن ایوانِ سپہر توامان کے برآمدے میں ٹھہری، اور ایک جوانِ رعنا، بلند بالا، گل عذار، ہنس مکھ، باغ و بہار، اترا۔

دربان : (جھک کر) بندگی حضور!

خاں صاحب : (زمین دوز ہو کر) سلام غریب پرور!
ماما : (مسکرا کر) اچھے رہے حضور! آج بہت دن پیچھے دیکھا۔
حسن آرا : یہ گاڑی کس کی ہے؟
روح افزا : ہاں کوئی آیا تو ہے۔
بہار النسا : پوچھو، پوچھو کسی سے، مردانی سواریاں ہیں یا زنانی۔
سپہر آرا : (جھانک کر) جانے کون ہے، مگر جوڑی تو اچھی ہے۔
بہار النسا : رنگت کیا ہے؟
سپہر آرا : کالی۔ وہ۔ مشکی، مشکی۔
روح افزا : پالکی گاڑی ہے یا فٹن؟
بہار النسا : میں کہتی ہی تھی آتے ہوں گے۔
سپہر آرا : کیا دولہا بھائی آئے؟
روح افزا : (تالیاں بجا کر) چلو آگئے اب باتیں ہوں گی۔
ماما : (پردے کے پاس سے) نواب صاحب ابھی ابھی فٹن سے اترے۔
بہار النسا : چل جھوٹی۔
ماما : اللہ کی قسم ابھی ابھی گاڑی پر سے اترے ہیں۔ ابھی ابھی تو آئے۔
روح افزا : واہ کہیں آئے نہ ہوں۔
ماما : مجھے لڑکے کی قسم اپنے۔
سپہر آرا : فٹن آتی، تو کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ سنتے۔ کوئی بات بھی ہے۔
ماما : ہائے اللہ میں کس کے سامنے سر پھوڑوں اپنا۔ اور جو آئے ہوں۔
حسن آرا : آئے کیوں کر ہوں، وہی بے تکی ہانکے جائے گی۔
ماما : اوئی نہ سہی۔

حسن آرا، اور سپہر آرا، اور روح افزا اور بہار النساء، اس ماما کی بیوقوفی، اور چڑچڑے پن، اور قسمیں کھاتے پر بہت ہی ہنسیں۔ ماما نے برا مانا کہ میں لاکھ قسموں پر قسمیں کھاتی جاتی ہوں۔ ان کو یقین ہی نہیں آتا۔ خیر نواب خورشید علی خاں صاحب، فٹن پر سے اترے، تو ایک مغلانی نے بڑی بیگم سے جا کر کہا کہ آپ کے داماد آئے ہیں۔ بہار النساء بیگم کے

دولہا۔ ادھر نواب صاحب داخل ہوئے۔

نواب : (بڑی بیگم سے) آداب بجالاتا ہوں۔

بڑی بیگم : (متانت سے) آؤ برخوردار میری بائیں آنکھ جب پھڑکتی ہے۔ کوئی نہ کوئی آتا ضرور ہے۔ اس دن آنکھ پھڑکی تو لڑکیاں آئیں۔ یہ روح افزا کی کیا حالت ہوگئی ہے بھائی۔ وہ صورت ہی نہیں ہیں۔ گھل کے کانٹا ہوگئی ہے۔

نواب : اب تو اچھی ہیں۔ مگر پرہیز نہیں کرتی ہیں۔ تیتا مرچ نہ ہو تو کھانا نہ کھائیں۔ پھر بھلا اچھی کیوں کر ہوں۔ آپ ذرا تاکید رکھیے گا۔

بڑی بیگم : واہ میری تاکید۔ تم برابر والے ہو۔ جب تمھارا کہا نہیں کرتیں، تو پھر کس کا کہنا مانے گی۔ تم اپنے طور پر سمجھاؤ۔ بہار النسا سمجھائے۔ کہو اب تو سُنا، تمھاری وکالت خوب چمکی ہے۔

نواب : جی ہاں آپ بزرگوں کی دعا سے صاحب تو مجھ کو چار سو کی منصفی دلواتے تھے۔ مگر میں نے منظور نہ کی۔ مجھے بہت کچھ خدا کے فضل سے یوں ہی مل جاتا ہے۔

بڑی بیگم : ماں تو تمھاری اچھی ہیں؟

نواب : جی ہاں بخیریت ہیں۔

بڑی بیگم : خفا تو نہیں ہوئیں کہ سسرال کیوں جاتے ہو؟ ایسا نہ ہو کہ ساس پھسلا دے

نواب : جی نہیں۔ واہ۔

بڑی بیگم : بیٹا زمانہ بہت نازک ہے، جہاں رہو اللہ کرے خوش رہو! بس ہماری تو یہی دعا ہے۔ زندگی، تندرستی، کھانے بھر کو رزق چاہیے۔ یہی ہزار نعمت ہے۔

نواب : بجا ہے۔

تھوڑی دیر تک باتیں کرکے، نواب ممدوح سے بڑی بیگم نے کہا: وہ کمرہ ہے سامنے۔ وہاں فرش بچھا ہوا ہے۔ لیٹو، آرام کرو۔ نواب صاحب سلام کرکے، اٹھ کھڑے ہوئے، اور کمرے کی طرف چلے۔ جب کمرے کے قریب پہنچے تو ٹھٹک گئے۔ اس وقت حسن آرا اور روح افزا، لہرا لہرا کر آہستہ آہستہ پڑھ رہی تھیں:

شراب تند دے ایسی ہی ساقی — کہ جس سے غم رہے مطلق نہ باقی

گلابی لاکے رکھ دے وہ میرے پاس — کہ ہو دولہن سے کی جس میں بو باس

چمک جا دے جو میرا جوہر عقل — کہ میں تجھ سے حکایت آن کردں نقل
سناؤں ابتدا سے پھر وہ قصّہ — کہ فی الواقع یہی تیرا ہے حصّہ

نواب صاحب ایک رسیا آدمی، بڑی دیر تک وہ لحن داؤدی اور نغمہ روح افزا، سنا کیے۔ اس کے بعد کہا، کہ اللہ اللہ آج تو گانا ہو رہا ہے۔

حسن آرا : (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ارے ہم تو بھاگتے ہیں۔

بہار النسا : اے بیٹھو بھی، کیا کچھ چوری پڑی ہے؟

روح افزا : آئیے، آئیے، آئیے۔ آئیے نہ۔

نواب : خلل انداز تو نہ ہوں گا۔

روح افزا : جی بجا ہے۔ آپ کی بیوی مثنوی پڑھ رہی ہیں، آپ جانیں، وہ جانیں،

اتنے میں نواب صاحب اندر تشریف لائے۔ وضع سنیے۔ جرّاب خاکی رنگ کا، گھٹنا چست، صوفیانہ رنگ، کرتہ سفید فلالین کا، اس پر سیاہ بیش بہا بانات کا دگلا۔ اور سبز گرنٹ کی گوٹ دس روپیہ کی سلائی، گھڑی اور زنجیر طلائی۔ سیاہ گرنٹ اُتو ہوتی بانکی تکلتے دار ٹوپی، اور ایک دلائی اوڑھے ہوئے۔ پاؤں میں تین روپیہ کا سیاہ وارنش کا بوٹ۔ عطر سے ازسرتاپا بسے ہوئے۔ سرخ و سفید مشین آدمی۔ حسن آرا اور سپہر آرا نے گردن نیچی کر کے بندگی کی۔ روح افزا نے کہا، کہ آپ بے اطلاع کیے ہمارے کمرے میں کیوں چلے آئے صاحب۔

نواب : حکم ہو تو الٹے پاؤں واپس جاؤں؟

بہار النسا : بسم اللہ، بن بلائے کوئی نہیں آنے پاتا۔

نواب : حسن آرا کو ہم نے پورے سوا برس کے بعد دیکھا۔

حسن آرا : (گردن نیچی کر کے) نہیں دولہا بھائی آپ کو یاد نہیں ہے۔ ساون میں آپ ایک مقدمہ کی پیروی کے لیے آئے تھے۔

سپہر آرا : جی ہاں دو دن آپ رہے تھے یہاں۔

نواب : ہاں سچ کہا خوب، یاد آیا۔

بہار النسا : آپ کی سالی سپہر آرا بیگم کو بڑا اشتیاق ہے، کہ آپ کے ساتھ بگھی پر ہوا کھانے جائیں۔

سپہر آرا : واہ کیا جھوٹ موٹ لگاتی ہو۔ بھلا میں نے کب کہا تھا؟
روح افزا : ہم گواہ ہیں۔
نواب : اچھا پھر اس میں عیب ہی کیا ہے۔ ہم نے تو ان سے (بہار النساء کی طرف اشارہ کر کے) کہا تھا کہ دو گھڑی چلا کرو ہوا کھانے۔
بہار النسا : اپنی عنایت تہہ کر رکھیے۔
روح افزا : اس وقت تو دولہا بھائی ان سے دور، قرآن، درمیاں، بالکل نواب نادر حسین معلوم ہوتے ہیں۔
حسن آرا : اے ہاں، خوب یاد آیا۔ جہاں آرا بہن کہہ گئی تھیں کہ جب خورشید دولہا آئیں تو ہم کو ضرور بلا لینا۔ بھیج دوں رقعہ۔
نواب : ضرور بلواؤ، آنکھیں ان کو ڈھونڈتی ہیں۔
سپہر آرا : وہ آپ کی شکایت کرتی تھیں، کہ خورشید دولہا آئے، اور ہم سے نہ ملے۔
نواب : ہاں سچ کہتی ہیں۔

اتنے میں روح افزا، ایک شیشے کی تشتری میں چکنی ڈلیا رکھ کر لائیں۔ نواب کے سامنے لے گئیں۔ نواب صاحب نے دو اٹھائیں اور کھالیں، چباتے ہی آخ تھو، آخ تھو۔
نواب : پانی منگواؤ، واسطے خدا کے۔

حضرات ناظرین سمجھے بھی کیا سمجھے؟ سالی نے بہنوئی سے اچھی دل لگی کی۔ بہنوئی اور سالی میں چہل ہوئی۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ وہ چکنی ڈلیاں لکھنؤ کے چابک دست، کامل فن کمہاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں (مٹی کی) نواب صاحب خاک نہ سمجھے۔ جھپ سے منھ میں رکھ ہی لیں۔ چباتے ہی مزہ کرکرا ہو گیا۔ ادھر ان پریزادوں نے قہقہہ لگانا شروع کیا۔ حضرت بہت ہی جھینپے۔ تھوڑی دیر کے بعد، جب منھ دھو چکے تو سپہر آرا نے گلوری دی۔
نواب : (گلوری کھول کر) اب یہ دیکھیے کھانے والے کی ایسی تیسی۔ کہیں اس میں مرچیں نہ جھونک دی ہوں۔ (پان کھا کر) اس وقت آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔
حسن آرا : باسی کھیر کھائیے تو لا دوں؟
نواب : نیکی اور پوچھ پوچھ۔

حسن آرا جا کر ایک قفلی اٹھا لائی۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے لی۔ کھولتے

ہیں تو مینڈکی اچک کر وہ ہوا ہیں۔

نواب : معقول، یہ روح افزا سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔ یک نہ شد، دو شد۔ انھوں نے سٹی کی سپیاری کھلائی۔ انھوں کے مینڈکی کی کھیر بنائی۔ ع۔ مینڈکی راز کام پیدا شد۔“ حسن آرا اور سپہر آرا اور روح افزا اور بہار النسار، مارے ہنسی کے لوٹ رہی تھیں۔

بہار النسا کا پراٹن صاحب بہادر کو طعنے دینا اور ان کی تینوں بہنوں کا کچا چھٹائیں لینا

شب کو نواب صاحب اور بہار النسار بیگم اور روح افزا اور حسن آرا اور سپہر آرا نے باہم خوب مزے مزے کی باتیں کیں۔ خوب چہچہے ہوئے۔ خوب قہقہے اڑے، چہل پہل رہی۔ حسن آرا اور سپہر آرا، ایک ہی کمرے میں سو رہیں۔ بہار النسار غائب۔ خیر سمجھ جائیے۔

بہار النسا : کہو تمھاری اماں جان تو جیتی ہیں یا ڈھلک گئیں۔

نواب : لاحول ولا قوۃ۔ کیلیے تکی اڑاتی ہو، اور دل دکھاتی ہو۔ مانا کہ وہ چڑچڑی ہیں، مگر پھر ماں ہیں۔

بہار النسا : ہاں ان کی تو محبت پھٹ پڑی ہے تم کو۔ آخر نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے کہ نہیں۔ بتیس دھار دودھ پلایا ہے کہ نہیں؟

نواب : تم ہمارے عیش کو منغص کر دیتی ہو۔

بہار النسا : تم کو میری پرواہی کیا ہے بھلا۔ کیا چکلہ نگوڑا اُجڑ گیا۔ یا بازار میں کسی نے جلتا بلتا سوختہ لگا دیا۔

نواب : اچھا اب اس وقت تو خدا کے لیے یہ باتیں نہ کرو کوئی چھ دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

بہار النسا : جی ہاں، ایسا ہی تو ہمارا پیار ہے نہ بہت۔

نواب : خدا گواہ ہے کہ ....

بہار النسا : بس چلیے خدا کا واسطہ نہ دیجیے۔ چپکے ہو رہیے۔

نواب : یہاں سے چلا جاؤں؟

بہارالنسا : ہاں کسی سے قول ہارے ہو، تو جاؤ تمھیں مردار بوڑھی ماں ہی کی قسم ہے۔ (دلہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے جو نہ جاؤ) واہ، کیا دھمکا لیا ہے۔ یہاں کچھ پروا بھی نہیں ایسی۔ جانو ہم اُنھیں پر تو پڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ہمارا ٹھور ٹھکانا ہی نہیں ہے کہیں (دوپٹا پھینک کر) یہ موا دوپٹہ تو اور بھی چھبتا ہے۔

راوی : دوپٹہ کا پھینکنا تھا کہ گوری گوری گردن اور پیارے پیارے ساعد سیمیں اور دست رنگین اور آڑی ہیکل، اور طوق اور جگتو کی چمک و دمک، جو نواب صاحب کی نظر سے گذری تو بس ستم ہو گیا۔ یا تو پہلے بہت ہی جھلائے تھے یا اب ریشہ خطمی ہو گئے۔ بہارالنساء کی بناوٹ سجاوٹ سے ع

سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا

نواب : کل ہم ہلکی سی اوڑھنی بنوا دیں گے۔

بہارالنسا : (بانکی ادا سے) اپنی اوڑھنی رہنے دیں آپ، یا شاہ چھڑے کی گل میں کسی کے پاس بھیج دیجیے :

تم کو تو دھیان یہی آٹھ پہرے کہ مجھے ۔۔۔ تت نیا روز ہر اک ماہِ شب افروز ملے

وہی چال چلیں گے کہ برابر والیاں ہم جولیاں ہم کو ہنسیں، اور نام رکھیں، اور ہم کٹ کٹ جائیں۔

نواب : اوخہ۔ اوخہ۔ اوخہ۔ اوخہ۔

بہارالنسا : (شوخی کے ساتھ دانت پیس کر) بس اب اوخہ۔ اوخہ۔ کروگے تو کاٹ کھاؤں گی لپک کے۔ اب میر مغزنہ کھائیے۔ پڑ کے سو رہیے۔

نواب : کیا؟ یہ نئی بات سنی آج۔

بہارالنسا : (مسکرا کر) اور نہیں تو۔

نواب : تمھیں ہماری ذرا محبت نہیں۔

بہارالنسا : جو نہ ہو تو ہم پر غیبی تباہی آئے، مگر تم جب اپنے ہتھکنڈے چھوڑ دیجی۔ یہ بارہ، بارہ، ایک ایک بجے غائب غلّہ رہنا چہ معنی دارد؟

نواب : طوفان نہ باندھیے۔

بہارالنسا : واہ آپ کی اماں اور بہنا ہی کا حصہ ہے۔

نواب : یا الٰہی تم جیسے لڑنے پر تیار ہو کر آئی ہو۔

بہار النسا : آئے ہی ہیں۔ کیا کچھ شک بھی ہے۔ یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ مجھے تمھاری سب خبر ہے۔

نواب : (ہکّا بکّا ہو کر) کیا ؟

بہار النسا : کیوں صاحب یہ پراٹن صاحب بن بن کر راتوں کو جانا۔ جاکٹ پتلون پہن کر کے دھمکانا، مجھ سے اڑتے ہو۔

نواب : ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

راوی : حضرات ناظرین یہ روایت طلب بات ہے۔ نواب صاحب بڑے مالدار اور امیر والانیاز۔ وکیلِ خوش تقریر، لائق تحریر، خوش وضع، خوش قطع، جوان تھے، مگر کسی قدر رنگین مزاج۔ بہار النسا بیگم تھیں تو انتہا کی طرح دار، اور طرّار ؟ مگر دن رات ناک چوٹی میں گرفتار، مگر حیا پرور اور پاک نظر۔ ان کو میاں کا اِدھر اُدھر جانا اور بد معاشی میں ہزاروں پلٹانا شاق گزرتا تھا۔ اسی سبب سے کبھی کبھی بیوی میاں میں چخ چل جاتی تھی۔ خیر۔ ع۔ "در میان جان و جاناں ماجرائی رفت رفت"

اب کی مرتبہ بہار النسا نے ایسی بات سنی تھی کہ ان کی چشم فسوں پرداز سے خون برسنے لگا۔ سنیے! ایک روز نواب صاحب جاکٹ پتلون ڈانٹ کر کہیں گئے۔ چرٹ منھ میں دبا تھا بھک، بھک، دھواں اڑاتے جاتے تھے۔ جب سڑک سے گلی اور گلی سے ایک اور گلی اور پھر ایک نالی سے ہو کر ایک ٹھیکڑے پر گئے، اور چڑھائی اتر کر ایک تنگ اور تیرہ و تار گلی میں داخل ہوئے تو دروازہ، دھم دھمایا، اور للکار کر غل مچایا کہ (اوپن دی ڈور) یعنی دروازہ کھولو۔ اندر سے آدمی آیا۔ آداب بجالایا، اور کانپتے ہوئے پوچھا، حضور کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟ کس کی تلاش میں آئے ہیں۔ حضرت نے ڈانٹ کر کہا، ول بیگم صاحب کو بلاؤ، کہو یہاں آؤ مسٹر پراٹن صاحب آیا ہے۔ کچھ پیگام (پیغام) لایا ہے۔ آدمی اندر گیا، اور باہر آن کر ڈرتے ڈرتے کہا کہ حضور کل تشریف لائیں۔ آٹھ بجے قدم رنجہ فرمائیں۔ ضرور آئیے گا۔ سرفراز فرمائیے گا۔ اس وقت پڑوس کی عورتیں آگئی ہیں۔

اب سنیے! کہ حسنِ اتفاق سے ایک کنجڑن جو پڑوس میں رہتی تھی، ان حضرت کو پہچان گئی۔ گھر میں جاکر بہار النسا بیگم سے اس نے کچا چٹھا کہہ سنایا۔ سنتے ہی آگ بھبھوکا ہو گئیں۔ سوچیں کہ آج آنے دو۔ دیکھو تو کیسا آڑے ہاتھوں لیتی ہوں، کہ پراٹن صاحب کا کہنا

بھول جائیں، مگر بہار النسا، ادھر ننہال چلی آئیں، اور بات جوں کی توں رہ گئی۔ اب ان کو موقع ملا کہ تخلیہ میں میاں کو سمجھائیں اور شرمائیں۔ نواب نے جو پتے پتے کی بات سنی تو سناٹے میں ہو گئے۔ یا الٰہی یہ کس نے آن کر ان سے کہہ دیا۔ ہم سمجھے تھے کہ ان کے فرشتے خاں کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوگی، غضب ہو گیا۔

بہار النسا : (شانہ ہلا کر) فرمائیے حضرت پراٹن صاحب!

نواب : کچھ خیر ہے۔

بہار النسا : چہ خوش۔ یہ بھی کوئی خیر کی باتیں ہیں۔

نواب : تو کچھ کہو تو۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ۔

بہار النسا : (مسکرا کر) ہاں، ہاں، آپ کیا سمجھیں گے۔ ہم ہندوستانی آپ خاص ولایت کے پراٹن صاحب۔ ہماری بولی آپ کیا سمجھیں گے بھلا۔ گٹ پٹ ہمیں آتی نہیں۔ پراٹن صاحب! ادھر دیکھیے صاحب بہادر، ذری ادھر دیکھیے براٹن صاحب بہادر۔

نواب : (گردن نیچی کر کے) کہیں بھنگ تو نہیں پی گئی ہو۔

بہار النسا : سیزی نہ پی ہوتی تو پراٹن صاحب کون بنتا۔

نواب : خدا گواہ ہے جو کچھ سمجھ میں بھی آیا ہو کہ تم کہتی کیا ہو؟

بہار النسا : گریباں میں منھ ڈالو۔ بہت بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ اب بھی تم نہیں شرمائے بڑے حیادار ہو، اور تو کیا کہوں۔

نواب : کیا خوب ابھی کچھ کہنا باقی بھی ہے شاید۔

بہار النسا : ہئی۔

نواب : اچھی کہانی چھیڑی۔

بہار النسا : جلائے جاؤ۔ اور پھر کہو دھواں نہ نکلنے پائے۔

نواب : (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) تمھارے دشمن۔

بہار النسا : اللہ جانتا ہے ہمیں حسد ہوتا ہے۔ پھر ہمیں کیوں بیاہ کر لائے تھے۔ یاد ہے؟ نکاح کے وقت کیا کیا لمبے چوڑے اقرار کیے تھے۔ اب ایسے غافل ہو گئے۔ پراٹن صاحب بن گئے۔ پراٹن صاحب۔ ہونھ۔

ایک نیا لطیفہ سنیے! ادھر میاں بیوی میں یہ شکوہ و شکایت کی باتیں ہوتی تھیں، اور

اُدھر حسن آرا، اور سپہر آرا، اور روح افزا دروازے کے پاس کھڑی چپکے چپکے جھانکتی، اور چوری چوری، ساری داستان سن رہی تھیں۔ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ جب ضبط نہ کر سکیں، تو برآمدے پر جاکر خوب ہنسیں، اور پھر آن کر کھڑی ہو گئیں۔ روح افزا، اور حسن آرا تو آہستہ آہستہ قدم رکھتی تھیں، تاکہ آہٹ معلوم نہ ہو۔ لیکن سپہر آرا کی شوخی کب اس کی مقتضی تھی، کہ دبے پاؤں جائیں۔ حسن آرا، اور روح افزا نے سمجھا دیا کہ دیکھو کہیں راز کھل نہ جائے، تو پھر بھاگنا پڑے۔ تھوڑی دیر تک تینوں بہنیں کھڑی سنا کیں۔ ایک مرتبہ بہار النسا، نے زور سے نواب کا ہاتھ جھٹک کر کہا، آپ تو پراٹن صاحب ہیں، اور میں ایک ہندوستانی عورت ہوں۔ آپ تشریف لے جائیں۔ ہم پراٹن صاحب کو گھر میں گھسنے نہ دیں گے۔ اس پر نواب صاحب نے کہا! ع۔ دیوار گوش دارد، فہمیدہ لب بجنیاں،، اتنا کہنا تھا کہ سپہر آرا کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کے ہنستے ہی حسن آرا، اور روح افزا بھی بیساختہ ہنس پڑیں۔ اور ہنسی کی آواز سنتے ہی۔ بہار النسا، دھک سے رہ گئی۔ اور نواب صاحب بھی ہکا بکا ہو گئے۔

نواب : تمھاری بہنیں بڑی شوخ ہیں۔

بہار النسا: یہ کہاں کی دل لگی نکالی ہے۔

روح افزا: بہن سلام۔

سپہر آرا : دولہا بھائی بندگی عرض ہے۔

حسن آرا : میں بھی پراٹن صاحب کو آداب عرض کرتی ہوں۔

راوی : پراٹن صاحب کے لفظ پر، ادھر بہار النسا، بیگم اور نواب صاحب اور اُدھر روح افزا اور حسن آرا، اور سپہر آرا نے وہ فرمائشی قہقہہ لگایا کہ فلک چہارم تک آواز پہنچی۔

بہار النسا، بیگم، اور ان کے شوہر نواب صاحب بہادر پر جو آوازے کسے گئے، تو دونوں سخت جھینپے۔ نواب صاحب نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی، اور بہار النسا، بیگم کا رُخ رنگین عرق آلود ہو گیا۔

بہار النسا : (آہستہ سے) ارے!

نواب : اف لاحول ولا قوۃ۔ سمجھا دو یہ بُری بات ہے۔

سپہر آرا : لاحول، کیا شیطان کو بھگاتے ہو۔ پراٹن صاحب؟

بہارالنسا : (کمرے سے نکل کر) اے تو اب بھاگی کہاں جاتی ہو۔

روح افزا : بس اب جائیے۔ پراٹن صاحب سے باتیں کیجیے۔

بہارالنسا : آؤ، آؤ! تمھیں حسنین کی قسم۔

سپہر آرا : آئیں کیا۔ کس کے پاس آئیں۔ کوئی بھائی بند اپنا ہو تو آئیں بھلا پراٹن صاحب کو کیا مُنھ دکھائیں۔

نواب : لاحول ولا قوۃ۔ اس پراٹن کے نام نے ہمیں خوب جھنڈے پر چڑھایا۔ لاحول ولا قوۃ کیسے رسوا ہوئے ہیں۔

بہارالنسا : پھر اپنے کرتوتوں۔

نواب : اب واسطے خدا کے کہیں جہاں آرا سے نہ کہنا۔

حسن آرا : خدا کی قسم ضرور کہیں گے۔ ہم، کہ تمھارے خورشید دولہا پراٹن صاحب بن گئے۔

نواب : خدا ہی خیر کرے۔

بہارالنسا : خیر کیا؟

سپہر آرا : اب تو قلعی کھل گئی۔

حسن آرا : کہی کچھ۔

روح افزا : دولہا بھائی!

حسن آرا : ہائیں پراٹن صاحب نہیں کہتی ہو۔

روح افزا : ہاں بھول گئی۔

بہارالنسا : اب ہم بھی سیم بن جائیں گے۔

نواب : بسم اللہ۔

بہارالنسا : شرمائے تو نہ ہوں گے۔

روح افزا : شرما چکے۔

بہارالنسا : جاؤ بہن۔ اب سو رہو۔

الغرض تینوں بہنیں قہقہے لگا کر سو رہیں، اور بہارالنسا بیگم نے مصنوعی پراٹن صاحب

کا قصور معاف کر دیا۔ سچ ہے:

دلوں میں کہنے سننے سے عداوت آ ہی جاتی ہے
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں محبت آئی جاتی ہے

نوابی دربار، اور خوشامدیوں کی گرمی بازار، اللہ رکھی کا جوگن ہونا، اور عیش و عشرت سے ہاتھ دھونا

حضرات ناظرین! بالقول ادھر کا ذکر تو تہہ کر رکھا۔ اب دوسرا تذکرہ سنیے! ایک برق وش تدرو رفتار، مقرّر لسان، اور نغز گفتار، حسینہ و جمیلہ، جس کا جوبن اور شباب پھٹا پڑتا تھا۔ ایک سفید ساری دلائی اوڑھے، چمکتی ہوئی جاتی تھی، اور جھڑوں کی جھنکار، اور کڑوں کی کھنکار، ستم ڈھاتی تھی۔ فرمایئے یہ کون آفت کا پرکالہ ہے؟ نہ حسن آرا، نہ سپہر آرا، نہ روح افزا، نہ بہار النساء، وہ تو سو رہی ہیں۔ یہ بی اللہ رکھی ہیں۔ وہ شوخ و شنگ، چلبلی عورت، جو میاں آزاد پر ریجھی تھیں۔ جن کو شوق چرّایا تھا، کہ میاں آزاد کی چاہتی بیوی بنیں، سرِ بازار بال کھولے ہوئے، چھم چھم کرتی جاتی تھیں۔

حسنِ اتفاق سے بی اللہ رکھی کا ایک ایسے مقام پر گزر ہوا، جہاں ارباب بذلہ سنج کا جمگھٹا تھا۔ سب بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے۔ اتنے میں۔ یہ جو ادھر سے چھماچھم کرتی ہوئی نکلیں، تو اکثر بگڑے دلوں نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی پلٹ پڑیں۔ یار لوگ سمجھے کہ گھیرے ہیں۔ مگر واہ ری اللہ رکھی، پاک دامن ہی آئی۔ اس ٹکڑی کی طرف گئی۔ دیکھا کہ ایک باغیچہ فرح بخش کے وسط میں، مرّبع چبوترہ ہے۔ اس پر فرش مکلّف بچھا ہے، اور صدر میں بیش بہا مسند پر ایک رئیس والاتبار، بصد کرّوفر متمکن ہیں۔ ارد گرد مصاحب، رفقار، بیٹھے، حقے گڑگڑا رہے ہیں۔ دھواں دھار۔ بی اللہ رکھی بھی جا کر ایک ٹھسّے کے ساتھ، مسند کا کونہ دبا کر بیٹھیں۔

نواب: یوں آئیے بی صاحب۔

بی اللہ رکھی: کھسک کر، بہت خوب۔

مصاحب: (دوسرے مصاحب کے کان میں) کیا زمانہ ہے واہ ہائے افسوس، ہم شریف اور شریف کے لڑکے، اور یہ وقعت کہ جوتیوں پر بیٹھے ہیں، اور کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔

دوسرا مصاحب : (پہلے مصاحب سے) یار کیا کہیں، والد مرحوم چکلہ دار تھے۔ جس کا چاہا بھنا سا سر اڑا دیا۔ ڈنکا سامنے بجتا تھا۔ گڑم دھم، گڑم دھم۔ انھیں آنکھوں وہ بھی دیکھا کہ، دو رویہ آدمی فرشی سلام کرتے تھے، اور انھیں آنکھوں اب یہ بھی دیکھ رہے ہیں، کہ بیسوا آن کر مسند کا کوتا دبا کر بیٹھ گئی اور نواب بولے کہ یوں آیئے یوں آیئے۔ واہ ری قسمت، (پیشانی پر دھول لگا کر) پھوٹ گئی قسمت۔

نواب : آپ کا اسم شریف بی صاحب؟

اللہ رکھی : حضور مجھے اللہ رکھی کہتے ہیں۔

نواب : کیا پیارا نام ہے۔

مصاحب : واہ حضور! نام کیا بتایا، دل مسوس لیا۔

نواب : کیا؟

مصاحب : کچھ نہیں حضور۔ بس اب کیا کہوں۔

اللہ رکھی : حضور کس ملک سے آئے ہیں؟

رفیق : پیر و مرشد! اس وقت دل کا عجب حال ہے۔ زندگی وبال ہے۔ اب چاہے آپ برا مانیں، چاہے بھلا۔ ہم تو بیچ کھیت کہیں گے کہ آپ غریب پرور اور شریف پرور نہیں ہیں۔ آپ پاجی پرست ہیں بس۔ غضب خدا کا یہ ٹکے کی بازاری عورت، مسند پر آن کے بے دھڑک بیٹھ جائے، اور آپ اس کے ساتھ اس تعظیم کے ساتھ پیش آئیں، اور پاس بٹھائیں۔ ہم شریف، وضع دار، عالی خاندان، لوگ ٹھوکریں کھائیں۔ آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔ خداوندا یہ کیسے کیسے گوکھے رئیس جمع ہیں یہاں دنیا میں۔

اتنا کہنا تھا کہ ایک دبلے پتلے مصاحب، بگڑ کھڑے ہوئے، اور لپک کر رفیق کے منھ پر ایک لپٹر جما یا۔ وہ آدمی تھے کرارے۔ لپٹر کھاتے ہی آگ ہو گئے۔ جھپٹ کے اس کمزور مار کھاتے کی نشانی کے ہفتے گانٹھ لیے۔ اس پر کل مصاحب اور رفقا، اور حوالی موالی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک : ہائیں، ہائیں، ہائیں،

دوسرا : ارے او نا معقول!

تیسرا : (کمر کس کر) چھوڑ دے۔

چوتھا : اتنی لاتیں جمائی ہوں گی کہ بھرکس نکل جائے گا مردک کا۔

پانچواں : مردک جس کا نمک کھاتا ہے، اسی کو گالیاں سناتا ہے۔

نواب : ارے اس بدبخت کو نکالو۔

مصاحب : پیرومرشد، یہ گردن زدنی، مارنے کے قابل ہے۔

دوسرا رفیق : دیکھیے تو نمک حرام کی باتیں۔ آپ کے منھ پر حضور، آپ کو، آپ کے مرے ہوئے نامی باپ کو بے نقط سنائیں۔

نواب : آج سے دربار میں نہ آنے پائے۔

حاضرین : بہت خوب حضور!

نواب : اجی اب بیچ بچاؤ تو کرادو۔

الغرض، تین چار آدمیوں نے، اس دبلے پتلے مصاحب کو رفیق شہ زور سے بچایا۔ دربار بھر میں ہلڑ۔ اللہ رکھی کھڑے کھڑے تھرتھراتی تھی۔ اور نواب صاحب اس کو تشفی دیتے جاتے تھے۔

نواب : نہیں، نہیں، گھبراؤ نہیں، کانپتی کیوں ہو۔

ایک مصاحب : (اللہ رکھی سے) اے حضور آپ نہ گھبرائیں۔

دوسرا مصاحب : واللہ بی صاحب جو ذرا بھی آپ پر آنچ آئے۔

تیسرا مصاحب : کیا مجال۔

نواب : تم تو میری پناہ میں ہو جی۔

اللہ رکھی : جی ہاں! مگر خوف سا معلوم ہوتا ہے۔

نواب : میں ابھی اس موذی کو یہاں سے نکلوائے دیتا ہوں۔

خدمت گار : حضور! وہ باہر کھڑے سب کو گالیاں دے رہے ہیں۔

اب سنیے کہ سب نے مل کر رفیق کو باہر نکلوادیا، مگر وہ ایک ہی شورہ پشت آدمی تھا۔ باہر جاکر بے نقط سنانا شروع کیا۔

رفیق : ایسے رئیس پر آسمان پھٹ پڑے، جوان سال زادیوں، ٹکے ٹکے کی عورتوں کو شریفوں پر ترجیح دے۔ کسی زمانہ میں ہم بھی فیل نشیں تھے۔ ہمارے یہاں بھی چودہ، چودہ، ہاتھی معرق ڈیوڑھی پر جھومتے تھے۔ آج اس تازہ دولت نے ہم کو پائیں فرش پر بٹھایا، اور

اس کم بخت عورت کو مسند پر جگہ دی۔ بازاری عورت کو خدا اس مروک سے سمجھے۔ لاحول ولا۔

نواب : یہ کون غل مچا رہا ہے۔

مصاحب : وہی ہے حضور۔

حاضرین : نہیں حضور وہ کہاں۔ وہ بھاگا پٹا توڑ۔ یہ کوئی فقیر بھوکوں مرتا ہے۔ نواب صاحب سے سوال کر رہا ہے۔

نواب : کچھ دلوا دو۔

مصاحب : بہت خوب، اجی داروغہ جی۔

داروغہ : ہُوت۔

مصاحب : اس سید کو دس روپیہ دے دو۔ سادات ہے بے چارہ۔

داروغہ : بہت اچھا۔

راوی : اے سبحان اللہ، کیا کہی واللہ۔ دس روپیہ تلوہ اڑائے اور سادات کی ایک ہی کہی۔

اس کے بعد اس رفیق نے ڈیوڑھی پر سے غل مچایا۔ خوب چلّایا، تو نواب چونکے۔

نواب : کوئی ہے؟

خدمت گار : حاضر حضور!

نواب : ادھر آؤ۔

خدمت گار : حاضر حاضر۔

نواب : اب یہ کون چلّایا؟

خدمت گار : حضور۔

نواب : جلد بتاؤ۔

خدمت گار : جا کر دیکھیں تو معلوم ہو۔

نواب : ابھی جاؤ۔

خدمت گار : بہت خوب۔

راوی : خدمت گار نے جو باہر جا کر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ وہی رفیق نواب صاحب کو گالیاں دے رہا ہے، کہ اس عورت کو جو بازاری ہے اس عنایت کے ساتھ مسند پر بٹھایا۔

اور ہم شریف زادوں کی خبر بھی نہ لی۔ داروغہ اور مصاحبوں نے اس کو راہ ہی میں روکا۔ اور سمجھایا، کہ اگر تم نے ٹھیک ٹھیک کہہ دیا تو ہم تم کو ذبح کر ڈالیں گے۔ خبردار یہ نہ کہنا کہ وہی رفیق گالیاں دے رہا ہے۔ بلکہ یوں بیان کرنا کہ وہ سیّد تو دس روپیہ انعام پا چکا۔ مگر جس وقت اس کو انعام دیا گیا، اس وقت اور لوگ وہاں موجود تھے۔ وہ سیّد تو حضور کو دعائیں دے رہا ہے، اور فقیر اور سادات اور درویش اس امر کے طالب ہیں کہ حضور کے دربارِ دُر بار، عظمت آثار سے کچھ انعام پائیں۔

راوی : سبحان اللہ۔ واہ رے خدمت گار اور واہ رے رفیقو۔ کیا خوب پٹی ہے، خدا کی قسم روح وجد کرنے لگی۔ کیا خوب بات بنائی ہے، کہ سید تو انعام پا کر دعائیں دے رہا ہے۔ ، اور جس وقت اس کو انعام دیا گیا، اس وقت اور فقرا دیکھتے تھے۔ وہ غل مچا رہے ہیں کہ حضور اس دریا سے ہم کو بھی کچھ ملے۔ نواب نام دار تو ایک بھولے بھالے، سادہ مزاج آدمی تھے، فوراً تسلیم کر لیا، کہ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ فرمایا کہ اسی دم سب فقیروں اور درویشوں کو انعام ملے۔ توڑوں کے منھ معاً کھولے جائیں۔ کوئی اس دربار سے محروم نہ جائے، ورنہ اس وقت بڑی ہیٹی ہو گی، اور میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ والد مرحوم کو خدا بخشے، کروڑوں درویش اور فقرا ان کی وجہ سے پرورش پاتے تھے، مردے جی جاتے تھے۔ یہ تھوڑے سے آدمی بھلا کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ ابھی ان سب کو روپیہ دیا جائے۔

مصاحب : داروغہ، داروغہ جی!

داروغہ : کہو، کہو۔

مصاحب : ان فقیروں کو چالیس روپیہ دے دو۔

نواب : کیا؟ چالیس، لاحول، اجی سو روپیہ تقسیم کرو۔

مصاحب : اے خدا سلامت رکھے۔

رفقا : واہ، وا، میرے مخبر نواب کیوں نہ ہو۔

داروغہ : (مصاحبوں سے) کیا رائے ہے۔

مصاحب : کچھ ہوتے ہو۔

رفقا : رائے کیا۔ خوردم۔ بُردم۔

داروغہ : لاؤ ہاتھ۔

مصاحب : ارے میاں ایسے گوکھے رئیس کہاں ملیں گے۔
رفقا : بیشک۔
مصاحب : کیا پاگل ہے واللہ۔
رفقا : گوکھا، بے وقوف۔
مصاحب : کہہ دو کہ حضور دے آئے۔
داروغہ : اور جو وہ پھر غُل مچائے۔
رفقا : اجی اس کو نکال باہر کرو، مردود کو۔
داروغہ : اچھا۔
مصاحب : دو دھکّا۔
داروغہ : ابھی۔

داروغہ نے تین گراں ڈیل، کرارے آدمیوں کو بھیجا کہ جو غُل مچا رہا ہے، اس کو ابھی نکال دو۔ گردن میں ہاتھ دو، اور رگیدتے ہوئے کوسوں لے جاؤ۔ اور کہہ دو، کہ اگر اب کی غل مچایا تو تم کو ذبح کر کے پھینک دیں گے۔

خدمت گار : اسی دم۔

یہ کہہ کر خدمت گار گئے، اور اس رفیق کی گردن ناپی۔ وہ بے چارہ گالیاں دیتا، اور کوستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مگر چلتے چلاتے اس نے اللہ رکھی کو کروڑوں صلواتیں سنائیں، اور اللہ رکھی نے سب باتیں سنیں۔ نواب تو اس وقت افیم کی پینک میں غش تھے۔ ان کی بلا سنتی کہ کیا کہہ رہا تھا۔ اللہ رکھی بے چاری کی روح پر صدمہ تھا، کہ ایک شخص خدا واسطے کو اس کو بے نقط سنا رہا ہے۔

اللہ رکھی : (نواب سے) ہمیں اس نے بہت گالیاں دیں۔
نواب : کیا مجال۔
اللہ رکھی : واہ
نواب : کیا طاقت اس کی۔
اللہ رکھی : حضور! قسم خدا کی۔
نواب : وہ نواب بھاگ گیا۔

راوی : بجا۔
اللہ رکھی : وہ موا گالیاں دے رہا ہے۔
نواب : تمھیں وہم ہے۔

نواب نامدار، والا تبار نے لاکھوں قسمیں دیں، اور ہزاروں جتن کیے کہ بی اللہ رکھی کھانا کھائے۔ جی چاہے تو اٹھیں کے باغ فرح بخش و دل کشا، شاداب و نزہت انتما میں کچھ روز فراغت تمام آرام فرمائیں، لیکن بی اللہ رکھی نے ایک نہ مانی۔ دل میں ٹھانی کہ اگر نواب سونے کا بھی بن کر آئے اور قارون ہی کا سامال دار ہو جائے، تو بھی اس کے ہاں دم بھر ٹھہرنا ناگوار ہے۔ ایسی ذلت اٹھانے سے جی بیزار ہے۔

اس منہ پھٹ رفیق کا بار بار طعنے دینا، اور اللہ رکھی کا نام لینا۔ اور اس بے چاری کو ٹکے کی عورت بیسوا کہنا، اور اس کا ضبط کرنا، مصیبت سہنا، ان سب باتوں سے اللہ رکھی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، تو نواب صاحب ہی شرمائے، کہ اللہ ری ہماری

یہ ہنس مکھ خندہ پیشانی، جان جانی، ہنستی کھل کھلاتی آتے۔ ہماری صحبت اس ہنسوڑ، ٹھٹھول، تک کو رلائے۔ ہماری صحبت باعث بدنامی ہے۔ جو ہے صید ناکامی ہے:

در محفل خود، راہ مدہ ہم چوں منی را افسردہ دل افسردہ کند انجمنی را

نواب نے قسمیں دے دے کر یوں پوچھا۔ سچ کہیے بی اللہ رکھی صاحب آخر میں کس قصور پر مورد عذاب ہوا۔ مجھ سے کون سا کردارِ ناصواب ہوا۔ اگر لاعلمی میں کوئی خطا ہوئی ہو معاف کرو۔ آئینۂ دل سے کدورت کو صاف کرو۔

اللہ رکھی : یہ کیا باتیں ہیں۔ جانیں، ہمیں اس وقت کیا یاد آیا۔ کس کے خیال نے رلایا۔ کس سبب سے آنسو آیا۔
نواب : اچھا بندہ تو بے قصور ہے۔ یا اس میں کچھ فتور ہے۔
اللہ رکھی : حضور! یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ ہماری سی بے حیا زندگی نگوڑی، کسی کی نہ ہو۔ یہ سب اپنے کرتوتوں ہوا۔ ماں بات نے اندھے کنویں میں ڈھکیل دیا۔ ایک بوڑھے کھسٹ کے ساتھ بیاہ دیا۔ آپ تو چین اڑایا کیے۔ ہمیں بھاڑ میں جھونک گئے۔ بوڑھے میاں شادی کرتے ہی بھاگ کے دوسرے شہر ہو رہے۔ ہم شام سے رو پیٹ کے سو رہتے تھے۔ دن کو بے قراری، رات کو اختر شماری، اور بزم گریہ و زاری۔ ہمارا چودہ پندرہ برس کا سن

ان کے حلوا کھانے کے دن۔ آج موئے کل دوسرا روز۔ ایک ایک ہڈی بدن کی گن لیجیے، مُنھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ان کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ مگر ایک ہی دفعہ عمر بھر میں موئے کو دیکھا تھا۔ بس پھر جو دیکھا ہو تو آنکھیں پھٹ ہو جائیں۔ ایک دفعہ خط بھیجا تو اس کے جواب میں بہت کچھ للّو پتّو، تتو تھبو، آؤ بھگت کی مگر زبانی داخلہ۔ بارے انٹا غفیل ہوے تو ہماری ماں نے بڑا جشن کیا، ہم نے کہا۔ امّاں اب ہمیں کسی جوان اور بھلے مانس کے ساتھ بیاہ دو۔ وہ تو راضی ہوگئیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے، کوئی اسّی روپیہ مہینے کا وظیفہ ہے۔ اور ان کا لڑکا میں جانوں کوئی بیس برس کا ہوگا۔ اسکول ماسٹر ہے سو روپیہ ملتا ہے مہینہ۔ پڑھا لکھا آدمی۔ چال چلن اچھا۔ خندہ پیشانی، نک سک سے درست، لسّاں، خوش تقریر۔ مکان کوئی دس بارہ ہزار کا۔ اس لڑکے کا کمرہ بھی خوب سجا سجایا تھا۔ آدمی خوش سلیقہ ہے۔ بڑے باتمیز۔ ان کے باپ مولوی آدمی ہیں۔ دور دور سے ان کے پاس پڑھنے کے لیے آتے جاتے ہیں۔ عورتیں سب سلیقہ والیاں اور ملنسار، تین چار دفعہ مجھ سے اور ان سے آنکھ لڑی تھی۔ ایک دفعہ اس نے اپنی مہری بھیجی، اور کہلایا کہ ہم اپنے والد سے کہیں، جو تم راضی ہو۔ میں سوچی کہ غضب ہو جائے گا، جو کہیں کھل جائے نکاح سے پہلے ہی سے بات چیت تھی۔ پیغام آتے جاتے تھے۔ مہریوں کی زبانی معاملے بھگتے تو لوگ طوطان باندھیں گے۔ اس سے میں چپکی ہو رہی، مگر اماں جان نے کہہ دیا کہ خبردار لڑکی کو اب نہ بیاہنا۔ بیوہ کا نکاح بھلے مانسوں میں نہیں ہوا کرتا۔ کہاروں میں، جولاہوں میں، دھوبیوں میں، ہو تو ہو، تمھیں شرم نہ آئے گی کہ ایک کے ساتھ پہلے بیاہا، اب دوسرے سے نکاح ہو۔ واہ خاندان میں بٹہ لگاؤ گی۔ جس میں ہفتاد و دو پشت تک کا نام بد ہو۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے بھلا۔ آج تک کسی بھلے مانس کی بیوہ کی شادی ہوئی ہے۔ خدائی بھر میں۔ پس وہ چٹ سے بدل گئیں۔ اب کوئی سوچو تو، کہ ہم تو دن رات جلیں پھکیں مریں، کھپیں، جوانی مفت میں برباد ہو جائے، اور وہ کہیں کہ بھل منسی کا خیال ہے یا نہیں۔ واہ اچھی بھل منسی ہے۔ ٹپکی پڑے ایسی بھل منسی نگوڑی پر، ہم درگذرے۔ اے بس میں تو ایک رات کو گھر سے نکل بھاگی۔ اس دن سے آج تک، جیسی پاک پیدا ہوئی تھی۔ ویسی ہی ہوں۔

آج اس آدمی نے ہزاروں باتیں سنائیں، اور کہا کہ یہ ٹکے کی عورت ہے۔ یہ بیسوا ہے۔ یہ ایسی اور یہ ویسی، اور کیا جانے کیا کیا کہا، میرا دل بھر آیا۔ عمر بھر میں ایک تو اس مولوی صاحب

کے لڑکے سے آنکھ لڑی تھی، دوسرے ایک اور تھے میاں آزاد، ان سے شادی کرنے کا۔۔۔

نواب : کون کون، کس کا نام تم نے لیا؟

مصاحب : حضور وہی کہا۔

رفیق : اچھا پتا لگا۔ خدا کی قسم خوب ہی ملے، ہاں جی صاحب فرمائیے۔

نواب : بعد مدت آج ان کا نام سننے میں آیا ہے۔ بڑے دوست ہیں۔

مصاحب : نواب صاحب کے وہ دوست ہیں صاحب۔

رفیق : ہاں حضور، روٹھ کر چلے گئے تھے۔

راوی : اللہ رکھی نے جو میاں آزاد کا نام لیا تو نواب نامدار، اور ان کے مصاحبین سلیقہ شعار چوکنّا ہوئے۔ ایک دوسرے کی طرف نظر حیرت سے دیکھنے لگے۔ اللہ رکھی سمجھی کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے، ورنہ وجہ کیا، کہ اس قدر تا اصرار بلیغ پوچھا۔ لوگ ایک ہی کائیاں۔ پرلے سرے کا خرانٹ۔ وہ تاڑ گئے کہ اللہ رکھی کو کچھ شک ہوا ہے۔ فوراً بگڑی ہوئی بات بنائی۔ کہ میاں آزاد، نواب صاحب کے دوست ہیں۔ روٹھ کے چلے گئے تھے۔ تاکہ بی اللہ رکھی صاف صاف ان کا حال بتادیں۔

نواب : ہم کو ان کی خبر ملے، تو ہم فوراً بلوالیں۔

اللہ رکھی : وہ تو باہر کہیں گئے ہیں۔

نواب : باہر، باہر کہاں؟

اللہ رکھی : کسی اور ملک کو گئے ہیں۔ نام اس کا مجھے معلوم ہی نہیں۔

راوی : حضرات ناظرین! آپ کچھ سمجھے بھی۔ یہ نواب صاحب کون ہیں۔ بھلا پوچھیے تو سہی۔ سنیے! یہ وہ نواب صاحب ہیں، جن کا بٹیر صف شکن تھا۔ وہی حقانی بٹیر جس کو میاں آزاد نے چھپا دیا تھا۔ جس کے منانے کے لیے میاں آزاد بھیجے گئے تھے، اور اونٹنی پر سوار ہو کر لکھنؤ میں داخل ہوئے، اور یہاں اللہ رکھی سے ملاقات ہوئی تھی۔

اللہ رکھی نے کل باتیں صاف صاف بیان کردیں، اور یوں کہا:

اللہ رکھی : وہ ہمارے یہاں اترے تھے سرا میں۔ آدمی خوبصورت اور جوان اچھے ہیں۔ ایک اونٹنی پر آئے تھے، بہت دن تک رہے۔ کہتے تھے کہ ہم کو ایک بھولے بھالے نواب مل گئے ہیں۔ جس راہ ہم ان کو چلاتے ہیں، اس راہ وہ چلتے ہیں۔ جو ناچ ہم ان کو نچاتے

ہیں۔ وہ ناچتے ہیں۔ عجب نواب تھے۔ انھوں نے ایک بٹیر پالا تھا۔ اس کو میاں آزاد نے کابک سے نکال کر چھپالیا، اور نواب صاحب سے مصاحبوں نے کہا، کہ حضور کیا بٹیر تھا۔ ایک بولا مینڈھے سے ٹکر لڑتا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ سجدہ کرتا تھا۔ تیسرا موا خوشامد خور بولا کہ پیرو مرشد وہ رمضان شریف میں روزہ رکھتا تھا۔ اے بس سب کے سب نے مل کر نواب کو الّو بنا لیا۔ ہاں میں ہاں ملاتے گئے۔ میاں آزاد کو اونٹنی دی گئی۔ وہ یہاں گل چھرّے اڑایا کیے، اور رنگ رلیاں منایا کیے۔ بس ان سے تو شادی کرنے کا البتہ جی چاہا۔

اس تقریر کو سن کر مصاحبوں اور رفیقوں اور حوالی موالی، کل حاضرین دربار کے ہوش اڑ گئے۔ جیسے دیکھیے شرمایا ہوا۔ دل میں آزاد اور اللہ رکھی دونوں کو صلواتیں سنا رہا ہے۔ نواب اس وقت مارے شرم کے گڑے جاتے تھے۔ عمر بھر میں آج ہی تو ان کو خیال آیا کہ ایسے مصاحبوں سے نفرت کرنا لازم ہے۔ جس وقت انھوں نے اللہ رکھی کی زبانی سنا کہ نواب کو الّو بنایا۔ نواب بھولے بھالے تھے۔ بٹیر کو حقانی سمجھتے تھے۔ جس نے جو کچھ کہہ دیا نواب نے فوراً مان لیا۔ اس وقت کٹ کٹ جاتے تھے۔ مصاحبوں نے اشاروں سے باہم گفتگو کی، اور لاکھ لاکھ چاہا کہ رنگ جمائیں، مگر جو فقرہ کہا اوچھا۔ تیر بہدف نہیں نواب اور بھی بد دماغ ہو گئے، اور جھڑکنے لگے۔

نواب : ہم آپ کے بڑے مشکور ہیں۔

اللہ رکھی : واہ، ہم کیا ہیں بھلا۔

نواب : آپ نے اس وقت ہماری عقل کی آنکھیں کھول دیں، ورنہ بالکل اندھے ہی تھے۔

اللہ رکھی : آپ کے دشمن۔

نواب : ہمارے دشمن ہمارے سامنے بیٹھے ہیں (مصاحبوں کی طرف اشارہ کر کے)

مصاحب : غریب پرور۔ اللہ جانتا ہے کہ ہم کیسے جاں نثار ہیں۔

نواب : بس ہم سمجھ گئے۔

مصاحب : حضور! توپ دم کر دیجیے جو ذرا خطا ہو۔ نمک حلال، کٹ مرنے والے۔ جان دینے والے آدمی ہیں۔

نواب : بس اب زیادہ پڑھاؤ نہیں۔ بک بک سے کیا فائدہ۔ اب قلعی کھل گئی۔ اُف! برسوں کے بعد چونکے ہم۔

مصاحب : اللہ جانتا ہے خداوند کہ۔۔۔۔

نواب : کچھ اب قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ جو ہوا وہ ہوا۔ آئندہ سمجھا جائے گا۔

اللہ رکھی : کیا؟ ہم تو کچھ سمجھے ہی نہیں کہ تم سب یہ کیا باتیں کر رہے ہو۔

نواب : وہ جس نواب کم بخت کا، بد نصیب کا تم نے ذکر کیا۔ وہ میں ہی ہوں۔

اللہ رکھی : (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ہائے افسوس۔

نواب : افسوس کرتی ہو تم کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک رئیس ان موذیوں کے پنجے سے چھوٹا۔

اللہ رکھی : اللہ جانتا ہے، جو ہم کو معلوم ہوتا، تو حشر تک یہ ذکر نہ کرتے۔

نواب : خدا کی قسم! تم نے مجھ پر اور میرے باپ دونوں پر اس وقت احسان کیا ہے۔ جو تم نہ اطلاع دیتیں، تو مجھے ان سے چھٹکارا ابھی نہ ملتا۔ خدا نے بچا یا۔ خیر اتنے دن تک جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب ہم بھی سر سو گئے۔ تم نے اس وقت ہمیں جلا لیا۔ نہیں ہمارا تو کہیں ٹھکانا ہی نہ ہوتا۔

اللہ رکھی : ہاں ہے تو ایسا ہی۔

مصاحب : حضور! جس نے جو کہہ دیا، حضور نے مان لیا۔ بس یہی تو خرابی ہے۔ جو حضور ذرا ہماری جانفشانی پر نظر ڈالیں، تو ہم کو موتیوں میں تولیں۔ خدا کی قسم موتیوں میں تولیں۔

نواب : میرا بس چلے تو تم سب کے مُنھ میں خاک بھر دوں، اور آنکھوں میں دھواں جھونکوں۔

مصاحب : خطا؟

نواب : اور اوپر سے باتیں بناتے ہو۔ بٹیر بھی کہیں روزہ رکھا کیے ہیں۔

مصاحب : خداوند! خدا کی خدائی سے کچھ بعید ہے یہ۔

نواب : چلو بس خدائی میں دخل نہ دو۔ معلوم ہے بڑے خدا پرست اور خدا شناس ہو۔ بس چلے تو دریا میں ڈلوا دوں۔ تم کو ایسی جگہ قتل کروں جہاں پانی تک نہ ملے۔

ایک مصاحب : اگر کوئی قصور ثابت ہو تو قتل کر ڈالیے۔

نواب : بجا جس میں ایک اور مقدمہ دائر ہو، اور پھانسی بھی پا جاؤں۔

دوسرا مصاحب : اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے، خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔ حضور کی خواجہ خضر کے برابر زندگی ہو۔

نواب : آپ اپنی خیر منائیے۔ اب ہم کو بہت نہ ستائیے۔

تیسرا مصاحب : کیا طاقت، کیا مجال۔

چوتھا مصاحب : اے حضور! قربان جاؤں۔ ہم تو غلام ہیں، حضور کے۔ ستانا کیا معنی۔

نواب : کلیجہ چھلنی کر دیا سب نے۔

مصاحب : خداوند! وہ آزاد! ایک ہی گرگا ہے۔ بڑا نیار یا اڑی مار۔

اللہ رکھی : بس بس، ان کو کچھ نہ کہیے گا۔ ان کا سا آدمی کوئی ہو تو بولے۔

نواب : کیا شک ہے۔ یہ لوگ تو اس فکر میں تھے کہ نواب کو اُلّو بنا کر، لنگوٹی بندھوا دو۔ بارے بخیر گذشت۔ اب بھی سویرا ہے۔ سستے چھوٹے اپنے حساب۔

اللہ رکھی : چھوٹے تو سستے۔ اے ہاں یہ کہاں کی نمک حلالی تھی بھلا کہ بٹیر کو روزہ دار اور نماز گذار کہہ دیا، اور رئیس کو محنت مخت میں ہنسوایا۔ جو سنے گا کیا کہے گا، یہ نمک حلالی ہے بھلا۔

مصاحب : کیا ہمارے نمک حلال ہونے میں شک بھی ہے کوئی۔

اللہ رکھی : گھر کی ٹکلی باسی ساگ۔

نواب : نمک حلال کے بچے بنے ہیں۔

مصاحب : خداوند۔ جو چاہیے کہہ لیجیے۔ ہم لوگ حجت اور تکرار تھوڑا ہی کر سکتے ہیں بھلا

نواب : اجی تم تو زہر دے دو۔ سنکھیا کھلا دو۔ تم وہ لوگ ہو بس کے گانٹھ۔

اللہ رکھی : اللہ بچائے ایسے آدمیوں سے۔ خدا بچائے ایسے بے ایمانوں سے۔

مصاحب : ہاں مسند پر بیٹھ کر جو چاہو کہہ لو۔ بازار میں جھونٹم جھونٹا کرتی پھرتی ہو۔ اور یہاں آن کر باتیں بناتی ہو۔

نواب : بس بس بہت زبان درازی اچھی نہیں ہوتی ہے جی، میرا دل کھٹا ہو گیا اور تم سب کی صورت سے نفرت ہو گئی

مصاحب : جو ہم خطاوار ہوں، تو خدا ہی ہمارا اہم سے سمجھے۔ مرتضیٰ علیؑ کی قسم جو ذرا سی بات میں نمک حرامی کی ہو۔ پیر و مرشد ہم پر آسمان ہی پھٹ پڑے۔ جو ہم نمک حرام ہوں۔ حضور چاہے نہ مانیں، مگر ایک عالم کہتا ہے کہ جیسے مصاحب ان کو ملے ہیں ویسے کسی کو کاہے کو ملتے ہیں، اور جو ملتے بھی ہیں، تو بڑے خوش قسمتوں کو۔

نواب : واہ یوں کہو کہ جس کی قسمت پھوٹ جاتی ہے، اس بدبخت کو تم ایسے گرگے مصاحب ملتے ہیں۔ زمانہ بھر کے چھٹے ہوے۔ اب آپ سب برطرف۔ بوریا بدھنا اٹھائیے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔ بس اب رخصت ہو جیے قبلہ۔

مصاحب : حضور مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ نہ چھوڑیں گے۔

رفیق : حضور کا سایہ دامن کافی ہے۔

نواب : دامن ہی نہیں سایہ کہاں سے آوے۔

رفیق : یہ آستانہ چھوڑ کر کہاں جائیں۔

مصاحب : کہیں ٹھکانہ بھی ہے۔

دوسرے : ٹھکانا تو سب کچھ ہو جائے مگر چھوڑ کر جانے کو بھی جی چاہے۔ بس رئیس کا اتنے دن تک نمک کھایا، اس سے بھلا مفارقت کیوں کر گوارا ہو۔ مار ڈالیے مگر ہم تو اس ڈیوڑھی پر سے نہ جانے کے۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ یہ در اور یہ سر مریں بھی تو حضور ہی کی چوکھٹ پر اور جنازہ بھی نکلے تو اسی دروازے سے۔

اللہ رکھی : نواب صاحب کیا آپ کا مکان یہی ہے۔

نواب : نہیں یہاں تو ہم شکار کے لیے آئے تھے صرف۔ آج ہی چلے جائیں گے۔

اللہ رکھی : اور یہ سب صاحب؟۔

نواب : جہاں سینگ سمائے۔

اللہ رکھی : ہاں اور کیا۔

مصاحب : اجی ہم حضور کے ہمراہ رکاب ہیں۔ جہاں حضور کا پسینا گرے وہاں خون بھی ہمارا ضرور گرے گا۔

نواب : اس میں کیا شک ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ شاباش شاباش۔

مصاحب : خدا سلامت رکھے۔

نواب : مگر سلامت رکھے تو آپ سے بھی جدا رکھے۔

مصاحب : خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔

الغرض نواب صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر چلے گئے اور خدمت گاروں کو حکم دیا کہ خبر دار کسی مصاحب کو ہمارے ہاں نہ آنے دینا۔ اس دن سے نواب نامدار نے مولویوں اور شاعروں اور بذلہ سنجوں اور مہذب آدمیوں کو بلایا اور خوشامد خوروں، لیموں نچوڑوں، بدمعاشوں، اوباشوں کو دھتا بتایا۔ سستے چھوٹے۔

اب بی اللہ رکھی صاحب کا حال سنیئے کہ ان کو جو اُس رفیق نے بار بار ٹکے کی عورت اور بازاری عورت، اور بیسوا کہہ کر مخاطب کیا تو ان کے دل پر چوٹ لگی اور کل زیور اسباب وغیرہ کو کوڑے کر کے ایک ٹیلے پر بستی سے باہر فقیروں اور درویشوں کی طرح رہنا شروع کیا۔ قسم کھالی کہ جب تک میاں آزاد روم سے واپس نہ آئیں گے۔ تب تک اسی قطع سے بسر کروں گی۔ نواب صاحب نے اِن کو لاکھ لاکھ سمجھایا مگر اللہ رکھی نے کہا میں ایک نہ مانوں گی۔

اللہ رکھی کی ایک ہمجولی نے بھی سمجھایا مگر بے سود۔

ہمجولی : یہ نہ کرو بہن۔

اللہ رکھی : بس جوگن ہو جائیں گے ہم۔ دنیا کو چھوڑا۔

ہمجولی : یہ کیوں۔

جوگن : دل ہی تو ہے۔ بس اب دنیا کو ترک ہی کر دیا۔ آزاد ہائے آزاد!

ناٹک ڈراما

دیباچۂ رازِ نکتہ سازاں ست ایں	فہرستِ خیالِ ہماں گذاراں ست ایں
تعویذِ دلِ سخن طرازاں ست ایں	طومارِ جنونِ عشقبازاں ست ایں

پہلا سین یعنی تماشا

ایک پر بہار اور جواہر نگار پردہ پڑا۔ اور پردے کے اندر سے ایک ترکِ زرّیں کمر، پری پیکر، رشک قمر، مہ وشِ سمن، برنے یہ لحنِ داؤدی اونچے سروں میں یوں گانا شروع کیا:

جہدے کن و با مردم دانا بنشیں — آموز ہنر
یا با صنمی لطیف و رعنا بنشیں — اے اہل خبر
زیں ہر دو اگر ترا میسر نہ شوند — از قسمت خویش
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں — یا دیدۂ تر

الٰہی یہ مطرب خوش نوا و یوسف لقا ہے یا پری۔ یہ نغمہ روح افزا ہے یا سحر سامری۔ یہ بلبل ہزار داستان ہے یا طوطی شکر فشاں ہے۔ چست وطرار، و مردم آزار، چرخ کج رفتار کی طرح جفا جو اور ستمگار، مگر:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

جس طرح بسنت کی رت میں بھونرا کلیوں کا رس چوس چوس کے مستی میں آن کر جھومنے لگتا ہے۔ اس طرح سامعین اس نغمۂ دلکش سے مستانہ وار وجد کرتے لگے، اور اس پریزاد بار بد نژاد کے لحن جاں بخش کا دم بھرنے لگے:

ز ناخن بازی مطرب جہاد رسازمی آید — کہ مشتِ ناخنی بر دل ز بر آواز می آید

پردہ گرا۔

پردہ اٹھا تو چکا چوند کا عالم ہوا۔

جادو ہے کہ غمزہ ہے کسی رشک پری کا — شوخی میں اثر برق کی ہے جلوہ گری کا
اس چشم فسوں ساز سے لڑتی ہیں نگاہیں — دھڑکا ہے مگر دل کی مجھے بے جگری کا
اک برق سی چمکی نگہ شعلہ فشاں ہیں — دیکھا جو بھبھوکا بدن اس رشک پری کا

جس نے دیکھا پھڑک گیا اور سجدۂ شکر بجا لایا:

یاں خوبرو بلائے دل و جاں سے کم نہیں — ہندوستان کا خطہ پرستان سے کم نہیں
چوری کی ہر نگاہ میں ہیں دل فریبیاں — غمزے میں رمز خندۂ پنہاں سے کم نہیں

اس بتِ پندار، خوش کلام، وطرار نے ایک جھلک دکھائی اور چشم زدن میں صورت چھپائی۔ پردہ گرا۔

دوسرا سین یعنی تماشا

پردہ اٹھا اور حاضرین نے پھر ٹکٹکی باندھی تو:

نظر پڑا اک بت پر بوش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو بست سالہ یہ قہر و آفت غضب خدا کا

اس جوانِ رعنا، بلند بالا نے یہ رباعی حسبِ حال سنائی:

گاہے خود را بر اوج چوں مہ دیدی　　گشتی دل شاد۔
گہ چو یوسف فتادہ در چہ دیدی　　کردی فریاد۔
بیداد نت چنانکہ میخواہند ت　　افسوس مکن
کار تو بحمید بنوت صدرہ دیدی　　می باش آزاد

پردہ گرا

تیسرا سین یعنی تماشا

پھر پردہ اٹھا۔ اور ایک چلبلی چنچل، کم سن، عورت سفید دلائی اوڑھے اور فالسئی پائجامہ پہنے چھم چھم کرتی ہوئی اسٹیج (تماشے کے تخت پر آئی)، اور چمک دمک کر یوں گانے لگی:

یک چند پے زینب و زیور گشتیم　　در عہد شباب۔
یک چندے دانش و دفتر گشتیم　　کردم حساب۔
چوں واقف ازیں جہاں ابتر گشتیم　　نقشے ست بر آب۔
دست از ہمہ شستیم و قلندر گشتیم　　انیک دریاب۔

یہ گا کر اس چھیل چھبیلی نے دلائی پھینکی۔ کپڑے اتارے، اور جوگن کے بھیس میں بانسری بجائی اور بانسری ہی میں یوں گاتی ہوئی چلی:

میں تو سیاں کو ڈھونڈھن چلیاں　　میں تو سیاں کو ڈھونڈھن چلیاں
انگ بھبھوت جوگن بن ملیاں　　میں تو سیاں کو ڈھونڈھن چلیاں

پردہ گرا۔

چوتھا سین یعنی تماشا

پردہ اٹھا۔ اور ایک تصویر سراپا تنویر نظر آئی۔ اور حاضرین جلسہ نے یہ شعر پڑھی:

عجب ہے کھینچی مصوّر نے کس طرح تصویر — کہ شوخیوں سے تو اک رنگ پر رہی کیوں کر

معلوم ہوتا تھا کہ زبان کھولا ہی چاہتی ہے۔ گویا بولا ہی چاہتی ہے۔ مصوّر چابک دست، مسلم الثبوت استاد، رشک مانی، روکش بہزاد کے ہاتھ کو قریب سے اور اس جادو جمال، مشتری خصال کی ادا کو دور سے چومنے کو جی چاہتا تھا۔ دل ہاتھ سے جاتا تھا۔ انکھڑیاں لگاوٹ باز، ایک ایک ادا میں لاکھ لاکھ انداز:

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

اس بتِ بے دیو درنگ، شوخ و شنگ نے یہ رباعی سنائی تو محفل بھر میں وجد آئی:

تا ہا تو فتاد آشنائی مارا — آزاد میاں۔
در دیدہ توئی چو روشنائی مارا — تحقیق یداں۔
روزاں و شبانہ ایں دعا میخواہیم — من از دل و جان۔
یارب ندہی داغ جدائی مارا — در ہر دو جہاں۔

پردہ گرا۔ اور رونے کی آواز آئی۔

پانچواں سین یعنی تماشا

پردہ میں سے، رباعی مندرجۂ بالا کا جواب کسی محبوب یوسف لقا چمن طبع، رنگین ادا نے پیارے پیارے سروں میں یوں دیا:

گر طالب صادقی ز نایاب منال — پیدا گردد۔
آں عقدہ کہ د انگشت وہم ست فخیال — ہم واگردد۔
گر آید افتا د و بپائے طلبت — زنہار مایست۔
شاید کہ ہمیں بیضہ برآر د پر و بال — عنقا گردد۔

پھر پردہ گرا۔

چھٹا سین یعنی تماشا

پردہ اٹھا۔ اور ایک بونا امیروں کا کھلونا سامنے آیا۔ اور اس نے غنغنا غنغنا کر اہل محفل کو خوب ہنسایا۔ سوا انچ کا قد حضرت کا، دبلے پتلے، ننھے ننھے، ہاتھ پاؤں،

تمر قرابنچہ ہاتھ میں، اور قرولی کمر سے لگی ہوئی۔ آنکھیں بند لیکن اکڑے کھڑے ہیں۔ انھوں نے یوں ہانک لگائی اور ساری محفل کھل کھلائی۔

پلاسا قیا ما بوے کی افیم — کہ ہے شوقِ گلگشت باغِ نعیم
پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا — جھلک آبِ اسوَد کی مجھ کو دکھا
نہ کر دیر اے ساقی مشک رنگ — بدہ جام افیوں مرا بید رنگ
کرم کر فقیروں پہ مائی ڈیر — میں قربان جاؤں ذرا کم ہیر
کدھر ہے تو اے ساقی مہرباں — بدہ او بیم رو کش زعفران

اتنے میں لوگوں نے جو زور سے تالیاں بجائیں تو حضرت پینک سے چونک پڑے اور قریب تھا کہ قرولی لے کر دوڑیں کہ اتنے میں پردہ گرا۔ ہُر۔

اک نظر ادھر بھی

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حضرات ناظرین! آداب اور کورنش اور تسلیمات کا گلدستہ پیش کش کرتا ہوں۔ کیوں سچ کہیے گا؟ گلہائے نو دمیدہ خوش بیانی و نکتہ رانی، سے دماغ کو طبلۂ عطار بنادیا یا نہیں؟

اس ڈراما کا مطلب سمجھنے کے قابل ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی لکھ کر ختم کرتے، مگر خوف ہے کہ مبادا یار لوگ آڑی ترچھی آئیں۔ جلی کٹی سنائیں۔ حضرات سنیے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ خواب کا جو ایک مضمون ظریفانہ ہم نے لکھا تو تلے اوپر کوئی درجن بھر خط دنادن گرنے لگے۔

ہمارے ایک نامہ نگار تھے۔ کسی شفیق با لتحقیق نے ان سے کہا کہ بھئی مضمون بالکل غت ربوط ہے۔ اور غلبۂ ذکاوت سے وجہ اس کی یہ بتائی کہ اکثر اڈیٹر شراب پینے کے عادی ہوتے ہیں۔ تاکہ سُرور میں قلم نوجوان کے مزاج کی طرح بل کھانے لگے، اور عرائس مضمون سے ہم آغوش ہوں۔ سبحان اللہ بہت دور کی سوجھی۔ مانا کہ اڈیٹر بادہ گسار ہوتے ہیں۔ مگر کون اڈیٹر بعض یوروپین اڈیٹر، ہم تو ہندو ہیں۔ اور ہندو بھی کون۔ برہمن۔ اور برہمن بھی کون (پنڈت جی مہاراج) پھر شراب مردار کا ذکر کیا ہمارے خیالات جو کچھ اس دخترِ رز کی

نسبت ہیں، وہ ہمارے مضمونوں سے ظاہر ہیں۔ جس قدر ہجو اس بنت العنب کی ہم نے کی کسی اور نے کی ہو بتادے۔

خیر اب سنیئے کہ اس ڈراما میں کل داستان کا لب لباب، اور خلاصہ ہے۔ اور پہلی جلد کا یہی خاتمہ ہے۔ شکر ہے کہ ایک جلد کے خاتمے کی نوبت آئی۔

اس جلد میں رسوم مذموم ہندوستان و دقیانوسی خیالوں کی ہجو ہے۔ مگر مذاق کے ساتھ دل لگی کی دل لگی۔ اور لطف کا لطف، مذاق کا مذاق، اور مطلب کا مطلب۔ یہی تو ظرافت کے معنی ہیں۔ وہ ظرافت ہی کیا جس کا ماحصل پھکڑ اور گالی گلوچ ہو۔ میاں آزاد کا ہر شہر و دیار میں جانا، اور وہاں بُری بُری رسموں پر جھلاّنا۔ ناول کا عمدہ پلاٹ ہے اور چونکہ مزاج کے انداز میں لکھا ہے لہٰذا امید ہے کہ ناظرین حق بین کے حق میں کسی قدر مفید ضرور ہو۔ اب اپنے ڈراما کا مطلب صاف صاف سن لیجیے۔

پہلے تماشے میں جو مہ وش سمن بر، پری پیکر، رشک قمر آئی تھیں وہ کون ہیں۔

اور جو رباعی انھوں نے سنائی اس سے کیا مطلب ہے ہم سے سنیئے:

اے کن وہا مردم دانا بنشیں — یا باصنمی لطیف و رعنا بنشیں

یہ صنم لطیف و رعنا کس سے مراد ہے۔ کتاب سے؟

پھر دوسرے تماشے میں ایک جوان رعنا بلند بالا کا بیان ہے۔ یہ کون ہیں۔ میاں آزاد فرخ نہاد۔ اب اس رباعی کا مطلب سنیئے:

گاہے خود را بر اوج چوں مہ دیدی — گشتی دلشاد
گہ چو یوسف فتادہ در چہ دیدی — کردی فریاد۔
میدار ندت چنانکہ میخواہندت — افسوس مکن۔
کار تو بہجت نیست صدرہ دیدی — می باش آزاد

پہلے مصرعے سے یہ مراد ہے کہ (کبھی تو لائق فائق، عالم فاضل، متقی مسترع بنے) اور دوسرے مصرعے سے یہ مطلب ہے کہ کبھی چاہِ او بار میں غوطے کھانے لگے۔ شراب ناب لنڈھانے لگے۔ نتیجہ یہ کہ آزاد اور شاکر رہو۔ مگر وضع کا پاس و لحاظ رہے۔

تیسرے تماشے میں ایک چنچل چھیل چھبیلی جوگن کے بھیس میں آئی۔ وہ بی اللہ رکھی ہیں۔ رباعی ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ جوانی کے عالم میں جوشِ شباب نے ایسا چوندھیا دیا کہ

گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں، مگر وہ خود مقرے ہیں کہ:

دست از ہمہ شستیم وقلندر گشتیم
چوں واقف ازیں جہانِ ابتر گشتیم

اور ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ بی اللہ رکھی نے عیش وعشرت اور نکھار اور سنگار سب سے کنارہ کیا۔

چوتھے تماشے میں یہ تصویر پیاری حسن آرا کی تھی۔ آخر کار مصرعہ رباعی۔ ع یارب نہ وہی داغ جدائی مارا۔ حسرت سے بھرا ہوا ہے۔

پھر پانچویں تماشے میں اس کا جواب سپہر آرا بیگم نے دیا کہ۔ ع۔ شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال عنقا گردد۔

چھٹے تماشے میں میاں خوجی خود ہی بول رہے ہیں۔ وہی قرولی وہی قرابینچہ۔ وہی افیم وہی تیکھاپن۔

اس کے بعد پردہ گرا اور فسانۂ آزاد کی جلد اول ناتمام ہوئی۔

تمت

قطعات تاریخ طبع و تصنیف فسانۂ آزاد جلد اول مطبوعہ بار اول چکیدۂ قلم جادو رقم شاعر جادو طراز ریاض فصاحت را زیب و زین منشی عابد حسین صاحب عابد اتالیق صاحبزادۂ راجہ صاحب بہادر ملاپور ضلع سیتاپور

دوائر دامن گل حرف غنچے — فسانہ کیا بہار بوستاں ہے
چمن بند قلم نے سال تاریخ — لکھا باغ و بہار جاوداں ہے
۱۲۹۷ھ

ولہ

رقم فرمود چوں پنڈت رتن ناتھ — نگار داستانِ حسن آرا
ہمی جستیم عابد سال طبعش — بگفتا ہاتفے ۔ مرغوبِ دلہا
۱۲۸۸ف

ولہ

داستان فسانۂ آزاد — تازہ افسوں خواب راحت ہے
لکھو عابد یہ مصرع تاریخ — کہ عجب طرز کی ظرافت ہے
۱۹۳۷سمت

ولہ

منشی دانا بگفت افسانۂ — نیست افسانہ مگر افسوں گریست
چوں بپرسیدم ز سال او — گفت ایں افسانہ سحر سامریست
۱۲۹۷ھ

از نتائجِ طبع سخنورِ کامل منشی بھگوان دیال صاحب عاقل سررشتہ دار مطبع اودھ اخبار

اودھ اخبار مسا نامی جہاں میں کون مطبع ہے — عطا حق نے کیا ہے اس کو تمغہ بڑھ کے عظمت کا
تعلق نہ ہو کیوں کر کاملانِ علم کو اس سے — بنایا ہے خدا نے اس کو مخزن اہل جودت کا

پھر ایسا مالکِ مطبع جو مداحی کے لائق ہے — عیاں ہے جس میں جلوہ جامعیت کی لیاقت کا
جہاں سے ہوگئی معدوم تاریکی جہالت کی — مٹایا کیا صفائے دل نے اس کی تام ظلمت کا
ہوا قطرے کا گر طالب کوئی بخشا اسے گوہر — کنارہ ہی نہیں ہے اس کے بحرِ جود و ہمت کا
بلاشک شہرۂ آفاق ہے خوش انتظامی میں — بڑھایا فرطِ خوش نظمی سے کیا رتبہ نظامت کا
ہوا یہ قصۂ دلچسپ چھپ کر مشتہر جس دم — جہاں میں چارسو شہرہ ہوا اس کی اشاعت کا
مؤلف کا خدا شاہد ہے کیا زورِ طبیعت ہے — زباں نے کیا دکھایا ہے مزہ اپنی طلاقت کا
نرالے ڈھنگ ہیں کس رنگ کی معجز بیانی ہے — کوئی عقدہ نہیں چھوٹا فصاحت میں بلاغت کا
قلیل الطبع ہیں ایسی خریداروں کی کثرت سے — بڑھے گا مرتبہ لاریب اس کثرت میں قلت کا
اگر ہے فکر تاریخ مسیحی کی تمھیں عاقل — تو یوں لکھو یہ کیا زیبا ہے افسانۂ ظرافت کا

از تصنیف جناب پنڈت رتن ناتھ صاحب[1] لکھنوی المتخلص بہ دریا شاگرد
حضرت ناطق نگرامی

اے نام تو در جہاں رتن ناتھ — از خامہ دُرِ سخن بہ بسفتی
تاریخ شنو ز روے انصاف — افسانۂ بے نظیر گفتی
۱۸۸۰ء

طبع زاد مولوی سید محمود صاحب نکہت۔ میر منشی ضلع پربھنی۔

حرف حرفِ فسانۂ آزاد — ہمہ دُر دانہ است ناسفتہ
بزم آراست آں چناں گویا — چمنِ انبساط بشگفتہ
در پسِ پردۂ ظرافت او — حسن آرائے عقلِ بنہفتہ
واقعاتِ مصائب و کلفت — خستگان را دل و جگر تفتہ
سالِ تصنیف از روی ادب — طرزِ ہندی معاشرت گفتہ
۱۲۹۷ھ

از نتائج طبع سامولوی ممتاز احمد صاحب تھانوی رفیق نواب صاحب بہادر سورت
جو پنڈت رتن ناتھ افسانہ — مبرا ز تعقیدِ اغلاق گفت

---

[1] سرشار کے ہم نام اور اچھے شاعر تھے۔

پے سال تصنیف ہاتف از غیب   بہ تمنا تہذیب الاخلاق گفت ۱۸۸۰ء

بلیدۂ کلک گہر سلک جناب پنڈت بشن ناتھ صاحب صبر لکھنوی محقق فارسی

محیط علم رتن ناتھ پنڈت آنکہ نوشت   یہ کلک فکر رسا نامۂ خرد بنیاد
تبارک اللہ ازیں نسخۂ نشاط انگیز   کہ وا نما دل اہل کمال دارد شاد
حدیقہ است کہ سر بر کشیدہ از چمنش   ہزار سرو معانی ز قصۂ آزاد
بشاخسار سطورش نشستہ طائر ہوش   فراز ہر شجرش مرغ عقل بیضہ نہاد
دماغ اہل خرد شد بسان شیشۂ عطر   شمال معنی رنگین او چو غنچہ کشاد
نشاطِ خرمی از دیدنش ز سر بگرفت   کسی کہ رنج کہن داشت خاطرش ناشاد
فتاد شہرۂ لطفش چو مہر در افواہ   رشیدہ نغمۂ آوازہ اش بگوش بلاد
گلی ز روضۂ دانش بباغ دہر شگفت   دری ز گلشن معنی بروی شہر کشاد
زہے سخنورِ رنگین خیال کز فکرش   بہ بوستانِ ظرافت دمید نخلِ سداد
نزاد مادرِ ایام این چنین فرزند   نہ پرورید جہان کہن چنین استاد
رقم نمود ظریفانہ داستان شگرف   بہ صاحبان خرد بہرہ از معانی داد
کشاد جوے لطیفے ز بحر طبع لطیف   کہ سیر شد ز زلالش روانِ ہر ناشاد
بطبع شوق سخن گو چہ کارہا کہ نکرد   بعلمِ حکمت و معنی چہ دادہا کہ نداد
ہنوز طائر معنی بہ بیضہ داشت مقام   کہ فکر صائب او رشتۂ بیاش نہاد
ہنوز دانہ نکردہ ز خاک نشو و نما   کہ کرد حدس وائے ز برگ و باران تعداد
نظیر شد بفلاطون بعقل و دانائی   سہیم شد بارسطو بعلم و استعداد
زمین لطف و عنایات نقشبند ازل   نمود خامۂ او کارِ مانی و بہزاد
چو گشت منتخب دہر این کتاب بدیع   نمود کلکِ ازل بہر انتخابش صاد
درین زمان سعادت قرین، وقتِ سعید   بطبع شد چو مزین بسانِ نقش مراد
بدیہہ صبر رقم کرد عیسوی سالش   فروغ دیدۂ بینش فسانۂ آزاد

۱۸۸۰ء

از سخنداں گرانمایہ کنور عنایت سنگھ صاحب رئیس لکھنؤ تعلق دار بریلی روہلکھنڈ

مشفقی پنڈت رتن ناتھ اہل استعداد ہست
لائق و فائق سخنداں صاحب ایجاد ہست
اللہ اللہ قصۂ آور دور سلک بیان
کز تماشایش دل رنگین مزاجاں شاد ہست
او یین حصہ ازاں قصۂ کنون ترتیب یافت
چند اد صفش چہ بنویسم کہ لاتعداد ہست
دل کشا کیفیتِ آزاد فرحت بخشِ جاں
ذکر روح افزائی حسن آرا لطافت زاد ہست
عاشقِ ناظورۂ افیون خوشا خواجہ بدیع
از بیان نادرش ملک مذاق آباد ہست
الغرض افسانہ ہم بے مثل در رنگ خود ست
ہم مصنف در فنِ خود بی بدل اُستاد ہست
مصرعۂ سالش چناں کلکِ عنایت زد رقم
انتخاب عالمی افسانۂ آزاد ہست
۱۸۸۰ء

طبعزاد منشی کامتا پرشاد صاحب ناداںؔ متوسل مطبع عالی جاہ گوالیار

رتن ناتھ سرشار نے ان دنوں
لکھا خوب افسانہ آزاد کا
پے سال تصنیف ناداں نے
بدیہہ۔ خیالات نادر۔ لکھا

از نتائج فکر مولوی محمد قمر الدین صاحب فوقؔ مدرس فارسی نارمل اسکول سندیلہ ضلع ہردوئی۔

چوں رتن ناتھ ناثرِ یکتا
ایں دُرِ آبدار معنی سفت
بہر سال دعائیہ اے فوقؔ
گلشن فیض باد۔ ہاتف گفت

فرہنگ فسانۂ آزاد

فسانۂ آزاد، الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال کا خزانہ ہے۔ اس میں عربی، فارسی سنسکرت، ترکی، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ان الفاظ کی ہے جو عربی اور فارسی سے اردو میں شامل ہوئے ہیں۔ ایسے تمام الفاظ مستند لغات میں مل جاتے ہیں۔ یہ مختصر فرہنگ صرف ان الفاظ پر مشتمل ہے جو عام طور پر کم استعمال ہوتے ہیں یا متروک ہو چکے ہیں۔ ایسے الفاظ کو معانی کے ساتھ فرہنگ کی صورت میں شامل کیا جا رہا ہے تاکہ پڑھنے والے اہلِ ذوق حسبِ ضرورت استفادہ کر سکیں ؛ اور ان کو ضخیم لغات کی ورق گردانی کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن ماہرین زبان و ادب کے لیے فرہنگ کی چنداں ضرورت نہیں۔

عربی محاورات اور امثال کے علاوہ مذہبی کتابوں کے کچھ مکمل اور نامکمل جملے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض کئی کئی بار آئے ہیں ان کو بھی فرہنگ کے ساتھ مع معانی شامل کر دیا ہے۔ جن مشہور عالموں، ادیبوں اور شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان کا مختصر تعارف بھی ضروری تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کی جن قدیم عمارتوں اور محلّوں کے نام کتاب میں آتے ہیں ان کے متعلق اختصار کے ساتھ تاریخی کتابوں کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

فرہنگ کی تدوین میں، نور اللغات، جامع اللغات، فرہنگ عامرہ اور مہذب اللغات سے مدد لی گئی ہے۔ اشخاص کے تعارف کے سلسلہ میں اردو فارسی کی مستند ادبی تاریخوں اور تذکروں کو پیش نظر رکھا ہے۔ عمارات کا تعارف، تاریخ سلاطین اودھ (از کمال الدین حسینی)، اور تاریخ اودھ (از نجم الغنی) نادر الوجود (از منشی نولکشور) اور تاریخ فرح بخش وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اور ان کی موجودہ حالت کے متعلق اپنا چشم دید حال لکھا ہے۔ تفصیلات کے لیے مذکورہ کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

امیر حسن نورانی

(الف)

آب بقا۔ وہ پانی جس کو پینے والا ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔
آب حیات۔ مشہور ہے کہ دنیا میں کسی جگہ ایسا چشمہ ہے۔
آب حیوان۔ سکندر ذوالقرنین
آب خضر اس چشمہ پر حضرت خضر پیغمبر کے ساتھ گیا تھا لیکن آب حیات اس لیے نہیں پیا کہ اس کے پینے کے بعد جسم کی طاقت زائل ہو جاتی اور پینے والا زندہ رہتا ہے مگر بے حس وحرکت۔ چاروں لفظ ہم معنی ہیں
آب زلال۔ میٹھا اور ٹھنڈا پانی۔ زلال سفید رنگ کا کیڑا ہوتا ہے جو برف میں رہتا ہے اس کو دبا کر نچوڑنے سے جو پانی نکلتا ہے ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔
آب رفتہ۔ وہ پانی جو بہہ گیا ہو۔
آب اسود۔ سیاہ پانی۔ مراد شراب
آب شورہ۔ کھٹا پانی جو، املی، امچور اور ہڑ کو ملا کر بناتے ہیں بہت ہاضم ہوتا ہے۔ کچا آم بھون کر بھی بنایا جاتا ہے۔
آب کاری۔ شراب بنانے کا کاروبار
آبِ رَواں۔ ایک قسم کا باریک کپڑا۔ ململ کی طرح۔ بہتا پانی۔
آب گیِر۔ جوہڑ۔ پوکھر۔ تالاب
آب دار۔ چمکدار۔ پانی رکھنے کی جگہ
آب ریز۔ پانی کا برتن۔ لوٹا
آبنوس۔ ایک درخت جس کی لکڑی سیاہ اور مضبوط ہوتی ہے۔
ابداع۔ پیدا کرنا۔ ظاہر کرنا۔
ابرن۔ زیور۔ گہنا
ابریق۔ صراحی۔ لوٹا۔
اَبْرہ۔ دوہرے کپڑے کا اوپر والا کپڑا
اُیَستا۔ سڑنا بد ذائقہ ہونا کھٹا ہونا
ابعادِ ثلاثہ۔ تین دوریاں۔ لمبائی۔ گہرائی بلندی۔
اَبلق۔ دورنگا سیاہ وسفید رنگ کا گھوڑا۔
اُبہت۔ بزرگی۔ رونق
آپا دھاپی۔ خودغرضی۔ تنہا خوری
اُپجنا۔ ظاہر ہونا۔ اُگنا۔

آتش زیر پا۔ بے قرار۔ بے چین

آتو ماما۔ آستانی۔ لڑکیوں کی اتالیق

آتش کا پرکالہ۔ انگارا۔ لوکا۔ آگ کا ٹکڑا۔

آتشین رخ۔ سرخ رنگ چہرہ۔ نور کا پتلا

آتما۔ روح۔ دم۔ نفس

آثیم۔ گنہگار

اِثمد۔ سرمہ کا پتھر

آٹھوں گانٹھ کمیت۔ چالاک۔ تیز۔ کمیت گھوڑا تیز اور چالاک ہوتا ہے

آٹھوں کا میلہ۔ ہندوؤں کا مشہور تہوار جو لکھنؤ میں بہت دھوم سے منایا جاتا ہے۔

اٹیرن۔ لکڑی کی چرخی جس پر کاتا ہوا سوت لپیٹا جاتا ہے۔

اٹیرنا۔ سوت لپیٹنا۔

اِجارہ۔ دعویٰ۔ قبضہ اختیار۔

اجتہاد۔ نئی بات نکالنے کی کوشش کرنا

اجاج۔ کڑوا۔ کھاری

آجل۔ دیر کرنے والا

اِجبار۔ زبردستی کرنا جبر کرنا۔

اچھوتی۔ بغیر چھوئی ہوئی بعض شاہان اودھ کے محلوں میں کنواری لڑکیاں نذر و نیاز کرنے کے لیے رکھی جاتی تھیں ان کو اچھوتی کہتے تھے۔

اچیلاہٹ۔ طراری۔ شوخی۔

اَحَدی۔ تیر انداز سپاہی جو ملازم ہوتے تھے مگر اپنے گھروں میں رہتے تھے حسب ضرورت بلائے جاتے تھے اکبر بادشاہ نے یہ عہدہ قایم کیا تھا۔

اِحدیّت۔ یکتائی۔ ایک ہونا

اِحتراق۔ سوزش۔ جلا ہوا ہونا

اِحتفال۔ جلسہ۔ محفل۔

احتکار۔ گراں فروشی کے لیے غلہ وغیرہ روکنا

اَحفاد۔ بیٹے۔ پوتے۔ نواسے

اَحیانا۔ اتفاقاً

اِحتیال۔ حیلہ بازی۔ بہانہ کرنا۔

اِحتضار۔ حاضر ہونا موت کا سامنا کرنا۔

اَخذ۔ لینا۔ پکڑنا

اَخضر۔ بہت سرسبز و شاداب۔ گہرا سبز رنگ۔

اَخگر۔ چنگاری

آخوند۔ معلّم۔ استاد

اخلاطِ اربعہ۔ صفرا۔ خون۔ بلغم۔ سودا

آدیس۔ فقیروں اور جوگیوں کا سلام و پیغام

اِدراج۔ جمع دُرج۔ موتی اور زیور رکھنے کی ڈبیہ۔

اَدماتی۔ بیہودہ عورت۔ آوارہ

اَدھی۔ ایک قسم کا باریک قیمتی کپڑا

اَدوری۔ موٹا چمڑا

اَوخنہ۔ دُخان کی جمع دھواں

اَدَوَات ۔ آلات
اَدْھَم ۔ مشکی گھوڑا سیاہی مائل
اَذُوقَہ ۔ نان نفقہ روٹی کپڑا
اِدّخار ۔ جمع کرنا ذخیرہ کرنا
اَرث ۔ وراثت
آرسی ۔ آئینہ
آرسی مصحف ۔ دولہا اور دلہن کو شادی کے بعد قرآن شریف اور آئینہ دکھانے کی رسم
اَرغنُون ۔ ایک قسم کا باجا جو افلاطون نے ایجاد کیا تھا۔
اَرمَلہ ۔ بے شوہر کی عورت
ارابہ ۔ وہ گاڑی جس میں بھینسا جوتا جاتا ہے
ارگجا ۔ پھول اور عطر وغیرہ جو فاتحہ پڑھنے والے کے پاس رکھے جاتے ہیں۔
اُریب ۔ آڑا، ترچھا
اِرَم ۔ شداد نامی بادشاہ کی بنائی ہوئی بہشت
اَرسطُو ۔ مشہور یونانی عالم و فلسفی کا نام جس کا حضرت عیسیٰ سے ۳۲۲ سال قبل انتقال ہوا تھا
اَرژَنگ ۔ چین کا ماہر نقاش جو قدیم زمانہ میں تھا
اُرغوَانی ۔ سرخ یا نارنجی رنگ
اَریب ۔ عقلمند، بڑا فاضل

اِرتعاش ۔ کپکپاہٹ، لرزش
اَزرَق ۔ نیلا نیلی آنکھ والا نیل گون
اَزہَر ۔ کلی، روشن
اَرشد ۔ بہت ہدایت پایا ہوا۔
اَڑی مار ۔ دغاباز
آزرم ۔ لڑائی
آسیا ۔ چکی
اسپند ۔ کالا دانہ ۔ جو نظر اتارنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔
اِستخارہ ۔ بھلائی طلب کرنا ۔ نیک شگون کے لیے خاص طریقہ پر فال دیکھنا۔
اِسترخا ۔ جسم کا ڈھیلا ہونا
اِستفراغ ۔ قے ہونا۔
اِسم بامُسمّیٰ ۔ جیسا نام ویسا کام
اَسوَار ۔ سوار کی جمع ہے۔
اَشعہ ۔ شعاعیں ۔ شعا کی جمع ہے۔
اَشہب ۔ سیاہ و سفید گھوڑا
اَشباہ ۔ مشابہ ہونا۔
اِشتات ۔ پراگندہ کرنا
اَشجع ۔ بہت بہادر
اِشراقی ۔ قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ تھا جس کے کچھ خاص عقائد تھے۔
اَشعری ۔ علماء اسلام کے ایک خاص گروہ کا نام ہے
اُشلُک لگانا ۔ تہمت لگانا
اَشغلہ ۔ طوفان اٹھانا ۔ فتنہ کرنا

اشلوک۔ نظم۔ بند۔ قول
اَصَالَتًا۔ بلاواسطہ۔ براہ راست
اِصْغا۔ سننا
اَصْلاً۔ قطعی۔ بالکل قطعی
آصِف خانی۔ ایک قسم کا لباس
اَصِیل۔ ماما۔ وفادار ملازمہ
اُضحُوکہ۔ وہ چیز یا شخص جس کو دیکھ کر لوگ ہنسیں
اضطرار۔ بے اختیار ہونا۔ عاجز ہونا
اَضْعاف۔ دوگنا کرنا۔ کمزور ہونا
اَضحیٰ۔ قربانی
اُصْطُرلاب۔ ستاروں کا پتہ لگانے والا آلہ
اِطْناب۔ طول دنیا۔ بڑھا کر پیش کرنا
اَطْلَس۔ صاف آسمان۔ ایک قسم کا ریشمی کپڑا
اُطاق۔ کمرہ
اِطْفاء۔ آگ بجھانا
اِطْراد۔ ہانکنا چلانا
اطریفل مشہور یونانی دوا۔ جو کئی دواؤں سے مرکب ہوتی ہے۔
اِعْتاق۔ غلام کو آزاد کرنا
اِعْتِصام۔ پکڑنا چنگل مارنا۔ پرہیزگاری
اِعْجاز۔ عاجز کرنا

اَعْوَج۔ ٹیڑھا
اَعْوَر۔ کانا۔
اَعْراب۔ بدو۔ عرب کے دیہاتی باشندے
اَعْقاب۔ پس ماندگان۔ مرنے والے کے بعد باقی رہنے والے اعزا و اقربا
اَعْمیٰ۔ اندھا۔
اَعْیان۔ جمع عَین۔ چشمے۔ امراء
اِغْماض۔ چشم پوشی کرنا۔ نظر انداز کرنا
اَغْوا۔ ابھارنا۔ بہکانا
اِفاضہ۔ فیض پہچانا
اُفتاد۔ ڈھنگ۔ عادت۔ اتفاق۔
اَفراسیاب۔ توران کے مشہور بادشاہ کا نام
اَفعیٰ۔ کالا سانپ۔ زہریلا
افشاندہ۔ چھڑکا ہوا۔ جھاڑا ہوا
اَفْشُردہ۔ نچوڑا ہوا
اَفگار۔ زخمی۔ زخم
اَفلاطون۔ یونان کا مشہور عالم و فلسفی
اَقصیٰ۔ بہت دور
اُقلیدس۔ علم ہندسہ جیومیٹری
اَقبح۔ بہت برا۔ بدصورت
اِقتران۔ نزدیک ہونا۔
اَقدس۔ بہت پاکیزہ
اِقلاع۔ اکھڑنا
اِقلیم۔ کرہ زمین کا ایک حصہ۔ کل زمین

کو قدیم عالموں نے سات حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان کو ہفت اقلیم کہا جاتا ہے۔

اِکّا تنہا۔ یکّہ (ایک قسم کی سواری) شمع دان

اِکتارا۔ ایک قسم کا ساز۔ کپڑے کی ایک قسم۔

اکاسِرہ۔ کسریٰ کی جمع۔ ایران کے مشہور شاہی خاندان کے بادشاہوں کا لقب۔

اِکّل کھرا۔ خود غرض۔ بے مروّت

اَکھڑ۔ چوپاؤں کے رہنے کی جگہ

اِکلیل۔ تاج۔ جڑاؤ عصا

اَکید۔ مضبوط۔ استوار۔

اگرئی۔ وہ رنگ جو گہرے شمشی رنگ سے ملتا ہے۔

اُلاغ۔ وہ گھوڑا جس سے ڈاک لانے اور لے جانے کا کام لیتے ہیں۔

اَلمعیٰ۔ دانش ور۔ بڑا فاضل

اُلوہیّت۔ خدائی

اَلم نشرح۔ کھل کر بیان کرنا۔ قرآن کی ایک سورہ کا نام ہے۔

اَلپاکا۔ ایک قسم کا دبیز کپڑا

آلکسی۔ کاہلی۔ سستی

العطش۔ پیاس

الجوع۔ بھوک

اَلوپ انجن۔ وہ سرمہ جس کو لگا کر آدمی دوسروں کو نظر نہ آئے۔

اَلیٹھ۔ جھگڑا۔ روک۔ کام میں بلاوجہ نقص نکالنا۔

اُلش اَلیٹ۔ کسی بزرگ کا جھوٹا کھانا۔ آگے کا اٹھا ہوا کھانا۔

اَمصار۔ جمع مصر۔ شہر۔

امعان۔ گہری نظر ڈالنا۔ گہرا سوچنا۔

اُمّ العوارِض۔ بیماریوں کی جڑ۔ اصل بیماری

اَمارَج۔ نشانہ۔

اَلآن۔ ابھی اس وقت۔

اُلاہنا۔ گلہ۔ شکایت۔

الابالا بکواس۔ ٹال مٹول

اِلیام۔ زخم بھرنا۔ زخم اچھا ہونا۔

اِنتما۔ بڑھنا۔ پھولنا

انٹاغفیل۔ افیون کے نشے میں بری طرح مدہوش ہو جانا۔

انفعال۔ شرمندہ ہونا۔ ندامت

اَنتیاں۔ کان میں پہننے کا زیور

انڈوا۔ ایک قسم کا لباس۔ جو بانس کے حلقے پر لچکا گوٹا لگا کر بناتے ہیں اور مرد اور عورتیں بازو پر باندھتیں ہیں اور سر پر باندھتیں ہیں۔

اَنیق۔ خوب۔ عجیب

ہنکس۔ لوہے کا چابک جس سے ہاتھی ہانکا جاتا ہے۔

اَنباز۔ شریک
اَناجیب شعری۔ بال کی جڑیں۔
اِنفاق۔ خرچ کرنا۔
اِنصرام۔ پورا ہونا۔ آخر ہونا۔
اَنوٹھی۔ انوکھی
آواگون۔ بار بار جنم لینا
اولوالالباب۔ عقل مند۔ بلند دماغ دانشور
اوگی۔ لمبا چابک
اُوکھلی۔ ہاون۔ وہ گہرا گڑھا یا ظرف جس میں اناج ڈال کر کوٹتے ہیں
اُوپچی۔ پانچوں ہتھیاروں سے مسلح سپاہی
اُولاغ۔ گدھا
اُوقچہ۔ پلنگ کی عمدہ سفید چادر جس کے حاشیے پر کار چوبی یا کلابتوں کا کام بنا ہو یہ چادر پلنگ پوش کے نیچے بچھائی جاتی ہے اور اس کا کنارا نیچے لٹکتا ہے۔
آویزہ دار پازیب۔ وہ پیر کا زیور جس میں گھنگرو لگے ہوں۔
آوان۔ شان۔ دولت مندی۔ چھب
اودھ اخبار لکھنؤ۔ اردو کا مشہور اخبار جو ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں فسانہ آزاد ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک قسط وار شائع ہوا۔ رتن ناتھ سرشار اخبار کے اڈیٹر بھی تھے یہ اخبار ۱۹۵۰ء میں بند ہوگیا۔
اَہالی مَوالی۔ گھر والے۔ نوکر چاکر
آہنگ۔ ارادہ۔ آواز۔ راگ
ایاغ۔ پیالہ
اِیزد۔ خدا تعالیٰ
اِیمن۔ وہ راگ جو رات کے پہلے پہر گایا جاتا ہے۔

ب

باٹ۔ راستہ
بادلا۔ بادل ایک قسم کا کپڑا جو ریشم اور سنہرے روپہلے تاروں سے بنا جاتا ہے۔ زربفت
بادِیہ۔ تانبے کا بڑا پیالہ۔ جنگل
بابُل۔ بغداد کے قریب ایک پرانا شہر جو دریا فرات کے کنارے آباد تھا۔ اب مٹ چکا
باد پا۔ ہوا کی رفتار سے دوڑنے والا گھوڑا
باج۔ زمین کا محصول۔
باربُد۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کا درباری گانے والا۔
بَدگُہر۔ بداصل۔ جس کے حسب نسب کا پتہ نہ ہو
بارہ باٹ کرنا۔ تتر بتر کرنا

باشتی برزوق۔ ترکی میں ایک قبیلہ کا نام
باگھ۔ شیر
باقر خانی۔ ایک قسم کی روٹی جو میدہ، گھی اور دودھ کی ملاوٹ سے بنائی جاتی ہے۔ یہ عہد شاہ جہاں میں الہ آباد کے حاکم باقر خاں نے ایجاد کی تھی۔
بالا بتانا۔ ٹالنا۔
بالمیک۔ رامائن کا مصنف۔ مشہور ہندی شاعر
بالے میاں۔ سید سالار مسعود غازی کا مختصر و مشہور نام جن کا مزار بہرائچ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔
باناث۔ بغیر بناوٹ کا کپڑا۔ اونی۔ جو ریشم اور اون کو جما کر بنایا جاتا ہے۔
بانک۔ برچھا۔ ایک جنگی فن جس میں دشمن کا مقابلہ چھریوں سے کیا جاتا ہے۔
بانکا۔ البیلا۔ وضع دار۔ ٹیڑھی ٹوپی لگانے والا۔
بجرا۔ چھوٹی، ہلکی کشتی جو تفریح کے لیے ہوتی ہے اور سوار خود چلاتا ہے۔
بخورات۔ خوشبودار چیزیں۔ لوبان۔ عود وغیرہ
برزخ۔ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ
برزن کوچہ۔ گلی ...

بروگ۔ تفرقہ۔ جدائی۔ علیحدگی۔
بجوگ۔ جدائی۔ حادثہ
بروگی۔ ہجر کا مارا۔ فراق کا صدمہ اٹھانے والا۔
بضاعت۔ پونجی
بکل مارنا۔ خاص طریقہ پر چادر یا رضائی جسم پر لپیٹنا جس سے سارا جسم چھپ جاتے۔
بگڑے بانڑ۔ نڈر۔ بے باک۔
بھنگر خانہ۔ بھنگ پینے کی جگہ
بانکڑی۔ سنہرے روپہلے تاروں کا بنا ہوا فیتہ جو عورتوں کے لباس میں ٹانکا جاتا ہے۔
بچھوا۔ ایک خاص طرح کا چھلا جو پاؤں کے انگوٹھے میں پہنا جاتا ہے۔
برہا۔ ایک گیت جو دیہاتی محبوب کی جدائی کے غم میں گاتے ہیں۔
بری یا ساچق۔ شادی سے پہلے دولہا کی طرف سے کپڑے، زیور اور مٹھائی جو دولہن کے گھر بھیجے جاتے ہیں اس رسم کو کہتے ہیں۔
بساط۔ وہ خاص کپڑا جس پر خانے بنے ہوتے ہیں اور اس پر مہرے رکھ شطرنج کھیلتے ہیں۔
بطلیموس۔ مشہور یونانی حکیم اور فلسفی کا

نام ہے جس کی کتاب مجتبیٰ بہت مشہور ہے

بکاوَل۔ باورچی

بکاوَلی۔ ایک قسم کی پلیٹ۔ تشتری

بُقراط۔ مشہور یونانی عالم اور حکیم فنِ طب کی بنیاد اسی نے رکھی تھی۔

بُقچہ۔ کپڑوں گٹھری

بلگرام۔ اتر پردیش کے ضلع ہردوئی میں واقع مشہور قصبہ جہاں متعدد ممتاز عالم، شاعر اور فنکار پیدا ہوئے تھے

بَلی لوٹن۔ وہ گھاس جس کی خوشبو سے بلیاں بہت خوش ہوتی ہیں۔ اس کو بال چھڑ بھی کہتے ہیں۔

بنّوٹ۔ لڑائی کا ایک فن۔ جن میں ایک رومال لے کر اس میں تانبے کا پیسہ باندھا جاتا ہے اور اس کو خاص طریقہ پر پھیر کر دشمن پر وار کرتے ہیں اور دشمن کی تلوار یا دیگر ہتھیار گرا دیتے ہیں اور اس کو ایسی چوٹ لگتی ہے جو جان لیوا ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا بہت چلن تھا۔

بوٹی پلانا۔ بھنگ کی پتی گھوٹ کر پلانا۔

بھاٹ۔ ایک قبیلہ جس کے افراد نسب نامے زبانی یاد رکھتے ہیں اور سناتے ہیں۔

بھاگ۔ ایک راگ کا نام ہے جو سات سروں میں گایا جاتا ہے۔

بانڈی۔ لاٹھی۔ ڈنڈا۔ ایک قسم کا لباس بھی ہوتا ہے۔

بھان متی۔ راجہ بھان کی بیٹی کا نام ہے جس کو راکشش اٹھا کر لے گئے تھے۔

بھج بند۔ بازو پر باندھنے والا ایک زیور

بہزاد۔ بہت مشہور مصوّر اور نقّاش تھا۔ یہ ایران کے بادشاہ، عبّاس صفوی کے زمانہ میں موجود تھا۔

بہنگی۔ ایک بانس یا لکڑی جس کے دونوں کناروں پر بوجھ اٹھانے کے لیے رسیاں بندھی ہوتی ہیں۔ اور مزدور اس کو شانے پر رکھ کر اٹھاتا ہے۔

بھیرویں۔ ایک راگ کا نام ہے جو صبح کے وقت گایا جاتا ہے۔

بدو فطرت۔ پیدائش کی ابتدا۔

بغلی ڈوبنا کشتی کا ایک داؤن

بُزِ اخفش۔ عربی قواعد کا ماہر خفش اپنی بکری کو علم نحو پڑھاتا تھا۔ جب بکری کسی وجہ سے سر ہلاتی تو اخفش سمجھتا تھا کہ اب وہ اس کی بات سمجھ گئی ہے۔ اس موقع پر کہتے ہیں جب کوئی بغیر سوچے سمجھے ہاں یا نہیں کر دے۔

بنت العنب۔ انگور کی بیٹی۔ شراب

بُردِ یمانی۔ ملک یمن کی بنی ہوئی چادر

قدیم زمانے میں یمن کی چادریں بہت
مشہور تھیں۔

بُردَہ فروش۔ غلاموں کی خرید و فروخت
کرنے والا۔

بِرُوگِن۔ جدائی کی تکلیف میں مبتلا ہونے
والی۔

بلعم باعور۔ بنی اسرائیل کا ایک عابد جو
خدا کی بارگاہ سے مردود قرار پایا تھا

بَنی وَبنا۔ دولہن اور دولہا۔

بُوق۔ جنگی باجا۔

بوڑی۔ برچھی۔ بلم

بہلیا۔ چڑیوں کا شکار کرنے والا۔ پکڑنے
والا۔

بھبھوکا۔ نہایت سرخ۔ روشن۔ خوبصورت

بھبھوکا ہونا۔ غصّہ میں بھر جانا۔ آگ بگولا
ہونا۔

بیرق۔ چھوٹے چھوٹے جھنڈے۔

پ

پاتال۔ زمین کا سب سے نیچے کا حصّہ

پاٹھا۔ ہاتھی کا بچہ

پاڑ۔ درخت یا کسی اونچے محفوظ مقام پر
لکڑی سے بنا یا ہوا مچان۔ جو شکار
کے لیے عارضی طور پر بنایا جاتا ہے۔

پاڑھا۔ ہرن کے مشابہ ایک جنگلی چوپایہ بارا
سنگھے کی ایک قسم

پالٹ کا ہاتھ۔ لاٹھی یا ڈنڈے سے لڑتے
وقت مخالف کے پاؤں پر چوٹ لگانا

پالی۔ مرغوں اور بیٹروں کی لڑائی کی جگہ۔
پالتو جانوروں کی لڑائی کا اکھاڑا۔

پانسہ۔ چھ پہل ہڈی کا ٹکڑا جس پر نقطے
پڑے ہوتے ہیں اس کو جو سر کے
کھلاڑی باری باری پھینکتے ہیں۔

پاتُر۔ کسبی بیسوا۔

پالان۔ اونٹ اور گدھے کی پیٹھ پر رکھنے
والی کاٹھی۔

پالٹ۔ پٹہ بازی۔ وہ چوٹ جو حریف کے
پاؤں پر لگاتے ہیں۔

پانچ اِندَرِی۔ حواس خمسہ۔ چکھنا سونگھنا
دیکھنا۔ سننا۔ چھونا

پلاش۔ ٹاٹ۔

پاکھر۔ لوہے کا لباس۔ تاروں سے بنی
جالی جو جنگ کے وقت گھوڑے کو
پہناتے ہیں۔

پَرَند۔ ریشم۔

پکھاوَج۔ ایک قسم کی لمبی ڈھولک۔ طبلہ
نما ڈھولک۔

پونگی۔ تونبی کا باجا جو سپیرے بجاتے ہیں

پھاندی۔ گنے کا گٹھا

پکھاولی۔ چمڑے کا مشکیزہ
پوکھر۔ تالاب
پتھر کلا۔ توڑے دار بندوق جو چقماق
کے ذریعہ آگ لگا کر چلائی جاتی ہے
پٹوا۔ زیورات اور بٹوے میں ڈوری
ڈالنے والا ایک پیشہ ہے۔
پدرود کرنا۔ رخصت کرنا۔ رخصت ہونا
پدمنی۔ عورتوں کی ایک قسم جو سب سے بہتر
مانی جاتی ہے۔
پَرقینچ۔ وہ پرندہ جس کے پر کاٹ دیے
جائیں۔ خاص طور پر کبوتر کے لیے
استعمال ہوتا ہے۔
پکھراج پری۔ امانت لکھنوی کے ڈرامہ
اندر سبھا میں شامل ایک کردار
پنڈا۔ حقہ پینے والے چلم کے اندر شیرا
ملا تمباکو رکھتے ہیں۔ اس پر توا رکھتے
ہیں اور اوپر آگ رکھی جاتی ہے۔
اس تمباکو کی ٹکیہ کو پنڈا کہتے ہیں۔
پو بارہ۔ چوسر کھیلنے والا جب پانسا پھینکے
اور دو پانسے چھ چھ نقطے والے گریں
اور ایک پانسہ ایک نقطہ والا آئے
تو اس کو پو بارہ کہتے ہیں۔ یہ بڑی
جیت ہوتی ہے۔
پونڈا۔ گنے کی ایک قسم جس کا رنگ سیاہ
و سفید ہوتا ہے اور بہت موٹا ہوتا ہے۔

پچھل پائی۔ چڑیل۔ ڈائن۔ جس کے پاؤں
الٹے ہوں۔
پیچوان۔ حقہ کی ایک قسم جس کی نے لمبی
اور لوچدار ہوتی ہے، اور لپیٹ کر
رکھا جاتا ہے۔
پیشواز۔ عورتوں کا ایک گھیر دار لباس
پیر فرتوت۔ بوڑھا۔ کھوسٹ۔
پیر زال۔ بہت بوڑھی عورت
پیل۔ شطرنج کا ایک مہرہ۔ اس کو پیلہ بھی
کہتے ہیں۔
بیزار۔ جو بچ۔

ت

تابش۔ گرمی۔ حرارت۔ چمک
تارخ۔ سر
تارکشی۔ سونے چاندی کے تاروں کو کھینچ
کر لمبا کرنا۔
تازی۔ عربی اسپ تازی۔ عربی گھوڑا
تام جھام۔ پالکی۔ ایک خاص قسم کی سواری
اس کو تامدان بھی کہتے ہیں۔
تباین۔ دو چیزوں کے درمیان فرق
تُھو تھمبو۔ روک تھام بیچ بچاؤ
تاتار۔ چینی ترکستان کا ایک علاقہ جہاں
چنگیز خاں اور ہلاکو خاں پیدا ہوئے تھے
تاتار کا مشکی ہرن بھی مشہور ہے۔
تجرید۔ عریانی علیحدگی

تحریف۔ ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف رکھنا ردوبدل کرنا جس سے مضمون بدل جائے۔
تصدیع۔ دردسر۔ تکلیف۔ دکھ
تعب۔ تکلیف۔ رنج
تڑاقے کی۔ چمکدار۔ بھڑکیلی
تُرہی۔ نفیری کے ساتھ کا ایک ساز جو نفیری کے ساتھ ملانے کے لیے بجاتے ہیں
تعدّی۔ تجاوز کرنا۔ جبر اور سختی کرنا
تعلیق۔ لٹکانا۔ معلق کرنا۔ حاشیہ لگانا
تعمیہ۔ پوشیدہ رکھنا۔ چھپانا
تعویق۔ ڈھیل۔ تساہل
تغار۔ مٹی کا کونڈا۔
تنبورہ۔ ایک قسم کا باجا جس میں ستار کی طرح تار لگے ہوتے ہیں
تنقیہ۔ کسی چیز کو زوائد سے پاک صاف کرنا
تُنکنا۔ بگڑنا۔ ناراض ہونا
توأم۔ جڑوان۔ ایک ساتھ پیدا ہونے والے بچے
تھانگ۔ چوروں کا ٹھکانا۔ مسکن
تہدید۔ دھمکی دینا
تقدم بالزمان۔ وقت اور زمانہ میں آگے ہونا۔
تقدم بالشرف۔ بزرگی اور عزت میں آگے ہونا

تشئید مبانی۔ بنیادیں مضبوط کرنا۔
تدرو۔ ایک خوبصورت پرندہ جس کو مولا کہا جاتا ہے۔
تال۔ علم موسیقی میں گانے کا ایک وزن
تبرید۔ طبیبوں کی اصطلاح میں ان ٹھنڈی دواؤں کو کہتے ہیں جو جلاب کے بعد طاقت کے لیے دی جاتی ہے
تپ مُزمن۔ وہ بخار جو زیادہ عرصہ تک رہے اور کسی وقت بھی نہ اترے۔
تختِ رواں۔ وہ سواری جو تخت کی طرح ہوتی ہے۔ اور بادشاہ اور امیر اس پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔
تختِ طاؤس۔ مور کی شکل کا وہ خوبصورت جڑاؤ تخت جو شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا تھا اور اس پر بیٹھ کر دربار کرتا تھا اس کے بنانے میں چھ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ تخت نادر شاہ درّانی اس وقت اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا جب اس نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں دہلی پر حملہ کیا تھا یہ تخت لال قلعہ میں دربار شاہی کے اندر رہتا تھا۔
تخرجہ۔ حروفِ ابجد سے مادۂ تاریخ نکالتے وقت جب کچھ عدد بڑھ رہے ہوں تو اتنے ہی عددوں کے

کسی لفظ یا حرف کو اس میں سے نکال
کر مطلوب عدد حاصل کرنا۔

تسنیم۔ جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

تکل۔ پتنگ کی ایک قسم جس میں دو کانپ
اور ایک ٹھڈا ہوتا ہے

تمامی۔ سنہرے اور روپہلے تاروں سے
بنا ہوا ایک قسم کا دھاری دار ریشمی
کپڑا۔

توڑا۔ سونے یا چاندی کی زنجیر جو ہاتھ یا
پاؤں میں پہنی جاتی ہے۔ ایک قسم کا
زیور

توغل۔ کمال حاصل کرنا۔ دھن سمانا

توقیع۔ خط پر مہر لگانا نشان لگانا غصہ
کا فرمان۔

تورہ۔ مختلف کھانوں کا خوان جو امیروں
کی شادی کے موقع پر کچھ دن قبل
تقسیم کرتے تھے

تورہ پوش۔ خوان پوش

توسن۔ گھوڑا

توشہ خانہ۔ رئیسوں اور بادشاہوں
کے مکان کا وہ کمرہ جس میں ان کے
لباس اور ہر طرح کے کپڑے رکھے
جاتے ہیں۔

تال کٹورا۔ لکھنؤ میں تعزیئے دفن کرنے کا
مقام جو وہاں کا ایک محلہ ہے

توم ڈالنا۔ عاجز کرنا ٹکڑے ٹکڑے کرنا

تناسخ۔ ایک صورت سے دوسری صورت
میں بدل کر آنا جس کو ہندو مذہب
میں آواگون کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ
ہے کہ انسان مرنے کے بعد کسی
دوسری شکل میں دوبارہ جنم لیتا ہے

تقطیع۔ ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ علم عروض کے
مقررہ وزنوں پر شعر کو تولنا پرکھنا۔
اس کو وزن یا پیمانے بحر کہتے ہیں۔

تنکی۔ ایک قسم کی بہت باریک روٹی

تغار۔ مٹی کا تھال۔ وہ گڑھا جس میں گارا
بناتے ہیں۔

تعویق۔ باز رکھنا۔ ڈھیل دینا۔ حیلہ کرنا

تطاول۔ دست درازی کرنا۔ ظلم کرنا

تصدیع۔ تصدیعہ۔ دردسر دینا۔
تکلیف دینا۔

تربینی۔ تین دریاؤں کے سنگم کی جگہ۔
الہ آباد شہر سے متصل اس جگہ کو کہا
جاتا ہے جہاں دریا گنگا اور جمنا اور
سرسوتی یکجا ہوتے ہیں۔ سرسوتی
زیر زمین مانا جاتا ہے جو نظر نہیں آتا
جیسا کہ ہندوؤں کا مذہبی عقیدہ ہے

تھل۔ جگہ۔ مقام۔ شہر کے رہنے کی جگہ

تل شکری۔ ایک قسم کی مٹھائی جو تل اور شکر
ملا کر بناتے ہیں اور اس میں میوے

بھی ملائے جاتے ہیں۔

ٹ

ٹاٹ باٹی۔ ایک قسم کا جوتا جس پر کلابتو کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔
ٹکلی۔ پیشانی (ماتھا) کا ایک زیور
ٹلوا۔ خوشامدی
ٹما۔ ٹھگنا۔ چھوٹے قد والا۔
ٹوڑی۔ ایک راگ کا نام ہے۔ ایک قسم کی بیڑ
ٹنکار۔ کمان چلنے کی جھنکار۔ حیرت
ٹانک۔ چار ماشہ کا وزن
ٹک۔ ذرا۔
ٹیکا۔ ماتھے کا ایک زیور جس کی ڈوری یا زنجیر سر پر باندھی جاتی ہے اور ٹیکا ماتھے پر رہتا ہے۔ ہندی میں کسی کتاب کی شرح کو بھی ٹیکا کہتے ہیں۔
ٹیمز۔ انگلستان کی راجدھانی لندن میں بہنے والا مشہور دریا۔
ٹانگھن۔ پہاڑی ٹٹو۔ چھوٹے قد کا ٹٹو۔ پیگو شہر کا ٹانگھن مشہور رہے۔
ٹیپ۔ وسیلہ۔ سہارا۔ دعوی
ٹپا۔ ایک راگ کا نام۔ دادرا۔ خیال
ٹیان کوڑی۔ زرد رنگ کی چھوٹی کوڑی
ٹینٹوا۔ گردن گلا

ث

ثانیہ۔ پل۔ سکنڈ
ثالث بالخیر۔ انصاف سے فیصلہ کرنے وا
ثبات۔ قیام۔ مضبوطی۔ ثابت قدمی۔
ثاقب۔ روشن
ثری۔ نرم مٹی۔ سیلی زمین
ثریا۔ پروین۔ وہ چھ ستارے جو پاس پاس ہوتے ہیں
ثعبان۔ اژدھا
ثقبہ۔ سوراخ
ثمین۔ قیمتی۔ انمول
ثیبہ۔ بیاہی عورت

ج

جانِ عالم۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی کا عوامی لقب۔
جام جہاں نما۔ ایران کے بادشاہ جمشید
جام جمشید۔ کو یونان کے حکماء نے علم نجوم کی مدد
جام جم۔ اور حساب سے ایک ایسا پیالہ بنا کر دیا تھا جس کے اندر دیکھنے سے آنے والے زمانے کے حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ تینوں نام ایک ہی معنی میں

استعمال ہوتے ہیں۔

جالینوس۔ مشہور یونانی فلسفی اور علم طب کا ماہر۔

جاچک۔ جھانجھ بجانے والا

جادہ۔ پتلا راستہ۔ لیکھ

جاگرن۔ شب بیداری۔ خدائی رات

جاروب۔ جھاڑو

جامہ وار۔ ایک قسم کا پھول دار اونی کپڑا۔ اونی چادر

جائس۔ مشہور قصبہ جو ضلع رائے بریلی (اتر پردیش) میں واقع ہے اور ملک محمد مصنف پدماوت کا وطن ہے۔

جپ جی۔ سکھوں کی مذہبی کتاب۔ جو منظوم مناجات ہے۔

جٹادھاری۔ لمبے بالوں والا۔ گیسو دراز

جدی۔ بکرا۔ ایک آسمانی برج کا نام ہے جسکی شکل بکرے جیسی ہوتی ہے۔

جر ثقیل۔ بھاری وزن اٹھانا۔ اس فن کو بھی کہتے ہیں جس کے ذریعہ بھاری وزن اٹھانے کے آلات بنائے جاتے ہیں

جرس۔ گھنٹہ گھڑیال

جریب۔ ایک پیمانہ جس سے زمین ناپی جاتی ہے۔ چاندی کا خول چڑھا ہوا ڈنڈا جو بادشاہوں اور امیروں

کے چوبدار رکھتے تھے۔

جریدہ۔ تن تنہا۔ اکیلا

جرعہ نوش۔ گھونٹ گھونٹ پینے والا۔

جرأت۔ بزرگی۔ مضبوطی۔ فوجی

جزو لاینفک۔ کسی چیز کا وہ حصہ جو اس سے علیحدہ نہ ہو سکے۔

جزر۔ بھاٹا۔

جزیہ۔ وہ ٹکس جو اسلامی حکومت میں دوسرے مذہب والوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے باعث لگاتے ہیں

جعفری۔ ایک قسم کا زرد پھول۔ گیندے کی طرح

جفت۔ جوڑا۔ وہ عدد جو دو پر تقسیم ہو جائے۔

جگت بازی۔ بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی۔

جلوت۔ باہر سب کے سامنے

جل ترنگ۔ ایک قسم کا باجا جو پیتل کی دو کٹوریوں یا اور برتنوں میں پانی بھر کر دو لکڑی سے بجایا جاتا ہے۔

جلو دار۔ مصاحب۔ ہمراہی

جل بانک۔ پانی کا کھیل۔ پانی میں کھیلنے والا ایک کھیل

جلب۔ کھینچنا حاصل کرنا۔

جنتر منتر۔ بازی گری۔ نظر بندی مکاری

جَوشَن ۔ لوہے کا بنا ہوا خاص لباس جو بازوؤں پر پہنتے ہیں ۔ یہ جنگی لباس جنگ کے وقت حفاظت کے لیے پہنا جاتا ہے ۔
جَوّ ۔ فضا ۔ زمین اور آسمان کا درمیانی خلا
جُو ۔ ندی ۔ چشمہ
جوئے شیر ۔ دودھ کی نہر ۔ فرہاد نے اپنی محبوبہ شیریں کی فرمایش پر پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کی ناکام کوشش میں اپنی جان دے دی تھی ۔ ایک تیشہ کی اپنی لگائی چوٹ سے ہلاک ہو گیا تھا دونوں ایران کے باشندے تھے ۔
جُوگیا ۔ ایک راگنی کا نام ہے
جَوّاد ۔ سخی ۔ شہسوار
جَودَت ۔ تیزی ۔ ذہانت تیز رفتار
جَوارِش ۔ ایک مرکب دوا ۔ ہاضم اور مقوی
جَوف ۔ پیٹ ۔ کھوکھلی
جُوق ۔ گروہ ۔ جھنڈ
جھمکڑا ۔ خوبصورتی ۔ حسین چہرہ کی جھلک
جھپان ۔ ایک قسم کی سواری جو فینس کی طرح ہوتی تھی عموماً عورتوں کے لیے بنائی گئی تھی
جہانگیریاں ۔ کلائی میں پہننے کا ایک جڑاؤ زیور جو چوڑیوں کی وضع ہوتا ہے
جیحون ۔ ملک عراق میں ایک دریا ہے ۔

جیقہ ۔ ایک جڑاؤ زیور جو پگڑی میں باندھا جاتا ہے
جِیُوڑا ۔ یہ جی کی تصغیر ہے ۔ دل ۔ جان ۔ زندگی ۔ روح ۔ محبوب
جِیُوڑا نکلنا ۔ دل پریشان ہونا
جَیش لشکر ۔ فوج
جیگھڑ ۔ پانی کا گھڑا
جیہڑ ۔ ایک زیور کا نام ہے
جِیوٹ ۔ بہادر

چ

چابک خِرام ۔ تیز رفتار
چار آئینہ ۔ ایک قسم کی زرہ جو جنگ میں سینہ کی حفاظت کے لیے پہنتے ہیں ۔
چار دانگ ۔ چاروں سمت
چاہِ ذقن ۔ ٹھوڑی کا گڑھا
چاہِ زنخ ٹھوڑی کا گڑھا ۔
چاکی کا ہاتھ ۔ پٹہ بازی کی اصطلاح میں وہ چوٹ جو مخالف کے سر پر گٹکا گھما کر لگاتے ہیں ۔
چاہِ بابل ۔ زمانہ قدیم میں عراق کا شہر بابل مشہور تھا جہاں ایک کنویں میں دو فرشتے الٹے لٹکے ہوئے ہیں ۔ جو آزمایش کے لیے انسانی شکل میں زمین پر آئے تھے ایک کا نام ہاروت دوسرے

کا ماروت ہے۔
چاہِ نخشب ۔ وہ کنواں جس سے ابنِ مقنع
کا بنایا ہوا مصنوعی چاند نکلتا تھا
نخشب ترکستان کے ایک شہر کا
نام ہے۔
چارچشم ۔ طوطا چشم ۔ بے مروت
چپڑقناتیا ۔ کمینہ ۔ خوشامدی
چپقلش ۔ لڑائی جھگڑا انکرار
چڑاگل کیڑو ۔ مسخرہ، احمق ایک قسم کا
سرخ پھول جس کا اوپر کا حصہ چڑے
کی سر کی شکل کا ہوتا ہے
چرِ تر ۔ چالاکی
چرِ بانک ۔ چالاک عیّار
چشم زخم ۔ نظرِ بد
چشم زدن ۔ پلک جھپکنا ۔ دم بھر بہت
جلد ۔
چغتائی ۔ مغل قوم کے ایک قبیلہ کا نام ہے
چکارا ۔ ہرن کی ایک قسم جو بہت خوبصورت
اور تیز رفتار ہوتا ہے۔
چک منڈی ۔ لکھنؤ میں قریش برادری
کا ایک مشہور محلّہ جو وسط شہر میں واقع
ہے۔
چگل ۔ چلم میں رکھنے کی گٹکی
چم خم ۔ چمک دمک ۔ چلت پھرت
چمپا کلی ۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور جس میں
چمیلی کی کلیاں سونے یا چاندی کی بنی
پر دئی ہوئی ہوتی ہیں۔
چمرخ ۔ وہ گول جھلا سا جس کے اندر
تکلا گھومتا ہے دبلے پتلے شخص کو بھی
کہتے ہیں۔
چک پھیریاں ۔ گول دائرہ بنا کر اس میں
پھرنا بھرانا
چل چنے ۔ چل دور ہو ۔ دور ہٹ
چلیپا ۔ سولی ۔ صلیب ۔ زلف سے تشبیہ دیتے
ہیں۔
چکوا چکوی ۔ سرخاب کا جوڑا ۔ جب نر دریا
کے اس کنارے پر ہوتا ہے تو مادہ
اس کنارے پر دونوں ایک دوسرے
کو آواز دیتے اور پکارتے رہتے
ہیں
چندن ہار ۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور
چنڈاول ۔ سنتری چوکیدار
چنگیر ۔ پھول رکھنے کا برتن ۔ گل دان
چنڈال ۔ کمینہ ۔ نیچ ۔
چنور ۔ مورچھل ۔
چونڈا ۔ بالوں کا گچھا جو عورتیں سر پر
باندھتی ہیں اس کو جوڑا بھی کہتے ہیں
چونچال ۔ ہوشیار ۔ چالاک ۔
چورنگ کرنا ۔ تلوار کی ایسی ضرب جس سے
شکار کے چاروں پیر کٹ جائیں۔

چھلا مبری ۔ ایک قسم کا کھیل جس میں ایک چھلا مٹی میں چھپا دیا جاتا ہے اور دو جگہ مٹی کے ڈھیر لگاتے ہیں۔ پھر دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ چھلا کس ڈھیر میں ہے۔

چھپکا ۔ ایک زیور کا نام ہے جو سر پر لگایا جاتا ہے

چہرۂ شاہی ۔ وہ سکہ جس پر بادشاہ یا ملکہ کی تصویر ہو۔

چھاگل ۔ پاؤں میں پہننے کا ایک زیور

چھٹکا ۔ وہ لال کپڑا یا چادر جو فنس یا سکھپال کے اوپر ڈالی جاتی ہے۔

چہرا پرداز ۔ مصور۔ نقاش۔

چھلاوا ۔ بھوت۔ پریت

ح

حاز ۔ حرارت رکھنے والا

حاشا ۔ ہرگز نہیں۔ پناہ

حبش ۔ افریقہ کا ایک ملک جہاں کے باشندے سیاہ رنگ ہوتے ہیں اور حبشی کہلاتے ہیں

حبیب لبیب ۔ عقل مند دوست

حجر اسود ۔ وہ سیاہ پتھر جو حرم کعبہ میں نصب ہے اور مسلمانوں میں متبرک

سمجھا جاتا ہے۔

حذر ۔ پرہیز۔ بچنا۔ احتیاط کرنا

حرز ۔ تعویذ۔

حریف ۔ ہم پیشہ۔ مقابل۔ باہم مخالف

حزیں ۔ تخلص ہے شیخ علی حزیں کا فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ بنارس میں سکونت اختیار کی تھی۔

حسنین ۔ مراد حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ

حشری ۔ وہ گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کے ساتھ مل کر نہ رہے۔

حشرات الارض ۔ کیڑے مکوڑے

حصیر ۔ بوریا۔ چٹائی

حضارت ۔ تازگی۔ شادابی۔ سرسبزی

حضیض ۔ پستی۔ نشیب

حیص بیص ۔ شور غوغا۔ کشمکش۔ بحث تکرار

حظ ۔ حصہ۔ نصیب۔ لطف۔

حفظ ماتقدم ۔ پہلے سے حفاظت کا انتظام کرنا

حلّہ ۔ زیور۔ پوشاک

حلاوت آگین ۔ مٹھاس سے بھرا ہوا۔

حلیف ۔ ہم عہد۔ ہم قسم دوست ساتھی

حلاج ۔ نداف۔ یہ لقب ہے حضرت حسین بن منصور کا جن کو انا الحق

(میں خدا ہوں۔) کہنے کے جرم میں
سولی پر لٹکایا گیا تھا۔

حَمِیم ۔ گرم پانی۔ رشتہ دار۔ یگانہ

حَنجَرہ حنجرہ ۔ حلق۔ گلو۔ نرخرہ

حَنظَل ۔ اندراتن۔ ایک تیز ترش پھل
جس کو توڑنے سے اس طرح آنسو
نکلتے ہیں جیسے پیاز کاٹتے ہیں۔

حنیف ۔ مذہب میں سچا دین ابراہیم
علیہ السّلام کو ماننے والا۔ اسلام
کو دینِ حنیف کہتے ہیں

حنّان ۔ رحمت والا بخشش والا

حِینِ حیات ۔ زندگی کا زمانہ۔ زندگی بھر۔

حِین ۔ وقت زمانہ

خ

خاتُونِ جنّت ۔ حضرت فاطمہ کا لقب
جو حضرت محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلم کی
بیٹی تھیں۔

خاص بَردار ۔ وہ ملازم یا سپاہی جو
بادشاہوں اور امیروں کی سواری
کے آگے مسلّح چلتے تھے۔

خاتَم ۔ انگوٹھی۔ ختم کرنے والا۔

خاوَر ۔ مشرق۔

خال خال ۔ کم کم۔ تھوڑے تھوڑے

خالِصَہ ۔ جو خالص ہو۔ کسی سے ملا نہ ہو

خام پارہ ۔ ناتجربہ کار۔ کچا ٹکڑا

خارا شگاف ۔ پتھر توڑنے والا اوزار

خانہ بر انداز ۔ خانہ بدوش۔ جس کا کوئی
گھر نہ ہو۔ جگہ جگہ عارضی قیام بنانے
اور اٹھانے والا۔

خَبطی ۔ احمق۔ بد حواس۔ ایک ہی خیال میں
محو رہنے والا۔

ختلی خرام ۔ ختلی گھوڑے کی چال۔ ختل
ایک مقام کا نام جہاں کے گھوڑے بہت
اچھے اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔

خَرگاہ ۔ بڑا خیمہ۔ بادشاہوں اور امیروں
کا خیمہ۔

خَرِیطَہ ۔ تھیلی یا لفافہ جس میں بادشاہوں
اور امیروں کا شقہ (مختصر خط) بھیجا
جاتا تھا۔

خجستہ ۔ مبارک۔ باعث برکت

خجالَت ۔ شرمندگی۔ پشیمانی

خَدیوِ مِصر ۔ مصر کا بادشاہ۔ خدیو مصر
کا ایک حکمراں خاندان تھا۔

خِرقَہ ۔ خرقہ وہ لباس جو صوفی اور درویش
پہنتے ہیں۔ اس کو گدڑی کہا جاتا ہے۔

خُردَہ گیری ۔ عیب جوئی۔ نکتہ چینی۔

خُرطُوم ۔ ہاتھی کی سونڈ۔ افریقہ کے ملک

سوڈان کے ایک بڑے شہر کا نام
بھی ہے۔

خسوف۔ چاند گرہن

خشوع۔ ڈرنا۔ گڑگڑانا

خضر۔ ایک پیغمبر کا نام جو حضرت موسیٰ کے
ہم عصر تھے۔ ان کو دائمی زندگی
ملی ہے۔ وہ راہ بھولنے والوں
کو راستہ بتاتے ہیں۔

خضوع۔ عاجزی۔ انکساری

خطا و ختن۔ خطا ملکِ چین کا ایک شہر
ہے جو قدیم زمانہ میں اپنی خوبصورتی
اور تجارت کے لیے مشہور تھا۔
ختن شمالی مغربی چین کا وہ مشہور شہر
جہاں کی مشک دنیا بھر میں مشہور
ہے۔ وہاں کے مشکی ہرن کا ذکر شاعروں
نے اپنے اشعار میں بہت کیا ہے۔

خطیر۔ بہت قیمتی۔ بہت زیادہ

خلخال۔ جھانجھ۔ پازیب پاؤں کے زیور

خلا ملا۔ خالی اور بھرا ہوا۔ مراد خلوت
اور جلوت کا شریک

خلجان۔ فکر۔ خلش۔ کھٹکا

خلوتی۔ تنہائی پسند

خمول۔ گمنام ہونا

خم و چم۔ ناز و ادا۔ چال کی لچک

خنگ۔ سفید گھوڑا

خنیاگر۔ گانے والا

خواجہ تاش۔ کسی بادشاہ یا امیر کے دو ملازم
آپس میں خواجہ تاش کہلاتے ہیں۔

خواصی۔ خدمت گزاری۔ بادشاہ کا
خاص ملازم۔ خدمت گزار۔

خونابہ۔ خون کے آنسو۔ پانی ملا ہوا خون

خیل۔ گروہ۔ خاندان۔ قبیلہ۔ گھوڑوں کا گلہ

خیوا۔ چینی ترکستان کا ایک قدیم شہر جو
اب روس کے مقبوضہ علاقہ میں شامل ہے

خیلا۔ احمق۔ لغو۔ بیہودہ۔ وہ عورت جس
کے جسم پر بہت سے تل ہوں۔

خیزران۔ بید۔ چابک

خیاط۔ درزی

خیط ابیض۔ صبح کی سفیدی

خیاطِ ازل۔ اللہ تعالیٰ مراد ہیں۔

د

دارا۔ قدیم ایران کا بادشاہ جس کو یونان
کے حکمراں سکندر بادشاہ نے ایران
پر حملہ کر کے شکست دی تھی۔

داب۔ ڈھنگ۔ طرز

دار الشفا۔ اسپتال۔ لکھنؤ کی ایک مشہور
شاہی عمارت جس میں شفا خانہ تھا۔
اب اس کو منہدم کر کے اسمبلی کے
اراکین کی رہائش گاہ تعمیر کی گئی ہے۔

دائنتا کِل کِل ۔ جھگڑا تکرار۔ قصہ قضیہ
دارُالحرب (لڑائی کا گھر یا ملک) وہ ملک
جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض
انجام دینے کی آزادی حاصل نہ ہو
دارُالضّرب۔ ٹکسال۔ جہاں سکے
ڈھالے جاتے ہیں
دامنی دمکے۔ اوڑھنی چمکے
دانگ ۔ سمت ۔ جانب۔ چھ رتی کا وزن
داد و ستد۔ لین دین
دائم الخمر ۔ ہمیشہ شراب کے نشہ میں
مست رہنے والا یا بندی سے شراب
پینے والا ۔
دائن۔ قرض دینے والا۔
داعیہ ۔ دعویٰ کرنے والی عورت۔ ارادہ
دبیر۔ منشی۔ انشاپرداز
دبیرِ فلک۔ عُطارد ستارہ
دبّاغ ۔ رنگ ساز ۔ رنگنے والا ۔
دجلہ۔ ملکِ عراق میں مشہور دریا ہے
جو شہر بغداد کے درمیان سے ہوکر
گزرتا ہے۔
دجل ۔ جھوٹ ۔ فریب
دخل ۔ آمدنی ۔ قبضہ
دُختِ رز ۔ (انگور کی بیٹی) شراب
دُرِّ یتیم ۔ وہ موتی جو سیپ میں تنہا پیدا ہوتا
ہے۔ وہ بڑا اور بہت چمکدار ہوتا ہے

دُرِ خوش آب ۔ بہت چمکدار موتی
دُرد ۔ تلچھٹ
دَرشنی ہنڈی ۔ جس ہنڈی کا روپیہ اس
کو پیش کرتے ہی مل جائے ۔
دَرک ۔ عقل ۔ تمیز۔ سمجھ ۔
دِرنگ۔ دیر۔ وقفہ
دخترِ تاک۔ شراب ۔ تاک انگور کی بیل کو
کہتے ہیں ۔
دُرِ عدن ۔ عدن کے سمندر کا موتی جو
بہت اچھا ہوتا ہے۔ عدن عرب کا
ایک ساحلی شہر ہے۔
دریوزہ گر ۔ بھکاری ۔ مانگنے والا
درہ دانیال ۔ جنوبی یورپ اور مغربی
ایشیا کے درمیان سمندری راستہ
جس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے ۔
درماندہ ۔ مجبور ۔ عاجز ۔
دریغا ۔ اے افسوس ۔ ہائے افسوس
دِرّہ ۔ چمڑے کا چابک
دُز دِیدہ ۔ چرایا ہوا۔ نظر بچا کر دیکھنا ۔
دِساور ۔ پردیس ۔ دوسرا علاقہ
دَستبرد ۔ خیانت ۔ غلبہ ۔ بیجا تصرف
دَغدغہ ۔ خوف ۔ اندیشہ ۔ تشویش
دَف ۔ ڈفلی ۔ ایک قسم کی ڈھولک
دُکرڑی ۔ ایک قسم کی گاڑی ۔ دو گھوڑوں
کی بگی ۔

دَقیانوسی ۔ بہت پرانا ۔ زمانہ قدیم میں عرب کے ایک بادشاہ کا نام جس کے عہد میں اس کے ظلم اور خدا بیزاری سے تنگ آکر اللہ کے کچھ نیک بندے پہاڑ کے ایک غار میں روپوش ہو کر سو گئے تھے جو بہت طویل عرصہ کے بعد ایک بار بیدار ہوئے تھے لیکن حالات ناساز گار دیکھ کر دوبارہ غار میں جا سوتے ان کو اصحاب کہف (غار والے ساتھی) کہتے ہیں قرآن مجید میں اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر ہے ۔ ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہے ۔

دِل رِیش ۔ غم زدہ ۔ زخمی دل والا

دَلق ۔ گدڑی ۔ پشمینہ کا لباس

دُون ۔ کمینہ ۔ کم ہمت ۔

دُودْمان ۔ خاندان

دُود افگن ۔ چمنی ۔ دھواں پھینکنے والی نلکی ۔

دُوسار ۔ آرپار ۔

دُہل ۔ ڈھول ۔

دَھک دَھکی ۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور جو سینہ پر لٹکتا رہتا ہے ۔

دِیدہ دُھوئی ۔ بے شرم ۔ ڈھیٹ ۔

دِیزہ ہ گھوڑا ۔ خچر ۔

دَیہیم ۔ تاج ۔

دَیُوث ۔ بے حیا ۔ بے عزت ۔

دُگلا ۔ روئی دار لبادہ ۔ انگرکھا ۔

دُلدُل ۔ وہ سیاہی مائل سفید گھوڑا جو کسی نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کیا تھا ۔ اور آپ نے حضرت علی کو دے دیا تھا ۔

دَلک ۔ رگڑ ۔ تصادم ۔ دھمک

دُلکی ۔ گھوڑے کی تیز چال جو پویہ سے کم ہوتی ہے ۔ دُلکنا دلکی چال چلنا

دُلمہ ۔ ایک قسم کا سالن ۔ پنیر ۔

دَمُ الاَخوَین ۔ سرخ رنگ کا گوند جو کپڑے رنگنے میں، استعمال ہوتا ہے ۔

دَم دَھاگا ۔ فریب ۔ جھانسا ۔

دَمادَم ۔ پے در پے ۔ متواتر

دَمدمہ ۔ مصنوعی قلعہ ۔ جو اصل قلعہ کے آگے بنایا جاتا ہے ۔

دَمڑ کا ۔ دَمڑک ۔ چمڑے کا گول ٹکڑا جو تکلے میں لگاتے ہیں ۔

دَوال ۔ رکاب کا تسمہ ۔ مشک کا تسمہ ۔

دُوت ۔ قاصد ۔ ایلچی ۔

دَھونسا ۔ بڑا نقارہ ۔

دِھیرَج ۔ مضبوطی ۔ مستعدی ۔

ڈ

ڈانک۔ سنہرہ یا روپہلا کاغذ یا پتی جو نگینہ کے نیچے چمک بڑھانے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔

ڈاب۔ ایک قسم کی لمبی گھاس جس سے چٹائی بُنی جاتی ہے۔ کچّا نارجیل

ڈانگ۔ چھلانگ۔ اونچی پہاڑی

ڈار۔ قطار

ڈاہ۔ جلن۔ عداوت

ڈابر۔ جھیل۔ تالاب

ڈانڈی۔ ایک قسم کی ڈولی جس پر آدمی بیٹھ کر سفر کرتے تھے اور مزدور اس کو اٹھا کر چلتے ہیں۔

ڈب۔ قابو۔ قبضہ

ڈمرو۔ ایک قسم کا باجا۔ ڈگڈگی

ڈھولنا۔ ایک زیور کا نام

ذ

ذات الجنب۔ پہلو کا درد۔ پسلی کا درد

ذقن۔ ٹھوڑی۔

ذقند۔ چھلانگ

ذکاوت۔ تیز فہمی۔ دانائی۔ زود حسی

ذوالفقار۔ حضرت علی کی تلوار کا نام

ذیل۔ دامن کے نیچے کا حصہ۔

ذمّی اسلامی حکومت کا غیر مسلم باشندہ

ذمیم۔ بری چیز۔ قابلِ برائی۔ خرابی۔

ذنب۔ گناہ۔

ر

راتِب۔ روزمرہ کی خوراک

راج بنس۔ شاہی خاندان

راس لیلا۔ کرشن جی اور گوپیوں کا کھیل

راسخ۔ مضبوط۔ پائیدار

راندہ۔ نکالا ہوا۔ رد کیا ہوا۔

راوٹی۔ چھوٹا تنبو۔ چھولداری بالاخانہ

راول۔ سردار۔ جوگی۔

رائحہ۔ بو باس۔ خوشبو

رامشگری۔ گانا۔ راگ الاپنا

راغ۔ جنگل۔ سبزہ زار۔ پہاڑ کا دامن۔

ربع مسکوں۔ دنیا کا چوتھائی حصہ

رجعت قہقری۔ الٹے قدم پھرنا۔

رجھانا۔ خوش کرنا۔

ردا۔ چادر۔

ردیف۔ جو گھوڑ سوار کے پیچھے سوار ہو غزل میں قافیہ کے بعد جو لفظ بار بار آئے رضاعی بر۔ دودھ شریک بھائی۔

رطل۔ شراب کا جام۔

رعنا۔ وضع دار۔ خوبصورت

رفق۔ نرمی

رقت ۔ نرمی ۔ روناگڑگڑانا
رکاب دار ۔ عمدہ باورچی ۔ کھانا لگانے والا ۔
رکیک ۔ کمزور حقیر
رکوع ۔ جھکاؤ ۔ جھکنا ۔ نماز میں سجدہ سے قبل گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر جھکنا
رم ۔ بھاگنا ۔ وحشت جدائی
رمل ۔ ایک فن کا نام ہے ۔ جس میں ہندسوں کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں یہ فن حضرت دانیال پیغمبر نے ایجاد کیا تھا ۔ عربی میں رمل ریت کو کہتے ہیں ۔ ابتدا میں ہند سے ریت ہی پر لکھے اور مٹائے جاتے تھے ۔ اس لیے یہ نام پڑگیا اس علم کا جاننے والا رمال کہلاتا ہے ۔
رمز ۔ اشارہ ۔ بھید ۔
رمق ۔ رہی سہی جان ۔ بقیہ جان ۔
رمنا ۔ جنگل ۔ گھومنا پھرنا ۔
رن ۔ جنگ ۔ صف بندی ۔
روبکار ۔ سامنا کرنا ۔ پیش ہونا ۔ وہ قبالہ جو حاکم کے سامنے لکھا جائے
روح اللہ ۔ حضرت عیسیٰ پیغمبر کا لقب ہے ۔
رودبار ۔ پانی کا وہ حصہ جو دو سمندروں کو ملائے ۔
روسنا ۔ خفا ہونا ۔ ناراض ہونا
روشن چوکی ۔ چار آدمیوں کا گروہ جو دولہا یا بادشاہ کی سواری کے ساتھ نفیری اور طبلہ وغیرہ بجاتا ہوا چلتا ہے اور وہ چوکی جس پر تاشہ بجانے والے بیٹھتے ہیں ۔
رونا ۔ ہرکارہ ۔ وہ ملازم جو عورتوں کے کام کاج کے لیے ملازم ہوتے ہیں اور ہر وقت دروازے پر حاضر رہتے ہیں
رود نیل ۔ ملک مصر کا مشہور دریا ۔
روئیں تن ۔ طاقت ور ۔ فولادی جسم والا
روزن ۔ سوراخ ۔ جھروکہ ۔
روح القدس ۔ لقب حضرت جبرئیل (فرشتہ) کا
ریش بابل ۔ لمبی داڑھی والا
ریش خند ۔ ہنسی ٹھٹھا ۔ مسخرہ پن ۔
ریحاں ۔ ایک خوشبو دار پودا ۔ بنفشہ
ریش مخضب ۔ رنگین داڑھی ۔ خضاب لگی داڑھی
رین ۔ رات ۔

ز

زاد بوم ۔ جائے پیدائش ۔ وطن
زاغ ۔ کوا
زال ۔ بڑھیا ۔ رستم کے باپ کا نام
زارنالی ۔ بے قراری ۔ خوب گریہ کرنا
زائچہ ۔ جسم پتری
زائیدہ ۔ جنا ہوا ۔ پیدا ہوا ۔
زبرجد ۔ زمرد ۔ سبز رنگ کا قیمتی پتھر

زَبُون ۔ عاجز ۔ ضعیف ۔

۱) زُبانہ ۔ شعلہ ۔ آگ کی لپٹ ۔

زُحَل ۔ ایک ستارہ جو منحوس سمجھا جاتا ہے اس کو سنیچر کہتے ہیں ۔

۱) زبیب خشک انگور ۔

زُجاج ۔ شیشہ ۔ قندیل ۔

زرتشت یا زرتشت ۔ ایک ایرانی رہنما جس نے قدیم زمانہ میں آتش پرستی کی بنیاد ڈالی تھی ۔ ان کے پیرو آتش پرست ہیں ۔ اب یہ پارسی کہلاتے ہیں ۔

زمہریر ۔ سخت سردی ۔ کرۂ ہوا کا سرد حصہ

زنبور ۔ بھڑ ۔ لوہے کا ایک اوزار جس سے کسی چیز کو پکڑ کر اٹھاتے ہیں جیسے برتن وغیرہ

زندیق ۔ جو سیدھی راہ سے بھٹک جائے خدا پر ظاہر میں ایمان لائے مگر دل سے منکر ہو ۔

زنگی ۔ حبشی

زنخ ۔ ٹھوڑی

زنجبیل ۔ سونٹھ ۔ جنت کی ایک نہر کا نام ہے ۔

زنبیل ۔ جھولی ۔ جس میں ہر طرح کی بہت سی چیزیں سما جائیں ۔

زہرہ ۔ پتہ ۔ حوصلہ ۔

زہرہ آب ہونا ۔ ہمت پست ہونا خوفزدہ ہونا

زیر پائی ۔ زنانہ جوتی ۔

زیرکی ۔ دانائی ۔

زیر انداز ۔ نیچے بچھانے کا کپڑا ۔

ژ

ژاژخا ۔ بکواس کرنے والا

ژرف ۔ گہرا ۔ غور و فکر

ژولیدہ ۔ الجھا ہوا ۔

ژندہ ۔ گدڑی ۔ پیوند لگا کپڑا

ژنگ ۔ مشہور مصور و نقاش مانی کی لکھی ہوئی کتاب کا نام ہے ۔

ژند ۔ ازدشت کی کتاب کا نام ہے جس نے مذہب آتش پرستی کا قائم کیا تھا

"س"

ساعی ۔ چغل خور ۔

ساقی ۔ حقہ پلانے والی

سامی ۔ بلند مرتبہ

سانحہ ۔ حادثہ ۔ غم انگیز واقعہ

سانٹے پر سانٹا لگانا ۔ چابک پر چابک مارنا ۔ سانٹا ہاتھی کو ہانکنے کی لکڑی کو کہتے ہیں ۔

سارنگ ۔ ایک قسم کا راگ ۔

سامری۔ حضرت موسیٰ کا ہم عصر مشہور
جادوگر جس نے گائے بچھڑا بنا کر
اس میں جان ڈالی تھی۔
ساشلیٹ۔ کپڑے کی ایک قسم۔
سبک پویہ۔ ہلکی چال۔
سبز بخت۔ خوش نصیب
سبزی اڑانا۔ بھنگ پینا۔
سبو کش۔ شراب کا جام پینے والا شرابی
ساچق۔ منہدی لگانے کی رسم۔ وہ
رسم جو دولہا کی جانب سے شادی
کے قبل ادا کی جاتی ہے۔ جس میں
آرائش وغیرہ کا سامان دولہن کے
گھر لے جاتے ہیں۔
سپاٹ ہونا۔ ہموار ہونا۔ صاف ہونا۔ کودنا
پھاندنا۔
سجایۂ مرضیہ۔ پسندیدہ عادات۔
سحبان۔ عرب کا مشہور خطیب، مقرر۔
سحاب نوال۔ ابر کی طرح بخشش کرنے
والا بہت سخی۔
سداد۔ مضبوطی۔ نیک کردار۔ سچائی۔
سرکہ جبیں۔ غصہ ور۔ ترش رو۔
سروہی۔ ایک قسم کا خنجر۔ چھوٹی تلوار۔
سرنگ۔ سیاہی مائل رنگ کا گھوڑا۔
سربالٹ کا ہاتھ۔ کشتی لڑنے کا ایک
داؤں۔

سرو چراغاں۔ لکڑی کے ٹکڑوں سے
سرو کے درخت کی شکل بناتے ہیں
اور اس کی شاخوں پر چراغ روشن
کرتے ہیں اس کو سرو چراغاں کہتے ہیں
سراپردہ۔ اونچی قنات۔ خاص قسم کا اونچا
اور قیمتی پردہ جو بادشاہوں اور وزیروں
کے محلوں میں استعمال ہوتا ہے۔
سراچہ۔ چھوٹا خیمہ۔
سرپیچ۔ صافہ۔ پگڑی
(۱) سلسبیل۔ جنت کی ایک نہر کا نام
سلخ۔ کھال کھینچنا۔ چاند کی آخری تاریخ
وہ دن جس کی شام کو چاند دیکھا جائے
سلک گوہر۔ موتیوں کی لڑی۔
سمندِ آہو شکار۔ وہ گھوڑا جو تیز رفتاری
کے باعث ہرن کا شکار کرنے والے
کو کامیاب کرتا ہے۔
سمن اندام۔ چمیلی جیسا نرم اور گورا بدن۔
سمک۔ مچھلی۔
سمو المکان۔ اونچے مرتبہ والا۔ بلند مقام
والا۔
سنگر۔ چھوٹا نیزہ۔
سنجاب۔ خاکی رنگ کی خوبصورت گلہری۔
(۲) سکھپال۔ ایک قسم کی پالکی جس میں رئیسوں
کی عورتیں سوار ہوتی تھیں۔ جس کی
کھال سے ایک قسم کا قیمتی خوشنما لباس

بنتا ہے۔ کپڑے کی ایک قسم۔

سَنگرَیزش۔ میوہ فروخت کرنے والیاں۔

سَنجر صَوْلَت۔ سلطان سنجر جیسے دبدبہ والا۔ بہادر

سنبلہ۔ سُنبُل۔ گیہوں اور جو وغیرہ کی بالی جس سے زلفوں کو تشبیہ دیتے ہیں

سُوں۔ قسم۔ جیسے خدا سوں۔ خدا کی قسم

سُورۃ قَدر۔ قرآن شریف کی ایک سورہ کا نام ہے۔ جس میں رمضان شریف کی ایک بہت برکت والی رات کا ذکر ہے جس کو شبِ قدر کہتے ہیں

سُوفار۔ تیر پچھلا سرا۔

سُوہا۔ باریک قسم کا ریشمی یا سوتی سرخ رنگ کا کپڑا۔

سُوزخوانی۔ سوز پڑھنا۔ سوز نظم کی ایک قسم ہے۔ جو شہدائے کربلا کے غم میں خاص مقررہ انداز میں پڑھی جاتی ہے۔

سَوسَن۔ چمیلی۔

سیم۔ چاندی۔

سیم غبغب۔ چاندی جیسی ٹھوڑی خوبصورت گوری ٹھوڑی

سینکڑے۔ سینگ کے بنے ہوئے باجے۔

سِیم تن۔ گورا بدن۔

سِیم ساق۔ گوری پنڈلی۔

سَیل۔ سیلاب۔

سِیاق۔ علم حساب۔ حساب کتاب

سِیاق سَباق۔ پچھلا، اگلا۔ شروع آخر

سِیدھیاں سنانا۔ گالیاں دینا

سِیلیاں۔ گردن میں پہننے کا ایک زیور

سِیس پھول۔ سر کا ایک زیور جو بالوں کی چوٹی میں لگایا جاتا ہے۔

سُیوف۔ تلواریں۔ سیف کی جمع ہے۔

سِیمرغ۔ ایک بہت بڑا پرندہ جس کا ذکر کہانیوں اور پرانی روایتوں میں ملتا ہے مگر اس کے وجود کا پتہ نہیں۔

ش

شامِ اودھ۔ لکھنؤ کی شام جو اپنی رنگا رنگ دلچسپیوں کے باعث مشہور تھی۔ نوابین اور شاہان اودھ کے زمانہ میں شام کو بازاروں کی سجاوٹ اور تفریحات کی رنگارنگی نہایت دلکش تھی۔ جو آج تک مشہور ہے۔

شاہنامہ۔ ایران کے بلند شاعر فردوسی کی تصنیف، جو قدیم ایران کی منظوم تاریخ ہے۔ فردوسی نے یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کی فرمایش

پر منظوم کی تھی اس میں ساٹھ ہزار
اشعار ہیں۔

شبدیز۔ سیاہ رنگ کا گھوڑا جو مشکی کہلاتا
ہے۔ اور وہ گھوڑا جو خسرو بادشاہ
نے پرویز کو دیا تھا۔

شتّت شملہم۔ (خدا کرے) ان کا گروہ
بکھر جائے۔ تتر بتر ہو جائے۔

شجیع۔ بہت بہادر۔

شبیہ۔ ہم شکل۔

شجرِ طوبیٰ۔ بہشت کے ایک درخت کا نام۔
طوبیٰ کے معنی خوش خبری۔

شحنہ۔ کوتوال۔

شُدّھ۔ پاک خالص (ہندی)

شُرغاٹا نُکھن۔ وہ گھوڑا جو پورا
بادامی رنگ کا ہو۔

شعار۔ طریقہ۔ طرزِ عمل۔ چلن

شغال۔ گیدڑ

شفتال۔ بدکردار۔ آوارہ

شق القمر۔ چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔
روایت ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت
محمد صلعم کی ایک انگلی کے اشارہ
پر چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے
تھے۔ یہ آپ کا نمایاں معجزہ سمجھا
جاتا ہے۔

شُقّہ۔ بادشاہی فرمان والا تحریری قطعہ

شُکرم۔ ایک قسم کی سواری۔ بگھی فٹن جیسے
انگریزوں نے رائج کیا۔

شگرف۔ عمدہ۔ اچھا۔ مضبوط۔

شلک۔ بندوق اور توپ داغنے کی آواز۔

شلنگے بھرنا۔ چھلانگ لگانا۔ اچھلنا

شمسِ بازغہ۔ روشن سورج۔ علم ہیئت
اور فلسفہ کی ایک عربی کتاب کا نام ہے
جو بہت مشہور ہے قدیم نصابِ تعلیم
میں شامل ہے۔

شمر۔ وہ شخص جس نے میدانِ کربلا کی
جنگ میں حضرت امام حسین رض کا
سر مبارک تن سے جدا کیا تھا۔

شماتت۔ دوسروں کی تکلیف پر خوش
ہونا۔

شنیع۔ بہت برا۔ گالی گلوج۔

شنجرف۔ گہرے سرخ رنگ نرم پتھر
جو دواؤں میں استعمال ہوتا ہے

شیمہ۔ خصلت۔ عادت

شہرِ شملہ۔ اندھیر نگری۔

شہلا۔ سرخ اور سیاہ آنکھ والا۔ نرگس
کی ایک قسم

شیر افگن۔ شیر کو پچھاڑنے والا بادشاہ
جہانگیر کی بیگم ملکہ نورجہاں کے
پہلے شوہر کا نام ہے جو بہت بہادر
تھا اور اس نے مقابلہ پر ایک شیر

کو مار ڈالا تھا۔

شیخ الرئیس۔ مشہور عالم اور طبیب حکیم بوعلی ابن سینا کا لقب ہے۔

شیخ سدّو۔ ایک فرضی بزرگ یا جن جس کی عقیدت مند عورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اس کی قبر امروہہ ضلع مراداباد میں زیارت گاہ عام ہے۔ اس کے نام کا بکرا بطور منت ذبح کیا جاتا ہے۔

شیدی لندھور۔ ایک مشہور حبشی کا نام ہے۔

شیون۔ رنج وافسوس

"ص"

صاد کرنا۔ پسند کرنا۔

صاعقہ۔ کڑک بجلی چمکنے کی تیز آواز۔

صارم۔ تیز کاٹنے والی تلوار۔ بہادر آدمی۔

صبّاغ۔ رنگ ریز۔ کپڑے رنگنے والا۔

صبیّہ۔ نابالغ لڑکی۔

صبوحی۔ صبح کو پینے والی شراب۔

صحنک۔ رکابی۔ طباق۔ کسی برتن میں کھانے کی چیزیں رکھ کر حضرت بی بی فاطمہ کی نذر دلاتے ہیں۔ اور پاک دامن عورتیں وہ کھاتی ہیں۔ بعض جگہ یہ رسم اب بھی جاری ہے۔

صَرفہ۔ فائدہ

صخرۃ۔ چٹان۔

صرع۔ مرگی کی بیماری۔

صریر۔ قلم چلنے کی آواز

صعوا۔ ممولا۔ جو ایک خوبصورت چڑیا ہے

صعود۔ اوپر چڑھنا۔ ابھارنا

صفدر۔ بہادر شیر

صلبی۔ پشتینی۔ حقیقی نسل کا ہونا۔

صلابت۔ ٹھوس ہونا۔ سختی

صلوٰتیں سنانا۔ برا بھلا کہنا۔ ملامت کرنا۔

صمصام۔ شمشیر

صمیم۔ خالص۔ تہہ دل سے۔ مغز۔

صُم۔ بہرہ

صوت۔ آواز

صوف۔ پشمینہ۔ اون

صولت۔ رعب۔ دبدبہ۔ حملہ۔

صہبا۔ شراب۔

صیت۔ شہرت۔

صیغہ۔ سانچہ۔ محکمہ۔ فعل کی مختلف صورتوں کو صیغہ کہتے ہیں۔

صیانت۔ حفاظت۔ دیکھ بھال۔

صیرفی۔ صراف۔ حیلہ گر۔ پرکھنے والا۔

صیف۔ گرمی کا موسم ۔

صہیونیت۔ یہودیت۔ یہودیوں کی عالمی تحریک کا نام۔

"ض"

ضاحک۔ ہنسنے والا۔

ضحیٰ۔ چاشت کا وقت۔

ضرغام۔ زبردست شیر۔ درندہ

ضغطہ۔ تنگی۔ سختی۔ دباؤ

ضریح۔ قبر۔

ضیف۔ مہمان

ضیغم۔ پھاڑ کھانے والا شیر

ضیق۔ تنگ۔

ضیق النفس۔ بیماری کا نام۔ سانس کا تنگی کے ساتھ آنا جانا۔ جسے دمہ کہتے ہیں۔

"ط"

طالع۔ قسمت۔ نصیب۔ طلوع ہونے والا۔

طارم۔ لکڑی کا مکان۔ بالا خانہ۔

طاس۔ طشت۔ لگن۔ بڑا تھال۔

طاغوت۔ شیطان۔

طائفہ۔ گروہ۔ آدمیوں کی ٹولی۔

طالع شناس۔ نجومی۔ قسمت کا حال بتانے والا۔

طاب ثراہ۔ اس کی قبر کی مٹی نرم و خشگوار رہے۔

طاق کسریٰ۔ نوشیرواں بادشاہ کا محل

طبخ۔ پکانا۔

طبّاع۔ تیز طبیعت

طبِ اکبر۔ طب کی ایک کتاب کا نام ہے جس کے مصنف حکیم محمد اکبر ارزانی تھے۔

طبلہ عطار۔ عطر فروش کا وہ ڈبہ یا خاص ظرف جس میں عطر رکھتا ہے۔

طبل۔ بڑا ڈھول۔

طُرفہ۔ انوکھی بات۔ انوکھی چیز۔

طرفۃ العین۔ پلک جھپکنے کا وقفہ۔

طربوش۔ ترکی ٹوپی۔

طعم۔ لذت۔ ذائقہ۔

طغیان۔ سرکشی۔ بغاوت۔

طغرا۔ ایک قسم کا خاص نشان بطور نام یا عبارت مختصر جگہ لکھنا۔ زیادہ الفاظ کو کم سے کم حروف میں خوبصورتی سے لکھنا۔ آرائش کے لیے ایسے طغرے مکان کے اندر لگائے جاتے ہیں۔ خطِ طغرا۔ خوشنویسی کی ایک قسم ہے۔

طِفلس ۔ ملک قفقاز کا قدیم دارالحکومت
طَلاقت ۔ تیز زبانی ۔
طَلعت ۔ دیدار ۔ روشنی
طَلایہ ۔ فوج کا وہ دستہ جو رات
" کو شہر کی حفاظت کے لیئے گشت
کرے ۔
طَنّاز ۔ شوخ ۔ ناز و انداز دکھانے
والا
طَنطَنہ ۔ نقارہ کی آواز
طَنبورہ ۔ چھ تاروں کا ستار
طُوری ۔ بٹیر کی ایک قسم جو لڑائی جاتی ہے
طُوبیٰ ۔ بہشت کا ایک پھل دار درخت
طُومار ۔ کاغذ کا گٹھا
طَیران ۔ اڑنا ۔ اڑانا

" ظ "

ظَبی ۔ ہرن ۔
ظلمات ۔ اندھیرے ۔ ایک سمندر کا
" نام جس کو بحرِ اٹلانٹک کہتے ہیں ۔
" اس مقام کو بھی کہا جاتا ہے
جہاں آبِ حیات کا چشمہ ہے ۔
ظَلُوم ۔ بہت بڑا ظالم ۔
ظَن ۔ گمان ۔ خیال ۔
ظِمأ ۔ پیاس ۔ تشنگی ۔

ظَہری ۔ پشت والی چیز ۔
ظَہر ۔ پیٹھ ۔

" ع "

عاج ۔ ہاتھی دانت
عاجِل ۔ جلدی کرنے والا ۔
موجود چیز
عار ۔ شرم ۔ حیا ۔
عارِض ۔ گال ۔ رُخسار ۔
عاری ۔ ننگا ۔ برہنہ ۔ خالی
عاشُورہ ۔ ماہِ محرم کی دسویں
" تاریخ ۔ حضرت
امام حسین کی شہادت کا دن
عاطِفت ۔ سرپرستی ۔ حمایت ۔
مہربانی ۔
عاق ۔ باپ سے سرکشی کرنے
والا ۔
عالی گہر ۔ معزز خاندان ۔
" اونچی ذات والا
عُدول ۔ نافرمانی ۔ حکم کے
" خلاف کرنا ۔
عَدن ۔ عرب کا ایک مشہور شہر
جو ملک یمن میں شامل ہے
اور ساحل سمندر پر واقع

" ہے۔ وہاں کے موتی بہت مشہور
" ہیں۔ دُرِّ عدن، کو شاعروں
" اور نثر نگاروں نے بطور تشبیہ بہت
" استعمال کیا ہے۔
عَدِیمُ التَّشبِیہ ۔ جس کے مثل کوئی نہ ہو۔
" جس کا کوئی ساجھے دار
" نہ ہو
عَذُوبَت ۔ مٹھاس۔
عَزَازِیل ۔ شیطان۔
عُزلَت ۔ گوشہ نشینی۔
عَزل ۔ ہٹانا۔ جگہ سے اتارنا۔
" مرتبہ گھٹانا
عَرُوض ۔ وزنِ شعر کا علم۔ یہ فن خلیل
" ابن احمد نے ایجاد کیا تھا۔ تاکہ
" اشعار کے وزن کی جانچ کی جاسکے
" اس کے لئے جو وزن مقرر ہیں
" ان کو بحرین کہتے ہیں۔ اصل بحریں
" ۱۸ ہیں ان کی مدد سے چند اور
" بحرین بنائی گئی ہیں۔
عَربَدہ جو ۔ لڑاکا۔ لڑائی کے لئے بہانے
ڈھونڈنے والا۔
عَرق گیر ۔ وہ آلہ یا ظرف جس میں
دواؤں کا عرق کشید کیا جاتا ہے
عَسکَر ۔ فوج۔ لشکر
عُشر عَشِیر ۔ دسواں حصّہ۔ تھوڑا سا

عِشق پیچاں ۔ ایک بیل دار پودا،
" جس کی بیل درختوں اور دیواروں
" پر چڑھ جاتی ہے۔
عَصَافِیر ۔ گوریّا چڑیاں۔ عُصفُور کی
جمع ہے۔
عُطارِد ۔ ایک ستارہ جو منشی فلک
" کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں علم و فضل
" اس کے متعلق ہے۔
عَطش ۔ پیاس۔
عُطارِد قلم ۔ بہترین لکھنے والا۔
عَظِیمُ اللہ فانی حقہ ۔ ایک قسم کا
" حقہ جو اپنے موجد کے نام سے
" مشہور ہے۔
عِفرِیت ۔ بھوت۔ پریت۔ دیو
عَفِیفَہ ۔ پاک دامن۔
عَقرَب ۔ بچھو۔
عَقِیم ۔ بانجھ۔
عقیقِ یمن ۔ عرب کے ملک یمن کا
" یاقوت۔ جو قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔
عَلَف ۔ گھاس۔ چارہ۔
عِلمِ لَدُنّی ۔ خدا داد علم
عَلَی التَّواتُر ۔ مسلسل۔ لگاتار۔
عَلّامی ۔ بہت علم والا۔ علامہ بھی
کہتے ہیں۔
عَلَائِم ۔ نشان۔ علامتیں۔ (اسباب)

عَمّاری ۔ ہودج ۔ اونٹ پر رکھنے
" کے لیئے ایک طرح کی بند ڈول
" سی بنا دیتے ہیں جس میں سواریاں
بیٹھتی ہیں
عُمق ۔ گہرائی ۔
عُمُود ۔ ستون ۔
عَمَّ نَوَالَہٗ ۔ اس کی بخشش عام ہے ۔
عمرو عیّار ۔ ایک چالاک شخص کا نام
" جو بڑا فریب کار اور جادوگر تھا۔
" یہ فرضی نام داستان امیر حمزہ
" کے مصنفوں نے خوب استعمال
" کیا ہے۔ اس کی زنبیل یعنی جھولا
" مشہور تھا جس میں چھوٹی بڑی
" بے شمار چیزیں بس سما جاتی تھیں
عمرانیات ۔ قدیم زمانہ کے علوم
عُنصُر ۔ جڑ ۔ بنیاد ۔
عُنفوان ۔ آغاز ۔ ابتدائی زمانہ ۔
اٹھتی جوانی ۔
عُنقا ۔ لمبی گردن کا ایک فرضی پرندہ
" جب کسی بے وجود چیز کا ذکر ہو
" تو یہ نام استعمال کیا جاتا ہے کمیاب
عَنبر ۔ ایک قسم کی خوشبو، جو ایک بحری
" جانور کے جسم سے حاصل ہوتی ہے ۔
عُود ۔ ایک خوشبودار درخت کی لکڑی
" جس کو جلانے سے خوشبودار دھواں
نکلتا ہے ۔
عَینُ الکمال ۔ نظر بد ۔
عِیاذاً باللہ ۔ خدا کی پناہ ۔

" غ "

غالیہ مُو ۔ خوشبودار، سیاہ
" بالوں والا ۔
غاشیہ بردار ۔ فرماں بردار ۔
غازہ ۔ ایک خوشبودار سفوف جو
" چہرہ پر ملا جاتا ہے ۔
غالیہ ریز ۔ خوشبو بکھیرنے والا ۔
پھیلانے والا ۔
غَبغَب ۔ ٹھوڑی ۔
غچّا کھانا ۔ دھوکہ کھانا ۔
غتربود ۔ غائب ہونا ۔ ختم ہونا
غُرّہ ۔ چاند کے مہینے کی پہلی تاریخ ۔
غُرفش ۔ بحث تکرار ۔ غصہ کی
" باتیں ۔
غِربال ۔ چھلنی ۔
غُرفہ ۔ کھڑکی ۔ جھروکہ ۔
غزال ۔ ہرن ۔
غصب ۔ چھین لینا ۔ دوسرے کی
چیز جبراً لے لینا ۔
غَضَنفَر ۔ شیر درندہ ۔

غضِّ بَصَر ۔ چشم پوشی کرنا ۔
غِل ۔ غش ۔ کدورت کھوٹ
غَمّاز ۔ چغل خور ۔
غُنّہ ۔ جس کی آواز ناک سے نکلے ۔
غَوث ۔ فریاد رس ۔ بڑا بزرگ ۔
〃 اولیاء اللہ کا ایک عہدہ ۔
غَوامِض ۔ گہری قابل غور باتیں ۔
〃 راز کی باتیں ۔ مشکل مسائل
غَوری ۔ تانبہ کی گہری پلیٹ یا پیالہ
غَوّاص ۔ غوطہ لگانے والا ۔
غَیرِ ذالِک ۔ اس کے سوا ۔ علاوہ ۔
غیر منقولہ ۔ جس کو منتقل نہ کیا جاسکے ۔

"ف"

فَاش ۔ ظاہر ۔ آشکار ۔
فَارِق ۔ جدائی ڈالنے والا ۔ فرق
〃 کرنے والا ۔
فَاتِر ۔ خراب ۔ سست
فَاقِد ۔ گم کرنے والا ۔ کھونے والا ۔
فَاقِع ۔ گہرا پیلا رنگ ۔
فَائِق ۔ بہتر ۔ بلند ہونے والا ۔
فَاسِخ ۔ توڑنے والا ۔ ختم کرنے والا ۔
فَانوس ۔ ایک قسم کا شمع دان جو لٹکا
〃 دیا جاتا ہے ۔

فتادگی ۔ گراپن ۔ گرا ہوا ہونا ۔
〃 کم ہمت ہونا ۔
فِتراک ۔ چلاّ شکار بند ۔
فِدوی ۔ قربان ہونے والا ۔
عاجزانا چیز ۔
فرزانہ ۔ عقل مند ۔ دانشور ۔
فَرَس ۔ گھوڑا ۔
فَرسَخ ۔ تین میل کے برابر فاصلہ ۔
فَرسَنگ ۔ 〃 〃 〃
فَرسا ۔ پرانا ہونے والا ۔ گھٹنے
والا ۔
فَرہَنگ ۔ عقل ۔ بزرگی ۔ لغت کی کتاب ۔
فَراوان ۔ بہت زیادہ ۔
فَرتوت ۔ بہت بوڑھا ۔
فَرزین ۔ شطرنج کا ایک مہرہ جو فرزین
〃 کہلاتا ہے ۔
فُرات ۔ عراق عرب کے ایک دریا کا
〃 نام ہے ۔
فَریدُ الدَّہر ۔ زمانہ بھر میں یکتا ۔
فَریدُون ۔ ایران کا مشہور بادشاہ تھا ۔
فری میسن ۔ قدیم انگلستان میں ایک
〃 پراسرار گروہ تھا جس کے ممبر
〃 کسی کو اپنا مسلک نہیں بتاتے
〃 تھے ۔ اشاروں سے اپنے
〃 گروہ کے افراد کو پہچانتے تھے ۔

" وہ اشارے وہی لوگ سمجھتے
" تھے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں
" میں بھی اس کا کچھ اثر پہونچا۔
" ہندوستان میں بھی اس کی
" شہرت ہوئی۔

فَرُّخ نِہاد۔ مبارک ذات والا۔
عالی نسب

فَرَع۔ شاخ۔ ڈالی

فِرط۔ زیادتی

فَخیم۔ بزرگ۔ بڑی چیز۔

فُسحت۔ کشادگی۔ فراغت

فُحش۔ بے نتیجہ بات۔

فضیحت۔ رسوائی۔ بدنامی۔

فغفور۔ چین کے ایک قدیم بادشاہی
" خاندان کا لقب۔ اس خاندان
" کا ہر بادشاہ چین کہلاتا تھا

فَق۔ حیران۔ پریشان۔

فِقدان۔ گم ہونا۔ کم یاب ہونا۔

فَقید۔ بے مثل۔ نایاب۔

فُکاہت۔ خوش طبعی بذلہ سنجی

فلک سیر۔ ایک نشیلی دوا۔ افیون
" کو بھی کہتے ہیں۔

فنجان۔ چھوٹی پیالی، چھوٹا پیالہ
جس میں قہوہ وغیرہ پیا جاتا ہو۔

فوطہ دار۔ خزانچی۔ نقد روپیہ رکھنے والا۔

فَتیل۔ مکر و فریب۔

فیل پا۔ پاؤں سوجنے کی بیماری۔

فَلکُ الافلاک۔ سب آسمانوں
" سے بڑا اور بلند آسمان، ساتواں
" آسمان۔

"ق"

قاقُم۔ ایک جانور کا نام ہے جس
" کی کھال بہت قیمتی ہوتی ہے
" اور اس سے عمدہ لباس بنتا ہے۔
" یہ پہاڑی جانور بہت کمیاب
" ہوتا ہے

قال و قیل۔ باہمی گفتگو جس میں
بحث مباحثہ کی صورت ہو۔

قابوچی۔ خود غرض مطلبی۔ دربان۔

قَبا۔ امیروں کا خاص لباس جو لمبا
" اور گھیر دار ہوتا ہے۔ جس طرح
" عبا۔

قابیل۔ حضرت آدم کے دوسرے
بیٹے کا نام۔

قارون۔ ایک بہت دولت مند
" بادشاہ تھا مشہور ہے کہ اس کے
" خزانوں کی کنجیاں چالیس اونٹوں
پر لادی جاتی تھیں۔ قارون کا خزانہ

" ضرب المثل بن گیا ہے۔
قاہرہ ۔ ملک مصر کا دارالسلطنت
قُبّہ ۔ گول گنبد نما عمارت۔ بُرج۔
قدغن ۔ روک۔ ممانعت۔
قُدّوس ۔ بہت پاکیزہ۔
قدوہ ۔ رہنما۔ سرگروہ۔ منتخب۔
قرابہ ۔ صراحی۔ شراب رکھنے کا ظرف۔
قرابین ۔ ایک قسم کی چھوٹی بندوق۔
قرمز۔ قرمزی ۔ سرخ۔ ارغوانی رنگ۔
قرن ۔ سو سال۔ صدی۔ ستاروں کا ملنا۔
قرنا۔ قرنائی ۔ بانسری۔ نرسنگا
" سینگ کا بنا ہوا بگل۔
قعر ۔ گہرائی۔ غار۔ گڑھا۔
قراول ۔ سنتری۔ بندوقچی۔
قرص ۔ ٹکیہ۔ چٹکی۔
قرمساق ۔ کمینہ۔ بھڑوا۔
قرۃ العین ۔ آنکھ کی ٹھنڈک۔ مذہب
" بابی کی ایک رہنما خاتون کا نام بھی
" ہے۔
قسطاس ۔ ترازو۔
قشون ۔ لشکر۔ فوج کا دستہ۔
قضاکار ۔ اتفاقاً۔
قطامہ ۔ کٹنی۔ خستہ عورت۔
قطرب ۔ مرگی کا مرض جنوں کی ایک قسم۔
قطاع الطریق ۔ رہزن۔ ڈاکو۔ لٹیرے۔

قفس عنصری ۔ مراد انسان کا جسم
" جس کے اندر روح قید ہے۔
قلماقنی ۔ وہ عورت جو مسلح ہو کر
" بادشاہوں اور امیروں کے
" محلوں میں پہرہ دیتی ہے۔
قلابہ ۔ مچھلی پکڑنے کا کانٹا۔
قلیان ۔ حقہ۔
قلب ساز ۔ جعلی سکہ اور سونا چاندی
" بنانے والا۔
قلاجنگ ۔ پہلوانی کا ایک خاص
" داؤں۔
قماش ۔ ڈھنگ۔ گنجفہ کی ایک
" بازی۔
قم ۔ لفظی معنی "اٹھ کھڑا ہو۔
" ایران کے ایک مشہور شہر کا
" نام ہے جو علماء کا مرکز ہے
قنات ۔ چاروں طرف کا پردہ۔
قنوج ۔ اودھ کا مشہور مردم خیز
" قصبہ جو ضلع ہردوئی (اترپردیش)
" میں واقع ہے زمانہ قدیم میں
" علماء اور فنکاروں کا مرکز تھا۔
قوز ۔ وہ فیتہ جو کپڑوں کے حاشیہ
" پر لگاتے ہیں۔
قوارہ ۔ ٹکڑا۔ پارچہ۔
قیراط ۔ ایک وزن کا نام۔ اونس کا چوبیسواں حصہ

"ک"

کاسک ۔ روس کے مشرقی علاقہ
" کی ایک قوم کا نام ہے۔
کاکل ۔ زلف۔ لمبے بال۔
کارچوب ۔ سونے یا چاندی کے
" تاروں سے کپڑوں پر پھول
" اور بیل بوٹے بنانے کی لکڑیاں یا اوزار
کاواک ۔ خالی۔ کھوکھلی چیز۔
کالم ۔ فوج کا ایک دستہ۔ صفحے کے
" دو حصے۔
کامروپ ۔ آسام کا ایک علاقہ جو
" جادوگروں کا مرکز تھا۔ یہاں
" کے جادوگر مشہور ہیں۔
کاوا دینا ۔ گھوڑے کو چکر دینا۔
کایر ۔ بزدل۔ مغلوب۔
کایا ۔ شکل جسم۔ روپ۔
کاگریزی ۔ سرخی مائل سیاہ رنگ
" بینجنی رنگ۔
کاسد ۔ کھوٹا۔ ناقص۔ بے قدر
کارچوبی ۔ زردوزی۔ سونے
" کے تاروں کا کام۔
کاست ۔ کمانے والا۔
کاری ۔ گہرا۔ سخت۔

کافہ ۔ گروہ۔ بھیڑ۔
کانڈ ۔ باب حصہ
کائیان ۔ دغاباز۔ چالاک۔
کالبد ۔ ڈھانچہ۔ جسم۔
کبریت ۔ گندھک۔
کبک ۔ چکور (ایک پرندہ)۔
کپوت ۔ نافرمان بیٹا۔
کتارا ۔ گنے کی ایک قسم۔ املی کا
" پھل۔
کتان ۔ باریک ریشمی کپڑا جو بہت
" نازک ہوتا ہے۔ السی اور سن
" سے بنا جاتا ہے اور چاندنی کی روشنی
" پڑتے ہی پھٹ جاتا ہے۔ جیسا کہ
" مشہور ہے۔
کتھک ۔ گویا۔ ناچنے والا۔ ناچ
" کی ایک قسم۔
کحل الجواہر ۔ وہ سرمہ جس میں موتی
" شامل ہوں۔
کڈھب ۔ بے ڈھنگ۔ بے طور۔
کرن پھول ۔ کانوں میں پہننے کا
" ایک زیور۔
کرم پیلہ ۔ ریشم بنانے والا کیڑا۔
کروبی ۔ فرشتہ۔
کرمک شب تاب ۔ جگنو۔
کرگس ۔ گدھ۔

کژدم ۔ بچھو ۔
کستوری ۔ مشک ۔ جو ختنی ہرن
" کی ناف سے نکلتی ہے ۔
کسبی ۔ بیسوا ۔ آوارہ ۔
کسم ۔ زعفران ۔
کگری ۔ کمہارن ۔
کشش انابیب شعری ۔ وہ کشش
" جس سے رقیق (پتلی) چیز اپنی
" ہموار سطح سے اوپر چڑھ جاتی ہے
کشف ۔ کھولنا ۔
کفاف ۔ وظیفہ ۔ روزینہ ۔ معاش
کفشگر ۔ جوتے بنانے والا ۔
کفران ۔ ناشکری ۔
کفش دوز ۔ موچی ۔
کفیل ۔ ذمہ دار ۔ دوسرے کا کام
خود کرنے والا ۔
کگڑ والا ۔ بازار میں حقہ پلانے والا
کالبدر فی النجوم ۔ جیسے چودھویں
" تاریخ کا چاند، ستاروں کے
" درمیان نظر آئے ۔
کلپانا ۔ غمگین کرنا ۔ ستانا ۔
کلپنا ۔ زور زور سے رونا ۔
کلتھی ۔ سیاہ رنگ کا ایک اناج ۔
کلاونت ۔ گویّا ۔
کلجگ ۔ برا زمانہ ۔

کلنک ۔ الزام ۔ بدنامی ۔
کلاغ ۔ کوّا ۔
کلال ۔ کمہار ۔
کلوخ اندازی ۔ پتھر پھینکنا ۔
" ڈھیلے مارنا ۔
کمپاس ۔ زمین ناپنے کا آلہ ۔
کمیت ۔ سرخ رنگ کا گھوڑا ۔
کما ینبغی ۔ جیسا کہ چاہیئے ۔
کمانچہ ۔ سارنگی جیسا ایک ساز ۔
کمبری ۔ وہ گھوڑا جو چڑھائی پر نہ
" چڑھ سکے ۔
کنہہ ۔ حقیقت ۔ اصلیت ۔ گہرائی ۔
کنچنی ۔ رنڈی ۔ کسبی ۔
کناری ۔ چوڑا گوٹا ۔
کنعان ۔ ملک شام کا قدیم شہر جہاں
" حضرت یعقوب پیغمبر رہتے تھے ۔
" ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ
" حسن و جمال میں ممتاز تھے جن کو
" ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنوئیں
" میں ڈال دیا تھا ۔ ان کو ماہِ کنعان
" بھی کہتے ہیں ۔
کورنش ۔ آداب بجالانا ۔ تعظیم کرنا ۔
کوس ۔ نقارہ ۔
کوتل ۔ وہ گھوڑا جس کو سجا بنا کر
" امراء کی سواری کے ساتھ لیجاتے ہیں

کوکا۔ دائی کا بیٹا۔ اتالیق۔
کوکھ جلی۔ بانجھ۔
کورِدہ۔ چھوٹا گاؤں۔ پُروا۔
کوچے۔ وہ پٹھا جو پاؤں کے پیچھے
" اور ایڑی کے اوپر ہوتا ہے۔
" اگر وہ کٹ جائے تو چلنا مشکل
ہوتا ہے۔
کوہ کن۔ پہاڑ کھودنے والا۔
" مراد فرہاد ہے جو شیریں پر
" عاشق تھا اور اس کے حکم سے
" پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کی کوشش
" میں اپنے ہی تیشہ سے ہلاک ہوگیا
" تفصیل لفظ جوئے شیر کی
" تشریح میں لکھی گئی ہے۔
کوہِ نور۔ مشہور ہیرا۔ جو راجہ بکرما
" جیت کو ملا تھا۔ اُس سے
" مالوہ کے کسی راجہ کے ہاتھ لگا،
" جس سے ہمایوں بادشاہ کو ملا۔
" اکبر اور جہاں گیر کے خزانہ میں
" رہا۔ شاہ جہاں نے اپنے تاج
" میں جڑوا لیا۔ اسی کے خاندان
" میں رہا۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ
" میں نادر شاہ درّانی نے دہلی پر
" حملہ کیا اور محمد شاہ سے کوہ نور
" چھین لیا اور ساتھ افغانستان لے گیا۔
" شاہ شجاع کے ذریعہ یہ
" مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ
" آیا اس سے انگریزوں نے
" حاصل کر کے انگلستان پہونچا
" دیا جو وہاں کے شاہی تاج
" میں جڑا گیا۔ اب ملکۂ برطانیہ
" کے تاج کی زینت ہے۔
کوہِ قاف۔ بحرِ کیسپین اور بحرِ
" اَسود کے درمیان ایک پہاڑ
" ہے جس کے شمال میں آرمینیا
" آذر بائیجان اور جارجیا واقع
" ہیں یہاں کی عورتیں بہت
" خوبصورت مشہور ہیں۔ پرانی
" عوامی کہانیوں میں کوہِ قاف
" کی پریوں کا بہت ذکر آتا ہے
کہروا۔ صبح کا تاج۔
کہولت۔ ادھیڑ عمر ہونا۔ بالوں کا
" کھچڑی ہونا۔
کیتکی۔ ایک پھول کا نام ہے
کید۔ مکر۔ فریب۔

"گ"

گاب۔ گودا۔ مغز۔
گات۔ وضع۔ ڈھنگ۔

گاجؔ ۔ غصہ ۔ گرج ۔
گاج پڑے ۔ آفت آئے ۔ مصیبت پڑے ۔
گاذر ۔ دھوبی ۔
گاؤ زمین ۔ وہ گائے جس کے لیئے
" مشہور ہے کہ اس کے سینگوں پر
" زمین کا بوجھ ہے ۔
گاؤدی ۔ احمق ۔ بیوقوف ۔
گٹکری ۔ وہ پیچدار آواز جو گانے
" والوں کے گلے سے نکلتی ہے ۔
گٹکا ۔ چھوٹی کتاب ۔ بڑی کتاب کا
" خلاصہ ۔ ایک طلسمی گولی جس کو منہ
" میں رکھ کر اڑ جاتے ہیں یہ عوامی
" روایت ہے
گرہیان کرنا ۔ تپاک ظاہر کرنا ۔
گاڑھی بوٹی چڑھانا ۔ زیادہ بھنگ
پی جانا ۔
گذری ۔ شام کا بازار ۔ وہ بازار
" جو شام کو لگتا ہے ۔
گزلک ۔ قلم تراش ۔ وہ چاقو جس کی
نوک مڑی ہوئی ہوتی ہے ۔
گرگ ۔ بھیڑیا ۔
گل کھلانا ۔ فساد کھڑا کرنا ۔ انوکھا
کام کرنا ۔
گل چلا ۔ بندوق کی گولی نشانے
" پر لگانے والا ۔

گل بکاؤلی ۔ ایک پھول کا نام ہے ۔
" ایک پری کا نام جس کا قصہ
بہت مشہور ہے
گلزار نسیم ۔ نسیم لکھنوی کی لکھی ہوئی
" مثنوی کا نام ہے جس میں
" گل بکاؤلی کا قصہ نظم کیا ہے ۔ اردو
کی مشہور اور مقبول مثنوی ہے
گلخن ۔ انگیٹھی ۔
گل سر سبد ۔ ممتاز ۔ چنا ہوا پھول
گل بانگ ۔ خوشی کا شور و غل
گل اندام ۔ پھول جیسے نرم و خوبصورت
" جسم والا ۔
گل دم ۔ بلبل ۔ ایک سرخ رنگ
کی چڑیا ۔
گل دینا ۔ پھانسی دینا ۔
گل ڈاب کرنا ۔ کسی کا مال چھین لینا ۔
گل ڈانگ ۔ خونخوار شکاری کتا
جو بہت قوی ہوتا ہے ۔
گلخپ ۔ باہمی تکرار ۔ رنجش کی
" باتیں ۔
گوت ۔ خاندان قبیلہ ۔
گوگرد ۔ گندھک ۔
گوہر شب چراغ ۔ بہت شفاف
اور چمکدار یاقوت جو اندھیرے
میں دھکتے کوئلے کی طرح چمکتا ہے ۔

گوہ کھرُد ۔ مڑا ہوا گوٹا۔ لچکا۔
گوپامَو ۔ ایک مشہور تاریخی قصبہ جہاں
" بڑے بڑے عالم و فاضل
" پیدا ہوئے۔ وہاں کے لوگ بددماغ
" اور مغرور مشہور تھے یہ قصبہ ضلع
" ہردوئی (اتر پردیش) میں واقع ہے
گھُور ۔ گہرا رنگ ڈراونی گرج۔
گیتی ۔ دنیا۔ عالم۔
گیدی ۔ بزدل۔ احمق۔ لالچی۔
گیہان ۔ دنیا۔ جہان۔
گیاہ ۔ گھاس۔
گیانی ۔ عالم۔ عقل مند۔

"ل"

لآلی ۔ موتی۔
لابُد ۔ ضروری۔
لابہ ۔ خوشامد۔ چاپلوسی۔
لاجَرم ۔ ضرور۔ خواہ مخواہ۔
لاجورد ۔ نیلے رنگ کا ایک قیمتی پتھر۔
لاریب ۔ بے شک۔ بلاشبہ۔
لات ۔ ایک بت کا نام جو اسلام
" سے پہلے کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا۔
لاطائل ۔ فضول۔ بے فائدہ۔
لامِس ۔ چھونے والا۔

لامِع ۔ روشن۔ چمکنے والا۔
لاینفک ۔ جدا نہ ہونے والا۔
لاہی ۔ ایک دبیز قسم کا ریشمی کپڑا
" گلبدن کی طرح۔
لبیب ۔ عقل مند۔
لبیک ۔ حاضر ہوں میں (پکار کا جواب ہے)۔
لُترے ۔ چغل خور۔ ادھر کی اُدھر لگانے
والے۔
لٹکن ۔ کان کا ایک زیور۔ کرن پھول۔
لُجّہ ۔ بھنور۔ تھاہ۔
لحم خوک ۔ خنزیر کا گوشت۔
لخلخہ ۔ ایک خوشبودار مرکب جو سونگھنے
" کے لئے بنایا جاتا ہے۔ بیہوشی کی
" حالت میں سنگھانے سے
" ہوش آجاتا ہے۔
لحیم ۔ موٹا تازہ۔
لُعبت ۔ گڑیا۔
لف ونشر ۔ لپٹا ہوا اور کھلا ہوا۔
" فن بلاغت کی ایک اصطلاح ہے۔
لگد ۔ لات۔ ٹھوکر
لن ترانی ۔ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ
" سکتے" یہ آیت قرآنی کا ایک جز
" ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے کوہ طور
" پر اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش
ظاہر کی تو ان کو یہ جواب ملا تھا۔

" اردو میں یہ لفظ شیخی بگھارنے
" اور ڈینگ ہانکنے کے معنی میں
" استعمال ہوتا ہے۔

لَوث ۔ آلودگی ۔
لَوذَعِی ۔ سمجھ دار۔ تیز فہم ۔
لَو فَرَضْنَا ۔ اگر ہم فرض کریں۔ مان لیں ۔
لَوز ۔ بادام ۔
(۱) لَو نکنا ۔ چمکنا۔ تیز روشنی یا چمک
" ہونا بجلی کا چمک کر ادھر ادھر
" نظر آنا ۔
لَہِیب ۔ شعلہ ۔
لَہنَہ ۔ احمق ۔ گھامڑ ۔
لَیتَ ۔ کاش کہ ۔ تمنّا کرنا ۔
لَیلَۃُ البَدر ۔ چاند کی چودھویں رات ۔
لِینَت ۔ نرمی ۔
لَوّامَہ ۔ سخت ملامت کرنے والا ۔
لَوذَعِی ۔ تیز فہم ۔ سمجھدار ۔
لَئِیم ۔ کمینہ ۔

"م"

مَآب ۔ لوٹنے کی جگہ ۔ بازگشت ۔
مَا بَقِی ۔ جو باقی رہ گیا ۔
مَابِہ الاِحتِیَاج ۔ جس چیز کی
ضرورت ہو ۔

مَاثُورَہ ۔ نقل کیا ہوا ۔ جزا دیا ہوا ۔
مَاثُوم ۔ گنہگار ۔
مَاجِد ۔ بزرگ مردِ بزرگوار ۔
مَاخُوذ ۔ گرفتار ۔ پکڑا ہوا ۔
مَار گَزِیدَہ ۔ سانپ کا ڈسا ہوا ۔
مَارُوت ۔ ایک فرشتہ کا نام ۔
مَالَایُطَاق ۔ جس چیز کی طاقت نہ ہو
" ناقابل برداشت بوجھ ۔
مَالَایَنحَل ۔ ناقابلِ حل ۔
مَال زَادِی ۔ کٹنی ۔ طوائف ۔
مَامَضٰی ۔ جو گزر چکا ۔
مَامَن ۔ امن کی جگہ ۔
مَامُون ۔ محفوظ ۔
مَاوٰی ۔ واپسی کی جگہ ۔ مکان ٹھکانا ۔
مَاہِ نَخشَب ۔ حکیم ابن مقنّع کا بنایا ہوا ۔
" مصنوعی چاند تفصیل "ج" کے
" تحت لکھی گئی ہے ۔
مَاہِیِ مَرَاتِب ۔ وہ اعزازی نشان
" جو بادشاہوں کی سواری کے
" آگے ہاتھیوں پر چلا کرتے تھے ۔
مَاجُور ۔ اجرت پایا ہوا ۔ بدلہ پانے
" والا ۔
مُبَارِز ۔ فوج میں سے بڑھ کر
" لڑنے والا جنگجو ۔
مُبَذِّر ۔ زیادہ خرچ کرنے والا ۔

مُتَخاصِم ۔ باہم دشمنی کرنا۔ آپس میں
لڑنے والے ۔
مُتَخَیّلَہ ۔ خیال میں لایا ہوا۔ خیال کی جگہ ۔
متعہ ۔ کچھ مدت کے لیئے کسی عورت
سے نکاح کر لینا۔ یہ طریقہ شیعہ مسلک میں
جائز ہے ۔
مُتَرَشِّح ۔ ٹپکنے والا ۔ ظاہر ۔ عیاں
مُتَرَقِّب ۔ انتظار کرنے والا ۔
مُتَصَدّی ۔ آگے آنے والا ۔ خدمت
گار ۔ پیشکار عربی زبان کا
مشہور شاعر جس نے نبوت کا
دعوی کیا تھا اس نے سنہ ۹۶۰ء میں
وفات پائی ۔
مَثَاب ۔ لوٹنے کی جگہ ۔ ٹھکانہ ۔
مِثقَال ۔ ساڑھے چار ماشہ وزن ۔
مُجاوِرَت ۔ ہمسائیگی ۔ پڑوسی ہونا ۔
مُجَبِّی ۔ سلام کرنے والا ۔ تعظیم دینے
والا ۔
محبس ۔ قید خانہ ۔ پنجرہ ۔
مُحَاذِی ۔ روبرو ہونے والا ۔
مَحَافہ ۔ ڈولی ۔ فنس ۔ پردہ دار
سواری ۔
مُحَزِّم ۔ انگیا جو سینہ پر پہنی جاتی ہے ۔
مخضب ۔ رنگا ہوا ۔ خضاب لگا ہوا ۔
مُخَدَّرات ۔ شریف پردہ نشین
خواتین ۔

مُخَنَّث ۔ خواجہ سرا ۔ ہیجڑا ۔
مُخَیَّم ۔ خیمہ لگانے کی جگہ ۔
مَخمَصَہ ۔ بھوک ۔ اضطراب بڑھانے
والا غم ۔
مُداوَمَت ۔ ہمیشگی ۔
مَدخُولَہ ۔ گھر ڈالی عورت ۔
مُدَقِّق ۔ باریک بیں ۔ گہری نظر
سے جانچنے والا ۔ باریک نکتہ پیدا
کرنے والا ۔
مُدَوَّر ۔ گول ۔ گرد اگرد گھیرایا ہوا ۔
مُذنِب ۔ گنہگار ۔
مُذَہَّب ۔ سنہرا ۔ سونے کا بنا ہوا ۔
مُرچنگ ۔ سہ شاخہ برچھے کی شکل کا
تار والا چھوٹا باجا جس کی آواز
بہت سریلی ہوتی ہے ۔
مُتَرادِف ۔ ہم معنی الفاظ ۔
مرگ چھالا ۔ ہرن کی بالوں سمیت
کھال ۔ جس کو بچھا کر جوگی پوجا
کرتے ہیں ۔
مَرزبُوم ۔ جنم بھومی جائے ولادت
مُرغُولہ ۔ دھوئیں کا چھلا ۔ بالوں کا
گھونگر ۔
مَرگِ مفاجات ۔ ناگہانی موت ۔
مرغولہ مو ۔ گھونگریالے بال والے ۔
مَرام ۔ مقصد ۔
مَروِی ۔ روایت کیا ہوا ۔ بیان کیا ہوا ۔

مُرتاض ۔ ریاضت کرنے والا محنت
" کرنے والا۔
مِرّیخ ۔ ایک مشہور ستارہ ہے۔
مرکوز ۔ جمایا ہوا۔ گڑا ہوا۔ ایک
" چیز پر نظر جمانا۔
مُروّق ۔ صاف کی ہوئی چیز خاص
" طور سے سیال چیزوں کے لئے
" استعمال ہوتا ہے۔ جیسے پانی۔
" شراب۔ وغیرہ۔
مُزخرف ۔ جھوٹی بات کو سجا کر دکھانا۔
مُستاصل ۔ جڑ سے اکھاڑنے والا۔
مُستدعی ۔ خواہش مند۔ چاہنے والا۔
مسٹ مارنا ۔ مکر کرنا۔ اپنے عیب
" یا غلطی چھپانے کے لئے خاموش
" ہو کر پڑے رہنا۔
مُستشرق ۔ یورپ کا وہ عالم جو
" مشرقی علوم میں مہارت حاصل
" کرے۔
مُشتری خِصال ۔ اچھی عادتوں
" والا۔ مشتری ایک مشہور ستارہ
" ہے جس کے اثرات علم نجوم کے
" مطابق اسامی عادات واطوار
" پر اچھے مرتب ہوتے ہیں۔
مَشہد ۔ شہادت کی جگہ۔ ایران کا
مشہور شہر جہاں امام موسیٰ رضا کا مدفن ہے۔

مُشک گنج ۔ شہر لکھنؤ کے مرکزی
" حصہ میں ایک محلہ کا نام ہے۔
" جہاں نوابی عہد میں سقے زیادہ
" آباد تھے۔
مُشبّک ۔ وہ کھڑکی یا روشن دان
" جس میں باریک سوراخ ہو یا
" جالی لگی ہو۔
مُصحف ۔ کتاب۔ آسمانی کتاب کو
" کہتے ہیں قرآن شریف کے لئے
" بھی مستعمل ہے۔
مصر کے مینار ۔ ان کو اہرام کہا
" جاتا ہے یہ قدیم مصری بادشاہوں
" کے مقبرے ہیں۔ جن کے اندر ان
" کی لاشیں مسالے لگا کر محفوظ
" رکھی گئی ہیں اور ساتھ ہی مال و زر
" بھی۔ یہ بہت مضبوط پتھر کے اونچے
" میناروں کی شکل کے بنے ہیں۔
مَصئون ۔ محفوظ۔
مَصاف ۔ جنگ
مِضراب ۔ لوہے کا وہ تار جو ٹکونا
" ہوتا ہے، جس سے ستار بجاتے ہیں۔
مَضیٰ مَا مَضیٰ ۔ جو ہوا سو ہوا۔
مُضغہ ۔ ٹکڑا۔ لوتھڑا۔ نوالہ بھر چیز۔
مَطرُوح ۔ حقیر۔ ناپسندیدہ۔ پھینکا ہوا۔

مطرود ۔ نکالا ہوا ۔
مطلع الفجر ۔ صبح ہونے کا وقت ۔
صبح سویرے ۔
مطلق العنان ۔ آزاد ۔ بے لگام
" کسی کی رائے نہ ماننے والا ۔
مطائبات ۔ تفریحات ۔ مہذب
" تفریح ۔
معرا ۔ ننگا ۔ خالی ۔
معمورہ ۔ آباد ۔ بھرا ہوا ۔
معدن ۔ زمین کی کان ۔
مغار ۔ غار ۔ پہاڑ کی کھوہ ۔
مغبچہ ۔ آتش پرست کا بیٹا ۔
مغاک ۔ غار ۔ گڑھا ۔
مفاوضہ ۔ مشورہ کرنا ۔ بات کہنا ۔
مقابہ ۔ وہ صندوقچہ یا ڈبیہ جس
" میں عورتیں سنگار کا سامان
" رکھتی ہیں ۔
مقیش ۔ سونے یا چاندی کے تاروں
" سے بنی بیل ۔ چوڑی جھالر ۔
" جو لباس میں لگائی جاتی ہے ۔
مقعر ۔ گہری جگہ ۔ گڑھا ۔
مقارنت ۔ اکٹھا ہونا ۔
مکتوم ۔ چھپا ہوا ۔ پوشیدہ رکھا ہوا ۔
مکائد ۔ مکر و فریب ۔
مکافات ۔ پاداش ۔ برائی کی سزا

ملح ۔ نمک ۔
ملکوتی صفات ۔ اچھی عادتوں والا ۔
" فرشتوں جیسی خصلتوں والا ۔
منکر نکیر ۔ دو فرشتے جو مرنے کے بعد
" قبر میں سوال و جواب کے لیے
" آتے ہیں ۔
منال ۔ جائداد ۔ دولت ۔
مندرے ۔ کانچ کے حلقے جو کان
پگڑی ۔ دستار میں پہنے جاتے ہیں ۔
منجیرا ۔ پیتل کی چوڑے منہ کی
" کٹوری کا جوڑا جن کو آپس
" میں ٹکرا کر باجے کی طرح بجاتے ہیں ۔
موباف ۔ بالوں کو لپیٹنے کا کپڑا
" یا فیتہ ۔
مہزول ۔ لاغر ۔ دبلا پتلا ۔
مہزوم ۔ شکست کھایا ہوا ۔
مینو ۔ بہشت ۔
میمنہ ۔ دایاں حصہ ۔ فوج کا دایاں
" بازو ۔
میسرہ ۔ بایاں حصہ ۔ فوج کا بایاں
بازو ۔
میر بخشی ۔ زمانہ شاہی میں تنخواہ
" تقسیم کرنے والا ۔ عہدہ دار

"ن"

نابکار ۔ بدکردار۔ بے کار۔
نابلد ۔ پردیسی۔ انجان۔
نالکی ۔ لمبی آرام کرسی کے طرز پر بنی ہوئی تام جھام کی سواری جس کو کہار اُٹھاتے تھے۔
ناہج راہ چلنے والا۔ کشادہ راہ پیدا کرنے والا۔
ناسفتہ ۔ بغیر بیدھا ہوا۔ بغیر پرویا ہوا موتی۔
ناسوت ۔ دنیا۔ عالم اجسام۔
ناشکیب ۔ بے صبر۔
ناصب ۔ گاڑنے والا۔ نصب کرنے والا۔
ناظورہ ۔ نگہبان۔ مالی۔
نافرجام ۔ بدانجام
ناقور ۔ قرنا باجا۔ سنکھ
ناقوس ۔ سنکھ عبادت کا گھنٹہ جو صبح کو بجایا جاتا ہے۔
نامساعدت ۔ ناموافقت۔
ناوک ۔ چھوٹا تیر۔
ناہید ۔ زہرہ ستارے کا دوسرا نام۔ یہ ستارہ حسن و جمال سے منسوب ہے۔
نبیل ۔ بزرگ۔ خوبصورت۔

نجابت ۔ بزرگی۔ اچھے نسب والا ہونا۔
نخچیر ۔ شکار۔
نخل ۔ کھجور کا درخت۔
نخاس ۔ دلال۔ لکھنؤ کا مشہور گزری بازار۔
نرت ۔ بھاؤ۔ انداز۔
نردبان ۔ زینہ۔ سیڑھی۔
نسطور ۔ آتش پرستوں کا رہنما۔
نسترن ۔ ایک بڑے سفید پھول کا پودا۔
نسیم عنبر شمیم ۔ عنبر کی مہک لئے ہوئے صبح کی ہوا
نیاّ منیاّ ۔ بھولا بسرا۔
نضارت ۔ تازگی۔ شادابی۔
نفخ ۔ پھونکنا۔ ہوا بھرنا
نفیر ۔ بانسری کی آواز۔
نقرہ خنگ ۔ گھوڑے کی ایک اعلیٰ قسم۔
نکیرین ۔ منکر اور نکیر دو فرشتوں کے نام ہیں جو مرنے والے سے قبر میں سوالات کرتے ہیں اور جواب مانگتے ہیں۔
نمط ۔ روش۔ طرح۔
نمیقہ ۔ تحریر۔ خط۔ رقعہ۔
نمیم ۔ چغل خور۔ غلام۔

نمش ۔ دودھ کی مصنوعی جھاگ جو سردی
" کے موسم میں دودھ میں مصری ملا کر
" رات کو شبنم میں رکھ دیتے ہیں
" صبح اس کو اچھالتے ہیں تو گاڑھا
" ذائقہ دار جھاگ بن جاتا ہے اس
کو کھاتے ہیں
نہنگ ۔ گھڑیال۔ مگرمچھ ۔
نہیل ۔ بھاؤ۔ انداز
نورتن ۔ بازو کا جڑاؤ زیور ۔
" نو جواہرات کو بھی کہتے ہیں وہ
" یہ ہیں۔ لعل۔ موتی۔ پکھراج
" مونگا ۔ لاجورد۔ نیلم ۔ ہیرا
" یعقوت ۔ فیروزہ ۔
نیم رُوز ۔ دوپہر ۔
نیوشہ ۔ کان میں ڈالی ہوئی بات ۔
نیرنگ باز ۔ مکار۔ فریبی ۔ جادوگر ۔
نیرو ۔ طاقت ۔ کس بل ۔
نیستا ۔ نرکل کا جنگل ۔
نیمچہ ۔ چھوٹی تلوار ۔
نی غم دُزدُ نی غمِ کالا ۔ نہ چور کا ڈر
" نہ سامان کا غم

"و"

وَاثِق ۔ معتبر ۔ مضبوط ۔

وَاجِبُ الْوُجُود ۔ وجود کے لائق ۔
" جس کا وجود لازمی ہو مراد
" خدا تعالیٰ ۔
وَارُستگی ۔ فارغ البالی ۔ آزادی ۔
وَارفتگی ۔ پشیمانی ۔ بے خبری ۔
" نڈھال پن ۔
وَارفتہ ۔ کھویا ہوا ۔ مدہوش ۔
وَاژگوں ۔ اوندھا ۔ منحوس ۔
وَاسُوختہ ۔ بیزار ۔ کڑھا ہوا ۔
وَاعِیَہ ۔ نگہبان ۔ حفاظت کرنے والا ۔
وَامِق ۔ دوست رکھنے والا ۔ ایک
" مشہور عاشق کا نام جو عذرا نامی
" خاتون سے محبت کرتا تھا اُن کی
" داستانِ محبت بہت مشہور ہے ۔
وَہبْ ۔ عطا کرنے والا ۔ بخشنے والا ۔
وَرَع ۔ پرہیزگاری ۔
وَسِیم ۔ خوبصورت ۔ نشان لگا ہوا ۔
وَش ۔ مانند ۔ نظیر ۔
وَضُوح ۔ آشکارا ۔ ثبوت
وَقَاحت ۔ بے حیائی ۔ بے ادبی ۔
وَہبی ۔ بخشی ہوئی چیز ۔
وَاجِبُ الْاِنْقِیاد ۔ جس کی فرمانبرداری
" ضروری ہو ۔
وَیراگی ۔ تارک دنیا ۔
" گوشہ نشین فقیر ۔

"ہ ۔ ھ"

ہاتِفْ ۔ آواز دینے والا۔ غیب کی
〃 آواز
ہارُوتْ ۔ ایک فرشتہ کا نام جو
〃 انسانی شکل میں اپنے دوسرے
〃 ساتھی ماروت کے ساتھ خدا
〃 کے حکم سے دنیا میں آزمائش
〃 کے لئے آئے تھے تاکہ دیکھیں
〃 دنیا کی رنگینی کس طرح انسان
〃 کو گمراہ کرتی ہے۔ مگر وہ خود
〃 دنیا میں آکر گناہ کے مرتکب
〃 ہوئے تو ان کو سزا ملی۔
ہالِکْ ۔ قتل کرنے والا۔ ہلاک کرنے
〃 والا۔
ہالَہْ ۔ دائرہ۔ چاند کے گرد روشنی
〃 کا دائرہ۔
ہامُونْ ۔ جنگل ۔ ریگستان۔
ہذَیانْ ۔ بیماری کی مدہوشی میں
〃 بڑبڑانا۔
ہَرَاوَلْ ۔ فوج کا وہ دستہ جو آگے
〃 چلتا ہے۔
ہَرَجْ مَرَجْ ۔ فتنہ فساد۔ گڑبڑ۔
〃 مصیبتیں۔

ہَرْزَہْ گو ۔ بکواس کرنے والا۔ بیہودہ
〃 بکنے والا۔
ہِزَبْرْ ۔ چیتا۔ شیر۔
ہڑونگی ۔ جھگڑالو۔ شور غل کرنے والا۔
ہفت خواں ۔ رستم پہلوان جب
〃 کاؤس کی حمایت میں لڑنے کے
〃 لئے ماژندران جا رہا تھا تو راستہ
میں اس کو سات خطرناک
〃 حادثات پیش آئے۔ جن سے
〃 اپنی قوت کے ذریعہ مقابلہ کرکے
〃 کامیاب رہا تھا۔ ان سات
〃 مقامات کو ہفت خوان کہا جاتا
〃 ہے یہ بھی روایت ہے کہ سات
کنوئیں راستہ میں اس کے لئے
〃 کھودے گئے تھے ساتوں سے
〃 بچ نکلا۔
ہفتِ اقلیم ۔ دنیا کو قدیم علماء
〃 نے سات حصوں پر تقسیم کیا
〃 تھا ہر حصہ ایک اقلیم کہلاتا ہے
〃 مراد پوری دنیا۔
ہلاہل ۔ قاتل زہر۔ جس کا علاج
〃 نہ ہو سکے۔
ہُما ۔ ایک پرندہ کا نام۔ کہا جاتا ہے
〃 کہ وہ جس کے سر پر اتفاق سے
〃 بیٹھ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے

" سایہ ہما، مشہور ہے ہما فرضی
" نام ہے جس کا در اصل کوئی
وجود نہیں ہے۔

ہُمایوں۔ مبارک۔

ہموارہ۔ برابر۔

ہم سنگ۔ ہم پلّہ۔

ہونّق۔ حیران۔

ہوادار۔ ڈولی کی طرح ایک
" سواری جس کو کہار اٹھاتے
ہیں۔

ہیزم۔ خشک لکڑی۔

ہیکل۔ بڑی عمارت۔ طوق۔
" ہار۔ گلے کا زیور۔

ہیہات۔ کلمہ حیرت و افسوس۔

ہیم راج۔ ایک مشہور ہندوستانی
پہلوان کا نام۔

ہبوب۔ ہوا چلنا۔

ہمیانی۔ روپیہ رکھنے کی چھوٹی
تھیلی جو کمر میں باندھی جاتی ہے۔

ہفت قلم۔ سات مشہور خط،
" فن خوشنویسی کی اصطلاح۔
" سات خط یہ ہیں۔
" ثلث۔ محقق۔ توقیع۔ ریحان
رقاع۔ نسخ۔ نستعلیق۔

"ی"

یابو۔ چھوٹا گھوڑا۔ ٹٹو۔

یاجوج ماجوج۔ ایک فسادی
" قوم جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے

یارانِ سرِ پل۔ بے تکلف اور
" بے فکرے دوست جو
مل بیٹھتے ہیں۔

یاسمن۔ چمیلی۔

یٰسین۔ قرآن شریف کی ایک
" سورہ کا نام جو عام طور پر
" بیماری اور حالتِ نزع
میں مریض کو سنائی جاتی ہے

یاقوت رقم۔ ایک ماہر خطاط
" کا لقب۔ اچھے خوشنویس
" کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔
" یعقوت مستعصمی بہت مشہور
" خطاط تھے۔

یدِ بیضا۔ (سفید چمکدار ہاتھ)
" حضرت موسیٰ کا جلا ہوا ہاتھ
جس کو بغل میں ڈال کر نکالتے
" تھے تو وہ روشن ہو جاتا تھا
" خوبصورتی اور خوبصورت
" چیزوں سے تشبیہہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

یدِ طُولیٰ ۔ مہارت ۔ کمال ۔
یَرَاق ۔ سامان ۔ ہتھیار ۔
یَسَار ۔ بائیں سمت ۔ بایاں ۔ بد قسمت ۔
یَاوَل ۔ چوبدار ۔ پہرہ دار
یَل ۔ پہلوان ۔
یَلدَا ۔ سال کی سب سے زیادہ اندھیری رات ۔
یُوز باشی ۔ سو سپاہیوں کا سردار ۔ یہ ترکی فوج کا عہدہ ہے ۔

یَجُر وید ۔ ہندو مذہب کی چار مستند کتابوں میں سے تیسری کتاب کا نام ہے ۔
یَابِس ۔ روکھا سوکھا ۔ خشک ۔
یَمین ۔ دایاں ۔ دائیں طرف ۔
یَبُوست ۔ خشکی ۔
یَرغَما ۔ گھوڑا ۔ یلغار ۔
یَدِ طُولیٰ ۔ مہارت ۔ کمال حاصل ہونا
یَاقُوتی ۔ طاقت کی ایک یونانی دوا جس میں یاقوت بھی شامل ہوتا ہے ۔

عربی ضرب الامثال و محاورات

اردو ترجمہ	عربی
انتظار کرنے کی تکلیف موت کی تکلیف سے زیادہ سخت ہے۔	اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْتِ۔
نیک بخت وہ ہے جو غیروں سے نصیحت حاصل کرے۔	اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَیْرِہٖ۔
آفتاب سے زیادہ روشن۔	اَظْھَرُ مِنَ الشَّمْسِ
لوگوں کی حفاظت کرو۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا	اِحْفَظِ النَّاسَ یَحْفَظْکَ اللّٰہُ
کوشش کرنا میرا کام ہے اور اس کام کا نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے۔	اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ
بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور یقیناً اسی کی طرف لوٹیں گے۔	اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،
حکم کی تعمیل ادب و تعظیم پر مقدم ہے۔	اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبِ
بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا، بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔	اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ
سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔	اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

عربی	اردو ترجمہ
إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ رِجْسٌ	بیشک شراب اور قمار بازی نجس و ناپاک ہیں۔
إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا	ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔
اَلتَّاخِيرُ مِنَ الرَّحْمٰنِ وَالتَّعْجِيلُ مِنَ الشَّيْطٰنِ۔	تاخیر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور جلدی کرنا شیطان کا کام ہے

یعنی اللہ تعالیٰ موقع اور مہلت دیتا ہے اور شیطان جلدی کراتا ہے۔ تاکہ کام خراب ہو۔

عربی	اردو ترجمہ
أَعْدَى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ۔	تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے پہلو میں موجود ہے۔
أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ۔	میں اللہ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں
أَنْتَ شَيْخٌ أَوْ سَيِّدٌ	تم شیخ ہو یا سید ہو
اَلْمَشْهُوْرُ كَالشَّمْسِ فِيْ نِصْفِ النَّهَارِ	(وہ) ایسا مشہور کہ جیسا دوپہر کا سورج
اَلْعَاقِلُ تَكْفِيْهِ الْإِشَارَةُ	عقلمند کے لئے اشارہ ہی کافی ہے
بَلَغْنَا الْمُرَادَ۔ وَزَالَ الْعِنَادُ	ہم اپنی مراد پاگئے اور عداوت ختم ہوگئی۔
بَيِّنُوْا أَوْ تُؤْجَرُوْا	بیان کرو اور اجر حاصل کرو
جَعَلَ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ	اس کا ٹھکانا جنت میں بنادیا
جَعَلْنَا الشَّمْسَ ضِيَاءً	سورج کو ہم نے روشنی کے لئے بنایا۔

عربی	اردو ترجمہ
اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْءَ۔	اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے کہ جب کوئی پریشان حال اس کو پکارتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے اور اس کی تکلیف دور فرماتا ہے۔
لَكَ الْحَمْدُ وَالشُّكْرُ يَا رَبَّنَا	اے ہمارے پروردگار سب تعریف اور شکر تیرے لئے ہے
مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ	ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسی طرح پہچاننے کا حق تھا۔
لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا	ہم کو کوئی علم نہیں سوا اس کہ جو تو نے ہمیں سکھایا۔
رَاحَةِ الرُّوْحِ فِيْ قِلَّةِ الْمَنَام	روح کی آسودگی اور آرام کم سونے میں ہے۔
غَبَتِ مَسَا قَبْلِ عِشَا	شام کے بعد عشا (رات) سے پہلے۔
مَا اسْمُكَ؟	تمہارا نام کیا ہے؟
وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا	اور ہم نے دن حصولِ معاش کے لئے بنایا۔
اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ	لڑائی ایک دھوکہ ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الشُّجَاعَ	بیشک اللہ تعالیٰ بہادر شخص کو پسند کرتا ہے۔
اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ	لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

عربی	اردو ترجمہ
حماک اللہ عن شر النوائب	اللہ تعالیٰ تم کو حادثات کے شر سے محفوظ رکھے۔
جزاک اللہ فی الدارین خیرا	اللہ تعالیٰ تم کو دونوں جہاں میں اچھا اجر عطا فرمائے۔
لاحول ولا قوۃ الا باللہ	ساری توانائی وطاقت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے
"لاحول"	بطور کلمۂ نفرت و بیزاری استعمال ہوتا ہے۔
شرف الانسان بالکمال لا بالمال	انسان کی بڑائی اور عزت اس کے علم وہنر سے ہے نہ مال و دولت سے۔
نعوذ باللہ من الشیطن الرجیم	ہم شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں۔
من اللہ الاعانۃ والتوفیق	اللہ ہی کی طرف سے مدد اور توفیق حاصل ہوتی ہے۔
کل طویل احمق	ہر لمبا آدمی احمق ہے
فاعتبروا یا اولوالابصار	عبرت حاصل کرو اے سوجھ بوجھ رکھنے والو دانشمندو۔
الامر فوق الادب	حکم کا درجہ ادب سے بڑا ہے۔
برد اللہ مضجعہ	اللہ تعالیٰ اس کی آخری آرام گاہ کو ٹھنڈا کرے۔
انی لا اقول الا حقا	میں سچ کے علاوہ کوئی بات نہیں کہتا ہوں۔
التائب من الدنیا کمن لا ذنب لہ	جو دنیا سے توبہ کرلیتا ہے وہ اس شخص جیسا ہوجاتا ہے جس نے کوئی گناہ

عربی	اردو ترجمہ
اُطلُبُوا العِلمَ ولَو کانَ بالصِّین	عِلم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین تک جانا پڑے۔
فضّلنا بعضھُم علیٰ بعضٍ	ہم نے فضیلت دی ہے ان میں سے بعض کو بعض پر
اَلصَّبرُ مِفتَاحُ الفرج ۔	صبر خوشحالی کی کنجی ہے
اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابِرِین ۔	بیشک اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔
اِذاجاءَ القضاءُ عمِیَ البصر	جب شامت آتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔
ھاتِ الصَّبوحَ حَیّوا یا اَیُّھا السُّکاریٰ	صبح کو پینے والی شراب لاؤ جیو اے سرمست رہنے والو۔
سَوادُ الوَجہِ فِی الدُّنیا وَ سَوادُ القَلبِ فِی العُقبیٰ۔	چہرہ کی سیاہی دنیا میں اور قلب کی سیاہی آخرت میں (بری ہوتی ہے)
عمّرہُ اللہُ اِلیٰ یومِ النشورِ	اللہ تعالیٰ اس کو قیامت تک زندہ رکھے۔
بلغَ العُلیٰ بکمالِہ	وہ اپنے کمالات کی بدولت بلندی پر پہونچا۔ (یہ شیخ سعدی کے ایک عربی کا قطعہ کا پہلا مصرع ہے)
لَو فرضنا ذالکَ	اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں۔ فرض کر لیں۔
اَلسَّعِیدُ مَن وُعِظَ بِغَیرِہ	خوش بخت وہ ہے جو اپنے مخالف سے سبق حاصل کرے۔

تعارف اشخاص

(جن کا ذکر فسانہ آزاد میں کیا گیا ہے)

ابنِ سینا۔ حکیم بو علی ابن سینا مشہور طبیب، عالم اور فلسفی تھے، یونانی طریقہ علاج کو ترقی دی۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فن طب پر ان کی کتاب قانون بہت مشہور ہے انہوں نے سنہ ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

ابُو جہل۔ عرب کے قبیلہ قریش کا سردار اور اسلام کا مخالف تھا۔ قرآن شریف میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

ابوالفضل۔ اکبر بادشاہ کا وزیر اور بلند پایہ عالم تھا اس کے والد شیخ مبارک اپنے زمانہ کے بڑے فاضل تھے۔ انشاء اور مکتوبات ابوالفضل فارسی کی معیاری کتابیں ہیں۔ آئینِ اکبری اس کی مشہور تصنیف ہے۔ سنہ ۱۰۱۱ ہجری میں جہانگیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔

اَبُو تُراب۔ یہ حضرت علیؓ کی کنیت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی تھی۔

اَبُوظَفَر۔ کنیت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ۔ متوفی سنہ ۱۸۶۲ء۔

اَخْفَش۔ نام سعید بن سعدہ۔ متوفی سنہ ۲۲۱ ہجری ماہر لغت نویس اور عربی قواعد میں فن نحو کا فاضل تھا۔ اس کو قواعد سے اتنی دلچسپی تھی کہ گھر میں اپنی بکری کو مخاطب کر کے سمجھاتا تھا۔ اگر کبھی بکری عادتاً سر ہلا دیتی تو وہ خیال کرتا کہ اب سمجھ گئی پھر دوسرا مسئلہ شروع کرتا۔ اس لئے "بُزِ اخفش" بطورِ مثل مشہور ہے۔ جو حماقت اور سادہ لوحی کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

اَسِیر۔ نواب مظفر علی خان اسیر۔ وزیر نواب واجد علی شاہ مشہور شاعر متوفی ۱۸۸۱ء

آغا میر۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین
" حیدر کا وزیر اعظم۔ بانی سرائے
" آغا میر لکھنؤ۔

آصف الدولہ۔ نواب وزیر
" اودھ بانی امام باڑا آصفی
" متوفی ۱۷۹۵ء

امانت۔ آغا حسن امانت شاگرد
" دبگیر مصنف اندر سبھا "

امیر خسرو۔ فارس کے بلند پایہ شاعر
" ماہر موسیقی درویش صفت
" حضرت نظام الدین اولیاء کے
" مرید اور ہم نشین خاص متوفی [illegible]

امرء القیس۔ زمانہ جاہلیت کا مشہور
" شاعر۔ اس کا قصیدہ معلقہ عربی
" ادب کا شاہکار ہے اس نے
" ۵۳۹ء میں وفات پائی۔

افراسیاب۔ توران کا مشہور
" بادشاہ تھا۔

التمش۔ شمس الدین التمش بادشاہ
" دہلی متوفی ۱۲۳۶ء

امجد علی شاہ۔ بادشاہ اودھ
" بانی امام باڑا حسین آباد لکھنؤ
" متوفی ۱۸۴۸ء۔

انیس۔ میر ببر علی انیس بلند پایہ
" مرثیہ گو شاعر متوفی ۱۸۷۴ء۔

انشاء۔ انشاء اللہ خان اردو کا
" ممتاز شاعر اور ماہر قواعد
" متوفی ۱۸۱۷ء۔

انوری۔ اوحد الدین انوری
" مشہور فارسی شاعر۔ ماہر قصیدہ
" نگار متوفی ۵۴۷ھ ہجری

ایاز۔ سلطان محمود غزنوی کا محبوب
" اور فرمانبردار غلام۔

بابر۔ ظہیر الدین بابر ہندوستان
" میں مغلیہ حکومت کا بانی۔
" متوفی [illegible]

بندہ دین اور کالکا۔ دونوں
" درگا پرشاد کتھک کے بیٹے تھے فن رقص کے جملہ
اقسام کے ماہر۔ ان کا خاندان آج تک رقص میں ممتاز ہے

بلعم باعور۔ بنی اسرائیل کا ایک بڑا عبادت گزار
" عالم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے جرم میں
" مردود قرار دیا گیا تھا۔

بحر۔ شیخ امداد علی بحر
" شاگرد ناسخ متوفی ۱۸۸۲ء

بطلیموس۔ یونان کا ممتاز فلسفی عالم
" جس کی تصنیف "مجسطی"
مشہور کتاب ہے۔

بقراط۔ یونان کا مشہور عالم اور
" ماہر طب۔ اس نے طب کو
" بے حد روشناس کیا۔

بھان متی۔ راجہ بھان کی بیٹی جس کو

" راکھشش اٹھا لے گئے تھے
" اس کا قصہ بہت مشہور ہے۔
بیدل۔ مرزا عبدالقادر مشہور، بلند
" مرتبہ فارسی شاعر اورنگ زیب
" کے ہم عصر۔ متوفی ۱۱۲۵ھ۔
بہزاد۔ ایران کا ماہر مصور و نقاش
" ایران کے بادشاہ اسماعیل
صفوی کا ہم عصر۔
بگّا بیگم۔ فن رقص کی ماہر۔ بادشاہ
" اودھ نصیرالدین حیدر کی
" درباری رقاصہ۔
تھاندھ۔ بالے میاں سید سالار مسعود
" غازی کا عوامی نام جن کا مزار بہرائچ میں
" ہے۔ ان کے نام کی چھڑیں اٹھائی
" جاتی ہیں۔
جالینوس۔ علم طب کا ماہر مشہور یونانی
" فلسفی اور طبیب۔
جلال لکھنوی۔ حکیم ضامن علی خاں جلال
" اردو کے ادیب اور شاعر، فن
" قواعد و لغت نویسی میں مہارت
" رکھتے تھے۔ ۱۳۲۷ ہجری میں
" وفات پائی۔
جرأت۔ شیخ قلندر بخش جرأت
" اردو کے مشہور شاعر متوفی
" ۱۲۲۴ ہجری۔

حافظ شیرازی۔ خواجہ شمس الدین
" حافظ فارسی کے سب سے
" زیادہ مقبول غزل گو شاعر۔
" جن کے دیوان سے فال نکالتے
ہیں۔ متوفی ۱۳۸۹ء مدفن شیراز۔
حسنین۔ مراد حضرت امام حسنؓ اور
" امام حسینؓ۔
حافظ نوراللہ۔ بہت مشہور اور ماہر
" خوش نویس تھے۔ ان کے شاگردوں
" کے ذریعہ اس فن کو بہت ترقی
" ہوئی۔ لکھنؤ میں قیام تھا۔
حافظ ابراہیم۔ ماہر خطاط۔ شاگرد
" حافظ نوراللہ۔ اودھ کے نوابی
عہد میں تھے۔
حامد علی۔ ماہر خوش نویس۔ شاگرد
" منشی ہادی علی۔ نولکشور پریس
" سے وابستہ تھے ترجمہ الف لیلیٰ
" کے مرتب۔
خاقانی۔ افضل الدین خاقانی
" شروانی فارسی کے بلند پایہ
قصیدہ نگار شاعر متوفی ۵۶۵ ہجری
چھجو خاں۔ ماہر پٹے باز۔ عہد
" آصف الدولہ میں اس کی بہت
" شہرت تھی۔
درد۔ خواجہ میر درد مشہور اردو شاعر
متوفی ۱۷۸۵ء بمقام دہلی۔

دھنیا مہری۔ مشہور کہارن جو
اودھ کے بادشاہ نصیر الدین
حیدر کی منظور نظر اور حکومت
کے معاملات میں دخیل تھی۔
اس کی وجہ سے رسالدار فقیر
محمد خان گویا کو بادشاہ کی
خفگی کے باعث استعفا دینا
پڑا تھا۔

راجہ مہرا۔ کہاروں کی برادری کا
سردار۔ عہد آصف الدولہ میں
بہت مشہور ناچنے والا اور ایک نئے ناچ کا موجد تھا۔ **رابعہ**
بصری ایک ممتاز عابدہ و زاہدہ خاتون
جن کا شمار اولیا میں ہوتا ہے
بصرہ کی رہنے والی تھیں ۱۳۵ھ
میں وفات پائی۔ ان کا مزار
کوہ طور پر ہے۔

رودکی۔ ابو عبد اللہ نام فارسی زبان
کا مشہور و ممتاز شاعر جو فارسی
شاعری کا بابا آدم کہلاتا ہے
متوفی ۳۲۹ھ ہجری۔

زلالی۔ حکیم زلالی خوانساری۔ فارسی
کا مثنوی گو شاعر متوفی ۱۰۲۴ھ ہجری۔

زال۔ سام کا بیٹا اور مشہور عالم پہلوان رستم کا
باپ تھا۔ زال بوڑھی عورت کو بھی کہتے ہیں۔

زرتشت۔ ایک ایرانی مذہبی رہنما۔ جس نے آتش
پرستی کی بنیاد ڈالی۔ پارسی مذہب کا
پیغمبر مانا جاتا ہے۔

سعدی شیرازی۔ شیخ مصلح الدین
سعدی زبردست عالم، صوفی
اور شاعر۔ ان کی تصانیف
گلستاں اور بوستاں عالمگیر
شہرت حاصل کر چکی ہے ۶۹۲ھ
میں وفات پائی۔

سلمان ساوجی۔ فارسی کے
بلند پایہ شاعر متوفی ۷۷۸ھ ہجری

سرب سکھ رائے۔ ایک
باکمال خطاط تھا۔ حافظ
نور اللہ کا شاگرد تھا۔

سرور۔ مرزا رجب علی بیگ
مصنف فسانہ عجائب متوفی ۱۸۶۹ء

سحبان بن زائل۔ عرب کا خوش
بیان مشہور مقرر۔ اسلام
سے قبل گزرا ہے۔

سودا۔ مرزا محمد رفیع۔ اردو کا
بلند پایہ شاعر متوفی ۱۷۸۱ء۔

سعادت علی خاں۔ اودھ کے
حکمران متوفی ۱۸۱۴ء۔

سندر جان۔ عہد آصف الدولہ
کی ماہر گانے والی۔

شاہ مینا۔ ایک بزرگ اور عالم
جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع عام و
خاص ہے۔ ان کی مزار پر

نوچندی جمعرات کو میلہ لگتا ہے۔

شجاع الدولہ ۔ اودھ کے دوسرے
" نواب وزیر و حکمران ۔متوفی
۱۷۷۴ء۔

شیخ سدّو ۔ ایک بزرگ
شخصیت جو بہت مشہور ہیں۔
" امروہہ ضلع مرادآباد میں ان
" کا مزار واقع ہے۔ جس پر
" لوگ عقیدت مندی کے ساتھ
" حاضر ہوتے ہیں منتیں مانتے
" ہیں۔ ان کے نام کا بکرا ذبح
" کرتے ہیں۔ عورتیں زیادہ
" عقیدت مند ہیں۔ مگر ان کے
" متعلق کوئی مستند بات معلوم
" نہیں۔

شہیدی ۔ کرامت علی ۔خوشگو
" شاعر۔ نعت گوئی میں مشہور
شاگرد مصحفی متوفی ۱۲۵۶ھ ہجری

شوری ۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر
" کے عہد کا گانے والا۔ جو ٹپّہ
گانے میں بہت ماہر تھا۔

شمس الدین ۔ اعجاز رقم خطاب
" تھا۔ فن نستعلیق کے ماہر ایک
" بلند پایہ خوش نویس۔ شاگرد
ہادی علی اشک۔ مطبع نولکشور سے وابستہ ہے۔

صبا ۔ میر وزیر علی۔ شاگرد آتش
" مشہور شاعر متوفی ۱۲۷۱ھ ہجری۔

طالب آملی ۔ محمد طالب نام۔
" ایران کے مقام آمل کے رہنے
" والے اور فارسی کے بلند پایہ
" شاعر تھے۔ جہانگیر بادشاہ
" کے عہد میں دربار سے ملک الشعراء
" کا خطاب پایا متوفی ۱۶۲۶ء

طوطا رام شایان ۔ فارسی
" اردو دونوں زبانوں میں ماہر
" تھا۔ اس نے منشی نولکشور کی
" فرمایش پر الف لیلیٰ کو نظم کیا
تھا۔ جو شائع ہو چکی ہے۔

ظہوری ۔ ملّا نورالدین ظہوری
" فارسی کے باکمال شاعر اور
" نثر نگار، دکن کے رہنے والے
" تھے "سہ نثر" انشا اور نورس
" فن موسیقی میں ان کی مشہور
" تصانیف میں انہوں نے ۱۰۲۵ء
" میں وفات پائی۔

ظہیر فاریابی ۔ فارسی کے مشہور
" باکمال قصیدہ گو شاعر متوفی ۱۵۹۸ء۔

عباس ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا نام تھا
" اور حضرت علیؓ کے ایک بیٹے کا نام بھی ہے جو
" امام حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے تھے

عمر خیام ۔ عمر نام خیام تخلص ۔ باکمال
″ فلسفی ماہر نجوم اور ممتاز رباعی
″ گو شاعر ۔

عرفی شیرازی ۔ جمال الدین نام
″ عرفی تخلص وطن شیراز فارسی
″ کا باکمال شاعر، جہانگیر کے دربار
″ سے وابستہ تھا۔ اس نے ۱۵۹۱ء
″ میں بمقام لاہور وفات پائی۔

عراقی ۔ فخرالدین نام، وطن ہمدان
″ (ایران) مشہور فارسی شاعر
″ متوفی ۱۲۸۹ء

عاشورن ۔ نصیرالدین حیدر بادشاہ
″ اودھ کے عہد کی ایک ماہر ناچنے
″ والی تھی

عیشی ۔ اردو کے خوشگو شاعر
″ متوفی ۱۲۴۸ ہجری ۔

عطار ۔ خواجہ فریدالدین عطار ۔
″ باکمال درویش بلند پایہ فارسی
″ شاعر ۔ تذکرۃ الاولیاء کے مصنف
″ متوفی ۶۲۱ ہجری ۔

غازی الدین حیدر ۔ اودھ
″ کے پہلے بادشاہ جنہوں نے دہلی
″ کی مرکزی حکومت کی قبلات
″ ترک کر کے خود مختار بادشاہی
″ کا اعلان کیا ۔ انہوں نے ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔

غالب ۔ مرزا اسداللہ خاں ۔ فارسی
″ اردو کے باکمال شاعر متوفی ۱۸۶۹ء ۔

غنی ۔ غنی کشمیری فارسی کے مشہور
″ شاعر متوفی ۱۶۶۹ء ۔

فردوسی ۔ ابوالقاسم نام طوس
″ (ایران) وطن باکمال رزمیہ شاعر
″ شاہنامہ کا مصنف متوفی ۴۱۱ ہجری

فرعون ۔ قدیم مصر کے بادشاہوں کا
″ ایک خاندان جس کا ہر بادشاہ
″ فرعون کہلاتا تھا مشہور فرعون
″ وہ ہے جس کے عہد میں حضرت
″ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ۔

فقیر محمد خان ۔ گویا تخلص ۔ اودھ
″ میں رسالدار تھے ۔ اردو کے
″ اچھے شاعر تھے ان کی کتاب
″ بستان الحکمت اردو نثر کی
″ مشہور کتاب ہے متوفی ۱۸۵۰ء

فیثاغورث ۔ یونان کا مشہور عالم
″ اور فلسفی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس
″ نے سب سے پہلے پیراکی کا فن
″ سیکھا ۔

فری میسن ۔ قدیم زمانہ میں
″ انگلستان کا ایک پراسرار
″ گروہ جس کا الگ ایک مذہب
″ و مسلک تھا جو کسی پر ظاہر نہیں

کرتے تھے۔ صرف اس گروہ کے
افراد ہی ایک دوسرے سے
واقف ہوتے تھے۔

قائمؔ علی خاں ۔ لکھنؤ کا مشہور
بھانڈ (نقال) تھا۔

عرف کریلا بھانڈ ۔ عام طور پر کریلا
کے نام سے مشہور تھا وہ اودھ
کے نواب سعادت علی خان کے
عہد سے نصیر الدین حیدر کے
زمانہ تک موجود تھا اس کا کمال
یہ تھا کہ مسلسل سات گھنٹے
تک طرح طرح سے منھ بناتا
تھا۔ محرم میں شربت کی سبیل لگاتا تھا۔
ایک بار بادشاہ نصیر الدین حیدر
مع اپنی بیگم کے اس کی سبیل
پر آئے تو اس نے برجستہ کہا۔
خدا حضور کو سلامت اور
بیگم صاحبہ کو قائم رکھے۔ اس
فقرہ پر بادشاہ اور مصاحبین
پھڑک اٹھے اور اس کو انعام
سے نوازا۔

قاضی نعمت اللہ ۔ باکمال خوش
نویس جو مشہور استادِ خطاطی
عبد الرشید دیلمی کے شاگرد
رشید تھے۔

قدرؔ بلگرامی ۔ غلام حسین نام وطن
بلگرام اردو کے اچھے ادیب وصحافی
خوش گو شاعر اور مرزا غالب کے
شاگرد تھے اودھ اخبار کے
ایڈیٹر رہے ۱۸۸۴ء میں وفات
پائی۔

قابیل ۔ حضرت آدم کے دوسرے
بیٹے کا نام جس کو پہلے بیٹے ہابیل
نے قتل کر دیا تھا۔

قارون ۔ ایک مشہور دولت مند
تھا کہا جاتا ہے کہ اس کے
خزانوں کی کنجیاں چالیس اونٹوں
پر لادی جاتی تھیں۔ حضرت
موسیٰ نے اس کو زکوٰۃ دینے
کی ہدایت کی۔ مگر وہ کسی طرح
نہ مانا۔ اس کی پاداش میں
تمام خزانوں سمیت زمین کے
اندر دھنس گیا۔ قارون کا خزانہ
اردو میں ضرب المثل کے طور پر
استعمال ہوتا ہے۔

قطب الدین ایبک ۔ ہندوستان
کا مشہور بادشاہ جس نے
دہلی میں قطب مینار تعمیر کرایا تھا
اس نے ۱۲۱۰ء میں بمقام لاہور
وفات پائی۔

کالی داس ۔ سنسکرت کا مشہور

شاعر، راجہ بکرماجیت کا ہم عصر تھا، شکنتلا، اس کا لکھا ہوا بہترین ناٹک ہے۔ جس کو بڑی شہرت حاصل ہے۔

مانی۔ ایران کا باکمال مصوّر اور نقاش اس کی کتاب اَرژنگ مشہور ہے۔ بہرام اوّل بادشاہ ایران نے اس کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے قتل کرا دیا تھا۔

محقق دوّانی۔ جلال الدین نام ایران کا مشہور عالم۔ تاتاری حکمران ہلاکو خان کا وزیر تھا اس کی کتاب اَخلاقِ جلالی" بہت مشہور ہے۔ متوفی سنہ ۵۲۸ ہجری۔

مصحفی۔ غلام ہمدانی نام۔ اردو کے باکمال شاعر متوفی سنہ ۱۲۴۰ ہجری

میر مونس۔ میر انیس کے چھوٹے بھائی۔ مرثیہ گوئی میں ماہر تھے۔

میر ضمیر۔ لکھنؤ کے ممتاز مرثیہ گو شاعر مرزا دبیر کے استاد تھے۔

منصور۔ حسین بن منصور حلاج۔ جن کو انا الحق کہنے کے جرم پر پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

محمد علی شاہ۔ اودھ کے بادشاہ جنہوں نے حسین آباد لکھنؤ میں خوبصورت امام باڑا تعمیر کرایا تھا۔ انہوں نے سنہ ۱۸۴۲ء میں وفات پائی۔

میر حسن۔ اردو کے باکمال شاعر ان کی مثنویات اردو نظم کا شاہکار ہیں۔ مرثیہ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ متوفی سنہ ۱۷۸۶ء۔

میر سوز۔ اردو کے مشہور شاعر غزل گوئی میں ممتاز متوفی سنہ ۱۷۹۸ء۔

میر تقی میر۔ اردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر مانے جاتے ہیں تذکرہ نگار بھی تھے غزلیات کے چھ دیوان اور متعدد مثنویات یادگار ہیں سنہ ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔

مرزا علی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں شاہی طبیب تھے۔

مینڈو خان۔ اودھ کی فوج میں رسالدار تھے لکھنؤ میں ان کی بنوائی ہوئی خوبصورت سرائے مشہور تھی جو اب مسمار ہو چکی ہے۔

ممتاز محل ۔ شاہ جہاں بادشاہ کی
محبوب ملکہ جس کی یادگار میں
اس نے تاج محل بنوایا تھا جو
۱۶۴۸ء میں تیار ہوا۔ ممتاز محل
نے ۱۶۳۱ء میں وفات پائی۔

منیرؔ ۔ اسماعیل حسین منیرؔ مشہور شاعر
اور ادیب جن کو ۱۸۵۷ء کی
جنگِ آزادی میں شرکت کے
جرم میں جزائر انڈمان میں قید
کر دیا گیا تھا ۱۸۸۱ء میں وفات
پائی۔

مومنؔ ۔ حکیم مومن خان دہلوی باکمال
غزل گو شاعر غالب و ذوق
کے ہم عصر متوفی ۱۸۵۱ء۔

نوبت رائے نظرؔ ۔ ممتاز صحافی
خوشگو شاعر، خدنگ نظر،
کے اڈیٹر، لکھنؤ کے ایک معزز
کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے
تھے۔ نولکشور پریس سے بھی
وابستہ رہے۔ متوفی ۱۹۲۲ء

نپولین ۔ مشہور جنرل فرانس کا
حکمران متوفی ۱۸۲۱ء۔

نورجہاں ۔ بادشاہ جہانگیر
کی ملکہ متوفی ۱۰۵۵ھ۔

نصیر الدین حیدر ۔ اودھ کے دوسرے
بادشاہ متوفی ۱۸۲۲ء۔

نادر شاہ دُرّانی ۔ افغانستان
کا بادشاہ جس نے محمد شاہ
مغل بادشاہ کے عہد میں دہلی
پر حملہ کیا تھا اور تختِ طاؤس
اور کوہِ نور ہیرا اپنے ساتھ لے
گیا تھا۔

نمرود ۔ عرب کا ایک ظالم حکمران
جس نے حضرت ابراہیم پیغمبر کو
آگ میں ڈلوا دیا تھا۔ مگر وہ محفوظ
رہے تھے۔

ناسخؔ ۔ شیخ امام بخش۔ باکمال
اردو شاعر۔ جنہوں نے
زبان کی اصلاح کے لئے مفید
کام کیا۔ ۱۸۳۸ء میں لکھنؤ میں
وفات پائی۔

نواب مرزا شوقؔ ۔ حکیم تصدق
حسین عرف نواب مرزا مصنف
مثنویات۔ زہرِ عشق۔ بہارِ عشق
اور فریبِ عشق۔

(۲) وزیرؔ ۔ خواجہ وزیر علی شاگرد ناسخؔ۔
لکھنؤ کے خوشگو شاعر تھے متوفی ۱۸۵۲ء۔

(۱) نسیمؔ ۔ دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد آتشؔ
نہایت خوش گو شاعر اور ٹکسالی
زبان کے ماہر مصنف مثنوی گلزارِ نسیم۔

لکھنؤ کی عمارات

(جن کا ذکر فسانہ آزاد میں آیا ہے)

امام باڑا آصفی۔ یہ عظیم الشان
عمارت قحط سالی کے زمانہ
میں نواب آصف الدولہ نے
تعمیر کرائی تھی۔ اس کا وسیع
ہال چھوٹی اینٹوں اور چونے کی
ڈاٹ پر قائم ہے۔ جس میں کوئی
ستون نہیں ہے۔ یہ ۱۶۷ فٹ
لمبا اور ۵۲ فٹ چوڑا ہے اس کی تعمیر ۱۷۸۴ء میں
کفایت اللہ نامی ماہر معمار کی
نگرانی میں ہوئی۔ نقشہ بھی
اسی کا بنایا ہوا تھا۔ اس میں
لکڑی کا استعمال بالکل نہیں کیا
گیا ہے اس کی تعمیر پر ۲۲ لاکھ
روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس کی
چھت پر ایسے پیچ در پیچ حجرہ نما
در اس طرح بنائے گئے ہیں کہ
اس میں داخل ہونے والا کچھ
دور جانے کے بعد راستہ بھول
جاتا ہے اور بہت مشکل سے
واپسی کا راستہ ملتا ہے۔
اسی لئے یہ بھول بھلیاں کے نام
سے مشہور ہے۔

امین آباد۔ یہ محلہ اور بازار
امجد علی شاہ کے زمانہ میں
ان کے وزیر امین الدولہ نے
آباد کیا تھا۔ اس بازار کے
وسط میں دو پارک ہیں۔ ایک
کا نام امین الدولہ اور دوسرے
کا امین آباد پارک ہے۔

بادشاہ باغ۔ یہ باغ بادشاہ
نصیر الدین حیدر نے دریا گومتی
کے کنارے محلہ حسن گنج میں تعمیر
کرایا تھا۔ یہ کام راجہ بختاور سنگھ
کی نگرانی میں انجام پایا تھا۔ اس
پر ۳۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ باغ
کے وسط میں سنگ مرمر کی خوبصورت بارادری
تھی جس میں سنگ مرمر کے ۳۷ خوشنما ستون نصب تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد
مہاراجہ راندھیر سنگھ والی کپورتھلہ
نے یہ باغ ۳۵ ہزار میں خرید لیا تھا
۱۹۰۵ء میں مہاراجہ مذکور نے

کینگ کالج کی عمارت کے
لیے بطور عطیہ دے دیا تھا۔
اب اس کے سارے رقبہ میں
لکھنؤ یونیورسٹی اور کالون تعلقدار
کالج کی عمارات ہیں۔

بیلی گارد۔ یہ لکھنؤ کی ریذیڈنسی کا
دوسرا نام ہے۔ یہ شاندار عمارت
نواب سعادت علی خان نے ۱۸۰۰ء
میں انگریز ریذیڈنٹ کے لیے
تعمیر کرائی تھی تحریک جنگ آزادی
۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے
اس کے آس پاس کی عمارتوں
کو ملاکر قلعہ بندی کر لی تھی۔
یہاں مجاہدین تحریک آزادی
اور انگریزی فوجوں میں سخت
معرکے ہوئے تھے۔ اس کا صدر
دروازہ بیلی گارد کے نام سے
مشہور تھا کیوں کہ اس کی حفاظت
کرنل بیلی کے سپرد تھی۔ اب پوری
عمارت اسی نام سے مشہور ہے۔

تحسین کی مسجد۔ یہ بڑی اور
خوبصورت مسجد محلہ چوک میں
اکبری دروازہ کے قریب واقع ہے
اور فرقہ شیعہ کے لیے مخصوص
ہے اس کو تحسین علی خان نے تعمیر
کرایا تھا۔

تالاب ٹکیت رائے۔ یہ تالاب
راجہ ٹکیت رائے وزیر مقدمات
دیوانی نے آصف الدولہ کے
عہد میں تعمیر کرایا تھا۔ آٹھوں کا
مشہور میلہ اسی تالاب کے کنارے
ہوتا ہے۔ اسی نام سے اس نے
ایک محلہ بھی بسایا تھا۔ جو اب
بھی موجود ہے۔

تارا والی کوٹھی۔ یہ عمارت
نصیر الدین حیدر نے اپنے دربار
کے انگریز نجومی کرنل والکوس
متوفی ۱۸۴۷ء کے مشورہ پر تعمیر
کرائی تھی اس کو رصدگاہ کے طور پر
استعمال کیا جاتا تھا نجوم سے متعلق
بہت سے آلات اس میں نصب
کئے گئے تھے اور ایک قیمتی دوربین
لگائی گئی تھی ۱۸۵۷ء تک ٹھیک
حالت میں تھی اس کے بعد
مسمار ہو گئی۔

چھتر منزل۔ یہ مشہور عمارت
نصیر الدین حیدر نے اپنی بیگمات
کی رہائش کے لیے تعمیر کرائی تھی
اسی کے متصل فرح بخش کے نام
جنرل مارٹن نے ایک کوٹھی پچاس

ہزار روپیہ میں خریدی تھی۔ جس کے اوپر طلائی چھتر لگا تھا۔ یہ عمارت دریا گومتی کے کنارے واقع ہے اور اب بھی اچھی حالت میں ہے اب اس وقت حکومت ہند نے اس کے اندر ڈرگ ریسرچ انسٹیٹوٹ قائم کر دیا ہے۔

چولکھی۔ اس نام سے عظیم اللہ خان حجام نے ایک وسیع اور خوبصورت عمارت بنوائی تھی۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد واجد علی شاہ اودھ کے آخری حکمران نے چار لاکھ روپیہ دے کر خرید لی۔ اس وقت سے چولکھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بادشاہ کی بیگمات رہتی تھیں۔ بیگم حضرت محل اور شاہزادہ برجیس قدر کا قیام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت اسی عمارت میں تھا۔ اب اس عمارت کا زیادہ حصہ مسمار ہو چکا ہے اور اس کی جگہ بازار اور نئی عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔

حسین آباد کا امام باڑا۔ یہ خوبصورت امام باڑا محلہ حسین آباد میں امجد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا یہ آصف الدولہ کے امام باڑے سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اس سے متصل ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

سوداگر کا امام باڑا۔ یہ مشہور امام باڑا امیر باقر نامی تاجر جواہرات نے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا اب تک اچھی حالت میں موجود ہے۔

اکبری دروازہ۔ یہ بلند اور شاندار دروازہ بادشاہ اکبر کے عہد میں اودھ کے نائب حکمراں محمود بلگرامی نے تعمیر کرایا تھا وہ صوبہ دار جواہر خان کا ماتحت تھا۔ یہ لکھنؤ کے چوک بازار کے شمالی سمت آخری سرے پر واقع ہے

بھولاناتھ کا کنواں۔ نواب وزیر سعادت علی خان کے عہد میں بھولاناتھ راجہ بخشی کے عہدہ پر فائز تھا۔ اودھ کے معززین میں شمار ہوتا تھا۔ آصف الدولہ اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس نے یہ بڑا کنواں رفاہ عام کے لیے تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود ہے۔

سرائے میندو خاں۔ امجد علی شاہ
کے عہد میں شاہی فوج کے
رسالدار میندو خان نے تعمیر
کرائی تھی۔ اب مسمار ہو چکی ہے
یہ حضرت گنج سے قریب دارالشفا
کے متصل واقع تھی۔

رومی دروازہ۔ یہ نہایت بلند اور
خوبصورت دروازہ امام باڑا
آصف الدولہ کے قریب نواب
آصف الدولہ نے تعمیر کرایا تھا۔
اس کو ماہر معمار کفایت اللہ نے
اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے
مطابق بنوایا تھا۔ یہ اب بھی اچھی
حالت میں موجود ہے۔

دل کشا باغ۔ نواب سعادت علی
خاں نے شہر سے متصل ایک
شکارگاہ بنوائی تھی جس میں ہر
قسم کے جانور چھوڑے گئے تھے
اور بالکل اصل جنگل کا ماحول تھا
اسی شکارگاہ کے قریب ایک محل
اور باغ تعمیر کرایا تھا جو اب بھی
موجود ہے۔

سکندر باغ۔ یہ خوبصورت
اور کشادہ باغ واجد علی شاہ
نے اپنی بیگم سکندر محل کے لئے تعمیر
کرایا تھا اسی سے متصل وہ مقام تھا جس
کو قدم رسول کہا جاتا ہے۔ سکندر باغ کو
۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں نقصان پہنچا مگر
زیادہ حصہ محفوظ رہا۔ اور یہ باغ اب تک
موجود ہے اور اب حکومتِ ہند
نے اس کو بوٹانیکل گارڈن قرار دے کر
اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔

شاہ نجف۔ اودھ کے بادشاہ
غازی الدین حیدر نے دریا گومتی
کے کنارے یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔
تاکہ مرنے کے بعد اسی میں دفن کئے
جائیں۔ یہ عمارت حضرت علیؓ کے
مزار مبارک واقع نجف اشرف
(عراق) کی نقل ہے جو ۱۸۲۷ء میں
تعمیر ہوئی تھی۔ بادشاہ مذکور
اسی مقبرہ میں دفن کئے گئے۔
یہ لکھنؤ کی خوبصورت عمارتوں میں
شمار ہوتی ہے اور دریا گومتی کے
بالکل کنارے واقع ہے۔

قدمِ رسول۔ غازی الدین حیدر
نے ایک بہت بلند چبوترہ تعمیر
کرایا تھا اور اس پر ایک حاجی کا
لایا ہوا وہ متبرک پتھر نصب کرایا
جس پر حضرت محمد صلعم کے قدم
مبارک کا نشان بتایا جاتا تھا۔

اب یہ مقام ختم ہو چکا ہے۔ یہ
سکندر باغ کے قریب واقع تھی۔

قیصر باغ۔ یہ عظیم الشان وسیع عمارت
اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی
شاہ نے ۱۸۴۸ء میں تعمیر کرائی
تھی اس کی تعمیر پر ۸۰ لاکھ روپیہ
صرف ہوا تھا۔ اس میں بادشاہ
کی بیگمات رہتی تھیں ۱۸۵۷ء کے
غدر میں اس کو بہت نقصان
پہنچا۔ تاہم اب بھی یہ عمارات
معمولی تعمیرات کے ساتھ موجود ہیں

کاظمین۔ یہ خوبصورت عمارت
حضرت موسیٰ کاظم رضؓ کے مقبرہ
کی نقل ہے جس کو ایک ہندو
جگناتھ اگروال نے تعمیر کرایا تھا
یہ امجد علی شاہ کے عہد حکومت
میں ۱۸۴۷ء میں تعمیر ہوا جگناتھ
نے اسلام قبول کر لیا اور اس
کا نام غلام رضا خان رکھا گیا
اس کے گنبد پر سونے کے
پتر چڑھائے گئے تھے۔

کربلا دیانت الدولہ۔ یہ بہت
خوبصورت عمارت حضرت
امام حسین رضؓ کے مقبرے کے طرز
پر نواب دیانت الدولہ نے
تعمیر کرائی تھی۔ اور اب تک
اچھی حالت میں موجود ہے۔

ملکہ زمانیہ کا امام باڑا۔ یہ وسیع
اور شاندار امام باڑا ملکہ زمانیہ
نے تعمیر کرایا تھا جو محلہ گولا گنج میں
واقع ہے اور اب اس کا بیشتر حصہ
مسمار ہو چکا ہے اس سے متصل ایک
بڑی مسجد بھی تھی جو خستہ حالت
میں موجود ہے۔

موتی محل۔ یہ مشہور اور خوبصورت
امام دریا گومتی کے عین ساحل پر
نواب سعادت علی خان نے تعمیر
کرائی تھی۔ اس کے قریب جو پل
ہے وہ اسی کی نسبت سے
موتی محل کا پل کہلاتا ہے۔
غازی الدین حیدر بادشاہ کی
زندگی کے آخری لمحات اسی عمارت
میں گزرے۔ اب اس عمارت
میں ۱۹۴۷ء کے بعد اچاریہ نریندر
دیو لائبریری قائم کی گئی ہے اور
حکومت کے چند دفاتر بھی ہیں۔

درگاہ حضرت عباسؓ۔ یہ لکھنؤ میں
فرقہ شیعہ کی بہت مشہور عبادت
گاہ ہے جس کا ذکر نواب مرزا شوق
نے اپنی مثنویات میں بھی کیا ہے

اس درگاہ کا بانی مرزا قیصر بیگ
نامی ایک شخص تھا کہا جاتا ہے
کہ حضرت عباسؓ کا اصلی علم کوئی
بزرگ ملک شام سے لکھنؤ
لائے تھے اور اس کو ایک مقام
پر زمین میں دفن کر دیا تھا۔
وہاں ایک غریب آدمی اقامت
گزین ہوا۔ اس نے خواب میں
دیکھا کہ یہاں حضرت عباس کا
علم دفن ہے۔ اس نے کھود کر
نکال لیا۔ مرزا قیصر بیگ نے یہ
علم محلہ رستم نگر کے ایک مقام پر
نصب کر دیا۔ جب اس کی شہرت
ہوئی تو لوگ جوق در جوق
زیارت کے لئے آنے لگے
نواب سعادت علی خان نے اس
پر طلائی گنبد تعمیر کرا دیا۔
غازی الدین حیدر کے عہد میں
نقارہ بجانے کا انتظام ہوا۔
اور عمارت کو وسعت دی گئی
اب لوگ یہاں علم لا کر چڑھانے
لگے جس کا سلسلہ اب تک جاری
ہے ہر نوچندی جمعرات کو یہاں
زائرین کا ہجوم ہوتا۔ لوگ حصول
مقاصد کے لئے منتیں مانگتے ہیں۔

حضرت گنج۔ یہ محلہ امجد علی شاہ نے
تعمیر کرایا تھا۔ اس کے قریب ایک
امام باڑا بھی بنوایا تھا اسی میں
وہ مدفون ہیں یہ محلہ اور اس کے
قرب وجوار کا علاقہ اب لکھنؤ کا
سب سے زیادہ خوبصورت اور
پر رونق بازار ہے۔ اس محلہ
میں بڑی بڑی خوبصورت نئے
طرز کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ اسی
کے قریب مبارک منزل تھی۔
جس میں نولکشور پریس قائم تھا

مارٹن کی کوٹھی۔ یہ ایک انگریز
جنرل مارٹن نے تعمیر کرائی تھی
جو نواب آصف الدولہ کے عہد
میں مکمل ہوئی۔ مارٹن کی وفات
کے بعد اس کو اسی میں دفن کیا
گیا تھا ۱۸۵۷ء میں مجاہدین
آزادی نے اس کی قبر کھود ڈالی تھی۔ اب اس
عمارت میں لا مارٹینر کالج ہے جو انگریزوں نے
اپنے بچوں اور ہندوستانی رئیسوں کے بچوں کی
تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔

کوٹھی روشن الدولہ۔ یہ شاندار
عمارت نواب غازی الدین حیدر
کے زمانہ میں وزیر سلطنت
نواب روشن الدولہ نے تعمیر کرائی
تھی اس عمارت میں دو مسجدیں

ہیں ایک قبلہ رُخ اور دوسری
اس کے برعکس محض عمارت کی
خوبصورتی بڑھانے کے لئے بنائی
گئی تھی یہ عمارت اب تک موجود
ہے اور اس میں سرکاری دفاتر
ہیں۔

وزیر باغ۔ یہ باغ لکھنؤ کے مغربی
حصہ میں وزیر اودھ نواب آغا
میر نے تیار کرایا تھا۔ جب اس
کی وزارت کا دور ختم ہوا تو
نواب وزیر نے یہ اپنی ملکہ کو
بخش دیا۔ اس باغ کی کمرکھ
بہت مشہور تھی۔ یہ باغ اور
اس سے ملحق آبادی اسی
نام سے مشہور ہے۔ باغ اپنی
اصلی حالت میں نہیں رہا کچھ
متفرق درخت بطور یادگار
اب بھی باقی ہیں۔

دارالشفا۔ یہ شاہی اسپتال
بادشاہ نصیر الدین حیدر نے
بنوایا تھا۔ اس کی شاندار
عمارت حضرت گنج کے قریب
واقع تھی اس میں عوام کے علاج
معالجہ کا اچھا انتظام تھا۔
محمد علی شاہ نے اس کو یہاں سے
ہٹا کر چوک کے قریب منتقل
کر دیا تھا۔ پرانی عمارت کو
مسمار کر کے ۱۹۴۷ء کے بعد
اس مقام پر یو پی اسمبلی اور
کونسل کے ممبروں کی رہائش
کے لئے کئی عمارتیں تعمیر کی گئی
ہیں۔ اسی کے قریب سرائے
مینڈو خان واقع تھی۔

کمپنی باغ۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء
کے بعد اپنا تسلط قائم کر کے
گول دروازہ اور امام باڑا
حسین آباد کے درمیان میں
واقع گھنی آبادی کو ختم کر کے
اس وسیع رقبہ میں ایک
باغ اور تفریح گاہ بنوائی اس کا
نام ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام
پر رکھا اس میں مختلف اوقات
میں تعمیرات ہوتے رہے
اب اس کے کچھ حصے پر
عمارتیں بن گئی ہیں اور نئے
طرز کا پارک بھی بن گیا ہے۔

Price Rs. 100/-